علم الاخلاق جلد اوّل

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

انتساب

قرآن کے حقیقی وارث

اور

قرآنی نظام کو پوری دنیا میں نافذ کرنے والی ذاتِ گرامی

حضرت امامِ زمانہ علیہ السلام (عجل اللہ تعالیٰ فرجہٗ شریف)

کے نام

فہرست مضامین

عرض مترجم 10
عرض ناشر 13
تمہید 14
پہلا باب: اخلاقی مباحث کی اہمیت 16
اسلامی روایات میں اخلاق کی اہمیت 20
۱۔علم اخلاق کی تعریف 22
۲۔فلسفہ اور اخلاق کا تعلق 23
۳۔اخلاق اور عرفان کا تعلق 24
۴۔اخلاق اور علم کا تعلق 25
۵۔آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے؟ 27
اخلاقی تبدیلی کے امکان پر آیات وروایات 31
اخلاق میں عدم تغیر کے قائلین کے دلائل 34
۶۔علم اخلاق کی مختصر تاریخ 35
۱۔سلمان فارسیؓ 37
۲۔ابوذر غفاریؓ 37
۳۔عمار یاسرؓ 37
۴۔نوف بکالی 38
۵۔محمد بن ابوبکر 38
۶۔جارود ابن منذر 38
۷۔حذیفہ بن منصور 38
۸۔عثمان بن سعید عمری 38
دوسرا باب انسانی زندگی اور تمدن میں اخلاق کا کردار 40

احادیث کی روشنی میں مادی زندگی اور اخلاق کا باہمی تعلق 51
تیسرا باب: اخلاقی مکاتب فکر 54
۱۔ اخلاق اور مکتب توحید 55
۲۔ اخلاق اور مادیت 55
۳۔ اخلاق اور عقلی فلسفہ 56
۴۔ اخلاق اور دیگر پسندی 56
۵۔ اخلاق اور ضمیر پرستی 56
۱۔ اخلاق اور نسبیت (Relativity) 57
۲۔ اخلاق اور رویے کا متقابل اثر 62
اخلاق اور عمل کا متقابل اثر احادیث کی روشنی میں 64
۳۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق 66
چوتھا باب: اخلاقی بنیادیں 68
۱۔ منفعت طلبی کی بنیاد 68
۲۔ عقلی بنیاد 69
۳۔ شخصیت کی بنیاد 70
۴۔ الٰہی بنیاد 71
اہم نکتہ 76
پانچواں باب: اخلاق اور آزادی 77
عقیدۂ جبر اور غیر اخلاقی مسائل 80
چھٹا باب: قرآن مجید میں اخلاق کے بنیادی اصول 83
تنقید و تحقیق 84
قرآن کے اخلاقی اصول 86
اصولِ اخلاق اسلامی اور احادیث 89
ساتواں باب: اخلاقی مسائل کا ایک دوسرے سے تعلق 98

آٹھواں باب: کہاں سے شروع کریں؟ 101
اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات 101
دوسرا نظریہ: روحانی طب 103
تیسرا نظریہ: سیر وسلوک 107
نواں باب: سیر وسلوک کے مختلف طریقے 111
ا۔ سیر وسلوک بحر العلوم 111
اس روش کے مطابق سیر وسلوک کی کیفیت 112
۲۔ مرحوم ملکی تبریزی کا طریقہ 115
ایک اور طریقہ 116
مکاتب سیر وسلوک کا خلاصہ اور نتیجہ 118
دسواں باب: کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟ 120
واعظ درونی کا کردار 122
گیارھواں باب: اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ضروری تیاری 124
ا۔ ماحول کی پاکیزگی 124
تفسیر ونتیجہ 125
۲۔ صحبت کا اثر 128
تفسیر اور نتیجہ 130
دوستوں کا کردار احادیث کی روشنی میں 133
صحبت کا اثر منطق کی روشنی میں 135
۳۔ اخلاق پر خاندانی تربیت وو راثت کا اثر 137
تفسیر ونتیجہ 139
اخلاق اور خاندانی تربیت احادیث کی روشنی میں 142
۴۔ علم وآگہی کا اثر 146
علم اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں 150

۵۔معاشرتی ثقافت کا اخلاقی تربیت پر اثر 154
تفسیر اور نتیجہ 156
معاشرتی آداب ورسوم اور اخلاق کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں 160
۶۔عمل اور اخلاق کا تعلق 163
تفسیر اور ترجمہ 164
اخلاق پر اعمال کا اثر احادیث کی روشنی میں 172
اخلاق اور خوراک کا باہمی تعلق 175
خوراک اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں 177
اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال 182
بارھواں باب: تہذیب اخلاق کی طرف عملی قدم 183
پہلا قدم توبہ 183
۱۔حقیقت توبہ 185
۲۔وجوب توبہ 185
۳۔توبہ کی عمومیت 187
۴۔ارکانِ توبہ 192
۵۔قبولیت توبہ عقلی ہے یا نقلی 198
۶۔جزئی توبہ 200
۷۔توبہ کی پائیداری 201
۸۔توبہ کے درجات 203
۹۔توبہ کے اثرات وبرکات 205
دوسرا قدم۔مشارطہ 208
تیسرا قدم مراقبہ 210
چوتھا قدم محاسبہ 214
پانچواں قدم معاتبہ ومعاقبہ (سرزنش اور سزا) 221

نیت اور اخلاصِ نیت 226
نیت کے ایک اور معنی 227
اخلاص 229
اخلاص احادیث کی روشنی میں 232
اخلاص کی حقیقت 234
اخلاص کی راہ میں رکاوٹیں 236
اخلاص کے آثار 238
ریاکاری 239
تفسیر 240
ریا احادیث کی روشنی میں 244
ریا کی حرمت کا فلسفہ 247
ریا کاروں کی علامات 247
ریا کا علاج 249
کیا عبادت میں نشاط خلافِ اخلاص ہے؟ 251
ریا اور سمعہ کا فرق 252
خاموشی اور اصلاحِ زبان 253
خاموشی، احادیث کی روشنی میں 256
ایک غلط فہمی کا ازالہ 258
اصلاحِ زبان 260
۱۔اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت 261
۲۔زبان کا فکر و اخلاق سے تعلق 265
۳۔آفات اللسان یا زبان کے خطرات 268
۴۔خطراتِ زبان سے بچنے کے کلی اصول 270
۱۔خطرات زبان کی طرف سنجیدہ توجہ 270

۲۔خاموشی 271
۳۔حفاظت زبان (بولنے سے پہلے سوچنا) 272
خودشناسی اور خداشناسی 273
۱۔خودشناسی اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق 274
۲۔خودشناسی احادیث کی روشنی میں 275
۳۔خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے 277
حدیث ''من عرف نفسہ'' کی سات تفسیریں 278
خودشناسی کی رکاوٹیں 281
عبادت اور دعا روح کو پروان چڑھاتی ہیں 283
تفسیر اور نتیجہ 285
پاکیزگی روح میں عبادات کا کردار احادیث کی روشنی میں 290
اللہ کا ذکر اور پرورش روح 293
تفسیر و نتیجہ 295
ذکر اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں 301
۱۔حقیقت ذکر 303
۲۔درجاتِ ذکر 305
ذکر کی رکاوٹیں 306
تیرھواں باب: نمونہ ہائے عمل 309
تفسیر اور نتیجہ 311
تولیٰ و تبریٰ احادیث کی روشنی میں 317
داستانِ موسیٰ و خضر 324
چودھواں باب: ولایت کا ایک اور چہرہ اور تہذیب نفوس میں اس کا کردار 327
علامہ مطہری شہید کا نظریہ 332
ناجائز مفاد پرستی 334

عرض مترجم

جب سے اس کرۂ خاکی پر انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آیا ہے، اخلاقی فضائل کی ضرورت اور اہمیت ہر دور اور ہر معاشرے میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر معاشرے میں اخلاقی فضائل سے آراستہ انسانوں کو عزت اور تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا رہا اور اخلاقی فضائل سے محروم افراد ہمیشہ ناپسندیدہ اور قابل مذمت ٹھہرائے جاتے رہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاقی فضائل کی کشش انسان کی فطرت اور اس کی سرشت میں رکھ دی ہے۔ دنیا کا ہر انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، رنگ، نسل یا خطے سے ہو، عدل، سچائی، ایمانداری، عفت، شجاعت اور علم سے محبت کرتا ہے اور انہیں پسندیدہ انسانی صفات مانتا ہے۔ اسی طرح وہ ظلم، جھوٹ، خیانت، بزدلی اور جہل کو ناپسندیدہ اخلاقی صفات قرار دے کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ جو افراد اخلاقی فضائل سے محروم ہیں، وہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ بظاہر ایسا رویہ اختیار کریں کہ لوگ انہیں فضائل اخلاقی سے آراستہ سمجھیں۔

آپ کو دنیا میں ایسا کوئی جاہل نہیں ملے گا جو جہل کو پسند کرتا ہو۔ آپ کو دنیا میں کوئی ایسا فریب کار اور خائن نہیں ملے گا جو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ دنیا کے ظالم ترین اور جابر ترین حکمران بھی عدل و انصاف کے قیام کے دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ حسن و قبح اخلاقی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ضمیر کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

جس معاشرے میں اخلاقی فضائل زندہ اور معاشرتی زندگی پر حاکم ہوں، اس معاشرے میں نہ صرف یہ کہ زندگی آرام و سکون سے گزرتی ہے بلکہ اس معاشرے میں انسان کو روحانی ترقی کے بھی زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جس معاشرے میں اخلاقی فضائل صرف کتب اور علماء و واعظین کی تقریروں تک محدود ہوں اور عملی زندگی میں ان کی کوئی جھلک نظر نہ آئے، اس معاشرے میں نہ صرف یہ کہ زندگی عذاب بن جاتی ہے بلکہ انسان کی معنوی ترقی کی راہیں بھی مسدود ہو جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں انسانیت کا درد رکھنے والے مفکرین اور مصلحین نے معاشرے میں اخلاقی فضائل کی بالادستی قائم کرنے کے لیے علمی، فکری اور عملی جدوجہد کی۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء بھیجے، ان سب کی بعثت کا مقصد بھی اخلاقی فضائل کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ رسول اللہؐ کی مشہور و معروف حدیث ہے:

"انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

''میں اچھے اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں۔''

یہ حدیث نبویؐ بہت گہرے معنی پر مشتمل ہے مگر اس کی گہرائی پر عام طور پر نظر نہیں کی جاتی۔ غور فرمائیں کہ حضورؐ نے یہ نہیں

فرمایا کہ میں تمہیں عقائد واعمال کی تعلیم دینے آیا ہوں یا بالفاظ دیگر آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہیں اصولِ دین اور فروع دین کی تعلیم دینے آیا ہوں بلکہ آپؐ نے "انما" کا لفظ استعمال کر کے یہ بیان فرمایا کہ میری بعثت کا مقصد اچھے اخلاق کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عقائد واعمالِ اسلامی یا اصولِ دین وفروع دین کا مقصد ہمارے اندر اچھے اخلاق کو پروان چڑھانا ہے۔

اس بات کی تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جو شیعہ وسنی دونوں کی کتب حدیث میں موجود ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"ما آمن بی من بات جارہ جائعا"

''جو شخص پیٹ بھر کر سو جائے اور اس کا پڑوسی رات کو بھوکا رہے، وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔''

اس حدیث میں پڑوسی کے مسلمان ہونے کی شرط نہیں رکھی گئی ہے اور پھر بہت سی احادیث میں ہے کہ پڑوس کی حد چاروں طرف سے چالیس گھر تک ہے۔

نتیجہ یہ کہ اگر آپ نے رات کو سیر ہو کر کھانا کھا لیا اور چاروں طرف چالیس گھروں تک آپ کا کوئی مسلم یا غیر مسلم پڑوسی رات بھر بھوکا سو رہا تو رسولؐ اللہ کی نظر میں آپ مسلمان نہیں، خواہ آپ رات بھر نوافل پڑھتے رہیں اور دن بھر روزہ رکھیں۔

مذہب، رنگ ونسل کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ایک اچھا انسان ہونا، اچھا مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص بہت بڑا شیخ القرآن والحدیث یا مفتی اعظم بن جائے، علامہ، حجۃ الاسلام، آیت اللہ یا آیت اللہ العظمیٰ بن جائے لیکن اگر وہ اچھا انسان نہیں ہے تو سب بیکار ہے۔

مگر اسے انسان کی بدقسمتی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ فطری اور عقلی طور پر اخلاقی فضائل کا اعتراف کرنے اور انبیاء و مصلحین کی عالمگیر اصلاحِ اخلاق کی کوششوں کے باوجود، اخلاقی بحران ہر دور میں انسانی معاشرے کا بڑا بحران رہا ہے۔

دورِ حاضر میں یہ بحران انتہائی پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ جب اخلاقی اقدار کی حاکمیت کی جگہ طاقت کی حاکمیت لے لے تو ایسی صورت میں طاقت ہی طاقت کا راستہ روک سکتی ہے۔ اگر طاقت کا توازن بگڑ جائے اور آج کی طرح دنیا ایک بڑی طاقت کے زیر اثر آ جائے تو طاقت کے اندھے استعمال کے نتیجہ میں صرف کمزور انسان ہی نہیں بلکہ اخلاقی اقدار کا جنازہ بھی نکل جاتا ہے۔

اخلاقی بحران کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی جتنی شدید ضرورت آج ہے، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ قرآن مجید اور معصومین علیہم السلام کی اخلاقی تعلیمات کے بغیر اس بند کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سرپرستی میں حوزہ علمیہ قم کے چند سینئر طلباء نے ''اخلاق در قرآن'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کا قابل تعریف کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب میں کتب اخلاق کی عام روش سے ہٹ کر ایک اچھوتا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جن اخلاقی فضائل ورذائل کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے بارے میں پہلے قرآنی آیات کی روشنی میں کافی

تفصیل سے بحث کی گئی ہے، بعدازاں اس کے بارے میں احادیث معصومینؑ کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔اس کے بعد انسان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی پر ان کے اثرات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

جن اخلاقی رذائل کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاج کے طریقے بھی بیان کیے گئے ہیں۔اس کتاب کو بلا مبالغہ ''روحانی اور اخلاقی صحت کا انسائیکلوپیڈیا'' کہا جا سکتا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد ''علم الاخلاق، قرآن کی روشنی میں'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ادارہ مصباح القرآن نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروا کر انتہائی مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ادارے کو اس اقدام پر مبارک باد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ادارہ مصباح القرآن کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے، اس ادارے کے منتظمین کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور تمام اہل اسلام کو اس کتاب سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، آمین

خادمِ علوم قرآن واہل بیتؑ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (Ph.D)

10 رنومبر 2004، لاہور۔

عرضِ ناشر

محترم قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ، آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی زیرسرپرستی لکھی جانے والی کتاب ''اخلاق درقرآن'' کا ترجمہ ''علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)'' کے نام سے اُردو زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔بلاشبہ یہ کتاب انسان کی زندگی میں انتہائی مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔آج کل دُنیا اخلاقی حوالہ سے جس جگہ پہنچ چکی ہے، اُس میں اخلاقیات کی خرابی ہی سب سے بڑی وجہ ہے۔لہٰذا اس قسم کی کتابوں کی کثرت سے اشاعت لازمی طور پر معاشرہ میں مثبت تبدیلی لاسکتی ہے۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ۔۔۔۔۔

www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرنایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادفرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تمہید

اخلاقی مسائل کو ہر دور میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن ہمارے دور میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہمارے دور میں اخلاقی بگاڑ اور سیدھی راہ سے انحراف کے اسباب وعوامل ہر زمانہ سے زیادہ ہیں۔ اگر ماضی میں بہت سے برے کاموں کو انجام دینے کیلئے اخراجات اور زحمت برداشت کرنے کی ضرورت تھی تو ہمارے دور میں انسانی ایجادات کی کثرت سے ہر چیز ہر جگہ اور ہر کسی کیلئے دستیاب ہے۔

۲۔ ہمارا دور پیمانوں کے بڑے ہو جانے کا دور ہے۔ جو کام ماضی میں محدود پیمانہ پر ہوتے تھے، وہ اب لامحدود پیمانے پر ہونے لگے ہیں۔

وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد انسانی قتل وغارت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ سٹیلائٹ کے ذریعے گندی فلمیں ساری دنیا میں پھیلائی جارہی ہیں اور اب انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہر قسم کی مضر معلومات دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچائی جارہی ہیں جس کی وجہ سے اخلاقی برائیاں بہت وسیع سطح پر پھیل چکی ہیں اور تمام سرحدوں کو توڑتی ہوئی دنیا کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اخلاقی بگاڑ اس قدر پھیل چکا ہے کہ خود اخلاقی بگاڑ کی بنیادی رکھنے والے چیخ اٹھے ہیں۔ اگر ماضی میں منشیات کی پیداوار صرف ایک جگہ، ایک گاؤں یا زیادہ سے زیادہ ایک شہر کو متاثر کرتی تھیں تو اب سمگلروں کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلائی جارہی ہیں۔

۳۔ جس طرح طب اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں مفید اور تعمیری معلومات غیر معمولی طور پر دنیا میں پھیلی ہیں، اسی طرح شیطانی علوم اور غیر انسانی اور غیر اخلاقی مقاصد کے حصول کی راہیں ماضی کی نسبت بہت زیادہ وسیع وعریض ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جن لوگوں میں برائی کا رجحان پایا جاتا ہے، ان کیلئے ممکن ہو گیا ہے کہ کبھی پیچیدہ اور پراسرار طریقوں اور کبھی سادہ اور آسان ذرائع سے اپنے مقصد تک پہنچ جائیں۔

ایسے حالات میں اخلاقی مسائل اور علم اخلاق کی طرف توجہ کرنا ماضی کے ہر دور کی نسبت زیادہ ضروری ہو گیا ہے، اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوتاہی سے ہم بڑے المیے یا المیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ انسانیت کا درد رکھنے والے دانشوروں اور آگاہ علماء کا فرض ہے کہ اخلاقی تعمیر نو کیلئے ایک دوسرے سے تعاون کریں اور موجودہ دور میں جبکہ اخلاقیات کو شدید خطرہ لاحق ہے، یہاں تک کہ بعض لوگ اخلاق کا سرے سے انکار کر رہے ہیں یا اسے غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کیلئے ہر کام کرنے کو اخلاقیات کے عین مطابق قرار دیتے ہیں، ایسے حالات میں علماء اور مفکرین کا فرض ہے کہ اپنی تمام کوشش اور جدوجہد کو بروئے کار لائیں۔

خوش قسمتی سے ہم مسلمانوں کے پاس قرآن مجید جیسا عظیم سرچشمہ موجود ہے جو گہرے اخلاقی مباحث سے اس قدر سرشار ہے کہ دنیا کے کسی دین کی کتب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ مفسرین نے قرآن مجید کے اخلاقی مباحث کی تفسیر کی ہے لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں، ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جو'' '' کے عنوان سے تفسیر موضوعی کے انداز میں ان مسائل کو یکجا کر کے بیان کرتی ہو۔ حالانکہ ایسی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پیامِ قرآن کے پہلے مجموعہ کے بعد، جس میں ہم نے اسلامی عقائد و معارف کو تفسیر موضوعی کے انداز میں زیر بحث قرار دیا، پیام قرآن کا ایک اور مجموعہ ترتیب دیا جائے جس میں قرآن مجید کے اخلاقی مباحث کو بیان کیا جائے۔

الحمدللہ! یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ کتاب دو جلدوں میں تیار ہوئی، پہلی جلد میں اخلاقی مسائل کے کلیات کو زیر بحث لایا گیا ہے جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب سے ایک جامع درسی کتاب کی حیثیت سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جلد میں اخلاقی مسائل کے جزئیات اور مصادیق پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اس کا بہت سا حصہ بھی الحمدللہ اشاعت کیلئے تیار ہو چکا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی روشنی میں انسانوں کی زندگی کی مشکلات دور کرنے کیلئے یہ دوسرا قدم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو اور ہمارے لیے روزِ آخرت کا ذخیرہ ہو۔ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اہل فکر و نظر کی نشاندہی پر اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔

والحمدللہ رب العالمین

ربیع الاول ۱۴۱۹

جون/ ۱۹۹۸ء

پہلا باب

اخلاقی مباحث کی اہمیت

اشارہ

قرآنی مباحث میں یہ بحث سب سے اہم ہے اور ایک لحاظ سے یہی انبیائے کرام کی بعثت کا سب سے اہم مقصد تھا، اس لیے کہ اخلاق کے بغیر نہ تو لوگوں کیلئے دین کا کوئی مفہوم باقی رہ جاتا ہے اور نہ ہی ان کے دنیوی امور کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ بقول شاعر ؎

اقوام روزگار بہ اخلاق زندہ اند
قومی کہ گشت فاقد اخلاق مردنی است

(دنیا کی اقوام اخلاق کی بدولت زندہ ہیں۔ اخلاق سے عاری قوم کا مقدر صرف موت ہے)

درحقیقت انسان صرف اسی صورت میں انسان کہلانے کا حقدار ہے جب وہ انسانی اخلاق سے آراستہ ہو، ورنہ وہ ایک ایسا خطرناک حیوان ہے جو انسانی ذہانت سے مسلح ہونے کی وجہ سے ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے، ہر طرف آگ لگا دیتا ہے، اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کیلئے جنگ برپا کرتا ہے اور اسلحہ بیچنے کیلئے قوموں کے درمیان نفاق اور تفرقہ کے بیج بو دیتا ہے اور بے گناہوں کو خاک وخون میں غلطاں کر دیتا ہے۔

ممکن ہے ایسا انسان بظاہر متمدن ہو لیکن اس کے باوجود وہ ایک خوش خوراک جانور ہے جو حلال وحرام کے فرق کو پہچانتا ہے نہ ظلم اور عدل کے فرق کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی ظالم اور مظلوم کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔

اس اشارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حقیقت کا بیان قرآن کی زبان سے سنتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:

۱۔ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲﴾

''اللہ وہ ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (جمعہ ۲)

۲۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''اللہ نے مومنین پر احسان کیا (اورانہیں ایک بڑی نعمت عطا فرمائی) جب ان میں انہی کی قوم سے ایک رسول مبعوث کیا تا کہ وہ انہیں اس کی آیات سنائے، انہیں پاک کرے اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، اگر چہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (آل عمران: ۱۶۴)

۳۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''(اس طرح ہم نے تبدیلی قبلہ کے ذریعے تم پر انعام کیا) جس طرح تم میں ایک رسول تم ہی میں سے معبوث کیا تا کہ وہ تمہیں ہماری آیات سنائے، تمہیں پاک کرے، تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے، تمہیں اس کی تعلیم دے۔'' (بقرہ: ۱۵۱)

۴۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

''اے ہمارے رب! تو ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، ان کا تزکیہ کرے۔ یقینا تو توانا اور حکیم ہے (اور اس کام پر قادر ہے)۔'' (بقرہ: ۱۲۹)

۵۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾

''جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اپنے نفس کو گناہ سے آلودہ کیا، نا اُمید اور محروم ہوگیا۔'' (شمس ۹، ۱۰)

۶۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾

''یقینا جس نے تزکیہ نفس کیا، اپنے رب کے نام کا ذکر کیا اور نماز پڑھی، وہ فلاح پا گیا۔''

(اعلی: ۱۴، ۱۵)

۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ (لقمان: ۱۲)

''ہم نے لقمان کو حکمت (ایمان اور اخلاق) عطا کی (اور انہیں کہا) اپنے رب کا شکر ادا کرو۔''

پہلی چار آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں، وہ یہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد لوگوں کا تزکیہ نفس اور ان کی تربیت اور اخلاق حسنہ کی ترویج تھا۔ حتی کہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تلاوتِ آیات الٰہی اور کتاب و حکمت کی تعلیم جس کا ذکر پہلی آیت میں آیا ہے، تزکیہ نفس اور انسانوں کی تربیت کے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جو علم اخلاق کا اصلی مقصد ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ تین آیات میں تزکیہ کا ذکر تعلیم سے پہلے آیا ہے، اس لیے کہ مقصودِ آخر تزکیہ ہے، اگرچہ عملی طور پر تعلیم اس پر مقدم ہے۔

اگر ان آیات میں سے ایک آیت میں تعلیم کو تزکیۂ اخلاق سے پہلے بیان کیا گیا ہے تو اس میں اس بیرونی حقیقت کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ عام طور پر تعلیم تزکیہ و تربیتِ نفس کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے مقدم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان چار میں سے پہلی تین آیات اور چوتھی آیت اس مسئلہ کے ان دو میں سے ایک پہلو کو مدنظر رکھے ہوئے ہیں۔

ان چار آیات کی تفسیر میں یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ اس تقدیم اور تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ یہ تعلیم اور تربیت دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس طرح صحیح تعلیم انسان کی اخلاقی سطح اور تزکیۂ نفس کی کیفیت کو بہتر کرتی ہے، اسی طرح اخلاقی فضائل بھی انسان کے علم و دانش کی سطح کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، اس لئے کہ انسان صرف اسی صورت میں علم کی حقیقت کو سکتا ہے جب وہ تکبر، ہٹ دھرمی، خود پسندی اور اندھے تعصب سے پاک ہو۔ اس لئے کہ یہ سب علمی ترقی کے راستے کی رکاوٹ ہیں، ورنہ یہ اخلاقی برائیاں انسان کے چشم و دل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ حق کو اس کی اصل صورت میں دیکھنے اور اسے قبول کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا چار آیات میں یہ نکات بھی قابل غور ہیں:

پہلی آیت میں معلم اخلاق رسولؐ کی بعثت کو اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور تعلیم و تربیت کو ضلالِ مبین یعنی کھلی گمراہی کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ (وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ)۔ یہ اخلاق کے بارے میں قرآن کے نہایت اہتمام کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسری آیت میں اخلاقی تربیت کرنے والے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والے رسولؐ کو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان قرار دیا گیا ہے۔ یہ اخلاق کی اہمیت کی ایک اور دلیل ہے۔

تیسری آیت جو کہ تبدیلی قبلہ کی آیات کے بعد ہے اور تبدیلی قبلہ کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت قرار دے رہی ہے، یہ کہہ رہی ہے کہ یہ نعمت بھی بعثت رسولؐ اکرم کی نعمت کی مانند ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیۂ نفس، تعلیم و تربیت کرے اور ایسی چیزوں

کی تعلیم دے جو معمولی ذرائع سے ممکن نہیں ہے۔[1]

ایک اور نکتہ جو چوتھی آیت میں قابل غور ہے کہ اس میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہو کر چند دعائیں مانگی ہیں جن میں سے سب سے اہم دعا ان کی ذریت میں سے ایک مسلمان امت کے معرضِ وجود میں آنے کی دعا اور ان میں کتاب وحکمت کی تعلیم دینے والے اور تزکیۂ نفس کرنے والے رسول کی بعثت کی دعا ہے۔

پانچویں آیت میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن شریف گیارہ اقسام کے طولانی ترین مجموعہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرما رہا ہے کہ ''جس نے تزکیۂ نفس کیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے نفس کو آلودہ کیا، وہ مایوس اور نا اُمید ہو گیا'' (قد افلح من زکھا۔ وقد خاب من دسھا)۔

یہ مسلسل تاکیدیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ گویا قرآن شریف کی نظر میں تمام اقدار اسی عظیم قدر میں سمو دی گئی ہیں اور اسی کو فلاح ونجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک مختصر فرق کے ساتھ یہی بات چھٹی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اس میں تزکیۂ نفس کو نماز اور ذکرِ خدا پر مقدم رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فضائل اخلاقی کی روشنی میں انسان میں تزکیۂ نفس اور پاکیزگی قلب وروح نہ پائی جاتی ہو تو نہ ذکر خدا کسی کام آتا ہے اور نہ ہی نماز کسی روحانی منزل پر پہنچاتی ہے۔ آخری آیت میں عظیم معلم اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے اور علم اخلاق کو حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی اور انہیں حکم دیا کہ اس عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرو۔''

سورۂ لقمان کی اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ ان کی امتیازی خصوصیت تربیت نفوس اور تربیت اخلاق تھی۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ یہاں حکمت سے مراد ''حکمت عملی'' اور وہ تعلیمات ہیں جو اس حکمت عملی تک پہنچاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر حکمت سے مراد ہے ''تعلیم وتربیت''۔

یہ نکتہ ضرور مدنظر رہے کہ جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ بنیادی طور پر حکمت کے معنی لگام کے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس چیز کیلئے استعمال کیا جانے لگا جو ''روکنے'' کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چونکہ علم ودانش اور اخلاقی فضائل انسان کو برائی اور انحراف سے روکتے ہیں، اس لئے ان کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔

---

[1] وَيُعلمكم مالم تكونوا تعلمون یعنی وہ تمہیں ان چیزوں کے تعلیم دیتا ہے جن کو معمول کے ذرائع سے جاننا تمہارے لئے ممکن نہ تھا۔ پس غور کرتو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایسی چیزوں کی تعلیم کا ذکر کیا گا ہے جن کا جاننا وحی کے بغیر ناممکن ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہو کہ سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے اخلاقی مسائل اور تہذیب نفس کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اسے ایک ایسا بنیادی امر قرار دیا ہے جو دیگر تمام امور کی اساس اور بنیاد ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ تمام اسلامی قوانین و احکام پر سایہ فگن ہے۔

بلاشبہ اخلاقی ارتقاء خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، آسمانی ادیان کا بنیادی مقصد، تمام معاشرتی اصلاحات کی اساس اور ہر برائی کے خلاف جہاد کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

اب ہم احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ احادیث میں اس مسئلہ کو کیا اہمیت دی گئی ہے۔

اسلامی روایات میں اخلاق کی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث میں اس موضوع کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔

ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق [۱]

یعنی ''میں صرف اخلاقی فضائل کی تکمیل کیلئے معبوث ہوا ہوں۔''

ایک اور روایت میں:

انما بعثت لاتمم حسن الاخلاق [۲]

ایک اور روایت میں:

بعثت بمکارم الاخلاق و محاسنها [۳]

کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

''انما'' کا لفظ حصر کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے تمام مقاصد کا خلاصہ انسانی اخلاق کی تکمیل تھا۔

---

[۱] کنز العمال 16:3 حدیث: 52157

[۲] کنز العمال 16:3 حدیث: 5218

[۳] بحار الانوار 05:66

۲۔ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

لو کنا لا نرجو جنة ولا نخشی نارا ولا ثوابا ولا عقابا لکان ینبغی لنا ان نطالب بمکارم الاخلاق فانها مما تدل علی سبیل النجاح[۱]

''اگر ہمیں جنت کی امید اور جہنم کا خوف نہ ہوتا اور ثواب وعقاب کی بھی کوئی بات نہ ہوتی تو بھی ہمیں چاہئے تھا کہ اخلاقی فضائل کی طلب کرتے، اس لئے کہ یہی نجات اور کامیابی کیلئے رہنما ہیں۔''

یہ حدیث بخوبی اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اخلاقی فضائل نہ صرف نجات اخروی کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کے بغیر دنیوی زندگی کی بھی اصلاح ممکن نہیں ہے۔(اس بارے میں ہم آئندہ صفحات میں انشاءاللہ تفصیل سے بحث کریں گے)۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

جعل الله سبحانه مکارم الاخلاق صلة بینه و بین عباده فحسب احد کم ان یتمسك بخلق متصل بالله

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے اخلاقی فضائل کو اپنے اور بندوں کے درمیان تعلق کا ذریعہ قرار دیا ہے۔لہٰذا یہی وجہ کافی ہے کہ تم اخلاقی فضائل کو اختیار کرو تا کہ وہ تمہیں اللہ سے متصل کر دیں۔''[۲]

دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سب سے بڑا معلم اخلاق اور مربی نفوس اور تمام فضائل کا سرچشمہ ہے۔اخلاق الٰہی کے بغیر قربِ خدا کا حصول ممکن نہیں ہے۔

بنا برایں ہر اخلاقی فضیلت اللہ اور انسان کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتی ہے اور اسے قدم بقدم اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس کے قریب کرتی ہے۔

آئمہؑ دین کی ساری زندگی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ انہوں نے ہر مقام پر لوگوں کو فضائل اخلاق کی طرف دعوت دی اور خود بھی فضائل اخلاق کا اسوۂ حسنہ تھے۔انشاءاللہ ہم آئندہ مباحث میں ان کے اخلاق کریمہ کی مثالیں دیکھیں گے۔اس سلسلہ میں یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام باعظمت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

یعنی ''آپ اخلاق عظیم کی منزل پر فائز ہیں۔''(قلم:۴)

---

[۱] مستدرک الوسائل 2:283 (پرنا ایڈیشن)

[۲] تنبیہ الخواطر 362

اہم نکات

ا۔علم اخلاق کی تعریف

یہاں پر ہر بات سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اخلاق کی تعریف کریں۔''اخلاق''،''خلق''اور''خلق'' کی جمع ہے۔ مفردات راغب میں ہے کہ ان دونوں الفاظ کا مادہ ایک ہی ہے۔''خلق'' انسان کی ظاہری شکل اور صورت کو کہتے ہیں جبکہ ''خلق'' باطنی صفات وخصوصیات کو کہا جاتا ہے جن کا مشاہدہ صرف قلب کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ''اخلاق انسان کی روحی اور باطنی صفات کو کہتے ہیں۔'' چند ایک علماء کے مطابق بعض اوقات انسان کے ان افعال پر بھی لفظ اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کے باطنی اخلاق کی بنیاد پر صادر ہوتے ہیں۔اول الذکر کو صفاتی اخلاق اور ثانی الذکر کو عملی اخلاق بھی کہا گیا ہے۔

''اخلاق'' کی تعریف اس کے نتیجہ کے اعتبار سے بھی کی جاسکتی ہے۔وہ اس طرح کہ بعض اوقات انسان کسی ایسے فعل کو انجام دیتا ہے جو اس کے کردار کا مستقل حصہ نہیں ہوتا۔لیکن جب وہ کسی ایسے فعل کو انجام دیتا ہے جو اس کے کردار کا مستقل حصہ ہوتا ہے (مثلاً بخل) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فعل اس شخص کے باطن میں جڑیں رکھتا ہے۔ایسی جڑوں کو خلق اور اخلاق کہا جاتا ہے۔

اسی چیز کے پیش نظر ابن مسکویہ اپنی کتاب''تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق''میں کہتے ہیں:

''خلق وہ نفسانی حالت ہے جو انسان کو مختلف کاموں کے انجام دینے کی دعوت دیتی ہے،بغیر اس کے کہ اسے غور وفکر کی ضرورت ہو۔''[1]

فیض کاشانی نے بھی اپنی کتاب''حقائق''میں اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے:

''خلق اس پائیدار نفسی کیفیت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی کام کو غور وفکر کے بغیر اور آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔''[2]

اسی لئے اخلاق کو دو اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔وہ ملکات (پختہ باطنی خصوصیات) جن کی بدولت اچھے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں،انہیں اخلاق حسنہ اور ملکاتِ فضیلہ کہا جاتا ہے اور وہ ملکات جو برے اعمال کے ظہور پذیر ہونے کا سبب ہوں،انہیں اخلاق بد اور ملکات رذیلہ کہا جاتا ہے۔

بنابرایں علم اخلاق کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے:

---

[1] تہذیب الاخلاق 51

[2] حقائق۔54

''علم اخلاق وہ علم ہے جو اچھے اور برے ملکات، خصوصیات، اسباب اور نتائج سے بحث کرتا ہے۔''

بالفاظ دیگر: علم اخلاق اچھی صفات کے حصول اور بری صفات کے خلاف مجاہدہ کے طریقوں اور ہر ایک کے انفرادی و اجتماعی اثرات سے بحث کرتا ہے۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان صفات کی بنیاد پر انجام پانے والے اعمال وافعال پر بھی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص ہمیشہ غصے کا مظاہرہ کرے تو اسے اخلاق رذیلہ کہا جائے گا، اس کے برعکس بخشش اور سخاوت کو اخلاق حسنہ کہا جائے گا۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ ہیں جنہیں ایک دوسرے کا نام دیا گیا ہے۔

بعض مغربی مفکرین نے بھی علم اخلاق کی تعریف اس انداز میں کی ہے جس کا نتیجہ ہماری تعریفات سے ہم آہنگ ہے۔ جیکس اپنی کتاب ''فلسفۂ اخلاق'' میں کہتا ہے کہ ''علم اخلاق انسان کے طرزِ عمل سے، جیسا کہ اسے ہونا چاہئے، بحث کرتا ہے۔''[1]

بعض دیگر مفکرین نے مختلف تعریفیں بیان کی ہیں مثلاً فولکیہ کہتا ہے:

''ان قوانین کا مجموعہ جن کی پیروی کر کے انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے، علم اخلاق کہلاتا ہے۔''[2]

یہ ان لوگوں کی بات ہے جو اعلیٰ انسانی اخلاق کیلئے کسی اہمیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی نظر میں مقصد تک پہنچنا ہی سب سے اہم ہوتا ہے، خواہ مقصد کیسا ہی کیوں نہ ہو اور ان کی نظر میں اخلاق حصولِ مقصد کے ذریعہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۔ فلسفہ اور اخلاق کا تعلق

فلسفہ کی تعریف میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کی توانائی کے مطابق سارے جہان سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اس تعریف کی بنیاد پر تمام علوم اس کلی تعریف کے دائرے میں واقع ہوتے ہیں۔ اسی لئے گزشتہ ادوار میں علوم کی تعداد کم تھی اور ان کا دائرۂ کار بھی محدود تھا۔ علم فلسفہ ان سب علوم کو زیر بحث لاتا تھا اور فلسفی اس شخص کو کہا جاتا تھا جو مختلف علوم سے آگاہی رکھتا تھا۔ اس دور میں فلسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

(الف) وہ امور جو انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہیں اور انسان کے افعال کے علاوہ ہر چیز ان میں داخل ہے۔

(ب) وہ امور جو انسان کے اختیار اور اس کی قدرت کے دائرہ میں واقع ہیں، یعنی انسانی افعال۔

پہلے حصے کو حکمت نظری کہا جاتا تھا اور اسے مزید تین شاخوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:

۱۔ فلسفہ اولیٰ یا حکمت الٰہی جو وجود کے عمومی احکام اور کائنات کے آغاز وانجام کے بارے میں بحث کرتا تھا۔

۲۔ طبیعیات، جس کی بہت سی شاخیں تھیں۔

---

[1] فلسفہ اخلاق۔9

[2] الاخلاق النظریہ۔10

۳۔ ریاضیات، اس کی بھی متعدد شاخیں تھیں۔

دوسرا حصہ جو انسان کے افعال سے متعلق ہے، اسے حکمت عملی کہا جاتا تھا اور اس کی بھی تین شاخیں تھیں:

۱۔ اخلاق، اس سے مراد وہ افعال ہیں جو انسان کی سعادت اور ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں اور ان کی جڑیں انسان کے اندر ہوتی ہیں۔

۲۔ تدبیر منزل، اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جو گھریلو زندگی کے انتظام وانصرام سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ سیاست اور تدبیر مدن، یہ شعبہ انسانی معاشرے کے امور کے انتظام وانصرام سے بحث کرتا ہے۔

اس طرح اخلاق کو ایک انفرادی معاملہ سمجھ کر اسے خاندان اور معاشرے کے امور یعنی تدبیر منزل اور سیاست مدن کے برابر رکھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے علم اخلاق، فلسفہ عملی یا حکمت عملی کی ایک شاخ ہے۔

لیکن چونکہ دورِ حاضر میں علوم کی متعدد شاخیں وجود میں آ چکی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں، لہٰذا فلسفہ کا نام صرف پہلے حصہ یعنی حکمت نظری کی پہلی شاخ سے مخصوص ہو چکا ہے۔ بالفاظ دیگر اب فلسفہ کا اطلاق صرف اس علم پر ہوتا ہے جو کائنات کے کلی امور اور اس کے آغاز وانجام سے بحث کرتا ہے۔

اس مسئلہ پر فلاسفہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ حکمت نظری کا مقام ومرتبہ زیادہ ہے یا حکمت عملی کا۔ بعض حکمت نظری کو افضل سمجھتے ہیں جبکہ بعض کی نظر میں حکمت عملی برتر ہے۔ اگر مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو دونوں کا نکتہ نظر صحیح ہے لیکن اس موقع پر یہ بحث مناسب نہیں ہے۔

''فلسفہ'' اور ''اخلاق'' کے باہمی ربط وتعلق کے بارے میں انشاء اللہ مختلف مناسبتوں سے بات ہوتی رہے گی۔

۳۔ اخلاق اور عرفان کا تعلق

اخلاق وعرفان یا بالفاظ دیگر اخلاق اور سیر وسلوک الی اللہ کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عرفان کی نظر زیادہ تر معارفِ الٰہی پر ہے اور وہ بھی از راہِ علم واستدلال نہیں بلکہ از راہِ کشف وشہودِ باطنی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا قلب اس طرح پاک اور نورانی ہو جائے، اس کی چشم حقیقت کھل جائے اور اس کے حجابات اس طرح برطرف ہو جائیں کہ وہ چشم دل سے اللہ تعالیٰ کی پاک ذات اور اس کے اسماء اور صفات کا مشاہدہ کرے اور اس سے عشق کرنے لگے۔

واضح سی بات ہے، چونکہ علم اخلاق ناپسندیدہ اخلاقی صفات کو، جو کہ چشم دل پر پردہ پڑ جانے کی بنیادی وجہ ہے، دور کرنے میں مدد دیتا ہے، لہٰذا وہ عرفان الٰہی کے ستونوں میں سے ایک ستون اور اس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے۔

دوسری طرف سیر وسلوک الی اللہ، جس کا آخری مقصد معرفت خدا اور قربِ خدا کا حصول ہے، وہ درحقیقت عرفان واخلاق کا مجموعہ ہے۔ باطنی سیر وسلوک ایک قسم کا عرفان ہے جو انسان کو روز بروز اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے نزدیک تر کرتا ہے۔ حجابات کو

برطرف کرتا ہے اور واصل حق ہونے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ بیرونی سیر وسلوک اخلاق ہی ہے۔ ایسا اخلاق جس کا مقصد تہذیب وتزکیہ نفس ہے، نہ کہ صرف مادی زندگی کو بہتر کرنا۔

۴۔ اخلاق اور علم کا تعلق

گزشتہ صفحات میں ہم نے جن آیات کے بارے میں بحث کی، وہ کتاب وحکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفس کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھتی نظر آتی ہیں۔ کبھی تزکیہ نفس تعلیم پر مقدم نظر آتا ہے تو کہیں اس کے برعکس تعلیم کو تزکیہ نفس پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس سے ان دونوں کے گہرے اور اٹوٹ تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

یعنی جب انسان اچھے اور برے اعمال اور اچھی اور بری اخلاقی صفات کا علم حاصل کرتا ہے اور فضائل اور رذائل اخلاقی کے نتائج سے آگاہ ہوتا ہے تو اس کا یقیناً اس کی تربیت اور پرورش پر اثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ عمل اور اخلاق کی بہت سی برائیاں جہالت اور نادانی سے جنم لیتی ہیں۔ لہٰذا اگر جہالت اور نادانی کی جگہ علم وآگہی کی حکمرانی قائم ہو جائے، یا بعبارتِ دیگر معاشرے کی ثقافتی سطح اونچی ہو جائے تو بہت سی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی اور ان کی جگہ خوبیاں لے لیں گی اور بہت سے اخلاقی مفاسد کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کی جگہ اخلاقی محاسن لے لیں گے۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی کلی ضابطہ اور قانون نہیں ہے۔

بدقسمتی سے اس معاملہ میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے افراط کا راستہ اختیار کیا اور بعض تفریط کے راستے پر چل نکلے۔

بعض نے معروف یونانی فلسفی سقراط کی پیروی کا راستہ اختیار کیا، سقراط کا عقیدہ یہ تھا کہ علم وحکمت اخلاقِ حمیدہ کا سرچشمہ ہیں اور رذائل اخلاقی کی بنیاد جہل ونادانی ہے۔ سقراط کے پیروکار بھی کہتے ہیں کہ اخلاقی برائیاں ختم کرنے کیلئے واحد راستہ یہ ہے کہ معاشرے میں علم وآگہی کی سطح کو بلند کیا جائے۔ ان کے نکتہ نظر سے فضیلت مساوی ہے علم ومعرفت کے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص علم وآگہی کے ہوتے ہوئے بدی اور شر کی طرف نہیں جاتا اور اگر کوئی نیکی کو پہچان لے تو اس کو ترک نہیں کرتا۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اپنی اور دوسروں کی علمی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ خیر وشر کے نتائج اور بدی ونیکی کے اثرات کا علم حاصل کریں تاکہ ہمارے وجود کی شاخوں پر فضائل اخلاقی کی کونپلیں نمودار ہو جائیں۔

اس کے برعکس ایک گروہ علم اور اخلاق کے باہمی تعلق کا سرے سے منکر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بدکار لوگوں کو علم وآگاہی دینے کا اس کے سوا کچھ نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ ہوشیاری اور چالاکی سے جرائم کرنے لگتے ہیں۔ ضرب المثل ہے کہ اگر چوروں کو روشنی کی مدد حاصل ہو جائے تو وہ چن چن کر قیمتی چیزیں چرائیں گے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم اور اخلاق کے تعلق کا نہ تو مکمل طور پر انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اخلاق کو سو فیصد علم کا ثمر اور نتیجہ قرار

دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرتی تجربات بھی اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہم معاشرے میں ایسے بہت سے افراد کو دیکھ سکتے ہیں جو بدعمل تھے لیکن جب انہیں اپنے برے اعمال کے برے نتائج کا علم حاصل ہو گیا تو انہوں نے برائی کو چھوڑ دیا اور نیکی کی طرف رخ کر لیا۔ ہم خود اپنی زندگی میں بھی اس چیز کا تجربہ رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اچھے اور برے اعمال کی اچھائی اور برائی اور ان کے نتائج و اثرات کا علم رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود برائی کے راستہ پر چلتے جا رہے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ ان کے وجود پر حاکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو دو پہلو رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت اور وجود کا ایک پہلو علم و آگہی سے تشکیل پاتا ہے اور دوسرا پہلو اس کی جبلی خواہشات سے تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کبھی پہلے پہلو کو ترجیح دیتا ہے اور کبھی دوسرے پہلو کو۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے علم و اخلاق کے باہمی تعلق کے حوالہ سے مندرجہ بالا دو میں سے کسی ایک نظریے کو اختیار کیا ہے، وہ انسان کی شخصیت کے ایک ہی پہلو کے معترف ہیں اور دوسرے پہلو کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

قرآن شریف کی بعض آیات بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔ قرآن مجید نے کئی آیات میں جہالت اور برائی کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

''تم میں سے جو بھی جہالت کی وجہ سے برے کام کا مرتکب ہو، پھر توبہ اور اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔'' (انعام: ۵۵)

ایسی ہی بات سورۂ نساء کی آیت ۱۷ اور سورۂ نحل کی آیت ۱۱۹ میں بھی کہی گئی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں جہل سے مراد وہ جہلِ مطلق نہیں ہے، جو توبہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جہالت کے درجات میں سے وہ درجہ ہے کہ اگر وہ برطرف ہو جائے تو انسان حق کی طرف آ جاتا ہے۔

پیام قرآن کے پہلے دورہ کی پہلی جلد میں، جہاں ہم نے معرفت اور شناخت کی بحث کی ہے، ہم نے ایسی بہت سی آیات درج کی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہل، کفر کا سرچشمہ ہے، جہل برائیوں کا سرچشمہ ہے، جہل ہٹ دھرمی، ضد، تعصب اور بہانہ جوئی کا سرچشمہ ہے۔ اندھی تقلید، اختلاف و انتشار، سوءظن اور بدگمانی، گستاخی اور بے ادبی ہے۔ غرضیکہ سب بری صفات کی بنیاد جہل ہے جو تمام اقدار کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ [1]

دوسری طرف بہت سی آیات واضح اور صریح طور پر یہ کہتی ہیں کہ ''بعض لوگ علم و آگہی کے باوجود غلط راستے پر چلتے ہیں۔ مثلاً آلِ فرعون کے بارے میں فرمایا:

---

[1] پیام قرآن دورہ اول جلد 1 ص 86 تا 98

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ

''انہوں نے یقین رکھتے ہوئے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے ہماری آیات کا انکار کیا۔''(نمل:۱۴)

اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

''وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ اس کا علم رکھتے ہیں۔''(آل عمران:۷۵)

اس کے بعد کی چند آیات میں بھی ایسی ہی بات کہی گئی ہے، مثلاً

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۸

''اور بے شک ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں تا کہ تم لوگ اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ لفظ یا مطلب) خدا کے پاس سے ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔''(آل عمران:۷۸)

ممکن ہے اس آیت میں جس علم و آگہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ جھوٹ کے بارے میں نہ ہو لیکن اس کے باوجود یہ آیت ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے، اس لئے کہ جھوٹ کا برا ہونا اور اس کے بارے میں عقل و شریعت کا حکم کسی پر مخفی نہیں ہوسکتا۔

روزمرہ کے تجربات بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اخلاقِ رذیلہ سے آگہی بہت سے مقامات پر انسان کو برائی سے روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے مقامات پر آگاہ افراد بھی برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور اخلاقِ رذیلہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں پر دونوں مکاتب فکر کے درمیان والا مکتبہ فکر حقیقت کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

۵۔ آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے؟

علم اخلاق اور تمام اخلاقی مباحث کی قسمت کا دارومدار اسی مسئلہ پر ہے، اس لئے کہ اگر اخلاق میں تبدیلی ممکن نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ علم اخلاق ایک بے معنی اور بیہودہ علم بن جائے گا بلکہ تمام انبیاء کی بعثت اور تمام آسمانی کتب کا نزول بھی بے مقصد ہو جائے گا اور برائی سے روکنے والی تمام سزائیں بھی بے معنی ہو جائیں گی۔

لہٰذا انبیاء کی تعلیمات اور آسمانی کتب میں جو اخلاقی اور تربیتی نظام دیئے گئے ہیں اور دیگر تمام مذاہب میں برائی سے

روکنے کیلئے جوسزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ سب اس بات کا بہترین ثبوت ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے۔ اخلاقی طریقے صرف انبیاءنہیں بلکہ تمام عقلاء کے یہاں بھی قابل قبول واقع ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود تعجب ہوتا ہے کہ فلاسفر اور علمائے اخلاق نے اس موضوع پر بہت بحث کی ہے کہ آیا اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟

بعض یہ کہتے ہیں کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ برے اور بدطینت لوگ ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی آ بھی جائے تو وہ سطحی اور ناپائیدار ہوتی ہے اور جلد ہی وہ پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے مؤقف کی تائید میں دلائل بھی ہیں جن میں سے ایک یہ کہ جسم اور جان کی ساخت کا اخلاق کے ساتھ قریبی تعلق ہے اور ہر شخص کا اخلاق اس کی روح اور جسم کی خلقت کے تابع ہے۔ جس طرح روح اور جسم میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، اسی طرح اس کے اخلاق میں تبدیلی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔

اس طرزِ تفکر کے حامل بعض شعراء نے اپنے اشعار میں وسیع پیمانے پر اشارہ کیا ہے۔ (اگرچہ ممکن ہے کہ ان کے اشعار کو اس بارے میں مبالغہ پر محمول کیا جائے)۔

بعض معروف شعراء کے اشعار کے نمونے ملاحظہ فرمائیے:

پر تو نیکان نگیرد ہر کہ بنیادش بداست
تربیت نا اہل را چون گردگان برگنبداست
شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسی؟
ناکس بہ تربیت نہ شودای حکیم کسی

''ناقص لوہے سے اچھی تلوار کیسے بنائی جاسکتی ہے؟ اے حکیم! تربیت کے ذریعے نا اہل کو اہل نہیں بنایا جاسکتا۔''

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و درشورہ زار خس

''اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ بارش کی طبیعت میں لطافت پائی جاتی ہے۔ لیکن باغ میں پھول اگتے ہیں اور شورزمین میں صرف خس وخاشاک۔''

برسیہ دل چہ سود خواندن وعظ
نرود میخ آہنین درسنگ
آہنی را کہ موریانہ بخورد
نتوان برداز آن بہ صیقل رنگ

''جس کا دل سیاہ ہو، اسے وعظ ونصیحت کا کیا فائدہ، اس لئے کہ آہنی میخ کبھی پتھر میں نہیں جاتی۔ جس لوہے کو دیمک لگ جائے، اس کو چمکا کر اس کا زنگ نہیں اتارا جاسکتا۔''

چون بود اصل گوہری قابل
تربیت را در اوائر باشد
ہیچ صیقل نکو ندارد کرد
آہنی را کہ بد گہر باشد
سگ بہ دریای ہفت گانہ مشوء
کہ چو ترشد پلید تر باشد
خر عیسیٰ گرش بہ مکہ برند
چون بیاید ہنوز خر باشد

''اگر اصل گوہر قابل ہوتو تربیت اس پر اثر کرتی ہے۔ کسی قسم کا صیقل اس لوہے کو نہیں چمکا سکتا جو اصل میں برا ہو۔ کتے کو سات سمندروں سے مت دھوؤ، اس لئے کہ وہ گیلا ہوکر اور بھی نجس ہوجاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کو اگر مکہ بھی لے جائیں تو واپس آ کر گدھا ہی رہے گا۔''

اپنے اس مؤقف کی تائید میں ایک اور دلیل جو اس مکتبہ فکر کے افراد دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وعظ ونصیحت اور سزا کے خوف جیسے بیرونی عوامل کی وجہ سے اگر اخلاق میں تبدیلی آ بھی جائے تو ان عوامل کے زائل ہوجانے کے بعد انسان اپنی اصل اخلاقی حالت کی طرف پلٹ جاتا ہے، جیسا کہ پانی کی ٹھنڈک حرارت کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہے لیکن جیسے ہی حرارت ختم ہوتی ہے، پانی اپنی اصل ٹھنڈک کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ طرزِ فکر اور یہ استدلال انسانی معاشرے کی بدقسمتی اور انحطاط کا سبب ہے۔ اخلاقی صفات میں ''تبدیلی کی قابلیت'' کے حامی مندرجہ بالا دو دلیلوں کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

ا۔ انسان کے اخلاق اور اس کی روح وجسم کے باہمی تعلق کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ تعلق ایک طبیعی تقاضہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ انسان کے اخلاق کی علت تامہ نہیں ہے۔ یعنی اخلاقی صفات کے حصول کا زینہ تو فراہم کرسکتا ہے لیکن کسی خاص اخلاقی صفت کے حصول پر انسان کو مجبور نہیں کرسکتا۔ جس طرح بعض بیماریوں میں مبتلا والدین کے بچوں میں اس بیماری کے پیدا ہونے کا امکان تو ہوتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ بیماری بہرحال ان میں پیدا ہوجائے کیونکہ احتیاطی تدابیر اختیار کرکے ان موروثی بیماریوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

کمزور افراد صحت کے اصولوں کی پابندی اور مناسب ورزش کے ذریعے طاقتور بن جاتے ہیں۔اس کے برعکس طاقتور افراد ان چیزوں کے ترک کر دینے سے کمزور ہو جاتے ہیں۔

علاوہ برایں انسان کے جسم اور روح میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔لہٰذا ان سے معرضِ وجود میں آنے والے اخلاق میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آج کے تمام پالتو جانور ایک دن وحشی تھے۔انسان نے انہیں پکڑ کر سدھار لیا اور وہ پالتو جانور بن گئے۔ بہت سے پودوں اور درختوں میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔اگر تربیت کے ذریعے ایک جانور اور پودے کی خصوصیات بدلی جا سکتی ہیں تو انسان کے اخلاق میں تبدیلی کیوں نہیں لائی جا سکتی؟ اب بھی بہت سے جانوروں کو ایسے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے جو ان کی طبیعت کے خلاف ہیں اور وہ ان کاموں کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا جواب سے ہی ان کے دوسرے استدلال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے،اس لئے کہ بعض اوقات بیرونی عوامل کی تاثیر اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ذاتی خصوصیات مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تبدیلی آنے والی نسلوں میں بھی منتقل ہو جاتی ہے جس کا مشاہدہ پالتو جانوروں کی زندگی میں کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ میں بہت سے ایسے انسان نظر آتے ہیں جن کے اخلاق تربیت کے نتیجہ میں مکمل طور پر تبدیل ہو گئے اور ان کی زندگی کے انداز و اسلوب میں ۱۸۰ درجے کی تبدیلی آ گئی۔اگر کچھ افراد کبھی ظالم لٹیرے تھے تو وہ مشہور و معروف عابد و زاہد بن گئے۔اگر ہم اس بات کی طرف دھیان دیں کہ ایک پختہ اخلاقی صفت کس طرح وجود میں آتی ہے تو ہمیں اس کے برطرف کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ ہر اچھا اور برا عمل انسان کی روح پر اثر انداز ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ روح کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔اس عمل کے تکرار سے اس کا اثر بھی زیادہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔آہستہ آہستہ انسان کے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ''عادت'' کا نام دیا جاتا ہے۔جب عادت برقرار رہے تو وہ ایک پختہ ملکہ بن جاتی ہے۔

پس جس طرح تکرارِ عمل کے نتیجہ میں برے اخلاقی ملکات معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں، اسی طرح انہیں ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔البتہ اچھے اخلاقی ملکات کی تشکیل کیلئے نصیحت، غور و فکر، صحیح تعلیمات اور صحت مند ماحول کی تاثیر اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں ایک تیسرا مکتب فکر بھی موجود ہے جو یہ کہتا ہے کہ بعض اخلاقی صفات میں تبدیلی ممکن ہے اور بعض میں نہیں۔ جو صفات فطری اور طبیعی ہوتی ہیں، ان میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی لیکن جو صفات بیرونی عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں، ان میں تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔[1]

اس نظریہ کی تائید میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اس لئے کہ صفات کے درمیان اس فرق کا قائل ہونا طبیعی اور فطری

---

[1] محقق نراقی نے جامع السعادات میں اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔(جامع السعادات جلد 1 ص 24)

اخلاق کی فرع ہے، حالانکہ یہ بات ثابت نہیں ہے۔ اگر بالفرض ثابت ہوبھی تو کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ فطری صفات میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ کیا جنگلی جانوروں کو پالتو جانور نہیں بنایا جاسکتا؟ کیا تعلیم وتربیت اس قدر گہری تاثیر کی حامل نہیں ہوسکتی کہ انسان کے وجود کی گہرائی میں جاکر تبدیلی کردے؟

اخلاقی تبدیلی کے امکان پر آیات وروایات

جو کچھ ہم نے مذکورہ صفحات میں کہا، وہ عقلی اور تاریخی حوالے سے تھا۔ جب ہم نقلی دلائل یعنی وحی اور ارشاداتِ معصومین کی طرف رجوع کرتے ہیں تو مسئلہ اور بھی واضح ہوجاتا ہے، اس لئے کہ:

۱۔ انبیاء ورسل کی بعثت اور آسمانی کتب کا نزول، انسانوں کی ہدایت کا یہ سارا اہتمام اس بات کی مضبوط ترین دلیل ہے کہ تمام انسانوں میں فضائل اخلاقی کی پرورش ممکن ہے۔[1]

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲﴾ (جمعہ: ۲)

اور اس جیسی آیات اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد ان لوگوں کی ہدایت، تربیت اور تزکیہ نفس تھا جو ضلال مبین یعنی کھلی گمراہی میں تھے۔

۲۔ وہ تمام آیات جو یا بنی آدم، یا ایها الناس اور یا عبادی جیسے الفاظ کے ذریعے تمام انسانوں کو خطاب کرکے امر و نہی کررہی ہیں یا تزکیہ وتہذیب نفس پر مشتمل مطالب کو بیان کررہی ہیں۔ اخلاق رذیلہ کی تبدیلی اور ناپسندیدہ صفات کی اصلاح کے ممکن ہونے کی بہترین دلیل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان خطابات کی یہ عمومیت لغو اور بیہودہ ہوتی۔

ممکن ہے اس کے جواب میں کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ تمام آیات عملی احکام پر مشتمل ہیں جبکہ اخلاق کا تعلق اندرونی صفات سے ہے۔

لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اخلاق اور عمل لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے کیلئے علت اور معلول یعنی سبب اور نتیجہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ہر اچھی اخلاقی صفت اچھے اعمال کا سرچشمہ ہوتی ہے جبکہ ہر بری اخلاقی صفت برے افعال کا سبب ہوتی ہے۔ اس کے مقابل اچھے اور برے اعمال بار بار کی تکرار سے اچھے اخلاق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ یہ نظریہ کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، عقیدۂ جبر کی پیداوار ہے۔ اس لئے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اچھے اور برے اخلاق کے حامل افراد اپنے اخلاق کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ چونکہ ان کے اعمال ان کے اخلاق کی بنیاد پر استوار ہوتے

---

[1] ملاحظہ فرمائے اصول کافی جلد 1 ص 155 اور کشف المراد، بحث قضاء وقدر ومفاسد جبر۔

ہیں، لہٰذا وہ اپنے اچھے یا برے افعال کے انجام دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس کے باوجود وہ مکلف ہیں کہ اچھے اعمال کو انجام دیں اور برے اعمال سے اجتناب کریں۔ یہ عین جبر ہے اور جتنی خرابیاں عقیدۂ جبر کی وجہ سے لازم آتی ہیں، اس نظریہ کی وجہ سے بھی لازم آتی ہے۔[1]

جو آیات وضاحت اور صراحت کے ساتھ تہذیب اخلاق کی طرف راغب کرتی ہیں اور رذائل اخلاقی سے اجتناب کی تاکید کرتی ہیں، وہ بھی اخلاقی صفات میں تبدیلی کے ممکن ہونے کی مضبوط دلیل ہیں۔ جیسا کہ:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

''جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، وہ فلاح پا گیا اور جس نے اسے گناہ سے آلودہ کیا، نا اُمید اور محروم ہو گیا۔'' (شمس: ۹، ۱۰)

اس آیت میں لفظ ''دسھا'' استعمال ہوا ہے جس کا مادہ ''دس'' ہے۔ لفظ ''دسیسہ'' بھی اسی سے نکلا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ناپسندیدہ چیز کو کسی چیز میں داخل کر دیا جائے۔ اس آیت میں اس لفظ کا استعمال یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی طبیعت کی بنیاد پاکیزگی اور تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور رذائل اخلاقی باہر سے اس میں داخل ہوتے ہیں اور دونوں میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ سورۃ فصلت کی آیت ۳۴ میں ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝

''بدی کو نیکی کے ذریعے دور کرو، تم اچانک دیکھو گے کہ جو شخص تمہارا دشمن تھا، گویا وہ تمہارا پرانا اور مخلص دوست ہے۔''

یہ آیت اس بات کو بخوبی ثابت کرتی ہے کہ پرانی اور گہری دشمنی جو انسان کے اخلاق پر گہرا اثر ڈالتی ہے، محبت اور اچھے سلوک کے نتیجہ میں گرم جوشی اور دوستی میں بدل جاتی ہے۔ اگر اخلاق میں تبدیلی ممکن نہ ہوتی تو یہ تبدیلی بھی ممکن نہ ہوتی۔

اسلامی احادیث میں بھی یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ مشہور و معروف حدیث

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (سفینۃ البحار، مادہ خلق)

اخلاق میں تبدیلی کے امکان کی بہترین مثال ہے۔

۲۔ بہت سی روایات حسن خلق کی ترغیب دیتی ہیں مثلاً یہ حدیث نبوی:

لو یعلم العبد ما فی حسن الخلق لعلم انه یحتاج ان یکون له خلق حس [1]

''اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حسن اخلاق کے کیا فوائد ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا کہ انہیں اچھے اخلاق کی ضرورت ہے۔''

۳۔ آنحضرتؐ سے ایک حدیث میں ہے:

الخلق الحسن نصف الدین [2]

''حسن اخلاق نصف دین ہے۔''

۴۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الخلق المحمود من ثمار العقل، الخلق المذموم من ثمار الجهل [3]

''پسندیدہ اخلاق عقل کا ثمر ہے اور ناپسندیدہ اخلاق جہل کا ثمر ہے۔''

چونکہ علم اور جہل میں تبدیلی ممکن ہے، لہٰذا اخلاق جو ان کا ثمر ہے، اس میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

۵۔ ایک اور حدیث نبوی میں ہے:

ان العبد لیبلغ بحسن خلقه عظیم درجات الاخرة و شرف المنازل وانه لضعیف العبادة [4]

''انسان عبادت میں کمزور ہونے کے باوجود حسن اخلاق کی بدولت آخرت میں عظیم درجات اور اشرف منازل پر فائز ہوسکتا ہے۔''

اس حدیث میں حسن اخلاق کا عبادت کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔ اعلیٰ اخروی درجات کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً اختیاری اعمال کا نتیجہ ہیں اور حسن اخلاق کے حصول کی رغبت دلائی گئی ہے جو ایک اکتسابی امر ہے جس میں کوئی اجبار و اکراہ نہیں ہے۔

اس قسم کی روایات و کلمات ارشاداتِ معصومین علیہم السلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں [5] جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اخلاقی صفات میں تبدیلی ممکن ہے ورنہ یہ سب ترغیبات بے معنی اور لغو قرار پائیں گی۔

---

[1] بحار الانوار 10_369

[2] بحار الانوار 71:385

[3] غرر الحکم 1280_1281

[4] محجة البیضاء ﷺ 5 ﷺ 93

[5] اصول کافی جلد 2 میں مرحوم کلینی نے باب حسن خلق میں اس قسم کی 18 روایات نقل کی ہیں

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جریر بن عبداللہ سے فرمایا:

انك امرء قد احسن الله خلقك فاحسن خلقك [1]

''اللہ نے تجھے خوبصورت چہرہ عطا کیا ہے، تو اپنے اخلاق کو خوبصورت بنا۔''

مختصر یہ کہ کتب احادیث ایسی احادیث سے بھری پڑی ہیں جو اخلاق میں تبدیلی کے ممکن ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔ [2]

ہم اس باب کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو فضائل اخلاق کے حصول کی رغبت دلا رہی ہے:

الكرم حسن السجية و اجتناب الدنية

''انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ حسن خلق کو اختیار کرے اور اخلاقی پستی سے اجتناب کرے۔'' [3]

اخلاق میں عدم تغیر کے قائلین کے دلائل

مندرجہ بالا دلائل کے جواب میں کچھ ایسی روایات کا سہارا لیا گیا ہے جن سے پہلی نظر میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ناممکن ہے:

۱۔ رسولؐ اللہ کی مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:

الناس معادن كمعادن الذهب والفضة، خيارهم فى الجاهلية خيار هم فى الاسلام

''لوگ سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں، دورِ جاہلیت کے اچھے اسلام میں بھی اچھے ہیں۔''

۲۔ آنحضرتؐ سے ہی ایک اور حدیث میں مروی ہے:

اذا سمعتم ان جبلا زال عن مكانه فصدقوه، و اذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصدقوه! فانه سيعود الى ما جبل عليه

''جب تم سنو کہ پہاڑ نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے تو اسے سچ سمجھ لو مگر جب یہ سنو کہ کسی نے اپنا اخلاق چھوڑ دیا ہے تو اسے سچ مت سمجھو۔ وہ جلدی اپنی فطرت پر لوٹ آئے گا۔'' [4]

---

[1] سفینۃ البحار، مادہ خلق

[2] اصول کافی جلد 2، روضہ کافی، میزان الحکمہ، ج 3 اور سفینۃ البحار کے متعلقہ ابواب کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] غرر الحکم۔

[4] جامع السعادات: 24:1

جواب

ان روایات کا جواب سابقہ روایات کی روشنی میں دینا مشکل نہیں ہے جن سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اخلاق میں تبدیلی ممکن ہے۔اس لئے کہ یہ بات قابل قبول ہے کہ لوگوں کی روحی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔بعض سونے کی کان جیسے ہوتے ہیں اور بعض چاندی کی کان کی مانند ہوتے ہیں۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ روحی کیفیات تبدیلی کو قبول نہیں کرتی ہیں۔یہ صفات مقتضی کی حیثیت رکھتی ہیں مگر علت تامہ نہیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ ایسے افراد تعلیم وتربیت کی روشنی میں مکمل طور پر تبدیل ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ اگر ہم اسی حدیث کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیں تو وہ اس طرح ہوگا کہ سب لوگ اچھے اخلاق کے مالک ہیں۔یعنی بعض خوب ہیں اور بعض خوب تر (سونے اور چاندی کی مانند)۔لہٰذا ان میں اخلاق رذیلہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حدیث نمبر ۲ بھی مقتضی کی حیثیت رکھتی ہے، نہ علت تامہ کی یا دوسرے الفاظ میں لوگوں کی اکثریت کی حالت کو بیان کر رہی ہے، نہ سب کی حالت کو، ورنہ اس حدیث کا مضمون تاریخی طور پر غلط ہے، اس لئے کہ تاریخ یہ بات قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے اخلاق میں تبدیلی کی اور مرتے دم تک اس پر قائم رہے۔ہمارا روزمرہ کا تجربہ بھی یہ بتلاتا ہے کہ بہت سے برے افراد تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں اپنی زندگی کی راہ بدل لیتے ہیں اور عمر بھر نئے راستے پر قائم رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ لوگوں کی روحی اور اخلاقی کیفیات مختلف ہونے کے باوجود کوئی شخص بھی کسی مخصوص اخلاقی روش پر قائم رہنے پر مجبور نہیں ہے۔عین ممکن ہے کہ اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل افراد ہوائے نفس کی پرستش کے نتیجہ میں اخلاقی انحطاط کی دلدل میں گر جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بری اخلاقی صفات کے حامل افراد استاد اور مربی کے زیر سایہ خودسازی کی منازل طے کر کے کمال کے اعلیٰ ترین درجات پر پہنچ جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض فاسد اور مفسد افراد اپنے برے کردار پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کیا کریں، ہمیں تو اللہ نے پیدا ہی اس طرح کیا ہے۔وہ چاہتا تو ہمیں کسی اور اخلاق پر پیدا کر دیتا۔

بہرحال عدم تغیر کا قائل ہونے کا نتیجہ عقیدۂ جبر کو تسلیم کرنے، انبیاء کے مکتب کے انکار، علمائے اخلاق اور ماہرین نفسیات کی کوششوں کو بیہودہ سمجھنے اور انسانی معاشرے کے فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

۶۔علم اخلاق کی مختصر تاریخ

مذکورہ بالا بحث کو ہم علم اخلاق کی مختصر تاریخ بیان کرنے پر ختم کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاقی بحث کا آغاز اسی وقت ہوگیا تھا جب انسان نے روئے زمین پر قدم رکھا تھا۔اس لیے کہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، انہوں نے نہ صرف اپنی اولاد کو اخلاقی تعلیمات سے آگاہ کیا بلکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا اور انہیں جنت میں ٹھہرایا، اوامر و نواہی کے ذریعے انہیں اخلاقی مسائل سے آگاہ کر دیا۔

دیگر انبیاء بھی لوگوں کا تزکیہ نفس کرنے کے کاموں میں مشغول رہے جو کہ انسانوں کی سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آ گیا جن کی تعلیمات کا بڑا حصہ اخلاقی مباحث پر مشتمل ہے۔ ان کے سب پیروکار انہیں علم اخلاق کے عظیم معلم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

لیکن اخلاق کے سب سے عظیم معلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو انما بعثت لا تمم مکارم الاخلاق کا پرچم لے کر مبعوث ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

''اور یقیناً آپ خلق عظیم کی منزلت پر فائز ہیں۔'' (قلم: ۴)

فلاسفہ میں سے بھی بعض عظیم شخصیات معلم اخلاق کی حیثیت سے معروف تھیں جن میں افلاطون، ارسطو، سقراط اور یونان کے بعض دیگر فلاسفہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بہر حال رسولؐ اللہ کے بعد آئمہ معصومین علیہم السلام اخلاق کے عظیم ترین معلم تھے۔ اس بات کا ثبوت اخلاقی روایات کا وہ عظیم ذخیرہ ہے جو ان سے نقل ہوا ہے۔ ان کے مکتب میں ایسی عظیم شخصیات نے پرورش اور تربیت پائی جن میں سے ہر ایک اپنے دور کا معلم اخلاق تھا۔

آئمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے اصحابِ بافضیلت کی زندگی ان کے اخلاقی مقام و مرتبہ اور فضائل اخلاق کا روشن ترین ثبوت ہیں۔

یہ ایک مفصل داستان ہے کہ ''علم اخلاق'' کب اسلام میں پیدا ہوا اور یہ کہ اس علم کی مشہور شخصیات کون تھیں۔ آیت اللہ صدر نے اپنی گرانقدر تالیف ''تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام'' میں اس کی طرف مختصر اشارہ کیا ہے۔

موصوف نے اس موضوع کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

(الف) وہ فرماتے ہیں کہ علم اخلاق کی بنیاد رکھنے والی اولین شخصیت امیر المومنین علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے جنہوں نے جنگ صفین سے واپسی پر امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے معروف خط میں اخلاقی مسائل کی بنیادوں کو واضح فرمایا۔ اس خط میں اخلاقی فضائل اور صفات رذیلہ کا نہایت عمدہ انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ [1]

اس خط کو سید رضی مرحوم نے نہج البلاغہ میں درج کیا ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے شیعہ علماء نے اسے نقل کیا ہے۔ اہل

---

[1] حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا رسالۃ الحقوق ان کی دعائے مکارم الاخلاق اور دیگر بہت سی دعائیں اور مناجات اخلاق اسلامی کے معروف مصادر میں سے ہیں جن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سنت کے بعض علماء مثلاً ابو احمد بن عبداللہ عسکری اپنی کتاب "الزواجر والمواعظ" میں اس خط کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر حکمت میں سے کوئی چیز سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے تو وہ یہی خط ہے۔

(ب) علم اخلاق کے عنوان سے لکھی گئی پہلی کتاب ابونصر سکونی اسماعیل بن مہران کی تالیف ہے۔ان کا تعلق دوسری صدی سے ہے۔ان کی کتاب کا نام "صفة المومن والفاجر" ہے جو اخلاق اسلامی کی پہلی کتاب کی حیثیت سے معروف ہے۔

(ج) اس کے بعد آیت اللہ صدر ان شخصیات کا ذکر کرتے ہیں جو اگر چہ کسی کتاب کے مولف تو نہ تھے مگر علم اخلاق کے بزرگان کی حیثیت سے معروف ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔سلمان فارسیؓ

جن کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ سلمان فارسی کی حیثیت حکیم لقمان جیسی ہے۔وہ اولین و آخرین کا علم رکھتے تھے۔وہ ایک وسیع سمندر تھے اور ہم اہل بیتؑ میں سے تھے۔[1]

۲۔ابوذر غفاریؓ

انہوں نے ساری عمر اخلاق اسلامی کی ترویج میں گزاری اور خود اخلاق اسلامی کا عمدہ نمونہ تھے۔اخلاقی مسائل میں حضرت عثمان اور امیر شام سے ان کے اختلافات تاریخ میں مشہور ہیں۔آخر کار انہوں نے اپنی جان بھی اسی راہ میں قربان کر دی۔

۳۔عمار یاسرؓ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ان کے اور ان کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے اور ان کے اخلاقی مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے:

> ''کہاں ہیں میرے بھائی جو رہ راہِ حق کی طرف آئے اور اس پر ثابت قدم رہے؟ کہاں ہیں عمار؟''
> پھر آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا اور طویل گریہ فرمایا۔پھر فرمایا:
> ''ہائے میرے وہ بھائی جو قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔فرائض کو اہتمام سے ادا کرتے تھے۔سنتوں کو زندہ کرتے تھے اور بدعتوں کو مٹاتے تھے۔''[2]

---

[1] بحار الانوار۔22۔391

[2] نہج البلاغہ خطبہ 142

۴۔نوف بکالی

۹۰ ہجری کے بعد فوت ہوئے، وہ زہد وعبادت اور علم اخلاق میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

۵۔محمد بن ابوبکر

حضرت علی علیہ السلام کے پیروکار تھے اور زہد وعبادت میں ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔روایات میں ان کا ذکر حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب خاص میں کیا گیا ہے۔اخلاق میں ان کی زندگی ایک نمونہ تھی۔

۶۔جارود ابن منذر

یہ حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کے اصحاب میں شامل اور بزرگ علماء میں سے تھے۔علم وعمل اور جامعیت میں اعلیٰ مقام پر تھے۔

۷۔حذیفہ بن منصور

یہ حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہم السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ان معصومینؑ سے علم حاصل کیا۔وہ مکارم اخلاق اور تہذیب نفس میں نابغہ روزگار تھے۔

۸۔عثمان بن سعید عمری

یہ امام زمان حضرت مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے وکلائے اربعہ میں سے تھے اور حضرت عمار یاسر کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ معارف واخلاق واحکام وفقہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی بزرگ شخصیات ہیں جن کے اسمائے گرامی کے ذکر سے یہ بحث طولانی ہوجائے گی۔

اس ضمن میں اس بات کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں علم اخلاق پر بہت زیادہ کتب لکھی گئی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام قابل ذکر ہیں:

۱۔ المانعات من دخول الجنة۔ یہ کتاب جعفر بن احمد قمی کی تالیف ہے جو تیسری صدی کے بزرگ علماء میں سے تھے۔

۲۔ الآداب اور مکارم الاخلاق۔ یہ کتاب علی بن احمد کوفی کی تالیف ہیں جو چوتھی صدی کے علماء میں سے تھے۔

۳۔ طهارت النفس یا تهذیب الاخلاق و تطهیر الاعراق۔ تالیف: ابن مسکویہ جو پانچویں صدی کے علماء میں سے تھے۔ان کی یہ کتاب علم اخلاق کی مشہور کتب میں سے ہے۔انہوں نے علم اخلاق میں ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جس

کا نام ''آداب العرب والفرس'' ہے۔ یہ کتاب پہلی کتاب جیسی مشہور نہیں ہے۔

۴۔ تنبیه الخاطر و نزهة الناظر جو ''مجموعہ ورام'' کے نام سے مشہور اور علم اخلاق کی معروف کتب میں سے ہے۔ یہ کتاب ورام ابن ابی خوارس کی تالیف ہے جو چھٹی ہجری کے علماء میں سے تھے۔

۵۔ ساتویں صدی میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی معروف کتب ''اخلاق ناصری''، ''اوصاف الاشراف'' اور "آداب المتعلمین" نظر آتی ہیں۔

ان میں سے ہر کتاب علم اخلاق کی کتب میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

۶۔ دیگر صدیوں میں بھی "ارشاد القلوب"، تالیف: دیلمی، "مصابیح القلوب"، تالیف: سبزواری، "مکارم الاخلاق"، تالیف: حسن بن امین الدین، "الآداب الدینیه"، تالیف: امین الدین طبرسی، "محجة البیضاء" تالیف: فیض کاشانی جو کہ اس علم کی بہترین کتب میں سے ہے اور "جامع السعادات"، "معراج السعادة" اور "اخلاق بشر" اور دیگر بہت سی کتب تالیف ہوئیں۔[1]

مرحوم علامہ آقا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب ''الذریعہ'' میں علم اخلاق کی درجنوں کتب کا ذکر کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ بہت سی کتب سیر وسلوک اور بعض کتب عرفان کی حیثیت سے شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتب میں ایک یا چند ابواب کو علم اخلاق کے لیے مخصوص کر دیا گیا جس کا واضح ترین نمونہ بحار الانوار اور اصولِ کافی ہیں۔ ان کتب کے بہت سے حصے اخلاقیات سے متعلق ہیں اور اس علم کا بہترین سرمایہ شمار ہوتے ہیں۔

[1] تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلامیہ کے آخری اب سے تلخیص وتصرف کے ساتھ۔

دوسرا باب

انسانی زندگی اور تمدن میں اخلاق کا کردار

بعض نا آگاہ افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی مسائل کا تعلق صرف انسان کی ذاتی زندگی سے ہے یا وہ انہیں ایسے مقدس، روحانی اور معنوی امور سے متعلق سمجھتے ہیں جن کا نتیجہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ تفکر ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اکثر بلکہ سب اخلاقی مسائل انسان کی معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، خواہ وہ اثرات مادی ہوں یا معنوی۔ اخلاق کے بغیر انسانی معاشرہ ایک ایسے چڑیا گھر میں تبدیل ہو جائے گا جس میں صرف پنجرے ہی ان انسان نما حیوانوں کی تخریبی کارروائیوں کا سد باب کر سکتے ہیں۔ اخلاق کے بغیر انسانوں کی طاقتیں ضائع اور ان کی صلاحیتیں کچلی جائیں گی۔ آزادی ہوس ران افراد کا کھلونا بن جائے گی اور انسانی زندگی اپنا حقیقی مفہوم کھو دے گی۔

اگر گزشتہ تاریخ میں صحیح غور و فکر کیا جائے تو بہت سی ایسی اقوام نظر آئیں گی جن میں سے ہر ایک کسی خاص اخلاقی انحراف کی وجہ سے یا تو زوال سے روبرو ہو گئیں یا پھر مکمل طور پر تباہ ہو گئیں۔

کئی حکمرانوں نے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے اپنے ملک و ملت کو دردناک آلام و مصائب کے منہ میں دھکیل دیا۔ کئی فوجی کمانڈروں نے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے اپنے سپاہیوں کی جان کو خطرے میں ڈالا اور اپنی خودسری کی وجہ سے انہیں ہلاکت سے دوچار کیا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسانی زندگی اخلاق کے بغیر لطافت، شگوفائی اور حسن سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اخلاق کے بغیر خاندانوں کی شیرازہ بندی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ لیکن ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ اخلاق کے بغیر انسان کی معاشرتی زندگی ایسے دردناک انجام سے دوچار ہو جاتی ہے جس سے برے انجام کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اخلاقیات کے بغیر بھی انسانی معاشرہ کی خوش نصیبی صحیح قوانین اور احکام پر عمل کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اخلاقیات کی مدد کے بغیر قوانین پر عمل کرنا بھی ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ جب تک لوگوں کے اندر احکام اور قوانین پر عمل کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو، بیرونی کوششوں سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں کیا ہو سکتا۔ طاقت کے استعمال سے قوانین کا نفاذ، قوانین کے نفاذ کی بدترین صورت ہوتی ہے جسے انتہائی اضطرار کی صورت میں ہی اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ایمان اور اخلاق قوانین کے نفاذ کی بہترین ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہم نمونہ کے طور پر بعض قرآنی آیات پر نظر ڈالتے ہیں جو ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں:

۱۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۹۶﴾

''اگر بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے ان پر برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے تکذیب کی اور ہم نے ان کی کرتوتوں پر ان کو پکڑ لیا۔

(اعراف:۹۶)

۲۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾

''اور نیکی اور بدی ہرگز باہم برابر نہیں ہیں۔ بدی کو نیکی کے ذریعے دور کرو۔ اچانک تم دیکھو گے کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، گویا وہ تمہارا مخلص دوست بن چکا ہے اور یہ بات انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صابر ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے۔

(فصلت:۳۴،۳۵)

۳۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴿۱۵۹﴾

''اللہ کی رحمت کی بدولت آپ ان کے لیے مہربان ہوگئے۔ اگر آپ سخت دل ہوتے تو یہ لوگ یقیناً آپ کے پاس سے دور ہو جاتے۔ پس آپ انہیں معاف کر دیں، ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں، امور میں ان سے مشورہ کریں، پھر جب آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں۔ یقیناً اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(آل عمران:۱۵۹)

۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴿۳۴﴾

''ہم نے جس بستی میں کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے عیش پرستوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔(سبا:۳۴)

۵۔ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ ۡ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ

اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے، اس میں آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا سے اپنے حصے کو فراموش نہ کرو۔ جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اسی طرح احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو کیونکہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (قارون نے) کہا: ''جو کچھ میرے پاس ہے، میں نے اسے اپنے علم کے ذریعے حاصل کیا ہے۔'' کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اس سے پہلے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور اور دولت مند تھے (اور جب اللہ کا عذاب آ جائے) تو مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (قصص: ۷۷، ۷۸)

۶۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾

''میں نے ان سے کہا تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ آسمان سے تم پر مسلسل برکت والی بارشیں بھیجتا ہے اور تمہارے اموال اور کثرت اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرتا ہے اور تمہارے لیے باغات اور نہریں بناتا ہے۔ (نوح: ۱۰ تا ۱۲)

۷۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

''اگر یہ تورات، انجیل اور جو بھی ان کی طرف نازل کیا گیا، قائم کرتے تو اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں جبکہ زیادہ تر بدعمل ہیں۔ (مائدہ: ۶۶)

۸۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''جو کوئی عمل صالح انجام دے، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کے حساب سے انہیں جزا دیں گے۔ (نحل: ۹۷)

۹۔ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾

''اور جو میرے ذکر سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی اس پر تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا محشور کریں گے۔(طٰہٰ: ۱۲۳)

۱۰۔ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ

''جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''(انفال:۴۶)

تشریح اور نتیجہ

مندرجہ بالا ان آیات میں سے پہلی آیت میں زمین و آسمان کی برکات اور تقویٰ کے باہمی تعلق کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تقویٰ اور ایمان کی بدولت آسمان و زمین کی برکات انسان رواں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس آیات الٰہی کی تکذیب اور تقویٰ سے دوری کی وجہ سے عذاب نازل ہوتا ہے:

وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰٓى اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنۡ كَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾

آسمان و زمین کی برکات کے معنی بہت وسیع ہیں۔ بارش کا برسنا، پودوں کا اگنا، نعمتوں کی فراوانی اور انسانی ذرائع میں اضافہ، سب اس میں آ جاتے ہیں۔

برکت اصل میں کسی چیز کے ثابت اور برقرار رہنے کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہر پائیدار نعمت پر کیا جاتا ہے۔ بنابراین بے برکت چیزیں وہ ہوتی ہیں جنہیں ثبات و قرار حاصل نہ ہو اور وہ جلد فنا ہو جاتی ہوں۔

بہت سی اقوام جو بہت زیادہ مادی وسائل، قدرتی ذرائع، صنعتی پیش رفت اور ترقی میں بہت آگے ہیں، اخلاقی انحطاط اور بد عملی کے نتیجہ میں ان نعمتوں کی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہیں اور یہی نعمتیں ان کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآنی آیات میں ایسے لوگوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کی نعمتیں ان کی تباہی اور بدبختی کا سبب بن گئیں۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۸۵ میں ہے:

وَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَاَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

یعنی ''ان کے اموال اور اولاد تمہارے لیے باعث تعجب نہ ہونے چاہئیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ دنیا میں انہیں ان کے ذریعے سزا دے اور ان کی جان اس طرح نکلے کہ وہ کافر ہوں۔''

اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ جب نعمتیں اور اخلاقی انحطاط یکجا ہو جائیں تو یہ دنیا میں بھی باعث عذاب ہے اور اخروی

زیان اور خسارے کا بھی سبب ہے۔

بالفاظ دیگر جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور ایمان، اخلاق اور انسانی اصول ایک ساتھ ہوں تو یہ آبادی، ترقی، فلاح و بہبود اور سعادت وخوش نصیبی کا سبب ہوتی ہیں۔ زیر بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب نعمتیں اور اخلاقی انحطاط، بخل، ظلم، خودسری وہوس رانی ایک ساتھ ہو جائیں تو اس کا نتیجہ تباہی وفساد ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں کینہ ونفرت اور دشمنی کو ختم کرنے کا بہت موثر اور اہم طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں دشمنی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اخلاق کے تعامل کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ایسا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر کسی میں یہ بزرگی اور وسیع القلبی نہیں پائی جاتی بلکہ صرف وہی لوگ اس مقام پر پہنچتے ہیں جو صبر واستقامت رکھتے ہیں اور اس اخلاقی فضیلت کو صرف وہی پا سکتے ہیں جنہیں ایمان وتقویٰ سے بڑا حصہ ملا ہو:

وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾

نفرت اور کینہ آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے ہیں اور ایک پہاڑ بن جاتے ہیں جو ہمیشہ انسانی معاشروں کی ایک بڑی مشکل رہی ہے۔ تمام جنگوں کے پیچھے یہی خرابی کارفرما ہے جو ہر چیز کو نگل لیتی ہے اور ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

اگر اس آیت میں بیان کردہ طریقہ، یعنی بدی کا مقابلہ نیکی سے، اختیار کیا جائے تو سب کینے اور نفرتیں اس طرح زائل ہو جائیں گے جیسے گرمیوں کی دھوپ میں برف پگھل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ بہت سی خطرناک جنگوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ جرائم کم ہو جائیں گے اور تعاون ودوستی کی راہیں کھل جائیں گی۔

لیکن جیسا کہ خود قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان نے ایمان وتقویٰ اور اخلاقی تربیت سے بہت زیادہ حصہ پایا ہو۔

ظاہر سی بات ہے کہ اگر آپ سختی کا جواب سختی سے دیں اور بدی کے جواب میں بدی سے پیش آئیں تو برائی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور روز بروز ان کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ وسیع سطح پر بدقسمتی کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن بدی کا نیکی سے مقابلہ کرنے کی بھی کچھ حدود وشرائط ہیں جن کو مناسب مقام پر بیان کیا جائے گا۔

تیسری آیت لوگوں کو جذب کرنے میں حسن اخلاق کی تاثیر کو بیان کر رہی ہے اور اس حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے کہ اگر کوئی سربراہ اخلاق الٰہی سے آراستہ ہو تو اسے اپنے امور کی انجام دہی میں کتنی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور کس طرح بکھرے ہوئے دلوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے معاشرے کی پیش رفت اور ترقی کی راہیں کھولتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹

''اللہ کی رحمت کی بدولت آپ ان پر نرم اور مہربان ہو گئے۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ آپ کے اردگرد سے بکھر جاتے۔ آپ انہیں معاف کیجیے۔ ان کے لیے استغفار کیجیے۔ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کیجیے۔ پھر جب آپ کوئی فیصلہ کریں تو اس پر ثابت قدم رہئے اور اللہ پر توکل کیجیے کیونکہ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

یہ آیت انتظامی امور میں کامیابی، دلوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور معاشرے میں اتحاد پیدا کرنے میں حسن اخلاق کی گہری تاثیر کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حسن اخلاق کی یہ تاثیر صرف الٰہی اور معنوی امور میں محدود نہیں ہے بلکہ انسان کی مادی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں تین چیزوں کا حکم دیا گیا ہے:

عفوودرگزر۔ استغفار۔ مشورہ۔

یہ تینوں بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، اس لیے کہ جو اخلاقی کیفیت مہربانی اور تواضع کی بنیاد پر ہوتی ہے، وہ لوگوں کی خطاؤں سے چشم پوشی، استغفار اور غلطیوں کی تلافی کا سبب بنتی ہے اور لوگوں کے انسانی احترام کا باعث ہوتی ہے۔

چوتھی آیت بداخلاقی کے بعض منفی اثرات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہمیشہ عیش پرست افراد نے انبیاء کے خلاف صف آرائی کی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا سراپا تکبر اور خود پسندی سے بھرا ہوا تھا۔ آیت یہ کہتی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴

''ہم نے جس بستی میں کوئی رسول بھیجا تو وہاں کے عیش پرستوں نے کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔''

قرآن شریف ان کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے کہ یہ اس قدر مغرور تھے کہ کہتے تھے کہ:

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۳۵

''اور ہم مال واولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں ہرگز سزا نہیں دی جائے گی۔''

یہ اخلاقی کیفیت معاشرے میں اصلاح کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کے خلاف صف آرائی کا سبب بنتی ہے۔ ایسے لوگ اہل حق کو قتل کر دیتے ہیں، حق پرستوں کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور معاشرے میں ظلم اور بدعنوانی کے بیج پھیلاتے

ہیں۔ یہاں سے انسانی معاشرے پر اخلاقی انحطاط کے منفی اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ناز ونعمت کی بنیاد پر وجود میں آنے والے تکبر کی وجہ سے یہ افراد فکری لحاظ سے بھی واضح اور بھیانک غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ نعمتوں کی فراوانی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں بہت پسندیدہ ہیں کیونکہ اگر وہ مقرب بارگاہِ الٰہی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں یہ نعمتیں عطا نہ فرماتا۔ اس طرح یہ افراد ہر قسم کی اخلاقی اقدار کا انکار کر دیتے تھے۔ قرآن شریف اگلی آیت میں اس طرزِ تفکر کی غلطی کو نمایاں کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معیار قرب صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔

صرف قریش کے ثروت مند مشرکین ہی نہیں بلکہ ناز ونعمت کے پروردہ سارے متکبر، انبیاء اور مصلحین کے سامنے اسی مؤقف کو اختیار کرتے رہے۔

پانچویں آیت میں اسی مسئلہ کا ایک اور رخ دکھایا گیا ہے۔ یہ آیت بنی اسرائیل کے مغرور اور متکبر دولتمند قارون کا حال بیان کررہی ہے۔

جب بنی اسرائیل کے اہل علم ودانش نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اپنے مال و دولت کو اپنی اور اپنے معاشرے کی سعادت کے لیے کام میں لاؤ اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان سے پیش آؤ اور ظلم وفساد کی راہ پر نہ چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا:

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۝۷۷

اس نے مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ جواب دیا:

''میں نے یہ ساری دولت اپنے علم اور اپنی قابلیت سے حاصل کی ہے۔''

یعنی یہ نہ کہو کہ یہ دولت اللہ نے مجھے دی ہے بلکہ یہ کہو کہ میرے علم اور میری قابلیت کے نتیجہ میں یہ دولت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ آخر کار اسی تکبر اور غرور نے اسے انکارِ آیاتِ الٰہی کی ہولناک کھائیوں میں گرادیا اور وہ ظلم وفساد اور دشمنانِ حق وعدالت کے ساتھ دوستی اور تعاون میں مشغول ہوگیا۔ پھر ایک حادثہ میں اپنے تمام اموال سمیت زمین میں دھنس گیا۔

یہاں ایک بار پھر یہی حقیقت واضح ہوکر نظر آتی ہے کہ رذائل اخلاقی کس حد تک انسان اور معاشرے کے چہرے کو تبدیل کردیتے ہیں اور انہیں سعادت اور خوش نصیبی تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دوران گفتگو بنی اسرائیل کے اہل علم ودانش نے اس سے کہا:

''خوش نہ ہو، اللہ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔''

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۝۷۶

یہ بات واضح رہے کہ اسلام اور عقل کی رو سے خوش رہنا اور خوشی و مسرت کی زندگی گزارنا برا عمل نہیں ہے۔ یہاں خوشی و مسرت سے مراد غرور و تکبر، اللہ تعالیٰ سے غفلت اور ظلم و بدعنوانی و گناہ سے حاصل ہونے والی خوشی و مسرت ہے جو مزید سرکشی اور فساد کا سبب بنتی ہے۔

چھٹی آیت میں ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی شکایت کو دیکھتے ہیں۔ اس میں ہمیں اس حقیقت کی طرف متعدد اشارے ملتی ہیں کہ انسان کے اعمال اور اس کی اخلاقی صفات انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

''یا اللہ! میں نے اپنی قوم سے کہا کہ اپنے رب کے حضور استغفار کرو (غرور و نخوت کی سواری سے نیچے اتر آؤ، اپنے گناہوں، کفر و عناد اور ہٹ دھرمی سے توبہ کرو) اس لیے کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے تاکہ وہ آسمان سے مسلسل بابرکت بارش نازل کرتا رہے اور تمہیں اموال و اولاد کی کثرت سے نوازے اور تمہیں باغات اور نہریں عطا کرے۔''

آگے چل کر انہی آیات میں اللہ کے احکام کے سامنے ان کی سرکشی اور ان کی ان بری خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے گناہوں کی بنیادی وجہ تھیں۔

ممکن ہے کوئی یہ کہہ دے کہ مندرجہ بالا آیت توبہ و استغفار اور نعمتوں کی فراوانی کے درمیان ایک معنوی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں معنوی تعلق کے ساتھ ساتھ ظاہری تعلق بھی مراد ہو۔ لہٰذا قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

''جو کچھ لوگوں نے کیا، اس کی وجہ سے زمین اور سمندر میں فساد ظاہر ہوا۔'' (روم: ۴۱)

سورۂ ہود میں یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے جہاں رسولؐ اللہ مشرکین مکہ سے فرماتے ہیں:

أَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى

''میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اپنے رب کی خدمت میں استغفار کرو، پھر اس کے حضور میں توبہ کرو، وہ ایک مقررہ مدت تک تمہیں اچھی نعمتوں سے بہرہ مند فرمائے گا۔'' (ہود: ۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مقررہ مدت تک ''متاع حسن'' سے بہرہ مند فرمانا دنیوی زندگی کی مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جس کا دار و مدار گناہوں سے توبہ، استغفار اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنے اور اچھی اخلاقی صفات اپنانے پر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صفات رذیلہ مختلف قسم کے گناہوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں جبکہ گناہ معاشرے میں مختلف قسم کی

خرابیوں اور تعلقات کے ٹوٹنے، اتحاد، دوستی، محبت اور اعتماد کے خاتمہ کا سبب بنتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ معاشرتی بگاڑ، اقتصادی بدحالی اور امن وامان کے برباد ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ساتویں آیت میں اہل کتاب کی سرکشی اور طغیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۶

''اگر اہل کتاب تورات وانجیل کو اور جو کچھ ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوا، قائم کرتے (اور تقویٰ اختیار کرتے اور عمل صالح انجام دیتے) تو آسمان اور زمین سے رزق حاصل کرتے۔ (لیکن) ان میں سے بہت کم اعتدال کی راہ پر ہیں جبکہ ان کی اکثریت کے اعمال برے ہیں۔''

اس آیت میں بھی ہم اعمالِ صالح اور تقویٰ اور زمین وسمان سے برکتوں کے نزول کے درمیان قریبی تعلق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ تعلق روحانی بھی ہوسکتا ہے اور طبیعی بھی، بلکہ حقیقت میں یہ دونوں تعلق پائے جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ فیض الٰہی محدود نہیں ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اس سرچشمۂ فیض سے مستفیض ہونے کی صلاحیت اور قابلیت پیدا کریں۔ لیکن راہِ اعتدال سے انحراف نے، خواہ افراط کی صورت میں ہو یا تفریط کی شکل میں، انسانی زندگی کو اندھیروں سے بھر دیا ہے اور آرام وسکون کی بساط لپیٹ دی ہے۔ ویران کن جنگیں انسانی جانوں اور معنوی ومادی سرمائے کو چاٹ جاتی ہیں اور انسانوں کی کئی برس کی محنت کو تباہ وبرباد کر دیتی ہیں۔

اس آیت کا یہ جملہ ''وما انزل الیھم'' سب آسمانی کتاب، حتی کہ قرآن مجید کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ سب آسمانی کتابوں کی بنیادی تعلیمات ایک ہی ہیں۔ اگرچہ اسلامی وقرآنی تعلیمات گزشتہ کتب کی نسبت زیادہ کامل اور جامع ہیں۔

آٹھویں آیت میں ہم ایک نئی تعبیر کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ آیت حیات طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی اور اعمال صالح (اور جو صفات اعمال صالح کا سرچشمہ ہیں) کے درمیان موجود تعلق کو بیان کرتی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۷

''جو کوئی عمل صالح انجام دے، خواہ مرد ہو یا عورت اور مومن بھی ہو تو ہم انہیں پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کے مطابق انہیں جزا دیں گے۔''

گزشتہ آیات میں زیادہ تر اخلاق اور معاشرتی زندگی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی گئی لیکن زیر بحث آیت میں زیادہ تر ذاتی

زندگی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔لہٰذا ارشاد فرمایا کہ جو انسان خواہ مرد ہو یا عورت، اگر ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہے تو اسے حیات طیبہ نصیب ہوگی۔اس آیت میں کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حیات طیبہ صرف آخرت میں محدود ہے بلکہ زیادہ تر دنیوی زندگی یا دنیوی اور اخروی دونوں قسم کی زندگی پیش نظر ہے۔

حیات طیبہ کیا ہے؟ مفسرین نے حیات طیبہ کی متعدد تشریحات بیان کی ہیں۔بعض نے اس سے رزق حلال مراد لیا ہے۔ بعض نے قناعت اور اللہ کی عطا پر راضی رہنا مراد لیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رزق حلال اور توفیق عبادت ہے۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی پاکیزگی اور ہر قسم کی آلودگی، ظلم وخیانت، عداوت وغیرہ سے دوری اور ہر قسم کی پاکیزگی مراد ہے۔لیکن "**ولنجزینھم اجرھم**" جو کہ اخروی اجر کو بیان کر رہا ہے، سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیات طیبہ کا اشارہ زیادہ تر اس دنیا میں پاکیزہ زندگی کی طرف ہے۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت اور روگردانی کو ''معیشت ضنک'' (تنگ اور سخت زندگی) کا سبب قرار دیا گیا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

''جو بھی میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگ اور سخت ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا محشور کریں گے۔''

ہم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے اسماء وصفات کی طرف توجہ تمام اخلاقی فضائل کی پرورش کا سبب ہے اور انسان کو روز بروز اخلاق وصفات کے حوالہ سے اسماء وصفات الٰہی کے قریب کرتی ہے۔یہ اخلاقی خصوصیات جو انسان کے اعمال صالح کا اصل سرچشمہ ہیں، اس کی زندگی کو وسیع، آسان اور پاکیزہ بنا دیتی ہیں۔

اس کے برعکس اللہ کی یاد سے روگردانی انسان کو اس سرچشمۂ نور سے دور کر کے اسے تاریک شیطانی صفات کے قریب کر دیتی ہے جو معیشت ضنک یعنی تنگ زندگی کا سبب ہو جاتی ہیں اور وہ ایک مرگبار زندگی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔اس طرح یہ آیت بھی بہت وضاحت کے ساتھ اخلاق وایمان اور انفرادی واجتماعی زندگی کے باہمی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

بعض مفسرین اور اہل لغت نے ''معیشت ضنک'' کی تشریح کرتے ہوئے اسے رزق حرام سے بسر ہونے والی زندگی قرار دیا کیونکہ ایسی زندگی بہت سی پریشانیوں کا سبب بنتی ہے۔بعض دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ ایمان سے محروم افراد عام طور پر بہت حریص ہوتے ہیں۔مادی خواہشات کی شدت اور نہ ختم ہونے والی پیاس، مادی نعمتوں کے ضائع ہو جانے کا خوف، بخل اور دیگر مذموم صفات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام مادی وسائل کے باوجود انسان کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

قیامت کے دن ان لوگوں کا اندھا پن بھی درحقیقت دنیا میں ان کے اندھے پن کا تجسم ہوگا کیونکہ انہوں نے دنیا میں اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں اور حق وسعادت کی راہ کو نہیں دیکھا اور شہوت کی تاریکیوں میں ڈوب گئے۔

اس نکتہ کی مزید تشریح کتاب کے اس حصہ کے آخر میں بیان ہوگی۔

دسویں آیت میں دشمنی اور اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کہ وحدت کے خاتمہ اور قوت و طاقت کے گھٹنے کا سبب ہوتے ہیں:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

''آپس میں اختلاف نہ کرو کیونکہ اس سے تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

ظاہر سی بات ہے کہ تمام اختلافات اور ہر کشمکش صفات رذیلہ کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ ہر چیز پر اپنی حاکمیت کی خواہش کرنا، خود پسندی، مفاد پرستی، احساس برتری، حرص و کینہ و حسد جیسی صفات میں سے ہر ایک اختلاف اور دشمنی کا سبب ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ کمزوری اور عزت و شوکت کے خاتمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن شریف نے "تذهب ریحکم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''ریح'' کے معنی اصل میں ''ہوا'' کے ہیں اور بطور کنایہ طاقت، قوت اور غلبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب ہوا چلتی ہے تو پرچم، جو کسی قوم کی طاقت، قوت اور غلبہ کی علامت ہوتا ہے، لہرانے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ:

''اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہاری طاقت، قوت اور غلبہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''ہوا کے چلنے کے نتیجہ میں کشتی کی رفتار زیادہ ہو جاتی ہے اور وہ جلدی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔''

لغت کی معروف کتاب ''التحقیق'' کے مؤلف فرماتے ہیں کہ روح اور ریح کے معنی میں ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ روح غیر مادی دنیا میں روحانی حرکت کے معنی دیتی ہے جبکہ ریح مادی دنیا میں حرکت کے معنی رکھتی ہے۔

بعض اوقات ریح کا لفظ خوشبو کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے:

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ

''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔'' (یوسف: ۹۴)

اس لحاظ سے ممکن ہے اس جملہ کے معنی یہ ہوں کہ طاقتور افراد یا اقوام کی خوشبو ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے لیکن اگر ان میں اختلاف پیدا ہو جائے تو ان کا اثر و رسوخ ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اختلاف کی وجہ خواہ خود پسندی، مفاد پرستی، حسد، بخل ہو یا کچھ اور، انسانی زندگی پر اس کے منفی اثر اور معاشرتی پسماندگی میں اس کے کردار کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں سے اخلاقی مسائل اور معاشرتی زندگی کے مسائل کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کی ہر اخلاقی صفت، معنوی اور اخروی پہلو کے علاوہ مادی اور دنیوی زندگی سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا ہرگز درست نہیں ہے کہ اخلاقی مسائل کا تعلق انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی تک محدود ہے اور یہ معاشرتی زندگی سے الگ تھلگ کوئی چیز ہے، بلکہ اس کے برعکس، ان کا قریبی اور قوی تعلق ہے۔ کسی بھی قسم کی معاشرتی تبدیلی اخلاقی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر اگر کسی بڑے معاشرے کے لوگ سعادت مندانہ اور صلح و امن پر مبنی تعاون و رواداری کی زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہوں تو کم از کم اتنی اخلاقی پختگی ان میں ضرور ہونی چاہیے کہ انسانوں کے فکری، روحی اور جذباتی اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ سب انسان مختلف پہلوؤں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ امید ہرگز نہیں کرنی چاہیے کہ سب لوگ ہر چیز میں ہماری پیروی کریں، بلکہ مشترکہ اصولوں کی حفاظت کی کوشش کرنی چاہیے اور فکر و عمل کے اختلافات کو بالغ نظر یا وسیع القلبی، نرمی اور بردباری سے برداشت کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر دو افراد بھی طویل المدت تعاون جاری نہ رکھ سکیں گے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اختلاف کو برداشت کرنے کی اخلاقی جرأت جو اتحاد، قدرت اور عظمت کے حصول کے لیے ضروری ہے، صرف باتوں سے پیدا نہیں ہوسکتی، اس کے لیے کافی زیادہ تزکیہ نفس اور تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

احادیث کی روشنی میں مادی زندگی اور اخلاق کا باہمی تعلق

گزشتہ صفحات میں جن باتوں کا ہم نے قرآنی آیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے، وہ احادیث میں بھی وسیع پیمانہ پر نظر آتی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی صفات انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ہم یہاں پر چند احادیث کو نقل کرتے ہیں:

۱۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فی سعة الاخلاق کنوز الارزاق

''رزق کے خزانے اخلاق کی وسعت میں پائے جاتے ہیں۔'' (بحار الانوار، ۷۵: ۵۳)

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

حسن الخلق یزید فی الرزق

''حسن اخلاق رزق میں اضافہ کرتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۶۸: ۳۹۶)

۳۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من حسن خلقه كثر محبوه و آنست النفوس به (غرر الحکم)

''جس کا اخلاق اچھا ہو، اس کے چاہنے والے زیادہ ہوتے ہیں اور دل اس سے مانوس ہوتے ہیں۔''

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان البر و حسن الخلق يعمر ان الديار و يزيدان فی الاعمار

''نیکی اور حسن اخلاق شہروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں۔'' (بحار الانوار، ۶۸: ۳۹۵)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شہروں کی آبادی اتحاد، اخلاص اور تعاون کی مرہون منت ہے۔ جو چیزیں ان اقدار کو پختہ کرنے میں موثر ہوتی ہیں، وہ شہروں کو آباد رکھنے میں بھی اتنی ہی موثر ہوتی ہیں۔

طویل عمری بھی آرام وسکون، فکری آسودگی، غربت کی روک تھام اور معاشرتی تعاون کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں بھی حسن اخلاق کی بدولت ہی حاصل ہوسکتی ہیں۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

حسن الخلق يثبت المودة

''حسن اخلاق سے محبت میں ثبات پیدا ہوتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۴: ۱۴۸)

متعدد احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بداخلاقی معاشرے میں نفرت، اختلاف، رزق کی تنگی اور بے سکونی کا باعث بنتی ہے۔

۶۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من ساء خلقه ضاق رزقه

''بداخلاق کی روزی تنگ ہوجاتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۷۔ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

من ساء خلقه اعوزه الصديق و الرفيق

''بداخلاق کے دوست اسے چھوڑ جاتے ہیں۔'' (غرر الحکم)

۸۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

سوء الخلق نكد انكم العيش و عذاب النفس

''بداخلاقی زندگی میں گھٹن اور روحی عذاب کا باعث ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا:

من ادوم الناس غما

''کون سب سے زیادہ غمگین ہوتا ہے؟''

آپؑ نے فرمایا:

اسوئھم خلقا

''جو سب سے زیادہ بداخلاق ہوتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل، ۹:۸ ۳۳)

۱۰۔ ایک حدیث میں ہے کہ لقمان حکیم اپنے بیٹے کو اس طرح نصیحت کرتے تھے:

ایاك والضجر و سوء الخلق وقلة الصبر فلا یستقیم علی ھذہ الخصال صاحب

''بے حوصلگی، بداخلاقی اور کم صبری سے پرہیز کر کیونکہ ان صفات کے مالک کا کوئی دوست باقی نہیں رہتا۔'' (بحار الانوار، ۱۰:۴۱۹)

تیسرا باب

اخلاقی مکاتب فکر

علم اخلاق میں بہت سے مکاتب فکر ہیں جن میں سے زیادہ تر گمراہ ہیں اور ان کا نتیجہ بھی خلافِ اخلاق ہوتا ہے۔قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ان مکاتب فکر کی شناخت مشکل نہیں ہے۔قرآن شریف فرماتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۵۳﴾

''یہی میرا سیدھا راستہ ہے،لہٰذا اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، وہ تمہیں اس راہ سے الگ کر کے متفرق کر دیں گے۔اللہ نے تمہیں یہ نصیحت کی ہے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''(انعام:۱۵۴)

یہ آیت اسلامی عقائد اور عملی و اخلاقی تعلیمات کے ایک بڑے حصے کے بیان کے بعد آئی ہے اور دس اسلامی احکام پر مشتمل ہے۔سب انفرادی اور اجتماعی نظام ہائے زندگی کی طرح اخلاقی مکاتب فکر بھی ''نظریۂ کائنات'' اور کائنات کے متعلق کلی اور عمومی نظریات سے جنم لیتے ہیں۔یہ دونوں ایک اکائی کی طرح باہم جڑے ہوئے ہیں۔

جو لوگ نظریۂ کائنات کو آئیڈیالوجی سے الگ سمجھتے ہیں اور ان کے باہمی تعلق کا انکار کرتے ہیں،ان کا استدلال یہ ہے کہ نظریۂ کائنات منطق اور سائنسی دلائل پر قائم ہوتا ہے جبکہ آئیڈیالوجی یعنی ''یہ ہونا چاہیئے'' اور ''یہ نہیں ہونا چاہیئے'' احکام ہیں۔یہ طرزِ فکر رکھنے والے افراد اس اہم نکتہ سے غفلت کر گئے ہیں یہ احکام اسی صورت میں صحیح اور حکیمانہ ہو سکتے ہیں جب کائنات کے حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ورنہ یہ نا قابل قبول فرضی باتیں متصور ہوں گی۔

اس بات کو کئی مثالوں کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے،مثلاً جب اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ شراب خوری نہ کرو یا بین الاقوامی قوانین یہ کہتے ہیں کہ منشیات کا استعمال ممنوع ہے تو یہ احکام،خواہ الٰہی ہوں یا انسانی،یقیناً کچھ حقائق کی بنیاد پر بنتے ہیں۔وہ حقیقت یہ ہے کہ شراب اور منشیات کا استعمال انسان کی روح اور جسم پر بہت منفی اور تباہ کن اثرات مرتب کرتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی احکام مصلحت پر مبنی ہیں تو اس کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں۔جب ہم کہتے ہیں،

کلما حکم به العقل حکم به الشرع

''ہر وہ حکم جو عقل دیتی ہے،شریعت بھی وہی حکم دیتی ہے۔''

تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ احکام اور حقائق کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔

انسانی معاشروں کے قانون ساز اداروں میں جب ماہرین انفرادی واجتماعی مسائل پر بحث کر کے قانون سازی کرتے ہیں تو وہ بھی اسی حقیقت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کوئی حکیمانہ حکم انسانی زندگی کے حقائق سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ حکم، حکم اور قانون نہیں بلکہ بیہودگی اور دھونس کہلائے گا۔ چونکہ حقیقت ایک ہی ہے، لہٰذا کسی چیز کے بارے میں صحیح حکم بھی ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم حقائق اور ان کی بنیاد پر قائم قوانین کو جاننے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

اس گفتگو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں نظریات کا اخلاقی مسائل کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے اور مختلف اخلاقی مکاتب فکر کی پیدائش اور ان کے اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ہم اخلاقی مکاتب فکر پر نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ اخلاق اور مکتب توحید

اس مکتبہ فکر کی بنیاد پر تمام موجودات مخلوق خدا ہیں۔ ہم سب اسی کی طرف سے ہیں اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ انسان کی خلقت کا مقصد معنوی اور روحانی کمال حاصل کرنا ہے۔ مادی ترقی جہاں تک اس ہدف کے حصول کی راہ ہموار کرے، وہ بھی معنوی ترقی ہی محسوب ہوگی۔

معنوی وروحانی ترقی یا تکامل کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اور ایسی راہ پر چلنا ہے جو انسان کو اس کی صفات کمال سے نزدیک کردے۔

اس مکتب کی رو سے وہ تمام صفات افعالی جو انسان کو اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کریں، معیارِ اخلاق قرار پاتی ہیں۔ اس مکتب کے نظام اقدار کا مرکز ومحور بھی اعلیٰ انسانی صفات، معنوی کمال اور قرب خدا ہے۔

۲۔ اخلاق اور مادیت

ہم جانتے ہیں کہ مادہ پرستی کے کئی شعبے ہیں جن میں کمیونسٹ مکتب فکر زیادہ مشہور ہے۔ یہ مکتب فکر ہر چیز کو مادی نظر سے دیکھتا ہے اور خدا اور معنوی کمال پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ مکتب فکر اقتصاد کو ہی ہر چیز کی بنیاد قرار دیتا ہے اور تاریخ کے لیے بھی مادی اور اقتصادی ماہیت کا قائل ہے۔ اس مکتب فکر کی رو سے ہر وہ چیز جو کمیونسٹ اقتصادی نظام سے نزدیک کرے، عین اخلاق ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

''ہر وہ چیز جو کمیونسٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کردے، وہ اخلاق ہے۔''

مثلاً جھوٹ یا سچ کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ ان میں کون سی چیز انقلاب کی رفتار تیز کرتی

ہے۔اگر جھوٹ انقلاب کی رفتار کو تیز کر رہا ہو وہ اخلاقی ہے اور اگر سچ انقلاب پر منفی اثر ڈالے تو وہ غیر اخلاقی ہے۔

مادہ پرستی کے دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے نکتہ نظر کے مطابق اخلاق کی تشریح کرتے ہیں۔جو مادی لذتوں کو ہی زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں،ان کے نزدیک اخلاق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔بہ عبارت دیگر ان کے نزدیک ہر وہ صفت یا فعل جو حصولِ لذت کی راہ ہموار کرے،عین اخلاق ہے۔

جو مادہ پرست ذاتی مفاد کو ہر چیز کی بنیاد قرار دیتے ہیں،ہر چیز کو حتی کہ انسانی معاشرے کو بھی اس حد تک محترم سمجھتے ہیں جب تک ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل ہو رہی ہو۔(مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشرے اسی کا نمونہ ہیں)۔ان کے یہاں وہی چیز اخلاقی ہے جو ان کے ذاتی مفادات کے حصول میں معاون ثابت ہو۔یہ ہر چیز کو ذاتی مفاد پر قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

۳۔اخلاق اور عقلی فلسفہ

وہ فلاسفہ جو عقل کو بنیادی حقیقت قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ بیرونی دنیا کی مانند انسان کے اندر ایک عقلی دنیا آباد کرے،ان کے نزدیک وہ تمام صفات و اعمال اخلاق کے زمرے میں شمار ہوں گے جو انسان کی عقل کو اس کے حیوانی میلانات پر حاکم بنانے میں مدد دیں۔

۴۔اخلاق اور دیگر پسندی

فلاسفہ کی وہ جماعت جو زیادہ تر معاشرے کے بارے میں سوچتے ہیں اور فرد کی بجائے معاشرے کو اصل قرار دیتے ہیں،ان کی نظر میں وہ افعال اخلاق کہلاتے ہیں جن کا مقصد دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہو اور ہر وہ چیز جس کا فائدہ دوسروں کی بجائے اپنے آپ کو پہنچے،وہ غیر اخلاقی ہے۔

۵۔اخلاق اور ضمیر پرستی

وہ فلاسفہ جو عقل انسانی کی بجائے ضمیر انسانی کو اصل قرار دیتے ہیں،جنہیں ''ضمیر پرست'' کا نام دیا جا سکتا ہے،وہ ایسے امور کو معیار اخلاق قرار دیتے ہیں جن کا حکم انسانی ضمیر دیتا ہے۔یہ وہ امور ہیں جن کو ضمیر انسانی بغیر عقلی استدلال کے ضروری قرار دیتا ہے،مثلاً انسانی ضمیر عدل کو اچھا اور ظلم کو برا،ایثار کو اچھا اور خود پرستی کو برا،شجاعت کو اچھا اور بزدلی کو برا کہتا ہے۔

اس مکتب فکر کی تاکید اس بات پر ہے کہ اخلاقی ضمیر کو زندہ و بیدار کیا جائے اور ہر چیز جو اخلاقی ضمیر کو کمزور کرتی ہے،اس کا خاتمہ ہونا چاہیے تاکہ انسانی ضمیر اچھے اور برے کے درمیان ایک اچھے جج کی طرح فیصلہ کر سکے۔

حسن و قبح عقل کے طرفدار اگرچہ عقل کی بات کرتے ہیں لیکن ان کی مراد عقل استدلالی نہیں بلکہ عقل وجدانی ہے جس کا دوسرا نام اخلاقی ضمیر ہے۔وہ کہتے ہیں کہ احسان کا حسن اور ظلم کا قبح ثابت کرنے کے لیے کسی عقلی استدلال کی ضرورت نہیں ہے،بلکہ

سلیم النفس انسان کے ضمیر پر یہ حقیقت خود بخود آشکار ہے۔

لیکن ان فلاسفہ میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اس حقیقت کا انکار نہیں کرتے کہ ممکن ہے بعض امور میں اخلاقی ضمیر کوئی فیصلہ نہ کر سکتا ہو بلکہ خاموش ہو۔ ایسے مرحلہ پر اخلاقی امور کو غیر اخلاقی امور سے پہچاننے کے لیے وحی اور شریعت سے رہنمائی لینے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر عقل کے حکم کو شریعت کی تائید حاصل ہو جائے تو انسان زیادہ اطمینان کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہوگا۔

نتیجہ

اہم اخلاقی مکاتب فکر کے بارے میں مختصر گفتگو سے اسلام کے اخلاقی مکتب فکر کی برتری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس خدا پر ایمان ہے جو کمال مطلق اور مطلق کمال ہے اور اس کا حکم تمام موجودات پر حاکم ہے۔ انسانوں کا کمال اس میں ہے کہ اس کی صفات جمال وجلال کا عکس اپنے اندر پیدا کریں اور اس کی ذات مقدس سے نزدیک سے نزدیک تر ہوں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اخلاقی صفات انسانی معاشرے کی فلاح اور انسانوں کی مشکلات سے نجات دینے میں موثر نہیں ہیں۔ صحیح اسلامی نظریۂ کائنات، ساری کائنات کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ذات واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ اس دائرے کا مرکز اور ماسوا اللہ ہر چیز، اس سے متصل اور ایک دوسرے کے ساتھ بھی باہم پیوستہ ہیں۔ بنا برایں ہر وہ چیز جو فرد کے لیے مفید ہے، معاشرے کے لیے بھی مفید ہے اور ہر چیز جو معاشرے کے لیے مفید ہے، فرد کے لیے بھی مفید ہے۔

بالفاظ دیگر اخلاقی اقدار دو طرفہ اثر رکھتی ہیں۔ وہ فرد کی بھی تعمیر کرتی ہیں اور معاشرے کی بھی۔ جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اخلاقی امور صرف وہی ہیں جو دوسروں کے لیے مفید ہوں، نہ کہ اپنے لیے، وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اگر کہیں ان دونوں میں جدائی نظر آتی بھی ہے تو وہ بہت محدود اور مختصر ہے۔ ہم اس بات کی وضاحت پہلے بھی کر چکے ہیں۔ مناسب مواقع پر اس کی مزید وضاحت ہوتی رہے گی۔

اہم نکات

ا۔ اخلاق اور نسبیت (Relativity)

آیا اچھے اور برے اخلاق اور فضائل ورذائل مطلق (Absolute) ہیں یا نسبی (Relative)، مثلاً شجاعت، ایثار اور اپنے نفس پر تسلط رکھنا، بغیر کسی استثناء کے ہر زمان ومکان میں اچھی صفات تصور کی جا سکتی ہیں، یا یہ کہ ان کا اچھا یا برا ہونا نسبی (Relative) ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ صفات بعض معاشروں میں اور بعض زمانوں اور بعض جگہوں پر اچھی

ہیں اور بعض میں بری؟

جو حضرات اخلاق کو نسبی سمجھتے ہیں، ان کے دو گروہ ہیں:

پہلا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نسبیت کو سارے عالم وجود پر حاکم سمجھتے ہیں۔ جب وجود اور عدم نسبی ہوں تو اخلاق بھی لامحالہ نسبی ہوں گے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو وجود اور اخلاق کے درمیان کسی تعلق کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی فضائل و رذائل کی شناخت کا معیار معاشرے میں ان کی قبولیت یا عدم قبولیت ہے۔ اس طرح ایک ہی صفت مثلاً شجاعت کسی معاشرے میں مقبول اور کسی معاشرہ میں غیر مقبول ہو۔ جس معاشرے میں یہ مقبول ہو، وہاں اس کا شمار اخلاقی فضائل میں ہوگا۔ جہاں یہ غیر مقبول ہو، وہاں اس کا شمار رذائل اخلاقی میں ہوگا۔

یہ گروہ اخلاقی افعال کے حسن و قبح کو بھی معاشرے کے رد و قبول کے معیار پر جانچتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذاتی طور پر کوئی بھی فعل اچھا یا برا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ ہم گزشتہ بحث میں بیان کر چکے ہیں، اخلاقی مسائل کا تعلق ان معیاروں سے ہے جو نظریۂ کائنات سے جنم لیتے ہیں، جو معاشرے کو ہی اصل سمجھتے ہیں، وہ بھی اس کی خالص مادی شکل میں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اخلاق کو نسبی سمجھیں۔ اس لیے کہ انسانی معاشرہ ہر وقت تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے اور اس کی مادی شکل بھی بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ بات باعث تعجب نہیں ہوگی کہ اگر یہ گروہ معاشرتی رد و قبول کو اچھے اور برے اخلاق کی شناخت کا معیار قرار دے۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ واضح ہے۔ اس طرزِ فکر کی رو سے اخلاقی اصول معاشرے کے رہنما اور پیشرو ہونے کی بجائے معاشرے کے تابع ہوں گے۔ اس طرزِ فکر کے مطابق زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا ایک اخلاقی فعل تھا کیونکہ معاشرہ اسے قبول کرتا تھا۔ اسی طرح غارت گری جو زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے لیے باعث فخر تھی، وہ بھی ایک اخلاقی فعل محسوب ہوگی۔ اسی طرح ہم جنسیت ان معاشروں میں ایک اخلاقی فعل شمار ہوگی جہاں یہ بدبختی موجود ہے۔

اس قسم کے مکاتب فکر انسانی معاشروں کے لیے جس قسم کے مہلک اثرات اور خطرات کا باعث ہو سکتے ہیں، وہ کسی عاقل پر پوشیدہ نہیں ہے۔

اسلام میں اخلاقی فضائل و رذائل کا معیار اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ ثابت اور نا قابل تغیر ہے، لہٰذا اسلام میں اخلاقی معیار بھی مستقل اور نا قابل تغیر ہے۔ انسانی معاشروں اور افراد کا فرض ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کی پیروی کریں، نہ کہ اسے اپنا تابع بنائیں۔

خدا پرست، انسانی فطرت اور اخلاقی ضمیر کو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا پرتو سمجھتے ہیں، بشرطیکہ یہ آلودہ نہ ہو چکے ہوں۔ اس لیے اخلاقی ضمیر پر مبنی اخلاق اور حسن و قبح عقلی (عقل عملی مراد ہے) ثابت اور مستقل سمجھتے ہیں۔ اسلام اخلاق کے نسبی ہونے کی نفی

کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی متعدد آیات میں اچھے اور برے یا بالفاظ دیگر ''خبیث'' و ''طیب'' کو بطور مطلق بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں انسانی معاشرے کے حالات کو غیر موثر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ

''کہہ دیجئے کہ طیب اور خبیث کبھی برابر نہیں ہو سکتے، خواہ خبیثوں کی کثرت آپ کے لیے حیران کن ہو۔'' (مائدہ:۱۰۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

''وہ ان کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔'' (اعراف:۱۵۷)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر فضل اور احسان کرتا ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔'' (بقرہ:۲۴۳)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''آپ جس قدر اصرار کریں لوگوں کی اکثریت مومن نہیں بنے گی۔'' (یوسف:۱۰۳)

ان تمام آیات میں ایمان، پاکیزگی اور شکر کو ایک ''قدر'' (Value) قرار دیا گیا ہے، خواہ لوگوں کی اکثریت ان کی مخالف ہو۔ اسی طرح کفر، ناپاکی اور ناشکری کو منفی قدریں قرار دیا گیا ہے، اگرچہ اکثریت انہیں اپنائے ہوئے ہو۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے خطبات میں، جو نہج البلاغہ میں مندرج ہیں، بار بار اس بات پر تاکید کی ہے کہ آپ کسی عمل یا قدر کا لوگوں کی اکثریت کی طرف سے رد یا قبول ہونا معیار فضیلت و رذیلت نہیں ہے۔ ایک جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

ایها الناس لا تستو حشوا فی طریق الهدی لقلة اهله فان الناس قد اجتمعوا علی مائدة شبعها قصیر وجوعها طویل

''اے لوگو! راہ حق پر چلتے ہوئے اس وجہ سے وحشت زدہ نہ ہو جانا کہ اس پر چلنے والے کم ہیں، اس لیے کہ لوگ ایک ایسے دسترخوان کے گرد جمع ہو گئے ہیں جس کی سیری مختصر اور بھوک طویل ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

حق و باطل، ولکل اھل؛ فلئن امر الباطل لقدیما فعل، ولئن قل الحق فلربما ولعل

''حق اور باطل دونوں موجود ہیں اور دونوں کے حامی اور طرفدار بھی موجود ہیں۔ اگر باطل کی حکمرانی قائم ہوجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے اور اگر حق کے پیرو کم ہیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوجائے (اور وہ کامیاب ہوجائیں)۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶)

یہ سب باتیں اخلاق کے نسبی ہونے کی نفی کرتی ہیں اور معاشرے کی اکثریت کے ردوقبول کو اعمال اور اخلاق کے اچھا یا برا ہونے کا معیار نہیں مانتی ہیں۔

قرآن مجید اور ارشاداتِ معصومینؑ میں اس حقیقت کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

سوال

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آسمانی شریعتوں، خصوصاً اسلام کی تعلیمات میں بھی کہیں کہیں نسبت کو قبول کیا گیا ہے، مثلاً اسلام جھوٹ کو ایک غیر اخلاقی عمل قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کے درمیان اصلاح کے لیے اسے اخلاقی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں۔ یہ کسی حد تک اخلاق اور حسن وقبح کے نسبی ہونے کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔

جواب

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا جواب بھی واضح ہے۔ وہ یہ کہ اخلاق یا حسن وقبح کا نسبی ہونا اور بات ہے اور مختلف مباحث میں استثناء کا موجود ہونا ایک الگ بات ہے۔

بالفاظ دیگر نسبیت میں کوئی ثابت اور مستقل معیار موجود نہیں ہے۔ اس میں جھوٹ اچھا ہے نہ برا۔ اسی طرح احسان اور ظلم کا بھی یہی حال ہے۔ ان کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ اس بات سے ہوگا کہ کسی معاشرے کی اکثریت انہیں قبول کرتی ہے یا رد کرتی ہے۔

لیکن اسلام کی تعلیمات میں جھوٹ، ظلم، بخل، کینہ اور حسد وغیرہ غیر اخلاقی افعال ہیں، خواہ اکثریت انہیں قبول کرے یا نہ کرے۔

یہ ایک ثابت اور مستقل اصول ہے لیکن کہیں کہیں کسی استثنائی صورتحال کا پیدا ہوجانا عین ممکن ہے۔ لہٰذا استثناعات کا پایا جانا جو کہ ہر کلی قاعدے میں پائے جاتے ہیں، نسبیت کی دلیل نہیں ہوسکتے۔ اگر ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی

غلط فہمیوں کا سد باب ہو جائے گا۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ چونکہ احکام موضوعات کے تابع ہیں، اس لیے ان میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کو کسی صورت میں نسبیت کی دلیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اس بات کی وضاحت اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ ہر حکم کا ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے، مثلاً کسی شخص کے جسم پر زخم لگانا ایک جرم ہے جس کا قصاص لینا واجب ہے۔ لیکن بعض اوقات موضوع بدل جاتا ہے۔ ایک جراح ایک چاقو ہاتھ میں لے کر ایک مریض کی جان بچانے کے لیے اس کا پیٹ چاک کر دیتا ہے یا اس کے قلب کو شگافتہ کر دیتا ہے تاکہ اس کے دل کی رگوں کی اصلاح کر سکے۔ ایسی صورت میں موضوع بدل جاتا ہے اور یہ عمل جرم نہیں کہلاتا بلکہ طبیب اور جراح قابل تعریف اور انعام کے حقدار قرار دیئے جاتے ہیں۔

موضوعات کی تبدیلی سے احکام میں رونما ہونے والی تبدیلی کو نسبیت کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نسبیت یہ ہے کہ کوئی موضوع اپنی ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر، مختلف اشخاص یا مختلف اوقات میں مختلف احکام کا محکوم ہو جائے۔

شرعی احکام بھی اسی طرح سے ہیں۔ شراب حرام اور نجس [1] ہے۔ لیکن اگر وہ سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو پاک اور حلال ہے۔ اس بات کا نسبیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نسبیت یہ ہے کہ جو معاشرے شراب کو پسند کرتے ہیں، وہ شراب کو حلال قرار دیں اور جو معاشرے اسے ناپسند کرتے ہیں، وہ اسے حرام قرار دیں۔

اخلاقی مسائل میں بھی بعض اوقات ہمارا سامنا ایسے موضوعات سے ہوتا ہے جو ایک صورت میں فضیلت اور اس شکل کے تبدیل ہو جانے سے رذیلت بن جاتے ہیں۔ حد اعتدال میں نڈر ہونا شجاعت ہے جو ایک فضیلت ہے۔ لیکن اگر یہ حد اعتدال سے نکل کر تہور کی صورت اختیار کر لے تو یہ فضیلت سے نکل کر رذیلت بن جاتی ہے یا یہ کہ جھوٹ، جہاں عام طور پر برائی کا سبب اور اعتماد کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے، حرام اور رذیلت ہوتا ہے۔ لیکن جہاں اس کا مقصد لوگوں کے تعلقات میں بہتری پیدا کرنا ہو، وہاں حلال اور فضیلت بن جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ موضوع کی اس تبدیلی کو نسبیت کا نام دینا چاہیں، ہم نام رکھنے کے معاملہ میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کرتے اور یہ اختلاف ہمارے نکتہ نظر سے ایک لفظی اختلاف ہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں موضوع اور ماہیت میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اگر نسبیت کے طرفداروں کا مؤقف بھی یہی ہو تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ مسئلہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ ہم کسی موضوع کے ایک ہی حالت پر ہوتے ہوئے معاشرے کی اکثریت کی پسند و ناپسند کو فضیلت و رذیلت اور حسن و قبح کا معیار قرار دیں۔

مذکورہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام، قرآن، عقل اور منطق کی رو سے اخلاق کا نسبی ہونا غلط ہے۔ درحقیقت اخلاق کا نسبی ہونا اخلاق کی نفی کے مترادف ہے، اس لیے کہ اخلاق کے نسبی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو برائی معاشرے میں

---

[1] شراب کے نجس ہونے میں فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ صحیح فتویٰ یہ ہے کہ شراب حرام ہے مگر نجس نہیں ہے۔

عام ہو جائے، وہ فضیلت ہے۔ وسیع پیمانہ پر پھیلنے والی ہر اخلاقی بیماری صحت اور سلامتی سمجھی جانے لگے گی۔ اس طرح اخلاق معاشرے کی اصلاح کی بجائے معاشرہ میں بگاڑ اور خرابی کا سبب بن جائے گا۔

۲۔اخلاق اور رویے کا متقابل اثر

اخلاق اور عمل کا باہمی تعلق اور اخلاق کا انسان کے عمل پر اثر کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اعمال عام طور پر ہمارے اندرونی صفات کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں۔جس شخص کے دل میں بخل، حسد یا تکبر نے ٹھکانہ بنالیا ہو اور اس کی فکر اور روح کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہو، ظاہر سی بات ہے کہ اس کے اعمال بھی اس رنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ایک حاسد شخص کے اعمال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسد کی آگ اس کے دل میں جل رہی ہے اور کسی پل اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔اس طرح متکبر افراد کی تمام حرکات وسکنات میں تکبر کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔تمام اچھی اور بری اخلاقی صفات کا انسان کے اعمال پر اسی طرح کا اثر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے ان اعمال کو اخلاقی اعمال کا نام دیا ہے، اس لیے کہ یہ اعمال انسان کی اخلاقی صفات سے ظاہر ہوتے ہیں۔اس کے مقابل وہ اعمال ہوتے ہیں جو کبھی انسان سے سرزد ہوتے ہیں، مثلاً وہ اعمال جو امر بالمعروف، نہی از منکر یا کسی نصیحت کے زیر اثر سرزد ہوتے۔البتہ ان اعمال کا تناسب اخلاقی اعمال کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔

یہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے اور لوگوں کے اعمال کی اصلاح کے لیے اخلاقی بنیادوں کی اصلاح کرنا ہوگی، اس لیے کہ زیادہ تر اعمال کی بنیاد اخلاقی صفات ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیائے الٰہی اور اسلامی معاشرے کے مصلحین کی زیادہ تر کوشش یہی رہی ہے کہ صحیح تربیت کے ذریعے معاشرے کے افراد میں اخلاقی فضائل کو پروان چڑھائیں اور رذائل اخلاقی کو کم سے کم حد تک لے جائیں تاکہ اس طریقہ سے لوگوں کے اعمال کی اصلاح کی جا سکے۔قرآن شریف میں تزکیہ نفس کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے، وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جس طرح اخلاق ہمارے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی طرح ایک عمل کو بار بار انجام دینے سے اس کا اثر انسان کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔اس لیے کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح پر اثر انداز ہوتا ہے۔عمل کو جس قدر دہرایا جائے، اسی قدر روح پر اس کا اثر بھی گہرا ہوگا اور بتدریج وہ عمل ایک پختہ عادت میں تبدیل ہو جائے گا۔مزید تکرار سے یہ عمل عادت سے گزر کر ایک ''حالت'' اور ''ملکہ'' میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان کی ایک اخلاقی صفت بن جاتا ہے۔

اس طرح عمل اور اخلاق ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے۔اس حقیقت کا قرآن مجید اور احادیث میں وسیع پیمانے پر ذکر ملتا ہے۔

اہل جہنم کی بعض خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑭

''ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔'' (مطففین: ۱۴)

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برے اعمال زنگ کی طرح دل پر اثر کرتے ہیں اور اس کے فطری نور اور پاکیزگی کو برطرف کر کے اسے تاریک کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ⑧①

''جو کوئی برائی کا مرتکب ہوا اور اس کی خطا اس کے وجود پر مکمل طور پر چھا جائے، وہ جہنمی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' (بقرہ: ۸۱)

انسان کے وجود پر گناہ کے مکمل طور پر چھا جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اثر انسان کی روح پر اس قدر زیادہ ہو جائے کہ اسے تاریک کر دے اور اسے گناہ کے رنگ میں رنگ دے۔ جب انسان کی یہ حالت ہو جائے تو کوئی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ گویا انسان کی ماہیت ہی بدل جاتی ہے۔ بار بار گناہ کرنے کے نتیجہ میں نہ صرف انسان کی اخلاقی صفات بلکہ اس کے عقائد و نظریات بھی بدل جاتے ہیں۔

جیسا کہ کفر پر اڑے رہنے والے افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۧ

''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔'' (بقرہ: ۷)

ظاہر سی بات ہے کہ اللہ کسی سے عداوت اور کینہ نہیں رکھتا کہ اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے۔ درحقیقت یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو حجاب اور پردوں کی صورت میں انسان کے حواس کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان کو حقیقت کے ادراک سے روک دیتا ہے۔ (ایسے امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دینے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر سبب اور مسبب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اس کی ذات ہی مسبب الاسباب ہے)۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ برے اعمال انسان کے عقیدہ کو بھی تباہ کر دیتے ہیں:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا

يَسْتَهْزِءُوْنَ۝۱۰

''جن لوگوں نے برے اعمال انجام دیئے، آخر ان کا حال یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔'' (روم:۱۰)

ان الفاظ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اگر انسان مسلسل برے کام کرتا رہے تو اس کا اثر انسان کی روح میں بہت گہرائی تک ہوتا ہے اور نہ صرف اس کے اخلاق بلکہ اس کے عقائد کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

قرآن شریف میں تو یہاں تک بیان ہوا ہے کہ برے اعمال کی مسلسل انجام دہی سے انسان کی اچھائی اور برائی کی پہچان کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ نیکی اسے بدی نظر آنے لگتی ہے اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۝۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۝۱۰۴

''کہہ دیجئے کہ آیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جن کی کوششیں دنیوی زندگی میں بھٹک گئیں (اور انہوں نے سارا الٰہی سرمایہ برباد کر دیا) اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔'' (کہف:۱۰۳، ۱۰۴)

ایک اور مقام پر مسلسل جھوٹ بولنے اور اللہ سے وعدہ خلافی کو نفاق کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝۷۷

''ان کے عمل نے ان کے دلوں میں ایسا نفاق پیدا کر دیا جو اس دن تک ان کے ساتھ رہے گا جب وہ اللہ سے ملاقات کریں گے، ایسا اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ خلافی کی اور مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔'' (توبہ:۷۷)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت میں لفظ ''یکذبون'' استعمال ہوا ہے جو استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے اور نفاق کی پیدائش میں اس عمل کی تاثیر کو بیان کرتا ہے، اس لئے جھوٹ بولنا اور اسے سچ ظاہر کرنا انسان کے ظاہر و باطن کے اختلاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس حالت کے مستقل ہو جانے کا نام نفاق ہے۔

اخلاق اور عمل کا متقابل اثر احادیث کی روشنی میں

یہ حقیقت کہ انسان کے اچھے اور برے اعمال اس کی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اچھی بری صفات کی تشکیل کرتے ہیں،

احادیث میں بھی وسیع پیمانہ پر بیان ہوئی ہے۔نمونہ کے طور پر چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كان ابی یقول ما من شی افسد للقلب من خطیئة، ان القلب لیواقع الخطیئة فما تزال به حتی تغلب علیه فیصیر اعلاه اسفله

''میرے والد (حضرت امام محمد باقر علیہ السلام) فرماتے تھے کہ گناہ سے بڑھ کر کوئی چیز انسان کے دل کو تباہ نہیں کرتی۔گناہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس پر غالب آ جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل الٹ جاتا ہے اور اس کا اوپر کا حصہ نیچے ہو جاتا ہے۔'' (اصول کافی، ۲:۲۶۸)

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا اذنب الرجل خرج فی قلبه نکتة سوداء فان تاب انمحت وان زاد زادت، حتی تغلب علی قلبه، فلا یفلح بعدها ابدا

''جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔اگر وہ توبہ کر لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے۔اگر وہ مزید گناہ کرتا رہے تو یہ نقطہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتا ہے۔اس کے بعد وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔'' (اصولِ کافی، ۲:۲۷۱)

اسی بنیاد پر احادیث میں گناہ پر اصرار کرنے کے بارے میں بہت تنبیہ کی گئی ہے، یہاں تک کہ گناہِ صغیرہ پر اصرار کو بھی گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔(بحار الانوار، ۱۰:۳۵۹)

حلال وحرام اور فرائض وسنن کے بارے میں مامون کے ایک سوال کے جواب میں حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ گناہ صغیرہ پر اصرار کرنا اسے گناہِ کبیرہ میں بدل دیتا ہے۔(بحار الانوار، ۱۰:۳۶۶)

۳۔ کتاب ''الخصال'' میں ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اربع خصال یمتن القلب: الذنب علی الذنب.....

''چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں: گناہ پر گناہ کرتے چلے جانا.....'' (خصال، ۱:۲۵۲)

دار المنثور، جلد ۶ صفحہ ۳۲۶ پر بھی ایسی ہی احادیث مندرج ہیں۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عمل کا تکرار یقینی طور پر انسان کے دل اور جان پر اثر انداز ہوتا ہے اور بری صفات کی تشکیل کا سبب بنتا ہے۔اسی لئے تاکید کی گئی ہے کہ جب بھی مومن سے گناہ سرزد ہو تو اسے چاہئے کہ فوراً توبہ کے پانی سے اپنے قلب کو دھوئے اور گناہ کے منفی اثرات کو مٹا دے تاکہ گناہ اس کی مستقل باطنی کیفیت نہ بن جائے۔اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ

حکم دیا گیا ہے کہ معصومین علیہم السلام کی نورانی احادیث سے دلوں کے زنگ کو برطرف کیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ:

ان القلوب لترین کما یرین السیف وجلائہ الحدیث (نورالثقلین، ۵: ۵۲۳)

''لوگوں کے دل زنگ آلود ہوجاتے ہیں جیسے تلوار زنگ آلود ہوجاتی ہے، اس کی چمک حدیث ہے۔''

۳۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق

ایک اور اہم مسئلہ جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ آیا اخلاقی مسائل دوسروں کے ساتھ رابطہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص بالکل تنہا زندگی بسر کر رہا ہو تو اس کے لیے اخلاق ایک بے معنی چیز ہوگی؟ یا یہ کہ بعض اخلاقی مفاہیم اکیلے انسان پر بھی صادق آتے ہیں۔ اگرچہ اخلاقی مسائل کا بڑا حصہ دوسروں کے ساتھ رابطہ کی صورت میں تشکیل پاتا ہے، آیا اس لحاظ سے اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ہم آپ کی توجہ اس بحث کی طرف مبذول کراتے ہیں جو ''زندگی در پرتو اخلاق'' میں آئی ہے:

''بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ تمام اخلاقی مسائل کا تعلق انسان کے دوسروں کے ساتھ معاشرتی رابطوں کے ساتھ ہے۔ اگر معاشرہ موجود نہ ہو اور ہر شخص تنہا اور دوسروں سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہو اور کسی کو دوسرے کی خبر تک نہ ہو تو ایسی صورت میں اخلاق کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

اس لئے کہ رشک، حسد، تواضع، تکبر، حسن ظن، عدالت، ظلم، عفت، سخاوت اور ان جیسی صفات صرف معاشرے میں انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ اور تعلق کی صورت میں ہی کوئی مفہوم رکھ سکتی ہیں۔ لہٰذا معاشرے کے بغیر انسان اخلاق کے بغیر انسان ہوگا۔

لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ بہت سے فضائل و رذائل اخلاقی کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے ہے لیکن یہ کوئی عام قانون نہیں ہے۔ بہت سے اخلاقی مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق صرف انفرادی زندگی سے ہے اور وہ ایک اکیلے انسان پر بھی مکمل طور پر صادق آتے ہیں، مثلاً مسائل اور مشکلات پر صبر یا جزع، حوادث کے مقابل شجاعت یا بزدلی، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سستی یا استقامت، خالق کائنات کے بارے میں توجہ یا غفلت، اس کی وسیع و بے انتہا نعمتوں پر شکرگزاری یا ناشکری اور اس قسم کے بعض دیگر امور ایسے ہیں جنہیں علمائے اخلاق نے کتب اخلاق میں زیر بحث قرار دیا ہے اور انہیں فضائل و رذائل اخلاقی میں شمار کیا ہے۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو انفرادی بھی ہوسکتے ہیں اور اگر کوئی انسان معاشرے سے الگ تھلگ بھی ہو تو یہ اس پر صادق آسکتے ہیں۔ یہاں سے اخلاق کی انفرادی اخلاق اور اجتماعی اخلاق میں تقسیم کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ علم اخلاق میں اجتماعی اخلاق کی حیثیت زیادہ وزنی ہے اور انسان کی شخصیت کا زیادہ تر دارومدار اسی پر ہے۔ اگرچہ انفرادی اخلاق بھی انسان کی شخصیت کی تشکیل

میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔[1]

ظاہر سی بات ہے کہ اخلاق کی اس تقسیم سے اخلاقی مسائل کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ البتہ اس سے گروہ بندی کے لحاظ سے اخلاقی مباحث کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس بحث پر وقت صرف کرنا کہ کون سی اخلاقی صفات صرف انفرادی پہلو رکھتی ہیں اور کون سی اخلاقی صفات صرف اجتماعی پہلو رکھتی ہیں، مفید معلوم نہیں ہوتا۔ ہم اس سلسلہ میں مذکورہ بالا کلی اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی اخلاق بھی معاشرتی مسائل پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔

[1] زندگی در پرتو اخلاق، صفحہ 29 تا 31

چوتھا باب

اخلاقی بنیادیں

اگر اخلاق کو ایک بڑے پھلدار درخت سے تشبیہ دی جائے تو اخلاقی سہاروں کو باغبان اور پانی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اگر باغبان یا پانی نہ ہوتو درخت خشک ہوجائے گا یا مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجائے گا جن کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہو جائے گی یا اس کے پھل میں کمی ہوجائے گی۔

علمائے اخلاق اور فلاسفہ نے اخلاق کے لیے جن سہاروں کا ذکر کیا ہے، وہ مختلف اقسام کے ہیں۔ درحقیقت ان کا تعلق ان کی جہاں بینی (نظریۂ کائنات) سے ہے۔ ہم یہاں ان میں سے چند اہم نمونوں کی طرف اشارہ کریں گے:

ا۔ منفعت طلبی کی بنیاد

ایک گروہ صرف اس لئے اخلاقی مسائل پر تاکید کرتا ہے کہ مادی مفادات کا اس کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک معاشی ادارہ امانت اور سچائی کے اصولوں پر اچھی طرح کار بند رہے تو وہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ اپنی طرف جذب کرسکتا ہے جس کے نتیجہ میں اسے بھاری منافع حاصل ہوگا۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد مختلف حالات میں مختلف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، مثلاً جب وہ بنک میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کے سرمایہ کے ساتھ سروکار رکھتے ہیں تو بہت ایمانداری برتتے ہیں تاکہ اپنے بنک یا ادارہ کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرسکیں۔ لیکن جیسے ہی اپنے ادارہ سے باہر آتے ہیں تو ممکن ہے کہ ایک خائن انسان بن جائیں۔ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ اب ان کا منافع خیانت سے وابستہ ہو۔

اس کی ایک اور مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ ممکن ہے ایک تاجر یا دکاندار اپنے گاہکوں کے ساتھ بہت محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہو تاکہ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ گاہک اپنی طرف کھینچ سکے لیکن ممکن ہے کہ یہی شخص اپنے گھر میں بیوی بچوں سے اور ہمسایوں سے بدزبانی اور بداخلاقی سے پیش آتا ہو۔

یہ اخلاق جس کی بنیاد منفعت طلبی ہے، اس کا سب سے بڑا نقص اور عیب یہ ہے کہ یہ اخلاق کے لیے کسی اصل اور بنیادی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر ہر وقت اور ہر لحظہ مفاد اور منفعت کی طلب میں گامزن رہتا ہے، خواہ یہ فائدہ اور منفعت اخلاق میں ہو یا خلافِ اخلاق میں۔

بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کا مقصد ذاتی فوائد و منافع نہیں بلکہ معاشرتی مفاد اور اجتماعی مصالح

ہونا چاہئے، اس لیے کہ اگر انسانی معاشرے میں اخلاقی بنیادیں متزلزل ہو جائیں تو دنیا ایک ایسے جہنم میں تبدیل ہو جائے گی جہاں سب عذاب میں ہوں گے اور وہ تمام مادی وسائل جو زندگی کو بہتر بنانے میں کام آ سکتے ہیں، اس جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

اس گروہ کا طرزِ فکر اگرچہ نسبتاً بہتر ہے لیکن جس اخلاق کی بات یہ گروہ کرتا ہے، اس کا مقصد بھی حصولِ منفعت ہے۔ یہ گروہ بھی اخلاقی فضائل کے لیے ذاتی قدر و قیمت کا قائل نہیں ہے۔

وہ مادہ پرست لوگ جو کسی وحی و نبوت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے پاس اس طرزِ تفکر کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ لوگ اخلاق کو آسمان کی بلندی سے زمین کی سطح پر لے آتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ رفاہ اور آسائش کے حصول کا ذریعہ قرار دینے لگتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسانی معاشرے پر اخلاق کے مثبت مادی نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں اور ہم گزشتہ صفحات میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن بحث اس نکتہ پر ہے کہ آیا اخلاق کی بنیاد صرف یہی ہے یا یہ کہ ان نتائج کو علم اخلاق کے ذیلی فوائد اور برکات قرار دیا جائے۔

بہرحال اخلاق کے بارے میں منفعت پرستی پر مبنی نظریہ ایک طرف سے اخلاق کی بنیادی اہمیت کو مخدوش کر دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں اخلاق اور مفاد میں تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہو جائے، وہاں یہ نظریہ اخلاق کو چھوڑ کر مفاد کی راہ پر چل نکلتا ہے۔

۲۔ عقلی بنیاد

وہ مفکرین جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عقل ہر چیز پر حاکم ہے اور تمام امور میں عقل کی پیروی کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے اخلاق کے بنیاد بھی اسی پر ہے کہ عقل نیک و بد کو پہچانتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل اس حقیقت کو بخوبی سمجھتی ہے کہ شجاعت فضیلت اور بزدلی رذیلت ہے۔ امانت و صداقت کمال ہیں اور خیانت اور جھوٹ نقص اور عیب ہیں۔ یہی عقلی ادراک ہمیں فضائل اخلاقی کے حصول اور رذائل اخلاقی سے اجتناب کی طرف راغب کرتا ہے۔

بعض لوگ انسانی ضمیر کو اخلاق کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ضمیر جس کا دوسرا نام عقل عملی ہے، انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عقل نظری کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے لیکن ضمیر کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا اور یہی انسانیت کا حقیقی رہنما ہو سکتا ہے۔

لہٰذا انسانی ضمیر کا یہ حکم کہ امانت، صداقت، ایثار، سخاوت اور شجاعت اچھی خصوصیات ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم ان صفات کے حصول کے لیے متحرک ہو جائیں۔ اسی طرح انسانی ضمیر کا یہ فیصلہ کہ بخل و خود پسندی ناپسندیدہ صفات ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ ہم ان صفات سے دوری اختیار کریں۔

اس طرح عقل اور ضمیر ایک ہی نکتہ پر متفق ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ اخلاق کی یہ بنیاد مبنی برحقیقت ہے اور بذاتِ خود اس قابل ہے کہ تربیت نفس اور حصولِ فضائل اخلاقی کی محرک ہو سکے۔ لیکن جیسا کہ یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہے کہ ضمیر کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور برے کاموں کو بار بار انجام دینے کے نتیجہ میں ضمیر بے اثر ہو جاتا ہے اور کبھی تو ضمیر مردہ ہو کر بدی کو نیکی اور نیکی کو بدی سمجھنے لگتا ہے، اس کے علاوہ انسانی ضمیر اپنے تمام تر تقدس کے باوجود بعض اوقات خطا کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے، لہٰذا ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف عقل اور ضمیر پر بھروسہ کرتے ہوئے دیگر عوامل سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی مضبوط اور نا قابل فریب بنیادوں کو تلاش کیا جائے جو نہ تو غیر اخلاقی اعمال کے نتیجہ میں بے اثر ہوں اور نہ ہی ان کی ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع ہو۔

۳۔ شخصیت کی بنیاد

بعض لوگ اس لئے اخلاقی مسائل کی طرف مائل ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں اخلاقی خصوصیات انسان کی شخصیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے بقول چونکہ انسان اچھی شخصیت کا خواہش مند ہوتا ہے، لہٰذا جب وہ دیکھتا ہے کہ صداقت اور امانت سے شخصیت بنتی ہے تو وہ ان صفات کو اپنانے لگتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ بہادر، سخی، وفادار اور مہربان افراد کے لیے عزت و احترام کا قائل ہے تو وہ ان صفات کا طالب نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس جب وہ دیکھتا ہے کہ بزدل، بخیل، کم ہمت، خائن اور بے وفا افراد کی معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہے تو وہ ان صفات سے دور ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کی بازگشت بھی عقل اور ضمیر کی طرف دکھائی دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں انفرادی ضمیر کی بجائے اجتماعی ضمیر کارفرما ہے۔ یعنی جو چیز اجتماعی ضمیر کی رو سے صحیح ہے، وہ فضیلت ہے اور جو چیز اجتماعی ضمیر کے خلاف ہو، وہ رذائل اخلاقی میں شمار ہوگی۔ معاشرے کا یہی اجتماعی فیصلہ انسان کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے اور اسے بدی سے روکتا ہے۔

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجتماعی ضمیر اخلاقی اقدار کے لیے ایک موثر محرک ہو سکتا ہے لیکن جن نقائص کی طرف ہم نے انفرادی ضمیر کے ضمن میں اشارہ کیا تھا، وہ سب یہاں بھی صادق آتے ہیں۔

اجتماعی ضمیر بھی خطا کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اگر حکومتوں کی طرف سے وسیع سطح پر پروپیگنڈا کیا جائے تو ممکن ہے کہ اجتماعی ضمیر نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی جاننے لگے۔ تاریخ میں اس کے نمونے بکثرت موجود ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے میں لڑکیوں کو قتل کرنا، حتیٰ کہ انہیں زندہ دفن کرنا ایک اخلاقی فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ دورِ حاضر میں بھی بعض ترقی یافتہ معاشروں میں طاقت اور وسائل پر قابض حلقے اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کر کے اجتماعی ضمیر کو دھوکہ دیتے ہیں اور غیر اخلاقی چیزوں کو اخلاقی اقدار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ انسان کا ضمیر رحمت الٰہی کی ایک تجلی ہے اور انسان کے اندر اللہ کی عظیم

انسانی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، مگر اس کے باوجود وہ معصوم نہیں ہے اور بعض اوقات خطا کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی اطمینان بخش اور معصوم ذریعہ اس کی اصلاح نہ کرے تو ممکن ہے کہ سالہا سال تک وہ اپنی غلط روش پر چلتا رہے۔

۴۔ الٰہی بنیاد

اگرچہ مذکورہ بالا اخلاقی بنیادوں میں سے ہر ایک اخلاقی مسائل کی طرف بڑھنے کے سلسلہ میں ایک کردار ادا کرتی ہے لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کجی اور انحراف بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ منفعت طلبی کی بنیاد، جو ہر حال میں اپنے راستے پر چلتی ہے اور کبھی اخلاقی مسائل میں سے گزر کرتی ہے اور بعض اوقات ان سے الگ ہوجاتی ہے۔

بعض دیگر بنیادوں میں اگرچہ یہ صورتحال نہیں ہے مگر ان کی قوت اور تاثیر یقیناً محدود ہے۔ ان میں نقائص پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان سے غلطی بھی سرزد ہوجاتی ہے۔

اگر کوئی بنیاد اور محرک موثر ہونے کے ساتھ ساتھ نقائص سے بھی پاک ہو اور اس میں غلطی کا امکان بھی نہ ہو تو وہ صرف الٰہی بنیاد اور الٰہی محرک ہوسکتا ہے جو وحی کی بنیاد پر قائم اور استوار ہوتا ہے۔

یہاں اخلاقی فضائل کسی منفعت طلبی اور معاشرتی رفاہ کے حصول کا ذریعہ نہیں ہوتے۔ (اگرچہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ اخلاق امن وسکون، انفرادی ومعاشرتی رفاہ اور مادی فوائد کا بھی ضامن ہوتا ہے)۔

یہاں یہ بنیادی اہمیت معنوی محرک کی ہوتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ جو کمالِ مطلق اور مطلق کمال ہے اور تمام صفاتِ جمال وجلال کی جامع ہے، اخلاق کا مرکز ومحور ہوتی ہے۔ ہر انسان کوشش کرتا ہے کہ خود کو اس کمالِ مطلق کے نزدیک کرے۔ اس کے اسماء وصفات کے پرتو کو اپنی ذات کے اندر پیدا کرے اور روز بروز اس کے قریب تر ہوتا جائے۔ اس راہ پر چلنے والا انسان کسی حد کو قبول اور تسلیم نہیں کرتا بلکہ لامحدود کمال کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اس کا باطن کمالِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کی ذات وصفات کے انوار سے اس کا باطن منور ہوجاتا ہے اور وہ ہر لحظہ فضیلت وکمال کے اعلیٰ ترین درجات کا طالب ہوتا ہے۔ مادی مفادات اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے اخلاقی فضائل کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی اس تگ ودو کا محرک صرف اخلاقی ضمیر نہیں ہوتا بلکہ وہ ان سب سے بالاتر اور عظیم تر محرک کی بنیاد پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔

وہ عقل اور ضمیر کی بجائے وحی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہوکر اس راہ میں گامزن رہتا ہے۔

قرآن مجید واضح طور پر اخلاقی اعمال کو اللہ اور آخرت پر ایمان کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور بہت سی آیات میں عمل صالح کا ذکر ایمان کے بعد اور شجرۂ ایمان کے ثمر کے طور پر آیا ہے۔

قرآن مجید ایمان کو ایک ثابت اور پائیدار درخت سے تشبیہ دیتا ہے جس کی جڑیں بہت مضبوط اور انسان کے قلب وجان میں بہت گہرائی تک گئی ہوئی ہیں۔اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک انتہائی خوبصورت اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرۡعُهَا فِى السَّمَآءِ ۝ تُؤۡتِىۡۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍ بِاِذۡنِ رَبِّهَا ؕ

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو ایک پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی جس کی جڑیں پائیدار اور شاخیں آسمان میں ہیں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔''(ابراہیم:۲۴،۲۵)

ظاہری بات ہے کہ جس درخت کی جڑیں انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اور اس کی شاخیں انسان کے سارے وجود اور تمام اعضاء میں پھیلی ہوئی ہوں، وہ ایسا پھلدار درخت ہوگا جس پر کوئی خزاں نہیں آسکتی اور نہ ہی کوئی طوفان اسے اکھیڑ سکتا ہے۔

سورۂ والعصر میں یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے۔اس صورت میں تمام انسانوں کو خسارے اور نقصان میں بتایا گیا ہے اور صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو سب سے پہلے ایمان رکھتے ہیں، پھر عمل صالح کرتے ہیں، حق کی حفاظت کرتے ہیں اور صبر واستقامت کی تلقین کرتے ہیں۔

وَالۡعَصۡرِ ۝ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۝

یہ بات ایک اور دلچسپ انداز میں بھی بیان کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ

''اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتے تو تم میں سے کوئی بھی تزکیہ نہ کرسکتا لیکن اللہ جسے چاہتا ہے (اور قابل سمجھتا ہے) اس کا تزکیہ کرتا ہے۔''(نور:۲۱)

بنابرایں انسان کے اخلاق وعمل کی پاکیزگی اور مکمل تزکیہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔یہی بات سورہ اعلیٰ میں ان الفاظ میں بیان کی گئی:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسۡمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝

''یقیناوہ شخص فلاح پاگیا جس نے تزکیہ کیا، اپنے رب کے نام کو یاد کیا اور نماز ادا کی۔''(اعلیٰ:۱۴،۱۵)

ان آیات کے مطابق اخلاق وعمل کا تزکیہ اللہ کے ذکر اور نماز سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔اگر تزکیہ کا عمل ذکر خدا اور نماز سے

سیراب ہوتا رہے تو وہ پائیدار رہتا ہے اور اگر کسی اور بنیاد پر استوار ہو تو سست اور کمزور ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر تقویٰ اور اخلاقی عمل کے ایمان کے ساتھ مضبوط تعلق کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۹۳

''جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے رہے، ان پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو انہوں نے کھایا، اگر وہ تقویٰ اختیار کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں۔ پھر تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں، پھر تقویٰ اختیار کریں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

''(مائدہ:۹۳)

اس آیت میں کبھی تقویٰ کو ایمان اور عمل صالح پر مقدم رکھا گیا اور کبھی ان کے بعد اور کبھی نیکی پر مقدم رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مرحلہ ایسا ہوتا ہے جہاں اخلاقی اور عملی تقویٰ ایمان سے پہلے ہوتا ہے۔ یہ تقویٰ قبولیت ایمان کی آمادگی اور جستجوئے ایمان کی ذمہ داری کے احساس کا دوسرا نام ہے۔

اس کے بعد جب انسان حق کو پہچان کر اس پر ایمان لے آتا ہے تو تقویٰ کا ایک اعلیٰ درجہ اس کے وجود پر سایہ فگن ہو جاتا ہے اور مختلف اقسام کی نیکیوں کے انجام دینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طرح ایمان اور تقویٰ کے درمیان بہت قریبی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اخلاص کی مضبوط ترین اور اعلیٰ ترین بنیاد اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی بارگاہ میں احساس ذمہ داری ہے۔ ایمان جو مادی مسائل سے بہت بالاتر ہے اور اس کا کسی بھی چیز سے مبادلہ نہیں کیا جا سکتا، ہر وقت اور ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوتا، ہر چیز اس کے مقابلہ میں ناچیز اور حقیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ جس میں قربانی و ایثار کی اعلیٰ ترین مثالیں نظر آتی ہیں، اولیاء اللہ کی زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نیز یہی وجہ ہے کہ مادی معاشروں میں جہاں ہر چیز کو مادی اور ذاتی منفعت کی بنیاد پر پرکھا جاتا ہے، اخلاقی مسائل بہت کمزور دکھائی دیتے ہیں اور زیادہ تر وہیں نظر آتے ہیں جہاں مفادات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ خوش اخلاقی، ادب، ایمانداری، وفا، سخاوت اور دیگر تمام اخلاقی اقدار صرف اس وقت تک محترم ہوتی ہیں جب وہ مادی مفادات کے حصول میں مفید ثابت ہوں۔ جہاں مادی مفادات خطرے میں پڑ جائیں، وہاں یہ اخلاقی اقدار بھی غیر موثر ہو جاتی ہیں۔

ماں باپ جو بڑھاپے میں مفید نہیں رہتے، فراموش کر دیئے جاتے ہیں۔ انہیں بوڑھوں کے ہوسٹل میں داخل کر کے ان کے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔

بچے جیسے ہی کام کرنے کے قابل ہوتے ہیں، گھر سے باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔اس لئے نہیں کہ معاشی لحاظ سے خود کفیل ہوجائیں بلکہ اس لئے کہ ہمیشہ کے لیے فراموش ہوجائیں۔

شریک حیات سے محبت بھی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب وہ مادی فائدہ اور لذت پہنچانے کے قابل ہو، ورنہ وہ بھی فراموش کردی جاتی ہے۔اسی وجہ سے ان ممالک میں طلاق کی شرح خوفناک حد تک زیادہ ہے۔

مادی مکاتب فکر، جہاں اخلاق کی کوئی الٰہی بنیاد نہیں ہوتی، وہاں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے شوقِ شہادت ایک بے معنی چیز ہوتی ہے۔ان معاشروں میں ایک حد سے زیادہ سخاوت کو دیوانگی سمجھا جاتا ہے۔عفت اور پاکدامنی کو نااہلی، زہد اور دنیوی لذتوں سے بے رغبتی کو سادہ لوحی قرار دیا جاتا ہے۔

ان ممالک سے رونما ہونے والی طاقتیں اور ان کے حکمرانوں کی زندگی اس اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ان ترقی یافتہ اور طاقتور ممالک کا انسانی حقوق کے معاملے میں دوہرا معیار کس قدر وحشت انگیز ہے، جہاں انسانی حقوق ان کے مفادات کے لیے ذرا بھی نقصان دہ ہوں، وہ انہیں مکمل طور پر نظر انداز کردیتے ہیں اور اس اعلیٰ اخلاقی حقیقت کو اپنے مفادات پر قربان کردیتے ہیں۔

خطرناک ترین اور انسانی حقوق کے خلاف بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد یہاں پر پسندیدہ اور ہر دلعزیز نظر آنے لگتے ہیں۔اس کے برعکس پاکیزہ سیرت و کردار کے افراد جو حقوق انسانی کی حفاظت کے لیے میدان عمل میں اتر آتے ہیں لیکن ان کے کچھ مادی مفادات کے لیے خطرناک ہوتے ہیں، وہ انہیں ایسے شیاطین قرار دینے لگتے ہیں جنہیں ہر لحاظ سے کچلنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ایک ہی وقت میں دنیا کے ایک حصہ میں جمہوریت اور عوامی حاکمیت کے زبردست حامی نظر آتے ہیں تو دنیا کے کسی اور حصہ میں بدترین آمریت کی حمایت کررہے ہوتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک بنیادی اہمیت ان کے اپنے مادی مفادات کی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے پاس اخلاق کی کوئی واضح بنیاد نہیں ہوتی۔

یہاں پر ایک نکتہ بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ مادی مفادات کو سب کچھ سمجھنے والے یہ افراد صرف اپنے زمان و مکان پر نظر رکھتے ہیں۔انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ گزشتہ لوگوں نے کیا کیا اور آنے والے لوگ کیا کریں گے۔ہاں! اگر ان باتوں کا کسی حد تک ان کی موجودہ زندگی سے کوئی تعلق ہو تو اس حد تک وہ اسے اہمیت بھی دیتے ہیں، ورنہ ان کی منطق یہ ہوتی ہے کہ جب ہم نہ ہوں گے تو دنیا کو سیلاب بہالے جائے یا باقی رہے، ہمیں اس سے کیا سروکار!

لیکن جو خدا پرست ہوتے ہیں، وہ حیات بعد از موت کے عقیدہ کی بنیاد پر اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عدل میں حاضری کے احساس کی وجہ سے اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر کوئی نیکی دنیا میں چھوڑ جائیں گے جو ضرورت مند انسانوں کے کام آتی رہے گی تو اس کی برکتیں اگلے جہان میں بھی انہیں ملتی رہیں گی۔اس طرح ایسے افراد صرف اپنی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ہزاروں سال کے بعد بھی انسانوں کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

ایک مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ:

اذامات المؤمن انقطع عمله الا من ثلاث: صدقة جارية، اوعلم ينتفع به اوولد صالح يدعوله

''جب مومن مر جاتا ہے تو اس کا عمل رک جاتا ہے، سوائے ان تین چیزوں کے: صدقۂ جاریہ، وہ علم جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔''

(بحارالانوار، ۲:۲۲)

اس طرح آخرت پر ایمان صدقۂ جاریہ، مفید علمی خدمات اور نیک اولاد کی تربیت جیسے عظیم اخلاقی کاموں کا سبب بنتا ہے جبکہ مادہ پرستوں کے یہاں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

آیت اللہ مرتضیٰ مطہری شہید اپنی کتاب ''فلسفہ اخلاق'' میں خود پسندی کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

ذاتی خود پسندی، خاندانی خود پسندی اور قومی خود پسندی۔ اس کے بعد وہ ان تینوں کو اخلاق کے خلاف قرار دے کر مشہور فرانسیسی مفکر گوسٹاولوبون کی کتاب ''تمدنِ اسلام عرب'' سے اس کے ایک بیان کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں جس کا ذکر یہاں پر مفید معلوم ہوتا ہے:

گوسٹاولوبون اس بارے میں کہ اہل مشرق مغربی ثقافت کا اس طرح استقبال کیوں نہیں کرتے جیسے انہیں کرنا چاہئے، چند وجوہات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کا طرزِ زندگی ہمارے طرزِ زندگی سے مختلف ہے۔ ان کی زندگی سادہ ہے جبکہ ہم نے اپنی زندگی کی مصنوعی ضروریات بنا رکھی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل مغرب نے ان کے بارے میں جو ظالمانہ رویہ اختیار کیا، وہ اس سلسلہ کا سب سے اہم سبب ہے۔

اس کے بعد وہ ان مظالم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہل مغرب نے امریکہ، چین اور ہندوستان میں کئے۔ اس سلسلہ میں وہ خاص طور پر ''افیون کی جنگ'' کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے مراد انگریزوں کی وہ چال ہے کہ انہوں نے چینیوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے انہیں افیون کا عادی بنا دیا تا کہ ان کی مزاحمت کو توڑا جا سکے۔ چینی ان کی اس چال کو سمجھ گئے اور مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ آخر کار انگریز توپ اور بندوق کے ذریعے ان پر مسلط ہو گئے اور افیون کو ان میں رواج دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں چین میں سالانہ چھ لاکھ افراد افیون کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔

جب اخلاق کی بنیاد ایمان اور معنوی اقدار پر نہ رکھی جائے تو جہاں اخلاق اور مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوگا، وہاں اخلاق پسپا ہو جائے گا۔

اہم نکتہ

جو کچھ ہم نے اس بارے میں کہا کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان، اخلاق کی مضبوط بنیاد ہے۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اخلاقیات کو گہرائی بخشنے میں ہم ''عقل فطری'' کے کردار کا انکار کر رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا ضمیر انسان کے اندر اللہ کا نمائندہ ہے اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان کی طاقت سے بھی بہرہ مند ہو اور خود پرستی اور ہوائے نفس کی قید سے آزاد ہو۔

قرآن مجید میں بار بار اس مسئلہ پر زور دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۱۰۰﴾

''اور اللہ ان لوگوں پر رجس قرار دے دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''(یونس:۱۰۰)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۲۲﴾

''اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے (یعنی حق بات کو سنتے ہیں نہ حق بات کہتے ہیں)۔''(انفال:۲۲)

جو لوگ نماز کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴿۵۸﴾

''اور جب تم نماز کے لیے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور کھیل کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔''(سورہ مائدہ آیت ۵۸)

مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں اخلاقیات سے متعلق قرآنی نکتہ نظر کا خلاصہ واضح ہو جاتا ہے۔

پانچواں باب

اخلاق اور آزادی

اس سوال پر بہت بحث وتمحیص ہوتی رہی ہے کہ کیا اخلاق انسان کی آزادی کو محدود کر دیتا ہے اور یہ کہ یہ محدودیت انسان کے لیے مفید ہے یا مضر؟ ہمارا خیال یہ ہے کہ ان بحثوں کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ آزادی کے مفہوم کو درست طرح سے نہیں سمجھا گیا۔ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی جاتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ اخلاق انسان کو محدود کر دیتا ہے، لہٰذا اس کی استعداد وصلاحیت پروان نہیں چڑھ سکتی۔

۲۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق انسان کی فطری خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے تاکہ انسان حقیقی کمال تک پہنچ سکے، حالانکہ اگر یہ خواہشات غیر ضروری ہوتیں تو اللہ تعالیٰ انہیں پیدا کیوں کرتا۔

۳۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اخلاق لذت پسندی کے خلاف ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا مقصد ہی حصولِ لذت ہے۔

۴۔ بعض اوقات اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر غیر آزاد ہے اور ہمیشہ جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، لہٰذا اخلاقی پند ونصیحت کی نوبت ہی نہیں آسکتی۔

۵۔ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ دینی اخلاق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر رکھی جاتی ہے جو کہ بذاتِ خود خوف یا طمع کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی غیر اخلاقی ہیں۔

انسان کی متضاد قسم کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو آزادی کے مفہوم کو صحیح طرح سے سمجھا گیا ہے اور نہ ہی دینی اخلاق، خصوصاً اسلامی اخلاق اور اس کی بنیادوں کے بارے میں صحیح غور وفکر کیا گیا ہے۔

اسی وجہ سے ہم سب سے پہلے آزادی کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

انسان کیوں اپنے وجود کی گہرائی سے آزادی کا خواہاں ہے؟ انسان کیوں آزاد ہو؟ انسان کے جسم اور روح کی پرورش میں آزادی کا کیا کردار ہے؟ مختصر یہ کہ آزادی کا فلسفہ کیا ہے؟

ان تمام سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں اور خصوصیات پنہاں ہیں جو آزادی کے بغیر نشوونما نہیں پاسکتی ہیں۔ چونکہ انسان ان صلاحیتوں کی پرورش اور نشوونما کا خواہش مند ہے، لہٰذا وہ آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ اس لیے کہ آزادی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزادی جو ان تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ضروری ہے، ہر قسم کی قید وشرط سے آزاد

آزادی ہے یا محدود اور مشروط آزادی ہے؟

اس بات کو ایک دو مثالوں کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے۔

ایک باغبان کی مثال پر غور کریں جو مختلف قسم کے پھلوں اور پھولوں کی پرورش کے لیے بیج بوتا ہے اور بروقت پانی دیتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر یہ درخت اور پودے آزاد فضا میں نہ ہوں، انہیں سورج کی گرمی اور روشنی اور بارش سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملے، یا اس کی جڑیں کسی پتھر سے ٹکرا کر زمین کے اندر گہرائی تک نہ جاسکیں تو باغبان کو کوئی پھل یا پھول حاصل نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ درخت کے پھلدار ہونے کے لیے جڑوں، تنے اور شاخوں کی آزادی ضروری ہے۔

لیکن بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ کسی درخت میں غیر ضروری شاخیں پیدا ہو جائیں یا درخت اپنے اصل راستے سے بھٹک جائے یا ٹیڑھا ہو جائے۔ ایسی صورت میں باغبان اپنا مخصوص قینچہ اٹھا کر نہایت بے رحمی سے غیر ضروری شاخوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کوئی عقلمند اس باغبان پر اعتراض نہیں کرسکتا کہ اس نے درخت کی شاخوں کو کیوں آزادی سے بڑھنے نہیں دیا۔

اسی طرح وہ ٹیڑھے تنے کو ایک سیدھی اور مضبوط لکڑی سے باندھ دیتا ہے تاکہ وہ اپنی صحیح سمت کی طرف بڑھ سکے۔ یہاں بھی کوئی عقلمند اس پر یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ اس نے درخت کو کیوں پابزنجیر کر دیا اور کیوں اس کی آزادی کو محدود کر دیا۔ اس لیے کہ ایسے ہر اعتراض کے جواب میں باغبان یہ کہے گا کہ درخت کے پھل دینے کے لیے اس کی آزادی ضروری ہے لیکن اس مقصد سے بھٹکنے کی آزادی نہیں دی جاسکتی۔

انسان کے بارے میں بھی یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس میں بھی بے پناہ غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ اسے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی آزادی ہے لیکن اسے یہ آزادی ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ وہ ان صلاحیتوں کو تباہ کر دے۔

جو لوگ آزادی سے ہر قسم کی مادر پدر آزاد، آزادی مراد لیتے ہیں، انہوں نے آزادی کے معنی کو نہیں سمجھا ہے۔ آزادی کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ انسان اعلیٰ ترین مادی یا معنوی مقاصد کے حصول کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ انسان اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے سڑک پر چلنے میں آزاد ہے۔ لیکن اس آزادی کے یہ معنی ہرگز نہیں لیے جاسکتے کہ انسان ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہ کرے۔ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ چوراہے پر سرخ بتی دیکھ کر رکنا اور ٹریفک کے دوسرے قوانین کی پابندی کرنا گاڑی چلانے کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو سب اس پر ہنسیں گے اور اسے کہیں گے کہ آزادی کو کسی قانون کا پابند ہونا چاہئے تاکہ انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکے، نہ یہ کہ اموال اور صلاحیتیں ضائع ہوں، جانوں کا نقصان ہو اور انسان اپنے مقصد تک نہ پہنچ پائے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سی آزادیاں جھوٹی آزادیاں ہیں اور درحقیقت امارت اور غلامی ہیں۔ جو جوان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے منشیات کا عادی ہو جاتا ہے، درحقیقت وہ قید میں ہے۔ وہ آزادی جو اخلاقی قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہو، وہی

حقیقی آزادی ہے جو انسان کو ہوائے نفس کی قید سے آزادی دلاتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان کس قدر معنویت کا حامل ہے:

ان تقوی الله مفتاح سداد، و ذخیرة معاد، و عتق من کل ملکة، و نجاة من کل هلکة

''تقویٰ بند دروازہ کی چابی، آخرت کا ذخیرہ، ہر قسم کی غلامی سے آزادی اور ہر قسم کی ہلاکت سے نجات ہے۔'' (نہج البلاغہ: خطبہ ۳۲۰)

مندرجہ بالا تجزیہ اور مثالوں سے حقیقی آزادی اور جھوٹی آزادی کا فرق واضح ہو جاتا ہے جس کی مدد سے آزادی جیسی مقدس حقیقت کے غلط استعمال کو روکا جا سکتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق فطری خواہشات کو کچل دیتا ہے اور اگر فطری خواہشات غیر ضروری ہوتیں تو اللہ انہیں پیدا کیوں کرتا!

انسان کی فطری خواہشات درحقیقت بارش کے ان حیات بخش قطروں کی مانند ہیں جو آسمان سے برستے ہیں۔ بلاشبہ اگر یہ غیر ضروری ہوتے تو اللہ تعالیٰ انہیں نازل نہ کرتا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم قطروں کو اس بات کی اجازت دیں کہ وہ اکٹھے ہو کر تباہ کن سیلاب کی شکل اختیار کر لیں۔ عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے پانی کو ڈیم بنا کر روک لیا جائے اور اس الٰہی نعمت کو ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے زراعت کی ترقی کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ انسان کی فطری خواہشات بھی بارش کے قطروں کی مانند ہیں۔ اگر انہیں کسی منصوبہ بندی کے تحت مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو وہ ایک تباہ کن سیلاب کی طرح انسان کی ہر چیز کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے۔

مندرجہ بالا بحث سے بہت واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاق انسان کو محدود کرتا ہے نہ اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے اور نہ ہی فطری خواہشات کو کچلتا ہے۔ اخلاق کا کام یہ ہے کہ آزادی کو سعادت کی راہ میں بروئے کار لائے اور فطری خواہشات کو کمال مطلوب تک پہنچنے میں رہنمائی فراہم کرے۔

آزادی کی اس تشریح سے، جو ہمارے خیال میں آزادی کی صحیح تشریح ہے، اخلاق کے مخالفین کے بہت سے اعتراضات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عقیدۂ جبراورغیراخلاقی مسائل

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ارادہ کی آزادی، ایمان اوراخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اس لئے کہ، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اگرانسان کی آزادی کی نفی ہوجائے تو تمام اخلاقی مفاہیم کی عمارت منہدم ہوجاتی ہے۔اسی لیے ادیانِ الٰہی جو انسان کی تہذیب نفس اوراخلاقی تربیت کے فریضہ کوانجام دیتے ہیں، انسانی آزادی کے زبردست حامی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجیدان آیات سے بھرا پڑا ہے جوانسانی ارادے کی آزادی کوثابت اور جبر کی نفی کرتی ہیں۔اس قسم کی آیات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں اور جبر واختیار کے بارے میں ان پر بحث کی گئی ہے۔

بنیادی طور پر امر ونہی، نیکی اوراطاعت کی دعوت اوراللہ کی نافرمانی سے رکنے کا حکم، سزا وجزا، اللہ کی عدالت، قوانین کا نفاذ اورحدوداالٰہی کا نفاذ، سب انسانی ارادے کی آزادی پر دلالت کرتے ہیں۔

اگر قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے جبر کے قائلین اپنے نظریہ کے حق میں استدلال کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات کے حقیقی اور صحیح مفہوم کو سمجھا نہیں گیا ہے۔اس لیے کہ یہ آیات تفویض کی نفی کرتی ہیں مگران سے جبر کا اثبات نہیں ہوتا۔

عقیدۂ جبر ہر قسم کی غیراخلاقی روش اختیار کرنے کا ایک اہم سبب ہوسکتا ہے۔ ہر گناہگار انسان اس بات کو بہانہ بنا کر کہ اس کی قسمت کا فیصلہ روزِاول سے یہی کر دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ اس الٰہی فیصلہ کے خلاف نہیں جاسکتا، گناہ اور بدکاری کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے تاریخ میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بہت سے گناہگار انسان اسی عقیدہ کی بنیاد پر اپنے گناہوں کا جواز پیش کرتے ہوئے اپنے آپ کو معذور گردانتے تھے۔ان کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ ہم اچھے یا برے، اس میں ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، کاتب تقدیر نے روزِ اول سے ہماری تقدیر ہی ایسی بنادی ہے۔لہٰذا نہ نیک لوگوں کو اپنی نیکی پر فخر کرنا چاہئے اور نہ ہی برے لوگوں کو ان کی برائی پر سرزنش کی جانی چاہئے۔

اسی بنیاد پر تمام انبیاءعلیہم السلام خصوصاً رسولؐ اسلام نے اخلاقیات کی بنیادوں کی مضبوطی اور تزکیہ نفس کے لیے سب سے پہلے انسانی ارادے کی آزادی کا اثبات کیا۔

بہرحال جبر واختیار، قضا وقدر، ہدایت وضلالت، سعادت وشقاوت اوران جیسے دیگر مسائل مستقل اور مفصل موضوعات ہیں۔مستقبل میں تفسیر موضوعی کے مباحث میں ہم انہیں زیر بحث لائیں گے۔ یہاں ہمارے پیش نظر صرف اس مسئلہ کی نشاندہی کرنا اوراخلاقی مسائل پراس کے اثرات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

جولوگ حصولِ لذت کو ہی زندگی کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے اخلاقیات کو اس کے منافی قرار دیتے ہیں[1]، وہ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ اگر ہم لذت کو صرف مادی لذت میں محدود کر دیں اور روحانی لذتوں کو نظر انداز کر دیں، تب بھی اخلاقی اصولوں کی پابندی کے بغیر مادی لذت کا حصول ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قید و شرط لذت طلبی کا نتیجہ بہت دردناک ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دردناک نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ بہت سی نقد لذتوں کو ترک کر دیا جائے۔

یہ نکتہ نظر پیش کرنے والے اگرچہ گزشتہ دور کے فلاسفہ میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کی یہ بات منشیات کے عادی اس شخص کی بات کی مانند ہے جسے یہ کہا جائے کہ تمہارا آج کا نشہ مستقبل میں تمہارے لیے بہت برے نتائج لے کر آئے گا تو وہ جواب دیتا ہے کہ موجودہ لمحہ کو غنیمت جانو، آج عیاشی کر لو، کل کس نے دیکھا ہے۔

لیکن جب قلبی، اعصابی اور دماغی امراض منشیات کے استعمال کے نتیجہ میں اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ اپنی اس منطق پر حسرت و افسوس کا اظہار کرتا ہے لیکن اس وقت بدقسمتی سے عموماً واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔

عفت، امانت، صداقت اور جوانمردی جیسی اقدار کے بارے میں اخلاقی نصائح کی یہی حیثیت ہے۔ جس معاشرہ میں خیانت اور بدعنوانی عام ہو جائے، اس معاشرہ کے لوگوں کو کونسی لذت میسر آ سکتی ہے۔ بخل جیسی صفت جس معاشرہ پر حاکم ہو اور ہر شخص اپنی ذات کے لیے لذت کی جستجو کر رہا ہو، اس معاشرے کے لوگ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس معاشرہ کا ہر فرد تنہا ہوتا ہے اور مشکلات کا تنہا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرہ میں سخاوت عام ہو، وہاں اگر ایک شخص کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو سب اس کی خبر گیری کرتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں کوئی تنہا نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی مشکلات کے سامنے عاجز و ناتواں ہوتا ہے۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف ہم قرآن شریف اور احادیث کی روشنی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام اخلاقی صفات کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک معنوی اور دوسرا مادی۔ اگر اس کے معنوی اثر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس کے مادی فوائد ہی اس قدر وسیع ہیں کہ سب لوگوں پر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان اخلاقی اصولوں کو اپنا لیں تاکہ یہ دنیا ایک جنت بن جائے جس میں سب لذت میں ڈوبے ہوئے ہوں اور اخلاقی برائیوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والے جہنم سے محفوظ ہوں۔

آخر میں ان لوگوں کے نکتہ نظر کا جائزہ لیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دینی اخلاق اللہ کی اطاعت پر مبنی ہے اور اللہ کی اطاعت خوف اور طمع پر مبنی ہے جو کہ بذات خود غیر اخلاقی صفات ہیں۔

اس نکتہ نظر پر دو پہلوؤں سے تنقید کی جا سکتی ہے۔

خوف اور طمع کی اصطلاح کا استعمال یہاں پر درست نہیں ہے۔ اس کی بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ اخروی

---

[1] اس مکتبہ فکر کا ایک معروف علمبردار آر لیسٹیپ ہے جو زمانہ قبل از مسیح میں رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خیر سے مراد لذت ہے، شر سے مراد رنج و الم ہے۔ انسان کا حقیقی مقصد زندگی دنیوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہے اور انسان کو اس کے اچھے یا برے نتائج کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ (علم اخلاق یا حکمت عملی: ۲۴۳)

سعادت کے حصول اور عدل الٰہی کی میزان سے سزا سے بچنے کی خاطر اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپناتے ہیں اور یہ بات ہرگز غیر اخلاقی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ فانی زندگی کی عارضی لذتوں کو ابدی زندگی پر قربان کر دیتے ہیں اور بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے سے فائدے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص خیانت اور جھوٹ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ذلت و رسوائی سے بچنے کی خاطر ان دو برائیوں سے پرہیز کرتا ہو تو کیا اس کا یہ عمل غیر اخلاقی کہلائے گا؟ اگر کوئی شخص اپنی صحت و سلامتی کے پیش نظر شراب خوری سے اجتناب کرتا ہو اور منشیات سے دور رہتا ہو تو کیا اس کا یہ عمل غیر اخلاقی کہلائے گا؟ اسی طرح اگر کوئی شخص لوگوں سے ادب، تواضع اور محبت کے ساتھ پیش آتا ہو تا کہ لوگ اس سے دور نہ جائیں اور وہ زندگی میں تنہا نہ رہ جائے تو کیا اسے غیر اخلاقی عمل کہا جائے گا؟

مختصر یہ کہ ہر اخلاقی عمل کے مادی فوائد بھی ہوتے ہیں۔ ان فوائد کے حصول کی کوشش کو طمع کہنا مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح غیر اخلاقی اعمال کے نتیجہ میں رونما ہونے والے مضر اثرات سے بچنے کو خوف اور بزدلی جیسی غیر اخلاقی صفات نہیں کہنا چاہیے۔

چھٹا باب

قرآن مجید میں اخلاق کے بنیادی اصول

اس بحث کا آغاز کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم دوسرے مکاتب فکر میں اخلاق کے بنیادی اصولوں پر ایک نظر ڈالیں۔

زمانہ قدیم کے فلاسفہ کا ایک گروہ جنہیں علم اخلاق کے بانی قرار دیا جاتا ہے، اخلاق کے چار بنیادی اصولوں کے قائل تھے۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے تمام اخلاقی فضائل کو ان چار چیزوں میں سمیٹ دیا تھا:

۱۔حکمت ۲۔عفت ۳۔شجاعت ۴۔عدالت

کبھی کبھار وہ ان میں خدا پرستی کا اضافہ بھی کر دیتے تھے۔اس طرح مجموعی طور پر اخلاق کے بنیادی اصولوں کی تعداد پانچ ہو جاتی تھی۔

اس مکتبہ فکر کا بانی سقراط کو قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کا عقیدہ یہ تھا کہ:

''نیکی اور اخلاق کا دارومدار نیک و بد کی پہچان (یعنی دانائی) پر ہے اور علم و دانش ''حکمت'' کے علاوہ کوئی فضیلت مطلق نہیں ہے۔ جب علم کا تعلق اس بات سے ہو کہ انسان کو کن چیزوں سے ڈرنا چاہئے اور کن چیزوں سے نہیں ڈرنا چاہیے تو اس دانائی کو ''شجاعت'' کہتے ہیں۔ جب اس کا تعلق انسان کی نفسانی خواہشات سے قائم ہو جائے تو اسے ''عفت'' کہا جاتا ہے۔ جب اس کا تعلق انسانوں پر حکم اور قوانین سے قائم ہو جائے تو اسے عدالت کہتے ہیں۔ اگر انسان کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کے حوالہ سے اس کی ذمہ داریوں پر غور کیا جائے تو یہ ''خدا پرستی'' اور ''دینداری'' ہے۔ یہ پانچ فضائل یعنی حکمت، شجاعت، عفت، عدالت اور خدا پرستی سقراط کے مکتبہ فکر میں اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔'' (سیر حکمت در اروپا، ۱:۱۸)

بہت سے مسلمان علماء جنہوں نے علم اخلاق پر کتب لکھی ہیں یا اس سلسلہ میں بحث کی ہے، نہ صرف ان چار یا پانچ اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اس میں مزید تحقیق اور موشگافی کر کے ان کی بنیاد کو اور بھی پختہ کیا ہے اور انہیں اپنی اخلاقی بحث کی بنیاد قرار دیا ہے۔

وہ اس بارے میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کے نفس اور روح میں تین قوتیں پائی جاتی ہیں:

۱۔ قوۂ ادراک یعنی حقائق کو پہچاننے والی قوت۔

۲۔ قوۂ جاذبہ یعنی یہ وہ قوت ہے جو حصولِ منافع کے لیے سرگرم عمل رہتی ہے جسے دوسرے الفاظ میں ''شہوت'' کہا جاتا ہے۔ (البتہ اس سے مراد صرف جنسی شہوت نہیں ہے بلکہ انسان کی ہر قسم کی خواہشات اس کے زمرے میں آجاتی ہیں)۔

۳۔ قوۂ دافعہ یعنی یہ وہ قوت ہے جو نقصانات اور خطرات کو دور کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس قوت کو دوسرے الفاظ میں

''غضب'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ ان تینوں قوتوں کے اعتدال کو اخلاقی فضائل شمار کرتے ہیں جو بالترتیب حکمت، عفت اور شجاعت کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں کہ جب شہوت اور غضب قوۂ عقل کے تابع ہوں تو جو کیفیت انسان کی ہو جاتی ہے، اسے ''عدالت'' کہا جاتا ہے جو کہ چوتھا اخلاقی اصول ہے۔

بالفاظ دیگر مذکورہ بالا تینوں قوتوں میں ہر ایک کا نکتہ اعتدال پر ہونا بذاتِ خود فضیلت ہے جن کا نام حکمت، عفت اور شجاعت ہے جبکہ ان سب کا اس طرح جمع ہو جانا کہ شہوت اور غضب قوۂ ادراک کے تابع ہو جائیں تو یہ ایک اور فضیلت ہے جسے عدالت کہتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی انسان میں شجاعت پائی جاتی ہے مگر اس کا مناسب موقع پر استعمال نہیں ہوتا۔(مثلاً ان کی شجاعت بیہودہ جنگوں میں استعمال ہوتی ہے)۔ایسی صورت میں شجاعت تو موجود ہوتی ہے لیکن عدالت موجود نہیں ہوتی۔لیکن اگر یہ فضیلت جسے شجاعت کہتے ہیں، کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے بروئے کار لائی جائے، یعنی یہ حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو عدالت معرضِ وجود میں آتی ہیں۔

اس طرح مسلم مفکرین کا یہ گروہ انسان کے تمام اخلاقی فضائل کو ان چار بنیادی فضائل کے تابع قرار دیتا ہے۔ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی اخلاقی فضیلت ایسی نہیں ہے جو ان چار فضائل میں سے کسی ایک کی شاخ نہ ہو۔اس کے برعکس تمام اخلاقی رذائل انہی چار فضائل اخلاقی سے افراط وتفریط کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے ''احیاء العلوم''، ''محجۃ البیضاء'' اور دیگر معروف کتب اخلاق کی طرف رجوع فرمائیں۔

تنقید و تحقیق

اخلاقی فضائل کو مذکورہ بالا چار بنیادی فضائل میں تقسیم کرنے کی کوئی مسلمہ اسلامی بنیاد اور اساس نظر نہیں آتی بلکہ یہ ان تحقیقات کا نتیجہ ہے جو مسلم مفکرین نے حکمائے یونان کے نظریات پر کی ہیں اور ان کے نقائص کو برطرف کر کے انہیں مکمل کیا ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ایک روایت میں آتا ہے:

الفضائل اربعة اجناس: احدها الحكمة و قوا مها فى الفكرة، و الثانى العفة وقوامها فى الشهوة، و الثالث القوة و قوامها فى الغضب، و الرابع العدل و قوامه فى اعتدال قوى النفس

''فضائل کی چار اقسام ہیں، ان میں سے ایک حکمت ہے جس کی جڑیں غور وفکر میں ہیں، دوسری عفت

ہے جس کی جڑیں شہوت میں ہیں، تیسری قوت ہے جس کی جڑیں غضب میں ہیں، چوتھی عدالت ہے جس کی بنیاد تمام قوائے نفسانی کا اعتدال ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۸۱)

یہ حدیث اگرچہ علمائے اخلاق کی مذکورہ تقسیم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے مگر کافی حد تک اس کے قریب ضرور ہے۔ لیکن یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند ضعف سے خالی نہیں ہے۔

بہرحال علمائے اخلاق نے فضائل کو جس طرح مندرجہ بالا چار فضائل میں تقسیم کیا ہے، اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱۔ بعض عادات کو جو یقیناً فضائل اخلاقی کا حصہ ہیں، کو مندرجہ بالا چار اخلاقی فضائل کے ذیل میں قرار دینا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حسن ظن ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی ضد بدگمانی اور سوءظن ہے۔ اگر اس کو مندرجہ بالا چار فضائل میں سے کسی ایک کے تحت قرار دینا چاہیں تو اسے حکمت کے ذیل میں رکھا جائے گا جبکہ حسن ظن کو کسی بھی طور پر حکمت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن ظن اور چیزوں کی صحیح شناخت دو الگ چیزیں ہیں بلکہ کبھی تو ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ بعض اوقات ظنی قرائن اس بات کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں گناہ یا جرم کیا ہے مگر انسان حسن ظن کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔

اسی طرح مصائب پر صبر اور نعمتوں پر شکر فضائل اخلاق میں شمار ہوتے ہیں، حالانکہ نہ تو انہیں قوۂ ادراک کے تحت قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ قوۂ شہوت و غضب کے تحت۔ خاص طور پر اگر صابر و شاکر شخص ان صفات کے کسی فائدے کی بجائے خود انہی کو فضیلت سمجھتے ہوئے انہیں اپنائے ہوئے ہو۔

اسی طرح اور بھی بہت سی صفات ہو سکتی ہیں جو فضائل کے زمرے میں آتی ہیں مگر انہیں مندرجہ بالا چار میں سے کسی ایک فضیلت کے تحت درج کرنا بہت مشکل ہے۔

۲۔ مذکورہ تقسیم میں حکمت کو بنیادی اخلاقی فضائل میں شمار کیا گیا ہے اور اس کے معاملہ میں افراط و تفریط کو رذائل میں شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکمت حقائق کی شناخت کا فرض انجام دیتی ہے جبکہ اخلاق کا تعلق جذبات، جبلت اور ملکات نفس سے ہے، نہ کہ عقلی ادراک سے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی سوچ رکھنے والے افراد کو خوش اخلاق نہیں کہا جا سکتا۔

اخلاق عقل کے لیے ایک ہتھیار تو ہو سکتا ہے لیکن عقل اور ''اچھائی کی پہچان'' کو اخلاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر عقل اور قوۂ ادراک انسانی جبلت اور جذبات کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کو مناسب شکل و صورت دیتے ہیں جبکہ اخلاق ان کیفیات کا نام ہے جو ان فطری خواہشات اور جذبات کے اوپر عارض ہوتی ہیں۔

۳۔ یہ بات اگرچہ عام طور پر صحیح مانی جا سکتی ہے مگر اس کے باوجود ایسی چیزیں بھی نظر آتی ہیں جن میں افراط یعنی زیادہ روی قابل تصور نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قوۂ عقلیہ جس قدر زیادہ ہو، بہتر ہے اور اس میں افراط یعنی زیادہ روی قابل تصور نہیں ہے۔ بعض

لوگ جو ''جربزہ'' کو قوۂ عقلیہ کے افراط کا نام دیتے ہیں، ان کا اندازِ فکر صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''جربزہ'' عقل و ذہانت کی کثرت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک انحراف اور کج روی ہے جو مسائل کے فیصلہ میں جلد بازی کے نتیجہ میں رونما ہوتا ہے۔ (جربزہ سے مراد انسان کی وہ ذہنی اور عقلی کیفیت ہے جس کی مدد سے وہ حق کو باطل اور باطل کو حق، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھاتا ہے جس طرح عدالتوں میں بعض تیز اور ذہین وکیل کیا کرتے ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقل اور فکر کی بلندی میں اس مقام پر تھے کہ آپؐ کو ''عقلِ کل'' کہا جاتا ہے۔ کیا یہ خلاف فضیلت ہے؟

یہ بات بجا ہے کہ بعض اوقات زیادہ عقل اور ذہانت مشکلات اور تکالیف کا سبب بن جاتی ہے جبکہ غافل اور نادان افراد ان سے محفوظ رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا شمار فضائل میں ہوتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ تقسیم کے قائلین نے ''عدالت'' کو فضیلت اور اس کے افراط و تفریط کو ظلم کرنے اور ظلم برداشت کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ ظلم کرنا یا ظلم برداشت کرنا کسی بھی لحاظ سے ''عدالت'' میں افراط و تفریط نہیں ہیں بلکہ ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فضائل کو رذائل کے افراط و تفریط کے مقابل حد اعتدال سے تعبیر کرنا اگرچہ غالباً صحیح ہے لیکن اسے ایک کلیہ قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اخلاقی مباحث میں اسے کوئی بنیادی مقام دیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ

علمائے قدیم نے جن چار چیزوں کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا ہے، وہ درحقیقت فلاسفۂ یونان کے طرزِ فکر کی تکمیل ہے۔ اسے اخلاقی صفات کی درجہ بندی کا ایک جامع معیار قرار نہیں دیا جاسکتا، اگرچہ بہت سے اخلاقی مسائل پر یہ صادق بھی آتا ہے۔

قرآن کے اخلاقی اصول

اب ہم قرآن کے اخلاقی اصولوں کے بارے میں بحث کی طرف واپس آتے ہیں۔ جس طرح عام طور پر کتابوں کے مباحث کو باقاعدہ ابواب اور فصول کی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے، قرآن اس طرح کی جمع کردہ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ آسمانی وحی کا ایک مجموعہ ہے جو بتدریج اور مختلف صورتوں اور حالات کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوا۔ اس کے باوجود تفسیر موضوعی کے اسلوب کی رو سے اسے یہ شکل دی جاسکتی ہے۔ قرآن شریف کی تمام آیات کی تقسیم کے پیش نظر، اخلاق کے مبادیات کو مندرجہ ذیل چار شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۲۔ مخلوق سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۳۔ اپنی ذات سے متعلق اخلاقی مسائل۔

۴۔ دنیا اور کائنات سے متعلق اخلاقی مسائل۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا، اس کے حضور خشوع وخضوع اور اس کے احکام کے سامنے راضی برضا رہنا اور سر تسلیم خم کرنا ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق پہلے شعبہ سے ہے۔

تواضع، فروتنی، ایثار وقربانی، محبت وخوش اخلاقی اور ہمدردی ورحم دلی جیسے مسائل کا تعلق دوسرے شعبہ سے ہے۔

دل کو ہر قسم کی ناپاکی اور آلودگی سے پاک کرنا، مشکلات ومصائب پر ثابت قدم رہنا، ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق تیسرے شعبہ سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متعلق اسراف وتبذیر نہ کرنا اور اس جیسے مسائل کا تعلق چوتھے شعبہ سے ہے۔

ان چاروں اخلاقی بنیادوں کی جڑیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور آئندہ مباحث میں ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اشارہ کریں گے۔

البتہ یہ چار شعبے معروف فلسفی ملا صدرا کی مشہور کتاب ''اسفار'' کے چار شعبوں سے مختلف ہیں۔ ملا صدرا اور ان کے ہم فکر انسان کو ایک مسافر اور خودسازی کو سیر وسلوک سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق عارف انسان کو چار سفر درپیش ہوتے ہیں:

۱۔ مخلوق سے حق کی طرف سفر (السفر من الخلق الی الحق)۔

۲۔ حق کے ساتھ حق میں سفر (السفر بالحق فی الحق)۔

۳۔ حق کی مدد سے حق کی طرف سے خلق کی طرف سفر (السفر من الحق الی الخلق بالحق)۔

۴۔ مخلوق کے اندر حق کی طرف سفر (السفر بالحق فی الخلق)۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ اسفارِ اربعہ یا سیر وسلوک الی اللہ کے چار مراحل ایک مختلف راستے کو طے کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بعض حصوں اور اخلاق کے مذکورہ چار شعبوں میں کچھ شباہتیں بھی پائی جاسکتی ہیں۔

قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے اصول ان میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سورۂ لقمان کی آیات ہیں جو اس آیت سے شروع ہوتی ہیں:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ

''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور بذریعہ الہام حکم دیا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو۔'' (لقمان: ۱۲)

اس طرح معارف وعقائد کی گفتگو میں سب سے پہلے نعمتیں بخشنے والے کے شکر کی بات کی گئی ہے۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ شکر منعم خدا شناسی کا پہلا قدم ہے جیسا کہ علم عقائد وعلم کلام کے علماء نے وضاحت سے کہا ہے کہ شناخت خدا کا بنیادی محرک شکر نعمت کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ جب انسان آنکھ کھولتا ہے تو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ ایسے میں اس کا

ضمیر بلا فاصلہ اسے ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی شناخت اور معرفت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہی معرفۃ اللہ کا پہلا قدم ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں توحید کا ذکر کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

''اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

گفتگو کے ایک اور مرحلہ پر آخرت کا ذکر آتا ہے جو کہ معارف دینی میں دوسرے اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں لقمان اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ

''اے میرے بیٹے! اگر خردل کے دانے کے برابر بھی (کوئی اچھا یا برا عمل) ہو اور کسی چٹان کے اندر یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو، اللہ (قیامت کے دن حساب کے لیے) اسے حاضر کر دے گا۔''

(لقمان:۱۶)

اس کے بعد اخلاقیات اور حکمت عملی کے اصولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے شکر کا حکم دینے کے بعد ماں باپ کا احترام اور ان کی شکر گزاری:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ (لقمان:۱۴)

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے، یہ کہ تو اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔''

۲۔ نماز، اللہ تعالیٰ سے تعلق، اس کے حضور میں خشوع و خضوع اور دعا کی اہمیت:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ

''نماز قائم کرو۔'' (لقمان:۱۷)

۳۔ امر بالمعروف اور نہی از منکر:

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔'' (لقمان:۱۷)

۴۔ زندگی کے تلخ حوادث پر صبر کرنا:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ

''جو مصیبت تمہیں پیش آئے، اس پر صبر کرو۔'' (لقمان: ۱۷)

۵۔ لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

''اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر۔'' (لقمان: ۱۸)

۶۔ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے ساتھ تواضع وفروتنی اور ترک تکبر:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸

''اور زمین پر اترا کر مت چل، بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (لقمان: ۱۸)

۷۔ بول چال میں میانہ روی اور اعتدال:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ

''اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر۔'' (لقمان: ۱۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فضائل اخلاقی کا ایک بڑا حصہ ان آیات میں حکمت لقمان کے نام سے بیان ہوا ہے اور آیت ۱۳ سے آیت ۱۹ تک شکر، صبر، خوش اخلاقی، تواضع میانہ روی، امر بالمعروف، نہی از منکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سورۂ انعام کی تین آیات (۱۵۱، ۱۵۳) میں دس اہم احکام بیان کئے گئے ہیں جن میں اخلاقیات کا ایک بڑا حصہ بیان کر دیا گیا ہے، جیسے بچوں، یتیموں اور عام لوگوں پر ظلم وستم سے اجتناب، ہر ایک کے ساتھ عدل سے پیش آنا، رشتہ داروں اور دوستوں کی تعصب پر مبنی غیر عادلانہ حمایت سے اجتناب، ظاہری اور باطنی برائیوں سے اجتناب، ماں باپ کے حقوق کا احترام، تفرقہ پردازی سے پرہیز اور ہر قسم کے شرک سے اجتناب۔ [1]

اصولِ اخلاق اسلامی اور احادیث

اسلامی احادیث میں اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کو حدیث کے اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا گیا ہے جو حکمائے یونان کی روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث جو کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، معروف صحابی امام سماعہ بن مہران کہتے

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ میں ان آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب کی ایک جماعت آپؑ کی خدمت میں حاضر تھی کہ عقل وجہل کی گفتگو شروع ہوگئی۔آپؑ نے فرمایا:

''عقل اور جہل کے لشکروں کو پہچانو تا کہ ہدایت پاسکو۔''

میں نے عرض کیا:''میں آپؑ پر قربان ہوجاؤں، جب تک آپؑ بیان نہ فرمائیں، ہم کیسے جان سکتے ہیں؟''

امام علیہ السلام نے فرمایا:''اللہ نے پہلے عقل کو پیدا کیا، پھر جہل کو۔(عقل اطاعت کے راستہ پر چلی اور جہل معصیت کی راہ پر)اللہ نے عقل کو ۷۵ لشکر دیئے اور انہی کی ضد ۷۵ لشکر جہل کو دیئے۔''

پھر آپؑ نے عقل وجہل کے لشکروں کو اس طرح بیان فرمایا:

الخیر وھو وزیر العقل	''نیکی عقل کی وزیر ہے۔''
وجعل ضدہ الشر وھو وزیر الجھل	''اس کی ضد برائی ہے جو جہل کی وزیر ہے۔''
والایمان وضدہ الکفر	''ایمان اور اس کی ضد کفر ہے۔''
والتصدیق وضدہ الجمود	''تصدیق اور اس کی ضد انکار ہے۔''
والرجاء وضدہ القنوط	''امید اور اس کی ضد ناامیدی ہے۔''
والعدل وضدہ الجور	''عدالت اور اس کی ضد ظلم ہے۔''
والرضاء وضدہ السخط	''رضا اور اس کی ضد ناراضگی ہے۔''
والشکر وضدہ الکفران	''شکر اور اس کی ضد ناشکری ہے۔''
والطمع وضدہ الیاس	''طمع اور اس کی ضد مایوسی ہے۔''
والتوکل وضدہ الحرص	''توکل اور اس کی ضد حرص ہے۔''
والرافۃ وضدہ القسوۃ	''نرم دلی اور اس کی ضد سنگدلی ہے۔''
والرحمۃ وضدھا الغضب	''رحمت اور اس کی ضد غضب ہے۔''
والعلم وضدہ الجھل	''علم اور اس کی ضد جہل ہے۔''
والفھم وضدہ الحمق	''فہم اور اس کی ضد حماقت ہے۔''
والعفۃ وضدہ التھتك	''عفت اور اس کی ضد ناپاک دامنی ہے۔''
والزھد وضدہ الرغبۃ	''زہد اور اس کی ضد دنیا طلبی ہے۔''

والرفق وضده الخرق ''خوش خوئی اوراس کی ضد بدخوئی ہے۔''

والرهبة وضده الجراة ''خوف اوراس کی ضد جرأت ہے۔''

والتواضع وضده الكبر ''تواضع اوراس کی ضد تکبر ہے۔''

والتودة وضدها التسرع ''آہستگی اوراس کی ضد جلد بازی ہے۔''

والحلم وضده السفه ''حلم اوراس کی ضد نابردباری ہے۔''

والصمت وضده الهذر ''خاموشی اوراس کی ضد فضول کلامی ہے۔''

والاستسلام وضده الاستكبار ''حق کے سامنے جھک جانا اوراس کی ضد استکبار ہے۔''

والتسليم وضده الشك ''حق کوتسلیم کرنا اوراس کی ضد شک ہے۔''

والصبر وضده الجزع ''صبر اوراس کی ضد بے صبری ہے۔''

والصفح وضده الانتقام ''عفوودرگزر اوراس کی ضد انتقام ہے۔''

والغنى وضده الفقر ''توانگری اوراس کی ضد فقر ہے۔''

والتذكر وضده السهو ''تذکر اوراس کی ضد غفلت ہے۔''

والحفظ وضده النسيان ''یادرکھنا اوراس کی ضد فراموشی ہے۔''

والتعطف وضده القطيعة ''محبت وپیوند اوراس کی ضد قطع تعلق ہے۔''

والقنوع وضده الحرص ''قناعت اوراس کی ضد حرص ہے۔''

والمواساة وضدها المنع ''ایثار اوراس کی ضد محروم کرنا ہے۔''

والمودة وضدها العداوة ''موت اوراس کی ضد عداوت ہے۔''

والوفاء وضده الغدر ''وفا اوراس کی ضد فریب کاری وپیمان شکنی ہے۔''

والطاعة وضدها المعصية ''اطاعت اوراس کی ضد معصیت ہے۔''

والخضوع وضده التطاول ''خضوع اوراس کی ضد برتری طلبی ہے۔''

والسلامة وضدها البلاء ''سلامتی اوراس کی ضد ابتلاء ہے۔''

والحب وضده البغض ''محبت اوراس کی ضد بغض ہے۔''

والصدق وضده الكذب ''سچ اوراس کی ضد جھوٹ ہے۔''

والحق وضده الباطل ''حق اوراس کی ضد باطل ہے۔''

والامانة وضدها الخيانة ''امانت اوراس کی ضد خیانت ہے۔''

والاخلاص وضده الشوب ''اخلاص اوراس کی ضد نیت کی آلودگی ہے۔''

والشهامة وضدها البلادة ''ہمت اوراس کی ضد پست ہمتی ہے۔''

والفهم وضده الغباوة ''فہم اوراس کی ضد نافہمی ہے۔''

والمعرفة وضدها الانكار ''معرفت اوراس کی ضد انکار ہے۔''

والمداراة وضدها المكاشفة ''پردہ پوشی اوراس کی ضد پردہ دری ہے۔''

وسلامة الغيب وضدها المماكرة ''کسی کی عدم موجودگی میں اس کی حفاظت اوراس کی ضد سازش ہے۔''

والكتمان وضده الافشاء ''راز کی حفاظت اوراس کی ضد افشائے راز ہے۔''

والصلاة وضدها الاضاعة ''نماز اوراس کی ضد نماز کو ضائع کرنا ہے۔''

والصوم وضده الافطار ''روزہ اوراس کی ضد روزہ نہ رکھنا ہے۔''

والجهاد وضده النكول ''جہاد اوراس کی ضد جہاد سے منہ موڑنا ہے۔''

والحج وضده نبذ الميثاق ''حج اوراس کی ضد اللہ کے پیمان کو توڑنا ہے۔''

وصون الحديث وضده النميمة ''گفتگو کی حفاظت، اس کی ضد چغل خوری ہے۔''

وبر الوالدين وضده العقوق ''والدین سے نیکی اوراس کی ضد بدسلوکی ہے۔''

والحقيقة وضدها الرياء ''جستجوئے حق اوراس کی ضد ریاکاری ہے۔''

والمعروف وضده المنكر ''معروف اوراس کی ضد منکر ہے۔''

والستر وضده التبرج ''حجاب اوراس کی ضد زینت کی نمائش ہے۔''

والتقية وضدها الاذاعة ''راز اوراس کی ضد افشائے راز ہے۔''

والانصاف وضده الحمية ''انصاف اوراس کی ضد تعصب ہے۔''

والتهيئة وضدها البغي ''صلح پسندی اوراس کی ضد بغاوت وسرکشی ہے۔''

والنظافة وضدها القذر ''پاکیزگی اوراس کی ضد گندگی ہے۔''

والحياء وضدها الجلع ''حیا اوراس کی ضد بے حیائی ہے۔''

والقصد وضده العدوان	''میانہ روی واعتدال اوراس کی ضدتجاوز ہے۔''
والراحة وضدها التعب	''راحت اوراس کی ضدتکلیف ورنج ہے۔''
والسهولة وضدها الصعوبة	''سہولت اوراس کی ضدصعوبت ہے۔''
والبركة وضدها المحق	''برکت اوراس کی ضدبربادی ہے۔''
والعافية وضدها البلاء	''عافیت اوراس کی ضدبیماری وابتلاء ہے۔''
والقوام وضدها المكاثرة	''اعتدال اوراس کی ضدکثرت طلبی ہے۔''
والحكمة وضدها الهواء	''حکمت اوراس کی ضدخواہشات کی پیروی ہے۔''
والوقار وضده الخفة	''وقاراوراس کی ضدسبکی ہے۔''
والسعادة وضدها الشقاوة	''سعادت اوراس کی ضدشقاوت ہے۔''
والتوبة وضدها الاصرار	''توبہ اوراس کی ضدگناہ پراصرار ہے۔''
والاستغفار وضده الاغترار	''استغفاراوراس کی ضدفریب خوردگی ہے۔''
والمحافظة وضدها التهاون	''حق کی حفاظت جس کی ضدحق کے بارے میں سستی ہے۔''
والدعاء وضده الاستنكاف	''دعااوراس کی ضددعاسے انکار ہے۔''
والنشاط وضده الكسل	''نشاط اوراس کی ضدکاہلی ہے۔''
والفرح وضده الحزن	''خوشی اوراس کی ضدغم ہے۔''
والالفة وضدها الفرقة	''الفت اوراس کی ضدفرقت ہے۔''
والسخاء وضده البخل	''سخاوت اوراس کی ضدبخل ہے۔''

فلا تجتمع هذه الخصال كلها من اجناد العقل الا فى نبى اووصى نبى او مؤمن قد امتحن الله قلبه للايمان و اما سائر ذلك من مو الينا فان احدهم لا يخلو من ان يكون فيه بعض هذه الجنود حتى يستكمل وينقى من جنود الجهل فعند ذلك يكون فى الدرجة العليا مع الانبياء والا وصياء و انما يدرك ذلك بمعرفة العقل و جنوده و بمجانبة الجهل و جنوده و فقنا الله وايا كم لطاعته و مرضاته انشاء الله

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا

''عقل کے یہ لشکر نبی یا وصی کے سوا کسی میں جمع نہیں ہو سکتے یا پھر وہ مومن جس کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے لیے آزمالیا ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے دیگر محبین میں ان میں سے کچھ لشکر پائے جاتے ہیں۔ وہ ان لشکروں کی تکمیل اور جہل کے لشکروں سے دوری کے لیے مصروف عمل رہتے ہیں۔ جب وہ یہ عمل مکمل کر لیتے ہیں تو انبیاء واوصیاء کے درجہ میں قرار پاتے ہیں۔ یہ عقل اور اس کے لشکروں کی معرفت اور جہل اور اس کے لشکروں سے دوری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں اپنی اطاعت اور اپنی رضا کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔'' (اصولِ کافی، ۱: ۲۰ تا ۲۳)

مندرجہ بالا حدیث اخلاق اسلامی کے اصول وفروغ کے بارے میں ایک جامع حدیث ہے۔ بعض علماء نے اسے مستقل طور پر زیر بحث قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں مستقل کتب لکھی ہیں۔

۲۔ نہج البلاغہ میں کلماتِ قصار میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ (حدیث کے ذیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان سے مراد علمی اور عملی ایمان ہے جس میں اخلاقی اصول بھی شامل ہیں) امام علیہ السلام نے جواب دیا:

الایمان علی اربع دعائم، علی الصبر و الیقین و العدل و الجهاد

''ایمان چار ستونوں پر قائم ہے: صبر، یقین، عدالت اور جہاد۔''

پھر آپؑ نے مزید فرمایا:

والصبر منها علی اربع شعب، علی الشوق والشفق والزهدو الترقب

''صبر بھی چار بنیادوں پر قائم ہے: شوق، خوف، زہد اور انتظار۔''

(شوق سے مراد جنت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و پاداش کا شوق، خوف سے مراد اللہ تعالیٰ کی سزا اور جہنم کا خوف ہے، یہ دونوں نیکی کی طرف حرکت اور برے کاموں سے باز رہنے میں موثر ثابت ہوتے ہیں۔ زہد یعنی دنیا کی چکا چوند سے بے رغبتی مصائب کو انسان کے لیے حقیر اور ناچیز بنا دیتا ہے جبکہ موت کا انتظار انسان کو اعمالِ حسنہ کی انجام دہی کی رغبت دلاتا ہے۔)

پھر آپؑ نے فرمایا:

و الیقین منها علی اربع شعب، علی تبصرة الفطنة و تاول الحکمة، و موعظة العبرة، وسنة الاولین

''یقین کے بھی چار شعبے ہیں: ہوشیاری میں بصیرت، حکمت کے دقیق نکات کا ادراک، حوادث سے

عبرت حاصل کرنا اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

والعدل منها علی اربع شعب، علی غائص الفهم، وغور العلم، و زهرة الحکم، و رساخة الحلم

''اور عدل کے بھی چار شعبے ہیں: فہم، امور کے لیے باریک بینی، علم میں غور وفکر، صحیح فیصلہ اور پائیدار حلم و بردباری۔''

آخر میں آپؑ نے فرمایا:

والجهاد منها علی اربع شعب، علی الامر بالمعروف و النهی عن المنکر و الصدق فی المواطن وشنئآن الفاسقین

''اور جہاد کے بھی چار شعبے ہیں: امر بالمعروف، نہی از منکر، معرکہ جنگ میں صداقت اور فاسقوں سے دشمنی۔''

اس کے بعد آپؑ نے کفر کے چار ستونوں کی اسی طرح تفصیل سے بیان فرمایا جو ایمان کی ضد ہے۔

(نہج البلاغہ: کلماتِ قصار: ۱۳۱ اصولِ کافی، ۲، ۳۹۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں:

اربع من اعطیهن فقد اوتی خیر الدنیا و الاخرة، صدق حدیث واداء امانة وعفة بطن و حسن خلق

''چار چیزیں ایسی ہیں جو کسی کو مل جائیں تو اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل جائے گی: بات چیت میں سچائی، امانت کی ادائیگی، عفت شکم (حلال خوری) اور حسن خلق۔'' (غرر الحکم)

۴۔ اسی بات کا خلاصہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

''مجھے ایسی نصیحت فرمایئے جس میں دنیا اور آخرت کی بھلائی موجود ہو اور وہ نصیحت طویل بھی نہ ہو۔''

آپؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

لا تکذب

''جھوٹ نہ بولو۔'' (تحف العقول: ۲۶۴)

حقیقت یہی ہے کہ تمام فضائل اخلاقی کی بنیاد سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نہ صرف دوسروں کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ اور خدا کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولے۔ جب انسان نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر "ایاك نعبدو ایاك نستعین" یعنی "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں"، تو اس کی اس بات میں جھوٹ نہ ہو۔ وہ ہر قسم کے شیطانی اور نفسانی معبودوں سے دور ہو اور اس کا سر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکا ہوا ہو وہ مال و دولت، مقام و منصب اور کسی دوسری طاقت پر بھروسہ کرنے کی بجائے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور اسی سے مدد طلب کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا بن جائے تو اخلاقیات کے تمام اصول و فروع اس میں زندہ ہو جائیں گے۔

۵۔ احادیث میں "افضل الاخلاق"، "اکرم الاخلاق"، "احسن الاخلق" اور "اجمل الخصال" جیسی اصطلاحات دیکھنے میں آتی ہیں جن میں اخلاق اسلامی کے اہم اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

سئل الباقر عن افضل الاخلاق فقال الصبر و السماحة

"حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے افضل ترین اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: صبر اور سخاوت۔" (بحار الانوار، ۳۶: ۳۵۸)

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اکرم الاخلاق الشخاء و اعمها نفعا العدل

"معزز ترین اخلاق سخاوت اور نفع بخش ترین اخلاق عدل ہے۔" (غرر الحکم)

نیز آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اشرف الخلائق التواضع و الحلم و لین الجانب

"بہترین اخلاقی صفات تواضع، حلم اور نرم دلی ہیں۔" (غرر الحکم)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا:

ای الخصال بالمرء اجمل فقال وقار بلامهابة، و سماح بلا طلب مکافاة، و تشاغل بغیر متاع الدنیا

"انسانی صفات میں سے کونسی صفت سب سے خوبصورت ہے؟ آپؑ نے فرمایا: وہ وقار جس میں ہیبت نہ ہو، وہ سخاوت جس میں بدلہ کی توقع نہ ہو اور غیر متاع دنیا میں مشغول ہونا۔" (اصول کافی، ۲: ۲۴۰)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں بری اخلاقی صفات کو اصول کفر کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

اصول الکفر ثلاثة: الحرص و الاستکبار و الحسد

''تین چیزیں کفر کی جڑ ہیں: حرص، تکبر اور حسد۔''

پھر آپؑ نے تینوں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

فاما الحرص فان آدم حین نهی عن الشجرة حمله الحرص ان اکل منها، و اما الاستکبار فابلیس حین امر بالسجود الآدم استکبر، و اما الحسد فابنا آدم حیث قتل احدهما صاحبه

''آدم کو ایک درخت سے منع کیا گیا تھا۔ حرص نے ان پر حملہ کیا جس کی وجہ سے انہوں نے اس درخت سے کھا لیا۔ تکبر کی برائی یہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے تکبر کیا (اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون اور مردود قرار پایا)۔ حسد کا اظہار اس وقت ہوا جب آدم کے ایک بیٹے نے حسد کی وجہ سے دوسرے کو قتل کر دیا۔'' (اصولِ کافی، ۲:۲۸۹)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت کے سب سے بڑے حوادث جو اس نسل انسانی کے آغاز سے ہی رونما ہو گئے، ان تین صفات کی وجہ سے تھے۔ حرص نے آدم کو جنت سے نکالا، تکبر نے ابلیس کو ملعون و مردود بنایا اور حسد نے انسانی معاشرے میں قتل و خونریزی کی بنیاد ڈالی۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان اول ما عصی الله عزوجل به ست: حب الدنیا و حب الریاسة، و حب الطعام و حب النوم و حب الراحة و حب النساء

''چھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے پہلی بار اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی: دنیا کی محبت، مقام اور عہدے کی محبت، غذا کی محبت، نیند کی محبت، آرام سے محبت اور عورتوں سے محبت۔'' (بحار الانوار، ۶۹:۱۰۵)

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں اخلاقی فضائل اور اخلاقی رذائل کی بنیادوں کی اجمالی وضاحت ہو گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ ان روایات سے ظاہر ہوتا ہے، ان کی کوئی خاص تعداد معین نہیں کی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھے یا برے اخلاق کی مختلف النوع وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس طرح انسان کی جسمانی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی، اسی طرح اس کی روحانی صفات کی تعداد بھی گنتی سے باہر ہے۔

ساتواں باب

اخلاقی مسائل کا ایک دوسرے سے تعلق

فضائل اخلاقی غالباً ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور مربوط ہیں۔ اسی طرح رذائل اخلاقی کے درمیان بھی قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان مکمل جدائی غالباً ناممکن ہے۔

یہ ربط و تعلق بعض اوقات مشترکہ بنیاد کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی ان کے نتائج و ثمرات کی یکسانیت کی وجہ سے۔ مشترکہ بنیاد پر رونما ہونے والی صفات کی ہمارے پاس واضح مثالیں موجود ہیں۔ اکثر مواقع پر غیبت کی بنیاد حسد ہوتا ہے۔ حاسد کسی شخص کے ساتھ اپنے حسد کی وجہ سے اس کی عزت و آبرو کو داغدار کرنے کے لیے یا اس کی شخصیت کو خراب کرنے کے لیے اس کی غیبت کرتا ہے۔ اسی طرح کسی پر تہمت اور جھوٹا الزام لگانا، تکبر، احساس برتری اور دوسروں کو حقیر جاننا وغیرہ بھی حسد کے نتائج ہیں۔

اس کے برعکس بلند ہمتی جس طرح طمع کا راستہ روکتی ہے، اسی طرح حسد، تکبر، غرور اور خوشامد وغیرہ کا بھی مقابلہ کرتی ہے۔

نتائج اور ثمرات کے لحاظ سے بھی صفات کا باہمی ربط و تعلق واضح ہے۔ ایک جھوٹ کئی جھوٹ بولنے کا سبب ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ انسان ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے بعض دوسرے گناہوں کا مرتکب ہوجائے یا ایک جرم کو چھپانے کے لیے مزید جرائم کا مرتکب ہوجائے۔

اس کے برعکس ایک اچھا اخلاقی عمل مثلاً ایمانداری، لوگوں کے درمیان محبت، دوستی اور معاشرتی تعاون کا باعث ہوجائے۔

احادیث میں بھی اس بات کی طرف لطیف اشارہ موجود ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا کان فی الرجل خلة رائعة فانتظر اخواتها

''جب تم کسی شخص میں کوئی ایک اچھی صفت دیکھو تو منتظر رہو کہ اس صفت کی ساتھی صفات بھی اس میں پیدا ہوجائیں گی۔'' (بحار الانوار، ۶۶: ۴۱۱)

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان خصال المکارم بعضها مقید ببعض

''اچھی صفات ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔''

اسی حدیث کے ذیل میں ہے:

صدق الحدیث و صدق الباس و اعطاء السائل و المکافات بالصنایع واداء

الامانة و صلة الرحم والتودد الى الجار والصاحب و قرى الضيف وراسهن الحياء

''سچائی، میدان جنگ میں ثابت قدمی، سائل کو عطا کرنا، احسان کے بدلہ میں احسان، امانت کو ادا کرنا، صلہ رحمی، ہمسایوں اور دوستوں سے محبت اور مہمان نوازی کی بنیاد حیاء ہے۔''

(بحارالانوار، ۶۶:۳۷۵)

درحقیقت حیاء جو کہ گناہ سے نفرت کی روح ہے، تمام اخلاقی صفات کی بنیاد ہوسکتی ہے جس طرح سچائی کا امانت، میدانِ جنگ میں ثابت قدمی، دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ محبت سے گہرا تعلق ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله عزوجل جعل للشرا قفالا و جعل مفاتيح تلك الاقفال الشراب، و الكذب شر من الشراب

''اللہ تعالیٰ نے برائی کے تالے بنائے ہیں اور ان تالوں کی کنجی شراب ہے اور جھوٹ شراب سے بدتر ہے۔'' (بحارالانوار، ۶۹:۲۳۶)

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جھوٹ سب گناہوں کی جڑ بن سکتا ہے۔ یہی بات حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ایک حدیث میں مختصر طور پر اس طرح بیان فرمائی ہے:

جعلت الخبائث كلها فى بيت و جعل مفتاحها الكذب

''تمام برائیاں ایک گھر میں رکھ دی گئی ہیں اور ان کی کنجی جھوٹ ہے۔'' (بحارالانوار: ۶۹، ۲۶۳)

ہم اس گفتگو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں:

روایت میں ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا:

''یارسولؐ اللہ! میں تنہائی میں زنا، شراب خوری، چوری اور جھوٹ کا مرتکب ہوا ہوں۔ آپؐ ان میں سے جس ایک کو ترک کرنے کا حکم دیں، میں آپؐ کے لیے اسے چھوڑ دوں گا۔'' (معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص سارے گناہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا بلکہ آنحضرتؐ کی خاطر ان میں سے کسی ایک کو چھوڑنے پر تیار تھا)۔

آپؐ نے فرمایا: ''جھوٹ چھوڑ دو''۔

وہ شخص چلا گیا۔ جب اس نے زنا کا ارادہ کیا تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر آپؐ نے مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ لیا اور میں نے سچ کہا تو آپ مجھ پر زنا کی حد جاری فرمائیں گے اور اگر جھوٹ بولا تو آپؐ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کی خلاف

ورزی ہوگی۔

اسی طرح چوری اور شراب خوری کے وقت بھی اس کے ذہن میں ایسا ہی خیال پیدا ہوا۔ وہ شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''آپؐ نے ان سب گناہوں کا راستہ مجھ پر بند کر دیا ہے اور میں نے ان تمام گناہوں کو ترک کر دیا ہے۔'' (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ۶: ۳۵۷)

مندرجہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تربیت نفس اور تہذیب اخلاق کے لیے خاص طور پر کسی مخصوص اخلاقی صفت کی اصلاح کے لیے ان چیزوں سے کام کا آغاز کرنا چاہیے جو بنیادی حیثیت کی حامل ہیں اور ان اخلاقی صفات کی مدد حاصل کی جائے جو ان کے ساتھ پیوستہ اور مربوط ہیں۔

آٹھواں باب

کہاں سے شروع کریں؟

یہاں تک ہم علم اخلاق، اس کے آثار و نتائج اور محرکات وغیرہ کے بارے میں کلی اور عمومی آگہی حاصل کر چکے ہیں۔ اب ہم ان کلی اور عمومی معلومات کی روشنی میں تہذیب نفس کے راستے کا آغاز کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اب ہم مسائل ذہنی سے مسائل عینی کی طرف یا کلیات سے جزئیات کی طرف آتے ہیں۔

لیکن ضروری ہے کہ ہم یہاں بھی ذرا توقف کریں اور اس روحانی سفر کے لیے ضروری ساز و سامان کا انتظام کر لیں تا کہ دورانِ سفر حیرت و سرگردانی یا بدنظمی کا شکار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے:

۱۔ اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات۔

۲۔ کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟

۳۔ اندرونی اور بیرونی واعظ کا کردار۔

۴۔ وہ امور جو انسان کو اس عظیم مقصد تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں جیسے اللہ کا ذکر، عبادات اور دعائیں، زیارات، مسلسل نصیحت اور تلقین۔

۵۔ ماحول کی پاکیزگی۔

اخلاقی مسائل کا سامنا کرنے کے بارے میں تین نظریات

پہلا نظریہ یہ کہتا ہے کہ تہذیب نفس اندرونی دشمنوں کے ساتھ جہاد ہے جو کہ انسانوں کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہ نظریہ رسولؐ اللہ کی معروف حدیث پر مبنی ہے جس کے مطابق آنحضرتؐ نے جہاد سے واپس آنے والے مجاہدین کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا:

مرحبا بقوم قضو الجهاد الاصغر و بقی علیهم الجهاد الاکبر فقیل یا رسول الله مالجهاد الاکبر، قال: جهاد النفس

''آفرین ہے ان لوگوں پر جو جہاد اصغر کر آئے ہیں اور جہاد اکبر ابھی ان پر باقی ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نفس کے خلاف جہاد۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۱: ۱۲۲)

بحار الانوار میں اس حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی ہے:

ثم قال: افضل الجهاد من جاهد نفسه التی بین جنبیه

''پھر آپؐ نے فرمایا: سب سے افضل جہاد نفس کے خلاف جہاد ہے جو انسان کے دونوں پہلوؤں کے بیچ میں ہے۔'' (بحارالانوار، ۶۷:۶۵)

قرآن مجید میں جہاد کے بارے میں آنے والی آیات میں سے بعض کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جہاد اکبر کے بارے میں ہیں۔ اس لیے کہ یا تو خاص طور پر ان میں نفس کے خلاف جہاد مدنظر ہے، یا اس لیے کہ ان کا مفہوم وسیع ہے اور جہاد کی دونوں اقسام اس میں داخل ہیں۔

تفسیر قمی میں سورۂ عنکبوت کی آیت ۶

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

''جو جہاد کرتا ہے اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ تمام عالمین سے بے نیاز ہے۔''

کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شہوات، ناجائز لذتوں اور گناہوں کے خلاف جہاد ہے۔

اس آیت کی اس تفسیر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ جہاد کا فائدہ خود جہاد کرنے والے کو ہوتا ہے اور یہ بات زیادہ تر نفس کے خلاف جہاد میں صادق آتی ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس پہلی آیت میں لقاء اللہ کے بارے میں بات کی گئی ہے:

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵

''جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو، سو اللہ تعالیٰ (سے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور آنے والا ہے اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے۔''

یہ بات بالکل واضح ہے کہ لقاء اللہ اور شہودِ الٰہی اور قرب خدا کا حصول نفس کے خلاف جہاد کے مقاصد ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں بھی یہ بات کہی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹

''جو لوگ (خلوص نیت سے) ہماری راہ میں جہاد کریں، ہم یقیناً ان کو ہدایت دیں گے اور یقیناً اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔''

یہ آیت بھی ''فینا'' (ہماری راہ میں) اور ''لنهدینهم سبلنا'' (ہم یقیناً ان کو اپنی راہوں کی ہدایت کریں گے) جیسے قرائن کی وجہ سے زیادہ تعلق جہادِ نفس سے ہی رکھتی ہے، یا یہ کہ اس کا مفہوم عام ہے اور دونوں اقسام کے جہاد اس میں آجاتے ہیں۔

سورۂ حج کی آیت ۷۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ

''اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی مقرر نہیں کی۔''

اکثر مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں جہاد سے مراد، جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر دونوں ہیں یا خاص طور پر جہادِ اکبر مراد ہے۔ جیسا کہ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے کہ جہاد کا حق ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خلوصِ نیت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے۔ (مجمع البیان، ۷: ۹۷)

علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار میں اس آیت کو ان آیات کے زمرے میں قرار دیا ہے جو جہادِ اکبر سے متعلق ہیں۔ (بحار الانوار، ۶۷: ۶۳)

ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا: (میزان الحکمہ، ۲: ۱۴۱)

یارسول اللہ ای الجھاد افضل؟ قال ان یجاھد الرجل نفسہ و ھواہ

''یارسولؐ اللہ! کونسا جہاد افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: انسان کا اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا۔''

عقل و جہل کے لشکروں سے متعلق حدیث جو گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے، بھی اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہے کہ انسان کا وجود ایک میدانِ جنگ ہے جس میں ایک طرف عقل اور اس کے لشکر کھڑے ہیں اور دوسری طرف جہل اور ہوائے نفس اور اس کے لشکر صف آراء ہیں۔ یہ دونوں لشکر مسلسل حالت جنگ میں ہیں۔ کمالات انسانی میں انسان کی ترقی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ عقل کے لشکر جہل کے لشکروں پر غالب آ جائیں۔ ان کی جزئی کامیابی بھی کمالات انسان میں جزئی ترقی شمار ہوتی ہے۔

دوسرا نظریہ: روحانی طب

اس نظریہ کے مطابق انسان کے جسم کی طرح انسان کی روح بھی بیمار ہوتی ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے بھی روحانی معالجوں کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اخلاقی بیماریوں سے نجات کی دواؤں کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ انسان کی روح صحت مند، پرنشاط اور فعال ہو جائے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کی بارہ آیات میں روحی اور اخلاقی بیماریوں کو ''مرض'' کہا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰ میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

''ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے اور اللہ نے (ان کے گناہ اور نفاق کی وجہ سے) ان کی بیماری کو

بڑھادیا ہے۔''

سورۂ احزاب آیت ۳۲ میں شہوت پرستوں کو ایسے بیمار قرار دیا گیا ہے جو پاکدامن عورتوں کو اپنے دام میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔اس آیت میں رسولؐ اللہ کی ازواج کو حکم دیا گیا ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ

''ایسے نرم لہجہ میں بات نہ کرو جس کی وجہ سے بیمار دل افراد کسی طمع میں مبتلا ہو جائیں۔''

دوسری آیات میں بھی ایسے معنی یا ان سے وسیع تر معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہر قسم کے اخلاقی اور عقیدتی انحراف پر محیط ہیں۔

ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی نور معرفت،تقویٰ اور اخلاق سے سرشار دل کو قلب سلیم کا نام دیا گیا ہے:

وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝

''جس دن لوگ حساب کے لیے اٹھائے جائیں گے، مجھے رسوا نہ کرو اور اس دن جب مال اور اولاد کسی کو فائدہ نہ دیں گے سوائے اس کے جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے۔''

(سورۂ شعراء:۸۷تا۸۹)

سلیم کا لفظ سلامت سے مشتق ہے جو فساد، انحراف اور بیماری کی ضد ہے۔آئمہ معصومینؑ سے مروی روایات کی رو سے اس آیت میں قلب سلیم سے مراد وہ قلب ہے جو غیر اللہ سے خالی ہو(یعنی ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی بیماری سے دور ہو)۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ آرزو پوری ہوگئی اور وہ صاحب قلب سلیم ہو گئے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝

''اور ان کے پیروکاروں میں ابراہیم بھی تھے۔ جب وہ قلب سلیم کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوئے۔''

صاحب قلب سلیم ہونے کی خواہش جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں تھی، بندگی خدا کی راہ میں کوشش وجدوجہد، ایثار وقربانی، شرک اور ہوائے نفس کے خلاف جنگ کے نتیجہ میں پوری ہوگئی اور آخر کار وہ اس مقام پر فائز ہو گئے۔

احادیث میں بھی اس نظریہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جن کے چند نمونے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام رسولؐ اللہ کی توصیف میں فرماتے ہیں:

طبيب دوا ربطبه قدا حكم مراهمه و احمى مواسمه يضع ذلك حيث الحاجة

اليه من قلوب عمی وآذان صم والسنة بكم، متتبع بدوائه مواضع الغفلة و مواطن الحيرة

''وہ ایک طبیب تھے جو اپنی طب کے ساتھ معاشرے میں چلتے تھے۔ آپؑ نے مرہم کو خوب محکم کیا اور اپنے اوزاروں کو گرم رکھا تا کہ اندھے دلوں، بہرے کانوں اور گونگی زبانوں کا علاج کر سکیں۔ وہ اپنی طب کو ساتھ لیے ان بیماروں کی تلاش میں پھرتے تھے جو فراموش ہو چکے تھے اور حیرت و سرگردانی میں گم تھے۔'' (خطبہ ۱۰۸)

۲۔ قلب سلیم، جس کے بارے میں دو آیات کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا:

ما القلب السليم؟

یعنی ''قلب سلیم کیا ہے؟''

آپؐ نے فرمایا:

دين بلا شك وهوى، و عمل بلا سمعة ورياء (مستدرک الوسائل، ۱: ۱۰۳)

''اس سے مراد ایسا دین ہے جو شک اور ہوس پرستی سے پاک ہو اور ایسا عمل جو سمعہ اور ریا سے دور ہو۔''

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا علم كطلب السلامة ولا سلامة كسلامة القلب

''کوئی علم سلامتی کی جستجو جیسا نہیں ہے اور کوئی سلامتی قلب کی سلامتی جیسی نہیں ہے۔'' (بحار الانوار ۷۵: ۱۶۴)

ایک اور حدیث میں حضرت امام علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

اذا احب الله عبدا رزقه قلبا سليما و خلقا قويما

''جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے قلب سلیم اور معتدل اخلاق عطا فرماتا ہے۔''

۳۔ متعدد احادیث میں اخلاق رذیلہ کو قلبی بیماریاں قرار دیا گیا ہے۔ حضورؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

اياكم والمراء والخصومة فانهما يمرضان القلوب على الاخوان، و ينبت عليهما النفاق

''جھگڑے اور مخالفت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ دلوں میں بھائیوں کے خلاف بیماری پیدا کرتے ہیں اور ان کے اوپر منافقت اگتی ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۰: ۳۹۹)

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما من شیء افسد للقلب من خطیئته

''گناہ سے زیادہ کوئی چیز انسان کے دل کو خراب نہیں کرتی۔'' (بحار الانوار، ۷۰: ۳۱۲)

۴۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الا و من البلاء الفاقة و اشد من الفاقة مرض البدن، و اشد من مرض البدن مرض القلب

''خبردار! فقر ایک مصیبت ہے۔ اس سے بری مصیبت جسمانی بیماری ہے اور اس سے بڑی مصیبت دل کی بیماری ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۸۸)

۵۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں حسد کو ایسی بیماری کہا گیا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں موجود رہی ہے:

الا انه قد دب الیکم داء الامم من قبلکم وهو الحسد، لیس بحالق الشعر، لکنه حالق الدین، و ینحی فیه ان یکف الانسان یده و یحزن لسانه و لا یکون ذاغمز علی اخیه المومن

''ایک بیماری جس میں گزشتہ اقوام مبتلا تھیں، تمہاری طرف آ چکی ہے۔ وہ بیماری حسد ہے جس سے جسم کے بال نہیں جھڑتے لیکن ان کا دین جھڑ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ جب حسد کے آثار نظر آئیں تو اپنے ہاتھ اور زبان کو روک رکھے اور آنکھ کے اشارے سے بھی اپنے مومن بھائی کی اہانت نہ کرے۔'' (میزان الحکمہ، ۱: ۶۳۰)

۶۔ بہت سی احادیث میں اخلاقی رذائل کو ''داء'' کہا گیا ہے جس کے معنی بیماری کے ہیں۔ نہج البلاغہ میں خطبہ ۱۷۶ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فاستشفوه من ادوائکم ..... فان فیه شفاء من اکبر الداء و هو الکفر والنفاق و الغی و الضلال

''قرآن سے اپنی بیماریوں کی شفا طلب کرو۔ اس میں سب سے بڑی بیماری کفر، نفاق، گمراہی و

ضلالت کی شفا موجود ہے۔''

یہ الفاظ اور بھی بہت سی احادیث میں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ اس نقطہ نظر کے مطابق فضائل و رذائل اخلاقی انسان کی روح کی صحت یا بیماری کی علامات ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے رسول، آئمہ معصومینؑ اور معلمین اخلاق روحانی طبیب ہیں جبکہ ان کی تعلیمات اور نصائح شفا بخش دوائیں ہیں۔

اس لحاظ سے جس طرح جسمانی بیماری کے علاج میں صحت مند ہونے کے لیے دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی ضروری ہے، اسی طرح روحانی اور اخلاقی بیماریوں سے نجات کے لیے بدکار دوستوں، برے ماحول اور ان تمام عوامل سے پرہیز ضروری ہے جو اخلاقی بیماریوں کے زیادہ ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

جسمانی بیماریوں کے علاج میں بعض اوقات جراحی یعنی آپریشن کی ضرورت پیش آتی ہے اور طبیب جراحی کے آلات سے جسم کو چاک کر کے علاج کرتا ہے۔ طب روحانی میں بھی غیر اخلاقی افعال کی سزا کے طور پر نافذ ہونے والی حدود، تعزیرات اور سزائیں جراحی یعنی آپریشن کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جسمانی طب میں دو مراحل بالکل واضح ہیں: احتیاط اور علاج۔ طب روحانی میں بھی یہ دونوں مراحل موجود ہیں۔ روحانی معالج اور معلمین اخلاق ایک طرف سے روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں تو دوسری طرف سے روحانی طور پر صحت مند افراد کو بیماری سے محفوظ رہنے میں احتیاطی تدابیر بتاتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۰۸ میں حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں جہاں مرہم کا ذکر کیا، وہاں زخموں کو جلانے والے اوزاروں کا بھی ذکر فرمایا۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اخلاقی بیماریوں کا علاج بھی جسمانی بیماریوں کی طرح مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

جسمانی بیماریوں کے علاج کی طب میں بعض عام ضابطے ہیں جن کا ہر بیماری کے علاج میں خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہر بیماری کے علاج کے کچھ مخصوص قوانین اور ضوابط بھی ہوتے ہیں۔ طب روحانی میں بھی اسی طرح سے ہے۔ توبہ، ذکر الٰہی، نماز، روزہ اور دیگر عبادات، محاسبہ اور مراقبہ وغیرہ ہر روحانی بیماری کے علاج کے عام قوانین ہیں جبکہ ہر روحانی بیماری کے علاج کے مخصوص قوانین بھی موجود ہیں جو کتب روایات و اخلاق میں موجود ہیں۔

تیسرا نظریہ: سیر و سلوک

اس نظریہ کے مطابق انسانوں کو مسافروں سے تشبیہ دی گئی ہے جو نقطہ عدم سے سفر کا آغاز کر کے لقاء اللہ اور قرب خدا کی طرف گامزن ہیں جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔

اس روحانی سفر میں بھی جسمانی سفر کی طرح رہنما، سواری، سامانِ سفر، زادِ راہ، مشکلات و موانع کی برطرفی، ڈاکوؤں،

چوروں اور جان و مال کے دشمنوں سے بچاؤ کے انتظامات ضروری ہیں۔

اس روحانی سفر میں بھی کئی منازل اور دشوار گھاٹیاں، خطرناک کھائیاں درپیش ہوتی ہیں۔ انسان ان سب سے گزر کر ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اگرچہ بعض حضرات کا اصرار ہے کہ سیر وسلوک، راستے اور منازل سے آگاہی، سواری، زادِ سفر اور رہنما سے آگاہی کا علم، علم کا اخلاق سے جدا اور الگ علم ہے۔ ممکن ہے ایک لحاظ سے ان کی بات درست ہو لیکن اگر وسیع نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیر وسلوک روحانی بھی انہی راستوں سے گزرتا ہے جہاں سے اخلاقی تربیت کی راہیں گزرتی ہیں، یا کم از کم اتنا ضرور ہے کہ اخلاق الٰہی سیر وسلوک کا ایک حصہ ضرور ہے۔

بہر حال آیات قرآنی اور احادیث معصومینؑ میں بھی اس نظریے کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵، ۱۵۶ میں ہے:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اے رسولؐ! ان صابرین کو بشارت دے دیجیے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

اس آیت کی رو سے انسان ایک طرف سے اپنے آپ کو اللہ کی ملکیت قرار دیتا ہے اور دوسری طرف سے خود ایک ایسا مسافر بن جاتا ہے جو اللہ کی طرف محو سفر ہے۔

سورۂ علق میں ہے:

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴿۸﴾

''یقیناً سب کی بازگشت تیرے رب کی طرف ہے۔'' (علق: ۸)

سورۂ انشقاق میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾

''اے انسان! تو بہت کوشش اور مشقت کے ساتھ اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے اور آخر کار اس سے ملاقات کرے گا۔'' (انشقاق: ۶)

سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ

تُوْقِنُوْنَ②

''اللہ نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے ذریعے اٹھا رکھا ہے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے۔ وہ اسی طرح اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین حاصل کرلو۔'' (رعد:۲)

قرآن مجید میں بیس سے زیادہ آیات میں لقاء اللہ کا ذکر پایا جاتا ہے جو سالکانِ الی اللہ اور عارفانِ الٰہی کی آخری منزل مقصود ہے۔یعنی اس بے نظیر محبوب اور بے مثال مقصود کا معنوی اور روحانی دیدار۔

یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی آیات ایک لحاظ سے عمومیت رکھتی ہیں اور سب اس میں داخل ہیں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فطرت اور خلقت کے اعتبار سے مومن اور کافر دونوں کی منزل وہی ہو جبکہ بعض لوگ انحراف اور گمراہی کی وجہ سے راستے میں ہلاکت کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں اور اولیائے الٰہی اپنے اپنے درجات کے مطابق اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے نطفہ آغازِ تخلیق سے ہی ایک مکمل انسان بننے کے مراحل طے کررہا ہوتا ہے اور مکمل انسان بننے کے بعد بھی اپنے ارتقاء اور تکامل کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ان میں سے بعض نطفے ابتدائی مراحل میں ہی ہلاکت کا شکار ہوجاتے ہیں جبکہ بعض ولادت کے بعد مختلف حوادث وآفات کی وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ان سب باتوں سے زیادہ واضح اور روشن بات وہ ہے جس میں قرآن مجید نے تقویٰ کو بہترین زادِراہ قرار دیا ہے۔ (زادِراہ عام طور پر مسافر کے غذائی سامان کو کہا جاتا ہے لیکن لغت کی رو سے اس کے معنی وسیع تر ہیں اور ہر قسم کی ذخیرہ سازی اس میں آجاتی ہے۔)

بنابرایں یہ عبارت جو تقویٰ کو بہترین زادِراہ قرار دے رہی ہے،اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کے سفر کی نشاندہی کرتی ہے جس میں بہرحال زادِراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔چونکہ یہ سفر روحانی ہے،لہٰذا اس کا زادِراہ بھی روحانی ہے۔احادیث میں بھی ایسی عبارات وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہیں۔

نہج البلاغہ میں متعدد خطبات میں اس دنیا سے آخرت کے سفر کے لیے زادِراہ لینے کی بات کی گئی ہے،خطبہ ۱۵۷ میں ہے:

فتزودوا فی ایام الفناء لایام البقاء

''ان فانی ایام میں باقی رہنے والے ایام کے لیے زادِراہ کا انتظام کرلو۔''

خطبہ ۱۳۲ میں ہے:

ان الدنیا لم تخلق لکم دار مقام،بل خلقت لکم مجاز التزودوا منها الاعمال الی دار القرار

''یہ دنیا تمہارے لیے اقامت گاہ نہیں بلکہ گزرگاہ ہے تاکہ اس میں سے اقامت گاہ کے لیے اعمال کا

زادِراہ حاصل کرو۔''

خطبہ ۱۳۳ میں ایک انتہائی لطیف انداز میں اس طرح کہا گیا ہے:

والبصیر منها متزود والاعمی لها متزود

''بینائی رکھنے والا اس دنیا سے زادِراہ حاصل کرتا ہے جبکہ اندھا اس کے لیے زادِراہ حاصل کرتا ہے۔''

سورۂ ابراہیم کی آیت ۱ میں "صراط العزیز الحمید"، سورۂ حمد میں "الصراط المستقیم" اور بہت سی آیات میں سبیل اللہ اور انفال، آیت ۳۶ میں "لیصدوا عن سبیل اللہ" جیسے الفاظ اس نظریہ کی طرف اشارہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

نواں باب

سیر وسلوک کے مختلف طریقے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن ارباب سیر وسلوک اور علماء نے اس راہ میں قدم رکھا ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنا رہنما قرار دیا ہے (نہ وہ صوفیاء جنہوں نے غیر اسلامی طریقے اپنائے) ان میں سے ہر ایک نے ایک روش اور طریقہ کار تجویز کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس راہ کی منازل ومراحل کو بیان کیا ہے جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں مختصراً اشارہ کرتے ہیں تاکہ یہ بحث مکمل تر اور مفید تر ہو جائے۔

ا۔ سیر وسلوک بحر العلوم

اس کتاب کو علامہ بحر العلوم کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے بعض حصوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ بحر العلوم کی طرف ان کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کتاب کے بعض حصے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں قرب الٰہی کو طے کرنے کے چار عوالم یا بعبارت دیگر چار منازل کا ذکر کیا گیا ہے:

ا۔ اسلام ۲۔ ایمان ۳۔ ہجرت ۴۔ جہاد

ان چاروں عوالم میں سے ہر ایک کے تین مراحل کا ذکر کیا گیا ہے جن کی مجموعی تعداد بارہ بنتی ہے۔ ان بارہ مراحل کو طے کرنے کے بعد سالك الی اللہ عالم خلوص میں داخل ہوتا ہے۔

یہ بارہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ **اسلام اصغر**: اس سے مراد شہادتین کا اقرار، ان کی ظاہری تصدیق اور دینی فرائض کی بجا آوری ہے۔

۲۔ **ایمان اصغر**: اس سے مراد تمام معارف اسلامی کی قلبی تصدیق اور ان پر باطنی یقین ہے۔

۳۔ **اسلام اکبر**: اس سے مراد اسلام کے تمام حقائق اور اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

۴۔ **ایمان اکبر**: اس سے مراد اسلام اکبر کی روح اور معنویت ہے جس میں انسان مرتبہ اطاعت سے مرتبہ شوق ورضا ورغبت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

۵۔ **ہجرت صغری**، اس سے مراد دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا ہے، جیسے مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کی تھی۔

۶۔ **ھجرت کبری**: اس سے مراد گناہگاروں، ظالموں اور بدکاروں سے دوری اختیار کرنا ہے۔

۷۔ **جھاد اکبر**: رحمن کے لشکروں کی مدد سے جو کہ عقل کے لشکر ہیں، شیطان کے لشکروں کے خلاف جہاد کرنا۔

۸۔ شیطان کے لشکر پر فتح وکامیابی اوران کے تسلط سے آزادی اور عالم جہل وطبیعت سے نکلنا۔

۹۔ **اسلام اعظم**: اس سے مراد اپنی خواہشات نفس اور آرزوؤں پر غلبہ پانا ہے کیونکہ فتح وظفر کے بعد بیداری کے بیرونی عوامل، انحراف وگمراہی کے اندرونی عوامل پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس مقام پر قلب سالک مرکز انوارِ الٰہی و فیوض ربانی بن جاتا ہے۔

۱۰۔ **ایمان اعظم**: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کے سامنے اپنے فنا کا مشاہدہ کرنا ہے۔ اس مرحلہ میں **سالك فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی** (پس میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا) کے عالم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر عبودیت اور بندگی کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔

۱۱۔ **ھجرت عظمی**: اس سے مراد اپنے وجود سے ہجرت کر کے اسے فراموش کر دینا ہے۔ یہ عالم وجودِ مطلق کی طرف سفر کا مرحلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کی طرف کامل توجہ کا مرحلہ ہے جس کی طرف **وادخلی جنتی** میں خطاب کیا گیا ہے۔

۱۲۔ **جھاد اعظم**: اپنی ذات سے ہجرت کے بعد اس مرحلہ میں سالک اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس سے توسل کرتا ہے تا کہ اپنی خود بینی کے سارے آثار کو مٹا دے اور نابود کر دے اور توحید مطلق کے مرحلہ میں داخل ہوجائے۔

ان بارہ عوالم کو طے کرنے کے بعد سالک عالم خلوص میں داخل ہوجاتا ہے اور "**بل احیاء عندربھم یرزقون**" (وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پاتے ہیں) کا مصداق بن جاتا ہے۔[1]

اس روش کے مطابق سیر وسلوک کی کیفیت

علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک میں مندرجہ بالا عوالم کا ذکر کرنے کے بعد اس مشکل اور پر مشقت راہ کو طے کرنے کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں پچیس اہم ہدایات دی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

قرب خدا کی راہ پر چلنے والا سالک الی اللہ انسان، اصول دین اور احکام دین اسلام سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے بعد سامان سفر باندھتا ہے اور مندرجہ ذیل پچیس ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے لگتا ہے:

۱۔ ان عادات ورسوم وآداب کو ترک کرنا جو انسان کو اس راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اسے آلائشات میں غرق کر دیتے ہیں۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سیر وسلوک کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس رسالہ میں بارہ عوالم کی ترتیب اور رسالہ "لب اللباب" میں علامہ طباطبائی کے ارشادات میں تھوڑا سا فرق پایا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ان کو باہم ملا دیا ہے۔

۲۔ منزل کی طرف بڑھنے کا پختہ عزم: اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اثنائے سفر میں کسی چیز سے خوفزدہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی قسم کے شک وشبہ کو دل میں داخل نہ ہونے دے۔

۳۔ نرمی اور تحمل: اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وقت میں زیادہ امور کو اپنے اوپر مسلط نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ اس کا حوصلہ سرد ہو جائے اور وہ متنفر ہو کر آگے بڑھنے سے رک جائے۔

۴۔ وفا: اس کے معنی یہ ہیں کہ جو توبہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور کی ہے، اس کے بارے میں وفادار رہے اور ان گناہوں کی طرف واپس نہ پلٹ جائے۔ نیز یہ کہ استاد اور رہنما کے احکامات وہدایات کے بارے میں بھی وفادار رہے۔

۵۔ ثابت قدمی اور استقلال: اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لائحہ عمل وہ اپنے لئے منتخب کرے، آہستہ آہستہ اسے ایک پختہ عادت میں تبدیل کر دے تاکہ کسی صورت میں اس سے واپس نہ ہو سکے۔

۶۔ مراقبہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام حالات میں اپنے اوپر کڑی نظر رکھے تاکہ کسی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہو۔

۷۔ محاسبہ: حدیث میں ہے:

لیس منا من لا یحاسب نفسه کل یوم

''جو شخص ہر روز اپنا محاسبہ نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں۔'' (ارشاد القلوب، باب ۳۹)

۸۔ مواخذہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی کسی خطا کا مرتکب ہو، اپنے نفس کا مواخذہ کرے اور اس طرح اپنے آپ کو سزا دے۔

۹۔ مسارعہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآنی حکم پر:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف سرعت اور تیزی سے آگے بڑھو۔'' (آل عمران: ۱۳۳)

عمل کرتے ہوئے ہر قدم اٹھانے میں جلدی کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان اپنی وسوسہ اندازی کے ذریعے اسے عمل سے روک دے۔

۱۰۔ ارادت: اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے باطن کو اس طرح پاکیزہ اور خالص کرے کہ اس کے اندر کوئی کھوٹ باقی نہ رہے اور وہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کا مکمل عاشق ہو جائے۔

۱۱۔ ادب: یعنی اللہ تعالیٰ، رسولؐ اکرم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی بارگاہ کے ادب کو ملحوظ رکھے اور زبان پر ذرا بھی حرف اعتراض نہ آئے۔ ان کے احترام کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے، یہاں تک کہ دعا میں ایسے الفاظ بھی استعمال نہ کرے جو امر و نہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

۱۲۔ نیت: اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیر وسلوک کے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنے کا قصد کرے۔

۱۳۔ صمت: صمت خاموشی کو کہتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک غیرضروری گفتگو سے پرہیز کرے اورصرف ضروری گفتگو پر اکتفا کرے۔

۱۴۔ جوع: یعنی بھوکا رہنا اور کم کھانا۔ یہ بھی سیر وسلوک کی اہم شرائط میں سے ہے لیکن اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس میں اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ کمزوری پیدا ہوجائے۔

۱۵۔ خلوت یعنی تنہائی: اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہگاروں، دنیا پرستوں اور کم عقل لوگوں سے دور رہے اور عبادت اور ذکر کے وقت ہجوم اور شوروغوغا سے دور رہے۔

۱۶۔ شب بیداری: (خاص طور پر رات کے آخری حصے میں)، اس طرف قرآن شریف اور احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ دوامِ طہارت: یعنی ہمیشہ باوضو رہنا کیونکہ اس سے انسان کے باطن میں ایک خاص نور پیدا ہوتا ہے۔

۱۸۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی: یہ جس قدر زیادہ ہو، اتنی ہی کم ہے۔

۱۹۔ خواہشات نفسانی سے، خواہ وہ مباح ہی کیوں نہ ہوں، پرہیز کرنا۔

۲۰۔ رازداری: یہ سیر وسلوک کی سب سے اہم شرائط میں سے ہے اور اس راہ کے اساتذہ اس پر بہت تاکید کرتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی عبادات اور اپنے لائحہ عمل کو پوشیدہ رکھے (تاکہ اس کے اندر ذرا بھی نمود ونمائش اور ریاکاری کا پہلو پیدا نہ ہو)۔اسی طرح اگر عالم غیب سے کچھ حقائق اس پر منکشف ہوں تو انہیں بھی پوشیدہ رکھے اور کسی سے بیان نہ کرے (تاکہ عجب اور خود پسندی کا شکار نہ ہوجائے)۔

۲۱۔ استاد اور مربی کا ہونا: خواہ عام استاد اور مربی ہوں جن کی رہنمائی میں سیر وسلوک کے مراحل طے کرے یا خاص استاد اور مربی، جو کہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ ہیں۔

البتہ اس سلسلہ میں اس طرف دھیان رہے کہ استاد اور مربی کا انتخاب انتہائی احتیاط سے کیا جائے۔جب تک کسی کی علمی اور دینی صلاحیت کو آزمانہ لے، اس کی ہدایت پر بھروسہ نہ کرے کیونکہ بعض اوقات شیاطین بھی استاد کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں یعنی بھیڑ یئے گڈریے کا روپ دھار لیتے ہیں اور سالک کو گمراہ کردیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مرحوم علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: ''حتی کہ غیر معمولی چیزوں کا ظاہر ہونا، انسان کے باطن کی خبر دینا، پانی اور آگ پر چلنا، مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا بھی ہمیں یہ اطمینان نہیں دے سکتے کہ ان اعمال کا انجام دینے والا سیر وسلوک میں کوئی مقام یا پیش رفت حاصل کرچکا ہے، اس لیے کہ یہ سب باتیں روحانی مکاشفہ کے ذریعے بھی حاصل ہو جاتی ہیں جبکہ اس منزل سے منزل یقین تک کا راستہ بہت طویل ہے۔

۲۲۔ ورد: اس سے مراد وہ زبانی اذکار ہیں جو سالک کے لیے راستہ کھولتے چلے جاتے ہیں اور دشوار راستوں سے گزرتے ہوئے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔

۲۳۔ نفی خواطر: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اپنے دل کو مسخر کر کے اس پر اپنی حکومت قائم کر لے۔ اس کی سوچوں کا مرکز (concentration) اس طرح ہو کہ اسکے ارادہ واختیار کے بغیر کوئی خیال اس کے دل میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

۲۴۔ فکر: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک معرفت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے صحیح اور گہرے غور وفکر کا مالک ہو اور اس کا تمام غور وفکر اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال وتجلیات ہوں۔

۲۵۔ ذکر: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف قلبی توجہ ہے۔ یہ ورد سے الگ چیز ہے۔ ورد کا تعلق لفظ اور زبان سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک کی ساری نظر اللہ تعالیٰ کے جمال پر مرکوز ہو اور وہ غیر اللہ کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔

یہ تھا رسالہ سیر وسلوک کا خلاصہ جو کہ علامہ بحر العلوم کی طرف منسوب ہے۔ علامہ طباطبائی نے بھی معمولی فرق کے ساتھ رسالہ ''لب اللباب'' میں اسی روش کو اختیار کیا ہے۔

۲۔ مرحوم ملکی تبریزی کا طریقہ

مرحوم حاج میرزا جواد آقا تبریزی کا شمار سیر وسلوک کے بلند مرتبہ اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ سیر و سلوک میں جو روش اختیار کی ہے وہ بعض جہات سے علامہ بحر العلوم سے منسوب رسالہ سے مختلف ہے۔

موصوف قرآن شریف کی مختلف آیات اور بہت سی احادیث کی روشنی میں لقاء اللہ کو سیر وسلوک کا مقصد اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ لقاء اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاکیزہ اور منزہ ہے کہ اسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے۔ اسی طرح لقاء اللہ سے مراد قیامت کے دن ثواب اور نعمتوں سے ملاقات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک قسم کا قلبی شہود ہے جس میں سالک دل کی آنکھ سے قلبی اور روحانی مشاہدہ کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ اس طویل اور نشیب وفراز سے بھرپور راستے کو طے کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں جس کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ اس راہ کو طے کرنے کی پختہ نیت۔

۲۔ گزشتہ اعمال سے صحیح توبہ کرنا، ایسی توبہ جو انسان کے وجود کی گہرائی اور اس کے اعمال پر اثر انداز ہو اور اسے اس طرح بدل ڈالے کہ گناہ کے اثرات اس کے جسم وجان سے زائل ہو جائیں۔

۳۔ صراطِ مستقیم کے لیے توشۂ سفر اختیار کرنا: اس کے لیے وہ چند لائحہ ہائے عمل تجویز کرتے ہیں:

الف۔ صبح کے وقت مشارطہ: (یعنی اپنے آپ سے شرط کرے کہ حق کے سوا کسی راہ پر نہیں چلے گا)۔

دن بھر مراقبہ: (یعنی سارا دن اپنے آپ پر کڑی نظر رکھے کہ راہ حق سے منحرف نہ ہوجائے)۔
شام کو محاسبہ: (یعنی اس طرف توجہ کرنا کہ دن بھر کیا کرتا رہا ہے)۔

ب۔ اوراد واذکار کی طرف توجہ اور بیداری اور سونے کے وقت کے اعمال کی طرف توجہ۔

ج۔ نماز شب کی طرف توجہ اور رات کی تنہائی میں اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز اور یہ کہ نیند اور غذا کی ریاضت میں غیر ضروری زیادہ روی سے پرہیز کرے۔

د۔ تازیانہ سلوک کا استعمال: اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی طرف توجہ کرنے اور حق کے بارے میں کسی قسم کی کوتاہی پر اپنا مواخذہ کرنا، اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنا اور اپنے پیمان سے بیوفائی اور شیطان کی پیروی پر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی سرزنش کرنا اور اخلاص کی راہ پر چلنے میں مسلسل جدوجہد کرنا۔

۴۔ تبدیلی کا آغاز: اس مرحلہ میں سالک ہر چیز سے قبل زندگی کے خاتمہ اور موت کے بارے میں غور وفکر کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بارے میں غور وفکر حب دنیا کو جلا کر خاکستر کر دینے اور بری صفات کی اصلاح کے لیے بہت موثر ہتھیار ہے۔ (اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے اسماء وصفات کے بارے میں غور وفکر کرے اور اولیائے حق کو یاد رکھے اور کوشش کرے کہ اپنے آپ کو ان کی صفات سے نزدیک کرے)۔

۵۔ منزل کے قریب: اس مرحلہ پر وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کے تین عالم ہیں:

۱۔ عالم حس وطبیعت ۲۔ عالم خیال ومثال ۳۔ عالم عقل وحقیقت

عالم حس وطبیعت صرف اور صرف تاریکی اور ظلمت ہے۔ جب تک آدمی اس عالم سے عبور کر کے آگے نہ بڑھ جائے تو وہ عالم مثال میں ہرگز داخل نہیں ہوسکتا۔ عالم مثال کے حقائق شکل وصورت کے حامل ہوتے ہیں اور مادہ سے آزاد معلوم نہیں ہوتے۔

جب تک سالک عالم مثال سے عبور نہ کرلے، وہ عالم عقل میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس عالم سے مراد وہ عالم ہے جس میں حقیقت اور نفس انسانی کی کوئی صورت اور مادہ نہیں ہوتا۔ جب سالک عالم عقل میں داخل ہوجاتا ہے اور اپنے نفس کو مادہ اور صورت کے بغیر دیکھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت عطا ہوتی ہے اور وہ "من عرف نفسه فقد عرف ربه" کا مصداق بن جاتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے مرحوم ملکی تبریزی کا رسالہ "لقاء اللہ" مطالعہ فرمائیں)۔

ایک اور طریقہ

آقائے حسن مصطفوی نے، جو ایک بلند پایہ عالم اور محقق ہیں، اپنے رسالہ "لقاء اللہ" میں سیر وسلوک الٰہی کے لیے ایک اور لائحہ عمل کا ذکر فرمایا ہے۔

وہ اس جامع رسالہ میں، جو کہ آیات واحادیث پر مبنی ہے، پہلے لقاء اللہ کے بارے میں آیات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ان کی تفسیر میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ سے روحانی اور معنوی ملاقات ہے۔ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس منزل مقصود کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر قسم کی مادی حدود، زمان ومکان کی حدود، یہاں تک کہ ذاتی حدود کو توڑ کر عالم لاہوت میں فنا ہو جائے اور اس آیت کا مصداق بن جائے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

''اے مطمئن روح! اپنے رب کی طرف پلٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔'' (فجر: ۲۷ تا ۳۰)

اس کے بعد وہ اس عظیم منزل تک پہنچنے کے لیے پانچ مراحل کو طے کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

۱۔ عقائد کی تکمیل اور مضبوطی اور اصولِ دین کی طرف خاص توجہ۔

۲۔ توبہ کے ذریعے گناہوں، اعمال صالح کی طرف واپسی (گناہوں سے پرہیز) اور واجبات کی انجام دہی۔

۳۔ نفس کو رذائل سے پاک اور اخلاقی فضائل سے آراستہ کرنے کے لیے تیار ہونا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی انانیت کو مٹا دینا اور اس کی عظمت کے سامنے فنا ہو جانا۔

اس مرحلہ میں مادی زندگی سے تعلق برطرف ہو جاتا ہے۔ مال، اولاد اور مادی لذتوں سے تعلق، روحانی اور معنوی تعلق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ میں صرف ایک تعلق باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے سالک کا اپنی ذات سے تعلق۔ یہ تعلق اس قدر گہرا اور مضبوط ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شدتِ ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔ یہاں پر ایک نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں تک سالک نے جو بھی مراحل طے کیے، وہ اپنی ذات کے لیے کیے۔ بالفاظ دیگر وہ ''خود'' کو لقاء اللہ کی منزل تک لے جانا چاہتا تھا۔ وہ خود اعلیٰ مقامات تک پہنچنا چاہتا تھا، بارگاہِ خدا کے مقربین میں شامل ہونا چاہتا تھا اور ان معنوی کمالات کے حصول کا خواہش مند تھا۔ یعنی وہ ہر مقام پر اپنے بارے میں سوچتا تھا نہ کہ ہدف کے بارے میں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی معنوی مقام پر پہنچتا تو اسے خوشی محسوس ہوتی تھی لیکن اگر کوئی اور اس مقام پر پہنچتا تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ یہاں سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اب ساری توجہ اسی ''میں'' (خود پسندی) کی طرف مبذول کی جائے تاکہ سالک کی ساری توجہ ظہور جلوۂ حق کی طرف ہو جو اس کی اپنی ذات کے ساتھ مشروط اور مقید نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ''میں'' یعنی خود پسندی کا خاتمہ ہونا ضروری ہے تاکہ لقاء اللہ کی منزل تک پہنچنے کا یہ آخری حجاب برطرف ہو جائے۔

اس حجاب کو برطرف کرنے کے کئی طریقے ہیں:

الف۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی اور توحید صفاتی کی طرف قلبی توجہ: اس توجہ سے سالک پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

سامنے غیر اللہ کی حقیقت ہیچ ہے۔

ب۔ انانیت اور حجاب نفس کو برطرف کرنے کے لیے فکر و استدلال کا راستہ: اس کے معنی یہ ہیں کہ سالک اللہ تعالیٰ کو ایک لامحدود، ازلی و ابدی وجود کے طور پر دیکھتا ہے جو کہ حی مطلق ہے جبکہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے محدود، انتہائی عاجز و ناتواں اور سراپا فقر و احتیاج پاتا ہے۔ ایسا محتاج اور فقیر جو ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ کے وجود کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔

ج۔ علاج بالاضداد: اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقام پر اپنے آپ کی طرف توجہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے صالح بندوں کے بارے میں غور و فکر کرے اور اپنے آپ کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں محسوس کرے۔

۵۔ اس مرحلہ میں سالک ایک ملکوتی انسان بن کر عالم جبروت میں داخل ہو جاتا ہے۔ عالم جبروت میں داخل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کمال خلوص و صفا کی وجہ سے اور نور الٰہی سے محو ہونے کی وجہ سے ایک اثر و رسوخ حاصل کر لیتا ہے اور الٰہی فرائض کو انجام دینے کے لیے، لوگوں کی ہدایت اور امر بالمعروف و نہی از منکر کے لیے مکمل معرفت کی بنیاد پر قدم اٹھاتا ہے۔

بالفاظ دیگر وہ کافی حد تک اپنی فکر سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے اور تمام مسائل، احکام، فرائض اور آداب شریعت اور علاج میں مہارت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے علامہ حسن مصطفوی کی کتاب ''لقاء اللہ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کتاب میں ہر جگہ آیات اور احادیث سے اپنی بات کو ثابت کیا ہے۔

مکاتب سیر و سلوک کا خلاصہ اور نتیجہ

علمائے سیر و سلوک اور اس راہ پر چلنے والوں کی تعلیمات سے، جن کے نمونے پیچھے صفحات میں بیان ہو چکے ہیں، مندرجہ ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

۱۔ سیر و سلوک کا حقیقی مقصد لقاء اللہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا چشم و دل سے شہود اور اس کی بارگاہِ مقدس میں روحانی اور معنوی طور پر حاضر ہونا ہے۔

۲۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان تمام گناہوں سے توبہ کرے، اپنے آپ کو اخلاقی رذائل سے پاک اور اخلاقی فضائل سے آراستہ کرے۔

۳۔ اس راہ میں آداب اربعہ یعنی مشارطہ، مراقبہ، محاسبہ اور مواخذہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی صبح کے وقت انسان یہ طے کر لے کہ دن بھر گناہ کے قریب نہیں جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی عمل انجام نہیں دے گا۔ پھر دن بھر اپنے سرکش نفس پر کڑی نظر رکھے۔ رات کو سونے سے قبل دن بھر کی کارکردگی کا جائزہ لے اور اپنا محاسبہ کرے۔ اگر محاسبہ

کے دورانِ ثابت ہو کہ اس سے کوئی غلط کام سرزد ہوا ہے تو بعض لذتوں کو ترک کر کے نفس کو سزا دے۔

۴۔ ہوائے نفس کے ساتھ جنگ کرنا، اس لیے کہ یہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ترین واجبات میں سے ہے۔

۵۔ شرع مقدس میں وارد ہونے والے اذکار و اوراد کی طرف توجہ کرنا جیسے "لاحول و لاقوۃ الا باللہ" اور "لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین"، اسی طرح "یا اللہ"، "یا حی" اور "یاقیوم" یہ اور ایسے اذکار اس راہ پر چلنے کی قوت کا سبب بنتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کی توحید ذات، توحید صفات اور توحید افعال کی طرف قلبی توجہ کرنا اور اس کی صفات کمال وجلال میں غرق ہو جانا۔ یہ بھی اس راہ پر نشیب وفراز کو طے کرنے کا ایک موثر توشہ وسامان ہے۔

۷۔ انانیت کے بت کو توڑنا جو سب سے بڑا بت ہے، یہ اس مقصد تک پہنچنے کی اہم ترین شرائط میں سے ہے۔

۸۔ ایسے استاد اور مربی کے زیر سرپرستی کام کرنا جس کی حیثیت ایک طبیب کی سی ہوتی ہے اور جو بیمار کا علاج کرتا ہے۔

اگرچہ بعض علماء نے اسے سیر وسلوک کی شرط قرار دیا ہے جبکہ بعض اس پر خاص اصرار نہیں کرتے۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے شیاطین کے خطرناک جال میں پھنس جاتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک فرشتہ کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پیروی میں لوگ اپنے دین، دنیا اور ایمان واخلاق سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

بعض علماء نے لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے کام کو اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کو، جو انبیاء واولیا کا کام ہے، سیر وسلوک کے آخری مرحلہ پر قرار دیا ہے جبکہ بعض نے اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا اور اسے سالک کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

اس کتاب میں ان مباحث کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے:

۱۔ ان افکار ونظریات کا خلاصہ پیش کرنا جو کہ بہر حال اخلاقی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں تا کہ اس کتاب کے قارئین زیادہ آگہی اور بصیرت کے ساتھ تہذیب اخلاق کی راہ پر قدم اٹھا سکیں۔

۲۔ اس راہ پر چلنے والے تمام افراد کو خبردار کرنا کہ حق اور باطل کے درمیان فرق بہت لطیف ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پاک دل نوجوان آب بقا تک پہنچنے کی امید میں اس وادی میں قدم رکھتے ہیں لیکن عقل وشریعت سے منحرف ہو کر کفر وضلالت کی گھاٹیوں میں گر جاتے ہیں اور رہبر نما رہزنوں کے ہتھے چڑھ کر اپنا سب کچھ برباد کر دیتے ہیں۔

دسواں باب

کیا ہر مرحلہ پر استاد اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے؟

سیر وسلوک کے بہت سے علماء کا عقیدہ ہے کہ کمال وفضیلت، تقویٰ واخلاق اور قرب الی اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی استاد کی سرپرستی میں عمل کریں۔ گزشتہ صفحات میں رسالہ سیر وسلوک، منسوب بہ بحر العلوم اور مرحوم علامہ طباطبائی کے رسالہ ''لب اللباب'' کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ بیان کیا کہ ان دونوں کتابوں کی فصل ۲۱ میں استاد اور مربی کی سرپرستی میں عمل کرنے کو سالک کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، خواہ یہ اساتیدِ خاصہ یعنی انبیاء اور آئمہ معصومین علیہم السلام ہوں یا عام اساتذہ جو اس راہ پر چلنے والی شخصیات ہیں۔

لیکن اس فن کے صاحب نظر افراد خبردار کرتے ہیں کہ تقویٰ اور تہذیب نفس کی راہ پر چلنے والوں کو چاہیے کہ بآسانی اپنے آپ کو ہر کس وناکس کی سرپرستی میں نہ دیں بلکہ انہیں چاہیے کہ جب تک ان کی علمی اور دینی صلاحیت کو اچھی طرح پرکھ نہ لیں، کسی کی سرپرستی کو قبول نہ کریں۔ یہاں تک کہ غیر معمولی کام انجام دینا، پوشیدہ امور کی خبریں دینا، مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا، حتی کہ پانی اور آگ کے اوپر سے گزرنا بھی کسی کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ غیر مہذب جوگی وغیرہ بھی اس قسم کے کام انجام دے سکتے ہیں۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ سیر وسلوک کے آغاز میں استاد کی سرپرستی میں عمل کرنا ضروری ہے لیکن جب اس سلسلہ میں قابل ذکر پیش رفت حاصل ہوجائے تو استاد اور سرپرست کی ہمراہی ضروری نہیں رہتی مگر یہ بات یقینی ہے کہ استادِ خاص یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے کسب فیض ہر مرحلہ پر لازم ہے۔

استاد اور مربی کی ضرورت کے اثبات کے لیے بعض اوقات سورۂ انبیاء کی آیت ۷ سے استدلال کیا جاتا ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

''اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو۔''

لیکن یہ آیت تعلیم کے بارے میں ہے، نہ کہ تربیت کے بارے میں۔ لیکن چونکہ بہت سے مقامات پر تربیت کی بنیاد تعلیم پر ہوتی ہے، لہٰذا ایسے مقامات پر علماء سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس میں اور کسی خاص فرد کو اپنے اعمال اور اخلاق کا سرپرست اور نگہبان بنانے میں واضح فرق ہے۔

بعض اوقات اس مؤقف پر حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے جو قرآن شریف میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک اولوالعزم نبی ہونے کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام سے بے

نیاز نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں:

طی این مرحله بی همرهی خضر مکن
ظلمات است بترس از خطر گمراهی
(اس مرحلہ کو خضر کی ہمراہی کے بغیر طے نہ کرو
تاریکیاں بہت ہیں، گمراہی کے خطرے سے ڈرو)

لیکن اگر داستانِ موسیٰ و خضر میں غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے حضرت خضر کی شاگردی اختیار کی تھی جس کا مقصد کائنات میں ہونے والے مختلف حوادث کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسرار کا علم حاصل کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم، علم ظاہر تھا جس کا تعلق ظاہری اعمال و فرائض سے تھا جبکہ حضرت خضر کا علم، علم باطن تھا اور اس کا دائرہ کار ظاہری اعمال و فرائض سے بالاتر تھا۔ [1]

اس داستان میں اگرچہ استاد کے حضور سے کسب فضائل کی اہمیت کی طرف اجمالی اشارہ ملتا ہے لیکن اس میں اور تمام مراحل تہذیب نفس میں ایک خاص استاد کا انتخاب کرنے میں فرق ہے۔

اس مسئلہ پر لقمان اور ان کے بیٹے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس الٰہی استاد نے اپنے بیٹے کے اخلاق کی سرپرستی کی اور منزل کمال تک پہنچنے کی راہ طے کرنے میں [2] اس کی مدد کی۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

هلك من ليس له حكيم يرشده

''جس کو کوئی ہدایت کرنے والا حکیم نہ ملے، وہ ہلاک ہو گیا۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۱۵۹)

لیکن ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کے اخلاقی مباحث میں ہمیشہ مخصوص استاد کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر وہ نہ ہو تو اخلاق، تقویٰ، تربیت نفس اور سیر و سلوک درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو آیات و احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے اور کتب اخلاق میں بزرگوں کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اس راہ کو طے کر کے اعلیٰ مقامات تک پہنچے ہیں۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مخصوص استاد کا ہونا اور پاکیزہ و مقدس افراد کے انفاس قدسیہ سے مدد لینا، راہِ کمال کو کم از کم مدت میں طے کرنے اور اخلاقی مشکلات کو حل کرنے کا اچھا ذریعہ ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، سورۂ کہف کی آیات ۶۰ تا ۸۲ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیے۔

[2] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۷ کی طرف رجوع فرمائیے۔

ایها الناس استصبحوا من شعلة مصباح واعظ متعظ

''اے لوگو! اپنے دل کے چراغ کو کسی باعمل واعظ کی نصیحت کے شعلے سے روشن کرو۔'' (خطبہ، ۱۰۵)

لیکن بدقسمتی سے بہت سی مثالیں ایسی ہیں جہاں استاد کے وجود سے الٹے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے آپ کو مربی اور مرشد کے طور پر متعارف کروایا، حالانکہ وہ رہبر نہیں بلکہ رہزن تھے اور پاک دل افراد کو تصوف کی راہ یا کسی اور گمراہی کی طرف لے گئے یا شرمناک اخلاقی برائیوں کی طرف لے گئے۔ اسی لیے ہم اس راہ پر چلنے والے تمام افراد کو خبردار کرتے ہیں کہ اگر وہ اخلاقی مسائل میں استاد کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو بہت احتیاط سے کام لیں اور اپنے انتخاب میں سخت گیری اور باریک بینی سے کام لیں۔ کبھی بھی ظاہر کا دھوکا نہ کھائیں بلکہ افراد کی سابقہ کارکردگی کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اہل علم کے مشورے سے کسی استاد اور مربی کا انتخاب کریں تاکہ اپنے مقصد کو پاسکیں۔

واعظ درونی کا کردار

بیرونی واعظ کے بارے میں کافی گفتگو ہوچکی ہے۔ اب واعظ درونی کے بارے میں گفتگو کی باری ہے۔ بعض احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کا بیدار ضمیر جسے واعظ درونی کا نام دیا گیا ہے، اخلاق وتقویٰ کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ اس کے بغیر اس راہ کو طے کرنا بہت مشکل ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ابن آدم انك لاتزال بخير ما كان لك واعظ من نفسك، وما كانت المحاسبة من همك

''اے فرزند آدم! جب تک تمہارے پاس واعظ درونی موجود ہو اور جب تک خود احتسابی تمہارا سب سے اہم کام ہو، تم ہمیشہ خیر اور نیکی کی راہ پر رہو گے۔'' (بحارالانوار، ۷۵، ۱۳۷)

معمولی سے فرق کے ساتھ آپؑ سے ہی ایک اور حدیث بھی منقول ہوئی ہے۔ (بحارالانوار، ۷۵: ۱۴۷)

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

واعلموا انه من لم يعن على نفسه حتى يكون له منها واعظ وزاجر، لم يكن له من غيرها لا زاجر ولا واعظ

''خوب جان لو کہ جب تک کوئی خود اپنی مدد نہ کرے اور اس کے اندر واعظ اور منع کرنے والا موجود نہ ہو، دوسروں کی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔'' (خطبہ: ۹۰)

واضح سی بات ہے کہ اس راہ میں انسان کو ایک ایسے واعظ کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ ہو، اس کے اندر کے رازوں سے باخبر ہو اور ہر وقت اس کی نگرانی کرے۔ واعظ درونی یعنی بیدار ضمیر کے سوا یہ کام کون کرسکتا ہے! یہی وہ واعظ ہے جو ارتکاب گناہ وخطا کے بعد اولین فرصت میں انسان کو سرزنش کرتا ہے اور اخلاقی انحطاط کی پستی میں گرنے سے باز رکھتا ہے۔

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اجعل من نفسك على نفسك رقيبا

''اپنے اندر میں سے اپنے اوپر ایک نگران مقرر کرو۔'' (غرر الحکم)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے ہی مروی ہے:

ينبغي ان يكون الرجل مهيمنا على نفسه مراقبا قلبه، حافظا لسانه

''ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس پر مسلط ہو، اپنے قلب کی نگرانی کرے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔'' (غرر الحکم)

گیارھواں باب

اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ضروری تیاری

تہذیب اخلاق میں ترقی اور پیش رفت کے بارے میں اب تک جن چیزوں کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی کئی اور عوامل ہیں جو رذائل اخلاقی کے خلاف جہاد اور فضائل اخلاقی کی تقویت کے لیے بہت موثر ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ ماحول کی پاکیزگی

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان کا معاشرتی ماحول اس کے باطن اور اس کے اعمال پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ انسان بہت سی صفات اپنے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ پاکیزہ ماحول میں عام طور پر پاکیزہ افراد پروان چڑھتے ہیں اور آلودہ ماحول میں آلودہ افراد کی پرورش ہوتی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ انسان ناپاک ماحول میں پاکیزہ زندگی گزار سکتا ہے اور اس کے برعکس پاکیزہ ماحول میں انسان ناپاک زندگی بھی گزار سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ماحول افراد کی خوبی یا بدی کی علت تامہ نہیں ہے لیکن ایک اہم عامل کے طور پر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ممکن ہے بعض لوگ ماحول کے جبر کے قائل ہوں۔ ہم اگرچہ ماحول کے جبر کے قائل نہیں ہیں لیکن موثر عوامل کی قوی تاثیر کا انکار ہرگز نہیں کرتے۔

اس مختصر اشارہ کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں جو انسان کی شخصیت پر ماحول کے اثر کے بارے میں دلالت مطابقی یا دلالت التزامی کے انداز میں گفتگو کر رہی ہیں:

۱۔ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۔ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

"پاکیزہ زمین کے عمدہ نباتات اس کے رب کے حکم سے اگتے ہیں جبکہ ناپاک زمین سے ناکارہ پودے اگتے ہیں۔ ہم اپنے دلائل کو اسی طرح شکر گزار لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔" (اعراف: ۵۸)

۲۔ وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَهُمْ ۚ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۚ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿١٣٨﴾

''اور ہم بنی اسرائیل کو دریا کے پار لے گئے۔ پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کی عبادت کر رہی تھی تو وہ کہنے لگ کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک ایسا خدا بنا دو جیسے ان کے خدا ہیں۔ موسیٰ نے کہا: تم جاہل لوگ ہو۔'' (اعراف:۱۳۸)

۳۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

''نوحؑ نے کہا: اے میرے رب! روئے زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑ، اس لیے کہ اگر تو نے انہیں زندہ چھوڑ دیا تو فاجروں اور کافروں کو ہی جنم دیں گے۔'' (نوح:۲۷۔۲۸)

۴۔ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین وسیع ہے، پس تم صرف میری عبادت کرو (اور دشمنوں کے دباؤ کے آگے نہ جھکو)۔'' (عنکبوت:۵۶)

۵۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان سے کہیں گے کہ تم کس حال میں تھے؟ (مسلمان ہونے کے باوجود کیوں کفار جیسے تھے) وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے وطن میں کمزور تھے۔ فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم کہیں ہجرت کر جاتے (ان کے پاس کوئی بہانہ نہ ہوگا) اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ان کا کیا ہی انجام ہے۔'' (نساء:۹۷)

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں انسان کے اعمال وافعال پر ماحول کے اثر کو لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں علمائے تفسیر نے مختلف قسم کے مطالب بیان کیے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وحی کا صاف اور خوشگوار پانی بارش کے قطروں کی طرح دل کی سرزمین پر برستا ہے۔ پاکیزہ دل اسے قبول کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں معرفت کے حسین پھول اور تقویٰ کے لذیذ پھل اس میں اگنے لگتے ہیں جبکہ ناپاک دلوں پر اس کا مناسب اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگوں پر انبیاء کی دعوت اور اسلامی تعلیمات کا ایک جیسا اثر

نہیں ہوتا تو اس کی وجہ فاعلیت کا نقص نہیں بلکہ قابلیت میں نقص ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس مثال کا مقصد یہ بات سمجھانا ہے کہ ہمیشہ نیکی اور برائی کی جستجو اس کی مناسب جگہ سے کرنی چاہیے، اس لیے کہ نامناسب جگہ پر جستجو کا نتیجہ توانائی کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس آیت کے بارے میں تیسرا احتمال بھی موجود ہے جو ہماری بحث میں مفید واقع ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کو نباتات اوران کے ماحول کو زمین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ برائی سے آلودہ ماحول میں پاکیزہ انسانوں کی پرورش مشکل ہے، خواہ تعلیمات کتنی ہی طاقتور اور موثر ہوں۔ جس طرح بارش کے قطروں کے بری زمین میں برسنے سے خوبصورت پودے نہیں اگتے، لہٰذا تہذیب نفس اور اخلاق صالح کی پختگی کے لیے ماحول کی اصلاح کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

البتہ مندرجہ بالا تینوں مطالب کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ تینوں باتیں اس تمثیل کے پیش نظر ہوں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ برائی سے آلودہ معاشرتی ماحول اخلاقی فضائل کا دشمن ہوتا ہے جبکہ پاکیزہ ماحول تہذیب وتزکیہ نفس کے لیے بہترین اور مناسب ترین حالات فراہم کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن رسولؐ اللہ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

ایاکم وخضراء الدمن، قیل یارسول اللہ و من خضراء الدمن قال: المرائۃ الحسناء فی منبت السوء

''کوڑے کے ڈھیر پر اگنے والے خوبصورت پودوں سے اجتناب کرو۔ صحابہ نے کہا: یارسولؐ اللہ! آپ کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ آپؐ نے فرمایا: برے ماحول میں پرورش پانے والی حسین عورت۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۴:۱۹، بحارالانوار، ۱۰۰:۲۳۲)

یہ تشبیہ انسان کی شخصیت پر اچھے یا برے ماحول کی تاثیر اور مسئلہ وراثت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔

دوسری آیت میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے جو مسلسل کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روحانی اور معنوی تعلیمات اور توحید و دیگر اسلامی عقائد کے ماحول میں رہتے رہے۔ انہوں نے دریا کے پھٹ جانے، فرعون کے چنگل سے آزادی پانے اور اس قسم کے دیگر کئی معجزے بھی دیکھے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھا تو ان سے متاثر ہو گئے اور کہنے لگے:

''اے موسیٰ! ہمیں بھی ان کے خداؤں جیسا ایک خدا بنا دو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اس بات سے سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی تم جاہل اور نادان قوم ہو۔ پھر انہوں نے بت پرستی کی برائیاں ان کے لیے بیان کیں۔

حیرت کی بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حقائق کی واضح تشریح کے باوجود اس ماحول کا منفی اور زہریلا اثر

ان کے اندر باقی رہ گیا اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طلائی بت بنا لیا اور ان جاہلوں کی اکثریت کو اپنے پیچھے لگا کر توحید سے گمراہ کر کے شرک کی راہ پر لے آیا۔

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بگڑا ہوا ماحول اخلاقی مسائل، حتیٰ کہ اعتقادی مسائل پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے عرصہ دراز تک مصر کے بت پرستوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں اس قسم کے فکری رجحانات پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے بت پرستی کا منظر دیکھا تو ان کے ان رجحانات میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ بہر حال یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ ماحول انسان کے افکار و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔

تیسری آیت حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی بت پرست قوم کے خلاف بد دعا کے ذکر پر مشتمل ہے جو اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ ماحول انسان کے اخلاق و عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بد دعا کے اختتام پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ:

''یا اللہ! اگر تو نے انہیں زندہ چھوڑ دیا تو یہ فاجروں اور کافروں کے سوا کسی کو جنم نہیں دیں گے۔''

یعنی یہ لوگ خود تو کافر اور گمراہ ہیں ہی مگر ان کے بنائے ہوئے ماحول میں پرورش پانے والی آئندہ نسلیں بھی فاجر اور کافر ہی بنیں گی۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں برائی سے آلودہ ماحول سے ہجرت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ میری زمین بہت وسیع ہے اور تم صرف میری ہی بندگی کرو (اور کفر و شرک سے آلودہ ماحول میں دشمنوں کے دباؤ کے سامنے نہ جھکو)۔

پانچویں آیت میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ انہیں خبردار کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں ان کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ آیت یہ کہہ رہی ہے:

''جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے تو ان سے کہیں گے کہ (مسلمان ہوتے ہوئے تم کفار کی صف میں کیوں کھڑے تھے) وہ جواب دیں گے کہ ہم اپنے وطن میں سخت دباؤ میں تھے، فرشتے ان سے کہیں گے کہ اللہ کی زمین اتنی وسیع تھی تو تم نے ہجرت کیوں نہ کی؟ (ان کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا اور وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے)۔''

ہجرت کا مسئلہ اسلام کے بنیادی ترین مسائل میں سے ہے، یہاں تک کہ اسلام کی تاریخ کی بنیاد بھی ہجرت کو ہی قرار دیا گیا ہے۔ ہجرت میں کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان برائی سے آلودہ ماحول اور اس کے منفی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں کے نادرست تصور کے خلاف ہجرت صرف ابتدائے اسلام کے دور سے مختص نہ تھی بلکہ جب بھی اور جہاں بھی مسلمان یہ محسوس کریں کہ کفر و شرک اور گناہ سے آلودہ ماحول میں رہنے سے ان کے عقائد و اخلاق کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو ان پر

واجب ہے کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ایک حدیث میں رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے:

من فربدینه من ارض الی ارض و ان کان شبرا من الارض استوجب الجنة و کان رفیق محمد(ص) و ابراهیم

''اگر کوئی اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جائے،خواہ ایک بالشت کے فاصلہ پر،تو وہ جنت کا حقدار بن جاتا ہے اور وہ محمد وابراہیم علیہما السلام کا ہم نشین ہوگا۔''

(نورالثقلین،۱:۵۴۱)

ایک بالشت کی مقدار کا ذکر اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی کوئی شخص ہجرت کرے گا،اس میں رسولؐ اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شباہت پیدا ہو جائے گی۔

مختصر یہ کہ ہر دور میں،معاشرتی ماحول انسان کو بنانے اور بگاڑنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔اگرچہ اس میں جبر کا عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔بنابرایں اخلاق کی پاکیزگی اور ملکات فاضلہ کی پرورش کے لیے ماحول کی پاکیزگی پر توجہ دینا اس سلسلہ کے اہم ترین امور میں سے ایک ہے۔

اگر ماحول اس قدر خراب ہو چکا ہو کہ اس کو ٹھیک کرنا ممکن نہ ہو تو ایسے ماحول سے ہجرت کرنا ضروری ہے۔جب کسی انسان کا دنیوی اور مادی مستقبل خطرے میں ہو تو وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے لیکن جب اس کا معنوی،مذہبی اور اخلاقی مستقبل خطرے میں ہو تو وہ ہجرت نہیں کرتا اور اس کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ اپنے وطن کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو ان برائیوں سے آلودہ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

تمام علمائے اخلاق پر لازم ہے کہ اخلاقی فضائل کی پرورش کے لیے ماحول کی پاکیزگی کے لیے منصوبہ بندی کریں کیونکہ اس کے بغیر کی جانے والی تمام کوششیں بے اثر نہیں تو کم اثر ضرور ہو جائیں گی۔

۲۔صحبت کا اثر

ایک اور عامل جس کی تاثیر تجربے سے ثابت ہو چکی ہے اور علمائے علم اخلاق و ماہرین تعلیم و تربیت بھی اس پر متفق ہیں، صحبت اور دوستی کا مسئلہ ہے۔عام طور پر دوست اور ساتھی پاکیزہ افراد کے آلودہ ہونے کا سبب بن جاتے ہیں۔اس کے برعکس پاکیزہ افراد بھی اپنے مضبوط ارادے کی بدولت ناپاک افراد کو پاکیزگی اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔اس مختصر اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان آیات پر نظر ڈالتے ہیں جو اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ

بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ﴿۳۸﴾

''جوکوئی رحمٰن کے ذکر سے منہ موڑے گا، ہم شیطان کو اس کے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور وہ (شیاطین) ایسے لوگوں کو اللہ کی یاد سے روک دیتے ہیں جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہیں۔ جب قیامت کے دن وہ ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے تو کہیں گے کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب جیسا فاصلہ ہوتا، تو کس قدر برا ہم نشین تھا۔''

(زخرف:۳۶، ۳۷، ۳۸)

۲۔ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ﴿۵۷﴾

''ان میں سے ایک کہے گا کہ میرا ایک دوست تھا جو یہ کہا کرتا تھا کہ کیا تو بھی اس بات کو سچ سمجھتا ہے کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور ہمیں جزا دی جائے گی۔ کیا تم اس کی خبر لینا چاہتے ہو، یہاں سے جہاں تم دیکھ رہے ہو، پھر اچانک وہ اسے جہنم میں دیکھے گا تو کہے گا اللہ کی قسم! تو تو مجھے ہلاک کرنے والا تھا۔ اگر میرے رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میں بھی اس وقت جہنم میں ہوتا۔'' (صافات:۵۱ تا ۵۷)

۳۔ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا﴿۲۹﴾

''جس دن ظالم حسرت کی شدت کی وجہ سے اپنے ہاتھ چبائے گا اور کہے گا: کاش میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ کاش میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے مجھے اللہ کی یاد سے روک دیا حالانکہ اللہ کی یاد میرے پاس آ چکی تھی۔ شیطان ہمیشہ ہی انسان کو ذلیل کرتا ہے۔''

(فرقان:۲۷، ۲۸، ۲۹)

تفسیر اور نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت اگرچہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ کی یاد سے غافل ہونے کی وجہ سے شیطان کی ہم نشینی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔لیکن یہ آیت انسان کے اخلاق اور انجام پر، بری صحبت کے اثرات کو واضح کرتی ہے۔

ابتداء میں یہ آیت کہتی ہے:

''جو کوئی اللہ کی یاد سے روگردانی کرے گا، ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیں گے جو ہمیشہ اس کے ساتھ اور اس کا ہم نشین بن کر رہے گا۔''

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾

اس کے بعد اس برے ہم نشین کے کردار کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ وہ شیاطین اللہ کی طرف جانے کا راستہ ان پر بند کر دیتے ہیں اور انہیں اس مقدس مقصد کی طرف بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ان سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ یہ گمراہ لوگ، گمراہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے ہیں:

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾

پھر اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہتی ہے:''قیامت کے دن جب سب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے، پردے ہٹ جائیں گے اور حقائق آشکار ہو جائیں گے تو وہ کہے گا کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب جتنا فاصلہ ہوتا، تو کس قدر برا ہم نشین ہے۔''

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾

ان بیانات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برے ساتھی انسان کو مکمل طور پر اللہ کی راہ سے منحرف کر سکتے ہیں۔یہ اس کے اخلاق کی بنیادوں کو تباہ کر سکتے ہیں اور حقائق کو اس طرح ان کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ وہ عین گمراہی میں ہوتے ہوئے خود کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان کی یہ حالت ہو جائے تو صراطِ مستقیم کی طرف اس کی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت بیدار ہوتا ہے جب سارے راستے اس پر بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

آیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برا ہم نشین آخرت میں بھی اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور یہ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ جو شخص انسان کی ہلاکت کا سبب بنا ہو، وہ ہر وقت اس کے ساتھ موجود ہو اور اسے کہا جائے کہ اب تم اس سے جدا ہونے کی آرزو نہ کرو، تم سب کا انجام ایک ہے:

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور (ان سے کہا جائے گا کہ) جبکہ تم (دنیا میں) کفر کر چکے تھے تو آج یہ بات تمہارے کام نہ آئے

گی کہ (تم اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو۔'' (زخرف:۳۹)

انہی آیات سے مشابہ سورۂ فصلت کی آیت ۲۵ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ۝۲۵

''ہم نے ان کے لیے برے ہم نشین مقرر کر دیئے جنہوں نے پیچھے سے اور آگے سے برائیوں کو آراستہ کر کے انہیں دکھایا۔ اللہ کا فرمان ان کے بارے میں وقوع پذیر ہوا اور اپنے سے پہلے جن وانس کے گمراہوں کے انجام سے دوچار ہو گئے، یقیناوہ خسارہ اٹھانے والے تھے۔''

دوسرے حصے کی آیات میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے برے ہم نشین ہمیشہ انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اپنی کوشش کے نتیجہ میں ان کے دام سے بچ جاتے ہیں، حالانکہ وہ ہلاکت کی سرحدوں تک آگے جا چکے ہوتے ہیں۔ ان آیات میں بھی انسان کے عقائد و اخلاق پر بری صحبت کے برے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ بری صحبت انسان کو برا بننے پر مجبور کر دے بلکہ ممکن ہے کہ انسان اپنی کوشش کے نتیجہ میں اپنے آپ کو بچالے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ اہل بہشت اپنے ساتھیوں سے کہیں گے کہ دنیا میں میرا ایک دوست تھا جو مجھے یہ کہتا رہتا تھا کہ کیا تم بھی ان باتوں کو سچ جانتے ہو کہ جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے؟ (لیکن اللہ کے فضل سے میں اس کی باتوں میں نہیں آیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا)۔ صافات، ۵۰ تا ۵۳

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۝۵۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ۝۵۱ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ۝۵۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ۝۵۳

اس موقع پر وہ اپنے اس پرانے اور نالائق دوست کی جستجو کرتا ہے اور جنت کی بلندی سے دوزخ کی طرف دیکھتا ہے تو اس کا وہ دوست جہنم میں غوطے کھاتا نظر آتا ہے:

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ۝۵۵

اسے دیکھ کر وہ اسے کہتا ہے کہ خدا کی قسم! تو مجھے ہلاک کر دینے والا تھا جس طرح تو خود ہلاک اور بدبخت ہو گیا ہے۔ اگر میرے رب کا فضل وکرم میرے شامل حال نہ ہوتا تو آج میں بھی دوزخ میں ہوتا:

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ۝۵۶ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۝۵۷

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ برا ساتھی انسان کو جہنم کے کنارے تک لے جاتا ہے۔ اگر انسان کا ایمان

پختہ نہ ہو، اس میں تقویٰ نہ ہو اور اللہ کا فضل وکرم اس کے شامل حال نہ ہو تو وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

آیات کے تیسرے گروہ میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ظالم برے اور نالائق دوستوں کے انتخاب پر سخت افسوس کریں گے، اس لیے کہ ان پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ان کی بدبختی کی اصل وجہ ان کی یہی دوستی تھی۔ اس دن ظالم حسرت اور پشیمانی کی شدت سے اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا کہ کاش! میں نے رسول کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا، کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے اللہ کا ذکر میرے پاس آ جانے کے بعد بھی مجھے گمراہ کر دیا اور شیطان تو ہمیشہ انسان کو ذلیل کرنے والا ہے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

اس طرح قیامت کے دن ظالم سب سے پہلے اس بات پر شدید پچھتاوے کا شکار ہوں گے کہ انہوں نے رسولؐ کا راستہ کیوں ترک کیا! اس کے بعد وہ برے لوگوں سے تعلق قائم کرنے کا اعتراف کرتا ہے اور اسی تعلق کو اپنی گمراہی کا اصل سبب قرار دیتا ہے، یہاں تک کہ ان کی تاثیر کو، انبیاء کی تاثیر سے زیادہ قوی قرار دیتا ہے (البتہ یہ بیمار دلوں کا معاملہ ہے)۔

آخری جملے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ برے دوست شیطان کا لشکر ہوتے ہیں جنہیں شیاطین انس کہا جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ان آیات میں ظالم کی پشیمانی کے بیان کے لیے:

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ

''ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے گا۔''

کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ افسوس اور پچھتاوے کی آخری منزل کا بیان کرتے ہیں۔

عام طور پر انسان افسوس وندامت کے اظہار کے لیے اپنی انگلی دانتوں میں دبا لیتا ہے۔ اس سے اگلے مرحلہ پر اپنے ہاتھ کی پشت پر کاٹتا ہے اور افسوس وندامت کے آخری مرحلہ پر یکے بعد دیگرے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے۔ درحقیقت اس طرح وہ اپنے آپ سے انتقام لیتا ہے کہ اس نے کیوں کوتاہی کی اور کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنی ہلاکت اور بدبختی کے اسباب فراہم کیے۔

ان آیات میں اور بعض دیگر آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے دوست اور ہم نشین اس کی سعادت اور ہلاکت میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ انسان کے اخلاق اور کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ اس کے عقائد کی تشکیل میں بھی موثر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات بہت ضروری ہے کہ ایک معلم اخلاق اپنے زیر تربیت افراد پر اس پہلو سے خصوصی توجہ دے۔ خاص طور پر دور حاضر میں، جبکہ نالائق دوستوں کے ذریعے برائی پھیلانے کے اسباب وحشت ناک صورت اختیار

کر چکے ہیں اور مختلف قسم کی اخلاقی برائیوں کا اصل سبب بن چکے ہیں۔

دوستوں کا کردار احادیث کی روشنی میں

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی بہت واضح احادیث موجود ہیں۔ رسولؐ اللہ کی ایک حدیث میں اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں:

المرء علی دین خلیله و قرینه

''انسان اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے۔'' (اصول کافی، ۲:۵ ۷ ۳)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ بات ایک اور انداز میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

لا تصحبوا اهل البدع ولا تجالسوهم فتصیر واعند الناس کواحد منهم قال رسول الله (ص) المرء علی دین خلیله وقرینه

''اہل بدعت سے دوستی نہ کرو اور ان کے ہم نشین نہ بنو، اس لیے کہ تم لوگوں کے ہاں انہی میں شمار کیے جاؤ گے، رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ انسان اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہوتا ہے۔'' (مذکورہ حوالہ)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دوستوں کے ایک دوسرے پر اثر کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

مجالسة الاخیار تلحق الاشرار بالاخیار و مجالسة الفجار تلحق الابرار بالفجار

''نیک لوگوں کی صحبت، برے لوگوں کو نیکوں سے ملا دیتی ہے اور برے لوگوں کی صحبت نیک لوگوں کو برے لوگوں سے ملحق کر دیتی ہے۔'' (صفات الشیعہ از شیخ صدوق بمطابق نقل از بحارالانوار، ۱۹۷:۷۱)

اسی حدیث کے ذیل میں ایک نہایت پر معنی جملے میں کہا گیا ہے:

فمن اشتبه علیکم امره ولم تعرفوا دینه فانظروا الی خلطائه

''اگر کسی شخص کا حال تم پر واضح نہ ہو اور تم اس کی دینداری کی کیفیت کو نہ جانتے ہو تو اس کے دوستوں کو دیکھو'' (یعنی اگر اس کے دوست اللہ سے محبت کرنے والے ہوں تو سمجھ لو کہ وہ مومن ہے اور اگر اس کی ہم نشینی حق کے دشمنوں سے ہے تو سمجھ لو کہ وہ بھی برا شخص ہے)۔

بعض روایات میں اس حقیقت کو اس تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے:

صحبة الاشرار تکسب الشر کالریح اذا مرت بالنتن حملت نتنا

''برے لوگوں کی صحبت سے برائی حاصل ہوتی ہے، جس طرح ہوا گندگی کے پاس سے گزرتی ہے تو بدبودار ہوجاتی ہے۔'' (غررالحکم)

ان بیانات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح برے لوگوں کی صحبت برائی کا راستہ ہموار کرتی ہے، اسی طرح اچھے لوگوں کی صحبت، ہدایت اور اخلاقی فضائل کی روشنی کو انسان کے دل میں زیادہ کردیتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

عمارة القلوب فی معاشرة ذوی العقول

''اہل عقل کی صحبت دلوں کو آباد کرتی ہے۔'' (غررالحکم)

نیز آپؑ سے ہی مروی ایک اور حدیث میں ہے:

معاشرة ذوی الفضائل حیاة القلوب

''اہل فضائل کی ہم نشینی دلوں کو زندہ کرتی ہے۔'' (غررالحکم)

دوستوں اور ہم نشینوں کا انسان کی باطنی خصوصیات پر کتنا گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کہتے تھے:

لا تحکموا علی رجل بشیء حتی تنظروا الی من یصاحب فانما یعرف الرجل باشکاله و اقرانه، وینسب الی اصحابه و اخدانه

''کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک اس کے دوستوں کے بارے میں معلوم نہ کرلو۔ اس لیے کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا اور انہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔'' (بحارالانوار، ۱۷:۱۸۸)

حضرت لقمان ایک خوبصورت حدیث میں اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں:

یابنی صاحب العلماء، واقرب منهم، وجالسهم وزرهم فی بیوتهم، فلعلك تشبههم فتکون معهم

''اے بیٹا! اہل علم سے دوستی کرو اور ان کے نزدیک رہو۔ ان کے گھر آمد و رفت رکھو تاکہ ان جیسے ہوجاؤ اور (دنیا اور آخرت میں) ان کے ساتھ رہو۔'' (غررالحکم)

مختصر یہ کہ احادیث میں دوستوں کے ایک دوسرے کے اخلاق پر اثر کے بارے میں بہت زیادہ اور پر معنی ارشادات موجود ہیں۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک وسیع مضمون تیار ہوسکتا ہے۔

اس بحث کا اختتام حضرت علی علیہ السلام کی اس مختصر مگر پر معنی حدیث پر کرتے ہیں، اس حدیث میں آپؑ اپنے فرزندِ عزیز حضرت امام حسن علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قارن اهل الخير، تكن منهم، وباين اهل الشر تبن عنهم

''اہل خیر کے قریب رہو، ان میں شامل ہوجاؤ گے۔ اہل شر سے دور رہو تا کہ ان کی برائی سے دور رہو۔''

(نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱)

صحبت کا اثر منطق کی روشنی میں

کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کے امکان کی بہترین دلیل اس کا وقوع ہے۔ جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس کے صحیح ہونے کی بہترین دلیل وہ عملی نمونے ہیں جنہیں ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ برے لوگوں کی صحبت انسان کو برا بنا دیتی ہے اور اچھے لوگوں کی صحبت انسان کی روح کی پاکیزگی اور نورانیت کا سبب بنتی ہے۔

پرانی کہاوت ہے کہ بری اخلاقی خصوصیات متعدی بیماریوں کی مانند ہوتی ہیں جو تیزی سے دوستوں اور ہم نشینوں میں منتقل ہوجاتی ہے، خاص طور پر اگر انسان کم عمر ہو، اس کی معلومات کم ہوں، ایمان وعقائد کمزور ہوں تو دوسروں کی اخلاقی خصوصیات زیادہ تیزی سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایسے افراد سے میل جول انسان کے لیے زہر قاتل ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اچھے یا برے افراد کا انجام دوستوں اور ہم نشینوں کے بدل جانے سے مکمل طور پر بدل جاتا ہے اور ان کی زندگی کے تمام اطوار و انداز بدل جاتے ہیں۔ اس بات کی متعدد نفسیاتی وجوہات ہیں:

۱۔ ماہرین نفسیات اپنی تحقیقات میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کے اندر نقالی یا بالفاظ دیگر تقلید کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یعنی لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے دوستوں اور اقرباء کے افعال کی نقالی یا تقلید کرتے ہیں۔ ہنس مکھ لوگ اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں ہنسی بکھیرتے ہیں جبکہ افسردہ افراد انجمن کو افسردہ کر دیتے ہیں۔

جو لوگ مایوس ہوتے ہیں، وہ اپنے دوستوں کو بھی مایوس کرتے ہیں۔ منفی سوچ رکھنے والے اپنے دوستوں کی سوچ کو بھی منفی بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوستوں کی خصوصیات ایک دوسرے پر تیزی سے اثر انداز ہوتی ہیں۔

۲۔ برائی کا مشاہدہ اور اس کا تکرار اس کی برائی کو کم کر دیتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے ایک عام چیز بنا دیتا ہے۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ گناہوں کو ترک کرنے کا ایک موثر سبب ان کے برا ہونے کا احساس ہے۔

۳۔ انسانوں پر تلقین کے اثر کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ برے دوست عام طور پر اپنے دوستوں پر تلقین کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدترین اعمال ان کی نظر میں اچھے نظر آنے لگتے ہیں اور ان میں اچھائی اور برائی کی تمیز کے معیار بالکل گر جاتے ہیں۔

۴۔ برے لوگوں کی صحبت انسان کے اندر منفی سوچ کو مضبوط کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کے بارے میں بدگمان ہو جاتا ہے۔ یہ بدگمانی اخلاقی فساد کی دلدل میں گر جانے کا ایک اہم سبب بنتی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار

''برے لوگوں کی صحبت انسان کو اچھے لوگوں کے بارے میں بدگمان کر دیتی ہے۔'' (بحار، ۷۱: ۱۹۷)

ایک اور حدیث میں برے لوگوں کی ہم نشینی کو دل کی موت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث میں ہے:

اربع یمتن القلب ..... ومجالسة الموتی، فقیل له یارسول الله و ما الموتی؟ قال (ص) کل غنی مسرف

''چار چیزیں دل کو مردہ کر دیتی ہیں جن میں سے ایک مردوں کی ہم نشینی ہے۔ پوچھا گیا کہ یارسولؐ اللہ! مردے کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہر دولت مند اسرافِ کار''۔ (بحار الانوار، ۷۱: ۱۹۵)

دوستوں کی اچھی یا بری صفات کے ایک دوسرے میں منتقل ہونے کے بارے میں شعراء و ادباء نے بھی دادِ سخن دی ہے:

کم نشیں بابدان کہ صحبت بد
گرچہ پاکی ترا پلید کند

(برے لوگوں کے ساتھ کم بیٹھو کیونکہ وہ تمہیں پلید کر دیں گے، خواہ تم پاک ہو)

آفتاب ارچہ روشن است آنرا
پارہ ای ابر ناپدید کند

(سورج اگرچہ روشن ہے مگر بادل کا ایک ٹکڑا اسے چھپا دیتا ہے)

بابدان کم نشین کہ بدمانی
خو پذیراست نفس انسانی

(برے لوگوں کے ساتھ کم بیٹھو، کیونکہ نفس انسانی دوسروں کی عادات کو قبول کرتا ہے)

صحبت نیک راز دست مدہ
کہ ومہ بہہ شود ز صحبت بہ

(اچھے لوگوں کی صحبت کو ترک نہ کرو کیونکہ اچھے لوگوں کی صحبت سے لوگ اچھے ہو جاتے ہیں)

اس سلسلہ میں اشعار تو بہت زیادہ ہیں، ہم اس بحث کو شیخ سعدی کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں:

گلی خوشبوی درحمام روزی
رسید از دست محبوبی بدستم
(ایک روز حمام میں خوشبودار مٹی کسی محبوب کی طرف سے میرے ہاتھ میں آئی)
بدوگفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دل آویز تومستم
(میں نے اس سے کہا تم مشک ہو یا عبیر کیونکہ میں تمہاری خوشبو سے مدہوش ہو گیا ہوں)
بگفتا من گلی ناچیز بودم
ولیکن مدتی باگل نشستم
(اس نے کہا کہ میں ناچیز مٹی تھی لیکن کچھ عرصہ پھول کی صحبت میں رہی)
کمال ہم نشین درمن اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم
(میرے ہم نشین کے کمال نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو نظر آ رہی ہوں)

۳۔اخلاق پر خاندانی تربیت وراثت کا اثر

ہم سب جانتے ہیں کہ بچے کی پہلی تربیت گاہ گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ بہت سی اخلاقی خصوصیات خاندان میں ہی نشوونما پاتی ہیں۔ خاندان کا اچھا یا برا ماحول اخلاقی فضائل کی پرورش میں بہت موثر واقع ہوتا ہے بلکہ اسے انسان کے اخلاق کی عمارت کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ بہت جلدی اثر قبول کرتا ہے اور بچپن میں جو چیزیں اس کی روح پر اثر انداز ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔

اس بات کو حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

العلم (فی) الصغر کالنقش فی الحجر

''بچپن کی تعلیم پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔'' (بحار الانوار، ۱: ۲۲۴)

بچہ اپنے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں سے بہت سی اخلاقی خصوصیات سیکھتا ہے۔ شجاعت، سخاوت، صداقت، امانت اور ان جیسی دیگر صفات بچے بڑی آسانی سے اپنے بڑوں سے سیکھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جھوٹ، خیانت، بے راہ روی اور ایسے ہی اخلاقی رذائل بھی بچوں کے اندر بڑوں سے ہی آتے ہیں۔

اس کے علاوہ ماں باپ کی اخلاقی خصوصیات، وراثت کے ذریعے بھی بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ جینز کے ذریعے والدین کی

جسمانی خصوصیات کے ساتھ ان کی اخلاقی خصوصیات بھی بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ اگر چہ ان کی تاثیر سو فیصد نہیں ہوتی اور بچہ ان کی وجہ سے مجبور نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تبدیلی بھی ممکن ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں ماں باپ دو طرح سے اپنے بچوں کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں جنہیں تکوین اور تشریع کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تکوین سے مراد وہ اخلاقی خصوصیات ہیں جو نطفہ میں پوشیدہ ہیں اور غیر شعوری طور پر بچوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ تشریع سے مراد وہ تعلیم و تربیت ہے جو شعوری طور پر انجام پاتی ہے اور اچھی یا بری اخلاقی صفات کی بنیاد بنتی ہے۔

اگر چہ ان دونوں میں جبر کا عنصر نہیں پایا جاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ انسان کی صفات اور باطنی کیفیات کی زمین ضرور ہموار کرتی ہیں۔ اس بات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ پاک، صالح، شجاع اور مہربان افراد کے بچے بھی انہی کی مانند ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ آلودہ افراد کے بچے بھی آلودہ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں اقسام کی مثالوں میں استثناء بھی پایا جاتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وراثت و تربیت کا اثر جبری نہیں ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی ان آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

''اس لیے کہ اگر تو نے انہیں باقی رکھا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف فاجر اور کافر نسل کو جنم دیں گے۔'' (نوح)

۲۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

''اللہ نے اسے (مریم کو) عمدہ انداز میں قبول فرمایا اور اس کی اچھی پرورش کی اور اس کی کفالت کی ذمہ داری ذکریا کو سونپی۔'' (آل عمران: ۳۷)

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر برتری عطا فرمائی۔ وہ ایسی نسل کے لوگ تھے جو (تقویٰ اور پاکیزگی میں) ایک دوسرے سے تھے اور اللہ سننے، جاننے والا ہے۔''

۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

''اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' (تحریم: ۶)

۵۔ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

''اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ بدچلن آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکردار تھی۔'' (مریم:۲۸)

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ نے ان کی تباہی کے لیے عذاب کی دعا کرتے ہوئے یہ دلیل بھی بیان کی کہ اگر یہ قوم باقی رہی تو دوسروں کو بھی گمراہ کرے گی اور ان سے صرف فاجر اور کافر نسل ہی جنم لے گی:

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فاسد اور مفسد افراد جن کی نسلیں بھی فاسد اور مفسد ہوتی ہیں، انہیں جینے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ انہیں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوکر نیست و نابود ہوجانا چاہیے۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ معاشرتی ماحول، خاندانی تربیت اور وراثت بھی اخلاق وعقائد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام دوٹوک الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ ان کی ساری نسل فاسد اور کافر ہوگی، اس لیے کہ ان کے معاشرے میں برائی کی موج اس قدر طاقتور تھی کہ اس کے اثر سے نجات حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا جبری اثر سو فیصد اور یقینی ہوتا ہے اور انسان بے اختیار اس کی طرف مائل ہوجائے۔

بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس حقیقت کو وحی الٰہی کی روشنی میں جانتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا دیا تھا کہ:

اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ

''ان میں سے جو اب تک ایمان لا چکے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔'' (ہود:۳۶)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ آیت آئندہ نسلوں کے بارے میں بھی ہو۔ لہٰذا بعید از قیاس نہیں ہے کہ انہوں نے آنے والی نسل کے بارے میں یہ فیصلہ مندرجہ بالا تینوں عوامل (ماحول، تربیت اور وراثت) کی بنیاد پر کیا ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ قوم نوحؑ کے گمراہ لوگوں کے بچے جب حد بلوغ کو پہنچتے تو وہ انہیں لے کر حضرت نوحؑ کے پاس آتے اور اسے کہتے کہ اس بوڑھے کو دیکھ رہے ہو، یہ ایک جھوٹا شخص ہے، اس سے بچ کر رہنا، میرے باپ نے بھی مجھے یہی نصیحت کی تھی (تم بھی اپنے بچوں کو اسی طرح نصیحت کرنا)۔

اس طرح فاسد نسلیں ایک دوسرے کے بعد آتی تھیں اور چلی جاتی تھیں۔ (فخر رازی اور تفسیر مراغی)

قرآن مجید میں حضرت مریم علیہا السلام، جو کہ دنیا کی معزز ترین اور عظیم ترین خواتین میں سے تھیں، ان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت، خاندانی تربیت اور ماحول انسان کی روحانی کیفیات پر اثر انداز ہوتے ہیں، لہٰذا پاکدامن اور پاکیزہ بچوں کی پرورش کے لیے ان عوامل کی تاثیر پر ضرور توجہ دی جانی چاہیے۔

ان عوامل میں سے ایک زمانۂ حمل میں ماں کی ذہنی اور روحانی کیفیت ہے جس کی بنیاد پر وہ ہر وقت بچے کو شیطان کے وسوسوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اللہ کی پناہ میں دیتی ہے اور یہ آرزو رکھتی ہے کہ وہ بچہ اللہ کے گھر کے خدمت گزاروں میں سے ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس کی منت بھی مان لیتی ہے۔

مندرجہ بالا آیت یہ کہہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے احسن انداز میں قبول فرمایا اور اس کی عمدہ پودے کے انداز میں پرورش فرمائی۔

پاکیزہ انسان کو ایک پاکیزہ اور عمدہ پودے سے تشبیہ دینا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح خوبصورت پھول یا اچھے پھل کا پودا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اچھے بیج کا استعمال کیا جائے، اس کی نشوونما کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے اور باغبان مسلسل اس کی دیکھ بھال کرتا رہے، اچھے انسان کی پرورش کے لیے بھی یہ سب کچھ ضروری ہے اور وراثت، ماحول اور خاندانی تربیت کا اس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت کے ذیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ

یعنی ''اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی کفالت کی ذمہ داری حضرت ذکریاؑ کو سونپی۔''

ظاہر سی بات ہے کہ جو حضرت زکریا علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی کی گود میں پلی ہو، اس کی شخصیت پر اس تربیت کا کیسا اثر ہوا ہوگا۔

لہٰذا یہ بات ہرگز قابل تعجب نہیں ہونی چاہیے کہ اس عمدہ تربیت کے نتیجہ میں حضرت مریم ایمان، اخلاق اور تقویٰ میں ایسے مقام پر فائز ہوگئیں جس کی طرف آیت کا یہ حصہ اشارہ کرتا ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

''جب بھی ذکریاؑ ان کی عبادت گاہ میں داخل ہوتے، ان کے پاس کھانا دیکھتے اور پوچھتے کہ اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملا؟ وہ جواب دیتیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔''

جی ہاں! جنتی تربیت کا نتیجہ بھی جنتی اخلاق اور جنتی خوراک ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں، جو درحقیقت اس آیت کی تمہید ہے جس میں حضرت مریم اور حضرت ذکریا علیہما السلام کے ذریعے ان کی تربیت کا ذکر کیا گیا ہے، پاکیزگی، تقویٰ اور فضیلت کے حصول میں وراثت اور تربیت کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آل عمران کو اہل عالم پر چن لیا اور برتری دی۔ وہ ایک ایسی نسل کے لوگ تھے (جو پاکیزگی اور فضیلت میں ایک دوسرے سے تھے) اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ان کا ایک دوسرے سے ہونا، وراثت کے عنصر کی طرف اشارہ ہے یا خاندانی تربیت کی طرف یا دونوں کی طرف۔ اس آیت کے ذیل میں جو روایات [1] نقل ہوئی ہیں، ان میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ آیات ناقابل انکار طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کا تربیتی ماحول اور اس کی وراثت، ضروری قابلیت اور لیاقت پر اثر ڈالتے ہیں۔ جو افراد ایسی تربیت اور وراثت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، ان کا ایسے لوگوں سے موازنہ بھی نہیں کیا جا سکتا جو آلودہ وراثت اور غلط تربیت یافتہ ہوں۔

چوتھی آیت اہل ایمان کو مخاطب کر کے کہہ رہی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

یہ آیت سورۂ تحریم کی ابتدائی آیات کے بعد ہے جن میں ازواجِ رسول کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے اعمال پر خصوصی طور پر نظر رکھیں۔ اس کے بعد اس آیت میں یہی بات عمومی انداز میں سب مسلمانوں سے کہی گئی ہے۔

واضح سی بات ہے کہ یہاں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے۔ اس سے دور رکھنا اور بچانا صرف خاندانی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ہی ممکن ہے جو گناہوں کو ترک کرنے، نیکیوں کی طرف مائل ہونے اور تقویٰ کا سبب بنتی ہے۔ اس طرح یہ آیت جہاں خاندان کے بارے میں سرپرست کے فرض کی نشاندہی کر رہی ہے، وہاں تقویٰ اور فضائل اخلاقی کے حصول میں تعلیم و تربیت کی تاثیر کو بھی واضح کر رہی ہے۔

تعلیم و تربیت کا لائحہ عمل خاندان کی تشکیل کے سنگ بنیاد یعنی شادی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بچے کی پیدائش سے لے کر دیگر تمام مراحل میں اسے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھانا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب مندرجہ بالا آیات نازل ہوئی تو ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا:

---

[1] نور الثقلین، ۱: ۳۳۱ کی طرف رجوع فرمائیے۔

''یارسولؐ اللہ! میں کس طرح اپنے خاندان کو جہنم کی آگ سے بچاؤں؟''

آپؐ نے فرمایا:

تأمرهم بما امر الله و تنهاهم عما نهاهم الله ان اطاعوك كنت قد وقيتهم، وان عصوك كنت قد قضيت ما عليك

''انہیں امر بالمعروف ونہی ازمنکر کرو۔ اگر وہ قبول کرلیں تو تم نے انہیں آتش جہنم سے بچا لیا اور اگر قبول نہ کریں تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔'' (نورالثقلین، ۵:۲۷۳)

یہ نکتہ بھی نہایت واضح ہے کہ امر بالمعروف خاندان کو جہنم سے بچانے کا ایک موثر ذریعہ ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا چاہیے اور تمام نفسیاتی، قولی اور عملی پہلوؤں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے یہ آیت وراثت کے مسئلہ پر بھی نظر رکھتی ہو کہ انسان انعقادِ نطفہ کے وقت رزقِ حلال کھائے ہوئے ہو اور یادِ خدا میں مصروف ہوتا کہ پیدا ہونے والا بچہ مثبت وراثت کے ساتھ دنیا میں آئے، اس لیے کہ آتش جہنم سے دور رکھنے میں یہ باتیں بھی شامل ہیں۔

پانچویں اور آخری آیت حضرت مریم اور بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ کی ولادت کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس آیت میں ہے کہ جب حضرت مریم اپنے نومولود بچے کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئیں تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ تو نے عجیب برا کام کیا ہے:

''اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہیں تھا، تیری ماں بھی بدکار نہ تھی (پھر تو کیسے شوہر کے بغیر ماں بن گئی؟'')

یہ الفاظ (خاص طور پر اس لیے کہ قرآن مجید نے انہیں نقل کیا ہے اور ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کی ہے) اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ماں باپ کی طرف سے وراثت کا عنصر اور اسی طرح خاندانی تربیت، انسان کے اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جسے سب لوگ تجربہ کی بنیاد پر جانتے تھے اور اگر اس کے خلاف کوئی چیز رونما ہوتی تو اس پر حیرت کا اظہار کرتے۔

مندرجہ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے کہ اخلاقی مسائل میں وراثت اور خاندانی تربیت کے عنصر کا کردار بہت اہم ہے، خواہ یہ کردار مثبت پہلو میں ہو یا منفی میں۔

اخلاق اور خاندانی تربیت احادیث کی روشنی میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان کی پہلی درسگاہ دامنِ مادر اور باپ کی آغوش ہوتی ہے۔ اسی درسگاہ میں بچہ فضائل و رذائل کا پہلا سبق سیکھتا ہے۔ اگر تربیت کے مفہوم کا دائرہ تکوینی اور تشریعی تک بڑھا دیا جائے تو پہلا مدرسہ رحم مادر اور صلب پدر ہوتا ہے جو بچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی فضیلت اور رذیلت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

احادیث میں انتہائی لطیف عبارات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔نمونے کے طور پر ذیل میں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

حسن الاخلاق برهان كرم الاعراق

''حسن اخلاق انسان کی اچھی وراثت کی دلیل ہے۔'' (غرر الحکم)

یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ اور صاحب فضیلت خاندانوں میں زیادہ تر با فضیلت بچے پروان چڑھتے ہیں جبکہ برے افراد عام طور پر برے خاندانوں میں پرورش پاتے ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عليكم فى طلب الحوائج بشراف النفوس و ذوى الاصول الطيبة فانها عندهم اقضى وهى لديهم ازكى

''اپنی حاجات کی طلب میں ایسے افراد کی طرف رجوع کرو جو شریف النفس ہوں اور انہوں نے پاکیزہ خاندانوں میں پرورش پائی ہو۔ایسے لوگ حاجات کو بہتر اور پاکیزہ طور پر پورا کرتے ہیں۔''

۳۔ حضرت علی علیہ السلام مالک اشتر کے نام عہد نامہ میں قابل افسروں کے انتخاب کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم الصق بذوى المروءات والاحساب و اهل البيوتات الصالحة والسوابق الحسنة ثم اهل النجدة و الشجاعة و السخاء و السماحة فانهم جماع من الكرم و شعب من العرف

''پھر ان لوگوں سے تعلق قائم کرو جو اچھے خاندانوں سے اور اچھے ماضی کے حامل ہوں۔اس کے بعد شجاع، سخی اور بزرگ منش افراد سے تعلق پیدا کرو، اس لیے کہ وہ نیکی اور فضیلت کا مرکز ہیں۔''

۴۔ برے والدین کا اثر بچوں کے اخلاق پر اس حد تک ہوتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ايما امراة اطاعت زوجها وهو شارب الخمر، كان لها من الخطا يابعدد نجوم السماء، وكل مولود يلد منه فهو نجس

''جو عورت شراب خور شوہر کی اطاعت کرے (یعنی اسے ہم بستری کرنے دے) تو وہ آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر گناہوں کی مرتکب ہوتی ہے اور اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ نجس ہوگا۔'' (لئالی

الاخبار)

متعدد احادیث میں شراب خور اور بد اخلاق شخص کو رشتہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔(وسائل الشیعہ، ۱۴، ۵۴، ۵۵)

۵۔ ماں باپ کی تربیت کا بچوں کی شخصیت پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ مشہور حدیث نبوی میں ہے کہ:

كل مولود يولد على الفطرة حتى يكون ابواه هما اللذان يهودانه و ينصرانه

''ہر نومولود توحید اور اسلام کی پاکیزہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔'' (مجمع البیان، سورۂ روم: ۳۰)

جب خاندانی تربیت ایمان اور عقیدہ کو بدل سکتی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اخلاق پر اثر انداز نہ ہو؟

۶۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت کو ماں باپ پر بچے کا بنیادی ترین حق قرار دیا گیا ہے۔حدیث نبویؐ میں ہے:

حق الولد على الوالد ان يحسن اسمه و يحسن ادبه

''باپ پر بچے کا حق یہ ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھے آداب سکھائے۔'' (کنز العمال، حدیث ۴۵۱۹۲)

واضح سی بات ہے کہ نام کا بچوں کی شخصیت پر گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔عظیم شخصیات اور صاحبان تقویٰ وفضیلت افراد کے ناموں پر بچوں کے نام رکھنا، بچوں کو ذہنی طور پر ان کے قریب کر دیتا ہے۔اسی طرح اہل فسق وفجور کے نام انسان کو ان کے نزدیک کر دیتے ہیں۔

اسلام نے اس لطیف نفسیاتی مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور کتب احادیث میں اچھے اور برے ناموں کے بارے میں مفصل ابواب مرتب کیے گئے ہیں۔(وسائل الشیعہ، ۱۵: ۱۲۲ تا ۱۳۲)

۷۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ما نحل والد ولده افضل من ادب حسن (کنز العمال، حدیث ۴۵۴۱۱)

''بہترین دولت جو ایک باپ اپنے بچے کو دے سکتا ہے، وہ حسن ادب ہے۔''

۸۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

و انك مسول عما وليته به من حسن الادب و الدلالة على ربه عزوجل و المعونة له على طاعته

''تمہیں جن کا سرپرست بنایا گیا ہے، تم ان کے حسن ادب، اللہ کی طرف ان کی ہدایت اور اللہ کی اطاعت میں ان سے تعاون کرنے کے ذمہ دار ہو۔'' (بحار الانوار، ۷۱: ۴)

۹۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ حسن اخلاق بہترین ورثہ ہے جو باپ سے اولاد کو ملتا ہے:

خیر ماورث الآباء الابناء الادب

''اچھے آداب وتربیت بہترین ورثہ ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملتا ہے۔'' (غرر الحکم)

اس بحث کو نہج البلاغہ میں سے حضرت علی علیہ السلام کے ایک فرمان پر ختم کرتے ہیں۔ جب کچھ جہلاء نے امیر المومنینؑ کی شخصیت کا دوسروں سے موازنہ کیا تو آپؑ نے اپنا مقام اور مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وقد علمتم موضعی من رسول اللہ بالقرابۃ القریبۃ والمنزلۃ الخصیصۃ وضعنی فی حجرہ و انا ولید یضمنی الی صدرہ..... یرفع لی کل یوم علما من اخلاقہ ویامرنی بالاقتداء

''رسولؐ اللہ سے جو خصوصی قرابت اور منزلت مجھے حاصل تھی، تم اسے خوب جانتے ہو۔ آنحضرتؐ بچپن میں مجھے اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور اپنے سینے سے لگاتے تھے اور ہر روز فضائل اخلاق کا ایک پرچم میرے لیے بلند فرماتے تھے اور مجھے حکم دیتے تھے کہ میں ان کی پیروی کروں (میری موجودہ اخلاقی حالت رسولؐ اللہ کی اسی تربیت کا نتیجہ ہے۔''

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس خطبہ میں رسولؐ اللہ کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

ولقد قرن اللہ بہ (ص) من لدن ان کان فطیما اعظم ملک من ملائکتہ یسلک بہ طریق المکارم و محاسن اخلاق العالم لیلہ ونہارہ

''رسولؐ اللہ کی شیر خوارگی کے ایام ختم ہوتے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں میں سے سب سے بڑے فرشتے کو ان کے ساتھ لگا دیا جو انہیں شب و روز اچھی صفات اور اخلاق حسنہ کی راہ پر چلاتا تھا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ)

بنابرایں رسولؐ اللہ فرشتے کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ انسان کی اچھی یا بری اخلاقی صفات اس کے اندر سے ہی اور اس کے ارادے سے وجود میں آتی ہیں۔ لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اچھے اور برے اخلاق کے تشکیل پانے میں متعدد عوامل کارما ہیں جن نیں سے ایک والدین کی طرف سے ملنے والی وراثت اور خاندانی تربیت بھی ہے۔ علمی اور منطقی تجزیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے بہت سے عملی اور تجرباتی دلائل موجود ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اسی وجہ سے کسی فرد یا معاشرے کو حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاندانی وراثت اور تربیت پر توجہ دی جائے اور انسان کی شخصیت کی تشکیل میں اس دور کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

۴۔علم وآ گہی کا اثر

اخلاقی تربیت کے لیے ایک اور اہم عنصر افراد کے علم وآ گہی کی سطح کو بلند کرنا ہے، اس لیے کہ منطق اور تجربہ کی رو سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ انسان کے علم ومعرفت کی سطح جس قدر بلند ہوتی ہے، اس میں اخلاقی فضائل کی نشوونما بھی اسی قدر بہتر ہوتی ہے۔اس کے برعکس جہالت اور معارف الٰہیہ سے ناواقفیت سے فضائل اخلاقی کو بہت نقصان پہنچتا ہے اور اخلاقی سطح انتہائی پست ہوجاتی ہے۔

کتاب کے آغاز میں ہم علم اور اخلاق کے باہمی تعلق کے بارے میں مختصر بحث کر چکے ہیں۔ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے اس قدر گہرا تعلق ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ علم مساوی ہے اخلاق کے۔

بالفاظِ دیگر علم وحکمت اخلاق کا سرچشمہ ہیں (اور جیسا کہ سقراط سے منقول ہے):

''رذائل اخلاقی جہل ونادانی کا نتیجہ ہیں، مثلاً متکبر اور حاسد انسان اس لیے تکبر اور حسد میں گرفتار ہوتے ہیں کہ وہ ان کے برے اثرات سے لاعلم ہوتے ہیں۔''

بنابرایں اگر معاشرے میں علم ومعرفت کی سطح بلند ہوجائے تو اس سے لوگوں کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اگر چہ اس بات میں کسی حد تک مبالغہ پایا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم اخلاقی تربیت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اہل علم ہیں، ان کی اخلاقی آلودگی جاہل افراد کی اخلاقی آلودگی کی نسبت کم ہوتی ہے۔اگر چہ ان دونوں میں استثناء بھی پایا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں رسولؐ اللہ کی دعوت کے بارے میں ہے کہ وہ اس لیے مبعوث ہوئے تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنائیں اور انہیں اخلاقی آلودگی اور گناہوں سے پاک کریں:

هو الذی بعث فی الامین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویز کیهم و یعلمهم الکتب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین

''اس طرح، ضلال مبین اور کھلی گمراہی سے نجات اور رذائل اخلاقی اور گناہوں سے پاک ہونا قرآن مجید کی آیات کی تلاوت اور تعلیم کتاب وحکمت کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں جو یقینی طور پر ان دونوں کے باہمی ربط وتعلق کی دلیل ہے۔''

پیام قرآن کے دورۂ اول کی پہلی جلد میں، معرفت وشناخت کی بحث کے ذیل میں ہم نے قرآنی آیات کی رو سے علم و معرفت اور اخلاقی فضائل کے باہمی ربط اور جہل ونادانی اور رذائل اخلاقی کے باہمی ربط پر بہت سارے شواہد پیش کیے۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر اختصار کے ساتھ ان نمونوں کا ذکر کریں گے:

۱۔ جہالت ہر فساد اور گمراہی کی جڑ ہے۔سورۂ نمل کی آیت ۵۵ میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنی گمراہ قوم سے کہتے ہیں:

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ۝۵۵

''تم اپنی شہوت کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رخ کرتے ہو۔تم ایک جاہل قوم ہو۔''

یہاں جہالت اور نادانی کو جنسی انحراف کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ جہالت جنسی بے راہ روی کا سبب ہے۔سورۂ یوسف کی آیت ۳۳ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ جنسی بے راہ روی اور جہالت کے باہمی رابطہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ۝۳۳

''(یوسفؑ نے) کہا:اے میرے رب!زندان مجھے اس چیز سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں۔اگر تو ان کی چالوں سے مجھے نہ بچائے تو میں ان کی طرف مائل ہوسکتا ہوں اور جاہلوں میں سے ہوجاؤں گا۔''

۳۔ جہالت حسد کی وجوہات میں سے ایک ہے۔سورۂ یوسف کی آیت ۸۹ میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے (جب وہ مصر کے حاکم بن گئے تھے تو غلہ لینے کے لیے آنے والے اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں):

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ۝۸۹

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا،جب تم جاہل تھے۔''

یعنی تمہاری جہالت اس حسد کا سبب بنی جس کی وجہ سے تم نے یوسفؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے کنویں میں پھینکا۔

۴۔ جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا سبب ہے۔سورۂ فتح کی آیت ۲۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اللہ کے خلاف مشرکین کے تعصب اور ان کی ضد کی اصل وجہ ان کی جہالت تھی:

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ

''یاد کرو جب کافروں نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھر لیے۔''

۵۔ جہالت اور بہانہ جوئی کا باہمی تعلق ہے تاریخ انبیاء ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ان کی جاہل قومیں جہالت کی وجہ سے کیسے کیسے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں۔قرآن مجید نے ان کی بہانہ جوئی اور جہالت کے باہمی تعلق کو بار بار بیان فرمایا ہے۔سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۸ میں ہے:

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ

قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ

''جولوگ علم نہیں رکھتے تھے، انہوں نے کہا کہ اللہ ہم سے کیوں بات نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ ان سے پہلے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ ان کے دل ایک جیسے ہیں۔''

یہاں جہل اور لاعلمی کو بہانہ جوئی کا بنیادی سبب قرار دیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ اخلاقی بے راہ روی اور جہالت کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔

۶۔ جہالت اور بدگمانی کا بھی تعلق ہوتا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں جنگ احد میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ

''پھر (شکست کے) غم کے بعد اس نے ہلکی نیند کی شکل میں تم پر امن نازل کیا جس نے تم میں سے کچھ لوگوں کو ڈھانپ لیا جبکہ بعض دوسرے جنہیں اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی، اللہ کے بارے میں جاہلیت کی ناحق بدگمانی میں مبتلا تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ بدگمانی ایک اخلاقی برائی ہے جو دوسری بہت سی فردی اور معاشرتی برائیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس آیت میں جہل اور بدگمانی کا تعلق واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ بے ادبی جہالت سے جنم لیتی ہے۔ سورۂ حجرات کی آیت ۴ میں رسولؐ اللہ کے شایانِ شان احترام نہ کرنے والوں کو جاہل قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴

''اے رسولؐ! جولوگ آپؐ کے حجروں کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔''

اس آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو وقت بے وقت آنحضرتؐ کے گھر کے باہر آ کر آوازیں لگاتے کہ:

یا محمد ﷺ! یا محمد! اخرج الینا

''اے محمدؐ! باہر آؤ۔''

ان کی یہ حرکت آنحضرتؐ کو بہت ناگوار اور شاق گزرتی تھی مگر آپؐ شرافت اور لحاظ کی وجہ سے خاموش رہتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۂ حجرات کی آیت ۴ نازل ہوئی۔

"اکثرھم لایعقلون" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی یہ بے ادبی ان کے عقل وشعور کی سطح نیچی ہونے کی وجہ سے تھی۔

۸۔ اہل جہنم جاہل ہوں گے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہل جہنم اپنے برے اعمال اور برے اخلاق کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔قرآن شریف جہنم میں جانے والوں کو جاہل اور نادان قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''ہم نے جنوں اور انسانوں کی اکثریت کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں، یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔'' (اعراف:۱۷۹)

اس میں اور قرآن مجید کی کئی دیگر آیات میں جہالت اور بری اخلاقی صفات کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔

۹۔ صبر اور علم کا آپس میں تعلق ہے۔سورۂ انفال کی آیت ۶۵ میں مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ وہ اپنی تعداد کم ہونے کے باوجود ایمان اور صبر کے ذریعے، جو کہ علم وآگہی کا نتیجہ ہے، اپنی اس کمزوری کی تلافی کر سکتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اے نبی! مومنین کو جنگ کے لیے جوش دلایئے۔اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں ایک سو ہوں تو وہ ایک ہزار پر غالب آجائیں گے، اس لیے کہ وہ (کافر) ناسمجھ لوگ ہیں۔''

جی ہاں! یہ کافروں کی جہالت اور ناسمجھی ہی ہے جس کی وجہ سے وہ سست اور بے صبر ہو جاتے ہیں اور یہ اہل ایمان کے علم و آگہی کا نتیجہ ہے کہ وہ صابر اور ثابت قدم رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا ایک سپاہی دس کافروں پر بھاری ہوتا ہے۔

۱۰۔ منافقت اور انتشار کا سبب جہالت ہے۔سورۂ حشر کی آیت ۱۴ میں یہودیوں کے ایک قبیلہ بنونضیر کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے پرفریب ظاہر کے باوجود مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے:

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِىْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ

تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''وہ کبھی ایک ہوکر تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ صرف قلعوں کے اندر بند ہوکر یا دیواروں کے پیچھے سے ہی تم سے جنگ کریں گے۔ان کی آپس کی جنگ بہت شدید ہے،تم انہیں ایک سمجھتے ہومگر انکے دل پراگندہ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے عقل ہیں۔''

اس طرح ان کے نفاق اور پراگندگی کو، جو کہ رذائل اخلاقی میں سے ہے، جہالت اور نادانی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

نتیجہ

جو کچھ مندرجہ بالا دس عناوین کے تحت بیان ہوا ہے، وہ قرآن مجید کی ان آیات کا ایک حصہ ہے جو علم اور فضائل اخلاقی اور دوسری طرف جہل اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کو واضح کرتی ہیں۔

یہ بات بکثرت روزمرہ کے مشاہدے میں آتی ہے کہ جاہل اور بے علم افراد برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان میں صفات رذیلہ پائی جاتی ہیں۔لیکن جب برے اعمال کی قباحت اور صفات رذیلہ کے نقصانات کے بارے میں ان کے علم و معرفت کی سطح بلند ہوتی ہے اور مبداء و معاد (اللہ اور آخرت) کے بارے میں ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ ان برے اعمال وصفات کو یا تو مکمل طور پر ترک کر دیتے ہیں یا بہت حد تک کم کر دیتے ہیں۔

اس مسئلہ کی منطقی دلیل بھی واضح ہے۔اعلیٰ صفات اور اعمال صالحہ کی طرف حرکت کرنے کے لیے محرک کی ضرورت ہوئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اچھے اعمال وصفات کے فوائد اور برے اعمال وصفات کے مفاسد سے آگاہی بہترین محرک ہے۔ اسی طرح مبداء و معاد سے آگاہی اور انبیاء و اولیاء کے مکتب سے آگاہی انسان کو ان کے قریب کرتی ہے جس سے اخلاقی مفاسد کی وسیع سطح پر اصلاح ہوجاتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں علم و آگہی سے مراد مادی فنون اور صنائع سے آگہی نہیں ہے، اس لیے کہ بہت سے لوگ ان چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آلودہ ہوتے ہیں، بلکہ یہاں علم و آگہی سے مراد اعلیٰ انسانی اقدار، تعلیمات الٰہی، معنوی مصالح و مفاسد اور معارف الٰہیہ کا علم ہے۔

علم اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ایسی عبارت بکثرت پائی جاتی ہیں جن سے علم و معرفت و آگاہی اور فضائل اخلاقی کے قریبی تعلق اور جہل و ناآگاہی اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ذیل میں ہم نمونے کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثمرة المعرفة العزوف عن الدنیا

''معرفت کے درخت کا پھل دنیا میں زہد ہے۔'' (غرر الحکم)

یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ زہد اہم ترین اخلاقی فضائل میں سے ہے

۲۔ حضرت علی علیہ السلام سے ہی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

یسیر المعرفة یوجب الزهد فی الدنیا

''مختصر سی معرفت بھی اس بات کا سبب ہوجاتی ہے کہ انسان دنیا میں زاہد ہوجائے۔'' (غرر الحکم)

ممکن ہے کہ یہاں معرفت سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہو جس کی ذات پاک کے سامنے ہر چیز چھوٹی اور حقیر ہے۔ یہ معرفت بذات خود دنیا اور دنیوی زرق و برق سے بے نیاز اور بے توجہ ہوجانے کا سبب ہے یا پھر ممکن ہے کہ اس سے مراد دنیا کی بے ثباتی اور گزشتہ اقوام کے انجام کی معرفت ہو جو کہ زہد کی روح انسان کے اندر پیدا کر دیتی ہے، یا پھر ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد آخرت اور وہاں کی عظیم نعمتوں کی معرفت مراد ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے یہ تمام معرفتیں مراد ہوں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں جو کہ حضرت علی علیہ السلام سے ہی ہے، بے نیازی اور ترک کے علم و معرفت کے ساتھ تعلق کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

من سکن قلبه العلم بالله سبحانه، سکنه الغنی عن الخلق

''جس کے دل میں اللہ کی معرفت جگہ بنالے، وہ لوگوں سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔'' (غرر الحکم)

ظاہر سی بات ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کی معرفت رکھتا ہو اور کائنات کو اس کی ذات کا ایک حقیر سا جلوہ سمجھتا ہو، وہ صرف اسی پر توکل کرے گا اور اپنے آپ کو اس کے سوا ہر کسی سے بے نیاز پائے گا۔

۴۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

من عرف الله و عظمه منع فاه من الکلام، و بطنه من الطعام

''جس کو اللہ کی معرفت حاصل ہوجائے اور وہ اس کی عظمت کو جان لے، وہ اپنے منہ کو ناشائستہ باتوں اور اپنے شکم کو حرام خوراک سے محفوظ رکھتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۲۳۷)

یہ حدیث اللہ کی معرفت اور حفظِ زبان اور حفظ شکم کے باہمی تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من عرف الله خاف الله و من خاف الله سخت نفسه عن الدنیا

''جو اللہ کی معرفت حاصل کر لے وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ دنیا کی چکاچوند سے بے

نیاز ہوجاتا ہے۔‘‘(اصولِ کافی، ۲:۷ ۲۳)

اس حدیث میں بھی معرفت خدا اور خوف خدا کے بہت سے اخلاقی فضائل کے ساتھ تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔

۶۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں عفو و درگزر اور معرفت خدا کے باہمی تعلق کو اس طرح سے بیان فرماتے ہیں:

اعرف الناس باللہ اعذرھم للناس و ان لم یجدلھم عذرا

’’جو شخص سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہے، وہ سب سے بڑھ کر لوگوں کو معاف کرتا ہے، خواہ معاف کرنے کی کوئی وجہ بھی موجود نہ ہو۔‘‘(غرر الحکم)

(ظاہری بات ہے کہ یہ حدیث ذاتی امور سے متعلق ہے نہ کہ قومی اور معاشرتی امور سے متعلق)۔

۷۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام ہی سے اللہ کی معرفت اور ترک تکبر کے باہمی ربط کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

و انہ لا ینبغی لمن عرف عظمۃ اللہ ان یتعظم

’’جو اللہ کی عظمت کو جان لے، اسے اظہارِ عظمت زیب نہیں دیتا۔‘‘(نہج البلاغہ، خطبہ: ۱۴۷)

۸۔ پاکیزگی عمل اور علم کے باہمی تعلق کے بارے میں ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لن یزکی العمل حتی یقارنہ العلم

’’کوئی عمل اس وقت تک پاکیزہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا علم کے ساتھ تعلق نہ ہو۔‘‘(غرر الحکم)

ظاہری بات ہے کہ عمل کی پاکیزگی عام طور پر اخلاق کی پاکیزگی ہوتی ہے اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

۹۔ اسی سلسلہ میں رسولؐ اللہ سے ایک حدیث میں ہے:

بالعلم یطاع اللہ و یعبد و بالعلم یعرف اللہ و یوحد و بہ توصل الارحام و یعرف الحلال و الحرام، والعلم امام العمل

’’علم و معرفت کے ذریعے ہی اللہ کی اطاعت ممکن ہے، علم کے ذریعے ہی اللہ کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے اور اس کی واحدانیت کو سمجھا جا سکتا ہے، اسی کے ذریعے صلہ رحمی کی جا سکتی ہے، اسی کے ذریعے حلال و حرام کی پہچان ہوسکتی ہے، علم ہی عمل کا رہنما ہے۔‘‘(تحف العقول: ۲۱)

اس حدیث میں بھی بہت سے اخلاقی فضائل کو شجر علم کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔

۱۰۔ یہی بات مزید صراحت کے ساتھ امیر المومنین علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

ثمرۃ العقل مداراۃ الناس

’’عقل کا پھل یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے۔‘‘(غرر الحکم)

ان احادیث کے مقابلہ میں ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو جہل اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کو بیان کرتی ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجهل اصل كل شر

''جہالت ہر برائی کی جڑ ہے۔'' (غرر الحکم)

۲۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحرص والشره والبخل نتيجة الجهل

''حرص، طمع اور بخل جہالت کا نتیجہ ہیں۔'' (غرر الحکم

اس کی وجہ یہ ہے کہ حریص اور طماع انسان ان چیزوں کی طلب میں تگ و دو کرتا ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی سے زائد ہیں۔ مال و دولت کے ساتھ اس کی محبت ایک غیر منطقی اور غیر معقول لگاؤ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح بخیل اپنے بخل کے ذریعے ان چیزوں کو اپنے پاس رکھتا ہے جنہیں وہ اپنی زندگی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام جہل اور رذائل اخلاقی کے باہمی تعلق کو جامع تر انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

الجاهل صخرة لا ينفجر ماؤها! وشجرة لا يخضر عودها! وارض لا يظهر عشبها

''جاہل ایک ایسا پتھر ہوتا ہے جس سے پانی نہیں نکلتا، ایک ایسا درخت ہوتا ہے جس کی شاخیں سبز نہیں ہوتیں اور ایک ایسی زمین ہوتا ہے جس میں سے کوئی پودا نہیں اگتا۔'' (غرر الحکم)

۴۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا ترى الجاهل لا مفرطا او مفرطا

''جاہل حالت افراط میں ہوتا ہے یا حالت تفریط میں۔'' (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۷۰)

اس بات کے مدنظر کہ علمائے اخلاق کے مطابق فضائل اخلاق افراط یعنی زیادہ روی اور تفریط یعنی کوتاہی کے درمیان نقطہ اعتدال پر واقع ہوتے ہیں، اس حدیث سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ جہالت اور رذائل اخلاقی کے درمیان قریبی تعلق ہوتا ہے۔

۵۔ علمائے اخلاق کی بڑی تعداد اصلاحِ اخلاق، تہذیب نفس اور خودسازی کے لیے اصلاحِ زبان کو ابتدائی قدم قرار دیتے ہیں۔ احادیث میں جہل و نادانی اور بدزبانی کے درمیان گہرے تعلق کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الجاهل اسير لسانه

''جاہل اپنی زبان کا قیدی ہوتا ہے۔''(بحارالانوار، ۷۵:۳۶۸)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علم اور اخلاق حسنہ اور جہل اور اخلاق رذیلہ کے باہمی تعلق کے بارے میں بکثرت آیات واحادیث پائی جاتی ہیں۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تہذیب نفس کا ایک مؤثر ذریعہ،علم وآگہی کی سطح کو بلند کرنا ہے۔مبداء ومعاد کی معرفت اور فضائل اخلاقی ورذائل اخلاقی کے اچھے اور برے اثرات سے آگہی،تہذیب اخلاق میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

علم میں اضافے کی دوشاخیں ہیں:

۱۔ ان میں سے ایک کا تعلق فرد اور معاشرے پر رذائل اخلاقی کے منفی اثرات سے ہے۔جیسا کہ اگر انسان کو علم ہو کہ شراب اور منشیات انسانی صحت اور معاشرے کو کس قدر ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں تو ان سے دور رہنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔اس طرح سے فضائل اخلاقی کی پرورش اور رذائل اخلاقی کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو فضائل اخلاقی کے فوائد اور رذائل اخلاقی کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔لیکن اس نکتہ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ علم وآگہی کی سطح میں اضافہ اصلاح اخلاق کی علت تامہ نہیں ہے مگر اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حصولِ فضائل اخلاقی کا راستہ ضرور ہموار کرتی ہیں۔

۲۔ علم وآگہی میں اضافے کی دوسری شاخ کا تعلق اس بات سے ہے کہ مجموعی طور پر معاشرے کی علمی سطح کو بلند کیا جائے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب مبداء ومعاد،انبیاء واولیاء کے حالات اور اس قسم کی دیگر چیزوں کے بارے میں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو انسان کے اندر فضائل اخلاقی کی محبت اور رذائل اخلاقی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر معرفت وآگہی کی سطح کم ہونے سے اور معارف وعقائد سے جہالت کی وجہ سے انسان کے اندر صفات رذیلہ کا خارزار پیدا کرنے کے لیے مناسب حالات فراہم ہو جاتے ہیں جبکہ علم ومعرفت میں اضافے سے فضائل اخلاقی کا گلستان پیدا ہونے کے حالات فراہم ہو جاتے ہیں۔

۵۔معاشرتی ثقافت کا اخلاقی تربیت پر اثر

ثقافت ان امور کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو انسان کی روح اور فکر کی تشکیل کرتے ہیں اور مختلف مسائل میں اس کے رجحانات کو معین کرتے ہیں۔

کسی معاشرے کے عقائد،تاریخ،آداب ورسوم،فن وادب کے مجموعہ کو اس معاشرے کی ثقافت کہا جاتا ہے۔تربیت اخلاق کے سلسلہ میں ان میں سے بعض مثلاً ''معاشرتی ماحول'' پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔اب ہم کسی معاشرے میں فضائل اخلاقی کی بنیادوں کے استحکام یا رذائل اخلاقی کو گہرا کرنے میں ثقافت کے دیگر عناصر کے کردار کا جائزہ لیں گے۔

ان عناصر میں سے ایک تو کسی معاشرے کی تاریخ اور آداب ورسوم ہیں۔اگر ان کا محور اخلاقی فضائل ہوں تو معاشرے میں

اعلیٰ انسانی صفات کی پرورش اور تہذیب نفس کے لیے مناسب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی بنیاد رذائل اخلاقی ہوں تو معاشرہ برائیوں کی لپیٹ میں آنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی آیات میں اس بارے میں واضح اشارات ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی اقوام صرف اس لیے رذائل اخلاقی کے ہولناک گڑھے میں گر گئیں کہ ان کے معاشرے پر غلط آداب ررسوم اور جاہلانہ ثقافت کی حاکمیت قائم تھی، مثلاً:

۱۔ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۲۸﴾

''جب یہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ برے کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟'' (اعراف:۲۸)

۲۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۷۰﴾

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا تھا۔ اگر ان کے آباء واجداد عقل نہ رکھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ ان کی پیروی کریں گے؟'' (بقرہ:۱۷۰)

۳۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴿۵۳﴾

''جب انہوں نے اپنے باپ (آذر) اور اپنی قوم سے کہا یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' (انبیاء: ۵۲، ۵۳)

۴۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾

''آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو اس بستی کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم انہی کی راہ پر چلیں گے۔''

(زخرف:۲۳)

۵۔ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝۸۲

''لیکن اس کی قوم کے پاس صرف یہی جواب تھا کہ انہیں اپنی بستی سے باہر نکال دو کیونکہ یہ طہارت پسند ہیں۔''(اعراف:۸۲)

۶۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝۵۸ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝۵۹

''جب ان میں سے کسی کو یہ خبر دی جاتی ہے کہ اس کے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو شدت غم سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور سخت غصے میں آ جاتا ہے اور اس بری خبر کے سننے کے بعد اپنی قوم سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ اس بچی کو رکھ لے یا اسے مٹی میں دفن کر دے۔ یہ کتنا برا فیصلہ کرتے ہیں۔''(نحل:۵۸،۵۹)

۷۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ

''محمد اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے خلاف سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔تم انہیں حالت رکوع وسجود میں پاؤ گے۔ وہ اپنے رب سے اس کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں۔ان کے چہروں پر سجدوں کے آثار ان کی پہچان ہے۔''(فتح:۲۹)

تفسیر اور نتیجہ

ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ ہر قوم کی ثقافت اخلاقی صفات کو پروان چڑھانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔اعلیٰ اور عمدہ ثقافت میں اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل افراد کی تربیت ہوتی ہے۔ بری اور روبہ انحطاط ثقافت رذائل اخلاقی کو پروان چڑھانے کا کام کرتی ہے۔مندرجہ بالا آیات ان دونوں نکات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں۔

پہلی آیت میں ان شیطان صفت گمراہ لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے برے کاموں کا جواز اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم نے یہ طریقہ اپنے بزرگوں سے سیکھا ہے:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے اور ہم یہ کام اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بزرگوں کے طور طریقوں کو اپنے عمل کے اچھا ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے اور نہ صرف یہ کہ ان پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔

دوسری آیت میں بھی یہی بات ایک اور انداز میں کہی گئی ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ آؤ، جو کچھ اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے، اس کی پیروی کرو تو وہ غرور و تکبر سے کہتے تھے کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ ہم تو وہی کریں گے جو کچھ ہم نے اپنے آباء واجداد کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے جاہلانہ طور طریقے اور اخلاقی رذائل ان کی نظر میں اللہ کی آیات سے زیادہ قابل قدر تھے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

قرآن شریف مزید کہتا ہے کہ کیا ان کے آباء واجداد گمراہ نہ تھے؟ (پھر کیوں وہ ان جاہلوں کی روش کو قرآن کی حیات بخش تعلیمات پر مقدم قرار دیتے ہیں.....؟):

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

تیسری آیت میں بھی ہم خلاف اخلاق اعمال پر غلط ثقافت کے اثرات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس آیت میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کے ساتھ گفتگو کو دیکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم کیوں ان بے جان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ایسا ہی کریں گے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی اس اندھی تقلید پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہو۔''

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

لیکن بدقسمتی سے یہ کھلی گمراہی نسل در نسل منتقل ہوتی گئی اور ایک ثقافت کی صورت اختیار کر گئی۔ نہ صرف یہ کہ لوگ اسے برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس پر فخر بھی کرتے تھے۔

چوتھی آیت میں بھی یہی بات ایک اور شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب بت پرستوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم

باشعورانسان ہوتے ہوئے بےشعور بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک مذہب پر دیکھا ہے اوران کی تقلید کرتے ہوئے ہم ہدایت پر ہیں:

بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾

وہ اپنے اس احمقانہ کام کو نہ صرف یہ کہ گمراہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے آباء واجداد سے ملنے والی ہدایت سمجھتے تھے۔ اگلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ طرزِ تفکر سب مترفین (مغرور دولت مندوں) میں پایا جاتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِىۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿۲۳﴾

ظاہر سی بات ہے کہ یہ اندھی تقلید جس کی وجہ سے برائی، اچھائی نظر آتی تھی، بہت سی وجوہات رکھتی تھی لیکن اس کی ایک وجہ یقیناً یہ تھی کہ برائی ایک دیرپا ثقافت کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

سورۂ مائدہ کی آیات ۱۰۳ اور ۱۰۴ میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں نے حلال وحرام کے سلسلہ میں کچھ احمقانہ بدعتیں اپنا رکھی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے حلال خوراک کو اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا۔ وہ اپنی اس روش پر اس قدر سختی سے کاربند تھے کہ اس کے مقابلہ میں آیاتِ الٰہی کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھے اوران کے جواب میں یہ کہتے تھے کہ:

حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ

''جو کچھ ہمیں اپنے آباء واجداد سے ملا ہے، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔''

ان آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آداب ورسوم بدکس حدتک غیر اخلاقی صفات کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔ رذائل کو فضائل میں بدل دیتے ہیں اور گمراہانہ عقائد کو عین ہدایت سمجھتے ہیں۔

پانچویں آیت میں اخلاقی اقدار پر معاشرتی آداب وسنن کی تاثیر کے بارے میں ایک نئی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ قوم لوط جن کے اخلاقی انحراف نے تاریخ کے صفحات کو سیاہ کر دیا ہے (اور بدقسمتی سے یہ برائی ہمارے جدید دور جاہلیت میں مغربی تمدن کے مراکز میں ماضی کی نسبت زیادہ کریہہ اور قانونی شکل میں رونما ہوچکی ہے) جب حضرت لوط اوران کے ساتھیوں نے انہیں تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرنے کی دعوت دی تو وہ بہت برہم ہوئے اور چلانے لگے کہ ان لوگوں کو اپنے شہر میں سے باہر نکال دو جو یہ چاہتے ہیں کہ پاکیزگی یا تقویٰ کو رواج دیں (یا پاکیزگی وتقویٰ کا مظاہرہ کرتے ہیں):

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

آلودہ ماحول اور غلط ثقافت نے ان پر اتنا گہرا اثر ڈالا تھا کہ وہ تقویٰ اور پاکیزگی کو گناہ سمجھنے لگے تھے اور ناپاکی اور آلودگی

پرفخر کرتے تھے۔ظاہری بات ہے کہ ایسے معاشرے میں رذائل اخلاقی تیزی سے پھیلتے ہیں اور فضائل اخلاقی کمزور ہوجاتے ہیں۔

چھٹی آیت میں زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی وحشت ناک رسم کی نشاندہی کی گئی ہے جو ایک غلط رسم سے مانوس ہوجانے کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب بیٹی کی پیدائش کو اپنے لیے ذلت کا سبب سمجھتے تھے۔جب بھی ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تو غم و غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا تھا اور کئی کئی دن ہفتے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا تھا کہ اس ذلت کو قبول کرکے بیٹی کو اپنے پاس زندہ رہنے دے یا اسے دفن کرکے اس ذلت سے نجات حاصل کرلے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

ظاہری بات ہے کہ نومولود بچے کا قتل قبیح ترین اور انتہائی قابل نفرت کام ہے لیکن غلط آداب ورسوم کی وجہ سے اس کے برا ہونے کا احساس ختم ہوچکا تھا اور لوگ اسے ایک فضیلت اور افتخار سمجھنے لگے تھے۔

بعض تفاسیر میں اس وحشت ناک مسئلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ زندہ دفن کرنا لڑکیوں کو ہلاک کرنے کا ایک طریقہ تھا جبکہ اس کے کئی اور طریقے بھی رائج تھے۔بعض اوقات وہ لڑکی کو ہلاک کرنے کے لیے اسے پانی میں ڈبودیتے تھے۔کبھی پہاڑ کے اوپر سے نیچے پھینک دیتے تھے اور بعض اوقات انہیں ذبح کردیتے تھے۔اس بری رسم کے آغاز اور اس کے اسباب کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ تفسیر نمونہ، سورۂ نحل کی آیت ۵۸ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

جو بات ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایسی رسوم بدترین رذائل اخلاقی کے لیے زمین ہموار کردیتی ہیں اور بدترین رذائل کو بہترین فضائل میں بدل دیتی ہیں۔یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی قوم کی ثقافت، فضائل یا رذائل کی طرف مائل کرنے کا ایک اہم محرک ہوتی ہے۔جو لوگ رذائل اخلاقی کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ ثقافت کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کریں۔

اس کی مثالیں ہم اپنے موجودہ دور میں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ عرب کے دور جاہلیت کی طرح آج بھی جاہلیت کی ثقافت مختلف قسم کے اخلاقی رذائل کا اصل سبب بنی ہے۔مثال کے طور پر چند سال قبل چین میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں شریک ممالک کی اکثریت کا اصرار تھا کہ ان تین باتوں کی حمایت کی جائے:

۱۔ عورتوں کے جنسی تعلقات کی آزادی۔

۲۔ ان میں ہم جنسیت کو جائز قرار دیا جائے۔

۳۔ اسقاطِ حمل کی آزادی۔

بعض اسلامی ممالک نے، جن میں ہمارا ملک بھی شامل ہے، اس کی شدت سے مخالفت کی۔

ظاہری بات ہے کہ جب اقوام کے تعلیم یافتہ نمائندے ان برے اور گھناؤنے کاموں کو عورتوں کے حقوق کی آڑ میں جائز

قرار دینے لگیں اور اس کی بنیاد پر جب ثقافت تشکیل پا جائے تو لوگوں کے درمیان کیسے کیسے اخلاقی رذائل کی ترویج ہوگی۔ ان اخلاقی رذائل کا نہ صرف تہذیب اخلاق بلکہ معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر بھی نمایاں اثر پڑتا ہے۔

اس سلسلہ کی ساتویں اور آخری آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس تاریک معاشرے میں جس ثقافت کی بنیاد رکھی، اس میں انہوں نے کس قدر سرعت کے ساتھ فضائل اخلاقی کے مراحل طے کیے۔ آیت کہتی ہے:

''محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (ان میں یہ نمایاں صفات پائی جاتی ہیں کہ) وہ کفار کے ساتھ سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم انہیں ہمیشہ حالت رکوع و سجود (یعنی عبادت میں مشغول) پاؤ گے، وہ اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کے خواہش مند ہیں اور ان کی نشانی یہ ہے کہ سجدے کا نشان ان کے چہرے پر نمایاں ہے۔''

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ

ظاہری بات ہے کہ "والذین معه" (جو لوگ ان کے ساتھ ہیں) سے مراد صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو کسی زمان و مکان میں ان کے ساتھ رہے ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے عقائد کو تسلیم کرنے میں اور الٰہی آداب و سنن پر مبنی ثقافت کو قبول کرنے میں رسولؐ اللہ کا ساتھ دیا۔

معاشرتی آداب و رسوم اور اخلاق کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں

اسلام نے اچھے آداب و رسوم کی پیدائش اور برے آداب و رسوم کے ساتھ مقابلہ کرنے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ احادیث میں بھی اس مسئلہ پر بہت تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں اچھے آداب و رسوم کی داغ بیل ڈال کر اخلاقی اعمال کی انجام دہی کی راہ ہموار کی جا سکے اور رذائل اخلاقی کی روک تھام کی جا سکے۔

مندرجہ ذیل احادیث میں سے ہر ایک اس سلسلہ میں ایک خاص نکتہ کو بیان کر رہی ہے:

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"خمس لا ادعهن حتی المهات الاکل علی الحضیض مع العبید..... وحلب العنز بیدی ولبس الصوف و التسلیم علی الصبیان، لتکون سنة من بعدی

(بحار الانوار، ۷۳:۶۶)

''میں پانچ کاموں کو زندگی بھر ترک نہیں کروں گا: غلاموں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانا، اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہنا، کھردرا لباس پہننا اور بچوں کو سلام کرنا تاکہ یہ میرے بعد سنت بن جائے۔''

ان کاموں کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے اندر تواضع وفروتنی کو پیدا کیا جائے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے مروی ہے:

من سن سنة حسنة عمل بها من بعده كان له اجره و مثل اجورهم من غير ان ينقص من اجورهم شيئا. ومن سن سنة سيئة فعمل بها بعده كان عليه وزره ومثل اوزارهم من غير ان ينقص من اوزارهم شيئا

''جو کوئی کسی اچھے عمل کی بنیاد ڈال دے اور لوگ اس پر عمل کرتے رہیں تو اسے اپنے نیک کام کا اجر بھی ملے گا اور ان سب لوگوں کے اجر کے برابر بھی اجر ملے گا جو اس کام کو انجام دیں گے اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ جو کوئی کسی برے کام کی بنیاد ڈالے اور بعد میں لوگ اس پر عمل کریں تو اسے اپنے برے کام کے گناہ کی وجہ سے ان سب کے برے کام کا گناہ بھی ہوگا اور ان کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔'' (کنزالعمال:۱۵:۸۷۰)

اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں نقل کی ہے۔

یہ حدیث جو مختلف الفاظ میں رسولؐ اکرم، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے نقل ہوئی ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اخلاقی اعمال کا راستہ ہموار کرنا اس قدر اہم ہے کہ اس کام کو انجام دینے والا اس کے تمام آثار ونتائج میں شریک ہوتا ہے۔ اسی طرح سے گمراہی وبدکاری کی راہ ہموار کر کے رذائل اخلاقی کی بنیاد ہموار کرنے والا بھی اس کے تمام آثار ونتائج میں شریک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے مالک اشتر کو تاکید کے ساتھ نصیحت کی کہ ''اچھے آداب ورسوم کی حفاظت کرنا اور ان کو ختم کرنے سے پرہیز کرنا۔''

لا تنقض سنة صالحة عمل بها صدور هذه الامة و اجتمعت بها الالفة وصلحت عليها الرعية. ولا تحدث سنة تضر بشيء من ماضى تلك السنن فيكون الاجر لمن سنها و الوزر عليك بما نقضت منها

''کسی ایسی اچھی سنت کو جسے اس امت کے گزشتگان نے قائم کیا اور لوگ اس سے مانوس ہو چکے ہوں

اوراس سے امت کے امور کی اصلاح ہوتی ہو، نہ توڑنا اور کسی ایسی سنت کو ایجاد نہ کرنا جو گزشتگان کی اچھی سنتوں کو نقصان پہنچائے، اس لیے کہ جنہوں نے ان سنتوں کو قائم کیا، ان کا اجر انہیں ملے گا اور ان کو ختم کرنے کا گناہ تم پر ہوگا۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب: ۵۳)

درحقیقت اچھے طور طریقوں کو ایجاد کرنے سے کار ہائے خیر اور پرورش فضائل اخلاقی میں مدد ملتی ہے اور یہ درحقیقت نیکی اور خیر میں تعاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح برے طور طریقے ایجاد کرنا گناہ اور بدکاری میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ ان اچھے یا برے اعمال میں ان کے قائم کرنے والے بھی شریک ہوتے ہیں جبکہ ان اعمال کے انجام دینے والوں کے اجر وثواب یا عذاب وگناہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

سنت حسنہ کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ رسولؐ اللہ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اسلام سے قبل پانچ سنتیں قائم کی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تائید کرتے ہوئے انہیں احکام اسلام میں شامل کر دیا۔ وہ پانچ سنتیں یہ ہیں کہ:

''انہوں نے باپ کی بیوی کو بیٹے پر حرام قرار دیا،
قتل کا خون بہا ایک سو اونٹ مقرر کیا،
بیت اللہ کے گرد سات چکروں کا طواف مقرر کیا،
انہیں ایک خزانہ ملا تو انہوں نے اس کا خمس ادا کیا اور زمزم کو نئے سرے سے کھود کر اسے سقایۃ الحجاج کا نام دیا۔''

كانت لعبد المطلب خمسا من السنن اجريها الله عزوجل فى الاسلام حرم نساء الاباء على الابناء، و سن الدية فى القتل ماة من الابل و كان يطوف بالبيت سبعة اشواط، ووجد كنزا فاخرج منه الخمس، وسمى زمزم حين حفرها سقاية الحاج

مندرجہ بالا احادیث اور دیگر بہت سی احادیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کے آداب و رسوم اور ثقافت اس قوم کے اعمال اور اخلاق پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ اسلام اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہوئے اچھے آداب و رسوم کی حفاظت کو ضروری قرار دیتا ہے اور برے آداب ورسوم کو قائم کرنے یا ان کی حفاظت کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے۔

۶۔عمل اور اخلاق کا تعلق

یہ بات بالکل بجا ہے کہ انسان کے اعمال اس کے اخلاق سے جنم لیتے ہیں اور انسان کے باطنی اخلاق کا اظہار اس کے اعمال سے ہوتا ہے لیکن دوسری طرف یہ بات بھی صحیح ہے کہ انسان کے اعمال بھی اس کے اخلاق کی تشکیل میں کردار ادا کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایک اچھے یا برے عمل کو مسلسل انجام دیا جائے تو وہ انسان کی پختہ عادت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تہذیب اخلاق کا ایک راستہ تہذیب اعمال ہے۔انسان کو اس بات پر خاص توجہ دینی چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی برا عمل بار بار تکرار کے نتیجہ میں اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں قائم کر لے اور انسان کی روح کو اپنے رنگ میں رنگ لے۔

اسی لیے آیات واحادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ گناہ اور برائی کے سرزد ہونے کے بعد فوراً توبہ کی جائے۔یعنی توبہ کے پانی سے دل کو گناہ کے اثرات سے پاک کر لیا جائے تاکہ تکرارِ عمل کے ذریعے برا عمل اخلاق رذیلہ میں تبدیل نہ ہو جائے۔

اس کے برعکس اسلام میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ انسان اچھے اعمال کو اس قدر تکرار کے ساتھ انجام دے کہ وہ ایک پختہ عادت بن جائے۔

اس اشارہ کے بعد ہم چند آیات نقل کرتے ہیں جن میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

۱۔ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۴

''جو وہ سمجھ رہے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو زنگ کی طرح ان کے دلوں کو الگ گئے ہیں۔''(مطففین:۱۴)

۲۔ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

''اسی طرح اسراف کرنے والوں کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے۔''(یونس:۱۲)

۳۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ۭ

''کیا وہ جس کے برے اعمال اس کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہوں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہو، اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو حقیقت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ ہے۔''(فاطر:۸)

۴۔ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

''میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے ہیں۔''(نمل:۲۴)

۵۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

''اے رسولؐ! ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں خبر دوں جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں کھو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے عمل کر رہے ہیں۔'' (کہف: ۱۰۳، ۱۰۴)

۶۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

''توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو از روئے جہالت برا کام کر گزرتے ہیں اور پھر جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں، اللہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔'' (نساء: ۱۷)

۷۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ۔ ۱۰۳)

''اے رسولؐ! ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) لو تاکہ اس طرح تم ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔''

تفسیر اور ترجمہ

پہلی آیت میں گناہ اور برے اعمال کے ان آثار کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کے قلب اور روح پر مرتب ہوتے ہیں جن سے دل کی پاکیزگی اور نورانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کی جگہ تاریکی اور ظلمت لے لیتی ہے۔ آیت کہہ رہی ہے:

''یہ کم بچنے والے جو سوچ رہے ہیں، حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال زنگ کی طرح ان کے دلوں پر لگ گئے ہیں۔''

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

آیت کا یہ حصہ ''مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ'' فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ برے اعمال کو مسلسل انجام دینے سے ان کے روح اور دل پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس طرح زنگ آئینے کی چمک کا خاتمہ کر کے اسے تاریک کر دیتا ہے، اسی طرح گناہ کے بارے میں بے توجہی، انسان کے دل پر ظلمت اور شقاوت کا زنگ چڑھا دیتی ہے۔

''ران'' اس زنگ کو کہتے ہیں جو قیمتی چیزوں کی چمک کو ختم کر دیتا ہے۔ زنگ درحقیقت اس سرخ رنگ کی تہہ کو کہتے ہیں جو ہوا میں موجود نمی کی وجہ سے لوہے کو لگ جاتا ہے جس سے عام طور پر لوہا اور دھاتیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

انسان کے دل پر گناہوں کے تباہ کن اثرات کو بیان کرنے کے لیے یہ بہت مناسب الفاظ ہیں جو آیات واحادیث میں بار

بار استعمال ہوئے ہیں۔ احادیث کی بحث میں ہم ان الفاظ پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

دوسری آیت میں دل پر زنگ لگ جانے کے مرحلہ سے بھی اگلے مرحلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مرحلہ تزئین اعمال کا مرحلہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برے اعمال اگر تکرار کے ساتھ انجام دیئے جائیں تو آہستہ آہستہ انسان ان سے مانوس ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ برے اعمال اس کو خوش نما اور دلکش معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ ان پر فخر کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے:

''اس طرح مسرفین کے اعمال ان کی نظروں میں خوش نما بنا دیئے جاتے ہیں۔''

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

''ما كانوا يعملون'' اور ''مسرفين'' کے الفاظ گناہ کے تکرار اور اس کے بار بار انجام دینے پر دلالت کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ برے اعمال کو مسلسل انجام دینے سے نہ صرف وہ انسان کی نظر میں برے نہیں رہتے بلکہ بتدریج وہ اچھے اعمال نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بذات خود ایک صفت رذیلہ ہے جو تکرار گناہ کے نتیجہ میں گناہگار انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کون ان برے اعمال کو ایسے افراد کے لیے خوش نما بناتا ہے!

بعض آیات میں اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ ان لوگوں کے گناہوں کی ایک سزا ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ملتی ہے، اس لیے کہ جب وہ برے اعمال کو خوبصورت سمجھتے ہیں تو ان کو اور بھی زیادہ ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں اپنی رسوائی اور بدبختی کا سامان کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیتے ہیں۔'' (نمل: ۴)

لیکن سورۂ انعام کی آیت ۴۳ میں اس کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے جس میں کفر و گمراہی پر اصرار کرنے والے کفار کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور جو کام وہ کرتے تھے شیطان نے انہیں ان کے لیے خوش نما بنا دیئے۔''

بعض اوقات اس کی نسبت بتوں کی طرف دی گئی ہے:

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ

''اسی طرح اکثر مشرکین کے شرکاء (بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کے لیے خوش نما بنا دیا۔''

بعض اوقات اس حقیقت کا ذکر فعل مجہول کی صورت میں کیا گیا ہے جیسا کہ ہمارے زیر بحث آیت میں یہی اسلوب اختیار

کیا گیا ہے۔

اگر ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبارات کے اس اختلاف کے باوجود معنی میں کوئی تضاد یا فرق نہیں پایا جاتا بلکہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ بعض اوقات تکرار عمل باعث زینت ہوتا ہے، اس لیے کہ عمل کے تکرار سے اس کے قبیح ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان اس کے بارے میں غیر جانبدار ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی اس عمل کو انجام دیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اچھا اور خوش نما نظر آنے لگتا ہے اور ایک زنجیر کی طرح اس عمل کے انجام دینے والے کے ہاتھ پاؤں میں پڑ جاتا ہے جس سے نکلنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو جرائم پیشہ افراد کے حالات کا مطالعہ کرنے والا ہر انسان بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

بعض اوقات اندر سے نفس امارہ کے وسوسے اور باہر سے شیطان کے وسوسے انسان کے برے اعمال کو اس کے لیے خوش نما بنا کر دکھاتے ہیں، خواہ اس نے اس عمل کو مکرر انجام نہ دیا ہو، ایسی صورت میں بعض اوقات نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ انسان کسی گناہ کبیرہ کو اپنا انسانی یا دینی فرض سمجھ کر انجام دے رہا ہوتا ہے۔ ایسا شخص کسی کی غیبت کو واجب قرار دے کر اس کی غیبت کرنے لگتا ہے، حالانکہ اس بیچارے کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ یہ غیبت کرنے والے شخص کا حسد ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی غیبت کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے جنہوں نے ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا۔ چونکہ ان کے یہ جرائم ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے مطابق تھے، لہٰذا وہ نہ صرف یہ کہ ان اعمال کو برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے تھے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا دینا چاہتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی بدکاریوں کو ان کی نظر میں خوش نما بنا دیتا ہے تاکہ وہ اور زیادہ رسوا ہوں اور ان کو زیادہ سنگین سزا ملے۔

یہ نکتہ بھی ضرور مدنظر رہے کہ توحید افعالی کی رو سے اس کائنات میں ہونے والے کام کو اللہ کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اس کی ذات پاک علت العلل ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ لوگ اپنے اعمال کے جوابدہ نہ ہوں۔ تمام حمد وثناء اس خدائے بزرگ وبرتر کے لیے ہے جس نے طاقت اور قدرت عطا کی اور لعنت ہو ان لوگوں پر جو اس طاقت اور قدرت کو گناہ میں صرف کرتے ہیں۔

بعض اوقات فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو خوش نما دکھائی دیں۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

یعنی ''مادی چیزوں مثلاً بیوی، بچے اور سونا چاندی وغیرہ لوگوں کی نظر میں خوش نما بنا دیئے جاتے ہیں (تاکہ اس طرح ان کی آزمائش ہو سکے)۔''

برے کاموں کے خوبصورت نظر آنے کی ایک وجہ ان کاموں کا تکرار ہے جس سے وہ عمل انسان کی روح اور دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی کیفیت کو بدل دیتا ہے جبکہ اچھے اعمال کی تکرار سے انسان کے اندر اخلاق فاضلہ کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جو لوگ تہذیب نفس اور فضائل اخلاقی کے حصول کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں، وہ اچھے اعمال کے تکرار سے مدد حاصل کریں اور برے کاموں کے تکرار سے بچیں کیونکہ اچھے کاموں کا تکرار انسان کا معین و مددگار ہوتا ہے جبکہ برے اعمال کا تکرار دشمن اور غدار ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں پھر برے اعمال کی تزئین کا ذکر ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''کیا وہ شخص جس کے برے اعمال اس کے لیے خوش نما بنا دیئے گئے ہیں اور وہ انہیں اچھے اعمال کی صورت میں دیکھ رہا ہے (وہ اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حقیقت بین ہے اور حقیقت کو اس کی اصل صورت میں دیکھتا ہے؟'')

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ

اس آیت میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس شخص کا ذکر کرتا ہے جس کی نظر میں اس کے برے اعمال خوش نما بنا کر دکھائے جاتے ہیں تو اس کے مقابل کا صاف الفاظ میں ذکر نہیں کیا گیا۔ گویا آیت سامعین کو ایک وسیع منظر پیش کر رہی ہے کہ ایسے شخص کے برعکس جو کچھ انہیں نظر آ سکتا ہے، اسے دیکھیں اور اس کا تصور کریں۔ آیت درحقیقت یہ بیان کرنا چاہتی ہے کہ آیا ایسا شخص اس حقیقت پسند اور حقیقت بین شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل کے طور پر دیکھتا ہے؟ آیا ایسا شخص ان پاک دل افراد کی مانند ہوسکتا ہے جو ہر وقت محاسبۂ نفس میں مصروف رہتے ہیں تاکہ برے اعمال کے عادی بننے سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہوں اور اپنی جان کو ہلاکت کے خطرے میں نہ ڈالیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، اسے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، اسے ہدایت دیتا ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا ہے، ان لوگوں کے لیے جو بڑی جرأت مندی کے ساتھ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان کا انجام ایسا ہی ہونا چاہیے۔

تفسیر فی ظلال میں ہے کہ جس شخص کی اچھی نیت اور اچھے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے دل میں برے اعمال کے بارے میں ایک خاص قسم کی حساسیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو اللہ کی سزا سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ لہٰذا نقصان اور ہلاکت سے بچنے کے لیے ہر وقت محاسبۂ نفس میں مصروف رہتا ہے، ہمیشہ شیطان کی چالوں سے محتاط رہتا

ہے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد کا منتظر رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہدایت اور گمراہی کے راستے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ (فی ظلال، ۶:۶۷۵)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام (یا امام رضاؑ) کے اصحاب میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے امام سے سوال کیا کہ خود پسندی جو انسان کے عمل کو باطل کر دیتی ہے، وہ کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

العجب درجات منها ان یزین للعبد سوء عمله فیراه حسنا فیعجبه و یحسب انه یحسن صنعا

یعنی عجب اور خود پسندی کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے برے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے اور ان پر خوش ہونے لگے اور اس حیرت میں ڈوب جائے کہ اس نے کتنا عمدہ کام انجام دیا ہے۔

چوتھی آیت میں ملکہ سباء اور ان حالات کا ذکر ہے جن کی خبر ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو دی تھی۔ ہدہد نے اپنی اطلاع میں کہا کہ میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں خوش نما بنا دیا ہے:

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سورج اور اس کی روشنی بہت باعظمت ہیں اور زندگی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں لیکن اس کا طلوع وغروب، بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے کے پیچھے اس کا پوشیدہ ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود طبیعی قوانین کا پابند ہے اور خود اس کی ذات میں کسی قسم کا کوئی ارادہ نہیں پایا جاتا۔ یہی دلیل اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ لیکن آباؤ اجداد کی غلط تعلیم وتربیت اور تکرارِ عمل کے نتیجہ میں اس عمل کا قبح (برائی) ان کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور یہ عمل انہیں ایک اچھے عمل کی صورت میں نظر آتا تھا۔

دنیا کے بعض ممالک میں گائیں پائی جاتی ہیں جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ وہ ان کے سامنے ایسے اعمال انجام دیتے ہیں اور ان کے لیے ایسے مقام ومرتبہ کے قائل ہیں جنہیں دیکھ کر ہر خالی الذہن انسان ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا جبکہ ان کے پجاری بڑی سنجیدگی سے ان کی پوجا میں مصروف ہوتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ہی عمل پر دوسرے ہنستے ہیں اور وہ اسی پر فخر کرتے ہیں، کیوں؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بار بار اس عمل کو انجام دینے کی وجہ سے اس عمل کا قبح اور اس کی برائی کا تصور ان کے ہاں سے رخصت ہو گیا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں تزئین عمل کو شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے لیکن ظاہری بات ہے کہ شیطان کے بھی کچھ وسائل و ذرائع ہیں جن میں سے ایک برے اعمال کا بار بار انجام دینا اور ان کا عادی بن جانا ہے۔

پانچویں آیت میں بھی یہی حقیقت اختلافِ الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس آیت میں خطاب رسولؐ اللہ سے ہے۔ آپؐ سے کہا جارہا ہے:

''لوگوں سے کہئے کہ آیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں باخبر کردوں جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوشش دنیوی زندگی میں بھٹک کر رہ گئی مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔''

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ جنہوں نے اپنی عمر کا قیمتی ترین سرمایہ یعنی جوانی اور فکر و عمل کی طاقتیں غلط راستوں میں صرف کر کے برباد کردیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اچھے کام کیے ہیں اور ان پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

یہ لوگ اس بدبختی میں کیوں گرفتار ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ برائی، بدکاری، ہوس پرستی اور خود پسندی کے نتیجہ میں ان کے عقل پر سیاہ پردہ پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں اور حقائق ان کو اس طرح دکھائی ہی نہیں دیتے جس طرح حقیقت میں وہ ہوتے ہیں۔

اس بدبختی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کر چکے ہیں اور ان کے اعمال تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔''

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

اس آیت کی تفسیر میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں، ان میں ایسی عبارات نظر آتی ہیں جو اس آیت کے مصادیق میں سے کسی واضح مصداق کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ سب کے سب اس آیت کے اندر جمع ہیں۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد منکرین ولایت علیؑ ہیں۔ بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ ان سے مراد مسیحی راہب ہیں جنہوں نے دنیا اور دنیوی لذتوں کو ترک کر دیا ہے، حالانکہ ایسا کر کے وہ گمراہ ہوئے ہیں۔

بعض احادیث میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین میں بدعتیں ایجاد کیں۔ بعض

میں خوارج نہروان اور بعض میں یہود و نصاریٰ کے بدعت گزار مراد لیے گئے ہیں۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے اعمال گناہ اور جرائم پر مشتمل تھے جبکہ وہ خود اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے "حبطت اعمالھم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں "حبط" کے معروف معنی یہ ہیں کہ اونٹ یا کوئی اور جانور زیادہ یا زہریلی گھاس کھالے جس کے نتیجہ میں اس کا پیٹ پھول جائے اور وہ ہلاک ہوجائے۔ ظاہری بات ہے کہ ایسے اونٹ کا موٹا پا اس کی صحت کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسی بیماری کی علامت ہوتا ہے جو موت کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ بعض نادان لوگ اسے صحت اور طاقت کی علامت سمجھتے ہوں۔

بعض انسانوں کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر توانائی اور کوشش کو اپنی ہلاکت اور بدبختی کی راہ میں بروئے کار لاتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ سعادت اور خوش نصیبی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

چھٹی آیت میں توبۂ کامل کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ توبہ ان لوگوں کو نصیب ہوگی جو اولاً تو جہالت اور نادانی کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں، وہ گناہ کے برے انجام اور اس کی سزا سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ثانیاً جلد ہی وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوجاتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں رجوع کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾

ظاہری بات ہے کہ یہاں جہالت سے مراد وہ جہالت نہیں ہے کہ انسان کو سرے سے اچھے اور برے کا علم ہی نہ ہو کیونکہ ایسی صورت میں برے عمل کو انجام دینے والا معذور ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد نسبی جہالت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہ کو تو جانتا ہے لیکن اس کے برے انجام سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "یتوبون من قریب" سے مراد موت سے پہلے توبہ کر لینا ہے۔ حالانکہ لفظ ''قریب'' کا اس سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ ممکن ہے موت سے پہلے توبہ کرنے والا گناہ سے پچاس سال بعد توبہ کر رہا ہو۔ جو روایات ان مفسرین نے اپنے اس مؤقف کے حق میں بیان کی ہیں، وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہیں بلکہ ان سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان موت سے قبل بھی توبہ کر لے تو اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔

لیکن بعض دیگر مفسرین نے اس سے نزدیک کا زمانہ مراد لیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جلد ہی اپنے برے کام سے پشیمان ہوکر اللہ کی طرف لوٹ آئے، اس لیے کہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے اثرات کو مکمل طور پر انسان کی روح اور جان سے دھوڈالے اور ان کا ذرا سا اثر بھی دل میں باقی نہ رہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان جلد ہی (اس سے پہلے کہ گناہ کی جڑیں انسان کے وجود میں مضبوط ہوجائیں اور اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں) اس سے پشیمان ہوجائے۔ بصورتِ دیگر گناہ کے اثرات انسان کے قلب وجان

میں باقی رہ جانے کے غالب امکانات موجود رہتے ہیں۔پس کامل توبہ وہی ہے جو جلد از جلد کی جائے۔لغت اور عرف کے لحاظ سے یہی معنی لفظ ''قریب'' کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

ساتویں اور آخری آیت میں زکوٰۃ کا حکم اور اس کے آثار ونتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً

یعنی ''مومنین سے زکوٰۃ وصول کرو۔''

آگے چل کر زکوٰۃ کے معنوی اور اخلاقی آثار کا ذکر کیا گیا ہے:

''آپ اس عمل سے ان کو پاک کریں گے اور ان کو نشوونما دیں گے۔''

تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا

واضح سی بات ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی انہیں دنیا پرستی اور بخل سے پاک کرتی ہے اور ان میں انسان دوستی، سخاوت اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات ان کے اندر پیدا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ معاشرے میں فقر وتنگدستی کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے برطرف ہو جاتی ہیں اور معاشرہ ان کے منفی اثرات سے پاک ہو جاتا ہے۔پس زکوٰۃ نہ صرف رذائل اخلاقی کے خاتمہ کا سبب بنتی ہے بلکہ زکوٰۃ دینے والے کو فضائل اخلاقی سے آراستہ بھی کرتی ہے۔یہ وہی حقیقت ہے جس پر ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، یعنی اعمال نیک و بد کا فضائل ورذائل اخلاقی کی پرورش میں کردار!

یہی بات حجاب سے متعلق آیت میں ایک اور پیرائے میں بیان ہوئی ہے:

وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ ؕ

''جب تم ان سے کوئی استعمال کی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔تمہارا یہ عمل تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے۔''(احزاب:۵۳)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عمل میں عفت کا لحاظ رکھنے سے پاکیزگی قلب حاصل ہوتی ہے اور اس کے برعکس ترک عفت انسان کے قلب وروح کی آلودگی کی وجہ بنتی ہے اور رذائل اخلاقی کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا آیات کی تفسیر وتشریح کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ انسان کے اعمال اس کے اخلاق کی تشکیل میں اہم

کردار ادا کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خودسازی اور تزکیہ نفس کے لیے ہمیں اپنے اعمال پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ برے اعمال کو مکرر انجام دینے سے ایک تو ان کے برا ہونے کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کی روح ان کی عادی ہوجاتی ہے اور بات یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ انسان ان اعمال کے ارتکاب سے نہ صرف یہ کہ رنجیدہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر فخر بھی کرنے لگتا ہے۔

اخلاق پر اعمال کا اثر احادیث کی روشنی میں

مندرجہ بالا آیات میں اخلاق پر اعمال کے اثر کے حوالہ سے جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، احادیث میں بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ان کا ذکر ہوا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

مامن عبدالا وفی قلبه نكته بيضاء فاذا اذنب ذنبا خرج فی النكتة نكتة سوداء فان تاب ذهب ذلك السواد، وان تمادی فی الذنوب زاد ذلك السواد حتی يغطی البياض، فاذاغطی البياض لم يرجع صاحبه الی خير ابدا، وهو قول الله عزوجل: كلابل ران علی قلوبهم ما كانوا يكسبون

''ہر انسان کے دل میں ایک روشن نکتہ ہوتا ہے۔ جب وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس روشن نکتہ پر ایک سیاہ نکتہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرلے تو وہ سیاہ نکتہ مٹ جاتا ہے۔ اگر وہ گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرتا رہے تو یہ سیاہ نکتہ بھی پھیلتا جاتا ہے، یہاں تک کہ روشن نکتہ کو پوری طرح سے ڈھانپ لیتا ہے۔ پھر وہ شخص کبھی نیکی کی طرف واپس نہیں جاسکتا۔ یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جس طرح وہ سوچتے ہیں، حقیقت میں اس طرح نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اعمال ہیں جو زنگ کی طرح ان کے دلوں کو لگ گئے ہیں۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۲۷۳)

یہ حدیث اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتی ہے کہ جب انسان پے در پے گناہ کرتا رہے تو اس کا دل تاریک ہوجاتا ہے اور یہ تاریکی رذائل اخلاق کا سبب بنتی ہے اور انسان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ نیکی کی طرف واپسی کے راستے اس پر بند ہوجاتے ہیں۔

۲۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

ان الخير عادة

''نیکی ایک عادت ہے۔'' (بحار الانوار ۷۴: ۲۳۲)

اسی مضمون پر مشتمل ایک حدیث نبویؐ میں ہے:

الخیر عادۃ والشر لجاجۃ

''نیکی عادت ہے اور شر لجاجت ہے۔'' (کنز العمال، حدیث: ۲۲۷۲۸)

ایک حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

احب لمن عود منکم نفسہ عادۃ من الخیر ان یدوم علیھا

''میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے کسی اچھی بات کو اپنایا ہے تو اس پر قائم رہے۔''

(بحار الانوار، ۹۹:۶۴)

ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ کسی اچھے یا برے عمل کو مکرر انجام دینے کے نتیجہ میں انسان کے نفس میں اس عمل کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اچھے یا برے اعمال اچھے یا برے اخلاق کی پیدائش کا سبب ہوتے ہیں جبکہ اچھے یا برے اخلاق، اچھے یا برے اعمال کا باعث ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام امام حسن علیہ السلام کے نام اپنے مشہور وصیت نامہ میں فرماتے ہیں:

وعود نفسک التصبر علی المکروہ، ونعم الخلق التصبر فی الحق

''مشکلات کے مقابلہ میں اپنے اندر صبر کی عادت پیدا کرو، اس لیے کہ راہ حق میں صبر ایک عمدہ صفت ہے۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب: ۳۱)

یہاں بھی ہم تکرارِ عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی عادت اور صبر کے درمیان باہمی تعلق کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

۴۔ گناہ سے توبہ کے بارے میں بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ توبہ کرنے میں جلدی کرنی چاہیے اور توبہ میں تاخیر سے اجتناب کرنا چاہیے (ورنہ گناہ کے اثرات دل میں باقی رہ جائیں گے جو وقت گزرنے کے ساتھ ایک پختہ عادت کا موجب بن جاتے ہیں)۔

ایک حدیث میں امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

تاخیر التوبۃ اغترار، وطول التسویف حیرۃ ..... والاصرار علی الذنب امن لمکر اللہ

''توبہ میں تاخیر دھوکہ اور غفلت کا سبب بنتی ہے..... تاخیر کا طولانی ہو جانا حیرت و سرگردانی کا سبب بنتا ہے اور گناہ پر اصرار اللہ کی پکڑ سے غفلت کا باعث بنتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۶:۳۰)

ایک اور حدیث نبویؐ میں توبہ کے بارے میں یہ خوبصورت تعبیر نظر آتی ہے:

من تاب، تاب الله عليه و امرت جوارحه ان تستر عليه، و بقاع الارض ان تكتم عليه و انسيت الحفظة ما كانت تكتب عليه

''جو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹتا ہے، اللہ بھی اس کی طرف لوٹتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کے گناہوں کو پوشیدہ رکھیں، زمین کے ان حصوں کو جن پر اس نے گناہ کیے تھے اور نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی یہی حکم دیا جاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اسے فراموش کر دیں۔'' (کنز العمال: ۷۹)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ توبہ گناہ کے اثرات کو محو کر کے قلب کی پاکیزگی اور تقدس کو بحال کر دیتی ہے۔ یہی بات مزید واضح طور پر حضرت علی علیہ السلام کی اس حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

التوبة تطهر القلوب و تغسل الذنوب

''توبہ قلب کو پاک کر دیتی ہے اور گناہوں کو دھو دیتی ہے۔'' (غرر الحکم: ۳۸۳۷)

اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گناہ دل پر برے اثرات چھوڑ جاتا ہے جو بتدریج ایک باطنی کیفیت اور اخلاق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ توبہ ان اثرات کو مٹا دیتی ہے اور ان کو ایک مستقل اخلاقی کیفیت میں تبدیل ہونے سے روک دیتی ہے۔

کئی اور احادیث میں بھی توبہ کو طہور قرار دیا گیا ہے جو کہ گناہ اور بری باطنی خصوصیات کی تشکیل کے باہمی ربط کی نشاندہی کرتا ہے۔ (بحار الانوار، ۶۹: ۱۲۱ اور ۹۱: ۱۳۳)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی معروف پندرہ مناجات میں سے ایک تائبین کی مناجات ہے، اس مناجات میں ہے:

و امات قلبي عظيم جنايتي فاحيه بتوبة منك يا املي و بغيتي

''اے میرے رب! میرے بڑے بڑے گناہوں نے میرے دل کو مردہ کر دیا ہے، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو توبہ کے ذریعے اسے زندہ کر دے، اے میری امید اور اے میری آرزو!''

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ گناہ انسان کی روح اور قلب کو آلودہ کر دیتا ہے اور تکرارِ گناہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب مردہ ہو جاتا ہے۔ توبہ دل کی زندگی اور روح کی نشاط کو بحال کرتی ہے۔

لہٰذا رہروانِ راہِ فضیلت اور سالکانِ الٰہی پر لازم ہے کہ فضائل اخلاقی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے اچھے اور برے اعمال کے مثبت اور منفی اثرات پر کڑی نظر رکھیں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ انسان کا ہر عمل اس کی روح اور اس کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اعمال اچھے اور پاکیزہ ہوں تو روح پر اچھے اور پاکیزہ اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر اعمال برے اور ناپاک ہوں تو روح پر برے اور ناپاک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اخلاق اور خوراک کا باہمی تعلق

ممکن ہے کہ پہلی نظر میں بعض لوگوں کے لیے یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ خوراک کس طرح اخلاق اور نفسی کیفیات پر اثر انداز ہوسکتی ہے؟ اس لیے کہ خوراک کا تعلق تو براہِ راست جسم سے ہے جبکہ اخلاق کا تعلق روح سے ہے۔لیکن اگر جسم اور روح کے باہمی تعلق پر غور کیا جائے تو یہ تعجب اور حیرت برطرف ہوجاتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی نفسیاتی بحران یا شدید رنج وغم کی وجہ سے قلیل سی مدت میں انسان جسمانی طور پر کمزور ہوجاتا ہے، انسان کے بال سفید ہوجاتے ہیں،نظر کمزور ہوجاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔اس کے برعکس اچھی جسمانی کیفیت انسان کی روح پر مثبت اثرات مرتب کر کے اس کو شاداب اور بانشاط بنادیتی ہے۔

زمانۂ قدیم سے اہل علم ودانش انسان کے اخلاق پر اس کی خوراک کے اثرات کے بارے میں غور وفکر کرتے رہے ہیں اور یہ باتیں لوگوں کی ثقافت کا حصہ بھی بن چکی تھیں کہ مثال کے طور پر خون پینے کو سنگدلی کا سبب سمجھا جاتا تھا اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ صحت مند عقل ایک صحت مند جسم میں ہی ہوسکتی ہے۔

قرآن آیات اور احادیث میں بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔سورۂ مائدہ کی آیت ۴۱ میں یہودیوں کی ایک جماعت کے بارے میں، جو اسلام کے خلاف جاسوسی اور کتاب خدا میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۖ

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔''

اس کے فوراً بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ

''وہ آپ کی باتوں کو بہت زیادہ سنتے ہیں تاکہ انہیں جھٹلائیں اور بہت حرام خواری کرتے ہیں۔''

اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی یہ قلبی کیفیت آیات الٰہی کی تکذیب اور مسلسل حرام خوری کا نتیجہ تھی،اس لیے کہ اگر ان اوصاف کا "لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم" سے کوئی تعلق نہ ہو تو یہ فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے انتہائی غیر معیاری گفتگو قرار پائے گی۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حرام خوری آئینہ دل کے تاریک ہوجانے، دل پر اخلاق رذیلہ کے اثر اور فضائل اخلاقی سے دوری کا سبب ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۹۱ میں اللہ تعالیٰ شراب اور جوئے کے بارے میں فرماتا ہے:

''شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرنا چاہتا ہے۔''

إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

اس میں کوئی شک نہیں کہ بغض وعداوت دو باطنی اور اخلاقی خصوصیات ہیں جن کا اس آیت میں شراب خواری کے ساتھ گہرا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حرام خوراک کھانا اور شراب خواری دشمنی اور لڑائی، جھگڑے کی ایجاد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سورۂ مومنون، آیت ۵۱ میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ

یعنی ''اے رسولو! پاکیزہ خوراک کھاؤ اور اعمالِ صالح انجام دیتے رہو۔''

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پاکیزہ خوراک کھانے اور عمل صالح کے درمیان ایک تعلق ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کی خوراکیں کھانے کے مختلف اخلاقی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حلال اور پاکیزہ خوراک روح کو پاک کرتی ہے اور اعمالِ صالحہ کا سبب بنتی ہے جبکہ ناپاک اور حرام خوراک روح کی تاریکی اور برے اعمال کا سبب بنتی ہے۔

تفسیر روح البیان میں عمل صالح اور پاکیزہ خوراک کے باہمی تعلق کا ذکر کرنے کے بعد مندرجہ ذیل اشعار سے استدلال کیا گیا ہے: (ترجمہ اشعار از مترجم)

علم و حکمت زاید از لقمہ حلال
عشق و رقت آید از لقمہ حلال

(علم وحکمت کا سبب رزق حلال، عشق ورقت کا سبب رزق حلال)

لقمہ تخم ہا است و برش اندیشہ ہا
لقمہ بحرا گوہرش اندیشہ ہا

(رزق بیج، اس کا ثمر فکر وخیال، رزق بحر، اس کا گہر فکر وخیال)

ایک اور شعر میں کہا گیا ہے: (تفسیر روح البیان ۶:۸۸)

قطرہ باران توچون صاف نیست
گوہر دریائے تو شفاف نیست

(تیری بارش کے قطرے صاف نہیں ہیں، اس لیے تیرے سمندر کے موتی شفاف نہیں ہیں)

تفسیر اثناء عشری میں بھی اس آیت کے ذیل میں قلبی پاکیزگی اور اعمالِ صالحہ کے رزق حلال کے ساتھ تعلق کی طرف اشارہ کیا

گیا ہے۔

خوراک اور اخلاق کا تعلق احادیث کی روشنی میں

قرآن شریف میں اگرچہ اس تعلق کے بارے میں صرف چند اشارات پائے جاتے ہیں مگر احادیث میں یہ بات بہت تفصیل کے ساتھ نظر آتی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم ذیل میں چند احادیث بیان کرتے ہیں:

۱۔ متعدد احادیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ رزقِ حرام سے اجتناب کیا جائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''یا رسولؐ اللہ! میں چاہتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو۔''

آپؐ نے فرمایا:

طهر ما كلك ولا تدخل بطنك الحرام

''اپنی خوراک پاکیزہ رکھو اور اپنے پیٹ میں حرام داخل نہ کرو۔'' (بحار الانوار، ۹۰: ۳۷۳)

ایک اور حدیث میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

من احب ان يستجاب دعائة فليطيب مطعمه و مكسبه

''جو شخص یہ چاہتا ہوں کہ اس کی دعا قبول ہو، وہ اپنی خوراک اور پیشہ پاکیزہ رکھے۔'' (بحار الانوار، ۹۰: ۳۷۲)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله لا يستجيب دعاء بظهر قلب قاس

''اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا قبول نہیں کرتا جو قساوت قلبی کا شکار ہو۔'' (بحار الانوار ۹۰: ۳۰۵)

ان سب احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ناپاک اور حرام خوراک قساوت قلب کا سبب ہوتی ہے، اسی وجہ سے حرام خوار کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔ یہاں سے روح و دل کی ناپاکی اور رزق حرام کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن کوفہ کی سنگدل فوجوں کے سامنے خطبہ دینے کا ارادہ فرمایا مگر جب آپ نے خطبہ شروع کیا تو وہ خطبہ سننے پر آمادہ نہ ہوئے اور شور و غل کرنے لگے۔ اس پر آپؑ نے فرمایا:

ملئت بطونكم من الحرام فطبع الله على قلوبكم

''چونکہ تمہارے پیٹ حرام سے بھرے ہوئے ہیں، لہٰذا اللہ نے تمہارے دلوں پر مہر لگا دی ہے (اور تم

حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہو)۔'' (سخنان حسین علیہ السلام ابن علی علیہ السلام از مدینہ تا کربلا: ۲۳۲)

۲۔ متعدد احادیث میں رزق حرام اور عبادات کی عدم قبولیت کے درمیان باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ رسولؐ اللہ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من اکل لقمة حرام لن تقبل له صلوة اربعین لیلة، ولم تستجب له دعوة اربعین صباحاو کل لحم ینبته الحرام فالنار اولی به و ان اللقمة الواحدة تنبت اللحم

''جو شخص حرام کا ایک لقمہ کھائے گا، چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی، چالیس روز تک اس کی دعا مستجاب نہ ہوگی، رزق حرام سے جو گوشت اس کے جسم پر پیدا ہو، وہ جہنم کے لیے زیادہ موزوں ہے اور ایک لقمہ بھی گوشت کی پیدائش میں موثر ہوتا ہے۔'' (سفینۃ البحار، ۱، مادہ اکل)

ظاہر سی بات ہے کہ قبولیت نماز کی کئی شرائط ہیں جن میں حضور قلب اور پاکیزگی دل بھی شامل ہیں۔ لیکن رزقِ حرام قلب کی پاکیزگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

۳۔ رسولؐ اللہ سے مروی متعدد احادیث میں ہے:

من ترك اللحم اربعین صباحاساء خلقه

''جو شخص چالیس روز گوشت نہ کھائے، وہ بداخلاق ہو جائے گا۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۷: ۲۵)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گوشت میں ایسے مواد موجود ہیں کہ اگر چالیس دن تک انسان ان سے دور رہے تو اس کا انسان کے اخلاق اور باطنی کیفیات پر یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان بداخلاق ہو جاتا ہے۔

البتہ بعض احادیث میں گوشت کے زیادہ استعمال کی مذمت بھی کی گئی ہے لیکن زیادہ عرصہ تک گوشت کے ترک کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

۴۔ بہت سی احادیث میں جو "کتاب الاطعمه والاشربه" میں بیان ہوئی ہیں، بعض غذاؤں اور اچھے یا برے اخلاق کے باہمی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

علیکم بالزیت فانه یکشف المرة.....ویحسن الخلق

''روغن (یعنی زیتون کا تیل یا کوئی اور تیل) استعمال کیا کرو..... یہ صفراء کو ختم کرتا ہے اور اخلاق کو بہتر کرتا ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۱۷: ۲۵)

۵۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

من سرہ ان یقل غیظہ فلیاکل الحم الدراج

''جوشخص یہ چاہتا ہو کہ اس کا غصہ کم ہوجائے تو وہ تیتر کا گوشت کھائے۔''(فروع کافی،۶:۳۱۲)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خوراک، غصے اور حلم کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔

۶۔ تفسیر عیاشی میں ایک مفصل روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خون کو کیوں حرام قرار دیا ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

واما الدم فانہ یورث الکلب و قسوۃ القلب و قلۃ الرافۃ والرا حمۃ لا یومن ان یقتل ولدہ ووالدیہ.....

''اللہ تعالیٰ نے خون اس لیے حرام کیا ہے کہ یہ دیوانگی، سنگدلی اور رحمت کی کمی کا باعث ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ انسان اپنے بیٹے یا والدین کو قتل کر ڈالے۔'' (تفسیر برہان ۱:۴۳۴ مستدرک الوسائل ۱۴:۱۶۳)

اسی حدیث کے ایک اور حصے میں آیا ہے،

و اما الخمر فانہ حرمھا لفعلھا و فسادھا وقال ان مدمن الخمر کعابد الوثن ویورث ارتعاشا ویذھب بنورہ ویھدم مروتہ

''اور اللہ نے شراب کو اس کے منفی اثرات کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے۔ عادی شراب خوار انسان بت پرست کی طرح ہوجاتا ہے۔ اس کے جسم میں لرزہ پیدا ہوجاتا ہے، اس کے چہرے کی نورانیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی مروت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔''

۷۔ متعدد احادیث میں انگور کھانے اور غم واندوہ کے برطرف ہونے کے باہمی تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

شکی نبی من الانبیاء الی اللہ عزوجل الغم فامرہ اللہ عزوجل بالکال العنب (کافی،۶:۳۵۱)

''ایک نبی نے اللہ تعالیٰ سے غم واندوہ کی شکایت کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں انگور کھانے کا حکم دیا۔''

اس حدیث میں خوراک اور اخلاقیات کے باہمی تعلق پر مزید تاکید نظر آتی ہے۔

۸۔ کئی احادیث میں انار کھانے اور شیطانی وسوسوں کے خاتمے اور نورانیت قلب کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک

حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من اکل رمانه علی الریق انارت قلبه اربعین یوما

''جوشخص نہار منہ ایک انار کھائے، چالیس دن تک اس کا دل نورانی رہے گا۔'' (کافی، ۶:۳۵۱)

۹۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفر ابن ابی طالبؑ سے فرمایا:

یاجعفر کل السفرجل فانه یقوی القلب و یشجع الجبان

''اے جعفر! ''بہی'' کھایا کرو، یہ دل کو قوت دیتی ہے اور بزدلی کا خاتمہ کرتی ہے۔'' (کافی، ۶:۳۵۱)

۱۰۔ بعض احادیث میں ضرورت سے زیادہ کھانے اور سنگدلی، قساوت اور نصیحت کا اثر نہ ہونے کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب ''اعلام الدین'' میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

ایاکم وفضول المطعم فانه یسم القلب بالقسوة ویبطیء بالجوارح عن الطاعة ویصم الهمم عن سماع الموعظة

''ضرورت سے زائد کھانا کھانے سے اجتناب کرو کیونکہ یہ قساوت قلب، عبادت میں سستی و کاہلی کا سبب ہوتا ہے اور نصیحت سننے کے معاملہ میں کانوں کو بہرہ کر دیتا ہے۔''

بحارالانوار اور اہل سنت کی بعض روایات میں بھی یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ہے۔

(بحارالانوار، ۷۴:۱۸۲)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ضرورت سے زائد غذا کے تین منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے دل میں قساوت پیدا ہوتی ہے، انسان عبادات وفرائض کی انجام دہی میں سستی اور کاہلی کا شکار ہوجاتا ہے اور نصیحت کو سننے اور سمجھنے والی سماعت سے محروم ہوجاتا ہے۔

یہ حقیقت بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے کہ جب انسان نے زیادہ اور ثقیل کھانا کھایا ہوتا ہے تو وہ عبادات کو بمشکل انجام دیتا ہے اور اس کی عبادت میں کوئی نشاط وسرور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر انسان نے کم اور سادہ کھانا کھایا ہو تو صبح کی اذان سے پہلے بیدار ہوجاتا ہے اور عبادت ومطالعہ کے لیے اس کی حالت بہت اچھی ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ جب انسان روزہ رکھتا ہے تو اس کے دل میں رقت اور نرمی پیدا ہوجاتی ہے اور نصیحت کو قبول کرنے کے لیے بہتر آمادگی اس میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو اس وقت اس کا ذہن اور سوچ ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتے اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے دور محسوس کرتا ہے۔

۱۱۔ احادیث میں شہد کھانے اور دل کی پاکیزگی کے باہمی ربط کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

(بحار الانوار، ۶۳: ۲۹۴)

العسل شفاء من کل داء ولا داء فیه یقل البلغم و یجلی القلب

''شہد تمام بیماریوں کے لیے شفا ہے اور خود اس میں کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ بلغم کو کم اور دل کو روشن کرتا ہے۔''

نتیجہ

مذکورہ بالا احادیث اور اس مضمون کی دیگر احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ غذا اور باطنی کیفیات اور اخلاقیات کے درمیان قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خوراک اچھے یا برے اخلاق کی علت تامہ ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خوراک اخلاق کی پاکیزگی کی راہ ہموار کرنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے، حرام و حلال کے لحاظ سے بھی اور کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بھی۔

موجودہ دور کے سائنسدانوں اور محققین کا کہنا بھی ہے کہ بہت سی اخلاقی کیفیات کا تعلق ان ہارمونز سے ہے جو مختلف حالات میں ہمارے بدن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کا ہماری خوراک سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کا کہنا ہے کہ ہر جانور کے گوشت میں اس جانور کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جو لوگ یہ گوشت کھاتے ہیں، ان کے اندر بھی یہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ درندوں کا گوشت انسان میں درندگی پیدا کرتا ہے، سور کا گوشت جنسی بے راہ روی کا باعث ہوتا ہے۔

اس طرح معنوی تعلق کے علاوہ خوراک اور اخلاقیات کے درمیان مادی اور طبیعی تعلق بھی پایا جاتا ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حرام غذائیں دل کو تاریک کر دیتی ہیں اور اخلاقی خوبیوں کو کمزور کر دیتی ہیں۔

ہم اس بحث کو اس واقعہ کا ذکر کر کے ختم کرتے ہیں جسے مسعودی نے مروج الذہب میں بیان کیا ہے:

مسعودی، فضل بن ربیع سے روایت کرتا ہے کہ ایک دن شریک بن عبداللہ، عباسی خلیفہ مہدی کے پاس گیا۔ مہدی نے اسے کہا کہ ان تین کاموں میں سے ایک کام تمہیں ہر حال میں کرنا پڑے گا: قاضی کا عہدہ قبول کر دیا میرے بیٹے کے استاد بن جاؤ یا ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ شریک نے ذرا سوچا اور کہا کہ تیسرا کام سب سے آسان ہے۔ مہدی نے اسے روکا اور باورچی کو انواع و اقسام کے لذیذ کھانے تیار کرنے کو کہا۔ جب شریک اس لذیذ (اور حرام) کھانے سے فارغ ہوا تو باورچی نے مہدی کی طرف منہ کر کے کہا:

''یہ کھانا کھانے کے بعد یہ شخص کبھی فلاح و سعادت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد شریک نے قاضی کا عہدہ بھی قبول کر لیا اور اس کے بیٹے کو تعلیم دینے پر بھی آمادہ ہو گیا۔ (مروج الذہب، ۳: ۳۱۰، سفینۃ البحار، مادہ شرک)

اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال

ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان کے اعمال اس کی اندرونی صفات کی بنیاد پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اندرونی صفات کی حیثیت جڑ کی سی ہوتی ہے جبکہ اعمال کی حیثیت شاخ اور پھل کی سی ہوتی ہے۔

اسی لیے اخلاقی صفات اور اخلاقی اعمال ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، مثلاً نفاق جو صفاتِ رذیلہ میں سے ہے، انسان کے اندر اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ یہ صفت انسان کے اندر خلافِ توحید، دوہری شخصیت کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے اور یہی خصوصیت منافقانہ اور ریاکارانہ اعمال کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔

حسد ایک باطنی صفت ہے جس کی وجہ سے انسان کسی شخص سے اس لیے جلتا ہے کہ اللہ نے اسے کوئی نعمت عطا کر رکھی ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنے ان اعمال سے کرتا ہے جو وہ اس کی کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکانے اور مشکلات پیدا کرنے کے لیے انجام دیتا ہے۔

تکبر اور غرور بھی وہ اندرونی صفات ہیں جو اس لیے انسان میں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے مقام اور قدر و منزلت سے آشنا نہیں ہوتا یا پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے معاملہ میں کم ظرف ثابت ہوتا ہے۔ جب انسان دوسروں کی تحقیر اور تذلیل کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی اسی صفت رذیلہ کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علمائے علم اخلاق نے کتب اخلاق میں عام طور پر ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا ہے بلکہ کبھی وہ اسباب و وجوہات کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی نتائج کا۔ اول الذکر کو اخلاقی صفات اور ثانی الذکر کو اخلاقی اعمال کا نام دیا جاتا ہے۔

البتہ اخلاقی اعمال علم فقہ کا موضوع ہیں اور فقہاء فقہی نقطہ نظر سے ان پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے باوجود علمائے اخلاق ان کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ البتہ علم اخلاق کے عالم اور فقیہ کے زاویۂ نگاہ میں فرق ہوتا ہے۔ فقیہ ان اعمال کے بارے میں وجوب، استحباب، کراہت اور اباحت کے حوالہ سے بات کرتا ہے اور کبھی ثواب و عقاب کے حوالہ سے ان افعال کا جائزہ لیتا ہے۔ لیکن علم اخلاق کا عالم ان افعال کا اس لحاظ سے مطالعہ کرتا ہے کہ یہ انسان کے روحانی کمال یا انحطاط کا مظہر ہیں۔

بارھواں باب

تہذیب اخلاق کی طرف عملی قدم

اس فصل میں ہم ان امور کو زیر بحث لائیں گے جو فضائل اخلاقی کی پرورش کیلئے زمین کو ہموار کرتے ہیں اور قدم بقدم انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔علم اخلاق میں اس بحث کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور اس میں بہت سے امور کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

پہلا قدم توبہ

بہت سے علمائے اخلاق نے توبہ کو تہذیب اخلاق اور سیر الی اللہ کا پہلا قدم قرار دیا ہے۔ایسی توبہ جو صفحۂ قلب کو آلائشات سے پاک کردے، تاریکیوں کو روشنی سے بدل دے، انسان کی پشت سے گناہوں کا بوجھ اتار کر اسے ہلکا کردے تاکہ وہ آسانی سے قرب الٰہی کا راستہ طے کر سکے۔

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضا کی ساتویں جلد کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''گناہ سے توبہ اور ستار العیوب اور علام الغیوب کی بارگاہ کی طرف واپس آنا سالکین کے سفر کا نقطہ آغاز، فلاح پانے والوں کا سرمایہ، مریدانِ حق کا پہلا قدم، اہل محبت کی کلید، برگزیدگانِ الٰہی کیلئے صبح روشن کا طلوع اور مقربانِ الٰہی کا پسندیدہ عمل ہے۔''

اس کے بعد وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان لغزشوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے اور حضرت آدمؑ کی لغزش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس میں کیا مشکل ہے، سب فرزندانِ آدمؑ ارتکابِ خطا کے بعد حضرت آدمؑ کی پیروی کریں، اس لئے کہ صرف اعمالِ خیر کا صدور تو فرشتوں سے ہوسکتا ہے جبکہ برائی کی تلافی نہ کرنا شیاطین کی خصوصیت ہے اور شر کے بعد خیر کی طرف پلٹنا انسان کی طبیعت ہے۔جو شخص ارتکاب گناہ کے بعد خیر کی طرف واپس پلٹ آتے ہیں، وہی انسان ہیں۔

درحقیقت توبہ دین کی بنیاد ہے، اس لئے کہ دین انسان کو برائیوں سے دوری اور اعمالِ خیر کے قریب ہونے کی دعوت دیتا ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر توبہ کو نجات بخش صفات و اعمال کے ذکر میں مقام اول دیا جائے۔''(محجۃ البیضا، ۷:۶ تا ۷)

بالفاظِ دیگر اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان، خاص طور پر سیر و سلوک الی اللہ کے آغاز میں، خطاؤں اور لغزشوں کا مرتکب ہوتا ہے۔اگر توبہ کے دروازے اس پر بند کردیئے جائیں تو وہ مایوس ہوکر قرب الٰہی کے سفر کو ہمیشہ کیلئے ترک کردے۔اسی لئے اسلام کے تربیتی نظام میں توبہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور تمام گناہگاروں کو دعوت دی گئی ہے کہ اپنی اصلاح کیلئے اور ماضی کی تلافی کیلئے رحمتِ

الٰہی کے اس دروازے سے قرب الٰہی کی طرف سفر کا آغاز کریں۔

اس حقیقت کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے مناجاتِ تائبین میں خوبصورت ترین پیرائے میں بیان کیا ہے:

الهی انت الذی فتحت لعبدك بابا الی عفوك سمیته التوبة فقلت توبوا الی الله توبة نصوحا، فما عذر من اغفل دخول الباب بعد فتحه

اے میرے معبود! تو نے اپنے بندوں کیلئے اپنے عفو و درگزر کی طرف ایک دروازہ کھولا ہے جسے تو نے توبہ کا نام دیا ہے اور تو نے حکم دیا کہ اللہ کی طرف خالص توبہ کرو۔ اب جبکہ دروازہ کھلا ہے، کوئی اس دروازے سے نہ گزرے تو اس کے پاس کیا عذر باقی ہے!'' (بحار الانوار، ۹۴: ۱۴۲، مفاتیح الجنان، مناجات التائبین)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ کو بہت پسند کرتا ہے، اس لئے کہ انسان کی ہر سعادت کا پہلا قدم توبہ ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الله تعالی اشد فرحا بتوبة عبده من رجل اضل راحلته وزاده فی لیلة ظلماء فوجدها

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کوئی شخص دورانِ سفر، تاریک رات میں، بیابان میں اپنی سواری اور زادِ راہ کے گم ہو جانے کے بعد اس کے دوبارہ مل جانے پر خوش ہوتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۴۳۵)

یہ بیان جو کہ بہت سے لطیف کنایات پر مشتمل ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ توبہ سواری بھی ہے اور زادِ راہ بھی، تاکہ انسان اس کے ذریعے گناہ کی تاریک وادی سے آگے گزر جائے اور نور و رحمت کی منزل اور اعلیٰ انسانی صفات تک پہنچ جائے۔

توبہ کی بحث کے ذیل میں بہت سے امور آتے ہیں جن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں:

۱۔ حقیقت توبہ	۲۔ وجوب توبہ
۳۔ توبہ کی عمومیت	۴۔ ارکان توبہ
۵۔ توبہ کی قبولیت عقلی ہے یا نقلی	۶۔ جزئی توبہ
۷۔ توبہ کا دوام	۸۔ توبہ کے درجات
۹۔ توبہ کے نتائج و برکات	

۱۔حقیقت توبہ

اصل میں توبہ کے معنی ہیں گناہ سے واپس پلٹنا۔ یہ اس صورت میں ہے جب اس کی نسبت گنہگار شخص کی طرف دی گئی ہو۔ جیسے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے شراب نوشی سے توبہ کر لی۔لیکن قرآن شریف اور احادیث میں متعدد مقامات پر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی گئی ہے۔اس صورت میں اس کے معنی رحمت کی طرف واپسی کے ہیں۔وہ رحمت جو گناہ کی وجہ سے سلب کر لی جاتی ہے، جب بندہ عبادت کی راہ پر واپس آ تا ہے تو اللہ کی رحمت بھی اس کی طرف واپس ہو جاتی ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ''تواب'' ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ رحمت واپس بھیجنے والا یا بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا۔

درحقیقت توبہ کا لفظ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان مشترک معنوی یا مشترک لفظی ہے۔لیکن جب اسے بندوں کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ''الیٰ'' استعمال ہوتا ہے اور جب اسے اللہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ''علیٰ'' استعمال ہوتا ہے۔

محجۃ البیضاء میں توبہ کی حقیقت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ توبہ کے تین ارکان ہیں: علم، حال اور فعل۔ان تینوں میں سے ہر ایک دوسرے کی علت ہے۔

علم سے مراد گناہوں کے نقصانات کا علم ہے اور یہ کہ بندے کو اس بات کا علم ہو کہ گناہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔ جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جائے تو اس کا دل اس بات پر غمگین ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے دور ہو گیا ہے۔ چونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کے عمل کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے تو وہ نادم اور پشیمان ہوتا ہے۔ یہ ندامت ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں اس کے اندر ایک عزم اور ارادہ پیدا کرتی ہے۔

حال میں وہ اس عمل کو ترک کر دیتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں وہ عزم کرتا ہے کہ پھر اس عمل کو انجام نہ دے گا جو محبوب سے دوری کا سبب بنتا ہے اور ماضی کے حوالے سے وہ تلافی کی کوشش کرتا ہے۔

درحقیقت علم اور یقین کا نور انسان کے اندر وہ حالت پیدا کر دیتا ہے جو ندامت اور پشیمانی کا سرچشمہ بنتی ہے۔ یہ ندامت ماضی، حال اور مستقبل کے لحاظ سے مذکورہ بالا تین اقدامات کا سبب بنتی ہے (محجۃ البیضاء)

یہ وہی حقیقت ہے جسے بعض اہل معرفت روحی انقلاب کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توبہ انسان کی روح اور جان کے اندر پیدا ہونے والا انقلاب ہے جو انسان کو اپنی زندگی کے تمام معمولات میں نظر ثانی کی دعوت دیتا ہے۔

۲۔وجوب توبہ

تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ توبہ واجب ہے۔قرآن مجید میں بار بار توبہ کا حکم دیا گیا ہے، سورۂ تحریم، آیت ۸

میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، خالص، توبہ، امید ہے کہ اس طرح تمہارا رب تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور تمہیں جنت کے باغات میں داخل کرے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔''

جب بھی اللہ تعالیٰ نے گمراہ اقوام کی ہدایت کے لیے کوئی نبی بھیجا تو ان کی تبلیغ کا پہلا قدم یہ تھا کہ انہوں نے توبہ کی طرف دعوت دی۔ اس لیے کہ توبہ اور دلوں کو گناہوں کے اثرات سے پاک کئے بغیر ممکن ہی نہیں کہ دل میں توحید اور اخلاقی فضائل کیلئے کوئی جگہ پیدا ہو سکے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے پہلی بات یہ کہی:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ

''اے میری قوم! اللہ سے مغفرت طلب کرو پھر اس کی بارگاہ میں توبہ کرو۔'' (ہود: ۵۲)

یہی بات حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اس طرح کہی:

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ

''پس تم اس سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف توبہ کرو۔'' (ہود: ۶۱)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم کو دعوت کا آغاز اس دعوت سے کیا:

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

''پس تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف توبہ کرو کیونکہ میرا رب بہت مہربان ہے اور (توبہ کرنے والوں) سے محبت کرتا ہے۔'' (ہود: ۹۰)

احادیث میں بھی گناہ کے بعد فوراً توبہ کرنے پر بہت تاکید کی گئی ہے۔

۱۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام حضرت امام حسن علیہ السلام کے نام اپنی وصیت میں فرماتے ہیں:

وان قارفت سيئة فعجل محوها بالتوبة (بحار الانوار ۲۰۸:۴۴، نہج البلاغہ)

''اگر تم گناہ کے مرتکب ہو جاؤ تو جس قدر جلدی ممکن ہو اسے توبہ کے ذریعے مٹا دو۔''

اس حقیقت کے پیش نظر کہ امام سے گناہ سرزد نہیں ہوتا، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس جملے کا مقصد عام لوگوں کو

نصیحت کرنا ہے۔

۲۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ عبداللہ ابن مسعود سے فرماتے ہیں:

یابن مسعود لا تقدم الذنب ولا توخر التوبة، ولکن قدم التوبة و اخر الذنب

''گناہ کو مقدم اور توبہ کو موخر نہ سمجھو بلکہ توبہ کو مقدم اور گناہ کو موخر رکھو۔''

۳۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مسوف نفسه بالتوبة من هجوم الاجل علی اعظم الخطر

''موت کے خطرہ کی موجودگی میں جو شخص توبہ میں تاخیر کرتا ہے، وہ سب سے بڑے خطرے سے دوچار ہے (کہ اس کی عمر تمام ہوجائے اور اس نے توبہ نہ کی ہو)۔'' (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۳۰)

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام علی رضاؑ رسولؐ اللہ سے نقل فرماتے ہیں، (مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۳۰)

لیس شیء احب الی اللہ من مومن تائب او مومنة تائبة

''توبہ کرنے والے مومن یا مومنہ سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کو محبوب نہیں ہے۔''

یہ عبارت توبہ کے وجوب کی دلیل ہوسکتی ہے، اس لئے کہ اس میں توبہ کو اللہ کی محبوب ترین چیز کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ توبہ کے وجوب پر بڑی واضح عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ عذاب الٰہی سے بچنے کی راہ ضرور تلاش کرنی چاہئے، خواہ اللہ کا عذاب یقینی ہو یا احتمالی۔ چونکہ توبہ بہترین وسیلہ نجات ہے، عقل اسے واجب قرار دیتی ہے۔ اگر گناہگار افراد توبہ نہ کریں تو وہ دنیا اور آخرت میں کس طرح اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں!

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ از روئے قرآن و حدیث و عقل توبہ واجب ہے اور توبہ کے واجب ہونے پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں۔ بنابرایں از روئے ادلہ اربعہ توبہ واجب ہے اور اس کا وجوب بھی فوری ہے، جیسا کہ ان چاروں دلائل سے واضح ہے۔

علم اصولِ فقہ میں بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ تمام اوامر و نواہی پر فوری عمل کرنا واجب ہے مگر یہ کہ دلیل سے ثابت ہو کہ فوریت ضروری نہیں ہے۔

۳۔ توبہ کی عمومیت

توبہ کسی خاص گناہ، خاص فرد یا افراد، کسی خاص زمانے یا خاص عمر سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر گناہ سے توبہ کرنا، ہر فرد پر اور ہر زمان و مکان میں واجب ہے۔ اگر توبہ میں قبولیت کی شرائط موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں صرف ان لوگوں کی توبہ قبول نہ ہونے کا ذکر کیا گیا ہے جو عالم برزخ کی دہلیز پر پہنچ کر یا عذابِ خدا کو دیکھ کر توبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ (جیسے فرعون، جس نے دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہوتے وقت کہا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں)۔

اس وقت توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے۔اس وقت کی توبہ مجبوری کی توبہ ہوتی ہے، اختیاری نہیں۔قرآن شریف میں ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۸

''ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوگی جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ انمیں سے کسی کی موت آ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی، اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قابل قبول نہیں ہے جو حالت کفر پر مرجاتے ہیں۔ان کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''(نساء:۱۸)

فرعون کے واقعہ میں ہے کہ جب وہ دریائے نیل میں بننے والے خشک راستے میں داخل ہوا اور اچانک پانی کی لہروں نے اسے گھیر لیا تو اس نے کہا:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰

''میں ایمان لایا کہ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمین میں سے ہوں۔''(یونس:۹۰)

لیکن فوراً اس نے یہ جواب بھی سن لیا:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱

''اب ایمان لا رہے ہو؟ حالانکہ اس سے پہلے تم نے نافرمانی کی اور تم فساد کرنے والوں میں سے تھے (اب تیری توبہ قابل قبول نہیں ہے)۔''(یونس:۹۱)

بعض گزشتہ اقوام کے بارے میں قرآن شریف میں ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝۸۴

''اب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن کو ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے، ان کا انکار کرتے ہیں۔''(مومن:۸۴)

قرآن شریف ان کے جواب میں کہہ رہا ہے:

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۵ (مومن:۸۵)

''جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں

دیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہی ہے، یہی وہ موقع تھا جہاں کافروں نے خسارہ اٹھایا۔''

اسی اصول کی بنیاد پر اسلام کے عدالتی نظام میں یہ ایک قانون ہے کہ اگر کوئی مجرم گرفتار ہونے کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی توبہ مجبوری کی توبہ ہوتی ہے جو انسان کے اندر کوئی مثبت تبدیلی نہیں لاتی۔

بنابرایں صرف ایک صورت میں توبہ قابل قبول نہیں ہوتی، وہ حالت جس میں انسان کے پاس کوئی اختیار باقی نہ رہے اور وہ توبہ کرنے پر مجبور ہو۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ تین اور حالات میں بھی توبہ قبول نہیں ہے:

پہلی صورت شرک اور بت پرستی ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ

''اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں کرے گا، اس کے نچلے درجہ کے گناہوں کو، جس کیلئے چاہے معاف کردے گا۔''(نساء:۴۸)

لیکن یہ نقطہ نظر صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں توبہ کی نہیں بلکہ توبہ کے بغیر بخشش کی نفی ہورہی ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صدرِ اسلام میں جن مشرکین نے اسلام قبول کیا تھا، ان کی توبہ قبول ہوئی تھی، اسی طرح اگر آج سارے مشرک توبہ کرلیں اور مسلمان ہوجائیں تو تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی توبہ قبول ہوجائے گی لیکن اگر مشرک توبہ نہ کرے اور حالت شرک میں مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور بخشش اس کے شامل حال نہ ہوگی۔لیکن اگر ایمان لے آئے اور پھر اس دنیا سے چلا جائے اور اس نے کچھ گناہ بھی کئے ہوں تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے۔

یہی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم ہے۔مختصر یہ کہ اللہ کی مغفرت اور بخشش مشرکوں کو نصیب نہیں ہوگی لیکن اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے۔لیکن توبہ تمام گناہوں، حتی کہ شرک کی بھی بخشش کا سبب ہوجاتی ہے۔

دوسری اور تیسری صورت یہ ہے کہ توبہ گناہ کے تھوڑے عرصہ بعد کرلی جائے اور توبہ ان گناہوں سے ہو جو از روئے جہالت کئے گئے ہوں، نہ کہ سرکشی و بغاوت کی وجہ سے، اس لئے کہ سورۂ نساء، آیت ۱۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۷

''توبہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو از روئے نادانی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔اللہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔''

لیکن یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں توبہ سے مراد کامل توبہ ہے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص سرکشی وعناد کی وجہ سے گناہ کرے اور پھر سرکشی وعناد سے باز آجائے اور توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول فرماتا ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے بہت سے افراد کا تذکرہ ملتا ہے جو ابتداء میں اسلام کے سخت دشمن تھے مگر بعد میں توبہ کر کے مخلص مسلمان بن گئے۔ اسی طرح یہ بات بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر انسان سالہا سال تک گناہ کرتا رہے اور بعد میں پشیمان ہوجائے اور حقیقی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی موت سے ایک سال قبل توبہ کرلے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک سال زیادہ ہے، اگر موت سے ایک ماہ قبل بھی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک ماہ بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک جمعہ (یعنی ایک ہفتہ قبل) توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک جمعہ بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک روز قبل توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک دن بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص مرنے سے ایک ساعت قبل توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایک ساعت بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص اس وقت توبہ کرلے جب اس کی جان اس کے گلے تک پہنچ جائے (یعنی حیات واختیار کے آخری لمحوں میں) تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔

البتہ اس کے معنی یہ ہیں کہ توبہ انہی تمام شرائط کے ساتھ انجام پائے، مثلاً اگر اس نے کسی کا حق ضائع کیا ہو تو وہ مرنے سے قبل اس کے حق کی ادائیگی کی وصیت کر کے توبہ کرے۔

قرآن شریف میں بہت سی آیات ہیں جو توبہ کی عمومیت پر دلالت کرتی ہیں جس کے معنی ہیں کہ تمام گناہوں میں توبہ کی گنجائش ہے:

۱۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵۳

''اے رسولؐ! کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (زمر: ۵۳)

۲۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۹

''جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ اور اصلاح کرلے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (مائدہ: ۳۹)

۳۔ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ

رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

''تم میں سے جوکوئی از روئے نادانی گناہ کا مرتکب ہو، پھرتوبہ اوراصلاح کرلےتواللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''(انعام:۵۴)

اس آیت کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ سارے گناہ اس کے اندرآ جاتے ہیں اورآیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تمام گناہ قابل عفو ہیں۔

۴۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۫ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۣ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''اور جب وہ گناہ کرتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرتا ہے اور پھر وہ دانستہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔''(آل عمران:۱۳۵)

اس آیت میں بھی گناہ اور ظلم سے مراد تمام گناہ ہیں، اس لئے کہ بعض گناہ دوسروں پر ظلم کے زمرے میں آتے ہیں اور بعض گناہ اپنے اوپر ظلم محسوب ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ان دونوں قسم کے گناہوں کی مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت بھی توبہ کی عمومیت پر دلالت کرتی ہے۔

۵۔ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

''اے اہل ایمان! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو، امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔''(نور:۳۱)

اس آیت میں ''جَمِيْعًا'' کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ اس آیت میں ہر گناہ گار مسلمان کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر توبہ میں عمومیت نہ پائی جاتی تو اس طرح ہر گنہگار مسلمان کو توبہ کا حکم دینا صحیح نہ ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سے بعض میں اسراف، بعض میں ظلم اور بعض میں سوء کے الفاظ استعمال ہوئے اور توبہ کی صورت میں ان سب کی معافی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ وسنی کی کتب حدیث میں بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کا دروازہ زندگی کے آخری لمحات کھلا رہتا ہے۔ ان احادیث کے مطالعہ کیلئے بحارالانوار، اصولِ کافی، درالمنثور، کنزالعمال، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان، تفسیر روح المعانی اور دیگر کتب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے اس حدیث کے متواتر ہونے کا دعویٰ بے جا نہ ہو۔

۴۔ارکانِ توبہ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ توبہ درحقیقت پشیمانی اور ندامت کی وجہ سے، اللہ کی نافرمانی سے اللہ کی اطاعت کی طرف واپس پلٹنے کا نام ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ اس پشیمانی کا لازمہ یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم حاصل ہو جائے کہ گناہ کی وجہ سے وہ اپنے محبوب حقیقی سے دور ہو گیا ہے، لہٰذا وہ اپنے گزشتہ برے عمل کو ترک کرنے کا پختہ عزم کر لے اور گناہوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اسی لئے قرآن مجید میں توبہ کے ساتھ اصلاح کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس حقیقت کی بہترین دلیل ہیں:

۱۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کرنے اور سخت سزا کی وعید سنانے کے بعد جو آیات الٰہی کو چھپانے کے گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے، کہا جاتا ہے کہ:

''مگر وہ لوگ جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں اور جو کچھ انہوں نے چھپایا تھا، اسے بیان کریں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہو جاتا ہوں، اس لئے کہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (بقرہ:۱۶۰)

۲۔ سورۂ آل عمران، آیت ۸۹ میں مرتد ہو جانے والوں اور ان کی سخت سزا کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

''مگر وہ لوگ جو اس کے بعد توبہ کر لیں، اصلاح کریں، اس لئے کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

۳۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۴۶ میں منافقوں اور ان کے برے انجام کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ اور اصلاح کر لیں اور اللہ سے مضبوط تعلق قائم کریں اور اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کریں۔''

اسی طرح سورۂ نور کی آیت ۵ میں پاکدامن عورتوں پر بدچلنی کا الزام لگانے والوں کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾

''سوائے ان کے جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

۵۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۹ میں اللہ تعالیٰ ایک عمومی قانون کی حیثیت سے فرماتا ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

''پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے بخشنے والا رحم کرنے والا ہے جو از روئے جہالت گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد توبہ و اصلاح کرتے ہیں۔''

۶۔ یہی بات سورۂ طٰہٰ کی آیت ۸۵ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَاِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾

''بے شک میں ان لوگوں کے لیے بہت بخشنے والا ہوں جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے، پھر ہدایت پا گئے۔''

اس آیت میں توبہ اور عمل صالح (یعنی ماضی کی خرابیوں کی اصلاح) کے علاوہ، جو کہ توبہ کے دو اساسی رکن ہیں، ایمان اور ہدایت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

درحقیقت گناہ ایمان کے نور کو کم کر دیتا ہے اور انسان کو ہدایت کی راہ سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے بعد گناہگار کو چاہیے کہ تجدید ایمان کرے اور راہِ ہدایت کی طرف واپس آ جائے۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں توبہ کے بارے میں قرآن مجید کی منطق مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے جس کی رو سے حقیقی توبہ کے لیے صرف استغفر اللہ کہنا، حتیٰ کہ ندامت اور گناہ کو مکمل طور پر ترک کر دینے کا عزم مصمم بھی کافی نہیں ہے بلکہ گناہ کی وجہ سے انسان کے اپنے قلب و جان اور معاشرے پر جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی اصلاح کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں اصلاح کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور ہر قسم کی خرابی اور فساد کی اصلاح پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی رو سے:

۱۔ توبہ کرنے والے شخص پر لازم ہے کہ اس نے جس جس کا حق پامال یا ضائع کیا ہے، وہ انہیں واپس کرے۔ اگر صاحب حق فوت ہو چکا ہو تو اس کے وارث کو ادا کرے۔

۲۔ اگر اس نے غیبت یا کسی اور طریقہ سے کسی کی عزت کو داغدار کیا ہو تو اس سے معافی مانگے اور اگر وہ شخص فوت ہو چکا ہو تو اس کے لیے کارِ خیر انجام دے تاکہ اس کی روح اس سے راضی ہو جائے۔

۳۔ اگر اس کی عبادات فوت ہو گئی ہوں تو ان کی قضا انجام دے۔ اگر کسی عبادت کے ترک کرنے کا شریعت نے کوئی کفارہ مقرر کیا ہے تو وہ کفارہ بھی ادا کرے۔

۴۔ چونکہ گناہ دل کو تاریک کر دیتا ہے، لہٰذا اس خرابی کی اصلاح کے لیے اس قدر عبادت کرے کہ نورانیت تاریکی پر غالب آ جائے۔

اصلاح کے بارے میں جامع ترین تعبیر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد میں نظر آتی ہے جو نہج البلاغہ میں کلمات قصار میں ہے۔ کسی شخص نے امیر المومنین علیہ السلام کی موجودگی میں کہا: ''استغفر اللہ''۔ گویا امام علیہ السلام اس کے گزشتہ کردار واعمال سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کی توبہ صرف لفظی توبہ ہے، نہ کہ حقیقی، لہٰذا آپؑ اس کی اس استغفار پر برہم ہوئے اور فرمایا:

''تیری ماں تجھے روئے! تجھے معلوم ہے استغفار کیا ہے؟ استغفار بلند مرتبہ لوگوں کا مقام ہے۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

''یہ ایک ایسا اسم ہے جو چھ معانی پر صادق آتا ہے:

اولها الندم على مامضى

''اول یہ کہ گزرے ہوئے برے اعمال پر انسان نادم اور پشیمان ہو۔''

والثانى العزم على ترك العود اليه ابدا

''دوم یہ کہ اس کام کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دینے کا عزم کرے۔''

والثالث ان توء دى الى المخلوقين حقوقهم حتى تلقى الله املس ليس عليك تبعة

''سوم یہ کہ لوگوں کے ضائع شدہ حقوق ان کو ادا کرے تا کہ قیامت کے دن کسی کا حق تمہارے ذمہ نہ ہو۔''

و الرابع ان يعمدالى كل فريضة عليك ضيعتها فتودى حقها

''چہارم یہ کہ جن فرائض کو تو نے ترک کیا ہے، انہیں انجام دے (ان کی قضا یا کفارہ انجام دے)۔''

والخامس ان يعمدالى اللحم الذى نبت على السحت فتذيبه با الاحزان حتى تلصق الجلد بالعظم وينشا بينهما لحم جديد

''پنجم یہ کہ حرام خواری کے نتیجہ میں جو گوشت تمہارے بدن پر بنا ہے، گناہ پر پشیمانی اور غم کے ذریعے اسے پگھلا دو، یہاں تک کہ تمہاری کھال ہڈیوں سے چپک جائے، پھر اس پر نیا گوشت پیدا ہو۔''

والسادس ان تذيق الجسم الم الطاعة كما ازقته حلاوة المعصية فعند ذلك

تقول استغفر الله

''ششم یہ کہ جس قدر تم نے گناہ کی لذت اور شیرینی کا لطف اٹھایا ہے، اب اسی قدر عبادت کی سختی کی تلخی کو برداشت کرو۔ جب یہ سب کچھ کرلو تو پھر کہو 'استغفر اللہ'۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۴۱۷)

یہی بات ایک اور روایت میں کمیل بن زیاد نے امیر المومنین علیہ السلام سے اس طرح نقل کی ہے کہ میں نے امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا:

یا امیر المومنین العبد یصیب الذنب فیستغفر الله منه فما حد الاستغفار؟

''یا امیر المومنینؑ! انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، پھر استغفار کرتا ہے، استغفار کی حد کیا ہے؟''

امامؑ: ''التوبہ'' یعنی استغفار کی حد توبہ ہے۔

کمیل: ''کیا اتنا ہی کافی ہے؟''

امامؑ: ''نہیں۔''

کمیل: قلت فکیف؟ ''میں نے کہا، کیسے؟''

قال ان العبد اذا اصاب ذنبا یقول استغفر الله بالتحریك

''آپؑ نے فرمایا جب انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو زبان کی حرکت سے استغفار کرتا ہے۔''

قلت و ما لتحریك

''میں نے کہا تحریک سے کیا مراد ہے؟''

قال: الشفتان و اللسان یرید ان یتبع ذلك بالحقیقة

''آپؑ نے فرمایا: زبان اور لب گردش میں آتے ہیں اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرح حقیقت تک پہنچ سکے۔''

قلت وما الحقیقة؟

''میں نے عرض کیا: حقیقت کیا ہے؟''

قال تصدیق فی القلب و اضمار ان لا یعود الی لذنب الذی استغفر منه

''آپ نے فرمایا: اس سے مراد سچائی کا وہ ادراک ہے جو گناہ کے بارے میں اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ عزم کرلیتا ہے کہ جس گناہ سے اس نے استغفار کرلی ہے، اسے پھر کبھی انجام نہ دے گا۔''

فاذا فعل ذلك فانه من المستغفرين

''کیا جب وہ ایسا کرلے تو وہ مستغفرین میں شامل ہوجاتا ہے؟''

قال لا

''آپؑ نے فرمایا: نہیں!''

فكيف ذاك؟

''پس توبہ کی حقیقت کیا ہے؟''

لانك لم يبلغ الى الاصل بعده

''اس لیے کہ ابھی تک تم توبہ کی اساس تک نہیں پہنچ پائے ہو۔''

فاصل الاستغفار ماهو؟

''پھر استغفار کی اصل اور اساس کیا ہے؟''

الرجوع الى التوبة من الذنب الذى استغفرت منه وهى اول درجة العابدين

''جس گناہ سے استغفار کی ہے، اس سے توبہ کی طرف واپس آنا، یہ عابدین کا پہلا درجہ ہے۔''

پھر آپؑ نے فرمایا:

وترك الذنب والاستغفار اسم واقع لمعان ست

''ترک گناہ اور استغفار ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے چھ معنی و مراحل ہیں۔''

پھر آپؑ نے مختصر فرق کے ساتھ انہی چھ مراحل کا ذکر فرمایا جو نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

(بحارالانوار، ۶: ۲۷)

ممکن ہے یہاں پر یہ کہا جائے کہ اگر یہی توبہ ہے تو پھر شاید ہی کوئی شخص توبہ کرسکتا ہو!

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس حقیقت کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا چھ مراحل توبۂ کامل کی شرائط ہیں، جیسا کہ پانچویں اور چھٹی شرط۔ جبکہ دیگر چار شرائط واجب اور لازم ہیں۔ بعض محققین نے ان مراحل کے بارے میں کہا ہے کہ پہلے دو مراحل توبہ کے ارکان ہیں، تیسرا اور چوتھا مرحلہ توبہ کی شرائط لازم ہیں جبکہ پانچواں اور چھٹا مرحلہ شرائط کمالِ توبہ ہیں۔ (گفتارِ معنوی، تالیف: شہید آیت اللہ مطہری: ۱۹۳)

ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اما علامة التائب فاربعة: النصيحة لله فى عمله، و ترك الباطل، ولزوم الحق، و

الحرص علی الخیر

''توبہ کرنے والے کی چار علامات ہیں:

۱۔اللہ کے بندوں کی خیر خواہی

۲۔ترک باطل

۳۔حق پر سختی سے کاربند رہنا

۴۔کارہائے خیر کوانجام دینے کی شدید خواہش (تحف العقول: ۳۲)

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر انسان کا گناہ ایسا ہو جس کی وجہ سے اس نے کسی کو گمراہ کیا ہو، جیسے باطل کے حق میں تبلیغی مہم اور بدعت گزاری وغیرہ، تو اس کی اصلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جن افراد کو اس نے گمراہ کیا ہے، حتی الامکان انہیں راہِ راست پر لے کر آئے، ورنہ اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

یہاں سے یہ بات واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ جو لوگ آیات الٰہی میں تحریف یا بدعت گزاری کے مرتکب ہوتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی کا راستہ ہموار کرتے ہیں، ان کی توبہ کتنی سخت اور دشوار ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص بھرے مجمع میں ایسی تقریر کرے جس سے لوگ گمراہ ہو جائیں یا کتب و رسائل کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کر دے اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر توبہ کرے تو ایسی توبہ ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص سر عام کسی کی غیبت کرکے، اس پر تہمت لگا کر اس کی آبرو کو داغدار کر دے اور پھر اپنے گھر میں خلوت میں بیٹھ کر توبہ کرے تو اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی۔ ہاں! اگر وہ شخص، جس کی آبرو کو اس نے داغدار کیا ہے، اسے معاف کر دے تو پھر اور بات ہے یا پھر اسی طرح مجمع عام میں اپنی بات کو جھٹلائے، جس طرح اس نے مجمع عام میں غیبت کی تھی یا تہمت لگائی تھی۔

ایک معتبر حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر کسی شخص پر حد جاری کی جائے، پھر وہ توبہ کر لے تو کیا اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

اذا تاب وتوبته ان یرجع مما قال ویکذب نفسه عند الامام وعند المسلمین، فاذا فعل فان علی الامام ان یقبل شهادته بعد ذلك

''ہاں! اگر وہ توبہ کر لے اور اس کی توبہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا، اسے واپس لے اور حاکم اور مسلمانوں کے سامنے اپنے آپ کو جھٹلائے تو پھر حاکم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کی گواہی کو قبول کرے۔'' (وسائل الشیعہ ۱۸: ۲۸۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

اوحی اللہ عزوجل الی نبی من الانبیاء قل لفلان وعزتی لودعوتنی حتی تنقطع اوصالك، ما استجیب لك، حتی تردمن مات الی مادعوته الیه فیرجع عنه

''اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ فلاں شخص سے کہو کہ اگر تو مجھے اس قدر پکارے کہ تیرے جوڑ الگ الگ ہو جائیں تو میری عزت کی قسم! میں تیری دعا پھر بھی قبول نہیں کروں گا جب تک کہ تو ان لوگوں کو زندہ کر کے اس گمراہی سے واپس نہ لے آئے جس پر تو نے انہیں ڈالا تھا۔''

(بحارالانوار ۲۱۹:۶۹)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اصلاح کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور اس کے بغیر توبہ صرف ظاہری توبہ ہوگی۔

یہاں پر اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جو لوگ گناہوں کی کثرت کے باوجود زبانی استغفار پر قناعت کر لیتے ہیں اور اس کے ارکان و شرائط کو پورا نہیں کرتے، وہ اپنے آپ سے بھی اور توبہ و استغفار سے بھی مذاق کر رہے ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

التائب من الذنب کمن لاذنب له، و المقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء

''جو شخص گناہ سے (کامل اور جامع الشرائط) توبہ کر لے، وہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا اور جو شخص گناہ پر قائم رہتے ہوئے استغفار کرتا ہے کہ گویا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔''

(اصولِ کافی، ۴۳۵:۲)

۵۔ قبولیت توبہ عقلی ہے یا نقلی

تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر توبہ جامع الشرائط ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور قبول ہوتی ہے۔ آیات و روایات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا توبہ کی قبولیت عقلی ہے یا نقلی؟

بعض علماء کا نظریہ ہے کہ توبہ کے بعد عذاب و سزا کا ٹل جانا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو توبہ کے باوجود بندے کو معاف نہ کرے۔

اس کے برعکس بعض علماء قائل ہیں کہ توبہ کے بعد عذاب اور سزا کا ٹل جانا واجب ہے اور توبہ کے باوجود مجرم کو معاف نہ کرنا

ایک ایسا ناپسندیدہ عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ممکن ہے اس مقام پر ایک اور نظریئے کو قبول کر لیا جائے۔ وہ یہ کہ توبہ کی قبولیت ایک عقلی مسئلہ ہے۔ اگرچہ عقل، توبہ اور عذر خواہی کے قبول کرنے کو ضروری اور لازمی قرار نہیں دیتی مگر دنیا بھر کے عقلاء میں یہ طریقہ رائج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی برے کام کا مرتکب ہونے کے بعد معافی مانگے اور اپنے برے کام کے تمام اثرات کو بھی مٹا دے اور ایسی حالت پیدا کر دے کہ گویا اس نے کوئی برا کام یا نقصان کیا ہی نہیں ہے، تو دنیا بھر کے عقلاء کی روش یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کو معاف کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں معاف کرنے پر تیار نہ ہو تو اسے کینہ پرور اور انسانی حقوق سے عاری سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ، جو کہ ہر کسی اور ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ توبہ کرنے والے اور معافی مانگنے والے بندوں کی توبہ قبول کرے اور انہیں معاف فرمائے بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہا جائے کہ قبولیت توبہ عقلی ہے اور اس سلسلہ میں "قائدہ قبیح نقض غرض" (یعنی مقصد شکنی فعل قبیح ہے) کو بنیاد بنایا جائے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادات اور اطاعات سے بے نیاز ہے۔ جتنی عبادات بھی اس نے بندوں پر فرض کی ہیں، ان کا مقصد بندوں کی بہتری اور انہیں درجۂ کمال تک پہنچانا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر تمام واجبات کا مقصد ہمارا روحانی ارتقاء اور ہمیں اللہ کے قریب کرنا ہے۔

قرآن مجید میں نماز کو برائی اور بدکاری سے روکنے کا ذریعہ (عنکبوت: ۴۵)، روزہ کو تقویٰ کا سبب (بقرہ: ۱۸۳) اور زکوٰۃ کو فرد اور معاشرے کی پاکیزگی اور برتری کا وسیلہ (توبہ: ۱۰۳) کہا گیا ہے۔

احادیث میں بھی ایمان کو شرک سے پاکیزگی، نماز کو تکبر سے پاکیزگی، حج کو مسلمانوں کی وحدت اور جہاد کو مسلمانوں کی عزت و شوکت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۲۵۲)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تمام فرائض انسان کی سعادت اور ارتقاء کے لیے مقرر کیے گئے ہیں تاکہ انسان ان کے ذریعے مقام عبودیت تک رسائی حاصل کر سکے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ (ذاریات: ۵۶)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ توبہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کمال اور ارتقاء کی طرف اپنا سفر جاری رکھے۔ چونکہ انسان معصوم نہیں ہے، اس سے گناہ اور خطا کا سرزد ہونا انہونی بات نہیں ہے، لہٰذا اگر واپسی کا کوئی راستہ اس کے لیے کھلا نہ ہو تو وہ کمال اور ارتقاء سے محروم رہ جائے گا۔ لیکن اگر اسے بتا دیا جائے کہ گناہ اور خطا کی صورت میں توبہ کرو اور گناہ کے ذریعے جو خرابی تم نے پیدا کی ہے، اس کی تلافی کرو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔ ایسی صورت میں انسان سعادت کے قریب تر اور انحراف و خطا سے دور ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ توبہ کو قبول نہ کرنا حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ اور سبب نقض غرض ہوگا۔ اس لیے کہ تمام فرائض کا مقصد انسان کی

سعادت ہے اور توبہ کی عدم قبولیت اس مقصد کے حصول کو ناممکن بنادے گی۔ مختصر یہ کہ توبہ کا ایک فلسفہ ہے جو انسان کے کمال اور ارتقاء کے ساتھ قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اگر توبہ کا دروازہ بند ہوجائے تو کمال وارتقاء کا جذبہ مرجاتا ہے بلکہ انسان پستی کی طرف جا گرتا ہے، اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اب جبکہ اس کے پاس نجات کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے تو پھر وہ گناہوں سے کیوں اجتناب کرے۔ اسی لیے تمام انسانی مربی، خواہ کسی آسمانی دین پر ایمان رکھتے ہوں یا نہیں، اپنے زیر تربیت افراد پر واپسی اور توبہ کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں تاکہ ان کے اندر کمال وارتقاء کا جذبہ سرد نہ ہو۔

اس طرح یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اگر توبہ میں قبولیت کی شرائط پائی جاتی ہوں تو نہ صرف از روئے قرآن واحادیث بلکہ از روئے عقل بھی اس کی قبولیت ضروری اور ناقابل انکار ہے۔

۶۔ جزئی توبہ

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بعض گناہوں سے توبہ کرلے اور بعض گناہوں کو انجام دیتا رہے؟ مثلاً ایک شخص جو شراب خواری بھی کرتا ہو اور غیبت بھی، یہ فیصلہ کرے کہ شراب خواری کو ہمیشہ کے لیے ترک کردے مگر غیبت کے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ نہ کرے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ سارے گناہوں سے ہونی چاہیے، اس لیے کہ گناہ کوئی بھی ہو، اس کے معنی اللہ کے حکم کی نافرمانی اور اس کی بارگاہ کی بے حرمتی ہے۔ اگر کوئی شخص گناہ کے اس نتیجہ سے پشیمان ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ہر گناہ کو ترک کردے، نہ یہ کہ بعض گناہوں کو ترک کردے اور بعض کو انجام دیتا رہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جزئی توبہ بھی ممکن ہے۔ علم اخلاق کے بعض بزرگ علماء جیسے مرحوم نراقی نے ''معراج السعادۃ'' میں اپنے والد بزرگوار سے اس نظریئے کو نقل کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے انسان بعض گناہوں کے نتیجہ اور برے اثرات کے بارے میں زیادہ علم وآگہی حاصل کرلے اور ان سے توبہ کرلے مگر جن گناہوں کے بارے میں ایسی آگہی نہ رکھتا ہو، ان کو انجام دیتا رہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اکثر توبہ کرنے والوں کی توبہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ اکثر لوگ کسی خاص گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور ممکن ہے کہ کسی اور گناہ کے مرتکب ہوتے رہیں۔ ہمیں کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ رسولؐ اللہ، آئمہ معصومینؑ یا بزرگانِ دین میں سے کسی نے ایسی توبہ کو غیر معتبر قرار دیا ہو اور اس بات پر زور دیا ہو کہ توبہ اسی صورت میں توبہ ہوگی جب تمام گناہوں سے توبہ کی جائے۔

قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی جزئی توبہ کے صحیح ہونے کی تائید ہوتی ہے، مثلاً ربا خواروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

''اگر تم توبہ کرلو (تو تمہاری توبہ قبول ہوگی) اور تمہارا سرمایہ تمہارا۔'' (بقرہ:۲۷۹)

مرتد ہونے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوْا ۣ فَإِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾

''ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی، سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرلیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (آل عمران: ۸۷ تا ۸۹)

اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے والوں اور معاشرے میں فساد برپا کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٤﴾

''اگر اس سے پہلے تم ان پر قابو پالو، وہ توبہ کرلیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (مائدہ: ۳۴)

بدکاری کے مرتکب افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾

''مگر جو لوگ توبہ کرلیں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔'' (نساء: ۱۶)

اگرچہ ان میں سے بعض آیات دنیوی سزا کے بارے میں ہیں اور ان سے معافی بھی توبہ کے ذریعے ہی ممکن ہے لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق موجود نہیں ہے کہ اگر دنیوی سزا میں توبہ قبول ہوجائے تو یقیناً اخروی سزا کے بارے میں بھی قبول ہوجائے گی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ گناہوں کے بارے میں آگہی اور ان کے محرکات کے مختلف ہونے کی وجہ سے جزئی توبہ کے قابل قبول ہونے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بہرحال ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ مکمل توبہ وہی ہوتی ہے جو تمام گناہوں سے کی جائے، نہ کہ جزئی توبہ۔

۷۔ توبہ کی پائیداری

توبہ کو ہمیشہ پائیدار ہونا چاہیے۔ جب بھی انسان نفس امارہ کے وسوسوں کے زیر اثر کسی خطا کا مرتکب ہو تو اسے چاہیے کہ فوراً توبہ کرے اور ''نفس لوامہ'' کے مرحلہ میں داخل ہوجائے۔ اسے اس سلسلہ میں آگے بڑھتے رہنا چاہیے، یہاں تک کہ وہ ''نفس مطمئنہ''

کے مقام پر فائز ہو جائے اور وسوسہ کی جڑیں کٹ جائیں۔

دوسری طرف انسان پر یہ بھی لازم ہے کہ جب وہ کسی گناہ سے توبہ کرے تو خوب احتیاط کرے کہ اپنی توبہ پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے ترکِ گناہ کے عہد پر ثابت قدم اور پائیدار رہے۔ لہٰذا اگر توبہ کے بعد اس گناہ کا رجحان اس کے اندر باقی رہ جائے تو اسے چاہیے کہ اس کے خلاف جہاد میں مشغول ہو جائے۔ یہی وہ جہاد ہے جسے جہاد بالنفس یا جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں وہ تائبین کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی صف میں بھی شامل ہو جائے گا۔

اس مقام پر بعض علمائے اخلاق نے یہ بے نتیجہ یا کم نتیجہ بحث بھی کی ہے کہ آیا وہ توبہ کرنے والا افضل ہے جو توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ گناہ کی خواہش کے خلاف جہاد بھی کرتا ہے یا وہ توبہ کرنے والا جس نے توبہ کے ساتھ گناہ کی خواہش کو ختم کر ڈالا ہو۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ان دو قسم کی توبہ کاروں میں سے کون افضل ہے! اہم بات یہ ہے کہ توبہ کرنے والا کیا طریقہ کار اپناتا ہے کہ وہ گناہ کی طرف واپس نہ جائے۔ اس مقصد کے لیے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ گناہ کے ماحول اور گناہ کی محافل سے دور رہنا، اس لیے کہ آغاز میں توبہ کمزور ہوتی ہے اور تائب کی حالت اس بیمار جیسی ہوتی ہے جو حال ہی میں کسی بیماری سے صحت یاب ہوا ہو اور اگر وہ دوبارہ ایسے ماحول میں جائے جہاں بیماری کے جراثیم پائے جاتے ہوں تو اس کے دوبارہ بیمار ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

۲۔ تائب پر لازم ہے کہ اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کے معاملہ میں نظر ثانی کرے۔ جو لوگ ماضی میں فعل گناہ پر اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان سے دوری اختیار کرے۔

۳۔ جب کبھی گناہ کا وسوسہ اس کے دل میں پیدا ہو، فوراً اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائے کیونکہ:

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾

''اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

۴۔ جن گناہوں کو اس نے ترک کیا ہے، ہر وقت ان کے خطرناک اثرات و نتائج کے بارے میں غور و فکر کرتا رہے اور ان آثار کو ہمیشہ مدنظر رکھے تاکہ ان سے غفلت کے نتیجہ میں دوبارہ گناہ کی خواہش اس کے اندر پیدا نہ ہو جائے اور اس کا دل وسوسوں کے حملے کا شکار نہ ہو جائے۔

۵۔ ان لوگوں کے حالات و واقعات کو ہمیشہ یاد رکھے جو گناہوں کی وجہ سے دردناک انجام سے دوچار ہوئے، حتیٰ کہ معصوم انبیاء کے حالات کا بھی مطالعہ کرے جو ترک اولیٰ کے مرتکب ہوئے۔ مثلاً انسان کو ہمیشہ چاہیے کہ وہ اس بارے میں غور و فکر کرے کہ کس طرح حضرت آدم علیہ السلام اس عظیم مقام پر ہوتے ہوئے جنت سے نکال دیئے گئے، یا حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے شکم ماہی میں قید کر دیئے گئے، یا وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام سالہا سال تک اپنے بیٹوں کی جدائی کا عذاب برداشت کرتے رہے۔

ان چیزوں کے مطالعہ سے یقیناً وسوسے کمزور ہوجاتے ہیں اور توبہ پائیدار ہوجاتی ہے۔

۶۔ تائب پر لازم ہے کہ گناہوں کی ان سزاؤں کے بارے میں سوچا کرے جن کی خبر دی گئی اور اس بات کو ہرگز فراموش نہ کرے کہ ہوسکتا ہے کہ توبہ کے بعد گناہ کی صورت میں اس کی سزا اور بھی سخت ہو۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ان رحمتوں اور عنایات پر بھی توجہ رکھے جو توبہ کرنے والوں کو نصیب ہوتی ہیں اور جن میں وہ خود بھی شامل ہو چکا ہے اور اپنے آپ کو یہ تلقین کرتا رہے کہ اس نے ان رحمتوں اور عنایات کی حفاظت کرنی ہے اور جو مقام اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے، اسے کھونا نہیں ہے۔

۷۔ اپنے تمام اوقات کے لیے صحیح اور مثبت کاموں کا ایک نظام الاوقات (Time Table) بنائے اور اس کے مطابق ایک آبرومندانہ زندگی کے لیے ضروری کام، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور صحت مند تفریحی کاموں میں مشغول رہے، اس لیے کہ بیکاری ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو گناہ کی طرف واپس لے جانے والے وسوسوں کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیتی ہے۔

کسی عالم سے پوچھا گیا کہ اس حدیث کے کیا معنی ہیں کہ "التائب حبیب اللہ" یعنی "تائب اللہ کا محبوب ہوتا۔" انہوں نے جواب دیا کہ تائب سے مراد وہ شخص ہے جو اس آیت کا مصداق ہے:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

"توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، اللہ کی عبادت کے لیے سرگرم عمل رہنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، امر المعروف اور نہی از منکر کرنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، ایسے مومنین کو بشارت دے دو۔" (توبہ: ۱۱۲)

۸۔ توبہ کے درجات

علمائے اخلاق نے توبہ اور تائبین کے مختلف مراتب و مدارج بیان کیے ہیں۔

ایک لحاظ سے تائبین کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا گروہ ان تائبین کا ہے جو اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد اپنی توبہ توڑ کر دوبارہ گناہ کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی افسوس بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نفس امارہ کے درجہ میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ان کا انجام مبہم اور خطرناک ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ توبہ پر ہو اور ان کی عاقبت اچھی ہوجائے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی عمر کا خاتمہ توبہ شکنی پر ہو اور اس طرح ان کی عاقبت بہت بری اور دردناک ہو۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی راہ پر چلنے لگتے ہیں لیکن کبھی کبھار شہوات کے غلبہ کی وجہ سے توبہ شکنی کے مرتکب ہوجاتے ہیں لیکن توبہ شکنی پر نادم اور شرمندہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی پہلے گروہ کی طرح نفس امارہ کے درجہ پر ہوتے ہیں لیکن ان کی نجات کی امید ان کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو توبہ کرنے کے بعد گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہیں اور فرائض وواجبات کو پابندی سے ادا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار غیر ارادی طور پر، توبہ شکنی کے مقصد کے بغیر، کسی گناہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں لیکن فوراً نادم اور پشیمان ہو جاتے ہیں اور اپنے نفس کو سرزنش کرنے لگتے ہیں اور ایک بار پھر پختہ عزم کے ساتھ توبہ کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ یہ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ گناہ کے محرکات وعوامل سے دور رہیں۔

یہ گروہ نفس لوامہ کے درجہ پر ہوتا ہے جو نفس امارہ کی نسبت بلند تر درجہ ہے۔ یہ نفس مطمئنہ کے قریب ہوتے ہیں اور ان کی نجات کی امید بہت زیادہ ہوتی ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو توبہ کے بعد فولادی عزم کے ساتھ اللہ کی اطاعت اور بندگی کی راہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ چونکہ یہ معصوم نہیں ہوتے، لہٰذا ممکن ہے کبھی گناہ کا رجحان ان کے اندر پیدا ہوجائے۔ لیکن عملی طور پر یہ اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ایمان اور عقل کی طاقت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔

یہ لوگ صاحبِ نفس مطمئنہ ہوتے ہیں۔ سورۃ والفجر کی آیات ۲۷ اور ۳۰ میں انہی لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔''

اس کے علاوہ توبہ کے مراحل ومراتب کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے:

مرحلہ اول: کفر سے ایمان کی طرف توبہ۔

مرحلہ دوم: تقلیدی ایمان سے تحقیقی ایمان کی طرف توبہ۔

مرحلہ سوم: خطرناک اور بڑے گناہوں سے توبہ۔

مرحلہ چہارم: گناہانِ صغیرہ سے توبہ۔

مرحلہ پنجم: گناہ کی خواہش سے توبہ۔ اگرچہ عملی طور پر گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔

اللہ کے بندوں میں سے ہر گروہ کی مخصوص توبہ ہوتی ہے۔ انبیاء کی توبہ اندرونی اضطرابات سے ہوتی ہے یعنی ان لحظات

سے ہوتی ہے جن میں ان کا باطن اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی توبہ ان سانسوں سے ہوتی ہے جن میں وہ ذکر خدا کی حالت میں نہیں ہوتے۔

اولیاء کی توبہ ان نامناسب امور سے ہوتی ہے جو ان کی سوچ پر طاری ہوتے ہیں۔

خواص کی توبہ غیر اللہ کی طرف متوجہ اور مشغول ہونے سے ہوتی ہے۔

عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک آغازِ توبہ میں ایک مخصوص درجہ کی معرفت اور آگاہی رکھتا ہے۔

(بحارالانوار،۶:۳۱)

۹۔توبہ کے اثرات وبرکات

حقیقی اور دل کی گہرائی سے اٹھنے والی جامع الشرائط توبہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے اور اس کے اثرات و برکات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ان اثرات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ توبہ کرنے والا مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے کہ دورانِ گناہ میں اس نے جو خرابیاں کی ہیں،حتی الامکان ان کی اصلاح کرے اور وہ اپنے کئے پر نادم اور شرمندہ ہوتا ہے۔

۲۔ حقیقی تائب اپنے آپ کو گناہ کی محافل سے دور رکھتے ہیں اور ان عوامل سے بھی دور رہتے ہیں جو ان کے اندر گناہ کی رغبت پیدا کر سکتے ہیں۔

۳۔ تائب اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ محسوس کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی مسلسل کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

ان علامات کے ذریعے ہم حقیقی توبہ کرنے والوں کو زبانی توبہ کرنے والوں سے پہچان سکتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کہ:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ

''اے اہل ایمان! اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔''(تحریم:۸)

کہا ہے کہ ''نصوح'' سے مراد وہ توبہ ہے جس میں لوگوں کیلئے نصیحت پائی جاتی ہو،یعنی جسے دیکھ کر دوسرے گناہگاروں کو بھی توبہ کی ترغیب ملے،اس لئے کہ اس توبہ کے آثار تائب کے اندر ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اپنے عمل سے دوسروں کو یہ درس دے رہا ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے دل سے گناہوں کی جڑیں نکال پھینکیں اور کبھی گناہ کی طرف واپس نہ جائیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے مراد خالص توبہ ہے،جبکہ بعض نے کہا ہے کہ نصوح ''نصاحت'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی سلائی کرنے کے ہیں،اس لئے کہ گناہ ایمان کے لباس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور خالص اور سچی توبہ اس پارہ پارہ لباس کو سینے کا کام کرتی

ہے، یا یہ کہ گناہ انسان اور اللہ کے تعلق کو منقطع کر دیتا ہے اور توبہ اس تعلق کو پھر جوڑ دیتی ہے۔ (بحار الانوار ۶: ۱۷)

توبہ کے فوائد اور برکات بہت زیادہ ہیں جن کی طرف قرآن وسنت میں تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ ان فوائد اور برکات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

''اے اہل ایمان! اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ کرو۔ امید ہے کہ وہ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔'' (تحریم۔ ۸)

۲۔ توبہ کرنے والوں پر زمین وآسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ سورۂ نوح آیات ۱۰ تا ۱۲ میں ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ﴿۱۲﴾

''میں نے (اپنی قوم سے کہا): تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں برسائے گا۔ تمہارے اموال واولاد میں اضافہ کرے گا، تمہیں سرسبز باغات دے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا۔''

۳۔ توبہ صرف گناہ کو مٹاتی ہی نہیں بلکہ اسے نیکی میں تبدیل کر دیتی ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ

''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں، تو اللہ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔'' (فرقان: ۷۰)

۴۔ اگر توبہ سچی اور خالص ہو تو اللہ تعالیٰ گناہ کے اثرات کو اس طرح مٹا دیتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا تاب العبد توبة نصوحا احبه الله و ستر عليه فى الدنيا و الآخرة فقلت و كيف يستر عليه؟ قال ينسى ملكيه ما كتبا عليه من الذنوب ويوحى الى جوارحه اكتمى عليه ذنوبه، ويوحى الى بقاع الارض اكتمى ماكان يعمل عليك من الذنوب فيلقى الله حين يلقاه و ليس شىء يشهد عليه بشيئ من الذنوب

(اصول کافی ۲:۰ ۴۳)

''جب بندہ خالص اور سچی توبہ کرتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرتا ہے اور دنیا میں اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔''

راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا: کس طرح پردہ ڈال دیتا ہے؟

آپؑ نے فرمایا: جو فرشتے گناہ لکھتے ہیں، انہیں اس کا گناہ بھلا دیتا ہے، اس کے اعضاء و جوارح کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گناہ کو چھپا دیں۔ زمین کے جس حصے پر اس نے گناہ کیا ہوتا ہے، اسے حکم دیتا ہے کہ اس کا گناہ چھپا دے۔ پھر جب وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کے خلاف گواہی دے۔''

۵۔ حقیقی تائب اس طرح اللہ کی محبت اور عنایت کا مستحق قرار پاتا ہے کہ حاملانِ عرش الٰہی اس کیلئے استغفار کرتے ہیں اور اس کے اور اس کے خاندان کیلئے جنت میں داخلے کی دعا کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

ان الله عزوجل اعطى التائبين ثلاث خصال ، لو اعطى خصلة منها جميع اهل السماوات والارض لنجوا بها

''اللہ تعالیٰ نے حقیقی تائب کو تین فضیلتیں عطا کی ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی تمام اہل آسمان و زمین کو دی جاتی تو وہ اس کے سبب نجات پا لیتے اور وہ یہ ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴿۲۲۲﴾ (بقرہ:۲۲۲)

یعنی ''اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور طہارت اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

ظاہر سی بات ہے کہ جس سے اللہ محبت کرے، اسے سزا نہیں دے گا۔

اس کے بعد حدیث میں اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴿۸﴾ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''وہ فرشتے جوعرش کواٹھائے ہوئے ہیں اور جواس کے گردطواف کرتے ہیں اوراپنے رب کی حمد وتسبیح کرتے ہیں اوراس پرایمان رکھتے ہیں اوراہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیراعلم ہرچیز پر چھائے ہوئے ہیں۔پس توان لوگوں کوبخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اوران کوعذاب جہنم سے بچا۔اے ہمارے رب! توانہیں جنت کے باغوں میں داخل فرما جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہےاوران کے آباء، ازواج اوراولاد میں سے جوصالح تھے، ان کو بھی۔تو غالب اورحکیم ہےاورانہیں برائیوں سے محفوظ رکھااورجس کواس دن تو نے برائیوں سے محفوظ رکھا،تو نے اسےاپنی رحمت میں داخل کرلیااوریہی عظیم کامیابی ہے۔''(مومن ۷ تا ۹)

اس مقام پرہم توبہ کے بارے میں، جوکہ تہذیبِ اخلاق کی طرف پہلاعملی قدم ہے،اپنی بحث کوختم کرتے ہیں۔اگرچہ اس سلسلہ میں اوربھی مباحث ہیں جن کا توبہ کے بارے میں ایک مستقل بحث میں ذکرکیا جانا چاہئے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک قلب گناہ کے زنگ سے پاک نہ ہواورانسان کی جان اورروح توبہ کے پانی کے ذریعے پاک نہ ہوجائے اورتوبہ کا نورگناہ کی تاریکی کو باہرنہ نکال دے،تہذیب اخلاق، سیروسلوک الی اللہ،قرب الٰہی کی منزل تک پہنچنا،نورِ ہدایت اورنا قابل بیان عرفانی جذبات میں غرق ہوجانا ناممکن ہے۔

یہ پہلی منزل ہےاورایسی منزل ہے جوہرمنزل سے زیادہ اہم ہے۔اس منزل تک پہنچنا پختہ ارادےاوراللہ تعالیٰ کی مدداور الطاف کے بغیرممکن نہیں ہے۔

دوسراقدم۔مشارطہ

سیروسلوک کے مراحل کے بارے میں گزشتہ صفحات میں ہم نے مختصراً اشارہ کیا ہے۔اب وہ مرحلہ آچکا ہے کہ ہم آیات و روایات کی روشنی میں ان کے بارے میں تفصیل سے بات کریں۔

علمائے اخلاق نے توبہ کے بعدجس قدم کا ذکرکیا ہے، وہ مشارطہ ہے۔مشارطہ کے معنی ہیں اپنےنفس کے ساتھ شرط باندھنا۔اس میں ہرروزاپنےنفس کونصیحت اور یاددہانی کروائی جاتی ہے۔اس کا بہترین وقت صبح کی نماز سےفراغت کے بعد بیان کیا گیاہے جواس عبادت کےنورسےمنورہوتا ہے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنےنفس کومخاطب کرکے کہتا ہےاور یادآوری کرواتا ہے کہ میرے پاس عمر سے زیادہ قیمتی کوئی سرمایہ نہیں ہے۔اگر یہ سرمایہ برباد ہوگیا تو میرا سب کچھ برباد ہوجائے گا۔انسان کو چاہئے کہ سورۃ العصر کی تلاوت کرکے اپنے

نفس سے کہے کہ اگر میرا سرمایہ ضائع ہو گیا تو میں بہت بڑے اور نا قابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جاؤں گا۔ اس نقصان کی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب میں ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین اور صبر کی تلقین جیسا سرمایہ اکٹھا کر سکوں۔

انسان اپنے آپ سے کہے کہ ذرا سوچو! اگر اس حالت میں تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے اور مرنے کے بعد کے مراحل کی سختیاں دیکھ کر تم سخت پشیمان ہو کر گڑگڑاتے ہوئے فرشتوں سے التجا کرو:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ

''اے فرشتو! اللہ کیلئے مجھے دنیا میں واپس بھیج دو تا کہ اپنی کوتاہیوں کے مقابلہ میں اچھے اعمال انجام دے سکوں۔'' (مومنون:۹۹،۱۰۰)

فرض کرو کہ فرشتوں نے ''کلا'' (ہرگز نہیں) کہہ کر تمہیں منفی جواب دے دیا تو بتاؤ کہ اس زندگی میں کی گئی کوتاہیوں کی تلافی کس طرح کرو گے!

پھر اپنے ساتوں اعضاء، آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، پیٹ اور شرمگاہ کے بارے میں اپنے نفس سے اس طرح گفتگو کرے کہ یہ اعضاء تیرے کارکن اور خادم ہیں اور تیرے تابع فرمان ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے سے ایک خاص گروہ کو جہنم میں داخل کیا جائے گا؟ ہوسکتا ہے یہ سات دروازے ان سات اعضاء سے گناہ کرنے والوں کیلئے ہوں، پھر کیوں نہ ان اعضاء کو قابو میں رکھ کر جہنم کے دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیا جائے اور جنت کے دروازے اپنے اوپر کھول لئے جائیں۔

اسی طرح اپنے نفس کو اپنے ان اعضاء کے بارے میں سمجھائے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ ان سے اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کو صرف اُس کی اطاعت میں استعمال کرنا چاہئے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی بعض دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشارطہ کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ صحیفۂ سجادیہ کی اکتیسویں دعا میں، جو دعائے توبہ کے نام سے معروف ہے، آپؑ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

ولك يارب شرطي الا اعود في مكروهك، وضماني ان لا ارجع في مذمومك وعهدي ان اهجر جميع معاصيك

''اے میرے رب! میں نے تیری بارگاہ میں یہ شرط کی ہے کہ جو کچھ تجھے پسند نہیں ہے، اس کی طرف واپس نہ لوٹوں گا اور میں یہ عہد کرتا ہوں کہ جن چیزوں کی تو نے مذمت کی ہے، ان کے قریب نہ جاؤں گا اور جن چیزوں سے تو نے منع فرمایا ہے، ان سے دور رہوں۔''

قرآنی آیات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب اہم امور سے متعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا کرتے تھے

اور یہ بھی مشارطہ کی ایک قسم ہے۔سورۂ احزاب، آیت ۲۳ میں ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

''مومنین کے درمیان کچھ ایسے افراد ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچائی کے ساتھ پورا کیا (اور اس راہ میں شہادت پائی) جبکہ ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔'' (بحارالانوار، ۶۷: ۶۴)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض اللہ سے عہد اور شرط باندھتے تھے اور اسے توڑ دیتے تھے۔اس آیت سے پہلے آیت ۱۵ میں ہے:

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾

'(کچھ لوگ جو جنگ احزاب میں دوسروں کو میدانِ جنگ سے واپسی کی ترغیب دیتے تھے) اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر چکے تھے کہ وہ میدان میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ کے عہد کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا۔''

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من لم یتعاهد النقص من نفسه غلب علیه الهوی، و من کان فی نقص فالموت خیر له

''جو شخص اپنی ذات کے نقائص کی چھان بین نہ کرے، اس کی خواہشات اس پر غالب آ جاتی ہیں اور جو شخص نقص کی حالت پر باقی رہے، اس کیلئے موت بہتر ہے۔'' (بحارالانوار ۶۷: ۶۴)

مختصر یہ کہ مشارطہ تہذیب اخلاق کی راہ میں اٹھایا جانے والا ایک اہم قدم ہے۔اس کے بغیر غفلت و قریب کے سیاہ بادل انسان کے دل پر اپنا منحوس سایہ ڈال دیتے ہیں اور اس کی نجات بہت مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسرا قدم مراقبہ

''مراقبہ'' رقبہ سے ماخوذ ہے اور عربی میں رقبہ گردن کو کہتے ہیں۔جب انسان کسی چیز کی نگرانی کرتا ہے تو اپنی گردن اونچی کر کے دیکھتا ہے۔لہٰذا مراقبہ کا لفظ نگرانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

علمائے علم اخلاق کی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں: ''اپنے آپ کی نگرانی کرنا'' مراقبہ کا مرحلہ مشارطہ کے بعد آتا ہے۔

یعنی جب انسان مشارطہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی اور گناہ سے اجتناب کا عہد کر لیتا ہے تو اس کے بعد اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پاکیزگی پر کڑی نظر رکھے، اس لئے کہ غفلت کی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے تمام عہد و پیمان و مشارطہ کی عمارت زمین بوس ہو جائے۔

البتہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی نگرانی کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے اعمال کی نگرانی کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾

یعنی ''بے شک تمہارے اوپر حفاظت اور نگرانی کرنے والے (کراماً کاتبین) مقرر کیے گئے ہیں (جو تمہارے اعمال کی کڑی نگرانی کرتے ہیں)''۔ (سورۂ انفطار: ۱۰)

اس آیت میں حافظین سے مراد اعمال کی نگرانی کرنے والے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے:

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

یعنی ''جو کچھ تم کرتے ہو، وہ اسے جانتے ہیں۔'' (انفطار: ۱۲)

سورۂ ق کی آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾

''انسان جو لفظ بھی اپنے منہ سے نکالتا ہے، ایک فرشتہ اس کی نگرانی کیلئے مامور ہوتا ہے۔''

ان سب سے بڑھ کر خود اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کا سب سے بڑا نگران ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔'' (نساء: ۱)

سورۂ احزاب کی آیت ۵۲ میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾

''اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

سورۂ علق، آیت ۱۴ میں ہے:

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾

''کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ (اس کے تمام اعمال و اموال) کو دیکھ رہا ہے؟''

سورۂ سبا، آیت ۲۱ میں ہے:

وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾

''اور تیرا رب ہر چیز پر محافظ ہے۔''

لیکن سالکانِ راہِ حق، اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس کے اعمال کی نگرانی کریں، خود اپنے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ مراقبت اندر سے اُٹھتی ہے، باہر سے مسلط نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر بہت زیادہ اور غیر معمولی ہوتا ہے۔ البتہ بیرونی مراقبت پر توجہ دی جائے تو اندرونی مراقبت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔

درحقیقت اس دنیا میں انسان کی حیثیت اس شخص کی مانند ہے جس کے پاس گراں بہا موتی ہیں۔ وہ بازار میں جاتا ہے تاکہ ان کے بدلہ اپنے لئے بہترین ارباب زندگی خریدے لیکن وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اردگرد چوروں اور ٹھگوں کا ہجوم ہے۔ ایسی صورت میں وہ ذرا سی بھی غفلت کرے تو اس کا نفیس اور قیمتی سرمایہ لٹ سکتا ہے اور وہ حسرت واندوہ سے ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔

بالکل اسی طرح شیاطین جن وانس، اس دنیا میں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اندرونی ہوا و ہوس بھی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد نہ کرے اور اپنے اعمال کی نگرانی نہ کرے تو اس کے ایمان اور تقویٰ کا سرمایہ لٹ جائے گا اور وہ اس دنیا سے اگلی دنیا کو جاتے وقت خالی ہاتھ ہوگا۔

قرآنی آیات واحادیث میں اس حقیقت کی طرف متعدد مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے:

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿١٤﴾

''کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟'' (علق: ۱۴)

یہ آیت ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کررہی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، لہٰذا ہمیں بھی چاہئے کہ اپنے اعمال پر نظر رکھیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨﴾ (حشر: ۱۸)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ ہر انسان یہ دیکھتا رہے کہ اس نے کل کیلئے کیا آگے بھیجا ہے۔ اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرو (اور جان لو کہ) اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں یہ جملہ ''وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ'' (ہر انسان دیکھے کہ اس نے کل کیلئے کیا آگے بھیجا ہے)، درحقیقت مراقبہ کے مفہوم کو بیان کررہا ہے۔

ایک اور مقام پر اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾

''انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے پر نظر رکھے۔'' (عبس: ۲۴)

یعنی انسان یہ دیکھے کہ اس نے کھانا حلال کے راستے سے حاصل کیا ہے یا حرام کے راستے سے۔

۲۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کی تفسیر میں:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ

یعنی ''اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔'' فرماتے ہیں:

الاحسان ان تعبداللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك

''احسان یعنی نیکی یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (کنز العمال، ۳:۲۲، بحار الانوار، ۲۵:۲۰۴)

یہ بڑی واضح سی بات ہے کہ اگر انسان اس حقیقت کی طرف توجہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، تو اس سے اس کے اندر مراقبہ کی روح زندہ ہو جاتی ہے تاکہ وہ مسلسل اپنے اعمال کی نگرانی کرے۔

۳۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (غرر الحکم)

ینبغی ان یکون الرجل مھیمنا علی نفسہ، مراقبا قلبہ، حافظا لسانہ

''انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر حاوی رہے، اپنے دل کی نگرانی کرے اور اپنی زبان کی حفاظت کرے۔''

۴۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من رعی قلبہ عن الغفلۃ و نفسہ عن الشھوۃ و عقلہ عن الجھل، فقد دخل فی دیوان المتنبھین، ثم من رعی عملہ عن الھوی، ودینہ عن البدعۃ، ومالہ عن الحرام فھو من جملۃ الصالحین

''جو شخص اپنے دل کی غفلت سے، اپنے نفس کو شہوت سے اور اپنی عقل کو جہل سے بچائے، اس کا نام بیدار اور آگاہ افراد کے دیوان (رجسٹر) میں لکھا جاتا ہے۔ جو کوئی اپنے عمل کو نفس پرستی سے، اپنے دین کو بدعت سے اور اپنے مال کو حرام سے بچائے، وہ صالحین میں شمار ہوگا۔'' (بحار الانوار، ۶۷:۶۸)

۵۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یابوسا للقانطین من رحمتی، ویابوسا لمن عصانی ولم یراقبنی

''بدنصیب ہیں وہ جو میری رحمت سے مایوس ہیں اور بدنصیب ہیں وہ جو میری نافرمانی کرتے ہیں اور توجہ نہیں رکھتے کہ میں دیکھ رہا ہوں۔'' (اصولِ کافی، ۲:۶۷)

۶۔ ایک خطبہ میں امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

فرحم اللہ امرء راقب ربہ وتنکب ذنبہ، وکابر ھواہ، وکذب مناہ

''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے رب کی طرف متوجہ رہتا ہے، گناہ سے پرہیز کرتا ہے، اپنے نفس کی خواہش سے جنگ کرتا ہے اور اپنی آرزوؤں کو جھٹلاتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۴:۳۴۹)

۷۔ نہج البلاغہ میں ہے:

فاتقوا اللہ عباد اللہ تقیۃ ذی لب شغل التفکر قلبہ ___ وراقب فی یومہ غدہ

''اللہ سے ڈرو، اس صاحب عقل شخص کی طرح جس کی سوچ نے اس کے دل کو مشغول رکھا ہوا ہے اور جو آج، کل (قیامت) کے بارے میں مراقبہ کرتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۸۳)

ان روایات میں اپنے بارے میں، اللہ کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں مراقبہ کرنے کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی اپنے اعمال اور اخلاق پر ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں کڑی نظر رکھنا۔

مختصر یہ کہ سالکانِ راہ خدا پر لازم ہے کہ مشارطہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کا عہد و پیمان باندھنے کے بعد انسان اپنے اوپر مسلسل اور کڑی نگرانی رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہوا یہ عہد و پیمان کسی بھی موقع پر ٹوٹنے نہ پائے۔ اس سلسلہ میں انسان کو اپنے نفس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جیسے قرض خواہ مقروض سے کرتا ہے، اس لئے کہ جس طرح انسان دوسروں سے اپنے مالی مطالبات میں سستی کرے تو اس کا سرمایہ ضائع ہوسکتا ہے، اسی طرح اگر وہ معنوی معاملات میں اپنے نفس سے مطالبہ کرنے میں سستی کرے تو بہت بڑا نقصان اٹھائے گا۔

چوتھا قدم محاسبہ

چوتھا قدم جو علمائے علم اخلاق نے رہروانِ راہ قرب کیلئے بیان کیا ہے، وہ محاسبہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر سال، ہر ماہ، ہر ہفتہ یا ہر دن کے اختتام پر اپنے اچھے اور برے اعمال، اطاعت و معصیت خدا اور خدا پرستی اور نفس پرستی کے حوالہ سے اپنا محاسبہ کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک تاجر اپنے تجارتی معاملات کا انتہائی باریک بینی سے محاسب کرتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ محاسبہ دینی امور میں ہو یا دنیوی امور میں، اس کا ان دو بڑے فائدوں میں سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر محاسبہ کے نتیجہ میں زیادہ منافع نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل صحیح تھا اور یہ کہ اسے اپنے اسی راستے پر آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ اگر محاسبہ کے دوران نقصان نظر آئے تو اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا طریقہ کار غلط تھا یا کہیں کوئی چور یا بد دیانت افراد اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں لامحالہ وہ اپنے معاملات کی اصلاح کی طرف توجہ دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں آیات واحادیث میں بھی وسیع پیمانے پر اشارات پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد آیات ہمیں اس نکتہ پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں کہ کائنات میں ہر جگہ ایک لطیف نظم وربط کام کر رہا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں ہر نظام حساب وکتاب کی بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾

''اس نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں قانون مقرر کیا تاکہ تم میزان میں طغیان نہ کرو (اور اسے عدل اور حساب کی راہ سے منحرف نہ کردو)۔'' (الرحمن: ۷، ۸)

ایک اور مقام پر ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ﴿۸﴾

یعنی ''اللہ کے پاس ہر چیز کی ایک مقدار (واضح حساب) ہے۔'' (سورۂ رعد: ۸)

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۘ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ (حجر: ۲۱)

''ہر چیز کے خزانے صرف ہمارے پاس ہیں اور ہم انہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔''

قرآن شریف کی متعدد آیات میں قیامت کے دن کے سخت اور باریک بینی پر مبنی حساب کا ذکر ہے۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾

''اگر ایک ذرے کے برابر بھی (کوئی اچھا یا برا عمل) ہو تو خواہ کسی چٹان کے اندر ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں، اللہ اسے (قیامت کے دن حساب کیلئے) لے آئے گا۔ اللہ لطیف اور خبیر ہے۔'' (لقمان: ۱۶)

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ (بقرہ:۲۸۴)

''جو کچھ تمہارے باطن میں ہے،خواہ اسے ظاہر کر دیا یا چھپاؤ،اللہ اس پر تمہارا حساب لے گا۔''

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہی ''یوم الحساب'' ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا یَوۡمَ الۡحِسَابِ۠ ﴿۲۶﴾

''جولوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں،ان کیلئے سخت عذاب ہے،اس لئے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے تھے۔''(ص:۲۶)

قیامت کے دن کا حساب اس قدر سخت اور باریک بینی پر مبنی ہوگا کہ انسان کو خود ہی اپنا محتسب بنا دیا جائیگا۔

اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا ﴿۱۴﴾

یعنی''اپنا اعمال نامہ پڑھ۔آج اپنا حساب کرنے کیلئے تو خود ہی کافی ہے۔''(بنی اسرائیل:۱۴)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دنیا اور آخرت میں ہر چیز کا حساب ہے،انسان کیلئے اس بات کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ اس زندگی میں حساب سے غافل رہے! جب کل اسے اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ آج سے،اسی دنیا میں اپنا محاسبہ کرے۔بنابرایں مندرجہ بالا آیات اور ان جیسی دیگر آیات انسان کو یہ اہم پیغام دیتی ہیں کہ اپنے حساب سے غافل نہ رہے۔اگر وہ چاہتا ہو کہ کل اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے وقت اس کی پشت پر گناہوں کا بوجھ نہ ہو تو اسی دنیا میں خود اپنا محاسبہ کرے،اس سے پہلے کہ اس دنیا میں اس کا حساب لیا جائے۔

احادیث میں بھی اس موضوع پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

۱۔ ایک مشہور حدیث نبویؐ میں ہے:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبو اوزنوها قبل ان توزنو اوتجهزوا للعرض الاکبر

''اپنا محاسبہ کرو،اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور اپنا وزن کرو،اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے اور(قیامت کے دن کی)بڑی حاضری کیلئے تیار ہو جاؤ۔''(بحارالانوار:۶۷:۷۳)

۲۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے حضرت ابوذرؓ غفاری کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

یاابا ذر حاسب نفسك قبل ان تحاسب فانه اهون لحسابك غدا وزن نفسك قبل توزن

''اے ابوذرؓ!اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے،اپنا محاسبہ کرو اور اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا

جائے اپنا وزن کرو۔'' (میزان الحکمہ ،۱:۱۹ بحوالہ امالی طوسی)

۳۔ ایک حدیث میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

ما احق للانسان ان تکون له ساعة لا یشغله شاغل یحاسب فیها نفسه، فینظر فیما اکتسب لها و علیها فی لیلها و نهارها

''انسان کیلئے کس قدر اچھا ہے کہ اپنے اوقات میں سے ایک ساعت مخصوص کرے جس میں کوئی کام اسے اپنی طرف مشغول نہ کرے، اس میں وہ اپنا محاسبہ کرے اور دیکھے کہ جو کام اس نے اپنے شب و روز میں انجام دیئے ہیں، ان میں سے کونسا اس کیلئے مفید اور کونسا نقصان دہ ہے۔'' (مستدرک الوسائل:۱۲:۱۵۴)

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی بات کو اس پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

حق علی کل مسلم یعرفنا، ان یعرض عمله فی کل یوم و لیلة علی نفسه، فیکون محاسب نفسه، فان رای حسنة استزاد منها و ان رای سیئة استغفر منها لئلا یخزی یوم القیامة

''ہر مسلمان جو ہماری معرفت رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ ہر شب و روز اپنے اعمال کا جائزہ لے، اپنا محاسبہ کرے۔ اگر کوئی نیکی دیکھے تو اس میں اضافہ کی دعا مانگے اور اگر اسے کوئی برائی نظر آئے تو اس سے استغفار کرے تا کہ قیامت کے دن رسوا نہ ہو۔'' (تحف العقول:۲۳۱)

۵۔ اس بات کو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

یا هشام لیس منا من لم یحاسب نفسه فی کل یوم فان عمل حسنة استزاد منه و ان عمل سیئا استغفر الله منه و تاب (مستدرک الوسائل ۱۲:۱۵۳)

''اے ہشام! جو کوئی ہر روز اپنا محاسبہ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پس اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اس میں اضافے کی دعا مانگے اور اگر کوئی برا عمل انجام دیا ہو تو اس سے استغفار اور توبہ کرے۔''

اس موضوع پر احادیث بہت زیادہ ہیں۔ جو حضرات ان کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں، مستدرک الوسائل، کتاب الجہاد، ابواب جہاد النفس کی طرف رجوع کریں۔ (مستدرک الوسائل، ۱۲:۱۵۲ تا ۱۵۶، اصول کافی ۲:۴۵۳)

ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں محاسبۂ نفس کوغیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ جولوگ اہل محاسبۂ نفس نہیں ہیں، وہ آئمہ معصومینؑ کے سچے پیروکار نہیں ہیں۔

ان احادیث میں محاسبہ کے فلسفہ وحکمت کی طرف بھی واضح طور پر اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کام نیکیوں میں اضافے اور برائیوں کی روک تھام اور تلافی کا باعث ہوتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ انسان گرداب ہلاکت میں گرنے اور غفلت کے دریا میں ڈوبنے سے بھی محفوظ ہوجاتا ہے۔

یہ بات بہت غور وفکر کے قابل ہے کہ ہم مادی اور معنوی امور کو یکساں اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ مادی امور میں تو ہم بڑے حساب کتاب اور کھاتے وغیرہ کا انتہائی باریک بینی سے انتظام کرتے ہیں لیکن معنوی امور کا انگلیوں پر بھی حساب نہیں کرتے، حالانکہ معنوی امور کی اہمیت مادی امور کی نسبت اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے درمیان موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

لایکون العبد مومنا حتی یحاسب نفسه اشد من محاسبة الشریك شریکه، و السید عبده

''کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے نفس سے حساب لینے میں اتنی سخت گیری نہ کرے جتنی کوئی شریک اپنے شریک یا مالک اپنے غلام سے حساب لینے میں کرتا ہے۔''(محاسبۂ نفس از سیدابن طاؤس: ۱۴، بحارالانوار، ۶۷، ۷۲)

یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ بعض بزرگوں نے محاسبۂ نفس کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں جن میں سیدابن طاؤس متوفی ۶۶۴ ہجری کی ''محاسبۃ النفس''، نویں ہجری کے عالم مرحوم کفعمی کی ''محاسبۃ النفس'' اور سیدعلی مرعشی متوفی ۱۰۸۰ ہجری کی ''محاسبۃ النفس'' اورحاج مرزاعلی حائری مرعشی متوفی ۱۳۴۴ ہجری کی "محاسبة النفس فی اصلاح عمل الیوم والاعتذار من الامس" قابل ذکر ہیں۔

اس مقام پر چند امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ انسان کو اپنا محاسبہ کس طرح کرنا چاہئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اپنا محاسبہ کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے۔وہ اس طرح کہ آپؑ نے رسول اللہؐ کی یہ حدیث بیان فرمائی:

اکیس الکیسین من حاسب نفسه

''عاقل ترین شخص وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرے۔''

ایک شخص نے پوچھا:

و کیف یحاسب الرجل نفسه

یعنی ''انسان کس طرح اپنا محاسبہ کرے؟''

امام علیہ السلام نے اسے تفصیلی جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''جب سارا دن گزر جانے کے بعد شام ہو تو اپنے نفس کو مخاطب قرار دے کر کہو: اے نفس! آج کا دن گزر گیا اور قیامت تک واپس نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے اس کے بارے میں پوچھے گا کہ تو نے یہ دن کیسے گزارا؟ اس دن میں کیا عمل کیا؟ آیا اللہ کا ذکر کیا اور اس کی حمد کی؟ آیا کسی مومن کی غیبت کو روکا؟ آیا کسی مسلمان کی مدد کی؟ آج کون کون سے مثبت کام کئے؟

اس کے بعد دن بھر کے کاموں کو یاد کرے۔ اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا ہو تو اللہ کی حمد کرے اور تکبیر کہے کہ اس نے اللہ کی توفیق سے یہ نیکی انجام دی۔ اگر اس کا کوئی برا عمل اسے یاد آئے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور اسے ترک کرنے کا پختہ عزم کرے اور محمدؐ و آل محمدؐ پر صلوات بھیج کر اور امیر المؤمنین علیہ السلام سے تجدید بیعت کے ذریعے اپنے دل سے اس کے آثار کو محو کرنے کی کوشش کرے اور انؑ کے دشمنوں پر اور انؑ کے حقوق روکنے والوں پر لعنت کرے۔''

جب انسان یہ جامع اور کامل محاسبہ انجام دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''چونکہ تو ان سے محبت کرتا ہے جو میرے محبوب ہیں اور ان سے دشمنی کرتا ہے جو میرے دشمن ہیں (اور تیرے اس محاسبۂ نفس کی وجہ سے) میں تیرے گناہوں پر سخت گیری نہیں کروں گا اور تجھے اپنے عفو میں داخل کروں گا۔'' (بحار الانوار: ۸۹: ۲۵۰)

بلاشبہ یہ محاسبہ کا بہترین طریقہ ہے۔

۲۔ محاسبۂ نفس کے آثار کیا ہیں؟

اگرچہ اس سوال کا جواب گزشتہ بیانات سے واضح ہو جاتا ہے لیکن بہتر ہے کہ جو کچھ اس بارے میں احادیث میں بیان ہوا ہے، اس سے بھی استفادہ کیا جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من حاسب نفسه وقف علی عیوبه و احاط بذنوبه، و استقال الذنوب و اصلح العیوب

''جو کوئی محاسبۂ نفس کرتا ہے، اپنے عیوب سے واقف ہو جاتا ہے اور اپنے گناہوں کا احاطہ کر لیتا ہے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اپنے عیوب کی اصلاح کرتا ہے۔'' (غرر الحکم)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

من حاسب نفسه سعد

''جو اپنا محاسبہ کرتا ہے، خوش نصیب ہوجاتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل: ۱۲: ۱۵۴)

ایک اور حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں:

ثمرة المحاسبة صلاح النفس

یعنی ''اصلاحِ نفس محاسبہ کا ثمر ہے۔'' (غرر الحکم)

بعض علمائے اخلاق نے محاسبہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ محاسبہ اس طرح سے کیا جائے جیسے اپنے شریک کار سے کیا جاتا ہے۔ اگر منافع حاصل ہو تو اپنا حصہ وصول کرے اور شریک کار کا شکریہ ادا کرے، اگر نقصان پر نظر پڑے تو شریک کار کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائے اور اسے مستقبل میں اس نقصان کی تلافی پر مجبور کرے۔

انسان کا سب سے اہم سرمایہ یعنی اس کی عمر کا بھی یہی حال ہے۔ یہ سرمایہ انسان کے نفس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا نفع کارہائے خیر اور اس کا خسارہ اور نقصان گناہ ہیں۔ اس کی تجارت کا وقت دن بھر کے اوقات اور اس کا شریک تجارت اس کا نفس امارہ ہے۔

انسان پر لازم ہے کہ محاسبہ کرتے وقت سب سے پہلے اپنے نفس سے فرائض کا حساب لے۔ اگر سارے فرائض انجام دیئے گئے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرے اور اس راہ پر چلنے میں اپنی حوصلہ افزائی کرے۔ اگر کوئی فریضہ ادا ہونے سے رہ گیا ہو تو اپنے آپ سے اس کی قضا بجالانے کا مطالبہ کرے۔ اگر کوئی فریضہ ناقص طور پر انجام دیا گیا ہو تو نوافل کے ذریعے اس کے نقص کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی معصیت اور گناہ کا ارتکاب کیا ہو تو اس کی تلافی کا مطالبہ کرے، جیسے ایک تاجر اپنے شریک کار سے محاسبہ کرتا ہے، یہاں تک کہ چھوٹی سی رقم کے بارے میں بھی اسے کوئی رعایت نہیں دیتا تاکہ اسے کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ انسان کو نفس امارہ کے ساتھ خاص طور پر ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے کیونکہ وہ انتہائی مکار اور چالباز ہے۔

انسان کو چاہئے کہ جو محاسبہ قیامت کے دن فرشتوں نے کرنا ہے، اسی دنیا میں خود اپنے لئے کرے، یہاں تک کہ محاسبہ کرتے وقت اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات، اپنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے بولنے اور خاموشی پر بھی اپنا محاسبہ کرے۔ مثلاً اپنے نفس سے سوال کرے کہ فلاں مقام پر کیوں خاموش رہے؟ فلاں موقع پر فلاں بات کیوں کہی؟ (بہتر ہے کہ انسان روز بروز یا ہر گھنٹے اپنا محاسبہ کرے، ورنہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا)۔

اگر انسان اپنی زندگی میں انجام دیئے جانے والے ہر گناہ پر ایک کنکر اپنے گھر کے کسی کونے میں رکھتا رہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے گھر کا صحن کنکروں سے بھر جائے گا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نقائص اور عیوب کا محاسبہ کرنے کو اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن جو فرشتے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال لکھنے کیلئے مقرر فرمائے ہیں، وہ اپنا کام انتہائی باریک بینی سے انجام دیتے ہیں۔ ان سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ

یعنی ''اللہ نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے اور یہ اسے بھولے ہوئے ہیں۔'' (مجادلہ:٦)

ہم اس بحث کا اختتام اس حدیث پر کرتے ہیں جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن کس طرح محاسبہ ہوگا تا کہ ہم دنیا میں محاسبہ کا طریقہ سیکھ سکیں:

رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

لا تزول قدما عبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع عن عمرہ فی ما افناہ و عن شبابہ فی ما ابلاہ، وعن مالہ من این اکتسبہ و فی ما انفقہ و عن حبنا اھل البیت (خصال صدوق:۲۵۳)

''قیامت کے دن قدم اٹھانے سے قبل ہر انسان سے چار چیزوں کا سوال کیا جائے گا:

۱۔اس نے اپنی عمر کہاں فنا کی؟

۲۔اپنی جوانی کو کہاں صرف کیا؟

۳۔مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟

۴۔ہم اہل بیتؑ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا (کہ آیا ہماری محبت کا حق ادا کیا یا نہیں؟)''

پانچواں قدم معاتبہ ومعاقبہ (سرزنش اور سزا)

پانچواں قدم جو محاسبہ کے بعد آتا ہے، وہ معاتبہ اور معاقبہ ہے یعنی سرزنش اور سزا۔یعنی انسان اپنے نفس کو اس کی خطاؤں اور خلاف ورزیوں پر سرزنش کرے اور سزا دے، اس لئے کہ اگر انسان محاسبہ کرے اور غلط کاموں کے خلاف کسی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کرے تو محاسبہ کا الٹا اثر ہوگا یعنی نفس مزید جری اور دلیر ہو جائے گا۔

جب انسان اپنے نوکروں اور ملازمین کا محاسبہ کرتا ہے تو ان کے غلط کاموں پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے جو ہلکی سرزنش سے سخت سزا تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔اسی طرح جو لوگ قربِ الٰہی کے سفر میں مشغول ہیں، انہیں بھی چاہئے کہ اپنے سرکش نفس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں، ورنہ محاسبۂ نفس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا یعنی اس کی جرأت اور حوصلے میں اضافہ ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نفس لوامہ کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝

''میں نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں۔'' (سورۂ قیامت:۲)

ہم سب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ نفس لوامہ سے مراد انسان کا زندہ اور بیدار ضمیر ہے جو برے اعمال کی انجام دہی

پر اسے سرزنش کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک قسم کی سزا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ برے کاموں کی انجام دہی پر اپنے آپ کو سزا دینے کے مختلف درجات ہیں جو ملامت سے شروع ہوتے ہیں اور پھر نفس امارہ کو مختلف لذتوں سے محروم کرنے کی صورت میں شدید سے شدید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس کی دلچسپ مثال ان تین افراد کا واقعہ ہے جنہوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔ جنگ سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ اس قطع تعلق کے نتیجہ میں ان کی حالت یہ ہوگئی کہ گویا زمین اپنی تمام تر راحت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، یہاں تک کہ ان تینوں نے ایک دوسرے سے بھی قطع تعلق کر لیا اور توبہ میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور یہ آیت نازل فرمائی:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اور ان تین افراد کی بھی توبہ قبول کی جو (مدینہ میں) رہ گئے تھے (اور جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی اور مسلمانوں س نے ان سے تعلق توڑ لیا تھا) یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے دل بھی ان کیلئے تنگ ہو گئے اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی پناہ نہیں ہے۔ پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی تا کہ وہ توبہ کر سکیں۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (توبہ:۱۱۸)

ممکن ہے یہ جملہ ''وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ''، ''ان کے دل بھی ان پر تنگ ہو گئے''، معاقبہ نفس کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی انہوں نے اپنے آپ کو سزا دینے کیلئے آپس میں ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیا اور مکمل تنہائی اور خلوت اختیار کر لی ہو اور اس کیفیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی ہو۔

اسی طرح سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۲ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ابولبابہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ آیت یہ ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

''اور کچھ دوسرے لوگ، جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور اچھے اور برے اعمال باہم مخلوط کر دیئے، امید ہے اللہ انہیں معاف کر دے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا

ہے۔'' (توبہ:۱۰۲)

ابولبابہ ایک انصاری تھے جنہوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔ بعد میں سخت پشیمان ہوئے اور اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ لیا۔ یہ ستون اب بھی ستونِ ابولبابہ یا ستونِ توبہ کے نام سے معروف ہے۔ وہ کچھ عرصہ اس ستون سے بندھے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت نازل کر کے ان کی توبہ کو قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔

ظاہری بات ہے کہ ابولبابہ کا یہ اقدام ''معاقبہ'' یعنی اپنے آپ کو سزا دینا شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیر و سلوک کا یہ قدم رسول اللہؐ کے دور میں ان کے اصحاب میں بھی رائج تھا۔

ممکن ہے آیت کا یہ جملہ ''خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط'' (انہوں نے اچھے اور برے اعمال باہم ملا دیئے) بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

احادیث میں بھی معاقبہ کے بارے میں واضح بیانات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ میں ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے متقین کی نمایاں صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان استصعبت علیه نفسه فی ما تکره لم یعطها سولها فی ما تحب

''جب بھی اس کا نفس کسی ایسے کام کو انجام دینے میں سرکشی کرے جو اسے ناگوار گزرتا ہے (یا گناہ کی راہ پر چلتا ہے) تو وہ (یعنی متقی) بھی اس (یعنی نفس) کو اس کی پسندیدہ چیز سے محروم کر دیتا ہے (اور اس طرح اپنے سرکش نفس کو سزا دیتا ہے)۔'' (نہج البلاغہ: ۱۹۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک متقی انسان اپنے نفس کی سرکشی کی وجہ سے اسے نیند، اس کی پسندیدہ خوراک اور آرام وغیرہ سے محروم کر دیتا ہے تاکہ اس طرح نفس کو سزا ملے اور وہ آئندہ گناہ اور نافرمانی کی راہ پر نہ چلے۔

۲۔ غرر الحکم میں ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

اذا صعبت علیك نفسك فاصعب لها تذل لك

''جب تمہارا نفس سخت گیری کرے (یعنی اللہ کی اطاعت میں تمہارا ساتھ نہ دے) تو تم بھی اس پر سخت گیری کرو (یعنی اسے اس کی پسندیدہ چیزوں سے محروم کر دو) تاکہ وہ تمہارا مطیع ہو جائے۔''

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

من ذم نفسه اصلحها من مدح نفسه ذبحها

جو اپنے نفس کی مذمت کرتا ہے، وہ اس کی اصلاح کرتا ہے اور جو اس کی تعریف کرتا ہے، وہ اسے ذبح کر دیتا ہے۔ (غرر الحکم)

۴۔ امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

دواء النفس الصوم عن الھوی، والحمیہ عن الذات الدنیا

''سرکش نفس کی دوا خواہشات پر قابو رکھنا اور دنیوی لذتوں سے پرہیز کرنا ہے۔'' (غرر الحکم: ۵۱۵)

اصحاب رسولؐ، علمائے بزرگ اور پاک دل مومنین کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے ارتکابِ گناہ کی صورت میں اپنے نفس کو سزا دی تا کہ مستقبل میں اس گناہ کا تکرار نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ رسولؐ اللہ کے ایک صحابی تھے جن کا نام ثعلبہ تھا۔ وہ انصاری تھے اور انہوں نے سعید بن عبدالرحمن کے ساتھ، جو مہاجر تھے، عہد اخوت باندھا تھا۔ ایک جنگ میں سعید رسولؐ اللہ کے ساتھ گئے جبکہ ثعلبہ مدینہ میں رہے۔ سعید کو اپنے اس بھائی پر اعتماد تھا کہ وہ اس کے اہل وعیال کا خیال رکھے گا۔ وہ بھی اسی بنیاد پر ہر روز انہیں پانی، ایندھن وغیرہ فراہم کرتے تھے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک دن سعید کی بیوی پردے کے پیچھے سے ثعلبہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھی کہ ثعلبہ کی نفسانی خواہش اس پر غالب آ گئی۔ اس نے پردہ ایک طرف کر دیا اور سعید کی خوبصورت بیوی کو بانہوں میں لینے کیلئے ہاتھ آگے بڑھائے سعید کی بیوی چیخ کر بولی: ثعلبہ کیا کر رہے ہو؟ کیا یہ صحیح ہے کہ تمہارا مجاہد بھائی اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو اور تم اس کے گھر میں اس کی بیوی کے بارے میں بری نیت رکھتے ہو؟

ثعلبہ کا ضمیر اچانک بیدار ہو گیا۔ وہ سعید کے گھر سے نکل کر صحرا کی طرف نکل گیا اور گریہ وزاری میں مشغول ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح معافی مانگنے لگا:

الھی انت المعروف بالغفران وانا الموصوف بالعصیان

''اے میرے معبود! تو مغفرت کی وجہ سے معروف ہے جبکہ میں نافرمانی سے موصوف ہوں۔''

اس طرح اس نے اپنے اس گناہ کی وجہ سے سختی کی اور آخر کار آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرا آپؐ سے بیان کیا اور اپنی توبہ آپؐ کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ نازل فرمائی:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۫ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۫ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''جب وہ کسی برے کام کے مرتکب ہوتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اور پھر وہ دانستہ

اپنے کئے ہوئے گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔''[1]

۲۔ آیت اللہ بروجردی مرحومؒ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ بعض اوقات دورانِ درس کسی شاگرد سے سختی سے بات کر جاتے تھے۔ اگر چہ یہ ایک پدرانہ سختی ہوتی تھی مگر وہ اس پر اپنے شاگرد سے معافی طلب کرتے تھے اور جیسا کہ انہوں نے منت مانی ہوئی تھی، اس سے اگلے دن روزہ رکھ کر اپنے نفس کو سزا دیتے تھے۔

۳۔ علمائے اخلاق میں سے ایک بزرگ عالم نے ایک خطیب کا واقعہ بیان کیا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں منبر پر جاتے وقت امام حسین علیہ السلام کو سلام کرتا ہوں اور ان کا جواب سنتا ہوں۔ اگر ان کی طرف سے جواب نہ آئے تو منبر پر نہیں جاتا اور تقریر نہیں کرتا۔ میری یہ روحانی حالت اس طرح حاصل ہوئی کہ ایک بار میں ایک بہت بڑی اور اہم مجلس میں گیا۔ ایک بہت مشہور خطیب تقریر کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے بعد ایسی تقریر کروں جس سے اس کی دلکش تقریر کا اثر ختم ہو جائے۔ لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت ہی برا خیال تھا جو میرے دل میں آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے نفس کو سزا دینے کیلئے چالیس دن تک کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ اس معاقبہ نفس کے نتیجہ میں میرے دل میں یہ نورانیت پیدا ہوگئی کہ امام حسین علیہ السلام کو سلام کرتا ہوں تو ان کا جواب سنتا ہوں۔

مختصر یہ کہ مراقبہ اور محاسبہ کا فیصلہ کن اثر صرف اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب ان کے بعد معاقبہ اور مناسب سزا کا بھی انتظام ہوتا کہ نفس امارہ کو اس کی سرکشی سے باز رکھا جا سکے، ورنہ مراقبہ اور محاسبہ کی تاثیر بہت کمزور ہوگی۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم جوگیوں اور بھٹکے ہوئے صوفیاء کے طرزِ عمل کو صحیح جاننے لگیں اور ان واقعات کی تصدیق کرنے لگیں جو غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کئے ہیں جن سے یہ درس ملتا ہے کہ انسان اپنے نفس کی خطاؤں پر اسے خطرناک اور احمقانہ قسم کی سخت سزائیں دے۔ معاقبہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ انسان روزہ رکھ کر، یا نفس کی پسندیدہ حلال لذتوں سے اسے محروم کر کے اسے مناسب سزا دے۔

مرحوم نراقی ''معراج السعادۃ'' میں لکھتے ہیں:

اگر انسان سے کوئی غلط کام سرزد ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو سزا دے، مثلاً کوئی سنگین عبادت انجام دے یا اپنے اموال میں سے کوئی پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خیرات کرے۔ اگر اس نے حرام یا مشکوک غذا کا لقمہ کھایا ہو تو اپنے نفس پر بھوک مسلط کرے۔ اگر کسی کی غیبت کی ہو تو اس کی تعریف کر کے یا اپنے نفس پر خاموشی کو مسلط کر کے اپنے آپ کو سزا دے یا ذکر خدا سے اس کی تلافی کرے۔ اگر اس نے کسی فقیر یا تنگدست کی تحقیر کی ہو تو اسے بھاری مقدار میں مال دے اور اسی طرح دیگر گناہوں اور لغزشوں کی تلافی کرے۔

---

[1] یہ واقعہ مختلف کتب میں تفصیل کے ساتھ ''خزینۃ الجواہر، ص ۳۲۰ سے نقل کیا گیا ہے۔ فخر رازی نے تفسیر کبیر، ج ۹، ص ۹ میں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نیت اور اخلاصِ نیت

بہت سے علمائے اخلاق نے اخلاقی مباحث کے آغاز میں نیت اور اخلاصِ نیت کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ اور جدا قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک نیت اور چیز ہے اور اخلاصِ نیت اور چیز ہے لیکن مقام بحث میں انہوں نے ان کے فرق کو واضح نہیں کیا۔

ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کیلئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیت سے مراد کسی کام کو کرنے کا عزمِ راسخ اور پختہ ارادہ ہے، خواہ اس کام کو انجام دینے کا محرک الٰہی ہو یا مادی۔

ظاہر سی بات ہے کہ کوئی بھی کام اسی صورت میں نتیجہ بخش ہوسکتا ہے جب مضبوط ارادے اور پختہ عزم کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ حصولِ علم، تجارت، زراعت، پیداواری سرگرمیاں، معاشرتی اور سیاسی سرگرمیاں اور ہر کام صرف اسی صورت میں نتیجہ بخش اور مفید ہوتا ہے جب اسے تذبذب اور دو دلی کے ساتھ نہیں بلکہ یقین اور یکسوئی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔ ایسا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان اس کام کو انجام دینے سے قبل اس کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح سے جائزہ لے۔ اس کام کی پیشرفت کی ضروری شرائط اور پیش آنے والی ممکنہ رکاوٹوں سے آگاہ ہو، پھر مضبوط ارادے کے ساتھ میدان میں اترے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھے۔

تہذیب اخلاق اور سیر وسلوک الی اللہ کیلئے بھی پختہ اور دوٹوک ارادہ ضروری ہے۔ کمزور، سست اور کاہل افراد ہرگز اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ معمولی سی رکاوٹ کا سامنا کرنے پر رک جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کمزور ارادہ انسان کی طاقت کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس قوی ارادہ انسان کی تمام اندرونی صلاحیتوں کیلئے مہمیز ثابت ہوتا ہے اور انسان کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف حرکت میں لے آتا ہے۔

قرآن مجید میں اسی چیز کو عزم کا نام دیا گیا ہے اور اللہ کے بڑے انبیاء کو اسی وجہ سے اولوالعزم کہا گیا کہ ان کے ارادے بہت بلند اور پختہ تھے۔

قرآن مجید میں رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

''ہم نے آدمؑ سے عہد لیا تھا (کہ شجرۂ ممنوعہ کے قریب نہ جانا) لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔'' (طٰہٰ:۱۱۵)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ماہِ رجب کی ایک دعا میں ہے:

وقد علمت ان افضل زادالراحل اليك عزم ارادة يختارك بها و قدناجاك

بعزم الارادة قلبی

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیری طرف آنے والوں کا بہترین زادِسفر پختہ ارادہ ہے جس سے وہ تجھے اختیار کرتا ہے اور میرا دل پختہ ارادے سے تجھ سے مناجات کر رہا ہے۔''

(مفاتیح الجنان، اعمال ماہِ رجب)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انما قدر الله عون العباد علی قدر نیاتهم فمن صحت نیته تم عون الله له، و من قصرت نیته قصر عنه العون بقدر الذی قصره

''اللہ تعالیٰ بندوں کی نیت کے حساب سے ان کی مدد کرتا ہے، جس کی نیت صحیح ہو، اللہ اس کی پوری مدد کرتا ہے، جس کی نیت ناقص ہو، اللہ تعالیٰ اس کی نیت کے مطابق اس کی مدد کرتا ہے۔''

(بحارالانوار، ۶۷:۲۱۱)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما ضعف بدن عما قویت علیه النیة

''جس کام کی نیت مضبوط ہو، بدن اس پر سست اور ناتوان نہیں ہوتا۔'' (بحارالانوار، ۶۷:۲۰۵)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ پختہ عزم اور ارادہ انسان کی جسمانی طاقت کو بھی زیادہ کرتا ہے اور اسے قوت اور حوصلہ بخشتا ہے۔

نیت کے ایک اور معنی

اس میں محرک کا فرق ہے۔ ممکن ہے چند افراد ایک ہی کام کر رہے ہوں، مثلاً جہاد میں شریک ہوں، ایک کا محرک مال غنیمت کا حصول یا برتری طلبی ہو جبکہ دوسرے کا محرک حق کی مدد کرنا، ظلم کا خاتمہ کرنا اور فتنہ کی آگ کو بجھانا ہو۔

ان دونوں افراد کا عمل ظاہری شکل میں ایک جیسا ہے، دونوں میدانِ جنگ میں جا کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہیں لیکن دونوں کی حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی لیے اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ابتدائے کار میں انسان اپنی نیت کو واضح کر لے۔

سالکانِ راہِ خدا بھی بڑی باریک بینی سے اپنی نیت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا ان کا مقصد اصلاحِ نفس، اخلاقی ارتقاء اور قربِ خدا کی منزل تک پہنچنا ہے یا لوگوں پر اپنی برتری کا سکہ جمانے کیلئے کرامات حاصل کرنا ہے!

مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" کا اشارہ بھی اسی حقیقت کی طرف ہے جو کہ حدیث کے ذیل سے واضح ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرء مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ و رسولہ ومن کان ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امراۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ

''اعمال کی قدر و قیمت کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی طرف محسوب ہوگی اور جس کی ہجرت حصولِ دنیا کی خاطر یا کسی عورت سے شادی کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت اسی کی طرف محسوب ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔'' (بحار الانوار ۶۷:۲۱۱)

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

علی قدر النیۃ تکون من اللہ عطیۃ

''اللہ کی عطا انسان کی نیت کے حساب سے ہوتی ہے۔'' (غرر الحکم، حدیث ۱۵۹۴)

مندرجہ بالا بحث سے بخوبی یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر کام میں کامیابی کیلئے عزم راسخ، مستحکم نیت اور قوت ارادی اشد ضروری ہے۔ جب تک یہ حاصل نہ ہو، انسان کی تمام کوششیں لاحاصل یا کم حاصل رہیں گی۔

جو لوگ اصلاحِ نفس اور تہذیب اخلاق کی راہ میں قدم بڑھانا چاہتے ہیں، وہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان پر بھی لازم ہے کہ فولادی عزم اور آہنی ارادے سے اپنے کام کا آغاز کریں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

یہاں یہ سوال پیش آ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا قوتِ ارادی کو کس طرح حاصل کیا جائے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اس قوتِ ارادی کے حصول کا اصل راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کام کے نتائج اور مقصد کی عظمت کی طرف توجہ کرے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرے۔ جس قدر ان معاملات میں انسان کی سوچ اور تجزیہ وسیع ہوگا اور وہ مقصد کی اہمیت کو اچھی طرح پہچانتا ہوگا، اسی قدر مضبوط قوتِ ارادی سے اس راہ میں قدم اُٹھائے گا۔

جب انسان یہ سوچے کہ اس کے وجود کی قدر و قیمت اس کی اخلاقی صفات پر منحصر ہے اور یہ کہ انسان کی خلقت کا مقصد اخلاقی ارتقاء اور قربِ خدا کے سوا کچھ نہیں ہے، اگر وہ اس اہم ہدف سے غفلت کرے گا تو اس کی ہلاکت کا سفر شروع ہو جائے گا۔ انسان جس قدر ان حقائق کے بارے میں باریک بینی اور موشگافی سے کام لے گا، اسی قدر پختہ عزم اور ارادے سے اس راہ میں قدم

اُٹھائے گا۔

ایک جملے میں اس بات کو اسی طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پختہ ارادے، مقصد کی مکمل معرفت اور اس کی طرف مکمل توجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

اخلاص

اخلاص سے مراد خلوصِ نیت ہے اور خلوصِ نیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی بھی کام کے فیصلے کے پیچھے اصل محرک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہو۔

ممکن ہے بعض لوگ کسی کام کو انجام دینے کا پختہ عزم اور محکم ارادہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرک مادی ہو۔ لیکن سالکانِ راہِ خدا کا عزم اور ارادہ خلوصِ نیت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور ان کے ہر کام کا محرک الٰہی ہوتا ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث میں کسی چیز کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی، جتنی اخلاصِ نیت کو دی گئی ہے۔ قرآن مجید اور احادیثِ معصومینؑ میں جگہ جگہ اخلاصِ نیت کا ذکر ملتا ہے اور اسے دنیا اور آخرت کی کامیابی کا بنیادی عامل قرار دیا گیا ہے۔ اصولی طور پر اسلام کی نظر میں اس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جس میں اخلاص نیت نہ ہو۔

دوسری طرف سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اخلاصِ نیت کے حصول کو مشکل ترین کام قرار دیا گیا ہے۔ اس قدر مشکل کہ صرف اللہ کے اولیاء اور بندگانِ خاص ہی اخلاصِ کامل کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، اگرچہ اخلاص نیت کا ہر درجہ اپنے مقام پر پسندیدہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر پہلے ہم اخلاص نیت سے متعلق قرآنی آیات کا جائزہ لیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں **مخلصین** (خالص ہونے والے) یا **مخلصین** (جو خالص ہو چکے ہیں) کے بارے میں بات کی گئی ہے اور مختلف الفاظ میں ان کی تعریف و ستائش کی گئی ہے:

۱۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

''انہیں اس کے سوا اور کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا کہ اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے یکسوئی سے اس کی عبادت کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی پائیدار دین ہے۔'' (بینہ: ۵)

اس حقیقت کے پیش نظر کہ دین کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس میں تمام عقائد و اعمال آ جاتے ہیں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ ''مآ امروا'' میں ضمیر غائب تمام آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کی طرف لوٹتی ہے، اور اس چیز کے پیش نظر کہ اخلاص، نماز اور زکوٰۃ کا حکم ان سب کو دیا گیا ہے، مسئلہ اخلاص کی اہمیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام احکامِ الٰہی کی بنیاد توحید اور اخلاص کی حقیقت پر رکھی گئی ہے۔

۲۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ (مومن: ۱۴)

''اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے صرف اللہ کو پکارو خواہ یہ کافروں کو ناگوار گزرے۔''

۳۔ ایک اور مقام پر رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾

''اے رسولؐ! کہہ دو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے دین کو اللہ کیلئے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں۔'' (زمر: ۱۱)

ان آیات اور ان جیسی دیگر متعدد آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاص دین کا بنیادی رکن ہے، اس کے علاوہ **مخلصین یا مخلصین** کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اہم عبارات نظر آتی ہیں۔

۱۔ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

تیرے مخلص بندوں کے علاوہ ان سب کو بہکاؤں گا۔ (حجر۔ ۳۹۔۴۰)

یہ بات شیطان نے اس وقت کہی تھی جب اس بے بارگاہ قرب الٰہی سے دھتکارا گیا تھا۔ اس آیت سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اللہ کے مخلص بندوں کی حالت اس قدر مضبوط ہے کہ شیطان کو بھی اس کے گمراہ نہ ہونے کا یقین۔

۲۔ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

''تمہیں وہی صلہ دیا جائے گا جو عمل تم کرتے رہے، سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔''

(صافات۔ ۳۹۔۴۰)

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق صلہ ملے گا مگر مخلصین کو بے حساب اجر و نعمت سے نوازا جائے گا۔

۳۔ اس طرح سورۂ صافات ہی کی آیات ۲۷ اور ۲۸ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مخلصین اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے معاف ہوں گے اور امید ہے جنت کی طرف روانہ کر دیئے جائیں گے۔

۴۔ اسی سورت کی آیات ۱۵۹ اور ۱۶۰ میں اللہ کو لوگوں کی بیان کردہ صفات سے پاکیزہ و منزہ قرار دیا گیا ہے مگر مخلصین کی بیان کردہ توصیف کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اللہ ان کی بیان کردہ صفات سے منزہ ہے، سوائے اللہ کے مخلص بندوں کے۔''

(صافات:۱۵۹،۱۶۰)

۵۔ سورۂ یوسف کی آیت ۲۴ میں عزیز مصر کی بیوی کے وسوسوں کے مقابلہ میں حضرت یوسفؑ کی حمایت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا:

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴

''اس طرح ہم نے بدی اور فحشاء کو اس سے پھیر دیا۔ بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔''

مخلص اور مخلص کا فرق بیان کرنے کے لئے بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن شاید ان میں سے بہترین تفسیر یہ ہے کہ مخلص سے مراد وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو خالص بنانے کے مراحل میں سے گزر رہے ہیں جبکہ مخلص سے مراد وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو خالص بنانے کا عمل مکمل کر کے ہر لحاظ سے مکمل طور پر خالص ہو چکے ہیں۔

یہاں پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے اندر پائی جانے والی آلائشات کی دو اقسام ہیں:

ایک وہ آلائشات جن سے انسان آگاہ ہوتا ہے اور ان کو برطرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے عقیدہ و عمل کو خالص بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آلائشات کی دوسری قسم اس قدر مرموز اور پوشیدہ ہوتی ہے کہ اول تو انسان ان کو پہچان ہی نہیں سکتا اور اگر انہیں پہچان لے تو انہیں برطرف کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک مشہور حدیث میں ہے:

ان الشرك اخفى من دبيب النمل على صفاة سوداء فى ليلة ظلماء

(بحار الانوار:۶۹:۹۳)

''شرک تاریک رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی چال چلتا ہے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا لطف ایسے حالات میں سالک کے شاملِ حال نہ ہو تو وہ ان دشوار مراحل سے کبھی نہ گزر سکے اور آلائشات میں پھنسا رہ جائے گا۔ لیکن جو لوگ اپنی طاقت، توانائی اور دائرۂ اختیار سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے اپنے آپ کو حتی الامکان خالص بنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا یہ انعام دیتا ہے کہ باقی ماندہ راستے کو وہ اس کی توفیق و عنایت سے طے کر لیتے ہیں اور مخلص سے مخلص ہو جاتے ہیں۔

جب انسان اس مرحلہ پر پہنچ جائے ہیں تو شیاطین کے وسوسوں اور ہوائے نفس کے شر سے مکمل طور پر محفوظ ہو جاتا ہے۔ شیطان ایسے انسانوں سے مایوس ہو جاتا ہے اور باقاعدہ طور پر ان کے سامنے ہار مان لیتا ہے۔

اس مقام پر سالک اللہ تعالیٰ کی نعمت کے وسیع دسترخوان سے بے حساب بہرہ مند ہوتا ہے۔ اللہ کے جلال اور جمال کے بارے میں ان کی توصیف پر خالص توحید کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ وہ جنت میں بھی بغیر حساب کتاب کے جاتا

ہے، اس لئے کہ دنیا میں ہی وہ اپنا حساب صاف کر چکا ہوتا ہے۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

قد اخلص لله فاستخلص

''اس نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے خالص کیا اور اللہ نے اس کے خلوص کو قبول کر لیا (اور اسے مرحلہ کمال تک پہنچا دیا)۔'' (خطبہ: ۸۷)

اسی بناء پر ایک حدیث میں رسولؐ اللہ کے بارے میں ہے: (بحار الانوار، ۱۴: ۵۲۰)

فعند ذلك استخلص الله عزوجل لنبوته و رسالته من الشجرة المشرفة الطيبة ..... محمدا اختصه للنبوة و اصطفاه بالرسالة

''اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی نبوت اور رسالت کیلئے حضورؐ کو پاکیزہ شجر سے چن لیا۔''

آئمہ معصومینؑ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

وجدت ابن آدم بين الله و بين الشيطان فان احبه الله تقدست اسمائه، خلصه و استخلصه و الا خلى بينه و بين عدوه (بحار الانوار، ۵: ۵۵)

''میں نے فرزندِ آدم کو اللہ اور شیطان کے درمیان پایا ہے۔ اگر اللہ (اس کے کردار کی وجہ سے) اس سے محبت کرتا ہو تو اسے خالص و مخلص بنا دیتا ہے، ورنہ اسے شیطان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔''

مختصر یہ کہ نیت، عقیدہ، اخلاق اور عمل میں اخلاص پیدا کرنا تہذیب نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کے اہم ترین اور اساسی ترین مراحل میں سے ایک ہے۔

اخلاص احادیث کی روشنی میں

اخلاص کے بارے میں احادیث میں بھی مفصل بحث کی گئی ہے جس کے بعض پہلوؤں کا ہم ذیل میں جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: (محجۃ البیضاء، ۸: ۱۲۵۔ خصال، باب الثلاثۃ: ۱۶۷)

ثلاث لا يغل عليهن قلب رجل مسلم اخلاص العمل لله عزوجل و النصيحة لائمة المسلمين و اللزوم لجماعتهم

''تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں خیانت نہیں پائی جانی چاہئے:
عمل کو اللہ کے خالص کرنا، مسلمان حکام کی خیر خواہی اور جماعت مسلمین کے ساتھ رہنا۔''

۲۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الاخلاص سر من اسراری استودعه قلب من احببته من عبادی

''اخلاص میرے رازوں میں سے ایک راز ہے جسے میں اپنے اس بندے کے قلب میں ڈالتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں۔'' (محجۃ البیضاء:۸:۱۲۵)

۳۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص اشرف نهاية

''اخلاص اشرف ترین انجام ہے۔'' (تصنیف الغرر:۱۹۷)

۴۔ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

الاخلاص اعلی الایمان

''اخلاص ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔'' (غرر الحکم:۱:۱۲۵)

۵۔ امیر المومنین علیہ السلام سے ہی ایک اور حدیث میں ہے:

فی اخلاص الاعمال تنافس اولوا النهی والالباب

''اہل عقل وخرد اعمال کے اخلاص میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔'' (غرر الحکم، ۲:۵۱۳)

۶۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

بالاخلاص تتفاضل مراتب المومنين

''مومنین کی درجہ بندی اخلاص کے درجات کی بنیاد پر ہوگی۔'' (میزان الحکمہ، ۱:۳۰)

۷۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

غاية اليقين الاخلاص

''اخلاص یقین کا آخری درجہ ہے۔'' (غرر الحکم:۲)

۸۔ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اخلص قلبك يكفك القليل من العمل

''اپنے دل کو خالص کرلو تو تمہارا قلیل عمل بھی کافی ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۰:۱۷۵)

۹۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص عبادة المقربين

''اخلاص مقربین کی عبادت ہے۔'' (غرر الحکم، ۱:۲۵)

۱۰۔ ہم اس مفصل بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

طوبی لمن اخلص الله العبادة و الدعاء و لم يشغل قلبه بما ترى عيناه، ولم ينس ذكر الله بما تسمع اذناه ولم يحزن صدره بما اعطى غيره

''خوش نصیب ہے وہ شخص جو اپنی عبادت اور دعا کو اللہ کیلئے خالص کرے اور اپنے دل کو ان چیزوں میں مشغول نہ کرے جو اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ جو کچھ اس کے کان سنتے ہیں، اس کی وجہ سے اللہ کے ذکر کو فراموش نہ کرے اور جو کچھ دوسروں کو دیا گیا ہے، اس پر اس کا دل غمگین نہ ہو۔''

(اصولِ کافی)

اخلاص کی حقیقت

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضاء میں اس بارے میں کہتے ہیں:

''اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی نیت ہر قسم کے شرکِ مخفی اور شرکِ جلی سے پاک ہو۔''

قرآن مجید میں ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝۶۶

''چوپایوں میں تمہارے لئے درس عبرت ہے، اس لئے کہ ہم ان کے پیٹ میں سے ہضم شدہ خوراک اور خوراک کے درمیان سے تمہیں خالص اور لذیذ دودھ پلاتے ہیں۔'' (نحل:۶۶)

خالص دودھ وہ ہوتا ہے جو خون کے دھبوں، اندرونِ شکم کی آلائشات اور دیگر آلودگیوں سے پاک ہو۔ خالص نیت اور خالص عمل بھی وہی ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی آلائش نہ ہو۔'' (محجۃ البیضاء، ۸:۱۲۸)

احادیث میں بھی اخلاص کی حقیقت اور مخلصین کی نشانیوں کے بارے میں نہایت لطیف بیانات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ان لكل حق حقيقة و ما بلغ عبد حقيقة الاخلاص حتى لايحب ان يحمد على شيء من عمل لله (بحار الانوار، ۶۹:۳۰۴)

''ہر حقیقت کی ایک علامت ہوتی ہے۔کوئی شخص اس وقت تک اخلاص کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک اس کی حالت یہ نہ ہو جائے کہ وہ اللہ کیلئے کئے گئے اعمال پر اپنی تعریف کو پسند نہ کرے۔''

۲۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

اما علامة المخلص فاربعة، يسلم قلبه، وتسلم جوارحه، وبذل خيره و كف شره (تحف العقول:۱۶)

''مخلص کی چار نشانیاں ہیں: اس کا دل اللہ کے حضور جھکا ہوا ہوتا ہے، اس کے اعضاء اللہ کے حکم کے سامنے جھکے ہوئے ہوتے ہیں، لوگوں کو اس سے خیر نصیب ہوتی ہے اور اپنی برائی کو روکے رکھتا ہے۔''

۳۔ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لايكون العبد عابد الله حق عبادته حتى ينقطع عن الخلق كله اليه، فحينئذ يقول هذا خالص لي فيتقبله بكرمه

''کوئی عابد اللہ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک مخلوق سے منقطع ہو کر مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ جب وہ ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے لئے خالص ہو چکا ہے۔ پس وہ اپنے کرم سے اسے قبول کر لیتا ہے۔'' (مستدرک الوسائل، ۱:۱۰۱)

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما انعم الله عزوجل على عبد اجل من ان لايكون في قلبه مع الله غيره (مستدرک الوسائل، ۱:۱۰۱)

''کسی بندے پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ کے ساتھ اور کوئی نہ ہو۔''

اخلاص کی غیر معمولی اہمیت اور راہِ حق پر چلنے اور قرب الٰہی کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں اس کی گہری تاثیر کے بارے میں آگاہی حاصل کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اخلاص کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاص نیت، ایمان، یقین اور معرفت الٰہی کی گہرائی سے جنم لیتا ہے۔ انسان کا توحید افعالی پر جس قدر زیادہ یقین ہوگا اور وہ عالم ہستی میں اللہ کے سوا کسی کو موثر نہ سمجھے، ہر چیز کو اسی کی طرف سے اور اس کے حکم کے تابع سمجھے، حتی کہ اسباب و عوامل کو بھی اس کا مطیع اور محکوم جانے تو ایسے شخص کے تمام اعمال خلوص پر مبنی ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کا مبداء موثر صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہے۔

یہ حقیقت احادیث میں بھی مختصر اور موثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الاخلاص ثمرة اليقين

''اخلاص یقین کا پھل ہے۔'' (غرر الحکم، ۱:۳۰)

چونکہ "واعبد ربك حتى يأتيك اليقين" (اپنے رب کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہیں یقین آ جائے) کی رو سے عبادت اسباب یقین میں سے ہے، اسی لئے حضرت علیؑ ایک اور ارشاد میں فرماتے ہیں:

الاخلاص ثمرة العبادة

''اخلاص عبادت کا ثمر ہے۔'' (غرر الحکم: ۱:۱۷۱)

چونکہ علم معرفت یقین کے ذرائع میں سے ہیں اور یقین اخلاص کا سرچشمہ ہے، ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثمرة العلم اخلاص العمل

''علم کا ثمر اخلاصِ عمل ہے۔'' (غرر الحکم، ۱:۳۶۱)

آخر میں ہم مولا علی علیہ السلام کا ایک جامع فرمان نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جس میں اخلاص کے سرچشموں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

اول الدين معرفته و كمال معرفته التصديق به، و كمال التصديق به توحيده و كمال توحيده الاخلاص له

''دین کا آغاز اللہ کی معرفت ہے، اس کی معرفت کا کمال اس کی ذاتِ مقدس کی تصدیق ہے، اس کی تصدیق کا کمال توحید ہے اور اس کی توحید کا کمال یہ ہے کہ انسان اس کیلئے خالص ہو جائے۔''

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱)

اخلاص کی راہ میں رکاوٹیں

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے اس بارے میں واضح اور لطیف نکات بیان کئے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاص کی راہ میں بہت سی خفیہ اور آشکار رکاوٹیں موجود ہیں جن میں سے بعض بہت قوی اور خطرناک جبکہ بعض نسبتاً کمزور ہوتی ہیں۔ شیطان اور ہوائے نفس بھی انسان کے ذہن کو آلودہ کرنے اور اخلاص کی بجائے اعمال کو ریاکاری کی آلائشات سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریاکاری اور آلودگی نیت کے بعض درجات تو اس قدر واضح اور آشکار ہوتے ہیں کہ ہر انسان انہیں پہچان سکتا ہے، مثلاً

شیطان کسی نمازی سے یہ کہے کہ نماز آہستہ آہستہ اور خشوع وخضوع سے پڑھ تا کہ حاضرین تجھے ایک صالح مومن سمجھیں اور کبھی تیری غیبت اور بدگوئی نہ کریں۔ یہ نہایت ہی واضح شیطانی فریب ہے۔

بعض اوقات یہ شیطانی وسوسہ نسبتاً پوشیدہ شکل میں ہوتا ہے اور اطاعت کی صورت میں سامنے آتا ہے، مثلاً وہ انسان سے کہتا ہے کہ تم ایک نمایاں اور ممتاز شخصیت ہو۔ اگر تم اپنی نماز اور دیگر اعمال کو خوبصورت اور پرکشش بنالو تو لوگ تمہارے پیچھے نماز پڑھنے لگیں گے۔ اس طرح تم ان کے ثواب میں بھی شریک ہوجاؤ گے۔ انسان آسانی سے اس وسوسے کا شکار ہوکر ریاکاری کے ہولناک گڑھے میں جا گرتا ہے۔

بعض اوقات شیطان کا وسوسہ اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ شیطان کسی نماز گزار سے یہ کہے کہ مخلص انسان وہ ہوتا ہے جو خلوت اور جلوت میں ایک جیسا ہے، جس کی عبادت خلوت میں کم اور جلوت میں زیادہ ہو، وہ ریاکار ہوتا ہے۔ اس طرح شیطان اسے اس بات پر اکساتا ہے کہ خلوت میں بھی اچھی طرح نماز پڑھے تا کہ جلوت میں اچھی طرح نماز پڑھے تو ریاکاری شمار نہ ہو اور اپنے مقاصد بھی حاصل کرسکے۔ یہ ایک انتہائی خفیہ ریاکاری ہے اور ممکن ہے کہ زیادہ تر لوگ اس سے غافل رہیں۔ اسی طرح اس سے زیادہ خفیہ اور مرموز قسم کی ریاکاری بھی ممکن ہے۔ (محجۃ البیضاء، ۸: ۱۳۳)

سچ تو یہ ہے کہ اخلاص کے موانع اس قدر زیادہ، پیچیدہ اور مخفی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے پاس پناہ لئے بغیر ان سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

احادیث میں بھی اخلاص کے موانع کے بارے میں جس انداز سے خبردار کیا گیا ہے، وہ بہت اہم اور قابل ذکر ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

كيف يستطيع الاخلاص من يغلبه الهوى

''جس کی ہوائے نفس اس پر غالب ہو، وہ کیسے اخلاص پر قادر ہوسکتا ہے!'' (غرر الحکم، ۲: ۵۵۳)

اس حدیث میں اخلاص کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوائے نفس اخلاص تک لے جانے والے راستوں کو تاریکیوں سے پر کردیتی ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

قلل الامال تخلص لك الاعمال

یعنی ''اپنی آرزوؤں کو چھوٹا کردو، تمہارے اعمال میں اخلاص پیدا ہوجائے گا۔'' (غرر الحکم: ۲۹۰۶)

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات انسان شیطان کے عجیب وغریب اور فریب کارانہ وسوسوں کا شکار ہوجاتا ہے، مثلاً شیطان اسے کہتا ہے کہ نمازِ جماعت میں شرکت نہ کرو کیونکہ ممکن ہے لوگوں کے سامنے عبادت کرنے سے تمہاری نیت ریاکاری سے آلودہ نہ ہوجائے۔ لہٰذا گھر پر ہی نماز پڑھا کرو اور اگر کبھی لوگوں کے سامنے نماز پڑھنی پڑے تو اس میں سے مستحب اعمال کو ساقط کردو

اور نماز کو جلدی جلدی ادا کرو تا کہ ریا کاری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اسی طرزِ فکر کی وجہ سے مستحب اعمال مؤکدہ بھی ترک کر دیتے ہیں۔

شاید اسی وجہ سے قرآن مجید پوشیدہ اور آشکارا انفاق کرنے کا حکم دیتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

''وہ اپنے اموال رات میں اور دن کو پوشیدہ و اعلانیہ انفاق کرتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے اور ان پر کوئی خوف اور حزن نہ ہوگا۔'' (بقرہ: ۲۷۴)

ایک اور نکتہ کا ذکر کر کے ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ تنہائی اور خلوت میں اخلاص کا ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان لوگوں کے درمیان کھلم کھلا اپنے اعمال کو اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اخلاص کے آثار

چونکہ اخلاص انسان کے قلب و روح میں پیدا ہونے والا گراں بہا ترین موتی ہے، لہٰذا اس کے آثار و نتائج بھی انتہائی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں احادیث میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ایک بہت مشہور معروف حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ما اخلص عبدالله عزوجل اربعين صباحا الا جرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه

''کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو چالیس روز اللہ کیلئے خالص گزارے مگر یہ کہ حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔'' (عیون الاخبار الرضا، ۲:۶۹۔ بحار الانوار: ۶۷: ۲۴۲)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں:

عند تحقق الاخلاص تستنير البصائر

''حصولِ اخلاص پر انسان کی بصیرت نورانی ہو جاتی ہے۔'' (غرر الحکم، ۲:۴۹۲)

آپؑ ہی سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

فی اخلاص النيات نجاح الامور

''کاموں کی کامیابی نیتوں کے اخلاص پر مضمر ہے۔'' (غرر الحکم، ۲:۱۴)

یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ نیت جس قدر پاکیزہ ہو، انسان اسی قدر کاموں کے باطن پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ بعبارتِ دیگر، اس صورت میں امور کی پختگی اعلیٰ ترین حدوں پر ہوتی ہے۔ اسی لئے کاموں کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی نیت ریا سے آلودہ ہو تو وہ باطن سے زیادہ ظاہر پر توجہ دیتا ہے جس کے نتیجہ میں کاموں میں کھوکھلا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ناکامی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لو خلصت النیات لزکت الاعمال

''اگر نیتیں خالص ہو جائیں تو اعمال پاک ہو جاتے ہیں۔'' (غرر الحکم، ۲: ۶۳)

ریاکاری

ریاکاری اخلاص کا نکتہ مخالف ہے۔ آیات و احادیث میں اس کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسے اعمال کے باطل ہونے کا سبب اور منافقین کی نشانی اور شرک کی اقسام میں سے ایک قسم قرار دیا گیا ہے۔

ریاکاری فضائل اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے اور رذائل اخلاق کے بیج انسان کے قلب و جان میں بکھیر دیتی ہے۔ ریاکاری اعمال کو کھوکھلا کر دیتی ہے اور انسان کو اعمال کے باطن پر توجہ دینے سے روک دیتی ہے۔ ریاکاری انسان کو گمراہ کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اس مختصر اشارے کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں ریاکاروں کے چہرے اور ان کے اعمال کے نتائج پر نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات کو باطل نہ کرو، اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنے مال میں سے انفاق کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے عمل کی مثال پتھر جیسی ہے جس پر مٹی (کی معمولی سی تہہ) ہے (اور اس میں بیج بکھیر دیئے گئے ہوں) اور اس پر بارش پڑے تو سب کچھ صاف ہو جائے۔ وہ اپنے اعمال کا کچھ نتیجہ حاصل

نہیں کرتے اور اللہ ان کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (بقرہ: ۲۶۴)

۲۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

''جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے، وہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔'' (کہف: ۱۱۰)

۳۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

''منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور وہ انہیں دھوکا دیتا ہے، جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر سستی چھائی ہوئی ہوتی ہے، وہ ریا کاری کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔'' (نسا: ۱۴۲)

۴۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خود خواہی اور خود نمائی کی خاطر اپنے گھروں سے نکلے۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اس پر محیط ہے۔'' (انفال: ۴۷)

۵۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴿۶﴾ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿۷﴾

''ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ جو ریا کرتے ہیں اور ضروریاتِ زندگی استعمال کیلئے نہیں دیتے۔'' (ماعون: ۴، ۷)

تفسیر

پہلی آیت میں احسان جتلانے والے، اذیت پہنچانے والے اور ریا کاری کرنے والے ایک ہی زمرے میں شمار کئے گئے ہیں اور ان سب کو صدقات کی بربادی کا سبب قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسا شخص اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس لئے کہ ایسے افراد کو ان لوگوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے:

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ

آیت کے ذیل میں ایک بہت دلنشین مثال کے ذریعے ایسے افراد کی حالت کو بیان کیا گیا ہے:

''ان کے اعمال کی مثال ایک پتھر جیسی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہہ ہو (اور اس میں بیج بکھیر دیئے گئے ہوں)، اس پر زوردار بارش آئے (اور ساری مٹی اور بیجوں کو بہا کر لے جائے) اور صاف پتھر باقی رہ جائے۔''

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

یقیناً ایسے افراد کو ان کے کاموں کا کوئی نتیجہ نہیں ملتا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۴

اس آیت میں ایک لطیف اشارے کے ذریعے ریاکاروں کو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے کافر قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے اعمال کو کھوکھلا اور بے بنیاد قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اپنے اعمال کی تخم ریزی ریا کی کھیتی میں کی، جس میں نشوونما کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ وہ خود ایک پتھر کی مانند ہیں جس پر مٹی کی ہلکی سی تہہ موجود رہے اور وہ کسی بیج کی پرورش کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بے شک ان کے دل پتھروں کی مانند ہیں اور ان کی روح پر کسی اچھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال بغیر جڑوں کے درخت کی مانند اور ان کی نیتیں آلودہ ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس آیت کے بعد اگلی آیت میں خالصین اور مخلصین کے اعمال کو سرسبز اور پر برکت باغوں سے تشبیہ دی گئی ہے جن میں اچھے بیج اور پودے لگائے گئے، مناسب بارش، دھوپ اور ہوا سے ان کی پرورش کی گئی اور اس میں بکثرت پھل پیدا ہوئے۔

دوسری آیت میں رسولؐ اللہ کو مخاطب کر کے حکم دیا جا رہا ہے کہ خالص توحید کو اسلام کی بنیاد اور اساس کی حیثیت سے لوگوں سے متعارف کروائیں:

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ

''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں تم جیسا انسان ہی ہوں، (مجھ میں اور تم میں صرف اس بات کا فرق ہے) کہ میری طرف وحی آتی ہے اور تمہارا معبود صرف ایک ہے۔'' (کہف:۱۱۰)

اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال ہر لحاظ سے خالص ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۝۱۱۰

''جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے، وہ عمل صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔''

اس آیت کی رو سے عبادت میں شرک کرنا بھی توحید کی بنیادوں کو تباہ کر دیتا ہے اور عقیدۂ آخرت کی بھی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر جنت میں داخل ہونے کا اجازت نامہ عمل خالص ہے۔

اس آیت کے شانِ نزول میں آیا ہے کہ جندب بن زہیر نامی ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اپنے اعمال اللہ کیلئے انجام دیتا ہوں اور میرا مقصد اس کی رضا کا حصول ہے لیکن جب لوگوں کو میرے اچھے کاموں کا علم ہوتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

رسولؐ اللہ نے اس کی بات سن کر فرمایا:

ان اللہ طیب ولا یقبل الا الطیب ولا یقبل ما شورك فیه

''اللہ تعالیٰ طیب ہے اور اعمال طیب کو ہی قبول کرتا ہے، جس عمل میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے، اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔'' (تفسیر قرطبی، ۶:۱۰۸ ۴)

اسی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں ایک اور واقعہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کو پسند کرتا ہوں مگر میری یہ خواہش ہے کہ لوگ بحیثیت مجاہد میرے مقام کو جانیں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

اس قسم کے اور بھی واقعات اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بیان کئے گئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان اعمال کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں اللہ کی خوشنودی کے علاوہ دیگر اہداف بھی پیش نظر تھے۔ اس آیت میں ریا کار کو ایسا مشرک قرار دیا گیا ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

من صلی یرائی فقد اشرك و من صام یرائی فقد اشرك و من تصدق یرائی فقد اشرك ثم قرء فمن كان یرجو القاء ربه.....

''جس نے نماز پڑھی اور ریا کیا، اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا اور ریا کیا، اس نے شرک کیا۔

پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

(المیزان ۱۳:۷۰ ۴ بحوالہ درالمنثور)

تیسری آیت میں ریا کو منافقین کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں

جبکہ اللہ ان کو دھوکا دیتا ہے۔ جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان پر سستی چھائی ہوئی ہوتی ہے، وہ لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں:

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ نفاق ظاہر و باطن کے اختلاف کا نام ہے جبکہ ریا کاری بھی ظاہر و باطن کا اختلاف ہوتی ہے، اس لئے کہ عمل ظاہراً الٰہی ہوتا ہے لیکن اس کا باطن شیطانی اور ریا کارانہ ہوتا ہے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ریا کاری کو منافقین کا عمل کہنا بالکل سیدھی سی بات ہے۔

چوتھی آیت میں ریا کار کے اعمال کو اللہ اور آخرت پر ایمان سے محروم شیطان کے ساتھی کا عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ لوگوں کو دکھانے کیلئے اپنا مال نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان ان کا ساتھی اور ہم نشین ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو، اس کا ساتھی بہت برا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

اس آیت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کفار جیسا طرزِ عمل اپنانے سے منع فرما رہا ہے ''جو خود پرستی اور خودنمائی کے جذبے سے جنگ کیلئے گھروں سے نکلے۔ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اللہ ان کے اعمال پر محیط ہے۔''

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

آیت کے اندرونی قرائن اور مفسرین کے بیانات کے مطابق یہ آیت قریش کے سپاہیوں کے بارے میں ہے جو جنگ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کیلئے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ مکہ سے نکلتے وقت لہو ولعب کے آلات، گانا گانے والے اور شراب بھی ساتھ لئے ہوئے تھے۔ ان کی حالت سے خود پرستی اور خودنمائی اس قدر واضح تھی کہ اگر وہ بت پرستی کا دعویٰ کرتے تھے تو وہ ریا کارانہ تھا۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ چونکہ بدر عربوں کے تجارتی میلے کی جگہ تھی اور مشرکین سال کے دوران جب بھی وہاں جاتے تو ان کی، خاص طور پر ابوجہل کی، کوشش ہوتی کہ عیاشی کا سامان اپنے ساتھ لے جائے تاکہ وہاں اپنے جاننے والوں کے سامنے اپنی برتری کا اظہار کر سکے۔

بہرصورت قرآن شریف مسلمانوں کو ایسے کاموں سے منع فرما رہا ہے اور انہیں حکم دے رہا ہے کہ تقویٰ اور اخلاص کو اپنا کر

اپنی تمام مشکلات پر غلبہ حاصل کریں اور میدانِ بدر میں ریاکاروں اور خود پرستوں کا جو انجام ہوا، اس سے عبرت حاصل کریں۔

آخری آیت میں بھی ایک اور انداز سے ریاکاری کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہلاکت ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو ریا کرتے ہیں اور استعمال کی چیزیں لوگوں کو نہیں دیتے۔''

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝٤ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝٥ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝٦ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝٧

قرآن مجید میں ''ویل'' کا لفظ ۲۷ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ خطرناک اور سنگین گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ ریاکاروں کیلئے اس لفظ کا استعمال ریاکاری کے گناہ کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ریا کس قدر قبیح اور گھناؤنا گناہ ہے اور انسان کی سعادت کی راہ میں سنگین خطرات کا باعث ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ریاکاری تہذیب نفس اور تطہیر قلب وروح کیلئے ایک اہم رکاوٹ ہے اور اس کا نقطۂ مقابل اخلاص اور پاکیزگی قلب ہے۔

ریا احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ریا کے مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اسے خطرناک ترین گناہ قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

اخوف ما اخاف علیکم الریا و الشهوة الخفية

''سب سے زیادہ خوفناک چیز جس سے میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں، ریاکاری اور خفیہ شہوت ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

ظاہراً خفیہ شہوت سے مراد ریاکاری کے مخفی محرکات ہیں۔

۲۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے:

ادنی الریاء شرك

یعنی ''ریا کا ادنیٰ ترین درجہ بھی شرک ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۳۔ ایک اور حدیث میں آپؐ ہی سے مروی ہے:

لا یقبل اللہ عملا فیہ مقدار ذرۃ من ریاء

''جس عمل میں ذرہ بھر ریا ہو، اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۴۔ آنحضرتؐ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

ان المرائی ینادی علیہ یوم القیامۃ فاجر یا غادر یا مرائی ضل عملك و حبط اجرك اذھب فخذ اجرك ممن کنت تعمل لہ (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

''قیامت کے دن ریا کار کو آواز دی جائے گی: اے فاجر! اے فریب کار! اے ریا کار! تیرے اعمال کھو گئے۔ تیرا اجر برباد ہو گیا۔ جا! اپنے اعمال کا اجر انہیں سے لے جن کیلئے تو نے عمل کیا تھا۔''

۵۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ کو روتے ہوئے دیکھا، عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپ کیوں گریہ کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

انی تخوفت علی امتی الشرك، اما انھم لایعبدون صنما ولا شمسا ولاقمر او لاحجرا، ولکنھم یراؤن باعمالھم

''میں اپنی امت کے بارے میں شرک سے خائف ہوں۔ وہ کسی بت، سورج، چاند یا پتھر کو نہیں پوجیں گے لیکن اپنے اعمال میں ریا کاری کریں گے۔'' (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

۶۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں: (محجۃ البیضاء، ۶:۱۴۱)

ان الملك لیصعد بعمل العبد مبتھجا بہ فاذا صعد بحسناتہ یقول اللہ عزوجل اجعلوھا فی سجین انہ لیس ایای ارادبھا

''فرشتہ کسی شخص کے عمل کو خوشی کے ساتھ اوپر لے جاتا ہے، جب وہ اس کی نیکیاں لے کر اوپر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انہیں جہنم میں ڈال دو، اس نے یہ اعمال میرے لئے انجام نہیں دیئے۔''

۷۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

یقول اللہ سبحانہ انی اغنی الشرکاء فمن عمل عملا ثم اشرك فیہ غیری فانا منہ بریء وھو للذی اشرك بہ دونی

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرکاء سے بے نیاز ہوں۔ جو کوئی کسی عمل کو انجام دے اور میرے سوا کسی اور کو اس میں شریک کرے، میں اس عمل سے بیزار ہوں اور یہ عمل اس کیلئے ہے جسے شرک قرار دیا گیا

ہے۔‘‘(میزان الحکمہ ،۲:۱۰۱۷)

رسولؐ اللہ سے مروی یہ سات احادیث، جو انتہائی بامعنی اور جھنجھوڑ دینے والی ہیں، اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آثار ونتائج، جو فرد، معاشرے، جسم اور روح پر مرتب ہوتے ہیں، بہت ہی برے ہیں۔

آئمہ معصومین سے بھی اس سلسلہ میں ہلا دینے والی روایات موجود ہیں:

۸۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

سیاتی علی الناس زمان تخبث فیه سرائرهم وتحسن فیه علانیتهم خوف یعمهم الله بعقاب فیدعونه دعاء الغریق فلا یستجیب لهم

’’لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب ان کا ظاہر حسین اور باطن آلودہ ہوگا۔اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ دنیا کی طمع میں گرفتار ہو جائیں گے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی خواہش نہیں کریں گے۔ان کا دین ریاکاری ہوگا، ان کے دلوں میں خوفِ خدا نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب پھیلا دے گا، پھر وہ اسے اس طرح پکاریں گے جیسے ڈوبنے والا پکارتا ہے لیکن ان کی دعا قبول نہ ہوگی۔‘‘(اصولِ کافی، ۲:۲۹۵)

۹۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

کل ریاء شرك انه من عمل للناس کان ثوابه علی الناس ومن عمل لله کان ثوابه علی الله

’’ہر ریا شرک ہے۔جو شخص لوگوں کیلئے عمل کرتا ہے، اس کا اجر بھی لوگوں کے ذمہ ہے۔جو شخص اللہ کیلئے عمل کرتا ہے، اس کا اجر بھی اللہ کے ذمہ ہے۔‘‘(اصولِ کافی ۲:۲۹۳)

۱۰۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

المرائی ظاهره جمیل وباطنه علیل.....

’’ریاکار کا ظاہر خوبصورت اور باطن بیمار ہوتا ہے۔‘‘(امالی صدوق:۳۹۸،غرر الحکم:۱:۶۰)

اس سلسلہ میں رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ سے بکثرت احادیث پائی جاتی ہیں۔

ریا کی حرمت کا فلسفہ

شاید ظاہر بین افراد ریا اور اس کے وحشت ناک آثار کے بارے میں یہ احادیث دیکھ کر حیرت زدہ ہو جائیں اور یہ سوچنے لگیں کہ اگر انسان کا عمل اچھا ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی نیت کیا ہو! فرض کریں ایک انسان ہسپتال یا مسجد، سڑک، پل یا کوئی ایسی چیز بنوائے جس سے عوام الناس کو فائدہ ہو تو اس کی نیت جیسی بھی ہو، لوگوں کو اس کے عمل کا فائدہ تو پہنچ رہا ہوتا ہے۔

یہ طرزِ فکر ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس لئے کہ ہر عمل اپنے اندر دو قسم کے اثرات رکھتا ہے: ایک اثر خود اس کے کام کے انجام دینے والے پر اور دوسرا لوگوں پر۔ ریا کار اپنے ریا کارانہ عمل کے ذریعے اپنے باطن کو ویران کر دیتا ہے اور توحید کے عظیم الشان مقام سے دور ہو کر شرک کی گھاٹیوں میں جا گرتا ہے۔ وہ لوگوں کو عزت کا سبب سمجھنے لگتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے۔ یہ ریا کاری ایک قسم کی بت پرستی ہے جو بہت سی اخلاقی برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ ریا کاری کی بنیاد پر انجام پانے والا عمل معاشرے کیلئے بھی نقصان کا سبب ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ریا کار شخص عمل کے باطن اور حقیقت کی بجائے اس کے ظاہر پر توجہ دیتا ہے، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی بہبود کیلئے کیا جانے والا کام لوگوں کیلئے عذاب بن جاتا ہے اور اس سے ناقابل تلافی نقصانات بھی رونما ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں جو معاشرہ ریا کاری کا عادی ہو جاتا ہے، وہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس معاشرے کی سیاست، معیشت، ثقافت، دفاع، غرضیکہ ہر چیز کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ ظاہر پر قناعت ہو رہی ہوتی ہے اور کوئی بھی معاشرے کی خیر و سعادت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ ہر شخص انہی کاموں کے پیچھے پڑا رہتا ہے جس کا ظاہر خوبصورت ہوتا ہے۔ اس طرزِ فکر و عمل سے معاشرے کی ساخت پر جو زد پڑتی ہے، وہ کسی عقلمند پر پوشیدہ نہیں ہے۔

ریا کاروں کی علامات

مندرجہ بالا احادیث اور ان جیسے دیگر سخت بیانات پڑھ کر بہت سے لوگ ریا اور ریا کار کی شناخت کے بارے میں وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات بالکل بجا ہے کہ انسان ریا کے بارے میں سخت گیری کرے، اس لئے کہ ریا انتہائی پر اسرار طور پر انسان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ ممکن ہے انسان سالہا سال تک ایک عمل کو انجام دیتا رہے اور کئی سالوں کے بعد اسے معلوم ہو کہ اس کے عمل کی ساری عمارت ریا کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

لیکن اس کے باوجود انسان کو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے اور افراط و تفریط سے بچنا چاہئے۔ ریا کو اس کی علامات کی روشنی میں سمجھنا اور پہچاننا چاہئے اور خوامخواہ کے وسوسوں سے بچنا چاہئے۔

علمائے اخلاق نے اس سلسلہ میں بہت اچھی مباحث کی ہیں۔ مرحوم فیض کاشانی نے محجۃ البیضاء میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر

کوئی عالم یا واعظ یہ جاننا چاہے کہ وہ اپنے مواعظ میں مخلص ہے، ریا کار نہیں ہے تو کیا کرے؟

پھر وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اس بات کی کئی علامات ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس سے بہتر واعظ، جس کی مقبولیت اور علم بھی زیادہ ہو، معاشرے میں پیدا ہو جائے تو وہ خوش ہو اور حسد کے جذبات اس کے دل میں پیدا نہ ہوں، ہاں! رشک اور چیز ہے کہ وہ اس جیسا یا اس سے بہتر بننے کی آرزو کرے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر معاشرے کی بڑی اور معتبر شخصیات اس کی مجلس میں ہوں تو اس کے بولنے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ ان کی توجہ حاصل کرنے کیلئے اس کا انداز نہ بدلے بلکہ سب حاضرین کو ایک نظر سے دیکھے۔

ایک اور نشانی یہ ہے کہ اگر گلی یا بازار میں چلتے وقت اس کے سامعین یا ارادتمندوں کی ایک جماعت اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہو تو اس سے اسے خوشی نہ ہو۔ (محجۃ البیضاء، ۶:۲۰۰)

ریا کارانہ اور غیر ریا کارانہ اعمال کا فرق جاننے کیلئے بہترین کسوٹی وہی ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہے:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

اما علامة المرائی فاربعة: یحرص فی العمل لله اذا کان عنده احد ویکسل اذا کان وحده ویحرص فی کل امره علی المحمدة ویحسن سمته بجهده

''ریا کار کی چار علامات ہیں اگر کوئی اس کے پاس موجود ہو تو عمل کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے، جب تنہا ہوتا ہے تو عمل میں سستی کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے ہر کام پر اس کی تعریف کریں اور ہر لحاظ سے اپنے ظاہر کو بہتر بنانے میں لگا رہتا ہے۔'' (تحف العقول: ۱۷)

۲۔ ایک اور حدیث میں یہی بات امیر المومنین علیہ السلام نے ذرا مختلف انداز میں بیان کی ہے:

للمرائی اربع علامات:

یکسل اذا کان وحده وینشط اذا کان فی الناس و یزید فی العمل اذا اثنی علیه وینقص منه اذا لم یثنی علیه (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۲:۱۰۸)

''ریا کار کی چار علامات ہیں:

اکیلا ہو تو سستی کے ساتھ عمل کرتا ہے، لوگوں کے درمیان ہو تو نشاط و تازگی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کی تعریف کی جائے تو اس کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے اور تعریف نہ کی جائے تو اس کا عمل کم ہو جاتا ہے۔''

مختصر یہ کہ ہر وہ کام جو لوگوں کی نظر میں زیادہ خوبصورت اور پرکشش بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جائے، اس میں ریاکاری کا جذبہ داخل ہو جانے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ یہ محرک خواہ کتنا ہی پوشیدہ اور مخفی کیوں نہ ہو، خلوت وجلوت میں عمل کی انجام دہی کی کیفیت کے مختلف ہونے کی مدد سے آشکار ہو جاتا ہے۔

یہ بات اس قدر مرموز اور پراسرار ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے ضمیر کو فریب دینے کیلئے خلوت میں اپنے عمل کو بہتر بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے تاکہ اسے جلوت میں پرکشش بنانے کا جواز حاصل کر سکے۔ اس صورت میں جلوت میں انجام دیئے جانے والے عمل کے ساتھ خلوت میں انجام دیا جانے والا عمل بھی ریا سے آلودہ ہو جاتا ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں افراط وتفریط سے بچنا ضروری ہے۔ اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ ریاکاری سے بچنے کیلئے نمازِ باجماعت اور منبر سے درس یا وعظ کہنا ترک کر دیتے ہیں۔

احادیث میں بھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی عمل انجام دے اور لوگوں کو اس کا علم ہونے پر وہ شخص خوش ہو تو اس کے عمل کی صحت اور قربت الٰہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر اس نے ابتداء میں اس کام کو اللہ کیلئے انجام دیا ہو۔ (وسائل الشیعہ :۱:۵۵)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیک لوگوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کسی محفل میں یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے کسی کی نیکی کی تشہیر کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ بزرگوں کی سیرت یہ رہی ہے کہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں۔ اس طرح سے عمل کو انجام دینے والے کا اجر بھی ضائع نہیں ہوتا، بشرطیکہ ابتداء میں اس کی نیت خالص ہو۔

قرآنی آیات میں متعدد مقامات پر پوشیدہ اور دکھا کر صدقہ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان لوگوں کو دکھا کر عمل کرے اور اس کا عمل ریا سے محفوظ بھی ہو۔

قرآن مجید کی پانچ آیات میں انفاق کو "سرا و علانیۃ" یا "سرا وجھرا" انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان دونوں کے معنی ہیں "پوشیدہ وآشکار" (بقرہ:۲۷۴، رعد:۲۲، ابراہیم:۳۱، نحل:۷۵، فاطر:۲۹)

بنیادی طور پر بعض اسلامی عبادات کو لوگوں کی موجودگی میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے جیسے نماز جمعہ، حج، نمازِ جنازہ اور جہاد وغیرہ۔ اگر انسان وسوسوں کا شکار ہو جائے تو وہ ان سب کو ترک کر دیتا ہے۔

ریا کا علاج

تمام ناپسندیدہ اعمال واخلاق کے علاج کی طرح ریا کا علاج بھی دو طرح سے کیا جا سکتا ہے:

ایک یہ کہ اس کے اسباب وعوامل کی طرف توجہ کر کے ان کا خاتمہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کے خطرناک منفی نتائج پر غور کیا جائے جو اس برائی سے آلودہ افراد کو پیش آ سکتے ہیں۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ریا کا بنیادی وجہ "شرکِ افعالی" اور "حقیقت توحید سے غفلت" ہے۔ اگر ہمارے اندر توحید افعالی

کی بنیادیں مضبوط ہوں اور ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ عزت، ذلت، رزق اور نعمتیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے دل بھی اس کے اختیار میں ہیں تو ہم کسی طور پر بھی این وآن کی پسند کی خاطر اپنے اعمال کو ریا سے آلودہ نہیں کریں گے۔

اگر ہمیں یقین ہو کہ جو اللہ کے ساتھ ہے، اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور جو اللہ سے دور ہوتا ہے، اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا:

اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَـكُمۡ ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور اگر اللہ تم کو چھوڑ دے تو کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔'' (آل عمران:۱۶۰)

اسی طرح ہمیں یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہئے:

اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۳۹﴾

''اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرنے والے ان کے پاس عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ہر قسم کی عزت تو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔'' (نساء:۱۳۹)

اگر ان چیزوں پر ایمان ہمارے دل وجان کی گہرائی میں اتر جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے کوئی عمل انجام دے یا ان کی نظر میں عزت اور اعتماد حاصل کرنے کیلئے اپنے اعمال کو ریا سے آلودہ کرلے۔

بعض علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ ریا کی بنیادی وجہ حب جاہ ومقام ہے۔ اگر اس بات کو کھولا جائے تو تین چیزیں سامنے آتی ہیں: لوگوں کی طرف سے تعریف کی خواہش، لوگوں کی طرف سے مذمت سے فرار اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اس کی طمع۔

اس کے بعد وہ ایسے شخص کی مثال بیان کرتے ہیں جو اس لئے جہاد پر جاتا ہے کہ لوگ اس کی بہادری کی باتیں کریں یا اس لئے جہاد کرتا ہے کہ لوگ اسے بزدل نہ کہیں، یا اس لئے جہاد کرتا ہے تاکہ مال غنیمت حاصل کرسکے۔ صرف وہی شخص اپنے جہاد کا صحیح ثمر حاصل کرسکتا ہے جو اللہ کے دین کی حفاظت اور سربلندی کیلئے دشمنانِ دین سے جنگ کرے۔

دوسری طرف سے اگر انسان ریاکاری کے خطرناک نتائج پر غور کرے کہ ریا ایک ایسی آگ ہے جو انسان کے اعمال کو جلا کر راکھ کردیتی ہے، صرف اس کی عبادت کو تباہ وبرباد نہیں کرتی بلکہ ایسا گناہ بھی ہے جو دنیا اور آخرت میں انسان کو رسوا کر دیتا ہے۔ ریا ایک دیمک ہے جو انسان کی سعادت کے محل کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیتی ہے۔ ریا ایک قسم کا کفر ونفاق اور شرک ہے۔ ریاکاری انسان کی شخصیت کو تباہ کردیتی ہے اور اسے حقیقی آزادی اور احترام سے محروم کردیتی ہے۔ قیامت کے دن اسے بدبخت ترین انسان بنادیتی ہے۔

اگر ان باتوں کی طرف توجہ کی جائے تو ان کا مثبت اثر ضرور ظاہر ہوگا اور ریاکار ریا سے رک جائے گا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ریا سے آلودہ نیتوں کو زیادہ عرصہ تک چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ ریا کاروں کی قلعی عام طور پر اسی دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہ ذلیل ورسوا ہو جاتے ہیں۔ ان کی باتوں سے ریا کی آلودگی ظاہر ہوتی رہتی ہے جس سے لوگوں کی نظروں سے ان کی عزت جاتی رہتی ہے۔ اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنے سے بھی انسان ریا سے رک سکتا ہے۔

خالص عمل سے انسان کو جو روحانی اور معنوی لذت حاصل ہوتی ہے، اس کا موازنہ کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات نیت کو خالص بنانے کیلئے کافی ہے۔

بعض علمائے اخلاق نے کہا ہے کہ ریا کے علاج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی عبادات اور نیکیوں کو پوشیدہ رکھنے کا اہتمام کرے تا کہ آہستہ آہستہ یہ بات ایک پختہ عادت بن جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ جمعہ، جماعت، حج اور دیگر اجتماعی عبادات میں شرکت سے گریز کرنے لگے کیونکہ یہ بھی ایک بہت بڑا نقصان ہے۔

کیا عبادت میں نشاط خلافِ اخلاص ہے؟

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کسی عبادت کو اچھی طرح سے انجام دینے کے بعد سرور اور نشاط محسوس کرے تو کیا یہ ریا کاری کی علامت نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس سرور و نشاط کا سبب اللہ کی دی ہوئی توفیق عمل اور عمل سے حاصل ہونے والی نورانیت اور روحانیت ہو تو یہ اخلاصِ نیت کے منافی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس نشاط کی وجہ یہ ہو کہ لوگوں نے اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ خلوص کے منافی ہے۔ اگرچہ اس سے عمل باطل نہیں ہوتا، بشرطیکہ لوگوں کے مشاہدہ کی وجہ سے وہ اپنے عمل کی مقدار اور معیار میں تبدیلی نہ لائے۔

احادیث میں بھی یہ بات بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ان کے ایک صحابی نے سوال کیا کہ اگر ایک شخص کوئی عمل انجام دے رہا ہو اور کوئی دوسرا اسے دیکھ رہا ہو جس سے عمل کرنے والے کو خوشی ہو تو کیا یہ خلوص نیت کے خلاف ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

لاباس، مامن احد الا وهو يحب ان يظهر له في الناس الخير اذا لم يكن صنع ذلك لذلك!

''کوئی حرج نہیں ہے، ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عمل خیر لوگوں میں معروف ہو (اور لوگ اسے ایک نیک آدمی کے طور پر پہچانیں) بشرطیکہ عمل کو انجام دینے کا مقصد یہ نہ ہو۔''

(وسائل الشیعہ، ۱:۵۵)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس سے ملتا جلتا سوال رسولؐ اللہ سے کیا کہ اگر کوئی انسان کوئی عمل

قربِ الٰہی کے حصول کی نیت سے انجام دے اور لوگ اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے اچھا سمجھنے لگیں تو یہ کیسا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

تلك عاجل بشری المومن

''یہ ایک بشارت ہے جو اللہ اس دنیا میں مومن کو دیتا ہے۔''

ریا اور سمعہ کا فرق

یہاں ایک اور سوال رونما ہوتا ہے کہ ریا اور سمعہ میں کیا فرق ہے؟ آیا یہ دونوں خلوص نیت کے خلاف اور بطلانِ عمل کا موجب ہوتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ریا یہ ہے کہ انسان کسی عمل کو اس طرح انجام دے کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس طرح لوگوں کی نظر میں اس کا مقام و مرتبہ اونچا ہو جائے۔ لیکن سمعہ یہ ہے کہ انسان اپنا عمل تو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ انجام دے تا کہ بعد میں اسے لوگوں کو سنا سکے اور معاشرے میں اس کا مقام و مرتبہ اونچا ہو جائے۔ ان دونوں اعمال کا محرک غیر الٰہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ریا میں عمل لوگوں کو دکھایا جاتا ہے اور سمعہ میں عمل لوگوں کو سنایا جاتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں عمل باطل ہوتا ہے۔

لیکن اگر سمعہ کی تشریح اس طرح کی جائے کہ انسان کسی عمل کو قصد قربت الٰہی کی نیت سے انجام دیتا ہے، بعد میں جب لوگ اس کے اس عمل کے بارے میں سنتے ہیں تو اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس حالت میں یقیناً عمل باطل نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی عمل کو مقصد قربت سے انجام دے اور بعد میں یہ سوچنے لگے کہ اپنے عمل کا چرچا کر کے شہرت اور عزت حاصل کرے (اس عمل کو ریا بعد از عمل کہتے ہیں)، تو اس سے عمل تو باطل نہیں ہوتا لیکن اس کی قدر و قیمت ضرور کم ہو جاتی ہے اور یہ اخلاقی انحطاط کا سبب بھی بنتا ہے۔

بعض فقہائے بزرگ نے انسان کے عمل میں ریا کاری کے داخل ہونے کی دس صورتیں بیان کی ہیں:

۱۔ اس کے عمل کا مقصد اور نیت ہی یہ ہو کہ عمل لوگوں کو دکھانے کیلئے کیا جائے۔ ایسی صورت میں عمل یقیناً باطل ہوگا۔

۲۔ اس کے عمل کا مقصد قربِ الٰہی بھی ہو اور ریا کاری بھی۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۳۔ اعمال کے بعض اجزا کو مثلاً نماز میں رکوع یا سجدے کو ریا کاری کیلئے انجام دے۔ اس صورت میں بھی عمل باطل ہے، اگرچہ اس جزو کے تدارک کی فرصت ابھی باقی ہو۔ اسی لئے بعض فقہاء نے نماز کے دوران ریا کو نماز کے دوران وضو ٹوٹ جانے سے تشبیہ دی ہے۔ اگرچہ اس میں احتیاط یہ ہے کہ ریا زدہ جزو کو دوبارہ انجام دیا جائے اور بعد میں نماز کو دوبارہ پڑھا جائے۔

۴۔ کسی مستحب جزو مثلاً دعائے قنوت وغیرہ میں ریا کرنا۔ اس کو بھی بطلانِ عمل قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ عمل اللہ کیلئے انجام دیا گیا ہولیکن ایسی جگہ یا مسجد وغیرہ میں انجام دیا گیا ہو جس کا محرک الٰہی نہ ہو۔اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۶۔ عمل اللہ کیلئے ہولیکن ایسے وقت میں انجام دیا جائے جس کا محرک الٰہی نہ ہو، مثلاً کوئی شخص اول وقت میں نماز ادا کرتا ہے، نماز تو اللہ کیلئے ادا کرتا ہے لیکن اول وقت کے معاملہ میں ریا کرتا ہے۔اس صورت میں بھی عمل باطل ہے۔

۷۔ عمل کی بعض خصوصیات میں ریا کاری کرنا مثلاً کوئی شخص نماز تو اللہ ہی کیلئے ادا کرتا ہے لیکن اس کے خشوع اور خضوع کی کیفیت میں ریا کاری کرتا ہے۔اس صورت میں بھی عمل باطل ہے کیونکہ یہ صفات عمل سے جدا نہیں ہیں۔

۸۔ عمل اللہ کیلئے انجام دیا جائے لیکن اس کے بعض مقدمات میں ریا کاری کی جائے۔مثال کے طور پر کوئی شخص مسجد میں اللہ کی خوشنودی کیلئے نماز ادا کرتا ہے لیکن اس کے مسجد کی طرف جانے میں ریا کاری پائی جاتی ہے۔اکثر فقہاء اس ریا کو عمل کے باطل ہونے کا سبب نہیں سمجھتے اور فقہی قاعدے کا بھی یہی تقاضا ہے۔

۹۔ عمل کی بجائے عمل کے بعض بیرونی اوصاف میں ریا کرنا، مثلاً یہ کہ انسان نماز اللہ کیلئے ادا کرے لیکن عمامہ باندھنے وغیرہ میں ریا کاری کرے۔یہ عمل اگرچہ مذموم ہے لیکن اس سے اصل عمل باطل نہیں ہوتا۔

۱۰۔ عمل اصل میں اللہ کیلئے انجام دیا جائے لیکن اگر لوگ دیکھ رہے ہوں تو اس سے عمل انجام دینے والے کو خوشی ہو مگر اس سے عمل کی کیفیت اور کمیت پر کوئی فرق نہ پڑے، اس سے بھی عمل باطل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں یہ ریا ہی نہیں ہے، اس لئے کہ ریا کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کو انجام دینے کا بنیادی مقصد ہی لوگوں کو دکھانا ہو۔

ریا کے بارے میں اس بحث کو ہم یہاں پر ختم کرتے ہیں۔اگرچہ اس بارے میں اور بھی مباحث ہیں لیکن طوالت سے پرہیز کی خاطر ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

خاموشی اور اصلاحِ زبان

بہت سی احادیث میں ان دو چیزوں کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور انہیں غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔علمائے اخلاق کی نظر میں بھی ان دونوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ سالکانِ راہِ حق خاموشی کے بغیر اور زبان کے گناہوں سے اجتناب کے بغیر کوئی پیش رفت نہیں کر سکتے، خواہ مختلف اقسام کی دوسری جسمانی اور روحانی عبادتیں اور ریاضتیں کرتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر تہذیبِ نفس اور سیر الی اللہ کی وادی میں داخل ہونے کی کنجی خاموشی اور اصلاحِ زبان ہیں۔جو لوگ اس مرحلہ میں ناکام ہو جائیں، وہ اعلیٰ روحانی منازل سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس تعارفی اشارے کے بعد ہم قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیتے ہیں۔

جب حضرت مریمؑ دردِزہ کی تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہی تھیں اور وہ آبادی سے دور ایک خشک بیابان میں تھیں، اس کے

علاوہ بچے کی پیدائش کے بعد لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا خوف ان پر چھایا ہوا تھا، ان کی اس کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس حالت میں موت کی آرزو کر رہی تھیں۔ اس حالت میں اچانک انہوں نے یہ آواز سنی:

''غمگین نہ ہو، ہم نے تمہارے پاؤں کے نیچے چشمہ جاری کر دیا ہے اور اللہ کے حکم سے کھجور کا خشک درخت پھلدار ہو گیا ہے۔ اس پھل میں سے کھاؤ اور پانی میں سے پیو اور اپنی آنکھیں اس نومولود بچے سے ٹھنڈی کرو۔ جب بھی تم کسی انسان کو دیکھو جو اس بارے میں تم سے وضاحت طلب کرے تو اشارے سے کہہ دو کہ میں نے رحمن کیلئے روزہ رکھا ہوا ہے اور آج میں کسی انسان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔'' (مریم: ۲۳ تا ۲۶)

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

اس آیت میں اگرچہ کئی چیزیں غور طلب ہیں لیکن جو بات ہمارے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت مریمؑ کو خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ منت کسی ایسی چیز کی ہی مانی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو۔ بنابرایں اس آیت میں خاموشی کا روزہ اللہ کا پسندیدہ عمل تھا۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں خاموشی کا روزہ لوگوں کے درمیان ایک جانا پہچانا عمل تھا۔ لہٰذا جب انہوں نے اشارے سے بتایا کہ انہوں نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے تو کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔

اسلام میں زمان و مکان کی شرائط مختلف ہونے کی وجہ سے خاموشی کا روزہ حرام ہے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

وصوم الصمت حرام

یعنی ''خاموشی کا روزہ حرام ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۷: ۳۹۰)

یہی بات امیر المومنین علیہ السلام کی نصیحتوں میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولا صمت یوما الی اللیل

یعنی ''اسلام میں صبح سے رات تک خاموشی کا روزہ نہیں ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۷: ۳۹۰)

البتہ اسلام میں مکمل روزے کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ انسان روزہ کی حالت میں اپنی زبان کو ان باتوں سے

آلودہ نہ کرے جنہیں گناہ قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح ضروری ہے کہ روزے کے دوران انسان اپنی آنکھوں اور کانوں کو گناہ سے آلودہ نہ ہونے دے۔ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الصوم لیس من الطعام والشراب وحدہ ان مریم قالت انی نذرت للرحمان صوما ای صمتا فاحفظوا السنتکم وغصوا ابصارکم

''روزہ صرف کھانے پینے سے اجتناب کا نام نہیں ہے۔حضرت مریمؑ نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں نے اللہ کیلئے (خاموشی) کا روزہ رکھا ہوا ہے۔لہٰذا جب تم روزے سے ہوتے ہوتو اپنی زبان اور آنکھوں کو گناہ سے محفوظ رکھو۔'' (نورالثقلین، ۳:۳۳۲)

بہرحال اس آیت اور اس کی تفسیر میں بیان ہونے والی روایت سے خاموشی کی اہمیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔اس سورۃ کی آیت ۱۰ میں بھی خاموشی کی اہمیت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔جب حضرت ذکریاؑ کو بڑھاپے میں اور بیوی کے بانجھ ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹے (حضرت یحییٰ) کی ولادت کی بشارت دی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نشانی طلب کی۔انہیں جواب ملا کہ نشانی یہ ہے کہ تمہاری زبان صحیح وسالم ہونے کے باوجود تین دن تک تم لوگوں سے بات نہ کرسکو گے (اور تمہاری زبان صرف دعا اور ذکر خدا کرسکے گی)۔

اس آیت میں اگرچہ خاموشی کی تعریف یا مذمت نہیں کی گئی ہے لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ذکریاؑ کیلئے نشانی قرار دیا جانا ہی یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ خاموشی ایک الٰہی عمل ہے۔یہی بات سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۱ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ حضرت ذکریا علیہ السلام کا لوگوں سے گفتگو نہ کرنا اختیاری عمل تھا۔ایسا نہیں تھا کہ ان کی زبان دعا اور ذکر خدا کے علاوہ کوئی بات کرنے کی قدرت ہی نہ رکھتی تھی۔بالفاظ دیگر حضرت ذکریاؑ کو تین دن کیلئے خاموشی کا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔

فخر رازی نے یہ تفسیر ابومسلم سے نقل کی ہے اور اسے عمدہ اور معقول تفسیر قرار دیا ہے۔لیکن یہ تفسیر آیت کے الفاظ کے ساتھ سازگار نہیں ہے،اس لئے کہ حضرت ذکریاؑ نے اللہ تعالیٰ سے اس بشارت کی نشانی طلب کی تھی۔ظاہری بات ہے کہ اختیاری سکوت کو ایسی نشانی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بہرحال آیت کی تفسیر میں یہ اختلافات ہمارے اس مقصد سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے کہ ازروئے قرآن خاموشی ایک پسندیدہ عمل ہے،اس لئے کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی ایک قابل قدر عمل تھا جسے ایک الٰہی نشانی قرار دیا گیا۔

خاموشی، احادیث کی روشنی میں

احادیث میں ''صمت'' یعنی خاموشی کی اہمیت پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بارے میں نہایت لطیف و ظریف نکات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے نتائج واثرات کو انتہائی دلکش اور دلنشین انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

۱۔ رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے: (بحار الانوار، ۷۵: ۳۱۲)

اذا رایتم المومن صموتا فادنوا منه فانه یلقی الحکمة و المومن قلیل الکلام کثیر العمل و المنافق کثیر الکلام قلیل العمل

''جب تم کسی مومن کو دیکھو کہ وہ زیادہ تر خاموش رہتا ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ، اس لئے کہ وہ تمہیں علم وحکمت دے گا۔ مومن باتیں کم اور عمل زیادہ کرتا ہے جبکہ منافق باتیں زیادہ اور عمل کم کرتا ہے۔''

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

دلیل العاقل التفکر و دلیل التفکر الصمت

''عاقل کی علامت غور وفکر ہے اور غور وفکر کی علامت خاموشی ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۵: ۳۱۲)

۳۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ارشاد ہے:

اکثر صمتك یتوفر فکرك و یستنر قلبك ویسلم الناس من یدك

''اپنی خاموشی کو زیادہ کرو، تمہاری فکر ترقی کرے گی اور تمہارے قلب کو نورانیت حاصل ہوگی اور لوگ تمہارے ہاتھ سے محفوظ رہیں گے۔'' (میزان الحکمہ، ۲: ۱۶۶۷)

ان روایات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ فکری ارتقاء اور خاموشی کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، اس لئے کہ انسان کی بہت سی فکری صلاحیتیں فضول اور بیہودہ باتوں میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ جب انسان خاموشی اختیار کرتا ہے تو یہ ساری توانائیاں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ فکر مصروف عمل ہو جاتی ہے اور علم وحکمت کے ابواب انسان کے دل پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں یہ بات معروف ہے کہ زیادہ باتیں کرنا کم عقلی کی نشانی ہے۔

۴۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی اہم ترین عبادت ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: (میزان الحکمہ: باب صمت)

اربع لا یصیبهن الا مومن، الصمت وهو اول العبادة.....

''چار چیزیں ایسی ہیں جو صرف مومن کو ملتی ہیں۔ خاموشی جو کہ تمام عبادات کا نقطۂ آغاز ہے.....''

۵۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

كان المسيح يقول لا تكثر الكلام فى غير ذكر الله فان الذين يكثرون الكلام فى غير ذكر الله قاسية ولكن لا يعلمون

''اللہ کے ذکر کے سوا کوئی بات زیادہ نہ کرو، جو لوگ ذکر اللہ کے سوا دوسری باتیں زیادہ کرتے ہیں، ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور انہیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۱۱۴)

۶۔ امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الصمت باب من ابواب الحكمة. ان الصمت يكسب المحبة انه دليل على كل خير

''خاموشی حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ خاموشی حصولِ محبت کا باعث ہوتی ہے اور ہر بھلائی کی راہ دکھاتی ہے۔'' (اصولِ کافی: ۲: ۱۱۳)

خاموشی کے حصولِ محبت کا ذریعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی رنجشیں اور عداوتیں زبان کے بے جا استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ خاموشی اختیار کرنے سے انسان ان قباحتوں سے بچ جاتا ہے۔

۷۔ خاموشی بہت سے گناہوں سے نجات کا ذریعہ اور جنت میں داخل ہونے کی کنجی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا:

''کیا تجھے ایک ایسی بات بتاؤں جس کے ذریعے اللہ تجھے جنت میں داخل کر دے گا؟''

اس نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! فرمایئے!''

رسولؐ اللہ نے اسے انفاق اور مشورے کے ذریعے دوستوں کی مدد کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا:

فاصمت لسانك الا من خير

''خیر کے علاوہ اپنی زبان بند رکھو۔'' (اصول کافی: ۲: ۱۱۳)

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ''اگر ان صفات میں سے ایک صفت بھی تم میں پیدا ہو جائے تو وہ تمہیں جنت میں لے جائے گی۔''

۸۔ خاموشی کے نتائج میں سے ایک مثبت نتیجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی شخصیت کو باوقار بناتی ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین

علیہ السلام فرماتے ہیں:

الصمت یکسیك الوقار، ویکفیك مونة الاعتذار

''خاموشی تمہیں وقار کا لباس پہناتی ہے اور تمہیں معذرت خواہی سے بچاتی ہے۔'' (غرر الحکم: ۱۸۲۷)

جو شخص زیادہ باتیں کرتا ہے، وہ غلطیاں بھی زیادہ کرتا ہے۔ اس سے اس کے وقار میں بھی کمی ہوتی ہے اور اسے بار بار معذرت خواہی کرنا پڑتی ہے۔

۹۔ یہی بات امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں زیادہ موثر انداز میں بیان فرمائی ہے:

ان کان فی الکلام بلاغة ففی الصمت السلامة من العثار

''اگر بات کرنے میں بلاغت ہے تو خاموشی میں سلامتی ہے۔'' (غرر الحکم، حکمت: ۳۷۱۴)

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات خاموشی کلام بلیغ سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

۱۰۔ اگرچہ اس موضوع پر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ہم امام حسن علیہ السلام کی اس حدیث کو بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں: (میزان الحکمہ، باب صمت، حدیث: ۱۰۸۲۶)

نعم العون الصمت فی مواطن کثیرة وان کنت فصیحا

''اکثر مقامات پر خاموشی اچھی مددگار ہوتی ہے، خواہ تم بات کرنے میں فصیح ہو۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ

خاموشی کے مندرجہ بالا فوائد اور مثبت نتائج کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ بات کرنا ہر مقام پر مذموم ہے اور یہ کہ انسان کو مکمل طور پر اپنے ہونٹ سی لینے چاہئیں، اس لئے کہ بذاتِ خود یہ ایک بڑی آفت ہے۔

احادیث میں خاموشی کی تعریف کرنے کا مقصد بیہودہ اور غیر ضروری گفتگو کی حوصلہ شکنی کرنا ہے ورنہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ بعض مواقع پر بات کرنا واجب اور خاموشی اختیار کرنا حرام ہے۔

یہ بات یہاں سے بخوبی واضح وعیاں ہو جاتی ہے کہ سورۂ رحمن میں ''بیان'' کو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے اور قدرتِ کلام وسخن انسان کی ایک امتیازی خصوصیت اور انسان کا ایک بڑا اعزاز ہے۔

بہت سی عبادات، جیسا کہ نماز، حج کے بعض اعمال وتلاوتِ قرآن اور ذکر الٰہی، زبان کے ذریعے ہی انجام دی جاتی ہیں۔ امر بالمعروف ونہی از منکر، علوم اسلامی ودیگر علوم واجب کی تعلیم، جاہلوں کی رہنمائی، غافلوں کو متنبہ کرنا، حق وعدالت کی طرف رہنمائی اور اس قسم کے دیگر فرائض اور کارہائے خیر صرف زبان کے ذریعے ہی انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان مواقع پر خاموش رہنا چاہئے۔ جو چیز انسان کی بدبختی کا سبب بنتی ہے، اسے قرب الٰہی کے سفر سے روک دیتی ہے اور تزکیہ نفس وتہذیب

اخلاق کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ ''فضول گفتگو'' ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں انسان اعتدال کی راہ اختیار کرے اور ہر قسم کے افراط تفریط سے محفوظ رہے۔

اس سلسلہ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی حقیقت کو مکمل طور پر آشکار کر دیتا ہے:

ایک شخص انؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''یابن رسولؐ اللہ! کلام افضل ہے یا سکوت؟''

آپؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

لكل واحد منها آفات فاذا سلما من الافات فالكلام افضل من السكوت، قيل كيف ذلك يابن رسول الله قال: لان الله عزوجل مابعث الانبياء والاوصياء بالسكوت، انما بعثهم بالكلام، ولا استحقت الجنة بالسكوت ولا استوجبت ولاية بالسكوت ولا توقيت النار بالسكوت انما ذلك كلة بالكلام، ما كنت لاعدل القمر بالشمس انك تصف فضل السكوت بالكلام و لست تصف فضل الكلام بالسكوت

''ان دونوں میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی آفات ہیں۔جب یہ دونوں آفات سے خالی ہوں تو بات کرنا خاموشی سے افضل ہے۔اس شخص نے کہا: یابن رسولؐ اللہ! کیسے؟ آپؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اوصیاء کو خاموشی کے ساتھ نہیں بل کہ کلام کے ساتھ معبوث فرمایا۔خاموشی کے ذریعے جنت ہاتھ نہیں آ سکتی، خاموشی کے ذریعے انسان ولایت الٰہی کے درجہ پر فائز نہیں ہوسکتا، خاموشی کے ذریعے انسان جہنم سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔یہ سب چیزیں کلام کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔میں ہرگز چاند اور سورج کو برابر قرار نہیں دیتا، یہاں تک کہ خاموشی کی فضیلت بھی کلام کے ذریعے ہی بیان کی جا سکتی ہے جبکہ کلام کی فضیلت کو کبھی خاموشی کے ذریعے بیان نہیں کیا جاسکتا۔''

(بحارالانوار ۶۸: ۲۷۴)

بلاشبہ کلام اور سکوت میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام اور موقع ہوتا ہے اور ہر ایک میں مثبت اور منفی پہلو پائے جاتے ہیں۔کلام کے مثبت پہلو اس کے منفی پہلوؤں سے زیادہ ہیں۔لیکن چونکہ اس کے مثبت پہلو اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب انسان کافی حد تک تہذیب نفس کے مراحل طے کر چکا ہو، اس لئے آغازِ سیر وسلوک پر خاموشی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔اس کے بعد جب سالک خواہشاتِ نفس پر غلبہ پالے اور اپنی زبان پر مسلط ہوجائے تو پھر اسے کلام کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

ہم اس بات کو اس پیمانے پر بھی پرکھ سکتے ہیں کہ اگر ہم ایک شب و روز میں کی جانے والی گفتگو کو ریکارڈ یا محفوظ کر لیں اور بعد میں ایمانداری کے ساتھ غور سے اسے سنیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس کا بہت کم حصہ الٰہی مقاصد یا زندگی کی ضروریات سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی ساری گفتگو فضول ہوتی ہے جس میں ناروا اور گناہ سے آلودہ باتیں بھی کافی ہوتی ہیں یا کم از کم مشکوک اور مشتبہ ضرور ہوتی ہیں۔

خاموشی کا مقصد غیر ضروری اور بے مقصد گفتگو اور گناہ آلود گفتگو کا سدباب کرنا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ لغت میں اگرچہ ''سکوت'' اور ''صمت'' کے ایک ہی معنی بیان کئے گئے ہیں لیکن علمائے علم اخلاق نے ان دونوں کے درمیان فرق روا رکھا ہے۔ ان کے مطابق ''سکوت'' سے مراد یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر گفتگو کو ترک کر دے جبکہ ''صمت'' کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بے مقصد اور غیر ضروری گفتگو کو ترک کیا جائے۔ سالکانِ راہِ خدا کیلئے اور تہذیب اخلاق و تزکیہ نفس کے لیے جو چیز ضروری ہے، وہ سکوت نہیں بلکہ صمت ہے۔

اصلاحِ زبان

سکوت و صمت کی اہمیت اور تزکیہ نفس پر اس کے مثبت آثار و نتائج کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ آفاتِ زبان کے سدباب کا ایک بنیادی طریقہ ہے، اس لئے کہ زبان علم و ثقافت اور عقیدہ و اخلاق کی کلید ہے۔ زبان کی اصلاح ان سب کی اصلاح اور زبان کا فساد ان سب کے فساد کا سبب ہے۔ بنابرایں اصلاحِ زبان کی بحث، خاموشی کی بحث سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

اخلاقی مباحث میں اصلاحِ زبان کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ زبان دل کی ترجمان اور عقل کی نمائندہ ہوتی ہے۔ یہ انسان کی شخصیت کی کلید اور اس کی روح کا دریچہ ہوتی ہے۔

بالفاظِ دیگر جو چیز بھی انسان کے قلب و جان پر نقش ہوتی ہے، سب سے پہلے اس کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ماضی میں اطباء کسی شخص کی صحت و بیماری کو جاننے کے لیے بھی اس کی زبان کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس دور میں جبکہ لیبارٹری میں کئے جانے والے ٹیسٹ، ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولتیں موجود نہ تھیں، اطباء کسی شخص کی زبان پر نظر ڈال کر اس کی بیماری اور صحت کی ساری کیفیت کا مطالعہ کر لیتے تھے۔

یہی بات فکری اور اخلاقی امور پر بھی صادق آتی ہے۔ انسان کی زبان سے انسان کی اخلاقی اور فکری حالت بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر علمائے علم اخلاق، اصلاحِ زبان کیلئے غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں اور فضائل اخلاقی کی تقویت اور روحانی کمالات کے حصول کیلئے اسے ایک اہم قدم قرار دیتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے حکیمانہ ارشادات میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

تکلموا تعرفوا فان المرء مخبوء تحت لسانه (نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۳۹۲)

''بات کرو تا کہ پہچانے جاؤ، اس لئے کہ انسان کی شخصیت اس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لا یستقیم ایمان عبد حتی یستقیم قلبه، ولا یستقیم قلبه حتی یستقیم لسانه

''کسی شخص کا ایمان درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا قلب درست نہ ہو اور کسی شخص کا قلب درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو۔'' (بحار الانوار ۶۸: ۲۸۶، محجۃ البیضاء ۵: ۱۹۵)

اس اشارے کے بعد ہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہیں اور چار پہلوؤں سے اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت کی حیثیت سے زبان کی اہمیت۔

۲۔ اصلاحِ زبان اور اصلاحِ روح وفکر واخلاق کا باہمی تعلق۔

۳۔ آفات زبان۔

۴۔ آفاتِ زبان کی روک تھام کے قواعد۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں سورۂ رحمن اور سورۂ بلد نے حق بیان ادا کر دیا ہے۔

سورۂ بلد کی آیات ۸ تا ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ۚ﴿۱۰﴾

''کیا ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دونوں (اچھی بری) راہیں بھی دکھا دیں۔''

یہ آیات انسان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر کر رہی ہیں۔ آنکھ، زبان اور ہونٹ، ہدایت کی نعمت اور خیر وشر کی معرفت کی نعمت۔

بلاشبہ انسانی اعضاء میں سے حیرت انگیز ترین عضو ہے جس کو اہم ترین ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایسی ذمہ داری جو کسی اور عضو کو نہیں سونپی گئی۔ زبان خوراک کو نگلنے میں مدد دینے کے علاوہ خوراک کو چباتے وقت اسے منہ میں ہلانے کا کام اتنی مہارت سے انجام دیتی ہے کہ خود دانتوں کے نیچے نہیں آتی۔ کبھی کبھار کھانا کھاتے ہوئے جب ہماری زبان دانتوں کے نیچے آجاتی ہے اور اس کے

نتیجہ میں جو تکلیف ہم محسوس کرتے ہیں، اس سے ہم بات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر زبان کو اپنے اس کام میں غیر معمولی مہارت حاصل نہ ہوتی تو ہر روز ہمیں کتنی مصیبت اٹھانا پڑتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ کھانا کھا لینے کے بعد منہ کے اندر کی فضا اور دانتوں کی صفائی کا کام بھی زبان ہی نہایت عمدگی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔

لیکن ان سب سے اہم مسئلہ بات کرنے کا ہے جو زبان کی انتہائی تیز اور منظم حرکات وسکنات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی بہت حیرت انگیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کے لیے ایسا آلہ انسان کو عطا کیا ہے کہ آسانی سے ہر وقت ہمیں دستیاب ہے، جو کبھی تھکتا بھی نہیں اور نہ ہی اسے استعمال کرنے پر کوئی اخراجات آتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات انسان کے اندر پائی جانے والی گفتگو کی صلاحیت اور استعداد ہے جس کی مدد سے انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے لامحدود الفاظ کا استعمال اور لامحدود جملے بنانے کی قدرت سے بہرہ ور ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسے الفاظ کی تخلیق کی ایسی استعداد اور صلاحیت عطا کی ہے جس کے استعمال سے ہزاروں زبانیں معرضِ وجود میں آئی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ الفاظ کی تخلیق کا یہ سلسلہ بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات میں اسے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا ہے، اس لیے کہ بہت سے الفاظ کے تلفظ اور گفتگو میں زبان کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہونٹ انسان کی زبان کو قابو میں رکھنے کا ایک اہم ذریعہ اور وسیلہ بھی ہیں۔ ایک حدیث نبویؐ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے:

یابن آدم ان نازعك لسانك فی ما حرمت علیك فقد اعنتك بطبقتین فاطبق

''اے فرزندِ آدمؑ! اگر تیری زبان تجھے گناہ پر اکسائے تو اسے قابو میں رکھنے کے لیے میں نے تجھے دو ہونٹ دیئے ہیں۔ ایسی حالت میں اپنے ہونٹوں کو بند کر لے۔''

(مجمع البیان ۱۰: ۴۹۴، نور الثقلین ۵: ۵۸۱)

سورۂ رحمن کی پہلی چار آیات میں بھی بیان کو، جو کہ زبان کا ایک اثر اور نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اہم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت قرار دیا گیا ہے۔ ان چار آیات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک ''الرحمن'' کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اس وسیع ترین رحمت پر دلالت کرتا ہے جو اللہ کے دوست اور دشمن سب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت یعنی قرآن کا ذکر ہے۔ اس کے بعد انسانی خلقت اور بعد ازاں قدرتِ بیان کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:

اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾

''رحمن، جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی تعلیم دی۔''

اس طرح آیت میں نعمت بیان کو انسان کی خلقت کے بعد سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کی ترقی اور تہذیب وتمدن کی پیش رفت پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت نہ ہوتی تو انسان اپنے تجربات ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہ کرسکتا اور اس طرح تہذیب وتمدن اور دین واخلاق کا پھیلنا ناممکن ہوجاتا۔

بلاشبہ اگر ایک دن یہ نعمت تمام انسانوں سے سلب کرلی جائے تو اسی دن انسانی معاشرہ زوال وپسماندگی کی تاریکی میں جا گرے گا۔

بیان کے لیے انسان کے پاس ایک آلہ ہے اور ایک اس کے استعمال کا نتیجہ۔ چونکہ ہم ان دونوں کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے یہ سارا عمل ہمیں بہت معمولی اور سادہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی پیچیدہ اور ظریف ولطیف کام اور ایک بے مثال اور نہایت اہم ہنر ہے۔

اس لئے کہ ایک طرف سے آواز ایجاد کرنے کا نظام کام کر رہا ہوتا ہے، پھیپھڑوں میں بھری ہوئی ہوا آواز کی تاروں کو متحرک کرتی ہے۔ یہ آواز زبان اور ہونٹوں کے استعمال کے نتیجہ میں حروف تہجی کو پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح الفاظ کی تخلیق جو کلام وبیان کا بنیادی ترین عنصر ہیں، نیز ایک انتہائی عجیب اور حیرت انگیز عمل ہے، اگر ہم دنیا کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کا جائزہ لیں (جن کی تعداد ماہرین لسانیات کے مطابق تین ہزار سے زیادہ ہے) تو اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی ضرور مدنظر رہے کہ الفاظ کی تخلیق کا سلسلہ کبھی نہ رکنے والا سلسلہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔

بہرحال نعمت بیان اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے جو انسان کے آرام وسکون اور اس کی ترقی وپیش رفت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔

یہ حقیقت احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (غرر الحکم، حکمت: ۹۶۴۴)

ما الانسان لولا اللسان الا صورة ممثلة، او بهيمة مهملة

''اگر زبان نہ ہوتی تو انسان کیا ہوتا! ایک بے جان مجسمہ یا صحرا میں بھٹکتا ہوا جانور!''

امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد سے یہ اہم حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ زبان ہی کی بدولت انسان جانوروں سے الگ اور ممتاز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

الجمال فی اللسان

''انسان کا سارا جمال زبان میں ہے۔'' (بحارالانوار، ۱۴۱:۷۴)

یہی بات امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

الجمال فی اللسان و الکمال فی العقل (بحارالانوار، ۸۰:۷۵)

''انسان کا حسن و جمال اس کی زبان میں ہے اور اس کا کمال عقل میں ہے۔''

ہم ان احادیث کو امیرالمومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ان فی الانسان عشر خصال یظهرها لسانه: شاهد یخبر عن الضمیر، و حاکم یفصل بین الخطاب، وناطق یردبه الجواب، و شافع یدرك به الحاجة، وواصف یعرف به الاشیاء، و امیر یامر بالحسن، وواعظ ینهی عن القبیح، و معز تسکن به الاحزان، و حاضر (حامد) تجلی به الضغائن و مونق تلذبه الاسماع (کافی، ۲۰:۸)

''انسان میں دس چیزیں ایسی ہیں جو زبان سے ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ یہ ایک شاہد ہے جو انسان کے باطن کی خبر دیتی ہے۔

۲۔ یہ ایک قاضی ہے جو حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔

۳۔ وہ ایک ترجمان ہے جو سوالات کا جواب دیتی ہے۔

۴۔ وہ ایک شفاعت و سفارش کرنے والی ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مقاصد کو حاصل کرتا ہے۔

۵۔ وہ ایک توصیف گر ہے جو چیزوں کے اوصاف بیان کرتی ہے۔

۶۔ وہ حاکم ہے جو نیکیوں کی طرف دعوت دیتی ہے۔

۷۔ وہ ایک واعظ ہے جو برائیوں سے روکتی ہے۔

۸۔ وہ ایک تسلی دینے والی ہے جس سے غموں کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

۹۔ وہ ایک ایسی تعریف کرنے والی ہے جو دلوں سے دشمنی اور کینے کے زنگ کو دور کر دیتی ہے۔

۱۰۔ وہ ایسی ہنرمند ہے جو کانوں کی لذت کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس بحث کے اختتام کے لیے ہم محجۃ البیضاء کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

اس کتاب کے مؤلف، مرحوم محسن فیض کاشانی ''آفات اللسان'' کے عنوان سے ایک بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور اس کی صنعت گری کا لطیف اور حیرت انگیز نمونہ ہے۔ وہ خود چھوٹی سی ہے لیکن اس کی عبادت اور گناہ دونوں ہی بہت بڑے ہیں، اس لئے کہ کفر اور ایمان کا اظہار زبان سے ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک سب سے بڑی اطاعت وعبادت ہے اور دوسرا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے، خواہ موجود ہو یا معدوم، خالق ہو یا مخلوق، خیالی ہو یا حقیقی، مظنون ہو یا موہوم، زبان اس کے بارے میں بات نہ کرتی ہو اور منفی یا مثبت اس کے بارے میں اظہارِ خیال نہ کرتی ہو۔

یہ ایسی خصوصیت ہے جو زبان کے علاوہ کسی اور عضو میں نہیں پائی جاتی۔ آنکھیں رنگوں اور شکلوں کو پہچاننے اور دیکھنے کے سوا اور کوئی کام انجام نہیں دیتی ہیں۔ کان صرف آوازوں کو سنتے ہیں۔ ہاتھ صرف ان چیزوں سے سروکار رکھتے ہیں جو جسمانی وجود رکھتی ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اعضاء کا ہے۔ لیکن زبان کی ایسی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کی جولانگاہ نیکی میں بھی بہت وسیع ہے اور بدی میں بھی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی زبان کو کھلا چھوڑ دے اور اس کی نگہبانی وحفاظت نہ کرے تو شیطان اسے ہر میدان میں لے جاتا ہے اور جہنم کے کنارے تک پہنچا دیتا ہے۔'' (محجۃ البیضاء، ۵: ۱۹۰)

۲۔ زبان کا فکر واخلاق سے تعلق

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان انسان کی روح کا دریچہ ہے۔ ہر انسان کی باتوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کی روح کی گہرائی میں کیا چھپا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کی بات اس کے دل وجان پر اثر انداز ہوتی ہے اور بتدریج اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ اس طرح روح اور زبان ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔

زبان اور فکر واخلاق کے باہمی تعلق کے بارے میں سورۂ محمد کی آیت ۳۰ نہایت واضح دلیل ہے۔ اس کی رو سے کسی کی باتوں پر غور وفکر کرنے سے بخوبی اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھی اور دورِ حاضر میں بھی لوگوں کے افکار، اسرار اور نیتوں کو جاننے کے لیے تفتیش کے دوران اس تعلق سے استفادہ کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے۔

منافقین کے بارے میں اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۰

''اگر ہم چاہیں تو انہیں آپ کو دکھا دیں تاکہ آپ ان کو چہروں سے پہچان لیں (لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے) آپ انہیں ان کی بات کرنے کے انداز سے پہچان سکتے ہیں اور اللہ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے۔''

علامہ راغب اصفہانی نے اپنی مشہور کتاب ''مفردات'' میں لکھا ہے کہ ''لحن'' کے معنی یہ ہیں کہ بات کو اس کے خاص قواعد و

ضوابط سے منحرف کر دیا جائے، اسے غلط اعراب دے دیئے جائیں، یا صاف بات کرنے کی بجائے اشارہ و کنایہ میں بات کی جائے۔ اس آیت میں "لحن القول" سے یہی آخری معنی مراد ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ منافقین کے اس اندازِ گفتگو سے، جس میں ایک بات کے دو معنی یا دو پہلو پائے جاتے ہیں، ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔

ابوسعید خدری سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

لحن القول بغضهم علی بن ابیطالب، و کنا نعرف المنافقین علی عهد رسول الله ببغضهم علی بن البیطالب (مجمع البیان، ۱۰۶:۹)

''لحن القول سے مراد منافقین کا بغض علی علیہ السلام ہے اور ہم زمانہ رسولؐ میں منافقین کو ان کے بغض علی علیہ السلام کی وجہ سے پہچانتے تھے۔'' (یعنی اس کا ایک نمایاں مصداق حضرت علی علیہ السلام سے ان کی دشمنی ہے)۔

احادیث میں انسان کے مافی الضمیر اور اس کے اندازِ گفتگو کے باہمی تعلق کے بارے میں مفصل بیانات پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما اضمر احد شیئا الا ظهر فی فلتات لسانه و صفحات وجهه

''انسان جو بات بھی اپنے دل میں چھپاتا ہے، وہ اس کی باتوں سے یا اس کے چہرے کے آثار سے ظاہر ہو جاتی ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۲۶)

امیر المومنین علیہ السلام کا یہ بیان جو نفسیات اور تحلیل نفسی کی بنیاد اور ستون قرار دیا جا سکتا ہے، اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ زبان انسان کی روح کا آئینہ ہوتی ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الانسان لبه لسانه

''انسان کی شخصیت کا خلاصہ اس کی زبان ہے۔'' (بحار الانوار، ۵۶:۷۸)

۳۔ آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں منقول ہے:

قلت اربعا، انزل الله تصدیقی بها فی کتابه، قلت المرء مخبوء تحت لسانه فاذا تکلم ظهر، فانزل الله تعالی و لتعرفنهم فی لحن القول، قلت فمن جهل شیئا عاداه، فانزل الله، بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه، وقلت قیمة کل امرء ما یحسن، فانزل الله فی قصة طالوت ان الله اصطفاه علیکم وزاده بسطة فی العلم و

الجسم، و قلت القتل یقل القتل، فانزل الله و لکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (بحارالانوار، ۶۸: ۲۸۳)

''میں نے رسولؐ اللہ کے زمانہ حیات میں چار باتیں کہی تھیں جن کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمائی۔ میں نے کہا تھا کہ انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے جب بولتا ہے تو ظاہر ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ

''آپ ان کے اندازِ گفتگو سے ان کو پہچان لیں گے۔'' (سورۂ محمد: ۳۰)

میں نے کہا تھا کہ لوگ جس چیز کو نہیں جانتے، اس کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ

''انہیں جس بات کا پورا علم نہیں تھا، انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔'' (یونس: ۳۹)

میں نے کہا تھا کہ ہر انسان کی قیمت وہ نیکی ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں طالوت کے واقعہ میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ

یعنی ''اللہ نے اسے تم پر چن لیا اور اسے علم اور جسمانی قوت میں وسعت عطا فرمائی۔'' (بقرہ: ۲۴۷)

میں نے کہا تھا کہ قصاص سے معاشرے میں قتل میں کمی ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ

یعنی ''اے صاحبانِ عقل! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔'' (بقرہ: ۱۷۹)

۴۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

یستدل علی عقل کل اولی الالباب

''کسی انسان کی بات سے اس کی عقل کی پہچان ہوتی ہے۔'' (غررالحکم)

۵۔ نیز آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

ایاك والكلام فی مالا تعرف طریقة ولا تعلم حقیقته فان قولك یدل علی عقلك وعبادتك تنبوعن معرفتك

''جس چیز کا راستہ اور حقیقت تمہیں معلوم نہ ہو، اس کے بارے میں بات نہ کرو، اس لئے کہ تمہاری بات تمہاری عقل کی اور تمہاری عبادت تمہاری معرفت کی نشاندہی کرتی ہے۔'' (غرر الحکم)

مختصر یہ کہ انسان کی شخصیت اور انسانی معاشرے کی تشکیل میں زبان کا کردار انتہائی اہم اور حساس ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کی نعمتیں انسان کے لیے عظیم سرمایہ ہیں مگر ان کی آفات اور ان کے خطرات بھی اسی قدر عظیم ہیں، جس طرح ایٹمی طاقت، اگر اس سے مثبت اور تعمیری انداز میں فائدہ اٹھایا جائے تو دنیا کو اس کی مدد سے آباد کیا جا سکتا ہے لیکن اگر اس سے ایٹم بم بنایا جائے تو چند لمحوں میں ساری دنیا کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ آفات اللسان یا زبان کے خطرات

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے کہ جس طرح زبان کے مثبت اور تعمیری فوائد بہت زیادہ ہیں، اسی طرح اس کے منفی اور مخرب اثرات بھی بہت زیادہ ہیں۔

محقق بزرگوار مرحوم محسن فیض کاشانی نے اپنی کتاب ''محجۃ البیضاء'' میں اور امام غزالی نے ''احیاء العلوم'' میں زبان کے گناہوں کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ امام غزالی نے زبان کے بیس گناہوں کی فہرست دی ہے جو یہ ہیں:

۱۔ ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا جن کا انسان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ بیہودہ اور ضرورت سے زائد گفتگو۔

۳۔ گناہ آلود چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا، جیسے شراب یا بدکار عورتوں کے بارے میں گفتگو کرنا۔

۴۔ جدال و مراء (جدال سے مراد وہ بحث ہے جس کا مقصد دوسرے کو ذلیل کرنا ہوتا ہے جبکہ مراء اس بحث کو کہتے ہیں جس کا مقصد اپنی برتری ظاہر کرنا ہو)۔

۵۔ گفتگو کے دوران جھگڑا کرنا اور ہٹ دھرمی سے کام لینا۔

۶۔ گفتگو کے دوران تکلف کرنا اور سجع و قافیہ کے لیے تصنع کرنا۔

۷۔ گالی گلوچ کرنا۔

۸۔ غیر مستحق کو لعنت کرنا۔

۹۔ غنا اور شاعری (اس سے مراد وہ شاعری ہے جو باطل مطالب پر مشتمل ہو یا لہو آمیز انداز میں گائی جائے)۔

۱۰۔ گھٹیا اور پست قسم کا مزاح۔

۱۱۔ دوسروں کا مذاق اڑانا اور ان کی تحقیر کرنا۔

۱۲۔ لوگوں کے راز فاش کرنا۔

۱۳۔ جھوٹا وعدہ کرنا۔

۱۴۔ جھوٹ بولنا۔

۱۵۔ چغل خوری (دو افراد کے درمیان لڑائی یا نفرت پیدا کرنے کے لیے ایک کی بات دوسرے کو بتانا)۔

۱۶۔ غیبت کرنا۔

۱۷۔ گفتگو میں منافقت (لوگوں کے سامنے ان سے اور طرح سے بات کرنا اور ان کی غیر موجودگی میں کسی اور طرح سے)۔

۱۸۔ بے جا تعریف کرنا، یا ایسے افراد کی تعریف کرنا جو اس کے مستحق نہیں ہیں۔

۱۹۔ بغیر سوچے سمجھے اور مطالعہ کئے بغیر بات کرنا۔

۲۰۔ ایسے امور کے بارے میں سوال کرنا جنہیں سمجھنا خود سوال کرنے والے کے لیے ناممکن ہو۔

اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان کے گناہ انہی بیس چیزوں میں منحصر اور محدود نہیں ہیں۔ شاید فیض کاشانی اور غزالی کا مقصد تمام گناہوں کو بیان کرنا نہ تھا۔ لہٰذا مندرجہ ذیل گناہوں کو بھی مذکورہ بالا فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تہمت لگانا۔

۲۔ جھوٹی گواہی دینا۔

۳۔ خودستائی یعنی اپنے منہ میاں مٹھو۔

۴۔ بے بنیاد افواہیں پھیلانا یا بے حیائی و بدکاری کی نشر و اشاعت کرنا۔

۵۔ سخت لہجہ میں اور بے ادبی کے ساتھ گفتگو کرنا۔

۶۔ کسی بات پر بے جا اصرار کرنا (جیسا کہ بنی اسرائیل نے اس گائے کے بارے میں کیا جس کے ذبح کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا)۔

۷۔ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا، بالفاظ دیگر زبان سے گھاؤ لگانا۔

۸۔ ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہ ہو۔

۹۔ زبان سے ناشکری کے کلمات ادا کرنا۔

۱۰۔ تبلیغ باطل، ترغیب گناہ، امر بہ منکر و نہی از معروف۔

شاید یہ بتانا بھی ضروری نہ ہو کہ یہ تیس گناہ بھی زبان کے گناہوں کی مکمل فہرست نہیں ہے بلکہ گناہانِ زبان میں سے زیادہ نمایاں گناہ ہیں۔

لیکن اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات اس سلسلہ میں افراط کی جانب نکل گئے اور بعض اوقات ان گناہوں کو بھی گناہانِ زبان کی فہرست میں لے آئے جن کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے، مثلاً فقر و ناداری کا ذکر کرنا، دین میں بدعت گزاری کرنا، تفسیر بالرائے اور جاسوسی وغیرہ۔ ان اعمال میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقل گناہ ہے، جو ممکن ہے زبان سے، قلم سے یا کسی اور ذریعے سے انجام دیئے جائیں۔ ان کو گناہانِ زبان میں شمار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اگر اس انداز سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر سارے گناہ اور اخلاقی رذایل مثلاً ریا، حسد، تکبر، قتل، زنا وغیرہ کو کسی نہ کسی طرح زبان کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات ایک ہی گناہ کی مختلف صورتوں کو ایک مستقل گناہ قرار دیا جاتا ہے، مثلاً استاد کے ساتھ بدزبان ماں باپ کے ساتھ بدزبانی اور دوسروں کو برے ناموں سے پکارنے کو الگ الگ گناہ شمار کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ایک ہی گناہ کی مختلف شکلیں ہیں۔

لہٰذا بہتر ہے کہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط سے اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ اس تقسیم سے اصل بحث پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۴۔ خطراتِ زبان سے بچنے کے کلی اصول

اب جبکہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہونے کے باوجود کس قدر خطرناک ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ یہ بہت سے گناہوں کی بنیاد واقع ہو جاتی ہے اور انسان کی سعادت کو خاکستر کر سکتی ہے، لہٰذا یہ فکر کرنی چاہئے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کی پابندی کر کے ان خطرات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے یا کم از کم حد تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

احادیث معصومینؑ، علمائے اخلاق کے اقوال اور عارفانِ حق کے ارشادات سے ایسے امور کی نشاندہی ہوتی ہے جنہیں ہم آفاتِ زبان کا مقابلہ کرنے کے عمومی اصولوں کے نام سے بیان کر رہے ہیں:

۱۔ خطرات زبان کی طرف سنجیدہ توجہ

ہر خطرناک چیز کے خطرات سے بچنے کے لیے سب سے پہلے اس کے خطرات کی طرف پوری طرح سے توجہ دینا ضروری ہے۔ ہر روز صبح کے وقت بیدار ہونے پر انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو نصیحت کرے کہ دن بھر خطراتِ زبان سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا رہے، اس لئے کہ یہ وہ عضو ہے جو انسان کو سعادت کی بلندیوں تک بھی لے جاتا ہے اور شقاوت و بدبختی کی ہولناک پستیوں میں بھی پھینک دیتا ہے۔ اگر اس سے غفلت کی جائے تو ایک خونخوار درندے کی طرح انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

یہ بات احادیث میں انتہائی حسین انداز میں بیان کی گئی ہے:

ایک حدیث میں سعید بن جبیر رسولؐ اللہ سے نقل کرتے ہیں:

اذا اصبح ابن آدم اصبحت الاعضاء کلها تستکفی اللسان انی تقول اتق الله

فینا فانك ان استقمت استقمنا و ان اعوججت اعوججنا

''جب فرزند آدم صبح بیدار ہوتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو خبردار کرتے ہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، اس لئے کہ اگر تم سیدھی راہ پر چلو تو ہم بھی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں اور اگر تم ٹیڑھے راستوں پر چلو تو ہم بھی ٹیڑھے راستوں پر چلنے لگتے ہیں۔'' (محجۃ البیضاء، ۵: ۱۹۳)

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان لسان ابن آدم یشرف علی جمیع جوارحه کل صباح فیقول کیف اصبحتم؟ فیقولون بخیر ان ترکتنا و یقولون الله فینا، و یناشدونه و یقولون انما نثاب و تعاقب بك

''انسان کی زبان ہر روز صبح کے وقت اس کے تمام اعضاء پر نظر ڈالتی ہے اور کہتی ہے: تم نے کس حال میں صبح کی؟ وہ کہتے ہیں: خیریت کے ساتھ، اگر تم نے ہمیں اسی حال پر رہنے دیا تو! (پھر وہ اسے کہتے ہیں) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، پھر اسے قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری ہی وجہ سے ہم ثواب یا عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔'' (اصولِ کافی، ۲: ۱۱۵)

۲۔خاموشی

گزشتہ صفحات میں ہم خاموشی کی اہمیت کے بارے میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں جس میں خاموشی کی اہمیت کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئیں۔ قرآنی آیات میں بھی خاموشی کی اہمیت کے بارے میں اشارات پائے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جس قدر کم بولے گا، اسی قدر اس کی غلطیاں کم ہوں گی اور جس قدر اس کی خاموشی زیادہ ہوگی، اسی قدر اسے زیادہ سلامتی نصیب ہوگی۔

اس کے علاوہ خاموشی کی زیادہ سے زیادہ مشق سے انسان کو اپنی زبان پر زیادہ سے زیادہ اختیار اور قابو حاصل ہوتا ہے اور انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔

س یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خاموشی سے مراد مکمل خاموشی نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کی زندگی کی بہت سی مادی اور معنوی ضروریات کی تکمیل، کئی عبادات و اطاعات، علوم و معارف کی نشر و اشاعت اور لوگوں کے امور کی اصلاح صرف بات کرنے اور زبان کے استعمال سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ یہاں خاموشی سے مراد قلتِ کلام ہے، یعنی ایسی باتوں سے پرہیز کرنا جو فتنہ و فساد یا گناہ کا باعث ہوں، یا مشکوک اور بے معنی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من کثر کلامه کثر خطوه، و من کثر خطوه قل حیاوه، و من قل حیاوه قل ورعه، و من قل ورعه مات قلبه، و من مات قلبه دخل النار

''جو زیادہ بولتا ہے، اس کی خطائیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کی خطائیں زیادہ ہوں، اس کی حیا کم ہو جاتی ہے، جس کی حیا کم ہو جائے اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے اور جس کا دل مردہ ہو جائے، وہ جہنم میں جاتا ہے۔'' (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۳۴۹)

آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

الکلام کالدواء قلیله ینفع و کثیره قاتل

''کلام دوا کی مانند ہے، اگر کم ہو تو صحت مندی کا باعث ہوتی ہے، زیادہ ہو تو مار ڈالتی ہے۔''

۳۔ حفاظت زبان (بولنے سے پہلے سوچنا)

اگر انسان بولنے سے پہلے سوچے تو زبان کی بہت سی لغزشوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ سوچے سمجھے بغیر یا مطالعہ کے بغیر بات کرنا انسان کو مختلف قسم کے گناہانِ زبان کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔

ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

ان لسان المومن وراء قلبه، فاذا اراد ان یتکلم بشیء تدبره بقلبه، ثم امضاه بلسانه، و ان لسان المنافق امام قلبه، فاذا هم بشیء امضاه بلسانه و لم یتدبره بقلبه

''مومن کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے، جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے دل سے غور و فکر کرتا ہے، پھر اسے زبان سے ادا کرتا ہے جبکہ منافق کی زبان اس کے دل کے آگے ہوتی ہے، جب وہ کچھ کہنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے اور اس کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتا۔''

(محجۃ البیضاء، ۵:۱۹۵)

یہی بات اختلافِ الفاظ کے ساتھ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۷۶ میں امیر المومنین علیہ السلام نے بھی بیان فرمائی ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

قلب الاحمق فی فمه و فم الحکیم فی قلبه (بحار الانوار، ۷۵:۳۷۴)

''احمق کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے جبکہ عاقل کا منہ اس کے دل میں ہوتا ہے۔''

ظاہری بات ہے کہ یہاں قلب سے مراد عقل وفکر ہے اور زبان کے دل کے آگے یا پیچھے ہونے کا مطلب بات کے معنی میں غور وفکر کرنا یا نہ کرنا ہے۔

واقعی یہ کتنا اچھا ہوا گر ہم بات کرنے سے پہلے سوچیں اور دیکھیں کہ یہ بات کرنے کا محرک کیا ہے، اس بات کے نتائج کیا ہوں گے؟ آیا یہ بات بے معنی، مضر یا کسی مومن کی توہین یا ظالم کی حمایت تو نہیں ہے؟ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ہے؟ امر بالمعروف ونہی از منکر کیلئے ہے؟ مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت پر مبنی ہے؟ اللہ کی رضا اور بندگانِ خدا کی خوشی کا باعث ہے؟

اس گفتگو کو ہم امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جو مندرجہ بالا تمام مطالب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور انسان کے دل کی نورانیت کا باعث بن سکتی ہے:

ان احببت سلامة نفسك وستر معايبك فاقلل كلامك و اكثر صمتك، يتوفر فكرك ويستنر قلبك

''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نفس کو سلامتی نصیب ہو اور تمہارے عیب پوشیدہ رہیں تو اپنی گفتگو کو کم اور خاموشی کو زیادہ کرو۔ اس سے تمہاری فکر کو قوت اور دل کو نورانیت ملے گی۔'' (تصنیف غرر الحکم، صفحہ ۲۱۶)

یہ تہذیب نفس اور پاکیزگی اخلاق میں زبان کے کردار اور حفاظت زبان کے کلی اصولوں کا خلاصہ تھا۔ البتہ غیبت، تہمت، چغل خوری، برائی اور باطل کی نشر واشاعت جیسے موضوعات پر ہم انشاءاللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

خودشناسی اور خداشناسی

اصلاحِ نفس، تہذیبِ اخلاق اور انسانی صفات کے حصول اور پرورش میں ایک اور اہم قدم خودشناسی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کئے بغیر کمالاتِ انسانی تک پہنچ جائے، اپنے عیوب کی اصلاح کر سکے اور اپنے آپ کو اخلاقی رذائل سے پاک کر سکے۔

جب تک بیمار کو اپنی بیماری کی خبر نہ ہو، کیا وہ طبیب کے پاس جائے گا؟

جو شخص سفر میں بھٹک گیا ہو، جب تک اسے احساس نہ ہو کہ وہ راستہ بھول گیا ہے، کیا وہ کسی رہنما کی ضرورت محسوس کر سکتا ہے؟

جب تک انسان کو احساس نہ ہو کہ دشمن اس کے گھر کے قریب ہے اور اس پر حملہ کرنے والا ہے، کیا وہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا ہے؟

ان تمام سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔اسی طرح جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچانے، اپنے عیوب اور نقائص سے باخبر نہ ہو، ہرگز اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی مسیحا نفس روحانی طبیب کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔اس مختصر تمہید کے بعد ہم خودشناسی اور تہذیب نفس کے باہمی تعلق اور خداشناسی وتہذیب نفس کے باہمی ربط وتعلق کا جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔خودشناسی اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق

خودشناسی اور تہذیب نفس کے باہمی تعلق کے دلائل نہایت واضح ہیں جنہیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے:

۱۔ انسان خودشناسی کے ذریعے انسانی نفس کی عظمت اور کرامت کو اور روح کی اہمیت کو، جو کہ انوارِ الٰہی اور نفخۂ ربانی کا پرتو ہے، اچھی طرح سے پہچان سکتا ہے اور اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ اس گوہر گراں بہا کو کم قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہئے اور اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

۲۔ خودشناسی کے ذریعے انسان ہوائے نفسانی کے خطرات، شہوت کے محرکات اور سعادت کے ساتھ ان کے تضاد کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو نہ پہچانے، وہ ان محرکات سے بے خبر رہ جاتا ہے۔اس کی حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جسے ایک خطرناک دشمن نے گھیرا ہوا ہو مگر وہ اس سے غافل ہو۔ظاہر سی بات ہے کہ ایسا شخص اس دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن کے مہلک وار کا نشانہ بن جائے گا۔

۳۔ جو انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے، وہ ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پہچان لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہیں۔ ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کو پہچان لینے کے بعد اس کے اندر ان کو پروان چڑھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کر سکے اور اپنے جوہر ذات کو ہویدا و آشکار کر سکے۔

جو شخص اپنی معرفت نہیں رکھتا، اس کی حالت اس شخص جیسی ہوتی ہے جس کے گھر میں جگہ جگہ قیمتی خزانے دفن ہوں لیکن وہ ان کو نہ جانتا ہو۔ممکن ہے ایسا شخص بھوک سے مرجائے جبکہ اس کے قدموں تلے اتنا بڑا خزانہ چھپا ہوا ہو جس سے ہزاروں افراد کو کھانا کھلایا جاسکتا ہو۔

۴۔ تمام اخلاقی برائیوں کی جڑیں انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔خودشناسی کی مدد سے انسان ان کو اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بیماریوں کا علاج آسان ہوجاتا ہے۔اس طرح تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کی منزل تک پہنچنے کی راہ اس کے لیے ہموار ہوجاتی ہے۔

۵۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خودشناسی، خداشناسی کا بہترین ذریعہ ہے جبکہ خداشناسی اور اللہ کی صفاتِ جلال و جمال کی پہچان اخلاقی فضائل کی نشوونما اور اخلاقی پستیوں سے نجات کے حصول اور اوجِ فضائل تک پہنچنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

اگر گزشتہ مطالبہ میں اس جملے کا بھی اضافہ کر لیا جائے کہ رذائل اخلاقی انسان کو تباہی سے دو چار کر دیتے ہیں، انسانی معاشرے کو خطرناک بحرانوں میں گرفتار کر دیتے ہیں، زندگی کے شہد کو کڑوے زہر اب میں بدل دیتے ہیں تو خودشناسی اور خودآگاہی کی اہمیت مزید واضح وآشکار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

کارل مینگنز اپنی کتاب ''تحلیلِ نفسی کے معجزات'' میں لکھتا ہے:

''خودآگاہی کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اپنی مثبت اور محبت انگیز طاقتوں کا بھی علم ہو اور ان منفی ومخرب قوتوں کا بھی علم ہو جو ہمیں بدقسمتی سے دو چار کر سکتی ہیں۔ ان منفی طاقتوں کو نظر انداز کرنا اور دوسروں کے اندر ان کے وجود کی بات نہ کرنا زندگی کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔''

''انسان موجودِ ناشناختہ'' جو ایک مشہور ومعروف کتاب ہے، اس میں ایک جملہ ہے جو ہماری بحث کی اہمیت کو واضح کر دیتا ہے:

''بدقسمتی سے صنعتی تمدن میں انسان کی پہچان پر توجہ نہیں دی گئی اور زندگی کا لائحہ عمل انسان کی فطری اور طبیعی بنیادوں پر وضع نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ظاہری حسن ورعنائی کے باوجود انسان کو فلاح کی راہ نہ دکھا سکا۔ سائنسی ترقی درحقیقت کسی منصوبہ بندی کے مطابق عمل میں نہیں آئی بلکہ تقریباً اتفاقی تھی۔ اگر گلیلیو، نیوٹن اور لیوازے اپنی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو انسان کے جسم اور روح کے مطالعہ پر صرف کرتے تو آج دنیا کی شکل کچھ اور ہوتی۔'' (صفحہ: ۲۲)

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہوس ران سرکشوں کی سزا خودفراموشی مقرر کی ہے اور مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾

''اور ان لوگوں کی طرح سے نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انکو ان کے اپنے بارے میں بھلاوے میں ڈال دیا۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔'' (حشر: ۱۹)

۲۔ خودشناسی احادیث کی روشنی میں

رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث میں خودشناسی کے بارے میں بہت اہم اور قابل قدر مطالب بیان ہوئے ہیں جو ہمیں اس سلسلہ میں ہر قسم کی تشریح ووضاحت سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

نال الفوز الاکبر من ظفر بمعرفة النفس (غرر الحکم، حدیث: ۹۹۶۵)

''جس نے اپنی معرفت حاصل کر لی، اس نے سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لی۔''

۲۔ اسی کے نقطہ مقابل میں آپؑ ہی سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

من لم یعرف نفسه بعد عن سبیل النجاة و خبط فی الضلال و الجهالات

(غرر الحکم، حدیث: ۹۰۳۴)

''جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا، وہ راہِ نجات سے دور ہو گیا اور گمراہی و جہالت میں گر گیا۔''

۳۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

العارف من عرف نفسه فاعتقها و نزهها عن کل ما یبعدها

''حقیقی عارف وہ ہے جو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے اور اسے خواہشات کی قید سے آزاد کروائے اور ہر اس چیز سے پاک کرے جو اسے سعادت سے دور کرتی ہو۔''

(غرر الحکم بحوالہ المیزان، ۶: ۱۷۳)

۴۔ نیز آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں ہے:

اکثر الناس معرفة لنفسه اخوفهم لربه (غرر الحکم، حدیث ۳۱۲۶)

''جو شخص سب سے زیادہ اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہو، وہ سب سے زیادہ اپنے رب سے ڈرتا ہے۔''

یہ حدیث خوفِ خدا اور خود شناسی کے قریبی تعلق کو بخوبی بیان کرتی ہے جبکہ خوف خدا تہذیب نفس کا اہم ذریعہ ہے۔

۵۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

من عرفه نفسه جاهدها، و من جهل نفسه اهملها

''جو اپنے نفس کو پہچان لے، اس کے خلاف جہاد کرتا ہے اور جو اپنے نفس کے بارے میں جاہل ہوتا ہے، وہ اسے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔'' (میزان الحکمہ، ۳: ۱۸۸۱ بحوالہ المیزان)۔

اس حدیث کی رو سے نفس کے خلاف جہاد، جسے جہادِ اکبر بھی کہا جاتا ہے، خود شناسی پر موقوف ہے۔

۶۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

من کرمت علیه نفسه هانت علیه شهواته

''جو اپنے آپ کو محترم جانتا ہے، وہ خواہشاتِ نفس کو حقیر جانتا ہے۔'' (یعنی آسانی سے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہیں کرتا)۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: ۲۰۹)

۷۔ جس طرح خودشناسی تہذیب نفس اور اخلاقی ارتقاء کی بنیاد فراہم کرتی ہے، اسی طرح نفس کی حقیقت سے جاہل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تمام اخلاقی اقدار سے بیگانہ اور اللہ سے دور ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ایک حدیث میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

من هانت عليه نفسه فلا تامن شره (تحف العقول، کلماتِ قصار امام علی نقی علیہ السلام)

''جو شخص عزتِ نفس سے محروم ہے، اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھو۔''

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ خودشناسی اور معرفت نفس فضائل اخلاقی کی پرورش اور روحانی ارتقاء کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے۔ جب تک انسان اس مشکل اور دشوار منزل کو عبور نہیں کرلیتا، کسی بھی معنوی مقام تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے علم اخلاق اس بات پر سخت تاکید کرتے ہیں کہ رہروانِ راہِ معرفت خودشناسی کو اہمیت دیں اور اس انتہائی بنیادی اہمیت کے معاملہ سے غفلت نہ کریں۔

۳۔ خودشناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے

قرآن مجید انتہائی صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

''ہم اپنی نشانیاں آفاق (کائنات کی وسعتوں) میں اور ان کے اپنے وجود میں انہیں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر واضح ہوجائے کہ وہ حق ہے۔'' (فصلت: ۵۳)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور تمہارے وجود کے اندر اس کی نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟'' (ذاریات: ۲۱)

بعض محققین نے اس آیت سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ معرفتِ نفس، معرفت خدا کا ذریعہ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ (اعراف: ۱۷۲)

''جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ قرار دیا (اور ان کے وجود کے اسرار انہیں دکھا کر فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں۔''

تفسیر المیزان میں ہے:

''انسان جس قدر متکبر ہو، وسائلِ زندگی کی فراوانی اسے جس قدر بھی مغرور بنادے، وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے وجود کا مالک نہیں ہے، نہ ہی اپنے امور کی تدبیر میں مستقل ہے۔ اگر وہ اپنا مالک ہوتا تو موت اور زندگی کے دیگر آلام ومصائب کو اپنے آپ سے دور رکھتا۔ اگر اپنے امور کی تدبیر میں مستقل ہوتا تو کبھی عالم اسباب کے سامنے عاجز ومجبور نہ ہوتا۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ مالک ومدبر رب کا محتاج ہونا انسان کے وجود کے عناصر ترکیبی میں سے ہے۔ فقر وحاجت مندی انسان کی پیشانی پر لکھی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کسی میں ذرہ بھر شعور ہو، وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا اور اس مسئلہ میں عالم اور جاہل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

بنابرایں انسان انسانیت کے جس مقام پر بھی ہو، وہ اس حقیقت کو بخوبی درک کرتا ہے کہ اس کا ایک مالک اور مدبر رب ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی ذاتی حاجت مندی کو تو دیکھ رہا ہو اور اپنی اس حقیقت کو نہ دیکھ سکے۔

لہٰذا یہ آیت ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے جسے انسان دنیوی زندگی میں محسوس کرتا ہے، وہ یہ کہ وہ اپنی زندگی کے تمام امور میں ایک ایسی ہستی کا محتاج ہے جو اس کی اپنی ذات سے باہر ہے۔ بنابرایں اس آیہ شریفہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے انسان کو اس کی نیازمندی اور احتیاج سے آگاہ کردیا اور انہوں نے ہماری ربوبیت کا اعتراف کرلیا۔'' (المیزان ۸:۳۰۷)

اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نفس انسان اور اس کی خصوصیات کی معرفت، اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

مشہور حدیث ''من عرف نفسه عرف ربه''، ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا''، اسی حقیقت کو بیان کررہی ہے۔ یہ حدیث الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ رسولؐ اللہ اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے۔ بحارالانوار میں یہ حدیث کتاب ادریسؑ کے صحیفہ چہارم سے، جو صحیفۂ معرفت کے نام سے موسوم ہے، اس طرح نقل ہوئی ہے:

من عرف الخلق عرف الخالق، و من عرف الرزق عرف الرازق، و من عرف نفسه عرف ربه (بحارالانوار، ۹۲:۴۵۶، ۵۸:۹۹ اور ۶۶:۲۹۳)

''جس نے مخلوق کو پہچان لیا، اس نے خالق کو پہچان لیا، جس نے رزق کو پہچان لیا، اس نے رازق کو پہچان لیا اور جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''شیعہ اور سنی دونوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ ایک مشہور حدیث ہے۔''

حدیث ''من عرف نفسه'' کی سات تفسیریں

اس حدیث کی مختلف اسالیب میں تشریح وتفسیر کی گئی ہے جن میں سے چند کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ یہ حدیث ''برہانِ نظم'' کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی اپنی روح و جسم کی ساخت کے حیرت انگیز پہلوؤں پر نظر ڈالے اور اس عجوبہ خلقت کے پیچیدہ اور پر اسرار نظام کو غور سے دیکھے تو اللہ کی معرفت کا دروازہ اس کے اوپر کھل جائے گا، اس لئے کہ یہ حیرت انگیز نظم کسی عالم و قادر مبداء کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ لہٰذا اپنے نفس کی معرفت اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔

۲۔ ممکن ہے یہ حدیث ''برہانِ امکان و جوب'' کی طرف اشارہ ہو، اس لئے کہ اگر انسان اپنے وجود پر غور کرے تو یہ حقیقت اس پر آشکار ہو جائے گی کہ وہ ہر لحاظ سے غیر مستقل اور وابستہ ہے۔ اس کا علم، اس کی قدرت و توانائی، اس کی عقل و ذہانت اور اس کے وجود کے تمام شاخ و برگ، غیر مستقل اور محتاج ہیں ایک ایسی ذات کے جو مستقل اور بے نیاز ہے۔ بالفاظ دیگر جو کوئی اپنے وجود کے بارے میں غور و فکر کرے، وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ خود ''ممکن الوجود'' ہے جو اپنے وجود اور تمام خصوصیات میں ''واجب الوجود'' کا محتاج ہے۔

۳۔ ممکن ہے یہ حدیث ''برہانِ علت و معلول'' کی طرف اشارہ ہو، اس لئے جب انسان اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو اس پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ اس کے جسم و روح کسی اور علت کے معلول ہیں جس نے ایک خاص زمان و مکان میں انہیں نعمتِ وجود سے نوازا ہے۔ جب انسان اپنے وجود کی علت کی جستجو کرتا ہے اور اپنے ماں باپ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی اور علت کے معلول ہیں۔ جب وہ علت و معلول کے اس سلسلہ کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلۂ علت و معلول لامتناہی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس سے تسلسل لازم آتا ہے اور تسلسل کا باطل ہونا ہر صاحب علم و دانش پر واضح ہے۔

بنا برایں علت و معلول کے اس سلسلہ کو لامحالہ کسی مقام پر ختم ہونا ہے، یعنی ایک ایسی علت پر جو معلول نہ ہو، جسے دوسرے الفاظ میں علت العلل یا واجب الوجود کہا جاتا ہے، جس کا وجود ذاتی ہے اور جو اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہیں ہے۔ جب انسان اس لحاظ سے اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو وہ اپنے رب کو بھی پا لیتا ہے۔

۴۔ یہ حدیث ''برہانِ فطرت'' کی طرف بھی اشارہ ہو سکتی ہے۔ جب انسان اپنے قلب و روح کی گہرائیوں اور مختلف زاویوں سے اپنے وجود کا جائزہ لیتا ہے تو دیکھتا ہے کہ توحید اور الوہیت کا نور اس کی فطرت میں ضوفشانی کر رہا ہے۔ اس طرح کسی قسم کے استدلال کی ضرورت محسوس کئے بغیر اپنے نفس کی معرفت سے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔

۵۔ ممکن ہے یہ حدیث ''صفاتِ خدا'' کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کا اپنا وجود مخلوقات اور ممکنات کی صفات کا حامل ہے تو وہ اپنے رب کی صفات کو پہچان لیتا ہے۔ وہ اپنی محدودیت سے اللہ تعالیٰ کے لامحدود ہونے کو سمجھ لیتا ہے، اس لئے کہ اگر اللہ بھی محدود ہو تو وہ مخلوق ہوگا۔ وہ اپنے فانی ہونے سے اللہ کے باقی ہونے کو سمجھ لیتا ہے، اس لئے کہ اگر وہ بھی فانی ہو تو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ اپنی نیاز مندی سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی، اپنے ضعف سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچان لیتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو نہج البلاغہ کے خطبۂ اول میں امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

و كمال الاخلاص له نفي الصفات عنه لشهادة كل صفة انها غير الموصوف و شهادة كل موصوف انه غير الصفة

''اللہ کے لیے اپنے ایمان کو خالص کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ممکنات کی نفی کی جائے، اس لئے کہ (مخلوق) کی ہر صفت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔''

۶۔ علامہ مجلسیؒ نے بعض علماء سے اس حدیث کی ایک اور تفسیر نقل کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''انسان کی روح ایک لطیف لاہوتی موجود ہے جس نے جامۂ ناسوت زیب تن کر رکھا ہے (یعنی اس کا تعلق عالم ماورائے طبیعت سے ہے مگر وہ عالم طبیعت میں سکونت پذیر ہے) اور یہ دس پہلوؤں سے اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر دلالت کرتی ہے:

۱۔ چونکہ روح بدن کی مدبر ہے، اس سے ہم یہ جان لیتے ہیں کہ کائنات کا بھی کوئی مدبر ہے۔

۲۔ چونکہ روح ایک ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق بھی ایک ہے۔

۳۔ چونکہ یہ جسم کو حرکت دینے پر قادر ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ قادر ہے۔

۴۔ چونکہ روح بدن سے مکمل طور پر آگاہ ہوتی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ آگاہ و خبیر ہے۔

۵۔ چونکہ اسے تمام اعضاء پر تسلط حاصل ہے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اپنی تمام مخلوقات پر مکمل تسلط رکھتا ہے۔

۶۔ چونکہ یہ بدن سے پہلے موجود تھی اور اس کے بعد بھی باقی رہے گی، یہ اللہ کے ازلی اور ابدی ہونے کی دلیل ہے۔

۷۔ چونکہ انسان اپنے نفس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت کو جان لینا ممکن نہیں ہے۔

۸۔ چونکہ انسان کو جسم کے اندر روح کی جگہ نظر نہیں آتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی مکان اور محل سے بے نیاز ہے۔

۹۔ روح کو چھونا ممکن نہیں ہے، پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو چھونا بھی ممکن نہیں ہے۔

۱۰۔ چونکہ انسان کی روح اور نفس کو دیکھا نہیں جا سکتا، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ خالق کو بھی دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

(بحار الانوار، ۵۸:۹۹ و ۱۰۰)

۷۔ اس حدیث کی تفسیر اس طرح بھی کی گئی ہے کہ ''من عرفه نفسه عرفه ربه'' تعلیق بہ محال ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انسان کے لیے محال ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنی روح کی حقیقت کو پہچان سکے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقی اور مکمل معرفت بھی ممکن نہیں ہے۔

لیکن یہ تفسیر بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اس سے پہلے بیان کی گئی تفاسیر مناسب ہیں اور اس حدیث کے یہ تمام معنی باہم مراد لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

بلاشبہ جوشخص اپنے آپ کو پہچان لے، وہ اللہ کو پہچان لے گا۔خودشناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے اور خدا شناسی یقینا تہذیب اخلاق اور قلب وروح کو اخلاقی آلائشات سے پاک کرنے کا موثر ترین اور یقینی ذریعہ ہے،اس لئے کہ اس کی پاک ذات تمام کمالات وفضائل کا سرچشمہ ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سیر وسلوک اور تہذیب نفس کا سب سے اہم قدم خودشناسی ہے۔لیکن خودشناسی کی منزل تک پہنچنے میں بھی بہت سی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

خودشناسی کی رکاوٹیں

جسمانی بیماریوں کے علاج کا پہلا قدم بیماری کی تشخیص ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کے جدید دور میں مختلف ذرائع کی مدد سے بیماری کی کمیت وکیفیت کے بارے میں بہتر آگاہی حاصل ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بیماریوں کا علاج کافی آسان ہوگیا ہے۔

روحانی بیماریوں اور اخلاقی آلائشات کا علاج بھی اسی طرح ہے۔جب تک اخلاقی معالجین کی ہدایات کے مطابق اخلاقی رذائل کی صحیح طرح سے تشخیص نہ کرلی جائے،ان کا علاج ممکن نہیں ہے۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ خطرناک جسمانی بیماریوں کی علامتوں کو دیکھنے کے باوجود، جب ذات کی بنیاد پر اپنی ان خطرناک بیماریوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ایسے افراد عموماً اس وقت بیماری کا اعتراف کرتے ہیں جب بیماری مہلک سرحدوں میں داخل ہوجاتی ہے۔مگر اس وقت اس اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور بیماری کا علاج ناممکن یا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

اخلاقی بیماریوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔عام طور پر حب ذات میں مبتلا انسان اپنے اخلاقی عیوب کا اعتراف نہیں کرتے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی اخلاقی برائیوں کی تاویل کرتے ہیں اور ان کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی خامی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔اس طرح وہ ان اخلاقی بیماریوں کی تشخیص کا راستہ ہی بند کردیتے ہیں۔

خودشناسی اور اپنے عیوب کا اعتراف کرنا بڑی جرأت وہمت کا کام ہے جس کے لیے آہنی عزم وارادے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ انسان ان عیبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔اگر کبھی اس کا کوئی عیب ظاہر ہوجائے تو وہ چالاکی سے اس کی تاویلیں کرنے لگتا ہے اور اس کا جواز ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

بعض اوقات تو اپنے عیوب کو پہچاننا انتہائی وحشت ناک ہوتا ہے اور اکثر لوگ اس وحشت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔لیکن اس کی انہیں بہت بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔

بہرحال حب ذات،خود پسندی اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا،خودشناسی کی منزل تک پہنچنے میں بنیادی رکاوٹ ہے۔جب تک یہ حجاب برطرف نہیں ہوتا،خودشناسی ممکن نہیں ہوسکتی اور جب تک انسان خودشناسی کا مرحلہ طے نہ کرلے اور اپنی خامیوں سے آگاہ نہ ہوجائے،تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کا راستہ اس پر بند رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی طرف سے جوارشادات ہم تک پہنچے ہیں، وہ اس بات کی صداقت کے زندہ گواہ ہیں۔رسولؐ اللہ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

اذا اراد اللہ بعبد خیرا فقھہ فی الدین وزھدہ فی الدنیا وبصرہ عیوبہ

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ اور دنیا میں زہد عطا کر دیتا ہے اور اس کے عیوب اس کو دکھا دیتا ہے۔'' (نہج الفصاحہ:۲۶)

حضرت علی علیہ السلام ایک مختصر مگر پر مغز جملے میں فرماتے ہیں:

جھل المرء بعیوبہ من اکبر ذنوبہ

''اپنے عیوب سے جاہل رہنا سب سے بڑا گناہ ہے۔'' (بحارالانوار، ۷۴:۴۱۹)

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ انسان کے لیے کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود پسندی کے اس حجاب کو پارہ کر کے اپنے عیوب سے آگاہ ہوجائے۔

مرحوم فیض کاشانی اس سلسلہ میں ایک مفید بحث میں اپنے عیوب کو پہچاننے کے چار راستے بیان فرماتے ہیں:

پہلا راستہ یہ ہے کہ انسان کسی ایسے استاد کی تلاش کرے جو نفس کے عیوب سے آگاہ ہو اور اخلاقی برائیوں کے مخفی پہلوؤں سے باخبر ہو۔جب انسان ایسا استاد تلاش کرلے تو اسے اپنے نفس کا حاکم بنالے اور اس کی رہنمائی میں قدم آگے بڑھائے۔مگر ہمارے دور میں اس کے امکانات بہت کم ہیں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ ایک سچے اور ایماندار دوست کی جستجو کی جائے اور اس سے درخواست کرے کہ اس کے معاملات پر نظر رکھے اور جب کبھی اس سے کوئی برا یا غیر اخلاقی فعل سرزد ہو، اسے اس سے آگاہ کرے۔بعض بزرگانِ دین فرمایا کرتے تھے:''رحم اللہ امرء اھدی الی عیوبی''، ''اللہ اس شخص پر رحم کرے جو میرے عیب مجھے تحفے میں دے۔'' لیکن ایسے افراد بھی بہت کم ہوتے ہیں، اس لئے کہ دوستوں کی اکثریت عیبوں کی پردہ پوشی کرتی ہے یا پھر بعض دوست ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسد جیسے جذبات کی وجہ سے آپ کے عیوب کو بڑھا چڑھا کر آپ کے سامنے بیان کریں گے۔داؤد بن نصیر طائی جو دوسری صدی ہجری کے عظیم عابد اور زاہد تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ لوگوں سے کیوں دور رہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: میں ایسے لوگوں کے نزدیک کیوں رہوں جو میرے گناہوں کو مجھ سے چھپاتے ہیں۔

دیندار افراد اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں کہ دوسروں کی نصیحت کی روشنی میں اپنے عیوب سے باخبر ہوں۔ لیکن آج کے دور میں حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں ہمارے عیب سے باخبر کرے تو وہی ہماری نظر میں قابل نفرت بن جاتا ہے۔ہم نہ صرف ان کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ الٹا ان سے جھگڑا کرنے لگتے ہیں، اپنے دل میں ان کے بارے میں کینہ اور غصہ بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان بھی ہم خود اٹھاتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم ان کی نصیحتوں

سے محروم ہو جاتے ہیں۔

تیسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے عیب اپنے دشمن کی زبان سے سنے، اس لئے کہ انسان کا دشمن بڑی باریک بینی سے اس کی کوتاہیوں اور خامیوں پر نظر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انسان ایک سخت کینہ پرور دشمن سے ایسی باتیں سیکھ لیتا ہے جو خوشامد کرنے والے دوستوں سے نہیں سیکھ سکتا۔

چوتھا راستہ یہ ہے کہ انسان لوگوں میں رہے۔ ان کے افعال و اخلاق کا غور سے مطالعہ کرے اور جو ناپسندیدہ اور مذموم صفات ان میں دیکھے، ان کے حوالہ سے اپنا جائزہ لیتا رہے کہ کہیں وہ صفات خود اس میں تو موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے اور انسان اس کے عیوب کے آئینے میں اپنے عیوب کو تلاش کر سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ آپؑ کو یہ آداب کس نے سکھائے؟ انہوں نے جواب دیا: میں نے یہ آداب کسی سے نہیں سیکھے لیکن جب میں نے جاہل کے جہل کو دیکھا اور وہ مجھے ناپسندیدہ لگا تو میں نے اس سے اجتناب کیا۔ (یہ بات حضرت لقمان کے بارے میں اس طرح مشہور ہے کہ آپ نے کس سے آداب سیکھے تو انہوں نے جواب دیا: بے ادب افراد سے)۔ (محجۃ البیضاء ۵:۱۱۲)

عبادت اور دعا روح کو پروان چڑھاتی ہیں

تہذیب اخلاق کے لیے دوسرا قدم یہ ہے کہ عبادات اور دعا کی طرف توجہ کی جائے۔ عبادت اور دعا تہذیب نفس اور اخلاقی فضائل کو پروان چڑھانے میں کتنا موثر کردار ادا کرتی ہیں، یہ جاننے کے لیے ہر چیز سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم عبادت کی حقیقت کو سمجھیں۔

عبادت کی حقیقت کے بارے میں گفتگو اگرچہ بہت طولانی اور مفصل ہے مگر اختصار کے ساتھ اس کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ عبادت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لفظ ''عبد'' کے مفہوم پر غور کیا جائے، اس لیے کہ ''عبادت''، ''عبد'' سے ماخوذ ہے۔

لغت کی رو سے ''عبد'' اس شخص کو کہتے ہیں جو سر سے پاؤں تک اپنے مالک اور آقا کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ آقا کے ارادے کے تابع اور اس کی ہر خواہش اس کے آقا کی خواہش کے تابع ہوتی ہے۔ اپنے مالک کے مقابلہ میں وہ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک نہیں سمجھتا اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی سستی روا نہیں رکھتا۔

اس لحاظ سے عبودیت کسی ایسی ذات کے سامنے خشوع و خضوع کے انتہائی درجے کا اظہار ہے جس سے انسان کا وجود اور اس کی ہر چیز وابستہ ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی انسان کا معبود صرف وہ ہو سکتا ہے جس نے اس پر بے حد و حساب انعام و اکرام کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں ہے۔

بالفاظِ دیگر ''عبودیت'' کسی انسان کی روح کے ارتقاء کا اعلیٰ ترین مرحلہ ہے۔ یہ انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کا دوسرا

نام ہے۔''عبودیت'' اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کے سامنے بے قید و شرط اور سو فیصد سپردگی کا نام ہے۔ بنا برایں، عبادت صرف رکوع و سجود اور قیام و قعود کا نام نہیں بلکہ یہ کمال مطلق اور ہر عیب و نقص سے پاک ذات کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسا عمل کمالِ مطلق کی طرف توجہ کرنے اور ہر قسم کی ناپاکی و آلائش سے اجتناب کا بہترین محرک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عمل کے ذریعے انسان اپنے معبود کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ معبود کے جلال و جمال کا پرتو اس کے وجود میں منعکس ہو جائے اور وہ ''مظہر صفاتِ خدا'' بن جائے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

العبودية جوهرة كنهها الربوبية (مصباح الشریعہ بحوالہ میزان الحکمہ، مادہ: عبد)

''عبودیت ایک ایسا جوہر ہے جس کے باطن میں ربوبیت پوشیدہ ہے۔''

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عبادت کے ذریعے عبد کوشش کرتا ہے کہ اس کے کردار اور صفات میں رب کی صفات جلال و جمال کا ظہور ہو۔ اس کے علاوہ عبد، عبودیت کے زیر سایہ ولایت تکوینیہ کے مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ (ولایت تکوینیہ کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو ولایت تکوینیہ حاصل ہے یا نہیں۔ اگرچہ علماء کی ایک جماعت انبیاء، آئمہ اور اولیاء کے بعد ولایت تکوینیہ کی قائل ہے مگر بزرگ علماء کی اچھی خاصی تعداد ولایت تکوینیہ کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص قرار دیتی ہے)۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن شریف کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ فضائل اخلاقی کی پرورش میں عبادت کیا کردار ادا کرتی ہے۔

۱۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱ (بقرہ:۲۱)

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

۲۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۸۳

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔'' (بقرہ: ۱۸۳)

۳۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ

''اور نماز قائم کرو، بے شک نماز بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے۔'' (عنکبوت: ۴۵)

۴۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

''یقیناً انسان حریص اور کم ہمت پیدا کیا گیا ہے۔ جب کوئی برائی اسے پہنچتی ہے تو بیتابی کرتا ہے اور جب کوئی خیر اور بھلائی اسے پہنچتی ہے تو دوسروں کو اس سے روکتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نمازوں کو دوام بخشتے ہیں۔'' (معارج: ۱۹ تا ۲۳)

۵۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ: ۱۰۳)

''ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو اور اس کے ذریعے انہیں پاک کرو اور ان کا تزکیہ کرو۔''

۶۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں اور آگاہ رہو کہ اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔'' (رعد: ۲۸)

۷۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز اور صبر کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (بقرہ: ۱۵۳)

تفسیر اور نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں عبادت کا تقویٰ، گناہوں سے پرہیز اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے ساتھ قریبی تعلق نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جو لوگ تہذیب نفس کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ سالکانِ راہِ خدا اور تقویٰ و خودسازی کی منزل کے مسافروں پر لازم ہے کہ وہ عبادت اور دعا کے ذریعے مدد مانگیں اور اپنے وجود کی آلائشات کو عشق خدا کی بھٹی میں جلا کر ان سے چھٹکارا حاصل کریں اور اس طرح اپنے وجود کے تانبے کو کیمیائے عبادت کے ذریعے سونا بنالیں۔

اس سلسلہ میں مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت بغیر کسی استثناء کے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے انہیں یہ کہہ رہی ہے:

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝۲۱

(بقرہ:۲۱)

اس آیت میں گزشتہ لوگوں کی غفلت کی طرف اشارہ کرنے سے شاید یہ مقصود ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اپنی بت پرستی کا جواز یہ بتاتے تھے کہ ان کی گزشتہ نسلیں بت پرستی اور شرک کی راہ پر چل رہی تھیں۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہا ہے کہ تمہارا اور تم سے پہلے سب لوگوں کا خالق اللہ ہی ہے، وہ ہر ایک اور ہر چیز کا خالق و مالک ہے اور صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ بت کسی طور پر بھی پرستش کے لائق نہیں ہیں۔اگر تم اخلاص کے ساتھ اس کی بندگی وعبادت کروگے تو تمہارے وجود کی شاخوں پر تقویٰ کے پھول کھلیں گے۔تمہاری موجودہ غیر اخلاقی صورتحال کی وجہ تمہاری جاہلانہ عبادات ہیں۔

یہ آیت عبادت اور تقویٰ کے تعلق کو غیر مشروط طور پر بیان کرتی ہے۔

دوسری آیت میں روزہ اور تقویٰ کے باہمی ربط وتعلق کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہا ہے:

''اے اہل ایمان! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝۱۸۳

ہر انسان اس بات کو بخوبی درک کرسکتا ہے کہ جب وہ روزہ کی حالت میں ہوتا ہے تو ایک خاص نورانیت اور پاکیزگی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے وہ اپنے آپ کو نیکی کے قریب تر اور برائیوں سے دور محسوس کرتا ہے۔اعداد وشمار سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہِ مبارک رمضان میں معاشرے میں جرائم کی سطح نیچے آجاتی ہے۔اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان جس قدر اللہ کی بندگی کے نزدیک ہوتا ہے، اتنا ہی برائیوں سے دور ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں نماز اور فحش حرکات ومنکرات سے دوری کا باہمی تعلق نظر آتا ہے۔اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے:

''نماز قائم کرو، یقیناً نماز (انسان کو) برائی اور گناہ سے باز رکھتی ہے۔''

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ

اس آیت میں ''فحشاء و منکرات'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تمام غیر اخلاقی افعال کے مجموعہ پر منطبق ہوتے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام غیر اخلاقی افعال کا سرچشمہ وہ غیر اخلاقی اقدار ہوتی ہیں جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔

بالفاظ دیگر یہ اندرونی اخلاق ہے جو ظاہری اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نماز فحشاء ومنکرات سے اس لئے روکتی ہے کہ نماز کے بامعنی اذکار واعمال کی بدولت انسان قرب خدا کی روحانی دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کے محرکات یعنی ہوائے نفس اور حب دنیا سے دور ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پابند نماز افراد کی زندگی میں گناہ کم نظر آتا ہے۔جس قدر نماز زیادہ معنویت کے ساتھ ادا کی جائے،اسی تناسب سے انسان برائی اور بدکاری سے دور ہوجاتا ہے اور اسی قدر انسان کے اندر اخلاقی صفات واضح اور آشکار ہوجاتی ہیں۔

چوتھی آیت میں صرف نماز یوں کو بعض اخلاقی رذائل مثلاً مشکلات میں بے صبری،حصول دولت کے بعد بخل وغیرہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''انسان حریص اور کم ہمت پیدا ہوا ہے،جب کوئی برائی اس پر آتی ہے تو وہ بے صبری کرنے لگتا ہے، جب اسے کوئی بھلائی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے اور دوسروں کا حق روکتا ہے،سوائے ان نمازیوں کے جو باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں۔''

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ (معارج:۱۹ تا ۲۳)

یہ آیت اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کردیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی طرف توجہ،عبادت اور دعا،انسان کے باطن سے بخل،بے صبری اور دیگر اخلاقی برائیوں کے خاتمہ پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔

پانچویں آیت میں زکوٰۃ اور روح کی پاکیزگی وتزکیہ نفس کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ ایک اہم عبادت ہے۔اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے:

''ان کے اموال سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کرو تاکہ تم اس کے ذریعے ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ نفس کرو۔''

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (توبہ:۱۰۳)

''تزکیھم بھا'' کے الفاظ واضح طور پر اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ زکوٰۃ کے ذریعے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے،اس لئے کہ زکوٰۃ کے ذریعے انسان بخل،حرص،دنیا پرستی اور حب مال جیسے رذائل سے پاک ہوجاتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان دوستی،سخاوت اور غریبوں سے ہمدردی جیسی اخلاقی صفات انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث نقل ہوئی ہیں،وہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔رسولؐ اللہ ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

ما تصدق احدکم بصدقة من طیب۔ و لا یقبل اللہ الا اخذھا الرحمان بیمینه و ان کانت تمرة فتربو من کف الرحمان فی الرحمان حتی تکون اعظم من الجبل

''تم میں سے جو کوئی مالِ حلال سے صدقہ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ سوائے مال حلال کے قبول نہیں فرماتا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاتھ سے وصول فرماتا ہے، خواہ وہ کھجور کا ایک دانہ ہو۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔'' (صحیح مسلم، ۲:۱۰۲، مطبوعہ بیروت)

یہ حدیث انتہائی بامعنی تشبیہ اور کنایہ پر مشتمل ہے اور زکوٰۃ ایسی عظیم عبادت کی اہمیت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے براہِ راست تعلق کو واضح کرتی ہے۔

چھٹی آیت میں ایک اور اہم عبادت یعنی اللہ کے ذکر کی اس خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ اطمینانِ قلب کا ذریعہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے ذریعے اطمینان پاتے ہیں اور آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾

اطمینان قلب ہمیشہ اللہ پر توکل، مادیات سے عدم تعلق اور دنیوی زیب و زینت، طمع، بخل اور حسد جیسی صفاتِ رذیلہ سے دوری میں مضمر ہے۔ اگر یہ صفات انسان کے دل میں موجود ہوں تو انسان کبھی اطمینانِ قلب حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ کا ذکر ان صفاتِ رذیلہ کو انسان کے دل سے دور کرنے میں گہرا اثر رکھتا ہے تاکہ انسان کا دل سکون کی دولت حاصل کر سکے۔

بالفاظ دیگر اگر ہم انسان کے دل میں موجود بے سکونی و اضطراب پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی اصل وجہ قلب میں موجود اخلاقی رذائل ہیں۔ اللہ کا ذکر اخلاقی رذائل کی جڑوں کو جلا کر خاکستر کر دیتا ہے اور بے اطمینانی کو اطمینان میں بدل دیتا ہے[1]۔

ساتویں آیت میں انسان کی روحانی قوت کے لیے نماز اور روزہ کے اثر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز اور صبر (روزہ) کے ذریعے مدد طلب کرو، اس لئے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (بقرہ:۱۵۳)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾

بعض احادیث میں آیا ہے کہ اس آیت میں صبر سے مراد روزہ ہے۔ یہ درحقیقت صبر کے ایک مصداق کا ذکر ہے ورنہ صبر کا

---

[1] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں جہاں اس کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔

مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت، اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں استقامت اور ناخوشگوار حوادث کے سامنے ثابت قدمی بھی شامل ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو آپؑ نماز پڑھتے اور اس کے بعد آیہ شریفہ "واستعینوا بالصبر و الصلوۃ" کی تلاوت فرماتے۔

کان علی اذا احالہ امر فزع، قام الی الصلوۃ ثم تلاھذہ الآیۃ واستعینوا بالصبر و الصلوۃ (اصول کافی بحوالہ المیزان، ۱: ۱۵۴)

یہ حدیث بھی اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ نماز انسان کو قوت بخشتی ہے۔

درحقیقت یہ عبادات انسان کے اندر توکل، شجاعت، ہمت اور صبر و استقامت جیسے فضائل پیدا کرتی ہیں اور خوف، بزدلی، تذبذب، بے چینی اور دنیا پرستی جیسے رذائل اخلاقی سے انسان کے دل کو پاک کر دیتی ہیں۔ اس طرح انسان کے دل میں بہت سے اخلاقی فضائل زندہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے اخلاقی رذائل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

نتیجہ

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبادات مختلف پہلوؤں سے تہذیب اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس تاثیر کے مختلف پہلوؤں کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اگر انسان اپنی زندگی میں خالق کائنات کی طرف توجہ رکھے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال و افعال کے بارے میں محتاط ہو جاتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو، اپنی خواہشاتِ نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ دنیا اللہ کی سلطنت ہے اور اللہ کی سلطنت میں اللہ کی نافرمانی بدترین ناشکری ہے۔

۲۔ عبادات خصوصاً دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ جلال و جمال بیان ہوئی ہیں، ان کا ذکر دعا کرنے والے کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ ان صفات کا پرتو اس کے اندر منعکس ہو جائے اور وہ اخلاقی ترقی کی راہ پر پیشرفت کرنے لگتا ہے۔

۳۔ آخرت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم اور پرجلال عدالت کی طرف توجہ بھی انسان کی روح و جسم کی پاکیزگی پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

۴۔ اگر عبادات اور دعا قلبی توجہ اور آداب کے ہمراہ ہو تو انسان کے باطن میں ناقابل بیان نورانیت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے جس کے سامنے رذائل اخلاقی کی قوت ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لحظہ کے لیے حضورِ قلب کے ساتھ انجام دی گئی عبادت اور دعا کے بعد انسان اپنے آپ کو نیکیوں کے بہت قریب محسوس کرتا ہے۔

۵۔ عبادات اور دعاؤں کے معنی اخلاقی تعلیمات اور سیر و سلوک الی اللہ کے اسرار و رموز سے سرشار ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان میں غور و فکر کرے تو اسے عظیم درس ملتے ہیں۔ خودسازی کے عاشق اور سالکانِ الی اللہ عبادات کے ذریعے اپنے اعلیٰ مقصد تک رسائی

حاصل کر سکتے ہیں۔عبادات، مناجات اور دعاؤں کے بغیر خاص طور پر عبادت اور ذکر وفکر سحر کے بغیر کوئی شخص کسی روحانی مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔

پاکیزگی روح میں عبادات کا کردار احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ان تمام کا ذکر کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔لہٰذا ہم ان کی طرف مختصر اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ وہ تمام احادیث جن میں فلسفہ احکام کو بیان کیا گیا ہے، ان سب میں دل کی پاکیزگی اور روحانی طہارت کے حصول میں عبادات کے کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

فرض الله الايمان تطهيرا من الشرك، و الصلوة تنزيها عن الكبر والزكاة تسبيبا للرزق،والصيام ابتلاء لاخلاص الخلق

''اللہ تعالیٰ نے ایمان کو، دلوں کو شرک سے پاک کرنے، نماز کو تکبر سے دوری کے لیے، زکوٰۃ کو وسعت رزق کے لیے اور روزہ کو بندوں میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے فرض کیا۔''

(نہج البلاغہ، کلمات قصار: ۲۵۲)

۲۔ رسولؐ اللہ کی ایک مشہور حدیث میں نماز کو صاف وشفاف پانی کی نہر سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے گھر کے سامنے بہہ رہی ہو اور انسان ہر روز پانچ مرتبہ اس میں نہاتا ہو۔ظاہر سی بات ہے کہ ایسے شخص پر کسی قسم کی گندگی باقی نہیں رہ سکتی۔

اسی طرح احادیث میں ہر عبادت کے آثار ونتائج کا ذکر کیا گیا ہے جو تہذیب نفس پر عبادت کے اثرات کو بیان کرتی ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام عبادت کے آثار کے بارے میں فرماتے ہیں:

فان قال فلم تعبدهم؟ قيل لئلا يكونوا ناسين لذكره ولاتاركين لادبه ولا لاهين عن امره و نهيه، اذا كان فيه صلاحهم و قوامهم، فلوتركوا بغير تعبد، لطال عليهم الامدفقست قلوبهم

''اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ نے بندوں کو کیوں عبادت کا حکم دیا ہے؟ (یعنی ان کی عبادت کی اسے کیا ضرورت ہے؟) ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ نے اس لیے عبادت کا حکم دیا تا کہ لوگ اس کی یاد کو بھلا نہ دیں، اس کی بارگاہ کے ادب واحترام سے غافل نہ ہو جائیں۔اس کے اوامر ونواہی کو نظر

انداز نہ کریں، اس لئے کہ اسی میں ان کی بہتری ہے۔ اگر لوگ عبادت کے بغیر چھوڑ دیئے جاتے تو ان پر غفلت کے طویل دورانیے آ جاتے اور ان کے دل سخت ہو جاتے۔''

(عیوان الاخبار الرضاؑ بحوالہ نور الثقلین، ۱:۳۹)

۴۔ ایک اور حدیث میں امام رضا علیہ السلام نماز کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مع مافیه من الایجاب والمداومة علی ذکر الله عزوجل باللیل و النهار لئلا ینسی العبد سیده و مدبره و خالقه، فیبطر و یطغی ویکون فی ذکره لربه و قیامه بین یدیه زاجر اله عن المعاصی و مانعاله عن انواع الفساد

''عبادت کے سبب بندہ شب و روز اللہ تعالیٰ کا باقاعدگی سے ذکر کرتا ہے تاکہ وہ اپنے آقا، مدبر اور خالق کو فراموش نہ کر دے اور غرور و سرکشی میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اللہ کا ذکر اور اس کی بارگاہ میں کھڑے ہونا انسان کو گناہوں سے روکتا ہے اور مختلف قسم کی خرابیوں سے بچاتا ہے۔'' (وسائل الشیعہ، ۳:۴)

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نماز کے نتائج اور اس کی قبولیت کے پیمانہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

من احب ان یعلم ان قبلت صلاته ام لم تقبل فلینظر هل منعت صلاته عن الفضشاء و المنکر، فبقدر ما منعته قبلت

''جو شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں تو وہ یہ دیکھے کہ اس کی نماز اسے بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے یا نہیں؟ جس قدر اس کی نماز اسے بدکاری اور گناہ سے روکتی ہے، اتنی ہی وہ قبول ہوئی ہے۔'' (مجمع البیان، ۸:۲۵۸)

یہ حدیث اس بات کو نہایت واضح طور پر بیان کر رہی ہے کہ صحیح نماز کا اخلاقی ارتقاء، برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی انجام دہی کے ساتھ براہِ راست اور قریبی تعلق ہے۔ جن کی نماز میں یہ اثر نہیں ہے، ان کی نماز ایک بے جان نماز کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسی نماز سے ادائے فرض کی خانہ پری تو ہو جاتی ہے مگر وہ اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں روزے کا فلسفہ اس طرح بیان ہوا ہے:

ان الصوم یمیت مراد النفس و شهوة الطبع الحیوانی، وفیه صفاء القلب و طهارة الجوارح و عمارة الظاهر و الباطن، والشکر علی النعم والاحسان الی

الفقراء، و زيادة التضرع والخشوع، والبكاء و جعل الالتجاء الى الله، و سبب انكسار الهمة، و تخفيف السيئات، وتضعيف الحسنات، و فيه من الفوائد مالا يحصى (بحارالانوار، ۹۳: ۲۵۴)

''روزہ ہوائے نفسانی اور خواہشاتِ حیوانی کو مار دیتا ہے۔ یہ قلب کی پاکیزگی اور اعضاء کی طہارت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انسان کے ظاہر و باطن کی آبادی کا سبب ہوتا ہے اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے، فقراء کے ساتھ نیکی و احسان، تضرع اور عاجزی، اللہ کی بارگاہ میں گریہ و التماس کا محرک ہوتا ہے۔ یہ ہمت گناہ کو توڑتا ہے، گناہوں کو کم کرتا ہے، نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے فوائد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔''

اس حدیث میں روزے کے چودہ مثبت اثرات کا ذکر کیا گیا ہے جو اخلاقی فضائل و اعمال کا ایک مجموعہ ہے۔

۷۔ ہم اس مفصل بحث کا خاتمہ امیر المومنین علیہ السلام کی ایک حدیث پر کرتے ہیں (جو لوگ تفصیل کے خواہشمند ہوں، وہ وسائل الشیعہ اور بحارالانوار میں ہر عبارت کے شروع میں اس کی فضیلت کی احادیث کی طرف رجوع فرمائیں)۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

دوام العبادة برهان الظفر بالسعادة

''عبادت میں باقاعدگی اور استمرار سعادت تک پہنچنے کا ثبوت ہے۔'' (غرر الحکم: ۷ ۵۱۴)

بلاشبہ جو لوگ سعادت کے طالب ہیں، انہیں اللہ کی عبادت، دعا اور مناجات کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا احادیث عبادت اور پاکیزگی قلب و تہذیب نفس کے قریبی تعلق پر روشنی ڈالتی ہیں، خصوصاً عبادت جس قدر اخلاص اور حضورِ قلب پایا جائے، اس کا یہ اثر اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔

اس بات کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب انسان اخلاص اور حضورِ قلب سے عبادت کرتا ہے تو اس کے بعد اپنے قلب و روح میں ایک خاص پاکیزگی اور نورانیت محسوس کرتا ہے۔ اس کے اندر نیکی کا رجحان بڑھ جاتا ہے اور اس کی طبیعت گناہ اور برائی سے متنفر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قریب محسوس کرتا ہے۔ اس کے اندر بندگی اور تسلیم و رضا کا جذبہ بھی قوی ہو جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ ایک نتیجہ تمام عبادات میں مشترک ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے حضور خشوع و خضوع اور اس کے لیے اخلاص و تسلیم، یادِ الٰہی کا دل میں زندہ رہنا اور غفلت کا خاتمہ، اس کے علاوہ ہر عبادت کے اپنے مخصوص نتائج و اثرات بھی

انسان کی روح پر مرتب ہوتے ہیں۔

ان کے مخصوص نتائج ان عبادات کے ساتھ ایک خاص ربط اور تعلق رکھتے ہیں۔نماز فحشاء ومنکرات سے روکتی ہے۔روزہ قوتِ ارادی کو مضبوط کرتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی کو عقل کے قابو میں دیتا ہے۔حج انسان کو دنیا کی چکا چوند سے آزاد کرتا ہے اور زکوۃ بخل اور حرص سے نجات دیتی ہے۔

ذکرِ خدا اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔ہر ذکر انسان کو اللہ کی کسی صفتِ جلال و جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا عکس اپنے اندر پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس طرح جو شخص ان تمام عبادات کو انجام دیتا ہے، وہ ان کے مشترک اور عام اثر کے علاوہ ان کے مخصوص اثرات سے بھی فیضیاب ہوتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے اندر اخلاقی فضائل کو پروان چڑھا سکتا ہے۔بنابرایں ہماری عبادت اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا اور مناجات، خودسازی کا ایک موثر قدم ہوتی ہیں، بشرطیکہ ہم ان عبادات کی روح اور ان کی حکمتوں سے آگاہی رکھتے ہوں اور صرف ان کے ظاہری پہلو پر اکتفانہ کریں۔ذکر خدا کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ہم مستقل عنوان کے تحت اس پر بحث کریں گے۔

اللہ کا ذکر اور پرورش روح

قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی روشنی میں علمائے اخلاق روح کی پاکیزگی اور تہذیب نفس کے معاملہ میں ذکر اللہ کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہوئے ہیں۔اسی وجہ سے انہوں نے سیر وسلوک کے تمام مراحل کے لیے مختلف اذکار کا ذکر کیا ہے، مثلاً مرحلہ توبہ میں ''یا غفار''، مرحلہ محاسبہ میں ''یا حسیب'' اور حصول رحمت الٰہی کے لیے ''یا رحمن'' اور ''یا رحیم'' کا ذکر تجویز کیا ہے۔

یہ اذکار مخصوص حالات اور سیر وسلوک کے مراحل کے علاوہ بھی، ذکر اللہ کی حیثیت سے ہر حال میں اچھے اور مفید ہیں۔اللہ کا ذکر بلاشبہ بہت بڑی عبادت ہے جو نفس اور شیطان کے وسوسوں کے مقابلہ میں انسان کی حفاظت کرتا ہے۔

خود پسندی اور غرور انسان کی سعادت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔اللہ کا ذکر ان رکاوٹوں کو برطرف کرتا ہے۔انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور اسے ان خطرات سے آگاہ کرتا ہے جو اس کی سعادت کو لاحق ہو سکتے ہیں۔

اللہ کا ذکر بارش کے حیات افروز قطروں کی مانند انسان کے قلب وروح کی سرزمین کو فضیلت وتقویٰ کے گلستان میں تبدیل کر دیتا ہے۔اس عبادت کی اہمیت کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے، کم ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی روشنی میں اللہ کے ذکر کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ تَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُہُمۡ بِذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾

''(اہل بیتؑ) وہ ہیں جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔

آگاہ رہو کہ دلوں کو اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان ملتا ہے۔'' (رعد:۲۸)

۲۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (عنکبوت:۴۵)

''اورنماز قائم کرو، بے شک نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔''

۳۔ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ (طٰہٰ:۱۴)

''بلاشبہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔''

۴۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝

''تم اور تمہارا بھائی میری آیات کے ساتھ جاؤ اور میری یاد کے بارے میں کوتاہی نہ کرو۔''(طٰہٰ:۴۲)

۵۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا

''اور جو میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی تنگ ہوجائے گی۔''(طٰہٰ:۱۲۴)

۶۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، صرف اس کی توجہ و عنایت کے طالب ہوتے ہیں۔تم دنیوی زندگی کی زیب وزینت کے لیے ان سے نظریں نہ پھیرو اور اس شخص کی اتباع نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی میں لگ گیا اور حد سے بڑھ گیا۔''(کہف:۲۸)

۷۔ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ (نجم:۲۹)

''جو ہماری یاد سے منہ موڑے ہوئے ہے اور دنیوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا، اس سے منہ پھیر لو۔''

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝ (احزاب:۴۱ تا ۴۳)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرو۔ وہی جو تم پر

رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر نور میں لے آئے اور وہ مومنین پر رحیم ہے۔''

۹۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ (مائدہ:۹۱)

''شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے۔''

۱۰۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور:۳۷)

''ایسے مرد جنہیں تجارت اور خرید وفروش اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتے۔''

تفسیر ونتیجہ

پہلی آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی یاد کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کے دل کو اس سے اطمینان ملتا ہے۔ اس سے مراد وہ اطمینان ہوتا ہے جو انسان کو لغزشوں اور خطاؤں سے آزادی دلائے اور اسے اخلاقی فضائل سے آراستہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہدایت یافتہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اللہ کے ذکر کی بدولت ان کے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ

اس کے بعد عام ضابطہ بیان کر دیا گیا کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

اس غیر معمولی اطمینان کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی پریشانی یا اضطراب کا سبب مبہم مستقبل ہوتا ہے یا تلخ ماضی۔ بالفاظ دیگر مستقبل میں رونما ہونے والے نامعلوم حوادث کا خوف یا ماضی میں رونما ہونے والے حوادث کی تلخ یادیں انسان کا آرام واطمینان تباہ کر دیتی ہیں اور انہی کے سائے بھوت بن کر انسان کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو نہ صرف تمام انسانوں بلکہ ساری کائنات کا سخی وکریم، رحمن ورحیم اور خالق ورازق رب ہے، جو ہر مشکل کو آسان کرنے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے اور پیچیدہ ترین مشکلات اس کے ارادے کے سامنے بالکل سادہ ہیں، اس رحمن ورحیم رب کا ذکر اور اس کی یاد انسان کو ان تمام پریشانیوں اور اضطرابات سے نجات دیتی ہے۔ انسان کے اندر اخلاقی فضائل کی پرورش کی راہ ہموار کرتی ہے۔ جب انسان اللہ کی یاد کے ذریعے اطمینان کی دولت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾

وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾ (فجر:۲۷تا۳۰)

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف واپس آ جا،تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے، پس میرے بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا۔''

دوسری آیت میں پہلے یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز انسان کو فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے۔ اس کے بعد کہا گیا: "ولذکر اللہ اکبر" یعنی ''اللہ کا ذکر سب سے بڑی بات ہے۔''

بلاشبہ اللہ کا ذکر نماز کی روح ہے جبکہ روح کسی چیز کا اشرف ترین جزو ہوتا ہے۔ اگر نماز فحشاء و منکرات سے روکتی ہے تو اس کی وجہ اللہ کا ذکر ہی ہے، اس لئے کہ اللہ کا ذکر انسان کو اللہ کی نعمتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور نعمتوں کی یاد انسان کو ان نعمتوں کے بخشنے والے کی نافرمانی سے روکتی ہے اور وہ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اللہ کا ذکر انسان کو قیامت اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان اور پرجلال عدالت کی یاد دلاتا ہے، انسان کو ملائکہ عذاب اور ملائکہ رحمت کی یاد دلاتا ہے جو بدکاروں کو سزا دینے اور نیکوکاروں کی پذیرائی اور استقبال پر مامور کئے جائیں گے۔ یہ چیز بھی انسان کو گناہ سے باز رکھنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔

بعض مفسرین نے "ولذکر اللہ اکبر" کے ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ اس جملے کی رو سے ''اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے۔''

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ''ذکر اللہ'' سے مراد وہ ذکر ہے جو اللہ اپنے بندے کا کرتا ہے۔ یعنی جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو جواباً اللہ تعالیٰ بھی اس کا ذکر کرتا ہوے۔ (محجۃ البیضاء، ۲:۲۶۶)

اللہ کا یہ ذکر انسان کو عبودیت اور بندگی کے اعلیٰ درجات کی طرف مائل اور راغب کرتا ہے اور یہ ذکر ہر چیز سے افضل اور برتر ہوتا ہے۔ لیکن پہلے معنی اور آیت کے درمیان زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔

تیسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہونے والی وحی کا ذکر ہے جس میں انہوں نے سرزمین طور پر ایک درخت کے قریب اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنا:

''میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری عبادت کر اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔''

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾

اس آیت میں اللہ کی یاد کو نماز کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔ پہلی وحی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس سے اللہ کے ذکر کی غیر معمولی اہمیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ توحید کے ذکر کے فوراً بعد اللہ کے ذکر اور نماز کا ذکر کرنا اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون سے خطاب کیا گیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ

السلام کو مبعوث کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ تم اور تمہارا بھائی فرعون کی طرف جاؤ اور میرے ذکر کے بارے میں کوتاہی نہ کرو:

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾

اللہ کے ذکر کا حکم اور وہ بھی فرعون جیسے جابر و سرکش کے خلاف، جنگ کے وقت، بہت پر معنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر انسان کو باطل کے خلاف جنگ میں کس قدر قوت، طاقت اور شجاعت عطا کرتا ہے۔

تفسیر فی ظلال میں اس آیت کی تشریح میں کہا گیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون سے کہا کہ میرا ذکر تمہارا ہتھیار اور اسلحہ ہے اور ایسا سہارا ہے جس پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔'' (فی ظلال القرآن، ۵: ۴۷۴)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں ذکر سے مراد پیامِ رسالت کی تبلیغ ہے جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی یاد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تشریحات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ جب اللہ کا رسولؑ، اللہ کے ذکر میں مشغول ہو اور اس سے روحانی طاقت حاصل کر رہا ہو تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ زیادہ موثر طور پر کر سکے گا۔

پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ترک کرنے کے بعض آثار و نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو کوئی میری یاد سے روگردانی کرے گا، اس کی زندگی سخت اور تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے نابینا محشور کریں گے۔''

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

ان لوگوں کی دنیوی سزا تنگ اور سخت زندگی اور اخروی سزا یہ ہے کہ وہ اندھے محشور ہوں گے۔

زندگی کی تنگی بعض اوقات اقتصادی مشکلات کی صورت میں ہوتی ہے اور بعض اوقات مال و دولت کی فراوانی کے باوجود بخل، حرص اور طمع کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ایسا انسان کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کے دروازے کھلے ہوں اور لوگ اس کی زندگی اور اس کے مال و دولت سے استفادہ کریں۔ ایسا شخص فقراء اور مساکین کو ان نعمتوں میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کر رکھی ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ دولت مند بخیل دنیا میں فقراء جیسی زندگی بسر کرتے ہیں اور آخرت میں حساب دولت مندوں کی طرح دیں گے۔ (بحار الانوار، ۶۹: ۱۱۹)

يعيش في الدنيا عيش الفقراء و يحاسب في الآخرة حساب الأغنياء

اللہ کی یاد سے غافل دولت مندوں کی اکثریت کا یہی حال ہوتا ہے۔ ان کا بخل اور ان کی طمع ہر وقت ایک آگ بن کر ان کی زندگی کو سلگاتی رہتی ہے۔ مال و دولت کی فراوانی کے باوجود انہیں آرام و اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

آخرت میں اندھا محشور ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس دنیا کے حقائق اور اس دنیا کے حقائق کے درمیان مکمل ہماہنگی پائی جاتی

ہے۔اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے والے ان حقائق کو اور آیات حق کو دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں جو اس دنیا میں ہر طرف موجود ہیں۔لہٰذا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اندھے پیش کئے جائیں گے۔

چھٹی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جارہا ہے کہ ان لوگوں کی پیروی سے اجتناب کریں جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ رہیں جو صبح وشام اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ان لوگوں کے ساتھ رہو جو صبح وشام اللہ کو پکارتے ہیں اور صرف اس کی توجہ اور عنایت کے طالب ہیں۔دنیا کی زیب وزینت کی خاطر ہرگز ان سے نظریں نہ پھیرو اور اس شخص کی پیروی نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔''

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

واضح سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بلاوجہ یہ سزا نہیں دے سکتا کہ اس کے دل کو اپنے ذکر سے غافل کر دے۔یہ سزا درحقیقت ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حق سے دشمنی کی راہ کو اپنایا اور تکبر،ہٹ دھرمی یا اندھی تقلید کی بنیاد پر حق سے دشمنی کرتے ہیں۔بالفاظ دیگر ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے اعمال کی سزا کے طور پر غفلت کو ان کے دلوں پر مسلط کر دیا ہے۔لہٰذا اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

یہ غافل افراد ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اعمال افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔اسی حقیقت کو آیت کے اختتام پر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

اس آیت سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے ذکر سے غافل ہونا انسان کے اخلاق پر منفی اثرات ڈالتا ہے اور اسے ہوس پرستی اور افراط وتفریط کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی روح میں ''اللہ'' یا ''ہوائے نفس'' میں سے کوئی ایک ہی اپنا گھر بنا سکتا ہے۔ان دونوں کا اجتماع ممکن نہیں ہے۔نفس پرستی اور اتباع ہوائے نفس انسان کو اللہ اور اللہ کی مخلوق سے غافل کر دیتی ہے۔اللہ کی یاد سے غفلت انسان کو اخلاقی اصولوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

ساتویں آیت میں بھی روئے سخن رسولؐ اللہ کی طرف ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ان لوگوں سے منہ موڑنے کا حکم دے رہا ہے جو

اللہ کی یاد سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جن لوگوں نے ہماری یاد سے منہ موڑا اور صرف دنیوی زندگی کے طلبگار رہیں، ان سے منہ موڑ لو۔''

فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۙ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿۲۹﴾

اس آیت میں ''اللہ کے ذکر'' کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن شریف ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس سے عقل اور منطقی دلائل مراد ہیں جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایمان ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''اللہ کا ذکر'' ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں یہ ساری چیزیں آ جاتی ہیں۔

بعض نے یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت ترک جہاد کی دعوت دے رہی ہے۔لہٰذا آیاتِ جہاد نے ان تمام آیات کو منسوخ کر دیا ہے، حالانکہ یہ آیت کسی چیز کو منسوخ نہیں کر رہی ہے بلکہ صرف ان لوگوں کی ہم نشینی کو ترک کرنے کا حکم دے رہی ہے جو اللہ کے ذکر سے غافل ہیں۔

اس آیت میں ''دنیا پرستی'' اور ''ترک ذکر خدا'' کا باہمی تعلق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔اس طرح اللہ کے ذکر کا اخلاقی فضائل کی پرورش میں اور ترک ذکر کا رذائل اخلاق کی پرورش میں کردار کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

آٹھویں آیت میں تمام مومنین کو خطاب کر کے انہیں اللہ کے ذکر کی طرف دعوت دی جا رہی ہے اور اس کا تاریکیوں سے نکلنے اور نور میں داخل ہونے سے تعلق بیان کیا جا رہا ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں تا کہ وہ تمہیں جہل، شرک اور گناہ کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، توحید اور تقویٰ کے نور کی طرف تمہاری رہنمائی کرے اور وہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوا اللّٰهَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوۡهُ بُکۡرَةً وَّاَصِیۡلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَکَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ﴿۴۳﴾

یہ بات قابل غور ہے کہ اہل ایمان کو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے اور صبح و شام اس کی تسبیح کرنے کا حکم دینے کے بعد اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا کا ذکر کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان تاریکیوں سے نکل کر نور میں آ جاتا ہے۔اس سے ہمارا یہی موقف ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر اخلاقی رذائل کی تاریکیوں کو دور کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے اور اسے بتدریج اخلاقی فضائل سے آراستہ کر دیتا ہے۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ یہ آیت ''ذکر کثیر'' کی علت کو بیان کر رہی ہے۔(المیزان،۶:۳۲۹)

اس آیت میں ذکر کثیر سے کیا مراد ہے؟اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ذکر مراد ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس سے مراد تسبیحات اربعہ کو تیس دفعہ پڑھنا یا تسبیح حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا پڑھنا مراد ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ نے جو بھی حکم دیا ہے،اس کی حدود مقرر ہیں اور حالت عذر میں وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے۔لیکن اللہ کا ذکر ایسا فریضہ ہے جس کی نہ تو کوئی حد مقرر کی گئی ہے اور نہ ہی کسی عذر کی وجہ سے ساقط ہو سکتا ہے۔

بہرحال ذکر کثیر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور مندرجہ بالا تمام امور اس کے ذیل میں آ جاتے ہیں۔

اس آیت میں جن ''ظلمات'' اور جس ''نور'' کا ذکر کیا گیا ہے،ان کی بھی مختلف تشریحات کی گئی ہیں۔کسی نے کفر کی تاریکی سے نکل کر ایمان کے نور میں آنا مراد لیا ہے۔کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مادیات کی تاریکیوں سے نکل کر روحانیت کی دنیا میں آنا ہے اور کسی نے معصیت کی تاریکیوں سے نکل کر اطاعت کے نور میں آنا مراد لیا ہے۔

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان معنی میں کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب باہم مراد ہو سکتے ہیں۔اس کے علاوہ رذائل اخلاقی کی تاریکیوں سے نکل کر فضائل اخلاقی کی روشنی میں آنا بھی اس میں داخل ہے اور یہ ذکر الٰہی کا سب سے اہم نتیجہ ہے۔

نویں آیت میں شراب اور جوئے کی آلائش کے برے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔تو کیا (ان نقصانات کے باوجود) تم ان کو ترک کرو گے؟''

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

اس آیت میں شراب اور جوئے کے تین نقصانات کا ذکر کیا گیا ہے۔دشمنی اور عداوت کا وجود میں آنا،اللہ کے ذکر سے روکنا اور نماز سے روکنا۔چونکہ باہمی دوستی ومحبت،اللہ کا ذکر اور نماز عظیم سرمایہ ہیں،اس لیے ان سے محرومیت بہت بڑا نقصان ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت کے لب ولہجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے ذکر اور نماز کے ترک کر دینے اور بغض و عداوت اور دیگر اخلاقی خرابیوں کی پیدائش میں گہرا تعلق ہے۔

دسویں اور آخری آیت جو کہ آیہ نور کے بعد کی آیت ہے،اس میں ان عظیم الشان الٰہی انسانوں کا ذکر ہے جو ان گھروں کے مکین ہیں جو انوار الٰہیہ کے مرکز ہیں۔ان عظیم الشان افراد کی خصوصیات کا ذکر اس طرح کیا جا رہا ہے:

''یہ نورِ الٰہی ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کیا جائے۔ ایسے گھر جن میں صبح و شام ایسے افراد اللہ کے نام کا ذکر اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، جنہیں کوئی تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر سکتے۔''

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡہَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡہِیۡہِمۡ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیۡعٌ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۙ

(نور:۳۶، ۳۷)

اس طرح نورِ الٰہی کے محافظ ان عظیم انسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیوی امور انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔ یادِ خدا اور ذکرِ الٰہی ان کا عظیم ترین افتخار اور اعزاز ہے۔ اس کے بعد ان کی دوسری صفات یعنی نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

نتیجہ

ذکر کے بارے میں قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر ہم نے صرف چند آیات کو زیرِ بحث قرار دیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کا ذکر باعث اطمینانِ قلب ہے۔ یہ فحشاء اور منکرات سے باز رکھتا ہے، دشمنانِ حق کے مقابلہ میں انسان کو طاقت اور ہمت دیتا ہے اور بخل، حرص، دنیا پرستی اور دیگر اخلاقی رذائل سے انسان کو پاک کرتا ہے۔

رہروانِ راہِ حق، سالکانِ الی اللہ اور وہ تمام افراد جو تہذیب اخلاق میں مشغول ہیں، ان پر لازم ہے کہ اس کیمیائے سعادت اور اکسیر خوش بختی سے غفلت نہ کریں۔ انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ نشیب و فراز اور خطرات سے بھرپور اس راستے پر جو چیز انسان کو ہمت اور قوت دیتی ہے، وہ اللہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ذکرِ الٰہی انسان کی زندگی کے مستقل معمولات کا حصہ بن جائے۔

ذکر اور تہذیب نفس کا باہمی تعلق احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اللہ کے ذکر کی اہمیت اس قدر وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے کہ اس مختصر بحث میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت جو بات ہمارے پیشِ نظر ہے، وہ یہ ہے کہ تہذیب نفس اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے ایک اہم عامل اور محرک کے طور پر اللہ کے ذکر کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ اس سلسلہ میں آئمہ معصومین علیہم السلام سے بہت احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ہم ذیل میں اس گلستان کے چند پھول پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات پر مشتمل ہیں اور یہ سب

تصنیف دررالحکم سے لی گئی ہیں:

۱۔ من عمر قلبه بدوام الذکر حسنت افعاله فی السر و الجهر

''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے دائمی ذکر سے اپنے دل کو آباد کرلیا، اس کے ظاہری و باطنی اعمال اچھے ہو جاتے ہیں۔''

۲۔ مدوامة الذکر قوت الارواح ومفتاح الصلاح

''ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا روح کی قوت اور کامیابی کی کنجی ہے۔''

۳۔ اصل صلاح القلب اشتغاله بذکر الله

''اصلاحِ قلب (اور تہذیب نفس) کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اللہ کے ذکر میں مشغول رہے۔''

۴۔ ذکر الله دواء اعلال النفوس

''اللہ کا ذکر نفس کی بیماریوں کی دوا ہے۔''

۵۔ ذکر الله رأس مال کل مومن، وربحه السلامة من الشیطان

''اللہ کا ذکر ہر مومن کا سرمایہ ہے جس کا نفع شیطانی وسوسوں سے نجات ہے۔''

۶۔ الذکر جلاء البصائر و نور السرائر

''اللہ کا ذکر بصیرت کی روشنی اور باطن کا نور ہے۔''

۷۔ من ذکر الله سبحانه احی الله قلبه و نور عقله و لبه

''جو اللہ کا ذکر کرتا ہے، اللہ اس کے دل کو زندہ اور اس کی عقل اور شعور کو منور کرتا ہے۔''

۸۔ استدیموا الذکر فانه ینیر القلب، وهو افضل العبادة

''اللہ کا ذکر ہمیشہ کیا کرو، یہ دل کو نورانی کرتا ہے اور سب سے افضل عبادت ہے۔''

۹۔ اذکروا الله ذکرا خالصا تحیوا به افضل الحیاة و تسلکوا به طرق النجاة

(میزان الحکمہ، ۲:۹۶۹)

''اخلاص کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو تاکہ سب سے افضل زندگی حاصل کرسکو اور نجات کی راہوں پر چل سکو۔''

۱۰۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام اپنے معروف وصیت نامہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اوصيك بتقوى الله يابنى! ولزوم امره وعمارة قلبك بذكره

''اے فرزند! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اس کے احکامات کی پابندی کرو اور اپنے دل کو اس کے ذکر سے آباد کرو۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱)

۱۱۔ غرر الحکم میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے،

ذكر الله مطردة للشيطان

''اللہ کا ذکر شیطان کو دور بھگانے کا ذریعہ ہے۔''

۱۲۔ حسن اختتام کے طور پر ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر تمام کرتے ہیں:

ذكر الله شفاء القلوب

''اللہ کا ذکر دلوں کی شفا ہے۔'' (کنز العمال، حدیث: ۱۷۵۱)

مندرجہ بالا بارہ احادیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ذکر اور تہذیب نفس میں گہرا اور قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ اللہ کا ذکر قلب کو نورانیت بخشتا ہے، تکبر، غرور، غفلت، حسد اور بخل جیسی بیماریوں کو دل سے دور کرتا ہے۔ اللہ کا ذکر شیطان کو دل سے دور کرتا ہے اور انسان کے دل کو ہر قسم کی آلائشات سے پاک کر کے صاف و شفاف کر دیتا ہے۔

علم اخلاق کے بعض علمائے بزرگ کا کہنا ہے کہ انسان کا دل کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اللہ کے ذکر سے پر ہو تو شیطانی وسوسے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو شیاطین کی جولانگاہ اور اس کے وسوسوں کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری طرف سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے ذکر کے ذریعے انسان سرچشمہ کمالات کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رذائل اخلاقی جو حقیقت میں نقائص ہیں، اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا رہروانِ سلوک الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ ہر وقت اللہ کے ذکر کی حالت میں رہیں، اس لئے کہ یہ شیطانی طاقتوں کے خلاف ایک تیز شمشیر ہے، قریب حق کی منزل تک لے جانے والا طاقتور مرکب ہے اور راستے کی تاریکیوں کو دور کرنے والا ضوفشاں چراغ ہے۔ ذکر خدا کی بدولت انسان اس مشکل سفر کو تیزی سے طے کرتا ہے اور کمالاتِ انسانی و فضائل اخلاقی تک پہنچنے کی راہوں کو روشن اور ہموار کرتا ہے۔

اس بحث کے اختتام پر تین نکات کا ذکر ضروری ہے:

۱۔ حقیقت ذکر

لغت کی مشہور کتاب ''مفرداتِ راغب'' میں ذکر کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں، ایک کسی چیز کو ذہن میں حاضر کرنا اور

دوسرے معارف وعقائد حقہ کو اپنے قلب وذہن میں محفوظ رکھنا۔

بزرگانِ علم اخلاق کا کہنا ہے کہ اللہ کا ذکر صرف یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کا نام اپنی زبان پر جاری کرلے اور مسلسل تسبیح وتہلیل وتکبیر کہتا رہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دل کی تمام گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف متوجہ رہے اور اسے ہر جگہ حاضر وناظر سمجھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کا ذکر تمام نیکیوں اور خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور انسان کو گناہ سے بچانے کے لیے ایک مضبوط دیوار کا کردار ادا کرتا ہے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کو انجام دینے کی طاقت اس امت میں نہیں ہے: برادرانِ دینی کے ساتھ مالی ایثار سے پیش آنا، لوگوں کو ان کا حق دینا اور ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

ولیس هو سبحان الله والحمدلله ولا اله الا الله اکبر و لکن اذاورد علی مایحرم علیه خاف الله عزوجل عنده و تترکه

یعنی ذکر سے مراد صرف سبحان اللہ و..... کہنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب فعل حرام کا موقع سامنے آئے تو انسان اللہ سے ڈر کر اسے ترک کردے۔'' (بحارالانوار، ۹۰:۱۵۱)

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

الذکر ذکران: ذکر عندالمصیبة حسن جمیل و افضل من ذلك ذکر الله عندماحرم الله علیك فیکون ذالك حاجزا

''ذکر کی دو اقسام ہیں: مصیبت کے وقت اللہ کو یاد کرنا (اور مصیبت پر صبر کرنا) اچھا عمل ہے مگر اس سے افضل اللہ کا ذکر ہے جو فعل حرام کے وقت تمہیں فعل حرام سے روک دے۔''

(بحارالانوار، ۷۵:۵۵)

مندرجہ بالا مطالب سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کا واقعی ذکر وہ ہے جو انسان کے وجود کی گہرائیوں پر اثر انداز ہو، انسان کی روح کی پرورش کرے اور اسے اللہ کی راہ کی طرف دعوت دے۔

جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہو اور شیطان کی راہ پر چلتا ہو، درحقیقت وہ اللہ کے ذکر میں مخلص نہیں ہوتا۔ حضرت امام رضا علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

من ذکر الله ولم یستبق الی لقائه فقد استهزء بنفسه

''جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور اس کی ملاقات کے لیے آگے نہیں بڑھتا (آخرت کے لئے اعمالِ صالحہ نہیں کرتا) وہ اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہا ہوتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۷۵:۳۵۶)

۲۔ درجاتِ ذکر

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے ذکر کے کئی درجات بیان کئے ہیں:

پہلا مرحلہ

اللہ کے ذکر کا پہلا مرحلہ لفظی ذکر ہے۔ اس میں انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ جلال و جمال کا ذکر کرتا ہے اور عام طور پر ان کے مفہوم اور معنی سے بے خبر ہوتا ہے۔ جس طرح بہت سے نمازی دورانِ نماز، نماز کے معنی و مفاہیم کو سمجھے بغیر صرف زبان سے اذکار نماز کو ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ذکر کا یہ مرحلہ درحقیقت ذکر کے اعلیٰ درجات کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم ہوتا ہے اور اس میں معنی کی مختصر آگاہی بھی ذکر کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ ذکر انسان کی تربیت اخلاق اور تزکیہ نفس میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کرتا۔

دوسرا مرحلہ

اللہ تعالیٰ کے ذکر کا دوسرا مرحلہ ذکر معنوی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان ذکر لفظی کر رہا ہو تو معنی کی طرف بھی متوجہ ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ معنی کی طرف توجہ کے ساتھ جو ذکر کیا جاتا ہے، وہ انسان پر زیادہ بہتر انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر انسان باقاعدگی کے ساتھ ایسا ذکر کرے تو وہ اس کے اثرات کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

تیسرا مرحلہ

اللہ کے ذکر کا تیسرا مرحلہ قلبی ذکر کا مرحلہ ہے۔ اس کی تفسیر میں علماء نے کہا ہے کہ قلبی ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ انسان کے دل میں سے اٹھے اور پھر اس کی زبان پر جاری ہو جائے، مثلاً جب وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرتا ہے، کائنات پر حاکم نظم کو جب دیکھتا ہے تو اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس توجہ کے بعد جب وہ کہتا ہے:

العظمة لله الواحد القهار

''ساری عظمت اللہ کے لیے ہے جو واحد اور قہار ہے۔''

تو یہ ذکر دل کی گہرائی سے اٹھنے والا ذکر ہوتا ہے اور درحقیقت انسان کی قلبی کیفیت کا عکاس ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی زبان پر کوئی لفظ جاری ہوئے بغیر اذکارِ الٰہی میں سے کسی ایک کے معنی و مفہوم دل

میں جگمگانے لگتے ہیں جیسے "یاسبوح و یاقدوس اور سبحانك اللھم لا الہ انت۔"

یہ قلبی اذکار تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس میں غیر معمولی تاثیر کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ ذکر فرشتوں کے ذکر کی مانند ہوتا ہے کہ جب انہوں نے اسمائے الٰہیہ کے بارے میں حضرت آدم علیہ السلام کے علم کی وسعتوں کو دیکھا تو بے اختیار بول اٹھے:

سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحکیم

''اے اللہ! تو ہر عیب و نقص سے پاک اور منزہ ہے، جو کچھ تو نے ہمیں تعلیم دیا ہے، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، بے شک تو علم و حکمت والا ہے۔''

قرآن مجید میں ذکر کے درجات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿٨﴾

''اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور ہر چیز سے منہ موڑ کر اس سے لو لگا۔'' (مزمل:۸)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿٢٠٥﴾

''اپنے دل میں تضرع اور خوف کے ساتھ، بغیر آواز بلند کئے صبح و شام اللہ کا ذکر کرو اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔'' (اعراف:۲۰۵)

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں گہرے ذکر لفظی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور "تتبل الیہ" یعنی ''ہر چیز سے منہ موڑ کر اللہ سے لو لگانے'' پر بات کا اختتام کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں ذکر قلبی کا تذکرہ کیا گیا ہے جو تضرع اور خوف خدا کے ساتھ ہونا چاہئے اور دل سے اٹھنے والے ذکر مخفی پر بات کو ختم کیا گیا ہے۔

ذکر کی رکاوٹیں

ذکر لفظی کی راہ میں کوئی بڑی اور قابل ذکر رکاوٹیں موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ انسان جب چاہے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات جلال و جمال کا زبان سے ذکر کر سکتا ہے۔ ہاں! اگر انسان دنیا میں اس قدر غرق ہو جائے کہ اس کے لیے ذکر لفظی کی بھی مجال باقی نہ رہے تو یہ اور معاملہ ہے۔

لیکن ذکر قلبی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں جن میں سے سب سے بڑی رکاوٹ انسان کی اپنی طرف سے ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور خود ہم سے بڑھ کر ہمارے قریب ہے، جیسا کہ اس آیۂ شریفہ میں ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴿۱۶﴾

''اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''(ق:۱۶)

حضرت علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں ہے:

ما رأیت شیئا الا ورایت اللہ قبلہ وبعدہ ومعہ

''میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے پہلے، جس کے بعد اور جس کے ساتھ اللہ کو نہ دیکھا ہو۔''

(کسی چیز سے پہلے اللہ کو دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کا خالق ہے، کسی چیز کے بعد دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز فنا ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی اور کسی چیز کے ساتھ دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس کا حافظ اور اس کا قائم رکھنے والا ہے)۔

مگر اس کے باوجود انسان کے برے اعمال اور اس کی شیطانی صفات اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ضخیم پردہ بن جاتی ہیں اور وہ اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہے۔

دعائے ابوحمزہ ثمالی میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانك لا تحتجب عن خلقك الا ان تحجبهم الاعمال دونك

''تو ہرگز اپنی مخلوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ان کے اعمال ہیں جو تیرے اور ان کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں۔ خود پرستی اور حب ذات کا حجاب سب سے بڑا حجاب ہے جو ایک قسم کا شرک ہے اور حقیقی توحید کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

کل ما الھی من ذکر اللہ فھو من ابلیس (میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، وہ ابلیس کی طرف سے ہوتی ہے۔''

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

کل ما الھی عن ذکر اللہ فھو من المیسر

''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، وہ جوا ہے۔'' (میزان الحکمہ، ۲:۹۷۵)

یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں جوئے کو شرک کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔(مائدہ:۹۰)

ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں،

آپؐ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا: (منافقون:۹)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے اموال واولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں۔''

آپؐ نے فرمایا:

هم عباد من امتی الصالحون منهم، لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله و عن الصلوة المفروضة الخمس

''یہ میری امت کے صالح افراد ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور پنجگانہ نمازوں سے غافل نہیں کرتے۔'' (میزان الحکمہ، ۲:۵۷۹)

تیرھواں باب

نمونہ ہائے عمل

اشارہ

ہر انسان اپنی زندگی میں ایسے افراد کی پیروی کرتا ہے جنہیں وہ اپنے لئے نمونہ، اسوہ اور پیشوا سمجھتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کردار کے لحاظ سے ان کے قریب کرے اور ان کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرے۔

بالفاظِ دیگر ہر انسان کے دل اور جان میں پیشوا اور ہیرو کا ایک خانہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تاریخ میں ہر قوم کے حقیقی یا فرضی ہیرو اور پیشواؤں کی ایک تعداد ہمیں نظر آتی ہے جن کی شخصیت ان کی تاریخ اور ثقافت کے ایک نمایاں حصے کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ اپنی محافل ومجالس میں ان کا ذکر کرتے ہیں، ان کی تعریف کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ صفات وخصوصیات کے لحاظ سے اپنے آپ کو ان کے قریب کرسکیں۔

اس کے علاوہ قانونِ محاکات (دوسروں جیسا بننا، خاص طور پر عظیم شخصیات کی مانند بننے کی کوشش کرنا) نفسیات کا ایک مسلم قانون ہے۔ اس قانون کے مطابق انسان اپنے اندر دوسروں کی طرف، خصوصاً ہیرو کی طرف جذب ہونے کی ایک کشش محسوس کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اعمال وصفات کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

جن افراد پر انسان ایمان رکھتا ہو، ان کی طرف کھینچنے والی کشش اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسلام میں تولیٰ اور تبریٰ کے نام سے دو اہم اصول پائے جاتے ہیں جنہیں دوسرے الفاظ میں "الحب فی اللہ" (اللہ کے لیے محبت) اور "البغض فی اللہ" (اللہ کے لیے دشمنی) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان دو اصولوں کی بنیاد پر ہم سب پر فرض ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی کریں اور پیشوایانِ دینی یعنی رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کو زندگی کے ہر معاملہ میں اپنے لئے رہنما اور نمونۂ عمل قرار دیں۔

یہ حکم اس قدر اہم ہے کہ قرآنی آیات اسے ایمان کی نشانی اور احادیث میں اسے ایمان کا مضبوط ترین سہارا (اوثق عری الایمان) قرار دیا گیا ہے۔ جب تک تولیٰ اور تبریٰ نہ ہوں، انسان کے باقی تمام اعمال اور عبادات واطاعات بے نتیجہ اور بے ثمر ہو جاتے ہیں۔ ہم اس بارے میں آیات واحادیث کو زیر بحث لائیں گے۔

یہ تولیٰ اور تبریٰ یا بعبارتِ دیگر "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ"، تہذیب نفس اور سیر وسلوک الی اللہ کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

اسی بنیاد پر بہت سے علمائے اخلاق نے رہروانِ راہ حق اور سالکانِ الی اللہ کے لیے مربی اور استاد کے وجود کو لازم قرار دیا

ہے۔اس سلسلہ میں ہم تولیٰ وتبریٰ سے متعلق آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫

''تمہارے لئے ابراہیمؑ اوران کے ساتھیوں میں اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اورتمہارے ان معبودوں سے، جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بیزار ہیں۔''(ممتحنہ:۴)

۲۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

''تم میں سے جولوگ اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں، ان کے لیے ان میں اسوۂ حسنہ ہے، جو روگردانی کرے گا تو اللہ غنی وحمید ہے۔''(ممتحنہ:۶)

۳۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک اچھا نمونہ ہے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔''(احزاب:۲۱)

۴۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''آپ کوئی ایسی قوم نہیں دیکھیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے محبت کریں خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا برادری سے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی مدد کی۔ وہ انہیں جنت کے باغوں میں داخل کردے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ یہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ کی جماعت ہی

فلاح پانے والی ہے۔''(مجادلہ:۲۲)

۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (ممتحنہ:۱۳)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ نے غضب کیا ہے۔''

۶۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

''مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں، وہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔عنقریب اللہ ان پر رحم کرے گا اور بے شک اللہ غالب اور حکیم ہے۔''(توبہ:۷۱)

۷۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷

''اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے ولی شیطان ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لاتے ہیں۔یہ لوگ اہل جہنم ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''(بقرہ:۲۵۷)

۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو!اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''(توبہ:۱۱۹)

تفسیر اور نتیجہ

سورۂ ممتحنہ کی آیات سے یہ بات بخوبی نظر آتی ہے کہ بعض نومسلم افراد کے کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔اس سورت کی ابتدائی آیات کے شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل حاطب ابن ابی بلتعہ نام کے ایک صحابی نے سارہ نامی ایک عورت کے ہاتھ اہل مکہ کو ایک خفیہ خط بھیجا کہ رسولؐ اللہ مکہ پر حملہ کرنے اور مکہ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔تم اپنے دفاع کا انتظام کرلو۔

رسولؐ اللہ کا جنگی منصوبہ یہ تھا کہ اہل مکہ کو ان کے اس حملے کی خبر نہ ہو سکے تاکہ وہ کسی قسم کا مقابلہ نہ کرسکیں اور جنگ میں

خونریزی کم از کم ہو۔ اس عورت نے خط اپنے بالوں میں چھپایا اور مکہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر رسولؐ اللہ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ آپؐ نے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا۔ پہلے تو اس عورت نے خط کا انکار کیا مگر جب حضرت علی علیہ السلام نے سخت اقدام کی دھمکی دی تو اس نے خط نکال کر انؑ کے حوالے کر دیا۔ حضرت علی علیہ السلام یہ خط لے کر رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

حاطب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی سخت سرزنش کی گئی۔ اس نے اپنی اس حرکت پر اپنا عذر پیش کیا جو بظاہر آنحضرتؐ نے قبول فرما لیا اس کے بعد سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں اس عمل پر سرزنش کی گئی تاکہ مستقبل میں اس عمل کا سد باب کیا جا سکے۔ ان آیات نے ایک اہم اسلامی اصول یعنی ''نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی اقتداء اور بدکاروں اور دشمنانِ خدا سے قطع تعلق کے اصول'' کو واضح کر دیا جسے دوسرے الفاظ میں "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" کہا جاتا ہے۔

اس سورت کے آغاز میں تمام مومنین کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:

''اے اہل ایمان! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ، تم ان سے دوستی اور محبت کا اظہار کرتے ہو جبکہ وہ اس وحی کا انکار کرتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی ہے اور انہوں نے اللہ کے رسولؐ کو اور تم کو اس لئے تمہارے شہر سے جلاوطن کیا کہ تم ایمان لائے۔'' (ممتحنہ:۱)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَن تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ ۚ

یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ اگر دوستانہ تعلقات اور ایمانی تعلقات کے باہمی ٹکراؤ کی حالت میں دوستانہ تعلقات کو ایمانی تعلقات پر مقدم رکھا جائے تو ایمان وعقیدہ کی بنیادیں سست اور متزلزل ہو جاتی ہیں اور انسان بتدریج باطل کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ"، یا اللہ کے دوستوں سے تولیٰ اور اللہ کے دشمنوں سے تبریٰ کا راز بھی یہی ہے۔

اس کے بعد اس سورت کی چوتھی آیت میں تمام مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، انہیں اہل ایمان کے لیے اسوہ حسنہ اور خوبصورت نمونہ عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے:

''ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں تمہارے لئے اچھا نمونہ عمل ہے۔ جب انہوں نے اپنی مشرک قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے بیزار ہیں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو۔''

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ

''اسوہ'' اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو دوسروں کے پیروی کرنے سے حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر اس سے مراد اقتداء کرنا اور پیروی کرنا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ اسوہ ہونے والی خصوصیت اچھے کاموں میں بھی ہوسکتی ہے اور برے کاموں میں بھی۔ اسی لئے اس آیت میں اسوۂ کے ساتھ حسنہ کی صفت بھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی ابراہیمؑ اور ان کے ساتھی تمہارے لئے اچھا نمونۂ عمل ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ ظاہری اور مادی تعلقات کو ایمانی تعلقات پر قربان کر دیا۔

دوسری آیت میں مذکورہ بالا آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے اور ایک بار پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جارہا ہے:

''تم مسلمانوں کے لیے ان کی زندگی میں اچھا نمونۂ عمل ہے۔ یہ نمونۂ عمل ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور جو کوئی (ان مردانِ حق کی پیروی سے) روگردانی کرے گا (اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے) وہ سب سے بے نیاز اور ہر تعریف کا حقدار ہے۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

یہ آیت دو چیزوں میں گزشتہ آیت سے مختلف ہے:

ایک یہ کہ اس آیت میں "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" کو اللہ اور آخرت پر ایمان کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے اس طرزِ عمل کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ تو تمہاری اپنی روحانی اور معنوی ترقی کے لیے اور تمہاری قومی اور معاشرتی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔

تیسری آیت کی نظر جنگ احزاب پر ہے اور اس میں اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر کمزوری، بے صبری اور ان میں سے بعض کی بدگمانیوں کے باوجود رسولؐ اللہ ثابت قدم رہے اور کسی بھی لمحہ بہترین جنگی حکمت عملی سے غافل نہیں ہوئے۔ آپؐ نے اپنے دست مبارک میں کدال لے کر خندق کھودنے کا کام انجام دیا، اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بذلہ سنجی اور مزاح بھی فرماتے تھے اور مسلمانوں کو جذبۂ جہاد ابھارنے والے اشعار پڑھنے اور سنانے کی تلقین بھی فرماتے تھے۔ ان سب کے باوجود ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس شدید دباؤ کی حالت میں آپؐ مسلمانوں کو مستقبل میں عظیم کامیابیوں کی خوشخبری بھی دیتے تھے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی مختصر جمعیت، اسلام دشمن قبائل کے اتحاد کے خلاف منظم اور ثابت قدم رہی۔

رسولؐ اللہ کا یہ طرزِ عمل تمام مسلمانوں کے لیے ایک حیرت انگیز نمونۂ عمل اور اسوۂ حسنہ تھا۔

قرآن مجید فرماتا ہے: (جنگ احزاب میں)

''رسولؐ اللہ تمہارے لئے اسوہ حسنہ تھے، ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔''

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾

رسولؐ اللہ صرف میدانِ جنگ میں، جو کہ جہادِ اصغر کا معرکہ تھا، مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ نہیں تھے بلکہ نفس کے خلاف جہاد میں بھی، جو جہادِ اکبر کہلاتا ہے، انتہائی اہم نمونۂ عمل تھے۔ جو کوئی آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چل سکے، وہ تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کی دشوار اور نشیب و فراز سے بھرپور راہوں پر سرعت سے آگے بڑھ سکے گا۔

یہاں پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں ''اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے'' پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں، وہی رسولؐ اللہ جیسے عظیم قائد کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اس لئے ایمان اور اللہ کا ذکر انہیں ان کی عظیم ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہیں جن کی انجام دہی کے لیے وہ ایک رہبر اور قائد کی جستجو کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر قائد اور رہنما نہیں پاتے۔

چوتھی آیت میں نکتہ مقابل یعنی ''البغض فی اللہ'' پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تم کوئی ایسی قوم نہیں دیکھو گے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتی ہو، خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی قوت بہم پہنچائی ہے۔''

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ

یہ آیت نہایت واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اگر انسان خونی رشتوں اور ایمانی رشتوں کے باہمی ٹکراؤ کے مقام پر آ جائے تو اسے کن تعلقات کو مقدم رکھنا چاہئے۔ یہ آیت انتہائی واضح الفاظ میں بتا رہی ہے کہ اگر تمہارے قریبی ترین رشتہ دار بھی اللہ کی راہ سے منحرف ہو جائیں اور کفر و فساد کی آلودگی سے آلودہ ہو جائیں تو ان سے تعلق توڑ کر اللہ اور اعلیٰ

اقدار سے تعلق قائم کرو۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات میں وزن اور پختگی پیدا کرنے کے لیے یہ دو انتہائی بامعنی جملے بھی ارشاد فرمائے:

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ط

''اللہ نے ایمان ان کے دلوں میں لکھ دیا ہے اور ایک روحِ الٰہی کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔''

بالفاظِ دیگر ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' کا سرچشمہ اور جڑ ایمان ہے اور ایمان کا استمرار اور بقا بھی ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' میں پوشیدہ ہے۔

اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ اور آخرت پر ایمان سے یہ سفر شروع ہوتا ہے اور ''الحب فی اللہ'' اور ''البغض فی اللہ'' سے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

(پانچویں آیت کی تفسیر اصل متن میں نہیں دی گئی ہے)۔

چھٹی آیت میں مومنین و مومنات کے روحانی اور معنوی تعلق کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں، امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ ان پر رحم کرے گا، بے شک اللہ عزیز و حکیم ہے۔''

امر بالمعروف اور نہی از منکر، نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی بنیاد پر قائم یہ روحانی تعلق اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ صرف اعمال و کردار میں ہی نہیں بلکہ اخلاقی صفات میں بھی ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے نمونۂ عمل بنتے ہیں۔ لہٰذا اگر اہل ایمان کو کسی گروہ یا جماعت کا ہمرنگ ہونا ہو تو وہ اس گروہ مومنین کے ہمرنگ بنیں۔

امر بالمعروف اور نہی از منکر ان مومنین کے اعمال میں برسرفہرست ہے جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کی یہ خصوصیت انہیں اس بات پر مائل کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اعمال و اخلاق کا بھی خیال رکھیں۔ یہ بذات خود تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کا ایک موثر عمل ہے۔

ساتویں آیت میں مومنین اور کافروں کے طرزِ فکر و عمل کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ مومنین اللہ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی صفات جلال و جمال سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ کفار طاغوت سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق میں بھی طاغوتی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اللہ مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے جبکہ جن

لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، ان کے ولی وسرپرست طاغوت ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکی کی طرف لے آتے ہیں۔ یہ اہل جہنم ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷

اس آیت میں تاریکیوں سے نکل کر نور کی طرف آنے کو اللہ کی ولایت کا نتیجہ اور نور سے نکل کر تاریکیوں کی طرف آنے کو ولایت طاغوت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت میں نور سے مراد تمام نیکیاں اور اخلاقی فضائل ہیں جبکہ ظلمت میں تمام برے اعمال اور اخلاقی رذائل شامل ہیں۔

جو شخص اللہ کی ولایت کے زیر سایہ ہوتا ہے، وہ رذائل سے فضائل اور برائیوں سے نیکیوں کی طرف ہجرت کا سفر شروع کر دیتا ہے، اس لئے کہ وہ ہر جگہ اللہ کی صفات جلال و جمال سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ وہ نیکی اور پاکیزگی کی طرف بھڑتا رہتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر برائی اور پلیدی سے پاک ہے۔ وہ رحمت، سخاوت اور بخشش کی طرف حرکت کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ رحمن ورحیم اور جواد وکریم ہے۔

جو لوگ ولایت طاغوت کے زیر سایہ ہوتے ہیں، ان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ فضائل کی طرف سے رذائل کی طرف حرکت کرتے ہیں اور اس طرح تاریکیوں کی طرف آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں تمام مومنین کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے:

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹

درحقیقت ان دو جملوں میں سے دوسرا جملہ ''كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ''، پہلے جملے ''اتَّقُوا اللّٰهَ'' کی تکمیل کر رہا ہے، اس لئے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ پر چلنا اس وقت ممکن ہی نہیں ہے جب تک انسان صادقین کی صحبت اختیار کر کے ان کی صحبت کے زیر سایہ قدم نہ اٹھائے۔

اہل سنت اور اہل تشیع کی بہت سی روایات میں حضرت علی علیہ السلام یا اہل بیتؑ کے تمام افراد کو صادقین کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ اہل سنت کی روایات کا مطالعہ کرنے کے لیے الدر المنثور، مناقب خوارزمی، در السمطین، شواہد التنزیل وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حافظ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ میں، علامہ حموینی نے فرائد السمطین میں اور شیخ ابوالحسن کازرونی نے شرف النبی میں

ان میں سے کچھ روایات نقل کی ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سلمان فارسیؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ یہ آیت عام ہے یا خاص؟

آپؐ نے فرمایا:

اما المامورون فعامة المومنین، و اما لصادقون فخاصة اخی علی و اوصیائه من بعده الی یوم القیامة

''اس آیت میں حکم عام ہے جس میں تمام مومنین شامل ہیں جبکہ صادقین خاص ہیں، میرا بھائی علیؑ اور قیامت کے دن تک ان کے اوصیاء۔'' (ینابیع المودۃ:۱۱۵)

ظاہری بات ہے کہ علیؑ اور انؑ کے اوصیاء جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، ان کے ساتھ ہونے کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ انسان اخلاق وعمل میں ان کی پیروی کرے۔

نتیجہ

تولیٰ وتبریٰ سے متعلق مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اولیاء اللہ سے تعلق قائم کرنا اور ظالموں، فاسدوں اور طاغوتوں سے تعلق توڑنا یعنی "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" قرآن کی سب سے بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے اور اس کا اخلاقیات پر بہت گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

یہ قرآنی اور اسلامی اصول زندگی کے تمام مسائل پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے، خواہ ان کا تعلق فردی واجتماعی زندگی سے ہو یا دنیوی واخروی معاملات سے۔ اسی طرح اخلاقی مسائل پر بھی، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، یہ اصول غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یہ اصول مومنین کی شخصیت کو بناتا ہے۔ ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے، انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر قدم پر نیک اور پاکیزہ افراد، خصوصاً رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کو اپنا اسوۂ عمل قرار دیں، اس لئے کہ یہ انسانی خلقت کے مقصد کے حصول یعنی تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس اور فضائل اخلاقی کی پرورش کے لیے ایک موثر قدم ہے۔

تولیٰ وتبریٰ احادیث کی روشنی میں

شیعہ اور سنی دونوں کی کتب احادیث میں "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" یعنی تولیٰ وتبریٰ کے بارے میں بکثرت روایات مندرج ہیں اور جتنی اہمیت اس مسئلہ کو دی گئی ہے، شاید ہی کسی اور چیز کو دی گئی ہو۔

اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اولیاء اللہ سے دوستی ومحبت اور دشمنانِ حق سے بیزاری کے بہت اہم اور مثبت اثرات رونما ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ ایمان کی قوت، تہذیب اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اور تقویٰ میں کیا جاسکتا ہے۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تہذیب نفس اور سیر وسلوک الی اللہ کی راہ پر چلنے والے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ کسی پیشوا اور رہنما کا دامن تھام لے۔ ہم یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں:

۱۔ خطبۂ قاصعہ میں رسولؐ اللہ اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک خوبصورت عبارت ملتی ہے:

ولقد قرن الله به من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملائكته يسلك به طريق المكارم، و محاسن اخلاق العالم، ليله و نهاره و لقد كنت اتبعه اتباع الفصيل اثر امه يرفع لى فى كل يوم من اخلاقه علما و يامرنى بالاقتداء

''جب سے رسولؐ اللہ کی شیر خوارگی کا زمانہ ختم ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنا سب سے بڑا فرشتہ ان کے ساتھ مقرر فرمادیا جو شب وروز انہیں اعلیٰ اخلاقی صفات کی راہ پر چلاتا تھا اور میں اس طرح ان کے پیچھے چلتا تھا، جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے، وہ ہر روز اپنے اخلاق کا ایک علم نصب فرماتے تھے اور مجھے اس کی پیروی کرنے کا حکم دیتے تھے۔'' (نہج البلاغہ: ۱۹۲)

خطبۂ قاصعہ کے اس اقتباس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کا عظیم ترین فرشتہ آغازِ طفولیت سے رسولؐ اللہ کی رہنمائی کے لیے مامور تھا، اسی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی رسولؐ اللہ کی اتباع کرتے تھے اور اس طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے اور رسولؐ اللہ بھی ہر روز انہیں ایک نئی اخلاقی صفت کا درس دیتے تھے۔

جب رسولؐ اللہ اور حضرت علیہ علیہ السلام جیسی عظیم شخصیات رہنما اور پیشوا کی ضرورت مند تھیں تو دوسروں کی ضرورت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

۲۔ زرارہ نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ حدیث نقل کی ہے:

بنى الاسلام على خمسة اشياء، على الصلوة و الزكاة و الحج و الصوم و الولاية، قال زرارة: فقلت: و اى شىء من ذلك افضل؟ فقال: الولاية افضل لا نها مفتاحهن و الوالى هو الدليل عليهن

''اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ولایت۔ زرارہ کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ ان میں سب سے افضل کیا چیز ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ولایت سب سے افضل ہے کیونکہ وہ ان کی کنجی ہے اور والی ان سب کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲:۱۸)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ولایت اور اولیاء اللہ کی اقتداء کرنا تمام عبادات اور اعمال کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔ یہاں سے تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور اعلیٰ اخلاقی صفات کے حصول کے لیے بھی ولایت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک دن رسولؐ اللہ نے صحابہ سے پوچھا:

ای عری الایمان اوثق؟ فقالوا: اللہ و رسولہ اعلم و قال بعضھم الصلوۃ و قال بعضھم الزکاۃ، وقال بعضھم الصیام، وقال بعضھم الحج و العمرۃ، و قال بعضھم الجھاد. فقال رسول اللہ لکل ماقلتم فضل و لیس بہ، و لکن اوثق عری الایمان الحب فی اللہ والبغض فی اللہ و تولی اولیاء اللہ و التبری من اعداء اللہ

''ایمان کے دستوں (handles) میں سے کونسا دستہ سب سے مضبوط ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ بعض نے کہا نماز، بعض نے کہا روزہ، بعض نے کہا زکوٰۃ، بعض نے کہا حج، بعض نے کہا جہاد۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا: جن چیزوں کا تم نے نام لیا، وہ سب بافضیلت اعمال ہیں لیکن میرے سوال کا جواب نہیں ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ایمان کا سب سے مضبوط دستہ یہ ہے کہ محبت اور دشمنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوں اور انسان اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے قطع تعلق کرے۔'' (کافی، ۲:۱۲۵)

اس حدیث میں لفظ ''عری'' استعمال ہوا ہے جو عروہ کی جمع ہے۔ عروہ کسی چیز کے دستہ کو کہتے ہیں جس کی مدد سے اسے پکڑا جاتا ہے۔ اس حدیث میں استعمال ہونے والا لفظ ''ایمان کا دستہ'' اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ قربِ الی اللہ کی منزل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کسی چیز کو دستے کی طرح مضبوطی سے پکڑ لے اور قرب الی اللہ کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ اس سلسلہ میں "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد دستہ کوئی نہیں ہے۔

۴۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی جابر سے فرمایا:

اذا اردت ان تعلم ان فیك خیرا فانظر الی قلبك فان کان یحب اھل طاعۃ اللہ و یبغض اھل معصیتہ، ففیك خیر، و اللہ یحبك؛ وان کان یبغض اھل طاعۃ اللہ و یحب اھل معصیتہ، فلیس فیك خیر، واللہ یبغضك والمرء مع من احب

''اگر تم یہ دیکھنا چاہو کہ تمہارے دل میں خیر اور نیکی موجود ہے یا نہیں تو اپنے دل کا جائزہ لو۔ اگر وہ اللہ

کی اطاعت کرنے والوں سے محبت اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے تو تم اچھے انسان ہو اور اللہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اللہ کی اطاعت کرنے والوں سے نفرت اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے تو تم میں نیکی نہیں پائی جاتی اور اللہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔'' (اصولِ کافی، ۲:۱۲۶)

اس حدیث کا یہ جملہ ''المرء مع من احب'' یعنی ''انسان اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے،'' اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہر انسان اپنے اخلاق و عادات میں اور اخروی انجام کے لحاظ سے انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے۔

اس طرح اس حدیث سے بھی اخلاقی مسائل پر ''ولایت'' کی تاثیر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ودالمومن للمومن فی اللہ من اعظم شعب الایمان، الا و من احب فی اللہ و ابغض فی اللہ و اعطی فی اللہ و منع فی اللہ فھو من اصفیاء اللہ

''ایک مومن کا اپنے مومن بھائی سے اللہ کی خوشنودی کے لیے محبت کرنا ایمان کا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کے لیے دوستی کرتا ہے، اللہ کے لیے دشمنی کرتا ہے، اللہ کے لیے کسی کو کچھ دیتا ہے اور اللہ کے لیے کسی سے کوئی چیز روکتا ہے تو وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہو جاتا ہے۔'' (بحار الانوار، ۶۶:۲۴۰)

۶۔ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا جمع اللہ عزوجل الاولین والآخرین قام منادفنادی یسمع الناس فیقول، این المتحابون فی اللہ قال: فیقوم عنق من الناس فیقال الھم اذھبوا الی الجنۃ بغیر حساب قال: فتلقاھم الملائکۃ فیقولون الی این؟ فیقولون الی الجنۃ بغیر حساب! قال فیقولون فان ضرب انتم من الناس؟ فیقولون نحن المتحابون فی اللہ، قال فیقولون وای شیء کانت اعمالکم قالوا کنا نحب فی اللہ و نبغض فی اللہ، قال فیقولون نعم اجر العالمین

''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اولین و آخرین کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس کی آواز

سب سنیں گے۔ وہ کہے گا کہ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت کچھ لوگ اٹھیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم بغیر حساب کے جنت میں جا رہے ہیں۔ فرشتے پوچھیں گے کہ تم کون لوگ ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے اعمال کیا تھے؟ وہ کہیں گے کہ اگر ہم کسی سے محبت کرتے تھے تو وہ بھی اللہ کے لیے ہوتی تھی۔ فرشتے کہیں گے کہ عمل کرنے والوں کے لیے اچھا اجر ہے۔'' (بحار الانوار، ۶۶: ۲۴۰)

یہ جملہ ''نعم اجر العاملین'' یعنی ''عمل کرنے والوں کے لیے اچھا اجر ہے''، اس حقیقت کو آشکار کر رہا کہ اولیاء اللہ سے محبت اور دشمنانِ خدا سے دشمنی، تمام اچھے اعمال کی انجام دہی اور برے اعمال سے اجتناب کا بنیادی سبب ہے۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے: (بحار الانوار، ۶۶: ۳۵۲)

ان حول العرش منابر من نور علیها قوم لباسهم ووجوههم نور لیسوا بانبیاء یغبطهم الانبیاء والشهداء قالوا یارسول الله حل لنا قال: هم المتحابون فی الله و المتحالسون فی الله والمتزاورون فی الله

''عرش کے اردگرد نور کے منبر ہیں۔ ان پر ایسے افراد ہوں گے جن کے چہرے اور لباس نور کے ہوں گے۔ وہ نبی نہیں ہوں گے مگر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ رسولؐ اللہ سے پوچھا گیا: یارسولؐ اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اللہ کے لیے ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور اللہ کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''

۸۔ ایک اور حدیث میں (یا مندرجہ بالا حدیث کے استمرار میں) رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

لو ان عبدین تحابا فی الله احدهما بالمشرق والآخر بالمغرب لجمع الله بینهما یوم القیامة وقال النبی افضل الاعمال الحب فی الله و البغض فی الله

(بحار الانوار، ۶۶: ۳۵۲)

''اگر اللہ کے دو بندے، اللہ کی خوشنودی کے لیے ایک دوسرے سے محبت کریں اور ان میں سے ایک

مشرق میں رہتا ہو اور دوسرا مغرب میں، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جنت میں انہیں ایک جگہ جمع کر دے گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: سب سے افضل عمل "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" ہے۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانوں کے درمیان ایمانی رشتہ ہر رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ یہ رشتہ ان کے درمیان اخلاق و اعمال میں ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جب لوگ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں اور ایک دوسرے میں ان افعال وصفات کا مشاہدہ کرتے ہوں جو اللہ کو پسند ہیں تو یہ "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" ان کی اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

۹۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

هل عملت لی عملا؟ قال صليت لك و صمت و تصدقت و ذكرت لك، قال الله تبارك و تعالىٰ، و اما الصلوة فلك برهان، و الصوم جنة والصدقة ظل، والذكر نور، فاى عمل عملت لى؟ قال موسى: دلنى على العمل الذى هو لك، قال ياموسى هل و اليت فى ولياوهل عاديت لى عدواقط فعلم موسى ان افضل الاعمال الحب فى الله و البغض فى الله

"اے موسیٰ! کیا تو نے کبھی کوئی عمل میرے لئے بھی انجام دیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا: یا اللہ! میں نے تیرے لئے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، صدقات دیئے اور تیرا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نماز تو تمہاری اپنی رہنما ہے، روزہ تمہارے لئے ڈھال ہے، صدقہ تمہارے لئے سایہ ہے، ذکر تیرے لئے نور ہے، میرے لئے تو نے کیا کیا؟ موسیٰ نے کہا: یا اللہ! تو اس عمل کی طرف میری رہنمائی فرما جو تیرے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تو نے کبھی میرے لئے ولی سے محبت کی ہے اور کیا تو نے کبھی میرے لئے کسی دشمن سے دشمنی کی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ سب سے افضل عمل "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" ہے۔" (بحار الانوار، ۶۶: ۲۵۲)

۱۰۔ ہم اس بحث کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں (اگرچہ اس موضوع پر احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے)۔

من احب لله و ابغض لله و اعطى لله و منع لله فهو ممن كمل ايمانه

"جو شخص اللہ کے لیے محبت کرے، اللہ کے لیے دشمنی کرے، اللہ کے لیے کسی کو کچھ دے اور اللہ کے

لیے کسی کو نہ دے تو اس کا ایمان درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔'' (بحار الانوار، ۶۶: ۲۵۲)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں "الحب فی اللہ" و "البغض فی اللہ" قرآن کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اسے افضل ترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ اسے کمالِ ایمان کی علامت اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ اس صفت کے حامل افراد دوسروں سے پہلے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں وہ مقام دیا جائے گا جس پر انبیاء و شہداء بھی رشک کریں گے۔

ان احادیث کی روشنی میں ولایت اور تولیٰ و تبریٰ کی تمام دینی امور میں اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ انسان بزرگانِ دین سے ان کے ایمان، تقویٰ، اخلاقی فضائل اور اعمال صالحہ کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے اعمال و کردار میں ان کی پیروی نہ کرے اور ان کی شخصیت کا پرتو اپنی شخصیت میں پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اسی حقیقت کو علمائے اخلاق نے اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ سیر و سلوک میں کامیابی کے لیے انسانِ کامل کی اقتداء لازمی شرط ہے۔

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر انبیاء کے مختلف واقعات کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ان کی زندگی کو اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل قرار دیں اور کامیابی و نجات کے سفر میں ان کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عام طور پر لوگوں میں قہرمان پرستی (Hero worship) کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنی زندگی میں کسی عظیم شخصیت سے محبت کرے اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اس کی پیروی کرے۔

کسی ایسے ہیرو کا انتخاب انسان کی زندگی کو کوئی شکل و صورت دینے میں بہت موثر کردار ادا کرتا ہے۔ ہیرو کی شناخت اور ان کے بارے میں انسان کا نقطہ نظر بدل جانے سے انسان کی زندگی کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔

بہت سے افراد یا اقوام کسی حقیقی ہیرو تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خیالی یا دیومالائی ہیرو بنا لیتے ہیں اور اپنے شعر و ادب میں ان کی تعریف و ستائش کے انبار لگا دیتے ہیں۔ کسی بھی قوم کے معاشرتی حالات اور پروپیگنڈہ مشینری کا قہرمان سازی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہی چیزیں باعث بنتی ہیں کہ کسی قوم کے ہیرو اللہ تعالیٰ کے عظیم بندے، سیاسی شخصیات، کھلاڑی یا فلمی اداکار بن جاتے ہیں۔

حقیقی ہیرو کی شناخت کے لیے انسان کے اس فطری رجحان کی درست سمت میں رہنمائی کرنے سے فرد اور معاشرہ کی اخلاقی تربیت میں بہت مدد ملتی ہے۔

اولیاء اللہ سے محبت کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں مسئلہ ولایت کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اس کے بغیر تمام دینی اعمال کو ناقص قرار دیا گیا ہے۔

داستانِ موسیٰ وخضر

استاداورمرشدکاانتخاب تزکیہ نفس اورسیر وسلوک الی اللہ میں اس قدراہمیت رکھتا ہے کہ بعض اوقات اللہ عالیٰ نے انبیاءکوبھی حکم دیا کہ ایک خاص مدت کے لیے کسی مرشداورر ہنما کی پیروی کریں۔

اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اورحضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ جوقرآن مجید میں بیان ہوا ہے، انتہائی اہم اور معنویت سے بھرپور ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کوحکم دیا کہ کچھ علوم کے حصول کے لیے،جن کاتعلق اخلاق وعمل سے تھا، اپنے دور کے ایک عالم اورپیغمبر کے پاس جا کرکسب فیض کریں۔اللہ تعالیٰ نے اس عالم اورپیغمبر کا ذکراس طرح فرمایا ہے:

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازااوراسے اپنی طرف سے علم عطا کیا۔''(کہف:٦٥)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رخت سفر باندھااوراپنے ایک ساتھی کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کے پاس پہنچ کرانہوں نے ان سے حصولِ علم کی خواہش کااظہار کیا۔انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھااورکہا:

''میں نہیں سمجھتا کہ تم میری تعلیمات کو برداشت کرنے کا صبروحوصلہ دکھاسکو۔''

مگرموسیٰ علیہ السلام نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ صبروحوصلہ کا مظاہرہ کریں گے۔

اس کے بعدتین اہم واقعات رونما ہوتے ہیں۔پہلے وہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے۔حضرت خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کردیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فوراًاعتراض کردیا کہ آپؑ کے اس عمل سے کشتی ڈوب سکتی ہے۔حضرت خضرؑ نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ تم صبرنہیں کرسکو گے۔حضرت موسیٰ نے معذرت کی اوراعتراض نہ کرنے کا وعدہ کیااوردونوں آگے بڑھنے لگے۔تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعدانہوں نے ایک نوجوان کودیکھا۔حضرت خضرؑ نے اسے دیکھتے ہی قتل کردیا۔جب حضرت موسیٰ نے بظاہرایک بے گناہ نوجوان کےقتل کا خوفناک منظردیکھاتو دامنِ صبران کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔انہوں نے پہلے سے زیادہ شدیدلہجہ میں اعتراض کرتے ہوئے کہا: آپؑ نے ایک بے گناہ معصوم جان کوقتل کردیا۔یہ تو یقیناًایک براعمل ہے۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ کوان کا وعدۂ خاموشی یاددلایااورکہا کہ اگراب تم بولے تو پھرتمہارااستہ میرے راستے سے الگ ہوجائے گا۔موسیٰ بھی سمجھ گئے کہ یقیناًاس میں کوئی اہم راز ہے۔وہ خاموش ہوگئے اورموقع کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت خضرؑ خود ان واقعات کی حقیقت پے پردہ اٹھائیں۔

تھوڑی دیر کے بعدایک اورواقعہ رونما ہوگیا۔حضرت خضرؑ اورحضرت موسیٰ ایک بستی میں داخل ہوئے۔بستی کے لوگوں نے ان کی مہمان نوازی نہ کی اورکھانا تک کھلانے پر تیار نہ ہوئے۔حضرت خضرؑ نے ایک دیوار دیکھی جوانتہائی بوسیدہ تھی اورکسی بھی وقت گر

سکتی تھی۔انہوں نے آستیں چڑھائی اور حضرت موسیٰ کو بھی کام پر لگایا اور دیوار کی مرمت کر دی تا کہ وہ گر نہ جائے۔ایک بار پھر حضرت موسیٰ اپنا وعدۂ خاموشی بھول گئے اور کہنے لگے: کیا اس بستی کے یہ بے مروت لوگ اس محبت آمیز رویے کے مستحق ہیں؟ اس موقع پر حضرت خضرؑ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس کے بعد تمہارا راستہ میرے راستے سے الگ ہے۔لیکن جدائی سے پہلے انہوں نے ان تینوں کاموں کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کر دی۔

کشتی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ایک ظالم وجابر بادشاہ دریا میں موجود صحیح وسالم کشتیوں کو ملاحوں سے چھین لیتا تھا۔ میں نے کشتی میں سوراخ کر کے اس میں عیب پیدا کر دیا تا کہ اس ظالم بادشاہ کی دستبرد سے محفوظ رہے اور اس کشتی کے غریب ملاح اپنی روٹی روزی کے اس وسیلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔

جس نوجوان کو میں نے قتل کیا، وہ مرتد اور کافر ہو گیا تھا اور سزائے موت کا مستحق تھا۔اس بات کا خطرہ بھی موجود تھا کہ وہ اپنے نیک ماں باپ پر دباؤ ڈال کر ان کو بھی بے دین بنا دیتا۔

باقی رہ گئی دیوار، تو وہ اس بستی کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔اس کے نیچے ان کا خزانہ دبا ہوا تھا۔ان کا باپ ایک نیک انسان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ ان کا خزانہ محفوظ رہے۔پھر انہوں نے کہا کہ میں نے ان میں سے کوئی کام بھی اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ یہ تینوں کام اللہ کے حکم سے کئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، علم ومعرفت کا ایک ذخیرہ حضرت خضر علیہ السلام سے لے کر ان سے الگ ہو کر اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔انہوں نے اس عظیم معلم اور مربی سے مندرجہ ذیل سبق حاصل کئے:

۱۔ ایک عالم اور حکیم رہنما کو تلاش کرنا اور اس کے علم واخلاق سے روشنی اصل کرنا اس قدر اہم ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم نبی کو حکم دیا گیا کہ دور دراز کا فاصلہ طے کر کے ایسے رہنما کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے روشنی حاصل کریں۔

۲۔ کسی کام میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ بہت سے کاموں کے لیے مناسب وقت اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ "**الامور رهنية باوقتها**"، "ہر کام اپنے وقت پر انجام پاتا ہے۔"

۳۔ ہمارے اردگرد جو حوادث اور واقعات رونما ہوتے ہیں، ان کے ظاہری پہلو کے ساتھ ساتھ ایک باطنی پہلو بھی ہوتا ہے۔ کسی واقعہ کے ظاہری اور ناخوشگوار پہلو کو دیکھ کر اسی کو ساری حقیقت سمجھ کر جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کر لینا چاہئے۔کسی بھی معاملہ کے بارے میں فیصلہ کرنے سے قبل اس کے باطن کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ معنوی عہد وپیمان کو بار بار توڑنے کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ انسان ہمیشہ کے لیے ان کے فوائد وبرکات سے محروم ہو جائے۔

۵۔ کمزور طبقات کی حمایت، یتیموں کی خیر خواہی اور ظالموں کے خلاف جنگ ایسے فرائض ہیں جنہیں ہر قیمت پر ادا کرنا ضروری ہے۔

۶۔ انسان جتنا بھی زیادہ علم رکھتا ہو، اسے اپنے علم پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اسے یہ بات ضرور مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس کے

علم سے آگے اور بھی علوم موجود ہیں۔ اگر انسان اپنے علم کو ہی علم کا کمال سمجھ لے تو اس سے اس کی ترقی کا سفر رک جاتا ہے۔

۷۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے مخصوص کارندے خاموشی اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مظلوم اور بے یارو مددگار بندوں کی مدد کرنے میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص الطاف وعنایات میں سے ہے جن کی توقع ہر صاحب ایمان کرسکتا ہے۔

یہ واقعہ خواہ حضرت موسیٰ کی تعلیم وتربیت کے لیے تھا یا دوسروں کے لیے ایک نمونہ اور مثال تھا، اس سے ہماری بحث متاثر نہیں ہوتی، اس لئے کہ جو سبق ہم اس سے سیکھ رہے ہیں، وہ ایک حقیقت ہے۔

مختصر یہ کہ علم میں اضافہ اور تہذیب نفس کے لیے رہبر اور پیشوا کی ضرورت اور اہمیت قابل انکار نہیں ہے۔

چودھواں باب

ولایت کا ایک اور چہرہ اور تہذیب نفوس میں اس کا کردار

تہذیب نفس اور سیر وسلوک الی اللہ سے متعلق امور اور اخلاقیات پر ولایت کی تاثیر کا عقیدہ صرف اس بنیاد پر نہیں کہ اولیاء اللہ اور ان کی ہدایات قول وفعل کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ ہیں بلکہ بعض علمائے بزرگ کے عقیدہ کے مطابق ولایت کی ایک اور قسم بھی موجود ہے جسے ولایت تکوینی کہا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اولیائے الٰہی، تربیت کے قابل افراد میں براہِ راست تصرف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ رسولؐ اور امامؑ انسانی معاشرے کے دل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو عضو دل کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہو اور اس کے ساتھ جس قدر زیادہ ہم آہنگ ہو، وہ اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوتا ہے، یا اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ نبیؐ اور امامؑ چمکتے ہوئے سورج کی مانند ہوتے ہیں۔ اگر تکبر، خود پسندی اور نفس پرستی کے بادل انسان کی روح اور دل پر سایہ فگن نہ ہوں تو اس آفتاب ولایت کی روشنی ایسے انسان کی روحانی نشوونما کرنے اور اسے پر اثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہاں ولایت ایک اور صورت میں رونما ہوتی ہے اور ظاہری تصرفات سے آگے بڑھ کر ایک غیر مرئی اور پر اسرار تاثیر اختیار کر لیتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ﴿٤٦﴾ (احزاب: ۴۵، ۴۶)

''اے نبیؐ! ہم نے تمہیں گواہ، بشارت دینے والا، خبردار کرنے والا، اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

یہ روشن چراغ اور آفتاب درخشاں سالکانِ راہ قرب کی راہوں کو ہی روشن نہیں کرتا بلکہ انسان کے وجود پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور نفوس کو نشوونما دے کر معنوی ارتقاء کی طرف لے چلتا ہے۔

ہشام بن حکم اور اہل سنت کے ماہر علم کلام عالم عمرو بن عبید کے درمیان ہونے والا مناظرہ بھی اس بات کی ایک دلیل ہے۔

ہشام بن حکم مسجد بصرہ میں داخل ہوئے۔ لوگ عمرو بن عبید کے گرد اجتماع کئے ہوئے تھے۔ ہشام بن حکم نے مجمع کو چیرتے ہوئے عمرو بن عبید کے قریب جا کر کہا کہ میں ایک اجنبی مسافر ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو سوال کرنا چاہتا ہوں؟

عمرو: جی فرمایئے!

ہشام: آیا آپ کی آنکھیں ہیں؟

عمرو: بیٹا یہ کیسا سوال کر رہے ہو؟ جو چیز تمہیں نظر آ رہی ہے، اس کے بارے میں سوال کر رہے ہو؟

ہشام: میرے سوالات کچھ اسی قسم کے ہیں، اگر آپ اجازت فرمائیں تو میں سلسلہ جاری رکھوں؟

عمرو: (غرور سے بھرے ہوئے لہجے میں) پوچھو، خواہ تمہارے سوال احمقانہ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہشام نے اپنا مذکورہ سوال دہرایا اور عمرو نے اس کا مثبت جواب دیا۔

ہشام: آپ اپنی آنکھوں سے کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو: رنگوں اور چیزوں کو دیکھتا ہوں۔

اس کے بعد ہشام نے منہ، کان، ناک کے بارے میں ایسے ہی سیدھے سادھے سوال کئے اور سیدھے سادھے جواب سنے۔ آخر میں ہشام نے پوچھا:

ہشام: کیا آپ کے پاس دل ہے اور آپ اس سے کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو: میرے تمام اعضاء و جوارح مجھے جو پیغام اور اطلاعات دیتے ہیں، دل کی مدد سے ان کا جائزہ لیتا ہوں (اور ان سے مناسب کام لیتا ہوں)۔

ہشام: کیا اعضا و حواس ہمیں قلب سے بے نیاز نہیں کرتے؟

عمرو: نہیں، اس لئے کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ جو اس سے غلطی سرزد ہو جائے، دل انہیں اس خطا سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہاں ہشام نے اصل وار کرتے ہوئے کہا:

اے ابو مروان! (یہ عمرو بن عبید کی کنیت تھی) جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء و جوارح کو امام اور رہنما کے بغیر نہیں چھوڑا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ عالم انسانیت کو امام کے بغیر، حیرت و سرگردانی میں چھوڑ دے اور ان کے لیے کوئی امام مقرر نہ کرے؟

عمرو بن عبید یہاں اصل نکتہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور خاموش ہو گیا اور سمجھ گیا کہ یہ جوان ہشام بن حکم ہے۔ اس نے ہشام بن حکم کو احترام کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھایا۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے ہشام سے یہ واقعہ سنا تو آپؑ نے تبسم فرمایا اور پوچھا:

''یہ منطق کس نے تمہیں سکھائی؟''

ہشام نے جواب دیا کہ یہ آپؑ کی صحبت کا فیض ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! یہ بات صحف ابراہیمؑ و موسیٰ میں بیان ہوئی ہے۔'' (اصولِ کافی، ۱:۱۶۹، خلاصہ)

بلاشبہ امامؑ عالم انسانیت کا قلب ہے۔ اس طرح یہ حدیث امام کی ولایت و ہدایت تشریعی یا تکوینی یا دونوں پر دلالت کر رہی ہے۔

ابوبصیر اور ان کے ایک پڑوسی جس نے نئی نئی توبہ کی تھی، کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی اسی حقیقت کی ایک اور دلیل ہے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میرا ایک ہمسایہ جو (بنی امیہ یا بنی عباس کی) ظالم حکومت کا کارندہ تھا اور اس ملازمت کے ذریعہ اس نے بہت مال و دولت جمع کر لی تھی۔ وہ عیش و عشرت اور شراب خوری کی محفلیں سجاتا اور اپنے دوستوں کو ان میں دعوت دیتا تھا۔ میں نے متعدد بار اس سے اس چیز کی شکایت کی مگر وہ باز نہ آیا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ میں ایک گناہگار انسان ہوں جبکہ تم ایک نیک اور پاکیزہ انسان ہو۔ اگر تم میرے حال سے اپنے امامؑ، امام جعفر صادق علیہ السلام کو خبر دو تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے وسیلہ سے مجھے گناہوں کی زندگی سے نجات دے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ اس کی بات کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ جب میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس کی حالت امام علیہ السلام کی خدمت میں بیان کی۔ آپؑ نے فرمایا کہ جب تم کوفہ واپس جاؤ اور وہ تمہیں ملنے آئے تو اسے کہنا کہ جعفرؑ بن محمدؑ تمہیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم گناہ ترک کر دو تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ جب میں کوفہ گیا تو وہ مجھے ملنے آیا اور میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کا پیغام اسے پہنچایا۔ امامؑ کا پیغام سن کر اس کے دل پر گہرا اثر ہوا اور وہ فرطِ جذبات سے رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا کہ تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا واقعی جعفرؑ بن محمدؑ نے ایسا کہا ہے؟

ابوبصیر نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ امامؑ نے یہ پیغام دیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے لئے یہی کافی ہے اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

چند روز بعد اس نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں دروازے کے پیچھے تقریباً برہنہ حالت میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ میرے گھر میں جو کچھ (مالِ حرام) تھا، وہ سب میں نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ جن اموال کے مالکوں کو میں جانتا تھا، وہ ان کے مالکوں کو لوٹا دیئے ہیں اور جن اموال کے مالکوں کو نہیں جانتا تھا، وہ ان کی طرف سے فقراء میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ اب جو میری حالت ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں نے برادرانِ مومن کی مدد سے اس کے لیے لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی فراہم کیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں بیمار ہوں۔ میں اس کے پاس گیا۔ میں باقاعدگی سے اس کی عیادت کرتا رہا اور اس کا علاج بھی کروایا مگر اسے افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار اس کی موت کا وقت قریب آ گیا۔

میں اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور وہ حالت نزع میں تھا۔ پھر اس پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا اور بولا:

''ابوبصیر! تمہارے امامؑ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد میں حج کے لیے مکہ گیا۔اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں جیسے ہی امامؑ کے گھر میں داخل ہوا، آپؑ نے بغیر کسی تمہید کے کمرے کے اندر سے اونچی آواز میں فرمایا:

''ابوبصیر! ہم نے تمہارے دوست سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا (اور اس نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا)۔''

(بحار الانوار، ۴۷: ۱۴۵)

ممکن ہے یہ واقعہ توبہ کا ایک عام واقعہ ہو لیکن اس بات کے پیش نظر کہ وہ شخص غیر معمولی طور پر گناہگار تھا اور اس نے یہ اقرار بھی کر لیا کہ وہ امامؑ کی نظر عنایت کے بغیر شیطان کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتا۔اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس شخص کے اندر رونما ہونے والی یہ تبدیلی امامؑ کے تصرف کا نتیجہ ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں نورِ ولایت کا کوئی نقطہ موجود تھا اور وہی اس چیز کا باعث ہوا کہ امامؑ نے اس میں تصرف کیا اور اسے نجات بخشی۔

تہذیب نفس میں اس معنوی تاثیر اور ولایت تکوینی کا ایک اور نمونہ یہ واقعہ ہے جو علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں نقل کیا ہے:

''جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون کی قید میں تھے تو اس نے ایک حسین و جمیل کنیز آپؑ کے پاس بھیجی۔(بظاہر اس کا مقصد امامؑ کی خدمت کرنا تھا مگر اصل میں اس کا مقصد آپ کو فریب دینا تھا) جب امامؑ نے اس کو دیکھا تو یہ آیت پڑھی جو ملکہ سباء کے ہدایا و تحائف کو دیکھ کر حضرت سلیمانؑ نے پڑھی تھی:

بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ۝۳۶

''بلکہ تم ہی اپنے ہدیہ پر فرحت محسوس کرتے ہو۔''(نمل:۳۶)

پھر آپؑ نے فرمایا:''مجھے اس کنیز کی اور اس جیسی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

ہارون اس جواب پر غضبناک ہوا اور اپنا ایلچی امامؑ کے پاس بھیجا کہ انہیں یہ پیغام دے کر ہم نے آپؑ کی مرضی اور اجازت سے آپؑ کو گرفتار اور قید نہیں کیا ہے اور کہا کہ کنیز کو ان کے پاس چھوڑ کر آؤ۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہارون نے ایک خادم بھیجا تا کہ یہ دیکھے کہ وہ کنیز امامؑ پر اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں؟ خادم نے واپس جا کر ہارون کو خبر دی کہ کنیز مسلسل جسدہ کی حالت میں تھی اور یہ کہے جا رہی تھی:

قدوس سبحانك سبحانك

اور اس نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔

ہارون نے کہا:''اللہ کی قسم! موسیٰ ابن جعفرؑ نے اس پر جادو کر دیا ہے۔''

پھر اس نے حکم دیا کہ کنیز کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔جب کنیز کو ہارون کے سامنے لایا گیا تو خشیتِ الٰہی سے اس پر لرزہ طاری تھا اور اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

ہارون نے اسے دیکھ کر سوال کیا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے؟

کنیز نے جواب دیا: میرے اندر ایک نئی حالت پیدا ہوگئی ہے۔ جب میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پاس تھی تو میں نے دیکھا کہ آپؑ شب و روز مسلسل نماز پڑھتے تھے۔ نماز سے فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہوجاتے۔ ایک بار میں نے کہا کہ مجھے آپؑ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے، اگر آپؑ کی کوئی حاجت ہو تو فرمائیے؟

امام علیہ السلام نے ایک طرف اشارہ کیا اور فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟

میں نے دیکھا تو مجھے ایک وسیع و عریض باغ نظر آیا جس کی حدیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یہ باغ پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور جگہ جگہ ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے۔ حسین و جمیل خادموں کی کثیر تعداد خدمت کے لیے آمادہ تھی۔ انہوں نے سبز حریر کے لباس پہنے ہوئے تھے اور یاقوت کے تاج ان کے سروں پر رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دھونے کے لیے آفتابے، ہاتھ خشک کرنے کے لیے تولئے تھے اور انواع و اقسام کے کھانے آمادہ تھے۔ یہ دیکھ کر میں حالت سجدہ میں گر گئی، سجدے میں ہی تھی کہ اس خادم نے مجھے اٹھایا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اپنی جگہ پر تھی۔

ہارون نے کہا:

''اے خبیث عورت! شاید تو نے سجدہ کیا اور سجدے میں سو گئی اور یہ سب کچھ خواب میں دیکھا۔''

کنیز نے کہا: اللہ کی قسم! میرے آقا! ایسا نہیں ہے۔ پہلے میں نے یہ منظر دیکھا اور بعد میں سجدہ کیا۔

ہارون نے خادم کو حکم دیا کہ اس خبیث عورت کو لے جاؤ اور اسے اپنے پاس نظر بند کرو تا کہ کوئی اس کی یہ کہانی نہ سن سکے۔

کنیز فوراً نماز میں مشغول ہوگئی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کر رہی ہو تو اس نے جواب دیا:

''میں نے عبد صالح (یعنی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

پھر اس نے مزید کہا کہ جب میں وہ سارے مناظر دیکھ رہی تھی تو میں نے حورانِ جنت کو دیکھا جنہوں نے مجھ سے کہا:

''عبد صالح سے دور ہو جاؤ تا کہ ہم داخل ہو سکیں، ان کی خدمت گار ہم ہیں، تم نہیں!''

یہ کنیز اسی حالت میں رہی، یہاں تک کہ اس دنیا سے چل بسی۔ (بحار الانوار، ۴۸: ۲۳۹)

اس واقعہ میں بھی تربیت کی قابلیت رکھنے والے نفوس میں امّام کے معنوی نفوذ اور تاثیر کا نمونہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومینؑ کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات نظر آتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان عظیم ہستیوں سے ایک ملاقات کے نتیجہ میں ہی مکمل طور پر تبدیل ہوگیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اولیائے کامل نے ان لوگوں پر ایسی نظر عنایت کی جس کے نتیجہ میں ان کے اندر یہ عظیم انقلاب رونما ہوگیا۔ اس تصرف کو دوسرے الفاظ میں ولایت تکوینی کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی ضرور مدنظر رہے کہ ایسی نظر عنایت بے سبب نہیں ہوتی۔ جن لوگوں پر یہ نظر عنایت ہوتی ہے، ان میں بھی ضرور کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام معصومؑ کی نظر عنایت کے مستحق بنتے ہیں۔

علامہ مطہری شہید کا نظریہ

علامہ مرتضیٰ مطہری شہید اپنی کتاب "ولاء ھا وولایتھا" میں فرماتے ہیں:

''عام طور پر یہ دو الفاظ چار معنی میں استعمال ہوتے ہیں: ولائے محبت، یعنی اہل بیتؑ سے عشق و محبت، ولائے امامت یعنی آئمہؑ کو افعال و کردار میں نمونہ عمل قرار دینا، ولائے زعامت یعنی آئمہؑ کو سیاسی اور معاشرتی امور میں اپنا حاکم ماننا اور دلائے تصرف یاد لائے معنوی جو کہ ولایت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔''

اس کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کی وضاحت کرتے ہوئے چوتھے معنی کی وضاحت کے ضمن میں کہتے ہیں:

''معنوی ولایت یا تصرف ایک غیر معمولی تکوینی تصرف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اللہ کی عبادت کے نتیجہ میں قرب الٰہی کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ انسان کامل کا مقام و مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد وہ معنویات کا قافلہ سالار بن جاتا ہے۔ اسے لوگوں کے باطن پر تسلط حاصل ہو جاتا ہے، وہ لوگوں کے اعمال کا گواہ اور حجت زمان ہو جاتا ہے۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق ہر دور میں ایک انسان کامل موجود ہوتا ہے جو انسان اور کائنات پر غیبی تسلط رکھتا ہے، وہ ارواح و قلوب پر بھی نظر رکھتا ہے اور اسے حجت خدا کہا جاتا ہے۔

ولایت تکوینی کے معنی یہ نہیں ہیں، جیسا کہ بعض جاہلوں نے سمجھ رکھا ہے کہ کوئی انسان کائنات کا سرپرست بن کر اللہ کی طرف سے نظامِ زمین و آسمان کو چلانے اور خلق و رزق کے امور کا چلانے والا بن جائے۔

اگرچہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے بلکہ اس بات کے ساتھ شباہت رکھتا ہے جو اللہ نے فرشتوں کے مدبرات امر اور مقسمات امر ہونے کے حوالے سے کہی ہے۔ لیکن قرآن ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم خلق کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے اور مارنے جیسے امور کو اللہ کے سوا کسی کی طرف نسبت نہ دیں۔

بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کامل قرب الٰہی کے نتیجہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے کائنات کے بعض امور پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:

''یہاں اس بات کی طرف مختصر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ یہ طرزِ فکر قرآنی معنی و مفاہیم پر مبنی ہے تاکہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ یہ کوئی قلندرانہ یا ملنگانہ بات ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ولایت کے چوتھے معنی کا تعلق عرفانی مسائل سے ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ چونکہ اس کا تعلق عرفانی مسائل سے ہے، لہٰذا اسے رد کر دیا جائے۔''

اس کے بعد وہ بہت سے پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''بنابرایں یہ محال اور ناممکن ے کہ انسان اللہ کی اطاعت اور بندگی کے نتیجہ میں فرشتوں کے مقام تک یا ان کے مقام سے بالاتر مقام پر نہ پہنچ پائے یا کم از کم ان کمالات کو حاصل نہ کر سکے جو ایک فرشتے کو حاصل ہیں (وہ فرشتے اذن الٰہی سے کائنات میں تصرف اور تدبیر کا اختیار رکھتے ہیں)۔''

مرتضیٰ مطہری شہید کے ان بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان انسان ہائے کامل کے ساتھ معنوی تعلق سے انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ ان پر روحانی طور پر اثر انداز ہو سکیں اور انہیں بتدریج رذائل اخلاقی سے دور کر کے فضائل و کمالات کے قریب لا سکیں۔

ناجائز مفاد پرستی

ہر دور میں اور ہر قوم میں ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو مفاہیم سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں مگر اس سے ان صحیح مفاہیم کی صحت متاثر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی قداست میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

تہذیب نفس اور سلوک الی اللہ کی راہ میں موثر پیشرفت کے لیے استاد اور مرشد کی ضرورت بھی انہی مسائل میں سے ہے جن سے سوئے استفادہ کیا گیا ہے (ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے)۔

صوفیاء میں سے بعض افراد نے اپنے آپ کو مرشد، شیخ، پیر طریقت اور قطب وغیرہ جیسے عنوان دے کر لوگوں کو اپنی بے قید و شرط پیروی کی دعوت دینا شروع کر دی۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر آپ پیر طریقت کو کوئی غیر شرعی عمل انجام دیتے دیکھیں تو ہرگز ان پر اعتراض نہ کریں، اس لئے کہ ان پر اعتراض کرنا روح تسلیم کے خلاف ہے۔

امام غزالی کا اہل تصوف کی طرح رجحان ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں ان کے بیانات سے ظاہر ہے اور اہل تصوف بھی انہیں اپنے بزرگوں میں شمار کرتے ہیں۔ غزالی اسی کتاب کے باب ۵ کی فصل ۱ میں کہتے ہیں:

''شیخ کے سامنے مریدوں کا باادب ہونا صوفیاء کے آداب میں سب سے اہم ہے۔ مرید کو شیخ کے سامنے بے اختیار ہونا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ شیخ کی اجازت کے بغیر اپنے جان و مال میں کوئی تصرف نہ کرے..... شیخ کے سامنے مرید کا بہترین ادب خاموشی اور جمود ہے، یہاں تک کہ شیخ جب، جو کچھ مناسب سمجھے، اسے کرنے کو کہے۔ اگر اسے شیخ کا کوئی عمل خلافِ شریعت دکھائی دے اور اس کا سمجھنا اس پر دشوار ہو تو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کو یاد کرنا چاہئے۔ حضرت موسیٰ حضرت خضرؑ کے کاموں کو غلط سمجھ کر اعتراض کرتے رہے مگر جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان افعال کی حقیقت بیان کی تو موسیٰ نے اپنے اعتراض واپس لے لئے۔ لہٰذا شیخ جو بھی عمل انجام دیتا ہے، اس کی کوئی حکمت ہوتی ہے۔'' (احیاء العلوم، ۵:۱۹۸)

شیخ عطار، یوسف بن حسین رازی کے حالات میں لکھتے ہیں:

''جب ان کے مرشد، ذوالنون مصری نے انہیں حکم دیا کہ مصر کو چھوڑ کر اپنے شہر چلے جائیں تو یوسف نے ان سے ہدایات طلب کیں۔ ذوالنون نے جواب دیا: جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اسے بھول جاؤ اور جو کچھ تم نے لکھا ہے، اسے مٹا دو تا کہ حجاب برطرف ہو جائے۔''

ابوسعید کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے کہتے تھے:

رأس هذا الامر كبس المحابر و خرق الدفاتر و نسيان العلم

''تصوف کی اساس یہ ہے کہ دوات اور روشنائی کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور کتابوں کا پیوں کو پھاڑ دیا جائے اور علم کو بھلا دیا جائے۔'' (اسرار التوحید: ۳۲)

ابوسعید کندی کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ایک خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ رہتے تھے۔کبھی کبھی چوری چھپے درس میں شرکت کر لیتے تھے۔ایک دن ان کی جیب سے دوات گر گئی (اور یہ راز فاش ہوگیا) تو ان کے صوفی ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: اپنی شرمگاہ چھپالو۔(نقد العلم والعلماء:۳۱۷)

اس کے برعکس رسولؐ اللہ کی مشہور ومعروف حدیث میں ہے:

وزن مداد العلماء بدماء الشهداء فيرجح مداد العلماء على دماء الشهداء

''قیامت کے دن علماء کے قلم کی روشنائی کو شہداء کے خون سے تولا جائے گا اور وہ شہداء کے خون پر بھاری ہوگی۔''

یہ بین تفاوت راہ از کجاست تابہ کجا

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ جب حقائق نااہل افراد کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں تو ان میں کس طرح تحریف کر کے ان سے سوء استفادہ کیا جاتا ہے، کیوان قزوینی المعروف بہ منصور علی شاہ کی ان باتوں پر غور فرمایئے۔موصوف صوفیاء کے اقطاب میں سے تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ قطب کی حدود ان دس معاملات پر پھیلی ہوئی ہے:

۱۔ مجھے بھی وہی باطنی ولایت حاصل ہے جو خاتم الانبیاء کو حاصل تھی.....فرق صرف یہ ہے کہ وہ بانی تھے اور میں مروج اور محافظ ہوں۔

۲۔ میں لوگوں کو اس طرح درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہوں کہ برائیوں کی روح کو ان کے بدن میں مار ڈالوں یا ان کے بدن سے نکال کر کفار کے بدن میں منتقل کر دوں۔

۳۔ میں نفس کی قیود سے آزاد ہوں۔

۴۔ مرید اپنے تمام معاملات اور عبادات میری اجازت سے انجام دیں۔

۵۔ میں مریدوں کو جس اسم کا ورد کرنے کا حکم دوں، وہی اللہ کا اسم ہوگا، باقی اسماء کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

۶۔ دینی معارف اور قلبی عقائد کو اگر میری تصدیق حاصل ہو تو وہ صحیح ہوں گے ورنہ خطا ہوں گے۔

۷۔ میری اطاعت فرض، میری خدمت لازم اور میری حفاظت ضروری ہے۔

۸۔ میں اپنے عقائد میں آزاد ہوں۔

۹۔ میں اپنے مریدوں کے قلبی حالات پر حاضر وناظر ہوں۔

۱۰۔ میں جنت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہوں۔(استوارنامہ:۹۵)

یہ باتیں جو ہذیان اور دیوانگی سے زیادہ شباہت رکھتی ہیں، اگرچہ تمام صوفیاء کے ہاں قابل قبول نہ ہوں مگر ان سے یہ

بات واضح ہو جاتی ہے کہ قطب ہونے کے مدعی، قطب کے لیے ان مقامات اور اختیارات کے قائل ہیں جن کا دعویٰ انبیاء نے بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تہذیب اخلاق اور سیر وسلوک میں استاد اور مربی کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے کیسے نتائج رونما ہو سکتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا دعویٰ اہل تصوف نے کیا ہے، ان میں سے بعض تو انبیاء سے مخصوص ہیں جبکہ بعض کا دعویٰ انبیاء نے بھی نہیں کیا ہے۔ جو شخص بھی مذہبی مسائل سے تھوڑی بہت آگاہی رکھتا ہو، وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر گہرا المیہ ہے۔ اگر اہل تصوف کی کتب مثلاً ''تذکرۃ الاولیاء''، شیخ عطار، تاریخ تصوف، نفحات الانس اور احیاء العلوم کے بعض مباحث کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اقطاب کے بارے میں ایسے دعوے نظر آتے ہیں کہ انسان وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ محققین، متکلمین اور فقہاء نے اس گروہ کے خلاف محاذ قائم کیا جس کی وجہ سے بعض ناآگاہ افراد کو دکھ اور رنج بھی ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ حقائق سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ان رجحانات کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے اور ان کا سدباب نہ کیا جائے تو اسلام کے اصول وفروع کا حلیہ اس طرح بگاڑ کر رکھ دیا جائے گا کہ ان کی اصل شکل پہچانی ہی نہیں جائے گی۔

ہم یہاں پر اخلاقی مسائل کے کلیات کے بارے میں قرآنی آیات کی روشنی میں اپنی اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں اگلے مباحث کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جن میں ایک ایک کر کے تمام اخلاقی فضائل ورذائل پر گفتگو کی جائے گی۔

بارالہا! فضائل اخلاقی کے کمال تک پہنچنا اور تیری بارگاہ کا قرب حاصل کرنا تیری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تو اس راہ میں ہماری مدد فرما اور اپنے بندگانِ صالح کے قرب کے مقام تک ہمیں رسائی عطا فرما اور ہمیں صاحب نفس مطمئنہ بنا دے تاکہ ہم ''فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی'' کے خطاب کے مستحق ہو سکیں۔

بارالہا! شیطان کا دام سخت اور سہمگین ہے اور ہوائے نفس ایک خطرناک دشمن ہے، رذائل اخلاقی کانٹوں کی طرح ہماری روح کو تڑپاتے ہیں، ایسے میں صرف تیری مخصوص عنایات ہمیں ان سب سے رہائی دلا سکتی ہیں۔

بارالہا! اس گفتگو کے اختتام پر اس دعا کے ذریعے اپنے آپ کو تیرے سپرد کرتے ہیں:

اللھم لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین ابدا

''پروردگار! مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔''



علم الاخلاق جلد دوم

(قرآن کی روشنی میں)

مؤلف

آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ

ڈاکٹر سید نیاز محمد ہمدانی (پی ایچ۔ڈی)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔

فہرست مضامین

عرضِ ناشر _____ 13
اچھے اور بُرے اخلاق۔۔قرآن کی روشنی میں _____ 14
تمہید _____ 14
پہلا باب: تکبر اور استکبار _____ 16
تفسیر _____ 19
انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ:۔ _____ 19
تکبر، احادیث کی روشنی میں _____ 32
تکبر، عقل کی روشنی میں _____ 34
1۔تکبر کی حقیقت اور تعریف:۔ _____ 36
2۔تکبر کا شاخیں:۔ _____ 36
3۔تکبر کس کے سامنے! _____ 37
4۔تکبر کے محرکات:۔ _____ 39
(1)۔علم _____ 39
(2)۔عمل:۔ _____ 40
(3)۔حسب ونسب:۔ _____ 41
(4)۔حسن وجمال اور ظاہری خوبصورتی:۔ _____ 42
(5)۔مال ودولت:۔ _____ 43
(6)۔جسمانی، سیاسی اور معاشرتی قوت:۔ _____ 43
(7)۔دوستوں اور مددگاروں کی کثرت:۔ _____ 44
5۔تکبر کی جڑیں:۔ _____ 44
6۔تکبر کی علامات:۔ _____ 45
7۔تکبر اور استکبار کے نتائج:۔ _____ 46

(1)۔کفر وشرک سے آلودگی:۔ 46
(2)۔علم ودانش سے محرومی:۔ 47
(3)۔تکبر بہت سے گناہوں کا اصل سبب ہے:۔ 47
(4)۔تکبر لوگوں کی نفرت کا سبب:۔ 48
(5)۔تکبر اور وسائلِ زندگی سے محرومی:۔ 49
(8)۔تکبر کا علاج:۔ 49
علمی طریقہ:۔ 49
عملی طریقہ:۔ 51
(9)۔علاج اور آزمائش:۔ 53
دوسرا باب: تواضع اور فروتنی 56
تواضع احادیث کی روشنی میں 59
تواضع کی تعریف: 62
تواضع اور انسانی احترام:۔ 63
تیسرا باب: حرص اور قناعت 64
تفسیر اور نتیجہ:۔ 66
حرص اور دنیا پرستی احادیث کی روشنی میں 74
حرص کی تعریف 77
انفرادی اور معاشرتی زندگی پر حرص کے اثرات 78
باطن کی بے نیازی 79
پسندیدہ اور ناپسندیدہ حرص 79
حرص کا علاج 81
ایک غلط فہمی کا ازالہ 83
چوتھا باب: حُبِّ دنیا 84
دُنیا پرستی احادیث کی روشنی میں 88

مطلوب دُنیا اور مذمُومِ دُنیا 91
پانچواں باب: حسد 95
تفسیر اور نتیجہ: 97
حسد، احادیث کی روشنی میں 105
چند اہم مسائل:۔ 107
1۔حسد کے معنی اور حسد ورشک میں فرق: 107
2۔حسد کے محرکات:۔ 108
3۔حسد کی علامات:۔ 111
4۔حسد کے منفی اثرات:۔ 112
5۔حسد کے درجات:۔ 115
6۔حسد کا علاج:۔ 116
7۔نُصح وخیر خواہی:۔ 119
چھٹا باب: غرور وخود بینی 121
1۔غرور کا مفہوم:۔ 122
غرور قرآن مجید کی روشنی میں 123
تفسیر اور نتیجہ:۔ 125
غرور کی مذمت احادیث میں 132
2۔غرور کے اسباب:۔ 133
3۔غرور کی نشانیاں:۔ 135
4۔فرد اور معاشرے پر غرور کے اثرات:۔ 136
5۔غرور کا علاج:۔ 138
ساتواں باب: طُولِ اَمل (لمبی آرزوئیں) 140
تفسیر اور نتیجہ 143
طولِ اَمل کے اسباب:۔ 143

طُولِ اَمل احادیث کی روشنی میں 148
طولِ امل کے نتائج:۔ 151
بہت سے گناہوں کا سبب:۔ 151
قساوتِ قلب کا سبب:۔ 152
آخرت فراموشی کا سبب:۔ 152
موجبِ زحمت ومشقت:۔ 153
ذِلت آمیز زندگی:۔ 154
نعمتوں سے محرومی:۔ 154
حقیقت سے دُوری کا سبب:۔ 154
کفرانِ نعمت:۔ 155
طُولِ اَمل کے اسباب ومحرکات 155
طُول اَمل کا علاج 157
مثبت اور تعمیری آرزوئیں:۔ 159
آٹھواں باب: تعصُّب اور ضد 162
تفسیر اور نتیجہ 165
گمراہ اقوام کی عمومی روِش:۔ 165
تعصب اور ھٹ دھرمی احادیث کی روشنی میں 172
تعصب کا مفہوم اور اس کے محرکات 174
1۔آباؤاجداد سے غیر معمولی محبت:۔ 175
2۔کوتاہ نظری:۔ 175
3۔شخصیت پرستی:۔ 175
4۔فکری اور معاشرتی گوشہ نشینی:۔ 176
تعصب اور لجاجت کے منفی اثرات 176
پسندیدہ اور ناپسندیدہ تعصب:۔ 178

مثبت تقلید اور اندھی تقلید:۔ 179
1۔ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنا:۔ 180
2۔ عالم کا جاہل کی تقلید کرنا:۔ 180
3۔ عالم کا کسی اور عالم کی تقلید کرنا:۔ 180
4۔ جاہل کا عالم کی تقلید کرنا:۔ 180
راہِ علاج:۔ 181
حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا:۔ 182
نواں باب: بُزدلی اور شجاعت 184
انبیائے الٰہی بزدل نہیں ہوتے:۔ 187
خوف اور بُزدلی احادیث کی روشنی میں 193
معقول خوف اور غیر معقول خوف 195
انفرادی اور قومی زندگی پر بزدلی کے منفی اثرات 196
بزدلی کے اسباب:۔ 197
علاج اور احتیاط 198
انسان کی زندگی پر شجاعت کے اثرات 200
دسواں باب: توکل 204
انبیاؑ کی زندگی میں توکل کا عکس:۔ 207
توکل احادیث کی روشنی میں 215
توکل کی حقیقت:۔ 218
توکل کے آثار و نتائج:۔ 222
توکل کے اسباب:۔ 224
توکل کے درجات:۔ 225
توکل تک پہنچنے کے راستے:۔ 226
گیارہواں باب: شہوت پرستی 228

شہوت پرستی احادیث کی روشنی میں 237
شہوت پرستی کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات 238
شہوت پرستی کے نقصانات:۔ 240
گناہ سے آلودگی:۔ 241
عقل کی خرابی:۔ 242
معاشرتی حیثیت کا نقصان:۔ 242
نفس کی غلامی:۔ 243
رُسوائی اور بے عزتی:۔ 243
شہوت پرستی کے اسباب:۔ 244
1۔ایمان کی کمزوری:۔ 244
2۔معاشرتی حیثیت اور احترام کو نظر انداز کرنا:۔ 245
3۔غفلت اور بے خبری:۔ 245
4۔بری صحبت اور ناپاک ماحول:۔ 245
شہوت پرستی کا علاج 246
الف:علمی طریقہ:۔ 246
ب۔عملی طریقہ:۔ 248
شکم پرستی اور جنسی شہوت:۔ 250
بارھواں باب:عفّت:ایک عظیم اخلاقی فضیلت 253
آبرومند محتاج:۔ 255
عفت:مومن کی نمایاں صفت:۔ 259
عفت:فلاح کی کنجی:۔ 260
عفت احادیث کی روشنی میں 260
بے عفّتی کے سدِّ باب کے طریقے 263
1۔حجاب:۔ 263

2۔مخلوط محافل کی روک تھام:۔ 264
3۔ذرائع ابلاغ کا کردار:۔ 264
تیرھواں باب:غفلت و بے خبری 266
غفلت،احادیث کی روشنی میں 276
غفلت کے بارے میں اہم نکات 279
غفلت کے اسباب 279
الف۔جہالت:۔ 279
ب۔غروراورخود پسندی:۔ 280
ج۔نعمتوں کا نشہ:۔ 280
د۔جسمانی صحت:۔ 281
ھ۔لمبی آرزوئیں:۔ 281
غفلت کے نتائج 281
ا۔سنگدلی:۔ 281
ب۔دل کی موت:۔ 282
ج۔عقل کی خرابی:۔ 282
د۔اللہ سے دُوری:۔ 283
ھ۔ہلاکت:۔ 283
غفلت کی علامات 283
غفلت کا علاج 285
1۔تاریخ سے عبرت:۔ 285
2۔ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا:۔ 286
3۔قلبی توجہ کے ساتھ نماز پڑھنا:۔ 286
4۔غوروفکر:۔ 287
5۔ماحول کی تبدیلی:۔ 287

یقظہ اور بیداری 288
مثبت تغافل 291
تغافل، اقوالِ معصومینؑ کی روشنی میں 292
چودھواں باب: بُخل 294
بُخل احادیث کے آئینے میں 308
بخل کے نتائج:۔ 312
بخل کے درجات:۔ 314
بُخل کی روک تھام اور علاج 316
پندرھواں باب: جُود وسخاوت 318
سخاوت، احادیث کی روشنی میں 323
سخاوت کے آثار ونتائج 325
سخاوت کی حدود 327
سخاوت کی صفت کیسے حاصل کی جائے:۔ 327
سولھواں باب: عجلت اور جلد بازی 330
عجلت اور جلد بازی احادیث کی روشنی میں 341
1۔عجلت اور شتاب زدگی کا مفہوم:۔ 343
2۔نیکی میں سرعت 344
عجلت اور شتاب زدگی کے منفی اثرات 346
1۔وقت اور توانائی کا ضیاع:۔ 346
2۔یاس وناامیدی:۔ 347
3۔ندامت اور پشیمانی:۔ 347
4۔غم واندوہ:۔ 348
5۔اغلاط کی کثرت:۔ 348
عجلت کے اسباب 349

1۔نفس پرستی:۔ 349
2۔حُبِ دُنیا:۔ 349
3۔کم ظرفی:۔ 349
4۔جہالت اور نادانی:۔ 350
راہِ علاج 350
سترھواں باب 351
صبر وشکیبائی 351
1۔صبر براطاعت:۔ 351
2۔صبر برمعصیت:۔ 351
3۔صبر برمصیبت:۔ 351
صبر،احادیث کی روشنی میں 368
صبر کے اثرات اور نتائج 371
صبر کی شاخیں 373
صبر واستقامت کے محرکات 375
جزع وبیتابی:۔ 377
جزع اور بے صبری کا علاج 381
1۔بیماری کی تشخیص اور بہترین طریقۂ علاج تجویز کرنا:۔ 381
2۔جزع کے منحوس نتائج کی یادآوری:۔ 381
3۔صابرین کے اجر کے بارے میں آیات واحادیث کا مطالعہ:۔ 382
4۔انبیأ واولیأ کے حالات کا مطالعہ:۔ 382
5۔تلقین بہ نفس:۔ 382
جزع اور معقول جذبات کے درمیان فرق 383

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

محترم قارئین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ، آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی زیرسرپرستی لکھی جانے والی کتاب ''اخلاق درقرآن'' کا ترجمہ ''علم الاخلاق (قرآن کی روشنی میں)'' کے نام سے اُردو زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہے۔اس کتاب کی دُوسری جلد اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔جن حضرات نے پہلی جلد کو بغور پڑھا ہے، وہ یقیناً اس بات کے قائل ہوئے ہوں گے کہ ایسی کتابوں کی ہر گھر میں اشد ضرورت ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب انسان کی زندگی میں انتہائی مثبت تبدیلی لانے کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔ آج کل دُنیا اخلاقی حوالہ سے جس جگہ پہنچ چکی ہے، اُس میں اخلاقیات کی خرابی ہی سب سے بڑی وجہ ہے۔لہٰذا اس قسم کی کتابوں کی کثرت سے اشاعت لازمی طور پر معاشرہ میں مثبت تبدیلی لاسکتی ہے۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ۔۔۔۔۔

www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرنایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادفرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

اچھے اور بُرے اخلاق۔۔قرآن کی روشنی میں

تمہید

اس کتاب کی پہلی جلد میں ہم نے اخلاقی مسائل سے متعلق کلی اصولوں، تہذیبِ نفس کے مختلف طریقوں، مختلف اخلاقی مکاتبِ فکر اور اخلاقیات کے محرکات ونتائج پر قرآن شریف کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

اب وقت آن پہنچا ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں ایک ایک کر کے فضائل ورذائلِ اخلاقی کا جائزہ لیں اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ان سے بحث کریں۔

اس بحث کو شروع کرتے وقت ہمیں یہ مسئلہ درپیش آیا کہ اس وسیع وعریض بحث کو کس نظم وترتیب پر منظم ومرتب کیا جائے۔ کیا حکمائے یونان کی روش کی پیروی کرتے ہوئے اخلاق کو چار شعبوں (حکمت، عدالت، شہوت اور غضب) میں تقسیم کرنے ہی پر قناعت کر لیں؟ لیکن یہ روش نہ تو قرآنی آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن کی روشنی میں ہم ان مسائل پر بحث کریں گے اور نہ ہی بذاتِ خود یہ نظم وترتیب سے خالی ہے جیسا کہ جلد اوّل میں ہم اس طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ رذائلِ اخلاقی کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے زیر بحث لایا جائے۔ لیکن اس قسم کے موضوعات میں ایسی ترتیب منطقی روش سے ہٹ جاتی ہے اور مباحث میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔

یا یہ کہ مشرق ومغرب کے فلسفی مکاتبِ فکر کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اخلاقی مباحث کے نظم وترتیب میں ان کی پیروی کی جائے۔ یہ بھی ممکن نہ تھا، اس لیے کہ ان میں سے ہر مکتبہ فکر اپنی کچھ مخصوص مشکلات لکھتا ہے اور اخلاقیات کے بارے میں قرآن شریف کی موضوعی تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ بھی نہیں ہے۔

اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک الہامی رہنمائی نے ہمارا کام آسان کر دیا اور خود قرآن مجید کی روشنی میں ہمیں ایک نئی روش نظر آئی۔ ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن مجید گزشتہ اُمتوں کے حالات وواقعات بیان کرتے ہوئے اس کے ذیل میں اہم اخلاقی مباحث پر روشنی ڈالتا ہے اور اس بات کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ رذائل وفضائلِ اخلاقی میں سے ہر ایک انسانی معاشرے پر کتنا گہرا اثر ڈالتا ہے اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے! درحقیقت قرآن مجید نے اخلاقی مسائل کو ایسے امتحانات اور آزمائشوں کی بنیاد پر پیش کیا جو معاشرے میں ایک مسلمہ حقیقت ہیں تاکہ ہر پڑھنے اور سننے والا ان سے تیزی سے نتیجہ اخذ کر سکے۔

اس لئے ہم نے سوچا کہ اپنے مباحث کی مخصوص اہمیت کے پیشِ نظر ان کی ترتیب، انسانی تاریخ کی اس ترتیب کے مطابق رکھی جائے جو قرآن مجید نے اپنائی ہے۔

بالفاظِ دیگر سب سے پہلے ہم آدم وحوا، شیطان کے وسوسوں اور آدم وحوا کے جنت سے نکالے جانے کے واقعہ کا جائزہ لیں

گےاوران رذائلِ اخلاقی کا مطالعہ کریں گےجن کی وجہ سے شیطان کے بارگاہِ الٰہی سے نکالے جانے اورآدم وحوا کے جنت سے نکالے جانے والے واقعات رونما ہوئے۔

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ شیطان نے استکبار،خود پسندی،احساس برتری اوراس کے بعدضداورتعصب کی بنیاد پرآدم کوسجدہ کرنے سے انکارکیا جبکہ آدم وحواحرص ولالچ کی وجہ سے اپنے دشمن کے غیرمنطقی وسوسوں کا شکار ہو گئے اورشیطان کے دامِ فریب میں آ گئے۔

اس کے بعد ہابیل اورقابیل کاواقعہ اورقابیل کےقتل کا سبب بننے والے رذائل اخلاقی کا مطالعہ کیا جائے گا۔اسی طرح اس کے بعدحضرت نوحؑ،بنی اسرائیل اورحضرت موسیٰ علیہ السلام اوردیگرانبیا کی زندگی کے آئینہ میں اخلاقی فضائل اوران کے آثارنتائج کا مطالعہ کریں گے۔اسی طرح وہ گمراہ اقوام جوعذاب ہائے الٰہی کا نشانہ بنیں،ان کے واقعات کا تجزیہ کرکے اخلاقی رذائل اوران کے نتائج کا مشاہدہ کریں گے۔

یہ روش نہ صرف یہ کہ پُرکشش اورشریں ہے بلکہ قرآنی مباحث کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ بھی ہے۔اس کے علاوہ اس ترتیب سےفضائل ورذائل کی حقیقی تصویرسامنے آجاتی ہے،گویاہم انہیں حس اورتجربے کی روشنی میں دیکھ رہے ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کوتوفیق عطا فرمائے کہ اپنے اندر سے ان رذائل اخلاقی کا خاتمہ کرسکیں جنہوں نے انسانی معاشرے کو ایک جہنم بنا کررکھ دیا ہےاوراپنے آپ کوان فضائلِ اخلاقی سے مزین کریں جوہمیں اورہمارے معاشرےکوزیادہ سے زیادہ پاکیزگی ،نورانیت،اطمینان قلب اورترقی وپیش رفت کی دولت سے مالا مال کردیں اورہم سب سے بڑی سعادت یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب سے آراستہ ہوجائیں۔

آمین یارب العالمین

ربیع الاوّل 1420ھ

قم،ناصرمکارم شیرازی۔

پہلا باب

تکبر اور استکبار

داستانِ انبیاؑ اور آغازِ خلقت میں سب سے پہلے جو صفتِ رذیلہ ہمارے سامنے آتی ہے، وہ تکبر اور استکبار ہے۔ تمام علمائے اخلاق اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صفتِ اُم المفاسد یعنی تمام برائیوں کی ماں ہے۔ اس صفت کا اظہار داستانِ آدم و ابلیس میں ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے اپنے تکبر اور استکبار کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

آدم و ابلیس کا یہ واقعہ تمام انسانوں اور تمام انسانی معاشرے کے لئے درس آموز اور عبرت انگیز ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ تکبر و استکبار اور ان کے برے نتائج صرف تخلیق آدم کے واقعہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے، تمام انبیاؑ کی تاریخ میں اس نے ایک واضح تخریبی کردار ادا کیا ہے۔

دورِ حاضر میں تمام انسانی معاشروں میں اور تمام عالمی حوادث اور خرابیوں میں سب سے بڑا اور اوّلین سبب استکبار ہے۔ اس کی لگائی ہوئی آگ میں سب جل رہے ہیں لیکن کوئی اس دردانگیز بیماری کا علاج سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

اس تمہیدی بیان کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت خاتم تک اس موضوع سے متعلق آیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

1۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کیلئے سجدہ اور خضوع کرو، ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا (اور اپنی نافرمانی و تکبر کی وجہ سے) کافر ہو گیا۔'' (بقرہ۔34)

2۔ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

''(اللہ نے) کہا (اپنے مقام و مرتبہ سے) نیچے اُتر جا، تجھے حق نہیں کہ (اس مقام و مرتبہ میں) تکبر کرے اور نکل جا، تو پست اور حقیروں میں سے ہے۔'' (اعراف 13)

3۔ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ ﴿۷﴾

''(داستانِ نوح علیہ السلام میں ہے کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا) میں نے جب بھی انہیں دعوت دی (کہ وہ ایمان لے آئیں) تاکہ تو انہیں بخشش دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لئے اور مخالفت پر اصرار کیا اور شدت کے ساتھ استکبار کیا۔''(نوح:7)

4۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ۝۱۵

''قوم عاد نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور کہا ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ، جس نے انہیں پیدا کیا، ان سے زیادہ طاقتور ہے اور وہ (اپنے اس گمان کی بنیاد پر) ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔''(فصلت:15)

5۔ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۝۸۸ [۷:۸۸]

''(قومِ شعیبؑ کے) متکبر افراد نے کہا: اے شعیبؑ! ہم تمہیں اور تم پر ایمان لانے والوں کو شہر بدر کر دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے طریقے پر لوٹ آؤ۔ شعیبؑ نے کہا: (کیا تم ہمیں واپس پلٹا دو گے؟) خواہ ہم نہ چاہتے ہوں؟''(اعراف:88)

6۔ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۣ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ۝۳۹ۚ [۲۹:۳۹]

''اور ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو ہلاک کر دیا اور موسیٰؑ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن انہوں نے زمین میں تکبر کیا مگر اللہ سے آگے نہ نکل سکے''۔(عنکبوت:39)

7۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝۸۲ [۵:۸۲]

''یقیناً آپ مسلمانوں کے بدترین دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے اور مسلمانوں سے سب سے قریب ان لوگوں کو پائیں گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایسے علماء اور راہب ہیں جو (حق کے سامنے) تکبر نہیں کرتے''۔(مائدہ:82)

8۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾

''پھر اس نے تیوری چڑھائی اور جلد بازی کی، پھر (حق کی طرف) پشت کی اور تکبر کیا اور (آخرکار) کہا: یہ (قرآن) گزشتہ جادوگروں کے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے''۔(مدثر:22 تا24)

9۔ اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

''جو بغیر دلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں بحث کرتے ہیں (ان کا یہ عمل) اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک ایک عظیم گناہ ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے''۔(مؤمن:35)

10۔ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

''ان سے کہا جائے گا: جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو، متکبروں کا کیا بُرا ٹھکانہ ہے''۔(زمر:72)

11۔ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

''عنقریب ہم ان لوگوں کو اپنی آیات سے پھیر دیں گے جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ اگر وہ ہر آیت کو دیکھ لیں تو بھی ایمان نہیں لائیں گے، اگر انہیں ہدایت کی راہ نظر آ جائے تو اسے اختیار نہیں کرتے اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل تھے۔''(اعراف:146)

12۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

''جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ اسے جانتا ہے اور اللہ متکبرین کو پسند نہیں کرتا''۔

(نحل:23)

13۔ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا

الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

''مسیح ہرگز اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، نہ ہی فرشتے اس سے انکار کریں گے اور جو لوگ اس کی بندگی سے منہ موڑیں اور تکبر کریں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔ جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے، انہیں ان کا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید عطا کرے گا۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور تکبر کیا، انہیں دردناک سزا دے گا۔ اللہ کے سوا وہ کوئی سرپرست اور مددگار نہیں پائیں گے۔'' (نسا: 172 تا 173)

14۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے سامنے تکبر کیا، ان کیلئے آسمان کے دروازے ہرگز نہیں کھولے جائیں گے مگر یہ کہ اونٹ سوئی کے سوراخ سے گزر جائے، اس طرح ہم گنہگاروں کو سزا دیتے ہیں۔'' (اعراف: 40)

تفسیر

انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ:۔

استکبار اور اس کے نتیجہ میں انسانی تاریخ میں جتنے المیے رونما ہوئے ہیں، قرآنی آیات ان سے بھری پڑی ہیں۔ انسان کی مادی اور معنوی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں اس صفتِ رذیلہ نے پیدا کی ہیں، وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ مندرجہ بالا اس موضوع سے متعلق آیات میں سے ایک انتخاب تھا۔

پہلی اور دوسری آیات میں آدم و ابلیس کے واقعہ کا ذکر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کی خلقت کی عظمت کے پیش نظر سجدہ کریں تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ (ابلیس اس وقت اپنے اعلیٰ مقام کی وجہ سے فرشتوں میں شامل تھا) ابلیس نے اللہ کے حکم کے سامنے سرکشی کی اور استکبار کا مظاہرہ کیا اور کافر ہو گیا۔ اس کی اس سرکشی، نافرمانی اور استکبار کی وجہ سے اللہ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے مقام سے اُتر جائے اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ پست اور حقیر ہوگا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۡ وَكَانَ مِنَ

الْكٰفِرِيْنَ﴿۳۴﴾

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ﴿۱۳﴾

درحقیقت یہ پہلا گناہ ہے جو دنیا میں وقوع پذیر ہوا۔اس گناہ کے نتیجہ میں ابلیس جیسا فرد،جس نے طویل عرصہ تک،خطبۂ قاصعہ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے فرمان کے مطابق چھ ہزار سال اللہ کی عبادت کی تھی،اپنے اس عظیم مقام سے گر گیا اور ذراسی دیر کے تکبر نے اس کے چھ ہزار سالہ عبادت کو برباد کر دیا۔

"اِذْاَحْبَطَ عَمَلَهُ الطَّوِيْلَ وَجَهْدَهُ الْجَهِيدَ،وَكَانَ قَدْعَبَدَ اللهَ سِتَّةَ اٰلَافِ سَنَةٍ۔۔۔۔عَنْ كِبْرِ سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ"(نہج البلاغہ،خطبہ:192)

اس عبرت انگیز داستان میں تکبر کے خطرات کے بارے میں اہم نکات پوشیدہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ صفتِ رذیلہ انسان کو کفر اور بے ایمانی کے مقام تک گرادے۔جیسا کہ مذکورہ آیت کے یہ الفاظ اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں:

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴿۳۴﴾"(بقرہ:34)

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس غرور وتکبر کے خطرناک حجاب کی وجہ سے واضح ترین حقائق کو جاننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکا تھا،اس لئے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں زبانِ اعتراض کھولی تو اُس نے کہا:

"قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴿۳۳﴾"

''اس نے کہا میں ایسے بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں جسے تو نے اس خشک مٹی سے پیدا کیا جو سڑے ہوئے کیچڑ سے لی گئی تھی۔(حجر:33)

ظاہری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو شرف عطا کیا تھا وہ اس لئے نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے ان کے اندر وہ روح پھونکی تھی جس کا تین آیت پہلے ذکر ہو چکا ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ﴿۲۹﴾

''اور جب میں اسے موزوں بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے لئے سجدہ کرو۔''(حجر:29)

ابلیس کی حالت یہ تھی کہ وہ آگ پر خاک کی برتری کو نہ سمجھ سکا۔زندگی کی پیدائش،زندگی کی تمام برکات،انسانوں کی رہائش کیلئے مناسب جگہ،مختلف قسم کے معدنیات اور زیرزمین ذخائر،حتیٰ کہ پانی کے ذخائر،یہاں تک کہ آگ پکڑنے والے معدنی وسائل(تیل،گیس،لکڑی اور کوئلہ وغیرہ)سب خاک سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔اس نے انتہائی حماقت اور خیرہ سری سے کہا:

"خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ"

''تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔''

مزید برآن یہ کہ بہت سے لوگ غلطی اور خطا کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن جب انہیں غلطی کا احساس ہوجائے تو حق کی طرف پلٹ آتے ہیں، توبہ کر لیتے ہیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ لیکن تکبر اور استکبار ایسی بیماری ہیں جو انسان کو احساسِ گناہ کے بعد بھی اعترافِ گناہ کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان نے اپنی خطا کی طرف متوجہ ہوجانے کے بعد بھی توبہ نہ کی۔ اس کے تکبر وغرور نے اسے اجازت نہ دی کہ انسان جیسی عظیم مخلوق کے سامنے سرِ تعظیم جھکا دیتا، بلکہ اس نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ تمام انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اللہ کے مخلص بندوں پر اس کا بس نہیں چلے گا۔ ابلیس نے نہ صرف یہ کہ انسان کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی بلکہ اللہ تعالیٰ سے عمرِ جاوداں کا مطالبہ بھی کیا تا کہ وہ اپنے اس گمراہ کن عمل کو دنیا کے خاتمہ تک جاری رکھ سکے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے تکبر، خود پسندی اور احساسِ برتری اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کا باعث بن گئیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا حسد، کفر اور ناشکری مخلوقِ خدا کی بربادی اور خرابی کا سبب بنے۔

اس طرح شیطان نے روئے زمین پر تعصب وتکبر کی بنیاد رکھی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے محاذ آرائی کا آغاز کیا۔ اس بات کو امیر المومنین علی علیہ السلام نے خطبۂ قاصعہ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"فَعَدُوُّاللهِ اِمَامُ الْمُتَعَصِّبِيْنَ وَسَلَفُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ الَّذِیْ وَضَعَ أَسَاسَ الْعَصَبِيَّةِ وَنَازَعَ اللهَ رِدَاءَ الْجَبْرِيَّةِ وَادَّرَعَ لِبَاسَ التَّعَزُّزِ، وَخَلَعَ قِنَاعَ التَّذَلُّلِ"۔

''اللہ کے دشمن، متعصبین کے امام اور متکبرین کے پیشوا نے عصبیت کی بنیاڈالی۔ مقامِ جبروت میں اللہ سے نزاع کیا، تکبر کا لباس پہن لیا اور تواضع کا لباس اُتار دیا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ:192)

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل وخوار اور پست وحقیر کر دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام اسی خطبہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

اَلاٰ تَرَوْنَ كَيْفَ صَغَّرَهُ اللهُ بِتَكَبُّرِهِ وَوَضَعَهُ بِتَرَفُّعِهِ فَجَعَلَهُ فِي الدُّنْيَا مَدْحُوراً، وَاَعَدَّلَهُ فِي الْآخِرَةِ سَعِيْراً"۔

''کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے تکبر کی وجہ سے اسے حقیر کیا، اس کی رفعت پسندی کی وجہ سے اسے پست کر دیا، دنیا میں اسے مردود قرار دیا اور آخرت میں اس کیلئے جہنم تیار کی۔''

مختصر یہ کہ جس قدر ہم داستانِ ابلیس اور اس کے اثرات کے بارے میں غور کریں، ہمیں تکبر اور استکبار کے خطرات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہوتی جاتی ہے۔

تیسری آیت میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ پر پہنچتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پہلے اولوالعزم اور صاحبِ شریعت نبی

تھے۔اس سے بھی یہی حقیقت واضح وآشکار ہوتی ہے کہ ان کے زمانے کے کفار کی ضد، کفر، ہٹ دھرمی کا سبب بھی استکبار تھا۔

جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی تو کہا:

''اے میرے رب! میں نے جب بھی انہیں ایمان لانے کی دعوت دی تا کہ تو ان کی بخشش فرمائے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیکن اور اپنے کپڑے اپنے اوپر اوڑھ لئے، انہوں نے اپنے کفر اور حق کی مخالفت پر اصرار کیا اور سخت استکبار کیا۔''

وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا ۚ﴿۷﴾

''اس آیت میں یہ بات واضح اور نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ ان کا استکبار، خود پسندی اور احساسِ برتری ہی ان کے کفر اور حق کے ساتھ ان کی دشمنی کا سبب تھا۔ان کے اندر استکبار کی بیماری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اس خوف سے کہ کہیں حق کی آواز ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار نہ کر دے، اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیتے تھے اور اپنے کپڑے اپنے سروں پر اوڑھ لیتے تھے۔ پیامِ حق کے ساتھ ان کی اس دشمنی اور عداوت کی صرف ایک وجہ تھی۔۔۔۔استکبار!

وہ حضرت نوح علیہ السلام پر تنقید کرتے تھے کہ معاشرے کے سادہ لوح اور پست افراد ہی تم پر ایمان کیوں لائے ہیں؟ جب تک یہ تمہارے اردگرد ہیں، ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔واقعی تکبر اور خود پسندی ایک ایسی بلا ہے جو تمام فضائل کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا طرزِ عمل اس بات کی واضح دلیل تھا کہ وہ حضرت نوحؑ کی باتوں کی حقانیت اور اثر انگیزی کو مانتے تھے، ورنہ کانوں میں انگلیاں دینے اور اپنے کپڑے اپنے سر اور چہروں پر اوڑھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی

ہوسکتا ہے کہ لباس اپنے اوپر اوڑھ لینے کے معنی یہ بھی ہوں کہ وہ حضرت نوحؑ کو دیکھ کر اس لئے اپنے کپڑے اپنے چہروں پر ڈال لیتے ہوں تا کہ وہ اور حضرت نوحؑ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں اور نہ ہی حضرت نوحؑ انہیں دعوت دے سکیں۔

آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک مہلت ان کے پاس تھی، وہ حضرت نوحؑ کی نصیحت اور دعوت کو اپنی پسندی اور احساسِ برتری کی وجہ سے نظر انداز کرتے رہے۔انہوں نے ایک لحظہ کیلئے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ ہوسکتا ہے کہ انہیں نصیحت کرنے والا اور دعوت دینے والا سچ کہہ رہا ہو۔لہٰذا جب حضرت نوحؑ کشتی بنا رہے تھے تو ان کی قوم کے لوگ ٹولیاں بن بن کر ان کے پاس سے گزرتے اور ان کا مذاق اڑاتے۔حضرت نوحؑ انہیں خبردار کرتے:

اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡکُمۡ کَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

''اگر آج تم ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو، ہم بھی تمہارا مذاق اُڑائیں گے (لیکن اس دن جب تم طوفان میں گھرے ہوئے ہو گے اور خوفزدہ وسراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہو گے، فریاد اور التجا کرو گے مگر تمہارے پاس کوئی

جائے پناہ نہیں ہوگی)''۔(ہود:38)

بنیادی طور پر متکبرین اور مستکبرین کا شیوہ ہی یہی ہے کہ سنجیدہ ترین بات بھی اگر ان کے مفادات کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو، وہ اس کو ہنسی مذاق میں اُڑا دیتے ہیں۔معاشرے کے کمزور اور مستضعف طبقات کا مذاق اُڑانا اور ان کی تحقیر کرنا مستکبرین کا معمولی مشغلہ ہوتا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے افراد اپنی گناہ آلودہ محافل میں کسی غریب، باایمان شخص کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں تاکہ اس پر ہنس کر اور اس کی تحقیر کر کے اپنی تفریح طبع کا سامان مہیا کر سکیں۔

اپنے تکبر اور استکبار کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں۔وہ اپنی دولت کی فراوانی کو، جو زیادہ تر حرام پر مشتمل ہوتی ہے، اپنی لیاقت اور قابلیت کی دلیل سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے دوسروں کی تحقیر و تذلیل کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

چوتھی آیت میں حضرت نوحؑ کے دور سے گزر کر ہم قومِ عاد اور ان کے نبی حضرت ہود علیہ السلام کے واقعہ پر جا پہنچتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ اس قوم کی بدبختی کا اصل سبب بھی اس کا تکبر تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قومِ ہودؑ نے زمین میں ناحق استکبار کیا اور کہا کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہوسکتا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔''

"فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ۔"

اس قوم نے اپنے تکبر و استکبار کی وجہ سے اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔اس معاملہ میں وہ اس حد تک چلے گئے کہ اللہ کی طاقت کو بھی فراموش کر دیا جس کی وجہ سے وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے لگے اور اس طرح انہوں نے اپنے اور حق کے درمیان فاصلے اور حجاب پیدا کر لئے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگلی آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان متکبروں کو ذلیل و خوار کرنے کیلئے نحس ایام میں ان پر شدید آندھی کا عذاب بھیجا۔(جس نے ان کو بھوسے اور تنکوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑا کر رکھ دیا)۔

تکبر ایک ایسا حجاب ہے جس کی وجہ سے انسان اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اپنی حقیر اور ناچیز طاقت کو اتنا زیادہ سمجھنے لگتا ہے کہ اللہ کی قدرت اور طاقت بھی اسے نظر نہیں آتی۔

اس آیت میں ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' کے الفاظ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے استعمال ہوئے ہیں کہ انسان کیلئے تکبر اور استکبار کسی حال میں صحیح اور برحق نہیں ہوسکتے۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کے وجود کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

پانچویں آیت ہمیں حضرت شعیبؑ کے زمانے میں لے جاتی ہے۔یہاں بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے کہ قومِ شعیبؑ کی بدبختی اور گمراہی کا اصل سبب بھی ان کا تکبر تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''قومِ شعیبؑ کے متکبر اشراف نے کہا: اے شعیبؑ! ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو ضرور شہر بدر کر دیں گے۔ ہاں! اگر تم ہم میں واپس آ جاؤ تو اور بات ہے۔''(اعراف:88)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۝۸۸

حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کے افراد جوان پر ایمان لائے اور تقویٰ وخدا پرستی کی راہ پر چل رہے تھے، ان کو شہر بدر کرنے کی دھمکی کی اس کے سوا کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے اور ان کے پیروکار مؤمنین کے ساتھ ملحق ہونے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، لہٰذا وہ ان کے مقابلہ پر اُتر آئے۔

ان کا یہ کہنا کہ ''اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا'' (یا یہ کہ تم ہم میں واپس آ جاؤ) کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اپنے دین ومذہب پر ایمان رکھتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ وہ ان کی طرف منسوب تھا، لہٰذا ان کے تکبر اور حُبِ ذات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ وابستگی کا اظہار کریں۔

چھٹی آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون وقارون کے زمانہ سے متعلق ہے۔ ان کے انحراف، گمراہی اور بدبختی کا اصل سبب ان کا تکبر تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کیا۔ موسیٰؑ روشن نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے مگر انہوں نے استکبار اور بڑائی سے کام لیا (لہٰذا انہوں نے حق کو قبول نہیں کیا اور ہم نے انہیں ہلاک کر دیا) اور وہ اللہ سے آگے نہ نکل سکے (اور اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے)''۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ۝۳۹(عنکبوت)

قارون ایک دولت مند شخص تھا اور اپنی دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں بھی بڑا سمجھتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے اس بے پناہ دولت کا مالک بنا ہے۔ وہ دولت کی وجہ سے تکبر کرتا تھا اور اپنی دولت کی نمائش کے ذریعے فقراً ومساکین کی تحقیر وتذلیل کرتا تھا۔ اسے جس قدر سمجھایا جاتا کہ اپنی دولت کو اخروی فلاح وسعادت کے حصول کیلئے استعمال کرے، اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کا غرور وتکبر اسے زندگی کے حقائق کو دیکھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس حقیقت کو نہ پاسکا کہ اس کی دولت چندروزہ زندگی میں اس کے پاس اللہ کی امانت ہے جو اس کے اصل حقداروں تک پہنچ جانی چاہئے۔

فرعون جو تختِ حکومت پر متمکن تھا، اس سے بھی زیادہ غرور وتکبر کا شکار تھا۔ وہ اس بات پر بھی قانع نہ تھا کہ لوگ اس کی پرستش کریں بلکہ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے ربِ اعلیٰ سمجھیں۔

ہامان، فرعون کا قریبی ساتھی اور اس کا وزیر تھا اور اس کے تمام مظالم میں اس کا شریک کار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون

کے تمام ظالمانہ فیصلوں پر عمل درآمد کرنا اُسی کی ذمہ داری تھا۔قرآن شریف کے الفاظ کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی شدید غرور وتکبر کا شکار تھا۔

ان تینوں نے ایک ہو کر اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف محاذ بنالیا۔انہوں نے زمین میں فتنہ وفساد برپا کیا اور آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید ترین عذاب میں گرفتار ہو گئے۔فرعون اور ہامان دریائے نیل میں غرق ہو گئے جوان دونوں کی قوت وطاقت کا اصل سرچشمہ تھا جبکہ قارون اپنی دولت سمیت زمین میں دھنس گیا۔

ساتویں آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے۔یہ آیت یہودیوں اور قومِ عیسیٰ کے فرق کو بیان کر رہی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے رسول! آپ یہودیوں اور مشرکین کو سب سے بڑھ کر مسلمانوں کا دشمن پائیں گے اور مسلمانوں سے محبت کرنے میں ان لوگوں کو دوسروں سے بڑھ کر پائیں گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں عالم اور زاہد ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔''

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ (مائدہ)

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اہلِ ایمان کے ساتھ یہودیوں کی دشمنی کا سبب ان کا تکبر تھا جبکہ اہلِ ایمان کے ساتھ نصاریٰ کی محبت کا سبب یہ ہے کہ ان میں تکبر اور استکبار نہیں تھا۔

متکبر اور مستکبر افراد کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے ان کے سامنے کمزور، ذلیل اور حقیر ہوں۔یہی وجہ ہے کہ جب انہیں کوئی نعمت ملتی ہے تو ان کی دشمنی میں شدت آجاتی ہے اور وہ ان کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آتے ہیں۔بلاشبہ تکبر حسد، کینہ اور دشمنی کا باعث ہوتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں نصاریٰ سے مراد تمام نصاریٰ نہیں ہیں بلکہ زیادہ تر نجاشی اور اس کی قوم مراد ہیں جنہوں نے حبشہ میں مسلمانوں کا استقبال کیا اور ان کے خلاف قریش کے نمائندوں کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبشہ میں مسلمانوں کو ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ مل گئی۔بہرحال اس آیت میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ استکبار، حق اور اہلِ حق کے ساتھ دشمنی کی بنیادی سبب ہوتا ہے جبکہ تواضع، حق اور اہلِ حق کے ساتھ محبت اور حق کے ساتھ خضوع کا سبب ہوتا ہے۔

آٹھویں آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ استکبار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کفر، بے ایمانی اور حق کے مقابلہ میں ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ظہورِ اسلام کے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں بات کر رہی ہے:

''اس نے تیوری چڑھائی اور جلد بازی کی، اس نے حق کی طرف پشت کی اور تکبر کیا اور کہا کہ یہ قرآن گزشتہ اقوام کے جادو کی طرح ایک جادو ہے۔''

"ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ"۔

''سحر'' کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ولید بن مغیرہ قرآن کی غیر معمولی کشش اور انسانی قلب وذہن پر اس کی گہری تاثیر کا اعتراف کرتا تھا۔ اگر وہ حقیقت پسندی سے دیکھتا تو قرآن مجید کی اس خاصیت کو اس کا اعجاز سمجھتا اور اس کی صداقت اور حقانیت پر ایمان لے آتا۔ مگر چونکہ اُس نے غرور واستکبار کی نظر سے دیکھا، لہٰذا یہ فیصلہ دیا کہ قرآن گزشتہ اقوام کے جادو کی مانند ایک جادو ہے۔ جب بھی انسان کی آنکھوں پر استکبار کی پٹی بندھ جائے، وہ حق کو باطل اور باطل کو حق دیکھنے لگتا ہے۔

ولید بن مغیرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس قدر مغرور اور خود پسند تھا کہ کہا کرتا تھا:

"اَنَا الْوَحِيْدُ بْنُ الْوَحِيْدِ، لَيْسَ فِي الْعَرَبِ نَظِيْرٌ، وَلَا لِاَبِي نَظِيْرٌ!"

''میں بھی اپنی مثال آپ ہوں اور میرا باپ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ عرب میں کوئی میری نظیر ہے، نہ میرے باپ کی کوئی نظیر ہے۔''

اس کے ساتھ وہ اپنے لوگوں میں ایک تعلیم یافتہ اور دانش مند انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس نے قرآن مجید کی عظمت کا اندازہ بخوبی کرلیا تھا۔ اس بات کا ثبوت اس کا وہ جملہ ہے جو اس نے رازداری کے ساتھ اپنے قبیلے بنی مخزوم سے کہا تھا:

"اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً، وَاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً، وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّهٗ لَيَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ۔" (تفسیر قرطبی، 10:6866 ودیگر کتبِ تفسیر وتاریخ)

''قرآن میں ایک ایک خاص شیرینی اور طراوت پائی جاتی ہے۔ اس کی شاخیں پُرثمر اور اس کی جڑیں مضبوط ہیں۔ یہ ایک ایسا کلام ہے جو ہر کلام سے برتر ہے اور اس سے برتر کوئی کلام نہیں ہے۔''

اس کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑھ کر قرآن کی عظمت سے آشنا تھا۔ لیکن اس کے غرور وتکبر نے اسے قرآن کے آفتابِ عالم تاب کو دیکھنے، اس کی حقانیت کا اعتراف کرنے اور اس کے سامنے سر جھکانے کی اجازت نہ دی۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وسوسہ کرنے والے اسرافِ کار وہ ہیں جو بغیر کسی حجت ودلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔''

"اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ۔"

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: ''یہ کام (حق کے مقابلہ میں بے اساس بحث وجدال) اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان کی نظر میں بہت زیادہ غضب کا باعث ہے۔''

"كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔"

آیت کے اختتام پر فرمایا کہ حق کو تسلیم نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے:

"كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔"

متکبر اور جبار لوگوں کے دلوں پر مہر لگانے کے معنی یہ ہیں کہ حق کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے ان کی عقل پر اسی طرح پردہ پڑ جاتا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کو مکمل طور پر کھو دیتے ہیں۔ انہیں اپنی ذات اور اپنے مفادات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان کے ذہن ایک ایسے بند برتن کی مانند ہو جاتے ہیں جن کے اندر کے گندے مواد کو باہر نکالنا یا باہر سے پاکیزہ مواد ان میں داخل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ دراصل تکبر اور جباریت جیسی صفات کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت جباریت بھی تکبر ہی سے جنم لیتی ہے، اس لئے کہ ایسے مواقع پر متکبر انسان کوشش کرتا ہے کہ جبر اور طاقت کے ذریعے اپنے مخالفوں کا خاتمہ کر دے۔ اس بارے میں وہ عقل کی کوئی بات سننے کا روادار نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر وہ اپنی خود پسندی اور تکبر کی وجہ سے دوسروں کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح جباریت تکبر کا نتیجہ اور ثمر قرار پاتی ہے۔

البتہ لفظ ''جبار'' اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہے مگر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ نقائص کی تلافی اور معاملات کی شکستگی کی اصلاح کرنے والا ہے۔

دسویں آیت میں ایک عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے جس کا کسی خاص گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کفار کو جہنم کے قریب لایا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا۔

''جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ وہاں رہو، متکبرین کا کتنا بُرا ٹھکانہ ہے۔''

"قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔"

یہ بات متعدد دیگر آیات میں بھی بیان کی گئی ہے جیسے سورۂ زمر، آیت 60 میں ہے:

"اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۔"

''کیا متکبرین کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے؟''

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اہلِ جہنم کی صفات میں سے ان کی صفتِ تکبر کو اُجاگر کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان کی ہلاکت و بدبختی میں اس صفتِ رذیلہ کا عمل دخل کس قدر زیادہ ہے، یہاں تک کہ یہ انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے اور جہنم میں بھی اُسے ایسی جگہ پر رکھا جاتا ہے جہاں مخصوص اور زیادہ دردناک سزا اُس کیلئے تیار کی گئی ہے۔

گیارہویں آیت میں بھی ایک عام ضابطے کی شکل میں متکبرین کے بارے میں کی گئی ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جولوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں،عنقریب ہم اُنہیں اپنی آیات سے پھیر دیں گے۔پھر وہ حق کی جو بھی نشانی دیکھیں گے،اس پر ایمان نہیں لائیں گے،اگر راہِ ہدایت کو دیکھیں گے تو اسے اختیار نہیں کریں اور اگر گمراہی کے راستے کو دیکھیں گے تو اسے اختیار کرلیں گے۔یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے''۔(اعراف:146)

"سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ‌ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ۚ وَاِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَىِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا‌ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ"۔

اس آیت کے دل دہلا دینے والے الفاظ ان مصائب کی شدت اور گہرائی کی خبر دیتے ہیں جن میں متکبرین کو گرفتار ہونا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو ایسی سزا دیتا ہے کہ یہ حق کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔پھر اگر اللہ تعالیٰ کی تمام آیات ومعجزات بھی انہیں دیکھا دیئے جائیں،یہ ایمان نہیں لاتے۔حتیٰ کہ اگر ہدایت کا راستہ ان کے قدموں کے سامنے رکھ دیا جائے تو بھی اس پر قدم نہیں رکھیں گے لیکن اگر گمراہی وسرکشی کا راستہ دیکھیں تو فوراً اس کی طرف لپکتے ہیں۔''

اس آیت میں ''بِغَيۡرِ الۡحَقِّ'' کے الفاظ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عظمت اور کبریائی صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔اگر انسان جیسی ناچیز مخلوق تکبر کرے تو یہ ہر حال میں ناحق ہوگا۔بعض اہلِ علم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ تکبر کی دو اقسام ہیں:اگر تکبر اللہ کے اولیاؑ کے مقابلہ میں ہو تو ناحق ہوگا لیکن اگر دشمنانِ خدا کے مقابلہ میں ہو تو یہ ناحق نہیں ہوتا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''تَ۬كَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ'' یعنی ''وہ زمین میں تکبر کرتے ہیں'' سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تشریح درست نہیں ہے بلکہ زمین میں تکبر ہر حال میں قابلِ مذمت ہے۔

آگے چل کر اس آیت میں تکبر کے سب سے اہم نتیجہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ یہ حق کی ہر نشانی اور ثبوت کو دیکھ لینے کے باوجود اسے قبول نہیں کریں گے جبکہ گمراہی وضلالت کی راہ دیکھ لیں تو فوراً اس کی طرف چل پڑیں گے۔

بلاشبہ تکبر اور غرور ایک ایسا حجاب ہے جس کی وجہ سے انسان حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے۔یہ حجاب حقیقی سعادت کی شاہراہ سے انسان کو دور کر دیتا ہے جبکہ ہلاکت اور بدبختی کے راستوں کو سعادت کی راہ کے طور پر انسان کو دکھاتا ہے۔کسی انسان کیلئے اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ وہ حق کی نشانیوں کو نظر انداز کر کے ضلالت وہلاکت کی راہ پر چل رہا ہو اور یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ فلاح وسعادت کی راہ پر چل رہا ہے۔

بارہویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''یقیناً اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے جنہیں یہ چھپاتے ہیں اور جنہیں یہ ظاہر کرتے ہیں اور بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝۲۳

قرآن مجید میں اس سے ملتی جلتی تعبیرات ہمیں بکثرت نظر آتی ہیں جیسے:

"وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○"

''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔(آلِ عمران:57)

"وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○"

''اور اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا''۔(مائدہ:64)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○"

''بے شک اللہ تعالیٰ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا''(مائدہ:87)

"اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○"

''بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔(انعام:141)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ○"

''بے شک اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا''۔(انفال:58)

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○"

''بے شک اللہ گمراہی وسرکشی پر خوش ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔(قصص:76)

ہماری زیر بحث آیت کے ذیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ"۔

''بے شک وہ استکبار کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

اگر ان تعبیرات میں غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے درمیان کیسا خاص رابطہ اور تعلق موجود ہے۔ہم یہ بات بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات میں جن افراد کو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ افراد قرار دیا گیا ہے، ان سب میں ایک صفتِ رذیلہ مشترک ہے اور وہ ہے خود پسندی اور احساسِ برتری۔یہی وہ صفتِ رذیلہ ہے جو ظلم، فساد، اسراف اور فخر وغرور کی بنیاد ہے۔

ان سات اقسام کے افراد کو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ افراد قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قرب سے دور ہی اس لئے ہیں کہ بدترین رذیلتِ اخلاقی جو قربِ خدا کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

تیرہویں آیت، جو مفسرین کے مطابق نجران کی نصاریٰ کے ساتھ گفتگو کے بارے میں ہے، کہہ رہی ہے:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ ہونے سے کوئی انکار نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کے مقرب فرشتے اس کی بندگی سے انکار کرنے والے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی عبادت سے روگردانی کرنے والے ہیں، جلد ہی اللہ ان کو قیامت میں محشور کرے گا۔''

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۔

اگلی آیت میں اس بات پر مزید زور دینے کیلئے کہا گیا:

''جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے، اللہ ان کا اجر پوری طرح دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید عطا فرمائے گا۔ لیکن جن لوگوں نے انکار اور استکبار کی روش اختیار کی، اللہ انہیں سخت سزا دے گا اور وہ (اللہ کی اس سزا کے خلاف) کوئی حامی اور مددگار نہیں پائیں گے''۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ (نساء)

یہ آیات عیسائیوں کے اُن بے بنیاد دعوؤں پر ایک تبصرہ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر ان کی خدائی کا انکار کر دیا گیا تو اُن کا مقام و مرتبہ گھٹ جائے گا اور ان کی توہین ہو جائے گی۔

قرآن مجید یہ فرماتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے لئے کسی ایسے مقام کے قائل تھے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ اپنے لئے اس مقام کا قائل ہے۔ سب اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتے ہیں اور اس کے حضور سر جھکائے ہوئے ہیں اور اُس کی بندگی کرتے ہیں۔ جو کوئی اللہ کی عبادت سے روگردانی اور استکبار کرے، خواہ نبی ہو یا فرشتہ، اسے دردناک عذاب دیا جائے گا اور کوئی اس عذاب سے بچانے کیلئے اس کا حامی و مددگار نہ ہوگا۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اگلی آیت میں استکبار و خود پسندی کے مقابلہ میں ایمان اور عملِ صالح کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ استکبار کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ درحقیقت ایمان اور عملِ صالح سے محروم ہوتے ہیں۔

اس آیت میں ''استنکاف'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا اصل مادہ نکف ہے جو ''نَصَرَ یَنْصُرُ'' کے وزن پر ہے۔ اس لفظ

کے اصل معنی انگلی کی مدد سے چہرے سے آنسو صاف کرنے کے ہیں۔ بنابرایں اللہ کی بندگی سے استنکاف کے اصل معنی اللہ کی بندگی سے دُور ہونے کے ہیں، خواہ اس کی وجہ جہالت، غفلت اور سستی وکاہلی ہو یا کوئی اور چیز لیکن جن اس کے بعد ''اسْتَكْبَرُوْ'' کا لفظ آجائے تو اس کے معنی ہوں گے: ''استکبار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے دور ہونا''۔ آیت میں ''یَّسْتَنْكِفْ'' کے بعد ''یَسْتَكْبِرْ'' کا لفظ استعمال کرنا اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال اس آیت کی سخت تعبیرات ان خطرات کی اہمیت کو بخوبی اُجاگر کر دیتی ہے جو استکبار کی وجہ سے ہر انسان کو لاحق ہوسکتے ہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے جسے ہم ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔

چودھویں اور آخری آیت میں استکبار کے ایک اور دردناک نتیجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے ساتھ استکبار سے پیش آئے، ان کیلئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ میں سے نہ گزر جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں''۔

''اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ○''(اعراف:40

اس آیت میں تکذیب کے ساتھ استکبار کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ گزشتہ بیانات میں ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اللہ کی آیات کے انکار اور انبیائے الٰہی کی مخالفت کی اصل وجہ استکبار تھی۔ کبھی وہ کہتے تھے کہ اس شخص کو جو نبوت کا مدعی ہے، ہم پر کیا برتری حاصل ہے؟ اللہ کی آیات ہم پر کیوں نازل نہ ہوئیں؟ کبھی کہتے کہ معاشرے کے غریب اور سادہ لوح جوان کیوں اس کے گرد جمع ہوگئے ہیں؟ ہم یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہمارے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہوں۔ اگر رسول اللہؐ ان فقیروں کو اپنے پاس سے دور نہ کر دیں تو ہم ان کی محفل میں شریک نہیں ہوں گے۔ اس طرح کے بہانوں کی آڑ میں وہ اللہ کی آیات پر ایمان لانے سے انکار کرتے تھے۔

''لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ''

کے الفاظ قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں آئے ہیں۔ یہ اس بات پر واضح تاکید ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے سوراخ سے گزرنا ناممکن ہے، اسی طرح متکبر افراد کا جنت میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ بالفاظِ دیگر جنت کا راستہ گویا اس قدر تنگ ہے کہ اسے سوئی کے سوراخ سے تشبیہ دی گئی ہے اور صرف متواضع افراد، جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے چھوٹا کرلیا ہے، وہی اس میں سے گزر سکتے ہیں۔

(اس آیت میں لفظ ''جمل'' کا استعمال ہوا ہے۔ عربی میں جمل اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کے حال ہی میں دانت نکلے

ہوں اور اس مضبوط رسی کو بھی کہتے ہیں جس کی مدد سے کشتیوں کو قابو میں رکھا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت میں جمل سے رسی مراد لی ہے)۔

"لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ"

''ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے''، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت احادیث میں اس طرح کی گئی ہے کہ جب مؤمن فوت ہوتا ہے تو فرشتے اُس کی روح اور اعمال کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور آسمانوں کے دروازے ان کیلئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جب متکبروں کی روح اور اعمال کو اوپر لے جایا جاتا ہے تو آسمان کے دروازے ان کیلئے نہیں کھولے جاتے اور منادی ندا دیتا ہے کہ ان کو واپس لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو۔ (تفسیر مجمع البیان)

نتیجہ:

مندرجہ بالا آیات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید تکبر اور استکبار کو انسان کی ناپسندیدہ ترین اور مذموم ترین صفت قرار دیتا ہے۔ یہ ایسی صفتِ خبیث ہے جو دوسری بہت سی برائیوں اور گناہوں، حتیٰ کہ کفر کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ جن لوگوں میں یہ صفت پائی جاتی ہے، وہ ہرگز سعادت حاصل نہیں کر سکتے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی راہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ پس سالکانِ الی اللہ اور راہیانِ راہِ حق پر لازم ہے کہ سب سے پہلے اپنے وجود سے استکبار اور خود پسندی کے شجرِ خبیثہ کی جڑوں کو اُکھاڑ پھینکیں، اس لئے کہ یہ ان کی راہ کی سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔

تکبر، احادیث کی روشنی میں

تکبر کی مذمت، اس کی حقیقت کی تشریح، اس کے نتائج اور اس کے علاج کے بارے میں کتبِ احادیث میں بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں۔ ان سب احادیث کو یہاں نقل کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن ان میں سے چند منتخب احادیث ہم یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اِيَّاكُمْ وَالْكِبْرَ فَاِنَّ اِبْلِيْسَ حَمَلَهُ الْكِبْرُ عَلَى اَنْ لَا يَسْجُدَ وَلِآدَمَ"۔

''تکبر سے دور رہو کیونکہ تکبر ہی کی وجہ سے ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا (اور ہمیشہ کیلئے مردود ہوگیا)''۔ (کنز العمال، حدیث: 7734)

2۔ نہج البلاغہ میں خطبہ قاصعہ میں بھی یہی بات ایک مختلف انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اس خطبہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ابلیس کے تکبر اور اس کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَاعْتَبِرُوا بِمَا كَانَ مِنْ فِعْلِ اللهِ بِإِبْلِيْسَ اِذْاَحْبَطَ عَمَلَهُ الطَّوِيْلَ وَجَهْدَهُ الْجَهِيدَ.....عَنْ كِبْرِ سَاعَةٍ وَاحِدَةٍفَمَنْ ذَابَعْدَاِبْلِيْسَ يَسْلَمُ عَلَى اللهِ بِمِثْلِ مَعْصِيَتِهِ"۔(نہج البلاغہ، خطبہ:92)

''جو کچھ اللہ نے ابلیس کے ساتھ کیا، اُس سے عبرت حاصل کرو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی عرصہ دراز کی عبادت اور مجاہدت کو تھوڑی سی دیر کے تکبر کی وجہ سے برباد کر دیا۔ کیسے ممکن ہے کہ ابلیس کے بعد کوئی اُس جیسا عمل کرے اور اس کے انجام جیسے انجام سے محفوظ رہے؟''

اس جملہ کی تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تھوڑی دیر کے تکبر اور خود پسندی کا بھی کس قدر خطرناک نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور کس طرح عمر بھر کی کمائی پل بھر میں تکبر کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور متکبر کے نصیب میں ہمیشہ کی شقاوت اور عذاب رہ جاتے ہیں۔

3۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِحْذَرِ الْكِبْرَفَاِنَّهُ رَأْسُ الطُّغْيَانِ وَمَعْصِيَةِ الرَّحْمٰنِ۔"

''تکبر سے دُور رہو کیونکہ یہ سرکشی اور رحمٰن کی نافرمانی کی جڑ ہے''۔(غرر الحکم:2609)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کبر تمام گناہوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے۔

4۔ ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَادَخَلَ قَلْبُ امْرِءٍ شَيْءٌ مِنَ الْكِبْرِ اِلَّانَقَصَ مِنْ عَقْلِهِ مِثْلَ مَادَخَلَهُ مِنْ ذٰلِكَ!قَلَّ ذٰلِكَ اَوْ كَثُرَ"۔

''جب انسان کے دل میں تکبر، داخل ہوتا ہے تو اس کے برابر عقل اس میں سے نکل جاتی ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ''۔(بحار الانوار، 186:75)

5۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُصُولُ الْكُفْرِ ثَلَاثَةٌ، اَلْحِرْصُ وَالْاِسْتِكْبَارُ وَالْحَسَدُ، فَاَمَّا الْحِرْصُ فَاِنَّ آدَمَ حِينَ نُهِيَ عَنِ الشَّجَرَةِ حَمَلَهُ الْحِرْصُ عَلٰى اَنْ اَكَلَ مِنْهَاوَاَمَّا الْاِسْتِكْبَارُ فَاِبْلِيْسُ حَيْثُ اُمِرَبِالسُّجُوْدِلِآدَمَ فَاَبٰى، وَاَمَّا الْحَسَدُ فَاِبْنَا آدَمَ، حَيْثُ قَتَلَ اَحَدُهُمَا صَاحِبَه"

''تین چیزیں کفر کی بنیاد ہیں: حرص، استکبار اور حسد۔ جب آدم کو اس خاص درخت سے منع کیا گیا تو حرص نے

انہیں اس درخت سے کھانے پر اُکسایا۔ جب اللہ نے ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اُس نے استکبار کی وجہ سے انکار کیا اور جہاں تک حسد کا تعلق ہے تو آدم کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو حسد ہی کی وجہ سے قتل کیا''۔

(اصولِ کافی، 289:2)

6۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

(اصولِ کافی، 310)

"لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ کِبْرٍ"۔

''جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

7۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَقْبَحُ الْخُلُقِ التَّکَبُّرُ"۔

''تکبر بدترین اخلاقی بُرائی ہے''۔ (غرر الحکم: 2898)

ان احادیث میں تکبر کو دیگر تمام گناہوں کا سرچشمہ، عقل کے نقصان، اخلاقی رذائل اور جنت میں داخل ہونے سے محرومی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس بُرائی سے روکنے کیلئے ایک مؤثر عامل اور محرک کا کردار ادا کر سکتا ہے اور اس حقیقت کو آشکار کرنے کیلئے کافی ہے کہ انسان کو انسانی اور ایمانی مقام سے گرانے میں یہ صفت کس حد تک مؤثر ہے۔

تکبر، عقل کی روشنی میں

آیات و روایات کے علاوہ، عقل کی نظر میں بھی تکبر انتہائی مذموم صفت ہے، اس لئے کہ سب انسان اللہ کے بندے ہیں۔ ہر ایک کے اندر مختلف قسم کی صلاحیتیں اور خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور اللہ کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے سب ایک جیسے اور باہم برابر ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور دوسروں کو حقیر اور کم تر سمجھے۔ اگر اللہ نے انسان کو کسی خاص نعمت سے نوازا ہے تو اسے چاہئے کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور تواضع اختیار کرے، نہ یہ کہ غرور و تکبر میں مبتلا ہو جائے۔

تکبر ایک ایسی بُرائی ہے کہ ہر وہ شخص جس کا ضمیر بیدار ہو، اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا کہ تکبر بہت بڑی بُرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ دین و مذہب نہیں رکھتے، وہ بھی اسے بدترین اخلاقی صفت سمجھتے ہیں۔

انسانی حقوق کا ضابطہ، جو بہت سے مفکرین اور دانشوروں نے اپنی مشترکہ کوششوں سے بنایا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ استکبار کے خلاف جنگ کے بارے میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عملی طور پر اس کے معکوس نتائج برآمد ہوئے ہیں اور اسے مستکبرین نے

دوسروں کو دبانے کیلئے ایک ہتھیار بنا رکھا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان تکبر کی رِداوڑھ لے جبکہ، بقولِ امیر المؤمنین علیہ السلام، اس کی حالت یہ ہے کہ اس کا نقطہ آغاز ایک حقیر نطفہ ہوتا ہے، انجام ایک بدبودار لاش اور اس کا اندر مختلف قسم کی آلائشات سے بھرا ہوا ہوتا ہے!

انسان، جو اس قدر کمزور اور عاجز ہے کہ ایک چھوٹا سا مچھر اُسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے، خوردبینی جراثیم اسے بیمار کر دیتے ہیں، گرمی ذرا سی بڑھ جائے تو بے حال ہو جاتا ہے، سردی سے ٹھٹھرنے لگ جاتا ہے، بارش نہ آئے تو اس کیلئے مصیبت بن جاتی ہے اور اگر ذرا زیادہ بارش آجائے تو اس کیلئے عذاب ہو جاتی ہے، خون کا دباؤ تھوڑا زیادہ ہو جائے تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک گھنٹے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اسے اپنی زندگی کے اختتام کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس کا بہترین دوست اس کا قاتل بن جاتا ہے، اس کا قریب ترین عزیز اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے، پانی جو زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، بعض اوقات اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ ہوا جو اس کی زندگی کیلئے سب سے زیادہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے، آندھی بن کر اس کے گھر کو تباہ کر دیتی ہے۔

سرطان کی بیماری دورِ حاضر میں بہت سی اموات کا سبب بن رہی ہے۔ ہزاروں ماہرین کی شب و روز کی کوششوں اور اربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس بیماری کا اصل سبب کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا خلیہ (Cell) جو خوردبین کے بغیر دیکھا بھی نہیں جا سکتا، سرکش ہو کر غیر منظم انداز میں اپنے جیسے خلیے پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے اور مختصر سی مدت میں رسولی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے طاقتور حکمران اور بڑی بڑی مسلح افواج کے سالار، جن کی کمان میں لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل افواج ہوتی تھیں، اسی بیماری کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ لاکھوں سپاہیوں پر مشتمل جدید ترین اسلحہ سے لیس ان کی فوجیں ایک خلیے کی سرکشی کا خاتمہ نہ کر سکیں۔

جس انسان کی کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم ہو، اُسے کیا حق حاصل ہے کہ بڑائی اور تکبر کا دعویٰ کرے۔ عظمت اور بڑائی صرف اللہ کو زیب دیتی ہے۔ اس کے سوا سب چھوٹے، ضعیف اور ناتوان ہیں۔

ہم اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشادِ گرامی پر ختم کرتے ہیں:

"مِسْكِيْنُ ابْنُ آدَمَ مَكْتُومُ الْاَجَلِ، مَكْنُوْنُ الْعِلَلِ، مَحْفُوظُ الْعَمَلِ، تُؤْلِمُهُ الْبَقَّةُ وَتَقْتُلُهُ الشَّرْقَةُ، وَتُنْتِنُهُ الْعَرْقَةُ"۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 219)

''بیچارہ ابن آدم، اس کی موت نامعلوم، بیماری کے اسباب پوشیدہ، اس کے اعمال اللہ کے ہاں محفوظ، ایک مچھر اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے، غذا کا ایک لقمہ اس کے گلے میں پھنس جائے تو اسے ہلاک کر دیتا ہے اور تھوڑا سا پسینہ اسے بدبودار کر دیتا ہے۔ جس انسان کی حالت یہ ہو، اُسے تکبر اور بڑائی کا دعویٰ زیب نہیں دیتا''۔

اہم نکات

اس سلسلہ میں چند ضروری نکات قابلِ بحث ہیں جنہیں ہم نوعناوین کے تحت زیر بحث قرار دیں گے۔

1۔تکبر کی حقیقت اور تعریف:۔

علم اخلاق کے علمائے بزرگ کے مطابق تکبر کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھ کر اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تکبر تین عناصر سے تشکیل پاتا ہے:

ایک یہ کہ انسان اپنے لئے کسی مقام کا قائل ہوتا ہے۔

دوسرے کیلئے بھی کسی مقام کا قائل ہوتا ہے۔

اپنے مقام کو دوسرے کے مقام سے برتر سمجھ کر خوشی محسوس کرتا ہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ تکبر خود پسندی سے مختلف چیز ہے،اس لئے کہ خود پسندی یعنی عُجب میں کوئی موازنہ درکار نہیں ہوتا بلکہ انسان علم،عبادت،دولت یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے،چاہے دنیا میں اس کے سوا کوئی بھی موجود نہ ہو۔لیکن تکبر میں متکبر اپنا موازنہ دوسروں کے ساتھ کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھتا ہے۔

کبر اور تکبر کے الفاظ بعض اوقات مذکورہ بالا نفسانی کیفیت کے بیان کیلئے استعمال ہوتے ہیں جبکہ بعض اوقات اس کیفیت کے بنیاد پر انجام پانے والے افعال کو بھی تکبر کا نام دیا جاتا ہے،مثلاً اس کے چلنے،بیٹھنے،بات کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے اردگرد کے لوگوں سے برتر سمجھتا ہے۔یہ اعمال وافکار جو اُس کے باطنی تکبر کی نشاندہی کرتے ہیں،انہیں بھی تکبر کہا جاتا ہے۔

تکبر کی علامات بہت زیادہ ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ متکبر افراد لوگوں سے بہت توقعات رکھتے ہیں،مثلاً وہ توقع رکھتے ہیں کہ لوگ انہیں سلام کریں،کوئی ان سے پہلے محفل میں داخل نہ ہو،محفل میں ہمیشہ نمایاں جگہ پر بیٹھیں،لوگ ان کا احترام کریں،کوئی ان پر تنقید نہ کرے،حتیٰ کہ ان کو نصیحت یا مشورہ بھی نہ دیں بلکہ ان کے سامنے دست بستہ رہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ تکبر کے ضعیف یا طاقتور ہونے کے اختلاف سے یہ حالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ممکن ہے بعض لوگوں میں ساری علامات پائی جاتی ہوں اور بعض میں ان میں سے کچھ نشانیاں موجود ہوں۔

2۔تکبر کا شاخیں:۔

اس مقام پر ہمارے سامنے کئی مفاہیم ظاہر ہوتے ہیں جن کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ باہم

مترادف ہیں، حالانکہ ان کے درمیان بہت لطیف فرق پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سب کی بنیاد تکبر ہے۔ احساسِ برتری ،خودمحوری،خود پسندی، برتری طلبی اور فخر، یہ سب ایسے مفاہیم ہیں جن کی بنیاد تکبر ہے۔

جوشخص خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہو، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ احساسِ برتری میں مبتلا ہے۔ جوشخص اس احساسِ برتری کی وجہ سے یہ چاہتا ہو کہ ہر جگہ اور ہر میدان میں اُس کا سکہ جما ہوا ہو، اُسے ''خودمحور'' کہا جاتا ہے۔

جوشخص معاشرتی معاملات میں، خصوصاً مشکل حالات میں صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچتا ہو اور دوسروں کے مفادات کو اہمیت نہ دیتا ہو، اسے ''خودخواہ'' یا ''خود پسند'' کہا جاتا ہے۔

جوشخص دوسروں پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتا ہو، اُسے ''برتری طلب'' کہا جاتا ہے۔

جوشخص اپنے مال ودولت ،طاقت واقتدار وغیرہ کی دوسروں کے سامنے نمائش کرے، اُسے ''فخر کرنے والا'' یا ''فخرفروش'' کہا جاتا ہے۔

حقیقت میں ان تمام صفات کی جڑ مشترک ہے جس کا نام تکبر ہے۔ اگرچہ یہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

3۔ تکبر کس کے سامنے!

علمائے علم اخلاق نے تکبر کی تین اقسام بیان کی ہیں:

1۔ اللہ کے سامنے تکبر۔

2۔ انبیاءؑ کے سامنے تکبر

3۔ مخلوق کے سامنے تکبر

اللہ کے سامنے تکبر، تکبر کی بدترین قسم ہے جو جہل اور نادانی کی بدترین شکل کا نتیجہ ہے۔ تکبر کی اس قسم میں یہ ضعیف انسان خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتا بلکہ خدائی کا دعویٰ کرنے کے بعد کوشش کرتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اپنی بندگی کی طرف بلائے۔ یہ شخص اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ فرعون کی طرح:

"فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾"

''میں تمہارا سب سے برتر رب ہوں''۔ (نازعات:24)

کا دعویٰ کرنے لگتا ہے، یا یہ کہنے لگتا ہے:

"مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ"

''میں تمہارے لئے اپنے سوا کسی خدا کو نہیں جانتا''۔ (قصص:38)

یہ بات معقول نظر نہیں آتی کہ فرعون جیسا شخص جو سالہا سال تک مصر جیسے وسیع وعریض ملک پر حکمرانی کرتا رہا، اس قدر احمق

ہوسکتا ہے کہ ربِ اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرے یا اپنے آپ کو کائنات کا معبود سمجھنے لگے، بلکہ جو بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ فرعون جیسے افراد کو بیوقوف بنانے کیلئے اس قسم کے دعوے کرتے تھے تاکہ اپنی خدائی کا عقیدہ لوگوں پر مسلط کر کے اپنی حکومت اور اقتدار کی بنیادیں مضبوط کریں۔

اللہ کے سامنے تکبر کی ایک اور شکل وہ ہے جو ابلیس اور اس کے پیروکاروں نے اختیار کی، جنہوں نے اللہ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے اپنی سمجھ بوجھ کو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے برتر سمجھا اور کہا کہ چونکہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا ہے، لہٰذا وہ ایک خاکی مخلوق کو کیوں سجدہ کرے؟

"لَمۡ اَکُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ○"

''میں ہرگز اس بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے خشک شدہ کیچڑ سے پیدا کیا۔'' (حجر:33)

"قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ۚ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ○"

''میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا''۔ (اعراف:12)

بعض اوقات تکبر کا یہ ضخیم حجاب اس طرح انسان کے عقل و ہوش پر پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدائے علیم و حکیم سے زیادہ دانا اور آگاہ سمجھنے لگتا ہے۔

تکبر کی دوسری قسم اللہ کے رسولوں کے سامنے تکبر کرنا ہے۔ تکبر کی یہ قسم گزشتہ انبیاؑ کی اُمتوں میں بہت پائی جاتی تھی۔ ان اُمتوں کے بعض افراد تکبر اور استکبار کی وجہ سے اللہ کے رسولوں کی اطاعت سے انکار کرتے تھے اور فرعون کی طرح تکبر سے کہتے تھے:

"اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا"

''کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں''۔ (مؤمنون:47)

کبھی قومِ نوحؑ کے متکبر یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"وَ لَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَکُمۡ ۙ اِنَّکُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ○"

''اگر تم نے اپنے جیسے انسان کی اطاعت اختیار کر لی تو تم ضرور نقصان اُٹھاؤ گے''۔

بعض اوقات بچگانہ بہانے بناتے اور کہتے:

"قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَوۡ نَرٰی رَبَّنَا ؕ"

''جو لوگ ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں ہوتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے''۔ (فرقان:21)

اگلی آیت میں قرآن مجید ان کے ان بہانوں کے جواب میں فرماتا ہے:

"لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○"

''انہوں نے اپنے بارے میں تکبر کیا اور بہت بڑی سرکشی کی''۔(فرقان:21)

تکبر کی تیسری قسم اللہ کے سامنے تکبر ہے۔اس قسم کے متکبرین اس طرح اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو حقیر اور بے مقدار سمجھنے لگتے ہیں۔وہ کسی کی بات نہیں مانتے، اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، کسی کے حقوق کا احترام نہیں کرتے اور ہمیشہ دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ انہیں بڑا سمجھیں اور ان کی تعظیم اور احترام کریں۔

اس قسم کے تکبر کی مثالیں معاشرے میں بکثرت نظر آتی ہیں، لہٰذا ان کی تشریح اور وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔بعض اوقات تکبر بڑھ کر اللہ اور اللہ کے رسولوں کے سامنے تکبر کی حد تک جا پہنچتا ہے۔

4۔تکبر کے محرکات:۔

تکبر کے محرکات اور اسباب بہت ہیں لیکن ان سب کی بنیاد ایک چیز ہے، وہ یہ کہ انسان اپنے آپ میں کوئی ایسا کمال تصور کرنے لگتا ہے جس کے بارے میں وہ سمجھتا ہے کہ دُوسرے اس کمال سے محروم ہیں۔انسان حُبِ ذات کی وجہ سے اپنے اس کمال کو بڑا (magnify) کرنے لگتا ہے اور اس حد تک چلا جاتا ہے کہ دوسروں کو اس کے نتیجہ میں حقیر سمجھنے لگتا ہے۔

علم اخلاق کے بعض علمائے بزرگ مثلاً فیض کاشانی نے اپنی کتاب محجۃ البیضاء میں سات چیزوں کو تکبر کا سبب قرار دیا ہے جن میں سے دو اسباب دینی ہیں یعنی علم اور عمل جبکہ باقی پانچ اسباب نسب، خوبصورتی، قوت، مال و دولت اور اقارب و احباب کی کثرت ہیں۔انہوں نے ان میں سے ہر ایک کی تشریح بھی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(1)۔علم

علم بہت تیزی سے بعض علما اور دانشوروں کے غرور و تکبر کا باعث بن جاتا ہے۔ایک حدیثِ نبویؐ میں بھی آیا ہے کہ:

"آفَةُ الْعِلْمِ الْخُيَلَاءُ"

یعنی ''تکبر علم کی آفت ہے''۔

بعض افراد اِس قدر کم ظرف ہوتے ہیں کہ علم کے چند باب پڑھ کر اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے ان کے سامنے جھکیں اور ان کا احترام کریں۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی علماءؒ کے علم میں جس قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اُتنا ہی بے علم سمجھنے لگتے ہیں، اس لئے کہ جب وہ اپنے آپ کو علم کے گہرے سمندر کے سامنے کھڑا دیکھتے ہیں تو ان پر یہ آشکار ہو جاتی ہے کہ ان کا علم اس سمندر کے سامنے چند قطروں سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ان میں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جس قدر ان کا علم زیادہ ہوگا، ان کی ذمہ داری بھی اُتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اسی حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے:

"مَنِ ازْدَادَ عِلْماً اِزْدَادَ خَوْفاً"۔

یعنی ''جس کا علم زیادہ ہوتا ہے، اس کا خوف بھی زیادہ ہوتا ہے''۔

(2)۔عمل:۔

عبادات اور نیک اعمال بھی بہت سے عبادت گزاروں اور نیکوکاروں کو تکبر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ افراد اپنی عبادات اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور یہ توقع کرنے لگتے ہیں کہ لوگ انہیں نیک اور مقدس سمجھ کر ان کی زیارت کیلئے آئیں، ان کی خدمت کریں، محافل ومجالس میں انہیں خاص احترام دیں، ان کی نیکی اور زہد وتقویٰ کے چرچے ہوں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عبادت کر کے لوگوں پر احسان کر رہے ہیں۔ یہ تو ان کے تکبر کا دنیوی پہلو ہوتا ہے۔ دینی لحاظ سے یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نجات یافتہ ہیں جبکہ دوسروں کی قسمت میں ہلاکت وبربادی لکھی جا چکی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہت برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ خود ہلاکت کے گڑھے کے دہانے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اِذَا سَمِعْتُمُ الرَّجُلَ يَقُوْلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ"۔

''جب تم کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنو کہ لوگ (اپنے اعمال کی وجہ سے) ہلاک ہو گئے تو سمجھ لو کہ سب سے زیادہ وہ خود ہوا''۔

ایک اور حدیث نبویؐ میں ہے:

"كَفٰى بِالْمَرْءِ شَرّاً اَنْ يُحَقِّرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ"۔

''کسی شخص کے بُرا اور بدبخت ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے''۔

مرحوم فیض کاشانی محجۃ البیضاء میں ان احادیث کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''کس قدر فرق ہے اس شخص میں جو کسی عالم یا عابد کو عالم یا عابد جان کو اس کا احترام کرتا ہے اور اس کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے اور اُس عالم اور عابد میں جو اُس شخص کو چھوٹا سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس سے دور ہو جائے''۔

(محجۃ البیضاء، 169:3)

آگے چل کر وہ مزید فرماتے ہیں:

''یہ ایک ایسی آفت ہے جس سے بمشکل ہی کوئی عابد محفوظ رہ سکتا ہے۔ جب بھی کوئی اس کی بے احترامی کرتا ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی بے احترامی کرنے والا اللہ کی نظر میں قابلِ نفرت اور مبغوض ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اللہ اس شخص کو معاف نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ خود کسی کو ایسی ہی تکلیف پہنچائے تو اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ ایک قسم کی جہالت اور نادانی ہے اور عُجب یعنی خود پسندی، تکبر اور غرور کا مجموعہ اور مرکب ہے۔ ایسا عابد جب دیکھتا ہے کہ اس کی بے احترامی کرنے والا کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے تو وہ اسے اللہ کا انتقام اور اپنی کرامت سمجھنے لگتا ہے۔''

کس قدر فرق ہے ایسے مغرور اور متکبر عابد میں اور ایسے متواضع عابد میں جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑے عابد نے حج کے سفر سے واپس آتے ہوئے کہا: اگر میں (گناہگار) ان حجاج میں نہ ہوتا تو شاید اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرما دیتا۔

ہم اس گفتگو کو رسولؐ اللہ کی اس حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، روایات میں ہے کہ کسی نے آنحضرتؐ کی مجلس میں کسی شخص کی نیکی اور تقویٰ کی تعریف کی۔ تھوڑی دیر بعد وہی شخص دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ لوگوں نے عرض کیا:

''یارسولؐ! وہ نیک اور متقی شخص یہ ہے جو ہماری طرف آرہا ہے''۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا: ''میں اس کے چہرے پر شیطان کی تاریکی کو دیکھ رہا ہوں۔''

وہ شخص قریب آیا، اُس نے سلام کیا اور رسولؐ اللہ اور اصحاب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اَسْئَلُكَ بِاللهِ حَدَّثَتْكَ نَفْسُكَ اَنْ لَيْسَ فِي الْقَوْمِ اَفْضَلُ مِنْكَ؟ فَقَالَ اَللهُمَ نَعَمْ"۔

''تمہیں اللہ کی قسم! کیا تم اپنے دل میں یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ ان لوگوں میں کوئی تم سے افضل نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں ایسا ہی سوچ رہا تھا''۔ (محجۃ البیضاء، 240:6)

اصحاب سمجھ گئے کہ وہ شیطانی تاریکی جس کا مشاہدہ آنحضرتؐ نے نورِ نبوت کی روشنی میں کیا تھا، یہی تکبر اور غرور ہے۔

(3)۔ حسب ونسب:۔

تکبر کا تیسرا سبب اور محرک حسب ونسب ہے۔ جو لوگ کسی ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں جو علم وعمل، تقویٰ، شرافت اور سخاوت وغیرہ جیسی اچھی صفات کی وجہ سے شہرت رکھتا ہو، وہ اسے اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے ہیں اور دوسروں کو، جو ادنیٰ خاندانوں میں پیدا ہوئے ہیں، اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ اسلام میں حسب ونسب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام کی نظر میں سب اللہ کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل ہے تو وہ تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ رسولؐ اللہ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کسی ایسے لفظ کے استعمال کو برداشت نہیں کرتے تھے جس سے خاندانی برتری کی بو آتی ہو۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوذرؓ نے کسی کو ''یابن الوداء'' (کالی عورت کا بیٹا) کہہ کر آواز دی۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

''ابوذرؓ! خاموش، سفید فام عورت کے بیٹے کو سیاہ فام عورت کے بیٹے پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔''

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں زمین پر لیٹ گیا اور اُس شخص سے کہا کہ اپنا پاؤں میرے چہرے پر رکھ دے۔ (محجۃ البیضاء، 243:6)

بہر حال قرآن مجید اور احادیث میں یہ بات بار بار بیان ہوئی ہے کہ کسی انسان کو حسب ونسب کی بنیاد پر کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ یہ اعتباری اُمور ہیں جو انسان کی ذات سے باہر ہوتی ہیں جبکہ انسان کی شخصیت کی قدر و قیمت ان صفاتِ معنوی کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس کی ذات کے اندر ہوتی ہیں۔ بالفرض اگر حسب ونسب کا کسی فضیلت کے ساتھ کوئی تعلق ہو بھی تو اس کو غرور وتکبر کا سبب نہیں ہونا چاہئے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے کسی خطبہ میں یا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے خطبہ شام میں اپنے حسب نسب پر فخر کا اظہار کیا ہے تو اس کی وجہ یا مقصد دوسروں کے سامنے بڑائی کا مظاہرہ کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ اپنے فضائل کا ذکر کر کے بے خبر لوگوں کو اپنے مقام اور اپنی امامت کے بارے میں آگاہ کریں۔

(4)۔ حسن وجمال اور ظاہری خوبصورتی:۔

تکبر کا چوتھا سبب یا محرک حسن وجمال اور ظاہری خوبصورتی ہے جس کی وجہ سے کوئی حسین اور خوبصورت شخص اپنے آپ کو دوسروں، خصوصاً اُن لوگوں سے جن میں کوئی جسمانی نقص ہو، برتر سمجھتا ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بیماری خواتین میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ چھوٹے قد کی ایک عورت رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئی۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ جب وہ اپنے مسائل وغیرہ پوچھ کر واپس جا رہی تھی تو میں نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا قد کتنا چھوٹا ہے! رسولؐ اللہ نے مجھے کہا:

''تم نے اس عورت کی غیبت کی ہے''۔

فیض کاشانی اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی اس حرکت کی وجہ ان کا تکبر تھا۔ اگر ان کا اپنا قد بھی چھوٹا ہوتا تو وہ ایسی حرکت نہ کرتیں۔

(5)۔مال ودولت:۔

تکبر کا پانچواں سبب مال ودولت ہونا ہے۔عام طور پر بادشاہ،حکمران،سرمایہ داراور جاگیردارلوگ زیادہ مال ودولت رکھنے کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔جولوگ قیمتی لباس،اعلیٰ قسم کی سواری،عالیشان گھروں کے مالک ہوتے ہیں اوران چیزوں کی وجہ سے ان چیزوں سے محروم لوگوں پر برتری ثابت کرتے ہیں اوران کی تحقیر کرتے ہیں،وہ اس قسم کے تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔یہ تکبر کی بدترین اورگھناؤنی ترین قسم ہے۔

اس قسم کے متکبر بعض اوقات اس قدر گھٹیا پن پراُتر آتے ہیں کہ کسی غریب مگر نیک اورصالح مؤمن انسان سے اس طرح کی بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ''تیری کیا حیثیت ہے؟ میں تجھ جیسے سینکڑوں افراد کوخرید کرآزاد کرسکتا ہوں۔میرے ایک دن کا خرچہ تیری ساری عمر کے اخراجات سے زیادہ ہے۔''

قرآن مجید نے اس قسم کے تکبر کے کئی نمونے بیان کیے ہیں اوران کے نتائج کوبھی بیان کیا ہے۔قارون کے واقعہ میں آیا ہے کہ ایک دن وہ اپنے فخر وتکبر کے اظہار کیلئے اپنی زینت کے ساتھ بنی اسرائیل کے سامنے ظاہر ہوا۔اس کواس حال میں دیکھ کراس کی قوم کے لوگ حسرت سے کہنے لگے کہ کاش!ہم بھی قارون کی مانند دولت مند ہوتے۔

''فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ۔ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ''۔

مزید وضاحت کیلئے تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

کتبِ تاریخ میں ہے وہ چار ہزار سواروں کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا۔وہ سب اعلیٰ گھوڑوں پر سوار تھے۔ سواروں کے لباس اورگھوڑوں کے لباس بھی انتہائی قیمتی تھے۔اس کے ساتھ انتہائی حسین کنیزیں بھی تھیں جوسفید گھوڑوں پر سوار تھیں جن کی زینیں سونے کی بنی ہوئی تھیں۔

لیکن اس کا یہ تکبر اوراس کی دولت زیادہ عرصہ باقی نہ رہے اورتھوڑی سی مدت کے بعداللہ کے حکم سے وہ اپنے تمام محلات اورساری دولت کے ساتھ زمین میں دھنس گیا اور ہمیشہ کیلئے متکبروں کیلئے درسِ عبرت بن گیا۔

(6)۔جسمانی،سیاسی اورمعاشرتی قوت:۔

تکبر کی چھٹی وجہ جسمانی،سیاسی یا معاشرتی قوت اورطاقت ہے جو عام طور پر حکمرانوں اور اُمراء میں پائی جاتی ہے۔وہ اپنے آپ کو''ظِلُّ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِیْنَ''سمجھنے لگتے ہیں۔وہ توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے ان کے سامنے غلام بن کر رہیں۔اگر کبھی کسی سے ان کی شان میں ذراسی گستاخی ہوجائے تواُسے ہرگز قابلِ معافی نہیں سمجھا جاتا۔

بعض بادشاہوں کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے کہ اُنہوں نے حکم دیا ہوا تھا کہ اگر کبھی رعایا کا کوئی فرداُن کے دربار میں حاضر ہوتو اپنا منہ کپڑے سے ڈھانپ کر آئے تا کہ ان کی سلطنت کی شان وشوکت عوام کے منہ کی بو سے آلودہ نہ ہوجائے۔

اس تکبر کی وجہ سے عام طور پران کا دماغ خراب ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے وہ غلط فیصلے کرنے لگتے اور آخر کار انکے اقتدار کا خاتمہ ہوجاتا۔

(7)۔دوستوں اور مددگاروں کی کثرت:۔

تکبر کی ساتویں وجہ دوستوں اور مددگاروں کی کثرت ہوتی ہے۔قومیں اور قبائل اپنی عددی برتری کی وجہ سے اور حکمران وسلاطین اپنے لشکر وسپاہ کی کثرت کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ممکن ہے بعض علماء اپنے شاگردوں،مریدوں یا پیروگاروں کی کثرت کی وجہ سے تکبر کا شکار ہوجائیں۔حتیٰ کہ بعض اوقات فاسق وفاجر افراد اس بات پر تکبر اور غرور کا شکار ہوجاتے ہیں کہ اُنہوں نے دوسرے سے زیادہ شراب خوری کی ہے یا دوسروں کی نسبت زیادہ تعداد میں عورتوں اور لڑکوں سے بدکاری کی ہے۔

یہ سات اُمور ایسے ہیں جن کی وجہ سے عام طور پر لوگ تکبر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔البتہ تکبر کی وجوہات ان عوامل ومحرکات میں محدود نہیں ہیں بلکہ ہر قسم کی مادی،معنوی،حقیقی یا خیالی برتری انسان کے تکبر کا سبب بن سکتی ہے۔

ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ غرور وتکبر سے بچنے کے لئے انسان کو اسبابِ کمال سے دوری اختیار کر لینی چاہئے۔ان باتوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے علم،عبادت،قوت،دولت وغیرہ میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے،انسان کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسی قدر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی وانکساری اور تواضع اختیار کرے اور اس حقیقت کو ضرور مدِنظر رکھے کہ ان چیزوں میں سے کوئی بھی پائیدار اور باقی رہنے والی نہیں ہے بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے ہیچ ہیں۔

5۔تکبر کی جڑیں:۔

دیگر رذائلِ اخلاقی کی طرح تکبر کی مخصوص جڑیں ہیں جنہیں تلاش کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس بیماری کی جڑوں کو اُکھاڑنا ناممکن ہے۔

فیض کاشانی نے محجۃ البیضا میں تکبر کی چار جڑوں کا ذکر کیا ہے جو عُجب (خود پسندی)،کینہ،حسد اور ریا ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ جڑ جو انسان کے اندر ہوتی ہے،وہ عُجب یعنی خود پسندی اور احساسِ برتری ہے۔

اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتا ہے اور ان کے سامنے فخر وتکبر کا اظہار کرتا ہے۔تکبر کی ایک اور جڑ کینہ ہے جو کسی کے خلاف انسان کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔کینہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان اپنے واقعی یا خیالی کمالات کو اس شخص کے سامنے ظاہر کرے جس سے وہ کینہ رکھتا ہے۔اسی طرح حسد اور ریاکاری بھی اس اخلاقی بُرائی کے ظہور کا سبب بنتے ہیں۔

اگرچہ یہ چار چیزیں تکبر کی اصل جڑیں ہیں لیکن ظاہری بات ہے کہ تکبر کی جڑیں ان چار چیزوں میں محدود نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی تکبر کی جڑیں ہوسکتی ہیں۔

6۔تکبر کی علامات:۔

جسمانی بیماریوں کی طرح اخلاقی بیماریوں کی بھی کچھ علامات ہوتی ہیں۔علمائے اخلاق نے تکبر کی علامات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ علامات کبھی چہرے کے تاثرات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں، مثلاً متکبر انسان دوسروں کے سامنے تیوری چڑھائے رکھتا ہے، ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ اپنا چہرہ پوری طرح ان کی طرف کرکے بات نہیں کرتا۔

بعض اوقات اس صفتِ رذیلہ کے آثار انسان کے اندازِ گفتگو سے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ایسا شخص اپنے بارے میں مبالغہ آرائی پر مبنی الفاظ استعمال کرتا ہے۔اپنے بارے میں ''مَیں''، ''مجھے''، ''میرے'' کی بجائے ''ہم''، ''ہمیں''، اور ''ہمارے'' جیسے الفاظ استعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی آواز کا اُتار چڑھاؤ بھی اس کے تکبر کی غمازی کررہا ہوتا ہے۔وہ دوسروں کی مختصر بات سننے کیلئے بھی تیار نہیں ہوتا جبکہ خود یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی لمبی چوڑی اور بے معنی باتوں کو غور سے سنیں۔

بعض اوقات تکبر کے آثار وعلامات انسان کی حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ بیٹھا رہے اور دوسرے اُس کے سامنے کھڑے رہیں۔ جب وہ محفل میں داخل ہو، سب اُس کے احترام میں کھڑے ہوجائیں لیکن وہ خود کسی کے احترام میں کھڑا نہ ہو۔ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ اَرَادَاَنْ يَنْظُرَ اِلىٰ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ النّٰارِ فَلْيَنْظُرْ اِلىٰ رَجُلٍ قٰاعِدٍوَبَيْنَ يَدَيْهِ قَوْ مٌ قِيٰامٌ"۔

''جو شخص کسی جہنمی کو دیکھنا چاہتا ہو تو وہ اُس شخص کو دیکھ لے جو خود بیٹھا ہوا ہے اور کچھ لوگ اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔متکبر انسان گلی، کوچے اور بازار میں تنہا جانا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہوں جو اس کے پیچھے پیچھے چلیں''۔(بحارالانوار، 206:70)

ایک حدیث میں ہے:

"كَانَ رَسُوْلُ اللهِ فِيْ بَعْضِ الْاَوْقٰاتِ يَمْشِيْ مَعَ الْاَصْحٰابِ فَيَأْ مُرُ هُمْ بِالتَّقَدُّمِ فِيْ غِمٰارِهِمْ"۔

''بعض اوقات رسول اللہ اپنے اصحاب کے ساتھ جارہے ہوتے تھے تو انہیں حکم دیتے کہ آپ آگے چلیں اور آپؐ خود ان کے درمیان چلتے تھے''۔(المحجۃ البیضاء، 247:6)

ایسا شخص چاہتا ہے کہ لوگ اسے ملنے آئیں مگر وہ کسی سے ملنے نہ جائے۔ وہ غریبوں اور معاشرے کے پسماندہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ اگر کبھی مجبوراً ایسے لوگوں میں بیٹھنا پڑ جائے تو کوشش کرتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، وہاں سے اُٹھ جائے۔

متکبر انسان اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ گھریلو کاموں کو ہاتھ تک نہیں لگاتا اور چاہتا ہے کہ اس کے بیوی، بچے اور ملازم ہر وقت دست بستہ غلاموں کی طرح اس کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

کبھی تکبر کے آثار اس کے لباس، سواری، گھریلو ساز و سامان وغیرہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان تمام اُمور میں اس کی کوشش ہوتی ہے کہ قارون کی طرح دوسروں کو اپنی دولت سے مرعوب کرے۔

البتہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انسان اچھا لباس نہ پہنے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننا شروع کر دے بلکہ اس حدیثِ نبوی کو مدِ نظر رکھ کر اس کے مطابق عمل کرے:

"كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَالْبَسُوْا وَتَصَدَّقُوْا فِيْ غَيْرِ سَرَفٍ وَلَا مَخِيْلَةٍ"

''کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ دو مگر اسراف اور تکبر نہ کرو''۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث: 3605)

مختصر یہ کہ تکبر کا ظہور انسان کی زندگی کے ہر پہلو میں ہوسکتا ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص تکبر میں مبتلا ہو مگر اس کے چہرے کے تاثرات، اندازِ گفتگو اور طرزِ عمل سے اس کا اظہار نہ ہو۔

7۔ تکبر اور استکبار کے نتائج:۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ تکبر ایسی صفتِ خبیثہ ہے جو انسان کے قلب و روح، افکار و اعمال اور فردی و اجتماعی سطح پر گہرے ارتباہ کن اثرات ڈالتی ہے۔ مختصر الفاظ میں اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی اور معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو اس صفتِ رذیلہ کے منفی اور تباہ کن اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔ ذیل میں اہم ان میں سے چند چیدہ چیدہ اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(1)۔ کفر و شرک سے آلودگی:۔

تکبر کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ یہ انسان کو کفر و شرک سے آلودہ کر دیتا ہے۔ آیا ابلیس کا کفر، توحید کے راستے سے اس کا بھٹک جانا بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ و بالغہ پر اس کے اعتراض کی وجہ تکبر کے علاوہ کوئی اور چیز تھی؟

آیا فرعون اور نمرود اور ان جیسے افراد جنہوں نے سرکشی کی وجہ سے انبیاؑ کی دعوت کو قبول نہیں کیا، ان کے انکار کی تکبر کے سوا کوئی اور وجہ تھی؟

تکبر انسان کو حق کے سامنے جھکنے نہیں دیتا، اس لئے کہ اس کی عقل و بصیرت پر پڑا ہوا تکبر کا ضخیم حجاب اسے حق کے حسین چہرے کا جلوہ نہیں دیکھنے دیتا۔ یہ تکبر کا سب سے بڑا نقصان ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب کسی شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ

السلام سے پوچھا: ''الحاد کا سب سے ادنیٰ درجہ کونسا ہے؟''
آپؑ نے فرمایا: ''تکبر''۔(اصول کافی، 309:2)

(2)۔علم ودانش سے محرومی:۔

تکبر کے منحوس نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ انسان علم ودانش سے محروم ہوجاتا ہے۔انسان صرف اس صورت میں علم وحکمت حاصل کرسکتا ہے جب وہ علم وحکمت کو اپنی گمشدہ دولت سمجھے اور جس کے پاس اسے پائے، اسے حاصل کرنے کیلئے اس کے پاس جائے۔لیکن متکبر انسان کا تکبر اسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے یا اپنے سے کم تر انسان کی شاگردی اختیار کرے۔اس طرح وہ علم وحکمت کے گراں بہا موتیوں سے محروم ہوجاتا ہے۔ایسے افراد صرف ان علوم کو قبول کرتے ہیں جو ان کی اپنی سوچ اور فکر سے پیدا ہوتے ہیں۔لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ ان کے تکبر کی وجہ سے ان کی سوچ کا دائرہ بھی محدود ہوجاتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کی سوچ کسی قابلِ ذکر حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔اسی حقیقت کے پیش نظر ایک حدیث میں جسے ہشام بن حکم نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کیا ہے، یہ بیان ہوا ہے:

"اِنَّ الزَّرْعَ يَنْبُتُ فِي السَّهْلِ وَلاٰ يَنْبُتُ فِي الصَّفا فَكَذٰلِكَ الْحِكْمَةُ تَعْمُرُ فِي قَلْبِ الْمُتَواضِعِ وَلاٰ تَعْمُرُ فِي قَلْبِ الْمُتَكَبِّرِ الْجَبَّارِ، لِاَنَّ اللهَ جَعَلَ التَّواضُعَ آلَةَ الْعَقْلِ وَجَعَلَ التَّكَبُّرَ مِنْ آلَةِ الْجَهْلِ"

''کھیتی نرم اور ہموار زمین میں اُگتی ہے اور کسی سنگلاخ زمین پر کوئی کھیتی نہیں اُگتی۔اسی طرح حکمت متواضع شخص کے دل میں آباد ہوتی ہے، کسی متکبر اور جبار کے دل میں نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے تواضع کو عقل کا ہتھیار اور تکبر کو جہل کا ہتھیار قرار دیا ہے''۔(بحارالانوار، 153:1)

(3)۔تکبر بہت سے گناہوں کا اصل سبب ہے:۔

اگر کبھی ہم حاسد، حریص، بدزبان یا دیگر گناہوں سے آلودہ کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ حقیقت نظر آجائے گی کہ ان سب خرابیوں کی وجہ تکبر ہے۔ایسے افراد کسی صورت میں اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ کسی کو اپنے سے اوپر دیکھیں۔لہٰذا جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کو کوئی نعمت حاصل ہوگئی ہے تو یہ آتش حسد میں جلنے لگتے ہیں۔وہ اپنے تکبر اور برتری کی بنیادیں مضبوط کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ مال ودولت کی خواہش کرنے لگتے ہیں جس سے ان کے اندر حرص جیسی بیماری پیدا ہوجاتی ہے۔تکبر کی وجہ سے دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے اور ان کی تحقیر کیلئے وہ دوسروں کے ساتھ بدزبانی کرتے ہیں۔ایک حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلْحِرْصُ وَالْكِبْرُ وَالْحَسَدُ دَوَاعٍ اِلٰى تَقَحُّمِ الذُّنُوْبِ"۔

''حرص، تکبر اور حسد کی وجہ سے انسان مختلف گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے''۔(نہج البلاغہ، حکمت:371)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلتَّكَبُّرُ يُظْهِرُ الرَّذِيْلَةَ"۔

''تکبر رذائلِ اخلاق کو ظاہر کرتا ہے''۔(غرر الحکم، حدیث:523)

(4)۔تکبر لوگوں کی نفرت کا سبب:۔

تکبر کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تکبر انسان سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور وہ معاشرے میں تنہائی کا شکار ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ کسی انسان کی ذات شرافت اور عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کرتی کہ متکبر و مغرور انسانوں کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل یا چھوٹا ہونے دے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متکبر افراد کے دوست، حتیٰ کہ قریبی رشتہ دار بھی ان سے دور ہوجاتے ہیں۔اگر کسی معاشرتی ضرورت کے تحت ان کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے پر مجبور ہوں تو دل میں ضرور ان سے نفرت کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ تَكَبَّرَ عَلَى النَّاسِ ذَلَّ"۔

''جو شخص لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آتا ہے، وہ ذلیل ہوجاتا ہے۔''(بحار الانوار، 235:74)

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اَمْقَتُ النَّاسِ اَلْمُتَكَبِّرُ"۔

''متکبر سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہوتا ہے''۔(بحار الانوار، 231:70)

ایک اور حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"ثَمَرَةُ الْكِبْرِ اَلْمَسَبَّةُ"۔

''تکبر کا پھل یہ ہوتا ہے کہ لوگ متکبر کے بارے میں بدگوئی کرتے ہیں''۔(غرر الحکم، حدیث:4614)

امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

"لَيْسَ لِلْمُتَكَبِّرِ صَدِيْقٌ"۔

''متکبر کا کوئی دوست نہیں ہوتا''۔(غرر الحکم، حدیث:7162)

ایک اور حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"ما جُتَلَبَ الْمَقْتَ بِمِثْلِ الْكِبْرِ"۔

''کوئی چیز تکبر کی طرح نفرت انگیز نہیں ہوتی''۔(غرر الحکم، حدیث:7167)

(5)۔تکبر اور وسائلِ زندگی سے محرومی:۔

زندگی میں کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ انسان کو اچھے اور تعاون کرنے والے ساتھی میسر ہوں۔جن افراد کے دوست اور ساتھی نہ ہوں، ان کی انفرادی کوششیں یا تو ناکام ہوجاتی ہیں یا ان کی کامیابی کا تناسب بہت کم ہوتا ہے۔چونکہ متکبر انسان معاشرے میں ناپسندیدہ ہوتا ہے اور تکبر کی وجہ سے تنہا رہ جاتا ہے، اس کی کامیابیاں بھی ناچیز ہوتی ہیں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بِكَثْرَةِ التَّكَبُّرِ يَكُوْنُ التَّلَفُ"۔

''زیادہ تکبر نقصان کا باعث ہوتا ہے''۔(غرر الحکم، حدیث:7169)

اس حدیث کی تشریح اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والی تباہ کن اور خونریز جنگیں تکبر ہی کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔جب متکبر افراد دنیا کے ممالک پر حکمران بن جائیں تو ہر ایک اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے ایسے اقدامات کرتا ہے جو ان کے درمیان جنگ کا باعث بنتے ہیں۔ان جنگوں میں جو خونریزی ہوتی ہے اور جو نقصانات ہوتے ہیں، وہ کسی پر مخفی نہیں ہیں۔

بعض اوقات تکبر اجتماعی شکل میں ہوتا ہے اور کوئی خاص قوم یا نسل اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتی ہے۔یہ احساسِ برتری اور تکبر بھی خونریز اور تباہ کن جنگوں کا سبب بنتا ہے جن سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔یہ جرمن قوم کا احساسِ برتری اور تکبر ہی تھا جو عالمی جنگوں کا سبب بنا جن میں لاکھوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے اور اربوں کے نقصانات ہوئے۔

مختصر یہ کہ اگر روح و جسم اور انفرادی و اجتماعی زندگی پر تکبر کے منفی اثرات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ کوئی اخلاقی بُرائی تکبر کی طرح نقصان دہ نہیں ہے۔

(8)۔تکبر کا علاج:۔

علمائے اخلاق نے تکبر کے علاج کے بارے میں مفصل مباحث کی ہیں جن میں سے اکثر نے تکبر کے علاج کے دو طریقوں پر زیادہ توجہ دی ہے: علمی طریقہ، عملی طریقہ۔

علمی طریقہ:۔

علمی طریقہ یہ ہے کہ متکبر انسان اپنے بارے میں اس طرح سے سوچے کہ وہ کیا ہے؟ کہاں تھا؟ کہاں جارہا ہے اور یہ کہ اس

کاانجام کیا ہوگا؟ اسی طرح اُسے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اوراس کے سامنے اپنی حیثیت کے بارے میں غور کرے۔

دنیا کی عبرت بھری تاریخ کا مطالعہ کرے، فرعونوں، نمرودوں اور قیصر وکسریٰ جیسے حکمرانوں کے حالات کا مطالعہ کرے تا کہ اسے معلوم ہو کہ دنیا کی عارضی اورزودگزر کامیابیاں اورفتوحات کچھ نہیں ہوتیں، ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے نہ انہیں عظمت کی نشانی قرار دیا جاسکتا ہے۔

جوانسان آغاز میں ایک حقیر نطفہ اور آخر میں ایک متعفن لاش ہوتا ہے، ان دومراحل کے درمیان کس بات پر فخر اور تکبر کرتا ہے۔

پیدائش کے آغاز میں وہ اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ چھوٹا سا کام کرنے کی قدرت اور طاقت نہیں رکھتا، یہاں تک کہ اپنے منہ سے بہنے والے پانی کو اپنے ہونٹوں کی مدد سے نہیں روک سکتا، بڑھاپے میں بھی اس کی حالت ایک بار پھر ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عَجِبْتُ لِلْمُخْتَالِ الْفَخُوْرِ وَاِنَّمَا خُلِقَ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ يَعُوْدُ جِيْفَةً وَهُوَ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ لَا يَدْرِيْ مَا يُصْنَعُ بِهٖ"۔

''مجھے متکبر پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ ایک حقیر نطفہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر متعفن لاش بن جاتا ہے اوران دومراحل کے درمیان کا اسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے''۔

اگر ہم کبھی ہسپتال جائیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اچھے خاصے صحت منداور تنومند افراد ایک حادثے یا بیماری کی وجہ سے بستر بیماری سے چپکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جسمانی صحت اور طاقت کوئی قابلِ اعتماد چیز نہیں ہیں۔

اگر ہم ایسے دولت مند افراد کو دیکھیں جو اقتصادی حالات بدل جانے کی وجہ سے اپنی تجارت میں وسیع پیمانہ پر خسارے کا شکار ہوکر فقر وناداری کا شکار ہوجاتے ہیں تو ہم پر واضح ہوجاتا ہے کہ مال ودولت بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔

اگر بڑے بڑے طاقتور حکمرانوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جو سیاسی حالات بدل جانے کی وجہ سے اقتدار سے محروم ہو گئے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے یا پھانسی کے تختہ پر چڑھ گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اقتدار بھی قابلِ اعتماد چیز نہیں ہے۔

اب یہ انسان کس چیز پر تکبر کرتا ہے؟ کس بات پر فخر کرتا ہے؟ کس بات پر اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے؟ امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ سلمان فارسی اور ایک متکبر شخص کے درمیان بحث ہورہی تھی۔ اس متکبر نے تکبر کے ساتھ سلمان فارسی سے پوچھا کہ تم کیا چیز ہو؟ سلمان فارسی نے جواب دیا کہ آغاز میں مَیں اورتم دونوں ایک حقیر نطفہ تھے، آخر میں ہم دونوں متعفن لاشیں ہوں گے۔ پھر قیامت کے دن ہم دونوں کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے۔ جس کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا، وہ برتر ہوگا اور جس کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا، وہ پست اور حقیر ہوگا۔ (بحارالانوار، 231:70)

مختصر یہ کہ انسان ان اُمور پر جس قدر زیادہ توجہ دے، اسے تکبر وغرور کے گھوڑے سے اُترنے میں اُتنی ہی آسانی ہو

جاتی ہے۔

عملی طریقہ:۔

تکبر کے علاج کا عملی طریقہ یہ ہے کہ انسان کوشش کرے کہ متواضع افراد کا رویہ اپنائے تا کہ یہ اخلاقی فضیلت اس کے وجود کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ لے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی پیشانی رکھ کر اس قسم کے اذکار کا وِرد کرے:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ حَقّاً سَجَدْتُ لَكَ تَعَبُّداً وَرِقّاً لَا مُسْتَنْكِفاً وَلَا مُسْتَكْبِراً"

سادہ لباس پہنے، سادہ کھانا کھائے، نوکروں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھے، سلام کرنے میں پہل کرے، محفل میں نمایاں مقام پر نہ بیٹھے اور چلتے ہوئے دوسروں پر سبقت حاصل نہ کرے۔ چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ یکساں طور پر گرمجوشی سے پیش آئے۔ مغرور اور متکبر افراد سے دوری اختیار کرے۔ اپنے لئے برتری کا قائل نہ ہو، مختصر یہ کہ تکبر کی ہر علامت سے پرہیز کرے اور تواضع کی ہر علامت اور نشانی کو اپنائے۔

رسولؐ اللہ کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے کہ آپ فقراً کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور فرماتے تھے:

"اِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ آكُلُ كَمَا يَأْكُلُ الْعَبْدُ"۔ (المحجة البيضأ، 6:256)

''میں تو ایک بندہ ہوں اور اسی طرح کھانا کھاؤں گا جیسے بندے کھانا کھاتے ہیں''۔

حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ آپؑ نے دو قمیصیں خریدیں۔ ایک کی قیمت چار درہم اور دوسری تین درہم کی تھی۔ آپؑ نے چار درہم والی قمیص اپنے غلام قنبر کو دے دی اور تین درہم والی اپنے لئے رکھ لی۔ (بحار الانوار، 76:310)

نہج البلاغہ میں خطبہ 160 میں حضرت علی علیہ السلام رسولؐ اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ كَانَ يَأْكُلُ عَلَى الْاَرْضِ وَيَجْلِسُ جَلْسَةَ الْعَبْدِ وَيَخْصِفُ بِيَدِهٖ نَعْلَهٗ، وَيَرْقَعُ بِيَدِهٖ ثَوْبَهٗ وَيَرْكَبُ الْحِمَارَ الْعَارِيَ وَيُرْدِفُ خَلْفَهٗ"۔

''رسولؐ اللہ بغیر فرش کے زمین پر بیٹھتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔ غلاموں کے انداز میں بیٹھتے تھے۔ اپنا جوتا اپنے ہاتھ سے مرمت کرتے تھے۔ اپنا لباس اپنے ہاتھ سے رفو کرتے تھے۔ گدھے کی ننگی پشت پر سواری کرتے تھے اور اپنے پیچھے بھی کسی کو بٹھاتے تھے۔''

البتہ زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے اب ان میں سے بعض چیزوں پر عمل کرنا خلافِ معمول ہے، لہٰذا ان پر عمل کرنے کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔ مقصد یہ ہے کہ ہم رسولؐ اللہ اور آئمہ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں، ان کے عظیم مقام کے باوجود ان کی تواضع کو دیکھیں اور تواضع کا درس حاصل کریں۔

یہ سب باتیں ایک طرف اور دوسری طرف یہ بھی کہ:

چونکہ تکبر کے مختلف اسباب اور عوامل ہیں جن کی تعداد علمائے اخلاق نے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، سات بیان کی ہے، لہٰذا تکبر کے عملی طریقۂ علاج میں ایک روش یہ بھی ہے کہ ان سات اسباب میں سے ہر ایک کو برطرف کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ اس بارے میں علمائے اخلاق نے خوبصورت انداز میں رہنمائی کی ہے۔ مثلاً یہ کہ جو لوگ نسب کی وجہ سے تکبر کرتے ہیں، انہیں اس حقیقت پر توجہ کرنی چاہئے کہ:

1۔ دوسروں کے کمالات پر فخر کرنا عین جہالت ہے۔ اگر کسی کا باپ صاحبِ علم وفضل ہو اور وہ خود علم وفضل سے بے بہرہ ہو تو باپ کے علم وفضل سے اس میں کوئی کمال اور فضیلت پیدا نہیں ہو جاتی۔

2۔ اگر اچھی طرح سے سوچا جائے تو واضح ہوگا کہ نسب کی وجہ سے تکبر کرنے والے کا باپ نطفہ سے اور جدِ اوّل خاک سے پیدا ہوا تھا۔ یہ تو کوئی ایسی چیز نہیں ہیں جن پر فخر کیا جا سکے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا:

"یَابُنَیَّ وَیْلٌ لِمَنْ تَجَبَّرَ وَتَکَبَّرَ، کَیْفَ یَتَعَظَّمُ مَنْ خُلِقَ مِنْ طِیْنٍ، وَاِلٰی طِیْنٍ یَعُوْدُ؟ لَا یَدْرِیْ اِلٰی مَاذَا یَصِیْرُ؟ اِلَی الْجَنَّۃِ فَقَدْ فَازَ اَوْ اِلَی النَّارِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِیْنًا۔"

''اے بیٹا! ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو تکبر کرتا ہے اور بڑائی کی خواہش کرتا ہے۔ آخر وہ کس بنیاد پر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے جبکہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے اور اسے مٹی میں مل جانا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ جنت! اگر ایسا ہو تو وہ کامیاب وکامران ہوا اور اگر جہنم میں گیا تو واضح وآشکار خسارہ اُٹھایا''۔

جو لوگ حسن وجمال کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، انہیں یہ بات مدِ نظر رکھنی چاہئے کہ ایک بیماری، خاص طور پر کوئی جلدی بیماری، ان کے سارے حسن وجمال کو برباد کر دیتی ہے۔ اگر بیماری کی آفت سے بچ جائیں تو بڑھاپے کے گردوغبار سے سارے حسن وجمال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سروقامت جوانی کا حسن کمر خمیدہ بڑھاپے کے ہاتھوں مغلوب ہو جاتا ہے اور چہرے کی رعنائی کی جگہ بڑھاپے کی جھریاں لے لیتی ہیں۔ کیا اس قدر تیزی سے زائل ہو جانے والے حسن وجمال پر فخر وتکبر کرنا عقلمندی ہے؟

اگر تکبر کا سبب جسمانی طاقت اور قوت ہو تو انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ چھوٹی سی قلبی یا دماغی بیماری فالج کے حملے کا سبب بن جاتی ہے اور طاقت وقوت سے بھرا ہوا بدن مفلوج ہو کر مکمل طور پر بیکار ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے چہرے سے مکھی تک اُڑانے کے قابل نہیں رہتا۔

جو لوگ دولت وثروت یا اعزّا واقارب کی کثرت کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، انہیں ان اُمور پر توجہ رکھنی چاہئے کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کے وجود سے باہر ہیں اور ان پر فخر ومباہات کرنا درست نہیں ہے۔ آخر یہ کوئی معقول بات ہے کہ انسان اپنے گھوڑے، خچر، گاڑی یا گھر وغیرہ پر فخر کرے۔ یہ چیزیں تو اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ ترین افراد کے ہاتھ میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان

میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں چور آسانی سے چرالے جاسکتے ہیں۔کس قدر حقیر اور بے قدر و قیمت ہے وہ برتری اور شرف جسے چور چرالے جاسکتے ہوں اور اس کے مالک کو اس سے محروم کر سکتے ہوں۔

اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی سب پر اچھی طرح واضح ہے کہ مال و دولت کبھی ایک ہاتھ میں نہیں رہتے۔آج اس کے ہاتھ میں ہیں تو کل کسی اور کے ہاتھ میں۔یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے دولت مند فقیر بن جاتے ہیں اور محلوں میں رہنے والے جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جو چیز اس قدر ناپائیدار اور کمزور ہے،اس پر اتنے غرور و تکبر کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟

اگر تکبر و غرور کا سبب علم اور دانش ہو، بدقسمتی سے یہ علم اور اہلِ علم کیلئے سب سے بڑی آفت ہے،اس لئے اس کا علاج بھی خاصا مشکل اور پیچیدہ ہے۔علم ایک ایسی فضیلت ہے جس کی فضیلت کے بارے میں بہت سے آیات و روایات گواہ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہی باتیں عالم کو تکبر میں مبتلا کر دیں۔ایسے افراد کو چاہئے کہ سورۂ جمعہ میں اہلِ کتاب کا ذکر پڑھ لیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عالم بے عمل کی حالت اُس گدھے جیسی ہوتی ہے جس پر کتابیں لادی ہوئی ہوں۔اس کے علاوہ عالم کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جس عمل کی وجہ سے وہ لوگوں کے ساتھ تکبر سے پیش آتا ہے اور اسے اپنی برتری کا سبب سمجھتا ہے،اس سے زیادہ تو اس کی ذمہ داری سنگین ہے۔

احادیث میں ہے کہ جتنی دیر میں جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے،اُتنی دیر میں عالم کے ایک گناہ کا حساب ہوگا۔صاحبِ علم شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کے دن عالم کا حساب عام لوگوں کے حساب کی نسبت بہت سخت ہوگا۔کیا ان تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے تکبر کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت تکبر کا سبب ہو تو انسان کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ صرف ان عبادات کو قبول فرماتا ہے جو ہر قسم کے تکبر اور خود پسندی سے پاک ہوں۔اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو گناہگار اپنے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہوں،وہ ایسے عبادت گزاروں کی نسبت نجات کے زیادہ قریب ہوتے ہیں جو اپنی عبادت پر تکبر کرتے ہیں۔

اصولی طور پر عبادت کی قبولیت کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنے اعمال کو اللہ کے سامنے حقیر اور بے قدر و قیمت سمجھے،حتیٰ کہ اگر تمام جن و انس کی عبادت کے مساوی وعبادت بھی انجام دے تو اسے اللہ کے خوف سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

(9)۔علاج اور آزمائش:۔

اس سے پہلے ہم یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی بیماریاں جسمانی بیماریوں کے ساتھ کافی مشابہت رکھتی ہیں۔اگر ان دونوں کو آپ میں صحیح موازنہ کیا جائے تو بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔جب کوئی طبیب کسی مریض کی کسی جسمانی بیماری کا علاج

کرتا ہے تو علاج کے اختتام پر ایک بار پھر وہ مریض کو مختلف آزمائشات (ٹیسٹ) کیلئے لیبارٹری میں بھیجتا ہے تا کہ اسے یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ بیماری کا مکمل طور پر قلع قمع ہو چکا ہے۔ اگر ٹیسٹ کی روشنی میں طبیب یہ دیکھے کہ بیماری کے کچھ اثرات اب بھی موجود ہیں تو وہ علاج کو مزید کچھ عرصہ جاری رکھتا ہے تا کہ مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔

علمائے علم اخلاق نے تکبر کے علاج کیلئے بھی ایسے ہی طریقے اختیار کئے ہیں۔ تکبر کا علاج کرنے کے بعد وہ بھی اپنے مریضوں کا ٹیسٹ لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیماری مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے یا اس کے کچھ اثرات باقی ہیں۔

مرحوم فیض کاشانی نے احیاالعلوم کی روشنی میں چند دلچسپ ٹیسٹ تجویز کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

1۔ انسان اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی علمی موضوع پر مناظرہ کرے اور دیکھے کہ اگر اس کا مخالف کوئی صحیح بات کہہ رہا ہو تو کیا وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے قبول کر لے بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کرے؟ یا نہیں، بلکہ اپنے ساتھی یا شاگرد کی زبان سے نکلی ہوئی حق بات قبول کرنا ابھی تک اس کیلئے سنگین اور دشوار ہے؟ پہلی صورت میں تکبر کا خاتمہ ہو چکا ہے جبکہ دوسری صورت میں اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکبر کی جڑیں ابھی تک دل میں باقی ہیں۔

2۔ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کسی محفل میں شریک ہو اور انہیں اپنے اوپر مقدم رکھے۔ خود ان کے پیچھے پیچھے چلے، پھر دیکھے کہ اگر یہ اس پر گراں نہیں گزر رہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر کا خاتمہ ہو چکا ہے ورنہ تکبر کی جڑیں ابھی تک موجود ہیں۔

لیکن بعض اوقات شیطان یہاں بھی انسان کو دھوکا دے جاتا ہے کہ انسان لوگوں کی نظر میں متواضع بننے کیلئے کسی محفل میں معمولی جگہ پر بیٹھتا ہے اور عام لوگوں میں گھل مل جاتا ہے۔ یہاں اس کے تکبر میں ریاکاری بھی شامل ہو جاتی ہے۔

3۔ اگر کوئی غریب اور مسکین شخص اس کی دعوت کرے اور وہ اس دعوت کو قبول کر لے یا اس کا دوست اس سے چاہے کہ وہ بازار سے اس کیلئے کوئی چیز لے آئے اور وہ اس کیلئے لے آئے۔ اگر وہ ایسے کام کرتے ہوئے اپنے ذہن اور جذبات پر کوئی بوجھ محسوس نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر کی بیماری مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اگر ایسا کرتے ہوئے وہ کسی قسم کا بوجھ یا دشواری محسوس کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی تک تکبر کی جڑیں اس کے دل میں باقی ہیں اور اسے ابھی مزید علاج کی ضرورت ہے۔

4۔ اپنی روزمرہ ضروریات کی اشیا خریدنے کیلئے بازار جائے، اگر ایسا کرنا اُس پر دشوار نہ ہو تو تکبر ختم ہو چکا ہے لیکن اگر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کا جی چاہتا ہو کہ لوگ اس حال میں اُسے دیکھیں اور اسکی تواضع کی تعریف کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تکبر میں ریاکاری کا عنصر بھی شامل ہو چکا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اُمور ہر معاشرے اور تمام حالات میں یکساں نہیں ہوتے۔ بعض اوقات واقعی ان میں سے بعض کاموں کو انجام دینا بعض افراد کیلئے معیوب ہو سکتا ہے اور اگر وہ ایسا کوئی کام کریں تو اخلاقی لحاظ سے معاشرے پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اہلِ مدینہ میں سے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ

بازار سے کوئی چیز خرید کر گھر لے جا رہا تھا، جب امام علیہ السلام کی نظر اس پر پڑی تو شرمندہ ہو گیا۔ آپؑ نے فوراً فرمایا:

''پریشان نہ ہو، تم نے اپنے گھر والوں کیلئے ایک چیز خریدی ہے اور اسے گھر لے جا رہے ہو۔ اللہ کی قسم! اگر مدینہ کے لوگ اس کو میرے لئے معیوب نہ سمجھتے تو میں بھی یہ پسند کرتا کہ بازار سے چیزیں خرید کر اپنے گھر لے جاؤں۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں حالات یہ تھے، جبکہ حضرت علی علیہ السلام کے دور میں حالات اور تھے، وہ ایسے کام کرتے تھے اور معاشرہ اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا۔ ان آزمائشات کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ انسان کے اندر تواضع پیدا ہوئی یا ابھی تک وہ تکبر میں مبتلا ہے۔

5۔ انسان سادہ اور کم قیمت کے کپڑے پہن کر دیکھے، اگر اُس سے اس کی طبیعت رنجیدہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر ابھی تک موجود ہے اور اگر یہ کام اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تکبر کی بیماری رخصت ہو چکی ہے۔ رسولؐ اللہ کی ایک حدیث میں ہے:

"مَنْ اِعْتَقَلَ الْبَعِيْرَ وَلَبِسَ الصُّوفَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ الْكِبْرِ"۔

''جو شخص اپنا اونٹ خود باندھے اور کھردُرا لباس پہنے (اور یہ اس پر گراں نہ گزرے) تو وہ تکبر سے پاک ہے۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ اکثر لوگ جسمانی بیماریوں کے علاج کو تو اہمیت دیتے ہیں اور بار بار طبیب کے پاس جاتے ہیں، مختلف قسم کے ٹیسٹ کرواتے ہیں تاکہ اپنے صحت کے بارے میں مطمئن ہو سکیں لیکن روحانی اور اخلاقی صحت جو اِن کی ابدی سعادت اور نجات کی ضامن ہے، اس سے غفلت برتتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا ہے:

"اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ"۔

''قیامت کے دن نجات صرف اُسے نصیب ہوگی جو قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں آئے گا۔''

دوسرا باب

تواضع اور فروتنی

تمہید

یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ تواضع اور فروتنی تکبر کی متضاد اخلاقی خصوصیت ہے اور ان دونوں مباحث کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات وروایات میں اور علماءؒ کے اقوال میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تعریف کا لازمہ، لامحالہ دوسرے کی مزمت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے علم کی تعریف وتمجید کو جہالت کی مذمت اور تنقیص سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ جو کچھ تکبر اور استکبار کے مباحث میں بیان ہو چکا ہے، ہم اُسی پر اکتفا کرتے ہوئے تواضع کے بارے میں بحث وگفتگو کو نظر انداز کر دیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تکبر اور تواضع کے باہمی تعلق ضدین یعنی دو متضاد چیزوں جیسا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ دونوں وجودی صفات ہیں۔ تکبر بھی ایک ایسی صفت ہے جو بعض انسانوں میں وجود رکھتی ہے اور تواضع بھی ایک ایسی صفت ہے جو بعض انسانوں میں وجود رکھتی ہے۔ ان کا باہمی تعلق وجود اور عدم جیسا نہیں ہے کہ اگر ایک کے بارے میں بات ہو رہی ہو تو لازماً دوسرے کی نفی ہو جائے۔

احادیث میں بھی اس معنی کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ضَادُّوا الْكِبْرَ بِالتَّوَاضُعِ"۔

''تکبر کا مقابلہ تواضع کے ذریعے کرو جو اس کی ضد ہے۔'' (تصنیف غرر الحکم، حدیث:5148)

اس تمہید کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس بحث کا آغاز کرتے ہیں:

1۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے (تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا) جلد ہی اللہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں جو مؤمنین کے سامنے تواضع اور کفار کے سامنے سخت اور طاقتور ہیں''۔ (مائدہ:54)

2۔ وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔

''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو بغیر تکبر کے، آہستگی کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے جاہلانہ انداز میں بات کرتے ہیں تو وہ انہیں سلام کر کے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں''۔(الفرقان:63)

3۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○

''اے رسولؐ! جو مؤمنین تمہاری پیروی کرتے ہیں، ان کے ساتھ تواضع اور مہربانی سے پیش آؤ۔''

تفسیر اور نتیجہ:۔

پہلی آیت میں ان مؤمنین کا ذکر کیا گیا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم فرمایا ہے۔ یہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مومنین کے سامنے متواضع ہیں اور کافروں کے سامنے طاقتور اور قوی ہیں۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

''اَذِلَّةٍ'' ذلول یا ذلیل کی جمع ہے جس کا مصدر ذُل ہے جس کے معنی نرمی، ملائمت اور جھک جانے کے ہیں جبکہ ''اَعِزَّۃ'' عزیز کی جمع ہے جس کا مصدر عزت ہے جس کے معنی شدت کے ہیں۔

جو جانور مکمل طور پر سدھائے ہوئے ہوں اور اپنے مالک کے اشاروں تک کو سمجھتے ہوں، انہیں ذلول کہا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہ کیفیت کسی کے اوپر کسی اور کی طرف سے مسلط کر دی جائے تو اس وقت اس کے معنی منفی ہو جاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر اس لفظ کے معنی منفی نہیں ہیں۔

بہر حال یہ آیت تواضع کی اہمیت اور متواضعین کے مقام کی عظمت کو بخوبی واضح کر رہی ہے۔

دوسری آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی برجستہ اور نمایاں اخلاقی صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ فرقان کی آیات 64 تا 74 میں ان کی بارہ اخلاقی صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ان صفات میں سب سے پہلی صفت تواضع ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح تکبر رذائلِ اخلاقی میں سے خطرناک ہے، اسی طرح تواضع اہم ترین اخلاقی فضیلت ہے۔

''رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں''۔

"وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا"

''ھون'' مصدر ہے جس کے معنی نرمی اور تواضع کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ اسمِ فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس قدر متواضع ہیں کہ گویا عین تواضع ہیں۔ آیت آگے چل کر کہہ رہی ہے:

"وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا"

یعنی' جب جاہل ان سے جاہلانہ انداز میں بات کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔'

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کے تواضع کی کیفیت بیان ہوئی ہے:

"وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا"

''یہ راتوں کو اپنے رب کے حضور حالتِ سجدہ و قیام میں ہوتے ہیں''۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ ''يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا'' سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ زمین پر چلتے وقت ان کی چال میں تواضع ہوتی ہے بلکہ اس سے مقصود ان کی زندگی کے تمام شعبوں سے تکبر کے چلن کی نفی ہے جو ان کے سادہ ترین کام یعنی چلنے سے ظاہر ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی اخلاقی خصوصیات کا اظہار اس کی حرکات وسکنات سے ہوتا ہے۔

بلاشبہ عباد الرحمٰن کی پہلی خصوصیت تواضع ہے جو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاکم ہے۔اسی طرح اگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورۂ اسرأ کی آیت 37 میں اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اللہ کو حکم دیا کہ:

"وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ"

''زمین پر تکبر کے ساتھ نہ چلو''۔

تو اس کے معنی صرف چلنے میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام کاموں میں تواضع اختیار کرنے میں ہیں جو اللہ کی بندگی کی نشانی ہے۔

تیسری آیت میں رسولؐ اللہ کو مومنین کے ساتھ تواضع اور محبت کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ"

''خْفِضْ''، ''خَتْم'' کے وزن پر ہے جس کے معنی ''نیچے کرنا'' ہیں۔''جَناح'' پروں کو کہتے ہیں۔ بنابرایں ''پروں کو جھکا لینا'' محبت آمیز تواضع کے اظہار کا کنایہ ہے، جس طرح پرندے اپنے چوزوں سے محبت کا اظہار کرتے وقت اپنے پروں کو پھیلا کر جھکا لیتے ہیں تا کہ وہ حوادث سے اور گم ہونے سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو حکم دے رہا ہے کہ مومنین کے ساتھ ایسی ہی محبت آمیز تواضع کے ساتھ پیش آئیں۔

اس لطیف اور پُرمعنی تعبیر کے استعمال سے ایک مختصر عبارت میں بہت سے نکات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو مومنین کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آنے کا حکم دے رہا ہے تو اُمت کے دیگر افراد کیلئے اس حکم کی کتنی اہمیت ہوگی، اس لئے کہ رسولؐ اللہ ساری اُمت کیلئے اُسوۂ عمل ہیں۔

سورۂ حجر، آیت 88 میں بھی اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اللہ کو ان الفاظ میں یہ حکم دیا ہے:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ"

الفاظ کے مختصر فرق کے ساتھ اولاد کو بھی ماں باپ کے ساتھ اسی طرح پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اسرا میں ہے:

"وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ"

''اپنے پر رحمت کی وجہ سے ان (والدین) کیلئے جھکا دو (اور ان کے ساتھ احترام، محبت اور تواضع کے ساتھ پیش آؤ)''۔ (بنی اسرائیل:24)

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنِ مجید نے تکبر اور استکبار کی مذمت کے ساتھ ساتھ اس کے نقطۂ مقابل یعنی تواضع اور فروتنی کی بھی مختلف الفاظ میں تعریف وستائش کی ہے۔

تواضع احادیث کی روشنی میں

اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کے منابع حدیث میں تواضع کی اہمیت کے بارے میں بہت زیادہ احادیث پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض احادیثِ متواضع افراد کی علامات یا دوسرے الفاظ میں تواضع کے ثمرات اور اس کے آداب وحدود کے بارے میں ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"مَالِي لَا أَرَىٰ عَلَيْكُمْ حَلَاوَةَ الْعِبَادَةِ؟ قَالُوا وَمَا حَلَاوَةُ الْعِبَادَةِ؟ قَالَ التَّوَاضُعُ"۔

''کیا وجہ ہے کہ میں تم میں عبادت کی حلاوت کو نہیں پاتا؟ لوگوں نے پوچھا، یارسولؐ اللہ! عبادت کی حلاوت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تواضع''۔ (میزان الحکمہ 4۔ حدیث 81825۔ المحجۃ البیضاء، 222:6)

ظاہر سی بات ہے کہ عبادت کی روح یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع اختیار کرے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع کی لذت اور حلاوت چکھ لے، وہ لوگوں کے سامنے بھی متواضع رہے گا۔

2۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عَلَيْكَ بِالتَّوَاضُعِ فَإِنَّهُ مِنْ أَعْظَمِ الْعِبَادَةِ"

''تواضع اختیار کرو، اس لئے کہ یہ سب سے بڑی عبادت ہے''۔ (بحار الانوار، 119:72)

3۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:

"التَّوَاضُعُ نِعْمَةٌ لَا يُحْسَدُ عَلَيْهَا"۔

''تواضع ایک ایسی نعمت ہے جس پر کوئی حسد نہیں کرتا''۔ (تحف العقول:363)

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو جو نعمت بھی نصیب ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اس کے بہت سے حاسد پیدا ہوجاتے ہیں۔

بعض اوقات یہ حسد اس قدر شدید ہوتا ہے کہ جس شخص کو نعمت میسر ہوتی ہے، اس کی زندگی بھی تنگ ہوجاتی ہے۔لیکن تواضع اس سے مستثنیٰ ہے، یہ ایسی نعمت ہے جس کی وجہ سے کوئی کسی سے حسد نہیں کرتا۔

4۔ اس بحث کو ہم رسولؐ اللہ کی اس حدیث کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں: (مکارم الاخلاق:51)

"یُبَاهِی اللهُ تَعَالٰی الْمَلَائِکَةَ بِخَمْسَةٍ۔ بِالْمُجَاهِدِیْنَ، وَالْفُقَرَاءِ، وَالَّذِیْنَ یَتَوَاضَعُوْنَ لِلّٰهِ تَعَالٰی، وَالْغَنِیِّ الَّذِیْ یُعْطِیالْفُقَرَاءَوَللاٰ یَمُنُّ عَلَیْهِمْ"۔

''اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے پانچ قسم کے افراد پر فخر کرتا ہے: مجاہدین (جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں)،فقراً (جو دنیا کے بدلے اپنا دین نہیں بیچتے)، جو اللہ کی خوشنودی کیلئے تواضع کرتے ہیں، وہ دولت مند جو احسان جتلائے بغیر فقراً کی مدد کرتے ہیں اور وہ جو تنہائی میں اللہ کے خوف سے گریہ کرتے ہیں۔''

تواضع کے مثبت اثرات کے بارے میں بھی معصومینؑ سے متعدد روایات ہم تک پہنچی ہیں:

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثَمَرَةُ التَّوَاضُعِ الْمَحَبَّةُ وَثَمَرَةُ الْکِبْرِ الْمَسَبَّةُ"۔

''تواضع کا ایک پھل محبت ہے جبکہ تکبر کا پھل لوگوں کی نفرت ہے۔'' (غرر الحکم، 6413، 6414)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"بِخَفْضِ الْجَنَاحِ تَنْتَظِمُ الْاُمُوْرَ"۔

''تواضع اور محبت سے معاملات منظم ہوتے ہیں''۔ (غرر الحکم: 4302)

ظاہر سی بات ہے کہ معاشرے کے نظم وضبط اور معاشرتی اُمور کی انجام دہی باہمی تعاون اور محبت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔جب لوگوں میں تکبر پایا جائے اور ہر ایک اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھ رہا ہو تو تعاون اور محبت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔افسروں اور حاکم میں سے بھی وہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ تکبر کی بجائے تواضع کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"اَلتَّوَاضُعُ لَایَزِیْدُ الْعَبْدَ اِلَّا رِفْعَةً اُتَوَاضَعُوْا یَرْفَعْکُمُ اللهُ۔ (کنز العمال: 5719)

''تواضع سے انسان کی بلندی میں اضافہ ہوتا ہے، تواضع اختیار کرو، اللہ تمہیں سربلند کرے گا۔''

احادیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ تواضع، قبولیتِ عبادت کی شرط ہے۔ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: (بحار الانوار، 72:121)

"اَلتَّوَاضُعُ اَصْلُ کُلِّ خَیْرٍ نَفِیْسٍ وَمَرْتَبَةٌ رَفِیْعَةٌ۔۔۔۔۔وَمَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ شَرَّفَهُ اللهُ عَلٰی

كَثِيْرٍ مِنْ عِبَادِهٖ۔۔۔۔۔ وَلَيْسَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عِبَادَةٌ يَقْبَلُهَا وَيَرْضٰهَا اِلَّا وَبَابُهَا التَّوَاضُعُ، وَلَايَعْرِفُ مَافِي مَعْنٰى حَقِيْقَةِ التَّوَاضُعِ اِلاَّ الْمُقَرَّبُوْنَ الْمُسْتَقِلِّيْنَ بِوَحْدَانِيَّتِهٖ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً وَاِذَاخَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلاٰمًا"۔

''تواضع ہرعمدہ نیکی اور بلند مرتبے کی بنیاد ہے۔۔۔۔۔۔جوتواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے بہت سے لوگوں پر بلندی عطا فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ تواضع ہی کی بدولت کسی عبادت کو پسند اور قبول فرماتا ہے اور تواضع کی حقیقت کو صرف اللہ کے مقرب بندے ہی پاسکتے ہیں جو توحید میں مستقل ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''رحمن کے بندے زمین پر آہستہ اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (باوقار انداز میں) سلام کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔''

ہم اس بحث کا اختتام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس حکمت آمیز ارشاد پر کرتے ہیں:

"بِالتَّوَاضُعِ تَعْمُرُ الْحِكْمَةُ لَا بِالتَّكَبُّرِ، كَذٰلِكَ فِي السَّهْلِ يَنْبُتُ الزَّرْعُ لَا فِي الْجَبَلِ"۔

''حکمت تواضع کی بدولت آباد ہوتی ہے، تکبر سے نہیں، جس طرح کھیتی سنگلاخ چٹانوں میں نہیں بلکہ نرم زمین میں اُگتی ہے''۔(بحارالانوار، 62:2)

مختصر یہ کہ تواضع انسان کی علمی اور ثقافتی زندگی پر بھی مثبت اثر ڈالتی ہے اور معاشرتی زندگی پر بھی، اس لئے کہ متواضع انسان معاشرے میں احترام اور محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اسی طرح تواضع انسان اور اللہ تعالیٰ کے تعلق پر بھی مثبت اثر ڈالتی ہے، اس لئے کہ تواضع عبادت کی روح اور اس کی قبولیت کی شرط ہے۔

تواضع کی علامات بھی احادیث میں بیان ہوئی ہیں، امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثَلَاثٌ حُثَّ رَأْسَ التَّوَاضُعِ: اَنْ يَبْدَءَ بِالسَّلَامِ مَنْ لَقِيَهُ، وَيَرْضٰى بِالدُّوْنِ مِنْ شَرَفِ الْمَجْلِسِ وَيَكْرَهُ الرِّيَاوَالسُّمْعَةَ"۔ (کنزالعمال، حدیث: 8506)

تین چیزیں تواضع کی بنیاد ہیں، ایک یہ کہ انسان ہر ملنے والے کو سلام میں پہل کرے، دوسرے یہ کہ مجلس میں نمایاں جگہ سے کم تر جگہ پر راضی ہو۔تیسرے یہ کہ انسان ریا اور سمعہ کو ناپسند کرے۔

بعض احادیث میں تواضع کی کچھ اور علامات بھی بیان کی گئی ہیں جن میں علمی برتری ثابت کرنے کیلئے بحث کو ترک کرنے

اورلوگوں کی زبان سے تعریف سننے کی خواہش نہ ہونا بھی شامل ہیں۔(اصول کافی 2۔122)

تواضع کی تعریف:

تواضع کا اصلی مادہ ''وضع'' ہے جس کے معنی کسی چیز کو نیچے رکھنے کے ہیں۔ بچے کی پیدائش کو بھی اسی مناسبت سے وضعِ حمل کہا جاتا ہے۔نقصان اور خسارے کیلئے بھی ''وضیعہ'' کہا جاتا ہے۔اخلاقی صفت کی حیثیت اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اپنے معاشرتی اور مرتبہ سے چھوٹا ظاہر کرے۔اس کے برعکس تکبر یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے معاشرتی مقام سے بڑا ظاہر کرے۔

مرحوم نراقی علم اخلاق پر اپنی معروف کتاب ''معراج السعادت'' میں تواضع کی تعریف میں یوں لکھتے ہیں:

''تواضع سے مراد وہ کسر نفسی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو دوسروں سے برتر دیکھنا پسند نہ کرے۔اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ اپنے کردار و گفتار میں ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جو دوسروں کی تعظیم اور احترام پر مبنی ہوتا ہے''۔(معراج السعادہ:300)

فارسی اور اُردو میں استعمال ہونے والا لفظ ''فروتنی'' اس مفہوم کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا:

"مَاحَدُّالتَّوَاضُعِ الَّذِیْ اِذَافَعَلَهُ الْعَبْدُ کَانَ مُتَوَاضِعًا؟ فَقَالَ: التَّوَاضُعُ دَرَجَاتٌ مِنْهَا اَنْ یَعْرِفَ الْمَرْءُ قَدْرَنَفْسِهِ فَیُنَزِّلَهَابِقَلْبٍ سَلِیْمٍ لَایُحِبُّ اَنْ یَأْتِیَ اِلٰی اَحَدٍاِلَّامِثْلَ مَایُؤْتٰی اِلَیْهِ، اِنْرَأٰی سَیِّئَةً دَرَاَهَابِالْحَسَنَةِ، کَاظِمُ الْغَیْظِ، عَافٍ عَنِ النَّاسِ ، وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ"۔(کافی،2:124)

''تواضع کی وہ حد کیا ہے جسے اختیار کر کے انسان متواضع کہلاتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: تواضع کے مختلف درجات ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے مقام اور مرتبہ کو پہچانے اور بخوشی اسے تسلیم کرے۔پھر وہ یہ پسند کرتا ہے کہ جس طرح دوسرے اس کا احترام کرتے ہیں، وہ بھی اس کا اسی طرح احترام کرے (اور جن باتوں کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، انہیں دوسروں کی شان کے بھی خلاف سمجھے)۔

اگر ان سے کوئی برائی دیکھے تو اس کا نیکی سے جواب دے، ان کے خلاف اپنا غصہ پی لے۔لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرے اور اللہ ایسے نیک لوگوں کو پسند فرماتا ہے''۔

جو کچھ ان احادیث میں بیان ہوا ہے، درحقیقت وہ تواضع کی علامات ہیں جن کی روشنی میں تواضع کی تعریف بھی بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

تواضع اور انسانی احترام:۔

ان مباحث میں عام طور پر لوگ افراط کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔بعض لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ تواضع کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل وحقیر کردے اور ایسے اعمال انجام دے جن کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں گر جائے اور لوگ اس سے بدگمان اور متنفر ہوجائیں۔بعض صوفیاؑ کے بارے میں یہ بات نقل کی گئی ہے جب کسی علاقے میں اُن کی نیکی کا چرچا پھیل جاتا تھا تو وہ ایسے اعمال کے مرتکب ہوجاتے تھے جن کی وجہ سے ان کی عزت خراب ہوجاتی تھی۔ان کا تصور یہ تھا کہ یہ ریاضت اور تواضع کی ایک قسم ہے۔

اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ تواضع کے نام پر کوئی شخص اپنی تحقیر اور تذلیل کرے اور لوگوں کی نظر میں اپنی عزت ووقار کو داغدار کرے۔تواضع میں یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ انسان اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔اگر تواضع صحیح طور پر انجام پائے تو اس کے یہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے بلکہ معاشرے میں انسان کے مقام ومرتبہ اور عزت ووقار میں اضافہ ہوتا ہے۔اسی حقیقت کو حضرت علیؑ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"بِالتَّوَاضُعِ تَكُونُ الرِّفْعَةُ"

''تواضع سے انسان کو رفعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے''۔(فہرست موضوعی غرر الحکم، 405:7)

مرحوم فیض کاشانی ''غایۃ الریاضہ فی خلق التواضع''یعنی''ریاضت میں تواضع کی حد'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''تمام اخلاقی صفات کی طرح تواضع میں بھی افراط وتفریط واعتدال کی حدیں پائی جاتی ہیں۔اس کی حد افراطِ تکبر ہے،حدِ تفریط ذلت وخواری کو قبول کرنا اور حدِ اعتدال تواضع ہے۔جو چیز فضیلت شمار ہوتی ہے،وہ یہ ہے کہ انسان ذلت میں گرے بغیر،اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت چھوٹا ظاہر کرے۔''

اس کے بعد وہ ایک مثال بیان کرتے ہیں:

''جو شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے جیسے افراد یا اپنے ساتھیوں پر برتری حاصل کرے اور ان سے آگے نکل جائے، وہ متکبر ہے۔ جو اپنے آپ کو ان سے پیچھے رکھتا ہے، وہ متواضع ہے۔لیکن اگر ایک پھٹے ہوئے (جوتے وغیرہ) مرمت کرنے والا کسی عالم کے پاس جائے اور وہ عالم اس کے احترام میں کھڑا ہوجائے اور چلتے وقت اس کے جوتے سیدھے کرے،تو یہ تواضع نہیں بلکہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے اور یہ قابلِ تعریف نہیں ہے۔مناسب یہ ہے کہ انسان ہر کسی کا اُس کے مقام ومرتبہ کے مطابق حدِ اعتدال میں احترام کرے۔عالم کا اس طرح احترام کرے جو عالم کیلئے مناسب ہے اور دوسروں کا بھی اُن کے مقام ومرتبہ کے مطابق احترام کرے۔''

تیسرا باب

حرص اور قناعت

تمہید:

ہم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی یہ حدیث بیان کر چکے ہیں جس میں آپؑ نے فرمایا کہ:

''گناہ کا پہلا سبب تکبر ہے جس کی وجہ سے ابلیس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور کافر ہو گیا۔ اس کے بعد گناہ کا دوسرا سبب حرص ہے جس کی وجہ سے آدم وحوا، اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ ان کے بعد گناہ کا سبب حسد تھا جس کی وجہ سے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا''۔ (سفینۃ البحار، 458:2)

صرف حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں ہی نہیں بلکہ تمام انبیاؑ کی تاریخ میں حرص کے منفی نتائج واضح وآشکار نظر آتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ اور دورِ حاضر میں مختلف اقوام کے حالات کا مطالعہ ومشاہدہ کریں تو یہ حقیقت بخوبی نظر آتی ہے کہ حرص یعنی ''زیادہ سے زیادہ کی خواہش'' مختلف قسم کے جرائم، خونریز جنگوں، قتل وغارت اور انسانی اقدار کی پامالی کا بنیادی سبب ہے۔

اس کا نقطۂ مقابل قناعت ہے جو امن، عدل، صلح، محبت اور اخوت کا سبب ہے۔

اس کتاب میں فضائل ورذائل اخلاق کی جو ترتیب، قرآن میں انبیاؑ کے حالات وواقعات کی روشنی میں ہم نے اختیار کی ہے، اس کے مطابق ہم نے حرص کو دوسری صفتِ رذیلہ قرار دیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے حالات میں یہودیوں، مشرکینِ عرب اور زمانۂ رسولؐ کے ضعیف الایمان مسلمانوں میں بھی نظر آتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

1. فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۛ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

''پس شیطان نے اسے وسوسہ میں ڈالا اور کہا: اے آدمؑ! کیا میں تمہیں ہمیشہ کی زندگی اور لازوال حکومت کا درخت دکھاؤں؟ پس ان دونوں نے اس میں سے کھایا (اور جنت کے لباس ان کے بدن سے اُتر گئے) اور ان کی شرمگاہیں کھل گئیں اور وہ اپنے آپ کو ڈھانپنے کیلئے درخت کے پتوں کا لباس پہننے لگے اور آدمؑ نے اپنے

رب کی نافرمانی کی اس کے اجر سے محروم ہوگیا''۔(طٰہٰ:120،121)

2۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۸۵﴾

''اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔اُس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح نشانی آ چکی ہے۔لہٰذا تم ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کیا کرو اور معاشرے میں اصلاح ہوجانے کے بعد اس میں بگاڑ پیدا نہ کرو، اگر تم مؤمن ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔''

3۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِىَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۔

''یہ میرا بھائی ہے۔اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں جبکہ میرے پاس ایک ہے لیکن وہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی میں اُسے دے دوں اور گفتگو میں وہ مجھ پر غالب آ گیا۔(داؤد نے) جواب دیا: اس نے اپنی بھیڑوں میں اضافے کیلئے تم سے تمہاری بھیڑ مانگ کر تم پر ظلم کیا اور زیادہ تر دوست ایک دوسرے کے خلاف ظلم وزیادتی کرتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے اور وہ بہت کم ہیں اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا۔پس اس نے استغفار کی اور سجدہ میں گر گیا اور توبہ کی''۔(ص:23،24)

4۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور یقیناً تم انہیں سب لوگوں سے، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی بڑھ کر زندگیِ دنیا کا حریص پاؤ گے۔ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار سال زندگی ملے۔حالانکہ اگر اسے یہ زندگی مل جائے تو بھی وہ اسے عذاب سے نہ بچا سکے گی اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔''(بقرہ:96)

5۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾

''بے شک انسان حریص اور کمزور پیدا کیا گیا ہے، جب کوئی بُرائی اس کو پہنچتی ہے تو بے تاب ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اسے دوسروں تک پہنچنے سے مانع ہوتا ہے(اور بخل کرتا ہے)''۔(معارج:19 تا21)

6۔ وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوًا انْفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا وَتَرَكُوۡكَ قَآئِمًا ؕ قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ اللَّهۡوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱﴾

''اور جب وہ تجارت یا لہوولعب کو دیکھتے ہیں تو تمہیں کھڑا چھوڑ کر ان کی طرف بھاگ پڑتے ہیں، ان سے کہو جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہوولعب اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے''۔(سورہ جمعہ 11۔)

7۔ وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ﴿۱﴾ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ﴿۳﴾

''ہلاکت ہے ہر عیب جو اور تمسخر کرنے والے کیلئے جو مالِ فراواں جمع کرتا رہتا ہے اور اس کو گنتا رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال و دولت اُسے ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔

تفسیر اور نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت آدم وحوا کے واقعہ کے بارے میں ہے۔قرآنی آیات کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ وحوا کو جنت میں سکونت دی اور انہیں ایک مخصوص درخت کے نزدیک جانے سے منع کر دیا اور انہیں شیطان کے شر اور اس کے وسوسوں سے خبردار بھی کر دیا۔لیکن آخر کار شیطانی وسوسے اپنا کام دکھا گئے۔آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نظر انداز کر دیا اور سجرۂ ممنوعہ کا پھل کھالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنت کی آرام وآسائش کی زندگی سے نکال دیئے گئے اور مشکلات سے بھرپور دُنیوی زندگی میں گرفتار ہو گئے۔

مذکورہ بالا آیات اسی حقیقت کو اس انداز میں بیان کر رہی ہیں:

''شیطان نے آدم کو ورغلایا اور کہا: اے آدم کیا میں تمہیں ہمیشہ کی زندگی اور لازوال حکومت کا درخت دکھاؤں؟'' (شیطان نے اس درخت کا تعارف ایسے درخت کی حیثیت سے کروایا جس کا پھل کھا لینے کے نتیجہ میں عیش وعشرت کی لازوال زندگی حاصل ہو جاتی ہے)۔آخر کار ان دونوں نے اس کا پھل کھالیا(اور جنت کا لباس ان کے بدن سے اُتر گیا) اور ان کی شرمگاہیں آشکار ہو گئیں اور انہوں نے درختوں کے پتوں کو سی کر لنگیاں بنالیں اور آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کے اجر سے

محروم ہوگیا۔"

" فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۛ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ "

اس آیت کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس چیز نے آدمؑ کو شیطان کے جال میں پھنسایا، وہ حرص ہی تھی۔

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مادی فوائد سمیٹنے کی خواہش اور حرص وطمع نسلِ انسانی کی بربادی کا ایک بڑا عامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں تین چیزوں کو کفر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے: تکبر جو شیطان کی سرکشی کا سبب بنا، حرص جو آدمؑ کے گناہ کا سبب بنا اور حسد جو قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل کا سبب بنا۔

یہ بات صحیح ہے کہ آدم کو شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے سے منع کرنا، نہی تحریمی نہیں تھا اور اس کی مخالفت گناہِ مطلق نہیں بلکہ ترکِ

اولیٰ تھا[1]۔ بالفاظِ دیگر یہ ایک ایسی ممانعت تھی جس طرح طبیب کسی مریض کو کوئی غذا کھانے سے منع کر دے۔ لیکن بہر حال آدمؑ سے

[1] علماء کے درمیان اس مسئلہ پر اختلاف ہے کہ حضرت آدمؑ نے شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا کر گناہ کیا یا نہیں؟ شیعہ علمأ زیادہ تر یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ گناہ نہیں بلکہ ترکِ اولیٰ تھا۔ لیکن شیعہ علما ٔ کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حضرت آدمؑ کا یہ فعل گناہ تھا۔ ان دونوں گروہوں کے اختلافِ رائے کی بنیادی وجہ فہمِ قرآن میں ان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اوّل الذکر گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیأ ورسل قبل از نبوت ورسالت بھی معصوم ہوتے ہیں، لہٰذا جن آیات واحادیث میں ان کی طرف کسی گناہ کی نسبت دی گئی ہے، ان کی تاویل کر کے وہ گناہ سے ترکِ اولیٰ مراد لیتے ہیں۔ دوسرا گروہ پہلے سے بنائے ہوئے عقائد کی روشنی میں آیات کی تاویل کی بجائے آیات کے واضح اور صریح بیانات کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ انبیأ ورسل کے قبل از نبوت ورسالت معصوم ہونے پر کوئی قرآنی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ وہ حضرت آدمؑ کے واقعہ میں استعمال ہونے والے الفاظ سے استدلال کرتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، مثلاً حضرت آدمؑ کو شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ممانعت ان الفاظ میں کی گئی:

"وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"۔

''تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے''۔ (بقرہ:35)

اگر قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی ممانعت کیلئے ''قریب مت جاؤ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس سے مراد عام ممانعت نہیں بلکہ اس کا مقصد ممانعت پر زور دینا اور اس میں تاکید پیدا کرنا ہے، مثلاً ''لاتقربوالزنا''، ''زنا کے قریب نہ جاؤ''۔ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ''زنا کے قریب نہ جاؤ، یہ حد سے بڑھا ہوا گناہ اور بہت بُرا راستہ ہے'' (بنی اسرئیل:32)۔ ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى''۔ ''جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ''۔ (نسأ:43) ''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ'' ''یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ'' (بنی اسرائیل:34) ''وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ'' ''حالتِ حیض میں عورتوں کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں'' (بقرہ:222) ممنوعہ کا پھل کھانا حرام اور گناہ نہ ہوتا تو اس کیلئے ''لاتقربا'' کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ اسی طرح ''وَلَا تَقْرَبَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'' ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے کے الفاظ بھی نہی اور ممانعت کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ اس درخت سے نہ کھاؤ ورنہ تم ترکِ اولیٰ کے مرتکب ہو جاؤ گے؟ اسی طرح سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ آیت ''وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى''۔ ''آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گیا'' میں ''عَصٰى'' اور غَوٰى'' کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ''عَصٰى'' معصیت سے فعلِ ماضی ہے جس کے معنیٰ ہیں ''نافرمانی''۔ قرآن شریف ''عَصٰى'' کا لفظ متعدد مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ شدید نافرمانی کیلئے آیا ہے جیسے ''فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ'' ''پس فرعون نے رسول کی نافرمانی کی'' (مزمل:16)۔ ''وَتِلْكَ عَادٌ ۗ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ''۔ ''قومِ عاد نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی''۔ (ھود:59) بنابرایں ''عَصٰى'' کے معنیٰ ترکِ اولیٰ کرنا ہر گز درست نہیں ہے، خاص طور جب اس کے بعد ''فَغَوٰى'' کا لفظ بھی آرہا ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو بارگاہِ قرب سے دھتکارا تو اُس نے کہا: ''اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ'' ''میں تیرے خالص بندوں کے سوا ان سب کو ضرور بہکا کر چھوڑوں گا'' (ص:83) آدم کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ''وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى''، ''آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور بہک گئے''۔ اب ظاہری بات ہے کہ ''لَا تَقْرَبَا''، "فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"، "وَعَصٰى" اور "فَغَوٰى" جیسے الفاظ جس ممانعت میں استعمال ہوئے ہوں، انہیں نہی تحریمی نہ ماننا اور اس نہی کی مخالفت کو ''ترکِ اولیٰ'' کا نام دینا زیادتی ہے۔ اگر حضرت آدمؑ کا فعل ''ترکِ اولیٰ'' ہوتا تو اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے، اپنی کتابِ حکیم میں ''ترکِ اولیٰ'' پر دلالت کرنے والے الفاظ استعمال کرتا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں کو عزت کا ہم سے زیادہ خیال ہے (مترجم)۔

توقع نہیں تھی کہ وہ ترکِ اولیٰ سے مرتکب ہوتے۔لیکن حرص، اگرچہ ہلکی اور کمزور شکل میں، ان کے دل میں موجود تھا جو اس عظیم خطا کا سبب بن گئی۔ یہ ایک ایسی خطا تھی جس کا نتیجہ نسلِ آدمؑ ابھی تک دنیا کی سخت اور دشوار زندگی کی صورت میں بھگت رہی ہے۔ یہ حرص کے بارے میں قرآن کی واضح ترین تنبیہ ہے۔دوسری آیت حضرت شعیبؑ کی قوم کے بارے میں ہے جن کی قوم کو حرص نے اپنے رسول کی ہدایات اور تعلیمات کے قبول کرنے سے روک دیا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے:

''ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔اس نے ان سے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانی آ چکی ہے۔ بنابرایں، ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کے اموال میں کمی نہ کیا کرو اور معاشرے میں اصلاح ہو جانے کے بعد بگاڑ پیدا نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے''۔

''وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ۔قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ۔قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَیِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَوۡفُوا الۡكَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ۔ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔''

اس آیت کی روشنی میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا پہلا گناہ شرک اور بت پرستی اور اس کے بعد ناپ تول میں کمی، لوگوں کے حقوق ضائع کرنا اور معاشرے میں بگاڑ اور خرابی پیدا کرنا۔ دنیا کے معاملہ میں ان کا حرص اس قدر زیادہ تھا کہ انہوں نے حضرت شعیبؑ کو صاف صاف کہہ دیا کہ اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں اپنی مرضی سے تصرف نہ کریں؟

قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُكَ تَاۡمُرُكَ اَنۡ نَّتۡرُكَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ ○(ھود: 87)

اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناپ تول میں کمی سے حضرت شعیبؑ کی قوم کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ معاشرے میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا تھا، لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد کم ہوتا تھا اور ان کے اموال میں کمی ہوتی تھی۔ بنابرایں حرص کا نتیجہ اُلٹا ہوا کرتا ہے۔

تیسری آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس میں حرص کا قابلِ نفرت اور کریہہ چہرہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دو بھائی حضرت داؤدؑ کے پاس مقدمہ لے کر آتے ہیں۔ایک کہتا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے۔اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک بھیڑ ہے مگر یہ مُصر ہے کہ میں اپنی بھیڑ بھی اسے دے دوں اور بحث میں بھی یہ مجھ پر غالب آ گیا ہے:

"اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ"

حضرت داؤد یہ سن کر ناراض ہوئے اور کہا کہ ''تمہارے بھائی نے تم سے بڑا ظالمانہ مطالبہ کیا ہے اور صرف تم ہی نہیں بلکہ اکثر لوگ اپنے دوستوں کے ایسے ہی ظلم کا نشانہ بنتے ہیں۔

آیت کے ذیل میں ہے کہ معاً حضرت داؤد علیہ السلام کو ایسا لگا کہ ہم نے اسے امتحان میں ڈالا ہے۔انہوں نے اپنے رب سے مغفرت طلب کی، سجدہ میں گرے اور توبہ کی۔

یہاں یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ اس واقعہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا پہلو کونسا تھا؟ موجودہ تحریف شدہ تورات میں ہے کہ اگرچہ حضرت داؤدؑ کی بہت سی بیویاں تھیں مگر وہ اپنے ایک جرنیل اوریا کی بیوی پر فریفتہ تھے اور چاہتے تھے کہ اوریا اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور وہ اس سے شادی کرلیں۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک بے بنیاد افسانہ ہے جو اخلاقی لحاظ سے ایک عام انسان کی شان کے بھی خلاف ہے، کجا یہ کہ ایک نبی کے بارے میں اس کا تصور کیا جائے۔

مسلمان مفسرین میں اس واقعہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش ان کے اندازِ عدالت میں تھی کہ اُنہوں نے دوسرے فریق کا مؤقف سنے بغیر یہ کہہ دیا تھا کہ ''تمہارے بھائی نے تم سے بڑا ظالمانہ مطالبہ کیا ہے''۔اگرچہ حضرت داؤدؑ کا فیصلہ صحیح تھا مگر اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ ترکِ اولیٰ پسند نہ آیا۔اُس نے مؤاخذہ کیا اور انہوں نے بھی اپنی خطا سے، جو اگرچہ ترکِ اولیٰ تھی، توبہ کرلی۔

اس داستان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جب حرص انسان پر غالب آجائے تو وہ اپنے کمزور بھائی پر بھی اس حد تک ظلم کر جاتا ہے جس کی ہر باضمیر انسان مذمت کرتا ہے۔

چوتھی آیت میں دُنیوی زندگی کے بارے میں یہودیوں کی حریصانہ ذہنیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے:

''تم انہیں سب لوگوں، حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص پاؤ گے۔''

ولتجدنهم احرص الناس علیٰ حیوٰة ومن الذین اشرکوا

یعنی ان کی حالت یہ ہے کہ مال و دولت جمع کرنے میں، دنیا پر قبضہ کرنے میں ہر چیز پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے میں وہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص ہیں۔حالانکہ مشرکین کسی آسمانی اور الٰہی دین کے پابند نہیں ہیں جبکہ یہودی جس آسمانی دین کے پیروکار ہونے کے مدعی ہیں وہ حرص سے معنی کرتا اور ان کی یہ حالت ہے کہ بے دین افراد سے بھی بڑھ کر حریص ہیں۔ان کے حرص کی شدت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ ہزار سال اس دنیا میں زندہ رہے، خواہ زیادہ مال و دولت جمع کرنے کی غرض سے یا اپنے ان مظالم اور گناہوں کی سزا سے بچنے کیلئے جو انہوں نے دولت جمع کرنے کیلئے کئے، وہ لمبی عمر کے

آرزومند نظر آتے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو دور حاضر کے یہودیوں میں یہ صفت رذیلہ گزشتہ نسلوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی دولت میں اضافہ کیلئے ہر قسم کا جرم کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے بڑی بڑی خونی جنگیں چھیڑنا، فتنہ وفساد کی آگ کو ہوا دینا، پڑوسی ملک کے درمیان جنگ کی آگ بھڑکانا، غرض اپنا اسلحہ بیچنے کیلئے اپنی دولت میں اضافہ کرنے کیلئے منشیات بیچنا، جھوٹا پروپیگنڈہ کرنا، غرضیکہ کسی بھی جرم کا ارتکاب ان کیلئے مشکل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص حرص کے تباہ کن نتائج کا صحیح معنوں میں جائزہ لینا چاہتا ہو تو یہودیوں کے قومی کردار کا مطالعہ کرے۔

اس آیت میں لفظ ''حیوٰۃ'' استعمال ہوا ہے جو اسم نکرہ ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی نظر میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے، وہ صرف زندگی ہے خواہ انسانی زندگی ہو یا حیوانی یا درندوں جیسی زندگی اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت صرف یہودیوں کی نفسیات کی عکاسی نہیں کر رہی بلکہ سب لوگوں کو خبردار کر رہی ہے کہ حرص اور دنیا پرستی کے نتائج کے بارے میں غور وفکر کریں، ایسا یہ ہو کہ وہ بھی انہی گردابوں میں پھنس جائیں جن میں یہودی پھنسے ہوئے ہیں۔

قرآن شریف میں ہے کہ یہودیوں نے بہت سے انبیاء کو قتل کیا۔ ان کے اس فعل کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ انبیاء کو اپنے ناجائز مفادات کے حصول کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ کتاب اللہ کی آیات میں انہوں نے جو تحریفات کیں ان کی بھی یہی وجہ تھی۔

پانچویں آیت میں کلی طور پر انسان کے حریص اور کم ہمت ہونے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اَنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعاً ۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا''۔

انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے کوئی برائی پہنچتی ہے تو بے تابی کرتا ہے اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو بخل کرتا ہے دوسروں تک فائدہ پہنچنے سے روکتا ہے۔

مفسرین نے ''هَلُوْع'' کے متعدد معنی بیان کیے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب یا باہم لازم وملزوم ہیں۔ لسان العرف میں اس کے معنی حرص، جزع، بے صبری اور شدید ترین جزع بیان کیے گئے ہیں۔

التحقیق، مؤلف کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے ہیں جبکہ جزع، حرص اور بے صبری اس کے آثار ونتائج ہیں۔

ان بیانات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لفظ ''هَلُوْع'' تین منفی اخلاقی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حرص، بے تابی اور بخل ہیں۔

''هَلُوْع'' کی جو تشریح بعد والی دو آیات میں بیان ہوئی ہے، وہ اس لفظ کے معنی کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے اور یہ تینوں مفاہیم بھی اس میں آجاتے ہیں، اس لئے کہ جزوع، جزع سے اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ بے تابی یا بے صبری کرنے

والا اور ممنوع، منع سے اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ بخل اور حرص سے کام لینے والا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات حریص، بخیل اور جزوع افراد کی مذمت کر رہی ہیں۔ ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ حرص، بخل کا سبب اور بنیاد ہے، اس لئے کہ حریص کی خواہش ہوتی ہے کہ ہر چیز اپنے لئے جمع کرے۔ اسی طرح بعض اوقات حرص، جزع اور بے صبری کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب حریص کسی چیز کو کھو دیتا ہے۔

یہ آیت کہہ رہی ہے کہ انسان ان صفات کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو سعادت اور کمال کیلئے پیدا کیا ہے تو پھر اس بات کے کیا معنی ہوئے کہ اُس نے انسان کو ان نقائص کے ساتھ پیدا کیا جو انسان کی سعادت اور کمال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں!

اس سوال کے جواب میں بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ صفات ان افراد کی ہیں جو ایمان سے محروم ہیں۔ اگر انسان کو ایمان کی دولت نصیب ہو جائے تو وہ صبر و حوصلہ و سخاوت کا منبع اور سرچشمہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب انسان ایمان سے محروم ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی مشکلات کے سامنے صبر و حوصلہ ہار جاتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی قابلِ اعتماد سہارا نہیں ہوتا جس پر بھروسہ کر کے وہ مشکلات کا مقابلہ کرے۔ اسی طرح ایسا انسان حریص اور بخیل بھی ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اللہ سے کوئی اُمید نہیں ہوتی جس کے ہاتھ میں غیب کے خزانوں کی چابیاں ہیں اور تمام نعمتوں اور برکتوں کے ذخیرے اس کے ہاتھ میں ہیں۔

اس نقطہ نظر کی تصدیق بعد والی آیات سے ہوتی ہے جن میں باایمان نمازیوں کو ان صفات کے حامل انسانوں سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مندرجہ بالا آیت دیگر بہت سی آیات کی طرح، جن میں انسان کو ظلوم اور جہول (احزاب:72)، یؤس و کفور (ہود:9) اور حصولِ نعمت کے وقت سرکشی کرنے والا (علق:6) کہا گیا ہے، دو پہلو رکھتی ہوں، جس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان کمال کی طرف حرکت کرتا ہے تو اعلیٰ علیین کے مقام پر پہنچ جاتا ہے اور جب پستی و انحطاط کا شکار ہوتا ہے تو اسفل السافلین کے مقام پر جا گرتا ہے۔

تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی نے ایک اور نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''هَلوع'' ہونا انسان کی ذاتی خصوصیات میں سے ہے اور حبِ ذات کی ایک شاخ ہے۔ بنیادی طور پر یہ رذائل اخلاقی میں سے نہیں ہے، اس لئے کہ حُبِ ذات جو اِن صفات کا سرچشمہ ہے، واحد ذریعہ ہے جو انسان کو کمال اور سعادت کی طرف قدم اُٹھانے پر مائل کرتا ہے۔ یہ صفات اس وقت مذموم ہوتی ہیں جب انسان صحیح تدبیر کے ساتھ ان کو صحیح سمت میں بروئے کار نہ لائے۔ درحقیقت یہ صفت بھی انسان کی دیگر صفات کی طرح سے ہے جو حدِ اعتدال پر ہوں تو فضیلت ہوتی ہیں اور اگر افراط و تفریط کی طرف نکل جائیں تو رذیلت بن جاتی ہیں۔

بہر حال یہ آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآنِ مجید انسان کو ایمان، نماز، دعا اور انفاق کی طرف دعوت دیتا ہے

تا کہ اسے حرص، بخل اور جزع جیسی آلودگیوں سے پاک کردے۔''

چھٹی آیت میں رسول اللہ ﷺ کے دور کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک سال قحط اور خشک سالی کی وجہ سے مدینہ میں غذائی اجناس کی کمی اور مہنگائی ہوگئی۔ شام سے ایک قافلہ غذائی اجناس لے کر مدینہ میں داخل ہوا۔ اس قافلہ نے مدینہ میں داخل ہوتے ہی اس دور کے طریقہ کے مطابق ڈھول باجے بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ڈھول باجے کی آواز سنتے ہی نومسلموں کا ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کے خطبہ کے دوران ہی اُٹھا اور بازار کی طرف بھاگا، حالانکہ وہ نماز پڑھ کر بھی بازار جا کر خریداری کر سکتے تھے۔

بارہ مردوں اور ایک خاتون کے سوا سب مسجد سے چلے گئے۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں ان حریص مسلمانوں کی سخت مذمت کی گئی جو مالِ دنیا کی محبت میں رسول اللہ ﷺ کو حالتِ خطبہ میں چھوڑ کر بازار کی طرف بھاگ گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ مختصر جماعت بھی، جو مسجد میں رہ گئی تھی، وہی حرکت کرتی تو آسمان سے ان سب پر پتھروں کی بارش ہوتی۔ (تفسیر مجمع البیان و دیگر تفاسیر)

جس لہجے میں آیت نے ان لوگوں کی مذمت کی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی حقیقی ضرورت کی تکمیل کے جذبہ کے تحت یہ حرکت نہیں کی تھی بلکہ بعض ڈھول باجے اور موج میلہ دیکھنے کی غرض سے اور بعض تجارت کی غرض سے مسجد سے بھاگے تھے۔

قرآن شریف اور اس واقعہ کے بارے میں اس طرح تبصرہ فرماتا ہے:

''جب انہوں نے تجارت اور لہو ولعب کو دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف بھاگے اور آپ کو (خطبہ کی حالت میں) کھڑا چھوڑ دیا''۔

"وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ط"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ لہو ولعب اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے''۔

"قَائِمًا ط قُلْ مَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ط وَاللهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ"۔

ممکن ہے یہ حرکت کرنے والوں میں سے بعض لوگ واقعی ضرورت مند ہوں اور انہوں نے ضرورت کے تحت ایسا کیا ہو (اگرچہ نماز کے بعد بھی ان کے پاس اپنی اس ضرورت کی تکمیل کیلئے کافی وقت تھا) لیکن آیت کے لب ولہجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حریص لوگوں کا ایک ٹولہ تھا جو اس نیت سے مسجد سے نکلا تھا تا کہ غذائی اجناس کو خرید کر بعد میں مہنگے داموں بیچ سکیں جبکہ ایک ٹولہ

صرف تماشا دیکھنے کیلئے مسجد سے نکل آیا تھا۔ یوں یہ دونوں گروہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نمازِ جمعہ کی سعادت سے محروم ہو گئے۔

ساتویں اور آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو دوسروں کے عیب تلاش کرتے ہیں اور ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، جو مال و دولت کی وجہ سے فخر و تکبر کرتے ہیں اور تنگ دست مؤمنین کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہیں:

''ہلاکت ہے ہر عیب جوئی کرنے والے، مذاق کرنے والے کے لئے، جو مال جمع کر کے گنتا رہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی دے دے گا''۔

''وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝''

اس آیت میں ''عَدَّدَہٗ'' کا لفظ، جو جہاں اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا پرست افراد اپنی دولت کو گن گن کر جمع کرتے ہیں، وہاں ان کے حرص کی شدت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جس قدر ان کے مال و دولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، وہ اس میں مزید اضافے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے بار بار اسے گنتے رہتے ہیں۔

''الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ'' (جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا)، درحقیقت ان کے ''ھمز'' اور ''لمز'' یعنی عیب جوئی طعنہ زنی کی علت اور سبب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی مال و دولت کی کثرت کے نشے میں وہ اس قدر مست و مغرور ہو گئے ہیں کہ غریب اہلِ ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ان کی تذلیل و تحقیر کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نہ صرف ان کی دولت ہمیشہ رہنے والی ہے بلکہ ان کو بھی ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

دنیا پرستوں کے حالات کا مطالعہ کرنے سے ہمارا ایسے حقائق سے سامنا ہوتا ہے جو عقل کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض افراد کو ہم جانتے ہیں جو ظاہری اور مادی علم میں بھی خاصے ترقی یافتہ تھے مگر ان کا پیسہ جمع کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں تھا۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس دولت کا کیا کرو گے جبکہ تم نے شادی بھی نہیں کی اور نہ کبھی سیر و تفریح کیلئے کسی سفر پر جاتے ہو۔۔۔۔۔۔؟ تو ان کا جواب ہوتا تھا کہ ہم اسی بات پر مطمئن اور خوش ہیں کہ ہماری دولت کی گنتی میں ایک زیرو کا اضافہ ہو جائے۔

مندرجہ بالا آیات اور ان کی تفسیر سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی نظر میں حرص، دنیا پرستی اور مادی دولت و نعمت پر فریفتگی بہت خطرناک، مذموم اور باعثِ شر و فساد ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ خودسازی اور معنوی و اخلاقی ارتقاء و تکامل کی راہ میں پیش آنے والی بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ ہے۔

حرص اور دنیا پرستی احادیث کی روشنی میں

حرص اور اس کے ہم معنی الفاظ احادیث میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور ان کے منفی نتائج کا وسیع پیمانے پر ذکر کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ذیل میں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

1۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اِعْلَمْ يَاعَلِيُّ! اَنَّ الْجُبْنَ وَالْبُخْلَ وَالْحِرْصَ غَرِيْزَةٌ وَاحِدَةٌ يَجْمَعُهَاسُوءُ الظَّنِّ"۔(میزان الحکمہ، 1:588)

''اے علیؑ! جان لو کہ بزدلی، بخل اور حرص ایک ہی چیز ہیں جن کو (اللہ پر) بدگمانی کہا جا سکتا ہے''۔

2۔ اسی بات کو امیر المومنینؑ نے جناب مالک اشتر کے نام اپنے عہد نامہ میں اس طرح بیان فرمایا کہ بخیل، بزدل اور حریص انسان سے مشورہ نہ کرنا۔ پھر آپؑ فرماتے ہیں: (نہج البلاغہ: مکتوب:53)

"اِنَّ الْبُخْلَ وَالْجُبْنَ وَالْحِرْصَ غَرَائِزُ شَتّٰى يَجْمَعُهَاسُوءُ الظَّنِّ بِاللّٰهِ"۔

''بخل، بزدلی اور حرص مختلف خصوصیات ہیں جن کو اللہ کے بارے میں بدگمانی میں جمع کیا جا سکتا ہے''۔

جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کی قدرت اور اس کے وعدوں کی صداقت پر ایمان اور ان اُمور کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہے، وہ کبھی بخل، بزدلی اور حرص میں مبتلا نہیں ہوتا۔ جس شخص کا عقیدہ توحید کامل ہو اور وہ اللہ کی صفات اور اسمائے حسنیٰ پر ایمان رکھتا ہو، وہ ان تین صفاتِ رذیلہ سے، جو درحقیقت ایک صفتِ رذیلہ یعنی اللہ کے بارے میں بدگمانی کا ظہور ہیں، پاک ہو جاتا ہے۔

3۔ حرص انسان کو ایک مستقل روگ میں مبتلا کر دیتا ہے، چنانچہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ مَطِيَّةُ التَّعَبِ"۔

''حرص رنج و زحمت کی سواری ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث:820)

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ عَنَاءُ الْمُؤَبَّدِ"۔

''حرص ابدی رنج و زحمت کا سامان ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث:982)

اگر ہم حریص افراد کی زندگی کا جائزہ لیں اور ان کی پُر درد و رنج زندگی کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ وہ صبح و شام بھاگ دوڑ کرتے ہیں تا کہ مال و دولت جمع کریں لیکن ان اموال سے کوئی لطف و لذت حاصل نہیں کرتے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مندرجہ بالا احادیث کی سچائی کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

بقول شیخ سعدی:

گفت چشم تنگ دنیا دولت را
یا قناعت پر کند یا خاک گور

''اس نے کہا کہ دنیا سے محبت کرنے والے کی تنگ آنکھ کو، یا قناعت پُر کرسکتی ہے یا قبر کی مٹی''۔

5۔ حریص انسان کبھی سیر نہیں ہوتا، لہٰذا ہمیشہ دولت جمع کرنے میں لگا رہتا ہے، یہاں تک کہ خود بھی اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ حضرت علی علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَلْحَرِیْصُ فَقِیْرٌ وَلَوْ مَلَکَ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِھَا"۔

''حریص فقیر ہوتا ہے، خواہ ساری دنیا کی دولت کا مالک بن جائے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 1753)

6۔ صرف وہی لوگ حقیقی تونگری اور غنا سے بہرہ مند ہوسکتے ہیں جو اسیر حرص نہ ہوں جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَغْنَی الْغِنٰی مَنْ لَمْ یَکُنْ لِلْحِرْصِ اَسِیْراً"۔

''سب سے بڑا تونگر اور غنی وہ ہے جو حرص کا اسیر نہ ہو''۔ (اصول کافی، 316:2)

7۔ حرص آخر کار انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ تباہی بعض اوقات صرف روحانی ہی نہیں بلکہ مادی بھی ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: (اصول کافی، 316:2)

"اِنَّ الدِّنْیَا رَوَالدِّرْھَمَ اَھْلَکَا مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ وَھُمَا مُھْلِکَاکُمْ"۔

''درہم و دینار نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور تم کو بھی ہلاک کر دیں گے''۔

8۔ حریص آدمی روز بروز حرص کے تانے بانے میں پھنستا چلا جاتا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنا اس کے لئے مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ اس بات کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَثَلُ الْحَرِیْصِ عَلَی الدُّنْیَا مَثَلُ دُوْدَةِ الْقَزِّ، کُلَّمَا ازْدَادَتْ مِنَ الْقَزِّ عَلٰی نَفْسِھَا لَفًّا کَانَ اَبْعَدَ لَھَا مِنَ الْخُرُوْجِ! حَتّٰی تَمُوْتَ غَمًّا"۔

''حریص انسان کی مثال ریشم کے کیڑے کی مانند ہے، جس قدر وہ اپنے گرد ریشم کا تار بنتا چلا جاتا ہے، اس کے اندر پھنستا جاتا ہے اور آخر کار اسی کے اندر مر جاتا ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 1550)

9۔ حرص انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے اور معاشرے میں اس کی عزت خاک میں ملا دیتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحِرْصُ یَنْقُصُ قَدْرَ الرَّجُلِ، فَلَا یَزِیْدُ فِیْ رِزْقِہٖ"۔ (غرر الحکم)

''حرص انسان کی عزت کو گھٹا دیتا ہے لیکن اس سے اس کے رزق میں اضافہ نہیں ہوتا''۔

10۔ حرص اُن برائیوں میں سے ہے جو بہت سی برائیوں کی جڑ بن جاتی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ حریص آدمی حلال وحرام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔لوگوں کے حقوق کا احترام نہیں کرتا اور مختلف قسم کے ظلم وزیاتیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''لَاتُدْخِلَنَّ فِي مَشْوَرَتِكَ حَرِيصاً يُزَيِّنُ لَكَ الشَّرَهَ بِالْجَوْرِ!''

''حریص انسان کو ہرگز اپنے مشورے میں داخل نہ کرنا کیونکہ وہ ظلم کے رجحان کو تمہاری نظر میں خوش نما بنا دے گا۔''(نہج البلاغہ:53)

مختصر یہ کہ حرص کے نتائج بہت خطرناک اور نقصان دہ ہیں اور وہ انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے،معاشرے میں اس کی عزت کو خاک میں ملا دیتی ہے۔حرص کی وجہ سے وہ اور بھی گناہوں میں گرجاتا ہے اور روز بروز سعادت سے دور ہوتا جاتا ہے۔انسان ایک ذلیل وحقیر غلام کی طرح اس کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ایک جملہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرص کے نتیجہ میں انسان کا دین بھی تباہ ہو جاتا ہے اور دنیا بھی۔

حرص کی تعریف

حرص کے معنی اجمالی طور پر سب پر واضح ہیں لیکن اگر اس کے معنی ومفہوم کے بارے میں غور وفکر کیا جائے تو نئے نکات ہم پر منکشف ہوتے ہیں۔

راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں کہ حرص کسی چیز کے بارے میں شدید رجحان اور کشش کو کہتے ہیں اور اصل میں یہ کپڑا دھوتے وقت اسے کسی چیز سے کوٹنے کو کہتے ہیں۔

امیر المومنینؑ نہایت خوبصورت جملے میں حرص کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''هُوَ طَلَبُ الْقَلِيلِ بِإِضَاعَةِ الْكَثِيرِ''

''حرص یہ ہے کہ انسان زیادہ چیز کو ضائع کر کے تھوڑی حاصل کرے۔''(سفینۃ البحار،حرص)

علمائے اخلاق نے حرص کو قوہ شہویہ سے تعلق رکھنے والے رذائلِ اخلاقی میں شمار کیا ہے اور اس کی تعریف میں کہا ہے کہ:

''حرص ایک ایسی نفسانی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو ضرورت سے زیادہ وسائلِ زندگی جمع کرنے پر مائل کرتی ہے۔یہ حُب دنیا کا ایک شعبہ اور ہلاک کر دینے والی صفت ہے جو انسان کو راہِ حق سے گمراہ کر دیتی ہے۔حرص ایک ایسا صحرا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔انسان اس میں جس قدر چلتا جائے،اس سے نکل نہیں پاتا۔

حریص کی حالت مریض استسقاء جیسی ہوتی ہے کہ وہ جس قدر پانی پیتا جائے، اس کی پیاس بجھنے میں نہیں آتی۔

حریص عقل و منطق سے محروم ہوجاتا ہے۔ اگر اُسے کہا جائے کہ تمہاری عمر اسی (80) سال ہوچکی ہے، اب پیچھے کتنی عمر باقی بچی ہے، پھر اس حرص و دنیا طلبی کا مقصد؟ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکنے کے باوجود وہ اپنی حرص سے باز نہیں آتا بلکہ بعض اوقات تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی حرص میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے: (بحارالانوار، 22:70)

"عُشِيْبُ بْنُ آدِمَ وَيَشُبُّ فِيهِ خَصْلَتَانِ: اَلْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ"۔

''انسان بوڑھا ہوجاتا ہے لیکن اس کے اندر دو خصلتیں جوان ہوجاتی ہیں: حرص اور طویل آرزوئیں''۔

انفرادی اور معاشرتی زندگی پر حرص کے اثرات

آیات و روایات کی روشنی میں جو تفصیلی بحث اب تک ہم کر چکے ہیں، اس کی روشنی میں حرص کے منفی اثرات بخوبی واضح ہو جاتے ہیں اور ان کا مطالعہ ہمیں دیگر تشریحات و تفاسیر کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ہم ان منفی اثرات کو فہرست اور اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

1۔ حرص انسان کو ابدی رنج و غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔

2۔ حریص کبھی سیر نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اگر اسے ساری دنیا کی دولت حاصل ہوجائے، وہ پھر بھی فقیر رہتا ہے۔

3۔ حریص فقیروں کی طرح زندگی گزارتا ہے اور فقیروں کی طرح مرتا ہے۔ مگر قیامت کے دن حساب دولت مندوں کی طرح دے گا۔

4۔ حرص انسان کو ہلاک کر دیتی ہے، اس لئے کہ حُبِ دنیا کی وجہ سے وہ اپنے اردگرد کے خطرات کو دیکھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور جلد بازی سے آگے بڑھنے کی کوشش اسے ہلاک کر دیتی ہے۔

5۔ حریص آدمی کی مشکلات اور پریشانیاں روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہیں اور آخر کار نجات کا راستہ اس پر بند ہوجاتا ہے۔

6۔ حرص انسان کی آبرو کو گھٹا دیتی ہے اور لوگوں کی نظر میں اس کے مقام کو کم کر دیتی ہے، اس لئے کہ حریص انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے معاشرتی اقدار کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسے قیدی کی مانند ہوجاتا ہے جس کی گردن میں زنجیر ڈال کر کبھی اِدھر کھینچا جاتا ہے اور کبھی اُدھر۔

7۔ حرص انسان کو مختلف قسم کے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حرص کی وجہ سے انسان جھوٹ، خیانت، ظلم اور غصب کا مرتکب ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر وہ حلال و حرام کی پابندی کرے تو اپنے مقاصد حاصل نہیں کرتا۔

8۔ حرص انسان کو اللہ سے دور کر دیتی ہے اور اللہ کے بندوں کی نظر میں حقیر کر دیتی ہے۔ اسے اطمینان اور سکون سے محروم

کر دیتی ہے اور اس کی زندگی کو غم واندوہ کا مرقع بنا دیتی ہے۔

9۔ حریص وہ مال و دولت جمع کرتا ہے جسے حاصل کرنے کی زحمت وہ اُٹھاتا ہے اور اس کے بارے میں جوابدہ بھی وہ خود ہوتا ہے جبکہ اس سے فائدہ دوسرے اُٹھاتے ہیں۔

10۔ حرص اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی اور اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہونے کا نتیجہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بدگمانی اور عدم اعتماد اور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

باطن کی بے نیازی

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ حریص غنا اور بے نیازی کو باہر کی دنیا میں تلاش کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو یہ دولت اپنے اندر تلاش کرنی چاہئے۔ کسی عالم سے پوچھا گیا کہ غنا اور بے نیازی کی حقیقت کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ تمہاری آرزوئیں چھوٹی ہوں اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے، اُس پر راضی رہو۔

ایک حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی مروی ہے اور حضرت علی علیہ السلام سے بھی، اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

"خَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ"۔

یعنی "بہترین بے نیازی روح کی بے نیازی ہے"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4949، امالی صدوق: 394)

رسول اللہ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

"اَلْغِنٰى فِي الْقَلْبِ، وَالْفَقْرُ فِي الْقَلْبِ"۔ (بحار الانوار، 68:69)

"بے نیازی بھی انسان کے دل کے اندر ہوتی ہے اور فقر بھی انسان کے دل کے اندر ہوتا ہے"۔

بلاشبہ جس شخص کی روح حرص کی وجہ سے بھوکی ہو، اگر اُسے ساری دنیا کی دولت دے دی جائے، پھر بھی وہ بھوکا اور فقیر رہتا ہے۔ اگر روح غنی اور سیراب ہو تو ساری دنیا بھی اس سے چھین لی جائے تو وہ بے نیاز اور غنی رہتا ہے۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ حرص

لفظ "حرص" سے عام طور پر منفی معنی ذہن میں منعکس ہوتے ہیں۔ جب بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اس سے ذہن مال و دولت، مقام و مرتبہ اور دیگر مادی و شہوانی حرص کی طرف جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہ معنی مذموم اور ناپسندیدہ ہیں۔

لیکن بعض اوقات یہ لفظ ایسے معنی کے بارے میں بولا جاتا ہے جو پسندیدہ ہیں اور رذائلِ اخلاقی سے نہیں بلکہ فضائلِ اخلاقی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً قرآن شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو ہدایت دینے اور انہیں گمراہی سے نکالنے میں حریص تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔"

''بے شک تمہاری طرف تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے۔ تمہاری سختیاں اس پر گراں گزرتی ہیں، وہ تمہاری ہدایت کے معاملہ میں حریص اور مؤمنین پر رؤف ورحیم ہے''۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ"

''(اے رسولؐ!) تم جس قدر بھی ان کی ہدایت کے بارے میں حریص ہو جاؤ (اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ) جن کو اللہ نے (ان کے بُرے اعمال وکردار کی وجہ سے) گمراہ کر دیا ہے، وہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے''۔

قرآن مجید کی دیگر آیات مثلاً سورۂ یوسف:103 اور سورۂ نسأ:129 بھی اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں یہ لفظ منفی معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ احادیث میں بھی بہت زیادہ مقامات پر یہ لفظ مثبت معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ خطبہ ہمام میں امیر المومنین علیہ السلام متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (نہج البلاغہ، خطبہ:193)

"فَمِنْ عَلَامَةِ اَحَدِهِمْ اَنَّكَ تَرٰى لَهٗ قُوَّةً فِيْ دِيْنٍ وَحِرْصاً فِيْ عِلْمٍ۔"

''ان کی صفات میں سے ہے کہ تم ان کو دین کے معاملہ میں قوی اور علم کے معاملہ میں حریص دیکھو گے''۔

متعدد احادیث میں آیا ہے کہ مؤمن فقہ میں، جہاد اور تقویٰ وغیرہ میں حریص ہوتا ہے۔ (بحار الانوار، 64:271، 294)

ہم اس بحث کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"لَا حِرْصَ كَالْمُنَافِسَةِ فِي الدَّرَجَاتِ"۔ (میزان الحکمہ، 1:589)

''قربِ الٰہی کے درجات کے حصول کیلئے مقابلہ کرنے جیسی کوئی حرص نہیں ہے''۔

بنابرایں حرص کا مفہوم بہت وسیع ہے جس کے معنی کسی شے کو حاصل کرنے کی غیر معمولی اور شدید خواہش کے ہیں۔ اگر وہ خیر وسعادت کی راہ میں ہو تو ممدوح اور پسندیدہ ہوگی اور اگر دنیا پرستی کی راہ میں ہوگی تو مذموم اور ناپسندیدہ ہوگی۔

حرص کا علاج

ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جب ہم کسی جسمانی بیماری کا علاج کرتے ہیں تو سب سے پہلے بیماری کی وجوہات کو تلاش کرتے ہیں، اس لئے کہ بیماری کی وجوہات ختم کئے بغیر ہم بیماری کا علاج نہیں کر سکتے۔ مسکن دواؤں کے ذریعے وقتی طور پر بیماری کی علامات کو دبایا جاسکتا ہے مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ پھر سر اُٹھا لیتی ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کا بھی یہی حال ہے۔ لہٰذا ان کا علاج کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ان کے اسباب، عوامل کو تلاش کیا جائے اور اس کے بعد ان کی مکمل طور پر بیخ کنی کی جائے۔

گزشتہ صفحات میں ہم احادیث کی روشنی میں یہ جان چکے ہیں کہ حرص کی وجہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی اور اس پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہونا ہے جس کی وجہ سے توحیدِ افعالی کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کو قادر و رازق سمجھتا ہو کہ ہر خیر و سعادت کی چابی اس کے ہاتھ میں ہے:

"تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○" (آلِ عمران: 26)

ایسا شخص کبھی دنیوی مال و متاع جمع کرنے میں حرص سے کام نہیں لے گا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر پختہ ایمان رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ:

"مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ط"

''جو کچھ تمہارے پاس ہے، فنا ہو جانے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے''۔ (نحل: 96)

ایسا شخص نہ صرف یہ کہ مال جمع کرنے میں حریص نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حریص ہو جاتا ہے۔

جب توحید پر، خاص طور پر توحیدِ افعالی پر انسان کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے تو بہت سی اخلاقی برائیاں یعنی رذائلِ اخلاقی اس پر حملہ آور ہو جاتی ہیں جن میں سے حرص سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا ایمان کو مضبوط کر کے اس بیماری کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

حرص کی ایک اور وجہ اس کے اثرات و نتائج کے بارے میں جہالت ہے۔ اگر انسان کو علم ہو کہ حرص کے نتیجہ میں اُس کی زندگی کا سارا سکون برباد ہو جائے گا اور یہ کہ حرص انسان کو ابدی رنج و زحمت میں مبتلا کر دیتا ہے، حرص کی وجہ سے معاشرے میں اُس کی عزت تباہ ہو جاتی ہے۔ حرص کی وجہ سے انسان مال و دولت کی فراوانی کے باوجود فقیروں جیسی زندگی گزارتا ہے۔ دنیا میں مال جمع کرنے کی تکالیف وہ اُٹھاتا ہے، آخرت میں اس کا حساب وہ دیتا ہے لیکن اس مال سے لطف اندوز دوسرے ہوتے ہیں۔ اگر انسان حرص کے ان اثرات و نتائج کو مدِ نظر رکھے تو کبھی حرص میں مبتلا نہ ہو۔

مرحوم فیض کاشانی اپنی معروف کتاب ''المحجۃ البیضا'' میں فرماتے ہیں کہ حرص کی دو تین اجزأ پر مشتمل ہے جن کا مجموعہ پانچ ہو جاتا ہے:

1۔ زندگی میں اعتدال اور میانہ روی: اگر کسی کی زندگی کے اخراجات زیادہ ہو جائیں تو قناعت اسے سیر نہیں کرتی۔ بنابرایں اخراجات میں اعتدال رکھنا حرص کا دشمن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"مَنِ اقْتَصَدَ اَغْنَاهُ اللهُ، وَمَنْ بَذَّرَ اَفْقَرَهُ اللهُ"۔

''جو شخص میانہ روی اختیار کرتا ہے، اللہ اُسے غنی کر دیتا ہے اور جو اسراف وتبذیر کا مرتکب ہوتا ہے، اللہ اُسے فقیر بنا دیتا ہے''۔(میزان الحکمہ، 2557:3)

2۔ جب انسان کے پاس زندگی گزارنے کیلئے کافی مقدار میں مال موجود ہو تو وہ مستقبل کے بارے میں فکرمند نہ ہو، اس لئے کہ بہت سے حریص صرف مستقبل میں مالی مشکلات سے بچنے کیلئے حرص میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وقت آنے پر مناسب تدبیر اختیار کرنے سے مستقبل کے مسائل بھی اپنے وقت پر حل ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید اسی کے بارے میں فرماتا ہے:

"اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ"

''شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے اور بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے''۔(بقرہ:268)

3۔ انسان قناعت اور اس سے حاصل ہونے والی عزت کے بارے میں غور وفکر کرے اور حرص وطمع کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ذلت کے بارے میں غور کرے، اس سے اسے حرص سے دور اور قناعت کے قریب ہونے میں مدد ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عِزُّ الْمُؤْمِنِ اِسْتِغْنَاهُ عَنِ النَّاسِ"۔

''مومن کی عزت اس میں ہے کہ وہ لوگوں سے بے نیاز رہے''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 338:5)

4۔ انسان گزشتہ نسلوں، خصوصاً یہودیوں اور دیگر حریص اقوام وقبائل کی زندگی کا مطالعہ کرے اور ان کے حالات کا انبیأ واولیأ اللہ کے حالات سے موازنہ کرے۔ پھر اپنی عقل کو قاضی بنا کر اس سے فیصلہ مانگے کہ وہ انبیأ واولیأ کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا اہل حرص ودنیا پرستی کے ساتھ۔ جن لوگوں نے عزت وآبرو سے زندگی بسر کی اور عزت وآبرو سے اس دنیا سے گئے، اپنی پاکیزہ روح اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوئے، انسان اُن کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے یا اُن لوگوں کے ساتھ جو دنیا میں ذلت اور رسوائی سے جیئے اور اسی حال پر مر گئے!

5۔ انسان بہت زیادہ مال ودولت کے خطرات اور دنیا وآخرت میں اس سے ہونے والے ممکنہ نقصانات کے بارے میں سوچے۔ اسی طرح قناعت سے حاصل ہونے والے سکون واطمینان اور آخرت میں اس کے اچھے انجام کے بارے میں سوچے، دنیوی حالات میں ہمیشہ اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر رکھے، اگر اپنے سے اوپر کے طبقات پر نظر کرے گا تو شیطان اسے ضرور اُکسائے

گا کہ دیکھو! یہ کس طرح ناز ونعمت میں عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے ہیں، تم کیوں ایسی زندگی کیلئے دوڑ دھوپ نہیں کرتے؟ تم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر خوفِ خدا کا شکنجہ کسا ہوا ہے؟ کیا یہ لوگ خوفِ خدا نہیں رکھتے؟ کیا تم ان سے زیادہ دیندار ہو؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ غفاری کہتے ہیں:

"اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ اَنْ اَنْظُرَ اِلٰی مَنْ هُوَ دُوْنِیْ، لَا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقِیْ"۔

''میرے خلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے نصیحت کی کہ میں اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر رکھوں، اپنے سے برتر پر نہیں''۔

(المحجۃ البیضاء، 54:6)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مندرجہ بالا آیات وحدیث کی روشنی میں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ دین اسلام لوگوں کی مادی ترقی کو پسند نہیں کرتا، اسی لئے اپنے پیروکاروں کو دنیا سے بیزاری کا درس دیتا ہے۔ یہ خیال صرف اور صرف ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلام حرص، دنیا پرستی اور تمام انسانی واخلاقی اقدار کی پابندی کرتے ہوئے مادی لحاظ سے خوشحال زندگی گزارنے کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ مادی وسائل درحقیقت مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اگر انسانی اقدار اور اخلاقی نشوونما کے حصول کیلئے مادی وسائل فراہم کیے جائیں تو اسلام کی نظر میں یہ قابلِ تعریف پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن اگر صرف ذاتی عیش پرستی اور ہوس رانی کیلئے انہیں حاصل کیا جائے، یا یہ خود ہی زندگی کا مقصد بن جائیں اور انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد سے بیگانہ کردیں تو اس صورت میں یہ قابلِ مذمت اور ناپسندیدہ ہیں۔

مال ودولت کی حیثیت بھی جدید صنعتی وسائل کی طرح ہے جن کو مثبت اور تعمیری انداز سے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور منفی اور تخریبی انداز سے۔ ہوائی جہاز تیز رفتار سفر کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور بمباری کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر انسانوں کی بے رحمانہ ہلاکت کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔

لہٰذا یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ حرص ودنیا پرستی کے مذموم ہونے کا بہانہ بنا کر انسان مثبت اور تعمیری اقتصادی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوجائے، جیسا کہ بہت سے سست اور کاہل افراد حرص اور دنیا پرستی سے دوری کی آڑ لے کر اپنی نااہلی اور نقائص کی پردہ پوشی کی کوشش کرتے ہیں۔

چوتھا باب

حُبِّ دنیا

تمہید:۔

''حرص'' جس کے دردناک انجام کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، اس کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب حُبِ دنیا ہے۔ جب حُبِ دنیا کی آگ کے شعلے انسان کے دل میں بھڑکتے ہیں تو وہ مادی نعمتوں اور لذتوں کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسرے عاشقوں کی طرح عقل وفکر سے فارغ ہوکر اپنے مقصد کے حصول کیلئے شب و روز ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور گندگی وآلودگی کے اس دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف حرص کی بیخ کنی کیلئے ''دنیا پرستی'' کو نشانہ بناتا ہے اور مختلف بیانات اور تعبیرات کے ذریعے مادی نعمتوں اور لذتوں کی قدر و قیمت کو انسان کی نظر میں کم کرتا ہے تاکہ دنیا کے عاشقانِ بیقرار عقل وشعور کی راہ اپنائیں اور حریصانہ انداز میں تمام انسانی واخلاقی اقدار کو پیروں تلے روندتے ہوئے حصولِ دنیا کی تگ ودو میں نہ لگے رہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآن مجید کی انتہائی نپی تلی عبارات کی روشنی میں اس مسئلہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

1۔ قرآن شریف میں مختلف مقامات پر دنیا کو بازیچہ اطفال اور سہو ولہو کا سبب قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے:

"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ط"

''اور دنیوی زندگی لہو ولعب کے سوا کچھ نہیں ہے''۔ (انعام:32)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط"

''جان لو کہ دنیوی زندگی لہو ولعب، زینت، باہمی تفاخر اور مال واولاد میں کثرت طلبی کا نام ہے''۔

ان آیات میں دنیا پرستوں کو ایک ایسے بچے سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کھیل اور تفریح میں غرق اور ہر بات سے بے خبر رہے، حتیٰ کہ وہ خطرات جو ان کے انتہائی قریب ہیں، ان سے بھی غافل ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے انسانی زندگی کو (5 سال سے 40 سال تک) پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر مرحلہ کو آٹھ سالوں پر

محیط قرار دیا ہے۔ پہلے آٹھ سال کھیل کود میں گزر جاتے ہیں۔ آٹھ سال لہوولعب میں گزر جاتے ہیں۔ آٹھ سال جوانی اور اس کی رعنائیوں کی نذر ہوجاتے ہیں، آٹھ سال فخر وغرور کی حالت میں گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد آٹھ سال مال واولاد کی کثرت کی طلب میں بسر ہوجاتے ہیں اور اس طرح انسان کی شخصیت پختہ ہوجاتی ہے جو ممکن ہے کہ عمر بھر تبدیل نہ ہو۔ اس طرح دنیا پرستوں کو معنوی زندگی اور معنوی اقدار کے بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

2۔ بعض آیات میں دنیوی زندگی کو اسبابِ فریب کا نام دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ○"

''اور دنیوی زندگی دھوکے اور فریب کی متاع کے سوا کچھ نہیں ہے''۔ (آل عمران:185)

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"

''ایسا نہ ہو کہ دنیوی زندگی تمہیں فریب دے دے اور نہ ہی شیطانِ فریب کار تمہیں اللہ کے بارے میں مبتلا کر دے''۔ (لقمان:33)

ان الفاظ وتعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا کا فریب کارانہ زرق وبرق انسان کے معنوی ارتقا کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے، جب تک انسان اس رکاوٹ کو عبور نہ کرلے، وہ معنوی لحاظ سے کوئی مقام اور مرتبہ نہیں پاسکتا ہے۔

دُنیوی زندگی ایک سراب کی مانند ہے جو مادی تعلقات کے پتے ہوئے صحرا میں انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جب انسان اپنی پیاس بجھانے کیلئے اس کے قریب پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پانی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پانی کی تلاش میں سرابوں کا تعاقب کرنے کے نتیجہ میں انسان مزید تھکتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ہلاک ہوجاتا ہے۔

ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو سالہا سال طلبِ دنیا دوڑتے رہے لیکن جب وہ اپنی اس منزل کو پالیتے ہیں تو یہ کہہ کر اعترافِ شکست کرتے ہیں کہ انہیں ان کی اصل منزل یعنی اطمینان قلب نہیں ملا بلکہ شہد کے ساتھ موم اور پھول کے ساتھ کانٹا ملا۔ اس طرح انہیں اطمینان وسکون کی جگہ ان کی پریشانی واضطراب میں اضافہ ہوا۔

3۔ اسی طرح قرآن شریف کی بعض آیات میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ دنیا کی محبت انسان کو آخرت سے غافل کردیتی ہے۔ یعنی ان کی ساری توجہات دنیا پر مرکوز ہوجاتی ہیں اور ان کی ساری دوڑ دھوپ کا مقصد صرف دنیا رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ○"

''وہ دنیوی زندگی کے ظاہر کو ہی جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں''۔ (روم:7)

ان لوگوں نے دنیوی زندگی کی حقیقت کو بھی نہیں پہچانا، بجائے اس کے کہ وہ اسے آخرت کی کھیتی سمجھتے ، اعلیٰ انسانی اقدار ومراتب تک پہنچنے کا راستہ سمجھتے ،فضائلِ اخلاقی کے حصول کے مشن کے میدان سمجھتے ،انہوں نے اسے اپنا مقصود ومطلوب بلکہ معبود بنالیا۔ظاہر سی بات ہے کہ ایسے لوگ آخرت سے غافل ہی ہوجاتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ○"

''کیا تم آخرت کی بجائے دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے ہو؟ دنیوی زندگی کا مال واسباب تو آخرت کے مقابلہ میں بہت کم ہے''۔(توبہ:38)

بے شک کم ظرف اور ہوس ران افراد کی نظروں میں یہ چھوٹی سی دنیا بڑی دکھائی دینے لگتی ہے کہ وہ اُخروی زندگی کو، جو کہ الطاف وعنایاتِ الٰہی سے بھرپور ہے،فراموش کردیتے ہیں۔

4۔ بعض آیات میں دنیا کو عَرَض کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں عارضی اور زوال پذیر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ط"

''تم دنیا کا فانی اور زوال پذیر سرمایہ چاہتے ہو جبکہ اللہ کے پاس بہت زیادہ غنائم ہیں''۔(نسأ:94)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ط"

''تم دنیا کی ناپائیدار دولت کے طالب ہو جبکہ اللہ تمہارے لئے آخرت چاہتا ہے''۔(انفال:67)

اسی طرح اور بہت سی آیات میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سے کچھ لوگ دنیا کی فانی اور زوال پذیر دولت کے حصول کی خاطر حرص اور طمع میں مبتلا ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ انسانی صفات اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ بلاشبہ حقیقی اور پائیدار نعمت وہی ہے جو اللہ کے پاس ہے۔اس کے سوا جو کچھ ہے،سب فانی اور عارضی ہے۔

یہ تعبیرات سب دنیا پرستوں کیلئے خطرے کی گھنٹی ہیں کہ خبردار! اپنے عظیم انسانی سرمائے کو زوال پذیر متاعِ دنیا پر قربان نہ کردینا۔

5۔ بعض آیات میں دنیوی نعمتوں کو ''زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (کہف:28،46) کہا گیا ہے اس سے ملتی جلتی تعبیرات بعض دوسری آیات میں بھی استعمال ہوئی ہیں جیسا کہ:

"مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ⑮"

''جو شخص دنیوی زندگی اور اس کی زینت کا طالب ہو تو ہم اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ اسے دنیا میں دے دیتے ہیں اور اس میں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جاتا (لیکن آخرت میں ان کا کوئی اجر نہیں ہوگا)''۔(ھود:15)

ایک اور مقام پر ازواجِ رسولؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"يَٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزۡوَٰجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدۡنَ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيۡنَ أُمَتِّعۡكُنَّ وَأُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحٗا جَمِيلٗا○"

''اے رسولؐ! اپنی بیویوں سے کہو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زینت کی خواہش مند ہو تو آؤ میں تمہیں متاعِ دنیا سے بہرہ مند کر دیتا ہوں اور تمہیں بطور احسن رخصت کر دیتا ہوں۔''(احزاب:28)

ان تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دنیوی زرق و برق فقط دنیوی زندگی کی زینت ہے۔اس کے زینت ہونے کے سامنے بھی سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زینت کو بیان کرنے کیلئے ''زُیِّنَ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،جس کے معنی ہیں ''زینت دی گئی'' جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی حقیقی نہیں بلکہ خیالی زینت ہے،مثلاً سورۂ بقرہ: 212 میں ہے:

"زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ٱلۡحَيَوٰةُ ٱلدُّنۡيَا"۔

''دنیوی زندگی کو کافروں کیلئے مزین کر دیا گیا''۔

سورۂ آلِ عمران: 14 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ ٱلشَّهَوَٰتِ مِنَ ٱلنِّسَآءِ وَٱلۡبَنِينَ وَٱلۡقَنَٰطِيرِ ٱلۡمُقَنطَرَةِ مِنَ ٱلذَّهَبِ وَٱلۡفِضَّةِ"۔

''لوگوں کیلئے عورتوں،اولاد اور سونے چاندی کے ذخیروں کو زینت دے دی گئی''۔

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان چیزوں کا زینت ہونا بھی حقیقت نہیں بلکہ ایک خیالی چیز ہے۔

یہاں ایک اہم سوال اُبھرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اُمور کو کیوں زینت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا مقصد انسانوں کی آزمائش اور تربیت ہے،اس لئے کہ جب انسان ان دلکش چیزوں کو،جو عام طور پر گناہ سے آلودہ ہوتی ہیں،اللہ کی خاطر ترک کرتا ہے تو اس کے اندر تقویٰ اور ایمان کا شجر بارآور ہونے لگتا ہے ورنہ غیر دلکش چیزوں کا ترک کرنا تو کوئی کمال اور فخر نہیں ہے۔

زیادہ بہتر الفاظ میں ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے اندر کی سرکش حیوانی خواہشات ان مادی اور گناہ آلودہ اُمور کو اس کی نظر میں زینت دیتی ہیں۔ بنابرایں ان چیزوں کا دلکش اور جاذب ہونا ہمارے اندر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔اگر اس زینت کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان خواہشات کے اندر یہ اثر اور رجحان اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔اگر بعض آیات میں

اسے شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے جیسا کہ:

"وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ"۔

''شیطان نے ان کے اعمال کو پُرکشش بنا دیا''۔(نمل:24)

تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ تزئین اللہ کا کام ہے، اس لئے کہ ہر چیز کا اثر اس کا دیا ہوا ہے۔ دوسرے لحاظ سے یہ ہماری خواہشاتِ نفسانی کا کام ہے اور تیسرے لحاظ سے یہ شیطان کا کام ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حُبِ دنیا حد سے بڑھ جائے تو انسان کو اللہ سے دور کردیتی ہے۔

دُنیا پرستی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں، خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں اور نہج البلاغہ میں دنیا پرستی کی وسیع پیمانے پر مذمت کی گئی ہے۔

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ دنیا کو دنیا کیوں کہا جاتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"لِاَنَّ الدُّنْيَا دَنِيَّةٌ خُلِقَتْ مِنْ دُونِ الْآخِرَةِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

''اس لئے کہ دنیا پست ہے اور آخرت سے پہلے پیدا کی گئی ہے''۔(بحارالانوار، 356:54)

2۔ نیز آنحضرتؐ سے ہی ایک حدیث میں ہے:

"اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ حُبُّ الدُّنْيَا"۔

''حُبِ دنیا سب سے بڑا گناہ ہے''۔(کنزالعمال، 184:3)

3۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حُبُّ الدُّنَارَأْسُ الْفِتَنِ وَاَصْلُ القِمِحَنِ"۔

''حب دنیا ہر فتنے آغاز اور ہر سختی کا اصل سبب ہے''۔(غررالحکم، حکمت:4870)

4۔ امیرالمومنین علیہ السلام سے ہی منقول ہے:

"اِنَّالدُّنْيَا لَمُفْسِدَةُ الدِّيْنِ وَمُسْلِبَةُ الْيَقِيْنِ"۔(غررالحکم، حکمت:3518)

''دنیا انسان کے دین کو تباہ کردیتی ہے اور اس کے سرمایۂ یقین کو چھین لیتی ہے''۔

5۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَنَّ اَوَّلَ مَاعُصِیَ اللّٰہُ بِہٖ سِتٌّ: حُبُّ الدُّنْیَا وَحُبُّ الرِّئَاسَۃِ وَحُبُّ الطَّعَامِ وَحُبُّ النِّسَاءِ وَحُبُّ النَّوْمِ وَحُبُّ الرَّاحَۃِ"

''سب سے پہلے جن چیزوں کے ذریعے اللہ کی نافرمانی کی گئی، وہ چھ ہیں: حبِ دنیا، حُبِ ریاست، حب طعام، حبِ زنان، حُبِ راحت''۔(بحارانوار، 60:70)

غالباً یہ چھ چیزیں یا ان میں سے بعض شیطان کی سرکشی، آدم کی نافرمانی اور قابیل کے گناہ میں کارفرما نظر آتی ہیں۔شاید اسی وجہ سے انہیں گناہ کے اوّلین اسباب کہا گیا۔

6۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اللہ کے ہاں سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

"مَامِنْ عَمَلٍ بَعْدَ مَعْرِفَۃِ اللّٰہِ جَلَّ وَعَزَّ وَمَعْرِفَۃِ رَسُوْلِہٖ اَفْضَلُ مِنْ بُغْضِ الدُّنْیَا وَاِنَّ لِذٰلِكَ لَشُعَباً کَثِیْرَۃً وَلِلْمَعَاصِیْ شُعَبًا"۔ (اصول کافی، 130:2)

''اللہ اور اس کے رسولؐ کی معرفت کے بعد سب سے افضل عمل یہ ہے کہ انسان دنیا کو ناپسندیدہ قرار دے۔اس کے بھی بہت سے شعبے ہیں جس طرح گناہوں کے مختلف شعبے ہوتے ہیں''۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا اور فرمایا کہ شیطان کی نافرمانی کا سبب اس کا تکبر تھا، آدم کی نافرمانی کا سبب حرص اور قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کا سبب حسد تھا۔پھر آپؑ نے فرمایا:

"فَشَعَّبَ مِنْ ذٰلِكَ حُبُّ النِّسَاءِ وَحُبُّ الدُّنْنَا وَحُبُ الرِّئَاسَۃِ وَحُبُّ الرَّاحَۃِ وَحُبُّ الْکَلَامِ وَحُبُّ الْعُلُوِّ وَالثَّرْوَۃِ، فَصِرْنَ سَبْعُ خِصَالٍ، فَاجْتَمَعْنَ کُلُّھُنَّ فِیْ (حُبُّ الدُّنْیَا) فَقَالَ الْاَنْبِیَاءُ وَالْعُلَمَاءُ بَعْدَ مَعْرِفَۃِ ذٰلِكَ"۔

''پس اس سے حُبِ دنیا، حُب زبانحب ریاست، حُبِ راحت، حُبِ کلام، حُبِ مقام و دولت جیسی برائیاں نکلیں، پس یہ سات خصلتیں ہیں جو ساری کی ساری ''حُبِ دنیا'' میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔اسی لئے انبیاؑ نے کہا کہ دنیا کی محبت ہر بُرائی کا سر ہے''۔

اس کے بعد امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَالدُّنْیَا دُنْیَا ئَانِ: دُنْیَا بَلَاغٍ وَدُنْیَا مَلْعُوْنَۃ"۔

''دنیا کی دو اقسام ہیں: ایک وہ دنیا جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو رہی ہوں اور دوسری ملعون ہے جو تمہیں

اللہ سے دور کر دیتی ہے۔''

7۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُرْفُضِ الدُّنْیَا فَاِنَّ حُبَّ الدُّنْیَا یُعْمِیْ وَیُصِمُّ وَیُبْکِمُ وَعُبْکِمُ وَیُذِلُّ الرِّقَابَ"۔

''دنیا کو ترک کر دو کیونکہ اس کی محبت انسان کو اندھا، بہرہ اور گونگا بنا دیتی ہے اور انسان کو ذلیل کر دیتی ہے''۔(اصول کافی:136:2)

ظاہری سی بات ہے کہ جب کسی چیز کی محبت انسان پر چھا جاتی ہے اور اسے واضح ترین حقائق سے غافل کر دیتی ہے تو وہ آنکھوں کے باوجود اندھا، کانوں کے باوجود بہرہ اور زبان کے باوجود گونگا ہوتا ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ چیز کے حصول کیلئے ذلت تک برداشت کر لیتا ہے۔

8۔ ایک اور حدیث میں دنیا پرستی کے منفی اثرات کو بیان کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حُبُّ الدُّنْیَا یُفْسِدُ الْعَقْلَ، وَیُصِمُّ الْقَلْبَ عَنْ سُمَاعِ الْحِکْمَةِ وَیُوجِبُ اَلِیْمَ الْعِقَابِ"۔

''حُب دنیا عقل کو بگاڑ دیتی ہے، دل کو حکمت کی باتیں سننے سے بہرا کر دیتی ہے اور دردناک عذاب کا باعث ہوتی ہے''۔(غرر الحکم، شرح فارسی، 397:3)

9۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا پرستی کے خطرناک نتائج کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اِنَّ الدُّنْیَا مُشْغِلَةٌ لِلْقُلُوْبِ وَالْاَبْدَانِ"۔

''دنیا پرستی انسان کی عقل اور جسم دونوں کو مشغول کر لیتی ہے''۔(بحار الانوار، 81:74)

10۔ ایک اور حدیث میں رسولؐ اللہ کی ایک اور پُرمعنی حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّهُ مَا سَکَنَ حُبُّ الدُّنْیَا قَلْبَ عَبْدٍ اِلَّا اِلْتَاطَ بِثَلَاثٍ: شُغْلٍ لَا یَنْفَدُ عَنَاؤُهُ، وَفَقْرٍ لَا یُدْرَکُ غِنَاؤُهُ، وَاَمَلٍ لَا یَنَالُ مُنْتَهَاهُ"۔

''جب دنیا کی محبت کسی کے دل میں بسیرا کر لیتی ہے تو اسے تین چیزوں سے آلودہ کر دیتی ہے: ایسی مشغولیت جس کی تھکاوٹ کی کوئی حد نہیں ہوتی، ایسا فقر جس کے بعد بے نیازی نصیب نہیں ہوتی اور ایسی آرزو، جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی''۔(بحار الانوار، 188:74)

مطلوب دُنیا اور مذمُوم دُنیا

ہم ان مباحث میں بار بار یہ نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ حُبِ دنیا جس کی مذمت کی گئی ہے، وہ درحقیقت دنیا پرستی ہے۔ جہاں تک دنیوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا تعلق ہے، خاص طور پر معنوی اور روحانی مقاصد کے حصول کیلئے، تو یہ نہ صرف یہ کہ حُب دنیا نہیں بلکہ حُب آخرت ہے۔ بالفاظِ دیگر بہت سے معنوی مقاصد مادی وسائل کے بغیر حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان اُمور میں مادی وسائل مقدمۂ واجب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انسان انہیں مقدمہ واجب کی نیت سے حاصل کرے تو نہ صرف اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس پر اجر و ثواب بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں دنیوی نعمتوں کا مثبت الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ آیۂ وصیت میں مالِ دنیا کو ''خیر'' کا نام دیا گیا ہے:

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ"

''تمہارے اوپر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت قریب آ جائے تو اگر وہ خیر (مال و دولت) چھوڑ کر جا رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کیلئے اچھی وصیت کر جائے''۔ (بقرہ:180)

2۔ ایک اور مقام پر مالِ دنیا کو ''برکات آسمان و زمین'' کہا گیا ہے جو متقین کو نصیب ہوتی ہیں:

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ"۔

''اور اگر شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کر لیں تو ہم آسمان و زمین کی برکتیں ان پر کھول دیں گے''۔

3۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے مالِ دنیا کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے:

"فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"۔

''جب نمازِ جمعہ تمام ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''۔ (جمعہ:10)

4۔ ایک اور مقام پر مال و دولت میں اضافہ کو توبہ کا انعام قرار دیا گیا ہے، حضرت نوحؑ کے واقعہ میں ہے:

"يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ○"

''میں نے مشرکوں سے کہا کہ تم اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو کیونکہ وہ بڑا بخشنے والا ہے تا کہ وہ تم پر آسمان سے پے در پے بارش بھیجے اور تمہارے مال واولاد میں اضافہ کرے اور سرسبز باغ اور نہریں تمہیں عطا کرے''۔(نوح:12،11)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ مال کو زندگی کے استحکام کا ذریعہ قرار دے کر حکم دے رہا ہے کہ اپنا مال نادان اور نااہل لوگوں کے ہاتھ نہ دو۔

"وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا"۔

''اور اپنے اموال کو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے استحکام کا ذریعہ قرار دیا ہے، نااہلوں کے ہاتھ میں نہ دو''۔(نسأ:5)

بعض آیات میں دُنیا کی مادی نعمتوں کو طیبات کہا گیا ہے:

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط"

''اے رسولؐ اللہ! ان سے کہو کس نے اللہ کی زینت کو اور اس پاکیزہ رزق کو، جو اُس نے اپنے بندوں کیلئے اُگایا ہے، حرام کیا ہے''۔(اعراف:32)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"۔

''اور یاد کرو جب تم زمین پر تھوڑے اور کمزور تھے اور اس بات سے خائف تھے کہ لوگ تمہیں مٹا نہ دیں، تو اُس نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہاری تائید کی اور تمہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق عطا کیا تا کہ تم شکر کرو''۔(انفال:26)

قرآن شریف میں استعمال ہونے والی ان پُرمعنی تعبیرات سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ معقول حدود میں رہتے ہوئے مادی نعمتیں نہ صرف یہ کہ ناپسندیدہ نہیں ہیں بلکہ پاک و پاکیزہ ہیں اور انسان کی پاکیزگی کا ذریعہ بھی ہیں۔

بعض آیات سے تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ مادی وسائل نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہیں بلکہ انسان کو اللہ کے صالح بندوں کے زمرے میں داخل کرنے کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ○"

''اوران میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کیا ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل سے ہمیں رزق عطا کرے تو ہم ضرور صدقہ دیں گے اور صالحین میں سے ہوجائیں گے۔''

یہ آیت ثعلبہ بن حاطب انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جس نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی تھی کہ میرے لئے دُعا فرمائیں کہ اللہ مجھے کثرتِ مال سے نوازے تاکہ میں اس کے ذریعے محتاجوں کی مدد کروں اور صالحین میں سے ہوجاؤں۔

رسول اللہ ﷺ اُس کی حالت کو جانتے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس کیلئے دُعا نہ کی لیکن جب اُس نے بہت اصرار کیا تو آپؐ نے اُس کیلئے دُعا فرمائی۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ مادی وسائل انسان کی سعادت وخوش بختی اور زمرۂ صالحین میں شامل ہونے کا ذریعہ ہوسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ حقیقت کھل کر آشکار ہوجاتی ہے کہ دُنیا کی مادی نعمتیں ذاتی طور پر مذموم اور قابل نفرت نہیں ہیں بلکہ ان کے اچھا یا بُرا ہونے کا دارومدار ان کے استعمال پر ہے۔ اگر ان کو صحیح طریقے سے استعمال میں لایا جائے تو یہ حسین وجمیل اور محبوب ومطلوب شکل وصورت کی حامل ہوتی ہیں ورنہ قابل مذمت ونفرت ہوتی ہیں۔

اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ''وسائل الشیعہ'' میں ایک پورا باب ہے جس کا عنوان ہے: ''آخرت کیلئے دُنیا سے مدد حاصل کرنے کا استحباب''۔ یہ بات وسائل الشیعہ کے بارہویں جلد میں صفحہ نمبر 16 تا 18 پر مشتمل ہے۔ اس باب میں گیارہ احادیث ہیں جو سب کی سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مادی وسائل کو ابدی فلاح وسعادت کے حصول کیلئے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے:

"غِنًا يَحْجُزُكَ عَنِ الظُّلْمِ خَيْرٌ مِّنْ فَقْرٍ يَحْمِلُكَ عَلَى الْإِثْمِ"۔

''وہ استغنا جو تجھے ظلم سے باز رکھے، اس فقر سے بہتر ہے جو تجھے گناہ پر مائل کرے۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں ایک شخص نے حسرت سے کہا:

''اللہ کی قسم! ہم تو طالبِ دُنیا ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت سا مال ودولت ہو''۔

امام نے پوچھا: تم اس مال سے کیا کرنا چاہتے ہو؟''

اس نے جواب دیا:

"أَعُوْدُ بِهَا عَلَى نَفْسِيْ وَعِيَالِيْ، وَأَصِلُ بِهَا، وَأَتَصَدَّقُ بِهَا، وَأَحُجُّ وَأَعْتَمِرُ"

''میں چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی بہتر بناؤں، اس کے ذریعے صلہ رحمی کروں، صدقہ دوں اور حج وعمرہ ادا کروں''۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ طلبِ دُنیا نہیں، یہ طلبِ آخرت ہے''۔

ہم اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جو نہج البلاغہ کے خطبہ 209 میں درج ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے کچھ اصحاب کے ساتھ علاؑ بن زیاد حارثی کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ وہ بصرہ کی مشہور شخصیت اور حضرت علیؑ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جب اُس کے گھر پہنچے اور اُس کے وسیع و عریض گھر کو دیکھا تو آپؑ نے اُس سے کہا:

''مَا كُنْتَ تَصْنَعُ بِسِعَةِ هٰذِهِ الدَّارِ فِي الدُّنْيَا وَاَنْتَ اِلَيْهَا فِي الْآخِرَةِ كُنْتَ اَحْوَجُ''۔

''تمہیں اس وسیع و عریض گھر کی اس دُنیا میں کیا ضرورت ہے؟ آخرت میں تم دُنیا کی نسبت اس کے زیادہ محتاج ہو''۔

پھر آپؑ نے فرمایا:

'وَبَلٰى اِنْ شِئْتَ بَلَغْتَ بِهَا الْآخِرَةَ تُقْرِيَ فِيْهَا الضَّيْفَ، وَتَصِلُ فِيْهَا الرَّحِمَ وَتُطْلِعُ مِنْهَا الْحُقُوْقَ مَطَالِعَهَا، فَاِذَا اَنْتَ قَدْ بَلَغْتَ بِهَا الْآخِرَةَ'

''ہاں! اگر تم چاہو تو اس وسیع گھر کے ذریعے آخرت حاصل کر سکتے ہو۔ وہ اس طرح کہ اس گھر میں مہمانوں کی تواضع کرو، صلہ رحمی کرو، اس کے واجب حقوق ادا کرو۔ اس طرح اس وسیع گھر کے ذریعے تم آخرت حاصل کر سکتے ہو۔''

نتیجہ یہ کہ اگر مادی وسائل کے حصول کا مقصد آخرت کو حاصل کرنا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا، معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنا ہو تو اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر مال کو جمع کرنے کا محرک حرص وطمع ہو اور انسان حصولِ مال میں، اس کے خرچ کرنے میں حلال وحرام کا پابند نہ ہو تو پھر اس سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے۔ بلاشبہ دُنیا پرست افراد اسی ذریعے سے اپنے اندر بہت سی صفاتِ رذیلہ بھی پیدا کر لیتے ہیں۔

محمد بن اسماعیل بن بزیغ حضرت امام رضا علیہ السلام کے ایک صحابی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے امامؑ سے سنا:

''لَا يَجْتَمِعُ الْمَالُ اِلَّا بِخِصَالٍ خَمْسٍ شَدِيْدٍ وَاَمَلٍ طَوِيْلٍ وَ حِرْصٍ غَالِبٍ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ وَاِيْثَارِ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ''۔

''مالِ دنیا صرف ان خصوصیات کی وجہ سے جمع ہو سکتا ہے: شدید بخل، طولانی آرزوئیں، طاقتور اور غالب حرص، قطع رحمی اور دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینا''۔ (وسائل الشیعہ، 19:12)

پانچواں باب

حسد

تمہید:۔

ایک اور اخلاقی برائی جس نے پوری انسانی تاریخ میں انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں، حسد ہے۔حسد کے معنی یہ ہیں کہ انسان دُوسروں کے پاس اللہ کی نعمتیں دیکھ کر جلے اور ان نعمتوں کے زوال کی خواہش کے ساتھ ساتھ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔

حسد انسان کی روح کی فضا کو تاریک اس کی زندگی کی فضا کو ظلماتی اور معاشرے کی فضا کو بدامنی اور بے سکونی سے بھر دیتا ہے۔حاسد کو دُنیا میں آرام نصیب ہوتا ہے نہ آخرت میں چین ملتا ہے۔ چونکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محسود کو اس نعمت سے محروم کردے جو اس کے پاس ہے۔لہٰذا وہ انواع واقسام کے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے، غیبت کرتا ہے، مختلف قسم کے ظالمانہ ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کا نفسیاتی بحران شدت اختیار کر لیتا ہے تو وہ قتل وخونریزی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

درحقیقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسد تمام برائیوں کی اصل جڑ اور شیطان کا بہت خطرناک جال ہے۔اس جال میں پھنس کر ابتدائے آفرینش میں آدمؑ کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔اسی وجہ سے حسد کو احادیث میں کفر کی تین بنیادوں میں شمار کیا گیا ہے: تکبر۔حرص۔حسد

حاسد انسان درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض کرتا ہے۔اس لئے اسے کفرِ خفی کی ایک قسم کہا جاتا ہے۔حسد کے بالمقابل ''خیرخواہی'' ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان دوسروں کو حاصل ہونے والی نعمتوں سے لطف اندوز ہو، اس نعمت کی حفاظت کی کوشش کرے۔اپنی سعادت کو دُوسروں کی سعادت میں مضمر سمجھے اور دُوسروں کے فائدے کو اپنا فائدہ سمجھے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ○ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ○ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ

قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○"

''اورآدمؑ کے دوبیٹوں کا قصہ انہیں سناؤ، جب ان دونوں نے اللہ کے حضور قربانی پیش کی۔ایک کی قربانی قبول ہوگئی اوردوسرے کی قربانی قبول نہ ہوئی۔(جس کی قربانی قبول نہ ہوئی،اُس نے اپنے بھائی سے) کہا: میں تجھے قتل کر کے چھوڑوں گا۔اُس نے کہا: میرا کیا گناہ ہے؟ اللہ تو صرف متقین کے اعمال قبول کرتا ہے۔اگر تو میرے قتل کیلئے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلئے ہرگز ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، اس لئے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا رب ہے۔اس کے نفس نے اس کیلئے اپنے بھائی کے قتل کو آسان بنادیا۔اس نے اُسے قتل کردیا اور خاسرین میں سے ہوگیا''۔(مائدہ:27تا30)

2۔ "اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ○ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ○"

''جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے،سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔باپ نے کہا: بیٹا! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، وہ تیرے خلاف کوئی منصوبہ نہ بنالیں، اس لئے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دُشمن ہے۔''(یوسف:4تا5)

3۔ "اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا○"

''آیا یہ لوگ اس لئے لوگوں (رسولؐ اور آلِ رسولؐ) سے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں نوازا ہے۔ہم نے آلِ فرعون کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو ملکِ عظیم دیا''۔(نسأ:54)

4۔ "وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○"

''بہت سے اہل کتاب اس حسد کی وجہ سے، جو اُن کے دلوں میں پایا جاتا ہے، یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پلٹا دیں، حالانکہ حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔پس تم عفو و درگزر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر بڑی قدرت رکھتا ہے''۔(بقرہ:109)

5۔ "وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ"

''اور حاسد کے شر سے، جب وہ حسد کرے۔''

6۔ "وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○"

''اسی طرح ان کے بعد آنے والے یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو، جو ہم سے پہلے ایمان لائے، بخش دے اور ہمارے دِلوں میں ان لوگوں کے خلاف نفرت پیدا نہ کر جو ایمان لائے۔ اے ہمارے رب! تو بے شک رؤف ورحیم ہے''۔(حشر:10)

7۔ "وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ○"

''اور ہم نے ان کے دلوں میں سے ہر قسم کا غِل (حسد، کینہ اور دُشمنی) نکال دیا اور وہ سب بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے''۔(حجر:47)

تفسیر اور نتیجہ:

پہلی آیت میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ حسد کیا اور آخر کار اُسے قتل کر دیا۔ یہ روئے زمین پر ہونے والا پہلا انسانی قتل تھا جو دوسرے مجرموں کیلئے ایک نمونہ بن گیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے رسولؐ! ان کو آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ ٹھیک ٹھیک سنا دو۔ جب ان دونوں نے اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کی۔ ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ (جس کی قربانی قبول ہوگئی، اُس نے دوسرے سے) کہا: اللہ کی قسم! میں تجھے ضرور قتل کر کے چھوڑوں گا۔ اُس نے جواب دیا: (اگر تیرا عمل قبول نہیں ہوا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے) اللہ تو صرف متقین کے اعمال قبول کرتا ہے''۔(مائدہ:27)

" وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ○"

یعنی میں نے تیرے لئے کوئی مشکل ایجاد نہیں کی کہ تو میری جان کے درپے ہوگیا ہے۔ تیرا مسئلہ تیرے اندر ہے۔ تیرا عمل خالص نہیں تھا اور اس میں تقویٰ موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اللہ نے اسے قبول نہیں کیا۔ وہ پاک ہے اور صرف پاک اعمال قبول کرتا ہے۔

پھر اس نے کہا: ''اگر تو مجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، اس لئے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا رب ہے''۔

"لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡكَ لِاَقۡتُلَكَ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ○"(مائدہ:28)

آخر کار حسد اور کینہ کی آگ اس دل میں اس طرح شعلہ ور ہوئی کہ اُس نے ان کے رشتہ اخوت کو جلا کر خاکستر کر دیا۔خون قابیل کی آنکھوں پر اُتر آیا۔

قرآن مجید فرماتا ہے کہ اس کے نفسِ سرکش نے اسے اپنے بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ کرلیا۔اُس نے اُسے قتل کر دیا اور خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہوگیا۔

"فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِیۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ○"(مائدہ:30)

بلاشبہ وہ نقصان اور خسارے میں مبتلا ہوگیا۔ہابیل جیسے نیک سیرت بھائی سے بھی محروم ہوگیا اور سکون واطمینان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا،اس لئے کہ اگر قاتل کا ضمیر ذرا بھی زندہ ہو تو وہ اُسے ہمیشہ مبتلائے عذاب رکھتا ہے اور آخرت میں بھی قاتل کو تباہی کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اُس نے اپنے بھائی کو سوتے ہوئے قتل کیا۔اس سے اس کے جرم کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جب حسد کی آگ بھڑکتی ہے تو وہ ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

لیکن بہت جلد وہ اپنے کئے پر پشیمان ہوگیا۔ایک گہرا غم واندوہ اُس کے دل ودماغ پر چھا گیا۔جب بھی اُس کی نظر اپنے بھائی کی خون آلود لاش پر پڑتی تو ایک عجیب سا وحشت واضطراب اس کے وجود پر چھا جاتا۔وہ اپنے بھائی کی لاش اُٹھائے پھرتا تھا اور اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اپنے بھائی کی لاش کو کہاں لے جائے تاکہ اپنے جرم کے نشان کو بھی چھپا سکے اور اس ہولناک منظر سے بھی نجات حاصل کر سکے۔

اُس کے اس عظیم گناہ کے باوجود اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا لطف اس پر ظاہر ہوا۔

''اللہ نے ایک کوا بھیجا جس نے زمین کھودنا شروع کر دی تاکہ اُسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح چھپائے۔جب اُس نے کوے سے یہ سبق سیکھا تو کہنے لگا کہ ہائے افسوس! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہیں تھا کہ اپنے بھائی کی لاش کو ہی دفن کر لیتا۔آخر کار وہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان ہوگیا۔''

"فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَهٗ كَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَةَ اَخِیۡهِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَةَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ○ۛ"(مائدہ:31)

بعض روایات میں ہے کہ قابیل کے سامنے دو کوے ظاہر ہوئے جو ایک دُوسرے سے لڑ رہے تھے۔ان میں سے ایک نے

دوسرے کو مار ڈالا۔ پھر اپنے پنجے سے زمین کھودی اور اُسے دفن کر دیا (نور الثقلین، 1:616)

بعض روایات میں ہے کہ وہ کوا کسی مردہ کوے کو لے آیا اور دفن کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اُس نے کوے کو اپنا کھانا زمین میں چھپاتے ہوئے دیکھا اور اس طرح مردے کو دفن کرنا سیکھا۔

وہ پشیمان تو ہوا لیکن اُس کی پشیمانی وہ پشیمانی نہ تھی جو اُسے توبہ پر مائل کرتی۔ اس طرح پشیمان ہونے کے باوجود گناہ کا بوجھ اُس کی گردن پر باقی رہا۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں: ایک یہ کہ آدمؑ کے بیٹوں نے جو قربانی اللہ کی بارگاہ میں پیش کی، وہ کیا تھی؟ اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی اور قابیل کی قربانی رد ہوگئی؟

قرآن مجید میں ان دونوں سوالوں کے جواب کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا[1] اور اس معاملہ کو مبہم رکھا گیا

اس بارے میں منقول احادیث بھی از لحاظِ سند و متن مختلف ہیں۔ عقل و منطق اور قرائن سے ہم آہنگ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو حکم دیا کہ ہابیل کو اپنا وصی مقرر کریں اور اسے اسمِ اعظم کی تعلیم دیں۔ قابیل چونکہ بڑا تھا، وہ اس بات پر مشتعل ہوگیا کہ یہ میرا حق ہے۔ آدمؑ نے ان دونوں کو حکم دیا کہ اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کریں۔

(ایک روایت کے مطابق ہابیل جانور پالتا تھا۔ اُس نے ایک موٹا تازہ جانور قربانی کیلئے پیش کیا۔ قابیل کاشتکار تھا، اس نے اپنی زرعی پیداوار میں سے بدترین حصہ قربانی کیلئے پیش کیا۔ دونوں نے اپنی قربانی ایک پہاڑ پر رکھ دی۔ آسمان سے ایک بجلی چمکی اور ہابیل کی قربانی کو جلا دیا جو قربانی کی قبولیت کی علامت تھی۔ قابیل کی قربانی اپنی جگہ پر پڑی رہی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی وصایت کیلئے ہابیل کی صلاحیت کی تائید کر دی) اس سے قابیل کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور اُس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا (نور الثقلین: 1:610)

بہرحال اس بُری حالت سے نکلنے کیلئے قابیل کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا اور اپنے عمل میں اخلاص پیدا کر کے اپنی معنوی کمی کی تلافی کرتا۔ (اس کو علمِ اخلاق میں غبطہ یا رشک کا نام دیا گیا ہے جو کہ ایک پسندیدہ چیز ہے) لیکن قابیل نے دُوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ اُس نے کوشش کی کہ اپنے بھائی کو اس نعمت سے محروم کر دے جو اُسے حاصل تھی۔ یہ بدترین راستہ تھا جو اُس نے منتخب کیا۔ اسی طرح اُس نے اپنے بھائی کا خون بہا کر اپنے حسد کی آگ بجھائی۔

اگر تکبر نے ابلیس کو ہمیشہ کیلئے اللہ کی بارگاہ سے دُور کر دیا اور حرص نے آدمؑ کو جنت سے نکال دیا تو حسد اس بات کا سبب بنا کہ قابیل اپنے بھائی کو قتل کر کے ہمیشہ کیلئے ملعون بن گیا۔ اب روئے زمین پر جتنے بھی قتل ہوتے ہیں، قتل کا آغاز گر ہونے کی حیثیت سے قابیل ہر قتل میں شریکِ جرم ہوتا ہے۔

---

[1] پہلے سوال کے بارے میں قرآن مجید خاموش ہے لیکن دُوسرے سوال کا جواب واضح طور پر قرآن مجید میں موجود ہے: ''مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ''۔ ''ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دُوسرے کی قبول نہیں ہوئی''۔

انسانی تاریخ بہت سے دردناک المیوں سے بھری پڑی ہے جن کی بنیادی وجہ صرف حسد تھی۔

آیات کے دوسرے گروہ میں حسد کی ایک اور کریہہ شکل اپنے تباہ کن اثرات کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان آیات کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ہے۔

حضرت یوسفؑ ظاہری حسن کے علاوہ سیرت وکردار کے حسن سے بھی مالا مال تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے منظورِ نظر بن گئے اور اسی چیز نے اُنؑ کے بڑے بھائیوں کے دل میں اُن کے خلاف حسد پیدا کر دیا۔ یہ مسئلہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب حضرت یوسفؑ نے اپنے والد سے کہا:

''ابا جان! میں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں''۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝

حضرت یعقوبؑ جانتے تھے کہ یہ خواب کوئی بچگانہ خواب نہیں ہے بلکہ یوسفؑ کے روشن مستقبل کی بشارت ہے۔ لہٰذا انہوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں کو نہ بتانا، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے خلاف کوئی منصوبہ بنالیں، اس لئے کہ شیطان انسان کا کھلم کھلا دشمن ہے۔

"قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝"

یہ معلوم نہیں ہے کہ برادرانِ یوسفؑ کو اس خواب کا پتا چلا یا نہیں؟ اگر انہیں اس کا پتا چلا ہو تو یہ اُن کے حسد میں اضافے کا باعث ہوا ہوگا۔ لیکن ان کے والد بہر حال جانتے تھے کہ اگر اس غیر معمولی خواب کا پتا چل گیا تو وہ ضرور یوسفؑ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا انہوں نے تاکید کے ساتھ حضرت یوسفؑ کو منع کر دیا کہ اس خواب کا اپنے بھائیوں سے ذکر نہ کریں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے فرطِ حسرت سے یوسفؑ کا یہ خواب اپنی بیوی کو بتا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیوی اس راز کو فاش نہیں کرے گی۔ لیکن یہ راز فاش ہوگا ہی اور حضرت یوسف کے بھائیوں کو اس کا علم ہو گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ خود اس راز کی حفاظت نہ کر سکے اور اپنا خواب اپنے بھائیوں کو بتا دیا (تفسیر برہان، 2433:2۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، 341:6)

قرآن مجید برادرانِ یوسفؑ کے جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۨ۝" (یوسف:8)

''یوسف اور اُس کا بھائی (بنیامین) ہم سے زیادہ ہمارے باپ کی نظر میں محبوب ہیں، حالانکہ ہم طاقتور ہیں (اور مشکلات میں اپنے باپ کی مدد کرتے ہیں) یقیناً ہمارا باپ کھلی گمراہی میں ہے''۔

اس طرح برادرانِ یوسفؑ نے اپنے باپ کی گمراہی کا فیصلہ سنا کر یوسفؑ کو اپنے اور اپنے باپ کے درمیان سے ہٹانے کا خطرناک منصوبہ بنالیا۔ انہوں نے ایک شیطانی سازش تیار کی جس کے مطابق طے پایا کہ یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا کہیں اور دُور دراز کسی صحرا میں پھینک دیا جائے تا کہ باپ کی توجہ ہماری طرف ہوجائے۔ اس کے بعد گناہ سے توبہ کر کے نیک بن جاؤ۔

"اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ○"(یوسف:9)

انہوں نے حضرت یوسفؑ کو قتل تو نہیں کیا لیکن حضرت یوسفؑ کو دُور دراز کے کسی صحرا میں پھینک دیا۔ اس سے حضرت یعقوبؑ کو اس قدر دُکھ ہوا کہ کثرتِ گریہ سے اُن کی بینائی زائل ہوگئی۔ لیکن حضرت یوسفؑ کا اس طرح دُور پھینک دیا جانا مصر پر ان کی حکومت کا پہلا قدم ثابت ہوا اور برادرانِ یوسفؑ اپنے والد کی نظرِ عنایت بھی حاصل نہ کر سکے۔

حسد کی موجیں اس قدر خطرناک ہوتی ہیں کہ بھائی کو بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیتی ہیں اور دُوسرے بہت سے گناہوں کا بھی سبب بنتی ہیں جن میں سے ایک جھوٹ ہے جو برادرانِ یوسفؑ نے اپنے گناہ کو چھپانے کیلئے اپنے اُس باپ سے بولا جو اللہ کا نبی تھا۔ اس طرح وہ نبی کی توہین کے بھی مرتکب ہوئے۔

تیسری آیت میں یہودیوں کا ذکر ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد اپنی کتب میں رسولؐ اللہ کی نشانیوں کا مطالعہ کر کے شام اور فلسطین کے علاقوں سے ہجرت کر کے مدینہ میں آبسی تھی اور حضورؐ کے ظہورِ پرنور کا انتظار کرنے لگی۔

لیکن رسولؐ اللہ کی بعثت کے بعد ان میں سے اکثر اپنے اُس باطنی عہد پر قائم نہ رہے اور نہ صرف حضورؐ کی حمایت میں کھڑے نہ ہوئے بلکہ آپؐ کے مخالفین کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا بنیادی سبب حسد تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے مادی مفادات کو خطرت میں محسوس کر رہے تھے۔

قرآن شریف اس حقیقت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

"اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا○"

''کیا یہ اس لئے لوگوں (رسول اللہ ﷺ اور آلِ رسولؐ) سے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے؟ حالانکہ ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت اور عظیم حکومت دی''۔ (نسأ:54)

ایک روز ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو، جن میں سے یہودی تعلق رکھتے ہیں، نبوت، حکمت اور حکومت عطا کی اور اب ہماری مشیت

کا فیصلہ یہ ہوا کہ یہ نعمت محمدؐ وآلِ محمدؐ کو عطا کریں۔ یہ سب کچھ ہماری حکمت اور مصلحت کی بنیاد پر تھا۔ کیا یہودی اس بات کو پسند کرتے تھے کہ جب یہ نعمت اُن کے پاس تھی تو کوئی اُن سے حسد کرتا؟ پس اب ان کے دل میں کیوں حسد کی آگ بھڑکنے لگی ہے؟

چوتھی آیت میں بھی اہلِ کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے پیشِ نظر یہودی ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لے آنے کے بعد تمہیں دوبارہ کفر کی حالت میں لوٹا دیں۔ وہ اس لئے ایسا چاہتے ہیں کہ ان کے اندر حسد پایا جاتا ہے، حالانکہ حق ان کیلئے واضح ہو چکا ہے۔ مگر تم انہیں نظر انداز کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

"وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○" (بقرہ:109)

حسد کے نتیجہ میں انسان اس قدر انحطاط میں گر جاتا ہے کہ نہ صرف مادی اُمور میں، جو عام طور پر انسانوں کے درمیان کشمکش اور ٹکراؤ کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ معنوی اُمور میں بھی دُوسرے سے حسد کرنے لگتا ہے، حالانکہ یہ ایسے اُمور ہیں جن میں کشمکش اور ٹکراؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور ہر کوئی انہیں حاصل کر سکتا ہے۔ بعض اوقات انسان حقیقت کو جانتے بوجھتے ہوئے حق کو پامال کر کے سعادت کا دروازہ اپنے اُوپر بند کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ دُوسروں کو بھی اس سعادت سے محروم کر دینے کا خواہش مند ہوتا ہے جو واقعی بری عجیب بات ہے۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے: ''حَسَداً مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِم'' اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے اس رویے کا اصل سبب وہ حسد ہے جو اِن کے رگ و پے میں بس چکا ہے۔ اس کا جہل و نادانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے آگے چل کر آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ:

"مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ"۔

یعنی حق کے ان پر واضح و آشکار ہو جانے کے بعد انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا۔

لیکن قرآن شریف مسلمانوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ ان حاسدوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ (اس لئے کہ ان کے حسد کی آگ ہی ان کی بہترین سزا ہے)۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیں کہ عفو و درگزر کی یہ پالیسی ہمیشہ جاری رہے گی اور ان کو یہ آزادی ہمیشہ میسر رہے گی کہ اللہ کے بندوں کیلئے جو مشکلات ان کا جی چاہے، پیدا کرتے رہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ یا تو یہ ہلاک ہو کر اُخروی عذاب میں گرفتار ہو چکے ہوں گے یا اسی دُنیا میں لشکرِ حق کے ہاتھوں کچلے جائیں گے۔

بہرحال یہ آیت نومسلم افراد کو یہ نصیحت کررہی ہے کہ یہودیوں اور دُوسرے بدخواہوں کے پیدا کردہ وسوسوں اور شکوک وشبہات کو کوئی اہمیت نہ دیں، اس لئے کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں، حسد کی بنیاد پر کررہے ہیں اور مسلمانوں کو ایمان اور تقویٰ کے زیرسایہ دیکھ کر انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

پانچویں آیت سورۂ فلق کی آیت ہے۔ اس میں بھی حاسدوں کے حسد کا ذکر ہے اور رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے اللہ کی پناہ طلب کریں۔

اس سورۃ کے آغاز میں رسولؐ اللہ کو حکم دیا گیا ہے:

"قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ"

''کہو میں صبح کی سفیدی کے رب کی پناہ میں آتا ہوں''۔

پھر اس چیز کے شر سے، جو اُس نے پیدا کی۔ پھر رات کی تاریکی اور گرہوں میں پھونک مارنے والی شیطانی طاقتوں کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد آخر میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے:

"وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ"

''اور میں حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، جب وہ حسد کرے۔''

یہاں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ دُنیا میں رونما ہونے والے فساد اور تباہی کا بیشتر حصہ حاسدوں کے حسد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ''بِرَبِّ الْفَلَقِ'' کے الفاظ سے ہوا ہے جس کے معنی ہیں ''صبح کی روشنی کا رب''۔ یہ الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دُنیا میں رونما ہونے والی تمام خرابیوں کا اصل سبب جہل وکفر وعناد کی تاریکیاں ہیں۔ اگر ان تاریکیوں کی جگہ علم، ایمان اور خیرخواہی کی روشنی لے لے تو ان شیطانی طاقتوں کی تدبیریں بے اثر ہوجائیں جو تاریکی کی آڑ میں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔

چھٹی آیت میں انصار کی مدح وستائش کے بعد ان کے بعد آنے والے گروہ کی تعریف کی گئی ہے جنہیں اصطلاحاً تابعین کہا جاتا ہے۔ اس گروہ کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۧ"

''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے، وہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے خلاف کینہ پیدا نہ کر جو ایمان لائے۔ بے شک تو رؤف ورحیم ہے''۔ (حشر:10)

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ باایمان افراد اپنے اور اپنے سے پہلے ایمان لانے والے اپنے برادرانِ ایمان کیلئے مغفرت کی دُعا مانگنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگتے ہیں کہ ان کے دل میں کسی صاحب ایمان کے خلاف کینہ وحسد پیدا نہ ہو، اس لئے کہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ جب تک یہ برائیاں دل سے مکمل طور پر زائل نہ ہوجائیں، محبت، اخوت اور اتحاد کے رشتے مضبوط نہیں ہوسکتے اور نہ ہی مسلم معاشرے کو کامیابی وترقی مل سکتی ہے۔

اس آیت میں لفظ ''غِلَ'' استعمال ہوا ہے جو ''غِلّ'' سے مشتق ہے۔ راغب اصفہانی اپنی معروف کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''غِل'' اصل میں اُس چیز کو کہتے ہیں جو چپکے سے اور بتدریج نفوذ کرتی ہے۔ بہتے ہوئے پانی کو بھی اسی لئے غَلَل، کہا جاتا ہے کہ وہ بتدریج اور آہستہ آہستہ درختوں کی جڑوں کے اندر اثر کرتا ہے۔

اس کے بعد خیانت کو اس لئے غلول کہا گیا کہ یہ بھی آہستہ آہستہ اور بتدریج اثر کرتی ہے۔ کینہ اور حسد بھی چونکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج دل میں داخل ہوتے ہیں، اس لئے انہیں ''غِلّ'' کہا گیا ہے۔

ساتویں اور آخری آیت میں اہلِ بہشت کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ○"

''ہم ان کے دلوں میں سے ہر قسم کا غِل (کینہ وحسد) دُور کردیں گے اور وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر ایک دُوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے''۔ (حجر: 47)

بلاشبہ اہلِ جنت ہر قسم کے حسد، کینہ اور عداوت سے پاک ہوں گے، اس لئے کہ یہ اہلِ جہنم کی صفات ہیں۔ ان کے درمیان محبت وصلح وصفا جیسے جذبات اس لئے حکم فرما ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے یہ ناپسندیدہ چیزیں ان کے دلوں سے زائل ہوچکی ہوں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر دُنیا میں کینہ، حسد اور عداوت جیسی بُری صفات انسانوں کے دل سے نکل جائیں تو دُنیا بھی جنت کی طرح ہوجائے جہاں سب لوگ امن وامان اور محبت اخوت کے ساتھ باہم زندگی بسر کریں گے۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر حسد کے تباہ کن اثرات اور قرآن کی زبان سے حسد کی شدید مذمت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ حسد کی وجہ سے بھائی بھائی کو قتل کردیتا ہے۔ حسد انسان کو مشاہدۂ حق سے باز رکھتا ہے۔ حسد کی وجہ سے معاشرے کی فضا تاریک ہوجاتی ہے۔ حسد محبت کے رشتوں کو پارہ پارہ کردیتا ہے۔ جو لوگ حسد میں مبتلا ہوتے ہیں، حسد کی آگ دُنیا میں ہی ان کی زندگی کو جہنم بنادیتی ہے۔

حسد، احادیث کی روشنی میں

احادیث میں بھی حسد کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس شدت کے ساتھ احادیث میں حسد کی مذمت کی گئی ہے، شاید ہی کسی اور برائی کی اس طرح مذمت کی گئی ہو۔ہم یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث بیان کرتے ہیں:

1. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ یَأْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"۔

''حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو''۔(المحجۃ البیضا، 325:5)

یہ حدیث اس بات کو بخوبی بیان کرتی ہے کہ حسد کی آگ انسان کی سعادت کے سارے سرمائے کو، جو اُس نے ساری زندگی میں کمایا ہو، جلا کر خاکستر کر سکتا ہے۔

2۔ "اِنَّ الْحَسَدَ یَأْکُلُ الْاِیْمَانَ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"۔

''حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے'' (اصولِ کافی، 306:2)

بلاشبہ حسد کی آگ صرف نیک اعمال کو ہی نہیں بلکہ سرمایہ ایمان کو بھی جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

3۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَدُ شَرُّ الْاَمْرَاضِ"۔

''اس حدیث کی رو سے کوئی اخلاقی بیماری حسد سے زیادہ بری نہیں ہے (غرر الحکم، فارسی شرح، 91:1)

4۔ نیز امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"رَأْسُ الرَّذَائِلِ الْحَسَدُ"۔

''حسد تمام اخلاقی رذائل کی جڑ ہے''۔(غرر الحکم فارسی شرح، 91:1)

5۔ ایک اور حدیث میں امیر المومنینؑ حسد کے آغاز اور انجام کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لِلّٰہِ دَرُّ الْحَسَدِ مَا اَعْدَلَہُ بَدَءَ بِصَاحِبِہٖ فَقَتَلَہُ"۔

''شاباش ہے حسد کو، یہ کس قدر عادل ہے، پہلے انسان کو دولت مند بناتا ہے، پھر قتل کر دیتا ہے۔''(بحار الانوار، 241:70۔شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، 316:1)

6۔ امیر المومنینؑ سے مروی ایک اور حدیث ہے:

"ثَمَرَةُ الْحَسَدِ شَقَاءُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"۔

''حسد کا ثمر دُنیا اور آخرت کی بدبختی ہے''۔(غرر الحکم)

7۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"آفَةُ الدِّيْنِ الْحَسَدُ وَالْعُجْبُ وَالْفَخْرُ"۔

تین چیزیں دین کیلئے آفت ہیں: حسد۔خود پسندی اور فخر''۔(الحجۃ البیضا،327:5)

8۔ ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات کر رہے تھے تو اُنؑ کی نظر ایک شخص پر پڑی جو عرشِ الٰہی کے زیر سایہ کھڑا تھا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: یا اللہ! یہ کون ہے جس پر تیرے عرش نے سایہ کیا ہوا ہے؟

اللہ تعالی نے جواب میں فرمایا:(بحار الانوار،275:70)

"يَامُوْسٰى هٰذَا مِمَّنْ لَمْ يَحْسُدُ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهٖ"۔

''اے موسیٰ! جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے لوگوں کو عطا کیا، اس نے اس پر کبھی حسد نہیں کیا''۔

9۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"سِتَّةٌ يَدْخُلُوْنَ النَّارَ قَبْلَ الْحِسَابِ بِسِتَّةٍ"۔

''چھ قسم کے لوگ چھ برائیوں کی وجہ سے، قبل از حساب جہنم میں داخل ہوں گے''۔

لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! وہ کون لوگ ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:

"قَالَ: اَلْاُمَرَاءُ بِالْجَوْرِ، وَالْعَرَبُ بِالْعَصَبِيَّةِ، وَالدَّهَاقِيْنُ بِالتَّكَبُّرِ، وَالتُّجَّارُ بِالْخِيَانَةِ، وَاَهْلُ الرُّسْتَاقِ بِالْجَهَالَةِ، وَالْعُلَمَاءُ بِالْحَسَدِ"۔

''حکمران ان اپنے ظلم کی وجہ سے، عرب اپنے تعصب کی وجہ سے، وڈیرے اپنے تکبر کی وجہ سے، تاجر خیانت کی وجہ سے، دیہاتی جہالت کی وجہ سے اور علماء حسد کی وجہ سے''۔(الحجۃ البیضا،327:5)

گویا حسد علماء کیلئے سب سے بڑی مصیبت اور بلا ہے۔

ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اِنَّهٗ سَيُصِيْبُ اُمَّتِيْ دَاءُ الْاُمَمِ! قَالُوْا: وَمَا دَاءُ الْاُمَمِ؟ قَالَ: اَلْاَشَرُ وَالْبَطَرُ وَالتَّكَاثُرُ وَ

التَّنَافُسُ فِي الدُّنْيَا، وَالتَّبَادُدُوَالتَّحَاسُدُحَتّٰى يَكُوْنَالْبَغْعُ، ثُمَّ يَكُوْنُ الْهَرْجُ!"(المحجة البيضا، 326:5)

''بہت جلد تمام اُمتوں کو لگنے والی بیماری میری اُمت کو بھی لگنے والی ہے۔لوگوں نے پوچھا: یارسولؐ اللہ! وہ کیا بیماری ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہوس رانی، عیاشی، کثرت طلبی، دُنیا پرستی میں مقابلہ، ایک دوسرے کے خلاف حسد، یہاں تک کہ وہ ظلم کا باعث بن جائے گا۔ پھر اس کے بعد بدامنی میں مبتلا ہو جائیں گے''۔

چند اہم مسائل:۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں حسد اور اس کے تباہ کن نتائج کا جائزہ لینے کے بعد اس موضوع کے چند دیگر پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تا کہ بحث ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ وہ پہلو یہ ہیں:

1۔ حسد کے معنی

2۔ حسد کے محرکات

3۔ حسد کی علامات

4۔ انفرادی اور معاشرتی سطح پر حسد کے اثرات

5۔ حسد کے علاج کے طریقے

1۔ حسد کے معنی اور حسد و رشک میں فرق:۔ [1]

علم اخلاق کے علمائے بزرگ نے حسد کی تعریف اس طرح کی ہے:

''حسد دُوسروں کے پاس موجود کسی نعمت کے زوال کی آرزو کو کہتے ہیں، خواہ وہ نعمت حاسد کو ملے یا نہ ملے''۔

بنابرایں حسد ایک تخریبی اور وِیرانگر عمل ہے جس کا مقصد دوسروں کے پاس موجود اُن نعمتوں کو تباہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دے رکھی ہیں۔ حسد کی بدترین صورت یہ ہے کہ انسان دوسروں کے پاس موجود اللہ کی نعمتوں کو زائل کرنے کی صرف آرزو ہی نہ کرے بلکہ اس کیلئے عملی کوشش بھی کرے۔ یہ حسد حاسد کے باطن میں چھپی ہوئی خباثت کی بدترین صورت کی عکاسی کرتا ہے۔

اس سے کم تر درجہ کا حسد یہ ہے کہ حاسد انسان محسود سے کسی نعمت کو سلب کر کے خود حاصل کرنا چاہے۔ اگرچہ یہ بھی صفاتِ

---

[1] حسد عربی زبان کا لفظ ہے جس کیلئے فارسی میں رشک کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں لفظِ رشک جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے، عربی میں اس کیلئے ''غِبْطَہ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

رذیلہ میں سے ہےلیکن اس کی برائی کا درجہ مذکورہ بالاصورت کی نسبت کم تر ہے۔

اس سے بھی کم تر درجہ کا حسد یہ ہے کہ انسان دُوسرے کے پاس موجودنعمت کے زائل ہونے کی صرف آرزو دل میں رکھتا ہےاوراس سلسلہ میں نہ کسی سے کوئی بات کرتا ہواور نہ ہی کوئی عملی قدم اُٹھاتا ہو۔

یہ کیفیت اگرانسان کے اندرغیرارادی اورغیراختیاری طور پر پیدا ہواس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔(کہا جاتا ہے کہ اکثر لوگوں میں یہ غیراختیاری طور پر پیدا ہوجاتی ہے)۔لیکن اگرارادی اوراختیاری طور پر پیدا ہوتو بلاشبہ یہ رذائلِ اخلاقی میں سے ہے۔لیکن اس کے بارے

علمِ اخلاق میں یہ بحث موجود ہے کہ آیا یہ گناہ ہے یانہیں؟اس سوال کی وجہ بھی یہ مسئلہ ہے کہ آیا کسی انسان کے اندر کسی ایسی بُری صفت کا پیدا ہونا،جس کی بنیاد پر کوئی براعمل انجام نہ پائے،حرام ہے یاصرف ایک اخلاقی انحطاط ہے!

حسد کے مقابل غبطہ ہے جسے اُردو میں رشک کہتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ آرزو کرے کہ جونعمت کسی اورکو حاصل ہے، ویسی ہی نعمت یا اُس سے بہترنعمت اُسے بھی حاصل ہو جائے۔ایسا شخص کسی دُوسرے سے زوالِ نعمت کا آرزومند نہیں ہوتا۔

لیکن بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ غبطہ یعنی رشک بھی ایک قسم کا حسد ہےاور وہ اس بات کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں(لسان العرب اورالتحقیق فی کلمات القرآن الکریم)۔

لیکن یہ نقطہ نظراس صورت میں صحیح ہوگا جب حسد کے معنی کووسعت دے دی جائے اوراپنی نعمتوں اوردُوسروں کی نعمتوں کے درمیان موازنہ کرنے کوبھی حسد کے زمرے میں داخل کردیا جائے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ صرف ایک لفظی اختلاف رہ جاتا ہےاورحسد کے معروف معنی وہی ہیں جواُوپر بیان ہوچکے ہیں۔

بہرحال حسدایک قابلِ مذمت صفت ہے جبکہ رشک یاغبطہ نہ صرف یہ کہ قابلِ مذمت نہیں ہے بلکہ پسندیدہ بھی ہے کیونکہ یہ ترقی اورپیشرفت کامحرک ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَغْبُطُ وَلَایَحْسُدُ، وَالْمُنَافِقُ یَحْسُدُ وَلَا یَغْبُطُ"۔

''مؤمن رشک کرتا ہے،حسدنہیں کرتااورمنافق حسدکرتا ہے،رشک نہیں کرتا''(اصولِ کافی،2:307)

2۔حسد کے محرکات:۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ ایک بُری صفت کئی دوسری برائیوں کا سرچشمہ اورسبب بنتی ہے۔اسی اصول کے مطابق حسد سے بھی کئی بُری صفات جنم لیتی ہیں اورحسد بھی بعض دُوسری بری صفات سے جنم لیتا ہے۔

علمائے علم اخلاق نے حسد کے بہت سے عوامل اور محرکات بیان کئے ہیں جن میں سے ایک عداوت اور کینہ ہے جس کی بنیاد پر کوئی شخص اپنے دُشمن کے پاس موجود کسی نعمت کے زوال کی آرزو کرتا ہے۔

حسد کا ایک اور محرک تکبر ہے۔ جب کوئی متکبر انسان کسی دُوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھتا ہے تو اس کے زوال کی آرزو کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر یہ نعمت اس شخص کے پاس رہی تو خود اُس کی بڑائی خطرے میں پڑ جائے گی۔

حسد کا ایک اور محرک حُبِ ریاست ہے۔ اس بیماری میں مبتلا انسان آرزو کرتا ہے کہ دُوسرے لوگ نعمتوں سے محروم ہو جائیں تا کہ ان پر حکومت کر سکے، اس لئے کہ اگر یہ مال و دولت اور طاقت وغیرہ میں دُوسروں سے برتر نہ ہو تو اس کی حکومت اور اقتدار کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی۔

حسد کا چوتھا محرک اپنے مقاصد تک نہ پہنچنے کا خوف ہوتا ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب انسان اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھنا شروع کر دے کہ اللہ کی نعمتیں محدود ہیں۔ اگر کوئی نعمت کسی اور کو مل گئی تو اِس کے اُس نعمت تک پہنچنے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔

پانچواں سبب احساسِ کمتری اور احساسِ حقارت ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو کسی مقام اور مرتبہ یا کسی نعمت کے قابل نہیں سمجھتے، وہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ آرزو کرنے لگتے ہیں کہ دُوسرے بھی کسی مقام و مرتبہ کو حاصل نہ کر سکیں تا کہ وہ بھی اِس جیسے ہو جائیں۔

حسد کا چھٹا محرک بخل اور خباثتِ نفس ہے۔ بخیل انسان نہ صرف یہ کہ اپنے پاس موجود اللہ کی نعمتوں سے دُوسروں کو فائدہ نہیں پہنچانا چاہتا بلکہ وہ یہ بھی خواہش کرتا ہے کہ دُوسروں کو اللہ کی نعمتیں حاصل نہ ہوں۔

درحقیقت یہ کسی انسان کی تنگ نظری اور کمینگی ہوتی ہے جو انسان کو حسد پر مائل کرتی ہے۔ بعض اوقات مندرجہ بالا چھ کے چھ محرکات کسی شخص میں یکجا ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ان میں سے چند کسی میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی نسبت سے کسی میں کم اور کسی میں زیادہ حسد پایا جاتا ہے۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر حسد کی بنیادی وجہ عقیدے کی خرابی ہوتی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت، اُس کے لطف وعنایت، حکمت وتدبیر اور عدالت پر ایمان رکھتا ہو، وہ کس طرح حسد میں مبتلا ہو سکتا ہے!

حاسد انسان درحقیقت زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہا ہوتا ہے کہ تو نے فلاں شخص کو فلاں نعمت کیوں دی ہے؟ تو نے یہ نعمت مجھے کیوں نہیں دی؟ اس طرح یہ شخص اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدالت پر اعتراض کر رہا ہوتا ہے۔ حاسد انسان زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ اگر اللہ نے کوئی نعمت کسی اور کو دے دی تو مجھے ایسی نعمت نہ دے سکے گا (العیاذ باللہ)۔ لہٰذا بہتر ہے کہ یہ نعمت اُس سے سلب ہو جائے اور مجھے مل جائے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حاسد افراد کا توحیدِ افعالی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت پر ایمان متزلزل نظر آتا ہے، اس

لئے کہ جوانسان ان حقائق پر ایمان رکھتا ہے، وہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں کی تقسیم کسی حساب کتاب پر اور کسی حکمت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اُسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ مجھے دُوسروں سے زیادہ اور بہتر نعمتیں عطا فرمائے۔

اسی لئے حضرت زکریا علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَلْحَاسِدُ وَّلِنِعْمَتِیْ مُتَسَخِّطٌ لِقَضَائِیْ غَیْرَرَاضٍ لِقِسْمَتِیَ الَّتِیْ قَسَمْتُ بَیْنَ عِبَادِیْ"۔ (المحجة البیضاء 5:326)

''حاسد میری نعمت کا دُشمن، میرے فیصلے پر غضبناک اور میری تقسیم پر ناراض ہوتا ہے''۔

اس سے ملتی جلتی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"لَاتَحْسُدَنَّ النَّاسَ عَلٰی مَآاٰتَیْنٰھُمْ مِنْ فَضْلِیْ وَلَاتَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی ذٰلِكَ وَلَاتَتَّبِعْهُ نَفْسَكَ فَاِنَّ الْحَاسِدَ سَاخِطٌ لِنِعَمِیْ ضَادٌّ لِقَسْمِیَ الَّذِیْ قَسَمْتُ بَیْنَ عِبَادِیْ وَمَنْ یَّكُ كَذٰلِكَ فَلَسْتُ مِنْهُ وَلَیْسَ مِنِّیْ"۔

''اے موسیٰؑ، خبردار! جو کچھ میں نے لوگوں کو اپنے فضل سے عطا کیا ہے، اس پر حسد نہ کرنا اور للچائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف نہ دیکھنا اور اپنے نفس کو اس کے پیچھے نہ چلانا، اس لئے کہ حاسد میری نعمت کا دُشمن اور میری تقسیم کا مخالف ہوتا ہے اور جو کوئی ایسا ہو، اس کا مجھ سے میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ (اصولِ کافی 2:307)

مختصر یہ کہ حاسد کے ایمان کی بنیادیں پختہ نہیں ہوتی ہیں ورنہ اُسے معلوم ہوتا کہ حسد، توحید سے انحراف کی ایک قسم ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عرب شاعر کا کہنا ہے:

الاوقل لمن کان لی حاسداً
اتدری علی من اسأت الادب
اسات علی اللہ فی فعلہ
اذاانت لم ترض لی ماوھب

''حاسد سے کہو کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کس کی بارگاہ میں بے ادبی کر رہے ہو؟ تمہاری بے ادبی اور گستاخی

اللہ اور اُس کے کاموں کے بارے میں ہے، جب تک تم مجھ پر اُس کی عطا اور بخشش پر راضی نہ ہو جاؤ''۔

3۔حسد کی علامات:۔

دیگر صفاتِ رذیلہ کی مانند حسد بھی بعض اوقات پوشیدہ اور بعض اوقات آشکار ہوتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی اُن علامات کو پہچانیں جن کا ماہرین علم اخلاق یا ماہرین نفسیات نے ذکر کیا ہے یا جنہیں ہم اپنے تجربات کی بنیاد پر جانتے ہیں۔اس طرح ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ اس بیماری کے وجود میں آتے ہی اسے پہچان کر اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کریں، اس سے قبل کہ یہ بیماری ہمارے وجود میں پختہ ہو جائے۔

حسد کی جو علامات بیان کی گئی ہیں، ان میں سے بعض چیدہ چیدہ علامات یہ ہیں:

1۔ جب حاسد کسی کے بارے میں سنتا ہے کہ اُسے کوئی نعمت ملی ہے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے، خواہ اُس کے آثار ظاہر نہ کرے۔

2۔ بعض اوقات اس حسد سے آگے بڑھ کر غیبت اور عیب جوئی میں مصروف ہو جاتا ہے۔

3۔ بعض اوقات مزید آگے بڑھ کر دُشمنی وعداوت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔

4۔ بعض اوقات وہ محسود کے بارے میں بے اعتنائی اور لاتعلقی کا اظہار کرنے پر قناعت کرتا ہے۔کوشش کرتا ہے کہ اُسے نہ دیکھے اُس کے بارے میں کوئی بات نہ سنے۔اگر کبھی کوئی شخص اس بارے میں بات کرے تو حاسد کوشش کرتا ہے کہ موضوع بدل کر اُسے کسی اور بات میں لگایا جائے اور اگر کبھی وہ اس کے بارے میں اظہار نظر کرنے پر مجبور ہو جائے تو کوشش کرتا ہے کہ اس کی نمایاں اور ممتاز صفات کے بارے میں خاموش رہے۔ان اُمور میں سے ہر ایک حسد کی علامت ہوسکتا ہے۔

اہلِ بیتِ عصمت کی احادیث میں بھی اس بارے میں واضح بیانات پائے جاتے ہیں، مثلاً امیر المومنینؑ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

يَكْفِيْكَ مِنَ الْحَاسِدِ اَنَّهُ يَغْتَمُّ فِيْ وَقْتِ سُرُوْرِكَ''۔

''حاسد کو پہچاننے کیلئے یہی کافی ہے کہ جب تو خوش ہو، وہ غمگین ہوتا ہے''۔(سفینۃ البحار: حسد)

اس کے برعکس جب انسان کو غم یا نقصان پہنچتا ہے تو حاسد کو خوشی ہوتی ہے۔سورۂ توبہ، آیت: 50 میں منافقین کے بارے میں ہے:

''اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ○''(توبہ:50)

''جب کبھی تمہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے تو اُنہیں برا لگتا ہے اور جب کبھی تمہیں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ

کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے سے اپنا انتظام کر رکھا تھا اور وہ خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں''۔

دیگر بھی متعدد آیات میں حسد کرنے والے کافروں کے اسی طرح عمل کا ذکر پایا جاتا ہے۔جن میں سے ایک آیت آغازِ بحث میں بیان ہو چکی ہے کہ کفار، اللہ سے ملنے والی نعمتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد کرتے تھے۔

احادیث میں بھی یہ بات بکثرت بیان کی گئی ہے کہ حاسد محسود کی نعمت کے زائل ہونے پر خوش ہوتا ہے اور اُس کی کامیابیوں پر ناخوش ہوتا ہے۔ایک حدیث میں امیر المومنینؑ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْحَاسِدُ یَفْرَحُ بِالشُّرُوْرِ وَیَغْتَمُّ بِالسُّرُوْرِ"۔

''حاسد شر اور برائی سے خوش اور خوشی سے غمگین ہوتا ہے''۔(غرر الحکم:1474)

4۔حسد کے منفی اثرات:۔

انفرادی اور معاشرتی زندگی پر حسد کے بہت سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔شاید ہی کسی اور بری صفت کے اتنے منفی اثرات رونما ہوتے ہوں جتنے حسد کے ہوتے ہیں۔ان میں سے اہم اور قابلِ ذکر یہ ہیں:

1۔ حاسد ہمیشہ اپنے ہی حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جس قدر دوسروں کی کامیابیوں میں اضافہ ہوتا ہے، اُسی قدر حاسد کے غم واندوہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُس کی نیندیں بھی اڑ جاتی ہیں اور وہ بیمار اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔حالانکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر توجہ رکھے اور ان پر شاکر رہے تو وہ بھی خوشحال اور اطمینان وسکون سے بھرپور زندگی گزار سکتا ہے۔

متعدد احادیث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:۔

"اَسْوَءُ النَّاسِ عَیْشاً اَلْحَسُوْد"۔

''سب سے بری زندگی حاسد کی زندگی ہوتی ہے۔''(تصنیف غرر الحکم:300)

ایک اور حدیث میں بھی امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

"لَارَاحَةَ لِحَسُوْد"۔

''حاسد کو کوئی آرام میسر نہیں ہوتا۔''(بحار الانوار، 256:70)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

اَلْحَسَدُ شَرُّ الْاَمْرَاض"۔

''حسد بدترین بیماری ہے''۔(شرح غرر الحکم:331)

ایک اور حدیث میں ہے:

"اَلْعُجْبُ لِغَفْلَةِ الْحُسَّادِ عَنْ سَلَامَةِ الْاَحْسَادِ"۔

''حاسد پر تعجب ہے کہ وہ اپنی صحت وسلامتی سے غافل ہوتا ہے''۔(بحارالانوار، 256:70)

ہم اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، اگرچہ اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں:

"اَلْحَسَدُ لَا یَجْلِبُ اِلَّا مَضَرَّةً وَّغَیْظًا، یُوْهِنُ قَلْبَكَ وَیَمْرَضُ جِسْمَكَ"۔

''حسد انسان کے اندر صرف ضرر اور غضب ہی پیدا کرتا ہے، دل کو کمزور اور جسم کو بیمار کر دیتا ہے''۔(بحارالانوار، 256:70)

2۔ حسد کے معنوی نقصانات مادی اور جسمانی نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں، اس لئے کہ حسد انسان کے ایمان کی بنیادیں ہلا دیتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کے عدل وحکمت کے بارے میں بدگمان کر دیتا ہے، اس لئے کہ دل کی گہرائی سے اصل میں حاسد اللہ تعالیٰ کی تقسیمِ نعمت پر معترض ہوتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک مشہور حدیث میں آیا ہے: (تصنیف غرر الحکم: 300)

"لَا تُحَاسِدُوْا فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْكُلُ الْاِیْمَانَ كَمَا تَاْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ"۔

''ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"آفَةُ الدِّیْنِ الْحَسَدُ وَالْعُجْبُ وَالْفَخْرُ"۔

''دین کی آفت حسد، خود پسندی اور فخر ہیں''۔(اصول کافی، 307:2)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ یَغْبِطُ وَلَا یَحْسُدُ، وَالْمُنَافِقُ یَحْسُدُ وَلَا یَغْبِطُ"۔

''مومن رشک کرتا ہے، حسد نہیں کرتا اور منافق حسد کرتا ہے، رشک نہیں کرتا''(اصولِ کافی، 307:2)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حسد ایمان کی رُوح سے بالکل سازگار نہیں ہے اور منافقت کی رُوح کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

گزشتہ بحث میں ہم یہ حدیثِ قدسی بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ حسد سے پرہیز کرو کیونکہ حاسد میری نعمت کا دُشمن اور میری تقسیم کا مخالف ہوتا ہے۔

3۔ حسد کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ حسد ایک ایسا ضخیم حجاب بن جاتا ہے جو انسان کو حقائق کی معرفت سے محروم

کر دیتا ہے، اس لئے کہ حاسد محسود کی مثبت خصوصیات کو دیکھ ہی نہیں سکتا، خواہ وہ اس کا اُستاد، مربی اور بزرگ ہی کیوں نہ ہو بلکہ اس کی نظریں ہمیشہ اس کے منفی پہلوؤں، کمزوریوں اور خامیوں کی تلاش میں مصروف رہتی ہیں۔ بعض اوقات تو وہ اس منفی رویے میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ محسود کی خوبیاں بھی اسے خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس حقیقت کو حضرت علی علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"اَلْحَسَدُ حَبْسُ الرُّوْحِ"۔

''حسد رُوح کا زندان ہے''۔ (شرح غرر الحکم: حکمت: 371)

4۔ حسد کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ حاسد اپنے دوستوں سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی رحمت ہوتی ہے جو دُوسروں پر نہیں ہوتی۔ اگر انسان کے اندر حسد کی بیماری پائی جاتی ہو تو وہ ہر اس شخص سے حسد کرنے لگتا ہے جس کے پاس کوئی ایسی نعمت ہو جو اس کے پاس نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے دُور ہونے لگتے ہیں اور اس کے اور دوسرے کے درمیان پائے جانے والے محبت کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس حقیقت کی تائید بھی امیر المومنین علیہ السلام کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

"اَلْحَسُوْدُ لَا خُلَّةَ لَهُ"۔

''حاسد کا کوئی دوست نہیں ہوتا''۔ (شرح غرر الحکم: حکمت: 371)

5۔ حسد کے منفی اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ انسان کو ترقی کرنے اور بلند مقامات کے حصول سے روک دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسد انسان کو لوگوں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے اور جو شخص معاشرے میں تنہا اور الگ تھلگ ہو، وہ کبھی بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس بات کی تصدیق بھی حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

"اَلْحَسُوْدُ لَا يَسُوْدُ"

''حاسد کبھی سیادت اور سرداری حاصل نہیں کر سکتا''۔ (غرر الحکم: 1017)

6۔ حسد کا سب سے منفی اثر یہ ہے کہ اس کی وجہ

سے انسان مزید بہت سے گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے۔ وہ دُوسروں کو نعمت سے محروم کرنے کیلئے مختلف قسم کے گناہوں، مثلاً ظلم، جھوٹ، غیبت، تہمت، چغلخوری وغیرہ جیسے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ اپنے پست مقصد کے حصول کیلئے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈہ استعمال کرتا ہے تا کہ اپنے محسود کو نقصان پہنچا سکے۔

اس بات کی تصدیق حضرت علی علیہ السلام کی اس حدیث سے ہوتی ہے:

"اَلْحَسُوْدُ كَثِيْرُ الْحَسَرَاتِ، وَمُتَضَاعَفُ السَّيِّئَاتِ"۔ (تصنیف الغرر: 301۔ شرح

غرر الحکم: 1520)

7۔ حسد کا ایک برا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حاسد محسود کو کوئی نقصان پہنچانے سے قبل اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ انواع واقسام کی رُوحانی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دُنیا وعقبیٰ کے عذاب کا مستحق بنالیتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث قابلِ ذکر ہے۔

"اَلْحَاسِدُ مُضِرٌّ بِنَفْسِهٖ قَبْلَ اَنْ يَضُرَّ بِالْمَحْسُوْدِ، كَاِبْلِيْسَ اُوْرِثَ بِحَسَدِهٖ بِنَفْسِهٖ اللَّعْنَةُ، وَلِاٰدَمَ الْاِجْتِبَاءُ وَالْهُدٰى"۔

''حاسد محسود سے قبل اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، جس طرح ابلیس نے حسد کی وجہ سے اپنے آپ کو ملعون بنادیا جبکہ آدمؑ کی برگزیدگی نے ہدایت کا راستہ کھول دیا''۔ (بحار الانوار، 255:70)

5۔ حسد کے درجات:۔

علمائے علمِ اخلاق نے حسد کے مختلف درجات کا ذکر کیا ہے جن میں سے دو درجات مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز ہیں:

1۔ وہ حسد جو انسان کے دل اور رُوح کی گہرائی میں پنہاں ہوتے ہیں اور انسان آسانی سے اس پر قابو رکھتا ہے تاکہ اس کے اثرات انسان کے قول وفعل میں ظاہر نہ ہوں۔

2۔ انسان کے اندر حسد کی حالت ایسی ہو کہ وہ اس پر قابو نہ رکھ سکتا ہو اور اس کے اثرات اس کے قول وفعل سے ظاہر ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ سب یا اکثر لوگوں سے باطن میں حسد موجود ہوتا ہے لیکن جب تک اس کے اثرات قول وفعل میں ظاہر نہ ہوں، ان کا گناہ نہیں لکھا جاتا۔ اس بارے میں جناب رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے:

"ثَلَاثٌ لَا يَنْجُوْ مِنْهُنَّ اَحَدٌ: اَلظَّنُّ، وَالطِّيَرَةُ، وَالْحَسَدُ، وَسَاُحَدِّثُكُمْ بِالْمَخْرَجِ مِنْ ذٰلِكَ، اِذَا ظَنَنْتَ فَلَا تُحَقِّقْ، وَاِذَا تَطَيَّرْتَ فَامْضِ، وَاِذَا حَسَدْتَ فَلَا تَبْغِ"۔

''تین چیزیں ایسی ہیں جن سے کوئی نجات حاصل نہیں کرسکتا: بدگمانی، وہم اور حسد۔ میں تمہیں ان سے نجات کی راہ بتاتا ہوں۔ جب تم کسی کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہو جاؤ تو اس کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش نہ کرو۔ جب کبھی وہم میں گرفتار ہو جاؤ تو اس کی طرف توجہ نہ کرو اور اپنی راہ پر چلتے جاؤ اور جب حسد میں مبتلا ہو جاؤ تو ظلم نہ کرو''۔ (المحجۃ البیضاء، 325:5)

ایک اور حدیث میں ہے

"قَلَّ مِنْ يَنْجُوْ مِنْهُنَّ"۔

''بہت کم لوگ ان سے نجات پا سکتے ہیں''۔(المحجۃ البیضاء،5:325)

اس تعبیر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کوئی عمومی اور ہمہ گیر حکم نہیں ہے اور اس کا اطلاق انبیاؑ و اولیاؑ پر نہیں ہوتا، اس لئے کہ اگر ان کا باطن حسد سے پاک نہ ہوتا تو وہ ان اعلیٰ مقامات پر فائز نہ ہو سکتے۔ بنابرایں جس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ ''کوئی شخص حسد سے محفوظ نہیں رہ سکتا، حتیٰ کہ انبیاؑ'' کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو حاسدوں کے حسد کا نشانہ نہ ہو، حتیٰ کہ انبیاؑ کے بھی حاسد ہوتے ہیں۔

بہرحال اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حسد اخلاقی رذائل میں سے ہے، خواہ عملی طور پر ظاہر ہو یا نہ ہو۔ بحث صرف اس میں ہے کہ اگر وہ عملی شکل اختیار نہ کرے تو گناہ ہے یا نہیں؟ بظاہر ایسی صورت میں اس کے گناہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ بہرحال ایک بری صفت ہے۔

علامہ نراقی معراج السعادۃ میں فرماتے ہیں:

''اگر حسد انسان کو برے اعمال پر مائل کرے اور وہ غیبت و بدگوئی کا مرتکب ہوجائے تو یقیناً اس نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن اگر وہ زبان پر قابو رکھے اور اپنے قول و فعل سے حسد کو ظاہر نہ ہونے دے لیکن باطن میں محسود کی نعمت کے زوال کا آرزومند ہو اور اُسے نقصان پہنچانے کا خواہش مند ہو اور اس بات کو برا بھی نہ جانتا ہو تو اس صورت میں بھی وہ گناہگار رہوتا ہے''۔(معراج السعادۃ:429)

لیکن بظاہر دُوسری قسم کے حسد کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس طرح حسد کا عدم ظہور بھی دو اقسام میں تقسیم ہوجاتا ہے: ایک وہ جس پر حاسد کو افسوس ہوتا ہے اور وہ اسے برا محسوس کرتا ہے اور ایک وہ جس پر اُسے کوئی افسوس نہیں ہوتا اور اُسے برا نہیں لگتا اور وہ اس حالت کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ یہ حالت گناہ کے زمرے میں شمار ہوتی ہو لیکن اس کے گناہ ہونے پر کوئی پختہ دلیل موجود نہیں ہے۔

6۔ حسد کا علاج:۔

گزشتہ مباحث میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ حسد ایک خطرناک بیماری ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ انسان کے دین اور دُنیا دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

دیگر اخلاقی رذائل کے علاج کی طرح حسد کا علاج بھی دو طریقوں سے کیا جاسکتا ہے:

1۔ علمی طریقہ 2۔ عملی طریقہ

علمی طریقہ میں حاسد کیلئے ضروری ہے کہ وہ دو باتوں پر توجہ کرے: رُوح اور جسم پر حسد کے تباہ کن اثرات اور حسد کی

پیدائش کے محرکات۔

جس طرح ہیروئین کے نشے میں مبتلا شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس نشے میں مبتلا افراد کے انجام پر غور کرے اور دیکھے کہ کس طرح اس نشے نے اُن کی جسمانی صحت کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کے بیوی بچے اور معاشرے میں ان کی عزت اور حیثیت کو نقصان پہنچا، کس طرح وہ جوانی میں موت کے منہ میں چلے گئے، کسی نے اُن کی موت پر دکھ اور غم محسوس نہیں کیا بلکہ شکر کیا کہ اس کی موت سے خاندان کو ایک مصیبت سے نجات ملی۔ اسی طرح حاسد کو چاہئے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ حسد ایک ایسی بیماری ہے جو جلد ہی اس کے جسم کو بھی بیمار کر دے گی اور اس کی روح کو کھوکھلا کر دے گی۔ اس کے آرام و سکون کو غارت کر دے گی اور غم واندوہ کی ایک مستقل چادر اس کے دل پر اُوڑھا دے گی۔ ان سب سے بدتر یہ کہ حسد اسے اللہ کی بارگاہ میں قابلِ نفرت بنا دے گا، اُس کا انجام ابلیس اور قابیل کے انجام کی مانند ہوگا اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے بھی وہ محسود کو اُس نعمت سے محروم نہیں کر سکے گا جس پر وہ اُس سے حسد کر رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص بار بار ان احادیث کا مطالعہ کرے جن میں حسد کے نقصانات کو بیان کیا گیا ہے تو یقیناً اس بیماری کے علاج میں مثبت اور مؤثر پیشرفت ہو سکتی ہے۔

حاسد کو ان خطوط پر بھی سوچنا چاہئے کہ اگر منشیات کا استعمال روح اور جسم کی صحت و سلامتی پر برے اثرات ڈالتا ہے اور قبل از وقت موت کا سبب بنتا ہے، اسی طرح وہ بھی حسد کی وجہ سے نہ صرف رُوحانی اور جسمانی صحت سے محروم ہو جائے گا بلکہ اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہو جائے گی، اس لئے کہ درحقیقت وہ اللہ کی حکمت اور اس کی تقسیم پر اعتراض کر کے کفر و شرک کے گڑھوں میں گر رہا ہے۔

دوسری طرف سے وہ حسد کے عوامل و محرکات کے بارے میں غور و فکر کرے اور ایک ایک کر کے ان عوامل و محرکات کی بیخ کنی کی کوشش کرے۔ اگر برے دوستوں کی صحبت کی وجہ سے وہ اس بیماری میں مبتلا ہوا ہے تو فوراً ایسے دوستوں سے قطع تعلق کر لے۔ اگر بخل اور تنگ نظری کی وجہ سے اس بیماری میں مبتلا ہوا ہے تو ان کا علاج کرے۔ اگر ایمان کی کمزوری اور توحید افعالی کی وجہ سے اس گرداب میں گرفتار ہوا ہے تو اپنے ایمان کی مضبوطی اور معرفتِ توحید میں اضافے کی کوشش کرے۔ اگر احساسِ کمتری کی وجہ سے حسد میں مبتلا ہوا ہے تو اپنی ذات، اپنی استعداد اور صلاحیتوں کا نئے سرے سے مثبت انداز میں جائزہ لے کر اپنی خود اعتمادی کو بحال کرے اور اللہ پر توکل کرتے ہوئے ترقی و پیش رفت کی راہ پر قدم بڑھائے اور حسد کو اپنے آپ سے دُور کرے۔

بہتر یہ ہے کہ حاسد ان تمام امور کا خلاصہ خصوصاً احادیثِ معصومینؑ کو ایک کاغذ پر لکھے اور دن میں چند بار تنہائی میں اسے بلند آواز سے پڑھ کر اپنے آپ کو سنائے۔ ایسا کرنے سے چند ہی دنوں میں اس کے مثبت اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ اس کا رُوح اور جسم بتدریج حسد کی گرفت سے آزاد ہوتے جائیں گے اور سلامتی و سعادت کی روشنی اس کے قلب و ذہن کو منور کرنے لگے گی۔

حاسد کو یہ نکتہ خاص طور پر نظر رکھنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے وقت اور صلاحیتوں کو محسود کی نعمت کے زوال کی بجائے اپنی ترقی اور

پیشرفت کیلئے استعمال کرے تو وہ کافی حدتک ترقی اور پیشرفت کرسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر حاسد کو چاہئے کہ وہ حسد کے محرکات کو رشک کے محرکات میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے اور تخریبی قوت کو تعمیری قوت میں تبدیل کرے۔

یہ بات حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

"اِحْتَرِسُوْا مِنْ سُوْرَةِ الْجُمَدِ وَالْحِقْدِ وَالْغَضَبِ وَالْحَسَدِ وَاَعِدُّوْا لِكُلِّ شَیْءٍ مِنْ ذٰلِكَ عِدَّةً تُجَاهِدُوْنَ بِهَا مِنَ الْفِكْرِ فِی الْعَاقِبَةِ وَمَنْعِ الرَّذِیْلَةِ وَطَلَبِ الْفَضِیْلَةِ"۔

''اپنے آپ کو بخل، کینہ، غضب اور حسد کی شدت سے بچاؤ اور ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ کرنے کیلئے وسیلہ تیار کرو جیسے فکر عاقبت، رذائل کو روکنا اور فضائل کی خواہش کرنا''۔ (تصنیف غرر الحکم: 300)

عملی طریقہ یہ ہے کہ کوئی بھی عمل بار بار انجام دینے سے پختہ عادت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر حاسد محسود کی شخصیت اور حیثیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی حیثیت اور ساکھ کو بہتر بنانے کی کوشش کرے، محسود کی غیبت اور بدگوئی کرنے کی بجائے اُس کی خوبیوں کی تعریف کرے، اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کی بجائے اُس کی مدد کرنے کی کوشش کرے، نہ صرف خود اُس کا خیر خواہ ہو بلکہ دُوسروں کو بھی اُس کی خیر خواہی کی تلقین کرے تو آہستہ آہستہ حسد اُس کے اندر سے ختم ہو جائے گا اور خیر خواہی اس کی جگہ لے لے گی اور اُس کا باطن پاکیزگی اور نورانیت سے بھر جائے گا۔

اسی طرح حسد کی ضد کی مشق کرنا حسد کی بیماری کا علاج کرنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"اِذَا حَسَدْتَ فَلَا تَبْغِ"۔

''جب تم حسد کرو تو حسد پر عمل نہ کرو اور محسود پر کوئی ظلم نہ کرو''۔ (تحف العقول: 50)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

"اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَسْتَعْمِلُ حَسَدَهُ"۔

''مومن اپنے حسد پر عمل نہیں کرتا''۔ (بحار الانوار، 323:55)

حسد کے علاج میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی رضا پر راضی رہے اور اپنی زندگی پر قناعت کرے۔ اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"مَنْ رَضِیَ بِحَالِهٖ لَمْ یَعْتَوِرْهُ الْحَسَدُ"۔

''جو اپنی حالت پر راضی ہو، کبھی حسد میں مبتلا نہیں ہوتا''۔ (تصنیف غرر الحکم: 300)

7۔ نُصح وخیر خواہی:۔

حسد کی ضد نصح اور خیر خواہی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نہ صرف دوسروں کی نعمت کے زوال کا آرزومند نہ ہو بلکہ اس نعمت کی بقا اور اس میں اضافے کا خواہاں ہو۔ بالفاظِ دیگر جو خیر وخوبی اپنے لئے پسند کرتا ہے، دُوسروں کیلئے بھی پسند کرے۔ یہ اُن پسندیدہ صفات میں سے ہے جن پر قرآن واحادیث میں بہت تاکید کی گئی ہے۔

تمام انبیاؑ اپنی قوم کے ناصح اور خیر خواہ تھے۔قرآن شریف میں حضرت نوحؑ کا جذبۂ خیر خواہی اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"۔

''میں اپنے رب کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور اللہ کی طرف سے اُن چیزوں کا علم رکھتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''(اعراف:62)

اس آیت میں تبلیغِ رسالت کے بعد اُمت کی نصیحت اور خیر خواہی کا ذکر کیا گیا ہے جو حسد، بخل اور خیانت کی ضد ہے۔الفاظ کے مختصر فرق کے ساتھ یہی بات حضرت ہودؑ کے بارے میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے:

"اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ○"

''میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہارے لئے ایک امین خیر خواہ ہوں''۔(ایضاً:68)

یہی بات حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں بھی کہی گئی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ صرف یہ چار رسول ہی اپنی اپنی قوم کے خیر خواہ نہ تھے بلکہ یہ خصوصیت تمام انبیاؑ اور معصومینؑ میں پائی جاتی تھی۔اس کے سچے پیروکاروں کو بھی اس صفت سے مزین ہونا چاہئے اور حاسد وبخیل نہیں ہونا چاہئے۔

رسولؐ اللہ نے ایک انصاری کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔لوگوں کو اس کے بارے میں تجسس ہوا اور اس کے حالات کی تحقیق کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی نیکیاں اور عبادات انجام نہیں دیتا تھا۔رات کو جلد سو جاتا تھا اور پھر صبح کی نماز کیلئے بیدار ہوتا تھا۔آخر کار انہوں نے خود اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے اندر کونسی خاص بات ہے کہ رسولؐ اللہ نے تمہارے بارے میں یہ بشارت دی۔

اس نے جواب دیا:

"مَا هُوَ اِلَّا مَا تَرَوْنَ غَيْرَ اِنِّيْ لَا اَجِدُ عَلٰى اَحَدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فِيْ نَفْسِيْ غِشًّا وَّلَا حَسَدًا عَلٰى خَيْرٍ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ"۔(المحجة البیضاء،5:325)

''میرا حال تو وہی ہے جو تم دیکھ چکے ہو۔ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ اللہ نے کسی مسلمان کو کوئی خیر اور بھلائی عطا کی

ہوتواس پر میرے دل میں کوئی کدورت اور حسد پیدانہیں ہوتا (بلکہ میں سب کا خیرخواہ ہوں اوراُن کی نعمتوں پر خوش ہوں)''۔

ایک اورحدیث میں ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

"اِنَّ اَعْظَمَ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَاللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَمْشَاهُمْ فِيْ اَرْضِهِ بِالنَّصِيْحَةِ لِخَلْقِهٖ"۔(اصولِ کافی:28)

''قیامت کے دن اللہ کے ہاں سب سے بلند مقام اُس شخص کا ہوگا جس نے روئے زمین پر اللہ کی مخلوق کی خیرخواہی میں سب سے زیادہ تگ ودو کی ہوگی''۔

ایک اورحدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیرخواہی کے معیار کواس طرح بیان فرمایا ہے:

لَيَنْصَحُ الرَّجُلُ مِنْكُمْ اَخَاهُ كَنَصِيْحَتِهٖ لِنَفْسِهٖ"۔(اصول کافی:28)

''تم میں سے ہرایک کواپنے برادرمومن کا اُتناہی خیرخواہ ہونا چاہئے جتناوہ اپنا خیرخواہ ہوتا ہے''۔

اُردواورفارسی میں نصیحت اورنصح کے الفاظ کسی کونصیحت کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔لیکن عربی میں ان الفاظ کے معنی بہت وسیع ہیں۔

راغب اصفہانی اپنی مشہورکتاب ''المفردات'' میں لکھتے ہیں کہ نصح اورنصیحت ہراُس قول یافعل کوکہتے ہیں جس میں دُوسروں کا فائدہ اورمصلحت پنہاں ہواور یہ لفظ اصل میں خلوص اوراخلاص کے ہم معنی ہے۔اسی لئے خالص شہدکوناصح کہاجاتا ہے۔درزی کے کام کوبھی اسی لئے نصح کہاجاتا ہے کہ وہ لباس کی اصلاح کرتا ہے۔چونکہ خیرخواہ انسان دوسروں کے اُمورکی اصلاح کیلئے خلوص واخلاص کے ساتھ کوشاں ہوتا ہے،اس لئے اُس کے عمل کیلئے نصح اورنصیحت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔بنیادی طور پر ہرخالص اور صاف چیزکوخواہ وہ عمل ہو یاقول،مادی اُمورسے متعلق ہو یامعنوی اُمورسے متعلق،اس پرنصح کے لفظ کااطلاق ہوتا ہے۔

لہٰذا جب اخلاقی مباحث میں نصیحت کا ذکرآیاہےتو اس کے معنی ہرقسم کے حسد،بخل،کینہ اورخیانت کوترک کرنے کے ہوتے ہیں۔

چھٹا باب

غرور وخود بینی

تمہید:۔

اخلاقی رذائل میں سے غرور ایک ایسی صفت ہے جو نہ صرف علمائے اخلاق کی نظر میں بلکہ عوام کی نظر میں بھی ناپسندیدہ ہے۔ اس صفتِ رذیلہ کے نتیجہ میں انسان اپنے آپ سے بیگانہ اور اپنے بارے میں جہالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ دُوسروں کے بارے میں بھی جاہل اور بے خبر ہو جاتا ہے اور اپنی فروی اور معاشرتی حیثیت کے بارے میں بھی لاعلمی اور بے خبری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

غرور انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور اور شیطان کے نزدیک کر دیتا ہے۔ حقائق کو اس کی نظر میں معکوس کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ شدید مادی اور معنوی نقصان اُٹھاتا ہے۔

مغرور افراد معاشرے میں ہمیشہ ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور اپنی لامحدود توقعات کی وجہ سے معاشرے میں الگ تھلگ ہو جاتے ہیں۔ غرور اور بھی بہت سی بری صفات، مثلاً احساسِ برتری، تکبر، خود پسندی، دُوسروں کے بارے میں کینہ وحسد اور ان کی تحقیر کا باعث بنتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ابلیس کے دھتکارے جانے کی بنیادی وجہ غرور تھا۔ ماضی میں جن اُمتوں کی دعوت قبول کرنے کا انکار کیا، اس کی وجہ بھی یہی صفتِ رذیلہ تھی۔

فرعون اور نمرود جیسے افراد غرور کی وجہ سے اللہ سے دُور ہوئے اور ایسی ذِلت اور بدبختی میں مبتلا ہوئے جو سب کیلئے درسِ عبرت ہو گئی۔

بعض اوقات کوئی شخص غرور میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات کوئی قوم اور نسل اس بری صفت کا شکار ہو جاتی ہے۔ دُوسری قسم بلاشک وشبہ بہت خطرناک ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے بعض اوقات پورا ملک یا پوری دُنیا جنگ کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ پہلی اور دُوسری عالمی جنگ کے اسباب میں سے ایک اہم سبب جرمنوں کا نسلی غرور تھا۔

اس تمہید کے بعد ہم لغت اور علمائے اخلاق کی تشریحات کی روشنی میں ''غرور'' کے مفہوم کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد اس موضوع کا قرآن وحدیث کی روشنی میں مطالعہ کریں گے۔

1۔غرور کا مفہوم:۔

یہ لفظ عربی زبان اور قرآن وحدیث میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوا ہے۔فارسی اور اُردو میں بھی یہ لفظ تقریباً انہی معنوں یا ان کے لوازم کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

راغب اصفہانی اپنی مشہور کتاب ''المفردات'' میں غرور (غین پر زبر کے ساتھ) کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو فریب دے اور غفلت میں مبتلا کر دے، خواہ وہ چیز مال اور مقام ہو یا شہوت اور شیطان۔

صحاح اللغہ میں غرور کے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں کہ اس سے مراد وہ تمام چیزیں جو انسان کو غافل کر دیتی ہیں یا اُسے دھوکا دیتی ہیں (خواہ مال و دولت، مقام و مرتبہ ہوں یا علم و دانش)۔

مجمع البحرین میں کہا گیا ہے کہ غرور سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا ظاہر خوبصورت اور دلکش اور باطن ناپسندیدہ، مجہول اور تاریک ہو۔

التحقیق فی کلمات القرآن الکریم میں اس لفظ پر بحث کرتے ہوئے اہل لغت کے نظریات کو بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ ''اس لفظ کے بنیادی معنی وہ غفلت ہے جو کسی اور چیز کی تاثیر کے سبب انسان میں پیدا ہوتی ہے۔جہل، دھوکا، فریب، نقصان اور شکست وغیرہ اس کے لوازم یعنی لازمی نتائج ہیں۔''

المحجۃ البیضاء فی تھذیب الاحیاء میں، جو کہ علم اخلاق کی بہترین کتاب شمار ہوتی ہے اور امام غزالی کی احیاء العلوم کی تہذیب و تکمیل ہے، غرور کے معنی اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

> ''غرور ان چیزوں پر خوش ہونے کا نام ہے جو انسان کی ہوائے نفس اور طبیعتِ انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ اس کی وجہ انسان کی غلط فہمی یا شیطان کا فریب ہوتا ہے۔جو شخص بھی یہ سمجھتا ہو کہ وہ ایک اچھا انسان ہے (اور اس میں کوئی خامی نہیں ہے) خواہ مادی لحاظ سے ہو یا معنوی لحاظ سے، اور اس کا نظریہ کسی بے بنیاد خیال پر قائم ہو تو ایسا شخص حقیقت ایک برا آدمی ہے۔اکثر لوگ اپنے آپ کو اچھا آدمی سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔لہٰذا وہ برے لوگ شمار ہوں گے، اگرچہ اُن کی شکل اور شدت مختلف ہو''۔(293:6)

تفسیر نمونہ میں اس لفظ کے معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ غرور اسم مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ دھوکا دینے والا۔شیطان کو اس لئے مغرور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وسوسوں کی مدد سے انسان کو دھوکا دیتا ہے اور غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔درحقیقت شیطان غرور کا ایک مصداق ہے ورنہ ہر وہ انسان، کتاب، مقام و مرتبہ، وسوسہ یا کوئی بھی چیز، جو انسان کو گمراہ کرے، غرور کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔

غرور قرآن مجید کی روشنی میں

اگرچہ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن بعض آیات میں اگرچہ یہ لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن اس لفظ کا مفہوم مکمل طور پر ان آیات میں بیان ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں غور کریں:

1۔ "قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○"

''شیطان نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا'' (اعراف:12)

2۔ "فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○"

''قوم نوحؑ کے کافر سرکردہ افراد نے کہا: ہم تمہیں اپنے جیسا بشر سمجھتے ہیں، جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے، وہ ہماری نظر میں پست اور سادہ لوح افراد ہیں اور ہم نہیں سمجھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی برتری حاصل ہے۔ بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔۔۔ اُنہوں نے مزید کہا: اے نوحؑ! تم نے ہم سے بہت بحث کر لی، جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو، اُسے لے ہی آؤ، اگر تم سچے ہو''۔ (ھود: 27 تا 32)

3۔ "قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ○"

''انہوں نے کہا: اے شعیب! تمہاری اکثر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور ہم تمہیں اپنے درمیان کمزور پاتے ہیں، اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور ہمارے مقابلے میں تمہاری کوئی قوت نہیں ہے''۔(ھود:91)

4۔ ''وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝''

''فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا: اے میری قوم! کیا ملکِ مصر میرا نہیں؟ اور کہا یہ نہریں میرے حکم سے نہیں چل رہی ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ میں اس شخص سے بہتر ہوں جو ایک پسماندہ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کرسکتا؟''(زخرف۔51۔52)

5۔ ''ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝''

''ان (یہود) کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم چند دن سے زیادہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ ان کی افترا پردازیوں نے ان کے دین کے معاملے میں ان کو فریب میں مبتلا کر دیا''۔(آلِ عمران:24)

6۔ ''فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ''

''انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور بولے: اے صالح! اگر تم واقعی رسول ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو''۔(اعراف:77)

7۔ ''يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝''

''وہ (جہنمی) ان (اہلِ جنت) سے کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں۔ لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ تم (رسول کی موت کے) منتظر رہتے تھے اور ہر چیز میں شک کرتے تھے اور تمہاری آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور شیطانِ فریب کار نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا''۔(حدید:14)

8۔ ''هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰي مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ○ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ○"

''یہ (منافق) وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جولوگ رسولؐ اللہ کے قریب ہیں، اُن کو زکوٰۃ نہ دوتا کہ وہ ان کے پاس سے پراگندہ ہوجائیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ کے ہیں لیکن منافق اس بات کو نہیں سمجھتے''۔(منافقون:7تا8)

9۔ "فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ○"

''جب انسان کا رب اُسے انعام واکرام کے ذریعے آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے بڑی عزت بخشی''۔(فجر:15)

10۔ "اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ○ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ○"

''کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غالب گروہ ہیں؟ یہ گروہ شکست سے دوچار ہوگا اور یہ پشت دِکھا کر بھاگیں گے''۔(القمر:44تا45)

11۔ "وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا"

''جن لوگوں نے اپنے دین کو بازیچہ بنالیا اور دُنیوی زندگی نے اُنہیں دھوکا دیا، اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو''۔(انعام:70)

12۔ "اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے، لہٰذا دُنیا کی زندگی کا دھوکا نہ کھانا اور ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اللہ کے بارے میں فریب دے جائے''۔(لقمان:33)

تفسیر اور نتیجہ:۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ غرور کی چنگاریاں سب سے پہلے انسان کی تخلیق کے موقع پر شیطان کے چہرے پر دیکھی گئیں اور جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں ہے کہ جب اللہ نے اُس سے پوچھا کہ

''جب میں نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو پھر کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا؟ اُس نے جواب دیا:

میں اس سے بہتر ہوں۔تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا''۔

"قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ○"(اعراف:12)

غرور اور خود پسندی کے حجاب نے اس کی بصیرت کو اس طرح ڈھانپ لیا کہ وہ اس بات کو بھی نہ جان سکا کہ اس کی سعادت اللہ کے حکم کی اطاعت میں ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مصیبت کے گڑھے میں اس طرح گر پڑا کہ ہمیشہ کیلئے مردود اور ملعون ہوگیا۔بنابرایں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح دُنیا پھر کے متکبرین ومستکبرین کا گرو ابلیس ہے،اسی طرح وہ دُنیا بھر کے مغروروں کا بھی گرو ہے، اس لئے کہ استکبار اور غرور لازم وملزوم ہیں۔

غرور کی وجہ سے ابلیس یہ نہ جان سکا کہ خاک آگ سے برتر اور توبہ،اصرار بر گناہ سے افضل ہے۔لہٰذا اُس نے گمراہی کی پگڈنڈی پر قدم رکھا اور اب تک اسی گمراہی میں سرگرداں ہے۔

دُوسری آیت میں پہلے اُولوالعزم نبی حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہوا ہے جو اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتا ہے کہ اُن کی قوم کی گمراہی اور سرکشی کی بنیادی وجہ اُن کا غرور تھا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اس کی قوم کے سرکردہ کافروں نے کہا:تم تو ہم جیسے انسان ہو،جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے، وہ بھی معاشرے کے پست اور سادہ لوح افراد ہیں۔ہمیں تو نظر نہیں آتا کہ تمہیں ہم پر کوئی برتری حاصل ہے بلکہ تم لوگ تو جھوٹے معلوم ہوتے ہو''۔

"فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ○"(ھود:27)

چند آیات کے بعد مزید نخوت وتکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''اے نوحؑ!تم نے ہم سے بہت بحث کر لی،اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو،اُسے لے آؤ''۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ○(ھود:32)

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ از رُوئے عقل انسان امکانی خطرے اور ضرر سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن اس مغرور قوم کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ حضرت نوحؑ کے معجزات میں اُن کی حقانیت کے آثار دیکھ چکے تھے۔اللہ کی طرف سے عذاب کا امکان بھی بہت قوی تھا،اس کے باوجود نہ صرف بے رُخی اور بے اعتنائی کر رہے تھے بلکہ حضرت نوحؑ کو چیلنج دے رہے تھے کہ اگر سچے

ہوتو عذاب لا کر دِکھاؤ۔

جوغرور شیطان کیلئے حجاب بن گیا تھا،قومِ نوحؑ کیلئے بھی حجاب بن گیااور آخرکار وہ عذابِ خدا میں گرفتار ہو گئے اوران کا نام ونشان مٹ گیا۔تاریخ کے ہر دَور میں مغرور افراد واقوام کا یہی انجام ہوا۔

تیسری آیت میں حضرت شعیبؑ کی قوم کا ذکر ہے۔یہ قوم حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد آئی اور اپنے غرور وخود بینی کی وجہ سے یہ قوم بھی قومِ نوحؑ کے انجام سے دوچار ہوگئی۔قرآن شریف فرماتا ہے۔

''انہوں نے شعیبؑ سے کہا کہ تمہاری زیادہ تر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں،تم ہمارے درمیان کمزور ہو ۔تمہارے قبیلے کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر چکے ہوتے۔ہمارے سامنے تمہاری کوئی طاقت نہیں ہے''۔

"قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ ○"(ھود:91)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کے منطقی دلائل اور معجزات الٰہی کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن ان کا غرور انہیں حق کو تسلیم کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔آخرکار ایک آسمانی کڑک نے پلک جھپکنے کی دیر میں ان کو جلا کر راکھ کر دیا۔

چوتھی آیت فرعون کے بارے میں ہے اور اس میں بھی اسی صفتِ رذیلہ کا ایک کریہہ منظر پیش کیا گیا ہے۔فرعون کے غرور اور نخوت نے اس دماغ میں اس قدر ہوا بھر دی تھی کہ وہ نہ صرف یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واضح دلائل سے بے اعتنائی کر رہا تھا بلکہ بچگانہ باتوں سے اپنی سرکشی کی تاویلیں کر رہا تھا۔قرآن مجید کہتا ہے:

''فرعون نے اپنی قوم کے درمیان منادی کرائی اور کہا: کیا میں ملکِ مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں میرے حکم سے جاری نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ میں اس شخص سے بہت برتر ہوں جو ایک پست معاشرتی حیثیت رکھتا ہے اور صحیح طرح سے بات بھی نہیں کر سکتا؟''

"وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۵۱

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ○"(زخرف:51تا52)

اپنے بیہودہ طرزِ استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں؟اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے؟

فرعون اور نمرود جیسے افراد اپنی نخوت اور اپنے غرور کی وجہ سے اپنی باتوں کے بیہودہ پن پر بھی توجہ نہیں دیتے تھے۔وہ ایسی احمقانہ باتیں کرتے ہیں کہ ان کے قریبی عزیز اور ساتھی بھی دل میں اُن پر ہنستے ہیں۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ حالت معارفِ الٰہیہ اور

حقائق کی شناخت کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہوتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی لکنت ان کے بچپن میں تھی۔ مبعوث ہونے کے بعد اللہ نے ان کی زبان کی لکنت دُور کردی تھی لیکن فرعون موجودہ صورت حال کی طرف توجہ کرنے کی بجائے ماضی کی بات پر بضد رہا اور ان کی زبان کی لکنت کا طعنہ دیتا رہا۔

پانچویں آیت میں یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ قوم بھی اپنے غرور کی وجہ سے اپنے آپ کو غیر منطقی اور غیر معقول امتیازی حیثیت کا مالک سمجھتی تھی۔ ان کا یہی طرزِ فکر ان کی گمراہی وسرکشی کا بنیادی سبب تھا۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

''آیاتِ الٰہی سے یہودیوں کی رُوگردانی کی) وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم چند دن سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (چونکہ ہم ایک برتر قوم ہیں، ہمارے سنگین جرائم کے باجود ہمیں کم سزا ملے گی) ان کا یہی افترا تھا جس نے دین کے معاملہ میں انہیں مغرور بنادیا تھا''۔

"ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ"(آلِ عمران:24)

بنی اسرائیل کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ گناہگار ترین اور سرکش ترین قوم تھی جس کی ایک بڑی وجہ اُن کا غرور تھا۔ بدقسمتی سے اب یہودیوں کا ایک گروہ جو صیہونی کہلاتا ہے، ایسے غرور کے نشے میں مست ہے۔ یہ لوگ ہر روز نت نئے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی تاریخ کے صفحات میں مزید سیاہ ابواب کا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور دُوسروں کیلئے کسی قسم کے حق کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو برتر قوم اور دُوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

چھٹی آیت حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں ہے۔ وہ بھی غرور کے نشے میں مست تھے کہ اپنے رسول سے کہتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو عذاب لاکر دِکھاؤ۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے معجزہ دیکھا مگر اس کی مخالفت پر اس قدر جری ہوگئے کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

''انہوں نے (معجزہ کے طور پر پہاڑ سے برآمد ہونے والی) اُونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم کے خلاف سرکشی کی اور کہنے لگے: اے صالح! اگر تم رسول ہو تو لاؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے رہتے ہو''۔

"فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ○"(اعراف:77)

اس کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے کہ ایک وحشت ناک زلزلے نے اُنہیں آن پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں بے جان جسم بن کر رہ گئے۔ اس طرح ایک مغرور اور اللہ سے غافل قوم اپنے منطقی انجام سے دوچار ہوگئی۔

ساتویں آیت اہلِ جہنم کے بارے میں ہے جو میدانِ محشر میں تاریکیوں میں ہوں گے جبکہ اہلِ ایمان اپنے ایمان کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہوں گے۔ ایسے میں یہ منافق اہلِ جہنم اُن سے کہیں گے: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں! لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ تم (رسول کی موت کے) منتظر تھے، تم ہر چیز میں شک کرتے تھے، تمہاری آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور شیطان نے تمہیں اللہ کے بارے میں فریب میں مبتلا کر دیا۔

"يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"(الحدید:14)۔

اگلی آیت میں واضح طور پر کہا گیا: کہ ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہارے پاس کوئی جائے فرار نہیں ہے اور تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے"۔

اس آیت میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔ ان منافق دوزخیوں کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ غرور میں مبتلا اور طویل آرزوؤں میں جکڑے ہوئے تھے۔

آٹھویں آیت میں دُنیا میں اہلِ ایمان کے بارے میں منافقین کے غرور کی تصویر پیش کر رہی ہے۔ یہ اپنی دولت کی وجہ سے نادار مومنین کی تحقیر کرتے تھے۔ قرآن شریف فرماتا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں کو زکوٰۃ نہ دو جو رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں تاکہ وہ ان کے پاس سے بکھر جائیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں مگر منافق یہ بات نہیں سمجھتے"۔

"هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ○"(منافقون:7)

اس کے بعد وہ اپنے غرور اور نخوت میں مزید آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ جب ہم جنگ سے مدینہ واپس جائیں گے تو معززین، ذلیلوں کو وہاں سے باہر نکال دیں گے، حالانکہ عزت تو ہے ہی اللہ کیلئے اور اُس کے رسول اللہ ﷺ کیلئے لیکن منافق یہ بات نہیں جانتے۔

"يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ○"(منافقون:8)

اگر یہ منافق مغرور نہ ہوتے تو اس طرح اپنی عزت اور دولت کے بل بوتے پر مومنین کو حقیر نہ سمجھتے اور کفر و نفاق کی وادیوں میں نہ بھٹکتے پھرتے۔

نویں آیت میں انسان، یا بالفاظِ دیگر غیر تربیت یافتہ انسانوں کی کم ظرفی اور پستی کا ذکر کیا گیا ہے جو نعمت اور عزت پر مغرور

ہوتے ہیں اور سرکشی کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جب اللہ انسان کو انعام واکرام سے آزماتا ہے تو وہ (مغرور ہو کر) کہتا ہے: اللہ نے مجھے عزت بخشی''۔(فجر:15)

"فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ○"

اگر انسان یہ بات شکر گزاروں کے طور پر کہے تو اُس کی طبیعت میں تواضع پیدا ہوجائے۔وہ یتیموں اور ناداروں کی مدد کرے لیکن اگلی آیات کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کہنا غرور اور نخوت کی وجہ ہے،اسی لیے تو نہ صرف یہ کہ اس کا مثبت اور مطلوبہ اثر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ سرکشی اور طغیان گری کا سبب بنتا ہے۔

دسویں آیت میں مکہ کے خود پرست وخود پسند مشرکین کا ذکر ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک متحد اور غالب گروہ ہیں''۔

"اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ○"(قمر:44)

اللہ ان مغرور اور سبک سر لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جلد ہی یہ گروہ شکست کھائے گا اور پشتِ دِکھا کر بھاگ جائے گا''۔

"سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ○"(قمر:45)

ان تمام مثالوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ غرور اور خود بینی، بدبختی اور ناکامی کا ایک اہم سبب ہے۔قرآن ایک معجزانہ پیشین گوئی کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جلد ہی یہ مغرور گروہ شکست اور ذِلت سے دوچار ہونے والا ہے۔

گیارہویں آیت میں مشرکین کا ذکر ہے جنہوں نے دین کو اور اللہ کے بنائے ہوئے زندگی کے نظامِ برحق کو بازیچہ بنالیا، جنہیں دنیوی مال ودولت نے مغرور کردیا اور یہی چیز اُن کے کفر وعناد کا سبب بنی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''جن لوگوں نے اپنے (فطری) دین کو لہو ولعب بنالیا اور دُنیا کی زندگی نے انہیں فریب میں مبتلا کردیا،انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو''۔

"وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا"(انعام:70)

یہ آیت اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ یہ لوگ ہدایت کے قابل نہیں ہیں،اس لئے کہ غرور نے انہیں اس قدر مست کردیا ہے اور مادی زندگی کی چکاچوند نے انہیں اس قدر فریب دیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ حق کے سامنے جھکنے کیلئے تیار نہیں ہیں بلکہ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔اس سے ان کے اس المیے کی نشاندہی ہوتی ہے جس میں وہ اپنے غرور کی وجہ سے گرفتار ہوئے۔

اس آیت میں دِيْنَهُمْ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ کا دین فطری ہے جو سب انسانوں،حتیٰ کہ مشرکوں کی

سرشت میں بھی موجود ہے۔اس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال و دولت کے غرور نے ان کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اُنہوں نے اپنے دین یعنی بت پرستی کو بھی بازیچہ بنالیا اور اس کی بھی پابندی نہیں کرتے۔ یہ احتمال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دین سے مراد یہاں دینِ اسلام ہو جو اللہ تعالیٰ نے ان کی سعادت اور نجات کیلئے بھیجا۔

بارہویں آیت میں تمام انسانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ دُنیا کے زرق و برق کا دھوکا نہ کھائیں اور اس پر مغرور نہ ہوں اور شیطان کے دامِ فریب میں مبتلا نہ ہوں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے لوگو!۔۔۔۔۔۔۔اللہ کا وعدہ حق ہے۔خبردار! دُنیوی زندگی کا دھوکا نہ کھانا اور ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دے جائے''۔

"يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"(لقمان:33)

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں دو چیزوں کو غرور اور فریب خوردگی کی وجہ بتایا گیا ہے۔ایک دُنیوی زندگی اور دُوسرا شیطان۔اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ غرور و فریب میں مبتلا ہونے کیلئے ضروری نہیں ہے کہ انسان کے پاس پُرتعیش زندگی کے اسباب کی فراوانی ہو بلکہ ممکن ہے کہ انسان کے پاس کچھ بھی مال و زرِ دُنیا نہ ہو اور اس کے باوجود شیطان اُسے کچھ بے بنیاد خیالات کے ذریعے حقیقت کے بارے میں، خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے بارے میں غرور میں مبتلا کر دے اور وہ حق کے مقابلے میں سرکشی پر اُتر آئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دُنیا کی رنگینی اور زرق و برق شیطان کا ایک خطرناک دام ہے لیکن بعض اوقات انسان کے بے اساس خیالات بھی شیطان کے اثر و رسوخ کی راہیں کھول دیتے ہیں اور انسان ان پر خوش اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات اور ان کی تشریح و تفسیر سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غرور و نخوت ایک ایسا ناسور ہے جس نے آفرینشِ آدم سے لے کر آج تک تاریخ کے تمام ادوار میں انسان کی گمراہی اور کفر و نفاق میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ان آیات میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صفتِ رذیلہ لوگوں کی بھاری اکثریت کی گمراہی کا باعث بنتی رہی ہے۔اس صفتِ رذیلہ کی برائی کے اظہار کیلئے اور کوئی دلیل موجود نہ بھی ہو تو یہ آیات ہی اس حقیقت کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔

غرور کی مذمت احادیث میں

اس بری خصلت کی مذمت احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے۔

1. حضرت علی علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"سُكْرُ الْغَفْلَةِ وَالْغُرُوْرِ اَبْعَدُ اِفَاقَةٍ مِنْ سُكْرِ الْخُمُوْرِ"۔

''غفلت کا نشہ شراب کے نشے سے بھی زیادہ طولانی ہوتا ہے''۔(غرر الحکم)

2۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"جِمَاعُ الشَّرِّ فِي الْاِغْتِرَارِ بِالْمَهَلِ وَالْاِتِّكَالِ عَلَى الْعَمَلِ"۔(غرر الحکم)

''تمام برائیوں کا مرکز اجتماع یہ ہے کہ انسان مہلت کا دھوکا کھا جائے اور اپنے عمل پر بھروسہ کرنے لگے''۔

انسان تھوڑا سا ناچیز عملِ خیر انجام دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اپنی نجات کو یقینی سمجھ بیٹھتا ہے اور قید و شرطِ آزادی کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے، یا یہ کہ گناہوں کے باوجود اللہ کی عطا کردہ مہلت کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتا ہے۔

3۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَا يُلْقَى الْعَاقِلُ مَغْرُوْرًا"۔

''عاقل کبھی مغرور نظر نہیں آئے گا''۔(غرر الحکم)

4۔ آپؑ ہی سے منقول ایک اور حدیث میں ہے کہ غرور انسان کو خیالات کے ہجوم میں گرفتار کر دیتا ہے اور اس کی نجات کے راستے بند کر دیتا ہے۔

"مَنْ غَرَّهُ السَّرَابُ تَقَطَّعُ بِهِ الْاَسْبَابُ"۔

''جس شخص کو سراب دھوکا دے دے، اُس کی نجات کے اسباب منقطع ہو جاتے ہیں''۔(غرر الحکم)

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"زَرَعُوا الْفُجُوْرَ وَسَقَوْهُ الْغُرُوْرَ وَحَصَدُوا الثُّبُوْرَ"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 2)

''انہوں نے فجور کی فصل بوئی، غرور کے پانی سے اس کی آبیاری کی اور ہلاکت کی فصل کاٹی''۔

6۔ آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمَوْعِظَةِ حِجَابٌ مِّنَ الْغِرَّةِ۔

''تمہارے اور نصیحت کے درمیان غرور کا حجاب ہے''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:282)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غرور انسان کو نصیحت سے ہمکنار نہیں ہونے دیتا۔

7۔ ایک اور مختصر مگر پُرمعنی حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''طُوْبٰی لِمَنْ لَّمْ تَقْتُلْهُ قَاتِلَاتِ الْغُرُوْرِ''۔

''خوش نصیب ہے وہ شخص جو غرور کے قاتلانہ حملوں کے ہاتھوں قتل نہ ہوا''۔(غررالحکم:5973)

اگرچہ غرور کی مذمت میں احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر اس کے نقصانات اور ہلاکت آفرینی کا اندازہ کرنے کیلئے یہ احادیث کافی ہیں۔

2۔غرور کے اسباب:۔

علم اخلاق کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ غرور اُن صفات رذیلہ میں سے ہے جن میں ہر قسم کے لوگ کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہیں، اگرچہ اس کے اسباب اور درجات یکساں نہیں ہیں۔

غرور خود بینی کے اسباب بہت زیادہ ہیں اور مغروروں کی بھی کئی اقسام ہیں:

کچھ لوگ علم ودانش میں کسی مقام پر پہنچ کر غرور اور خود بینی کے شکار ہوجاتے ہیں۔انہیں اپنے افکار ونظریات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور دُوسروں کے افکار ونظریات کو وہ کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔کبھی تو وہ اپنے آپ کو مقربانِ الٰہی اور اہلِ نجات میں سے سمجھنا شروع کردیتے ہیں۔کوئی ان کے افکار پر ذرا سی تنقید کردے تو ناراض ہوجاتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ سب ان کا احترام کریں اور ان کی باتوں کو بلا چون وچرا قبول کریں۔

بعض اوقات بعض کم ظرف افراد چند ایک کتابیں پڑھ کر اس طرح غرور وخود پسندی کے گدھے پر سوار ہوجاتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہر مسئلے کی چابی ان کے ہاتھ آگئی ہے، اسلئے کہ انہوں نے صرفِ میر پڑھی ہوئی ہے۔

یہ غرور کی بدترین صورت ہے جو کسی عالم کی علمی شخصیت کو بھی تباہ کردیتی ہے اور معاشرے میں اُس کی عزت کو بھی برباد کردیتی ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''يَابْنَ مَسعُوْد! لَا تَغْتَرَّنَّ بِاللهِ وَلَا تَغْتَرَّنَّ بِصَلَاحِكَ وَعِلْمِكَ وَعَمَلِكَ وَبِرِّكَ وَعِبَادَتِكَ''۔

''اے ابنِ مسعود! اللہ کے (کرم) کے بارے میں مغرور نہ ہو، اپنے صالح ہونے پر، اپنے علم، عمل، نیکی اور عبادت پر مغرور نہ ہو''۔(مکارم الاخلاق،2:350)

اس حدیث میں اعمالِ صالح، اللہ کی راہ میں انفاق اور عبادات کو بھی غرور کے امکانی اسباب میں شمار کیا گیا ہے۔

معاشرے میں ایسے کم ظرف افراد بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو چند عبادات یا نیک اعمال کو انجام دینے کی وجہ سے اس طرح غرور اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اہلِ سعادت ونجات اور دُوسروں کو ذلیل وحقیر سمجھنے لگ جاتے ہیں اور یہی چیز ان کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔

غرور کا ایک اور سبب یہ ہے کہ انسان اللہ کے لطف وکرم اور مغفرت پر مغرور ہو جائے۔ بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو بے دھڑک گناہ کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ اللہ بڑا غفور ورحیم ہے، وہ اس سے بالاتر ہے کہ ہم جیسے چھوٹے چھوٹے بندوں کے گناہوں کا حساب رکھے اور پھر انہیں سزا دے۔ اگر ہم گناہ نہ کریں تو اللہ کے عفو وکرم کس کام آئیں گے؟

اس قسم کی گمراہی پر مبنی اور غیر منطقی باتیں نہیں گناہ کرنے میں جری بنا دیتی ہیں جس کا نتیجہ ان کی ہلاکت اور بربادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

انسان کے اس قسم کے رویوں کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ انسان کو سرزنش کرتے ہوئے یہ سوال کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝

''اے انسان! کس چیز نے تجھے تیرے ربِ کریم کے بارے میں فریب وغرور میں مبتلا کر دیا ہے؟''

اس آیت کی تفسیر میں امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا جَرَّأَكَ عَلَى ذَنْبِكَ؟ وَمَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ؟ وَمَا أَنَّكَ بِهَلَكَةِ نَفْسِكَ؟" (نہج البلاغہ، خطبہ:223)

''اے انسان! کس چیز نے گناہ میں تیری جرأت میں اضافہ کر دیا ہے؟ کس چیز نے تجھے تیرے رب کے بارے میں دھوکا دیا ہے اور کس چیز نے تجھے اپنی ہلاکت کا مشتاق بنا دیا ہے؟''

جو شخص گناہ کر کے اس پر اتراتا ہے، اور جو شخص گناہ کر کے شرمندہ وپشیمان ہوتا ہے، ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا غرور کی سواری پر سوار ہے جبکہ دوسرا اللہ کے لطف وکرم کا اُمیدوار ہے۔

جہل اور نادانی بھی غرور کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ جس طرح بعض اوقات علم غرور کا سبب بن جاتا ہے، اسی طرح بعض اوقات جہلاء کا جہل بھی ان کیلئے باعثِ غرور ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ جَهِلَ اَغَرَّ بِنَفْسِهٖ وَكَانَ يَوْمُهٗ شَرًّا مِنْ اَمْسِهٖ"۔

''جو جاہل ہوتا ہے، اپنے بارے میں مغرور ہو جاتا ہے اور اس کا ہر روز گزرے ہوئے دن سے بدتر

ہوتا ہے''۔(غرر الحکم:8744)

اسی طرح دُنیوی مقام ومرتبہ، مال ودولت، جوانی اور حسن و جمال بھی غرور کا سبب بن جاتے ہیں۔

کم ظرف افراد کو جب ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ہر بات بھول جاتے ہیں کہ یہ سب عارضی اور ناپائیدار چیزیں ہیں جو جلد ہی زوال پذیر ہو جائیں گی۔ یہ غفلت اور فراموشی، خود بینی اور غرور کا سبب بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ خدا سے دُور اور شیطان کے قریب ہو جاتے ہیں اور انواع واقسام کے گناہوں کے مرتکب ہونے لگتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلدُّنْیَا حُلُمٌ وَالْاِغْتِرَارُ بِهَا نَدَمٌ"۔

''دنیا ایک بے حقیقت خواب ہے اور اس کا دھوکا کھانا موجبِ ندامت ہے''۔(غرر الحکم:1384)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَاتَغُرَّنَّكَ الْعَاجِلَةُ بِزُوْرِ الْمَلَاهِیْ، فَاِنَّ اللَّهْوَ یَنْقَطِعُ، وَیُلْزِمَكَ مَا اكْتَسَبْتَ مِنَ الْمَاْثِمِ"۔

''خبردار! دُنیا کے لہو ولعب کا دھوکا نہ کھانا، اس لئے کہ لہو ولعب ختم ہو جاتے ہیں اور ان کا گناہ تمہاری گردن پر رہ جاتا ہے''۔(غرر الحکم:10363)

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لوگ مال ودولت اور حکومت واقتدار کے زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن جب یہ چیزیں ان کے ہاتھ میں آتی ہیں تو ان کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان نعمتوں کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔

غرور کے اسباب بہت زیادہ ہیں اور مختلف اقسام کے ہیں۔ ان سے نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے، اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے اور اس حقیقت کی طرف توجہ رکھے کہ وہ تمام نعمتیں جو غرور وخود پسندی میں مبتلا کر دیتی ہیں، وہ جلد ہی فنا ہو جانے والی ہیں۔

3۔غرور کی نشانیاں:۔

غرور کی نشانیاں اور علامات بہت زیادہ ہیں جن کو دیکھتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس شخص میں یہ علامات موجود ہیں، وہ غرور میں مبتلا ہے۔ لوگوں سے بے رُخی برتنا، حلال وحرام کی طرف توجہ نہ کرنا، بڑوں کی عزت واحترام کو مدنظر نہ رکھنا، دوستوں اور عزیزوں سے محبت کو ترک کرنا، غفلت میں اَٹے ہوئے قہقہے لگانا، صالحین اور نیکوکاروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا، اکڑ کر چلنا، چلتے ہوئے پاؤں کو زمین پر مارنا، شانے لہرا لہرا کر چلنا اور اس طرح کی دیگر علامات جو انسان کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتی ہیں، یہ سب

غرور اور خود پسندی کی علامات ہیں۔

بعض اوقات غرور پوشیدہ حالت میں ہوتا ہے اور آسانی سے نظر نہیں آتا۔ البتہ اگر اس کی علامات کی غور سے جستجو کی جائے تو وہ نظر آجاتا ہے، مثلاً بعض افراد کچھ عرصہ کسی اُستاد کے پاس درس حاصل کرتے ہیں اور پھر درس چھوڑ کر اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھنے لگتے ہیں، یا بعض اوقات بعض لوگ غیر معمولی حد تک مردم بیزار ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ افراد یہ بہانے کرتے ہوں کہ ہم غیبت اور گناہ سے آلودہ ہونے سے بچنے کیلئے لوگوں سے الگ تھلگ ہوتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کا اصل عامل غرور اور احساسِ برتری ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو پاک اور مومن جبکہ دُوسروں کو ناقص اور گناہگار سمجھتے ہیں۔

صرف غرور ہی نہیں بلکہ دیگر رذائلِ اخلاقی بھی بعض اوقات پوشیدہ حالت میں ہوتے ہیں اور بظاہر فضائل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف علم اخلاق کے ماہر اُستاد ہی ایسی صورت میں ان کا کھوج لگا سکتے ہیں۔

4۔ فرد اور معاشرے پر غرور کے اثرات:۔

صفاتِ رذیلہ میں سے شاید ہی کوئی ایسی صفت ہو جس کے اثرات غرور کے اثرات سے زیادہ نقصان دہ اور مہلک ہوں۔ غرور کے آثار و نتائج انسان کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی دُنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ غرور کے تباہ کن اثرات میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

1۔ غرور انسان کے عقل و فہم اور ایک ضخیم پردہ ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ادراکِ حقائق کی صلاحیت کو کھو دیتا ہے اور انسان حقائق کو ان کی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتا ہے۔ ایسا انسان معاشرتی واقعات کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی ان کے بارے میں صحیح رویہ اپنا سکتا ہے۔

گزشتہ مبحث میں ہم امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان پڑھ چکے ہیں کہ غرور کا نشہ شراب کے نشے سے بھی زیادہ برا ہے۔ درحقیقت یہ نشہ ہی غرور کا حجاب ہے۔

2۔ غرور زندگی میں شکست اور پسماندگی کا سبب ہے۔ ایک مغرور فوج آسانی سے میدانِ جنگ میں شکست کھا جاتی ہے۔ مغرور سیاست دان بہت جلد سیاست کے میدان میں مار کھا جاتا ہے۔ مغرور طالب علم امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔ مغرور کھلاڑی آسانی سے مقابلہ ہار جاتا ہے اور ایک مغرور مسلمان اللہ کے قہر و غضب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ احادیث میں ''قاتلات الغرور'' یعنی ''غرور کے قاتلانہ حملوں'' سے مراد شاید یہی ہو۔

3۔ غرور انسان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے انحطاط اور زوال کی راہیں ہموار کر دیتا ہے، اس لئے کہ جب انسان مغرور ہوتا ہے تو اسے اپنے نقائص اور خامیاں نظر نہیں آتی ہیں۔ جو انسان اپنے نقص سے غافل ہو، وہ نقص کو دُور کرنے کی کوشش کیونکر کر سکتا ہے۔ لہذا ایسا شخص ہمیشہ اپنے نقائص کے ساتھ رہتا ہے اور سعادتِ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔

ہم امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان پڑھ چکے ہیں کہ جو مغرور ہوتا ہے، وہ جاہل ہوا ہے اور اس کا آج اس کے گزرے ہوئے دن سے بدتر ہوتا ہے۔ اس حدیث میں درحقیقت اسی اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

4۔ غرور انسان کے اعمال کی تباہی کا سبب بنتا ہے اسلئے کہ مغرور انسان اپنے اعمال کو احتیاط سے انجام نہیں دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے کاموں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک مغرور سرجن اپنے مریض کو موت کے منہ میں دھکیل دے یا اُسے ہمیشہ کیلئے اپاہج بنادے۔ ایک مغرور ڈرائیور تباہ کن ٹریفک حادثات کا شکار ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک مغرور مسلمان اپنے اعمال کو ریا و خود پسندی سے آلودہ کر کے برباد کر دیتا ہے۔

اس بات کو امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"غَرُوْرُ الْاَمَلِ یُفْسِدُ الْعَمَلَ"۔

''آرزوؤں کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا غرور عمل کو تباہ کر دیتا ہے''۔ (غرر الحکم: 6390)

5۔ غرور انسان کو مستقبل کے بارے میں بے فکر اور فکرِ عاقبت سے آزاد کر دیتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد اسی حقیقت کو بیان کر رہا ہے:

"لَمْ یُفَکِّرْ فِیْ عَوَاقِبِ الْاُمُوْرِ مَنْ وَثِقَ بِزُوْرِ الْغُرُوْرِ"۔

''جو شخص غرور میں مبتلا ہوجائے، وہ انجام کار سے غافل ہوجاتا ہے''۔ (غرر الحکم: 7566)

6۔ غرور عام طور پر ندامت اور پشیمانی کا سبب ہوتا ہے، اس لئے کہ مغرور انسان اپنے اور دُوسروں کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا اور اپنے ذاتی اور معاشرتی معاملات میں غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُسے پشیمانی اور ندامت اُٹھانا پڑتی ہے۔ اس بات کو امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

''دنیا ایک بے حقیقت خواب ہے جس پر مغرور ہونا پشیمانی کا موجب ہوتا ہے''۔ (غرر الحکم: 1384)

7۔ غرور کے نقصانات کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مغرور انسان دُنیا اور آخرت دونوں میں محروم رہتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْمَغْرُوْرُ فِی الدُّنْیَا مِسْکِیْنٌ فِی الْآخِرَةِ، مَغْبُوْنٌ لِاَنَّهُ بَاعَ الْاَفْضَلَ بِالْاَدْنٰی"۔

''مغرور انسان دُنیا میں مسکین اور آخرت میں گھاٹے میں ہوتا ہے، اس لئے کہ اس نے اعلیٰ جنس کم قیمت پر فروخت کردی ہوتی ہے''۔ (میزان الحکمہ، 3:2237)

5۔غرور کا علاج:۔

چونکہ عام طور پر غرور کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی قدر ومنزلت سے آگاہ نہیں ہوتا،لہٰذا اس بیماری کے علاج کا پہلا قدم اپنی ذات کے بارے میں آگہی ، اللہ کی معرفت اور دُوسرے انسانوں کی صلاحیتوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ہے۔

اگر انسان اپنے ماضی پر نظر ڈالے، جب وہ ایک کمزور سا نومولود بچہ تھا اور پھر اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرے، جب وہ بوڑھا اور ناتواں ہوجائے گا، اگر وہ اپنے مال ودولت ، مقام ومرتبہ اور حسن وجمال کے عارضی اور فانی ہونے کے بارے میں غور کرے تو کبھی غرور کا شکار نہ ہو۔

انسان اپنے علم پر کیوں مغرور ہو جبکہ اُس کی حالت یہ ہے کہ اگر اُس کے دماغ پر کوئی چوٹ لگ جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے سارے علم ،حتیٰ کہ اپنے نام تک کو بھول جائے۔

انسان کو اپنے مال پر بھی غرور نہیں کرنا چاہئے کیونکہ بازار کے ایک معمولی اُتار چڑھاؤ سے، یا کسی اور حادثے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنی ساری دولت سے محروم ہوسکتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ بھاری قرض تلے بھی دب جائے

انسان کس طرح اپنے اقتدار پر مغرور ہوسکتا ہے، حالانکہ عین ممکن ہے کہ کل وہ محروم اقتدار ہوکر زندان کی سلاخوں کے پیچھے ہو۔

بہرحال جو چیز انسان کو غرور کے نشے سے نجات دے سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں ،دُنیا کے حالات کے بارے میں، مادی نعمتوں کے زوال وفنا کے بارے میں خوب آگاہی حاصل کرے۔

قرآن مجید مغروروں کو دعوتِ فکر دیتا ہے:

"اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّاَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَعَمَرُوۡہَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡہَا وَجَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ﴿۹﴾"

''کیا انہوں نے زمین میں سیر کرکے یہ نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا؟ حالانکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے، انہوں نے زمین میں خوب ہل چلائے اور اسے آباد کیا اور ان کے رسول روشن نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس آئے ،(مگر انہوں نے کفر کی راہ اختیار کی)اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے''۔(روم:9)

اگر انسان اپنے جسم، رُوح اور وسائل کی طرف توجہ کرے اور یہ دیکھے یہ کہ سب کس قدر کمزور اور آسیب پذیر(

Vulnerable) ہیں اور یہ کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے حوادث انسان کی زندگی کو درہم برہم کر دیتے ہیں تو وہ کبھی غرور کا شکار نہ ہو۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مِسْكِيْنُ بْنُ آدَمَ مَكْتُوْمُ الْاَجَلِ، مَكْنُوْنُ الْعِلَلِ، مَحْفُوْظُ الْعَمَلِ، تُؤْلِمُهُ الْبَقَّلَةُ الشَّرِقَةُ وَتُنْتِنُهُ الْعَرْقَةُ"۔

''انسان کس قدر بیچارہ ہے، اس کی موت پوشیدہ ہے، اس کی بیماری کے اسباب مخفی ہیں، جو عمل کرتا ہے، وہ محفوظ کر لیا جاتا ہے، ایک مچھر اس کا آرام غارت کر دیتا ہے، ایک لقمہ گلے میں پھنس جائے تو ہلاک ہو جاتا ہے اور ذرا سا پسینہ اسے بدبودار کر دیتا ہے''۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 419)

سلطان محمود غزنوی کے مشہور وزیر ایاز کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا ایک مخصوص کمرہ تھا جہاں وہ ہر روز جا کر دروازہ بند کر لیتا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آجایا کرتا تھا۔ لوگوں کو اس کے اس رویے پر حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس کمرے میں کیا راز پوشیدہ ہے! تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ایاز نے اپنی چوپانی کے دَور کا لباس اس کمرے میں رکھا ہوا تھا اور ہر روز وہاں جا کر اُسے دیکھتا اور اپنے آپ سے کہتا:

''اے ایاز! تو ایک گڈریا تھا۔ اللہ نے تجھے وزارت کے رُتبے پر پہنچا دیا ہے۔ تو مغرور نہ ہونا، اس بات سے ڈر کہ اگر یہ مقام و مرتبہ تجھ سے چھن گیا تو تو ماضی کی نسبت زیادہ کمزور ہو جائے گا۔''

اگر سارے اربابِ اقتدار اپنے لئے ایسے اسبابِ عبرت تیار رکھیں تو کبھی غرور میں مبتلا نہ ہوں لیکن افسوس کہ ہر کوئی ایاز نہیں ہو سکتا۔

ساتواں باب

طُولِ اَمل (لمبی آرزوئیں)

تمہید:۔

طولِ اَمل یعنی لمبی آرزوئیں اہم ترین اخلاقی رذائل میں سے ہے جو انسان کو انواع واقسام کے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انسان کو اللہ سے دُور اور شیطان کے قریب کر دیتی ہے اور انسان کی آخرت کو تباہ کر دیتی ہے۔ البتہ ''آرزو'' اور اُمید'' بنیادی طور پر مذموم اور ناپسندیدہ نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی کو متحرک اور فعال رکھنے کیلئے ان کا وجود بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مادی اور معنوی ترقی وپیشرفت ہرگز ممکن نہیں ہے۔

اگر ماں کے دل میں اُمید اور آرزو نہ ہو تو وہ کبھی بچے کو دودھ نہیں پلائے گی اور اس کی پرورش میں انواع واقسام کی سختیاں اور تکالیف برداشت نہیں کرے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں ہے:

"اَلْاَمَلُ رَحْمَةٌ لِاُمَّتِیْ وَلَوْلَاالْاَ مَلُ مَارَ ضِعَتْ وَالِدَةٌ وَلَدَهَا وَلَاغَرَسَ غَارِسٌ شَجَرَهَا"۔ (بحار الانوار، 173:74)

''اُمید اور آرزو میری اُمت کیلئے رحمت ہے۔ اگر اُمید اور آرزو نہ ہوتی تو کوئی ماں اپنے بچے کو دُودھ نہ پلاتی اور نہ ہی کوئی باغبان کوئی درخت کاشت کرتا''۔

اگر کسی کو یقین ہو جائے کہ آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے، یا مستقبل قریب میں اس کی موت واقع ہو جائے گی تو وہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے اور اس کی زندگی کی گاڑی رُک جائے گی۔ شاید موت کے پنہاں ہونے میں بھی یہی حکمت ہو کہ انسان کے دل میں اُمید اور آرزو کا چراغ روشن رہے اور وہ زندگی کی گاڑی کو چلانے کی دوڑ دُھوپ کرتا رہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو بیلچے کی مدد سے زمین کھود رہا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اس کی اُمید کو چھین لے۔ اچانک اُس بوڑھے نے بیلچہ پھینکا اور زمین پر لیٹ کر سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اس کی اُمید اسے واپس لوٹا دے۔ وہ بوڑھا اچانک اُٹھا، بیلچہ اُٹھایا اور کام میں مصروف ہو گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ میں نے تمہیں دو مختلف حالتوں میں دیکھا۔ ایک بار تم نے

بیلچہ پھینکا اور لیٹ گئے، پھر تم اچانک اُٹھے اور بیلچہ لے کر کام میں مشغول ہو گئے۔ یہ کیا ماجرا تھا؟

بوڑھے نے جواب دیا کہ پہلے میرے ذہن میں خیال آیا کہ بوڑھا ہوں اور میرے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اتنی زحمت اور تکلیف برداشت کروں! یہ سوچ کر میں نے بیلچہ پھنکا اور لیٹ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ میں مزید چند سال زندہ رہوں، میرے جیسے کئی افراد تھے جو مزید کئی برس تک جیتے رہے، انسان جب تک زندہ ہوتا ہے، اسے عزت کی زندگی گزارنے کیلئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں نے بیلچہ اُٹھایا اور پھر کام میں مصروف ہوگیا۔ (بحارالانوار، 329:14)

یہی وجہ ہے کہ زندگی میں ترقی اور پیشرفت کیلئے افراد واقوام کے دل میں اُمید کی کرن روشن رہنی چاہئے لیکن یہی اُمید، جو بارش کے حیات بخش قطروں کی مانند ہوتی ہے، اگر حد سے بڑھ جائے تو ایک ایسا تباہ کن سیلاب بن جاتی ہے جو انسان کو دُنیا پرستی اور ظلم وجرائم کی دلدل میں غرق کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''طویل اَمل'' کو انسان کے دو خطرناک ترین دُشمنوں میں سے ایک قرار دیا ہے:

"خِصْلَتَانِ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ، فَاَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوٰى فَاِنَّهُ يَعْدِلُ عَنِ الْحَقِّ، اَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَاِنَّهُ يُحِبُّ الدُّنْيَا"۔ (المحجة البيضأ، 245:8)

''خوفناک ترین چیزیں جن سے تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں، دو چیزیں ہیں: اتباعِ ہوا یعنی خواہشات کی پیروی اور طولِ اَمل یعنی لمبی آرزوئیں۔ خواہشات کی پیروی راہِ حق سے منحرف کر دیتی ہے اور لمبی آرزوئیں دُنیا کی محبت پیدا کر دیتی ہیں''۔

نہج البلاغہ، خطبہ 42 میں بھی اسی سے ملتی جلتی حدیث امیر المومنین علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم اس موضوع کے بارے میں قرآنی آیات کی روشنی میں غور وفکر کرتے ہیں۔

1۔ "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ○"

''اور یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قومِ عاد کا جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا۔ تم نے ہواؤں میں محل بنائے اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو''۔ (اعراف:74)

2۔ "اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ○وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ"۔

''کیاتم ہر اُونچی جگہ پر ہواوہوس کی نشانیاں تعمیر کرتے ہو؟ مضبوط اور خوبصورت محل اور قلعے بناتے ہو کہ شاید ہمیشہ دُنیامیں رہ سکو؟''(شعرأ:128تا129)

3۔ "یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ○"

''(منافق) انہیں آواز دے کر کہیں گے: کیاہم دُنیا میں تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں! لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔تم (رسول کی موت) کا انتظار کرتے تھے، ہر چیز میں شک کرتے تھے، لمبی آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور فریب کار شیطان نے تمہیں اللہ کے بارے میں فریب دیا۔''(حدید:14)

4۔ "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○"

''کیاابھی اہلِ ایمان کیلئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کیلئے اور اُس وحی کیلئے جو اللہ نے نازل کی ہے، نرم ہو جائیں؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح سے نہ ہو جائیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر ایک طویل عرصہ گزر گیا اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں''۔(حدید:16)

5۔ ذَرْهُمْ یَاْكُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْا وَیُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ"۔(حجر۔3)

''انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، کھائیں پئیں اور ان کی آرزوئیں انہیں غافل کر دیں، جلد ہی ان کو معلوم ہو جائے گا''۔

6۔ "اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى○ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى○"

''کیاانسان اپنی تمناؤں کو پالیتا ہے؟ حالانکہ دُنیااور آخرت دونوں اللہ کے ہیں''(نجم۔24۔25)

7۔ "وَیْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ○ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ"

'ہلاکت ہے ہر عیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے والے کیلئے، جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔(ھمزہ۔1تا3)

8۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ

وَاَمْلٰی لَهُمْ"۔

''جولوگ ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعدحق سے پلٹ گئے، شیطان نے اُن کے برے اعمال کوان کیلئے خوشنما بنادیااورانہیں لمبی آرزوؤں سے دھوکادیا''۔(محمد۔25)

تفسیراورنتیجہ

طولِ اَمل کے اسباب:۔

مذکورہ بالاآیات میں سے پہلی دوآیات قومِ عادوقوم ثمود کے بارے میں ہیں۔ان دونوں اقوام نے زراعت اورصنعت میں بہت ترقی کی تھی جس کی وجہ سے دُنیامیں اس قدرمشغول ہوگئے کہ لمبی لمبی آرزوؤں نے انہیں اپنااسیر بنالیا۔وہ اس قدرتکبر،غرور اورنخوت کاشکارہوگئے کہ انہوں نے حضرت ہودؑاورحضرت صالحؑ کی دعوت کی طرف نہ صرف یہ کہ توجہ نہیں کی بلکہ ان کے مقابلہ پراُتر آئے۔

پہلی آیت میں قرآن مجیدحضرت صالح علیہ السلام کی بات کونقل کرتاہے جواُنہوں نے اپنی قوم سے کہی تھی:''یادکروجب قومِ عاداپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہوگئی اوراللہ نے تمہیں ان کا جانشین بنادیااورزمین میں تمہیں ٹھکانہ دیا،تم صحراؤں میں محل بناتے ہواور پہاڑوں کوتراش کراپنے گھر بناتے ہو۔اللہ کی نعمتوں کاذکرکرواورزمین میں فسادکی کوشش نہ کرو''۔

"وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ○"(اعراف:74)

دُوسری آیت قومِ ثمود کے بارے میں ہے۔ان کے رسول حضرت ہودؑ نے ان سے کہا:''کیاتم ہراونچی جگہ پراپنی ہواوہوس کی نشانیاں بناتے ہو؟خوبصورت اورمضبوط قلعے بناتے ہوکہ گویاتم نے ہمیشہ دُنیامیں رہناہے''(شعرأ:128تا129)

"اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ○ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ○"

حضرت ہودؑانہیں سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں کہ تمہاری گمراہی کی بنیادی وجہ تمہاری ہوس رانی اورلمبی آرزوئیں ہیں جنہوں نے تمہیں اللہ سے غافل اوردُنیا کی رونقوں میں غرق کردیا۔

قومِ عاداورقوم ثمود اس قصور میں مبتلاتھیں کہ جومضبوط عمارتیں اور قلعے انہوں نے پہاڑوں کوکھودکر بنائے ہوئے تھے،وہ انہیں ہرقسم کی آفات وحوادث سے محفوظ رکھیں گےاوروہ لمبےعرصہ تک عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسرکریں گے۔

قومِ ثمود کے بارے میں یہ بات ایک اور مقام پر اس طرح بیان کی گئی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام ان سے کہتے ہیں:

"اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ○ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ○وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ○وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ۔"(شعرأ:146تا149)

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہمیشہ یہاں امن وامان میں رہو گے؟ باغوں اور نہروں میں، کھیتوں اور میٹھے پھل والے نخلستانوں میں، اور تم پہاڑوں میں سے گھر تراشتے ہو اور ان میں عیش وعشرت میں غفلت کی زندگی گزارتے ہو''۔

ظاہری بات ہے کہ طولِ اَمل کے نتیجہ میں غرور وغفلت میں مبتلا ہوجانا صرف قومِ عاد وثمود تک محدود نہ تھا لیکن قرآن مجید کی روشنی میں یہ اخلاقی برائی دو اقوام میں بہت سی نمایاں تھی۔

تیسری آیت میں میدانِ محشر میں مومنین اور منافقین کی گفتگو کا ذکر ہے۔ قیامت کے دن منافق میدانِ محشر میں ظلمت اور تاریکی میں ہوں گے جبکہ مومنین اپنے ایمان اور عملِ صالح کے نور میں جنت کی طرف رواں دواں ہونگے۔ منافق اُن سے کہیں گے کہ ٹھہرو! ہمارا انتظار کرو تا کہ ہم بھی تمہارے نور کی روشنی میں چل سکیں۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہوجائے گی۔ اس وقت منافق کہیں گے:

"اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ط"

''کیا ہم دُنیا میں ایک ساتھ نہیں تھے؟''

مومنین انہیں جواب دیں گے: ہاں! ہم اکٹھے تھے لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنہ وفریب میں مبتلا کیا، تم مسلمانوں کیلئے برے حادثات اور برے دنوں کے منتظر رہتے تھے۔ اسلام، قیامت اور دعوتِ رسول کے بارے میں مسلسل شک کرتے تھے، لمبی آرزوؤں نے تمہیں غرور میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے تمہاری موت کا حکم آ گیا۔

".....قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ"۔

اس طرح اس آیت کی روشنی میں منافقین کی بدبختی اور ہلاکت کا سبب چار چیزیں ہیں جن میں سے چوتھی طولِ امل یعنی لمبی آرزوئیں ہیں۔

اس آیت میں ''اَمَانِيُّ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''امنیہ'' کی جمع ہے۔ اس سے مراد غیر حقیقی خیالات اور بے بنیاد آرزوئیں ہیں۔

تفسیر الصادقین اور تفسیر قرطبی میں اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے زمین پر چند متوازی خطوط کھینچے۔ پھر ایک عمودی خط ان سب کے اُوپر کھینچ دیا اور

اصحاب سے پوچھا: کیاتم جانتے ہوکہ یہ خطوط کیا معنی رکھتے ہیں؟انہوں نے جواب دیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ بیان فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا:''یہ خطوط انسان کی لمبی آرزوئیں ہیں،جن کی کوئی حدنہیں ہے،جبکہ عمودی خط موت ہے جو اِن سب کا خاتمہ کردیتی ہے۔''(تفسیر قرطبی،4617:9)

یہی بات ایک اور روایت میں ابنِ مسعود سے اس طرح نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک مربع چوکور بنائی، پھر اس کے درمیان ایک خط کھینچا اور اسے چوکور کے باہر تک لے گئے۔ پھر اس خط کے دونوں طرف چھوٹے خطوط کھینچے۔اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ جو خط اس چوکور کے اندر ہے، وہ انسان ہے اور یہ مربع شکل کی چوکور اس کی موت ہے جس نے اسے گھیرا ہوا ہے۔ چوکور سے نکلا ہوا خطِ دراز آرزوؤں کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی دونوں طرف چھوٹے چھوٹے خطوط حوادث وآفات ہیں۔اگر بالفرض اجل کا تیر خطا ہوجائے تو حوادث اُسے ہلاک کر دیتے ہیں اور اگر حوادث سے محفوظ رہے تو اجل اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔(تفسیر قرطبی، 4617:9)

چوتھی آیت میں مومنین کو ایک بالواسطہ مخاطب قرار دے کر انہیں خبردار کیا جارہا ہے کہ اپنی حالت پر کڑی نظر رکھیں، ایسا نہ ہو کہ طولِ امل میں گرفتار ہوکر وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوجائیں جس سے گزشتہ اقوام دوچار ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''کیا اہلِ ایمان کیلئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کیلئے اور جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کیلئے نرم ہوجائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر ایک طویل مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہوگئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔''

"اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○"(حدید۔16)

اس آیت کی رو سے اللہ کا ذکر اور حق کی طرف توجہ دل کی نرمی کا سبب بنتے ہیں۔اللہ کے ذکر اور حق کی طرف توجہ سے لمبی آرزوؤں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور انسان اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، اس کا دل نورانی اور اس کی سوچ حقیقت پسندانہ ہوجاتی ہے اور دُنیا کی ناپائیداری اور کھوکھلے پن کو دیکھنے لگتا ہے۔

دلی کزنور معنی نیست روشن
مخوانش دل کہ آن سنگ است وآھن
دلی کزگرد غفلت زنگ دار
از آن دل سنگ وآھن ننگ دارد

''جو دل معرفت کے نور سے روشن نہیں ہے، اسے دل نہ کہو، وہ پتھر اور لوہا ہے۔ جو دل غفلت کے گرد و غبار سے زنگ آلود ہے، اُس سے پتھر اور لوہے کو بھی شرم آتی ہے''۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے: ''ان (کفار و مشرکین) کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ کھائیں، پییں اور مادی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں اور ان کی آرزوئیں انہیں غافل کر دیں لیکن جلد ہی ان کو معلوم ہوگا (کہ انہوں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے)''۔

"ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ○" (حجر: 3)

درحقیقت ان لوگوں کا حال حیوان جیسا ہے جو گھاس اور چارے کے سوا کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان میں اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ یہ لمبی آرزوؤں کے فریب میں مبتلا ہیں جس نے انہیں حیوان سے بھی پست تر کر دیا ہے اور یہ اس قابل بھی نہیں رہے کہ اپنے انجام کے بارے میں سوچ سکیں یا موت کے آنے سے پہلے راہِ ہدایت کی طرف واپس آ سکیں۔

یہاں انسان کی زندگی اور اس کے وجود پر طولانی آرزوؤں کی منفی تاثیر کو بخوبی واضح کیا گیا ہے اور اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ طویل آرزوئیں کس حد تک انسان کو مصروف کر کے اللہ سے غافل کر دیتی ہیں۔

''ذَرْهُمْ'' یعنی ''انہیں چھوڑ دو'' سے یہ بات مکمل طور پر آشکار ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کی ہدایت کی کوئی اُمید نہیں ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کو ہرگز یہ حکم نہ دیا جاتا کہ انہیں چھوڑ دیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسے لوگوں کی ہدایت کی اُمید کس طرح ہو سکتی ہے جن کی زندگی کا اصل مقصد ہی حیوانوں کی طرف کھانا پینا ہو، جن کی آرزوئیں اور تمنائیں انہیں اجازت نہیں دیتیں کہ زندگی کے اختتام کے بارے میں سوچیں، اُس رب کے بارے میں غور و فکر کریں جس نے یہ ساری نعمتیں انہیں عطا کی ہیں اور نہ ہی وہ اس نکتہ پر کوئی سوچ بچار کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔

چھٹی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ لمبی آرزوئیں جنہیں انسان عملی جامہ بھی نہیں پہنا سکتا، اس طرح انسان کو جکڑ لیتی ہیں کہ وہ اپنی زندگی کی اصل راہ اور حقیقی مقصد سے دُور ہو جاتا ہے۔ آیت استفہامیہ انداز میں کہہ رہی ہے:

"أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنَّىٰ" (نجم: 24)

''کیا انسان کیلئے ممکن ہے کہ اُس چیز کو پائے جس کی وہ تمنا کرتا ہے؟''

اس استفہام کو اصطلاح میں استفہام انکاری کہا جاتا ہے۔ یہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کی تمنا پوری ہو جائے جبکہ اس کی عمر مختصر اور آرزوئیں اتنی دراز ہوتی ہیں کہ اگر اسے سو بار عمر دی جائے تو وہ بھی اُن آرزوؤں کے حصول کیلئے تھوڑی ہو۔ اگر کبھی اُس کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جائے تو اس کی جگہ ایک نئی آرزو جنم لے لیتی ہے اور اُسے اپنی راہ پر چلانے لگتی ہے۔

اگرچہ یہ آیت اُن آیات کے سیاق میں ہے جن میں اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کی شفاعت کے آرزو

مند تھے۔قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان کی یہ آرزو ہرگز پوری نہ ہوگی۔لیکن یہ آیت وسیع اور عمومی مفہوم بھی رکھتی ہے۔اسے اسی مفہوم میں محدود کرنا صحیح نہیں ہے۔

ساتویں آیت میں ان اہلِ دُنیا کا ذکر ہے جو صرف اور صرف آرزوہائے دراز کی تکمیل کیلئے ہلکان ہورہے ہوتے ہیں۔یہ آیت فرماتی ہے:

''ہلاکت ہے ہرعیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے والے کیلئے، جو مال اکٹھا کرتا ہے اور اس کو گنتا رہتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس کی ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔

"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ "
(همزه۔1تا3)

درحقیقت یہ تین آیات ایک دوسرے کے ساتھ علت ومعلول جیسا تعلق رکھتی ہیں، اس لئے کہ خود پسند اور مغرور انسان دوسروں کا مذاق اُڑاتا ہے کہ اُس نے جائز اور ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کر رکھی ہوتی ہے۔یہ دولت وہ اس لئے جمع کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس مال ودولت کی وجہ سے اسے ہمیشہ کی زندگی مل جائے گی۔اس کی یہ آرزوئے دراز اس میں غرور وخود پسندی پیدا کردیتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی عیب جوئی اور اُن پر طعنہ زنی کرتا ہے۔

اس آیت سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لمبی آرزوئیں انسان کو اس حد تک غافل کرسکتی ہیں کہ وہ موت کو مکمل طور پر بھول جاتا ہے۔یہی چیز اُس کے غرور، سرکشی اور دیگر گناہوں کا سبب بن جاتی ہے۔

آٹھویں اور آخری آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے حق کو پہچانا اور پھر اُس سے رُوگردانی کی۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''جن لوگوں نے حق کے واضح ہوجانے کے بعد اس کی طرف پشت کی، درحقیقت شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نظر میں خوشنما دِکھایا اور لمبی آرزوؤں کے ذریعے انہیں فریب دیا''۔

"إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ ۖ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۝"(محمد:25)

''اَمْلٰی لَھُمْ'' کے معنی ہیں:''ان کیلئے ایسی لمبی آرزوئیں پیدا کردیں جنہوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ اور مشغول کرلیا''

یہ آیت اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان حق کو پہچانے اور پھر اُسے نظرانداز کردے اور اپنی نجات کا راستہ بند کرلے۔کیا کسی عقل مند انسان سے ایسے طرزِعمل کی توقع کی جاسکتی ہے؟ جب شیطانی آرائش گری انسان کا احاطہ کرلے اور برائیاں اُسے اچھے اعمال کی شکل میں نظر آنے لگیں تو پھر حق کو واضح طور پر دیکھنے کے باوجود اس سے روگردانی کرنا بعید

نہیں ہوتا۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لمبی آرزوئیں انسان کیلئے کیسی کیسی بلائیں اور مصیبتیں لے کر آتی ہیں، یہاں تک کہ عقل مند انسان کو عقل وخرد سے بیگانہ کردیتی ہے۔

ان آیات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ لمبی آرزوئیں انسان کی سعادت کی خطرناک ترین دشمن ہیں جو نہ صرف افراد بلکہ اقوام کو بھی بدبختی وہلاکت کے منہ میں دھکیل دیتی ہیں۔

طُولِ اَمل احادیث کی روشنی میں

چونکہ آرزوئے دراز انسان کی اخلاقی اور معنوی زندگی، بلکہ مادی زندگی پر بھی مخرب اثرات مرتب کرتی ہے، لہٰذا احادیث میں بھی مختلف اسالیب میں انکی مذمت کی گئی ہے اور اس بیماری کی منطقی وجوہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

1۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَرْبَعَةٌ مِنَ الشَّقَاۗ جُمُوْدُ الْعَيْنِ وَقَسَاوَةُ الْقَلْبِ وَطُوْلُ الْاَمَلِ وَالْحِرْصِ عَلَى الدُّنْيَا۔

''چار چیزیں شقاوت اور بدبختی میں سے ہیں:

1۔ آنکھ کا جامد ہونا (رونا نہ آنا) 2۔ سنگ دِلی۔ 3۔ لمبی آرزوئیں۔ 4۔ دُنیا کے بارے میں حرص'' (تفسیر قرطبی، 3618:5۔ بحارالانوار، 164:70)

2۔ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''مَنْ اَطَالَ اَمَلَهُ اَمَلَهُ سَاَ عَمَلُهُ''۔

''جس کی آرزو دراز ہوگی، اُس کا عمل برا ہوگا'' (بحارالانوار 163:70)

یہ حدیث ان الفاظ میں بھی ملتی ہے:

اطول الناس املا اسوئھم عملا

جس کی آرزو سب سے دراز ہوگی اس کا عمل سب سے برا ہوگا۔ (تصنیف غررالحکم۔ 312)

3۔ نہج البلاغہ، خطبہ 14 میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِطُوْلِ اَمَالِهِمْ وَتَغْيِّبِ اٰجَالِهِمْ حَتّٰى نَزَلَ بِهِمُ الْمَوْعُوْدُ الَّذِيْ تُرَدُّ عَنْهُ الْمَعْذِرَةُ وَتَرْفَعُ عَنْهُ التَّوْبَةُ''۔

''تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئیں، اُن کی ہلاکت کا واحد سبب یہ تھا کہ اُن کی لمبی آرزوؤں کی وجہ سے موت اُن کی نظر سے اوجھل ہوگئی، یہاں تک کہ جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا، وہ آ گیا جس کے آنے پر معذرت رد ہوجاتی ہے اور توبہ کا دروازہ بند ہوجاتا ہے''۔

4۔ ایک حدیث میں فاطمہؑ بنت الحسینؑ اپنے والد بزرگوار حضرت امام حسینؑ سے اور وہ اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں۔

"اِنَّ صَلَاحَ اَوَّلِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِالزُّهْدِ وَالْيَقِيْنِ وَهَلَاكَ آخِرِهَا بِالشُّحِّ (بِالشَّكِّ) وَالْاَمَلِ"۔

''اس امت کے پہلے لوگوں کی صلاح زہد اور یقین کی بدولت تھی جبکہ آنے والوں کی ہلاکت بخل اور لمبی آرزوؤں کی وجہ سے ہوگی''۔(بحارالانوار، 164:70)

ظاہر ہے کہ ایمان اور یقین محکم اور دُنیوی زیب وزینت کا نتیجہ یہ تھا کہ دورِ اول کے مسلمان میدانِ جہاد میں صرف اللہ پر نظر رکھ کر صرف اس کی خوشنودی کے حصول کیلئے شمشیر زنی کرتے تھے۔ یہی میدانِ جہاد میں ان کی ثابت قدمی اور ان کی فتح کا بنیادی سبب تھا۔ لیکن جب زہد کی جگہ حبِ دُنیا نے لے لی اور ایمان ویقین کی جگہ شک براجمان ہوگیا تو پسپائی اور ذِلت اُن کا مقدر بن گئی۔ اُمتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کیلئے اب بھی زُہد اور یقین کی بحالی کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔

5۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی ایک اور حدیث ہے:

"اَلْاَمَلُ سُلْطَانُ الشَّيَاطِيْنِ عَلٰى قُلُوْبِ الْغَافِلِيْنَ"۔

''لمبی آرزوئیں غافلوں کے دِلوں پر شیطان کی حکومت ہوتی ہیں''۔(تصنیف غررالحکم:312)

6۔ ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"شَرُّ النَّاسِ الطَّوِيْلُ الْاَمَلِ السَّيِّئُ الْعَمَلِ"۔

''بدترین انسان وہ ہے جس کی آرزوئیں دراز اور عمل برا ہو''۔(تصنیف غررالحکم:312)

آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث ہے:

"اِنَّ الْمَرْءَ يُشْرِفُ عَلٰى اَمَلِهٖ فَيَقْطَعُهٗ حُضُوْرُ اَجَلِهٖ. فَسُبْحَانَ اللّٰهِ لَا اَمَلٌ يُدْرَكُ وَلَا مُؤَمَّلٌ يُتْرَكُ"۔

''انسان ہمیشہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ موت اُس کی آرزو کو منقطع کر دیتی ہے، سبحان اللہ! نہ آرزو ملی اور نہ آرزومند کو چھوڑا گیا''۔(تصنیف غررالحکم:313)

7۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک اور حدیث میں آتا ہے:

"اَشْرَفُ الْغِنٰی تَرْكُ الْمُنٰی" (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 211و34)

''افضل ترین بے نیازی یہ ہے کہ انسان آرزوؤں کو ترک کر دے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی دراز آرزوؤں کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو محتاج اور ضرورت مند سمجھتا ہے، ہر جگہ اور ہر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے اور اُن چیزوں کیلئے اپنی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیتا ہے جو اُسے کبھی نہیں ملتی ہیں۔

8۔ حضرت علی علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"كَذِبَ مَنِ ادَّعَى الْاِيْمَانَ وَهُوَ مَشْغُوْفٌ مِنَ الدُّنْيَا بِخِدَعِ الْاَمَانِيِّ وَزُوْرِ الْمَلَاهِيِّ"۔

''جھوٹا ہے وہ شخص جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر آرزوؤں کے فریب اور لغو باتوں اور کاموں کی وجہ سے دُنیا میں کھویا رہتا ہے''۔ (تصنیف غرر الحکم: 312)

ظاہر سی بات ہے کہ طلبِ آرزو کے دیوانے ہر چیز کو بھول کر اپنی آرزو کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں جس سے ان کے ایمان میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔

9۔ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کے ایک مختصر اور جامع فرمان میں ہے:

"اَلْاَمَانِيُّ تُعْمِي عُيُوْنَ الْبَصَائِرِ"۔

''آرزوئیں انسان کی چشمِ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہیں''۔

10۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا: کیا تم سب جنت میں جانا چاہتے ہو؟ سب نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

قَصِّرُوْا مِنَ الْاَمَلِ وَاجْعَلُوْا آجَالَكُمْ بَيْنَ اَبْصَارِكُمْ وَاسْتَحْيُوْا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ"۔

''اپنی آرزو کو مختصر رکھو اور موت کو ہمیشہ سامنے رکھو اور اللہ کی نافرمانی سے شرم کرو جس طرح شرم کرنے کا حق ہے''۔ (المحجۃ البیضاء، 8:246)

11۔ حضرت علی علیہ السلام کی ایک پُرمعنی حدیث ہے:

"اِنَّ الْاَمَلَ يُذْهِبُ الْعَقْلَ، وَيُكَذِّبُ الْوَعْدَ، وَيَحِثُّ عَلَى الْغَفْلَةِ وَيُوْرِثُ الْحَسْرَةَ"۔ (میزان الحکمہ، 1:103)

''لمبی آرزوئیں عقل کو زائل کر دیتی ہیں، جھوٹے وعدے کرتی ہیں، غفلت پر مائل کرتی ہیں اور ان کا انجام

حسرت وندامت ہوتا ہے"۔

12۔ اس بحث کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ایک دن آپؐ نے تین لکڑیاں لیں۔ ایک کو زمین میں گاڑا، دوسری کو اس سے کچھ فاصلہ پر گاڑ دیا اور تیسری کو ذرا زیادہ فاصلے پر گاڑ دیا۔ پھر صحابہ سے پوچھا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی: اللہ اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"هٰذَا الْاِنْسَانُ! وَهٰذَا الْاَجَلُ! وَهٰذَا الْاَمَلُ يَتَعَاطَاهُ ابْنُ آدَمَ وَيَخْتَلِجُهُ الْاَجَلُ دُوْنَ الْاَمَلُ"۔ (میزان الحکمہ، 104:1)

"یہ (پہلی لکڑی) انسان ہے اور یہ (دوسری لکڑی) اُس کی موت ہے اور یہ (تیسری لکڑی) اُس کی آرزو ہے۔ اس سے پہلے کہ انسان اپنی آرزو تک پہنچے، اُس کی موت اُس کا گریبان پکڑ لیتی ہے"۔

ان احادیث سے، جو گلستانِ احادیث سے حاصل کیا ہوا ایک چھوٹا سا گلدستہ ہیں، یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ طولِ اَمل ایک ایسی صفتِ رذیلہ ہے جو انسان کی سعادت کی سب سے بڑی دُشمن اور قربِ خدا کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔

طولِ امل کے نتائج:۔

لمبی آرزوئیں، جو بعض اوقات نہ ختم ہونے والی آرزو بھی بن جاتی ہیں، انسان کی مادی اور معنوی زندگی پر انتہائی خطرناک اثرات مرتب کرتی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر مذکورہ بالا آیات واحادیث میں آچکا ہے۔ لمبی آرزوؤں کے خطرناک نتائج کو فہرست وار اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے:

بہت سے گناہوں کا سبب:۔

لمبی آرزوؤں کا بدترین منفی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان مختلف قسم کے گناہوں کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر ایسی آرزوؤں کو شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس بیماری میں مبتلا افراد حلال وحرام سے آنکھیں بند کر کے، دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے، یتیموں کے اموال پر قبضہ کر کے، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، چور بازاری اور رشوت جیسے ذرائع سے اپنی دولت کو بڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے:

"مَنْ طَالَ اَمَلُهُ سَاءَ عَمَلُهُ"۔

"جس کی آرزو لمبی ہوگی، اُس کا عمل برا ہوگا"۔ (بحار الانوار، 156:1)

"اَطْوَلُ النَّاسِ اَمَلاً اَسْوَءُهُمْ عَمَلاً"۔

''جس کی آرزو سب سے لمبی ہوگی، اس کا عمل سب سے برا ہوگا۔''(غرر الحکم:3054)

اس کے برعکس:

"مَنْ قَصَّرَ اَمَلُهُ حَسُنَ عَمَلُهُ"۔

''جس کی آرزو چھوٹی ہوگی، اس کا عمل اچھا ہوگا''۔(غرر الحکم،295:5)

یہ تینوں احادیث امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہیں۔ ہماری جانیں اُنؑ کے نورانی اور رُوح پرور ارشادات پر قربان ہوجائیں۔

قساوتِ قلب کا سبب:۔

اس مبحث کے آغاز میں مندرج آیات میں سے ایک آیت کے ذیل میں ہم ایک قوم کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ وہ اس خیال میں تھے کہ طویل عمریں پائیں گے (اس وجہ سے وہ لمبی آرزوؤں میں مبتلا ہوگئے) اور ان کے دل سخت ہوگئے۔

اس کی دلیل بھی واضح اور روشن ہے کیونکہ آرزوئیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے غافل اور دُنیا کا حریص بنادیتی ہیں اور انسان آخرت سے بے خبر ہوجاتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ قساوت قلبی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"یَامُوْسیٰ لَا تُطَوِّلْ فِی الدُّنْیَا اَمَلَكَ فَیَقْسُوْا قَلْبَكَ، وَالْقَاسِی الْقَلْبِ مِنِّیْ بَعِیْدٌ"۔

''اے موسیٰ علیہ السلام! دنیا میں اپنی آرزوؤں کو طویل نہ کرو ورنہ تیرا دل سخت ہوجائے گا اور سنگدل مجھ سے دُور ہوتا ہے''۔(میزان الحکمہ، 104:1)

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے:

"مِنْ یَأْمُلُ اَنْ یَعِیْشَ اَبَدًا یَقْسُوْا قَلْبُهُ وَیَرْغَبُ فِی الدُّنْیَا"۔

''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ اس دُنیا میں رہے، اس کا دل سخت ہوجاتا ہے اور وہ دنیا کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔''(میزان الحکمہ، 104:1)

آخرت فراموشی کا سبب:۔

طولِ اَمل کے اس نتیجہ کے بارے میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں، ان کی

زندگی میں یہ نتیجہ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ایسے لوگ کبھی موت کی بات کرتے ہیں نہ آخرت کی فکر کرتے ہیں بلکہ ہمیشہ گردابِ غفلت میں غوطہ زن رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"طُوْلُ الْاَمَلِ یُنْسِی الْآخِرَۃَ"۔

''لمبی آرزوئیں فراموشیٔ آخرت کا سبب ہوتی ہیں۔''

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَکْثَرُ النَّاسِ اَمَلاً اَقَلُّھُمْ لِلْمَوْتِ ذِکْرًا"۔

''جس شخص کی آرزوئیں زیادہ ہوتی ہیں، وہ موت کو کم یاد کرتا ہے'' (تصنیف غرر الحکم:312)۔

موجبِ زحمت ومشقت:۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کی آرزوئیں جتنی لمبی ہوں گی، انہیں عملی جامہ پہنانے کیلئے اسی قدر زیادہ کوشش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کیلئے زیادہ مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی گھریلو سطح پر سختی اور اقتصادی جدوجہد میں زیادہ دوڑ دُھوپ اور زحمت ومشقت کا مرقع بن جاتی ہے۔

اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَنْ کَثُرَ مُنَاہُ کَثُرَ عَنَائُہُ"۔

''جس کی آرزوئیں زیادہ ہوں گی، اس کی زندگی میں مشقت زیادہ ہوگی۔''

نیز آپؑ نے فرمایا:

"مَنِ اسْتَعَانَ بِالْاَمَانِیِّ اَفْلَسَ"۔

''جس نے آرزوؤں سے مدد طلب کی، وہ مفلس ہوگیا''۔

ایک حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"اَلرَّغْبَۃُ مِفْتَاحُ النَّصَبِ"۔

''دنیا کی طرف رغبت سختی ومشقت کی چابی ہے''۔ (تصنیف غرر الحکم:312)

ذِلت آمیز زندگی:۔

لمبی آرزوؤں والے انسان زندگی میں زحمت اور مشقت کے علاوہ ذِلت ورُسوائی سے بھی دو چار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خیالی آرزوؤں کو حقیقت کا رُوپ دینے کیلئے ہر کس وناکس کے سامنے دست سوال دراز کرتے پھرتے ہیں۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ذُلُّ الرِّجَالِ فِیْ خَیْبَةِ الْاٰمَالِ"۔

''آرزوؤں کی ناکامی انسان کو ذلیل کر دیتی ہے''۔(غرر الحکم،405:2)

نعمتوں سے محرومی:۔

جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ لمبی آرزوؤں میں گرفتار اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زیادہ مالی وسائل اکٹھے کرنے میں لگا رہتا ہے، اس وجہ سے اُسے غیر ضروری بچت اور کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی بہت سی نعمتوں اور آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر دیتا ہے۔ ایسے افراد اپنے بیوی بچوں کے اخراجات کے معاملہ میں کنجوسی اور بخل سے کام لیتے ہیں اور دولت مند ہونے کے باوجود فقیروں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔

ہمیں اپنے اردگرد بہت سے ایسے افراد نظر آسکتے ہیں جو''اچھے مستقبل'' کی آرزو لئے اپنے پاس موجود اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہیں۔

حقیقت سے دُوری کا سبب:۔

لمبی آرزوؤں میں گرفتار انسان اس پیاسے کی مانند ہوتا ہے جو تلاشِ آب میں سراب کا تعاقب کر رہا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی خیالی آرزوؤں کی وجہ سے حقیقت کا اصل چہرہ نہیں دیکھ پاتے اور انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کس چیز کے طالب ہیں اور ان کا مطلوب کہاں ہے؟ اس حقیقت کو حضرت علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"اَلْاَمَانِیُّ تُعْمِیْ عُیُوْنَ الْبَصَائِرِ"۔

''آرزوئیں چشمِ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہیں''۔(غرر الحکم:1351)

مختصر یہ کہ صرف وہی شخص حقیقت کا اصل چہرہ دیکھ سکتا ہے جو معرفت کے سرچشمہ سے سیراب ہو اور اس کی عقل پر آرزوؤں کا حجاب نہ پڑا ہوا ہو۔

کفرانِ نعمت:۔

لمبی آرزوؤں کی وجہ سے انسان کی آنکھیں ہمیشہ اُن چیزوں پر لگی رہتی ہیں جو اس کے پاس نہیں ہوتی ہیں اور جنہیں شاید وہ کبھی حاصل نہ کر سکے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو، جو اُس کے پاس موجود ہیں، چھوٹا اور حقیر جاننے لگتا ہے اور یہی ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے جو دُنیا اور آخرت میں برے انجام کا سبب ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"تَجَنَّبُوا الْمُنٰى فَاِنَّهَا تُذْهِبُ بِبَهْجَةِ نِعَمِ اللهِ عِنْدَكُمْ، وَتُلْزِمُ اِسْتِصْغَارَهَا لَدَيْكُمْ، وَعَلٰى قِلَّةِ الشُّكْرِ مِنْكُمْ"۔

''آرزوؤں سے اجتناب کرو، اس لئے کہ ان کی وجہ سے اللہ کی نعمتوں کا حسن تمہاری نظر سے جاتا رہتا ہے اور تم انہیں حقیر سمجھنے لگتے ہو اور ان پر تمہارا شکر کم ہو جاتا ہے (اس طرح تم کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو جاتے ہو)''۔(تصنیف غرر الحکم:314)

طُولِ اَمل کے اسباب ومحرکات

لمبی آرزوؤں کا بنیادی سبب جہالت ہے۔اپنے بارے میں، دنیا کے بارے میں، اللہ کی قدرت کے بارے میں اور اُخروی جزا وسزا کے بارے میں انسان کی جہالت طول امل یعنی لمبی آرزوؤں کی کھائیوں میں پھینک دیتی ہے۔

تشریح:۔

جب انسان اپنے بارے میں جاہل اور بے خبر ہوتا ہے اور اس حقیقت سے غافل ہوتا ہے کہ کسی بھی لمحے اُس کی زندگی ختم ہوسکتی ہے تو وہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی عمر بہت لمبی ہے اور فوراً ہی آرزوہائے دراز کا ایک ہجوم اسے گھیر لیتا ہے اور اسے کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی نہیں دیتا۔

دُنیا کی ناپائیداری اور بے وفائی سے جہالت اور غفلت انسان کو طولِ امل کے گرداب میں پھینک دیتی ہے، حالانکہ دُنیا چھوٹے پر رحم کرتی ہے نہ بڑے پر، جوان پر رحم کرتی ہے نہ بوڑھے پر۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک بوڑھے کے مرنے سے قبل سینکڑوں بچے اور جوان موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں یا کسی بیمار کے مرنے سے پہلے سینکڑوں صحت مند موت کے گھاٹ میں اتر جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک طاقتور اور مقتدر حکمران ایک دن میں اقتدار سے محروم ہو کر پسِ دیوار زندان ہو جاتا ہے یا

دولت مندترین افراداتوں رات غربت وناداری کی چکی میں پھنس جاتے ہیں۔ان تمام امور سے غفلت اور بے خبری انسان کوطولِ امل کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔

مکتبِ وحی کے ایک ممتاز شاگرد حضرت سلمانؓ فارسی فرماتے ہیں:

"ثَلٰاثٌ اَعْجَبَتْنِیْ حَتّٰی اَضْحَکَتْنِیْ: مُؤَمِلُ الدُّنْیَا وَالْمَوْتُ یَطْلِبُہُ، وَغَافِلٌ لَیْسَ بِمَغْفُوْلٍ عَنْہُ، وَضَاحِکٌ مُلِءَ فِیْہِ لَایَدْرِیْ اَسَاخِطٌ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ عَلَیْہِ اَمْ رَاضٍ عَنْہُ"۔(المحجۃ البیضاء، 246:8)

''تین افراد پر مجھے اس قدر تعجب ہوتا ہے کہ مجھے ہنسی آنے لگتی ہے: ایک جو دُنیا کی آرزو کرتا ہے جبکہ موت اس کا پیچھا کر رہی ہوتی ہے، دوسرا وہ جو موت سے غافل ہوتا ہے جبکہ موت اس سے غافل نہیں ہوتی، تیسرا وہ جو منہ بھر کر ہنستا ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رب العالمین اس سے راضی ہے یا ناراض''۔

اس کے ہم معنی ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ اَیْقَنَ اَنَّہُ یُفَارِقُ الْاَحْبَابَ وَیَسْکُنُ التُّرَابَ وَیُوَاجِہُ الْحِسَابَ وَ یَسْتَغْنِیْ عَمَّا خَلَّفَ، وَیَفْتَقِرُ اِلٰی مَاقَدَّمَ کَانَ حَرِیًّا بِقِصَرِ الْاَمَلِ وَطُوْلِ الْعَمَلِ"۔

''جسے یقین ہو کہ وہ جلد ہی احباب سے بچھڑ جائے گا، خاک میں سکونت اختیار کرے گا، حساب کا سامنا کرے گا، جو کچھ پیچھے چھوڑ جائے گا، اس سے بے نیاز ہو جائے گا اور جو عملِ خیر آگے بھیجا ہے، اس کا محتاج ہوگا تو ایسے شخص کیلئے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنی آرزو چھوٹی رکھے اور عمل زیادہ کرے''۔(بحارالانوار، 167:70)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِتَّقُوْا خِدَاعَ الْاَمَالِ، فَکَمْ مِّنْ مُؤَمِّلٍ یَوْمٍ لَمْ یُدْرِکْہُ، وَبَانِیْ بَنَاًلَمْ یَسْکُنْہُ، وَجَامِعِ مَالٍ لَمْ یَاْکُلْہُ"۔

''آرزوؤں کے فریب سے بچو، کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اپنی آرزو کو نہ پا سکے اور کتنے ہی ایسے بنانے والے ہیں جو اپنے بنائے ہوئے گھروں میں نہ رہ سکے اور کتنے ہی مال جمع کرنے والے ہیں جو اپنا جمع کیا ہوا مال نہ کھا سکے''۔(تصنیف غررالحکم:313)

بعض اوقات آخرت اور اس کی لازوال نعمتوں سے غفلت اور زُہد اور دُنیوی زیب وزینت کی اسارت سے رہائی کی لذت سے بے خبری انسان کو طولِ امل کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِسْتَجْلِبْ حَلَاوَةَ الزَّهَادَةِ بِقِصَرِ الْاَمَلِ"۔ (تحف العقول: 207)

''آرزوؤں کو چھوٹا کر کے زندگی کی شیرینی کی لذت محسوس کرو''۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت سے غافل یا جاہل ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ جس اللہ نے شکمِ مادر میں اس کو رزق دیا جبکہ کوئی اس تک دسترس نہ رکھتا تھا، وہی اللہ اُس کو زندگی بھر رزق دے سکتا ہے۔ اگر اس کی اولاد اللہ سے محبت کرنے والی ہو تو اللہ اسے تنہا نہیں چھوڑے گا اور اگر اللہ کی دُشمن ہوئی تو اُس کی خدمت کرنا ایک احمقانہ عمل ہے۔

ان تمام امور سے جہالت اور بے خبری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان طولِ امل کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

طُول اَمل کا علاج

کسی بھی بیماری کے علاج کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ اس کے اسباب کا خاتمہ کیا جائے۔ جب تک بیماری کی جڑوں کو نہ اُکھاڑا جائے، ہر علاج سطحی علاج ہوگا۔ اس بنیادی اُصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور لمبی آرزوؤں کی بنیادی وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے بآسانی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ طولِ امل کا خاتمہ کرنے کیلئے سب سے پہلا اور بنیادی قدم یہ ہے کہ انسان غور و فکر سے کام لے۔

اس غور و فکر کا مقصد یہ ہو کہ ایک طرف سے انسان اپنے آپ کو پہچانے اور اس حقیقت کا ادراک حاصل کرے کہ اس کے اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے اور یہ کہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اگر آج صحت مند ہے تو کل بیمار۔ آج طاقتور اور مالدار ہے تو ہو سکتا ہے کہ کل کمزور اور فقیر ہو۔ ایسے انقلابات کے نمونے دُنیا میں بہت سے ہیں۔

دُوسری طرف سے انسان اس دُنیا کی ناپائیداری کے بارے میں غور و فکر کرے جہاں ایک چھوٹا سا حادثہ بڑے بڑے واقعات کا سبب بن جاتا ہے۔ نادر شاہ، جو ایک طاقتور بادشاہ تھا، اس کے بارے میں کہا گیا:

شبانگہ بہ دل تاراج داشت
سحرگہ نہ تن سر، نہ سرتاج داشت

''رات کو اس نے حملے اور تاراج گری کا ارادہ کیا مگر صبح اس کا سر تن پہ تھا نہ تاج سر پر''۔

بیک گردش چرخ نیلو فری
نہ نادر ہا بہ جامی مانند ونہ نادری

''آسمان کی ایک گردش کے نتیجہ میں نہ نادر باقی رہا اور نادری''۔

تیسری طرف ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم آخرت، حساب و کتابِ اعمال اور سزا و جزا پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ دُنیا ایک گزرگاہ

اور آخرت، ابدی رہائش گاہ ہے۔ ہمیں اس دنیا میں اگلی دُنیا کا مال واسباب جمع کرنا ہے۔ حرص انسان کا کوئی مسئلہ حل نہیں کرتی بلکہ روز بروز اس کی مشکلات اور پریشانیوں میں اضافہ کرتی ہے۔ انسان کے آرام وسکون کا بہترین ذریعہ تقویٰ اور اللہ پر توکل ہے، نہ کہ حرص و دنیا پرستی۔ اس مقصد کے حصول کا بہترین راستہ وہی ہے جو اس حدیث نبویؐ میں بیان ہوا ہے:

"خُذْمِنْ دُنْيَاكَ لِآ خِرَتِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ ،وَمِنْ صِحَّتِكَ لِسُقْمِكَ، فَإِنَّكَ لَاتَدْرِیْ مَا اسْمُكَ غَدًا"۔

''اپنی دنیا سے آخرت کا سامان اور اپنی زندگی سے بعد از موت کیلئے اور صحت کے وقت بیماری کے دنوں کیلئے سامان جمع کرو، اس لئے کہ تم نہیں جانتے کہ کل تمہارا کیا نام ہوگا (یعنی معلوم نہیں کہ کل تم زندہ کہلاؤ گے یا مردہ، بیمار کہلاؤ گے یا صحت مند)''۔ (بحار الانوار، 122:74)

دنیا کی محبت طولِ اَمل کا ایک اہم سبب ہے۔ حُبِ دُنیا میں جس قدر کمی ہوگی، اسی قدر آرزوؤں کی درازی میں کمی آتی جائے گی۔ اس کے برعکس جس قدر حُبِ دُنیا میں اضافہ ہوتا جائے گا، اسی قدر آرزوئیں بھی درازتر ہوتی جائیں گی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو موت کا ذکر آرزوؤں کو کوتاہ کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے جو چشمِ بصیرت کے آگے سے غفلت کے حجابات کو دُور کر دیتا ہے اور زندگی کے حقائق اپنی اصل صورت میں انسان کے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبہ 99 میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلَا فَاذْكُرُوْا هَادِمَ اللَّذَّاتِ، وَمُنَغِّصَ الشَّهَوَاتِ، وَقَاطِعَ الْاُمْنِيَّاتِ"

''لذتوں کو منہدم کر دینے والی، شہوات کو درہم برہم کر دینے والی اور آرزوؤں کو منقطع کرنے والی چیز (یعنی) موت کو یاد رکھو''۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عُدَّ نَفْسَكَ فِيْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ"۔

''اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرو (تا کہ طولِ امل کا شکار نہ ہو جاؤ)''۔ (بحار الانوار، 122:74)

اس کے برعکس امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

"اَكْثَرُ النَّاسِ اَمَلاً اَقَلُّهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْرًا"۔ (تصنیف غرر الحکم: 312)

''سب سے زیادہ آرزوئیں اُن لوگوں کی ہوتی ہیں جو موت کا ذکر سب سے کم کرتے ہیں''۔

طول امل کے علاج کا ایک اور طریقہ اس کے خطرناک اور منحوس اثرات ونتائج کے بارے میں غور وفکر کرنا ہے۔ اگر انسان اس نکتہ پر توجہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ آرزوہائے دراز کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور اخلاقی رذائل میں گرجاتا ہے جن کا

ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

یہاں دو نکتے قابلِ ذکر ہیں:

اوّل یہ کہ جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کے علاج میں بیمار کے رجحان کو تبدیل کیا جاتا ہے، مثلاً جو شخص روغنیات اور نشاستے کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہو، اسے تازہ پھل اور سبزیاں وغیرہ کھانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

اخلاقی بیماریوں کے علاج میں بھی یہ بات صادق آتی ہے اور معلم اخلاق کا کام ہے کہ دُنیا اور مادی اُمور سے متعلق لمبی آرزوؤں کو آخرت کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کے انعام واکرم کی آرزو میں تبدیل کر دے۔ دُنیوی مال و دولت اور مقام و مرتبہ کی خواہش کو معرفتِ خدا اور قربِ الٰہی کی خواہش میں تبدیل کر دے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان آرزوؤں کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات انسان درازیٔ عمر کی خواہش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہودیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

"يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ○"

''ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار سال جیئے''۔ (بقرہ:96)

یہاں ہزار سال لامحدود عمر کا استعارہ ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص سو سال جینے کی تمنا رکھتا ہو، اس سے کم تر ممکن ہے کہ کوئی شخص پچاس سال جینے کی آرزو رکھتا ہو۔ احادیث میں ان سب کو عمر دراز کی خواہش قرار دیا گیا ہے۔ (البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب انسان دُنیا کیلئے جینے کی خواہش رکھتا ہو۔ معنوی کمالات کے حصول اور انسانیت کی خدمت کیلئے طویل عمر کی خواہش کچھ اور بات ہے)۔

مختصر یہ کہ لمبی آرزوئیں، خواہ عمر سے متعلق ہوں یا مادی لذتوں، نفسانی شہوات یا مقام و مرتبہ سے متعلق، سب مذموم اور ناپسندیدہ ہیں۔ اگرچہ ان کی برائی اور ناپسندیدگی کے درجات مختلف ہیں۔

مثبت اور تعمیری آرزوئیں:۔

طولِ امل کے مبحث میں آخری بات یہ ہے کہ ساری آرزوئیں منفی اور انسان کی شخصیت کے انحطاط اور اخلاقی پستی کی دلیل نہیں ہوتی ہیں۔ اگر آرزوؤں کا رُخ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی طرف ہو، وہ انسانی معاشرہ کے ترقی کو مدِ نظر رکھے ہوئے ہوں اور کمال کے اعلیٰ درجات تک پہنچنے کیلئے انسان کو جدوجہد اور کوشش پر اُکساتی ہوں تو ایسی آرزوئیں جس قدر بھی دراز اور طولانی ہوں، وہ انسان کے کمال کی علامت ہوتی ہیں۔ پستی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جیسا کہ آغازِ بحث میں بیان ہو چکا ہے کہ مستقبل کے بارے میں اُمید اور آرزو ہی انسان کو کوشش اور عمل کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اگر کسی انسان کے دل میں اُمید کا چراغ بجھ جائے تو درحقیقت اس کی رُوح مر جاتی ہے، اس کی زندگی لذت اور نشاط سے

خالی ہوجاتی ہے۔ایسا انسان ایک بے مقصد اور سست رفتار موجود میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی آرزوئیں دو قسم کی ہوتی ہیں: جھوٹی آرزوئیں، جن کی حیثیت سراب کی سی ہوتی ہے۔ یہ سراب انسان کی زندگی کے صحرا میں نمودار ہوتا ہے اور پیاسے انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جس قدر اس کا تعاقب کرتا ہے، اُسی قدر اس کی پیاس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پیاس کی شدت سے ہلاک ہوجاتا ہے۔

آرزوؤں کی دُوسری قسم سچی آرزوئیں ہیں جو انسان کی زندگی کے گلستان کیلئے آبِ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُسے سیراب کر کے ثمر بار کر دیتی ہیں۔ ان آرزوؤں کی بنیاد پر انسان جس قدر محنت اور کوشش کرتا ہے، اُس کی زندگی کی لذت ونشاط ومعنویت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قرآن شریف اس حقیقت کا ذکر اس طرح فرماتا ہے:

"اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا○"۔

''مال اور اولاد زندگی ودُنیا کی زینت ہیں، جبکہ باقی رہنے والے اعمالِ صالح تمہارے رب کے ہاں اجر وثواب کیلئے بہتر اور زیادہ اُمید کا باعث ہیں۔'' (کہف:46)

اس آیت میں دونوں قسم کی آرزوؤں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

احادیث میں بھی مثبت اور تعمیری آرزوؤں کے بارے میں انتہائی بامعنی بیانات ملتے ہیں۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيْرَ لَيَقُوْلُ يَارَبِّ ارْزُقْنِيْ حَتّٰى اَفْعَلَ كَذَاوَ كَذَامِنَ الْبِرِّوَوُجُوْهِ الْخَيْرِ، فَاِذَاعَلِمَ اللهُ ذٰلِكَ مِنْهُ بِصِدْقِ نِيَّتِهٖ كَتَبَ اللهُ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلَ مَايَكْتُبُ لَهُ لَوْعَمِلَهُ،اِنَّ اللهَ وَاسِعٌ كَرِيْمٌ"۔(بحار الانوار، 261:8)

''جب اللہ کا کوئی نادار بندہ اس طرح دُعا کرتا ہے کہ یا اللہ! تو مجھے وسعتِ رزق عطا فرما تا کہ میں فلاں فلاں کارِخیر میں صرف کروں، اللہ کو اگر معلوم ہو کہ اس کی نیت سچی ہے تو وہ ان کارہائے خیر کا ثواب اس کے نامہ اعمال میں لکھ دے گا، خواہ فی الواقع اُس نے وہ انجام نہ دیئے ہوں۔اللہ کا کرم بہت وسیع ہے''۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت کو جانچنے کا پیمانہ اُس کی مثبت اور تعمیری آرزوئیں ہیں۔جس قدر مثبت اور تعمیری آرزوئیں وسیع تر اور عظیم تر ہوں گی، اُسی قدر اس انسان کی ہمت بھی عظیم اور بلند ہوگی۔احادیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن انسان کو اس کی آرزوؤں کی عظمت کے مطابق اجر اور صلہ عطا فرمائے گا، اس لئے کہ ان کی رُوح اور جسم زیادہ سے زیادہ اعمالِ صالح انجام

دینے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔

بعض احادیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی اچھے مقصد کا متمنی ہو اور اللہ کی رضا کیلئے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کی زندگی کے خاتمے سے پہلے اس کی اس تمنا کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ جنابِ رسولؐ خدا کا ارشاد ہے:

"مِنْ تَمَنّٰی شَیْئًا وَّ ھُوَ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَ رِضًا، لَمْ یَخْرُجْ مِنَ الدُّنْیَا حَتّٰی یُعْطَاہُ"۔

''اگر کوئی شخص کسی چیز کی آرزو کرے اور اس میں اللہ کی رضا بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے اس وقت تک دُنیا سے نہیں نکالتا جب تک کہ اُس کی آرزو اُسے عطا نہ کر دے۔'' (بحار الانوار، 261:68)

البتہ بعض اوقات ممکن ہے کہ مشیتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ انسان کی آرزو پوری نہ ہو، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ آرزو پوری ہونے پر وہ غرور و تکبر، حُبِ دُنیا، غفلت اور ایسی دیگر بیماریوں میں مبتلا ہو جائے۔ ایسی صورت میں ان آرزوؤں کی تکمیل کا راستہ روکنا اللہ تعالیٰ کا ایک مخفی لطف ہوتا ہے۔

اس بحث کو ہم اس نکتہ پر ختم کرتے ہیں کہ تعمیرِ آرزوئیں انسان کو کردار کی تعمیر کا جذبہ دیتی ہیں اور رُوحانی ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہیں، اس لئے کہ بزرگی کے اسباب فراہم کئے بغیر بزرگی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ایک عرب شاعر کا کہنا ہے:

أُعَلِّلُ النّفس بالآ مال أُدرکُھَا
مَااَضْیَقَ الْعَیْشُ لَوْلَا فُسْحَۃُ الْاَمَلِ

''میں تعمیری آرزوؤں کے ذریعہ اپنے آپ کو تعمیر کرتا ہوں تا کہ انہیں حاصل کر سکوں، اگر آرزوئیں وسیع نہ ہوں تو زندگی کا میدان کس قدر تنگ ہو جائے''۔

آٹھواں باب

تعصُّب اور ضد

تمہید:۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبودیت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان حق کے سامنے تواضع اور خضوع اختیار کرے اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔ اس کے برعکس ہر قسم کی ضد اور تعصب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حق سے دُور اور سعادت سے محروم ہوجاتا ہے۔

تعصب کسی چیز کے ساتھ غیر معقول اور غیر منطقی وابستگی کو کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حق کو اُس چیز پر قربان کر دیتا ہے۔ ضد، جس کیلئے فارسی میں لجاجت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کسی چیز پر اس طرح اصرار کرنے کو کہتے ہیں کہ انسان عقل ومنطق کو پیروں تلے روند ڈالتا ہے۔ تعصب اور لجاجت کا نتیجہ اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو انسان کی ترقی وتکامل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

جب ہم انبیاؑ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ حقیقت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ ان کی قوموں کی گمراہی کا سبب تعصب، ضد اور اندھی تقلید کے سوا کچھ نہ تھا۔ قرآن شریف نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے بیان فرمایا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد ہم قرآنی آیات کی روشنی میں اس موضوع کا جائزہ لیتے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے آغاز کرتے ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

1۔ "وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا۔"

''اور میں نے جب بھی انہیں بلایا تاکہ تو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر اوڑھ لیتے اور اپنی روِش پر اصرار کرتے رہے اور خوب استکبار کا مظاہرہ کیا''۔(نوح:7)

2۔ "وَقَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِہَتَکُمۡ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۬ۙ وَّلَا یَغُوۡثَ وَیَعُوۡقَ وَنَسۡرًا ۝"

''اور انہوں (قوم نوحؑ) نے کہا: اپنے خداؤں کو نہ چھوڑو، خاص طور پر ود، سواع اور نسر کو نہ چھوڑو''۔(نوح:23)

اس کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کا قصہ بیان ہوا ہے:

3۔ "قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ"۔

''انہوں نے کہا: تم اس لئے آئے ہو کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؑ واجداد کرتے تھے اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہم کو ڈراتے رہتے ہو''۔(اعراف:70)

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

4۔ "اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ○قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ"

''جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباؑ واجداد کو ان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔(انبیاؑ:52و53)

5۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۝

''اُس نے کہا: کیا جب تم انہیں پکارتے ہو تو وہ تمہیں جواب دیتے ہیں؟ یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباؑ واجداد کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے''۔(شعراؑ:72تا74)

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اور فرعون کی داستان آتی ہے۔قرآن مجید فرماتا ہے:

6۔ "قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ"۔

''(فرعونیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے) کہا: کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہمیں ہمارے آباؑ واجداد کی راہ سے ہٹا دو اور تم دونوں کو معاشرے میں ہم پر برتری حاصل ہو جائے؟ ہم تو تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں''۔(یونس:78)

7۔ "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ"۔

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس راہ کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ آیا اگر ان کے آباؤ اجداد کچھ عقل نہ رکھتے تھے اور ہدایت یافتہ بھی نہ تھے تو کیا پھر بھی یہ ان کی راہ کی اتباع کریں گے؟'' (بقرہ:170)

8۔ ''اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝''

''جب کفار نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھرے ہوئے تھے تو اس نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی تسکین نازل کی اور انہیں تقویٰ کی بات پر ثابت قدم رکھا اور وہ اس کے زیادہ حقدار تھے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔'' (فتح:26)

9۔ ''وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ۝''

''اگر ہم قرآن مجید کو کسی عجمی پر نازل کرتے اور وہ یہ قرآن انہیں سناتا تو یہ ہرگز اس پر ایمان نہ لاتے''۔ (شعرا:198 تا 199)

مختلف اقوام کے ایک دوسرے کے خلاف تعصب کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

10۔ ''وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝''

''یہودیوں نے کہا: نصاریٰ کا اللہ کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے اور نصاریٰ نے کہا: یہودیوں کا اللہ کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے، حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب کو پڑھتے تھے (لہٰذا ان میں ایسے تعصّبات نہیں ہونے چاہیں تھے) اسی طرح جاہل (مشرکین) بھی ان جیسی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ قیامت کے دن ان کے اختلافات کا فیصلہ کردے گا''۔ (بقرہ:113)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے تعصب، ضد اور اندھی تقلید کو ایک گمراہ قوم کی گمراہی کا سبب قرار دیا:

11۔ ''وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ''۔

''اوراسی طرح جب بھی ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو ان کے عیش پرست افراد نے کہا: ہم نے اپنے آباؤاجداد کوایک طریقے پر پایا ہےاور ہم انہی کے نقش قدم پر چلیں گے''۔(زخرف:23)

12۔ "وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ○"

''اوروہ کہتے ہیں: کیا ہم ایک مجنون شاعر کیلئے اپنے معبودوں کوچھوڑ دیں؟''۔(الصافات:36)

تفسیر اور نتیجہ

گمراہ اقوام کی عمومی روِش:۔

جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مندرجہ بالا تینوں اخلاقی برائیاں یعنی تعصب،ضداوراندھی تقلید ہی ماضی کی تمام گمراہ اقوام کی عمومی روِش تھی۔وہ اپنے جاہلانہ افکاراورطرزِ زندگی سے شدیدوابستگی کی وجہ سےان کے بارے میں اپنے بزرگوں کی اندھادھند تقلید کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہادیانِ برحق کی صدااان کےتعصب،ضداوراندھی تقلید کے نقارخانے میں طوطی کی آواز بن کررہ جاتی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے شروع کرتے ہیں۔آپؑ کے دَور کے بت پرست اس قدرمتعصب اورضدی تھے کہ وہ اس اولوالعزم رسول کی صدائے توحید سے وحشت زدہ ہوجاتے تھے۔مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں ہم حضرت نوح علیہ السلام کا یہ جملہ دیکھتے ہیں:

"وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ"(نوح:7)

''میں نے جب بھی انہیں ایمان لانے کی دعوت دی تاکہ (اے خدا) تو انہیں بخش دے، انہوں نے اپنی اُنگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اوراپنے کپڑے کھینچ کراپنے سراور چہروں پرڈال دیئے،انہوں نے حق کی مخالفت پراسراجاری رکھااورشدیدتکبر کامظاہرہ کیا''۔

جی ہاں!ان کاتعصب اس قدرشدیدتھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی آوازکو،جو پیغامِ حق کی حامل تھی،اپنے کانوں میں داخل ہونے کی اجازت دینے پرتیارنہ تھےاورنہ ہی ان کی شکل دیکھنے کے روادار تھے۔حق سے اس طرح دور بھاگنا واقعی نہ صرف حیرت انگیز بلکہ خطرناک بھی ہے۔

دُوسری آیت میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی اسی اخلاقی برائی کی ایک اورجھلک دکھائی گئی ہے۔قرآن مجید

کہتا ہے:

"وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝"(نوح:23)

''اورانہوں (قوم نوحؑ) نے کہا: اپنے خداؤں کو نہ چھوڑو، خاص پرود، سواع اور نسر کو نہ چھوڑو''۔

اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ آخر کیا بات ہے کہ تم اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں کو اپنی اور ساری کائنات کی تقدیر کا مالک سمجھتے ہو؟ تو ان کے پاس تعصب اور اندھی تقلید کے علاوہ اور کوئی دلیل موجود نہیں۔

تیسری آیت میں قومِ عاد اور اُن کے رسول حضرت ہودؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝"(اعراف: 70)

یعنی قومِ ہودؑ اس قدر ضدی، متعصب اور جاہل تھی کہ اللہ کے رسول کی دعوتِ توحید کے جواب میں کہنے لگی: کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ (ہم تو ایسا نہیں کریں گے) اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس کا تم ہم سے وعدہ کر رہے ہو۔

یہ اُن کے تعصب، ضد اور اندھی تقلید کا نتیجہ تھا کہ وہ خالص توحید سے، جو عالم ہستی کی روح ہے، اس طرح وحشت زدہ ہو رہے تھے اور عقل وشعور سے عاری بتوں کی پرستش اُن کی نظر میں دلکش اور جاذب تھی، یہاں تک کہ وہ نقصان سے بچنے کے آفاقی اصول کے پیش نظر اللہ کے عذاب سے بچنے کی کوشش کرنے کی بجائے اصرار کر رہے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ہمیں ڈرا رہے ہو، اُسے لے ہی آؤ۔

اس طرح وہ حق سے فرار اور اندھی تقلید پر اصرار کرتے رہے۔

چوتھی آیت میں نمرود اور قومِ نمرود کی حالت کا ذکر ہے جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی بدولت ان پر آئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝"(انبیأ:52)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا آذر) سے کہا: یہ بے جان مورتیاں کیا ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو؟

اُن کی قوم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لہٰذا وہ کہنے لگے:

"قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝"(انبیأ:53)

''انہوں نے کہا: ہم نے اپنے آباؤاجداد کوان کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے انہیں کہا کہ تم بھی گمراہ ہواور تمہارے باپ دادا بھی گمراہ تھےتو وہ پھر بھی بیدار نہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے بتوں کا کھوکھلا پن ظاہر کرنے کیلئے انہیں توڑ ڈالا۔ پھر بھی انہیں عقل نہ آئی بلکہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کوآگ میں جلانے کا منصوبہ بنالیا اوراس منصوبے پرعمل کرتے ہوئے انہیں آگ میں پھینک دیا۔ جب آگ حضرت ابراہیمؑ کوجلانے کی بجائے ٹھنڈی ہوگئی اورگلستان بن گئی اورانہوں نے یہ عظیم معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، پھر بھی ضد،تعصب اور جہالت کی راہ پر چلنے سے باز نہ آئے۔

ان سب باتوں سے یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ تعصب اورضد اس قدرخطرناک اخلاقی برائی ہیں کہ انسان پرآزادی سے سوچنے اورحق کی طرف جانے کے راستے بند کردیتی ہیں۔ایک بار جوشخص ان کے چنگل میں پھنس جائے، وہ ہر ذِلت اورحقارت کو قبول کرنے پرآمادہ ہوجاتا ہے۔ یہ برائیاں اس انسانی مقام کی عظمت اوراُس کی روح کی بلندی کوچکناچورکردیتی ہیں مگر وہ حق کے سامنے سرتسلیم خم نہیں کرتا۔

پانچویں آیت میں بھی نمرود کی قوم کی متعصّبانہ بت پرستی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے انتہائی واضح اوردو ٹوک دلیل سے بت پرستی کاابطال کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾

ابراہیمؑ نے کہا: جب تم انہیں بلاتے ہوتوکیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ یا کیا یہ تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟(شعراء۔73:72)

ان کے پاس اس واضح منطقی دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔انہوں نے اندھی تقلید کی پناہ لیتے ہوئے کہا:

"قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ"

''ہم نے اپنے آباؤاجداد کوایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے''۔(شعرأ:74)

حالانکہ اگرانسان کوتقلید کرنا بھی ہوتوکسی عالم اوردانش مند کی تقلید کرنی چاہئے، نہ کہ کسی متعصب جاہل کی۔لیکن متعصب اورہٹ دھرمی کا حجاب اس قدرضخیم ہوتا ہے کہ آفتاب ہدایت کی روشنی، منطق اورعقلی دلائل اس کے اندر سے گزرکردُوسری طرف روشنی نہیں کرسکتے۔

چھٹی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کے سامنے فرعون اوراُس کے ساتھیوں کی ضداورہٹ دھرمی کاذکر ہے۔انہوں نے اپنے آباؤاجداد کی بت پرستی کی روِش پراصرارکرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کوجواب دیا:

"قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا

نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ"۔

انہوں نے کہا: کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے اور تم دونوں کو زمین میں بڑائی حاصل ہو جائے؟ ہم تو دونوں کی بات ماننے والے نہیں ہیں (یونس:78)

انہوں نے کبھی اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ آیا موسیٰ علیہ السلام دین حق ہے یا باطل اور یہ کہ اسے ان کے آباؤ اجداد کے دین پر کوئی برتری حاصل ہے یا نہیں؟ وہ تو اس بات کی رٹ لگا رہے تھے کہ ہم تو اپنے آباؤ اجداد کی روِش کی حفاظت کریں گے، خواہ وہ حق ہو یا باطل، ہمارے لئے یہی اہم ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ بدگمانی سے کام لیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگاتے ہیں کہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہمارے آباؤ اجداد کی روِش سے ہٹا کر تم ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہو؟ درحقیقت تم نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے یہ سارا سلسلہ شروع کر رکھا ہے ورنہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی وحی اور نہ ہی کوئی رسالت!

اُن کی یہ بدگمانی بھی ان کے تعصب کا نتیجہ تھی اور وہ حق سے فرار کیلئے بے بنیاد عذر تراشی کر رہے تھے۔ شاید وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی روشنی نے مصر کے لوگوں کے افکار کو منور کر دیا تو نہ صرف یہ کہ ان کے آباؤ اجداد کا بیہودہ دین تباہ ہو جائے گا بلکہ ان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ پوری قوت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے محاذ آرائی پر اُتر آئے اور لوگوں میں بھی تعصب اور ضد کی آگ کو ہوا دینے لگے۔ چونکہ فرعون اور اُس کے درباری صرف اپنی حکومت بچانے کیلئے فکرمند تھے، لہٰذا وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی سب کچھ حکومت حاصل کرنے کیلئے کر رہے تھے۔

یہ سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں جاری رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دور آ گیا۔

ساتویں آیت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکین عرب کی گمراہی کا بنیادی سبب اندھی تقلید اور تعصب کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے اس تعصب کا اثر یہ تھا کہ معرفتِ حق کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حالت کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

"وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے، اس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس راہ کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔'' (بقرہ:170)

قرآن مجید انہیں دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ"۔ (بقرہ:170)

''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان کے آباؤ اجداد عقل سے کام نہ لیتے تھے اور ہدایت یافتہ نہ تھے؟''

آیت کے الفاظ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ وہ اس بات کا انکار نہیں کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ پیش کررہے ہیں، وہ ''مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ'' یعنی اللہ کا نازل کردہ تھا بلکہ وہ جہالت اور تعصب میں اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو اس پر مقدم گردانتے تھے، وہ آباؤ اجداد جن کی جہالت اور گمراہی بھی اُن پر واضح تھی۔

اس طرح جہالت وتعصب کی وجہ سے انسان اس مقام پر آجاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ ہدایات کو ترک کر کے حق کی طرف پشت کرلیتا ہے اور باطل کو گلے سے لگائے رہتا ہے، حالانکہ وہ حق اور باطل کو پہچانتا ہے۔

آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حدیبیہ کا واقعہ یاد دلا رہا ہے کہ کس طرح کفار رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کے تمام دلائل کو دیکھنے کے باوجود دورِ جاہلیت کے تعصب کی وجہ سے ایمان لانے پر تیار نہ ہوئے اور اس اخلاقی برائی نے انہیں ایک عظیم سعادت سے محروم کردیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَکَانُوْٓا اَحَقَّ بِھَا وَاَھْلَھَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ○''

''یاد کرو جب کفار نے اپنے دل جاہلیت کے تعصب سے بھر لیا تھا تو (اور نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لائے بلکہ مقابلے پر اتر آئے) اس کے برعکس اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی تسکین نازل کی (تاکہ وہ حق اور عدالت کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے متعصب دُشمنوں کا مقابلہ کرسکیں) اور اس نے انہیں تقویٰ کی بات پر پختہ کردیا اور وہ اس کے حقدار اور اہل تھے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' (فتح:26)

اس آیت میں حمیت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ''حَمٌّ'' (بروزن حَمَدٌ) سے مشتق ہے اور یہ اس حرارت کو کہتے ہیں جو بیرونی عوامل کی وجہ سے انسان یا کسی اور چیز میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی وجہ سے بخار کو بھی عربی میں ''حُمّٰی'' کہتے ہیں۔

عربی میں یہ لفظ غصے، تکبر اور تعصب پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ یہ انسان کے اندر ایک قسم کی گرمی پیدا کردیتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ آیت میں حمیت کو جاہلیت کی طرف نسبت دی گئی ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے تعصب کی بنیاد جہالت اور نادانی ہے۔ اس کے برعکس تسکین کو اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے، اس لئے کہ یہ تسکین اللہ پر ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں آگاہی ومعرفت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

اگلے مباحث میں ہم مثبت اور منفی تعصب پر روشنی ڈالتے ہوئے حمیت کو جاہلیت کی طرف نسبت دینے کے نکتہ کو مزید واضح کریں گے۔

نویں آیت میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت کے مشرکینِ عرب کے شدید تعصب سے پردہ

اُٹھا رہا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝"

اگرہم اس قرآن کوکسی غیرعرب پرنازل کرتے اوروہ اسے ان کے سامنے پڑھتا تو یہ اس پرایمان نہ لاتے۔(شعرا:198 تا199)

یہ آیت اس حقیقت کو بیان کررہی ہے کہ اگران اعلیٰ وارفع مطالب ومعارف پرمشتمل یہ فصیح وبلیغ قرآن کسی غیرعرب پر نازل کرتے تو یہ عرب اپنے تعصب کی وجہ سے اس پرایمان نہ لاتے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تعصب اورہٹ دھرمی کس قدر بری صفت ہے اورانسان کوحق سے دُور رکھنے میں کس قدر گہرا کردارادا کرتی ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے بعض اورمعنی بھی بیان کیے ہیں مگر ہماری نظر میں یہی معنی درست ہیں جوہم نے بیان کئے ہیں۔

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں تمام متعصب افرادکو جاہلیت کے عربوں کے انجام میں شریک قرار دیاہے:

"مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ حَبَّةٌ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ عَصَبِيَّةٍ بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ اَعْرَابِ الْجَاهِلِيَّةِ"۔

''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تعصب ہو، قیامت کے دن اللہ اسے جاہلیت کے عربوں کے ساتھ محشور کرے گا''۔(اصول کافی،2:308)

دسویں آیت میں تعصب کا ایک اور پہلو بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بعض اقوام یا گروہوں کے افراد اپنے آپ کوسب اقوام اورگروہوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور دوسری اقوام کے افرادکوکم تر سمجھتے ہیں۔گویا وہی اللہ کی برگزیدہ ترین قوم ہیں اور دوسرے کچھ بھی نہیں ہیں۔اسی بنیاد پرمختلف اقوام کے درمیان ایک مسلسل جنگ جاری رہتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝"

یہودیوں نے کہا کہ اللہ کے ہاں مسیحیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اورمسیحی بھی کہتے ہیں کہ یہودیوں اللہ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں ہے،حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں(جوایسے تعصّبات کی مذمت کرتی ہے)

ایسی ہی باتیں جاہل لوگ (عرب کے مشرک) بھی کہتے ہیں جن باتوں میں یہ باہم اختلاف کرتے ہیں، قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان اس کا فیصلہ کردے گا۔(بقرہ:113)

اس آیت میں استعمال شدہ الفاظ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ایسے تعصّبات اور خود پسندی کے احساسات کا سر چشمہ جہالت اور نادانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور ہر جاہل و نادان قوم ایسے تعصّبات میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

''الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ''، ''جو لوگ نہیں جانتے'' کے الفاظ ایک وسیع مفہوم کے حامل ہیں اور مشرکین عرب اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہیں۔بعض مفسرین نے اس سے قومِ نوحؑ یا تمام گزشتہ اُمتوں کو مراد لیا ہے جو جہالت اور نادانی کی وجہ سے تعصب میں مبتلا ہوگئی تھیں۔

گیارہویں آیت میں ایک عام کلی حکم بیان کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دَور میں کفر کے استمرار اور توحید کے خلاف مسلسل جنگ کا بنیادی سبب تعصب تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ"۔

آپ سے قبل ہم نے جس بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تو وہاں کے مغرور امراء نے کہا کہ ہم نے اپنے آباءواجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم تو انہیں کی اقتداء کرتے رہیں گے۔(زخرف:23)

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے رسولوں کی دعوت پر ایمان لانے میں تعصب ہر دور میں سب سے بڑی رُکاوٹ بنا رہا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اخلاقی برائی کس قدر خطرناک ہے۔

بارھویں آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جاہل اقوام اپنے تعصب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے انبیاؑ کو، جو عقلِ کُل ہوتے تھے، دیوانہ کہا کرتے تھے اور اس بہانے سے اُن کے خلاف صف آرائی کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَیَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ○"

''اور وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایک مجنون شاعر کیلئے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''۔(الصافات:36)

وہ اپنی جہالت اور تعصب میں اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ اپنی بات کے تضاد کو بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔شاعر ہونے کیلئے غیر معمولی عقل اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔لہٰذا شاعر اور دیوانگی کا آپس میں کوئی جوڑ ہی نہیں۔اسی طرح وہ انبیاؑ کو دیوانہ اور ساحر بھی کہتے تھے، حالانکہ سحر کیلئے بھی بعض علوم کی ضرورت ہوتی ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ دیوانہ، عالم اور ساحر نہیں ہوسکتا۔لیکن متعصب کفار اپنے تعصب، جہالت اور ضد کی وجہ سے ایسی متضاد باتیں کرتے تھے اور اپنے تضاد کو محسوس نہیں کرتے تھے۔

آخری نتیجہ:۔

گزشتہ آیات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت ثابت ہوجاتی ہے کہ حق کی شناخت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اندھی تقلید ہے جو تعصب، ہٹ دھرمی اور خواہشاتِ نفسانی کی غیر مشروط پیروی سے جنم لیتی ہے۔اس اخلاقی برائی کے تباہ کن نتائج نے انسانی تاریخ کے سیاہ ترین ابواب رقم کیے ہیں۔ یہ اللہ کے رسولوں کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ تھی اور اسی کی وجہ سے انسانی تاریخ میں بہت سی خونریزی ہوئی ہے۔

اگر یہ برائی نہ ہوتی تو آج انسانی تاریخ کی شکل کچھ اور ہوتی۔انسانی تمدن تیزی سے ترقی کرتا اور تعمیری کوششیں انسان کو تیز رفتاری سے منزلِ سعادت سے ہمکنار کر دیتیں۔

تعصب اور ہٹ دھرمی احادیث کی روشنی میں

تعصب کے معنی، اس کے اسباب اور تباہ کن نتائج کے بارے میں بحث کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق اسلامی احادیث پر ایک نظر ڈالی جائے، اس لئے کہ ہم جن اُمور سے بحث کرنا چاہتے ہیں، اُن میں سے بہت سی باتیں ان احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔

اس ضمن میں احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔بطور نمونہ ہم چند احادیث یہاں درج کرتے ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ حَبَّةٌ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ عَصَبِيَّةٍ بَعَثَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ اَعْرَا بِ الْجَاهِلِيَّةِ"۔

"جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تعصب ہو، قیامت کے دن اللہ اسے دور جاہلیت کے عربوں کے ساتھ اٹھائے گا"۔(اصول کافی، 308:2)

2۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللهَ يُعَذِّبُ السِّتَّةَ بِالسِّتَّةِ، اَلْعَرَبَ بِالْعَصَبِيَّةِ، وَالدَّهَاقِيْنَ بِالْكِبْرِ، وَالْاُمَرَأَ ب الْجَوْرِ، وَالْفُقَهَأَ بِالْحَسَدِ، وَالتُّجَّارَ بِالْخِيَانَةِ، وَاَهْلَ الرَّسَاتِيْقِ بِالْجُهْلِ"۔ (کافی، 162:8)

"اللہ تعالیٰ چھ قسم کے لوگوں کو چھ برائیوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرے گا: عربوں کو تعصب کی وجہ سے، زمینداروں کو تکبر کی وجہ سے، حکمرانوں کو ناانصافی کی وجہ سے، فقہا کو حسد کی وجہ سے، تاجروں کو خیانت کی وجہ

سے اور دیہاتیوں کو جہالت کی وجہ سے"۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اس حدیث میں تعصب کا ذکر باقی گناہوں سے پہلے کیا گیا ہے، حالانکہ باقی سارے گناہ گناہانِ کبیرہ ہیں۔

3۔ ایک اور حدیث میں جنابِ رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ"۔ (سنن ابی داؤد: حدیث: 5121)

"جو شخص لوگوں کو تعصب کی دعوت دے، وہ ہم میں سے نہیں، جو تعصب کی وجہ سے جنگ کرے، وہ ہم میں سے نہیں اور جو تعصب کی حالت میں مر جائے، وہ ہم میں سے نہیں"۔

4۔ حضرت علی علیہ السلام کا ایک خطبہ جو خطبہ قاصعہ کے نام سے معروف ہے، اس میں تکبر اور تعصب کی نفی کی گئی ہے جو ابلیس کی گمراہی کا بنیادی سبب تھا۔ اس خطبہ میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِعْتَرَضَتْهُ الْحَمِيَّةُ فَافْتَخَرَ عَلٰى آدَمَ بِخَلْقِهٖ وَتَعَصَّبَ عَلَيْهِ لِاَصْلِهٖ فَعَدُوُّ اللّٰهِ اَمَامُ الْمُتَعَصِّبِيْنَ وَسَلَفُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ الَّذِيْ وَضَعَ اَسَاسَ الْعَصَبِيَّةِ"۔

"تکبر اور تعصب اس پر حاوی ہو گیا اور اس نے اپنی خلقت کے سبب آدم کے خلاف فخر کیا۔ اس نے اپنی اصل اور اساس کی وجہ سے آدم کے خلاف تعصب برتا جس کی وجہ سے اللہ کا دشمن متعصب لوگوں کا پیشوا ہے اور تکبر کرنے والوں کا پیشرو ہے جس نے تعصب کی بنیاد ڈالی"۔ (نہج البلاغہ، خطبہ: 192)

5۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَنْ تَعَصَّبَ اَوْ تُعُصِّبَ لَهٗ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِيْمَانِ مِنْ عُنُقِهٖ"۔

"جس نے تعصب سے کام لیا یا جس کے حق میں تعصب سے کام لیا گیا، اس نے اپنی گردن ایمان کے رشتے سے آزاد کر لی"۔ (اصول کافی، 2:308)

یہ بات واضح ہے کہ تعصب اور ہٹ دھرمی لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لئے ہم نے ان دونوں کو ایک عنوان میں جمع کر دیا ہے۔ ہٹ دھرمی (جسے عربی اور فارسی میں میں لجاجت کہتے ہیں) کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔

1۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اِيَّاكَ وَاللَّجَاجَةَ فَاِنَّ اَوَّلَهَا جَهْلٌ وَآخِرُهَا نَدَامَةٌ"۔(میزان الحکمہ:4)

''لجاجت (ہٹ دھرمی اور ضد) سے اجتناب کرو، اس کی ابتدا جہالت اور انتہا ندامت ہے''۔

2۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَللِّجَاجُ اَكْثَرُ الْاَشْيَاءِ مَضَرَّةً فِي الْعَاجِلِ وَالْآجِلِ"۔

''لجاجت دُنیا اور آخرت میں سب سے بڑھ کر نقصان دہ ہے''۔(میزان الحکمہ :4۔ مادہ لجاجت)

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ کا فرمان ہے:

"اَللِّجَاجُ بَذْرُ الشَّرِّ"۔

''لجاجت برائی کا بیج ہے''۔(میزان الحکمہ :4۔ مادہ لجاجت)

4۔ نہج البلاغہ میں ہے:

"اَللِّجَاجَةُ تَسُلُّ الرَّأْيَ"۔

''لجاجت انسان کی رائے کو سست کر دیتی ہے''۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار:179)

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَيْسَ لِلْجُوْجِ تَدْبِيْرٌ"۔

''لجاجت کرنے والے کے پاس کوئی تدبیر نہیں ہوتی''۔(غرر الحکم)

ان روایات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعصب اور لجاجت انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی پر کس قدر گہرے منفی اثرات مرتب کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی وجہ سے انسان ایمان اور اسلام کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے اور کفر و شرک کی راہوں پر چل کر شیطان کی اتباع کرتے ہوئے ایمان کی حدوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کے دلائل آپ آئندہ مباحث میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

تعصب کا مفہوم اور اس کے محرکات

تعصب کا مادہ (ROOT) عصب ہے۔ اس سے مراد انسان جسم میں موجودہ ریشے ہیں جو ہڈیوں کے جوڑوں اور عضلات کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر قسم کی مضبوط وابستگی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا جو عام طور پر منفی مفہوم رکھتا ہے۔ البتہ بعض اوقات مثبت معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ آئندہ مباحث میں آئے گی۔

ظاہرسی بات ہے کہ کسی شخص، عقیدے یا چیز کے ساتھ غیر منطقی وابستگی انسان کو ضد، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور ایسی ہی وابستگی بہت سی جنگوں، خونریزی اور اختلافات کا سبب بنتی ہے۔

اگر چہ تعصّبات انسانی معاشرے سے ختم ہوجائیں اور لوگ عقل ومنطق کی روشنی میں غور وفکر کے عادی بن جائیں تو بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہوجائیں اور انسانی معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔

ایسے تعصّبات جن کا نتیجہ ضد، لجاجت اور ہٹ دھرمی کی صورت میں رونما ہوتا ہے، مندرجہ ذیل اسباب سے وجود میں آتے ہیں:

1۔آباؤاجداد سے غیر معمولی محبت:۔

کسی بھی چیز کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے بارے میں عقلی اور منطقی رویے سے دُور ہو جاتا ہے۔آباؤاجداد اور اُن کے دین سے غیر معمولی محبت اور وابستگی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔

یہ شدید اور غیر معمولی وابستگی اس چیز کا سبب بنتی ہے کہ آنے والی نسلیں اپنے آباؤاجداد کے بیہودہ اور جاہلانہ طریقوں کو مقدس رسوم کی حیثیت سے نہ صرف اپنالیتی ہیں بلکہ ان کی حفاظت کیلئے اس حدتک آگے چلی جاتی ہیں کہ جہاں ان کے اور حق کے درمیان ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے۔وہاں وہ حق کو ترک کردیتی ہیں۔

اس تعصب کا نتیجہ بعض اوقات اس شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی قوم اپنی بدترین رسوم کو اس حدتک کامل واکمل سمجھنے لگتی ہے کہ اس کے مقابلے میں دُوسری اقوام کی اچھی رسوم اور اچھے آداب کو بھی برا اور ہیچ جاننے لگتی ہے۔

2۔کوتاہ نظری:۔

جس قدر کسی قوم کی فکر پست اور ان کی تہذیب وثقافت کمزور ہوگی، اُن کے اندر جاہلانہ تعصّبات اور اندھی تقلید زیادہ ہوگی۔ اس کے برعکس جس قدر کسی قوم کی فکری سطح بلند ہوگی اور اُس کی ثقافت اعلیٰ اقدار پر اُستوار ہوگی، اُس کی سوچ اُسی قدر عقل ومنطق کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعصب اور ہٹ دھرمی کا خاتمہ ہوگا اور اندھی تقلید کی جگہ تحقیق لے لے گی۔

3۔شخصیت پرستی:۔

بعض اوقات کوئی شخص کسی انسان کی نظر میں اتنا مقدس ہوجاتا ہے کہ وہ اُس کے ہر قول وفعل کو تنقید سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے، خواہ اُس کے افکار ونظریات علمی اور فکری لحاظ سے انتہائی پست ہی کیوں نہ ہوں۔اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ اُس شخص کا تقدس، اُسے مقدس ماننے والوں کی آنکھوں اور دل ودماغ پر ایک دبیز پردہ ڈال دیتا ہے جو اُن کے اور حق کے درمیان رُکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہ لوگ اندھادھند اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور اُس کے افکار ونظریات کا جائزہ لئے بغیر اُس کیلئے جان ومال کی قربانی دینے سے بھی

گریز نہیں کرتے۔

4۔فکری اور معاشرتی گوشہ نشینی:۔

جب کوئی شخص اپنی ذاتی اور معاشرتی سوچ کے خول میں بند ہو جائے اور دیگر افراد اور معاشروں کے افکار سے بیگانہ اور نا آشنا ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ اپنی ذاتی او معاشرتی سوچ کے ساتھ شدید وابستگی قائم کر لیتا ہے اور اس سوچ سے ہٹ کر ہر فکر ونظریہ کے خلاف تعصب برتنے لگتا ہے۔اگر یہ شخص دوسروں کے ساتھ تعلق اور میل جول رکھتا ہو اور ان کے اور اپنے افکار کا موازنہ کرتا ہو تو دونوں سوچوں کے مثبت اور منفی نکات اُس پر واضح ہو جائیں اور منفی افکار کو ترک کر کے اچھے افکار کو اپنانے کی جرأت اُس کے اندر پیدا ہو جائے۔

تعصب اور لجاجت کے منفی اثرات

تعصب اور لجاجت کے منفی اثرات بہت شدید ہوتے ہیں جو متعصب اور لجاجت باز (لجاجت یعنی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لینے والے شخص کو لجاجت باز، لج باز اور لجوج کہتے ہیں) افراد کی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔

1۔ تعصب یعنی کسی شخص، چیز، عقیدے، عادت یا رسم ورواج کے ساتھ غیر منطقی وابستگی درحقیقت انسان کی عقل پر ایک ضخیم پردہ ڈال دیتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان خیر وشر، صلاح وفساد اور اپنے کاموں کے انجام وغیرہ کے بارے میں غور وفکر اور صحیح راستے کے انتخاب کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ احادیث میں سے ایک حدیث میں بیان ہوا کہ متعصب انسان صلاحیت تدبیر سے محروم ہوتا ہے۔ شیطان کے حالات میں بھی یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ تعصب کی وجہ سے وہ واضح ترین حقائق کا ادراک کرنے سے محروم رہا۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور ہمیشہ کیلئے اللہ کی بارگاہ سے دُھتکار دیا گیا۔

2۔ تعصب اور لجاجت ایک ایسی آگ ہے جو معاشرتی تعلقات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔اس سے معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان اتحاد ویگانگت ختم ہو جاتی ہے اور نفاق واختلاف کو تقویت ملتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں پائے جانے والے وسائل اور توانائیاں تعمیری مقاصد کیلئے صرف ہونے کی بجائے تخریبی مقاصد کیلئے استعمال ہونے لگتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تعصب کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَللِّجَاجُ يُنْتِجُ الْحُرُوْبَ وَيُوْغِرُ الْقُلُوْبَ"۔

''لجاجت جنگوں کی آگ کو بھڑکاتی ہے اور دِلوں کو کینہ سے بھر دیتی ہے''۔(غرر الحکم)

3۔ تعصب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوست ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں اور محبت عداوت میں تبدیل ہو

جاتی ہے۔

4۔ تعصب اور لجاجت کفر کے بنیادی اسباب میں سے ہیں۔گزشتہ اُمتوں کے کفر کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقوں کے ساتھ متعصّبانہ وابستگی رکھتی تھیں جو دینِ حق کو اختیار کرنے کی راہ میں بڑی رُکاوٹ تھی۔

5۔ تعصب اور لجاجت درد ورنج اور زحمت وتکلیف کا سبب ہیں،اس لئے کہ ان کی وجہ سے انسان عرصہ دراز تک گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے اور آخر کار ایک بند گلی میں پہنچ جاتا ہے اور اُسے واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے جو نہایت تکلیف دہ اور پر رنج وزحمت ہوتا ہے۔اسی نکتے کے پیشِ نظر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ثَمَرَةُ اللِّجَاجِ الْعَطَبُ"۔

''لجاجت کا پھل شکست اور ہلاکت ہے''(غرر الحکم)

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ندامت اور پشیمانی بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

''تعصب ولجاجت کا آغاز جہالت اور انجام ندامت ہے''۔

6۔ تعصب اور لجاجت کی وجہ سے بعض اوقات انسان کے معاملات کی باگ ڈور انسان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور وہ ایسی صورتِ حال میں پھنس جاتا ہے جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"لَا مَرْكَبَ أَجْمَحَ مِنَ اللِّجَاجِ"۔

''لجاجت سے زیادہ کوئی سواری سرکش نہیں''۔(غرر الحکم)

7۔ تعصب اور لجاجت انسان کی دُنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں یہ دُشمنی ،تفرقہ اور بہت سے دُوسرے غلط اقدامات کا باعث بنتے ہیں جن سے انسان کی زندگی کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔یہی چیزیں آخرت میں اللہ کی رحمت سے دُوری کا سبب بن جاتی ہیں۔یہ وہی بات ہے جو ہم امیر المومنین علیہ السلام کی اس حدیث میں پڑھ چکے ہیں:

"اَللِّجَاجُ اَكْثَرُ الْاَشْيَاءِ مَضَرَّةً فِي الْعَاجِلِ وَالْآجِلِ"۔

''دنیا اور آخرت میں سب سے مضر چیز لجاجت ہے''۔

ہم اس نکتے کی طرف ایک بار پھر متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر چہ تعصب،لجاجت اور اندھی تقلید معنی ومفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں لیکن چونکہ ان کے درمیان بہت گہرا تعلق پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ آپس میں لازم وملزوم ہیں،لہٰذا ہم نے ان تینوں کو ایک موضوع کے ذیل میں زیر بحث قرار دیا۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ تعصب:۔

تعصب، حمیت اور تقلید تین چیزیں ہیں جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دو اقسام ہیں: پسندیدہ اور ناپسندیدہ۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر تعصب صرف منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اگر انسان کی وابستگی غلط چیزوں یا باطل نظریات سے ہو تو اس سے پیدا ہونے والا تعصب بھی مذموم اور ناپسندیدہ ہوگا۔ یہ وہی چیز ہے جسے قرآن میں ''تعصب جاہلیت'' کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی وابستگی صحیح چیزوں اور برحق نظریات کے ساتھ ہو تو اُس سے پیدا ہونے والا تعصب بھی پسندیدہ اور ممدوح ہوگا۔

خطبہ قاصعہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے دونوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"فَاَطْفِئُوْا مَا كَمَنَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ مِنْ نِيْرَانِ الْعَصَبِيَّةِ، وَاَحْقَادِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَاِنَّمَا تِلْكَ الْحَمِيَّةُ تَكُوْنُ فِي الْمُسْلِمِ مِنْ خَطَرَاتِ الشَّيْطَانِ وَنَخَوَاتِهِ وَنَزَعَاتِهِ وَنَفَثَاتِهِ"۔

''جاہلیت کے تعصب اور کینے چنگاریاں ہیں جو تمہارے دِلوں میں پنہاں ہیں، انہیں خاموش کر دو، اس لئے کہ مسلمانوں میں ایسے ناروا تکبر اور تعصّبات شیطان کی خود پسندی، اُس کی فساد انگیزی اور ولولہ اندازی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں''۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 192۔ بند 22 تا 23)

اسی خطبہ میں ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ فَلْيَكُنْ تَعَصُّبُكُمْ لِمَكَارِمِ الْخِصَالِ، وَمَحَامِدِ الْاَفْعَالِ، وَمَحَاسِنِ الْاُمُوْرِ الَّتِيْ تَفَاضَلَتْ فِيْهَا الْمُهَدَاُ وَالنُّجَدَاءُ مِنْ بُيُوْتَاتِ الْعَرَبِ..... فَتَعَصَّبُوْا لِخِلَالِ الْحَمْدِ، مِنَ الْحِفْظِ لِلْجِوَارِ، وَالْوَفَاءِ بِالذِّمَامِ، وَالطَّاعَةِ لِلْبِرِّ، وَالْمَعْصِيَةِ لِلْكِبْرِ، وَالْاَخْذِ بِالْفَضْلِ، وَالْكَفِّ عَنِ الْبَغْيِ"۔

''اگر تمہیں تعصب سے کام لینا ہی ہے تو پسندیدہ اخلاقی صفات، نیک اعمال، عربوں کے ممتاز گھرانوں کی شخصیات کے اعمال واطوار کے بارے میں تعصب سے کام لو..... تمہارا تعصب ہمسایوں کے حقوق کی حفاظت، ایفائے عہد، نیکی کی اطاعت، تکبر کے خلاف بغاوت، بخشش وسخاوت اور ظلم وستم سے اجتناب کے بارے میں ہونا چاہئے''۔ (نہج البلاغہ: خطبہ 192، بند 76 تا 79)

اس طرح امیر المومنین علیہ السلام تعصب کی دونوں شاخوں کے بارے میں نصیحت فرماتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ عصبیت کیسی چیز ہے؟ آپؑ نے اس کے دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر

رکھتے ہوئے فرمایا:

"اَلْعَصَبِیَّۃُ الَّتِیْ یَأْثُمِ عَلَیْھَا صَاحِبُھَا اَنْ یَرَی الرَّجُلُ شَرَارَ قَوْمِہٖ خَیْرًا مِنْ خِیَارِ قُوْمٍ آخِرِیْن! وَلَیْسَ مِنَ الْعَصَبِیَّۃِ اَنْ یُحِبَّ الرَّجُلُ قُوْمَہٗ وَلٰکِنْ مِنَ الْعَصَبِیَّۃِ اَنْ یُعِیْنَ قُوْمَہٗ عَلَی الظُّلْمِ"۔

''وہ تعصب جس کی وجہ سے انسان گناہگار ہوتا ہے، یہ ہے کہ انسان اپنی قوم کے برے لوگوں کو دوسری قوم کے اچھے لوگوں سے بہتر سمجھے۔ اپنی قوم کے کسی فرد سے محبت کرنا تعصب نہیں ہے بلکہ تعصب یہ ہے کہ انسان ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔''(اصول کافی، 308:2)

اس حدیث کی روشنی میں اپنی قوم سے محبت کرنا اور نیکی کے معاملات میں ان کی مدد کرنا مزموم نہیں ہے، اس لئے کہ یہ محبت اور وابستگی اُسے کسی برے کام پر نہیں اُکسا رہی بلکہ محبت سے سرشار مثبت تعلقات کی مضبوطی پر متحرک کر رہی ہے۔ ناپسندیدہ اور مذموم تعصب یہ ہے کہ انسان قومی وابستگی کی وجہ سے حق اور عدالت کے اُصولوں کو پامال کر دے اور اپنی قوم کے برے افراد کو دوسری اقوام کے اچھے افراد سے بہتر سمجھے۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّۃَ حَمِیَّۃٌ غَیْرُ حَمِیَّۃِ حَمْزَۃَ ابْنِ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ، وَذٰلِکَ حِیْنَ اَسْلَمَ غَضَبًا لِلنَّبِیِّ فِیْ حَدِیْثِ الَّلسَلا الَّذِیْ اُلْقِیَ عَلَی النَّبِیِّ"۔

''کوئی تعصب جنت میں داخل نہیں ہوا، سوائے ایک تعصب کے اور وہ حضرتِ حمزہؓ بن حضرت عبدالمطلب کا تعصب ہے کہ جب رسولؐ اللہ پر گندگی ڈالی گئی تو وہ غضب ناک ہو گئے (اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے ہوئے مسلمان ہو گئے)''(اصول کافی، 308:2)

ظاہر سی بات ہے کہ ناپاک اور نامعقول مشرکوں کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کا تعصب جو حضرتِ حمزہؓ نے برتا، وہ حق اور عدل کی حمایت کیلئے تھا، لہٰذا اُن کا یہ تعصب قابلِ تعریف ٹھہرا۔ اگر اُن کا تعصب حق اور عدل کے خلاف ہوتا ہے تو یقیناً ناپسندیدہ اور مذموم ہوتا۔

مثبت تقلید اور اندھی تقلید:۔

تعصب کی طرف تقلید کی بھی دو شاخیں یا اقسام ہیں: مثبت تقلید اور منفی تقلید۔ اگر زیادہ باریک نظر سے مشاہدہ کیا جائے، تو تقلید کی چار اقسام قابلِ تصور ہیں جن میں سے تین منفی اور ایک مثبت ہے:

1۔جاہل کا جاہل کی تقلید کرنا:۔

یہ ایسی تقلید ہے جس میں کچھ جاہل اور نادان افراد بعض دیگر جاہل یا نادانوں کی تقلید کرتے ہیں۔قرآن شریف میں ایسی تقلید کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اسے بعض اوقات تعصب اور لجاجات کا سبب اور بعض اوقات ان کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔اس تقلید کی وجہ سے ایک نسل کی جہالت اگلی نسل میں منتقل ہوجاتی ہے اور وہ اس کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے انبیأ کی دعوت کے سامنے محاذ آرائی کرتے تھے۔

2۔عالم کا جاہل کی تقلید کرنا:۔

یہ تقلید کی بدترین قسم ہے۔اس میں یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات تعصب میں گرفتار شخص اپنے علم سے دستبردار ہوکر اندھادھند جاہلوں کی تقلید کرنے لگتا ہے۔علمأ اور مفکرین کی عوام زدگی درحقیقت اسی زمرے میں آتی ہے۔

3۔عالم کا کسی اور عالم کی تقلید کرنا:۔

اس تقلید میں بعض اوقات ایک عالم اور محقق شخص کسی خاص مسئلہ کی زحمت سے بچنے کیلئے آنکھیں بند کرکے کسی اور عالم کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ یہ بھی مذموم اور ناپسندیدہ تقلید کے زمرے میں آتی ہے۔اگرچہ پہلی دو اقسام سے پھر بھی بہتر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کے علمأ اور دانش مندوں پر لازم ہے کہ وہ تحقیق کی راہ اختیار کریں اور علمی سرمایہ رکھنے کے باوجود اندھی تقلید نہ کریں۔یہی وجہ ہے کہ فقہ میں یہ بات مسلم ہے کہ مجتہد پر تقلید کرنا حرام ہے اور جب کوئی مجتہد کسی کو سندِ اجتہاد دیتا ہے تو اس میں لکھتا ہے:''یحرم علیہ التقلید''۔یعنی اس پر تقلید حرام ہے۔

ہاں!اپنے شعبۂ مہارت کے علاوہ کسی اور شعبے میں اس شعبے کے مخصوص معاملات میں تقلید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔مثلاً آنکھوں کا ماہر ڈاکٹر دِل کی بیماری کے معاملات میں امراضِ قلب کے ماہر کی رائے کے مطابق عمل کرے گا یا یہ کہ کوئی ماہر اپنے ہی شعبے میں اپنے استاد یا اپنے سے زیادہ ماہر کی طرف رجوع کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے،اس لئے کہ یہ عمل تقلید کی مذموم اقسام میں شمار نہیں ہوتا بلکہ تقلید کی چوتھی قسم کے زمرے میں آتا ہے۔

4۔جاہل کا عالم کی تقلید کرنا:۔

اس تقلید میں غیر عالم شخص عالم کے علم کی روشنی میں عمل کرتا ہے یعنی انسان جس چیز کا علم نہیں رکھتا،اُس کے بارے میں اس چیز کے عالم سے رہنمائی حاصل کرتا ہے(جس طرح کسی بیماری میں مبتلا شخص اس بیماری کے ماہر طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے)۔

تشریح:۔

علوم وفنون کی حدیں اس قدر وسیع ہیں کہ کسی ایک انسان کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ تمام علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کر سکے۔ایسی صورت میں یہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ جو شخص جس علم میں آگاہی نہیں رکھتا، اُس میں اُس علم کے ماہر کی طرف رجوع کرے۔یہ ایک ایسا عقلی اُصول ہے جس پر دُنیا بھر کے عقلا متفق ہیں۔اگر اس اُصول کو ترک کر دیا جائے تو معاشرے کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جائے۔

معنوی واخلاقی امور اور دینی علوم میں بھی یہی صورت حال ہے۔ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ہر انسان تمام اسلامی علوم میں ماہر اور متخصص ہو جائے۔ان میں سے بعض علوم اس قدر وسیع ہیں کہ پچاس سال غور وفکر اور تحقیق کے بعد بھی مزید تحقیق ومطالعہ کی ضرورت رہتی ہے جیسا کہ علم فقہ۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسے علوم میں غیر عالم افراد، صاحبانِ علم کی طرف رجوع کریں گے۔البتہ اصولِ دین، جو دین کی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی علمی وفکری سطح کے مطابق دلیل کے ساتھ ان کے بارے میں علم رکھے کیونکہ ان میں تقلید جائز نہیں ہے۔

تقلید کی یہ قسم ناپسندیدہ اور مذموم نہیں ہے۔اس کا:

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴿۲۳﴾ (زخرف:23)

سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (نحل:43)

کا مصداق ہے۔

وہ مذموم تعصب جو لجاجت اور اندھی تقلید کو جنم دیتا ہے، اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

راہِ علاج:۔

تمام رذائل اخلاقی کے علاج کی طرح اس صفتِ رذیلہ کے علاج کا پہلا قدم بھی یہ ہے کہ اس کے اسباب اور محرکات کا خاتمہ کیا جائے۔چونکہ کسی چیز سے حد سے زیادہ محبت کرنا، معاشرے کی ثقافتی اور فکری سطح کا پست اور معاشرتی وفکری تنہائی تعصب کے بنیادی اسباب ہیں، لہٰذا اس صفتِ رذیلہ کا خاتمہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ افراد کی فکری سطح کو بلند کیا جائے، مختلف اقوام کے درمیان فکری اور ثقافتی تعلقات بڑھائے جائیں، محبتوں اور قوم پرستی کے میلانات کو اعتدال پر لایا جائے تاکہ تعصب، لجاجت اور اندھی تقلید کا خاتمہ کیا جا سکے۔

اسی طرح تعصب کے خطرناک نتائج کے بارے میں غوروفکر کرنے سے بھی اس صفتِ رذیلہ کا خاتمہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔اگر انسان اس حقیقت پر توجہ کرے کہ تعصب اس کے دل ودماغ پر ایسے پردے ڈال دیتا ہے۔جن کی وجہ سے انسان حقائق کا درست ادراک کرنے سے محروم رہ جاتا ہے، اس کی وجہ سے انسانی وحدت پارہ پارہ ہوجاتی ہے، اختلاف ونفاق میں شدت پیدا ہوجاتی ہے،فرداورمعاشرے کیلئے تکلیف دہ مسائل پیدا ہوجاتے ہیں اوربعض اوقات فرد یا معاشرہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں جن کا انہوں نے تصور تک نہیں کیا ہوتا۔ان تمام اُمور پرغوروفکر کرنے کے نتیجہ میں انسان اس برائی سے اجتناب پرآمادہ ہوجاتا ہےاورفرداورمعاشرہ خوش بختی اورسعادت کی راہ پرگامزن ہوجاتے ہیں۔

اخلاقی رذائل کا ایک علاج یہ ہے کہ ان کی سمت کوتبدیل کردیا جائے، بالفاظِ دیگران کومنفی صورت سے مثبت صورت میں تبدیل کردیا جائے ،مثلاً اگرکسی شخص کے اندرمنفی اورناپسندیدہ چیزوں کے بارے میں تعصب پایا جاتا ہےتواس کے اندرسے تعصب کا خاتمہ کرنے کی بجائے اس کے تعصب کومثبت اورتعمیری اقدار کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

یہ وہی بات ہے جوامیرالمومنین علیہ السلام نے خطبہ قاصعہ میں اسی طرح بیان فرمائی ہے:

''اگرتمہیں تعصب سے کام لیناہی ہےتوکوشش کروکہ تمہارا تعصب اچھے اخلاق، پسندیدہ افعال اوربہترین امور کے بارے میں ہو''۔(نہج البلاغہ: خطبہ 192)

حق کے سامنے سرتسلیم خم کرنا:۔

تعصب، لجاجت اوراندھی تقلید کی ضد''حق کے سامنے سرتسلیم کرنا'' ہےاور یہ ایک بہت بڑی اخلاقی فضیلت ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق کو جہاں کہیں بھی دیکھے،خواہ کسی ایسے شخص کے پاس جس سے اُس کا دور کا بھی تعلق نہ ہواوروہ شخص کتنا ہی حقیر اور پست کیوں نہ ہو،اُس حق کے سامنے اپنا سر جھکا لے۔

یہ اخلاقی فضیلت انسان کے علم ودانش میں ترقی ،گمراہی سے اجتناب اورصراطِ مستقیم پرقدم رکھنے میں بہت مثبت کردارادا کرتی ہے۔لیکن یہ اخلاقی فضیلت صرف صالح مؤمنین کونصیب ہوتی ہے جومحبت میں زیادہ روی اور ہرقسم کی متعصّبانہ وابستگی اورقومی وگروہی تعصّبات سے دُوررہتے ہیں۔

حق کے سامنے سرتسلیم خم کرلینا ایمان،فکری سلامتی ،ثقافت کی سطح کے بلند ہونے اورتہذیبِ نفس کی دلیل ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کومخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا○''

''تیرے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک اپنے اختلافات میں تجھے حاکم نہ بنالیں او

رپھر جو فیصلہ تو کردے، اس پر اپنے دل میں بھی تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے فیصلے کو دل وجان سے تسلیم کرلیں''۔(نسأ:65)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ

''کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کردیں تو پھر انہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار حاصل ہو''۔(احزاب:36)

یہاں اس نکتہ کا ذکر ضروری ہے کہ حق کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ انسان جہاں بھی حق کو دیکھے، بغیر کسی رُکاوٹ اور تعصب کے اس کے سامنے سر جھکا لے۔ دُوسرے یہ کہ انسان قضاوقدرِ الٰہی کے سامنے سرِتسلیم خم کردے، راضی بہ قضا رہے۔

یہاں پر ہماری گفتگو پہلے معنی کے بارے میں ہے۔ دوسرے معنی کے حوالے سے ہم ''تسلیم ورضا'' کے ذیل میں بحث کریں گے۔

نواں باب

بُزدلی اور شجاعت

تمہید:۔

بزدلی اور بے جا خوف اُن رذائلِ اخلاقی میں سے ہے جو انسانوں کی ذِلت اور پسماندگی کا سبب ہوتی ہیں۔ یہ انسان کی صلاحیت اور استعداد کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان کے دُشمن کو اس پر غالب آنے کا راستہ فراہم کرتی ہے۔

اس صفتِ رذیلہ کی ضد شجاعت ہے جو کامیابی کی سب سے اہم چابی اور انسانی عظمت و سربلندی کا زینہ ہے۔ شجاعت صرف میدان جنگ میں ہی نہیں بلکہ سیاسی، معاشرتی اور علمی میدان میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اخلاق نے بزدلی اور شجاعت کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور ان کے اسباب، آثار اور نتائج کا باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔

علمِ اخلاق کی سابقہ کتب میں شجاعت چار بنیادی فضائلِ اخلاقی میں سے ایک فضیلت قرار دی گئی ہے جبکہ بزدلی کو چار بنیادی رذائل میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔

انبیاؑ اور ان کے سچے پیروکاروں کی تاریخ شجاعت کے مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ بے شک وہ تمام انسانوں کیلئے جرأت اور بہادری کا قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

اب ہم اس اخلاقی فضیلت کے جلووں کا مشاہدہ کرنے کیلئے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں بزدلی کے منحوس اثرات کا بھی جائزہ لیں گے۔

1۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

"وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ○ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ○ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ○ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ○ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ○ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ○ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ○"

''ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے رُشد عطا کر دیا تھا اور ہم اس سے آگاہ تھے۔ جب اُس نے اپنے باپ (آزر)

اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ بے رُوح مورتیاں کیا ہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو ان کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا: تم اور تمہارے آباؤاجداد کھلی گمراہی میں ہو۔ انہوں نے کہا: کیا تم حق بات کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے؟ ابراہیمؑ نے کہا: تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، جس نے انہیں پیدا کیا اور میں اس بات پر گواہوں میں سے ہوں۔ اللہ کی قسم! تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد میں تمہارے بتوں کو تباہ کر دوں گا۔ پس اس نے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، سوائے اُن کے بڑے بت کے، تاکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے پاس آئیں (اور وہ انہیں حقائق سے آگاہ کرے)''۔ (انبیأ:51 تا58)

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے:

''یٰمُوْسٰی لَا تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ○''

''اے موسیٰؑ! نہ ڈرو کیونکہ میرے ہاں رسول خوفزدہ نہیں ہوتے''۔ (نمل:10)

3۔ قوم طالوت اور اُس کے بہادر سپاہیوں کے بارے میں ہے:

''فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ○وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ○''

''جب وہ اور وہ لوگ جو ایمان لائے تھے، نہر کو پار کر چکے تو وہ کہنے لگے: آج ہم میں جالوت اور اُس کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن ان میں جو یہ جانتے تھے کہ انہیں اللہ سے ملاقات کرنا ہے۔ اُنہوں نے کہا: کئی بار ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی فوج اللہ کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آجاتی ہے اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جب وہ جالوت اور اُس کی فوج کے سامنے آئے تو کہنے لگے: اے ہمارے رب! تو ہم پر صبر نازل فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔ (بقرہ : 249 اور 250)

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُنؐ پر ایمان لانے والے بہادر مومنین اور ایمان کو جھوٹا دعویٰ کرنے والے بزدلوں

کے بارے میں ہے:

"وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ○ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○" (احزاب:13اور22)

''اور یاد کرو جب ان (منافقوں) میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہلِ یثرب (اہل مدینہ) اب تمہارے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے، لہٰذا واپس چلے جاؤ اور ان میں سے کچھ لوگ نبی سے اجازت مانگتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، حالانکہ وہ صرف جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے۔ لیکن جب اہلِ ایمان نے احزاب کے لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے: یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اُس کے رسول نے سچ کہا اور اس سے صرف ان کے ایمان میں اضافہ ہوا۔''

5۔ ایک اور مقام پر اسی بارے میں آیا ہے:

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ○"

''ان سے کہو: کیا تم ہمارے بارے میں دو بہتر انجاموں کے علاوہ کسی اور کی توقع رکھتے ہو؟ (یا ہم تمہارے خلاف کامیاب ہو جائیں گے یا جامِ شہادت نوش کریں گے) لیکن ہمیں تو یہ توقع ہے کہ اللہ ہم پر اپنی طرف سے عذاب بھیجے یا ہمارے ہاتھوں تمہیں سزا دے۔ لہٰذا اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں''۔ (توبہ:52)

6۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب کے بارے میں ہے:

"اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○"

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے انہیں کہا کہ دُشمن کی فوجیں تم پر حملہ کرنے کیلئے جمع ہوگئی ہیں، لہٰذا ان سے ڈرو تو ان باتوں سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا اور انہوں نے کہا: اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور بہترین کارساز

ہے۔یہ تو شیطان ہے(جوایسی باتوں سے)اپنے پیروکاروں کوڈراتا ہے،ان سے نہ ڈرواوراگرایمان رکھتے ہو توصرف مجھ سے ڈرو''۔(آل عمران 173 تا175)

7۔ "اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا○"

''(گزشتہ انبیاؑ)ایسے تھے جواللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے تھےاورصرف اُسی سے ڈرتے تھے اوراللہ کے سواکسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ یہ بات کافی ہے کہ اللہ (اعمال کا)حساب کرنے والا (اور جزادینے والا)ہے۔''(احزاب۔39)

تفسیر

انبیائے الٰہی بزدل نہیں ہوتے:۔

پہلی آیات میں توحید کے عظیم الشان پیروحضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی بت پرست اورمتعصب قوم کے سامنے جرأت وبہادری کو بیان کیا گیا ہے۔ان آیات میں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم پیغمبرؑ یکہ وتنہا اپنی بت پرست قوم کے مقابلہ پرڈٹے ہوئے تھے۔اگرچہ حکومتِ وقت بھی بت پرست قوم کی حمایت کررہی تھی مگرحضرت ابراہیمؑ کی جرأت اورہمت میں کوئی سستی پیدانہ ہوئی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''ہم نے پہلے ہی سے ابراہیمؑ کورُشدعطا کردیا تھااورہم (اس کی قابلیت سے) آگاہ تھے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝ (انبیاء)

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کونہایت عمدہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔حضرت ابراہیمؑ اُن صلاحیتوں کوبہترین انداز سے بروئے کارلائے اورانسانوں کی بدبختی کی اصل وجہ یعنی شرک اوربت پرستی کے خلاف میدان میں اُترآئے۔انہوں نے اس جنگ کا آغازاپنے چچاآزرسے کیااورکہا:

''یہ بے جان مورتیاں کیا ہیں جن کی تم پوجا کرتے ہو؟''

جب آزرنے جواب دیا کہ یہی ہمارے آباؤاجداد کا طریقہ ہےتوحضرت ابراہیمؑ نے نہایت جرأت اوربیباکی سے جواب دیا کہ تم بھی کھلی گمراہی میں ہواورتمہارے آباؤاجداد بھی کھلی گمراہی میں تھے۔

آزرکویقین نہیں آرہا تھا کہ ابراہیمؑ واقعی بت پرستی کے خلاف جنگ کررہے ہیں یامذاق میں یہ باتیں کررہے ہیں۔لہٰذااس

نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا: تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ ابراہیمؑ جواب دیتے ہیں کہ ہرگز نہیں۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ انہوں نے مزید کہا: اللہ کی قسم! میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بتوں کو پاش پاش کر دوں گا۔

"وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ○"(انبیأ: 57)

آخر کار حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بات پر عمل کرتے ہوئے ایک مناسب موقع پا کر اُن کے سب بتوں کو پاش پاش کر دیا مگر اُن کے بڑے بت کو چھوڑ دیا تا کہ جب وہ اپنے بتوں کے پاس آئیں تو اس صورتِ حال کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

"فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ○"(انبیأ: 58)

ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انبیأ کے فضائل میں شجاعت انتہائی نمایاں تھی۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ کی راہ میں کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ بزدلی، جو ایک اخلاقی رذیلت ہے، انبیأ اس سے مکمل طور پر پاک ہوتے تھے۔ وہ یکہ و تنہا ہجوم دُشمنان کے سامنے ڈٹ جاتے تھے اور کامیاب ہو جاتے تھے۔ اگر بزدلی ان کے اوپر اپنا سایہ ڈال سکتی تو نہ وہ اپنے فرائض کو انجام دے سکتے اور نہ ہی دُشمنوں پر غالب آ سکتے۔

دُوسری آیت میں حضرت موسیٰؑ سے خطاب ہے۔ پہلی وحی میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنا عصأ زمین پر پھینک دو اور عصأ ایک بہت بڑا سانپ بن گیا جسے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام خوفزدہ ہو گئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''اے موسیٰؑ! خوفزدہ نہ ہو کیونکہ رسول میرے پاس خوفزدہ نہیں ہوتے''۔

"يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ○"(نمل: 10)

اگر اس حقیقت کو مدِ نظر رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات ہر جگہ موجود ہے تو اہلِ ایمان کو کسی حال میں اور کسی مقام پر خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ انہیں ہر حال میں اُس پاک ذات پر توکل کرنا چاہئے اور جرأت اور بہادری کے ساتھ مقدس الٰہی مقاصد کے حصول کیلئے مسلسل آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔

سورۂ قصص کی آیت 31 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ○"(قصص: 31)

''اے موسیٰؑ! آگے بڑھو اور خوفزدہ نہ ہو، تم امان میں ہو''۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اطمینان بخش خطاب کے آجانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن اور پرسکون ہو گئے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا کہ نہ صرف یہ کہ اس بہت بڑے سانپ سے ڈریں نہیں بلکہ اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیں تا کہ وہ دوبارہ عصأ بن جائے۔

"قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ○" (طٰہٰ: 21)

''اللہ نے کہا: اسے پکڑ لو اور مت ڈرو۔ ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے''۔

یقیناً یہ کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے بہت مشکل تھا مگر اُنہوں نے اسے انجام دیا اور کامیاب ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ تجربہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے ضروری تھا تا کہ وہ فرعون اور اُس جیسے اژدہوں کا دلیری سے مقابلہ کر سکیں۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ قرآن مجید میں یہ جملہ ''لَا تَخَفْ''، ''مت ڈرو'' نو بار آیا ہے جن میں سے پانچ بار اس خطاب کا رُخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے بڑے دُشمن کا سامنا تھا۔

آیات کے تیسرے گروہ میں طالوت کا ذکر ہے جسے اس دور کے نبی حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کی فوج کا سالار مقرر فرمایا تھا تا کہ وہ جالوت جیسے ظالم کا مقابلہ کر سکیں۔

طالوت نے جالوت کے لشکر کا سامنا کرنے سے پہلے اپنے لشکر کو آزمایا تا کہ جواں مرد اور ناجواں مرد میں امتیاز ہو سکے اور وہ کم ہمت اور بزدل جو دوسروں کی ہمت کمزور کرنے کا سبب بن سکتے ہوں، اُن کی پہچان ہو جائے۔ طالوت نے اپنے سپاہیوں کو، جو یقیناً پیاسے تھے، نہر کے پانی سے آزمایا اور کہا کہ جو کوئی اس پانی سے پیئے گا، وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو لوگ اپنی پیاس کا مقابلہ کرتے ہوئے صرف ایک گھونٹ پئیں، وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ سپاہیوں کی اکثریت نے، جو کم ہمت اور سُست عزم و ارادہ کے مالک تھے، اس آزمائش میں ناکام ہو گئے۔ ایک چھوٹی سی اقلیت اس آزمائش میں سرفراز ہوئی۔ اسی اقلیت کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ جب طالوت اور جالوت کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: کئی بار ایسا ہوا کہ چھوٹی فوج اللہ کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گئی اور پھر اُنہوں نے دُعا مانگی: (بقرہ: 250)

"رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○"

اللہ تعالیٰ نے اس شجاع اور باہمت گروہ کی برکت سے انہیں جالوت کے کیل کانٹے سے لیس لشکرِ جرار پر فتح عطا فرمائی۔

آیات کے اگلے مجموعے میں حضورؐ کے دور میں جنگِ احزاب کے موقع پر منافقوں اور ضعیف الایمان مسلمانوں کی بزدلی اور حقیقی مومنین کی جرأت اور شجاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے یہ کہا جا رہا ہے: ''یاد کرو جب ان (منافقوں) میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہلِ مدینہ! یہ جگہ یعنی میدانِ جنگ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کو چلے جاؤ اور ان میں سے بعض رسولؐ اللہ سے رُخصت مانگ رہے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ ان کے گھر غیر محفوظ نہیں تھے (بلکہ خوف کی وجہ سے وہ میدان سے جانے کا بہانہ بنا رہے تھے) اور فرار کرنا چاہ رہے تھے۔

"وَإِذْ قَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ

النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ○ (احزاب:13)

دشمن کے لشکر کی کثرت اور ساز وسامان کی فراوانی اس قدر خوفناک تھی کہ بزدل اور ڈرپوک افراد میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔

لیکن اسی سورۃ کی آیت 22 میں ہے کہ جو حقیقی مومن تھے، انہوں نے کفار کے مختلف قبائل پر مشتمل لشکر کو دیکھا تو ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئے بلکہ اسے اللہ کے وعدوں کی سچائی کی دلیل سمجھا جس کے نتیجہ میں ان کے ایمان، تسلیم اور شجاعت میں بھی اضافہ ہوگیا۔

"وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ○" (احزاب:22)

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منافقین اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو مدینہ واپس چلے جانے کی اجازت دے دی تھی، اس لئے کہ اگر وہ محاذ پر رہتے تو نہ صرف یہ کہ کوئی کارنامہ انجام نہ دے پاتے بلکہ دُوسروں کے حوصلے بھی پست کر دیتے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت 47 میں آیا ہے:

"لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا"۔

''اگر وہ تمہارے ساتھ چلتے تو تمہارے تذبذب اور اضطراب میں ہی اضافہ کرتے''۔

عربی زبان میں ''خبل'' اور خبال'' اضطراب اور تذبذب کے معنی دیتے ہیں جو عقل کی کمزوری اور قوتِ فیصلہ کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ خوف اور وحشت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان کا فکری توازن درہم برہم ہوجاتا ہے اور اس کی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ میں کمی آجاتی ہے۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں کی شجاعت کا ایک اور چہرہ نظر آتا ہے۔ یہ ایسی شجاعت ہے جس کا سرچشمہ ایمان سے جنم لینے والی سوچ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ ساتھی بخوبی جانتے تھے کہ میدان جنگ میں ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک فتح وکامرانی کا راستہ اور دوسرا شہادت کا راستہ۔ دونوں راستے صاحبانِ ایمان کیلئے کامیابی وسعادت کے راستے ہیں۔ دوسری طرف سے دشمن کے سامنے بھی صرف دو ہی راستے ہیں یا تو دُنیا میں لشکر اسلام کے ہاتھوں شکست کھا کر ذلیل ہوں اور اگر انہیں ظاہری اور وقتی کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو بالآخر آخرت میں صرف عذابِ الٰہی ہی ان کا مقدر ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ایسی سوچ رکھنے والا شخص کبھی خوف وہراس کا شکار نہیں ہوتا اور بزدلی جیسی اخلاقی رذیلت اس کے قریب نہیں آسکتی۔

"قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ○"(توبہ:52)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز ہی اسی طرزِ تفکر سے پیدا ہونے والی شجاعت میں مضمر ہے۔

چھٹی آیت میں جنگِ اُحد میں اہلِ ایمان کی شجاعت کا ایک نمونہ بیان کیا گیا ہے۔

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ جنگِ اُحد میں مالِ دُنیا کے دلدادہ کچھ مسلمان سپاہیوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو سنگین جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔

مشرکین کا لشکر فتح کے نعرے لگاتا ہوا میدانِ اُحد سے مکہ کی طرف واپس چل پڑا۔ راستے میں اُنہیں خیال آیا کہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر دوبارہ لشکرِ اسلام پر حملہ کر دیا جائے تا کہ اُن کی فتح مستحکم ہو جائے۔

رسولؐ اللہ نے اس موقع پر ایک انتہائی مؤثر تدبیر اختیار فرمائی اور حکم دیا کہ لشکرِ اسلام کے تمام مجاہد، حتیٰ کہ وہ بھی جو شدید زخمی تھے، اس طرف پیش قدمی کریں جہاں سے دُشمن واپس آ رہا تھا۔ لہٰذا لشکرِ اسلام پیش قدمی کر کے حمرأ الاسد کے مقام پر آ گیا۔ جب دُشمن کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے یہ سوچ کر کہ اپنی اس چھوٹی سی فتح کی حفاظت کرنا زیادہ مناسب ہے، لشکرِ اسلام پر حملہ کرنے کا خیال ترک کر دیا اور مکہ کی طرف پلٹ گیا۔

اس آیت میں مسلمانوں کے اس اقدام پر ان الفاظ میں ان کی تعریف کی گئی:

"اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ○(آل عمران:173)"

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے انہیں کہا کہ دُشمن حملہ کرنے کیلئے جمع ہو رہے ہیں، ان سے ڈرو تو (ڈرنے کی بجائے) ان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے: اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے''۔

دُنیا میں کہیں ایسی مثال نہیں ملتی کہ زخمی سپاہی فوراً میدانِ جنگ میں آ کر صفِ اوّل میں کھڑے ہو جائیں۔

ان کی اس بے مثال شجاعت نے دُشمن کی ہمت پست کر دی اور اسے مایوس اور ناکام واپس ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

لشکرِ اسلام کے حمرأ الاسد پر موجود ہونے کی اطلاع نے نہ صرف دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا بلکہ ان کی فتح کی لذت کو بھی تلخی میں بدل دیا۔ لشکرِ اسلام کے اس جرأت مندانہ اقدام سے دُشمن کو یہ پیغام مل گیا کہ اگرچہ کچھ مسلمان سپاہیوں کی غفلت سے انہیں عارضی شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ لشکرِ اسلام نے ایک شکست کا راستہ روک دیا بلکہ اپنی شکست کے منفی اثرات پر قابو پا لیا اور اللہ پر توکل کے ذریعے دِلوں میں اُمید کی شمع روشن کر دی۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جب بعض شیاطین نے لشکرِ اسلام کو دشمن کی فوج کے مجتمع ہونے کی خبر سنا کر

خوفزدہ کرنا چاہا تو وہ بالکل خوفزدہ نہ ہوئے بلکہ ان کے ایمان اور توکل میں اضافہ ہوگیا۔اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ اللہ کے وعدوں کی سچائی ان پر آشکار ہوگئی اور رسولؐ اللہ کی بات کی صداقت ان پر عیاں ہوگئی کہ اگر وہ میدانِ اُحد میں آپؐ کے حکم کی پیروی کرتے تو انہیں اس شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

اس جنگ کی ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ جن لوگوں نے جنگِ اُحد میں شرکت کی تھی،صرف وہی حمرأالاسد کی طرف پیش قدمی کریں۔اس طرح آپؐ نے دُشمن پر واضح کر دیا کہ زخمی مجاہدین پوری طرح سے جنگ کیلئے آمادہ ہیں اور ان کے عزم میں ذرا سی بھی کمزوری پیدا نہیں ہوئی ہے۔یہی وہ بات ہے جس نے دُشمن کو پریشان اور مضطرب کر دیا۔

آگے چل کر اسی سورۂ کی آیت 175 میں ضعیف الایمان بزدلوں اور بہادر مومنین کا فرق اس طرح واضح کیا گیا ہے:

"اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○"

(آلِ عمران:175)

''یہ شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے،پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو،اگر تم مومن ہو''۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس قسم کے خوف شیطانی وسوسے ہوتے ہیں جن کا مقصد مومنین کے ایمان کو کمزور کرنا ہوتا ہے لیکن حقیقی مومن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

جس طرح اس قسم کے خوف شیطانی وسوسوں کا نتیجہ ہوتے ہیں،اسی طرح مومنین کی جرأت اور بہادری کی بنیاد ان کا ایمان ہوتا ہے۔مومن اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔چونکہ اللہ کی طاقت اور قوت ہر طاقت اور قوت سے برتر ہے،لہٰذا مومن کو ہر میدان میں کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔اس کے برعکس کفار چونکہ اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں،لہٰذا جب وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہیں تو خوف اور وحشت کا سایہ ان پر چھا جاتا ہے۔

غزوۂ حمرأالاسد میں شیطانی طاقتوں نے گٹھ جوڑ کیا تا کہ قریش کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں اور وہ خوفزدہ ہو جائیں جبکہ قرآن کے مطابق ایسے حالات میں شیطان اور اس کے ساتھی ہی خوفزدہ ہوتے ہیں اور اللہ کے اولیأ کسی قسم کے خوف اور حزن کو قریب نہیں آنے دیتے۔

ساتویں اور آخری آیت مبلغانِ رسالت الٰہی کی یہ صفت بیان کر رہی ہے کہ وہ خوف جیسی صفتِ رذیلہ سے پاک ہوتے ہیں:

"الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا○"

یہ ایسے افراد تھے جو اللہ کی رسالتوں کی تبلیغ کرتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے یہی بات ہے کہ اللہ حساب لینے والا ہے۔(احزاب:39)

اللہ کے رسولوں کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کریں اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ خوف سے بالکل پاک ہوں۔

یہ آیت جو گزشتہ انبیاؑ کا ذکر کر رہی ہے، رسولؐ اللہ اور انؐ کے بعد آنے والے تمام مبلغین الٰہی کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچانے میں اللہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈریں۔ بالفاظِ دیگر یہ آیت اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ ڈرپوک اور بزدل افراد اللہ کے پیغام کی تبلیغ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انبیاؑ کو تبلیغ کرتے وقت تقیہ سے کام نہیں لینا چاہئے۔ لیکن یہ تفسیر صرف اسی صورت میں صحیح ہوسکتی ہے جب تقیہ مخالفین کے خوف کی وجہ سے ہو۔ لیکن تقیہ ہمیشہ مخالفین کے خوف کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس کا مقصد مخالفین کو جذب کرنا یا بتدریج انہیں حق کے قریب لانے کیلئے بھی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا سورج، چاند اور ستارے کو دیکھ کر ''ھٰذَا رَبِّیْ'' کہنا اس مفہوم کا حامل ہوسکتا ہے۔

نتیجہ:۔

قرآن مجید کی آیات جن میں سے چند نمونے ہم دیکھ چکے ہیں، جرأت اور شجاعت کی اہمیت اور انسان کی مادی اور معنوی ترقی میں ان کے کردار اور خوف کے منفی نتائج کو بخوبی آشکار کر دیتی ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ ان آیات میں بہادری اور بزدلی کو بطور مستقل زیر بحث نہیں لایا گیا لیکن ضمنی طور پر انہیں اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

خوف اور بُزدلی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اس صفتِ رذیلہ کی وسیع پیمانے پر مذمت کی گئی ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

1۔ ''لَایَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَاناً وَّلَا حَرِیْصًا وَّلَا شَحِیْحًا۔''

''مومن بزدل، حریص اور بخیل نہیں ہوتا''۔(بحارالانوار، 301:72)

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ خوف، حرص اور بخل کا ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ مؤمن اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے وہ اللہ کے فضل وکرم کی اُمید سے مالا مال ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے بزدل، حریص یا بخیل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

2۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْجُبْنُ وَالْحِرْصُ وَالْبُخْلُ غَرَائِزُ سُوْءٍ يَجْمَعُهَا سُوْءُ الظَّنِّ بِاللهِ سُبْحَانَهٗ"۔

''خوف، حرص اور بخل اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی سے پیدا ہوتے ہیں''۔(غررالحکم)

یہ حدیث مذکورہ بالا حدیث کی خوبصورت تشریح ہے۔

3۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دوستوں کو نصیحت کی کہ کبھی کسی بزدل شخص سے مشورہ نہ کریں:

"لَا تُشْرِكَنَّ فِيْ رَأْيِكَ جَبَانًا يُضَعِّفُكَ عَنِ الْاَمْرِ وَيُعَظِّمُ عَلَيْكَ مَا لَيْسَ بِعَظِيْمٍ"۔

''بزدل انسان کو ہرگز اپنے مشورہ میں شریک نہ کرو، وہ اہم کاموں میں تمہیں کمزور کردے گا اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دکھائے گا''۔(غررالحکم: حدیث:10349)

مالک اشتر کے نام اپنے حکم نامے میں بھی آپؑ نے بخیل، بزدل اور حریص سے مشورہ کرنے سے منع فرمایا:(نہج البلاغہ، مکتوب:53)

4۔ یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم فرماتے ہیں کہ بزدل افراد جنگوں میں شریک نہ ہوں کیونکہ وہ دوسروں کی حوصلہ شکنی کا باعث بن سکتے ہیں۔آپؐ فرماتے تھے:

"مَنْ اَحَسَّ مِنْ نَفْسِهٖ جَبْنًا فَلَا يَغْزُ"۔

''جو شخص اپنے اندر بزدلی محسوس کرتا ہے، وہ جنگ میں شرکت نہ کرے''۔

5۔ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام نے مذکورہ بالا حدیث کی بہت عمدہ تشریح فرمائی ہے:

"لَا يَحِلُّ لِلْجَبَانِ اَنْ يَغْزُوْا، لِاَنَّهٗ يَنْهَزِمُ سَرِيْعًا وَلٰكِنْ لِيَنْظُرْ مَا كَانَ يُرِيْدُ اَنْ يَغْزُوَ بِهٖ فَلْيُجَهِّزْ بِهٖ غَيْرَهٗ"۔

(بحارالانوار، 49:97)

''بزدل افراد کیلئے جنگ میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ جلد ہی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے(اس سے دوسروں کے حوصلے بھی پست ہوجائیں گے) لہٰذا انہیں چاہئے کہ اپنا سامانِ جنگ کسی اور کو دے دیں''۔

معقول خوف اور غیر معقول خوف

خوف کی دو اقسام ہیں: معقول اور غیر معقول۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن وحدیث میں جس خوف کی مذمت کی گئی ہے، وہ غیر معقول خوف ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جو چیزیں واقعی خطرناک ہیں، ان سے ڈرنا ایک قدرتی سی بات ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ہے، اس لئے کہ اگر انسان کسی بھی خطرناک چیز سے نہ ڈرے تو جلد ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے، مثلاً اگر کوئی شخص دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک پار کرنا چاہے تو اس کی زندگی خطرناک حادثات کا شکار ہوسکتی ہے۔ اس قسم کے خوف روزمرہ کی زندگی میں ہوں، مشکوک خوراک کے بارے میں یا سیاسی اور معاشی معاملات میں مکمل طور پر معقول اور منطقی ہوتے ہیں اور انسان کو مہلک حادثات سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

غیر معقول اور قابلِ مذمت خوف وہ ہوتا ہے کہ انسان ایسی چیزوں سے خوفزدہ ہو جن سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر انسان چھوٹے چھوٹے خیالی خطرات سے ڈرنے لگے اور خیالی دُشمنوں سے وحشت زدہ ہونے لگے تو رفتہ رفتہ ایسے شخص کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔ ایسا شخص ہر اس کام کو ہاتھ لگانے سے ڈرتا ہے جس میں ناکامی کا امکان ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خوف انسان کی پسماندگی اور بدبختی کا سبب بن جاتا ہے اور اُسے ذِلت وخواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔

یہ دُنیا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، ایک میدانِ جنگ ہے جس میں ہر قدم پر مشکلات، رُکاوٹیں اور خطرات سامنے آتے ہیں۔ انسان ان کے ساتھ مقابلہ کرکے ہی کامیابی کی منزل کو حاصل کرسکتا ہے۔

دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا کام ہو جس میں کامیابی کی سو فیصد ضمانت دی جاسکے یا جس کو کرنے میں کسی قسم کا خطرہ درپیش نہ ہو۔ اگر انسان میں جرأت اور شجاعت موجود نہ ہو تو وہ ہر قدم پر ناکام ہوتا رہے گا۔ یہاں سے شجاعت اور جرأت کی اہمیت اور ضرورت بخوبی آشکار ہوجاتی ہے اور بزدلی کا منفی کردار بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ہر کسان اور کاشتکار کے کھیت اور فصل کے نقصان کا امکان موجود ہوتا ہے۔ ہر تاجر کو تجارت میں نقصان کا امکان ہوتا ہے۔ کوئی مسافر سفر میں حادثے کے امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ ہر آپریشن میں ناکامی یا بعد میں پیچیدگی پیدا ہونے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اگر انسان تمام معاملات کی بنیاد منفی امکانات پر رکھ دے تو وہ کسی کام کو شروع ہی نہیں کرسکے گا۔ ایسا انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر صرف موت کا انتظار کرسکتا ہے۔

اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ان خطرات کو یکسر نظرانداز کردیا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان خطرات کا اچھی طرح سے جائزہ لے کر ان سے بچنے کی مناسب تدبیر کی جائے اور پھر جرأت اور شجاعت کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا جائے۔

مختصر یہ ہے جس طرح غیر معقول اور خیالی خطرات سے خوفزدہ ہونا صحیح نہیں ہے، اسی طرح حقیقی خطرات کو نظرانداز کرنا، ان

سے بے پرواہ ہو کر مقہورانہ اندازِ عمل اختیار کرنا بھی درست نہیں ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے بزدلی کی نہایت خوبصورت تعریف بیان فرمائی ہے:

"اَلْجُرْأَةُ عَلَى الصَّدِيْقِ وَالنُّكُوْلُ عَنِ الْعَدُوِّ"۔ (میزان الحکمہ، 370:1)

''بزدلی یہ ہے کہ انسان دوست کے خلاف جرأت منداور دُشمن کے سامنے کمزور ہو''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ شجاعت کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"مُوَافِقَةُ الْاَقْرَانِ وَالصَّبْرِ عِنْدَ الطِّعَانِ"۔ (میزان الحکمہ، 1412:2)

''شجاعت یہ ہے کہ انسان دوست کا ساتھ دے اور دُشمن کے سامنے ثابت قدم رہے''۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ" (بقرہ: 195)

''اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔

ایک اور مقام پر مومنین کی یہ صفت بیان فرمائی:

"اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" (فتح: 29)

''وہ کفار کے خلاف شدت سے کام لیتے ہیں''۔ (یعنی اُن کے مقابلے میں خوف اور کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے)۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ شجاعت ایک ایسی اخلاقی فضیلت ہے جو بزدلی اور تہور کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔

انفرادی اور قومی زندگی پر بزدلی کے منفی اثرات

یہ صفتِ رذیلہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر بہت سے منفی اثرات مرتب کرتی ہے اور یقیناً شکست، ذِلت اور پستی کے یقینی اسباب میں سے ایک ہے۔

ہمیں تاریخ میں بہت سی ایسی اقوام کا ذکر ملتا ہے جن کے پاس افرادی قوت اور ساز و سامان کی فراوانی تھی مگر اس کے باوجود سالہا سال تک ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن جیسے ہی ان میں ایک بہادر رہنما سامنے آیا، اُن کی ساری افرادی قوت اور سارا ساز و سامان حصولِ آزادی کیلئے مصروفِ عمل ہوگیا اور قلیل سی مدت میں وہ ایک آزاد اور معزز قوم بن گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی شجاعت نے تمام غزوات میں لشکر اسلام کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا اور اسلام کی تیز رفتار ترقی بھی اس کی مرہونِ منت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلشَّجَاعَةُ عِزٌّ حَاضِرٌ وَالْجُبْنُ ذُلٌّ ظَاهِرٌ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 171:7)

''شجاعت ایسی عزت ہے جو حاضر ہے جبکہ بزدلی ایک ظاہر آشکار ذِلت ہے''۔

ایک اور مقام پر آپؑ نے یہی بات اس طرح بیان فرمائی:

"اَلشَّجَاعَةُ نُصْرَةٌ حَاضِرَةٌ ظَاهِرَةٌ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 171:7)

''شجاعت ایک ایسی نصرت ہے جو حاضر ہے اور ایسی فضیلت ہے جو ظاہر و آشکار ہے''۔

اس صفتِ رذیلہ کا ایک اور منفی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو بڑے کاموں سے روک دیتی ہے، اس لئے کہ بڑے کاموں میں ہمیشہ مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے جنہیں صرف بہادر اور شجاع افراد ہی برداشت کر سکتے ہیں۔

بزدلی افراد کو زندگی میں یا تو کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوتی یا اگر ان کی زندگی میں کوئی کامیابی ہوتی ہے تو وہ بہت چھوٹی اور معمولی ہوتی ہے۔ بزدل افراد کوئی اصلاحی یا انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسلام میں بزدل افراد سے مشورہ کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کے بارے میں بھی احادیث ہم بیان کر چکے ہیں۔

بزدلی کے اسباب:۔

1۔ ایمان کی کمزوری اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی بزدلی کی بنیادی وجہ ہے، اس لئے کہ حقیقی مومن اللہ پر توکل اور اس کے وعدوں کی سچائی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسے افراد بڑے سے بڑے حوادث اور بحرانوں میں بھی مطمئن اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ مالک اشتر کے نام اپنے حکم نامے میں حضرت علیؑ نہج البلاغہ کے خطبہ: 53 میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْبُخْلَ وَالْجُبْنَ وَالْحِرْصَ غَرَائِزُ شَتّٰى يَجْمَعُهَا سُوْءُ الظَّنِّ بِاللّٰهِ"۔

''بخل، بزدلی اور حرص ایسے رجحانات ہیں جو اللہ کے بارے میں بدگمانی میں جمع ہوتے ہیں''۔

2۔ احساسِ کمتری بھی بزدلی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر کسی شخص میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی زیادہ ہوگی، اُسی قدر وہ بہادر ہوگا۔ ایک حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"شِدَّةُ الْجُبْنِ مِنْ عَجْزِ النَّفْسِ وَضَعْفِ الْيَقِيْنِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 185:4)

''بزدلی کی شدت نفسیاتی ناتوانی اور یقین کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے''۔

3۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض افراد، بعض جانوروں یا بعض دیگر موجودات کے بارے میں صحیح

معلومات نہ رکھنے کی وجہ سے ان سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی ان کے بارے میں صحیح معلومات مل جائیں، اس کا خوف برطرف ہوجاتا ہے۔

4۔ بزدلی کا ایک سبب عافیت طلبی ہے۔ شجاعت اگرچہ کامیابیوں کی راہ ہموار کرتی ہے لیکن ممکن ہے کہ انسان کو اس کی وجہ سے مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ لہٰذا عافیت طلب افراد کسی ایسے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے جو مشکلات کا باعث ہو۔

5۔ بعض اوقات انسان کی زندگی میں ایسے تلخ تجربات آتے ہیں جنہیں انسان نہیں دُہرانا چاہتا۔ یہ تجربات انسان کے اندر ایک قسم کا خوف پیدا کردیتے ہیں جو زندگی بھر انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اس کو مناسب نفسیاتی علاج کے ذریعے ہی برطرف کیا جاسکتا ہے۔

6۔ غیر ضروری احتیاط کسی خوف کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے اور خوف کا سبب بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو انسان ہر قسم کے خطرات سے اجتناب کرنا چاہتا ہو، وہ کبھی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا جس میں کوئی خطرہ پنہاں ہو۔ غیر ضروری احتیاط درحقیقت عافیت طلبی ہی کی ایک صورت ہے۔

7۔ بعض اوقات نامعلوم نفسیاتی اسباب انسان کے اندر خوف اور بزدلی کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر افراد اپنی اس حالت کو پسند نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں! ہمارا بس نہیں چلتا اور یہ خوف خود بخود ہم پر مسلط ہو جاتا ہے لیکن یہ خوف بھی ناقابلِ علاج نہیں ہے۔ مناسب نفسیاتی علاج سے اس قسم کے خوف سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

علاج اور احتیاط

تمام رذائلِ اخلاقی کی طرح بزدلی کے علاج کا بھی ایک طریقہ ہے کہ انسان اس کے منفی نتائج کے بارے میں غور وفکر کرے۔ جب کوئی بزدل شخص بزدلی کی وجہ سے رونما ہونے والی ذِلت، پسماندگی اور ناکامی پر غور کرتا ہے تو وہ اپنے طرز زندگی پر نظرثانی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے اور اس صفتِ رذیلہ سے نجات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

اس صفتِ رذیلہ کے دیگر اسباب کا خاتمہ اس کے علاج کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی کے سیاہ بادل انسان کے دل ودماغ کے اُفق سے چھٹ جائیں گے اور اللہ پر توکل کا خورشیدِ درخشاں انسان کے قلب وجان کو منور کردے تو خوف پیدا کرنے والے خیالات وافکار انسان کے ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ اس طریقہ سے اس بیماری کا علاج کرنے کیلئے احتیاط اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

بزدلی کے علاج کا ایک اور موثر علاج یہ ہے کہ انسان جن چیزوں سے ڈرتا ہو، اُن میں داخل ہوجائے اور انہیں بار بار انجام دے۔ بعض لوگ دوائی پینے یا ٹیکہ لگوانے سے ڈرتے ہیں۔ اگر ایسے افراد چند بار دوائی پی لیں یا ٹیکہ لگوالیں تو ان کا خوف برطرف ہوجاتا ہے۔

بعض لوگ سمندری یا ہوائی سفر سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔لیکن چند مرتبہ اس عمل سے گزرنے کے بعد ان کا خوف زائل ہوجاتا ہے۔اس طرح بعض لوگ مجمع میں تقریر کرنے سے ڈرتے ہیں۔یہ خوف بھی چند بار تجربہ کرنے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔

فوجی مشقوں کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایسی مشقوں کی وجہ سے سپاہیوں اور افسروں کے دل میں جنگ کا خوف نہیں رہتا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اس سلسلہ میں ایک نہایت خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا ہے:

"اِذَا هَبْتَ اَمْرًا فَقَعْ فِيْهِ، فَاِنَّ شِدَّةَ تَوَقِّيْهِ اَعْظَمَ مِمَّا تَخَافُ مِنْهُ"۔

''جب تم کسی چیز سے ڈرو تو اس میں داخل ہو جاؤ، اس لئے کہ اس کا خوف اس سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:175)

مرحوم علامہ حبیب اللہ خوئی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''شرح نہج البلاغہ'' میں اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اکثر ہوتا ہے کہ انسان کو کسی ایسے کام سے واسطہ پڑتا ہے جسے وہ خوف اور بزدلی کی وجہ سے نہیں کر پاتا۔اس کی یہ وحشت جو بزدلی کی وجہ سے ہوتی ہے،اُسے اپنے کاموں میں ترقی اور پیشرفت سے باز رکھتی ہے۔ایسی صورتِ حال میں امیر المومنین علیہ السلام اس خوف سے نجات کیلئے حوصلہ افزائی فرماتے ہیں کیونکہ اکثر اوقات تذبذب اور دودِلی سے پیدا ہونے والا خوفناک چیز سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے''۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں:

''محققین اور موجدین نے اس اصول پر عمل کر کے قابلِ فخر کارنامے انجام دیئے ہیں۔افریقہ کے جنگلوں اور صحراؤں میں اور سمندر کے نیچے چلے گئے اور نہ صرف بہت سی دولت کے ساتھ ساتھ شہرت بھی حاصل کی بلکہ سائنس کی خدمت بھی کی اور انسان کے علم ودانش کے ذخیرے میں اضافہ کیا''۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تذبذب اور دودِلی اور دردناک انجام اُس کام سے زیادہ انسان کیلئے وحشت ناک ہوتا ہے۔

عربی زبان میں اس بارے میں یہ ضرب المثل مشہور ہے:

"اُمُّ الْمَقْتُوْلِ تَنَامُ وَاُمُّ الْمُهَدَّدِ لَا تَنَامُ"۔(منهاج البراعة، 252:21)

''مقتول کی ماں سو جاتی ہے مگر جسے قتل کی دھمکی دی گئی ہو،اس کی ماں نہیں سوسکتی''۔

نیز یہ بھی کہا گیا ہے:

"كُلُّ اَمْرٍ مِنْ خَيْرٍ اَوْ شَرٍّ فَسَمَاعُهُ اَعْظَمُ مِنْ عَيَانِهٖ"۔

''ہر اچھا یا برا کام ایسا ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کے بارے میں سنا جاتا ہے، وہ اس کی حقیقت سے بڑا ہوتا ہے''۔(شرح نہج البلاغہ، 17:18)

خوف اور بزدلی کے علاج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان پاکیزہ زندگی بسر کرے، اس لئے کہ خوف کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان اپنے برے کاموں کے نتائج سے خائف ہوتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی ڈرتا ہے کہ کہیں اُس کے برے اعمال لوگوں پر آشکار نہ ہو جائیں۔

اس بات کو امیر المومنینؑ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَا اَشْجَعُ الْبَرِیْ وَ اَجْبَنَ الْمُرِیْبُ"۔ (غرر الحکم: 9626)

''پاک دامن شخص کتنا بہادر ہوتا ہے اور جس کا کردار داغدار ہو، وہ کتنا ڈرپوک ہوتا ہے''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَوْ تَمَیَّزَتِ الْاَشْیَاءُ لَکَانَ الصِّدْقُ مَعَ الشَّجَاعَةِ وَ کَانَ الْجُبْنُ مَعَ الْکِذْبِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 172:7)

''اگر تمام اشیاء نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں تو سچائی بہادری کے ساتھ اور بزدلی جھوٹ کے ساتھ نظر آئے گی''۔

انسان کی زندگی پر شجاعت کے اثرات

بزدلی اور خوف کی ضد شجاعت اور دلیری ہے۔ ان دونوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ موازنہ کر کے ہی بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح شجاعت کا مفہوم سمجھے بغیر بزدلی کے معنی ناقابلِ فہم ہوتے ہیں، اسی طرح بزدلی کے مفہوم کی شناخت کے بغیر شجاعت کے مفہوم کی پہچان بہت دُشوار ہے۔

اس کے باوجود گزشتہ مباحث کی تکمیل کیلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کی روشنی میں شجاعت اور زندگی پر اس کے اثرات کے بارے میں مزید وضاحت پیش کی جائے۔

1۔ امیر المومنین علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے عہد نامہ میں، جسے ''الٰہی سیاست کا جامع ترین منشور'' کہا جا سکتا ہے، متعدد مقامات پر شجاعت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ایک مقام پر مالک اشتر کو خبردار کرتے ہیں کہ ڈرپوک اور حریص افراد کو اپنے مشیروں میں شامل نہ کرو۔

ایک اور مقام پر فوجی سالاروں اور تمام اعلیٰ عہدیداروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ الْصَقْ بِذَوِی الْمُرُوآتِ وَالْاَحْسَابِ وَاَهْلِ الْبُیُوْتَاتِ الصَّالِحَةِ وَ السَّوَابِقِ الْحَسَنَةِ

ثُمَّ اَهْلِ النَّجْدَةِ وَالشَّجَاعَةِ وَالسَّخِيِّ وَالسَّمَاحَةِ، فَاِنَّهُمْ جِمَاعٌ مِنَ الْكَرَمِ وَشُعَبٌ مِنَ الْعُرْفِ"۔(نہج البلاغہ:53)

''معزز اور خاندانی افراد کے ساتھ، جن کا ماضی بے داغ ہو، تعلقات قائم کرو۔ بہادر سخی اور کریم افراد کے ساتھ تعاون کرو کیونکہ ایسے افراد ہی نیکی اور شرافت کا مرکز ہوتے ہیں''۔

2۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلشَّجَاعَةُ زَيْنٌ، اَلْجُبْنُ شَيْنٌ۔"(شرح فارسی غرر الحکم، 171:7)

''شجاعت زینت اور بزدلی عیب ہے''۔

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ کا فرمان ہے:

"اَلسَّخَاءُ وَالشَّجَاعَةُ غَرَائِزُ شَرِيْفَةٌ يَضَعُهَااللهُ سُبْحَانَهٗ فِيْ مَنْ اَحَبَّهُ وَ اَمْتَحِنُهُ"(غرر الحکم: 1820)

''سخاوت اور شجاعت پسندیدہ صفات ہیں جو اللہ اُن کو عطا فرماتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے اور جن کا وہ امتحان لے چکا ہے''۔

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہلِ بیتؑ کے فضائل بیان کرتے ہوئے سات صفات کا ذکر فرماتے ہیں جن میں سے ایک شجاعت ہے۔(بحار الانوار، 265:26)

5۔ شبِ ہجرت حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوئے۔ صبح کے وقت جب محاصرہ کرنے والے دھاوا بول کر اندر داخل ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر حضرت علیؑ کو پایا تو حضرت علیؑ کے بارے میں نازیبا کلمات کہنے لگے۔ آپؑ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ اللہ نے مجھے بہت سے فضائل سے آراستہ کیا ہے۔ پھر اپنے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"وَمِنَ الشَّجَاعَةِ مَالَوْ قُسِّمَ عَلٰى جَمِيْعِ جُبَنَاءِ الدُّنْيَا لَصَارُوْا بِهٖ شُجْعَانًا"۔

''اور اللہ نے مجھے وہ شجاعت عطا فرمائی ہے کہ اگر اسے دُنیا کے سب بزدلوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب کے سب شجاع اور بہادر بن جائیں''۔(بحار الانوار، 83:19)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے شام میں اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:

"اَيُّهَا النَّاس:اُعْطِيْنَا سِتًّا وَّفُضِّلْنَا بِسَبْعٍ اُعْطِيْنَا الْعِلْمَ وَالسَّمَاحَةَ وَالْفَصَاحَةَ

وَالشَّجَاعَةَ وَالْمَحَبَّةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ"۔ (بحار، 138:45)

''اے لوگو! اللہ نے ہمیں چھ نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور سات چیزوں سے ہمیں فضیلت دی ہے۔ جو چھ نعمتیں اُس نے ہمیں عطا کی ہیں، وہ ہیں: علم، حلم، سخاوت، فصاحت، شجاعت اور مومنین کے دل میں محبت''۔

اگرچہ اس بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش موجود ہے مگر ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے۔ آپؐ نے اُن کے سنگین جرائم کی وجہ سے اُن میں سے ایک کے علاوہ سب کیلئے سزائے موت کا حکم صادر فرمایا۔ اُس شخص نے حیرت سے پوچھا کہ آپؐ نے مجھے کیوں آزاد کر دیا؟ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کے ذریعے مجھے خبر دی ہے کہ تم میں پانچ ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کو بہت پسند ہیں:''

"اَلْغِيْرَةُ الشَّدِيْدَةُ عَلٰى حَرَمِكَ، وَالسَّخَاءُ، وَحُسْنُ الْخُلُقِ، وَصِدْقُ اللِّسَانِ وَالشَّجَاعَةِ"۔

''اپنے ناموس کے بارے میں شدید غیرت، سخاوت، حسنِ اخلاق، سچائی اور شجاعت''۔

یہ بات سن کر وہ شخص مسلمان ہو گیا اور اس کا شمار اچھے مسلمانوں میں ہونے لگا۔

مندرجہ بالا احادیث اور دیگر آیات و روایات کی روشنی میں ہم نے جو بحث کی، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نظر میں شجاعت کی کتنی اہمیت ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ شجاعت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور میدانِ جنگ کی شجاعت اس کا صرف ایک پہلو ہے۔ سیاست اور علم کے میدان میں شجاعت، علمی تحقیقات کی روشنی میں رونما ہونے والے نئے نظریات کے بیان کی شجاعت، جج کی حیثیت سے فیصلہ کرتے وقت شجاعت وغیرہ شجاعت کا اہم پہلو ہیں۔ بعض احادیث میں ہے:

"اَلصَّبْرُ شَجَاعَةٌ"۔

''صبر شجاعت ہے''۔ (نہج البلاغہ، حکمت: 4)

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَشْجَعُ النَّاسِ اَسْخَاهُمْ"۔

''سب سے بہادر انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ سخی ہے''۔ (غرر الحکم: 2899)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَوْ تَمَيَّزَتِ الْاَشْيَاءُ لَكَانَ الصِّدْقُ مَعَ الشَّجَاعَةِ وَكَانَ الْجُبْنُ مَعَ الْكِذْبِ"۔(شرح فارسی غرر الحکم، 118:5)

''اگر تمام اشیاً نمایاں ہوکر سامنے آجائیں تو سچائی بہادری کے ساتھ اور بزدلی جھوٹ کے ساتھ کھڑی نظر آئے گی''۔

ان احادیث میں سے ہر حدیث شجاعت کے وسیع مفہوم کے ایک پہلو کو اُجاگر کررہی ہے۔

دسواں باب

توکل

تمہید:۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اور بہت سی احادیث کے علاوہ انبیاؑ، اولیاؑ اور صالحین کے حالاتِ زندگی اور اخلاق وعرفان کی کتب میں توکل کو ایک اہم اخلاقی فضیلت قرار دیا گیا ہے۔جس کے بغیر انسان قربِ الٰہی کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

توکل کے معنی ہیں اپنے کاموں کو اللہ کے سپرد کرنا اور اس کے لطف وکرم پر اعتماد کرنا۔توکل ''وکالت'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کسی کو اپنے کام کی انجام دہی میں اپنا وکیل بنانا۔ظاہر سی بات ہے کہ انسان کا وکیل جس قدر زیادہ عالم اور اپنے کام میں ماہر ہو، انسان اُسی قدر زیادہ مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے۔چونکہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت لامحدود ہے، لہٰذا جب انسان اپنے کاموں میں اس پر توکل کرتا ہے، یعنی اُسے وکیل بناتا ہے تو اُسے بے حد اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے۔مشکلات کے مقابلے میں اُس کی ہمت اور جرأت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور کہیں وہ اپنے آپ کو بندگلی میں محسوس نہیں کرتا اور اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھتا رہتا ہے۔

جو انسان اللہ پر توکل کرتا ہے، وہ کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت اور اُس کے بے پایاں علم پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو فاتح اور کامیاب محسوس کرتا ہے۔اگر کبھی وقتی طور پر اسے ناکامی ہوجائے تو وہ ہرگز مایوس نہیں ہوتا۔

اگر توکل کی صفت صحیح معنوں میں کسی انسان کے دل میں پیدا ہوجائے تو یقیناً اس کے دل میں اُمید کی شمع روشن ہوجاتی ہے۔اس کے ارادے میں قوت اور اس کی ثابت قدمی کو دوام اور پامردی کو استحکام حاصل ہوجاتا ہے۔

انبیاؑ کی زندگی میں توکل کی صفت بہت نمایاں تھی۔قرآنی آیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انبیاؑ تمام مشکلات اور شدید ترین حالات میں توکل کو اپنی ڈھال بناتے تھے۔ان کی کامیابی کی ایک اہم وجہ یہی تھی کہ وہ اس اخلاقی فضیلت کی دولت سے مالا مال تھے۔

توکل کے بارے میں اس مختصر تمہید کے بعد قرآنی آیات کی روشنی میں انبیاؑ کی تاریخ کی ترتیب سے اُن کی زندگی میں توکل کے کردار پر گفتگو کریں گے۔حضرت نوحؑ سے اس کا آغاز کرکے جنابِ رسولِ خداؐ پر اس بحث کو ختم کریں گے۔

1۔ ''وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ"۔

''اے رسول! انہیں نوحؑ کا واقعہ سناؤ کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر میرا مقام اور اللہ کی آیات کے ذریعے میرا تم کو نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے تو میں نے تو اللہ پر توکل کرلیا ہے۔ تم اپنے معاملے کو سمیٹو اور اپنے شرکا کو اکٹھا کرو، یہاں تک کہ کوئی بات تم پر مبہم نہ رہے پھر میرا خاتمہ کردو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو''۔(یونس:71)

2۔ "اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ط"

''میں نے اللہ پر توکل کرلیا، جو میرا اور تمہارا رب ہے''۔(ھود:56)

3۔ "رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ"۔(ابراھیم: 37)

''اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت کے کچھ افراد کو تیرے بیت الحرام کے پاس بے آب و گیاہ وادی میں سکونت دی تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دِلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور انہیں پھلوں میں سے رزق عطا فرما تاکہ وہ شکر کریں''۔

4۔ "اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ"۔

''میں تو جہاں تک میری استطاعت ہے، اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ میری ساری توفیقات اللہ کے طرف سے ہیں اور میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔(ھود:88)

5۔ "وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ط وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ط اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ج وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ○ "(یوسف: 67)

''حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے کہا: اے میرے بچو! تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، میں اللہ کی طرف پیش آنے والے کسی حادثہ میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ حکم تو

صرف اللہ کا ہے۔ میں نے اسی پر توکل کیا اور سب توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا ضروری ہے''۔

6۔"وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝۸۴ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۵" (یونس: 85,84)

''اور موسیٰؑ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کے حکم کو مانتے ہو تو پھر اس پر توکل کرو۔ انہوں نے کہا: ہم نے اللہ پر توکل کیا جو ہمارا رب ہے۔ اے ہمارے رب! تو ہمیں کافروں کیلئے آزمائش نہ بنا''۔

7۔"وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ"(بقرہ: 250)

''جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے آرا ہوئے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! تو ہم پر صبر نازل فرما ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔

8۔"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝" (توبہ: 129)

''اگر وہ روگردانی کریں تو کہو: اللہ میرے لئے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر توکل کیا اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے''۔

9۔"وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰي مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ"۔(ابراھیم: 12)

''ہم کیوں اللہ پر توکل نہ کریں جبکہ اس نے ہمیں (سعادت کی راہ کی) ہدایت کی اور ہم یقیناً تمہاری طرف سے آنے والی تکالیف پر صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے''۔

10۔"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ"(طلاق: 3)

''اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کیلئے کافی ہوتا ہے''۔

تفسیر

انبیاؑ کی زندگی میں توکل کا عکس:۔

قرآن شریف کی آیات میں، خصوصاً انبیاؑ کی تاریخ میں ''توکل'' کو ان کی نمایاں ترین صفت کے طور بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے تمام حوادث میں اور دُشمن کی بے رحمانہ کاروائیوں کے نتیجہ میں رونما ہونے والی سخت ترین تکالیف اور مصائب میں صرف اللہ پر توکل کیا اور غیر اللہ پر بھروسہ کرنے سے مکمل طور پر دُور رہے۔

ہم حضرت نوحؑ کے واقعہ سے اس بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلے آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اللہ پر توکل کے نتیجہ میں ایک نا قابلِ شکست عزم کے ساتھ اپنے طاقتور اور متعصب دُشمنوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسولؐ اللہ کو حکم دے رہا ہے کہ آغازِ اسلام کے مسلمانوں کو ، جو کفار کی طرف سے شدید ترین مصائب میں مبتلا کئے جاتے تھے، نوحؑ کا واقعہ سناؤ کہ اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا:

''اے میری قوم! اگر میرا مقام اور اللہ کی آیات کے ذریعے میرا تمہیں نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے (تو جو کچھ تم سے ہوسکتا ہے، کرلو، مجھے کوئی خوف نہیں ہے) میں نے اللہ پر توکل کیا ہوا ہے۔ تم اپنی طاقت اور اپنے معبودوں کو جمع کرلو، پھر کسی بات کو بھی مبہم اور پوشیدہ نہ رہنے دو اور مجھے ایک لحظہ کی مہلت دیئے بغیر میرا کام تمام کردو (لیکن یاد رکھو کہ اللہ کی قدرت کے سامنے تم کچھ نہیں کرسکتے ہو)''۔

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ"۔ (یونس: 71)

یہ کونسی طاقت تھی جس نے حضرت نوحؑ کو طاقتور اور متعصب دُشمنوں کے خلاف اتنی جرأت اور ہمت بخشی کہ وہ ان کے سامنے کھڑے ہوکر ان کی طاقت کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور اُن کی تمام چالوں اور حربوں کو پائے حقارت سے ٹھوکر مار رہے ہیں اور اس طرح دشمنوں کو ایک نفسیاتی شکست سے دوچار کررہے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اس طاقت کا راز اللہ پر اُنؑ کا توکل تھا۔ یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ حضرت نوحؑ اپنے دشمنوں کی طاقت اور اُن کے معبودوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے بلکہ اُنہیں اپنی زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کرنے پر اُکسا رہے تھے اور انہیں دعوتِ مبارزہ دے رہے تھے۔ ایسی قدرت نمائی صرف اُن لوگوں کو زیب دیتی ہے، جو اللہ پر توکل کرتے ہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ سورۂ یونس، جس میں یہ آیت ہے، ایک مکمل سورۃ ہے، یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کے ذکر سے مکہ کے مسلمانوں کو، جو شمعِ رسالت کے پروانے بنے ہوئے تھے، دُشمن کے سامنے جرأت اور ہمت دینا چاہتا تھا اور انہیں یہ بتادینا چاہتا تھا کہ مشرکینِ مکہ کی کھوکھلی طاقت سے خوفزدہ نہ ہوں۔

اس آیت میں ''شُرَكَاءَكُمْ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد اُن کے بت ہوں جنہیں وہ اللہ کا شریک قرار دیتے تھے۔ دُوسرے یہ کہ اس سے مراد اُن کے دوست اور ساتھی ہوں۔ اس صورت میں اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم اور تمہارے دوست اور ساتھی یکجا ہوکر اپنی ساری طاقت استعمال کر دیکھو۔

دوسری آیت میں حضرت ہودؑ کی بات ہورہی ہے۔ ان کا زمانہ حضرت نوحؑ کے بعد تھا۔ جب ان کی بت پرست قوم نے انہیں جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تو اُنہوں نے واضح الفاظ میں جواب دیا:

قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ؕ (ھود: 54تا56)

''میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تم نے اللہ کے جو شریک بنا رکھے ہیں، میں اُن سے لاتعلق ہوں۔ تم سب مل کر میرے خلاف جیسی چاہو، چالیں چلو اور مجھے مہلت نہ دو (مگر یاد رکھو کہ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ) میں نے اللہ پر توکل کیا ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے''۔

حضرت ہودؑ نہ صرف یہ کہ اپنی بت پرست قوم کی عظیم طاقت اور اُن کی سازشوں اور شرارتوں کو خاطر میں نہیں لائے بلکہ انہیں اپنی طاقت کے استعمال پر اُکسا بھی رہے ہیں تاکہ اُن پر یہ ثابت کریں کہ میری رُوح اور میرے قلب کا رابطہ کسی اور مرکز سے ہے جس پر توکل کر کے مجھے دُشمنوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔

زجاج جو کہ مشہور مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''انبیأ کے بارے میں نازل شدہ آیات میں یہ سب سے اہم آیت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ایک رسول مخالفین کی عظیم تعداد کے سامنے عزم و ہمت کا پیکر بن کر کھڑا ہوجائے اور ان سے اُس لہجہ میں بات کرے۔ اس کی مثال حضرت نوحؑ کے واقعہ میں بھی ملتی ہے''۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اپنے مؤقف کے حق میں استدلال کرتے ہوئے اسی آیت میں آگے چل کر یہ کہہ رہے ہیں:

''مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا''

''ہر جاندار کی پیشانی اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ (ھود: 56)

پھر فرماتے ہیں:

"اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○"

''میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے''۔(ھود:56)

اس نکتہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ عام طور پر طاقتور افراد صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں مگر میرا رب قدرتِ کاملہ کا مالک ہونے کے باوجود صراطِ مستقیم پر ہے۔

بالفاظِ دیگر وہ اپنی قوم کو یہ بتا رہے ہیں کہ میرا توکل اُس ذات پر ہے جو لامحدود قدرت کا مالک ہونے کے باوجود تمام کاموں کو عدل کے معیار پر ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے۔

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ایک گوشے پر نظر ڈالی گئی ہے اور سخت ترین حالات میں اللہ پر اُنؑ کے توکل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔حضرت ابراہیمؑ اللہ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

"رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ"۔(ابراھیم: 37)

''اے میرے رب! میں نے (تیرے حکم سے اور تجھ پر توکل کرتے ہوئے) اپنی ذریت کے کچھ افراد کو تیرے بیت الحرام کے قریب بے آب و گیاہ وادی میں ساکن کر دیا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں۔اب تو لوگوں کے دِلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں میں سے رزق عطا فرما تاکہ وہ شکر ادا کریں''۔

اگر انسان کا ایمان پہاڑ سے بھی اونچا اور اس کا توکل سمندر سے بھی گہرا ہو، تب کہیں جا کر انسان اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو اللہ کے حکم کی اطاعت کے جذبے سے بے آب و گیاہ صحرا میں چھوڑ کر اپنے وطن واپس آ سکتا ہے۔

اس سے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ جب اُنؑ کی متعصب، ضدی اور غضب ناک قوم نے بت شکنی کی خاطر حضرت ابراہیمؑ پر مقدمہ چلایا اور وہ موت سے صرف ایک قدم کے فاصلہ پر تھے۔اس وقت بھی اپنی قوم کے معبودوں پر طنز کر رہے تھے اور بت پرستی کے بارے میں اُن کی بیہودہ سوچ پر خطِ بطلان پھیر رہے تھے(انبیاؑ:58 تا 67)

چوتھی آیت میں حضرت شعیبؑ کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو حضرت ہودؑ کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دَور سے کچھ عرصہ قبل کے دور میں تھے۔وہ بھی اپنی قوم کی دھمکیوں کے جواب میں کہتے ہیں:

"اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ"۔

''(میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس میں) میں حتی الامکان، اصلاح کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔میری توفیق صرف اللہ کے

طرف سے ہے اور میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں''۔(ھود:88)

یعنی میں اللہ کی پاک ذات پر ایمان اور توکل کی دولت سے مالا مال ہوں اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا ہوں اور پوری قوت سے اپنے مقصد کی طرف بڑھتا رہوں گا۔

یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ حضرت شعیبؑ اپنی قوم میں پھیلے ہوئے بگاڑ کی ہمہ گیر اصلاح کرنے کیلئے تین چیزوں پر انحصار کررہے ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراہم شدہ اسباب پر، جن کی طرف لفظ''توفیق'' سے اشارہ کیا جارہا ہے۔

2۔ کام شروع کرنے کیلئے طاقتور ارادہ جو اللہ پر''توکل'' سے حاصل ہوتا ہے۔

3۔ اور مثبت محرک، جس کی طرف لفظ''اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ''(میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) سے اشارہ کیا جارہا ہے۔

پانچویں آیت میں بنی اسرائیل کے جدِ اعلیٰ حضرت یعقوبؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب وہ انتہائی تنگی کی حالت میں تھے کہ ایک طرف سے اُن کا عزیز بیٹا یوسفؑ اُن سے بچھڑ چکا تھا، دوسری طرف سے شدید قحط پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے سارا خاندان مشکل میں گرفتار تھا اور وہ اپنے ایک اور عزیز بیٹے بنیامین کو اس کے سنگدل بھائیوں کے ساتھ بھیجنے پر مجبور تھے تاکہ وہ مصر جاکر وہاں سے کچھ غلہ لاسکیں۔

یہاں وہ اپنے بیٹوں کو نصیحت کررہے ہیں کہ:

''تم سب ایک دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا''۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''..... وَمَاۤ اُغۡنِیۡ عَنۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۚ وَعَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ''۔ (یوسف: 67)

''میں اس نصیحت کے ذریعے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی مصیبت کو تم سے نہیں ٹال سکتا، فیصلہ تو صرف اللہ کا چلتا ہے۔ میں نے اُسی پر توکل کیا ہے اور سب توکل کرنے والوں کو اُسی پر توکل کرنا چاہئے''۔

درحقیقت حضرت یعقوبؑ اس نصیحت میں بھی اپنے بیٹوں کو توکل کا درس دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ چونکہ ہر چیز اللہ کے حکم سے ہی وقوع پذیر ہوتی ہے، لہٰذا صرف اُسی پر توکل کرنا چاہئے کیونکہ اُس کے ارادے کے سامنے کسی کا ارادہ مؤثر نہیں ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہاں حکم سے مراد''حکمِ تکوینی'' ہے، نہ کہ حکمِ شریعی۔

چھٹی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا قصہ بیان کیا جارہا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور اپنی صداقت وحقانیت کی دلیل کے طور پر معجزات دِکھائے تو اس کے باوجود اُن کی قوم میں سے ایک گروہِ قلیل ہی

ان پر ایمان لایا اور ان کی حالت بھی یہ تھی کہ فرعون کی طرف سے خوفزدہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ ایمان لانے کے نتیجہ میں فرعون نے اپنی بیوی کو کس قدر اذیت ناک تکالیف پہنچائی تھیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو اپنی بیوی کو کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہ تھا، بنی اسرائیل میں سے چند افراد، جو ایمان لائے تھے، وہ کس طرح اُس سے کسی قسم کی رعایت کی توقع کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں اس وحشت سے نجات دینے اور ان کے دلوں میں اطمینان وسکون پیدا کرنے کیلئے انہیں اللہ پر توکل کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔

"وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ○"

''اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اُس کے حکم کو تسلیم کرتے ہو تو اس پر توکل کرو''۔ (یونس:84)

گویا وہ اپنی قوم کو یہ درس دے رہے ہیں کہ صرف اللہ پر توکل کر کے ہی فرعون جیسے ظالم اور طاقتور حکمران کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ توکل کی صفت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے آگے تھے ورنہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ایک چرواہا جس کے پاس کوئی ظاہری طاقت نہ تھی، اپنے دَور کی طاقتور ترین حکومت سے ٹکر لے سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مومن افراد نے اُن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کہا:

"فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ"

''ہم نے اللہ پر توکل کیا''۔ (یونس:85)

پھر اُنہوں نے اللہ کی بارگاہ میں رجوع کر کے کہا:

"رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ○" (یونس: 85)

''اے ہمارے رب! تو ہمیں ان ظالموں کے ظلم وستم کا نشانہ نہ بننے دے''۔

"وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○" (یونس: 86)

''اور اپنی رحمت سے ہمیں کافروں سے نجات عطا فرما''۔

یہاں فتنہ سے مراد اذیت اور ظلم وستم (torture) ہے جو بعض قرآنی سورتوں میں، جیسا کہ سورۂ بروج میں اصحابِ اخدود کے بارے میں اور سورۂ یوسف کی آیت 83 میں استعمال ہوا ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

یہ احتمال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں مقامات پر فتنہ سے مراد دین کی راہ سے گمراہ ہو جانا ہو، اس لئے کہ اگر فرعون اور اُس کا نظام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف کامیاب ہو جاتا تو وہ اسے اپنے برحق ہونے کی دلیل بنا لیتے اور اپنی گمراہی

میں مزید پختہ ہوجاتے۔

ساتویں آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے دور کی بات ہورہی ہے۔اس دَور میں بنی اسرائیل جالوت نامی ایک ظالم بادشاہ کے محکوم تھے۔انہوں نے مجبور ہوکر اپنے دور کے نبی حضرت سموئیل سے درخواست کی کہ ان کیلئے ایک سپہ سالار مقرر کریں جس کی قیادت میں جنگ کر کے وہ اپنے علاقے جالوت کے قبضے سے آزاد کرواسکیں۔حضرت سموئیل نے طالوت کو، جو ہر لحاظ سے باصلاحیت اور طاقتور جوان تھا، اُن کا سپہ سالار مقرر کیا جسے انہوں نے پس وپیش اور حیل وحجت کے بعد قبول کرلیا۔

اس کے بعد طالوت نے متعدد آزمائشوں کے ذریعے میدانِ جنگ میں لڑنے والے حقیقی جنگجوؤں کا انتخاب کیا۔زیر بحث آیت اس موقعہ کا ذکر کررہی ہے کہ جب جالوت کا بظاہر بڑا اور ہر لحاظ سے طاقتور لشکر اور طالوت کا بظاہر چھوٹا اور کمزور لشکر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔

"وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○"

''جب وہ جالوت کے مدِ مقابل آئے تو اُنہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم پر صبر نازل فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما''۔(بقرہ:250)

بظاہر دونوں لشکروں کے درمیان کوئی توازن نہ تھا لیکن جس چیز نے طاقت کے توازن کو بنی اسرائیل کے چھوٹے اور کمزور لشکر کے حق میں کردیا، وہ اللہ پر اُن کا توکل اور اللہ سے ثابت قدمی اور نصرت کی دُعا تھی۔اسی لئے اگلی آیت میں ہے:

"فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ"(بقرہ: 251)

''انہوں نے اللہ کے حکم سے جالوت کے لشکر کو شکست دے دی''۔

بظاہر بات ہے کہ صبر واستقامت، ثابت قدمی کا سبب اور ثابت قدمی کامیابی کا سبب ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی دعا میں ان تین چیزوں کی درخواست کی اور ان سب باتوں کی روح توکل اور اللہ پر پختہ ایمان ہے۔

آٹھویں آیت میں جنابِ رسولؐ خدا اور انؐ کے مقامِ توکل کا ذکر کیا جارہا ہے۔جب آپ ﷺ کو کفار کی طرف سے سخت ترین حالات کا سامنا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھایا کہ ان حالات میں ان سختیوں پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ"(توبہ: 129)

''پس اے رسولؐ! اگر یہ ایمان لانے کی بجائے رُوگردانی کریں تو (آپ فکرمند نہ ہوں) اور کہیں کہ اللہ میرے

لئے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اُسی پر توکل کیا اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے''۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان جتنا بھی اکیلا ہوجائے۔ اگر وہ اللہ پر توکل رکھتا ہو تو اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی، اس لئے کہ اللہ عرشِ عظیم کا رب اور لامحدود قدرت کا مالک ہے، ایسی قدرت جس کے سامنے انسانوں کی طاقت کی حیثیت ہی کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ اگر اُس کے بندے اس پر توکل کریں تو وہ دشمن کے مقابلے میں انہیں تنہا چھوڑ دے۔

اس آیت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل سرمایہ اللہ پر توکل تھا۔ سورۂ زمر کی آیت 38 میں بھی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا:

"قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ" (زمر: 38)

''اے رسولؐ! کہہ دو اللہ میرے لئے کافی ہے اور توکل کرنے والوں کو اس پر توکل کرنا چاہئے''۔

نویں آیت میں تمام گزشتہ انبیاؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاؑ کے موقف کو ان الفاظ میں بیان فرما رہا ہے:

"وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ"۔ (ابراھیم: 12)

''آخر ہم کیوں اللہ پر توکل نہ کریں جبکہ اسی نے ہمیں (سعادت کی راہ کی) ہدایت کی اور ہم یقیناً تمہاری طرف سے آنے والی تکالیف پر صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے''۔

اس آیت سے یہ بات اچھی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ طاقت فرسا شدائد کے خلاف ہر دور میں توکل انبیاؑ کا ہتھیار تھا اور اُن کی تمام کامیابیاں اسی ایک بات کی مرہونِ منت تھیں ''اللہ کی لامحدود قدرت پر توکل''۔ بڑے بڑے جابر حکمرانوں کی حاکمیت اور طاقت کو ان کی نظر میں پست اور حقیر کر دیتی تھی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت میں کہا گیا ہے: 'وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ'' یعنی توکل کرنے والوں کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے۔ جبکہ سورۂ ابراہیمؑ کی آیت 11 میں ہے:

"وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ"

''مومنین کو اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے''۔

اگر ان دونوں آیات کا حاصل جمع لیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں، وہی حقیقی مومن ہیں اور جو لوگ مومن ہیں، وہ یقیناً اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان دونوں آیات کی رو سے (متوکلون مومنین) ثابت ہوجاتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ توکل اللہ کی معرفت اور اس کی بخشی ہوئی ہدایت کا ثمر ہے جبکہ مشکلات

اور شدائد کے سامنے صبر وثابت قدمی توکل کا ثمر ہے۔

دسویں آیت میں اللہ پر توکل کے واضح نتائج کا ذکر کرتے ہوئے سب کو اللہ پر توکل کی تحریک دی جارہی ہے اور ان سے نجات کو وعدہ کیا جارہا ہے۔اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا"(طلاق:3)

''جواللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کیلئے کافی ہے اور اللہ اپنے کام کو انجام تک ضرور پہنچاتا ہے اور اللہ نے ہر چیز کی مقدار مقرر کررکھی ہے''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سب توکل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی مشکلات کو حل کرے گا۔اس کے بعد اس کی دلیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمارہا ہے کہ وہ ایسا قادر ہے کہ اپنے کام کو اور اپنے حکم کو ضرور انجام تک پہنچاتا ہے۔

اس جملے کے ذریعے اللہ تعالیٰ یہ واضح کررہا ہے کہ اگر اس نے توکل کرنے والوں کی مدد کا وعدہ کیا ہے تو وہ اس وعدے پر عمل کرنے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔

بعد ازاں ''قد جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قدرًا ''یعنی ''اللہ نے ہر چیز کی ایک مقدار مقرر کررکھی ہے''، فرما کر اس سوال کا جواب دے رہا ہے کہ بعض اوقات ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اللہ پر توکل کے باوجود ہمیں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے یا تاخیر سے حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس سوال کا جواب اس طرح دے رہا ہے کہ تم لوگ اُمورِ کائنات اور ان کی مصلحتوں سے آگاہ نہیں ہو جبکہ اللہ کے ہاں ہر معاملہ کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ ہر کام کیلئے مناسب وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر واقعہ مخصوص حالات میں رونما ہوتا ہے۔لہٰذا بعض اوقات اللہ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کوئی کام تاخیر سے ہو، ایسے معاملات میں جلد بازی جائز نہیں ہوتی۔

ایسی ہی بات سورۂ آلِ عمران میں بھی کہی گئی ہے کہ فتح وشکست اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ پر توکل مومنین کیلئے کامیابی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

"اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○"

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں بے یارومددگار چھوڑ دے تو اس کے بعد

کون تمہاری مدد کرے گا؟ اور مومنوں کو اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔" (آل عمران۔160)

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات میں انسانوں کی زندگی، انبیاؑ کے جہاد اور مشکلات پر غلبہ پانے میں توکل کے اہم کردار کو اچھی طرح نمایاں کیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر عدم اعتماد کس حد تک فرد اور معاشرے کی ہلاکت کا سبب ہے۔

توکل احادیث کی روشنی میں

احادیث میں اس اخلاقی فضیلت کی غیر معمولی اہمیت بیان کی گئی ہے اور جس قدر اس کے آثار و برکات کو بیان کیا گیا ہے، شاید کسی اور چیز کے بیان کئے گئے ہوں۔ مندرجہ ذیل روایات احادیث کے گلستان میں سے ایک گلدستہ کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں ایسے دقیق اور لطیف مطالب بیان کئے گئے ہیں جو ہماری بات کا بہترین ثبوت ہیں۔

1۔ جناب رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"مِنْ سَرَّهُ اَنْ يَكُوْنَ اَقْوَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ"۔

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ سب لوگوں سے زیادہ طاقتور ہو، وہ اللہ پر توکل کرے"۔ (کنز العمال، 110:3)

2۔ ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فِي التَّوَكُّلِ حَقِيْقَةُ الْاِيْقَانِ"۔ (غرر الحکم)

"یقین کی حقیقت توکل میں ہے"۔

تفسیر قمی میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کے ذیل میں ایک پر معنی حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کیلئے منجنیق میں رکھا گیا تو اُنؑ کے چچا آزر نے ان کے قریب جا کر ان کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا اور کہا کہ اپنے توحیدی مذہب کو چھوڑ دو (مگر حضرت ابراہیمؑ نے کوئی توجہ نہیں کی)۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو یہ منظر دیکھنے کے لئے دنیا کے آسمان پر جانے کا حکم دیا۔ اس وقت کائنات کی ہر چیز نے اللہ سے دعا کی کہ ابراہیمؑ کو نجات دے۔ زمین نے کہا: "یا اللہ! اس وقت میری پشت پر ابراہیمؑ کے علاوہ کوئی موحد نہیں ہے اور اب اسے بھی آگ میں ڈالا جا رہا ہے"۔ اللہ نے کہا: "اگر وہ مجھے پکارے تو میں ضرور اس کی مشکل کو حل کروں گا۔ اس وقت جبرائیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس گئے اور کہا: ابراہیمؑ! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ ابراہیمؑ نے جواب دیا: مجھے تمہاری مدد نہیں، اللہ کی مدد درکار ہے۔ اس موقع پر جبرائیلؑ نے ایک انگوٹھی حضرت ابراہیمؑ کو دی جس پر لکھا تھا:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. اَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ اِلَی اللّٰهِ. اَسْنَدْتُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ. وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ"۔

''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ، میں نے اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیا، میں نے اپنا معاملہ اللہ سے منسوب کر دیا اور میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا''۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھنکا گیا تو اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیمؑ کیلئے ٹھنڈی ہو جا۔ اس پر سردی کی شدت سے ابراہیمؑ کے دانت بجنے لگ گئے۔ پھر اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیمؑ کیلئے سلامتی بن جا۔ آگ حضرت ابراہیمؑ کیلئے سرد اور سلامتی بن گئی اور ابراہیمؑ اور جبرائیل وہاں باتیں کر رہے تھے۔

نمرود ایک بلند مقام سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جب یہ دیکھا تو کہا: اگر کوئی کسی خدا کو اپنانا چاہے تو اسے چاہے کہ ابراہیمؑ کے خدا جیسا خدا اپنائے۔

اللہ پر توکل آگ کو انسان کیلئے گلزار بنا دیتی ہے۔ ایسا ابراہیمی توکل میں جس میں وہ جبرائیل سے مدد مانگنے کو اللہ سے دُوری تصور کرتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ پانی اُس مقام سے حاصل کرنا چاہئے جہاں سے چشمہ شروع ہو رہا ہو۔ (تفسیر قمی، 72:2)

3۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْغِنٰی وَالْعِزَّ یَجُوْلَانِ فَاِذَا ظَفَرَا بِمَوْضِعِ التَّوَکُّلِ اَوْطَنَاهُ"۔ (کافی، 65:2)

''بے نیازی اور عزت حرکت میں رہتی ہیں، جہاں توکل دیکھتی ہیں، وہاں ڈیرہ ڈال دیتی ہیں''۔

اس حدیث میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جس دل میں توکل موجود ہے، وہی اپنے آپ کو غیر اللہ سے بے نیاز محسوس کرتا ہے اور اُسی کو عزت عطا ہوتی ہے، اس لئے کہ اُس نے ایک ایسی ذات پر بھروسہ کیا ہے جو عزت اور بے نیازی کا سرچشمہ ہے۔

4۔ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ لطیف پیرائے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰهِ لَا یُغْلَبُ وَمَنِ اعْتَصَمَ بِاللّٰهِ لَا یُهْزَمُ"۔

''جو اللہ پر توکل کرے، وہ مغلوب نہیں ہوتا اور جو اللہ کا سہارا لے، وہ شکست نہیں کھاتا''۔

(میزان الحکمہ، 4۔ حدیث: 22547)

6۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰهِ ذَلَّتْ لَهُ الصِّعَابُ وَتَسَهَّلَتْ عَلَیْهِ الْاَسْبَابُ"۔

''جو اللہ پر توکل کرتا ہے، مشکلات اُس کے سامنے عاجز ہو جاتی ہیں اور اسباب اُس کیلئے آسان ہو جاتے

ہیں"۔(غررالحکم:9028)

ظاہرسی بات ہے کہ اگر مسبب الاسباب ذات پرتوکل کیا جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوگا،اس لئے کہ ہر چیز اس کے حکم کے آگے سرتسلیم خم کئے ہے ہے۔

7۔ ایک حدیث میں آپؑ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہیں کہ توکل صرف بیرونی اسباب پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ انسان کے اندر بھی مثبت اثر ڈالتا ہے اور اسے وسوسوں اور شکوک وشبہات سے نجات دلاتا ہے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"مَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللهِ اَضَائَتْ لَهُ الشُّبَهَاتُ"۔(غرر الحکم:8985)

8۔ امیرالمومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:(بحارالانوار،265:55)

"يَاَيُّهَا النَّاسُ تَوَكَّلُوْ عَلَى اللهِ وَاتَّقُوْا بِهٖ فَاِنَّهُ يَكْفِيْ مِمَّنْ سِوَاهُ۔"

"اے لوگو!اللہ پرتوکل کرواوراس سے ڈرتے رہو کیونکہ وہ دُوسروں سے بے نیاز کردیتا ہے"۔

9۔ جابر بن یزید جعفی کہتے ہیں کہ میں اٹھارہ سال حضرت امام محمد باقرؑ کی خدمت میں رہا۔آپؑ نے مجھے کہا کہ اے جابر! ہمارے شیعوں کو میرا سلام پہنچادو اوران سے کہو کہ ہمارے اوراللہ کے درمیان کوئی ایسی رشتہ داری نہیں ہے جونجات کا سبب ہو،نجات کا ذریعہ اس کا قرب اوراس کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں۔

پھرآپؑ نے فرمایا:

"يَاجَابِرُ مَنْ هٰذَا الَّذِيْ سَئَلَ اللهَ فَلَمْ يُعْطِهِ؟ اَوْتَوَكَّلَ عَلَيْهِ وَلَمْ يَكْفِهِ؟ اَوْ وَثَقَ بِهٖ فَلَمْ يُنْجِهِ"۔

"اے جابر! وہ کونسا انسان ہے جس نے اللہ سے مانگا اوراللہ نے اسے نہ دیا یا اس پرتوکل کیا اوراس نے اس کا کام نہ بنایا؟ یا اس پر اعتماد کیا اوراس نے اسے نجات نہ دی؟"

اس حدیث میں اللہ پرتوکل،اس کے ذات پر اعتماد اوراس سے دعا کو کامیابی کے تین وسائل قرار دیا گیا ہے۔

10۔ توکل اورانسان کی مادی ومعنوی زندگی پر اس کے اثرات کے بارے میں گفتگو کی گنجائش تو بہت زیادہ ہے مگر ہم اس بحث کو لقمان حکیم کے اس حکیمانہ بیان پر ختم کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

"يَابُنَيَّ! تَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ثُمَّ سَلْ فِي النَّاسِ مَنْ ذَا الَّذِيْ تَوَكَّلَ عَلَى اللهِ فَلَمْ يَكْفِهٖ"۔

(میزان الحکمہ:4۔ حدیث:22661)

''اے بیٹا! اللہ پرتوکل کرو اور پھر لوگوں میں جا کر پوچھو کہ کون ہے جس نے اللہ پرتوکل کیا ہو اور اللہ نے اس کا کام نہ بنایا ہو!''

توکل کی فضیلت اور عظمت ان احادیث کی روشنی میں اس قدر واضح وآشکار ہے کہ اسے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے برعکس اللہ پرتوکل نہ کرنا اور مخلوق کا سہارا تلاش کرنا ایک ایسی صفتِ رذیلہ ہے جو انسان کو ذِلت ورُسوائی اور ناکامی ونامرادی کی پستیوں میں گرادیتی ہے۔

توکل کی حقیقت:۔

جیسا کہ بحث کے آغاز میں بیان ہوا کہ توکل کا مصدر وکالت ہے جس کے معنی ہیں اپنے کام اللہ کے سپرد کرنا اور اس پر اعتماد کرنا۔لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انسان کام اور کوشش کو ترک کردے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ انسان کے بس میں ہے، اس حدتک اپنی پوری کوشش کرے اور کسی بھی کام کو انجام دینے کے مختلف مراحل کو انجام دیتا رہے اور جو کچھ اس کے بس میں نہیں، وہاں معاملہ اللہ کے سپرد کردے اور اس کے الطافِ خفیہ وجلیہ کے ذریعے اس سے مدد مانگے۔

علمِ اخلاق کے ایک معروف عالم نے توکل کی تفسیر میں کہا ہے:

''توکل، ایمانی منازل میں سے ایک منزل اور اہلِ یقین کے درجات میں سے ایک درجہ ہے، ایسا درجہ جو مقربین سے مخصوص ہے، جو مفہوم کے لحاظ سے پیچیدہ اور عمل کے لحاظ سے سنگین ہے''۔

اس مفہوم کے پیچیدہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ عالمِ اسباب پر اعتماد کرنا ایک قسم کا شرک ہے اور اسباب سے غفلت اور بے اعتنائی برتنا شریعت میں ممنوع ہے بلکہ شریعت نے ان کے طرف راغب بھی کیا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں: ''شریعتِ اسلامی میں جس توکل کا حکم دیا گیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر کام میں قلبی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر رکھے اور یہ حصول اسباب کے خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ انسان اسباب کو اپنی کامیابی اور حصولِ مقصد کا بنیادی سبب نہ سمجھے۔''

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں: ''جیسا کہ نادان لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، توکل کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان تدبیر وعمل کو جو ترک کردے۔ یہ محض جاہلانہ تصور ہے جو شریعتِ اسلامی میں حرام ہے۔انسان پر فرض ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کرتے ہوئے زراعت، تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ کے ذریعے کسبِ معاش کیلئے عمل کرے.....اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اسباب پر بھروسہ نہ کیا جائے اور ان میں غرق نہ

ہوا جائے‘‘(اخلاقِ شبر:ص275)

المحجۃ البیضاء میں حقیقت توکل کے مبحث میں ہے:

’’توکل ایمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور ایمان کے تمام دروازوں کے تین رُکن ہیں: علم، حالت، اور عمل۔ علم کی حیثیت بنیاد اور جڑ جیسی ہے۔ توکل پر مبنی اعمال پھل کی حیثیت رکھتے ہیں اور باطنی حالت توکل کے مفہوم کی مصداق ہوتی ہے‘‘۔

اس کے بعد وہ اس علم کی تشریح کرتے ہیں جو توکل کی بنیاد اور جڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور توحید کے مراحل کی وضاحت کرتے ہیں جو توحید کی اساس اور جڑ کی تشکیل کرتے ہیں۔ پھر وہ اس طویل بحث کے بعد حقیقتِ توکل کے بارے میں کہتے ہیں کہ توکل درحقیقت وکیل (یعنی اللہ تعالیٰ) پر مکمل قلبی اعتماد کا نام ہے۔

مختصر یہ کہ توکل کا مفہوم بہت لطیف اور دقیق ہے، اس لئے اس میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اسباب کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر اعتماد نہ کیا جائے اور غیر اللہ پر قلبی انحصار سے، جو ایک قسم کا شرک ہے، اپنے آپ کو آلودہ نہ کیا جائے۔

انسان کیلئے ضروری ہے کہ حصولِ مقصد کیلئے تمام مادی وسائل کو بروئے کار لائے اور تمام رُکاوٹوں کو دُور کرنے کی پوری کوشش کرے مگر اس کے باوجود اس کی قلبی حالت یہ ہو کہ نتائج کیلئے اس کی نظر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لطف پر ہو اور وہ نتائج اور کامیابی کو صرف اور صرف اللہ کا عطیہ سمجھے، اسباب کا کرشمہ نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل سے پوچھا:

"مَالتَّوَكُّلُ عَلَى عَزَّوَجَلَّ..... اَلْعِلْمُ بِاَنَّ الْمَخْلُوْقَ لَايَضُرُّوَلَايَنْفَعُ وَلَاعُطِيَ وَلَايَمْنَعُ وَاِسْتِعْمَالُ الْيَاسِ مِنَ الْخَلْقِ"۔ (بحار الانوار، 138:68)

’’اللہ پر توکل کیا ہے؟ جواب دیا: توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم ہو کہ مخلوق کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتی، مخلوق کسی کو کوئی چیز نہیں دے سکتی اور کسی سے کوئی چیز نہیں روک سکتی اور یہ کہ انسان لوگوں سے مکمل طور پر مایوس ہو جائے‘‘۔

اس کے بعد جبرائیلؑ نے مزید کہا:

"فَاِذَا كَانَ الْعَبْدُ كَذٰلِكَ لَمْ تَعْمَلْ لِاَحَدٍسِوَى اللهِ وَلَمْ يَرْجُ وَلَمْ يَخَفْ سَوَى اللهِ، وَلَمْ يَطْمَعْ فِيْ اَحَدٍسِوَى اللهِ، فَهٰذَا هُوَ التَّوَكُّلُ"۔ (بحار الانوار، 138:68)

’’جب بندہ اس منزل پر پہنچ جائے تو وہ اللہ کے علاوہ کسی کے لئے کوئی عمل انجام نہیں دیتا، اور اللہ کے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور کسی حال میں اللہ کے سوا کسی سے دل نہیں لگاتا، یہ ہے توکل کی حقیقت!‘‘

ایک اور حدیث میں ہے امامِ معصومؑ سے پوچھا گیا کہ توکل کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

"لَا تَخَافُ سِوَاهُ۔"

یعنی ''توکل یہ ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔'' (بحارالانوار، 143:48)

ان تمام احادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ توکل کی روح یہ ہے کہ انسان کا سارا انحصار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔ جس شخص میں یہ حالت نہ پائی جائے، وہ توکل کی حقیقت پر فائز نہیں ہوا ہے۔

توکل کی اہمیت کے ساتھ ساتھ احادیث میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ انسان اسباب سے غفلت نہ کرے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص اپنا اُونٹ کھلا چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اُس سے پوچھا تو اُس نے کہا:

"تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ"۔

''میں نے اللہ پر توکل کیا''۔

آپؐ نے فرمایا:

"اِعقِلْهَا وَتَوَكَّلْ"۔

''اس کا زانو باندھ لو اور توکل کرو''۔ (الحجۃ البیضاء، 426:7)

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ایسی عبارات سے پُر ہیں جن میں مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ حتی الامکان مادی وسائل سے ضرور استفادہ کریں۔ دُشمن کے مقابلہ کیلئے تیار رہنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّاللهِ وَعَدُوَّكُمْ" (انفال:60)

''ان کا مقابلہ کرنے کیلئے جہاں تک کرسکو، قوت حاصل کرو، ایسے تربیت یافتہ گھوڑے جن کے ذریعے تم اللہ کے دُشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کرسکو''۔

نمازِ خوف کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میدانِ جنگ میں نماز ادا کرتے وقت اپنا اسلحہ اپنے ساتھ اُٹھائے رکھو۔

"وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ○" (نسأ:102)

جب اللہ تعالیٰ عین حالتِ نماز میں مادی اسباب و وسائل سے غفلت کی اجازت نہیں دیتا تو عام حالات میں اس کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے۔ بنابرایں اسباب و وسائل سے استفادہ توکل کے منافی نہیں ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کرنے لگے تو آپؐ تدبیر (planning) کے بغیر توکل علی اللہ کہہ کر گھر سے نہیں نکل پڑے۔ آپؐ نے دشمن کو غافل کرنے کیلئے ایک طرف سے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سوجانے کا حکم دیا اور دوسری طرف سے خود رات کی تاریکی میں پنہاں ہو کر مکہ سے باہر تشریف لے گئے۔ آپؐ سیدھے مدینہ کی طرف جانے کی بجائے، جو شمال کی سمت میں تھا، جنوب کی سمت میں جا کر چند روز غارِ ثور میں روپوش رہے، یہاں تک کہ جب دُشمن آپؐ کی تلاش میں مایوس ہو گئے تو آپؐ مکہ کا چکر کاٹ کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ اس کے باوجود آپؐ راتکی تاریکی میں سفر کرتے تھے اور دن کو روپوش ہو جاتے تھے۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کس کا دل نورِ توکل سے منور ہوگا! اس کے باوجود آپؐ نے اسباب و تدبیر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اصولی طور پر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی یہ ہے کہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اسباب اور وسائل کی مدد حاصل کریں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک مشہور و معروف حدیث میں ہے:

"اَبَی اللّٰہُ اَنْ یَجْرِیَ الْاَشْیَاءَ اِلَّا بِاَسْبَابٍ فَجَعَلَ لِکُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا"۔

''اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ ہر کام سبب کی بنیاد پر انجام پائے اور اُس نے ہر چیز کا ایک سبب مقرر کر رکھا ہے''۔ (اصولِ کافی، 138:1)

بنابرایں عالمِ اسباب سے بے اعتنائی نہ صرف یہ کہ توکل نہیں ہے بلکہ سنتِ الٰہی سے بے اعتنائی ہے جو رُوحِ توکل کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

ہم اس بحث کو حضرت موسیٰ ؑ کے دور سے متعلق ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیمار ہو گئے۔ بنی اسرائیل ان کی عیادت کو گئے۔ انہوں نے ان کی بیماری کی تشخیص کر لی اور کہا کہ اگر آپؑ فلاں دوائی استعمال کریں تو صحت یاب ہو جائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں کوئی دوائی استعمال نہیں کروں گا۔ اللہ مجھے دوائی کے بغیر اچھا کر دے گا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری بڑھ گئی۔ لوگ پھر ان کے پاس گئے کہ یہ دوائی اس بیماری کی مجرب دوا ہے۔ ہم اسی سے اس بیماری کا علاج کرتے ہیں اور ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا کہ میں دوائی استعمال نہیں کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ میری عزت اور میرے جلال کی قسم! میں تجھے اس وقت تک صحت نہیں دوں گا جب تک وہ دوائی استعمال نہ کرے جو لوگوں نے تجھے بتائی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوائی استعمال کی اور صحت مند ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو گیا کہ اللہ نے توکل کی بنیاد پر مجھے کیوں شفا نہ دی؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تم یہ چاہتے تھے کہ توکل کے ذریعہ میری حکمت کو باطل کر دو، کیا دواؤں کے اندر شفا بخش اثرات میرے سوا کسی اور نے رکھے ہیں؟ (الحجۃ البیضاء، 432:7)

اس حدیث سے توکل کی حقیقت واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی مدد کی پیشکش کی تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ صرف اللہ پر توکل کیا۔ کیا ان کا واقعہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے؟ جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ایسی صورت حال میں گرفتار ہو چکے تھے۔ جب طبیعی اسباب کو کام میں لانا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔ ان کیلئے ایک ہی راستہ باقی تھا کہ وہ عالمِ اسباب اور عالمِ طبیعت سے ماورا کسی سے مدد طلب کریں۔ یہاں اُنہوں نے فرشتوں کی مدد قبول کرنے سے انکار کیا کیونکہ فرشتے طبیعی اسباب نہیں تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ پسند نہیں کیا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کریں جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے طبیعی اسباب و وسائل کا راستہ مکمل طور پر کھلا تھا۔

توکل کے آثار و نتائج:۔

متوکل اپنے اُمور اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ اللہ جو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے، جو ہر چیز کے بارے میں مکمل علم و آگہی رکھتا ہے، جس کیلئے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا توکل کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توکل کرنے والے کے اندر ایک زبردست اعتماد پیدا ہو جاتا ہے اور مشکلات کے مقابلے میں بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی میدانِ جنگ میں ایک طاقتور دشمن کو اپنے سامنے پائے تو اس کی ہمت جواب دے جائے گی لیکن اگر اسے یہ بتا دیا جائے کہ تمہارے پیچھے تمہاری مدد کیلئے ایک طاقتور لشکر موجود ہے تو اس کے اندر جرأت اور اعتماد پیدا ہو جائے گا۔ اگر انسان کو یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت اس کی حامی و مددگار ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ کمزوری اور تنہائی کے احساس کو قریب آنے دے۔ ایک دُعا میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کَیْفَ اَخَافُ وَاَنْتَ اَمَلِیْ وَ کَیْفَ اُضَامُ وَاَنْتَ مُتَّکَلِیْ"۔

''پروردگار! میں کیسے ڈروں، جب میری اُمید تو ہے اور کیسے ممکن ہے کہ میں شکست کھا جاؤں جبکہ میرا سہارا تو ہے''۔ (بحار الانوار، 229:91)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَی اللّٰہِ لَا یُغْلَبُ، وَمَنْ اِعْتَصَمَ بِاللّٰہِ لَا یُھْزَمُ"۔

''جو اللہ پر توکل کرے، وہ مغلوب نہیں ہوتا اور جو اللہ کو سہارا بنائے، وہ شکست نہیں کھاتا'' (میزان الحکمہ، ج 4، ص 3659، حدیث: 22547)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث پہلے بیان ہو چکی ہے کہ بے نیازی اور عزت حرکت میں رہتے ہیں، جہاں توکل کو دیکھتے ہیں، وہاں ڈیرہ ڈال دیتے ہیں۔

ان باتوں سے بڑھ کر توکل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان حرص، بخل، حسد، دُنیا پرستی اور تنگ نظری جیسی صفاتِ رذیلہ سے پاک

ہوجاتا ہے۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب انسان قادرِ مطلق پر بھروسہ کرلیتا ہے تو پھران پست صفات کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

جب انسان اس آیۂ شریفہ:

"وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط"

''اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کیلئے کافی ہے''۔(طلاق:3)

کا ورد کرتا ہے تو کامیابی اور بے نیازی کے احسانات سے لبریز ہوجاتا ہے اور اس کے پاس کامیابی کے امکانات بہت زیادہ ہوجاتے ہیں۔بعض دُعاؤں میں آیا ہے۔

"اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْیَقِیْنِ وَاکْفِنِیْ بِالتَّوَکُّلِ عَلَیْكَ"۔

''یا اللہ! مجھے اپنی ذاتِ بابرکات پر یقین کی بدولت غنی کردے اور اپنے اوپر توکل کی برکت سے میرا کام بنادے''۔(بحارالانوار:14:87)

اللہ تعالیٰ پر توکل انسان کے دل کو اُمید سے بھر دیتا ہے اور اس کی بدولت انسان کی توانائی اور صلاحیت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔تھکن اس پر غالب نہیں آتی اور وہ ہر حال میں مطمئن ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

"لَیْسَ لِمُتَوَکِّلٍ عَنَاءٌ"۔

''متوکل کبھی تھکتا نہیں ہے''۔(شرح غررالحکم،72:5)

توکل سے انسان کی ذہانت اور فکری صلاحیتوں کو نشوونما ملتی ہے اور اس میں ایک خاص بصیرت پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے کہ توکل کی بدولت مشکلات اور مصائب میں انسان حواس باختہ اور وحشت زدہ نہیں ہوتا بلکہ پرسکون رہتا ہے اور مشکلات کے باوجود اُس کی صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت محفوظ رہتی ہے۔

یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

"مَنْ تَوَکَّلَ عَلَى اللّٰهِ اَضَائَتْ لَهُ الشُّبَهَاتِ وَکَفَى الْمَؤُوْنَاتِ وَاَمِنَ التَّبِعَاتِ"۔(شرح غررالحکم، 414:5)

''جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے، شبہات کی تاریکیوں میں اسے روشنی مل جاتی ہے، اسے کامیابی کے اسباب میسر ہو جاتے ہیں اور وہ سختیوں سے نجات پالیتا ہے''۔

توکل کے اسباب:۔

دیگر اخلاقی فضائل کی طرح توکل کے بھی متعدد سرچشمے ہیں لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ توکل کا عمدہ ترین سبب اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفاتِ جلال و جمال پر ایمان اور یقین ہے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کے بارے میں علم الیقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور کائنات کی ہر چیز کو اس کا محتاج پاتا ہے اور:

"لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہ"۔

''اللہ کے سوا کائنات میں کوئی مؤثر طاقت نہیں ہے۔''

کے مفہوم سے آگہی حاصل کر لیتا ہے، اپنی رُوح، جان اور دِل کو بھی اس کے زیر اختیار سمجھ لیتا ہے، ساری کائنات کو اللہ تعالیٰ کے الطافِ بیکراں کی تجلی گاہ سمجھتا ہے تو اُس کے دل میں بھی یقیناً توکل کا نور جگمگانے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی کمی بیشی میں اُس کے لطف و کرم کے زیر سایہ پناہ حاصل کرتا ہے اور اپنی تمام سرگرمیوں اور محنت و کوشش کے باوجود کامیابی کیلئے اللہ تعالیٰ پر انحصار کرتا ہے۔

بالفاظِ دیگر توکل کے درخت کے نورانی پھل کو ''توحید افعالی'' کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ وہی شجرۂ طیبہ ہے جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان میں ہیں جس کا پھل ہر موسم میں اس کی شاخوں پر لگتا ہے جن میں سے سب سے اہم پھل توکل ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث میں بھی اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سات مقامات پر یہ جملہ موجود ہے:

"وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ"۔

یعنی ''مؤمنین کو صرف اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے''۔

اس جملے سے ایمان اور توکل کا باہمی تعلق بخوبی واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلتَّوَکُّلُ مِنْ قُوَّۃِ الْیَقِیْنِ"۔

''توکل یقین کی قوت سے پیدا ہوتا ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 669)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَقْوَی النَّاسِ اِیْمَاناً اَکْثَرُھُمْ تَوَکُّلًا عَلَی اللّٰہِ سُبْحَانَہٗ"۔ (غرر الحکم: 3150)

''اللہ تعالیٰ پر جس کا ایمان سب سے زیادہ ہے، اُس کا توکل بھی سب سے زیادہ ہے''۔

اصبغ بن نباتہ اصحابِ امیر المومنین علیہ السلام میں سے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سجدہ میں کہا کرتے تھے:

"وَاَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ مَنْ يَعْلَمُ اَنَّكَ عَلٰى شَيْءٍ قَدِيْرٍ"۔ (بحار، 227:83)

''یا اللہ! میں تجھ پر اُس شخص کی طرح توکل کرتا ہوں جو یہ جانتا ہے کہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ عام طور پر ڈرپوک اور بزدل افراد توکل کی دولت سے بے نصیب ہوتے ہیں، اس لئے کہ توکل کا نور انسان کے اندر سے خوف اور بزدلی کی تاریکی کو نکال باہر کرتا ہے۔ اگر اس مسئلہ کی موشگافی کریں تو یہاں بھی بات ایمان اور یقین تک پہنچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس لئے کہ جس قدر انسان کا ایمان اور یقین پختہ ہوگا، اسی قدر اس کا توکل زیادہ ہوگا۔

یہ نکتہ بھی ضرور مدِ نظر رہے کہ توکل کے مثبت نتائج پر غور کرنا اور توکل کرنے والوں کے حالات کا مطالعہ کرنا بھی انسان کے اندر توکل کی روح کو طاقتور اور اس شجرۂ طیبہ کو زیادہ بارآور کرتا ہے۔

توکل کے درجات:۔

گزشتہ بحث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بعض لوگوں میں توکل کمزور اور بعض میں مضبوط کیوں ہوتا ہے، جب یہ بات طے ہوگئی کہ توکل ایمان سے پیدا ہوتا ہے تو یہ بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان جس قدر پختہ ہوگا، توکل بھی اُتنا ہی زیادہ ہوگا۔ غیر معمولی توکل غیر معمولی ایمان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شبِ ہجرت امیر المومنین علیہ السلام کا توکل اس لحاظ سے عجیب اور بے مثال تھا۔ اگر انسان کا ایمان درمیانے یا کمزور درجے کا ہو تو اس کا توکل بھی ویسا ہی ہوگا۔

کسی شخص نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا کہ ''وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ'' کے کیا معنی ہیں؟ آپؑ نے فرمایا:

"لَلتَّوَكُّلِ دَرَجَاتٌ..... مِنْهَا اَنْ تَثِقَ بِهٖ فِيْ اَمْرِكَ كُلِّهٖ فِيْ مَافَعَلَ بِكَ فَمَافَعَلَ بِكَ دُكُنْتَ رَاضِيًا وَتَعْلَمَ اَنَّهٗ لَمْ يَأْلُكَ خَيْرًا وَنَظَرًا، وَتَعْلَمَ اَنَّ الْحُكْمَ فِيْ ذٰلِكَ لَهٗ، فَتَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ بِتَفْوِيْضِ ذٰلِكَ اِلَيْهِ"۔

(بحار انوار، 336:75)

''توکل کے مختلف درجات ہیں..... ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم اپنے تمام اُمور میں اللہ پر اعتماد کرو اور پھر جو کچھ بھی وہ کردے، اُس پر راضی رہو اور اطمینان رکھو کہ تمہاری سرپرستی اور بھلائی میں اُس نے کوئی کوتاہی نہیں کی، نیز یہ بھی جان رکھو کہ تمام معاملات میں حاکمیت کا حق صرف اُس کا ہے۔ پس اپنے تمام

معاملات اُس کے سپرد کر کے اس پر توکل کرو‘‘۔

علمِ اخلاق کے بعض بزرگ علمانے توکل کے تین درجات بیان کیے ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ پر انسان کا ایمان اور اطمینان اُس شخص کی طرح سے ہو جس کا کوئی قابل اور مہربان وکیل ہو اور وہ اپنا کام اُس کے سپرد کر دے۔ یہ توکل کا کمزور ترین درجہ ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ پر اُس کا اعتماد ایسا ہو جیسا ایک بچے کا اپنی ماں پر ہوتا ہے۔ بچہ ابتدائے طفولیت میں ماں کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا، جیسے ہی اسے اپنی ماں نظر آتی ہے، فوراً اس سے لپٹ جاتا ہے۔ ماں کی عدم موجودگی میں اسے کوئی بھی حادثہ پیش آجائے تو وہ فوراً ماں کو پکارتا ہے۔

یقیناً یہ توکل کا بلند تر درجہ ہے جس میں انسان خود کو اللہ تعالیٰ کی عنایات اور رحمتوں کے سمندر میں غرق پاتا ہے۔ اس کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اور اس کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔

3۔ توکل کا یہ درجہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ کے سامنے انسان کا کوئی ارادہ بھی نہ ہو، جو اللہ چاہے، وہی یہ چاہے اور جو وہ نہ چاہے، یہ بھی نہ چاہے۔

علمائے علمِ اخلاق نے حضرت ابراہیمؑ کے توکل کو اسی درجہ کا توکل قرار دیا ہے کہ جب اُنہیں آگ میں پھینکا جا رہا تھا تو اُنہوں نے فرشتوں سے مدد نہیں مانگی اور جب فرشتوں نے اُن سے کہا کہ اللہ سے دعا کریں تو اُنہوں نے کہا کہ وہ میرے حال کو بخوبی جانتا ہے۔ لہٰذا مجھے اس سے سوال کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

توکل کا یہ درجہ عوام میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ یہ صدیقین کا مقام ہے۔ یہ درجہ اُن لوگوں کیلئے مخصوص ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے مکمل فنا کی حالت میں اور اُس کے جلال و جمال کے مشاہدے میں محو ہیں (تلخیص از معراج السعادۃ)

توکل تک پہنچنے کے راستے:۔

علمائے علم اخلاق نے توکل کی منزل تک پہنچنے کی متعدد راہیں تجویز کی ہیں جن میں سے ہر ایک اس اخلاقی فضیلت کے حصول میں معاون ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان توحیدِ افعالی پر پختہ ایمان رکھے اور اس بات پر یقین رکھے کہ اس کائنات کی ہر چیز کا مصدر وہی ذاتِ مقدس ہے، وہی مسبب الاسباب ہے اور ہر سبب اُسی کے حکم سے اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اور تمام موجودات اس کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہو رہے ہیں۔

ان اُمور میں غور و فکر اور اپنے گزشتہ حالات کا مطالعہ کرنے سے انسان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے ہمیں نیستی سے نکال کر وجود کا لباس پہنایا، رحمِ مادر میں ’’تین تاریکیوں‘‘ میں، جہاں کسی کی دسترس ممکن نہیں ہے، تو یہ اللہ کا لطف و کرم

ہی تھا جس نے اس کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔

اس دُنیا میں آجانے کے بعد خوشگوار اور لذیذ شیرِ مادر سے لے کر تمام عزیزوں کی محبتیں تک اُس نے فراہم کیں۔ اُسے ماں کی چھاتی سے دُودھ چوسنا سکھایا اور کس طرح اس کے جذبات واحساسات کو اُبھار کر ان سے کام لیتا ہے اور ماں ان تمام مادرانہ فرائض کو انجام دینے میں ذرا بھی نہیں تھکاوٹ محسوس کرتی۔

جب بچہ تھوڑا سا بڑا ہوتا ہے تو زمین وآسمان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس پر برسنے لگتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں الطاف کے سمندر میں غرق ہوجاتا ہے۔

جب انسان ان اُمور پر غور وفکر کرتا ہے تو اُسے یقین ہوجاتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور صرف اُسی پر توکل کرنا چاہئے، اس لئے کہ:

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (یونس: 107)

''اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتا ہے تو کوئی اس کو برطرف نہیں کرسکتا اور اگر وہ تمہیں خیر سے بہرہ مند کرنے کا ارادہ کرے تو کوئی اُس کے فضل کو روکنے والا نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ غفور ورحیم ہے۔''

جب انسان حقائق پر توجہ کرتا ہے تو وہ توکل کی حقیقت کے نزدیک ہوجاتا ہے اور متوکلین کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

گیارہواں باب

شہوت پرستی

تمہید:۔

لغوی اعتبار سے لفظِ شہوت کا اطلاق تمام مادی اور شہوانی خواہشات اور لذتوں پر ہوتا ہے۔بعض اوقات کسی مادی چیز کی شدید خواہش پر بھی شہوت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

عام مفہوم کے علاوہ شہوت کا لفظ ''جنسی شہوت'' کے مخصوص معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن مجید میں یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس بحث میں ہم اس کے خاص مفہوم یعنی جنسی شہوت کے بارے میں گفتگو کریں گے۔اس لئے کہ اس کے منفی اور مخرب اثرات دیگر تمام مادی خواہشات اور شہوات سے زیادہ ہیں۔

شہوت کا متضاد عفت ہے۔عفت بھی عام اور خاص معنی رکھتا ہے۔اس کے عام معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کی مادی لذت میں زیادہ روی سے اجتناب کیا جائے اور اس کے خاص معنی جنسی بے راہ روی سے اجتناب کرنا ہے۔

عفت ایک اہم اخلاقی فضیلت ہے جو انسانی معاشرے کی پیش رفت اور ارتقاء میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے جبکہ شہوت فرد اور معاشرے کے زوال اور بربادی کا ذریعہ ہے۔

تاریخی حقائق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جن افراد یا معاشروں میں عفت کا کردار نمایاں ہوتا ہے، وہ اپنی اور اپنے معاشرے کی ترقی و پیشرفت کیلئے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بہترین انداز میں بروئے کار لاتے ہیں اور اطمینان وسکون کی ایک اعلیٰ منزل پر زندگی گزارتے ہیں۔اس کے برعکس وہ معاشرے اور افراد جو شہوت پرستی میں ڈوبے ہوتے ہیں، وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کو برباد کردیتے ہیں اور بربادی کے گڑھے کے کنارے تک جا پہنچتے ہیں۔

قانون دانوں کا نظریہ ہے کہ جنسی شہوت کا جرائم کے ارتکاب میں بہت اہم کردار ہوتا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی طرح جنسی شہوت کا ہاتھ نہ ہو۔

اگرچہ یہ بات مبالغہ آمیز ہوسکتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی برائیاں اور خرابیاں جنسی شہوت سے جنم لیتی ہیں۔بہت سے قتل، وسیع پیمانے پر ہونے والی خونریزیاں، ڈاکے، غارت گری جیسی خرابیوں کی وجہ یہی جنسی شہوت ہوتی ہے۔حسین اور چالاک جاسوس عورتیں اسی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ممالک کے پوشیدہ راز چرانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں جن کا نقصان پوری قوم کو اُٹھانا پڑتا ہے۔اسی کمزوری کی وجہ سے بہت سے معززین کی عزت برباد ہوجاتی ہے۔

آیاتِ قرآن اور احادیثِ اسلامی میں جنسی شہوت شیطان کا ایک اہم ہتھیار ہے۔ قرآن مجید میں بھی مختلف مقامات پر عفت اور شہوت کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم ذیل میں مطالعہ کرتے ہیں:

1۔ "فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ۙ"

''پھر ان کے بعد نااہل اولاد ان کی جانشین ہوگئی جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور اپنی شہوت کی پیروی کی، جلد ہی وہ اپنی گمراہی کی سزا کا سامنا کریں گے۔ سوائے اُن کے جنہوں نے توبہ کی، ایمان لائے اور عملِ صالح انجام دیتے رہے۔ یہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔'' (مریم:59اور60)

2۔ "وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ ۟ وَيُرِيۡدُ الَّذِيۡنَ يَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوٰتِ اَنۡ تَمِيۡلُوۡا مَيۡلًا عَظِيۡمًا ۙ"(نسأ: 27)

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں معاف کرے اور جو لوگ شہوات کی پیروی کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم مکمل طور پر گمراہ ہو جاؤ''۔

3۔ "وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ ۖ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ اَئِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ وَتَقۡطَعُوۡنَ السَّبِيۡلَ ۙ وَتَاۡتُوۡنَ فِىۡ نَادِيۡكُمُ الۡمُنۡكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوۡمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۞"(عنکبوت 28اور29)

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہوئے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی۔ تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور نسل انسانی کی بقا کا راستہ روکتے ہو اور اپنی محفلوں میں برے اعمال انجام دیتے ہو۔ لیکن اُن کی قوم کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب لا کر دکھاؤ''۔

4۔ "وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِىۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوۡمٌ عَصِيۡبٌ ﴿۷۷﴾ وَجَآءَهٗ قَوۡمُهٗ يُهۡرَعُوۡنَ اِلَيۡهِ ؕ وَمِنۡ قَبۡلُ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىۡ هُنَّ اَطۡهَرُ لَـكُمۡ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ ؕ اَلَيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡدٌ ﴿۷۸﴾ قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِىۡ بَنٰتِكَ مِنۡ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعۡلَمُ مَا نُرِيۡدُ ﴿۷۹﴾

قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ﴿۸۰﴾
قَالُوۡا یٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنۡ یَّصِلُوۡۤا اِلَیۡکَ فَاَسۡرِ بِاَہۡلِکَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ وَلَا یَلۡتَفِتۡ مِنۡکُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیۡبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَہُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَیۡسَ الصُّبۡحُ بِقَرِیۡبٍ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ ؕ وَمَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ﴿۸۳﴾"

''جب ہمارے بھیجے ہوئے (عذاب کے فرشتے) لوط کے پاس آئے تو یہ اُس پر شاق گزرا اور اس نے کہا: یہ تو بڑا سخت دن ہے (اس لئے کہ اُس نے انہیں پہچانا نہیں تھا اور اس بات سے خائف ہوا کہ کہیں اس کی قوم ان کے درپے نہ ہو جائے) اور اس کی قوم کے لوگ جو پہلے سے بدکاری کرتے تھے، اس کی طرف دوڑے چلے آئے، اُس نے ان سے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں (ان سے شادی کر لو اور بدکاری سے باز آؤ) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رُسوا نہ کرو، آیا تم میں ایک بھی سمجھدار انسان نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا: تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں! لوط نے کہا: کاش مجھے تمہارے مقابلے میں کوئی قوت حاصل ہوتی یا میری کوئی مضبوط پناہ گاہ ہوتی۔ (ہود۔ 77 تا 83)

(عذاب کے فرشتوں نے) کہا: اے لوط! ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ان کا ہاتھ تم تک نہ پہنچ سکے گا۔ تم اس بات کے دوران اپنے خاندان کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے لیکن تمہاری بیوی انہی کے ساتھ عذاب کا شکار ہوگی، ان کیلئے صبح کا وقت مقرر ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے؟ اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے شہر کو تہس نہس کر دیا اور ان پر پتھروں کی بارش برسائی، جن پر تمہارے رب کی ہاں نشانی لگی ہوئی تھی اور یہ عذاب دُوسرے مجرموں سے بھی دُور نہیں ہے۔''

5۔ "کَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ﴿۳۳﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّیۡنٰہُمۡ بِسَحَرٍ﴿۳۴﴾"

''قومِ لوط نے (اپنے رسول کی) تکذیب کی اور ہم نے ان پر ایسی تیز ہوا بھیجی، جو کنکریوں کو اُڑا لے جاتی تھی، ہم نے اس کے خاندان کے سوا سب کو ہلاک کر دیا اور انہیں صبح کے وقت نجات دی''۔ (قمر 33 اور 34)

6۔ "وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ﴿۸۰﴾ اِنَّکُمۡ

لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ○ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ○ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ"۔

''اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسا برا عمل انجام دیتے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی۔ کیا تم از رُوئے شہوت عورتوں کی بجائے مردوں کے پاس ہوتے ہو، تم گمراہی میں حد سے بہت گزر چکے ہو۔ لیکن ان کی قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ ان کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ پاکیزگی پسند لوگ ہیں۔ پس ہم نے اسے اور اس کے خاندان والوں کو نجات دی، سوائے اس کی بیوی کے، کہ وہ شہر میں رہ جانے والوں میں تھی۔ پھر ان پر پتھروں کی ایسی بارش برسائی (جس نے انہیں تباہ و برباد کر دیا) پس دیکھ لو، مجرموں کا کیا انجام ہوا؟'' (اعراف 80 تا 83)

تفسیر:۔

پہلی آیت میں بعض انبیاؑ کا ذکر کرنے کے بعد اور اُن کے کردار کی اعلیٰ ترین صفات کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ان کے بعد ان کے فرزندانِ ناخلف ان کے جانشین ہو گئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی شہوات کی پیروی کی اور جلد ہی یہ اپنی گمراہی کی سزا کا سامنا کریں گے۔

"فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ (مریم: 59)

اس کے بعد بلا فاصلہ ایک استثنا بیان کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ توبہ کریں، ایمان لے آئیں اور عملِ صالح کرتے رہیں، وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا○"(مریم: 60)

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ نماز ضائع کرنے کے بعد شہوات کی پیروی کا ذکر اور اس کے بعد گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب بہت نپی تلی ہے جو ایک طرف سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ نماز شہوات کو توڑنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے سورۂ عنکبوت، آیت 45 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ "(عنکبوت:45)

''یقیناً نماز فحش کاموں ومنکرات سے باز رکھتی ہے''۔

دوسری طرف سے یہ آیت اس حقیقت کو بیان کررہی ہے کہ اتباعِ شہوات کا نتیجہ گمراہی ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِھَا یَسْتَھْزِءُوْنَ○"(روم۔10)

''اس کے بعد برے کام کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑایا''۔

واضح سی بات ہے کہ یہاں شہوات کا لفظ اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس سے صرف جنسی شہوت مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی مادی اور نفسانی خواہشات مراد ہیں۔البتہ جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنے ایمان کی تجدید کرلیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے رہیں،وہ جنت میں جائیں گے۔نماز ضائع کرنے اور شہوات کی پیروی کرنے کے منفی اثرات ان کی زندگی سے مٹادیئے جائیں گے۔

دوسری آیت میں اللہ کی طرف لوٹنے اور شہوات کی پیروی کے درمیان ایک تقابل کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ ۚ وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّھَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا○"(نسا:27)

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے جبکہ شہوات کی پیروی کرنے والے چاہتے ہیں کہ تم مکمل طور پر گمراہ ہوجاؤ''۔

جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں،اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی گمراہ کرکے انہیں اپنے جیسا بنالیں۔اس کے برعکس اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ جو لوگ شہوتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں،وہ اپنی شہوت رانی کی روِش ترک کرکے اللہ کے حضور توبہ کریں اور اس کی معرفت واطاعت اور تقویٰ وپاکیزگی کے نور سے اپنے آپ کو منور کرکے سعادت اور خوش بختی کی منزل سے ہمکنار ہوجائیں۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس آیت میں ''میلاً عظیماً'' کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں،ان سے مراد اللہ کی حدود کی حرمت کو پامال کرنا اور مختلف قسم کے گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ممکن ہے کہ اس آیت میں شہوات کے عام معنی مراد ہوں۔چونکہ یہ آیت ان آیات کے بعد واقع ہے جن میں محرم عورتوں سے نکاح کی ممانعت کی گئی ہے،لہٰذا ممکن ہے کہ اس سے مراد جنسی شہوت ہو۔بہرحال اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شہوات کا راستہ اللہ کے راستے سے بالکل جدا ہے۔

تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیت میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی شہوت پرستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سے ہر آیت میں ایک خاص نکتہ کو پیشِ نظر رکھا گیا جن کی طرف ہم اختصار کے ساتھ اشارہ کریں گے۔

تیسری آیت میں حضرت لوطؑ کی اپنی قوم کے ساتھ گفتگو کو بیان کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ "۔(عنکبوت:28)

''اور ہم نے لوط کو بھیجا۔جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہوئے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی''۔

اس آیت میں ''الْفَاحِشَة'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ہر اُس کام پر ہوتا ہے جو بہت زیادہ برا ہو،اگرچہ عام طور پر یہ جنسی بدکاری کیلئے بولا جاتا ہے۔اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ہم جنس پرستی کی برائی حضرت لوط کی قوم سے شروع ہوئی،اس سے قبل اس کا کوئی وجود نہ تھا۔

آگے چل کر آیت میں کہا جارہا ہے:''تم مردوں کی طرف جاتے ہو اور نسلِ انسانی کی بقا کی راہ منقطع کرتے ہو اور اپنی محفلوں میں بدکاری کرتے ہو''۔

اس آیت میں ہم جنس پرستی کی تحریم کی ایک اہم وجہ بھی واضح کردی گئی ہے اور وہ ہے انسانی نسل کا خاتمہ،اس لئے کہ اگر یہ عمل ایک عمومی صورت اختیار کرلے تو نسلِ انسانی کے منقطع ہوجانے کا خطرہ سنگین ہوجائے گا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ ''تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ'' یعنی ''تم راستہ کاٹتے ہو'' کے یہ معنی ہیں کہ قومِ لوط کے بدکار افراد راستوں پر بیٹھ جاتے تھے اور ڈاکہ زنی کے علاوہ مسافروں کو اپنی ہوس کا نشانہ بھی بناتے تھے۔

'نادی' کا مصدر ندا ہے اور یہ عام محفل یا تفریح کی محفل کیلئے بولا جاتا ہے کیونکہ وہاں لوگ ایک دُوسرے کو ندا کرتے ہیں۔ اگرچہ قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ اپنی محفلوں میں کسی نوعیت کی بدکاری کرتے تھے لیکن ظاہر سی بات ہے کہ وہ جو بھی بدکاری کرتے ہوں گے،وہ ان کی مشہور و معروف بدکاری سے ہی مناسبت رکھتی ہوگی۔

روایات میں ہے کہ وہ اپنی محفلوں میں ننگے ہوجایا کرتے تھے،ایک دوسرے کو انتہائی رکیک قسم کی گالیاں دیتے اور انتہائی فحش اور بیہودہ جملوں کا تبادلہ کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ ایسی حرکات بھی کرتے تھے جن کا ذکر کرنے کی عفتِ قلم اجازت نہیں دیتی۔

وہ اپنی اس شہوت پرستی میں اس قدر غرق تھے کہ اللہ تعالیٰ اور اخلاقی و انسانی اقدار کا مذاق اُڑاتے تھے۔لہٰذا جب حضرت لوطؑ نے انہیں ان کے برے عمل کے خطرناک نتائج سے ڈرایا تو انہوں نے جواب دیا ہے اگر تمہاری ان باتوں میں سچائی ہے تو اللہ کا عذاب لاکر دِکھاؤ۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ"۔(عنکبوت: 29)

ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کو بھی تضحیک وتمسخر کا نشانہ بناتے تھے۔

چوتھے پیراگراف کی آیات میں قومِ لوطؑ کی داستان کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان آیات میں اس موقعہ کا ذکر ہے۔جب عذاب کے فرشتے حسین وجمیل جوانوں کی صورت میں حضرت لوطؑ کے پاس آئے۔چونکہ حضرت لوطؑ انہیں نہیں جانتے تھے ،لہٰذا انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بڑا مشکل دن ہے۔انہیں اس بات کا خوف تھا کہ ان کی بدکار قوم کوئی ایسی حرکت نہ کر ڈالے جس سے مہمانوں کی عزت اور احترام پر حرف آئے۔

"وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ"۔(ھود: 77)

''دریں اثنا ان کی قوم کو ان مہمانوں کی آمد کی خبر ہوجاتی ہے۔وہ دوڑے ہوئے حضرت لوطؑ کے پاس آتے ہیں اور ان کے مہمانوں سے دست درازی کی کوشش کرتے ہیں۔قرآن شریف کے یہ الفاظ کہ:''اس سے قبل بھی یہ بدکاری کرتے تھے''،ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ کررہے ہوں کہ ان کے ہاں مہمانوں کے ساتھ بدکاری کرنا عام سی بات ہو۔

"وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ "(ھود: 78)

حضرت لوطؑ بہت پریشان ہوئے اور اپنے مہمانوں کی عزت واحترام کی حفاظت کی خاطر انہوں نے عجیب ایثار کا مظاہرہ کیا کہ اپنی قوم سے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں جو تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں (ان سے شادی کرلو) خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے سامنے رُسوا نہ کرو۔کیا تم میں کوئی سمجھدار انسان نہیں ہے؟

"قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ○"(ھود: 78)

لیکن وہ بے شرم نہایت بے حیائی اور ڈھٹائی سے حضرت لوطؑ کو جواب دیتے ہیں کہ تم خود جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں!

"قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ○"(ھود: 79)

جب حضرت لوطؑ نے یہ صورت حال دیکھی تو بے بسی سے کہنے لگے: کاش! میرے پاس کوئی طاقت ہوتی، کاش میرے پاس کوئی مضبوط پناہ گاہ ہوتی۔

"قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ○"(ھود:80)

بعد میں حضرت لوطؑ کو معلوم ہو گیا کہ ان کے مہمان اللہ کے فرشتے ہیں اور کوئی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو خبر دے دی کہ صبح کے وقت تباہ کن عذاب اس قوم پر آئے گا اور ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسے گی۔ فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی بیوی کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد کو لے کر رات کو ہی وہاں سے چلے جائیں کیونکہ صبح اللہ کا عذاب آجائے گا۔

پانچویں پیراگراف کی آیات میں اس بدکار قوم کو سخت سزا کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوطؑ کی قوم نے اپنے رسول کی طرف سے دی جانے والی عذاب کی خبر کو بار بار جھٹلایا۔ ہم نے ان پر ایک تیز ہوا بھیجی جو سنگریزوں کو اُڑا لے جاتی تھی (اور ان سب کو ان کے نیچے دفن کر دیا اور حضرت لوطؑ کی بیوی کے علاوہ ان کے خاندان کے دیگر افراد کو اس عذاب سے بچا لیا۔

"کَذَّبَتۡ قَوۡمُ لُوۡطٍۭ بِالنُّذُرِ○ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّیۡنٰہُمۡ بِسَحَرٍ○"(قمر:33تا34)

البتہ یہ ان کے اُوپر آنے والے عذاب کا ایک حصہ تھا۔ قرآن شریف واضح طور پر فرما رہا ہے کہ پہلے ہمارے حکم سے ایک زلزلہ آیا جس نے ان کے شہر کو تہہ و بالا کر دیا، یعنی نیچے والے حصے کو اُوپر اور اُوپر والے حصے کو نیچے کر دیا۔

"فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا "(ھود:82)

''اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش نازل کی۔

"وَّاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ"۔(ھود۔82)

ممکن ہے اس سے مراد فضا میں معلق آسمانی پتھر ہوں جو اللہ کے حکم سے ان کے ویران شدہ شہر کے کھنڈر اور ان کے بے جان جسموں کے اُوپر آ گرے ہوں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''حاصب'' کے معنی سنگریزوں کا طوفان ہو۔ یہ طوفان بعض اوقات صحرا کے سنگریزوں کے ایک ٹیلے کو ایک جگہ سے اُٹھا کر آسمان پر لے جاتا ہے اور وہاں سے بارش کی مانند کسی اور سرزمین پر برسا دیتا ہے اور بعض اوقات پورے کا پورا قافلہ سنگریزوں کی بارش میں دفن ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے ایسے عذاب کے آنے کا مخصوص وقت تک حضرت لوطؑ کو بتا دیا تھا۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ پہلے ہولناک زلزلے نے ان کے شہر کو ویران کر دیا ہو اور اس کے بعد ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسی ہو اور بعد ازاں سنگریزوں کا طوفان آیا ہو۔ یہ تین قسم کے عذاب اس بدکار قوم کے خلاف اللہ کے غضب کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔

چھٹے پیرا گراف کی آیات میں قومِ لوطؑ کا سارا واقعہ بطورِ خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''یاد کرو جب لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ آیا تم ایسا برا عمل انجام دیتے ہو جس کی تم سے پہلے کسی قوم میں مثال نہیں ملتی؟''

"وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ○"(اعراف: 80)

تم از رُوئے شہوت عورتوں کی بجائے مردوں کی طرف جاتے ہو، تم بدکاری میں حد سے گزر جانے والی قوم ہو، اس لئے کہ تم نے اللہ کے قوانین کو چھوڑ کر گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا ہے، ایسا راستہ جو نسلِ انسانی کی بربادی، مختلف اقسام کی بیماریوں اور دیگر معاشرتی برائیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

اگرچہ ''ایڈز'' ہمارے دور کی ایک مہلک بیماری ہے لیکن ممکن ہے یہ بیماری اُس دَور میں بھی موجود ہو اور حضرت لوطؑ کی قوم کے بعض افراد بھی اس میں مبتلا ہوں اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اجسام کو پتھروں اور سنگریزوں کے نیچے دفن کر دیا ہو تا کہ اس طرح دُوسروں کیلئے عبرت کا درس بنانے کے ساتھ ساتھ دُوسروں پر یہ احسان بھی ہو کہ یہ بیماری ان تک سرایت نہ کرے۔

بہر حال حضرت لوطؑ کی قوم اس قدر بے شرم تھی کہ نہ صرف یہ کہ حضرت لوطؑ کی بات نہیں مانتی تھی بلکہ انہوں نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ لوطؑ اور انؑ کے خاندان کو ان کی پاکیزگی کی سزا کے طور پر شہر بدر کر دیا جائے۔

"وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ"(اعراف: 82)

آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے لوطؑ اور اس کے خاندان کو نجات دی، سوائے اس کی بیوی کے جو شہر میں رہ جانے والوں میں تھی۔ پھر ہم نے ان پر ایک بارش (پتھروں کی) برسائی۔ دیکھو! ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا!

"فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ"۔(اعراف: 83تا84)

یہ قوم کس قدر بگڑ چکی تھی کہ پاکیزگی اور عفت کو قابلِ سزا جرم سمجھنے لگی تھی اور لوطؑ اور ان کے خاندان کو شہر بدر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن اللہ کے عذاب نے انہیں اپنی اس قرارداد پر عمل کرنے کی مہلت نہ دی۔

مذکورہ بالا آیات کا بڑا حصہ شہوت پرستی، عام اور خاص دونوں معنی میں، کے خطرناک نتائج کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، اس ناشائستہ اور پست اخلاقی عمل کی سخت مذمت کر رہی ہیں جو بہت سی معاشرتی برائیوں اور گناہوں کا سبب ہے۔

شہوت پرستی احادیث کی روشنی میں

شہوت پرستی کے مسئلہ کو احادیث میں بھی خاص اہمیت دی گئی ہے۔ زیادہ تر احادیث میں شہوت پرستی کے خطرناک نتائج کے بارے میں خبردار کیا گیا ہے۔ جھنجھوڑ دینے والی احادیث ہر پڑھنے والے کو شدید متاثر کرتی ہیں اور اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ شہوت پرستی، خواہ عام معنی میں ہو یا خاص معنی میں، انسان کو کمال اور سعادت کی منزل تک پہنچنے سے روکنے والا سب سے بڑا عامل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انسانی معاشرے میں گناہ اور دیگر برائیوں کے پھیلنے کا ایک بنیادی سبب بھی یہی شہوت پرستی ہے۔

1۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَاتَحْتَ ظِلِّ السَّمَاءِ مِنْ اِلٰه يُعبدُ مِنْ دُوْنِ اللهِ اَعْظَمُ عِنْدَاللهِ مِنْ هَوًى مُتَّبِع"۔ (الدر المنثور، 261:6)

''آسمان کے نیچے اللہ کے سوا جتنے بھی معبودوں کی پرستش کی جاتی ہے، ان میں سے کوئی بھی اللہ کے ہاں ہوائے نفس سے زیادہ برا نہیں ہے جو انسان کو اپنے پیچھے چلاتی ہے''۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہوت برائی کی طرف کھینچ کر لے جانے والے عوامل میں سب سے خطرناک ہے۔

2۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلشَّهَوَاتُ سُمُوْمٌ قَاتِلاتٌ"۔ (غرر الحکم، حدیث 876)

''شہوات قتل کر دینے والی زہریں ہیں (جو انسان کے ایمان، مروّت اور اُس کے اعتبار کو قتل کر دیتی ہیں)''۔

3۔ ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلشَّهَوَاتُ مَصَايِدُ الشَّيْطَانِ"۔ (غرر الحکم: 2121)

''شہوات شیطان کا جال ہیں (جن کے ذریعے وہ ہر عمر کے انسان کو شکار کر لیتا ہے)''۔

4۔ آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث ہے:

"اِمْنَعْ نَفْسَكَ مِنَ الشَّهَوَاتِ تَسْلَمْ مِنَ الْآفَاتِ"۔ (غرر الحکم: 2440)

''اپنے آپ کو شہوات سے روکو، آفات سے محفوظ ہو جاؤ گے''۔

5۔ آپؑ ہی سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"تَرْكُ الشَّهَوَاتِ اَفْضَلُ عِبَادَةٍ وَاَجْمَلُ عَادَةٍ"۔ (غرر الحکم: 4527)

''شہوات کو ترک کرنا افضل ترین عبادت اور خوبصورت ترین عادت ہے''۔

6۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ مَلَكَ نَفْسَهُ اِذَا غَضِبَ وَاِذَا رَغِبَ وَاِذَا رَهِبَ وَاِذَا اشْتَهٰى، حَرَّمَ اللهُ جَسَدَهُ عَلَى النَّارِ"۔ (بحار الانوار، 243:75)

''جو شخص غضب کی حالت میں اور رغبت اور خوف کی حالت میں اور شہوت کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے، اللہ اُس کے جسم کو آتشِ جہنم پر حرام کر دے گا''۔

7۔ ایک حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"ضَادُّوا الشَّهْوَةَ مُضَادَّةَ الضِّدِّ ضِدَّهُ وَحَارِبُوْهَا مُحَارِبَةَ الْعَدُوِّ الْعَدُوَّ"۔

''اپنی شہوات کی اس طرح مخالفت کرو جیسے ایک مخالف اپنے مخالف کی کرتا ہے اور ان کے خلاف اس طرح جنگ کرو جیسے کوئی شخص اپنے دُشمن سے جنگ کرتا ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 5934)

شہوت پرستی کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات

احادیث اسلامی میں شہوت اور ہوائے نفسانی کے بارے میں ہلا دینے والی احادیث موجود ہیں۔

اس بحث میں صرف امیر المومنین علیہ السلام کے ارشادات کی طرف اشارہ کریں گے:

1۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُهْجُرُوا الشَّهَوَاتِ فَاِنَّهَا تَقُوْدُكُمْ اِلٰى رُكُوْبِ الذُّنُوْبِ وَالتَّهَجُّمِ عَلَى السَّيِّئَاتِ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 2505)

''شہوات کو ترک کرو کیونکہ تمہیں ارتکابِ گناہ اور بدکاری کی طرف پیش قدمی کی طرف لے جاتی ہیں''۔

2۔ یہ مسئلہ بعض اوقات اس قدر شدت پیدا کر لیتا ہے کہ انسان کے دین کو مکمل طور پر برباد کر دیتا ہے۔

"طَاعَةُ الشَّهْوَةِ تُفْسِدُ الدِّيْنَ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 5985)

''شہوات کی اطاعت انسان کے دین کو برباد کر دیتی ہے''۔

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"طَاعَةُ الْهَوىٰ تُفْسِدُ الْعَقْلَ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 5983)

''ہوائے نفس کی اطاعت عقل کو تباہ کر دیتی ہے''۔

4۔ ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْجَاهِلُ عَبْدُ شَهْوَتِهٖ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 449)

''جاہل شخص اپنی شہوت کا بندہ ہوتا ہے''۔

5۔ ایک اور جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

"عَبْدُ الشَّهْوَةِ اَسِيْرٌ لَا يَنْفَكُّ اَسْرُهٗ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 6300)

''شہوت کا بندہ ایسا قیدی ہے جس کی قید ختم نہیں ہوتی''۔

6۔ آپؑ کا فرمان ہے:

"حَلَاوَةُ الشَّهْوَةِ يُنَغِّصُهَا عَارُ الْفَضِيْحَةِ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4885)

''شہوات کی پیروی کی رُسوائی اس کی شیرینی کا خاتمہ کر دیتی ہے''۔

7۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"شَبَبَ الشَّرِّ غَلَبَةُ الشَّهْوَةِ" (شرح غرر الحکم، حدیث: 5533)

''شہوت کا غلبہ ہی برائی کا سبب ہے''۔

8۔ ایک اور حدیث میں آپؑ کا فرمان ہے:

"كَيْفَ يَسْتَطِيْعُ الْهُدىٰ مَنْ يَغْلِبُهَا الْهَوىٰ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 7001)

''جو شخص ہوائے نفس سے مغلوب ہو، وہ ہدایت کیسے پا سکتا ہے!''

امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد کی رُو سے خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والے پر ہدایت وسعادت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

9۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ زَادَتْ شَهْوَتُهٗ قَلَّتْ مُرُوَّتُهٗ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 8022)

''جس کی شہوت بڑھ جاتی ہے، اُس کی شخصیت گھٹ جاتی ہے''۔

10۔ ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ اِشْقَاقَ اِلَى الْجَنَّةِ سَلَا عَنِ الشَّهَوَات"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 8591)

''جو شخص جنت کا اشتیاق رکھتا ہے شہوت پرستی کو ترک کر دیتا ہے''۔

11۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"لَا تَسْكُنُ الْحِكْمَةُ قَلْبًا مَعَ الشَّهْوَةِ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 10915)

''جس دل میں شہوت کا بسیرا ہو، حکمت وہاں ساکن نہیں ہو سکتی''۔

اس حدیث سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ حکمت اور شہوت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

شہوت پرستی کے نقصانات:۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شہوت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہر قسم کی مادی خواہشات داخل ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ اس کا زیادہ تر اطلاق جنسی شہوت پر ہوتا ہے لیکن یہ اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ گیارہ مقامات پر عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور صرف دو مقامات پر مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے۔

احادیثِ معصومینؑ اور علماؒ کی عبارات میں بھی یہ لفظ زیادہ تر عام معنوں میں استعمال ہوا ہے جس کا متضاد ''عفت'' یعنی گناہ آلودہ لذتوں سے اجتناب کرنا ہے۔

شہوت کا لفظ عام طور پر منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات یہ مثبت معنی میں بھی دیتا ہے مثلاً قرآن مجید میں اہلِ بہشت سے اللہ تعالیٰ کے خطاب میں کہا گیا ہے:

"وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ ....."(فصلت: 31)

''جو کچھ تمہارا دل چاہے گا، وہ جنت میں تمہارے لئے میسر ہوگا''۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"..... وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ....."(زخرف: 71)

''جنت میں وہ سب کچھ موجود ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت ملے گی''۔

لیکن زیادہ تر یہ لفظ منفی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جہاں نفسانی خواہشات انسان کے تمام وجود پر مسلط ہو کر اُسے گناہ وانحراف کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

یہ لفظ اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں تیرہ مقامات پر استعمال ہوئے ہیں جن میں چھ جگہ مثبت اور سات جگہ منفی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

بہرحال شہوت کے منفی معنی، خواہ عام ہوں یا خاص، انتہائی خطرناک نتائج کے حامل ہیں جن کا واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ جو روایات ہم نے بیان کی ہیں اور اس کے علاوہ ساری تاریخ کے بہت سے واقعات شہوت پرستی کے خطرناک نتائج کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتے ہیں۔ ہم ان نقصانات کا ذیل میں اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

گناہ سے آلودگی:۔

شہوت پرستی انسان کو انواع واقسام کے گناہوں کی طرف لے جاتی ہے۔ درحقیقت یہی تمام گناہوں کا بنیادی سبب ہے، اس لئے کہ حدیث نبویؐ کے مطابق 'حبک للشیٔ یُعمی ویُصم''، 'کسی بھی چیز کے بارے میں تمہاری محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے''۔ (بحارالانوار، 165:74)

شہوت انسان کو ایسے اندھے پن میں مبتلا کر دیتی ہے اُسے حقائق کے ادراک کی بصیرت سے محروم کر دیتا ہے، اچھائی اُسے برائی اور برائی اُسے اچھائی نظر آنے لگتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی بیان کردہ احادیث میں سے آٹھویں حدیث میں اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''شہوتِ سرکش سے بچ کر رہو کیونکہ یہ مختلف قسم کے گناہوں کے ارتکاب کی طرف لے جاتی ہے''۔

اسی طرح دسویں حدیث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا:

''شہوت پرستی انسان کی عقل کو برباد کر دیتی ہے''۔

جبکہ نویں حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''شہوت پرستی کی شدت انسان کے دین کو برباد کر دیتی ہے اور اسے بت پرستی کی حدوں تک لے جاتی ہے''۔

سورۂ حشر کی آیات 16 تا 17 کے ذیل میں مفسرین نے بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اس عابد کا نام برصیصا تھا۔ اگرچہ اس کا واقعہ مشہور ومعروف ہے لیکن یہاں اس کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔

بنی اسرائیل کا یہ عابد برسوں کی عبادت وریاضت کے نتیجہ میں قربِ الٰہی کے اُس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ اس کی دُعائیں قبول ہوتی تھیں اور اس کی دعا سے بیماروں کو شفا مل جاتی تھی۔ ایک روز ایک حسین عورت کو، جو بیمار تھی، اس کے پاس لایا گیا، اس کے رشتہ دار اُسے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ شیطان نے اس عابد کی شہوت کو اس طرح بھڑکایا کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور گناہ کا مرتکب ہو گیا۔ چونکہ اس بات کا خوف تھا کہ اس گناہ کے نتیجہ میں عورت حاملہ ہو جائے اور یہ اُس کی بدنامی اور رُسوائی کا سبب بن جائے، لہٰذا شیطان اور اُس کی ہوائے نفس نے اُسے یہ سمجھایا کہ وہ اس عورت کو قتل کر دے اور اس وسیع وعریض صحرا میں دفن کر دے۔

جب اس بیمار عورت کے بھائی اپنی بہن کی خبر لینے کیلئے اس عابد کی عبادت گاہ میں گئے تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ انہیں عابد پر شک گزرا اور انہوں نے تحقیق شروع کر دی۔ آخرکار انہیں اپنی بہن کی لاش مل گئی۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی اور حکمران کو بھی

اس کی اطلاع ہوگئی۔ عابد کو سزائے موت دینے کا فیصلہ ہوا۔ جب اُسے تختہ دار پر لے جایا گیا تو شیطان اس کے سامنے مجسم ہوا اور اس سے کہنے لگا کہ میں نے ہی اپنے وسوسوں کے ذریعے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے اور اگر تم میری اطاعت کرو تو میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔

عابد: بتاؤ کیا کروں؟

شیطان: مجھے ایک سجدہ کرو، یہی کافی ہے۔

عابد: رسی میرے گلے میں ڈالی جا چکی ہے، میں کیسے سجدہ کروں؟

شیطان: اشارے سے سجدہ کر دو، یہی کافی ہے۔

نادان عابد نے اشارے سے سجدہ کر دیا اور ساتھ ہی پھانسی کا پھندا تنگ ہوا اور اُس کی جان نکل گئی۔

عقل کی خرابی:۔

شہوت پرستی انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ حق اُسے باطل اور باطل اُسے حق نظر آنے لگتا ہے۔

احادیث میں ہم یہ حدیث بیان کر چکے ہیں:

"طَاعَةُ الْهَوىٰ تُفْسِدُ الْعَقْلَ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 5983)

''ہوائے نفس کی پیروی عقل کو فاسد کر دیتی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے شہوت پرست شہوت سے مغلوب ہو کر ایسے کام کر گزرتے ہیں کہ جب ان کی شہوت کا زور ٹوٹتا ہے تو سوائے ندامت اور پشیمانی کے ان کی پاس کچھ نہیں ہوتا۔

امیر المومنین علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"إِذَا أَبْصَرَتِ الْعَيْنُ الشَّهْوَةَ عَمِيَ الْقَلْبُ عَنِ الْعَاقِبَةِ"۔

''جب آنکھ شہوت پر نظر کرتی ہے تو قلب انجام پر نظر نہیں کر سکتا''۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 4063)

معاشرتی حیثیت کا نقصان:۔

شہوت پرستی انسان کی معاشرتی حیثیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے، اس لئے کہ شہوانی لذتوں کی تکمیل کیلئے انسان معاشرتی اقدار کو بھی پامال کر جاتا ہے۔ ایک محترم اور صاحبِ حیثیت شخص جب شہوانی کشمکش اور اپنی عزت و احترام کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے تو اُسے ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"زِيَادَةُ الشَّهْوَةِ تُزْرِي بِالْمُرُوَّةِ"

''شہوت کی زیادتی انسان کی شخصیت کوعیب دار کر دیتی ہے''۔(شرح غرر الحکم،حدیث:5507)

نفس کی غلامی:۔

شہوت پرستی کا ایک اور نقصان نفس کی غلامی ہے۔شہوت پرست انسان اس طرح شہوت کا اسیر ہو جاتا ہے کہ اُس کیلئے ان زنجیروں کو توڑنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔اس کا واضح ترین نمونہ اُن لوگوں کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جو نشہ کی عادی ہو جاتے ہیں۔اگر شہوت پرستی جنون کی حد تک جنسی معاشقوں تک جا پہنچے تو ایسی صورت میں انسان کی غلامی بھی بدترین صورت اختیار کر لیتی ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد ہم پڑھ چکے ہیں کہ شہوت کا غلام ایسا غلام ہے جس کی غلامی ختم نہیں ہوتی۔ایک اور حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"وَ كَمْ مِنْ عَقْلٍ أَسِيرٌ تَحْتَ هَوىً أَمِيرٍ"۔

''بہت سی عقلیں اس طرح شہوت کی اسیر ہیں جن پر ہوائے نفس کی حکمرانی ہے''۔(نہج البلاغہ،کلماتِ قصار:211)۔

حضرت علی علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

"اَلشَّهَوَاتُ تَسْتَرِقُ الْجُهُوْلَ"۔(نہج البلاغہ،حدیث:922)

''شہوات جہلاؑ کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں''۔

رُسوائی اور بے عزتی:۔

رُسوائی اور بے عزتی بھی شہوت پرستی کے نقصانات میں سے ایک ہے۔تاریخ ایسے بہت سے واقعات کو اپنے صفحات میں محفوظ کئے ہوئے ہے جن میں ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی ممتاز شخصیات شہوت پرستی کی دلدل میں گر کر ذلیل ورُسوا ہو گئیں۔ادیبوں اور شاعروں کے ادب پاروں اور اشعار میں بھی شہوت پرستی اور رُسوائی کو لازم وملزوم قرار دیا گیا۔

سورۂ یوسف میں زوجہ عزیز مصر کا واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ شہوت پرستی کے نتیجہ میں عزیز مصر کی زوجہ کس طرح رُسوا ہو گئی۔

انّ الْهَوای هُوَ الهَوانِ قُلِبَ اِسْمُهُ فَاِذا هَوَيْتَ فَقَدْ لَقَيْتَ هَوانًا

''شہوت پرستی پستی ہی کا دوسرا نام ہے،اسی لئے ہر شہوت پرست ذلیل اور پست ہو جاتا ہے''۔

شہوت پرستی کے اسباب:۔

ہم دیگر مباحث میں یہ بات کہہ چکے ہیں کہ تمام اخلاقی برائیوں کا علاج کرنے سے قبل ان کے عوامل و اسباب کو معلوم کرنا ضروری ہے۔علمائے اخلاق نے اپنے مباحث میں اس بات کو بہت اہمیت دی ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ ہم بھی شہوت پرستی کے اسباب کا کھوج لگائیں۔

انسان کے اندرونی میلانات جنہیں شہوات کہا جاتا ہے،خصوصاً جنسی شہوت، بالکل طبیعی اور خداداد ہیں اور انسان کی ترقی و پیشرفت میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔لہٰذا انہیں مکمل طور پر کچل دینا تو ممکن اور معقول نہیں ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں حدِ اعتدال پر رکھا جائے کیونکہ اس طرح نہ صرف کوئی مسائل پیدا نہیں ہوں گے بلکہ یہ انسانی معاشرے کی ترقی میں اپنا مثبت کردار بھی ادا کرتے رہیں گے۔مسائل اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب شہوات سرکش ہو کر عقل کی حاکمیت کے دائرے سے خارج ہو جائیں۔

اب دیکھنا یہ ہے وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے طبیعی میلانات یا شہوات عقل کی حاکمیت کے دائرے سے خارج ہو کر ایک تباہ کن طاقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل اُمور اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں:

1۔ایمان کی کمزوری:۔

ایمان کی کمزوری اللہ کے احکام کو نظر انداز کرنے کا بنیادی سبب ہے۔اگر انسان اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے اور قیامت کے دن قائم ہونے والی عدالت کو چشمِ بصیرت سے دیکھتا ہو تو وہ ہرگز شہوات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز نہیں کرے گا اور اس کی حدود کو نہیں توڑے گا۔

یہی وہ برہانِ الٰہی ہے جس نے مشکل ترین حالات میں حضرت یوسفؑ کی رہنمائی کی اور انہیں فحشاء و گناہ سے آلودہ ہونے سے بچایا۔

اگر انسان کا ایمان کمزور ہو تو اللہ اور آخرت کی طرف انسان کی توجہ کم ہو جائے گی اور شہوت کی سرکشی کے حالات فراہم ہو جائیں گے۔ایسے حالات میں انسان کی حالت ایک ایسے چوپائے جیسی ہو جائے گی جو اپنے پنجرے سے نکل کر، اپنے آپ کو بے قید و بند دیکھ کر، اندھا دھند عمل کرتا ہے اور جو اُس کے راستے کی رُکاوٹ بننے کی کوشش کرے، اُسے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان ضرور مدِ نظر رہے:

"مَنِ اشْتَاقَ إِلَى الْجَنَّةِ سَلَا عَنِ الشَّهَوَاتِ"۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 31)

''جو کوئی جنت میں جانے کا اشتیاق رکھتا ہو، وہ شہوات کو نظر انداز کر دیتا ہے''۔

بعض اوقات انسان شہوات سے لطف اندوز ہونے کیلئے ایمان کی حدود توڑ ڈالتا ہے تاکہ آزادی کے ساتھ اپنی شہوات کی

زیادہ سے زیادہ تسکین کر سکے۔اس بات کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝" (قیامت:5و6)

''انسان یہ چاہتا ہے کہ آزاد ہو (اور قیامت کے خوف سے بے پروا ہو کر) عمر بھر گناہ کرے، لہٰذا وہ سوال کرتا ہے کہ قیامت کب ہوگی؟ (ایسا سوال جو اُس کے انکار یا شک کو ظاہر کرتا ہے)''۔

2۔معاشرتی حیثیت اور احترام کو نظر انداز کرنا:۔

جب انسان اپنی معاشرتی حیثیت کو نظر انداز کر دے اور اس کی اپنی نظر میں اُس کی شخصیت کا احترام کمزور ہو جائے تو وہ شہوت پرستی سے آلودہ ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس اپنی معاشرتی حیثیت کا خیال انسان کو شہوات کے مقابلہ میں مضبوط بنا دیتا ہے، خواہ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لادینی معاشروں میں بھی معزز لوگ، شہوت کی اندھا دھند پیروی نہیں کرتے اور بے قید و شرط جنسی لذت کے حصول کی کوشش نہیں کرتے۔درحقیقت یہ اُن لوگوں کی عزتِ نفس ہی ہے جو انہیں شہوات کی سرکشی کے خلاف بناتی ہے۔البتہ پست اور گھٹیا افراد ہر قسم کے پست اور گھٹیا کام کرتے رہتے ہیں۔

3۔غفلت اور بے خبری:۔

شہوت پرستی کے اثرات سے غفلت اور بے خبری بھی شہوت پرستی کی دلدل میں گر جانے کا ایک اہم سبب ہے۔ہر قسم کی شہوت پرستی، خواہ وہ کھانے کی شہوت ہو یا جنسی شہوت، مختلف قسم کی بیماریوں کا سبب بنتی ہے اور انسان کی صحت پر برے اثرات ڈال کر انسان کی عمر کو کم کر دیتی ہے۔بعض اوقات اس کے انسان کی خاندانی زندگی پر بھی منفی اثرات پڑتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ غیر مذہبی معاشروں میں بھی ان منفی اثرات سے بچنے کیلئے بہت سے لوگ شہوات کی تسکین میں اعتدال کی راہ پر چلتے ہیں۔

4۔بری صحبت اور ناپاک ماحول:۔

بری صحبت، بدچلن دوست، ناپاک ماحول اور ذرائع ابلاغ کی گمراہ کن روِش بھی شہوت پرستی کی طرف دھکیلنے والے اسباب میں سے ہیں۔عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ برے دوست اپنے دوستوں کو گناہ کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور پھر انہیں گناہ کی دلدل میں غرق کر دیتے ہیں۔برے دوست انسان کو گناہ کے مختلف طریقے اور راستے سکھا دیتے ہیں۔لہٰذا یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ برے اور گناہگار افراد کی دوستی شہوت پرستی اور گناہ کی طرف مائل کرنے کا رائج ترین ذریعہ ہیں۔

ذرائع ابلاغ کی غلط روِش بھی شہوت پرستی سے آلودہ ہونے کا ایک اہم سبب ہے۔اس سلسلہ میں ہم نے اپنی

کتاب ''کلیاتِ مسائلِ اخلاقی'' کی پہلی جلد میں ''زمینہ ساز مفاسدِ اخلاقی'' کے عنوان سے تفصیل سے گفتگو کی ہے اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ برائی سے آلودہ صحبت نہ صرف یہ کہ انسان کو گناہ اور اخلاقی برائیوں سے آلودہ کر دیتی ہے بلکہ بسا اوقات کفر کی حد تک بھی لے جاتی ہے۔ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے۔

"وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا○ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا○ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا○" (الفرقان: 27تا29)

''اور اس روز (قیامت کے دن) ظالم حسرت زدہ ہو کر اپنے ہی دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا: کاش! میں نے رسول اللہ ﷺ کی راہ کو اپنایا ہوتا، کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا، اُس نے نصیحت کے آجانے کے بعد مجھے گمراہ کیا اور شیطان تو انسان کو بے یار و مددگار چھوڑ دینے والا ہے''۔

براماحول، بگڑے ہوئے اخلاق والے والدین بھی شہوت پرستی اور گناہ کی طرف مائل کرنے والے اسباب میں سے ہیں جن کی منفی تاثیر کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جب اچھے افراد ایسے ماحول میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا دل اور ایمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور وہ گناہ اور شہوت پرستی سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔

چونکہ ''کلیاتِ مسائلِ اخلاق'' میں ہم اس موضوع پر تفصیل سے بات کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں اتنی ہی گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔

شہوت پرستی کا علاج

تمام اخلاقی برائیوں کا طریقہ علاج اُصولی طور پر تقریباً ایک جیسا ہے جس کو ہم علمی طریقے اور عملی طریقے میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف: علمی طریقہ:۔

علمی طریقے سے مراد یہ ہے کہ انسان شہوت پرستی کے اثرات اور نتائج کے بارے میں غور کرے اور دیکھے کہ شہوات کی اندھا دھند پیروی کس طرح انسان کو ذِلت، بدبختی، معاشرتی حیثیت کے کمزور ہو جانے اور اللہ سے دُوری جیسے نقصانات سے دوچار کر دیتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی شہوت پرستی کی راہ میں گزاری ہے، اُن کا انجام اس حقیقت کی بین دلیل ہے۔

لہٰذا ان اُمور میں غور و فکر، اولیاؑ اللہ اور اُن کے سچے پیروکاروں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ انسان کی شہوت پرستی کی راہ پر

چلنے سے باز رکھتا ہے، اس لئے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی شہوات کے خلاف جہاد کر کے دُنیا میں بھی اور اللہ کے ہاں بھی بلند مقامات تک پہنچے ہیں۔

اس کے علاوہ عقل کی بنیادوں کو مستحکم کرنا بھی انسان کو اپنی شہوت پر مسلط ہونے میں مدد دیتا ہے۔ اس بارے میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ كَمُلَ عَقْلُهُ اِسْتَهَانَ بِالشَّهَوَاتِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، حدیث: 8226)

''جس کی عقل کامل ہوجاتی ہے، وہ شہوات کو حقیر جاننے لگتا ہے''۔

ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ غَلَبَ شَهْوَتَهُ ظَهَرَ عَقْلُهُ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، حدیث: 7953)

''جو اپنی شہوت پر غالب ہوجائے، اُس کی عقل غالب ہوجاتی ہے''۔

اسی طرح ایک اور مقام پر آپؑ نے فرمایا:

"كُلَّمَا قَوِيَتِ الْحِكْمَةُ ضَعُفَتِ الشَّهْوَةُ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، حدیث: 7205)

''جیسے جیسے حکمت مضبوط ہوتی ہے، شہوت ضعیف ہوتی جاتی ہے''۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور پُرمعنی پیغام میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"اُذْكُرْ مَعَ كُلِّ لَذَّةٍ زَوَالَهَا وَمَعَ كُلِّ نِعْمَةٍ اِنْتِقَالَهَا وَمَعَ كُلِّ بَلِيَّةٍ كَشْفَهَا، فَاِنَّ ذٰلِكَ اَبْقٰى لِلنِّعْمَةِ، وَاَنْفٰى لِلشَّهْوَةِ، وَاَذْهَبُ لِلْبَطَرِ، وَاَقْرَبُ اِلَى الْفَرَجِ وَاَجْدَرُ بِكَشْفِ الْغُمَّةِ وَدَرْكِ الْمَامُوْلِ"۔ (میزان الحکمہ، 4:3483)

''ہر (حرام) لذت کے ساتھ اس کے زوال کو بھی یاد کرو اور ہر نعمت کے ساتھ اُس بات کو بھی یاد رکھو کہ ایک روز وہ تم سے سلب ہوجائے گی اور ہر مصیبت کے وقت یہ یاد رکھو کہ اس نے برطرف ہوجانا ہے۔ ایسا کرنے سے نعمتوں میں پائیداری پیدا ہوتی ہے، شہوات کی نفی ہوتی ہے، خود پرستی کا نشہ اُتر جاتا ہے، آسانیاں نزدیک ہو جاتی ہیں اور غم و نداوہ برطرف ہوجاتے ہیں''۔

اس طرح نتائج کے بارے میں غور و فکر کرنا، انسان کو شہوات پرستی سے باز رکھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے تمام پیشواؤں کی کوشش یہی تھی کہ لوگوں کو شہوات کے منحوس نتائج سے آگاہ کریں اور انہیں شہوت کی قید سے آزاد کروائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بھی اس بات کو بیان کرتی ہے:

"خَمْسٌ اِنْ اَدْرَكْتُمُوْهُنَّ فَتَعوذُّوْا بِاللهِ مِنْهُنَّ: لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْهَا، اِلَّاظَهَرَ فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَالاوَجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ فِيْ اَسْلَافِهِمْ اَلَّذِيْنَ مَضَوْاوَلَمْ يَنْقُصُواالْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِلَّااَخِذُوابِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَؤُنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ، وَلَمْ يَمْنَعُوْاالزَّكَاةَ اِلَّامُنِعُوالْمَطَرَمِنَ السَّمَاءِ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوقاوَلَمْ يَنْقُضُوْا عَهْدَاللهِ وَعَهْدَرَسُوْلِهٖ اِلَّاسَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِمْ عَدُوَّهُمْ وَاَخَذُوْابَعْضَ مَافِيْ اَيْدِيْهِمْ، وَلَمْ يَحْكُمُوْابِغَيْرِ مَااَنْزَلَ اللهُ اِلَّاجَعَلَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ بِأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ"۔(اصولِ کافی، 373:2)

"پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ اگر تم اُن کو دیکھو تو اُن کے شر سے بچنے کیلئے اللہ کے ہاں پناہ طلب کرو: جب بھی کسی قوم میں برے اعمال اعلانیہ ظاہر ہونے لگیں تو وہ طاعون اور ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں جو اُن سے پہلے کسی قوم میں نہ تھیں۔ جب بھی کوئی قوم ناپ تول میں کمی کی مرتکب ہوتی ہے تو وہ قحط، بدحالی اور ظالم حکمرانوں کی حکومت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ جب کوئی قوم زکوٰۃ کی ادائیگی کو روک لیتی ہے تو اُسے بارش سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اگر بارش ہوتی ہے تو جانوروں کی خاطر ہوتی ہے اور جب بھی کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو توڑتی ہے تو اللہ اُن کے دُشمن کو ان پر مسلط کر دیتا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے، اُس کا ایک حصہ وہ دشمن لے جاتا ہے اور جب بھی کوئی قوم اللہ کے نازل کردہ احکام کے بغیر فیصلے کرتی ہے تو اللہ باہمی اختلافات کے ذریعے ان کو سختی میں مبتلا کر دیتا ہے"۔

یقیناً ان اُمور میں غور و فکر کرنا انسان کو گناہ اور غیر اخلاقی اعمال کی انجام دہی سے مستقل طور پر عارضی طور پر باز رکھتا ہے۔

ب۔عملی طریقہ:۔

شہوت پرستی کا عملی علاج کرنے کے کئی طریقے ہیں:

1۔ شہوت کے طوفان سے محفوظ رہنے کا بہترین عملی راستہ یہ ہے کہ جائز طریقوں سے جنسی شہوت کی صحیح تسکین کی جائے، اس لئے کہ اگر انسان کے اندر پائے جانے والے فطری اور طبیعی میلانات کی صحیح طریقے سے تسکین ہوتی رہے تو وہ تخریبی اور تباہ کن صورت اختیار نہیں کرتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان فطری تقاضوں کو کچلنے کی بجائے ان سے صحیح اور مثبت طریقے سے استفادہ کرنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر یہ فطری خواہشات ایک تباہ کن سیلاب میں تبدیل ہوکر نسلوں اور کھیتیوں کو تباہ کر دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ صحت مند تفریحات سے منع نہیں کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ حضرت امام

محمد تقی علیہ السلام سے منقول خطبہ نکاح میں ہے:

"اَمَّابَعْدُ فَقَدْكَانَ مِنْ فَضْلِ اللهِ عَلَى الْاَنَامِ اَنْ اَغْنَاهُمْ بِالْحَلَالِ عَنِ الْحَرَامِ"۔(بحار الانوار، 76:50)

''بندوں پر اللہ کا ایک فضل یہ بھی ہے کہ اُس نے حلال کی بدولت انہیں حرام سے بے نیاز کر دیا''۔

ایک اور حدیث میں یہ نکتہ اس پیرائے میں بیان ہوا ہے:

"لِلْمُؤْمِنِ ثَلاثُ سَاعَاتٍ، فَسَاعَةٌ يُنَاجِيْ فِيْهَا رَبَّهُ، وَسَاعَةٌ يَرُمُّ مَعَاشَهُ، وَسَاعَةٌ يُخَلِّيْ بَيْنَ نَفْسِهِ وَبَيْنَ لَذَّتِهَا فِيْمَا يَحِلُّ وَيَجْمُلُ"۔

''مؤمن اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے: ایک حصہ وہ جس میں وہ اپنے رب سے راز و نیاز کرتا ہے، ایک حصہ وہ جس میں وہ اپنی معاش کی اصلاح کرتا ہے اور ایک حصہ وہ جس میں وہ حلال لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے''۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار:390)

2۔ شہوت پرستی سے نجات کا ایک راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں نظم وضبط کی پابندی کرے۔ جب انسان کا نظام الاوقات (time table) مکمل ہوگا، اُس کی زندگی میں شہوت پرستی سے آلودہ ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

3۔ شہوانی آلودگی کے اسباب کو برطرف کرنا بھی شہوت پرستی کا علاج کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے کیونکہ اسباب وعوامل کی موجودگی میں انسان کے آلودہ ہوجانے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اگر انسان کو شہوانی ماحول میسر ہو اور شہوت پرستی کے وسائل مہیا ہوں تو ایسی صورت میں نوجوانوں اور کمزور ایمان ومعرفت رکھنے والوں کا محفوظ رہنا دُشوار ہوجائے گا۔

4۔ معاشرے کے افراد کی رُوحانی اور معنوی شخصیت کی تعمیر یا بالفاظِ دیگر کردار سازی بھی شہوت پرستی کی آلودگی سے محفوظ رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ جب انسان کو اپنے وجود کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجائے، اسے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اُسے یہ بھی احساس ہوجائے کہ اللہ نے اُسے زمین میں خلافت کا مقام دے رکھا ہے تو پھر وہ آسانی سے اپنے آپ کو شہوت کے ہاتھ نہیں بیچتا۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ كَرُمَتْ عَلَيْهِ هَانَتْ عَلَيْهِ شَهْوَتُهُ"۔(بحار الانوار، 71:78)

''جسے اپنی عزت کا احساس ہوجائے، اُس کی شہوت اُس کی نظر میں حقیر ہوجاتی ہے''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ عَرَفَ شَرَفَ مَعْنَاهُ صَانَهُ عَنْ دَنَائَةِ شَهْوَتِهِ"۔(غرر الحکم: 9049)

''جوشخص اپنی عزت اور شرافت کو پہچان لے،تو یہ بات اُسے اُس کی شہوت کی پستی سے بچالیتی ہے''۔

آخری نکتہ جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ صرف شہوات کا مقابلہ کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ تمام اخلاقی برائیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ عملی جہاد کو اہمیت دی جائے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر انسان بری صفات کا مقابلہ کرے اور ان کی مخالف سمت میں حرکت کرے،اُسی قدر بری صفات کمزور ہوتی جاتی ہیں اور اُن کی مخالف اچھی صفات طاقتور ہوتی چلی جاتی ہیں۔مثلاً اگر بخیل انسان اپنے اُوپر ہر جبر کر کے تھوڑی تھوڑی سخاوت کرنا شروع کر دے تو آہستہ آہستہ سخاوت کی عادت اس میں پیدا ہونا شروع ہوجائے گی۔

اگر شہوت پرست افراد بھی شہوت کی طغیانی کے مقابلے میں ہمت سے کام لیں تو شہوت کی طغیانی کا زور آہستہ آہستہ ٹوٹ جائے گا اور عفت کی روح اس کے اندر بیدار ہوتی چلی جائے گی۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی اپنے ایک ارشاد میں اس نکتہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"قَاوِمِ الشَّهْوَةَ بِالْقَمْعِ لَهَا تَظْفُرْ" (شرح فارسی غرر الحکم، 514:4)

''شہوات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرو،کامیاب ہوجاؤ گے''۔

شکم پرستی اور جنسی شہوت:۔

مرحوم فیض کاشانی نے ''المحجۃ البیضا'' میں،محقق نراقی نے ''معراج السعادۃ'' اور مرحوم شبر نے ''الاخلاق'' میں شکم پرستی اور جنسی شہوت پر مستقل بحث کی ہے۔

مرحوم فیض کاشانی ''المحجۃ البیضا'' میں فرماتے ہیں:''انسان کی ہلاکت کا سب سے اہم سبب شکم کی شہوت ہے جس نے آدم وحوا کو جنت سے دُنیا میں دھکیل دیا۔درحقیقت شہوتِ شکم ہر قسم کی شہوت اور تمام آفات اور آلام کا سرچشمہ ہے۔جنسی شہوت اسی کے نتیجہ میں پیدا ہوجاتی ہے اور یہ دونوں مل کر مال و دولت جمع کرنے اور مقام و مرتبہ کے حصول کی خواہش کو تقویت دیتی ہیں۔ان سب کے نتیجہ میں اختلافات، جھگڑے اور کشمکش کا سب بنتی ہیں۔ریاکاری،خودنمائی، کثرتِ مال و مقام اور احساسِ برتری جیسی برائیاں بھی یہیں سے جنم لیتی ہیں۔حسد،کینہ،عداوت اور دُشمنی بھی اسی سے جنم لیتی ہیں۔جب یہ سب چیزیں انسان میں پیدا ہوجاتی ہیں تو ہر قسم کے ظلم،فساد،گناہ و منکرات کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

اب جبکہ صورت حال ایسی ہے تو ضروری ہے کہ ان آفات کو کھول کر بیان کیا جائے اور ان کا مقابلہ کرنے کی راہیں واضح کی جائیں''۔(المحجۃ البیضا،145:5)

اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ شکم پرستی اور شہوت پرستی کی وجہ سے آخر کار انسان اپنے دین و ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

"وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ"۔ (بقرہ: 41)

''اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے، جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس موجود ہے اور اس کا انکار کرنے میں پہل کرنے والوں میں سے نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر نہ بیچو اور مجھ سے ڈرتے رہو''۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے علمأ کی مذمت کی ہے۔ روایات میں ہے کہ یہودیوں کے بعض بزرگ علمأ کی اپنی قوم کے امرأ میں بہت عزت تھی اور وہ ان کے احترام میں پرتکلف دعوتیں کرتے۔ یہ علمأ ان لوگوں کو خوش رکھنے کیلئے آیاتِ الٰہی میں تحریف کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ آیاتِ الٰہی کو دُنیوی مفادات کی حقیر قیمت پر فروخت کر دیتے تھے۔ (اس طرح انہوں نے اُس رسول کی رسالت کا انکار کر دیا جس کی بشارت تورات میں دی گئی تھی اور بنی اسرائیل سالہا سال سے ان کا انتظار کر رہے تھے)۔

احادیث میں بھی شہوت کی ان دو اقسام پر مفصل بحث کی گئی ہے، چند احادیث ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ثَلَاثٌ اَخَافُهُنَّ بَعْدِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْمَعْرِفَةِ وَمُضِلَّاتُ الْفِتَنِ وَشَهْوَةُ الْبَطْنِ وَالْفَرْجِ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''تین چیزیں ایسی ہیں جن سے میں اپنے بعد اپنی اُمت کے بارے میں ڈرتا ہوں: حق کو پہچان لینے کے بعد گمراہ ہو جانا، گمراہ کر دینے والے فتنے اور شکم اور شرم گاہ کی شہوت''۔

یہاں معرفتِ حق کے بعد گمراہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان حق کو پہچان لینے کے بعد گمراہ کرنے والی طاقتوں کے وسوسوں اور شکوک وشبہات کی وجہ سے گمراہ ہو جائے۔ یہ مسئلہ ہر دَور میں موجود رہا ہے اور ہمارے دَور میں خاص طور پر موجود ہے۔

''مُضِلَّاتُ الْفِتَنِ''، یعنی گمراہ کرنے والے فتنوں سے مراد وہ آزمائشیں ہیں جو اللہ کی طرف سے انسان کو پیش آتی ہیں اور شہوت پرستی کی وجہ سے انسان ان میں کامیاب نہیں ہو پاتا اور شہوتِ بطن وفرج سے مراد شکم پرستی اور جنسی شہوت میں زیادہ روی ہے۔

2۔ ایک اور مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَكْثَرُ مَا تَلِجُ بِهٖ اُمَّتِيَ النَّارَ الْاَجْوَفَانِ الْبَطْنُ وَالْفَرْجُ"۔ (اصول کافی، 79:2)

''میری امت کے زیادہ تر لوگ دو چیزوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے: پیٹ اور شرم گاہ''۔

3۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِذَا شَبِعَ الْبَطْنُ طَغٰی"۔ (اصولِ کافی، 270:6)

''جب پیٹ بھر جائے تو وہ سرکش ہو جاتا ہے''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَامِنْ شَیْءٍ اِلَی اللہِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ بَطْنٍ مَمْلُوٍّ"۔ (اصولِ کافی، 79:02)

''اللہ کے ہاں سب سے ناپسندیدہ چیز بھرا ہوا پیٹ ہے''۔

5۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا یفسد التقویٰ بغلبة الشهوة"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 10606)

''شہوت کے غلبہ کے سوا کوئی چیز تقویٰ کو خراب نہیں کرتی''۔

6۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"لَا تَجْتَمِعُ الْحِکْمَةُ وَالشَّهْوَةُ"۔ (شرح غرر الحکم، حدیث: 10573)

''علم وحکمت اور شہوت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے''۔

7۔ ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"مَارَفَعَ اِمْرَءًا کَهِمَّتِهٖ وَلَا وَضَعَهُ کَشَهْوَتِهٖ"۔ (شرح غرر الحکم، جلد6، حدیث: 9707)

''کوئی چیز ہمت کی طرح انسان کو بلندی پر نہیں لے جاتی اور کوئی چیز شہوت کی طرح انسان کو پستی کی طرف نہیں لے جاتی''۔

بارھواں باب

عفّت: ایک عظیم اخلاقی فضیلت

تمہید:۔

''عفت'' شکم پرستی اور شہوت پرستی کی ضد ہے اور اس کا شمار اہم انسانی فضائل میں ہوتا ہے۔ راغب اصفہانی اپنی مشہور کتاب ''المفردات'' میں عفت کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے نفس میں ایسی حالت پیدا ہو جائے جو اُسے شہوت سے باز رکھے اور جس شخص میں یہ حالت یا صفت پائی جاتی ہو، اُسے عفیف کہتے ہیں۔

''مقاییس اللّغہ'' میں اس کے معنی اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

''بنیادی طور پر عفت کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ برے کاموں کو انجام دینے سے باز رہنا، دُوسرے یہ کہ کسی چیز کا کم ہونا۔ لہٰذا عربی زبان میں پستان میں باقی بچے ہوئے دُودھ کو ''عفَّتْ'' (بروزنِ مدت) کہا جاتا ہے۔

لیکن مفردات میں راغب اصفہانی نے جو معنی بیان کئے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو معنی درحقیقت ایک ہی ہیں، اس لئے کہ عفیف انسان تھوڑی چیز پر قانع رہتا ہے۔

''التحقیق'' میں کہا گیا ہے: ''اس لفظ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو شہوانی اور نفسانی رجحانات سے محفوظ رکھے۔ جس طرح تقویٰ کے معنی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کے ہیں۔ بنابرایں عفت ایک اندرونی صفت ہے، جیسا کہ تقویٰ کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے ہے''۔

علمائے علمِ اخلاق نے عفت کو شہوت پرستی اور خمود کے درمیان کی معتدل راہ قرار دیا ہے۔ مذکورہ بالا بیانات میں عفت کے عام اور وسیع مفہوم کو بیان کیا گیا ہے، اس لئے کہ بعض علمأ نے اسے ''تہتک'' یعنی پاکیزگی کی رِدا چاک کرنے کی ضد قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اس لفظ کا استعمال صرف جنسی شہوت کے مقابل ہوتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ عفت، خواہ عام معنی میں ہو یا خاص معنی میں، عظیم انسانی فضائل میں شمار ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص عفت کے بغیر قربِ الٰہی کے مقام کو حاصل نہیں کرسکتا۔ دُنیوی زندگی میں بھی انسان کی عزت وآبرو کا انحصار انسان کی عفت پر ہے۔

اس مختصر تمہیدی بیان کے بعد ہم مندرجہ ذیل آیات کی روشنی میں عفت کا جائزہ لیتے ہیں:

1۔ "لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔

"(تمہارا انفاق) اُن فقرأ کیلئے ہے جو اللہ کی راہ میں مشکلات کا شکار ہو گئے ہوں جو کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ جہلاً اُن کی عفت کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتے ہیں مگر تم ان کے چہرے سے ان کو پہچان سکتے ہو۔ وہ اصرار کر کے لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے۔ تم جو بھی اچھی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اللہ اسے بخوبی جانتا ہے"۔ (بقرہ:273)

2۔ "وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ"۔

"اس عورت نے، جس کے گھر میں وہ (یوسف) تھا، اس سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کی اور سارے دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی: 'آ جاؤ'۔ یوسف نے کہا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔ وہ (عزیز مصر) میرا نعمت دینے والا ہے، اُس نے مجھے عزت کا مقام دیا ہے (کیا یہ ممکن ہے کہ میں اُس سے خیانت کروں؟) یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے"۔ (یوسف:23)

3۔ "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ○"

"اور اُس عورت نے اس (یوسف) کا ارادہ کر لیا اور اگر اُس نے اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو وہ بھی اس عورت کا ارادہ کر لیتا۔ ہم نے اس لئے ایسا کیا تا کہ برائی کو اس سے دور کر دیں کیونکہ وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا"۔ (یوسف:24)

4۔ "قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ○ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ○ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ"۔

"عزیز مصر کی بیوی نے کہا: یہ وہی شخص ہے جس کے عشق کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں، میں نے اسے اپنی طرف مائل کیا تھا مگر وہ بچ نکلا لیکن اگر اس نے میرے حکم کی اطاعت نہ کی تو ضرور زندان میں ڈال دیا جائے گا

اور ذلیل ہوکر رہے گا۔(یوسف نے کہا): اے میرے رب! زندان مجھے اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں۔ اگر ان کی چالوں کو دُور نہ کر دے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ اُس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان کی چالوں کو اس سے دور کر دیا۔ وہ یقیناً سننے اور جاننے والا ہے"۔(یوسف:32تا34)

5۔ "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ"۔

"اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں اور کنیزوں تک محدود رہتے ہیں، ان پر کوئی ملامت نہیں ہے اور جو لوگ اس سے آگے کوئی چیز طلب کریں، وہ حد سے گزرنے والے ہیں"۔(مومنون:5تا7)

6۔ "وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ"۔

"پاک دامن مرد اور پاک دامن عورتیں"۔(احزاب۔35)

تفسیر

آبرومند محتاج:۔

پہلی آیت میں انفاق کے بہترین مصرف کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا انفاق خاص طور پر ان لوگوں کیلئے ہونا چاہئے جو اللہ کی راہ میں مشکلات میں گھر گئے ہوں (اور اپنے گھر اور کاروبار وغیرہ سے محروم ہو گئے ہوں، اللہ کی راہ میں جہاد میں شرکت کی وجہ سے وہ اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کیلئے کوشش نہیں کر سکتے)، نہ ہی سفر کر سکتے ہیں:

"لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۣ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔(بقرہ۔273)

اس کے بعد ان کی ایک اہم خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عفت اور خودداری کی وجہ سے ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ بے خبر اور جاہل لوگ انہیں غنی سمجھتے ہیں مگر تم ان کے چہروں سے ان کو پہچان سکتے ہو۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ۔

اس لئے کہ وہ اپنے دل کا حال لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اپنی بدحالی کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ضرورت مند ہونے کے باوجود بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن حقیقتِ حال سے واقف لوگ ان کے چہرے کی رنگت وغیرہ سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کی ایک اور خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کبھی اصرار کر کے لوگوں سے کوئی چیز نہیں مانگتے۔

"لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا"۔

یعنی حتی الامکان کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور اگر کبھی ان کی ضرورت مندی بہت شدت اختیار کر لے اور انہیں کسی سے مدد یا قرض کی درخواست کرنی پڑ جائے تو ہرگز اصرار نہیں کرتے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم جو بھی اچھی چیز اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہو، اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔ (بقرہ:273)

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کرنا اچھا عمل ہے، خاص طور پر اگر ان لوگوں پر انفاق کیا جائے تو جو خوددار اور عفیف ہوں۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس آیت میں جس عفت کا ذکر کیا گیا ہے، اُس کا تعلق مالی معاملات سے ہے، جنسی معاملات سے نہیں۔بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ان کی تعداد چار سو کے لگ بھگ تھی۔ان کا تعلق مکہ اور مدینہ کے اردگرد سے تھا لیکن ان کے پاس رہنے کیلئے ٹھکانہ تھا نہ کوئی رشتہ دار تھا جس کے پاس جا کر وہ رہ سکتے، نہ ہی ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش تھا۔وہ مسجدِ نبوی کے قریب ایک بڑے سے چبوترے پر گزر بسر کرتے تھے۔وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بڑے جوش وخروش سے جہاد میں شرکت کرتے تھے لیکن ضرورت مندی کی شدت کے باوجود اپنی عزتِ نفس اور عفت کی حفاظت کرتے تھے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے۔

بہرحال جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن مجید کی اس آیت میں مختلف الفاظ کی تعریف کیلئے استعمال ہوئے ہیں۔دوسری اور تیسری آیت میں حضرت یوسفؑ کی عفت اور پاک دامنی کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے سخت ترین حالات میں، جہاں گناہ کے تمام اسباب فراہم تھے، اپنی عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کی۔انہوں نے ان شدید حالات میں اللہ کے ہاں پناہ طلب کی اور اس عظیم امتحان میں سرخرو ہوئے۔

قرآن شریف کی آیات میں بیان ہوا ہے کہ وہ عورت جس کے گھر میں حضرت یوسفؑ رہتے تھے، ان کو ورغلانے لگی، اس نے ان سے لطف اندوز ہونے کی تمنا کا اظہار کیا اور تمام دروازے بند کر کے انہیں کہا کہ جلدی کرو! حضرت یوسفؑ نے کہا: میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔وہ (عزیزِ مصر) میرا نعمت دینے والا ہے۔اُس نے مجھے عزت کا مقام دیا ہے (کیا ممکن ہے کہ میں اُس کے ساتھ ظلم اور خیانت کروں) یقیناً ظالم (اور خائن) کبھی فلاح نہیں پاتے۔

"وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ"۔ (یوسف:23)

حضرت یوسفؑ کے حسن اور ملکوت نے نہ صرف یہ کہ عزیز مصر کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا بلکہ اُس کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عزیز مصر کی بیوی کے دل میں عشق کی حرارت تیز سے تیز تر ہوتی گئی مگر حضرت یوسفؑ، جو عفیف اور پاکباز تھے، اُن کا دل صرف عشقِ خدا سے پُر تھا۔

عزیز مصر کی جوان اور حسین بیوی نے اپنی آرزو کی تکمیل کیلئے تمام وسائل استعمال کئے جن میں سے کوئی ایک بھی کسی عام نوجوان کے جذبات و احساسات کو بھڑکانے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے شہوت کے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنی کشتی اللہ کے سپرد کر دی ورنہ یقیناً اُن کی کشتی اس طوفان میں غرق ہو جاتی۔

اگلی آیت میں اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اُس عورت نے (یوسفؑ) سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر اس نے اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتا (لیکن ہم نے اس طوفان میں یوسف کو اکیلا نہیں چھوڑا اور ہم نے ایسا اس لئے کیا) تا کہ بدکاری اور فحشا کو اس سے دور کر دیں، اس لئے وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا۔

"وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ○"(یوسف:24)

"مِنْ عِبَادِنَا" (ہمارے بندوں میں سے) اور "مُخْلَصِیْنَ" (جو خالص ہو چکے ہیں) کی اصطلاحات بہت پر معنی ہیں جنہیں حضرت یوسفؑ کے اعزاز کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

حضرت یوسفؑ اپنی عفت اور پاکیزگی کے باوجود عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے ایسے الزام کا نشانہ بنے جو اُن کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مدد اور نصرت کا جو وعدہ کیا ہوا ہے، گہوارے کے ایک شیر خوار بچے کی گواہی کے ذریعے، اس پر عمل کرتے ہوئے معجزانہ طور پر حضرت یوسفؑ کو نجات دی۔

بعض بے علم افراد نے اس آیت کے ان الفاظ "هَمَّ بِهَا" سے یہ مفہوم اخذ کیا کہ "حضرت یوسفؑ نے بھی اس سے لطف اندوز ہونے کا ارادہ کر لیا تھا" لیکن یہ مفہوم انبیاؑ کی عصمت کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ آیت کے لب و لہجہ کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے بلکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ "اگر برہانِ رب نے حضرت یوسفؑ کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ بھی آمادہ ہو جاتے، لیکن چونکہ برہانِ رب نے ان کی مدد کی، لہٰذا وہ آمادہ بھی نہیں ہوئے"۔

فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں بہت خوبصورت بات کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "سب نے، حتیٰ کہ شیطان نے بھی حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کی گواہی دی کیونکہ جب اُس نے راندۂ درگاہ خدا ہو جانے کے باوجود یہ کہا کہ میں سب کو گمراہ کروں گا لیکن تیرے خالص بندوں کو گمراہ نہ کر سکوں گا"۔

"قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ"۔(ص:82اور83)

فخر رازی اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ''جولوگ یہ بیہودہ اور بے بنیاد بات کرتے ہیں، اگر وہ اللہ کے پیروکار ہیں تو حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کے بارے میں اللہ کی گواہی مان لیں اور اگر شیطان کے پیروکار ہیں تو شیطان کی گواہی کو مان لیں''۔

(تفسیر کبیر،117:18)

چوتھی آیت بھی، جو حضرت یوسفؑ کی کٹھن زندگی کے حالات اور اُن کی عفت و پارسائی کو بیان کر رہی ہے، ایک اور طوفان کا ذکر کر رہی ہے جو حضرت یوسفؑ کے سامنے نمودار ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جب عزیز مصر کی اپنے کنعانی غلام سے معاشقے کی داستان زبان زدِ عام وخاص ہوگئی تو زنانِ مصر عزیز مصر کی ملامت کرنے لگیں۔ اُس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا اور معاشرے کی معزز خواتین کو مدعو کیا اور ایک حساس لمحے پر حضرت یوسفؑ کو اس محفل میں نمودار ہونے کا حکم دیا۔

جب ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کے جمالِ دل آرا کو دیکھا تو بے اختیار ہوگئیں اور پھلوں کی بجائے اُنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور سب یک زباں ہوکر بول اُٹھیں کہ یہ جوانِ رعنا کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی حسین فرشتہ ہے۔

اس وقت عزیز مصر کی بیوی نے ان عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: یہی وہ جوان ہے جس کی محبت کی وجہ سے تم مجھے سرزنش اور ملامت کرتی تھیں۔ ہاں! یہ بات صحیح ہے کہ میں نے اسے اپنی طرف دعوت دی لیکن اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ لیکن اگر وہ میرے حکم کو نہیں مانے گا تو زندان میں ڈال دیا جائے گا اور یقیناً ذلیل وخوار ہوگا''۔

"قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصّٰغِرِينَ○"(یوسف:32)

یہ حضرت یوسفؑ کیلئے ایک اور سخت امتحان تھا۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑے تھے جہاں ایک طرف عزیز مصر کی بیوی کا مطالبہ پورا کر کے وہ ہر قسم کے آرام وسکون اور نعمتوں اور آسائشوں سے محفوظ ہو سکتے تھے جبکہ دُوسری طرف اگر وہ اس کا مطالبہ پورا نہ کرتے تو زندان اور زندان کی سختیاں اُن کا مقدر ٹھہرتیں۔ لیکن انہوں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اپنی راہ کا انتخاب کیا اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کی:

''اے میرے رب! زندان (اور اس کی ساری سختیاں) مجھے اس چیز سے زیادہ محبوب ہیں جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں۔ اگر ان کے مکر کو مجھ سے دور نہ کر دے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں''۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ

وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ○(یوسف:33)

آیت کے الفاظ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اس محفل میں شریک خواتین بھی عزیز مصر کی بیوی کی ہم نوا ہوکر حضرت یوسفؑ کو اس کا مطالبہ مان لینے کیلئے اصرار کرنے لگی تھیں۔ان میں سے کچھ حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر کی بیوی کا مطالبہ مان لینے کے فوائد بتارہی تھیں اور کچھ اس کا مطالبہ نہ ماننے کے سنگین نتائج سے انہیں ڈرا رہی تھیں۔لیکن حضرت یوسفؑ نے جس راہ کا انتخاب کر لیا تھا،اُس کے نتیجہ میں وہ خود کو ذہنی اور قلبی طور پر زندان اور زندان کی سختیوں کیلئے آمادہ کر چکے تھے۔

یہ ایک سنجیدہ دھمکی تھی جس پر عمل بھی ہوگیا۔حضرت یوسفؑ زندان میں ڈال دیئے گئے لیکن ان کی عظیم روح عزیز مصر کے محل کے آلودہ ماحول سے رہا ہوگئی۔اگلی آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زندان کو ان کی ترقی کا زینہ بنادیا اور وہ اپنے تقویٰ اور پاکیزگی کو محفوظ رکھتے ہوئے مصر کے تختِ اقتدار تک پہنچ گئے جبکہ شہوت سے آلودہ افراد رُسوا اور الگ تھلگ ہوگئے۔یہ وہ بدلہ تھا جو اللہ نے دُنیا میں پاکیزہ خاندان کے اس چشم و چراغ کو عطا کیا۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ "۔

''اس کے رب نے اس کی دُعا کو قبول کرلیا اور ان عورتوں کے شر کو ان سے دُور کردیا۔یقیناً وہ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔(یوسف:34)

عفت:مومن کی نمایاں صفت:۔

مذکورہ بالا آیات میں سے پانچویں آیت میں مومنین کی نمایاں صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔قرآن مجید ایک مختصر مگر پر معنی جملے میں عفت کو اہلِ ایمان کی نمایاں صفات میں سے ایک صفت کے طور پر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ"۔

''اور وہ اپنی شرم گاہوں کو آلودہ ہونے سے بچاتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں اور کنیزوں تک محدود رہتے ہیں،ان سے لطف اندوز ہونے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے اور جو لوگ اس سے آگے کوئی چیز طلب کریں،وہ حد سے گزرنے والے ہیں''۔(مومنون:5 تا 7)

یہ بات قابلِ ذکر ہے ان آیات میں قرآن مجید نے مومنین کی نمایاں صفات کا ذکر کرتے ہوئے نماز،لغو سے اجتناب اور ادائے زکوٰۃ کے بعد عفت کا ذکر کیا اور اسے امانت اور ایفائے عہد جیسی خوبیوں پر مقدم رکھا۔

عفت: فلاح کی کنجی:۔

آخری آیت میں اللہ تعالیٰ مردوں اور عورتوں کے دس نمایاں گروہوں کا ذکر کر رہا ہے جن کو وہ مغفرت اور اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ ان دس گروہوں میں سے نواں گروہ وہ پاک دامن مرد اور عورتوں ہیں جنہوں نے اپنی عفت کی حفاظت کی۔

دسویں گروہ کا ذکر ان الفاظ میں ہے: ''اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں''۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عفت کا اللہ کی یاد اور اس کے ذکر سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دے رہا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ مغفرت اور اجر کی عظمت کو بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔

ایک اور مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ روزہ بھی جنسی شہوت پر قابو میں رکھنے کا ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس طرح روزے اور عفت کے درمیان بھی گہرا تعلق موجود ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ اللہ فرماتے ہیں:

"یَامَعْشَرَ الشَّبَابِ اِنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ اَلْبَاءَۃَ فَلْیَتَزَوَّجْ فَاِنَّہٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَعَلَیْہِ بِالصَّوْمِ "(تفسیر مراغی، 10:22)

''اے گروہ جوانان! تم میں سے جو کوئی شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ شادی کر لے، اس لئے کہ وہ آنکھوں کو لوگوں کی ناموس کی طرف اُٹھنے سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کیلئے دیگر چیزوں سے زیادہ موثر ہے اور جو شادی کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ روزہ رکھے''۔

عفت احادیث کی روشنی میں

کتبِ حدیث میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو عفت پر بہت زور دیتی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام عفت کو افضل ترین عبادت سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَفْضَلُ الْعِبَادَۃِ الْعِفَافُ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''یہاں اس احتمال کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہاں عفت سے اس کے وسیع معنی مراد ہوں۔ البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے شکم پرستی اور شہوت پرستی کے مقابل استعمال کیا گیا ہو۔

2۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَاعُبِدَاللّٰہُ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِنْ عِفَّۃِ بَطْنٍ وَفَرْجٍ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''اللہ کے ہاں کوئی عبادت عفتِ شکم اور عفت فرج سے افضل نہیں ہے''۔

3۔ آپؑ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میری عبادات کمزور اور روزے کم ہیں لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ میں نے مالِ حرام نہیں کھایا ہوگا۔ امامؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"اَیُّ الْاِجْتِهَادِ اَفْضَلُ مِنْ عِفَّةِ بَطْنٍ وَفَرْجٍ"۔ (اصولِ کافی، 79:2)

''کونسی کوشش اور جدوجہد عفتِ شکم اور عفتِ فرج سے افضل ہے''!

4۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا اَعَفَّ بَطْنَهُ وَفَرْجَهُ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4114)

''جب اللہ کسی شخص سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے شکم اور شرم گاہ کی عفت عطا کر دیتا ہے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں مفضل روایت کرتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے حقیقی شیعوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّمَا شِيْعَةُ جَعْفَرٍ مَنْ عَفَّ بَطْنَهُ وَفَرْجَهُ وَاشْتَدَّ جِهَادَهُ وَعَمِلَ لِخَالِقِهٖ وَرَجَا ثَوَابَهُ وَخَافَ عِقَابَهُ فَاِذَا رَاَيْتَ اُولٰٓئِكَ فَاُولٰٓئِكَ شِيْعَةُ جَعْفَرٍ"۔

''جعفرؑ (صادق) کے شیعہ وہ ہیں جو شکم پرستی اور جنسی شہوت کے معاملہ میں عفت اختیار کرتے ہیں، اپنے خالق کیلئے ان کی جدوجہد اور عمل میں شدت پائی جاتی ہے، وہ اس کے ثواب کے اُمیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہوتے ہیں۔ جب تم کسی کو ان صفات سے متصف پاؤ تو سمجھ لو کہ یہی جعفرؑ (صادق) کے شیعہ ہیں''۔ (وسائل الشیعہ، 199:11)

6۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"قَدْرُ الرَّجُلِ عَلٰى قَدْرِ هِمَّتِهٖ، وَصِدْقُهٗ عَلٰى قَدْرِ مُرُوَّتِهٖ، وَشُجَاعَتُهٗ عَلٰى قَدْرِ اَنَفَتِهٖ وَعِفَّتُهٗ عَلٰى قَدْرِ غَيْرَتِهٖ"۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 47)

''کسی شخص کی قدر و منزلت اس کی ہمت کے برابر، اس کی صداقت اس کی جوانمردی کے برابر، اس کی شجاعت دُنیا سے اس کی بے رغبتی کے برابر اور اُس کی عفت اُس کی غیرت کے برابر ہوتی ہے''۔

ظاہر سی بات ہے کہ غیرت مند شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی ناموس کو ناپاک نظروں سے دیکھے۔ لہٰذا وہ خود

بھی کسی کی ناموس پر بری نظر نہیں ڈالتا۔

7۔ ہم اس بحث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد اپنی اُمت کے بارے میں تین چیزوں سے خائف ہوں۔ پھر آپؐ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے تیسری چیز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

شَهْوَةُ الْبَطْنِ وَالْفَرْجِ"(اصولِ کافی، 79:2)

''شکم اور شرم گاہ کی شہوت''۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات وروایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام نے شہوتِ شکم وفرج سے پاکیزگی حاصل کرنے کے معاملے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، یہاں تک کہ اسے انسان کی شخصیت، غیرت، ایمان اور شیعہ ہونے کی نشانی قرار دیا۔ تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ انسانی معاشرے کی بہت سی مشکلات کا سبب شہوت شکم اور شہوت جنسی ہیں۔ شہوتِ شکم انسان کو صحیح غور وفکر سے محروم کردیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتا اور نہ ہی معاشرے میں عدل کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ یہی چیز اُسے انواع واقسام کے گناہوں کے ارتکاب کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

اس کے علاوہ شہوتِ شکم اور بھی بہت سی جسمانی اور اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہے۔ بعض اوقات تو یہ ایسے بت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو زندگی کے ہر میدان میں انسان سے اطاعت وبندگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری زمانے کی تصویر کشی ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ بُطُوْنُهُمْ اِلٰهَتُهُمْ وَنِسَائُهُمْ قِبْلَتُهُمْ وَدَنَانِيْرُهُمْ دِيْنَهُمْ، وَشَرَفُهُمْ مَتَاعُهُمْ، لَايَبْغُوْنَ مِنَ الْاِيْمَانِ اِلَّااِسْمَهُ وَلَامِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا رَسْمَهُ وَلَامِنَ الْقُرْآنِ اِلَّادَرْسَهُ، مَسَاجِدُهُمْ مَعْمُوْرَةٌ مِنَ الْبَنَاءِ وَقُلُوْبُهُمْ خَرَابٌ عَلَى الْهُدٰى"۔(بحار الانوار، 453:22)

''لوگوں پر ایک وقت آئے گا اُن کا پیٹ اُن کا خدا ہوگا، اُن کی عورتیں اُن کا قبلہ ہوں گی، اُن کے دینار (یعنی مال ودولت) اُن کا دین ہونگے، اُن کے اموال اُن کی عزت ہوں گے، اُن کے پاس ایمان کا صرف نام اور اسلام صرف رسم اور قرآن صرف پڑھنے کی حد تک رہ جائے گا۔ عمارت کے لحاظ سے اُن کی مساجد آباد ہوں گی لیکن ہدایت کے لحاظ سے ان کے دل ویران ہوں گے''۔

آ گے چل کر اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ اللہ اس دور کے لوگوں کو حکمران کے جور، قحط اور حکام کے مظالم میں مبتلا کر دے گا۔

احادیث میں بکثرت ظلم وجور کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ان کے معنی میں یہ فرق ہوسکتا ہے کہ ظلم کے معنی وسیع تر ہیں اور عدل کی راہ سے انحراف کو ظلم کہا جاتا ہے، خواہ ایسا کرنے والا کوئی حاکم ہو، یا عام شخص، جبکہ جور کا لفظ صرف حاکم کے ظلم کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

"اِيَّاكَ وَاِدْمَانَ الشَّبَعِ فَاِنَّهُ يَهِيْجُ الْاَسْقَامَ وَيَشِيْرُ الْعِلَلَ"۔

''زیادہ کھانے سے احتراز کرو کیونکہ اس سے مختلف بیماریوں میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور بعض بیماریاں پیدا ہوتی ہیں''۔(شرح غرر الحکم، حدیث:2681)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی اپنے پیٹ، زبان اور شرم گاہ کے شر سے محفوظ ہو گیا، وہ ہر برائی سے محفوظ ہو گیا۔(معراج السعادۃ:310)

بے عفّتی کے سدِّ باب کے طریقے

شہوت، خصوصاً شکم اور شہوت جنس کو قابو میں رکھنے کے بہت سے طریقے موجود ہیں۔ان میں سے بعض تو عام ہیں جنہیں ہر قسم کی اخلاقی برائی کا سدِ باب کرنے کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے جیسے اچھا ماحول، اچھی صحبت، اچھی خاندانی تربیت اور اخلاقی برائیوں کے برے نتائج سے آگاہی وغیرہ۔

ان مسائل پر ہم پہلی جلد میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو خاص کر جنس شہوت اور پیٹ کی شہوت کو قابو میں رکھنے کیلئے مؤثر اور مفید ہیں جن میں سے بعض کو ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔

1۔حجاب:۔

جنسی شہوت میں تحریک پیدا کرنے میں عورتوں کی بے حجابی اور بن سنور کر مردوں کے سامنے آنے کا بہت بڑا کردار ہے۔ خاص طور پر غیر شادی شدہ نوجوانوں پر ان کے منفی اثرات بہت گہرے اور مضر ہوتے ہیں۔ہم اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ بے عفتی اور بے پردگی کا آپس میں براہِ راست تعلق ہے۔جس قدر کسی معاشرے میں بے حجابی اور بے پردگی زیادہ ہوگی، اُسی قدر بے عفتی میں اضافہ ہوگا۔

دیکھا گیا ہے کہ گرمی کے موسم میں چونکہ خواتین کا لباس ہلکا پھلکا ہوتا ہے، لہٰذا اس موسم میں خواتین کو جنسی طور پر ہراساں

کرنے یا ان سے چھیڑ چھاڑ کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔اس کے برعکس موسمِ سرما میں چونکہ زیادہ کپڑے پہنے جاتے ہیں اور برہنگی کم ہوتی ہے،لہٰذا ایسے واقعات بھی کم ہوجاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پردے کے معاملے پر بہت تاکید کی ہے۔سورۂ احزاب اور سورۂ نور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے کہ بے حجابی و بے پردگی جنسی بے راہ روی کا زینہ ہے اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیاں دورِ حاضر میں کسی پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

بے پردگی کا ایک یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عورتیں اظہارِ جمال کے ذریعے مردوں کی جنسی شہوت کو بیدار کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے کی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔اگرچہ اس کے منفی اثرات تو ہر دور میں معاشرے پر مرتب ہوتے رہے ہیں لیکن ہمارے دور میں،جبکہ نوجوان حصولِ تعلیم میں مصروف رہنے اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے تک نسبتاً طویل عرصے تک غیر شادی شدہ رہتے ہیں، اس کے منفی اثرات بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔

2۔مخلوط محافل کی روک تھام:۔

موجودہ معاشرتی صورتِ حال میں یہ تو ممکن نہیں رہا ہے کہ مردوں اور خواتین کے ایک دوسرے سے ملنے پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے لیکن غیر ضروری میل جول کو بہر حال روکنا چاہئے۔ایسا کرنے سے عفت اور پاکیزگی کے ماحول کو تقویت ملے گی۔مغربی ممالک میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے آزادانہ میل جول کے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں،ہمیں اُن سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔

3۔ذرائع ابلاغ کا کردار:۔

نوجوانوں میں جنسی شہوت کو تحریک دینے اور جنسی بے راہ روی پھیلانے میں ذرائع ابلاغ کا بھی اہم کردار ہے۔گندی فلمیں، برہنہ اور نیم برہنہ تصاویر پر مشتمل اشتہارات،عشقیہ افسانے اور ناول،اگرچہ کچھ لوگوں کیلئے مالی مفادات کے حصول کا ذریعہ ہیں لیکن ان سے معاشرتی عفت اور پاکیزگی کی روا تار تار ہوجاتی ہے۔یہ بات بھی صحیح ہے کہ دورِ حاضر میں ذرائع ابلاغ کا جال بہت وسیع ہوگیا ہے اور ان کو اخلاقی حدود میں محدود رکھنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے،لیکن جس قدر بھی اس سلسلہ میں کوئی کوشش کی جائے، اُسی قدر بہتر نتائج حاصل ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دَورِ حاضر میں آزادی اظہار کا مسئلہ بھی ایک نازک صورتِ حال اختیار کر گیا ہے جس کی آڑ لے کر ذرائع ابلاغ اپنے اُوپر لگائی جانے والی پابندیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگتے ہیں۔علاوہ ازیں اگر والدین نوجوانوں کو ذرائع ابلاگ سے

حاصل ہونے والی تفریح سے دُور رکھنا چاہیں تو ان کے اور نوجوان نسل کے درمیان فاصلے پیدا ہو جانے کا خوف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ پسماندگی اور رجعت پسندی جیسے الزامات سے بچنے کی خاطر بھی کوئی قدم اُٹھانے سے گریز کرتے ہیں اور اس طرح سب کے سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے اسلامی معاشرے میں رونما ہونے والی بے حیائی کے سیلاب کی بڑھتی ہوئی موجوں کو صرف مایوسی سے دیکھتے رہتے ہیں۔

تیرھواں باب

غفلت و بے خبری

تمہید:۔

غفلت ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے جس میں زمان ومکان اور حالات وشرائط سے غفلت اور بے خبری سب داخل ہیں۔ اپنے اعمال وافعال کے نتائج سے بے خبری گزشتہ، موجودہ اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات سے بے خبری، زندگی کے تلخ وشیریں واقعات میں پوشیدہ عبرتوں سے بے خبری، سب کے سب غفلت کے مفہوم میں داخل ہیں۔

غفلت انسان اور انسانی معاشرے کی فلاح اور سعادت کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ یہ ایسا خطرہ ہے جو فرد یا معاشرے کی سالہا سال کی محنت کو چند لمحوں میں برباد کر دیتا ہے۔

ایسے واقعات بکثرت دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں کہ کسی شخص نے سالہا سال محنت اور زحمت کر کے بہت سا مال جمع کیا لیکن ایک معمولی سی غفلت کی وجہ سے رونما ہونے والی آتش زدگی نے چند لمحوں میں سب کچھ خاکستر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اخلاق نے غفلت اور ذکر (جو کہ غفلت کا متضاد ہے) کے بارے میں اپنی کتب میں تفصیل سے بحث کی ہے اور غفلت کے اسباب وعوامل کو دور کرنے اور انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے حقائق کو بیان کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کی روشنی میں اس اہم موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں:

1۔ "وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ"۔ (اعراف:179)

"اور یقیناً ہم نے جن وانس میں سے اکثر کو جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں۔ یہی لوگ غافل ہیں"۔

2۔ "وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِىْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ○"(انبیأ:97)

''اور وعدۂ برحق (قیامت) قریب آچکا ہے، اس وقت کفار کی آنکھیں پتھرا جائیں گی اور وہ کہیں گے: ہائے! ہماری بدبختی، ہم تو اس سے غافل تھے بلکہ ہم تو ظالم تھے''۔

3۔ "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا○(کھف:28)"

''اور ان لوگوں کے ساتھ رہو جو صبح وشام اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں اور دُنیوی خوبصورتی کی طلب میں اُن سے منہ نہ موڑو اور اس شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے''۔

4۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ"۔(یونس:7اور8)

''جو لوگ ہماری ملاقات (قیامت) کی اُمید نہیں رکھتے اور دُنیوی زندگی پر خوش اور مطمئن ہیں اور ہماری آیات سے غافل ہیں، اُن کے کئے ہوئے اعمال کی پاداش میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

5۔ "يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ○"(روم:7)

''یہ صرف دُنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں''۔

6۔ "سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ○"۔(اعراف:146)

''عنقریب میں اُن لوگوں کو، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے، اپنی آیات سے موڑ دوں گا، اگر یہ ساری آیات کو بھی دیکھ لیں، پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے، اگر یہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اسے نہیں اپناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا اور ان سے غافل تھے''۔

7۔ "فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ"۔(اعراف:136)

''پس ہم نے اُن سے انتقام لیا اور انہیں دریا میں غرق کر دیا، اس لئے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل تھے''۔

8۔"فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ○"(عنکبوت: 65)

''جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں اور جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی تک لے جاتا ہے تو پھر مشرک ہو جاتے ہیں''۔

9۔ "وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ○"(زخرف:36)

''جو کوئی اللہ کی یاد سے رُوگردانی کرے، ہم ایک شیطان اُس کے ساتھ لگا دیتے ہیں جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے''۔

10۔"اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ○"(اعراف: 201)

''جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جب کوئی شیطانی وسوسہ اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرنے لگتے ہیں اور ان کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے''۔

11۔"لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ○"(ق: 22)

''تم اس (قیامت) سے غافل تھے۔ ہم نے تمہارے پردے برطرف کر دیئے ہیں اور اب تمہاری نظر تیز ہے''۔

12۔"وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ○"(مریم: 39)

''انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ، اس دن جب سب کچھ ختم ہو جائے گا، مگر یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے''۔

تفسیر

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں بدترین انسانوں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ایسے لوگ جن سے بدتر شاید کوئی اور نہ ہوگا۔ان کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ہم نے جن وانس کی کثیر تعداد کو جہنم کیلئے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل (عقل) ہیں مگر وہ ان کے ذریعے سمجھتے نہیں ہیں،ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں ہیں،ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔یہ چوپایوں کی مانند بلکہ اُن سے بھی گمراہ تر ہیں اور یہی غافل ہیں۔''

"وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ○"(اعراف: 179)

اس آیت میں اس جہنمی گروہ کی بدبختی کی اصل اور بنیادی وجہ غفلت بتائی گئی ہے۔ایسی غفلت جو غور وفکر نہ کرنے اور چشم وگوش کو بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو ایسے مقام تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔اگر چوپائے غفلت میں زندگی بسر کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غفلت کو دور کرنے والے وسائل سے بے بہرہ ہیں۔لیکن اگر انسان علم وآگہی کے حصول کیلئے ضروری وسائل رکھتے ہوئے بھی غفلت میں ڈوبا رہے تو وہ چوپایوں سے بھی پست ہو جاتا ہے۔

اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جہنمی بننے پر مجبور کر رکھا ہے۔آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جہنم کا انتخاب کرتے ہیں۔انہیں عقل دی گئی لیکن اُسے استعمال نہیں کرتے،اُنہیں آنکھیں اور کان بھی دیئے گئے ہیں مگر یہ ان کا بروئے کار نہیں لاتے اور ان سے حقائق کے ادراک کا کام نہیں لیتے۔

لہٰذا ان کے اس انجام کی وجہ ان کا اپنا طرزِ عمل ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ نے ایک مشروط فیصلہ کر رکھا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لائیں گے،ان کا انجام جہنم ہوگا اور ایسا کرنا یا نہ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

دوسری آیت میں قیامت کے دن کفار کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے۔جب اللہ کا وعدہ قریب آ جائے گا تو کفار پر ایک وحشت طاری ہو جائے گی اور ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ایسے میں وہ چیخ چیخ کر فریاد کریں گے:

ہائے ہماری بدبختی!ہم تو اس ہولناک حقیقت سے غافل تھے،ہم تو ظالم تھے۔

"وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ○"(انبیأ: 97)

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ کافر بھی غفلت کو ہی اپنی بدبختی کا سبب قرار دیں گے۔ایسی غفلت جس نے انہیں اپنے آپ پر ظلم کرنے پر لگا دیا، حتیٰ کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں اور آسمانی کتب کے ساتھ بھی ظالمانہ رویہ اپنالیا۔

کفار یہ بات اس وقت کہیں گے جب قیامت کا زلزلہ پوری کائنات کو ہلا کر رکھ دے گا اور غفلت کے پردے چاک ہونے لگیں گے۔اس وقت توبہ کے دروازے بھی بند ہو چکے ہوں گے۔

آیت میں آنکھوں کیلئے ''شَاخِصَة'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مصدر ''شخوص'' (بروزن خلوص) ہے اور یہ شدید حیرت اور ندامت کے وقت آنکھوں کی حرکت کے رک جانے کے معنی استعمال ہوتا ہے۔

تیسری آیت میں رسول ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کس قسم کے افراد کے ساتھ رہیں اور کس قسم کے افراد کو اپنے آپ سے دور کر دیں۔رسولؐ اللہ کو حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:۔

''اپنے آپ کو ان کے ساتھ رکھو جو صبح و شام اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور صرف اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، دُنیوی زینت کے حصول کی خاطر ان سے منہ نہ پھیرو اور جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، ان کی اطاعت نہ کرو، جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور ان کا معاملہ حد سے گزر گیا''۔

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○ (کھف:28)"

اس آیت میں جن لوگوں کو رسولؐ اللہ کی صحبت اور ہم نشینی کا اہل قرار دیا گیا، ان کی صفات یہ بتائی گئی ہیں۔کہ وہ ایمان رکھتے ہیں۔اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور صبح و شام اس کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔اس کے برعکس آپ کو ایسے لوگوں کی ہم نشینی اور ان کی بات ماننے سے منع کیا گیا ہے جس کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں، جو خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور ان کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔

اس آیت سے خواہشاتِ نفسانی کی پیروی اور اس کام میں زیادہ روی کا غفات کے ساتھ باہمی تعلق بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس آیت کے یہ الفاظ کے ''ہم نے ان کے دل کو اپنی یاد سے غافل کر دیا'' قابل غور ہیں۔

ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ خواہشات نفسانی کی پیروی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو یہ سزا دیتا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کے شان نزول کے بارے میں ہے کہ رسولؐ اللہ کے دور کے چند دولت مند متکبر رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے محمد! اگر آپ صدرِ محفل ہوں اور ان لوگوں کو محفل سے دور کر دیں جن کے لباس اور جسم کی بدبو سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے

اور جنہوں نے سخت اور کھردرا لباس پہنا ہوتا ہے تو پھر آپ کی محفل ہم جیسے اشراف کے شایانِ شان ہوگی۔ اس وقت ہم بھی آپ کی محفل میں شریک ہو کر آپؐ کے ارشادات سنیں گے، لیکن ان لوگوں کی موجودگی میں آپ کی محفل میں ہماری کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی حقیقت کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ صلح و جنگ، دونوں میں ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُن کی سوچ ایسی ہے کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔ لہٰذا اللہ نے جناب رسولِؐ خدا کو ان کے بارے میں خبردار کر دیا۔

چوتھی آیت میں اہلِ جہنم کی بعض صفات کا ذکر کیا گیا ہے:

''جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے (قیامت پر ایمان نہیں رکھتے) بلکہ صرف دُنیوی زندگی پر راضی اور مطمئن ہیں اور جو ہماری آیات سے غافل ہیں، ان کے اعمال کی وجہ سے اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

اس آیت میں جو بات سب سے آخر میں اور زور دے کر کہی گئی ہے، وہ ''اللہ تعالیٰ کی آیات سے غفلت'' ہے جو آخرت کے افکار اور دنیا پر اعتماد کی بنیادی وجہ ہے۔ اس کے برعکس اہلِ جنت کی خوش قسمتی اور سعادت کی بنیادی وجہ عرفان و آگہی اور اللہ کا ذکر ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا گیا ہے۔

تفسیر رُوح البیان میں اس آیت کے ذیل میں ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں تین قسم کے لوگوں پر حیران ہوں: ایک وہ جو دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر ہنستے ہیں، دوسرے وہ جو دُنیا سے دل لگائے ہوئے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اس سے جدا ہونا ہے، تیسرے وہ جو غافل ہیں مگر یہ جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے ان سے غافل نہیں ہیں اور پھر بھی وہ لہو ولعب میں مصروف ہیں''۔

اسی کتاب میں اس حدیث کے ذیل میں نعمان بن منذر کا واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں حیرہ کا بادشاہ تھا۔ ایک دن اُس نے ایک درخت کے نیچے لہو ولعب کی محفل برپا کی۔ اُس کا ایک دوست جس کا نام عدی تھا، اُس سے بولا کہ اے بادشاہ! یہ درخت ایک آواز دے رہا ہے، کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا پکار رہا ہے؟ بادشاہ نے کہا: نہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ عدی نے جواب دیا کہ یہ درخت کہہ رہا ہے:

رُبَّ رَکبٍ قَدانَاخُوا حَولَنا
یَمزَجُون الخَمرَ بِالمَأ الزُّلالِ
ثُمَّ اَضقَحُوا اَسَفَ الدَّ هرِبِهِم
وَ کَذٰلِكَ الدَّهرُ حَالًا بَعد حالٍ

''کتنے ہی شہسوار ہماری طرف آ کر گھوڑوں سے اُترے اور انہوں نے عیش و عشرت کی محفل برپا کی اور شراب کو آبِ زلال میں ملا کر پیا لیکن جلد ہی زمانے کے طوفان نے ان کی بساط اُلٹ دی۔ یہ ہے دُنیا اور ہر زمانے کے

بعدآنے والے زمانے کا حال''۔(رُوح البیان:18:4)

پانچویں آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو دُنیوی زندگی کے ظاہر پر قناعت کئے بیٹھے ہیں اور اس دُنیا کی حقیقت اور اس کے اسرار سے غافل ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے:

''کفار کی یہ جماعت صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتی ہے اور آخرت سے غافل ہے''۔

"يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ○"(روم:7)

اگر غفلت کا منحوس سایہ ان کے دِلوں پر پڑا ہوا نہ ہوتا تو دُنیوی زندگی میں بھی قدم قدم پر اور جگہ جگہ اللہ اور آخرت کی نشانیاں نظر آتیں۔قرآن مجید زمین وآسمان کی ہر چیز کو اور اس دُنیا پر حاکم نظام کو اللہ کی نشانیاں قرار دیتا ہے۔اسی دُنیا میں رونما ہونے والے حوادث میں آخرت کی نشاندہی کرنے والی نشانیاں بھی موجود ہیں۔بات صرف اتنی سی ہے کہ جن کے قلب زندہ اور دل کی آنکھیں اور کان زندہ ہیں، وہی اس نغمۂ توحید کو سن سکتے ہیں اور جن کے دلوں کو غفلت نے اندھا کر دیا ہے، وہ اسے نہیں سن سکتے۔

یہاں پر اس نکتہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ''ھُم'' کی ضمیر کی تکرار اس بات پر زور دینے کیلئے ہے کہ ان کی یہ غفلت ہی ان کی ظاہر بینی اور حقیقت سے دوری کا سبب ہے۔

یہ بھی ضرور پیشِ نظر ہے کہ''غفلت'' کا لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں آگہی کے حصول کے ذرائع موجود ہوں لیکن انسان خواہشاتِ نفسانی کے غلبے یا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے یا دیگر وجوہات کی بنیاد پر انہیں نظر انداز کر دے۔اس بات کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ روم کی اس آیت کے بعد والی آیات میں، جن میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر اور کائنات میں پھیلی ہوئی توحید اور قیامت کی نشانیوں کا ذکر کر کے غافلوں کو خبردار کیا ہے۔

چھٹی آیت میں کفار کے خطرناک ترین گروہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔یہ ایسے کافر ہیں جو کفر سے آلودہ ہونے کے ساتھ ساتھ تکبر وتعصب اور لجاجت جیسی بیماریوں میں بھی مبتلا ہیں۔آیت کے اختتام پر ان کی بدبختی کی وجہ بھی غفلت بتائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:''عنقریب میں ان لوگوں کو، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، اپنی آیات سے موڑ دوں گا۔اگر یہ ساری آیات کو بھی دیکھ لیں تو ایمان نہیں لائیں گے۔اگر یہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اسے نہیں اپناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اپنا لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل تھے''۔

"سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ○"۔(اعراف:146)

''سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ''، ''میں اپنی آیات سے موڑ دوں گا'' کے بارے میں مفسرین نے بہت زیادہ مباحث کی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا کام تو آیات کی طرف ہدایت دینا ہے، تمام انبیاؑ واوصیاؑ، جو اس کی طرف سے آئے، اُن کی بھی یہی ذمہ داری تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک خاص گروہ کو اپنی آیات سے موڑ دے اور ایمان لانے سے روک دے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف کی آیات میں غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے بعض اعمال جیسے تکبر، تعصب اور لجاجت وغیرہ کے نتیجہ میں اس کے دل پر تاریکی کا ایک حجاب ڈال دیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ مشاہدۂ جمالِ حق کی نعمت سے محروم ہوجاتا ہے۔درحقیقت یہ ان کے اپنے برے اعمال ہیں جو حجاب بن جاتے ہیں۔اس کو اللہ تعالیٰ کیطرف نسبت دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان اعمال کا یہ اثر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ اس طرح کے اعمال انجام دیتے ہیں، قدرت اُنہیں اس کی یہ سزا دیتی ہے کہ ان کا رُخ اللہ کی آیات کی طرف سے مڑ جاتا ہے۔

آیت کے اختتام پر اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ ان کو آیاتِ الٰہی سے موڑنے کی وجہ ان کا اللہ کی آیات کو جھٹلانا اور اس کی نشانیوں سے غافل رہنا ہے۔

ساتویں آیت، قرآن شریف میں ان آیات کے بعد واقع ہے جن میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے حق کے خلاف سرکشی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددُعا کی وجہ سے ان پر مختلف قسم کی سزاؤں کے نزول کا ذکر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

''ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں دریا میں غرق کردیا، اس لئے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور ان سے غافل تھے''۔(اعراف:136)

''فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِی الۡیَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِیۡنَ''۔

اس آیت میں قومِ فرعون کی ہلاکت وبدبختی کی وجہ آیات الٰہی کی تکذیب اور ان کی غفلت بتائی گئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تکذیبِ آیاتِ الٰہی کی وجہ بھی ان کی غفلت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے بعض آیات کی تکذیب کی ہو اور بعض سے غفلت برتی ہو۔اس صورت میں تکذیب اور غفلت میں سے ہر ایک ان پر آنے والے عذاب کا ایک مستقل سبب قرار پائیں گی۔

بعض مفسرین نے کہا کہ ''عَنۡهَا'' میں ''هَا'' کی ضمیر عذاب اور انتقام کی طرف لوٹ رہی ہے۔اگر یہ بات صحیح ہو تو آیاتِ الٰہی کی تکذیب ہی انکی ہلاکت کا سبب قرار پاتی ہے۔لیکن یہ احتمال بہت کمزور ہے، اس لئے کہ یہ ضمیر آیاتِ الٰہی کے بعد بیان ہوئی ہے اور اس کا تعلق بھی آیات الٰہی سے بنتا ہے۔

آٹھویں آیت میں اگرچہ غفلت کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے لیکن اس کا مفہوم اس آیت میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ آیت جنابِ رسولِ اللہ کے دَور کے مشرکین کے بارے میں ہے جو شدید غفلت میں مبتلا تھے۔کبھی کبھی وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہوجاتے تھے اور کبھی کبھی مکمل طور پر اس میں غرق ہوجاتے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرمارہا ہے۔

''جب یہ کشتی پرسوار ہوتے ہیں (طوفان کی لہریں ان کی کشتی کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں) تو وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارنے لگتے ہیں لیکن جب اللہ انہیں نجات دے کر خشکی تک لے جاتا ہے تو وہ پھر مشرک بن جاتے ہیں''۔

"فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ○"(عنکبوت: 65)

خطرناک طوفان کی ہلاکت آفرینی کو دیکھ کر ان کے دل اور چشم وگوش پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے برطرف ہوجاتے ہیں، ان کی عقل اور عقل کے چشم وگوش فعال ہوجاتے ہیں۔ بعض لوگ اس بیداری کو غنیمت جان کر اپنی گزشتہ روش کو ترک کر دیتے ہیں لیکن اکثر لوگ خطرہ ٹل جانے کے بعد دوبارہ شرک کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں لکھا ہے کہ عرب کے مشرکین دریائی سفر میں اپنے بت بھی کشتی میں اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کی برکت سے وہ طوفان وغیرہ جیسے حوادث سے محفوظ رہیں۔ لیکن جب وہ اپنی کشتی کو طوفانی لہروں میں گھرا ہوا دیکھتے تھے تو بتوں کو دریا میں پھینک کر ''یا اللہ، یا اللہ'' کہنے لگتے تھے۔ (روح البیان ,493:6)

نویں آیت میں ایک عام ضابطہ بیان کیا جارہا ہے جو تمام اقوام پر صادق آتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہا ہے:

''جو کوئی اللہ کے ذکر سے رُوگردانی کرتا ہے، ہم ایک شیطان اُس کے ساتھ لگا دیتے ہیں جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے''۔

"وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ○"(زخرف: 36)

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا ذکر فرشتوں کی ہم نشینی کا سبب بنتا ہے۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ....."۔

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہتے ہیں، اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں''۔

ان دونوں آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی یاد سے رُوگردانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے جبکہ اللہ کی یاد کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فرشتے انسان کی مدد کیلئے نازل ہوتے ہیں۔

جنابِ رسولؐ خدا سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اِذَا أَرَادَاللّٰهُ بِعَبْدٍشَرًّا قَيَّضَ لَهُ شَيْطَاناً قَبْلَ مَوْتِهٖ بِسَنَةٍ، فَلَايَرٰى حَسَنًا اِلَّاقَبَّحَهُ عِنْدَهٗ حَتّٰى لَايَعْمَلُ بِهٖ، وَلَايَرٰى قَبِيْحًا اِلَّاحَسَّنَهُ حَتّٰى يَعْمَلُ بِهٖ"۔

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے میں شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی موت سے ایک سال قبل ایک شیطان

اس کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ اس کے بعد ہر اچھا عمل اسے برا نظر آنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے ترک کر دیتا ہے اور برا عمل اسے اچھا نظر آنے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے کر گزرتا ہے"۔ (رُوح البیان، 369:8)

دسویں آیت میں ان متقی افراد کا ذکر ہے جو غفلت کا شکار ہو جانے یا شیطانی وسوسوں سے دوچار ہو جانے کی صورت میں فوراً اللہ کے ذکر کے ذریعے غفلت کے پردوں کو چاک کر دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جن لوگوں نے تقویٰ کی روِش اختیار کی، جب وہ شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور فوراً ان کی بصیرت روشن ہو جاتی ہے۔" (اعراف:201)

"اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ۝"

اس آیت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ کا ذکر انسان کے دل کی آنکھ کو بینا کر دیتا ہے جبکہ غفلت انسان کے دل پر شیطان کے تسلط کی راہ ہموار کر دیتی ہے۔

اس آیت میں لفظ "طٰٓئِف" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "طواف کرنے والا"۔ اس سے مراد وہ وسوسے ہیں جو شیطان کی طرف سے آ کر انسان کے دل کا طواف کرنے لگتے ہیں تاکہ اس میں داخل ہونے کی راہ تلاش کریں اور اس کعبے کو بت خانے میں بدل دیں۔ جب انسان اللہ سے غافل ہوتا ہے تو ان وسوسوں کو دل میں داخل ہونے کی راہ مل جاتی ہے لیکن جیسے ہی انسان اللہ کا ذکر کرنے لگتا ہے تو یہ وسوسے انسان کے دل سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت کا نور اس میں چمکنے لگتا ہے۔

گیارھویں آیت میں اُن غافلوں کا ذکر ہے جو ساری زندگی غفلت میں گزار دیتے ہیں۔ جیسے ہی اجل کا طمانچہ ان کے منہ پر لگتا ہے اور ان کی زندگی کے سارے اعمال ان کی نظر کے سامنے آ جاتے ہیں تو ان پر شدید وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ اس وقت ان سے کہا جاتا ہے:

"یہ وہی حقیقت ہے جس سے تم فرار کرتے تھے"۔

اس کے بعد قیامت کے منظر کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ میدانِ محشر میں لائے جائیں گئے اور ان کے اعمال کے گواہ اللہ کی عدالت میں ان کے اعمال کی گواہی دینے کیلئے آئیں گے تو ایک شدید وحشت ان کے سارے وجود پر مسلط ہو جائے گی۔ اس حالت میں ان سے یہ کہا جائے گا:

"تم اس حقیقت سے غافل تھے اور ہم نے تمہاری غفلت کا پردہ چاک کر دیا ہے، اب تمہاری نظر خوب تیز ہے"۔

"لَقَدۡ کُنۡتَ فِیۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ ۝" (ق:22)

قیامت کے دن اللہ کے دو کارندے اللہ کی عدالت میں انسان کے ساتھ ہوں گے۔ ان میں سے ایک اسے ہانکتا ہوا عدالت الٰہیہ میں لے کر آئے گا اور دوسرا اس عدالت میں اس کے اعمال کی گواہی دے گا۔

ممکن ہے یہ وہی دو فرشتے ہوں جو دُنیا میں انسان کے اچھے اور برے اعمال لکھنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ انسان اس دُنیا میں ان فرشتوں کو نہیں دیکھ سکتا اور کفار تو ان پر ایمان بھی نہیں رکھتے تھے لیکن قیامت کے دن جب غفلت کے حجاب اُٹھ جائیں گے تو ان کی آنکھیں سب کچھ دیکھنے لگیں گی۔

بارہویں اور آخری آیت میں قیامت کے دن غافلوں کی حالت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ جس دن سب کچھ ختم ہو چکا ہوگا۔ انکی حالت یہ ہے کہ یہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے''۔ (مریم:39)

''وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝''(مریم:39)

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ''یَوْمَ الْحَسْرَۃِ'' ہے، اس لئے کہ اس دن غافل اور بے خبر خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور اپنے اعمال کا مشاہدہ کریں گے۔ ایک طرف سے ان کا اعمال نامہ، دُوسری طرف سے گواہی دینے والے فرشتے، اور سب سے دردناک بات یہ کہ انسان کے اپنے اعضا بھی اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ ایسے میں ندامت اور حسرت کی آگ میں جلنے کے سوا انسان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا، تلافی کی بھی کوئی صورت ممکن نہ ہوگی۔ اس وقت فرشتے ان کی سرزنش کرتے ہوئے ان سے کہیں گے:

''یہ سب تمہاری غفلت کا پھل ہے''۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ کی یاد سے غفلت کے نتیجہ میں جو خطرہ ہماری فلاح وسعادت کو لاحق ہو سکتا ہے، وہ اس قدر بڑا ہے کہ غالباً اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ غفلت ہماری سعادت کی تمام بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے اور بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح زندگی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور انسان کی تمام خداداد صلاحیتوں کو ناکارہ اور بے اثر کر دیتی ہے۔

غفلت، احادیث کی روشنی میں

کتبِ احادیث میں غفلت اور اس کے مہلک نتائج کے بارے میں بکثرت ایسی احادیث موجود ہیں جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں درج کرتے ہیں:

1۔ جب جنابِ رسولِ خدا معراج پر تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ سے خطاب ہوا:

"يَاَحْمَدُ اَنْتَ لَا تَغْفَلْ اَبَدًا مَنْ غَفَلَ عَنِّیْ لَا اُبَالِیْ بِاَیِّ وَادٍ هَلَكَ"۔

''اے احمدؐ! مجھ سے کسی بھی لمحے غافل نہ ہونا، اس لئے کہ جو مجھ سے غافل ہوتا ہے، میں اُس کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ کس گڑھے میں گر کر ہلاک ہوتا ہے''۔(ارشاد القلوب، مطبوعہ بیروت، 214:1)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غفلت کا انجام ہلاکت ہوتا ہے۔

2۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک مختصر مگر پر معنی جملے میں فرماتے ہیں:

"اَلْغَفْلَةُ اَضَرُّ الْاَعْدَاءِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 128:1)

''غفلت سب سے زیادہ نقصان دہ دُشمن ہے''۔(کیونکہ یہی تمام گناہوں کی جڑ ہے)۔

3۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلْغَفْلَةُ تَكْسِبُ الْاِغْتِرَارَ۔ وَتُدْنِیْ مِنَ الْبَوَارِ"۔(شرح فارسی غرر الحکم، 295:7)

''غفلت انسان کو فریب دے کر ہلاکت کے قریب کر دیتی ہے''۔

4۔ آپؑ ہی سے مروی ہے:

"اَلْغَفْلَةُ ضَلَالُ النُّفُوْسِ وَعُنْوَانُ النُّحُوْسِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 369:1)

''غفلت دِلوں کی گمراہی اور نحوست کا عنوان ہے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"وَيْلٌ لِّمَنْ غَلَبَتْ عَلَيْهِ الْغَفْلَةُ فَنَسِيَ الرَّحْلَةَ وَلَمْ يَسْتَعِدَّ"۔

''ہلاکت ہے اُس شخص کیلئے جس پر غفلت غالب آجائے اور وہ اپنے سفر کو بھول جائے اور خود کو اس کیلئے آمادہ نہ کرے''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 227:6)

6۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنْ كَانَ الشَّيْطَانُ عَدُوًّا فَالْغَفْلَةُ لِمَاذَا"۔(بحار الانوار 190:75)

''جب شیطان انسان کا دُشمن ہو تو پھر غفلت کس لئے؟''

مندرجہ بالا احادیث میں جس غفلت کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے ''اللہ سے غفلت''، ''قیامت سے غفلت'' اور ''شیطانی وسوسوں سے غفلت'' مراد ہے۔

7۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَيَالَهَا حَسْرَةً عَلٰى كُلِّ ذِىْ غَفْلَةٍ اَنْ يَكُوْنَ عُمُرُهٗ عَلَيْهِ حُجَّةً وَاَنْ تُؤَدِّيَهُ اَيَّامُهٗ اِلَى الشَّقْوَةِ"(نہج البلاغہ، خطبہ:64)

''ہلاکت ہے ہر غافل کیلئے جس کی عمراس کے خلاف حجت ہے اوراس کی زندگی کے ایام اسے بدبختی تک لے جائیں''۔

یہاں غفلت سے مراد یہ ہے کہ انسان ساری زندگی اپنے انجام سے غافل رہے۔

8۔ غفلت کا مسئلہ اس قدر حساس ہے اوراہم ہے کہ انبیاؑ کی بعثت کا ایک مقصد غفلت کی بیماری کا علاج کرنا بیان کیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ خطبہ 108 میں امیرالمومنینؑ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مُتَتَبِّعٌ بِدَوَائِهٖ مَوَاضِعَ الْغَفْلَةِ وَمَوَاطِنَ الْحَيْرَةِ"۔

''آپؐ ایسے طبیب تھے جوغفلت کی بیماری کی دوا تیار کر کے غفلت کے مریضوں کے پیچھے پھرتے تھے''۔

9۔ ایک اورحدیث میں غفلت کے برے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ فرماتے ہیں:

"بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمَوْعِظَةِ حِجَابٌ مِنَ الْغَفْلَةِ وَالْغِرَّةِ"۔

''غفلت اورغرور تمہارے اورنصیحت کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں''۔(شرح فارسی غررالحکم، 296:7)۔

10۔ احادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ آپؑ ایک ایسی بستی کے پاس سے گزر رہے تھے جس کے سب باشندے اللہ کے غضب کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گئے تھے۔آپؑ نے ان میں سے ایک کو زندہ کیا اوراس سے پوچھا کہ تم لوگ کیسے اعمال کرتے تھے جن کی وجہ سے عذابِ خدا کا نشانہ بنے ہو؟ اُس نے جواب دیا: ہمارے اعمال یہ تھے: بت پرستی، حُبِ دُنیا، خوف کی کمی، لمبی آرزوئیں اورغفلت کے ساتھ لہوولعب۔(سفینۃ البحار، مادہ غفل)۔

11۔ امیرالمومنین علیہ السلام غفلت کے اجتماعی پہلو کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مِنْ دَلَائِلِ الدُّوْلَةِ قِلَّةُ الْغَفْلَةِ"۔(شرح فارسی غرر الحکم، 296:7)

''حکومتوں کی ترقی کی وجہ غفلت کی کمی ہے''۔

بے شک معاشرتی اورقومی معاملات میں غفلت اور بے توجہی عظیم نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

12۔ ہم اس بحث کو امیرالمومنینؑ کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ نے انتہائی بلیغ انداز میں لوگوں

کوخطاب کر کے فرمایا:

"اِتَّقِ اَیُّهَا السَّامِعُ مِنْ سَکْرَتِكَ وَاسْتَیْقِظْ مِنْ غَفْلَتِكَ، وَاخْتَصِرْ مِنْ عَجَلَتِكَ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 296:7)

''اے سننے والے! اپنی بے ہوشی سے باز آ، اپنی غفلت سے بیدار ہو اور اپنی جلد بازی کو کم کر''۔

مولائے متقیان علیہ السلام کے اس ارشاد کی رُو سے تین چیزیں انسان کی بدبختی اور ہلاکت کا سبب ہیں:

''شہوت پرستی کی بے ہوشی و مستی، حقائق سے غفلت اور کاموں میں جلد بازی''۔

نتیجہ:۔

اگر چہ لوگوں کی اکثریت غفلت کے خطرناک نتائج سے بے خبر ہے لیکن عظیم الٰہی پیشوا ان نتائج اور المیوں کو دیکھتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے مختلف اسالیب میں لوگوں کو خبردار کیا جس کی مثالیں ہم مذکورہ بالا احادیث میں دیکھ سکتے ہیں۔

ایک بار پھر اس نکتہ کی یاد آوری ضروری ہے کہ غفلت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اللہ سے غفلت، آخرت سے غفلت، دُنیا کی ناپائیداری سے غفلت، شیطان کے مکر اور وسوسوں سے غفلت اور مختصر الفاظ میں وہ تمام اُمور جو انسان کی سعادت و ہلاکت میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، ان سب سے غفلت، غفلت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

غفلت کے بارے میں اہم نکات

اگر چہ غفلت انسان کی عاقبت پر غیر معمولی اثرات مرتب کرتی ہے اور اس کا شمار صفاتِ رذیلہ میں ہوتا ہے لیکن معلوم نہیں علمائے اخلاق نے اس کو کیوں اہمیت نہیں دی؟ اُنہوں نے یا تو اس کے بارے میں سرے سے کوئی بات نہیں کی یا بہت کم بات کی ہے۔ بہر حال اس بحث سے متعلق چند باتیں بہت اہم ہیں۔ ہم ایک ایک کر کے ان کا ذکر کرتے ہیں:

غفلت کے اسباب

الف۔ جہالت:۔

غفلت اور بے خبری کی ویسے تو بہت سی وجوہات ہیں لیکن ان میں سب سے پہلی وجہ جہالت اور لاعلمی ہے۔ اللہ کے مقام، قیامت، دنیوی مال و مقام کی ناپائیداری اور شیطانی وسوسوں اور فریب کاریوں سے لاعلمی غفلت کا سب سے اہم سبب ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ مَنْ عَرَفَ الْاَیَّامَ لَمْ یَغْفَلْ عَنَ الْاِسْتِعْدَادِ"۔(میزان الحکمہ، 15189:3)

''جوشخص دُنیا کی حقیقت کو پہچان لے، وہ آخرت کی تیاری سے غافل نہیں ہوتا''۔

ب۔غروراورخود پسندی:۔

غرور اور خود پسندی بھی غفلت کا ایک اہم سبب ہے، اس لئے کہ مغرور اور خود پسند انسان صرف اپنی کامیابیوں پر نظر رکھتا ہے اوران پر خوشی سے پھولتا رہتا ہے۔وہ اپنی ان کامیابیوں کولازوال اوردائمی سمجھنا شروع کردیتا ہے اوریہی بات اس کی غفلت اورآگے چل کراس کی شکست اورناکامی کااہم سبب بن جاتی ہے۔

تاریخ میں ایسے افراد کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جوغرور اورخود پسندی کی وجہ سے غفلت کا شکار ہوگئے اورشکست وناکامی ان کامقدر بن گئی۔

ج۔نعمتوں کا نشہ:۔

نعمتوں کا نشہ بھی غرور اورخود پسندی کے نشے کی مانند ہوتا ہے اورانسان کوغفلت کے گرداب میں پھینک دیتا ہے۔جب کم ظرف افراد کے پاس نعمتوں کی فراوانی ہوجائے تووہ اپنے اردگردموجودحقائق سے بےخبراورغافل ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ جب موت کاطمانچہ اُن کے گال پر پڑتا ہےتوانہیں ہوش آتی ہے۔اس بارے میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ غَفَلَ عَنْ حَوَادِثِ الْاَیَّامِ اَیْقَظَهُ الْحِمَامُ"۔(شرح فارسی غرر الحکم، 297:6)

''جوشخص حوادثِ زمانہ سے غافل ہوجائے،موت اُس کو بیدارکردیتی ہے''۔

اس بارے میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ قَسْوَةَ الْبَطْنَةِ وَ كَظَّةَ الْمَلَاهِوَسَكْرَ الشَّبَعِ، وَغَرَّةَ الْمِلْكِ مِمَّا يُشَبِّطُ وَيُبْطِئُ عَنِ الْعَمَلِ وَيَنْسِي الذِّكْرَ وَيُلْهِي عَنِ اقْتِرَابِ الْاَجَلِ حَتّٰى كَاَنَ الْمُبَلَّىَ بِحُبِّ الدُّنْيَابِهٖ خَبْلٌ مِنْ سُكْرِ الشَّرَابِ"۔(تحف العقول: 311)

''شکم پرستی اورشکم سیری کی مستی اورحکومت کا نشہ انسان کومیدانِ عمل میں سست کردیتا ہے،اللہ کے ذکر سے غافل کردیتا ہے،موت کے قریب ہونے سے بےخبرکردیتا ہے، یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویاحُبِ دُنیا کے نشے میں مست انسان شراب کے نشے میں مست ہے''۔

د۔جسمانی صحت:۔

صحت اور تندرستی اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے لیکن یہ بھی غفلت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک پوشیدہ احسان ہے کہ وہ کبھی کبھی صحت اور تندرستی کی نعمت انسان سے لے لیتا ہے اور بیماری اور درد میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے انسان کی عقل سے غفلت کے پردے برطرف ہو جاتے ہیں اور اُس کے دل کی آنکھیں حقائق کو دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہیں اور وہ انکے مطابق زندگی میں مناسب رویہ اپنا لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولؐ خدا نے ایک مرتبہ سلمان فارسیؓ کی عیادت کرتے ہوئے فرمایا کہ بیماری کی حالت میں اللہ کی طرف سے انسان کو بہت سی نعمتیں عطا ہوتی ہیں،ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور انسان کی دُعا قبول ہوتی ہے۔(بحارالانوار،74:60)

ھ۔لمبی آرزوئیں:۔

لمبی اور کبھی پوری نہ ہونے والی آرزوئیں بھی غفلت کا ایک سبب ہیں کیونکہ انسان کی ساری توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں اور اسے دیگر تمام اُمور سے غافل کر دیتی ہیں۔امیر المومنین علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں،جو خطبہ دیباج کے نام سے مشہور ہے، فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمُوْا عِبَادَاللهِ اِنَّ الْاَمَلَ يَذْهَبُ الْعَقْلَ وَيُكَذِّبُ الْوَعْدَ وَيَحِثُّ عَلَى الْغَفْلَةِ وَيُوْرِثُ الْحَسْرَةَ"۔(بحار الانوار، 74:293)

''اللہ کے بندو! جان لو کہ آرزوئیں عقل کو زائل کر دیتی ہیں،قیامت کے وعدے کو جھٹلاتی ہیں،غفلت کی طرف راغب کرتی ہیں اور آخر کار انسان کو حسرت میں مبتلا کر دیتی ہیں''۔

غفلت کے نتائج

اللہ،آخرت،دُنیا کی بے ثباتی و بے مہری اور اپنے اعمال اور گناہوں سے غفلت انسان کا سب کچھ تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اسے ناقابلِ تلافی نقصان اور خسارے سے دوچار کر دیتی ہے۔احادیثِ معصومینؑ میں ان نقصانات سے اچھی طرح باخبر کیا گیا ہے۔ذیل میں ہم ان نقصانات کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں:

ا۔سنگدلی:۔

معارفِ الٰہی سے غفلت کا ایک نتیجہ سنگدلی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے،اس لئے کہ انسان کی رُوح کی لطافت اور دل کی

نرمی اللہ کے ساتھ تعلق اور اس کے سامنے عاجزی وخاکساری کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ جب ذکرِ خدا کی بارانِ رحمت انسان کے دل کی سرزمین پر برسنا بند کردے تو انسان کا دل ایک سنگلاخ چٹان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِیَّاکَ وَالْغَفْلَةَ فَفِیْهَا تَکُوْنُ قَسَاوَةُ الْقَلْبِ"۔ (بحار الانوار، 164:75)

''غفلت سے اجتناب کرو کیونکہ یہ سنگدلی کا سبب ہے''۔

ب۔ دل کی موت:۔

غفلت انسان کے قلب کو مردہ کردیتی ہے۔ قلب کی موت درحقیقت سنگدلی کے بعد انسان کے قلب پر طاری ہوتی ہے۔ جب دل کی موت واقع ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی نصیحت انسان پر اثر نہیں کرتی اور سعادت ونیک بختی کی راہیں انسان پر بند ہوجاتی ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ غَلَبَتْ عَلَیْهِ الْغَفْلَةُ مَاتَ قَلْبُهُ"(شرح فارسی غرر الحکم، 293:5)

''جس شخص پر غفلت آجائے، اُس کا دل مردہ ہوجاتا ہے،'' ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"بَیْنَکُمْ وَبَیْنَ الْمَوْعِظَةِ حِجَابٌ مِّنَ الْغَفْلَةِ وَالْغِرَّةِ"۔

''تمہارے اور نصیحت کے مابین غفلت اور غرور کا حجاب ہے''۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 293:5)

ج۔ عقل کی خرابی:۔

غفلت کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اعمالِ صالح کی توفیق کم ہی نصیب ہوتی ہے اور وہ برے اعمال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر کسی نیکی کا کوئی کام کر بھی لے تو غفلت کی وجہ سے اس میں اخلاص پیدا نہیں ہوسکے گا اور وہ اپنا عمل قبولیت کی شرائط کے ساتھ اللہ کی خوشنودی کیلئے انجام دے سکے گا۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (شرح فارسی غرر الحکم، 293:5)

"اِیَّاکَ وَالْغَفْلَةَ وَالاِغْتِرَارَ بِالْمُهْلَةِ فَاِنَّ الْغَفْلَةَ تُفْسِدُ الْاَعْمَالَ"۔

''غفلت اور مہلت کے غرور سے بچو، اس لئے کہ غفلت انسان کے اعمال کو برباد کردیتی ہے''۔

اس حدیث کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ماضی میں انسان نے جو نیک اعمال انجام دیئے ہوں، مستقبل کی غفلت اور غفلت کے نتیجہ میں ہونے والے گناہ انہیں بھی برباد کردیتے ہیں۔

د۔ اللہ سے دُوری:۔

غفلت انسان کو اللہ کا قرب حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے، اس لئے کہ قربِ الٰہی صرف معرفت اور ذکرِ الٰہی کی بدولت حاصل ہوسکتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام ایک مناجات، جسے علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"اِلٰهِیْ اِنْ اَنَا مَتَّنِی الْغَفْلَةُ عَنِ الْاِسْتِعْدَادِ لِلِقَائِكَ فَقَدْ نَبَّهْتَنِی الْمَعْرَفَةُ بِكَرَمِ آلَائِكَ"۔ (بحار الانوار، 91:99-96)

''اے میرے معبود! اگر غفلت نے مجھے سلا دیا اور تیری ملاقات کی استعداد سے مجھے محروم کر دیا تو تیرے کرم اور تیری نعمتوں کی معرفت نے مجھے بیدار کر دیا''۔

حضرت علی علیہ السلام کی یہ مناجات، مناجاتِ شعبانیہ کے نام سے معروف ہے۔ علامہ مجلسیؒ کا کہنا ہے کہ امیر المومنینؑ اور آئمہ معصومینؑ ماہ شعبان میں اس مناجات کو پڑھا کرتے تھے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کیا کرتے تھے۔

ھ۔ ہلاکت:۔

غفلت انسان کی دُنیوی اور اُخروی ہلاکت کا سبب ہے، اس لئے کہ یہ انسان کو معنوی اور مادی فوائد سے بے خبر کر دیتی ہے۔ غفلت میں مبتلا ہو کر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو کھو دیتا ہے۔ اپنے وسائل اور مواقع کو ضائع کر دیتا ہے اور اپنی استعداد کو برباد کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کو امیر المومنین علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"مَنْ طَالَتْ غَفْلَتُهُ تَعَجَّلَتْ هَلَكَتُهُ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 5:272)

''جس کی غفلت طویل ہو جائے، اس کی ہلاکت جلد واقع ہو جاتی ہے''۔

غفلت کی علامات

ممکن ہے بعض لوگوں کیلئے یہ بات مشکوک ہو کہ وہ غافل ہیں یا نہیں، لہٰذا غفلت کی علامات کو پہچاننا ضروری ہے تا کہ ہم غفلت سے محفوظ ہو کر سالکانِ راہِ خدا کی صف میں شامل ہو کر قربِ الٰہی کی منزل کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ احادیث میں غفلت کی بہت سی علامات بیان کی گئی ہیں جن میں سے نمونے کے طور پر ہم چند علامات کا ذکر کرتے ہیں:

شمعون بن لاوی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کا ایک مشہور مسیحی تھا۔ اُس نے آنحضرتؐ سے غافلوں کی علامات کے بارے سوال کیا۔ آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"اَمَّا عَلَامَۃُ الْغَافِلِ فَاَرْبَعَۃٌ اَلْعَمٰی وَالسَّھْوَ وَاللَّھْوَ وَالنِّسْیَانُ"۔

''غافل کی چار نشانیاں ہیں: اندھا پن (یعنی حقائق سے آنکھیں بند کر لینا)، سہو، لہو اور نسیان (یعنی وہ اپنی شہوات میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کو بھول جاتا ہے)۔'' (بحار الانوار، 122:1)

یہی بات حضرت لقمان کی نصیحت میں بھی بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

''ہر چیز اپنی علامات سے پہچانی جاتی ہے اور غافل کی تین علامات ہیں: سہو، لہو اور نسیان''۔ (خصال:138)

سہو اور نسیان میں یہ فرق ہے کہ جب انسان کسی چیز کو جانتا ہو اور بعد میں اسے بھول جائے تو اسے نسیان کہتے اور جن چیزوں کی طرف انسان کو متوجہ ہونا چاہئے، ان سے بے توجہی کو سہو کہتے ہیں۔

2۔ غفلت کی ایک علامت برے لوگوں کی صحبت ہے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْغَفْلَۃُ تَرْکُکَ الْمَسْجِدَ وَطَاعَتَکَ الْمُفْسِدَ" (بحار، 115:75)

''غفلت یہ ہے کہ تم مسجد کو ترک کر دو اور مفید (برے افراد) کی اطاعت کرنے لگو''۔

3۔ غفلت کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان باخبر کرنے والے عوامل کی طرف توجہ نہ کرے، مثلاً قبرستان سے گزرتے وقت یہ نہ سوچے کہ کسی بھی وقت وہ بھی یہاں پہنچ سکتا ہے یا کسی کے نمازِ جنازہ میں شرکت کرتے وقت اُسے یہ خیال نہ آئے کہ ایک دن اُس کا جنازہ بھی اسی طرح لے جایا جا رہا ہوگا یا کسی کے سوئم یا چہلم میں شرکت کرتے ہوئے اسے یہ خیال نہ آئے کہ ایک دن لوگ اس کے سوئم یا چہلم میں بیٹھے ہوں گے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کسی کے جنازہ میں شریک تھے۔ اچانک کسی طرف سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ آپؑ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"کَاَنَّ الْمَوْتَ فِیْھَا عَلٰی غَیْرِنَا کُتِبَ وَکَاَنَّ الْحَقَّ فِیْھَا عَلٰی غَیْرِنَا وَجَبَ وَکَاَنَّ الَّذِیْ نَرٰی مِنَ الْاَمْوَاتِ سَفْرٌ عَمَّا قَلِیْلٍ اِلَیْنَا رَاجِعُوْنَ"۔

''گویا موت دوسروں کے لئے مقرر ہوئی ہے، گویا مرنے والے ایسے مسافر ہیں جو ہمارے پاس لوٹ آئیں گے''۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، حکمت:122)

پھر آپؑ نے فرمایا:

"نُبَوِّئُھُمْ اَجْدَاثَھُمْ وَنَاْکُلُ تُرَاثَھُمْ کَاَنَّا مُخَلَّدُوْنَ بَعْدَھُمْ"۔

''ہم انہیں قبروں میں دفن کر کے ان کی میراث کھانے میں اس طرح مشغول ہو جاتے ہیں جیسے ہمیں ہمیشہ یہاں

رہنا ہے''۔

4۔ غفلت کی ایک اور علامت یہ ہے کہ انسان اپنی عمر ایسے کاموں میں صرف کرے جن کا کوئی دُنیوی اور اُخروی فائدہ نہ ہو۔حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''کَفٰی بِالرَّجُلِ غَفْلَۃً اَنْ یُضِیْعَ عُمْرَہٗ فِیْ مَالَا یُنْجِیہِ''۔

''کسی شخص کے غافل ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنی عمر ایسے کاموں میں ضائع کردے جو اسے نجات سے ہمکنار نہیں کرسکتے۔'' (شرح فارسی غرر الحکم، 585:4)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

کفی بالمرء غفلة ان یصرف همته فی مالا یعنیه

کسی انسان کے غافل ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے ہمت بے معنی کاموں میں صرف کردے۔(شرح فارسی غرر الحکم۔585:4)

غفلت کا علاج

غفلت ایک خطرناک اخلاقی بیماری ہے جس کا علاج کرنے کیلئے اس بحث کے کلی اصول وضوابط کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ غفلت کے انجام کے بارے میں غور کیا جائے اور جو کچھ اس باب میں بیان ہوا ہے، خاص طور پر احادیث پر خوب توجہ کی جائے۔اس سے غفلت کو دور کرنے اور بیدار یعنی ''یقظہ'' کی حالت حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی، مثلاً جس طرح منشیات کے عادی شخص کو اُن لوگوں کے نمونے دکھائے جاتے ہیں جن کی زندگی نشہ کی لعنت کی وجہ سے برباد ہوگئی تاکہ وہ اس انجام سے دوچار ہونے سے پہلے نشے کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرسکے۔

اسی طرح غفلت کا علاج کرنے کیلئے بھی اس بیماری کی بنیادوں پر توجہ کرنا ہوگی۔غفلت کے اسباب اور بنیادوں کو ہم گزشتہ مباحث میں بیان کرچکے ہیں، لہٰذا اسے دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزیں بھی غفلت کی بیماری سے نجات حاصل کرنے میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں:

1۔تاریخ سے عبرت:۔

ہمیں تاریخ کا غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔مدائن کے ایوان، کسریٰ کے محل، فراعنہ مصر کے اہرام، اپنے اندر عبرت کا بہت زیادہ سامان لئے ہوئے ہیں۔کل کے طاقتور حکمرانوں کی شکستہ قبریں یا کل کے طاقتور جوان جو اَب بوڑھے ہو چکے ہیں، جو چل

سکتے ہیں اور نہ بول اور سن سکتے ہیں، زبانِ حال سے ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ہم بھی اسی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یقیناً ان باتوں پر جس قدر زیادہ غور وفکر کیا جائے اور طاقتور حکومتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے واقعات پر جس قدر توجہ کی جائے، اسی قدر غفلت کی بیماری میں مبتلا ہونے کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ مَنْ عَرَفَ الْاَیَّامَ لَمْ یَغْفَلْ عَنِ الْاِسْتِعْدَادِ"۔ (میزان الحکمہ، 3:15189)

''جو شخص گردشِ زمانہ کو پہچان لے، وہ آخرت کے سفر کی تیاری سے غافل نہیں رہ سکتا''۔

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَغْفَلَ النَّاسِ مَنْ لَمْ یَتَّعِظْ بِتَغَیُّرِ الدُّنْیَا مِنْ حَالٍ اِلٰی حَالٍ"۔

''غافل ترین شخص وہ ہے جو دُنیا کے ایک حال سے دوسرے حال میں بدلنے سے نصیحت حاصل نہ کرے''۔ (بحار الانوار، 74:114)

2۔ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا:۔

دوامِ ذکرِ الٰہی غفلت کی بیماری سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے کیونکہ اللہ کا ذکر دل کو بیدار کرتا ہے، رُوح کو پاکیزگی بخشتا ہے، چشمِ بصیرت کو بینا کرتا ہے اور اس کی روشنی میں انسان حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بِدَوَامِ ذِکْرِ اللّٰہِ تَنْجَابُ الْغَفْلَۃُ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 4269)

''اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد کرنے سے غفلت کے حجاب برطرف ہوجاتے ہیں''۔

3۔ قلبی توجہ کے ساتھ نماز پڑھنا:۔

مقررہ وقت پر معنی کی طرف توجہ رکھتے ہوئے، قلبی توجہ کے ساتھ نماز ادا کرنا، دل کو غفلت کے زنگ سے پاک کر کے اس میں چمک پیدا کر دیتا ہے۔

دُنیوی زندگی کی طبیعت ہی یہ ہے کہ وہ غفلت پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات تو انسان کو اس قدر جذب کر لیتی ہے کہ وہ ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی۔ نماز انسان کو اپنے اعمال کے بارے میں غور کرنے اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے اور غفلت کے شیطان سے نجات حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

اس بارے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَیُّمَامُؤْمِنٍ حَافَظَ عَلَی الصَّلٰوتِ الْمَفْرُوْضَةِ فَصَلَّا هَالِوَ قْتِهَافَلَیْسَ هَذَا مِنَ الْغَافِلِیْنَ"۔(فروع کافی، 270:3)

''جوکوئی مومن مقررہ وقت پر صحیح طرح سے نماز ادا کرے، وہ غافل شمار نہیں ہوتا''۔

4۔غوروفکر:۔

غفلت کی بیماری کی روک تھام کا ایک اور موثر ذریعہ غوروفکر ہے۔اگر انسان اچھے اور برے کاموں کے انجام کے بارے میں غوروفکر کرنے کی عادت پیدا کرلے تو غفلت کی تاریکی اُس کی رُوح سے دُور ہو جاتی ہے۔

ایک دن جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے کہا:

یاابااذر اهم بالحسنه وام تعملها لکی لاتکتب من الغافلین

''یَاابَوذَرؓ! نیک کام کرنے کا ارادہ کرلو، خواہ انہیں انجام دینے کی توفیق تمہیں نہ ملے۔ایسا کرنے سے تم غفلین میں شمار نہیں ہوگے''۔(میزان الحکمہ: ج3۔حدیث:15188)

موت کے بارے میں غوروفکر کرنا انسان کی رُوح کے آئینے کو غفلت کے زنگ سے صاف کرنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے، خاص طور پر اگر انسان قبرستان سے گزرتے وقت یہ شعر پڑھا کرے:

هر که باشی وبه هر جابرسی
آخرین منزل هستی این است

''تم جو کچھ بھی ہو اور جس مقام تک جا پہنچو، تمہاری زندگی کی آخری منزل یہی ہے''۔

یہ غوروفکر یقیناً غفلت کے بنیادی اسباب یعنی شہوت پرستی، خود پسندی اور زیادہ طلبی کے رجحانات کو ختم کر دیتا ہے۔ایک حدیث میں حضرت علی السلام امام حسینؑ سے فرماتے ہیں:

"اَیْ بُنَیَّ اَلْفِکْرَةُ تُوْرِثُ نُوْرًا وَّالْغَفْلَةُ ظُلْمَةً"۔

''اے میرے فرزندِ عزیز! غوروفکر کے نتیجہ میں نور پیدا ہوتا ہے اور غفلت کے نتیجہ میں ظلمت اور تاریکی ہی پیدا ہوتی ہے''۔(بحارالانوار، 237:74)

5۔ماحول کی تبدیلی:۔

بعض ماحول قدرتی طور پر غفلت پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔غافلوں کی محفل، لہوولعب کی تقریبات، امیرانہ شان کے گھر خود بخود انسان کو غفلت کی طرف کھینچنے کا کام کرتے ہیں، یہاں تک کہ دُنیا کے بہت سے شہر غفلت کے مراکز میں تبدیل ہو

چکے ہیں۔غفلت کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان ایسی محافل وتقریبات سے اور ایسی جگہوں سے دور رہے اور برائی اور گناہ کے ماحول سے آلودہ شہروں سے ہجرت کرلے ورنہ غفلت کے شیطان سے چھٹکارا مشکل ہوگا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام مناجاتِ ابوحمزہ ثمالی میں اللہ تعالیٰ سے راز ونیاز کرتے ہوئے سلبِ توفیق کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَوَلَعَلَّكَ رَأَيْتَنِيْ اَلِفُ مَجَالِسَ الْبَطَّالِيْنَ فَبَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ خَلَّيْتَنِيْ"۔

''شاید تو نے مجھے غافلین کی محافل کا دلدادہ پا کر مجھے ان کے درمیان چھوڑ دیا''۔

ہم اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَحْذَرْ مَنَازِلَ الْغَفْلَةِ وَالْجَفَاءِ وَقِلَّةَ الْاَعْوَانِ عَلٰى طَاعَةِ اللّٰهِ"۔

''غفلت اور جفا کے مقامات سے اور ان مقامات سے اجتناب کرو جہاں اللہ کی اطاعت میں مدد کرنے والوں کی کمی ہو''۔(غرر الحکم، حدیث:2600)

یقظہ اور بیداری

یقظہ غفلت کی ضد ہے جس کے معنی خود آگاہی کے ہیں۔بعض عرفا اس کو سیر وسلوک کا پہلا قدم قرار دیتے ہیں۔اہلِ عرفان کی اصطلاح میں خوابِ غفلت سے بیداری، گزشتہ اعمال پر توجہ، غلطیوں کی اصلاح اور مستقبل میں صحیح روش اختیار کرنے کو یقظہ کہتے ہیں۔

امام خمینیؒ اپنی کتاب ''جہادِ اکبر یا مبارزۂ نفس'' میں یقظہ کو تزکیہ نفس کا پہلا قدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کب تک خوابِ غفلت میں پڑے رہنا چاہتے ہو؟ کب تک فساد اور تباہی میں غوطہ ور رہنا چاہتے ہو؟ خدا سے ڈرو اور اپنے انجام پر غور کرو۔خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔ابھی تم بیدار نہیں ہوئے ہو، ابھی تم نے پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا ہے۔راہِ سلوک میں پہلا قدم یقظہ ہے لیکن تم ابھی سوئے ہوئے ہو۔تمہاری آنکھیں کھلی اور دِل سوئے ہوئے ہیں۔اگر دل خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے نہ ہوتے تو اور گناہ کی وجہ سے سیاہ اور زنگ آلودہ نہ ہوتے تو تم اس بے فکری سے اپنے برے اعمال اور بری باتوں کو جاری رکھے ہوئے نہ ہوتے۔اگر تم آخرت اور اس کی ہولناک منازل کے بارے میں سوچتے تو ان سنگین ذمہ داریوں کو، جو تمہارے کندھوں پر ہیں، زیادہ اہمیت دیتے''۔(صفحہ:151)

قرآن شریف کی بہت سی آیات اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے ارشادات بھی اس طرف رہنمائی کرتے ہیں۔بنیادی طور پر انذار (ڈرانا، خبردار کرنا) اور تبشیر (بشارت، خوشخبری دینا) کی سب آیات کا بھی یہی مقصد ہے یعنی خوابِ غفلت سے

بیدار کرنا۔ قرآن شریف میں استعمال ہونے والے یہ الفاظ ''اَفَلَا تَعْقِلُوْن''، ''کیا عقل کو بروئے کار نہیں لاتے؟''، ''اَوَلَمْ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآن''، ''کیا یہ قرآن میں غور وفکر وتدبر نہیں کرتے؟'' جیسی عبارات درحقیقت ایسی صدائیں ہیں جو ایک بیدار دل رہنما گہری نیند سوئے ہوئے پیروکاروں کو جگانے کیلئے لگاتا ہے تاکہ وہ جاگ کر منزل کیطرف گامزن ہوجائیں۔

اسی طرح جو آیات اللہ کے ذکر کی تاکید کرتی ہیں اور اللہ کی یاد سے رُوگردانی کو زندگی کی تنگی کا سبب قرار دیتی ہیں اور انسان کو آخرت میں نابینا محشور ہونے سے ڈراتی ہیں، ان سب کا مقصد غفلت سے نکال کر یقظہ کی حالت میں لانا ہے۔

احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر یقظہ کے بارے میں رہنمائی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جارہی ہیں:

1۔ امیر المومنینؑ ایک خطبہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّ اللہَ اَرْسَلَ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا لِیُزِیْحَ بِہٖ عِلَّتَکُمْ وَیُوْقِظَ بِھَا غَفْلَتَکُمْ"۔ (بحار الانوار، 296:74)

''اے لوگو! اللہ نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا تاکہ تمہاری بیماریوں کو برطرف کرے اور تمہیں خواب غفلت سے بیدار کرے''۔

صرف رسول اللہ ﷺ ہی نہیں بلکہ تمام انبیاؑ اسی مقصد کے لئے مبعوث ہوئے ہیں یا کم از کم ان کا ایک مقصد یقظہ کی حالت پیدا کرنا ہوتا ہے۔

2۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے کوفہ کے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"اَیُّھَاالنَّاسُ تَیَقَّظُوْا مِنْ رَقْدَۃِ الْغَفْلَۃِ وَمِنْ تَکَاشُفِ الظُّلْمَۃِ،فَوَالَّذِیْ خَلَقَ الْحَبَّۃَ وَبَرَءَ النَّسَمَۃَ وَتَرَدّٰی بِالْعَظَمَۃِ، لَئِنْ قَامَ اِلَیَّ مِنْکُمْ عُصْبَۃٌ بِقُلُوْبٍ صَافِیَۃٍ وَنِیَّاتٍ مُخْلِصَۃٍ، لَایَکُوْنَ فِیْھَاشَوْبُ نِفَاقٍ وَلَانِیَّۃُ اِفْتِرَاقٍ لَاُجَاھِدَنَّ السَّیْفَ قَدَمًاقَدَمًاوَلَاُضَیِّقَنَّ مِنَ السُّوْفِ جَوَانِبَھَاوَمِنَ الرِّمَاحِ اَطْرَافَھَاوَمِنَ سَنَابِکَھَافَتَکَلَّمُوْا رَحِمَکُمُ اللہُ"۔

''اے لوگو! خوابِ غفلت سے بیدار ہوجاؤ اور تاریکیوں سے اجتناب کرو۔ اُس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور جانوں کو پیدا کیا اور عظمت کی ردا پہنی! جب بھی تم میں سے کچھ لوگ پاکیزہ دل اور صاف نیتیں لے کر، جن میں نفاق کی آلائش اور تفرقہ کا ارادہ نہ ہو، میری نصرت کیلئے شمشیر اُٹھائیں تو میں اُنہیں ساتھ لے کر قدم بقدم جہاد کروں گا اور اپنی شمشیر کی ضربات اور نیزے سے زمین دُشمن پر تنگ کردوں گا اور گھوڑے کے سم

گھسا دوں گا۔ پس بولو! خدا تم پر رحم کرے۔'' (بحار الانوار، 67:44)

امام حسن علیہ السلام نے یہ خطبہ ایسے حالات میں ارشاد فرمایا جب غفلت اہلِ کوفہ پر غالب آ چکی تھی اور آپؑ جس قدر بھی لشکرِ امیرِ شام کے خلاف لڑنے کیلئے ان کو متحرک کرنے کی کوشش کرتے، ان میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی تھی۔

3۔ کتاب ''فلاح السائل'' میں ایک دُعا ہے جسے امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف سے تائید حاصل ہے۔ اس دُعا میں نماز کی کوتاہیوں کے بارے میں یہ جملے قابلِ غور ہیں:

"فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاجْعَلْ مَكَانَ نُقْصَانِهَا تَمَامًا وَعَجِّلْنِيْ تَشَبُّتًا وَ تَمَكُّنًا وَسَهْوِي تَيَقُّظًا وَغَفْلَتِيْ تَذَكُّرًا وَ كَسَلِيْ نَشَاطًا"۔ (بحار الانوار، 14:82)

''پس اے اللہ! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر اپنی رحمتیں نازل فرما، اس نماز کے نقائص کو برطرف کر کے اسے کامل بنا دے اور مجھے ثابت قدمی اور توانائی عطا فرما تا کہ میں ان نقائص کی تلافی کر سکوں اور میرے سہو کو بیداری میں اور غفلت کو ذکر میں اور میری سستی و کاہلی کو نشاط اور چستی میں بدل دے''۔

4۔ نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں امیر المومنین علیہ السلام بیدرد انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَمَّا مِنْ دَائِكَ بُلُوْلٌ اَمْ لَيْسَ مِنْ نَوْمِكَ يَقْظَةٌ"۔

''آیا تمہارے درد کا کوئی علاج اور تمہاری نیند کی کوئی بیداری نہیں ہے؟'' (نہج البلاغہ، خطبہ: 222)

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِلَّا مُسْتَبْقِظٌ مِنْ غَفْلَتِهٖ قَبْلَ نَفَادِ مُدَّتِهٖ"۔ (غرر الحکم: 2752)

''آیا کوئی ہے جو اپنی مدت پوری ہونے سے قبل خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے؟''

ان تمام روایات میں کبھی غفلت کو نیند اور کبھی نشے سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ غفلت کے برعکس ''تذکُّر'' کو بیداری اور ہوشیاری سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"سُكْرُ الْغَفْلَةِ وَالْغُرُوْرِ اَبْعَدُ اِفَاقَةً مِّنْ سُكْرِ الْخُمُوْرِ"۔ (غرر الحکم: 5651)

''غفلت اور غرور کے نشے سے افاقہ شراب کے نشے سے زیادہ دُور ہوتا ہے''۔

6۔ اس بحث کو ہم امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں جس میں آپؑ نے یقظہ کو ایک نورانی چراغ سے تعبیر فرمایا ہے:

"فَاسْتَصْبِحُوْا بِنُوْرِ يَقْظَةٍ فِي الْاَبْصَارِ وَالْاَسْمَاعِ وَالْاَفْئِدَةِ"۔

''یقظہ کے نور سے اپنی آنکھوں، کانوں اور دلوں کو منور کرو''۔(نہج البلاغہ، خطبہ:222)

مثبت تغافل

جس طرح زندگی کے معاملات سے غفلت بدبختی کا سبب ہے، تغافل کا بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔تغافل یہ ہے کہ انسان حقائق کو دیکھ کر ان سے نظریں چرالے۔انسان یہ جانتا ہو اور مانتا ہو کہ یہ زندگی عارضی اور ناپائیدار ہے، یہ دُنیا ایک گزرگاہ ہے جہاں سے انسان کو جہانِ آخرت کی طرف جانا ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے، دُنیوی مال و دولت اور مقام و مرتبہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔لیکن اس کے باوجود ان تمام حقائق کو اس طرح نظرانداز کرے جیسے انہیں جانتا ہی نہیں۔

اس تغافل کو منفی تغافل کہیں گے جس کے نتائج غفلت کے نتائج سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ غفلت میں انسان حقائق سے بےخبر ہونے کی وجہ سے چاہ ہلاکت میں گر جاتا ہے جبکہ تغافل میں انسان سب کچھ جانتے ہوئے انجان بنا رہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اللہ کے ہاں ایسے شخص کا گناہ اور جرم زیادہ سنگین ہے۔

اس منفی تغافل کے برعکس ایک مثبت تغافل بھی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان بعض چیزوں کا علم تو رکھتا ہے لیکن انہیں نظرانداز کر دینا اور ان سے بےخبر رہنا ضروری یا پسندیدہ ہو۔ بالفاظِ دیگر انسان کسی چیز کو جانتا ہو مگر صرف اس لئے کہ اُسے ظاہر کرنے یا اُس پر عمل کرنے کے منفی نتائج برآمد ہوں گے، اُسے نظرانداز کردے تاکہ دُوسروں کی عزت و آبرو محفوظ رہ جائے۔

جن اُمور میں تغافل پسندیدہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان دُوسروں کے عیوب کو چھپائے۔ ہر انسان میں کمزوریوں اور عیب ہوتے ہیں اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اُس کے عیب کسی کو معلوم نہ ہوں۔لیکن بعض اوقات کوئی شخص کسی کے عیب سے باخبر ہوجاتا ہے، ایسے معاملات میں تغافل کے معنی کسی کے عیب پر پردہ ڈالنے کے ہیں، جن کو صرف خاص حالات میں، مخصوص دائرے کے اندر انتہائی لطافت کے ساتھ ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اگر کسی انسان کے عیوب پر پڑا ہوا پردہ اُٹھ جائے اور اس کی عزت خاک میں مل جائے تو ایسا شخص گناہ اور برے کاموں کے انجام دینے میں بےجھجک ہوجاتا ہے۔ایسے معاملات میں تغافل سے کام لے کر معاشرے کو برائیوں کی دلدل بنانے سے روکا جاسکتا ہے۔

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہتے ہیں کہ پرسکون اور مطمئن زندگی اہم اصول تغافل ہے۔ خاص طور پر اداروں کے سربراہان و مدیران، اپنی مشکلات اور مسائل کے حل کیلئے اس اصول سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ جہاں کسی کو ٹوکنا اور سرزنش ضروری ہو، وہاں ایسا کریں اور جہاں تغافل سے مسئلہ حل ہوسکتا ہو، وہ تغافل سے کام لیں۔اگر انسان زندگی میں اس اصول کو اپنالے تو بہت سے مسائل اور پریشانیوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معصومین علیہم السلام اجمعین کی تعلیمات میں تغافل کے معاملہ پر کوکافی توجہ دی گئی ہے۔

تغافل، اقوالِ معصومینؑ کی روشنی میں

ایک مشہور حدیث جسے امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل، کیا گیا ہے، آیا ہے:

"صَلَاحُ حَالِ التَّعَايُشِ التَّعَاشُرِ مِلْأُ مِكْيَالٍ ثُلُثَاهُ فِطْنَةٌ وَثُلُثُهُ تَغَافُلٌ"۔

''معاشرتی زندگی کی صلاح وسلامتی ایک ایسا پیمانہ ہے جس کے دو تہائی ذہانت اور ایک تہائی تغافل ہے''۔(تحف العقول:264)

اس روایت میں جہاں مثبت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، منفی تغافل کی مذمت بھی نظر آتی ہے۔ پہلے اس میں ذہانت کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ذہانت اور ہوشیاری غفلت کی ضد ہیں۔ اس حدیث میں ذہانت کا کردار تغافل کے کردار سے دوگنا بتایا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو زندگی کے اہم معاملات سے بے خبر نہیں رہنا چاہئے بلکہ مکمل بیداری اور احتیاط کے ساتھ ان چیزوں پر کاربند رہے تو جو معاشرتی زندگی کی فضا کو بہتر بنانے کیلئے ضروری ہیں۔

دُوسری طرف سے انسان تمام چیزوں کو نظر انداز کرتا رہے جن کے پیچھے پڑنے سے معاشرتی زندگی کی فضا خراب ہوتی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے مسائل جن میں اُلجھ کر انسان زندگی کے اصل اور اہم معاملات سے دُور ہو جائے۔ اُنہیں نظر انداز کرنا اور ان سے تغافل برتنا ہی بہتر اور پسندیدہ عمل ہے۔ دُوسروں کے عیوب کو تلاش کر کے انہیں اچھالنا اور معاشرے میں ایک دوسرے کی عزت کو داغدار کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے عیوب کو نظر انداز کرنا اور ان سے تغافل برتنا ہی بہتر اور پسندیدہ عمل ہے۔

اس سلسلہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مِنْ اَشْرَفِ اَعْمَالِ الْكَرِيْمِ غَفْلَتُهُ عَمَّا يَعْلَمُ"۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار:222)

''کریم انسان کا سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے تغافل کرتا ہے جو اُس کے علم میں آ جائیں''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ لَمْ يَتَغَافَلْ وَلَا يَغُضَّ عَنْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ تَنَغَّصَتْ عِيْشَتُهُ"۔

''جو شخص بہت سی باتوں سے تغافل نہیں کرتا، اس کی زندگی میں تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں''۔(غرر الحکم:9149)

ظاہر سی بات ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں خلافِ توقع ناخوش آئندہ باتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگر انسان انہی کے بارے میں سوچنا شروع کر دے اور ان پر وضاحتیں طلب کرنے بیٹھ جائے تو نہ صرف یہ کہ اُس کی زندگی تلخیوں کا شکار ہو جائے گی بلکہ اس کے دوست بھی اس سے دُور ہو جائیں گے۔

ہم اس بحث کو امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد پر ختم کرتے ہیں:

"وَعَظِّمُوْا اَقْدَارَكُمْ بِالتَّغَافُلِ عَنِ الدَّنِّ مِنَ الْاُمُوْرِ..... وَلَاتَكُوْنُوْا بِحَّاثِيْنَ عَمَّاغَابَ عَنْكُمْ، فَيَكْثُرُعَائِبُكُمْ..... وَتَكَرَّمُوْا بِالتَّعَامِيْ عَنَ الْاِسْتِقْصَاءِ"۔

''پست چیزوں سے تغافل کے ذریعے اپنی قدرو قیمت میں اضافہ کرو۔۔۔جو چیزیں تم سے پوشیدہ ہیں،اُن کی جستجو نہ کرو ورنہ تمہاری عیب جوئی کرنے والے زیادہ ہو جائیں گے۔۔۔۔اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل جاننے سے چشم پوشی کر کے اپنے کریم ہونے کا ثبوت دو''۔(بحارالانوار،64:75)

اس حدیث اور ایسی ہی دیگر احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کن معاملات میں تغافل سے کام لینا ضروری ہے اور کن باتوں سے غفلت نقصان دہ ہے۔

البتہ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ تغافل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان امر بالمعروف اور نہی ازمنکر کو ترک کر دے،اس لئے کہ امر بالمعروف اور نہی ازمنکر دینی فریضہ ہے اور اس سے غفلت یا تغافل نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح اُن اُمور کی اصلاح کیلئے، جو معاشرے کی بہتری کے لئے ضروری ہیں،مثبت تنقید کرنا بھی تغافل کے منافی نہیں ہے۔تغافل صرف اُن چیزوں کیلئے ہے جو چھوٹی چھوٹی ہیں یا ان عیوب کیلئے ہے جن کی پردہ پوشی ضروری ہے۔

چودھواں باب

بُخل

تمہید:۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت سی نعمتیں اتنی مقدار میں دے رکھی ہیں جو ہماری ضرورت سے زیادہ ہیں اور ہم دُوسروں کو ان سے فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔لیکن بعض لوگ بخل جیسی صفتِ رذیلہ کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں کسی کو شریک نہیں کرتے۔بعض لوگ اپنی دولت وثروت کی نمود ونمائش کے ذریعے غریبوں اور ناداروں کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں اور اس غیر انسانی حرکت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بعض اوقات انحصار طلبی (monopoly) یعنی کسی چیز کو اپنے تک محدود رکھنے کی خواہش، احساسِ برتری اور لالچ وطمع جیسی صفاتِ رذیلہ بھی بخل کے ساتھ مل جاتی ہیں اور اس کے قبح کو کئی گنا کر دیتی ہیں۔

ہم اپنے اردگرد اور ساری کائنات میں جہاں بھی نظر کرتے ہیں، ہر جگہ سخاوت اور بخشش کے مظاہر ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ سورج مسلسل جلتا ہے اور اپنے وجود کے ایک حصے کو روشنی اور حرارت میں تبدیل کر کے سارے نظامِ شمسی کو نور اور حرارت سے بہرہ مند کرتا ہے اور تمام زندہ موجودات کو زندگی بخشتا ہے۔

زمین کے شکم کو اللہ نے بہت سی نعمتوں سے بھر رکھا ہے جن میں پانی، قیمتی پتھروں اور دھاتوں کی کانیں اور ہماری زندگی کیلئے ضروری غذائی مواد وغیرہ شامل ہیں۔زمین بڑی سخاوت اور فراخ دلی کے ساتھ انسان کو ان تمام خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتی ہے۔

اس عالمِ کبیر کے علاوہ عالمِ صغیر یعنی خود انسان کے اندر بھی فطرت کی فیاضی کے بہت سے مظاہر موجود ہیں۔ہمارا دل، نظامِ تنفس، معدہ، ہاتھ پاؤں، آنکھیں اور کان وغیرہ میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو صرف اپنے لئے کام کرتا ہو اور جسم کے دُوسرے حصوں کو فائدہ پہچانے میں بخل سے کام لیتا ہو۔

اب اس کائنات میں، جہاں ہر طرف فیاضی اور سخاوت نظر آتی ہے، بخیل انسان کی کوئی جگہ ہوسکتی ہے؟ کیا نظامِ کائنات سے عدم ہم آہنگی اسے ہلاکت کی طرف نہیں لے جائے گی؟

یہ وجہ ہے کہ آیات وروایات میں وسیع سطح پر بخل کی مذمت اور جود وسخا کی تعریف وستائش نظر آتی ہے۔یہ صفت اللہ تعالیٰ کی صفات اور معصومینؑ کی صفات میں بھی نمایاں ترین مقام رکھتی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اس موضوع سے متعلق چند قرآنی آیات کو زیر بحث لاتے ہیں:

1۔ "اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ"۔ (قصص: 76اور 77)

''قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا لیکن اُن کے اُوپر ظلم کرتا تھا۔ ہم نے اُسے اتنے خزانے عطا کئے جس کی چابیاں ایک طاقتور جتھہ اُٹھاتا تھا، اس کی قوم نے اُس سے کہا کہ اِتراؤ نہیں! اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو کچھ اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، اُس میں آخرت کو تلاش کرو اور دُنیا سے اپنے حصے کو فراموش نہ کرو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو، اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

2۔ "اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ○ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَاۗىِٕفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَاۗىِٕمُوْنَ ○ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ"(قلم: 17تا20)

''اور ہم نے انہیں آزمایا، جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا، جب اُنہوں نے قسم کھائی کہ اپنے باغ کا پھل صبح صبح چن لیں اور انہوں نے انشاءاللہ نہیں کہا۔ جب وہ سوئے ہوئے تھے تو تمہارے رب کی طرف سے ایک عذاب اُن کے باغ پر آرہا اور اسے تاریک سیاہ رات کی طرح کر دیا''۔

3۔ "وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○"(توبہ: 75تا77)

''ان میں سے بعض نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اُس نے اپنے فضل سے ہمیں عطا کیا تو ہم صدقہ دیں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ لیکن جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا تو وہ بخل کرنے لگے اور وعدہ خلافی کرتے ہوئے رُوگرداں ہو گئے۔ اس عمل کی وجہ سے اُن کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، اس لئے کہ اُنہوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور جھوٹ بولتے تھے۔''

4۔ "وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ○"(آل عمران:180)

''جولوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے، اس میں سے انفاق نہیں کرتے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کیلئے فائدہ مند ہے بلکہ یہ ان کیلئے شر ہے۔ جس دولت کے بارے میں یہ بخل سے کام لیتے تھے، عنقریب قیامت کے دن وہ طوق بن کر ان کے گلے میں ڈال دی جائے گی۔ زمین وآسمان کی میراث اللہ کے لئے ہے اور وہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے۔''

5۔ "اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا"۔(النسأ:37)

''یہ وہ لوگ ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں اور دُوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں عطا کر رکھا ہے، اُسے چھپاتے ہیں، ہم نے ایسے کافروں کیلئے رُسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

6۔ "وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى○وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى○فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى"

''جو کوئی بخل سے کام لیتا ہے اور اس طرح غنی ہونا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی نیک جزا کو جھٹلاتا ہے، جلد ہی ہم اُسے مشکل میں گرفتار کر دیں گے''۔(اللیل:8 تا10)

7۔ "هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ"۔(محمد:38)

''تم وہی لوگ ہو جن کو اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے اور تم میں سے کچھ تو بخل سے کام لیتے ہیں، حالانکہ جو بخل سے کام لیتا ہے، وہ اپنے بارے میں بخل کرتا ہے اور اللہ غنی ہے اور تم فقیر ہو، اگر تم رُوگردانی کرو تو وہ تمہاری جگہ دُوسروں کو لے آئے گا جو تم جیسے نہیں ہوں گے (بلکہ سخی ہوں گے اور اللہ کی راہ میں انفاق کریں گے)۔''

8۔ "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"(تغابن:16 و حشر:9)

''جو اپنے نفس کے بخل سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

9۔ "وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا"(فرقان: 67)

''جو انفاق کرتے ہیں تو اسراف کرتے ہیں نہ سخت، بلکہ درمیان کی راہ اختیار کرتے ہیں''۔

10۔ "قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا"(بنی اسرائیل۔ 100)

''کہہ دو کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو بخل سے کام لیتے کہ انفاق کی وجہ سے تنگدستی کا شکار ہو جاؤ، بے شک انسان تنگ نظر ہے''۔

تفسیر

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت بنی اسرائیل کے ایک بڑے دولت مند کا ذکر کر رہی ہے جو اپنے بخل کی وجہ سے بہت برے انجام سے دوچار ہوا۔

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رشتہ دار تھا اور بنی اسرائیل کی مشہور اور دولت مند شخصیت تھا اور بظاہر اُن لوگوں میں سے تھا جو تورات کا کافی علم رکھتے تھے۔ لیکن اکثر دولت مندوں کی طرح اللہ سے غافل تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب بنی اسرائیل کے سامنے اپنی دولت کی نمود و نمائش کرتا تھا اور اُس کی ان حرکتوں سے اُن کے دل میں بھی یہ خواہش جنم لیتی تھی کہ کاش! وہ بھی قارون کی طرح دولت مند ہوتے!

قرآن شریف اس بارے میں فرماتا ہے:

''قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا''۔

اپنی قوم پر اس کے ظلم کی وجہ اس کا بخل تھا۔ وہ اس بات پر تیار نہ تھا کہ اپنی دولت سے اپنی قوم کو کوئی فائدہ پہنچائے۔ وہ اپنی دولت سے اپنی قوم کو کوئی فائدہ پہنچائے۔ وہ اپنی دولت کی نمود و نمائش کے ذریعے بھی اپنی قوم پر ظلم کرتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا تو وہ ان کا مخالف ہو گیا اور فرعون کے ساتھ مل گیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دُنیا پرست دولت مندوں کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ معاشرتی قوت حاصل کریں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ اپنے جیسے دیگر افراد کی سیاسی اور معاشرتی طاقت سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ انبیاؑ کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔

قرآن شریف میں قارون کے واقعہ میں آگے چل کر یہ بیان کیا گیا ہے:

''ہم نے اسے اس قدر دولت بخشی کہ اُس کی چابیاں اُٹھانے کیلئے طاقتور افراد کی ایک جماعت مامور تھی''۔

"وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ"۔ (قصص۔ 76)

قارون اپنی زندگی سے بہت خوش تھا۔عیش پرستی میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اُسے غریبوں اور فقیروں کے دُکھ کا کچھ احساس نہ تھا۔اس کی قوم کے کچھ باشعور افراد اسے سمجھاتے ہوئے کہتے تھے:

اس طرح اتراؤ نہیں کیونکہ اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے، اس میں آخرت کو تلاش کرو اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کرو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی اس کے بندوں کے ساتھ احسان کرو اور زمین میں فساد نہ کرو کیونکہ اللہ فساد کروالوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ"۔ (قصص 76اور 77)

ان پانچ ناصحانہ اور مشفقانہ باتوں کا قارون کے تاریک دل پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اُس کی سرکشی بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اُس نے کھلم کھلا توحیدِ افعالی کا انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ یہ دولت صرف میری اپنی کمائی کا نتیجہ ہے۔

اس سورت میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے قارون کی ایک اور اخلاقی رذیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس نے اپنی قوم کے سامنے اپنی دولت کی نمائش کی اور اس جنون آمیز نمائش میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اپنے قیمتی گھوڑے، جن پر سنہری زینیں تھیں اور مختلف قسم کے ملبوسات اور زیورات پہنے ہوئے کنیزیں اور دیگر مال و دولت کی اپنی قوم کے غریب اور مسکین افراد کے سامنے نمائش لگائی۔اس طرح اُس نے مذکور بالا ناصحانہ اور مشفقانہ مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے اس ردِعمل کا مظاہرہ کیا اور قوم کے غریب اور نادار افراد کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے اُن پر نمک چھڑکنے لگا''

جب اس کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اللہ نے اسے اور مہلت نہ دی۔ایک زلزلہ آیا جس کی وجہ سے صرف قارون اپنے محل اور ساری دولت سمیت زمین میں دھنس گیا اور اس کا ذکر تاریخ میں درسِ عبرت بن کر رہ گیا۔

قارون کی بدبختی کی اصل وجہ اُس کا بخل تھا جس کی وجہ سے اس نے عملی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور اللہ کی توحید کا انکار کر دیا۔صرف یہی نہیں بلکہ اس نے ایک بدکار عورت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ناجائز تعلقات کا افسانہ گھڑ کر اُنؑ کے خلاف ایک سازش کھڑی کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اللہ نے اسے مہلت نہ دی اور رُسوا کر دیا۔

وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس عظیم دولت کی وجہ سے وہ اس قدر طاقتور ہو چکا ہے کہ کوئی طاقت اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔اسی گھمنڈ

میں وہ اپنی قوم کے ساتھ ظلم اور تعدی کے ساتھ پیش آتا تھا اور آخر کار اپنے اعمال کے انجام کو پہنچ گیا۔

دُوسرے پیرا گراف کی آیات بخیلوں کے ایک گروہ کی عبرت ناک داستان بیان کر رہی ہیں۔قرآن مجید نے ان کو ''اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ'' (باغ والوں) کا نام دیا ہے۔بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور وہ یمن کے قریب صنعا نامی ایک شہر میں رہتے تھے۔

ان کی تعداد دس تھی۔ان کا باپ ایک نیک اور سخی انسان تھا جس نے ایک باغ میراث میں چھوڑا تھا۔باپ کے بعد اولاد نے سخاوت کی بجائے بخل کی روِش اپنائی اور فیصلہ کیا کہ باغ سے پھل چنتے وقت کسی فقیر کو خبر تک نہ ہونے دی جائے اور صبح کے اندھیرے میں باغ میں جا کر پھل چننے کا کام شروع کر دیا جائے۔

تفسیر رُوح البیان میں ان کا واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

''یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کے کچھ بعد کا ہے۔ان کا باپ بہت سخی تھا جو اپنے باغ کے محصول میں سے اپنے سال بھر کی ضرورت رکھ لیتا تھا اور باقی سارا ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیتا تھا جو بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اس سے اُنکے کافی دن گزر جاتے تھے۔لیکن باپ کے مرجانے کے بعد اُس کے بیٹوں نے کہا کہ اگر ہم باپ کے نقشِ قدم پر چلیں تو ہماری گزر بسر مشکل ہو جائے گی، اس لئے کہ ہم سب بال بچوں والے ہیں۔لہٰذا انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے، جبکہ ابھی اندھیرا باقی ہو، باغ میں جا کر پھل چن لیں اور انہوں نے اس ساری منصوبہ بندی میں انشاءاللہ نہیں کہا''۔(رُوح البیان، 10:114)

اللہ نے بھی انہیں ان کے عمل کی عبرت ناک سزا دی۔رات کو جب وہ سوئے تو اللہ کی طرف سے ایک عذاب نے سارے باغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس میں ایسی آگ تھی جس نے اُن کے سرسبز باغ کو جلا کر راکھ کر دیا۔اس کیلئے آیت میں یہ الفاظ استعمال ہوئے: ''فَاَصۡبَحَتۡ کَالصَّرِیۡمِ''۔

''صریم'' سیاہ راکھ کو کہتے ہیں۔لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ''صریم'' سے مراد ایسے درخت ہوں جن پر پھل نہ ہو۔اگر یہ معنی مراد لئے جائیں تو آیت کے معنی یہ ہوں گے؛ ''آسمان سے گرنے والی بجلی نے ان کے درختوں کے پھلوں کو جلا دیا جبکہ درخت اپنی جگہ قائم رہے''

اگلے روز جب وہ اپنے منصوبے کے مطابق صبح سویرے باغ میں پہنچے اور باغ کا وحشت ناک منظر دیکھا تو چیخ اُٹھے: ''ہم راستہ بھول گئے ہیں، بلکہ ہم تو بالکل محروم ہو گئے ہیں''۔

''فَلَمَّا رَاَوۡہَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ۙ﴿۲۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾''(قلم: 26اور 27)

ان آیات میں ''ضَآلُّوۡنَ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے

سرسبز باغ کی بجائے ایک جلے ہوئے باغ میں کھڑے ہیں تو انہوں نے سمجھا کہ ہم راستہ بھول کر اپنے باغ کی بجائے کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔ پھر جب اُنہوں نے غور سے دیکھا اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ ان کا اپنا باغ ہے جس کا یہ حال ہو چکا ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔

دُوسرے یہ کہ چونکہ وہ اپنے باپ کی روش کی بجائے بخل کو اپنی بہتری اور سعادت کا راستہ سمجھتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا راستہ انہیں تباہی کی طرف لے آیا تو وہ بول اُٹھے کہ ہم بھٹک گئے ہیں، صحیح راستہ وہی ہے جو ہمارے باپ کا تھا۔

آگے چل کر آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ بخیلوں کا یہ ٹولہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر ایک دوسرے کو ملامت اور سرزنش کرنے لگا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے اور انہوں نے اللہ سے دُعا کی کہ وہ انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ نے اُن کی توبہ قبول کر لی اور انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرمایا۔

بہرحال یہ آیت بخل کے دردناک انجام کو بیان کرتے ہوئے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالیں کہ مادی دُنیا میں بھی بخل انسان کے کام نہیں آ سکتا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید ان آیات کے آغاز میں فرماتا ہے کہ ''ہم نے مکہ والوں کو بھی اسی طرح آزمایا جس طرح ہم نے اصحاب الجنۃ کو آزمایا''۔ گویا یہ عبارت اس قحط اور خشک سالی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مکہ کے دولت مندوں کے بخل کی وجہ سے اُن پر آئی تھی۔

تیسری آیت میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے ایک بخیل شخص کا ذکر ہے۔ بہت سی تفاسیر کے مطابق ایک انصاری تھا جس کا نام ثعلبہ بن حاطب تھا۔ ابتدأ میں وہ بہت غریب تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ دولت مند ہو جائے۔ لہٰذا وہ بار بار جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کرتا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! دعا فرمایئے کہ میں دولت مند ہو جاؤں۔ آپؐ اس کے جواب میں فرماتے کہ ''تھوڑا سا مال جس کا حق تم ادا کر سکو، اُس بہت زیادہ مال سے بہتر ہے جس کا حق تم ادا نہ کر سکو''۔

آپ کا مطلب یہ تھا کہ کم پر راضی اور شاکر ہو لیکن اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر وہ اپنے فضل سے مجھے بہرہ مند کرے تو میں صدقہ بھی دیا کروں گا اور صالحین یعنی شاکرین میں سے ہوں گا۔

"وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔ (توبہ: 75)

جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند و بانگ دعوے کرنے والے اس کم ظرف شخص کیلئے دعا کی تا کہ اس کے اور دوسرے لوگوں کیلئے بھی آزمائش ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے اللہ نے اس کو اس کی توقع سے بھی بڑھ کر مال و دولت سے نوازا۔ جب زکوٰۃ کی آیت نازل ہوئی اور زکوٰۃ کا حکم اس شخص تک پہنچایا گیا تو اس کم ظرف شخص نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ بھلا دیا اور معمولی

مقدار میں زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔

ایک مختصر جملے میں قرآن مجید فرماتا ہے: ''جب اللہ نے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے انہیں عطا فرمایا تو انہوں نے بخل سے کام لیا، وہ روگردانی کرتے ہوئے پھر گئے''۔

اگرچہ ثعلبہ ایک شخص تھا لیکن جب اس کی دولت بہت زیادہ ہوگئی تو وہ اس کا انتظام کرنے کیلئے بہت سے افراد سے مدد لینے لگا، لہٰذا ممکن ہے کہ آیت میں جمع کا صغیہ اسی لئے استعمال ہوا ہو۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ثعلبہ جیسے کچھ اور افراد نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی ہی درخواست کی ہو اور پھر اُس الٰہی آزمائش میں کامیاب نہ ہو سکے ہوں۔

بہرحال اللہ سے کئے ہوئے اس عہد کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق کی مستقل بیماری پیدا ہوگئی، حالانکہ یہ وہ شخص تھا جو کثرتِ عبادت کی وجہ سے ''حمامۃ المسجد'' یعنی مسجد کا کبوتر کہلاتا تھا مگر بخل کی وجہ سے اور اللہ اور رسولؐ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمانوں کے زمرے سے نکل کر منافقین کی صف میں کھڑا ہو گیا۔

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بخیلوں کی سخت سزا کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ وہ سزا ہے جس کا ذکر پورے قرآن میں اس برائی کے علاوہ کسی اور برائی کیلئے نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو لوگ بخل کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں عطا کیا ہے، اس میں سے انفاق نہیں کرتے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اُن کے حق میں اچھا ہے بلکہ یہ اُن کیلئے شر ہے''۔

''وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ''۔ (آل عمران: 180)

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ زمین و آسمان کی میراث اللہ ہی کیلئے ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْر''

اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جب تم نے سب کچھ چھوڑ کر چلے جانا ہے تو پھر بخل کا فائدہ؟

اگرچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت اُن لوگوں کے بارے میں جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے لیکن اگر غور کیا جائے تو آیت کا مفہوم عام ہے اور بخل کی تمام اقسام اس کے ذیل میں آ جاتی ہیں۔ بعض مفسرین نے تو یہ بھی کہا ہے کہ مال کے بخل کے علاوہ علم کا بخل بھی اس میں داخل ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کس طرح طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا؟

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو کوئی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے۔ اللہ اُس مال کو ایک آتشیں اژدھے میں تبدیل کر کے اس کی گردن میں ڈال دے گا جو اسے مسلسل ڈستا رہے گا (تفسیر برہان، 1:327۔ عیاسی 1:207

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بخیلوں کے اموال صرف آخرت میں ہی نہیں بلکہ دُنیا میں بھی ان کے گلے کا طوق بن جاتے ہیں۔ دُنیا میں ان اموال کی حفاظت، ان کا حساب رکھنا اور پھر ان سب کو چھوڑ کر مر جانا بھی گلے میں طوق ہونے کی ہی ایک قسم ہے۔

پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے بخیلوں کی مذمت کر رہا ہے جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کی ترغیب دلاتے ہیں، اس لئے کہ ان کا تعارف ''مختال فخور'' کے طور پر کروایا گیا ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''مختال فخور'' کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''مختال فخور'' وہی لوگ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں اور جو کوئی اس حکم کی نافرمانی کرے، وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لئے کہ اللہ غنی اور حمید ہے۔

"الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝" (نسأ: 37)

ظاہری بات ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جمال کے ساتھ مکمل تضاد کی حالت میں ہو، اللہ تعالیٰ اُسے پسند نہیں کرتا اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی عنایات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان آیات سے پچھلی آیات میں انسان کی زندگی میں آنے والے مختلف مصائب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مادی زندگی سے انسان کو دل نہیں لگانا چاہئے۔ انسان کو مادی وسائل پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہئے اور اسے معلوم ہونا چاہئے کہ بخل انسان کو امیر نہیں کر سکتا بلکہ حالات میں ذرا سا اُتار چڑھاؤ راتوں رات ایک دولت مند شخص کو کنگال کر سکتا ہے۔ لہٰذا دولت پر فخر کرنا بے معنی ہے اور بخل بھی کسی مشکل کو حل نہیں کرتا۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے بخیل شخص دوسروں کو بخل کی دعوت اس لئے دیتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اس جیسے ہو جائیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ بخل کی وجہ سے انسانی ہمدردی کے جذبات ان میں باقی نہیں رہتے اور یہ سنگدل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، اب اگر کسی اور کو بھی فقراً اور ضرورت مندوں پر سخاوت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک بار امیر المومنین علیہ السلام نے حکم دیا کہ ایک شخص کو، جو سخی تھا اور فقراً کی مدد کرتا تھا، پانچ وسق کھجور بھیجی جائے (ایک وسق = 80 کلوگرام)۔ اُس شخص نے حضرت علی علیہ السلام یا کسی اور سے اس کی درخواست بھی نہیں کی تھی۔ جب امیر المومنین علیہ السلام نے یہ حکم دیا تو وہاں ایک بخیل شخص موجود تھا۔ اُس نے امیر المومنینؑ سے کہا یا امیر المومنینؑ! اس شخص نے آپ سے مدد کیلئے درخواست بھی نہیں کی، اگر آپؑ اسے ایک وسق بھی بھجوا دیتے تو کافی تھا!''

امیر المومنین علیہ السلام نے اس شخص کی سرزنش کی اور فرمایا:

"لَا كَثَّرَ اللّٰهُ فِي الْمُؤْمِنِيْنَ ضَرَبَكَ، أُعْطِيَ أَنَا وَتَبْخَلُ أَنْتَ"۔

''اللہ مسلمانوں کے معاشرے میں تجھ جیسے افراد کی تعداد میں اضافہ نہ کرے، دے مَیں رہا ہوں اور بخل تم کر رہے ہو؟''

''اگر میں کسی کی درخواست پر اس کی مدد کروں تو گویا اسے ایسی چیز کی قیمت ادا کر رہا ہوں جو میں نے اس سے لی ہے، اس لئے کہ مدد کی درخواست کر کے اس نے میری نظر میں اپنی عزت کو داغدار کیا ہے''۔(وسائل الشیعہ ، 6:318)۔

چھٹی آیت میں بخیلوں کی سخت سزا کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''''جو کوئی بخل سے کام لیتا ہے اور اس طرح غنی ہونا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی نیک جزا کو جھٹلاتا ہے، جلد ہی ہم اُسے مشکل میں گرفتار کر دیں گے''۔(اللیل:8تا10)

"وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى"

اس آیت سے مندرجہ ذیل نکات بخوبی واضح ہوتے ہیں:

1۔ بخل بے نیازی کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ بخل کی راہ اختیار کرنے والے انسان پر دُنیا اور آخرت دونوں کی راہیں دُشوار ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ آیت میں ''لِلْعُسْرٰى'' کا لفظ مطلق ہے اور ہر قسم کی مشکل اس میں آجاتی ہے، خواہ دُنیوی ہو یا اُخروی۔

2۔ اگر کوئی شخص اپنی ساری دولت اپنے ساتھ قبر میں اور آخرت میں لے بھی جائے تو جب وہ جہنم میں گرے گا، اس کا مال اسے کیا فائدہ دے گا؟

3۔ ان آیات میں ''یُسر'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جو ''عسر'' کا متضاد ہے۔مفسرین نے اس بارے میں بہت سے احتمالات دیئے ہیں جو ''عسر'' پر بھی صادق آتے ہیں۔ایک یہ کہ ''یُسر'' سے مراد یہ ہے کہ انسان پر اللہ کی اطاعت آسان ہو جاتی ہے جبکہ ''عسر'' کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان سے اطاعت کی توفیق سلب ہو جائے اور نیکی کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آسان زندگی کی راہ ہے۔بعض نے اس سے جنت کی راہ، بعض نے اللہ کے اجر و ثواب کی راہ اور بعض نے غیبی امداد کی راہیں مراد لی ہیں۔لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ''عسر'' اور ''یسر'' دونوں کے معنی وسیع ہیں جن میں دُنیا اور آخرت دونوں کی تمام مشکلات اور آسانیاں شامل ہیں۔

ساتویں آیت میں اللہ تعالیٰ اصحابِ رسولؐ کو مخاطب قرار دے کر بخیلوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''تم وہی لوگ ہو جنہیں کو اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے اور تم میں سے کچھ تو بخل سے کام لیتے ہیں، حالانکہ جو بخل سے کام لیتا ہے، وہ اپنے بارے میں بخل کرتا ہے۔'') محمد: 38)

"هَآ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ (محمد: 38)

آیت کے اختتام اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ"۔

''یعنی اللہ بے نیاز ہے اور تم فقر ہو''۔

اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ کہیں نادان افراد یہ سمجھنے لگ جائیں کہ اللہ ہمارے انفاق کا محتاج ہے۔

لہٰذا جو کچھ تم انفاق کرتے ہو درحقیقت یہ اللہ کی امانتیں ہیں جو چند روز تمہارے ہاتھ میں ہیں جو تمہاری تربیت اور تمہاری آزمائش کیلئے تمہیں سونپی گئی ہیں اور اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ ان امانتوں کا کچھ حصہ اس کے فقیر اور نادار بندوں میں تقسیم کردو اور کچھ جہاد پر صرف کردو۔

آیت کے اختتام پر بخیل کو تنبیہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اگر تم اللہ کے حکم سے رُوگردانی کروگے تو وہ تمہاری جگہ پر کچھ اور لوگوں کو لے آئے گا جو تم جیسے نہ ہوں گے''۔

"اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ"۔ (محمد: 38)

اس طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بخیلوں کو نیست و نابود اور ہلاک کرنے کی وعید سنادی ہے اور یہ شدید ترین وعید ہے جو بخیلوں کیلئے آئی ہے۔

بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ لوگ کون ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ انہیں تمہارا جانشین بنادے گا؟

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ سلمان کے کندھے پر رکھا۔ ایک روایت میں ہے کہ سلمان کے پاؤں پر رکھا اور فرمایا:

"هٰذَا وَقَوْمُهُ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ كَانَ الْاِيْمَانُ مَنُوْطًا بِالثُّرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِنْ فَارِسٍ"۔

''اللہ کی مراد اس کی قوم ہے، قسم ہے اللہ کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر ایمان ثریا پر بھی ہو تو اہلِ فارس کے کچھ افراد اُسے حاصل کرکے رہیں گے''۔

(تفسیر قرطبی، تفسیر رُوح البیان، تفسیر کبیر، تفسیر مراغی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر الدرالمنثور میں اسی آیت کے ذیل میں یہ بات دیکھی جاسکتی ہے)۔

آٹھویں آیت میں انفاق کا حکم دینے اور اس بات پر تاکید کرنے کے بعد کہ انفاق تمہارے لئے باعثِ خیر و برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے محفوظ رہتے ہیں، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

8۔ "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (تغابن: 16 و حشر: 9)

راغب اصفہانی اپنی کتاب "المفردات" میں کہتے ہیں کہ "شُحّ" اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں حرص بھی پائی جاتی ہو اور یہ انسان کی مستقل عادت بن جائے۔

لفظ "فلاح" جو بنیادی طور پر شگافتہ کرنے اور کاٹنے کے معنی رکھتا ہے، اس کا اطلاق ہر قسم کی خوش بختی اور کامیابی پر کیا جاتا ہے، اس لئے کہ انسان ہر رُکاوٹ کو شگافتہ کرتے ہوئے اور اپنے راستے سے اُسے کاٹتے ہوئے کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ فلاح کو مادی اور معنوی فلاح میں تقسیم بھی کیا گیا ہے۔

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ خبردار کر رہا ہے کہ مال اور اولاد فتنہ و آمائش ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ان دو چیزوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت کو انفاق کی راہ میں رُکاوٹ قرار دے رہا ہے کیونکہ انہی کی حد سے بڑھی ہوئی محبت انسان کو بخل کی بیماری میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تمام رات بیت اللہ کا طواف کرتے رہے اور اس دوران یہ دعا مانگے جا رہے تھے:

"اَللّٰهُمَّ قِنِی شُحَّ نَفْسِیْ"۔

یا اللہ! مجھے میرے نفس کے بخل سے بچالے"۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: "یا ابن رسولؐ اللہ! آج رات آپؑ نے اس دعا کے علاوہ کوئی اور دُعا نہیں مانگی؟"

آپؑ نے فرمایا:

"وَاَیُّ شَیْءٍ اَشَدُّ مِنْ شُحِّ النَّفْسِ اِنَّ اللّٰهَ یَقُوْلُ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"۔

"نفس کے بخل سے بڑھ کر کونسی چیز بری ہوسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا، وہ فلاح پا گیا"۔ (نور الثقلین: ج 5۔ ص 346)

انفاق کا حکم دینے کے بعد "خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ" کے الفاظ اس لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں انفاق اور سخاوت کا فائدہ خود انسان کو ہوتا ہے۔ اس سے انسان کی روحانی نشوونما ہوتی ہے۔ انسان کا نفس بخل کی تاریکی سے پاک ہوتا ہے اور

بہت سی معنوی اور مادی برکات انسان پر نازل ہوتی ہیں۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں ''شُحّ'' کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔آپؑ نے فضیل ابن عیاض سے پوچھا:

''جانتے ہو کہ 'شحیح' کون ہوتا ہے؟''

اُس نے جواب دیا: ''شحیح بخیل ہی کو کہتے ہیں''۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اَلشُّحُ اَشَدُّ مِنَ الْبُخلِ اِنَّ الْبَخِیْلَ یَبْخَلَ بِمَا فِیْ یَدِہٖ وَالشَّحِیْحُ یَشُحُّ عَلٰی مَافِیْ اَیْدِی النَّاسِ وَعَلٰی مَافِیْ یَدِہٖ حَتّٰی لَایَرٰی فِیْ اَیْدِی النَّاسَ شَیْئًا اِلَّاتَمَنّٰی اَنْ یَکُوْنَ لَہُ بِالْحِلِّ وَالْحَرَامِ، لَایَشْبَعُ وَلَا عَقْنَفْعُ بِمَارَزَقَہُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ"۔ (نور الثقلین: ج 5،ص 291)

''شُحُّ''، بخل سے بدتر ہے۔بخیل اُس مال کے بارے میں بخل کرتا ہے جو اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور ''شحیح'' اُس مال کے بارے میں بخل کرتا ہے جو دوسروں کے ہاتھ میں ہو، یہاں تک کہ وہ لوگوں کے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں دیکھنا چاہتا مگر یہ کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ چیز اسے مل جائے، خواہ حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے۔جو کچھ اللہ نے اُسے دیا ہے، اُس سے اُس کا پیٹ نہیں بھرتا اور وہ اس پر قناعت نہیں کرتا''۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ 'بخل تفقیر'' کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

رحمٰن کے بندوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ انفاق کرتے وقت وہ اسراف کرتے ہیں نہ سخت گیری بلکہ ان دولوں کے مابین اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

"وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا"(فرقان: 67)

''یَقْتُرُوْا'' کا مصدر ''قتر'' ہے جو اسراف کا نکتہ مقابل ہے۔اسراف اور اقتار ایک دُوسرے کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔اسراف کے معنی ہیں حد سے زیادہ انفاق کرنا اور اقتار کے معنی ہیں ضروری حد سے کم انفاق کرنا۔

درحقیقت اقتار بخل کی کمزور شکل ہے، اس لئے کہ اس میں کچھ نہ کچھ انفاق تو انجام پا رہا ہوتا ہے، اگرچہ ضرورت سے کم ہوتا ہے۔لیکن بخل میں تو کوئی انفاق انجام نہیں پاتا۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بخل تو درکنار، اقتار سے بھی پاک اور منزہ قرار دے رہا ہے۔

دسویں اور آخری آیت میں اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرما رہا ہے:

ان (مشرکوں) سے کہو کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم تنگدستی کے خوف سے

بخل سے کام لیتے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ (بنی اسرائیل:100)

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا "(بنی اسرائیل:100)

''اور انسان ایک بخیل مخلوق ہے''۔

یہاں انسان سے مراد غیر تربیت یافتہ انسان ہیں جو بخل کی روش پر چلتے ہیں۔ البتہ وہ انسان جو اولیاً اللہ کے زیر تربیت رہے ہوں بلکہ وہ انسان بھی جنہوں نے اپنی فطری پاکیزگی کو محفوظ رکھا ہو، بخیل اور طاقتور نہیں ہو سکتے۔

اس آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بخل ہمیشہ ذاتی یا گروہی مفادات کیلئے نہیں ہوتا بلکہ یہ صفتِ رذیلہ انسان کو اس حد تک گرا دیتی ہے کہ اگر اللہ کی رحمت کے خزانوں کی چابیاں بھی اسے دے دی جائیں تو وہ فقر اور تنگدستی کے خوف سے بخل کر راہ کو ترک نہیں کرتا۔

اس آیت میں ایک عام ضابطے کے طور پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: ''وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا''۔ ایسی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جیسے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ"۔ (عادات:6)

''انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے''۔

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ" (حج:66)

''انسان بہت بڑا کفرانِ نعمت کرنے والا ہے''۔

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ" (زخرف:15)

''انسان بطور آشکار بہت بڑا کفرانِ نعمت کرنے والا ہے''۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ"۔ (ابراھیم:34)

''انسان بہت بڑا ظالم اور بہت بڑا کفرانِ نعمت کرنے والا ہے''۔

یہ تمام بیانات ایسے انسانوں کیلئے ہیں جو اپنی فطری پاکیزگی کی دولت کو کھو چکے ہیں اور انبیاً و اولیاً کی تربیت کے فیض سے محروم رہے ہیں ورنہ پیدائشی طور پر کوئی انسان ایسے نقائص کے ساتھ دنیا میں نہیں آتا۔ اللہ نے انسان کی تخلیق کی بنیاد پاکیزگی پر رکھی ہے، ناپاکی پر نہیں۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں بخل کے بارے میں اسلام کا مؤقف اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ان آیات میں بخیلوں کے طرزِ عمل اوران کی مادی ومعنوی زندگی پر اس کے منفی اثرات وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں،اوراس بات کوکھول کر بیان کردیا گیا ہے کہ بخل ایک صفت رذیلہ ہے جوانسان کی فلاح کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

بُخل احادیث کے آئینے میں

کتب احادیث میں بخل کے بارے میں ایسی احادیث بکثرت پائی جاتی ہیں جو انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔نمونے کے طور پر ذیل میں چند احادیث بیان کی جارہی ہیں:

1. جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِيْلُ بَعِيْدٌ مِّنَ اللهِ بَعِيْدٌ النَّاسِ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّارِ"۔ (بحار، 308:73)

''بخیل اللہ سے دُور ہوتا ہے،لوگوں سے بھی دُور ہوتا ہے اورجہنم کے نزدیک ہوتا ہے''۔

2۔ایک حدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلنَّظَرُ اِلَى الْبَخِيْلِ يُقْسِي الْقَلْب"۔ (تحف العقول:214)

''بخیل شخص کو دیکھنے سے دل سخت ہوجاتا ہے''۔

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ بخیل انسان کا دل اس قدر تاریک ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے والے بھی اس تاریکی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

3۔ایک اورحدیث میں ہے کہ جنابِ رسولؐ خدا بیت اللہ کے طواف میں مشغول تھے۔آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا جو بیت اللہ کے غلاف سے چمٹا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا: یا اللہ! تجھے اس گھر کی حرمت کا واسطہ! میرے گناہوں کو معاف فرمادے۔

جنابِ رسولِ خدا نے اُس سے کہا: تمہارا گناہ کیا ہے؟ ذرا بیان کرو۔

اُس نے کہا: یارسولؐ اللہ: میرا گناہ اس سے کہیں بڑا ہے کہ میں اُسے بیان کرسکوں۔

آپؐ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے،تمہارا گناہ بڑا ہے یا زمین؟

اس نے کہا: یارسولؐ اللہ! میرا گناہ بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا سمندر؟

اس نے کہا: میرا گناہ

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا آسمان؟

اس نے کہا: میرا گناہ۔

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا اللہ کا عرش؟

اس نے کہا: میرا گناہ۔

آپؐ نے فرمایا: تمہارا گناہ بڑا ہے یا اللہ؟

اس نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: افسوس ہے تم پر! بتاؤ تم نے کونسا گناہ کیا ہے جسے اس قدر برا سمجھ رہے ہو؟

اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں ایک دولت مند شخص ہوں لیکن جس کوئی حاجت مند میرے پاس آتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آگ کا شعلہ میرے سامنے بھڑکا دیا گیا ہو۔

آپؐ نے فرمایا: مجھ سے دور ہو جاؤ اور مجھے اپنی آگ میں نہ جلاؤ۔ قسم ہے اس اللہ کی جس نے مجھے مبعوث فرمایا۔ اگر تو دو ہزار سال تک رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان عبادت کرتا رہے، روتا رہے، یہاں تک کہ تیری آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک دریا کی صورت میں بہہ کر باغوں اور درختوں کو سیراب کرنے لگیں لیکن اگر تو بخیل اور لئیم ہو تو اللہ تعالیٰ منہ کے بل تجھے جہنم میں ڈال دے گا۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں پڑا کہ جو کوئی بخل کرتا ہے، اپنی ذات کے بارے میں بخل کرتا ہے اور جو اپنے بخل سے محفوظ ہو، وہی فلاح پانے والا ہے؟ (جامع السعادات، 111:2)

4۔ ایک اور حدیث میں جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"یَقُوْلُ قَائِلُکُمْ اَلشَّحِیْحُ اَعْذَرُ مِنَ الظَّالِمِ وَأَیُّ ظُلْمٍ اَظْلَمُ عِنْدَاللّٰہِ مِنَ الشُّحِّ حَلَفَ اللّٰہُ بِعِزَّتِہٖ وَعَظَمَتِہٖ وَجَلَالِہٖ لَایَدْخُلُ الْجَنَّۃَ شَحِیْحٌ وَلَا بَخِیْلٌ"۔ (جامع السعادات، 111:2)

''تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ بخیل ظالم کی نسبت معذور ہے، حالانکہ اللہ کے ہاں کونسا ظلم بخل سے بڑھ کر ہے؟ جبکہ اُس نے اپنی عزت، عظمت اور جلال کی قسم کھا کر کہا ہے کہ حریص اور بخیل کسی صورت میں جنت میں داخل نہ ہوں گے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلشُّحُّ وَالْاِیْمَانُ لَایَجْتَمِعَانِ فِیْ قَلْبٍ وَاحِدٍ"۔ (جامع السعادات، 110:2)

''حرص اور بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے''۔

6۔ ایک اور مقام پر آپؐ کا فرمان ہے:

"اَلْبُخْلُ شَجَرَۃٌ تَنْبُتُ فِی النَّارِ اِلَّا بَخِیْلٌ"۔

''بخل ایک درخت ہے جو جہنم کی آگ میں اُگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بخیل کے سوا کوئی شخص جہنم میں نہیں جائے گا۔'' (جامع السعادات، 110:2)

7۔ روایات میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی ایک جنگ میں شہید ہو گئے۔ اُس کی رشتہ دار خواتین میں سے ایک ''واشہیدا'' کہہ کر اس پر رو رہی تھی۔ آپؐ نے اس عورت سے فرمایا: ''تمہیں کیا معلوم کہ وہ شہید ہو کر اس دنیا سے گیا ہے؟''

"فَلَعَلَّہٗ کَانَ یَتَکَلَّمُ بِمَا لَایَعْنِیْہِ اَوْ یَبْخَلُ بِمَا لَایَنْقُصُہٗ"۔

''شاید وہ ایسی چیزوں کے بارے میں باتیں کرتا ہو جن کا اُس سے کوئی تعلق نہ تھا یا اُس چیز کے بارے میں بخل کرتا تھا جسے دینے سے اُس کے مال میں کوئی کمی نہ آتی''۔ (جامع السعادات، 111:2)

اس حدیث سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ بیہودہ گفتگو اور بخل، خاص طور پر ایسی چیزوں کے بارے میں بخل جن کے دینے سے انسان کے مال میں کوئی کمی نہیں آیت، شہادت جیسے عظیم اعزار کو بھی بے رن یا کم رنگ کر دیتی ہے۔

8۔ آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جَاھِلٌ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ وَاَدْوَی الدَّاءِ الْبُخْلُ"۔

''جاہل سخی اللہ کی نظر میں بخیل عبادت گزار سے بہتر ہے اور بدترین بیماری بخل ہے''۔ (جامع السعادات، 110:2)

اس حدیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بخل عبادت آثار کو محو کر دیتا ہے۔

9۔ جناب رسولؐ خدا سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمُوْبِقَاتُ ثَلَاثٌ شُحٌّ مُطَاعٌ وَھَوًی مُتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِہٖ"۔

''تین چیزیں باعثِ ہلاکت ہیں: وہ شح (بخل) جس کی انسان طلب کرے، وہ ہوائے نفس جس کی انسان

پیروی کرے اور خود پسندی''۔(جامع السعادات،110:2)

اگر چہ اس موضوع پر احادیث بہت زیادہ ہیں لیکن ہم اس بحث کو اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

ایک مرتبہ خطرناک قیدیوں کا ایک گروہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیں مگر ایک کو مستثنیٰ کر دیا۔اس شخص نے پوچھا کہ آپؐ نے مجھے میرے ساتھیوں سے الگ کیوں کر دیا، حالانکہ ہم سب کا جرم ایک ہے؟

آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھے خبر دی ہے کہ تم اپنی قوم کے سب سے زیادہ سخی انسان ہو، اس لئے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔یہ سنتے ہی وہ شخص بھی مسلمان ہو گیا۔(میزان الحکمہ ،1277:2)

بہت سے دوسرے اخلاقی رذائل کی طرح اس صفتِ رذیلہ کا سبب ایمان کی کمزوری اور اللہ کی ناقص معرفت ہے۔جو شخص اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قادر سمجھتا ہے، اسے خیر و برکت کا سرچشمہ مانتا ہے، اُس کے تمام وعدوں کو سچا جانتا ہے اور انفاق فی سبیل اللہ کے معنوی اور مادی فوائد اور برکات پر یقین رکھتا ہے، اس کیلئے ممکن ہی نہیں ہے کہ اس صفتِ رذیلہ میں گرفتار ہو جائے۔حضرت علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:

"اَلْبُخْلُ بِالْمَوْجُوْدِ سُوْءُ الظَّنِ بِالْمَعْبُوْدِ"۔(غرر الحکم: 1258)

''جو چیز انسان کے پاس موجود ہے، اُس کے بارے میں بخل سے کام لینا معبود کے بارے میں بدگمانی اور سوءظن ہے''۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنْ كَانَ الْخَلَفُ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ حَقًّا فَالْبُخْلُ لِمَاذَا"۔

''اگر یہ بات حق ہے کہ جو مال اللہ کی راہ میں دے دیا جائے، اللہ اس مال کا جانشین ضرور بناتا ہے تو پھر بخل کیوں؟''(بحار الانوار،300:70)

فقہ الرضا میں ہے:

"اِيَّاكُمْ وَالْبُخْلَ فَاِنَّهَا عَاهَةٌ لَا تَكُوْنُ فِيْ حُرٍّ وَلَا مُؤْمِنٍ اِنَّهَا خِلَافُ الْاِيْمَانِ"۔

''بخل سے بچو کیونکہ یہ ایسی برائی ہے جو کسی آزاد یا مومن انسان میں نہیں پائی جاسکتی، یہ تو ایمان کے ہی خلاف ہے''۔(بحار الانوار،364:75)

ایک حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"يَا عَبْدِيْ اَتَبْخَلُنِيْ اَمْ تَتَّهِمُنِيْ اَمْ تَظُنُّ اَنِّيْ عَاجِزٌ غَيْرُ قَادِرٍ عَلٰى اِثَابَتِكَ"۔

''اے میرے بندے! کیا تو میرے بارے میں بخل سے کام لیتا ہے یا مجھے جھوٹا سمجھتا ہے یا میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں کمزور ہوں اور تجھے اجروثواب دینے کی قدرت نہیں رکھتا؟''(بحار،10:93)

یقیناً جولوگ آزاد انسان جیسی نفسیات رکھتے ہیں اور وہ جو ایمان سے سرشار ہیں اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو سچ جانتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے پورے کرنے اور بندوں کو اجروثواب عطا کرنے پر قادر ہے، اللہ کی راہ میں انفاق کرتے وقت اُن کا ہاتھ نہیں کانپتا بلکہ جہاں تک اُن کیلئے ممکن ہوتا ہے، وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ سخاوت اور بخشش کے ساتھ پیش آتے ہیں اور اجروثواب کی توقع صرف اللہ سے رکھتے ہیں جو عالم اور قادر ہے۔

بخل کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان دوسروں کی مدد سے بچنے کیلئے بہانہ جوئی کرتا ہے۔ بخیل انسان اپنے بخل کو چھپانے کیلئے بے بنیاد اور بیہودہ عذر اور بہانے تلاش کرتا ہے اور ایسے ہی طریقوں سے اپنے آپ کو بھی فریب دیتا رہتا ہے، مثلاً ممکن ہے کہ کسی شخص کے پاس کافی مقدار میں روپیہ موجود ہو لیکن اس کے باوجود کسی کی مدد کرنے کو تیار نہ ہو بلکہ اس قسم کے بہانوں کا سہارا لینے لگے کہ ہوسکتا ہے کہ خود مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے، ممکن ہے میری بیوی کا بچہ بیمار ہوجائے، یا ہوسکتا ہے کہ میرے گھر مہمان آجائیں یا ہوسکتا ہے کہ کاروبار میں نقصان وغیرہ جیسی صورت پیدا ہوجائے۔ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ مُتَحَجِّجٌ بِالْمَعَاذِیْرِ وَالتَّعَالِیْلِ"۔

''بخیل انسان بیہودہ بہانے اور دلیلیں تلاش کرتا ہے''۔(غررالحکم:1275)

ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں:

"کَثْرَةُ الْعِلَلِ آیَةُ الْبُخْلِ"۔

''بہانوں کی کثرت بخل کی علامت ہے''۔(بحارالانوار،209:74)

بخل کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپاتا ہے تاکہ لوگ اس سے کچھ مانگ نہ لیں اور اس کیلئے بھی اس قسم کے بہانے بنانے لگتا ہے کہ میں اپنی حقیقت اس لئے چھپاتا ہوں کہ نظر نہ لگ جائے، لوگ مجھ سے حسد نہ کرنے لگیں یا کوئی مجھے نقصان نہ پہنچادے۔

بخل کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں کوئی چیز دے کر آزردہ خاطر ہوجاتا ہے، گویا کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا گیا ہے یا اس کا کوئی عزیز داغِ مفارقت دے گیا ہے۔

بخل کے نتائج:۔

تمام صفاتِ رذیلہ میں بخل ایسی صفت ہے جو سب سے زیادہ مشکلات اور برے نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ بخیل شخص اگرچہ اپنا مال بچالیتا ہے مگر اپنی عزت کھودیتا ہے۔ یہ بات احادیث میں بھی وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

1۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ یَسْمَحُ مِنْ عِرْضِہٖ بِاَکْثَرِ مِمَّا اَمْسَکَ مِنْ عِرْضِہٖ"۔

''بخیل جتنا مال بچاتا ہے، اس سے زیادہ اپنی عزت کھو دیتا ہے''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 130:2)

2۔ بخیل اپنے دوستوں کو کھو دیتا ہے اور مشکلات میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَیْسَ لِبَخِیْلٍ حَبِیْبٌ"

''بخیل کا کوئی دوست نہیں ہوتا''۔(شرح فارسی غرر الحکم، 27:5)

اگر کوئی شخص اس کا دوست بن بھی جائے تو اُس کا بخل اس کے دوستوں کی بھی ذِلت اور رُسوائی کا اور اس کے دُشمنوں کی عزت کا سبب بن جاتا ہے جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبُخْلُ (اَلْبَخِیْلُ) یُذِلُّ مُصَاحِبَہٗ وَیُعِزُّ مُجَانِبُہٗ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 370:1)

3۔ بخیل ہمیشہ محنت ومشقت کرتا ہے اور اس کی محنت ومشقت کا ثمر اس کے وارثوں کو مل جاتا ہے۔ دُنیا میں وہ فقیروں جیسی زندگی گزارتا ہے اور آخرت میں مال جمع کرنے اور انفاق نہ کرنے کا عذاب جھیلتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ خَازِنٌ لِوَرَثَتِہٖ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 127:1)

''بخیل اپنے وارثوں کا خزانچی ہوتا ہے'' (اور ہوسکتا ہے کہ اس کے وارث اس کے ایصال ثواب کیلئے ایک روپیہ بھی خرچ نہ کریں)۔

4۔ بخیل فقیرانہ زندگی گزارتا ہے، اس لئے کہ جب انسان کے بخل میں شدت آجائے تو وہ اپنے بارے میں بھی بخل سے کام لینے لگتا ہے اور آرام وآسائش کی زندگی سے محروم ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات وہ بخل کی وجہ سے نفسیاتی بیماریوں میں بھی مبتلا ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ لوگ اس کے مال کی طمع کرنے لگے ہیں، اُس سے حسد کرتے ہیں اور اُس کے دُشمن ہوگئے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بخیل کی حالت کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچا ہے!

"عَجِبْتُ لِشَقِیِّ الْبَخِیْلِ یَتَعَجَّلُ الْفَقْرَ الَّذِیْ مِنْہُ ھَرَبَ وَیَفُوْتُہُ الْغِنَی الَّذِیْ اِیَّاہُ طَلَبَ فَیَعِیْشُ فِی الدُّنْیَا عَیْشَ الْفُقَرَاءِ وَیُحَاسَبُ فِی الْاٰخِرَۃِ حِسَابَ الْاَغْنِیَاءِ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 346:4)

''مجھے بدبخت بخیل پر تعجب ہوتا ہے کہ جس فقر سے وہ ڈرتا ہے، یہی تیزی سے اُس کو آلیتا ہے اور جس بے نیازی اور تونگری کی وہ آرزو کرتا ہے، وہی اُس سے رُخصت ہوجاتی ہے۔ دُنیا میں وہ فقیروں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں حساب اغنیا جیسا دے گا''۔

5۔ بخل بدنامی اور لوگوں کی طرف سے لعنت ونفرین کی کثرت کا سبب بنتا ہے۔ امیر المومنین فرماتے ہیں:

"بِالْبُخْلِ تَكْثُرُ الْمَسَبَّةَ"۔ (شرح فارسی غرر الحکم، 200:3)

''بخل کی وجہ سے لوگوں کی دشنام طرازیاں بڑھ جاتی ہیں''۔

6۔ بخل بہت سی صفاتِ رذیلہ کا مجموعہ اور سرچشمہ ہے: جیسے سوءظن، حسد، خوف، بزدلی، اخلاصِ نیت سے محرومی، باطنی پاکیزگی کا کھوجانا، سنگدلی وغیرہ۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبُخْلُ جَامِعٌ لِمَسَاوِئِ الْعُيُوْبِ وَهُوَ زِمَامٌ يُقَادُ بِهٖ اِلٰى كُلِّ سُوْءٍ"۔

''بخل تمام عیوب کا مجموعہ ہے اور ایسی لگام ہے جو انسان کو ہر برائی کی طرف لے جاتی ہے''۔

(بحار الانوار، 307:70)

بخل کے درجات:۔

تمام صفاتِ رذیلہ کی طرح بخل کے بھی مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے بعض تو بہت ہی ضعیف ہوتے ہیں جو اکثر لوگوں کو نظر ہی نہیں آتے جبکہ بعض اتنے طاقتور ہوتے ہیں جو بچوں کو بھی نظر آجاتے ہیں۔

بعض لوگ صرف اپنے اموال کے بارے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنے اموال سے کسی کو تھوڑا سا بھی فائدہ پہنچائیں۔ بعض لوگ دُوسروں کے مال کے بارے میں بھی بخل کا رویہ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی اور شخص اپنے مال سے کسی کو فائدہ پہنچا رہا ہے تو انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ بعض اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ کسی کو اپنے مال ودولت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بخل کا بدترین اور عجیب ترین نمونہ ہے۔

اس کے علاوہ بعض لوگ مادی اُمور میں بخیل ہوتے ہیں اور بعض معنوی اُمور میں، جیسے کسی کو اپنے علم سے نفع پہنچانے میں بخل سے کام لینا۔ بعض لوگ بڑے معاملات میں بخیل واقع ہوتے ہیں اور بعض لوگ چھوٹے چھوٹے مسائل میں۔ بعض لوگ واجبات میں بخل سے کام لیتے ہیں اور خمس وزکوۃ کی ادائیگی نہیں کرتے جبکہ بعض لوگ مستحبات میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

بعض لوگ کھلم کھلا بخیل ہوتے ہیں جبکہ بعض لوگ اپنے بخل کی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہیں گے کہ ''ہمیں اسراف پسند نہیں ہے، بچوں کے اخراجات بڑھ گئے ہیں، کیا کریں، کوئی حقیقی مستحق ہی نہیں ملتا، وغیرہ۔

مختصر یہ کہ بخل کی مختلف صورتوں کے بارے میں لطیف نکات بیان کئے گئے ہیں جن میں سے چند نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

1۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْبُخْلُ بِاِخْرَاجِ مَا افْتَرَضَهُ اللهُ سُبْحَانَهٗ مِنَ الْاَمْوَالِ اَقْبَحُ الْبُخْلِ"۔

''جن چیزوں کا ادا کرنا اللہ نے فرض قرار دیا ہے، اُن کی عدم ادائیگی بدترین بخل ہے''۔(غرر الحکم، 2038)

2۔ گزشتہ صفحات میں یہ واقعہ بیان ہو چکا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک شخص کو کچھ کھجوریں بھجوائیں۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک بخیل نے کہا کہ اگر آپؑ اس کا پانچواں حصہ بھی بھجوا دیتے تو کافی ہوتا۔ آپؑ نے اس کی سرزنش کی اور فرمایا: اللہ تجھ جیسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہ کرے، دے میں رہا ہوں اور بخل تو کر رہا ہے۔

3۔ ایک حدیث میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اِنَّ اَبْخَلَ النَّاسِ مَنْ بَخِلَ بِالسَّلَامِ"۔ (بحار الانوار، 4:73)

''سب سے بخیل شخص وہ ہے جو سلام کرنے میں بھی بخل کرے''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؐ کا فرمان ہے:

"اَلْبَخِيْلُ حَقًّا مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ" (بحار الانوار، 306:70)

''بخیل ترین شخص وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر صلوات نہ بھیجے''۔

5۔ بعض روایات میں بخل کے درجات کو ''لئیم'' کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے جو کہ بخل کا شدید ترین درجہ ہے۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلرِّجَالُ اَرْبَعَةٌ سَخِيٌّ وَ كَرِيْمٌ وَبَخِيْلٌ وَلَئِيْمٌ فَالسَّخِيُّ الَّذِيْ يَأْكُلُ وَيُعْطِيْ وَالْكَرِيْمُ الَّذِيْ لَايَأْكُلُ وَيُعْطِيْ وَالْبَخِيْلُ الَّذِيْ يَأْكُلُ وَلَايُعْطِيْ وَاللَّئِيْمُ الَّذِيْ لَايَأْكُلُ وَلَايُعْطِيْ"۔ (بحار الانوار، 356:68)

''لوگوں کی چار اقسام ہیں: سخی، کریم، بخیل اور لئیم۔ سخی وہ ہے جو خود بھی کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی دیتا ہے، کریم وہ ہے جو خود نہیں کھاتا اور دوسروں کو دے دیتا ہے، بخیل وہ ہے جو خود کھاتا ہے اور دُوسروں کو نہیں دیتا جبکہ لئیم وہ ہے جو خود کھاتا ہے نہ دُوسروں کو دیتا ہے''۔

بُخل کی روک تھام اور علاج

جسمانی امراض کی طرح رُوحانی امراض کے علاج کا پہلا قدم بھی یہ ہے کہ بیماری کی وجہ کو تلاش کر کے اُس کا خاتمہ کیا جائے، اس لئے کہ جب تک بیماری کی جڑ ختم نہ ہوگی، اُس کا علاج مستقل نہ ہوگا۔

بخل کی بہت سی وجوہات ہیں، لہٰذا اس کا علاج کرنے کیلئے اس کی صحیح وجہ کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگ شہوت پرستی کے دلدادہ ہوتے ہیں، لہٰذا مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں کیونکہ مال اُن کی شہوت پرستی کی تسکین کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مال کا تھوڑا سا حصہ بھی کسی فائدہ پہنچانے میں صرف نہیں کرتے۔ ایسے افراد کو بخل کا علاج کرنا چاہئے اور ان لوگوں کے حالات پر غور کرنا چاہئے جنہوں نے زندگی شہوت پرستی میں گزاری ہو اور آخر کار عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔

بخل کا ایک اور سبب لمبی آرزوئیں ہیں جو انسان کو مال جمع کرنے اور بخل پر مائل کرتی ہیں۔ ایسے افراد دُنیا کی ناپائیداری کے بارے میں غور کریں اور ان لوگوں کے انجام کا مشاہدہ کریں جو لمبی آرزوؤں کی وجہ سے مختلف حوادث اور بیماریوں کا شکار ہو کر برباد ہو گئے، اس سے انہیں اپنی روِش کے غلط ہونے کا احساس ہو جائے گا اور وہ بخل جیسی بری صفت سے چھٹکارا پالینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بخل کی ایک اور وجہ مال واولاد کی محبت ہے۔ لیکن اگر انسان اس بات پر توجہ رکھے کہ اللہ نے اُن کی روزی بھی اپنے ذمہ لی ہوئی ہے، اس کے علاوہ اگر انسان یہ سوچے کہ اگر اسکی اولاد اللہ کی فرمانبردار ہو تو اللہ انہیں ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا اور اگر اللہ کی نافرمان اور اس کی دشمن ہو تو ایسے افراد کیلئے مال ودولت جمع کرنے کی زحمت کرنا کوئی عقل مندانہ کام نہیں ہے۔ اس طرح غور وفکر کرنے سے بخل کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

اسی طرح یہ سوچنا بھی بخل کے خاتمہ کیلئے مفید ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس دُنیا میں ایسے ہیں جنہیں ماں باپ کی طرف سے کوئی میراث نہیں ملی مگر اپنی ذاتی لیاقت اور محنت کی وجہ سے وہ ان لوگوں سے بہتر حالت میں ہیں جنہیں والدین کی طرف سے بہت کچھ ورثہ میں ملا۔

بعض لوگ مال ودولت کو صرف مال ودولت ہونے کی حیثیت سے ہی قابلِ محبت سمجھتے ہیں اور اس کی محبت میں گرفتار ہو کر بخل میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مال جمع کرنے میں انتھک محنت کرتے ہیں مگر خرچ کرنے سے وحشت زدہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں کہ مال مادی اور معنوی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اگر اس سے صحیح استفادہ نہ کیا جائے تو اس میں اور پتھر اور لکڑی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بخل کا مقابلہ کرنے کا ایک اور ذریعہ یہ ہے کہ بخیل انسان دل کڑا کر کے تھوڑی تھوڑی سخاوت شروع کر دے۔ آہستہ آہستہ اسکے اندر سخاوت کی صفت مستحکم ہونا شروع ہو جائے گی اور بخل کا زور ٹوٹتا چلا جائے گا۔

بخیل افراد کے بارے میں لوگوں کی نفرت اور سخی افراد کے بارے میں لوگوں کے احترام اور تعریف کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ بھی بخل سے نجات حاصل کرنے کا ایک موثر طریقہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بخل کے دیگر برے آثار و نتائج کے بارے میں غور و فکر کرنا بھی انسان کو بخل کی زنجیروں سے آزاد کرسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلْبَخِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ بِالْیَسِیْرِ مِنْ دُنْیَاہُ وَیَسْمَحُ لِوُرَّاثِہٖ بِکُلِّھَا"۔

''بخیل اپنے اُوپر تھوڑا سا خرچ کرنے میں تو بخل کرتا ہے مگر اپنا سب کچھ اپنے وارثوں کیلئے چھوڑ جاتا ہے''۔(غرر الحکم:1884)

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَنْ بَرِءَ مِنَ الْبُخْلِ نَالَ الشَّرَفَ"۔(بحار الانوار، 229:70)

''جس نے بخل سے آزادی حاصل کرلی، وہ عزت و شرافت کے مقام پر پہنچ گیا''۔

ان تمام اُمور میں غور و فکر سے انسان بخل سے نجات پاسکتا ہے۔ خاص طور پر اگر انسان ان احادیث کو سامنے رکھے جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔

پندرھواں باب

جُود وسخاوت

تمہید:۔

یہ دو الفاظ جو بخل کے متضاد کے طور پر معروف ہیں، عام طور پر ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن بعض کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ جود کا مرتبہ سخاوت سے افضل ہے، اس لئے کہ جود کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ ''جود یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے درخواست کے بغیر اُسے عطا کرے اور اپنے دیئے ہوئے کو کم جانے''۔ جود کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''انسان لوگوں کی درخواست سے خوش ہو اور انہیں دیتے ہوئے بھی خوش ہو''۔

جود کی ایک اور تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''انسان مال کو اللہ کا مال سمجھ کر اور سائل کو اللہ کا بندہ سمجھ کر اور اپنے آپ کو اللہ اور بندے کے درمیان واسطہ سمجھ کر کسی کو کچھ دے''۔

البتہ سخاوت کا دائرہ وسیع تر ہے اور ہر قسم کی بخشش اس کے اندر آتی ہے۔

سخاوت اور جود کا فرق اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے مال کا ایک حصہ دوسروں کو دے دے اور دوسرا حصہ اپنے پاس رکھے، اس کا عمل سخاوت ہے اور جو شخص تھوڑا مال اپنے لئے رکھے اور زیادہ حصہ دوسروں کو بخش دے، اس کا عمل جود ہے۔

ان تمام تعریفوں کی روشنی میں جود کا مرتبہ سخاوت کے مرتبے سے افضل ہے۔ بہرحال جود اور سخاوت اہم اخلاقی اقدار میں سے ہیں۔ جس قدر بخل انسان کی شخصیت کی عظمت اور اس کے ایمان کے اعلیٰ درجات کی علامت ہیں۔

قرآن مجید میں اگرچہ جود اور سخاوت کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے ہیں لیکن ایسی تعبیرات ضرور استعمال ہوئی ہیں جو ان دونوں مفاہیم پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہیں اور قرآن نے اس کی بہت فضیلت بیان کی ہے۔

نمونے کے طور پر مندرجہ ذیل آیات میں غور فرمایئے:

1۔ ''يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ''۔ (حشر: 9)

''جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتے ہیں، یہ انہیں پسند کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں دیا جاتا ہے، اپنے دلوں میں اس کی حاجت محسوس نہیں کرتے اور خود ضرورت مند ہونے کے باوجود انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں''۔

2۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝

''کھانے کی محبت کے باوجود وہ اپنا کھانا یتیم، مسکین اور اسیر کو کھلا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمہیں اللہ کی خوشنودی کیلئے کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے''۔

3۔ ''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ''۔ (بقرہ: 261)

''جولوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اُس بیج جیسی ہے جس میں سے سات خوشے اُگیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں۔ اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہے، اسے دوگنا یا چند گنا کر دیتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔''

4۔ ''اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ''۔ (بقرہ: 274)

''وہ اپنے اموال شب و روز، پوشیدہ و آشکار انفاق کرتے ہیں، ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف اور غم نہیں ہے''۔

5۔ ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ''۔ (آل عمران: 92)

''تم ہرگز نیکی کی حقیقت کو نہ جان سکو گے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ پر انفاق نہ کرو اور جو انفاق تم کرتے ہو، اللہ اُس کا خوب علم رکھتا ہے''۔

6۔ ''اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ''۔ (بقرہ: 3)

''(متقین وہ ہیں) جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے انفاق کرتے ہیں''۔

7۔ ''وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا''۔

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ نہ باندھ لو اور نہ ہی اسے مکمل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت کا نشانہ بنو اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہو''۔ (بنی اسرائیل: 29)

تفسیر

پہلی آیت میں مدینہ کے اُن سخاوت منداانصار کا ذکر ہے جنہوں نے کھلے دل سے مکہ سے آنے والے مہاجرین کو قبول کیا اور انہیں اپنے اُوپر ترجیح دی اور کہا کہ ہم اپنا مال اور اپنے گھر کا تمہارے ساتھ مساوی طور پر بانٹ لیتے ہیں اور مالِ غنیمت میں سے کچھ حصہ نہیں لیں گے۔

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ اُن کا ذکر اس طرح فرماتا ہے:

یہ لوگ ہیں جو اپنے طرف ہجرت کر کے آنے والوں کو پسند کرتے ہیں اور جو کچھ ان مہاجرین کو دیا جاتا ہے ،اپنے دل میں اس کی حاجت محسوس نہیں کرتے اور خود ضرورت مند ہوتے ہوئے انہیں اپنے اُوپر ترجیح دیتے ہیں۔

"یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ"۔ (حشر:9)

بعض مفسرین نے لکھا ہے:''تاریخ ایسے استقبال کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کچھ مہاجر ایک شہر میں داخل ہوں اور اس شہر کے اہلِ ایمان اسطرح ان کا استقبال کریں کہ انہیں اپنے اوپر مقدم رکھیں اور اپنی زندگی کے تمام وسائل ان کے ساتھ برابر تقسیم کرلیں۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ چونکہ مہاجرین کی تعداد کم تھی اور ان کے میزبان انصار کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا بعض اوقات مہاجرین کی میزبانی پر انصار آپس میں لڑ پڑتے تھے اور پھر قرعہ اندازی کے ذریعے مسئلہ حل ہوتا تھا۔(فی ظلال: جلد 7)

بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انصار کی محبت، وسیع النظری اور سخاوت کی تعریف فرمارہا ہے۔

دوسری آیت میں ان عظیم الشان شخصیات کا ذکر ہے جو خود کھانے کی شدید ضرورت ہونے کے باوجود اپنا کھانا، یتیم، مسکین اور اسیر کو دیتے ہیں اور ان سے بدلے اور شکریے کی توقع تک نہیں رکھتے۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝(دھر:8اور9)

شیعہ اور سنی دونوں کی کتب میں بکثرت روایات پائی جاتی ہیں کہ سورہ دہر کی آیات 8 اور 9 اہلِ بیت کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ علامہ امینی نے ''الغدیر'' میں اہلِ سنت کے 36 علماً اور ان کی کتب کے نام درج کئے ہیں جنہوں نے اپنی کتب میں لکھا ہے کہ یہ آیات علیؑ، فاطمہؑ، حسن، اور حسین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں جبکہ اہلِ تشیع میں تو سب اس بات پر متفق ہیں کہ پوری

سورۂ دہر یا اس کا اچھا خاصہ حصہ انؑ کی شان میں نازل ہوا ہے۔

ان آیات میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ان سخی ہستیوں کی سخاوت کا ذکر اور انکی تعریف کر رہا ہے اور انکو عمدہ ترین اجر کی بشارت دے رہا ہے۔ ایک جگہ وہ انہیں ابرار کے نام سے یاد کر رہا ہے تو دوسری جگہ انہیں عباد اللہ (اللہ کے خاص بندے) کہہ رہا ہے۔

تیسری آیت میں انفاق کرنے والے سخی افراد کی زبردست حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اور جو تعبیرات اس آیت میں استعمال کی گئی ہیں، ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اُس بیج جیسی ہے جس میں سے سات خوشے اُگیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے، اسے دوگنا یا چند گنا کر دیتا ہے اور اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔''

"مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ"۔ (بقرہ: 261)

یہ آیت واضح طور پر اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ انفاق کا عمل انفاق کرنے والے نیک افراد کی رُوحانی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔ ان کے اموال بھی انفاق کی برکت سے کئی گنا ہوجاتے ہیں اور وہ خود بھی تیزی سے رُوحانی کمال کے مدارج طے کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چھوٹے چھوٹے قدم بھی عظیم نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ امام سجاد علیہ السلام جب بھی کسی کو کوئی چیز دیتے تو سائل سے لے کر اُسے چومتے تھے۔ جب انؑ سے اس کی وجہ پوچھی جاتی تو فرماتے تھے:

"لِاَنَّهَا تَقَعُ فِيْ يَدِ اللّٰهِ قَبْلَ يَدِ الْعَبْدِ"۔ (بحار الانوار، 129:93)

''اس لئے کہ بندے کے ہاتھ میں جانے سے قبل یہ اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے''۔

چوتھی آیت میں انفاق کے بارے میں ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وہ اپنے اموال شب و روز، پوشیدہ و آشکار انفاق کرتے ہیں، ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف اور غم نہیں ہے''۔

"اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"۔ (بقرہ: 274)

بنابرایں، سخاوت اور انفاق جس شکل میں بھی ہو، اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ دُوسری طرف سے انفاق اللہ کے عذاب کے

خوف کو برطرف کر دیتا ہے اور غم واندوہ کو انسان کی زندگی سے دُور کر دیتا ہے، مستقبل کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی زندگی کی کفالت کی ضمانت دے رکھی ہے۔ لہٰذا اپنے اموال کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں دے دینے سے وہ غمگین نہیں ہوتے، اس لئے کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کے رب کے فضل سے جو کچھ انہیں ملتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو انہوں نے دیا ہے۔

پانچویں آیت میں انفاق کے بارے میں ایک نئے انداز میں بات کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''تم ہرگز نیکی کی حقیقت کو نہ جان سکو گے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے اللہ کی راہ پر انفاق نہ کرو اور جو انفاق تم کرتے ہو، اللہ اُس کا خوب باخبر ہے''۔

"لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ"۔ (آل عمران:92)

عربی زبان میں 'بِرّ' اُس نیکی کو کہا جاتا ہے جو پوری توجہ کے ساتھ ارادہ واختیار سے کی جائے اور یہ انسان کی شخصیت اور رُوحانیت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں ''بِرّ'' مطلق ہے، اس کے ساتھ کسی قید یا شرط کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک انسان انفاق کو خوگر نہیں ہو جاتا، وہ نیکوکاری کی حقیقت کو نہیں چھو سکتا۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ''بِرّ'' سے بہشت، بعض نے تقویٰ اور بعض نے اچھا اجر مراد لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''بِرّ'' کا لفظ وسیع معنی رکھتا ہے اور یہ سارے معنی اس کے اندر آجاتے ہیں۔

چھٹی آیت میں اللہ تعالیٰ انفاق کو تقویٰ کا ایک اہم رُکن قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

''(متقین وہ ہیں) جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دے رکھا ہے، اس میں سے انفاق کرتے ہیں''۔

"الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ"۔ (بقرہ:3)

اس آیت میں ''يُنْفِقُوْنَ'' فعل مضارع کی صورت میں مذکور ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی نعمتوں میں سے مسلسل انفاق کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سخاوت اُن کی رُوح میں رچ بس چکی ہے اور اُن کی ایک نمایاں صفت بن چکی ہے۔

''مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ'' (جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے) کے الفاظ ایک انتہائی لطیف نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ متقین اپنے اموال کو اللہ کی عطا اور اس کی بخشش سمجھتے ہیں، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں دیتے وقت انہیں کوئی دشواری پیش آئے اور وہ بخل سے کام لیں۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انفاق صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام واجب اور مستحب صدقات اس میں داخل ہیں۔

ساتویں اور آخری آیت میں انفاق میں اعتدال کی راہ اپنانے اور افراط وتفریط سے اجتناب کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ نہ باندھ لو اور نہ ہی اسے مکمل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ رہ''۔ (بنی اسرائیل:29)

"وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا"۔

اس آیت میں سخاوت کی واضح تعریف کر دی گئی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک عملی مثال کے ذریعے سخاوت کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ آپؑ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اُٹھائی اور مٹھی بند کر لی۔ پھر آپؑ نے فرمایا کہ یہ بخل ہے۔ پھر آپؑ نے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اس طرح کھولی کہ ساری مٹی زمین پر گر گئی۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ اسراف ہے۔ پھر آپؑ نے مٹی کی ایک مٹھی لی اور اسے اس طرح کھولا کہ آپؑ کی ہتھیلی کا رُخ آسمان کی طرف تھا اور آپؑ نے انگلیاں بھی کھولی ہوئی تھیں۔ اس طرح کچھ مٹی زمین پر گر گئی اور کچھ آپؑ کی ہتھیلی پر باقی رہ گئی۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ اعتدال ہے (اور یہی سخاوت کی حقیقت ہے)۔ (نور الثقلین، 158:3)

ان آیات کی روشنی میں سخاوت کی عظمت اور اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عظیم انسانی صفت صرف انسانی معاشرے کے نظم اور سعادت کیلئے اور اس فقر و ناداری کے خلاف جہاد کے طور پر ہی ضروری نہیں ہے، جو کہ معاشرے میں انواع و اقسام کے گناہوں کا سبب بنتی ہے بلکہ انسان کے رُوحانی ارتقا میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

سخاوت، احادیث کی روشنی میں

احادیث میں جود و سخاوت کی فضیلت انتہائی حسین اور عمدہ پیرائے میں بیان کی گئی ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ ذیل میں ہم نمونے کے طور پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ جنابِ رسولؐ خدا کی ایک حدیث میں ہے:

"اَلسَّخَاءُ خُلُقُ اللهِ الْاَعْظَمُ" (کنز العمال، 337:6)

''سخاوت اللہ تعالیٰ کا سب سے عظیم اخلاق ہے''۔

درحقیقت تمام سخاوتیں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہیں، اس لئے کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب اُسی کی طرف سے ہے۔ مختلف اقسام کی نعمتیں، زمین و آسمان، ہمارا وجود، ہماری زندگی اور ہمارا سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے۔ جہاں کہیں کوئی سخاوت نظر آتی ہے، اُسی کی سخاوت کا پرتو ہے۔ اگر وہ ہمیں یہ نعمتیں عطا نہ کرتا تو ہم بھی سخاوت کی طاقت نہ رکھتے، حتیٰ کہ سخاوت کی صفت اگر کسی میں پائی جاتی ہے تو وہ بھی اس کی سخاوت ہے۔

2۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلسَّخَاءُ مِنْ اَخْلَاقِ الْاَنْبِیَاءِ وَهُوَ عِمَادُ الْاِیْمَانِ وَلَا تَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ اِلَّا سَخِیًّا اِلَّا ذُوْ یَقِیْنٍ وَهَمَّهُ عَالِیَةٌ لِاَنَّ السَّخَاءَ شُعَاعُ نُوْرِ الْیَقِیْنِ، وَمَنْ عَرَفَ مَاقَصَدَهَانَ عَلَیْهِ مَابَذَلَ"۔(بحار الانوار،68:355)

''سخاوت انبیاؑ کا اخلاق اور ایمان کا ستون ہے۔مومن سخی ہی ہوتا ہے اور سخی وہی ہوتا ہے جو یقین کی منزل پر فائز ہو اور بلند ہمت ہو،اس لئے کہ سخاوت یقین کے نور کی شعاع ہے اور جو شخص یہ جانتا ہو کہ اُسے کیا ملنے والا ہے تو جو کچھ وہ دیتا ہے،وہ اس پر آسان ہو جاتا ہے''۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سخاوت انبیاؑ میں پائی جاتی ہے اور ان کے یقین اور ایمان کی علامت ہے۔

3۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:(غرر الحکم:4511)

"تَحَلَّ بِالسَّخَاءِ وَالْوَرَعِ فَهُمَا حُلْیَةُ الْاِیْمَانِ وَاَشْرَفُ خَلَالِكَ"

''اپنے آپ کو سخاوت اور ورع کے ساتھ زینت دو کیونکہ یہ دونوں ایمان کا زیور اور تمہاری زینت ہیں''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلسَّخَاءُ ثَمَرَةُ الْعَقْلِ وَالْقَنَاعَةُ بُرْهَانُ النَّبَلِ"۔(غرر الحکم:2145)

''سخاوت عقل کا پھل اور قناعت شرافت کی دلیل ہے''۔

جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اور محنت و مشقت سے کمائے ہوئے اموال دوسروں کیلئے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں،درحقیقت ایسے لوگ عاقل نہیں ہوتے،اس لیے کہ مال جمع کرنے کی زحمت انہوں نے اٹھائی اور اس کا پھل اور فائدہ دوسروں کو پہنچا۔آیا کوئی عقل مند ایسا کام کرسکتا ہے؟

5۔ ایک اور حدیث میں آپؑ سخاوت کے بارے میں ایک لطیف نکتہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"غَطُّوا مَعَایِبَکُمْ بِالسَّخَاءِ فَاِنَّهُ سَتْرُ الْعُیُوْبِ"۔(غرر الحکم:6440)

''سخاوت کے ذریعے اپنے عیبوں کو چھپاؤ کیونکہ سخاوت عیبوں کا پردہ ہے''۔

حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کی صداقت تجربہ سے ثابت ہے۔ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جس میں مختلف قسم کے عیب پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ سخی ہوتے ہیں،لہٰذا لوگ اُن کا

احترام کرتے ہیں۔

6۔ ایک اورحدیث میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلسَّخَاءُ يَمْحَصُ الذُّنُوْبِ وَيَجْلُبُ مَحَبَّةَ الْقُلُوْبِ"۔(غرر الحکم: 1738)

''سخاوت گناہوں کودھودیتی ہےاور دِلوں کی محبت کوجذب کرتی ہے۔''

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت گناہوں کا کفارہ ہے۔

7۔ امیر المومنین علیہ السلام دِلوں کوجذب کرنے کیلئے محبت کی گہری تاثیر کا ذکران الفاظ میں فرماتے ہیں:

"مَا اسْتَجْلَبَتِ الْمَحَبَّةُ بِمِثْلِ السَّخَاءِ وَالرِّفْقِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ"۔

''سخاوت، رفاقت اورحسنِ اخلاق کی طرح کوئی چیزمحبت کوجذب نہیں کرتی''۔(غرر الحکم: 9561)

8۔ جناب رسولؐ خدااس بارے میں فرماتے ہیں:(بحارالانوار، 380:70)

"اَلسَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِّنَ اللهِ قَرِيْبٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْجَنَّةِ"۔

''سخی انسان اللہ کے قریب ہوتا ہے،لوگوں کے قریب ہوتا ہےاور جنت کے قریب ہوتا ہے''۔

9۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"شَابٌّ سَخِيٌّ مَرْهَقٌ فِي الذُّنُوْبِ اَحَبُّ اِلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ شَيْخٍ عَابِدٍ بَخِيْلٍ"۔(بحار الانوار، 307:70)

''گناہگار سخی جوان، بوڑھےاور بخیل عابد سے بہتر ہے''۔

10۔ہم اس بحث کوجنابِ رسولِؐ خدکی اس حدیث پرختم کرتے ہیں:(کنزالعمال، 392:6)

"تَجَافُوْا عَنْ ذَنْبِ السَّخِيِّ فَاِنَّ اللهَ آخِذٌ بِيَدِهٖ كُلَّمَا عَثُرَ"۔

''سخی کے گناہ کونظرانداز کرو کیونکہ جب بھی وہ ڈگمگاتا ہے،اللہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے''۔

مندرجہ بالا احادیث سے سخاوت کی غیر معمولی فضیلت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہےاور یہ بات بھی آشکار ہوجاتی ہے کہ کم ہی کوئی دُوسری فضیلت اس کے ہم پایہ ہوسکتی ہے۔

سخاوت کے آثار ونتائج

انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی پر سخاوت کے مثبت اثرات بہت زیادہ ہیں۔ جوتجربے سے بھی ثابت ہیں اوراحادیث

میں بھی ان کی طرف رہنمائی ملتی ہے، بطورِ مثال:

1۔ متعدد روایات سے یہ بات ثابت ہے اور تجربہ بھی اسکی تائید کرتا ہے کہ سخاوت دولت اور دُشمنی دونوں کی محبت کو جذب کرتی ہے، دوستوں کی تعداد میں اضافہ اور دُشمنوں کی تعداد میں کمی کرتی ہے۔

2۔ سخاوت انسان کے عیوب کی پردہ پوشی کرنے والا ایک پردہ ہے جس سے انسان کی عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔

3۔ سخاوت عقل کا ثمر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی عقل و خرد کو نکھارتی چلی جاتی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان بہت محنت اور زحمت سے مال و دولت کمائے اور اُس سے دُنیوی فوائد اور اُخروی ثواب کمائے بغیر ورثاٴ کیلئے چھوڑ کر چلا جائے۔ علاوہ ازیں سخاوت کے نتیجہ میں انسان کے دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے جن میں کچھ ذہین اور عقل مند افراد بھی ہوتے ہیں جن کی عقل و فکر سے استفادہ کر کے انسان اپنی عقل و فکر کو پختہ اور مستحکم کر سکتا ہے۔

4۔ سخاوت کے نتیجہ میں معاشرے سے طبقاتی اونچ نیچ کا فرق کم ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبقاتی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہونے والی کشمکش اور جھگڑے یا تو سرے سے ختم ہو جاتے ہیں یا کم ہو جاتے ہیں۔ غریب اور پس ماندہ لوگوں کے دلوں میں دولت مندوں کے بارے میں نفرت اور کینہ ختم ہو جاتا ہے اور ان کے خلاف جذبہ انتقام کمزور پڑ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں معاشرتی تعلقات میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

5۔ سخاوت انسان کے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے، اس کی آبرو محفوظ کرتی ہے اور اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کو پسپا کر دیتی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:۔

"اَلجود حَارِس الاَعْرَاضِ" (غرر الحکم، حدیث: 333)

''سخاوت عزتوں کی محافظ ہے''۔

6۔ جود و سخاوت معنوی اور رُوحانی اثرات بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں انبیاٴ کی نمایاں صفت میں شمار کیا گیا ہے۔ گزشتہ روایات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ سخاوت یقین کے نور کی شعاع ہے، حتیٰ کہ اگر بے ایمان افراد میں بھی یہ صفت پائی جائے تو ان کیلئے بھی فائدہ مند ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامری کو قتل نہ کرو کیونکہ وہ سخی ہے (کافی، 1:41)

سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل کو بت پرستی پر لگا کر ان میں بہت بڑی گمراہی پیدا کی اور زندگی کے آخری ایام میں اس کی حالت اتنی بری اور عبرت ناک ہوگئی کہ شاید وہ موت کو اس پر ترجیح دیتا لیکن اسکے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ چونکہ یہ سخی ہے، لہٰذا اسے قتل نہ کیا جائے۔

ہم گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ جنابِ رسولِ اللہ نے چند مجرموں کو سزائے موت سنائی لیکن ان میں سے ایک شخص کو

صرف سخاوت کی وجہ سے مستثنیٰ کر دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخی شخص مسلمان ہو گیا۔

جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ سخی انسان سے اہلِ آسمان بھی محبت کرتے ہیں اور اہلِ زمین بھی جبکہ بخیل سے اہلِ آسمان بھی نفرت کرتے ہیں اور اہلِ زمین بھی۔(وسائل الشیعہ ،252:15)

سخاوت کی حدود

تمام نیک اعمال اور اچھی صفات کی طرح سخاوت کی بھی کچھ حدود ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔سخاوت میں افراط اور زیادہ روی نہیں ہونا چاہئے۔ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ انسان اس حد تک سخاوت کرنے لگ جائے کہ اس کے زیر کفالت افراد کی زندگی مشکلات کا شکار ہو جائے۔

سخاوت حلال سے کمائے گئے مال سے کی جانی چاہئے۔حرام اور ظلم وستم سے حاصل ہونے والی آمدنی سے کی جانے والی سخاوت کی کوئی فضیلت نہیں ہے،جس طرح بہت سے ظالم بادشاہ کرتے ہیں۔

اسی طرح بیت المال یعنی حکومتی اور سرکاری اموال سے سخاوت کرنا درست نہیں ہے،اس لئے کہ بیت المال اور قومی دولت کو عدل وانصاف اور قوم ومعاشرے کے اجتماعی فائدے کے تقاضوں کے مطابق صرف کرنا ضروری ہے۔

سخاوت کی صفت کیسے حاصل کی جائے:۔

دیگر تمام اخلاقی صفات کی طرح یہ صفت بھی تعلیم وتربیت،غور وفکر اور مشق وعمل کے نتیجہ میں حاصل کی جاسکتی ہے۔اگر انسان یہ سوچے کہ جو مال ودولت اس کے ہاتھ میں ہے،وہ ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے اور اسے دوام وبقا بھی حاصل نہیں ہے تو یہ بات اسے اس پر مائل کرے گی کہ وہ اس مال ودولت کو اس طرح اپنے لئے محفوظ کرلے کہ جس دن اس کے ہاتھ خالی ہوں (قیامت کے دن) یہ دولت اس کے کام آئے۔اس طرح لامحالہ انسان اپنا مال اور اپنی دولت سخاوت کے ساتھ فقراً اور ضرورت مندوں کے فائدے کیلئے خرچ کرنے لگے گا۔

اس طرح سخاوت کے آثار ونتائج ،جن کا ذکر ہو چکا ہے، ان کے بارے میں غور وفکر کرنے سے بھی سخاوت کرنے میں انسان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

سخی اور بخیل افراد کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور ان کی عزت واحترام کا موازنہ کرنے سے جب انسان سخی افراد کی عزت واحترام اور بخیل افراد کی ذِلت اور بدنامی کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر سخاوت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ عملی طور پر انسان سخاوت کی راہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھانا شروع کر دے تو یہ صفت بتدریج اُس کے اندر پیدا ہونا شروع ہو جائے گی۔البتہ یہ بھی ضرور یاد رہے کہ ہوسکتا ہے کہ بخیل شخص کے لئے ابتدائی قدم اُٹھانا بھی خاصا دُشوار ہو لیکن مسلسل عمل کرتے رہنے کے نتیجہ میں یہ صفت انسان

کے اندر پختہ ہو جائے گی۔

علاوہ ازیں والدین اور اساتذہ کی تربیت بھی اس اخلاقی صفت اور دیگر اخلاقی صفات کے حصول میں مؤثر واقع ہوتی ہے۔ اگر والدین اور اساتذہ بچپن میں بچے کو اس صفت کی تعلیم دیں اور اس کی مشق کروائیں تو آگے چل کر یہ صفت اس میں پختہ ہو جائے گی۔

صاحب بن عباد کے حالات میں ہے کہ بچپن میں جب اسے مدرسہ میں داخل کروایا گیا تو ہر روز اُس کی ماں اُسے ایک دینار اور ایک درہم دیتی تھی اور اُسے کہتی کہ جو فقیر تمہیں سب سے پہلے نظر آئے، یہ اُسے دے دینا۔ آہستہ آہستہ یہ صفت اُس میں پختہ ہوتی چلی گئی اور بڑا ہو کر وہ ایسا سخی ہوا کہ سب اس کی سخاوت کی تعریف کرتے تھے۔ اگر رمضان المبارک میں ظہر کے بعد کوئی شخص اس کے گھر آ جاتا تو وہ اسے افطار تک اپنے پاس روک لیتا۔ ہر روز اس کے دسترخوان پر ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے۔ ماہ رمضان میں اس کی سخاوت سال کے دیگر مہینوں کی مجموعی سخاوت کے برابر ہوتی تھی۔ (سفینۃ البحار: صحب)

اس کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ایک روز خادم نے اسے شربت پیش کیا اس کے عزیزوں میں سے کسی کو شک گزرا کہ شربت زہر آلود ہے۔ صاحب بن عباد نے اُسے کہا کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ شربت زہر آلود ہے؟ اس نے کہا کہ یہ شربت خادم کو دو اور اسے کہو کہ اسے پی لے۔ صاحب بن عباد نے کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔

اُس شخص نے کہا کہ پھر یہ شربت کسی مرغ وغیرہ کو پلا کر دیکھ لو۔ صاحب نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی مرغ کی زندگی اس طرح ختم ہو جائے۔ بالآخر اس نے شربت زمین پر اُنڈیل دیا اور خادم کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اس کے باوجود خادم کو پوری تنخواہ دے کر رُخصت کیا۔ پھر اس نے کہا کہ یقین کو ہرگز شک کی وجہ سے نہیں توڑنا چاہئے اور سزا کے طور پر تنخواہ میں کٹوتی کرنا پست انسانوں کا شیوہ ہے۔ (سفینۃ البحار: صحب)

ہم اس بحث کو چند احادیث پر ختم کرتے ہیں:

جناب رسولِ خدا نے فرمایا:

"اَلْجَنَّةُ دَارُ الْاَسْخِيَاءِ"۔ (المحجة البيضاء، 62:6)

''جنت سخی لوگوں کا گھر ہے''۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اِنِّیْ جَوَّادٌ کَرِیْمٌ لَا یُجَاوِرُنِیْ لَئِیْمٌ"۔ (المحجة البيضاء، 62:6)

''میں سخی اور کریم ہوں، بخیل اور پست افراد میرے نزدیک (جنت میں) نہیں آ سکتے''۔

ایک حدیث میں جنابِ رسولِ خدا فرماتے ہیں:

"طَعَامُ الْجَوَّادِ دَوَاءٌ وَطَعَامُ الْبَخِيلِ دَاءٌ" (المحجة البیضاء،62:6)

''سخی کا کھانا شفااور بخیل کا کھانا بیماری ہے''۔

ابن سماک ایک مشہور عارف گزرے ہیں۔ان کا قول ہے:

"عَجِبْتُ لِمَنْ يَشْتَرِي الْمَمَالِيكَ بِمَالِهِ وَلَا يَشْتَرِي الْأَحْرَارَ بِمَعْرُوفِهِ"۔

''میں اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہوں جو مال دے کر غلاموں کو خریدتے ہیں لیکن نیکی کر کے آزاد لوگوں کو نہیں خریدتے''۔(سفینۃ البحار: سمک)[1]

کسی نے ایک عرب سے پوچھا: تمہارا سردار کون ہوتا ہے؟ اُس نے جواب دیا:

"مَنِ احْتَمَلَ شَتْمَنَا وَأَعْطَى سَائِلَنَا وَاغْضَى جَاهِلَنَا"۔

''جو ہمارے بدتمیزیوں کو برداشت کرے، ہمارے سائلوں کو عطا کرے اور ہمارے جاہلوں کو معاف کرے''۔(سفینۃ البحار)

---

[1] ابن سماک دوسری صدی ہجری میں ہارون رشید کے ہم عصر تھے۔انتہائی خوش بیان واعظ تھے۔ 183 ہجری میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

محدث قمی نے ''سفینۃ البحار'' میں ان کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز وہ ہارون رشید کے پاس گئے۔ ہارون نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ حضور! مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔عین اُسی وقت ہارون کیلئے پانی کا پیالہ لایا گیا۔ابن سماک نے کہا: تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر تمہیں ایسی بیماری لگ جائے جس کی وجہ سے یہ پانی نہ پی سکو تو کیا کرو گے؟

ہارون نے کہا: میں اپنی آدھی دولت اور آدھی حکومت دے کر اس بیماری کا علاج کرنے پر آمادہ ہوں۔

ابن سماک نے کہا: پانی پی لو۔

جب ہارون پانی پی چکا تو ابن سماک نے پھر کہا: تمہیں اللہ قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر تمہیں کوئی ایسی بیماری لگ جائے جس کی وجہ سے یہ پانی جو تم نے پیا ہے، باہر نہ آئے تو کیا کرو گے؟

اس نے کہا: باقی ماندہ دولت اور حکومت بھی اس کے علاج کے عوض دینے کو تیار ہوں۔

ابن سماک نے کہا: جس حکومت کا نصف پانی پینے پر اور نصف پانی کے باہر آنے پر قربان کیا جاسکتا ہے، وہ اتنی بھی قیمتی نہیں ہے کہ اس کیلئے جنگیں کی جائیں اور خون بہایا جائے۔

سولھواں باب

عجلت اور جلد بازی

تمہید:۔

ہر کام کو انجام دینے کیلئے مخصوص حالات اور شرائط کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر یا تو سرے سے وہ کام کیا ہی نہیں جا سکتا اور اگر کر لیا جائے تو اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ عقل مند افراد کسی بھی کام کو انجام دینے کے لئے مناسب حالات وشرائط کے پیدا ہو جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ جب مناسب حالات فراہم ہو جائیں تو میدان عمل میں کود پڑتے ہیں اور گوہر مقصود ہاتھ آنے تک مصروف عمل رہتے ہیں۔

اسی لئے عجلت، جلد بازی اور شتاب زدگی یعنی مناسب حالات فراہم ہونے سے قبل کسی کام کے شروع کرنے کو مذموم صفات رذیلہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس صبر وتحمل اور بردباری کو اخلاقی فضائل میں شمار کیا جاتا ہے (البتہ صبر کی بہت سی شاخیں ہیں جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا)

جلد بازی اور شتاب زدگی فرد اور معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کرتی ہے۔ قرآن مجید جو ہمیں زندگی کا ایک جامع لائحہ عمل دیتا ہے، انسان کو صبر وتحمل کے ساتھ عمل کرنے اور جلد بازی اور عجلت سے اجتناب کا حکم دیتا ہے اور انبیاؑ کے واقعات میں ہمیں جلد بازی کے تلخ اور صبر وتحمل کے شیریں پھل سے آشنا کرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم قرآنی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور انبیاؑ کی زندگی میں اس مسئلہ کی اہمیت کا مطالعہ کرتے ہیں:

1 "قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ○ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ○ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا"۔ (کھف: 66تا69)

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا: کیا میں آپ کی پیروی کروں تا کہ جو رُشد وآگہی آپ کو دی گئی ہے، آپ مجھے اُس کی تعلیم دیں؟ اُس نے کہا: تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے اور کیسے ممکن ہے کہ تم اس بات پر صبر کرو جس کا علم تمہیں حاصل نہیں ہے۔ موسیٰ ؑ نے کہا: انشاءاللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔''

2۔ "وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۔ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝"(ص: 21تا24)

''کیا شکایت کرنے والوں کی خبر آپ کے پاس آئی ہے، جب وہ (داؤد) کی محراب سے اُوپر چڑھ آئے اور وہ انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا؟ وہ بولے: ڈرو نہیں، ہم دونوں ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دُوسرے پر ظلم کیا ہے اور تم ہمارے درمیان حق کی روشنی میں فیصلہ کرو اور ظلم نہ کرو اور ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت کرو۔ یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے اور یہ مجھ سے اصرار کرتا ہے کہ میں اپنی بھیڑ اسے دے دوں اور بحث میں یہ مجھ پر غالب آ گیا ہے۔ داؤد نے کہا: یقیناً اس نے تیری بھیڑ تجھ سے مانگ کر تجھ پر ظلم کیا ہے اور بہت سے شریک ایک دُوسرے پر ظلم کرتے ہیں، سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یکا یک داؤد کو ایسا لگا کہ (اس واقعہ کے ذریعے) ہم نے اسے آزمایا ہے۔ اس نے فوراً اللہ سے مغفرت طلب کی، سجدے میں گر گیا اور توبہ کی''۔

3۔ "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔(قلم: 48تا50)

''پس اپنے رب کے حکم کے آجانے تک صبر کرو اور مچھلی والے (یعنی حضرت یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ، جب اُس نے حالتِ غم میں اپنے رب کو پکارا اور اگر اُس کے رب کی نعمت اُس کی دستگیری نہ کرتی تو وہ صحرا میں پھینک دیا جاتا، اس حال میں کہ وہ مذموم ہوتا۔ پس اُس کے رب نے اُسے چن لیا اور اُسے صالحین میں شامل کر لیا''۔

4۔ "فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا"۔(طٰہٰ: 114)

''اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی آپ کی طرف پوری ہو جائے، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو اور کہو: اے

میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

5۔ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ"۔

''انسان عجلت میں سے پیدا کیا گیا ہے لیکن تم عجلت سے کام نہ لو، عنقریب میں اپنی نشانیاں تمہیں دِکھاؤں گا''۔(انبیأ:37)

6۔ "وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"۔(اسرأ:11)

''اور انسان جلد بازی کی وجہ سے شر کو بھی خیر کی طرح سے پکارتا ہے اور انسان ہمیشہ جلد باز رہا ہے''۔

7۔ "وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ"۔

''یہ لوگ اچھائی (رحمت) سے پہلے آپ سے برائی (عذاب) کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے مثالیں گزر چکی ہیں اور تمہارا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کیلئے مغفرت والا ہے اور تمہارا رب شدید عقاب والا ہے''۔(رعد:6)

8۔ "وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ"۔(یونس:11)

''جس طرح لوگ خیر کے حصول کیلئے جلد بازی کرتے ہیں، اسی طرح اگر تمہارا رب انہیں سزا دینے میں جلدی کرتا تو ان کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن جو لوگ ہماری ملاقات پر ایمان نہیں رکھتے، ہم اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں''۔

9۔ "وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ○ قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِیْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ○ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ"۔

''وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو تمہاری یہ کامیابی کب آئے گی۔۔۔۔اب جبکہ یہ صورت حال ہے تو ان سے منہ موڑ لو اور انتظار کرو، وہ بھی منتظر ہیں، تم رحمت کے منتظر ہو اور وہ عذاب کے منتظر ہیں''۔(سجدہ:28 تا30)

10۔ "فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ"۔

''پس تم صبر کرو جیسے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان پر عذاب نازل ہونے کی جلدی نہ کرو، جب یہ ان

وعدوں کو دیکھیں گے جوان سے کئے جارہے ہیں تو انہیں ایسا لگے گا گویا صرف گھڑی بھر دُنیا میں رہے تھے۔ یہ ایک پیغام ہے جو پہنچایا جارہا ہے اور ہلاکت صرف فاسقوں کے حصے میں آتی ہے''۔(احقاق۔35)

تفسیر

پہلے پیراگراف کی آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خصر علیہ السلام کے واقعہ کے بارے میں ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ان کا ذکر ''عبدمن عبادنا'' یعنی ''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ'' کہہ کر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ کم وبیش سب جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک خاص قسم کے علوم کو جاننے کیلئے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جائیں۔ یہ علوم وحی کے ذریعے حضرت موسیٰ ؑ کے پاس آنے والے علوم سے مختلف تھے اور ان کا تعلق کائنات اور انسانوں کی زندگی کے مخفی اسرار سے تھا۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا: تمہارا علم ظاہر سے تعلق رکھتا ہے اور تم میرے کاموں پر صبر نہیں کرسکو گے۔ لیکن حضرت موسیٰ ؑ نے عہد کیا کہ میں صبر وتحمل سے کام لوں گا۔ حضرت خضرؑ نے ان سے کہا کہ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو میرے ہر کام کو خاموشی سے دیکھتے رہنا، خواہ تمہاری نظر میں وہ کتنا ہی نامناسب ہو۔ میرے ہر کام میں ایک حکمت ہے، مناسب موقع پر میں خود ہی تم کو بتادوں گا۔

درحقیقت حضرت خضرؑ چاہتے تھے کہ اہم معاملات کے بارے میں حضرت موسیٰ ؑ کے اندر صبر وتحمل کی رُوح پیدا کریں اور عجلت اور شتاب زدگی کی منفی صفت کو ان سے دور کردیں۔

حضرت خضرؑ کی شرط اور حضرت موسیٰ ؑ کے وعدے کے بعد دونوں چل پڑے۔ راستے میں اُنہیں کچھ فاصلہ کشتی کے ذریعے طے کرنا تھا۔ دونوں کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی چل پڑی اور حضرت خضر نے چپکے سے کشتی میں سوراخ کردیا۔ حضرت موسیٰ ؑ سے رہا نہ گیا اور اُنہوں نے اعتراض کردیا۔ مگر حضرت خضرؑ نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا تو خاموش ہوگئے اور معذرت بھی کرلی۔

کشتی سے اُتر کر تھوڑی دُور گئے تھے کہ حضرت خضرؑ نے ایک نوجوان کو دیکھا اور اُسے قتل کردیا۔ حضرت موسیٰ ؑ ایک بار پھر بول پڑے کہ آپؑ نے ایک بے گناہ انسان کو کیوں قتل کردیا؟ آپؑ نے کس قدر برا کام کیا؟

حضرت خضرؑ نے ایک بار پھر انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔ حضرت موسیٰ ؑ نے ایک بار پھر معذرت کی اور کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے وعدہ خلافی کی تو آپ کو حق ہوگا کہ آپ مجھے الگ کردیں۔

دونوں ایک بار پھر چلے اور شہر میں آپہنچے جہاں کے لوگ بڑے بخیل اور خصیص تھے جنہوں نے ان مسافروں کی درخواست کے باوجود انہیں کھانا کھلانے سے انکار کردیا۔ اسی شہر میں حضرت خضرؑ نے ایک بوسیدہ دیوار دیکھی جو کسی بھی لمحے گرسکتی تھی۔ حضرت خضرؑ

نے دیوار کو مرمت کر دی۔ حضرت موسیٰ ؑ کو انؑ کا یہ کام بھی نہایت عجیب لگا۔ ان سے رہا نہ گیا اور ایک بار پھر انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو فراموش کرتے ہوئے اعتراض کر دیا۔

اس موقع پر حضرت خضرؑ نے اپنے تینوں کاموں کے اسرار حضرت موسیٰ ؑ کو بتائے اور حضرت موسیٰ ؑ کو کائنات کے حقائق کی ایک اور دُنیا کی جھلک دکھائی۔ پھر حضرت موسیٰ ؑ ان علوم و معارف کا توشہ لے کر حضرت خضرؑ سے الگ ہو گئے۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ ؑ کو بتایا کہ انہوں نے کشتی میں سوراخ اس لئے کیا کہ اس میں نقص پیدا ہو جائے کیونکہ وہاں کا ظالم بادشاہ ہر اچھی کشتی کو اپنے قبضے میں لے لیتا تھا۔ میں نے ان مسکین افراد کی کشتی اس کے ہاتھ جانے سے روکنے کیلئے اس میں سوراخ کر دیا۔

اُس نوجوان کو اس لئے قتل کیا کہ وہ خطرناک حد تک بے ایمان اور سرکش تھا اور اس بات کا خوف تھا کہ اسکی یہ حالت اس کے نیک والدین کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اللہ نے یہ چاہا کہ یہ لڑکا اُن سے لے کر اس بدلے میں ایک نیک اور مہربان بیٹا انہیں عطا کرے۔

جہاں تک گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کا تعلق ہے تو اس کے نیچے دو یتیم بچوں کا خزانہ پوشیدہ تھا جو ان کے نیک اور صالح باپ نے وہاں دفن کر دیا تھا اللہ نے چاہا کہ ان کا یہ خزانہ محفوظ رہے اور جب یہ بڑے ہوں تو اسے نکال لیں۔ میں نے ان کاموں میں سے کوئی اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ یہ سارے کام اللہ کے حکم سے کئے ہیں۔ (سورۂ کہف: 60 تا 82)

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام جلد بازی سے کام نہ لیتے اور صبر و حوصلے سے مناسب موقع کا انتظار کرتے تو ان تین واقعات کے بعد انہیں حضرت خضرؑ سے جدا نہ ہونا پڑتا اور انہیں علم و معرفت کے مزید گوہر نصیب ہوتے۔

دوسرے پیراگراف کی آیات میں حضرت داؤدؑ کا ذکر ہے جنہیں فیصلہ کرنے میں جلد بازی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤاخذہ کا سامنا کرنا پڑا۔

واقعہ یہ تھا کہ ایک روز دو آدمی حضرت داؤدؑ کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کے خلاف شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں جبکہ میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے اور یہ چاہتا ہے کہ میری بھیڑ بھی مجھ سے لے لے اور بحث میں مجھ پر غالب آ گیا ہے۔

"اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ"۔

حضرت داؤدؑ نے تحقیق کئے بغیر فیصلہ سنا دیا کہ اس نے یہ مطالبہ کر کے تم پر ظلم کیا ہے۔ لیکن فوراً ہی انہیں اپنی خطا کا احساس ہو گیا اور وہ جان گئے کہ ہم نے ان کا امتحان لیا، لہٰذا انہوں نے استغفار کی اور سجدے میں گر کر توبہ کرنے لگے۔

اس واقعہ کی تمام تفصیلات کا ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے (تفسیر نمونہ میں ہم نے تفصیلات بیان کر دی ہیں)۔ اس واقعہ سے یہ بات بہرحال واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی کام، خاص طور پر عدالتی فیصلہ کرتے وقت جلد بازی شرمندگی کا سبب ہوتی ہے اور

انفرادی اور معاشرتی سطح پر مشکلات بھی پیدا کرتی ہے۔

تیسری آیت ایک اور پیغمبر کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنی عظیم ذمہ داری کی انجام دہی میں کوتاہی کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا مؤاخذہ کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونسؑ ایک طویل عرصہ تک ایک مہربان باپ کی طرح اپنی قوم کو تبلیغ وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے لیکن انؑ کی سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو افراد ان پر ایمان لائے جن میں سے ایک عالم اور ایک عابد تھا۔

آخر کار حضرت یونسؑ اپنی قوم سے مایوس ہو گئے اور عابد کے مشورے پر اپنی قوم کے خلاف بددُعا کی۔ ان کی بددُعا قبول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی خبر دی کہ فلاں دن ان کی قوم پر عذاب آنے والا ہے۔ حضرت یونسؑ نے بجائے اس کے کہ ایک بار پھر اپنی قوم پر حجت تمام کرتے، اس عابد کے ہمراہ اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ عالم قوم میں رہا اور تبلیغ کرتا رہا۔

عذاب کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ عالم کی تبلیغ بھی مؤثر واقع ہوئی اور اس قوم میں نمایاں بنیادی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ عالم کی ہمراہی میں وہ سب توبہ میں مصروف ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ لیکن حضرت یونسؑ کو اس نے ان کی اس عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے سرزنش کی اور سزا دی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب قرار دے کر کہہ رہا ہے:

''(آپ اس قوم پر عذاب کی دُعا کرنے میں جلدی نہ کریں) اور مچھلی والے (یعنی حضرت یونسؑ) کی طرح نہ ہو جائیں (جنہوں نے اپنی قوم پر عذاب آنے میں جلد بازی کی اور خود اپنے عمل کی سزا میں گرفتار ہو گئے) جب انہوں نے اللہ کو پکارا تو اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ وہ غم واندوہ سے بھرے ہوئے تھے اور اگر اللہ کی رحمت ان کی دستگیری نہ کرتی تو وہ مچھلی کے پیٹ سے باہر پھینک دیئے جاتے اور سخت مذمت کے سزاوار ٹھہرے''۔ (قلم: 48 اور 49)

''فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۘ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ○ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ○

لیکن اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور جب مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے تو ہر خطا سے پاک تھے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے:

''اُس کے رب نے اُس کی توبہ قبول کی اور انہیں صالحین میں شامل کر لیا''۔

''فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ○'' (قلم: 50)

اگرچہ حضرت یونسؑ نے کافی حد تک اپنی قوم پر حجت تمام کر دی تھی لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے انبیاؑ اس سے بڑھ کر صبر اور حوصلے والے ہوں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی تھوڑی سی جلد بازی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

چوتھی آیت میں جناب رسولِ خداؐ کو جلد بازی اور عجلت سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:

''اوراس سے پہلے کہ قرآن کی وحی آپ کی طرف پوری ہوجائے،قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرواور کہو: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

"فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا"۔(طٰہٰ:114)

بعض دیگر آیات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جنابِ رسولؐ خدا قرآن کے شدید اشتیاق کی وجہ سے وحی کو دریافت کرنے میں جلدی کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عمل سے روک دیا۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ (قیامت:16تا18)

''اگرچہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے متعدد احتمال بیان کئے ہیں لیکن ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ رسول کیلئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے کام میں جلد بازی کرے،خواہ وہ کام اس کی الٰہی ذمہ داری ہو اور اس کا تعلق لوگوں کو ہدایت دینے سے ہو۔

پانچویں آیت میں انسان کے بارے میں کہا جارہا ہے:

''انسان جلد بازی سے پیدا ہوا گیا ہے(یعنی جلد بازی اس کی سرشت میں اس قدر زیادہ ہے کہ گویا اس کی طبیعت ہی بن گئی ہے)لیکن میرے سامنے جلد بازی نہ کرو۔عنقریب میں اپنی آیات تمہیں دکھادوں گا۔

"خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ"۔(انبیاء:37)

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ جلد بازی انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے لیکن اسے وہاں بروئے کار لانا چاہئے جہاں حالات مناسب ہوں۔یہاں''اٰیٰتِی''یعنی''میری آیات''سے ممکن ہے جنابِ رسولؐ خدا کے معجزات،قرآن کی آیات یا عذاب کی نشانیاں مراد ہوں یا یہ سب مراد ہوں،اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص وقت پر ہی ظاہر ہونے والے حقائق ہیں اور ان کے قبل از وقت ظاہر ہونے کی جلدی کرنا صحیح نہیں ہے،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور کوئی کام خلاف حکمت انجام نہیں دیتا۔لہٰذا اس کے کاموں کے بارے میں بندوں کو عجلت سے کام نہیں لینا چاہئے۔

اس آیت میں انسان کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ انسان عجلت میں پیدا کیا گیا ہے،اس سے مراد وہ انسان ہیں جن کی الٰہی تربیت نہیں ہوئی ہے۔لہٰذا بعض آیات،جن میں انسان کے عجول یعنی جلد باز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے،اس سے پہلے انسانوں کی ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے،جیسے سورۂ بنی اسرائیل کی گیارہویں آیت،جس کے بارے میں عنقریب ہم گفتگو کریں گے۔

انسان کی یہ صفت بھی اس کے دیگر فطری میلانات کی طرح ایک مثبت اور تعمیری طاقت ہے۔اگر اسے حدِ اعتدال پر

رکھا جائے تو انسان کو فلاح اور سعادت کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔

چھٹی آیت کا مفہوم بھی وہی ہے جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ مگر اس میں عجلت اور جلد بازی کے ایک منفی اثر کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انسان جلد بازی کی وجہ سے شر کی طلب بھی اسی طرح کرنے لگتا ہے جیسے خیر کی طلب کرتا ہے اور انسان ہمیشہ سے جلد باز رہا ہے۔

"وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"۔ (اسرأ: 11)

اس آیت میں ''دُعآ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو طلب کرنے اور چاہنے کے معنی دیتا ہے، خواہ یہ طلب اور چاہت زبان سے ہو یا عمل سے۔ یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ چونکہ انسان عجول ہے، لہٰذا حصولِ منفعت کے اشتیاق میں بعض اوقات جلد بازی کی وجہ سے معاملے کے تمام پہلوؤں پر نظر کئے بغیر آگے بڑھنے لگتا ہے اور فائدے کی بجائے نقصان سے دوچار ہو جاتا ہے۔

یہ دُعا بعض اوقات لفظی صورت میں ہوتی ہے اور انسان اصرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے کسی ایسی چیز کیلئے دُعا مانگ رہا ہوتا ہے جو اُس کیلئے خیر و سعادت نہیں بلکہ بدبختی و ہلاکت کا سبب ہوتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَاَعْرِفْ طَرِيْقَ نَجَاتِكَ وَهَلَاكِكَ كَيْ لَا تَدْعُوا اللّٰهَ بِشَيْءٍ عَسٰى فِيْهِ هَلَاكُكَ وَاَنْتَ تَظُنُّ اَنَّ فِيْهِ نَجَاتُكَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى "وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا"۔ (نور الثقلین، 1:141)

''اپنی نجات اور ہلاکت کے راستوں کو پہچانو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اللہ سے کوئی ایسی چیز مانگو جس میں تمہاری ہلاکت ہو اور تم سمجھو کہ اس میں تمہاری نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: 'انسان جلد بازی کی وجہ سے شر بھی اسی طرح طلب کرنے لگتا ہے جیسے خیر کی طلب کرتا ہے''۔

بعض اوقات یہ دُعا عملی صورت میں ہوتی ہے جس میں انسان ایسے کاموں کے کرنے پر مصر ہوتا ہے جن کی بنیاد شہوت پرستی اور نتیجہ بدبختی ہوتا ہے لیکن انسان شیطان کی وسوسہ اندازی اور نفس کی زینت کاری کی وجہ سے انہیں اپنے لئے باعثِ خیر و سعادت سمجھتا ہے اور اس کے عدم حصول پر غمگین اور ملول ہوتا ہے۔

بعض اوقات مستقبل میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر اس وقت اس کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو وہ ساری عمر کیلئے ہلاکت اور بدبختی کے گڑھے میں گر گیا ہوتا۔

ساتویں آیت میں انسان کے عجول ہونے کے بارے میں ایک نئی بات کی گئی ہے، وہ یہ کہ عجول انسان نیکی میں عجلت اور

جلد بازی کی بجائے ہمیشہ شر وفساد کی راہ میں جلد بازی کرتا ہے۔ جنابِ رسولؐ خدا کے مخالف کفار عذاب الٰہی کی وعید سن کر خوفزدہ ہونے کی بجائے اصرار کرنے لگتے تھے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈرا رہے ہیں، وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ درحقیقت یہ بدبخت اپنی ہلاکت اور بربادی کیلئے عجلت اور جلد بازی کر رہے ہوتے تھے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:

''یہ لوگ حسنہ (بھلائی اور رحمت) سے پہلے آپ سے بدی (عذاب اور بربادی) میں جلدی کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے عبرت انگیز عذاب نازل ہو چکے ہیں (انہوں نے ان کا ذکر سن رکھا ہے اور جانتے ہیں کہ یہ مذاق نہیں ہے، لہٰذا ان پر عذاب میں تاخیر صرف اللہ کی رحمت کیوجہ سے ہے کہ شاید یہ بیدار ہو کر راہ راست پر آ جائیں) اور آپ کا پروردگار لوگوں کے ظلم کے باوجود ان کیلئے مغفرت والا ہے اور آپ کے رب کا عقاب بھی شدید (لہٰذا انہیں اللہ کی مغفرت اور ڈھیل کا دھوکا نہیں کھانا چاہئے)''۔ (رعد:6)

"وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ"۔

یقیناً اگر انسان کی عجلت اور شتاب زدگی میں تعصب اور لجاجت بھی شامل ہو جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے یعنی وہ نیکی کی بجائے برائی کی طرف جلد بازی کرتا ہے اور بدبختی کی موجوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال سورۂ معارج میں آئی ہے:

"سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ"۔ (معارج: 1 و 2)

''ایک سوال کرنے والے نے ایک واقع ہو جانے والے عذاب کا سوال کیا جو کافروں کیلئے ہے اور کوئی اُس کو دُور کرنے والا نہیں ہے''۔

بہت سے مفسرین اور محدثین نے لکھا ہے کہ یہ آیت نعمان بن حارث فہری کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو غدیر خم پر جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ'' کا اعلان سن کر آگ بگولا ہو گیا اور جب جنابِ رسولِؐ خدا نے اسے بتایا کہ یہ اعلان اللہ کے حکم سے کیا گیا ہے تو اس کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی اور وہ کہنے لگا کہ یا اللہ! اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو آسمان سے مجھ پر پتھر برسا۔ چند ہی لمحوں میں ایک پتھر آسمان سے آ کر اس پر گرا اور اسے ہلاک کر دیا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (مجمع البیان، 352:10)

کیا بہتر نہ ہوتا کہ اس قسم کے افراد حق کے سامنے عناد اور تعصب کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے عذاب مانگنے کی بجائے اس سے ہدایت طلب کرتے؟ لیکن کیا کیا جائے کہ ایسے خیرہ سر افراد عجلت زدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کی بجائے اُس کے عذاب کا مطالبہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں انسان کے عجول ہونے کے ایک اور پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ بدکار لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرتا، جس طرح وہ خیر اور بھلائی کیلئے جلدی کرتے ہیں تو سب کی موت واقع ہوجاتی (اور ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہتا)''۔ (یونس:11)

"وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے، لہٰذا وہ گناہگاروں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ اپنی رحمت سے اُنہیں مہلت دیتا رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بیدار ہوجائیں اور ہدایت پاجائیں۔

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی گمراہی میں سرگرداں رہیں''۔

"فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ"۔ (یونس:11)

بنابرایں اللہ تعالیٰ تمہاری طرح عمل نہیں کرتا تم خیر اور بھلائی حاصل کرنے میں عجول ہو مگر اللہ تمہیں سزا دینے میں عجول نہیں ہے، اس لئے کہ بنیادی طور پر اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم ہدایت پاؤ، نہ یہ کہ عذاب کا نشانہ بنو۔

قرآن شریف کی بعض دوسری آیات کی روشنی میں اس آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی دیا گیا ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ جلد بازی کی وجہ سے اللہ سے عذاب کا مطالبہ کررہے تھے، اُسی طرح جس طرح خیر اور بھلائی کے بارے میں جلد بازی کرتے ہیں۔ قرآن فرمارہا ہے کہ اگر اللہ عذاب کے بارے میں تمہاری درخواست جلدی سے قبول کرلیتا ہے تو تم میں سے کوئی زندہ باقی نہ رہتا۔ لیکن پہلے معنی آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فتح اور دُشمنوں کی شکست کے وعدوں پر کفار کی جلد بازی اور اضطراب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو تمہاری فتح اور کامیابی کب وقوع پذیر ہوگی؟ (یہ وعدہ پورا کیوں نہیں ہورہا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ تم جھوٹے ہو اور اپنے آپ کو فریب دے رہے ہو؟)''۔

"وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ"۔ (سجدہ:28)

قرآن مجید ان کے جواب میں جنابِ رسولِ خدا کو حکم دے رہا ہے: ''ان سے کہو (جلدی نہ کرو) یہ کامیابی آکر رہے گی اور اس روز کافروں کو ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی''۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۔ (سجدہ:29)

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور اپنے لطف وکرم سے آج تمہیں مہلت دی ہوئی ہے تا کہ تم آنکھیں کھولو اور ہدایت کی راہ اپنالو لیکن جس روز اللہ کا عذاب نازل ہوگا تو توبہ کے دروازے بند ہوجائیں گے اور واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔ لہٰذا جلد بازی اور شتاب زدگی کر کے اپنی تباہی و بربادی کو دعوت نہ دو بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کرو۔

اسکے بعد جنابِ رسولؐ خدا کو حکم دیا جارہا ہے: ''ان حالات میں آپ ان سے منہ موڑ لیں اور انتظار کریں، یہ بھی منتظر ہیں۔ (آپؐ اللہ کی رحمت اور حق کی کامیابی کا انتظار کریں گے اور یہ شکست اور عذاب کا)''۔

فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَانۡتَظِرۡ اِنَّهُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ''۔ (سجدہ:30)

دسویں آیت میں جنابِ رسولؐ خدا سے خطاب کیا جارہا ہے۔ اگرچہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی جلد بازی میں کوئی عمل نہیں کیا بلکہ ہمیشہ صبر وتحمل سے کام لیا، اس کے باوجود صبر کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کیلئے آپ کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا، اسی طرح آپ بھی صبر کریں اور ان کے عذاب کیلئے جلد بازی نہ کریں۔ جب یہ ہمارے عذاب کے وعدوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھیں گے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ دن کی ایک گھڑی کے برابر دُنیا میں رہے تھے۔

''فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّهُمۡ ؕ كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَ مَا يُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنۡ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ (احقاف:35)

اس آیت میں اس نکتے کو بیان کیا گیا ہے کہ آخرت کے سامنے دُنیا کی ساری عمر ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ لہٰذا اے رسولؐ! آپؐ ان کیلئے عذاب کے بارے میں جلدی نہ کریں۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاؑ اپنی اُمتوں کی خیرہ سری اور ان کے تعصب اور نادانی کے سامنے صبر وتحمل سے کام لیتے رہے اور انہیں اپنی اصلاح کی مہلت دیتے رہے۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ بھی ایسا ہی تھا اور اس آیت میں آپ کو صبر کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی حیثیت تاکید کی سی ہے یا یہ کہ اس کا مقصد دُوسروں کیلئے صبر وتحمل کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہے۔ اس کا ایک مقصد کفار کو خبردار کرنا بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی مہلت کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں۔

یہ آیت اس بات کی گواہ ہے کہ صبر وتحمل کو اختیار کرنا اور عجلت وشتاب زدگی سے اجتناب کرنا ایسی اخلاقی فضیلت ہے جو سب انبیاؑ میں پائی جاتی تھی۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عجلت اور جلد بازی سب اقوام میں پائی جاتی تھی اور پائی جاتی ہے،

اسلام کی نظر میں کس قدر ناپسندیدہ ہے۔اس کے برعکس صبر وتحمل اور حوصلہ وبردباری اہم ترین اخلاقی اور انسانی فضیلت ہے جس سے سب انبیاؑ آراستہ تھے۔

عجلت اور جلد بازی احادیث کی روشنی میں

احادیث میں عجلت وجلد بازی کی مذمت میں بہت زیادہ بحث کی گئی ہے۔ احادیث میں اس کے متضاد کے طور پر ''اَناۃ''اور''تَاَنِّی'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے جن کے معنی آہستگی اور دھیرے پن کے ہیں۔

1۔ جنابِ رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"اَلْاَنَاۃُ مِنَ اللہِ وَالْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ"۔(بحار الانوار، 340:68)

''تانی اور آہستگی اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی طرف سے''۔

2۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّمَا اَھْلَکَ النَّاسَ اَلْعَجَلَۃَ وَلَوْ اَنَّ النَّاسَ تَثَبَّتُوْا لَمْ یُھْلِکْ اَحَدٌ"۔

''عجلت اور شتاب زدگی نے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ اگر لوگ تانی اور آہستگی اختیار کرتے تو کوئی ہلاک نہ ہوتا''۔(بحارالانوار، 340:68)

یہاں ہلاکت سے مراد وہ ہلاکت ہے جو سوچے سمجھے بغیر جلد بازی میں کئے گئے کاموں کی وجہ سے رونما ہوتی ہے۔

3۔ آنحضرتؐ سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

"اِیَّاکَ وَالْعَجَلَۃَ فَاِنَّکَ اِنْ عَجَّلْتَ اَخْطَاتَ حَظَّکَ"۔(مجموعہ ورام: 255)

''عجلت سے پرہیز کرو کیونکہ جب بھی تم عجلت سے کام لوگے، اپنا نصیب کھودوگے''۔

4۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَعَ الْعَجَلِ یَکْثُرُ الزَّلَلُ"۔(غرر الحکم، حدیث: 9740)

''عجلت کی وجہ سے انسان کی غلطیاں زیادہ ہوجاتی ہیں''۔

5۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی شہادت کے قریب امام حسن علیہ السلام کے نام اپنی وصیت میں فرمایا:

"اَنْھَاکَ عَنِ التَّسَرُّعِ بِالْقَوْلِ وَالْفِعْلِ"۔(بحار الانوار، 339:67)

''میں تمہیں قول وفعل میں جلد بازی سے منع کرتا ہوں''۔

6۔ ایک اور حدیث میں آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْعَجَلُ قَبْلَ الْاِمْکَانِ یُوْجِبُ الْغُصَّۃَ"۔(غرر الحکم، حدیث:1333)

''مناسب حالات فراہم ہونے سے قبل عجلت غم وغصے کا باعث ہوتی ہے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے حالات میں انسان کی محنت اور کوشش برباد ہوجاتی ہے۔

7۔ نیز آپؑ ہی سے مروی ہے:

"مَنْ رَکِبَ الْعَجَلَ رَکِبَتْہُ الْمَلَامَۃُ"۔(غرر الحکم، حدیث:9095)

''جو کوئی جلد بازی کی سواری پر سوار ہوگا، ملامت اس پر سوار ہوجائے گی''۔

8۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَعَ التَّثَبُّتِ تَکُوْنُ السَّلَامَۃُ وَمَعَ الْعَجَلَۃِ تَکُوْنُ النَّدَامَۃُ"۔

''تانی اور آہستگی سلامتی کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ عجلت ندامت کے ساتھ ہوتی ہے''۔(بحار، 338:68)

9۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْعَجَلَۃُ مَذْمُوْمَۃٌ فِیْ کُلِّ اَمْرٍ اِلَّا فِیْ مَا یَدْفَعُ الشَّرَّ"۔(غرر الحکم، حدیث:1950)

''شر کو دُور کرنے کے علاوہ عجلت ہر کام میں مذموم ہے''۔

10۔ اس بحث کو امیر المومنینؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَمْنَعَ نَفْسَہُ مِنْ اَرْبَعَۃِ اَشْیَاءَ فَھُوَ خَلِیْقٌ بِاَنْ لَا یَنْزِلَ بِہٖ مَکْرُوْہٌ اَبَدًا قِیْلَ وَمَا ھِیَ؟ قَالَ: اَلْعَجَلَۃُ وَاللَّجَاجَۃُ وَالْعُجْبُ وَالنَّوَانِیْ"۔

''جو شخص چار چیزوں سے اپنے آپ کو بچالے تو وہ اس قابل ہے کہ کوئی برائی اُس پر نازل نہ ہو۔ پوچھا گیا کہ وہ چار چیزیں کونسی ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: عجلت، لجاجت، خود پسندی اور کاہلی''۔(بحار، 43:75)

ان احادیث میں ''تَاَنّی'' کو ایک الٰہی عطیہ اور ''عجلت'' کو ایک شیطانی صفت کہا گیا ہے جو انسان کو زندگی میں ناکام بناتی ہے، اس سے مواقع کو چھین لیتی ہے، اس کی لغزشوں کو زیادہ کردیتی ہے جس کی وجہ سے انسان پشیمانی اور ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس تانی اور آہستگی حالات ومواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے اور کامیاب وکامران ہونے میں مدد دیتی ہے۔

چند اہم نکات

1۔عجلت اور شتاب زدگی کا مفہوم:۔

عجلت اور شتاب زدگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان مناسب حالات وشرائط پیدا ہونے سے قبل کسی کام کو انجام دینے کیلئے میدان عمل میں کود پڑے۔ایسی صورت میں انسان کی تمام کوششیں برباد اور بے اثر ہو جائیں گی یا یہ کہ زیادہ سے زیادہ ایک ناقص نتیجہ انسان کے ہاتھ آ جائے گا۔یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ پھل کے پکنے سے پہلے اسے درخت سے توڑ لیا جائے۔اس صورت میں یا تو پھل بالکل بے فائدہ ہو جاتا ہے یا اس کا فائدہ نہایت ہی ناقص ہوتا ہے۔اس کی ایک اور مثال اس طرح سے دی جا سکتی ہے کہ کوئی کسان زمین میں مکمل طور پر تیار ہونے سے قبل اس میں بیج بو کر، بیج اور اپنی ساری محنت، دونوں کو برباد کر دے گا۔اگر اس صورت میں کوئی فصل پیدا ہو بھی جائے تو بہت کم ہو گی۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں خطبہ 5 میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَهَجَتَنِي الثَّمَرَةِ لِغَيْرِ وَقْتِ إِيْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ لِغَيْرِ أَرْضِهِ"۔

''وقت سے پہلے پھل توڑنے والا اس شخص کی مانند ہے جو غیر مناسب زمین میں بیج بوتا ہے''۔

عجول ایسے افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنے اعمال واقوال میں صبر وتحمل کے بغیر جلد بازی اور گھبراہٹ میں عمل کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشکلات اور ناکامیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔عجلت اور شتاب زدگی کا نقطہ مقابل تانی، صبر تحمل، بردباری، حوصلہ مندی، اطمینان اور وقار ہے۔

البتہ عجلت اور سرعت کو آپس میں ملانا نہیں چاہئے۔سرعت یعنی تیزی ایک مثبت صفت ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ مناسب حالات وشرائط فراہم ہو جانے کے بعد انسان وقت اور توانائیوں کو ضائع کیے بغیر فوراً عمل شروع کر دے اور تیزی سے اپنے مقصد کی طرف حرکت کرے۔یہ یقیناً کامیابی کا ذریعہ ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ عجلت اور سرعت کے مفہوم کو آپس میں گڈمڈ کر دیتے ہیں۔بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ جب سست اور کاہل افراد کو تیزی سے کام کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ عجلت ایک ناپسندیدہ عمل ہے، حالانکہ ان دونوں کا فرق نمایاں ہے۔

ہم اس بات کو حضرت علیؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"إِيَّاكَ وَالْعَجَلَةَ بِالْأُمُوْرِ قَبْلَ أَوَانِهَا، وَالتَّسَاقُطَ فِيْهَا عِنْدَ إِمْكَانِهَا"۔

''کسی کام کا وقت آنے سے پہلے عجلت میں اسے انجام دینے سے اجتناب کرو اور اس کا وقت آ جانے پر اسے انجام دینے میں سستی وکاہلی سے اجتناب کرو''۔(نہج البلاغہ، مکتوب:53)

2۔نیکی میں سرعت

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اہلِ ایمان کو نیکی کے کاموں میں سرعت کا حکم دیا گیا ہے۔سورۂ آلِ عمران کی آیت 114 میں اہل ایمان کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

"وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ"۔

''اعمال خیر میں تیزی سے عمل کرتے ہیں اور وہی صالحین میں سے ہیں۔''

سورۂ انبیاٗ،آیت 90 میں مؤمنین کی نمایاں صفات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

".....اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ....."۔

''یہ نیک کاموں میں سرعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں''۔

سورۂ مؤمنون کی آیت 61 میں مؤمنین کی نمایاں صفات کے ذکر میں آیا ہے:

"اُولٰۗىِٕكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ"۔

''یہ نیک کاموں میں سرعت کے ساتھ عمل کرتے ہیں اور ان میں دوسروں پر سبقت لے جاتے ہیں''۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت 133 میں اہلِ ایمان کو ایک عمومی فرمان سنایا جارہا ہے:

"وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ"۔

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف تیزی سے آگے بڑھو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے جو متقین کیلئے تیار کی گئی ہے۔''

سورۂ بقرہ کی آیت 148 میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

".....فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ....."۔

یعنی''اعمالِ خیر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو''۔

ظاہر سی بات ہے کہ نیکی کے کاموں میں مسارعت اور مسابقت ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں اور درحقیقت آپس میں لازم وملزوم ہیں،اس لئے کہ سرعت کے بغیر سبقت ممکن نہیں ہے اور جو سرعت سے عمل کرتا ہے،وہ دوسروں سے پہلے منزل پر پہنچتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی روایات بھی کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ہم نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں بیان کرتے ہیں:

1۔ جنابِ رسولِ خدا نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مِنَ الْخَیْرِ مَا یُعَجَّلُ"۔ (اصولِ کافی، 142:2)

''اللہ تعالیٰ اس نیک عمل کو پسند کرتا ہے جسے انجام دینے میں جلدی کی جائے''۔

2۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"بَادِرُوْا بِعَمَلِ الْخَیْرِ قَبْلَ اَنْ تُشْغَلُوْا عَنْہُ بِغَیْرِہٖ"۔ (میزان الحکمہ، 5381:1)

''نیک کام کو انجام دینے میں جلدی کرو، اس سے پہلے کہ کوئی اور کام تمہیں مصروف کر دے''۔

3۔ امام جعفر صادقؑ کی متعدد احادیث میں یہ مضمون پایا جاتا ہے:

"مَنْ ھَمَّ بِخَیْرٍ فَلْیُعَجِّلْہُ وَلَا یُؤَخِّرْہُ"۔ (کافی، 142:2)

''جو کوئی کسی نیکی کا ارادہ کرے، اسے جلدی انجام دے اور اس میں تاخیر نہ کرے''۔

4۔ ایک اور حدیث میں آپؑ نے یہی بات ذرا تفصیل سے بیان فرمائی ہے:

اِذَا ھَمَّ اَحَدُکُمْ بِخَیْرٍ اَوْ صِلَۃٍ فَاِنَّ عَنْ یَمِیْنِہٖ وَشِمَالِہٖ شَیْطَانَیْنِ فَلْیُبَادِرْ لَا یَکُفَّاہُ عَنْ ذٰلِکَ"۔

''جب تم سے کوئی شخص کسی عملِ خیر کو انجام دینے یا کسی کو کچھ دینے کا ارادہ کرے تو اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کے دائیں اور بائیں دو شیطان ہیں، لہٰذا اُسے چاہئے کہ فوراً عمل کر لے تاکہ شیطان اپنے وسوسوں کے ذریعے اُسے روک نہ دیں''۔

5۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لَیْسَ مِنْ عَادَۃِ الْکِرَامِ تَاخِیْرُ الْاَنْعَامِ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 7489)

''انعام میں تاخیر کرنا اہلِ کرم کا شیوہ نہیں ہے''۔

6۔ حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ ھَمَّ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَیْرِ فَلْیُعَجِّلْہُ فَاِنَّ کُلَّ شَیْءٍ فِیْہِ تَاخِیْرٌ فَاِنَّ لِلشَّیْطَانِ فِیْہِ نَظْرَۃً"

''جو کوئی کسی کارِ خیر کی نیت کرے، اسے انجام دینے میں جلدی کرے، اس لئے کہ جس کام میں تاخیر ہو جائے، اس پر شیطان کی نظر لگ جاتی ہے (اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے وسوسوں کے ذریعے انسان کی نیت اور ارادے کو کمزور کر دے)''۔

مختصر یہ کہ کارہائے خیر کی انجام دہی میں شیاطین جن وانس کی طرف سے ہمیشہ وسوسہ اندازی اور رُکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لہٰذا جیسے ہی کوئی شخص کوئی کارِ خیر انجام دینے کی نیت کرتا ہے، یہ شیاطین اپنی کاروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ بنابرایں ضروری ہے کہ کارہائے خیر کو انجام دینے میں تاخیر نہ کی جائے۔ البتہ سرعت اور عجلت کے فرق کو مدِ نظر رکھا جانا چاہئے۔

ہم اس بات کو امیر المومنین حضرت علیؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"لَاتُؤَخِّرْ اِنَالَةَ الْمُحْتَاجِ اِلٰى غَدٍ، فَاِنَّكَ لَاتَدْرِىْ مَايَعْرِضُ لَكَ وَلَهُ فِىْ غَدٍ"۔ (غرر الحکم ،حدیث: 10364)

''ضرورت مند کی مدد کرنے میں کل تک تاخیر نہ کرو، تمہیں کیا معلوم کہ کل تمہارے حالات کیا ہوں اور اس کے حالات کیا ہوں (ہوسکتا ہے کہ تم دینے پر قادر نہ رہو یا اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے)''

عجلت اور شتاب زدگی کے منفی اثرات

1۔ وقت اور توانائی کا ضیاع:۔

عجلت اور شتاب زدگی کے فردی اور اجتماعی زندگی پر بہت سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس سے ہونے والے نقصانات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ صفتِ رذیلہ انسان کے وقت اور توانائیوں کو ضائع کر دیتی ہے، مثلاً اگر دُشمن کسی ملک پر حملہ کر دے اور اس ملک کی مسلح افواج مناسب تیاری اور منصوبہ بندی کے بغیر جلد بازی اور عجلت میں دُشمن پر حملہ کر دیں تو نتیجہ شکست اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اس کی توانائیوں، وقت، وسائل اور افرادی قوت کا ضیاع بھی ہوگا۔

ذاتی معاملات میں بھی یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، اس لئے کہ جلد بازی اور شتاب زدگی پر مبنی حرکت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

''الحجۃ البیضا'' میں ایک دلچسپ حدیث بیان ہوئی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو سب شیاطین ابلیس کے پاس جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ آج سارے بت سرنگوں ہوگئے ہیں، کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟

ابلیس نے کہا: ضرور کچھ ہوا ہے۔ تم لوگ یہاں رہو، میں تحقیق کرتا ہوں۔

ابلیس نے اُڑان بھری اور ساری دُنیا کا چکر لگایا اور دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے علاوہ کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا اور اس نے دیکھا کہ فرشتوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ ابلیس نے واپس آکر انہیں اطلاع دی کہ

گزشتہ رات ایک رسول کی ولادت ہوئی ہے۔

اس نے مزید کہا کہ جو حاملہ عورت بچہ جنتی ہے، میں وہاں موجود ہوتا ہوں، سوائے اس بچے کی ولادت کے۔ پس اب تم اس بات سے مایوس ہو جاؤ کہ اس کے بعد بت پرستی کو فروغ حاصل ہوگا۔ لیکن تم اولادِ آدمؑ کو گمراہ کرنے کیلئے عجلت اور جلد بازی کے اعمال کو ذریعہ بنا سکتے ہو۔ (الحجۃ البیضا، 61:5)

2۔ یاس و نا اُمیدی:۔

عجلت اور جلد بازی کا ایک اور منفی نتیجہ مایوسی اور نا اُمیدی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ ایسی صورتِ حال میں بعض اوقات انسان کی حالت یہ بھی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر چیز حتیٰ کہ اللہ کی تقدیر سے بھی مکمل طور پر مایوس ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں:

"لَاتَعْجَلْ عَلٰی ثَمَرَةٍ لَاتَدْرِك وَاِنَّمَا تَنَالُهَافِیْ اَوَانِهَا وَاَعْلَمُ اَنَّاالْمُدَبِّرَ لَكَ اَعْلَمُ بِالْوَقْتِ الَّذِیْ یُصْلِحُ حَالُكَ فِیْهِ، فَشِقُ بِخَیْرَتِهٖ فِیْ جَمِیْعِ اُمُوْرِكَ، یُصْلِحُ حَالُكَ، وَلَاتَعْجَلْ بِحَوَائِجِكَ قَبْلَ وَقْتِهَافَیَضِیْقُ قَلْبُكَ وَصَدْرُكَ وَیَغْشَاكَ(یَغْشَاكَ) الْقُنُوْط"۔ (بحار الانوار، 379:75)

''وقت سے پہلے کوئی بھی پھل توڑنے میں جلدی نہ کرو۔ تم مناسب موقع پر ہی اسے حاصل کر سکتے ہو۔ یاد رکھو تمہارے اُمور کی تدبیر کرنے والا بہتر جانتا ہے کہ کس وقت کوئی چیز تمہارے لئے مفید ہے۔ لہٰذا ہر کام میں اس کے انتخاب پر بھروسہ کرو تا کہ تمہارے معاملات کی اصلاح ہو سکے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے کبھی بھی جلد بازی کرتے ہوئے قبل از وقت قدم نہ اُٹھاؤ کیونکہ اس سے تم پر افسردگی، تنگدلی اور مایوسی چھا جائے گی''۔

3۔ ندامت اور پشیمانی:۔

عجلت اور جلد بازی کا ایک اور برا نتیجہ ندامت اور پشیمانی ہے، جیسا کہ گزشتہ احادیث میں یہ بات بیان ہو چکی ہے، بہت سے لوگ مناسب تیاری کے بغیر مناسب وقت سے پہلے عجلت اور جلد بازی میں کوئی قدم اُٹھاتے ہیں جس کا نتیجہ ان کی توانائیوں اور وسائل کے ضیاع کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اور انہیں اس کا کوئی پھل نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں انسان ندامت اور پشیمانی کا شکار ہو جاتا ہے کہ کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَكَمْ مِنْ مُسْتَعْجِلٍ بِمَااِنْ اَدْرَكَهٗ وَدَّاَنَّهٗ لَمْ یُدْرِكْهُ"۔

''بہت سے لوگ جلد بازی میں ایسی چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر اُسے حاصل کرلیں تو یہ چاہیں گے کہ کاش! انہیں یہ چیز نہ ملی ہوتی''۔(نہج البلاغہ، خطبہ:150)

4۔غم واندوہ:۔

عجلت اور جلد بازی کا ایک اور منفی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شکست اور ناکامی کے بعد انسان غم واندوہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْعَجَلُ قَبْلَ الْاِمْكَانَ يُوْجِبُ الْغُصَّةَ"۔(غرر الحکم، حدیث:1333)

''مناسب حالات سے قبل جلد بازی میں اقدام کرنے کا نتیجہ غم وغصہ ہوتا ہے''۔

5۔اغلاط کی کثرت:۔

عجلت اور شتاب زدگی کا ایک اور منفی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان بکثرت غلطیاں کرتا ہے۔صحیح فیصلے صحیح اقدام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے انسان معاملے کے تمام پہلوؤں پر مکمل غور وفکر کرے۔ظاہری بات ہے کہ جلد بازی اور عجلت میں کئے گئے فیصلوں اور اقدامات میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر جلد باز افراد مختلف غلطیوں کا شکار ہوجاتے ہیں، جو ہدف اور مقصد کی تشخیص میں بھی ہوسکتی ہیں اور ہدف تک پہنچنے کے طریقوں میں بھی۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"مَعَ الْعَجَلِ يَكْثُرُ الزَّلَلُ"۔(غرر الحکم، حدیث:9740)

''عجلت اور جلد بازی میں کثرت سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں''۔

نیز آپؑ ہی سے منقول ہے:

"مَنْ عَجِلَ كَثُرَ عِثَارُهُ"۔(غرر الحکم، حدیث:7838)

''جو جلد بازی کرتا ہے، اس کی غلطیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں''۔

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اَصَابَ مُتَأَنٍّ اَوْ كَادَ. اَخْطَأَ مُسْتَعْجِلٌ اَوْ كَادَ"۔

''آرام وسکون کرنے والے افراد کامیاب ہوجاتے ہیں، یا کامیابی کے قریب ہوجاتے ہیں جبکہ جلد باز افراد خطا کے مرتکب ہوتے ہیں یا خطا کے قریب ہوجاتے ہیں''۔(غرر الحکم، حدیث:1290)

بہر حال عجلت، جلد بازی اور گھبراہٹ میں کئے گئے کاموں کے نقصانات اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنا ایک عام آدمی سوچ سکتا ہے۔جلد باز انسان اپنی جلد بازی کی جو قیمت ادا کرتا ہے، اُس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

عجلت کے اسباب

1۔نفس پرستی:۔

بہت سے دیگر رذائلِ اخلاقی کی مانند اس صفتِ رذیلہ کا بنیادی سبب بھی ہوائے نفسانی کی پرستش ہے۔نفس پرست انسان عام طور پر اپنی نفسانی خواہشات کے حصول کیلئے، غور وفکر کیے بغیر، جلد بازی سے عمل کرتا ہے، اس لئے کہ اس کی نفسانی خواہشات اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ اُسے غور وفکر کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔

2۔حُبِ دُنیا:۔

حُبِ دُنیا جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے، عجلت اور شتاب زدگی کی ایک اور وجہ ہے۔حُبِ دُنیا میں گرفتار شخص حُبِ دُنیا کے ہاتھوں اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے، دُنیا کی محبت ایک آگ کی طرح اس کے دل میں شعلہ ور ہوتی ہے اور اسے ناپختہ خیالات کی پیروی پر مائل یا مجبور کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ مشکلات اور مواقع کو دیکھ سکتا ہے نہ ان کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر سکتا ہے۔نتیجہ شکست اور ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

3۔کم ظرفی:۔

عجلت اور شتاب زدگی کا ایک سبب کم ظرفی بھی ہے۔کم ظرف افراد عام طور پر جلد باز ہوتے ہیں جبکہ کھلے دل اور زیادہ حوصلے والے افراد عموماً صبر وتحمل اور بردباری سے کام لیتے ہیں۔یہ افراد تمام معاملات کا ٹھنڈے دل اور دماغ سے جائزہ لے کر قدم اُٹھاتے ہیں۔اسی وجہ سے ان کی ناکامیوں کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔

شیطانی وسوسہ اندازی، نادان اور جاہل دوستوں کی باتیں، خوشامدی، جھوٹے اور حاسد افراد کی فریب کاریاں بھی شتاب زدگی اور عجلت کا اہم سبب ہوتی ہیں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"وَلَا تَعْجَلَنَّ اِلٰی تَصْدِیْقِ سَاعٍ فَاِنَّ السَّاعِیَ غَاشٌ وَاِنْ تَشَبَّهُ بِالنَّاصِحِیْنَ"۔

"چغل خوری کرنے والوں کی باتوں کی تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ خائن ہوتے ہیں، اگرچہ بظاہر اُنہوں نے

خیر خواہی کا لباس پہنا ہوا ہو''۔(نہج البلاغہ:53)

4۔ جہالت اور نادانی:۔

جلد بازی اور شتاب زدگی کی ایک اور وجہ جہالت، نادانی اور کم عقلی ہے۔ جاہل افراد عام طور پر توہمات اور غلط افکار میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے مناسب حالات وشرائط پیدا ہو چکے ہیں، حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حوادث اور ناکامیوں کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہوشیار اور آگاہ افراد معاملات کے تمام اطراف وجوانب کا غور سے جائزہ لے کر احتیاط اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی جلد بازی سے دُور رہتے ہوئے منصوبہ بندی کرتے ہیں اور یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مِنَ الْحُمْقِ اَلْعَجَلَةُ قَبْلَ الْاِمْكَانِ"۔(غرر الحکم، حدیث:9394)

''امکانات فراہم ہونے سے قبل جلد بازی حماقت کی ایک قسم ہے''۔

راہِ علاج

اس صفت رذیلہ کے علاج کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اس کے دردناک نتائج پر توجہ کرے اور جن لوگوں کی زندگی میں اس کے تلخ نتائج اور دردناک حوادث رُونما ہوئے ہیں، اُن کو یاد کرے۔ تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے نمونے اور مثالیں مل سکتی ہیں، جو اس سلسلہ میں ہماری چشم کشائی کر سکتی ہیں۔ جو کوئی ان امور میں غور وفکر کرے، وہ اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ جلد بازی سے نہ صرف یہ کہ انسان جلدی اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا بلکہ بعض اوقات تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلد بازی کی وجہ سے کبھی بھی اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

"اَلْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ" اور "وَالعَجَلَةُ الْاِمْكَانِ يُوْجِبُ الْغُصَّةَ وَمَعَ الْعَجَلَةِ تَكُوْنَ النَّدَامَةُ"

جیسے جملوں کو اگر فردی اور معاشرتی زندگی کا اصول بنا لیا جائے تو انسان عجلت اور شتاب زدگی کی بیماری سے نجات پا سکتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو ہمیشہ مدِ نظر رکھے:

''جلد بازی انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اور اگر صبر وتحمل سے کام لیں تو کوئی شخص خطرے میں گرفتار نہ ہو''۔(بحار الانوار، 340:68)

سترھواں باب

صبر وشکیبائی

تمہید:۔

انسان کو زندگی میں عجیب وغریب مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے رہتا ہے۔ اگر ان مشکلات کا مقابلہ صبر اور حوصلے سے کیا جائے تو انسان یقیناً کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان صبر وشکیبائی سے کام نہ لے اور مسائل ومشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے تو کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ پائے گا۔

یہاں صبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان مشکلات اور حوادث کے سامنے ثابت قدمی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔ اس کا نقطہ مقابل ''جزع'' ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان مشکلات وحوادث کے سامنے صبر وحوصلہ ہار کر اپنی شکست تسلیم کرلے۔ یہ مسئلہ مادی زندگی کے علاوہ معنوی اور رُوحانی زندگی میں بھی صادق آتا ہے۔ اگر انسان اپنے سرکش نفس، دُنیا کی پرفریب سنگینی اور گناہوں کی کشش کے سامنے صبر واستقلال کا مظاہرہ نہ کرے اور معرفتِ خدا اور اطاعت خدا کی راہ میں مشکلات کا مقابلہ نہ کرسکے تو وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لحاظ سے علمائے علمِ اخلاق نے صبر کی تین اقسام بیان کی ہیں:

1۔صبر براطاعت:۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے سامنے صبر واستقامت۔

2۔صبر برمعصیت:۔

یعنی گناہ کی کشش کے سامنے صبر واستقامت۔

3۔صبر برمصیبت:۔

تلخ اور ناگوار حوادث کے سامنے ثابت قدم رہنا۔ ان کے سامنے انفعالی (passive) طرز عمل نہ اپنانا اور جزع وبیتابی نہ کرنا۔

''صبر'' ایمان کے اہم ترین ارکان میں سے ایک ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا جسم سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی کسی اور موضوع پر ایسی تاکید کم ہی ملتی ہے جیسے صبر کے بارے میں۔ تقریباً ستر

آیات میں صبر کے بارے میں بات کی گئی ہے جن میں سے دس سے زائد جنابِ رسولِ خدا کے بارے میں ہیں۔

قرآن مجید میں صابرین کیلئے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر، آیت 10 میں آیا ہے۔

"اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔

''صابروں کو ان کا اجر بغیر کسی حساب کے پورا پورا دے دیا جائے گا''۔

اسی طرح صبر کو جنت میں داخل ہونے کی کنجی قرار دیا گیا ہے:

"سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔ (رعد:24)

''تم پر سلامتی ہو، اس سبب کہ تم نے صبر کیا، کس قدر عمدہ ہے عاقبت کا گھر''۔

جنابِ رسولِ خدا کی ایک حدیث میں ہے، جو آئندہ صفحات میں بیان ہوگی کہ صبر کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ اس تمہید کے بعد اُن قرآنی آیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن میں مختلف اسالیب میں صبر کے بارے میں تاکید کی گئی ہے:

1۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ"۔ (ص:44)

''ہم نے اُسے (ایوبؑ کو) صابر پایا، وہ کیا خوب بندہ تھا جو (اپنے رب کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا''۔

2۔ "وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔" (یوسف:18)

''وہ یوسف کے کرتے پر جھوٹا خون مل کر لے آئے تو (ان کے والد نے) کہا: تمہاری ہوائے نفس نے ایک برے کام کو تمہاری نظر میں خوبصورت بنا دیا، پس میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اُس پر اللہ سے مدد مانگتا ہوں''۔

3۔ "وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ"۔ (انبیاء:85)

''اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کا ذکر کرو، یہ سب صابرین میں سے تھے''۔

4۔ "قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا"۔ (کہف:67)

''خضرؑ نے کہا: تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے لیکن موسیٰؑ نے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا)''۔

5۔ "قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ"۔ (بقرہ:249)

''جو لوگ آخرت پر پختہ ایمان رکھتے تھے، اُنہوں نے کہا: اکثر ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت اللہ

کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آ گئی اور اللہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے"۔

6۔ "فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ"۔(احقاف:35)

"اے رسولؐ! صبر کیجئے، جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے اور (ان کے عذاب کیلئے) جلد بازی نہ کیجئے۔ جس دن یہ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا گویا وہ ایک گھڑی بھر دُنیا میں رہے"۔

7۔ "فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا"۔(معارج:5)

"پس صبر کرو، ایسا صبر جو خوبصورت ہو" (یعنی ہر قسم کی ناشکری سے پاک ہو)۔

8۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"۔(آلِ عمران:200)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! (مشکلات، مصائب اور نفسانی خواہشات کے مقابلے میں) صبر و استقامت سے کام لو، نیز دُشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ کے معاملہ میں تقویٰ اختیار کرو، شاید تم فلاح پا جاؤ"۔

9۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ"۔(بقرہ:153)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

10۔ "قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔(زمر:10)

"کہہ دو کہ اے میرے بندو، جو مجھ پر ایمان لائے ہو! اپنے رب کی نافرمانی سے بچو، جن لوگوں نے اِس دُنیا میں نیکی کی، اُن کیلئے نیک صلہ ہے۔ اللہ کی زمین وسیع ہے (لہٰذا اگر کفار کے سرغنوں کی طرف سے تم پر ہاتھ ڈالا جائے تو ہجرت کر جاؤ) اس لئے کہ صابروں کو اُن کا اجر و ثواب بغیر حساب کے ملے گا"

11۔ "سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔(رعد:24)

"(قیامت کے فرشتے اہلِ ایمان سے کہیں گے) تمہارے صبر و استقامت کی وجہ سے تم پر سلامتی ہو، آخرت کا

گھر کیا اچھا گھر ہے''۔

12۔ "أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا"۔(فرقان:75)

''(رحمٰن کے ان بندوں کو) ان کے صبر کی وجہ سے جنت کے بلند درجات دیئے جائیں گے اور انہیں ان کے صبر کا اجر عطا کیا جائے گا اور وہاں ان کا استقبال تحیہ اور سلام سے ہوگا''۔

13۔ "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ"۔(بقرہ:155)

''اور یقیناً ہم تمہیں کچھ خوف، بھوک، مال وجان اور پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ جو لوگ ان آزمائشوں کے سامنے صبر واستقامت کریں، انہیں (کامیابی اور اجرِ عظیم) کی بشارت دے دیں''۔

14۔ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔(والعصر:3)

''اور وہ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں''۔

تفسیر

اللہ کے رسولوں میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی نمایاں اخلاقی فضیلت حاصل تھی۔ حضرت ایوبؑ ایک بہت زیادہ صبر کرنے والے پیغمبر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ مشکلات کے سامنے صبر واستقامت کا ایک نمونہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنؑ کے حالات، سورۂ ص میں اس وقت بیان کئے گئے جب مکہ کے مسلمانوں پر سخت مصائب ڈھائے جا رہے تھے۔ یہ سورۃ ان کیلئے صبر واستقامت کی ایک عملی مثال کی حیثیت سے نازل ہوئی اور مسلمانوں کیلئے صبر واستقامت کا درس بھی۔

یہ بات صحیح ہے کہ حضرت ایوبؑ کا نام یا انؑ کا واقعہ قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں بیان ہوا ہے لیکن سورۂ ص میں اس کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت سورۂ ص ہی کی آیت 44 ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اور ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا۔ وہ کیا خوب بندہ اور (اپنے رب کی طرف) رجوع کرنے والا تھا''۔

حضرت ایوب علیہ السلام آزمائش کے طور پر کئی بڑے مصائب میں گرفتار ہوئے تاکہ انؑ کی شکر گزاری کا درجہ بھی نمایاں ہو جائے اور وہ اپنے رب کے قریب بھی ہو جائیں۔ انؑ کا مال، کھیتی باڑی، بہت سے جانور اور لائق و ہونہار بیٹے، سب کچھ ہلاک و برباد ہو گیا اور وہ خود بھی شدید بیمار ہو گئے۔ انؑ کی بیماری اس قدر شدید تھی کہ وہ شدتِ درد سے تڑپنے لگتے۔ لیکن ان سب باتوں میں سے کوئی بھی اللہ کے حضور میں انؑ کی شکر گزاری کو کم نہ کر سکی۔

انہوں نے دوستوں اور دُشمنوں کے طعنے برداشت کئے جو شاید ہر مصیبت سے بڑی مصیبت تھے۔ بعض اوقات بنی

اسرائیل کے عبادت گزار اور راہب انؑ سے ملنے آتے تو صاف الفاظ میں کہتے کہ آپؑ نے کونسا اتنا بڑا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں آپؑ اس دردناک عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں؟

لیکن اس پر بھی حضرت ایوبؑ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور اپنے شکر کے صاف وشفاف چشمے کو ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دیتے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے صرف یہ کام کیا کہ طویل عرصے کی پریشانی اور مصیبت کے بعد ایک دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

''اے میرے رب! شیطان نے مجھے دُکھوں اور عذاب میں ڈال دیا ہے (اور میں صرف تجھ سے اس مصیبت سے نجات کی اُمید رکھتا ہوں)'' (ص:41)

"وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ"۔

جب اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان پیغمبر نے مصیبت اور آزمائش کے سارے مراحل طے کر لئے اور ان کے سامنے صبر واستقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹے رہے اور شیطان کو شرمندہ اور مایوس کر دیا تو اللہ نے اپنی رحمت کے دروازے انؑ پر کھول دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال ودولت سے زیادہ مال ودولت انہیں عطا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ'' کا اعزاز بھی عطا فرمایا۔

ابن مسعود، جو ایک معروف مفسر اور قاری تھے، ان کا کہنا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے انسانی تاریخ میں اعزاز اپنے نام کر لیا اور قیامت تک اہلِ صبر کے قافلہ سالار بن گئے۔

"رَاسُ الصَّابِرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَه"۔ (تفسیر رُوح البیان، 45:2)

اس بات کو معمولی اور سادہ سی بات نہ سمجھا جائے کہ ایک شخص جس کے پاس وسیع پیمانے پر سب کچھ ہو اور اس کا سب کچھ یکا یک برباد ہو جائے، دوستوں اور دُشمنوں کے طعنے سننے کو ملیں، جن کا زخم تلوار کے زخم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اور پھر اس کی زبان پر اللہ کی رضا کے خلاف کوئی کلمہ جاری نہ ہو بلکہ اُس کی زبان ان تمام حالات میں بھی ذکر وشکرِ الٰہی میں مصروف رہے اور آخر کار صرف اللہ تعالیٰ سے اپنی حالت بیان کرے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس جملے میں حضرت ایوبؑ نے اللہ سے شکایت کی ہے۔ لیکن ان لوگوں کی بات قطعی غلط ہے، اس لئے کہ حضرت ایوبؑ کی اس بات میں شکایت کا ذرا سا بھی رنگ نہیں ہے، بقولِ شاعر:

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ درگنج تو نیست
نیستی وحاجت وعجز ونیاز آوردہ ام

''اے بادشاہِ حقیقی! میں چار چیزیں لے کر تیری بارگاہ میں آیا ہوں جو تیرے خزانے میں نہیں ہیں: نیستی،

حاجت مندی، عاجزی اور نیاز مندی لے کر آیا ہوں''۔

ان آیات میں سے دوسری آیت حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کے بارے میں ہے۔ وہ بھی صبر وشکیبائی میں ایک قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ وہ اپنے انتہائی عزیز بیٹے کے فراق اور جدائی میں مبتلا ہو گئے۔ سالہا سال تک اشکبار آنکھوں سے اپنے عزیز فرزند کی جدائی پر صبر کرتے رہے، یہاں تک کہ نابینا ہو گئے مگر اللہ کی رضا کے خلاف ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں لائے بلکہ مسلسل صبر وشکر کی روش پر گامزن رہے۔ ایسا صبر جس کو خود انہوں نے صبر جمیل کا نام دیا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا ہے۔

برادرانِ یوسفؑ اپنے بھائی کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر باپ کے پاس آئے۔ (حضرت یعقوبؑ نے ان کے جواب میں) کہا: تمہارے نفس نے یہ کام تمہاری نظروں میں خوبصورت بنا کر دکھا دیا، میں صبر جمیل کروں گا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس پر اللہ کی مدد کا طالب ہوں۔

"وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔"(یوسف:18)

حضرت یوسف علیہ السلام کے چھوٹے اور نادان بھائی اس بات سے غافل تھے کہ اگر انہوں نے حضرت یوسفؑ کی قمیص کو خون آلود کر لیا تھا تو چند جگہوں سے اس قمیص کو پھاڑ بھی ڈالتے تا کہ بھیڑیئے کے حملے کا کوئی ثبوت بھی پیدا ہو جاتا۔ ان کی اسی کمزوری نے ان کے جھوٹ کو ظاہر کر دیا اور حضرت یعقوبؑ ان کے فریب سے باخبر ہو گئے جس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا:

"بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا"۔

لیکن چونکہ اس وقت وہ بے بس تھے، بے ساختہ انہوں نے کہا: "فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ" (صبر جمیل سے مراد وہ صبر ہے شکر کے ساتھ ہو، ایسا صبر جس کے ساتھ کسی قسم کی بے صبری اور بیتابی کی آلائش نہ ہو)۔

صبر جمیل کے بارے میں مفسرین نے مختلف تشریحات بیان کی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ صبر جمیل سے مراد ایسا صبر ہے جس میں بیتابی اور لوگوں کے سامنے اپنے حالات کی شکایت نہ پائی جائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ صبر جمیل سے مراد وہ صبر ہے جو اللہ کیلئے ہو۔

جنابِ رسولِ خداؐ سے پوچھا گیا کہ صبر جمیل سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"هُوَ الَّذِيْ لِاَشْكُوى مَعَهٗ"۔

''یہ وہ صبر ہے جس کے ساتھ شکوہ نہ پایا جائے''۔ (تفسیر قرطبی، 338:5)

بعض نے کہا ہے کہ صبر جمیل وہ صبر ہے جس میں انسان اپنے حالات کی شکایت بندوں کے سامنے نہ کرے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے صرف اپنے رب کے سامنے اپنے حالات کی شکایت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت یوسفؑ

کو بکثرت یاد کرنے پر حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے ان پر تنقید کی تو انہوں نے جو جواب دیا، قرآن میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"قَالَ اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ"۔

''انہوں نے جواب دیا کہ میں صرف اللہ کے حضور اپنے غم واندوہ کی شکایت کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کا علم رکھتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔(یوسف:86)

تیسری آیت میں چند اور انبیاؑ کا ذکر ہے جنہوں نے صبر واستقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور اللہ نے ان کے صبر ہی کی بدولت انہیں اپنی خصوصی رحمت سے نوازا اور انہیں اپنے صالح بندوں کے زمرے میں شمار فرمایا۔

"وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِدۡرِيۡسَ وَذَا الۡكِفۡلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيۡنَ ۖ وَاَدۡخَلۡنٰهُمۡ فِىۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ"۔

(انبیاء:85اور 86)

''اور اسماعیلؑ، ادریسؑ او ذوالکفل کا ذکر کریں، یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا۔ وہ یقیناً ہمارے صالح بندوں میں سے تھے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا صبر بالکل واضح ہے۔ جب ان کے والدؑ نے ان کو اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہا تو وہ اس کیلئے آمادہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ نے چھری انؑ کے گلے پر پھیر دی۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم کیا اور ایک دنبہ بھیج دیا جو حضرت اسماعیلؑ کی جگہ قربان ہو گیا۔

اس کے علاوہ وہ مکہ کی تپتی ہوئی بے آب وگیاہ سرزمین پر اللہ کے گھر کے قریب رہے، یہاں تک کہ بتدریج وہ جگہ آباد ہو گئی۔

حضرت ادریسؑ کے صبر کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم میں مبعوث ہونے والے سب سے پہلے نبی تھے۔ اگرچہ اس راہ میں اُنہوں نے بہت تلخیاں برداشت کیں اور اپنی قوم کو دعوت دی مگر انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔

حضرت ذوالکفل کو یہ نام دینے اور پہلے سے مبعوثِ صبر کرنے والے انبیاؑ کے زمرے میں ان کا شمار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو، جو بنی اسرائیل پر حکومت کرتے تھے، وحی کی کہ میں تمہاری روح قبض کرنا چاہتا ہوں۔ تم حکومت کسی ایسے شخص کے سپرد کر دو جو اس بات کا عہد کرے کہ ہر رات اللہ کی عبادت کیلئے شب بیداری کرے، ہر روز روزہ رکھے اور غضب ناک ہوئے بغیر لوگوں کے درمیان عدل کرے۔

ایک جوان نے کہا کہ میں ان سب باتوں کا وعدہ کرتا ہوں اور پھر (ہر قسم کی مشکلات کے باوجود) ساری زندگی ان تین

باتوں پر قائم رہا۔اللہ نے اس نوجوان کو مقامِ نبوت پر فائز کیا اور اسے ذوالکفل کا نام دیا (رُوح البیان،515:5)

یہ تین شخصیات صبر واستقامت کے ان قابلِ تقلید نمونوں میں سے ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کیلئے اُسوۂ عمل کے طور پر کیا ہے۔

چوتھی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ کا ذکر ہے۔اس درس آموز نکات سے بھرپور، انسان ساز واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چند نئے علوم سیکھنے کیلئے حضرت خضرؑ کے پاس گئے اور انؑ سے درخواست کی کہ جو علوم اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو سکھائے ہیں، ان میں سے مجھے بھی کچھ سکھا دیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت کا مکمل علم رکھتے تھے لیکن حضرت خضرؑ دنیا میں ہونے والے مختلف حوادث کے سربستہ رازوں کا علم رکھتے تھے۔حضرت خضرؑ کو اندیشہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ بے صبری کا شکار ہو جائیں گے۔لہٰذا انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:

"قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا"۔(کھف: 67اور 68)

''تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ان باتوں پر صبر کرو جن کی تم پوری خبر نہیں رکھتے''۔

حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے وعدہ کیا کہ وہ صبر کا مظاہرہ کریں گے۔لیکن بعد میں ایسے حوادث وواقعات پیش آئے جن کے اسرار سے ناواقفیت کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔دو مواقع پر تو حضرت خضرؑ نے انؑ کا اعتراض سننے کے بعد ان کی معذرت قبول کر لی لیکن تیسرے واقعہ کے بعد ان دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔

اس داستان میں ہمارے لئے بہت سے درس ہیں لیکن ان میں سے ایک ہمارے موجودہ موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اگر حضرت موسیٰؑ میں کچھ زیادہ صبر ہوتا تو وہ مزید بہت سے اسرار سے آگاہ ہو سکتے تھے لیکن انؑ کی بے صبری اور ناشکیبائی آڑے آ گئی اور وہ صرف تین واقعات کے اسرار جان سکے۔

ایک مشہور مفسر کا کہنا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ میں زیادہ صبر ہوتا تو اسرار وعلوم کے ہزاروں نکتے ان پر کھل جاتے۔اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ صبر وشکیبائی، علم وآگہی کے خزانے کی چابی ہے۔

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ آیا انبیاؑ اپنے زمانے کے عالم ترین افراد نہیں ہوتے تھے؟ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ حضرت موسیٰؑ بعض علوم سیکھنے کیلئے حضرت خضرؑ کے پاس گئے اور صرف چند نکات سیکھنے کے بعد حضرت خضرؑ نے انہیں جدا کر دیا؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ ہر نبی کو اپنے دائرہ کار میں اور احکامِ شریعت میں سب لوگوں سے زیادہ عالم ہونا چاہئے اور بے شک حضرت موسیٰؑ ایسے ہی تھے۔لیکن حضرت خضرؑ کا دائرہ کار تدبیرِ اُمور کرنے والے فرشتوں (مدبرات

امرًا) کی طرح دنیا میں پیش آنے والے حوادث وواقعات سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کام بظاہر شریعت کے مطابق نہیں تھے اور حضرت موسیٰؑ انؑ پر اعتراض کرتے تھے لیکن جب حضرت خضرؑ نے ان واقعات کے پسِ پردہ حقیقی اسرار کو بیان کیا تو حضرت موسیٰؑ سمجھ گئے۔

اگر چہ نظامِ تکوِین پر حاکم قوانین اور نظامِ تشریع کے احکام ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں اور ان کا نتیجہ اور انجام ایک ہی ہوتا ہے لیکن بظاہر ان میں اختلاف نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی رفاقت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔

ممکن ہے بعض انبیاؑ اور آئمہ بھی نظامِ تکوین کے اسرار سے آگاہی رکھتے ہوں (بعض روایات کے مطابق جنابِ رسولِؐ خدا اور آئمہ علیہم السلام یہ علم رکھتے تھے) لیکن انبیاؑ کی نبوت ورسالت اور آئمہ کی امامت کیلئے یہ ضروری نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ فضیلت تو ضرور ہے لیکن رسالت وامامت کی شرط نہیں ہے۔

پانچویں آیت میں بنی اسرائیل کے ایک نبی کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا نام تفسیر اور تاریخ کی کتب میں سموئیل بیان ہوا ہے۔ جب بنی اسرائیل جالوت نامی حکمران کے ظلم وجور سے تنگ آ گئے تو وہ حضرت سموئیل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ جالوت کے خلاف جنگ کیلئے کسی کو ان کا قائد مقرر کریں۔ حضرت سموئیل نے بھی طالوت نامی ایک جوان کو ان کا قائد وپیشوا مقرر کر دیا۔

جب طالوت نے جالوت کا مقابلہ کرنے کیلئے بنی اسرائیل کا ایک بڑا لشکر تیار کر لیا تو اللہ کی عطا کردہ بصیرت وفراست کے ذریعے طالوت نے یہ دیکھ لیا کہ ان کی فوج کے زیادہ تر سپاہی کم ہمت اور بزدل ہیں اور لشکر میں ان کے ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ وہ دوسروں کے حوصلوں کو بھی پست کرنے کا باعث بنیں گے۔ لہٰذا طالوت نے ان کو آزمانے کا ارادہ کیا جس کے بعد تھوڑے سے افراد ان کے ساتھ رہ گئے۔

باقی ماندہ تھوڑے سے افراد اپنی تعداد میں کمی کی وجہ سے پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم طالوت کی بڑی فوج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لیکن قرآن مجید میں ہے:

> ''جو لوگ اس بات کا علم رکھتے تھے کہ انہیں اللہ سے ملاقات کرنا ہے (اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے) انہوں نے کہا کہ اکثر اوقات اللہ کے حکم سے ایک چھوٹی جماعت بڑے لشکر پر غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

''قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ"۔ (بقرہ:249اور 250)

''پھر جب جالوت کے لشکر کے سامنے آئے تو انہوں نے دُعا کی کہ اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما، ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں پر فتح عطا فرما''۔

اس طرح انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ جذبے اور صبر واستقامت سے خالی بڑا لشکر میدانِ جنگ میں کامیاب نہیں ہوتا جبکہ چھوٹا لیکن پختہ عزم وارادے اور صبر وثابت قدمی کی صفات آراستہ لشکر بڑی فوج پر غالب آ سکتا ہے۔ آخر کار طالوت کی کمان میں اس چھوٹے سے لشکر نے جالوت کی بہت بڑی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ جالوت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ قتل ہو گیا، جو اس وقت طالوت کے لشکر کے ایک طاقتور نوجوان سپاہی تھے۔ اس طرح بنی اسرائیل نے اپنی سرزمین اور اپنی قوم کو دشمن کی غلامی سے آزاد کروالیا اور تاریخ میں صبر واستقامت کی اہمیت کا ایک اہم باب رقم کر دیا۔

ان آیات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس صبر واستقامت کی بنیاد اللہ پر توکل اور آخرت پر پختہ ایمان تھا۔ بعض روایات کے مطابق طالوت کے لشکر کی تعداد تین سو تیرہ تھی (جنگ بدر میں جنابِ رسولِ خدا کے اصحاب کی تعداد کے برابر)۔ حضرت داؤد نے پتھر سے جالوت کی پیشانی کا نشانہ لیا اور پتھر نے جالوت کی پیشانی کو توڑ دیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔

اس کی ہلاکت سے اس کی فوج کے حوصلے ٹوٹ گئے اور وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق جالوت کی فوج ایک لاکھ تجربہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

چھٹی آیت میں جنابِ رسولِ خدا کو خطاب کر کے انہیں اولوالعزم رسولوں کی زندگی سے صبر واستقامت کا درس لینے کا حکم دیا گیا ہے۔

"فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔"

''جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر کریں اور ان (مخالفوں) پر عذاب کیلئے جلد بازی نہ کریں''۔ (احقاف:35)

اگرچہ بنیادی طور پر اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخالفانِ اسلام پر عذاب کی بددعا کرنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور اگر ان میں سے کچھ لوگوں میں راہِ حق پر آنے کا رجحان ہو تو وہ اس راہ پر گامزن ہو جائیں اور اہلِ سعادت کے ساتھ ملحق ہو جائیں۔ لیکن یہ ایک کلی ضابطہ بھی ہے اور اس بات کی روشن دلیل ہے کہ صبر ایک ایسی فضیلت ہے جو سب اولوالعزم رسولوں کے لائحہ عمل کا جزو ہے۔

جی ہاں! تمام بڑے اور صاحبِ شریعت رسولوں کا جاہل، ضدی اور سخت دُشمنوں سے واسطہ رہا ہے لیکن انہوں نے زیادہ سے زیادہ صبر واستقامت سے کام لیا تاکہ اپنی اُمت کی ہدایت کے کام کو بہترین انداز میں انجام دے سکیں۔

حضرت نوحؑ نے 950 سال اپنی قوم کو اللہ کی طرف دعوت دی، شب و روز محنت اور زحمت کی، خلوت اور جلوت میں انہیں نصیحت کی مگر ان میں سے ایک قلیل تعداد ہی انؑ پر ایمان لائی۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور انؑ پر ایمان لانے والوں کو بدترین مصائب کا نشانہ بنایا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو بے حد ستایا گیا، یہاں تک کہ ان کو سولی پر لٹکا دینے کی سازش تیار کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔

مختصر یہ کہ دُنیا میں حق و باطل کی جنگ ہمیشہ جاری رہی ہے اور اس جنگ میں کامیابی کا زینہ صرف صبر و استقامت ہے۔

یہاں پر یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ اولوالعزم رسولوں سے کونسے رسول مراد ہیں؟ اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں لیکن معصومین علیہم السلام کی روایات کے مطابق ان کی تعداد جنابِ رسولِؐ خدا سمیت پانچ ہے اور ان سے مراد صاحبِ شریعت رسول ہیں۔

ساتویں آیت میں اللہ تعالیٰ جنابِ رسولِؐ خدا کو عرب کے متعصب مشرکین اور کفار کی طرف سے تمسخر اور تکذیب اور اذیت پہنچائے جانے پر صبر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا"۔ (معارج:5)

اس سے مراد وہ صبر ہے جس میں لوگوں کے سامنے شکایت نہ کی جائے۔

''پس صبر کرو، ایسا صبر جو خوبصورت ہو''۔ (یعنی ہر قسم کی ناشکری سے پاک ہو)۔

صبرِ جمیل کی تفسیر میں ہم اس سلسلہ کی آیت 2 میں مفسرین کے مختلف اقوال بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ایک حدیث نقل کر کے ہم اس بحث کو مکمل کر دیتے ہیں:

حضرت امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ صبرِ جمیل کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

"صَبْرٌ لَيْسَ فِيهِ شِكْوىٰ إِلَى النَّاسِ"۔ (اصولِ کافی، 93:2)

آٹھویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر اور مصابرہ کا حکم دیا ہے (جس کی تفسیر آگے آ رہی ہے) اور اسے فلاح اور نجات کی کنجی قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"۔ (آلِ عمران:200)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر و استقامت سے کام لو، نیز دُشمن کے مقابلہ میں (بھی) صبر و استقامت دکھاؤ اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تا کہ تم فلاح پا جاؤ''۔

اس آیت میں چار چیزوں کا حکم دیا گیا ہے اور انہیں کامیابی اور فلاح کی کنجی قرار دیا گیا ہے۔

1۔ حوادث ومشکلات ومصائب اور رُکاوٹوں کے سامنے صبر واستقامت۔

2۔ مصابرہ، جو عربی گرائمر کی رو سے باب مفاعلہ سے ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے صبر واستقامت کے سامنے صبر واستقامت کرنا۔ اس سے مراد دشمن کے سامنے صبر واستقامت کرنا ہے۔ بایں معنی کہ جس قدر وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کریں، اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ اس سے زیادہ صبر واستقامت سے کام لیں تاکہ کامیاب ہوجائیں۔

3۔ ''رَابِطُوْا'' جو مرابطہ یا رباط سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی جگہ باندھنے کے ہیں۔ عام طور پر عربی زبان میں یہ لفظ سرحدوں کی حفاظت کے معنی میں بولا جاتا ہے، اس لئے کہ اسلامی لشکر کے سپاہی اپنے گھوڑوں اور دیگر جنگی ساز وسامان کو وہاں رکھتے تھے۔

4۔ آخری حکم تقویٰ کا ہے جو ایک چھتری کی طرح پہلی تین چیزوں پر محیط ہے۔ اگر صبر، مصابرہ اور مرابطہ، ریاکاری، ذاتی اور گروہی مفادات سے بالاتر تقویٰ کے ساتھ ملا ہوا ہو تو دنیا اور آخرت میں نجات اور فلاح کا سبب ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مصابرہ کے معنی عادات اور ہوائے نفس کے مقابلے میں صبر واستقامت کرنا ہے جبکہ مرابطہ سے مراد نفس کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ اور دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑنا ہے۔

کتاب ''رُوح البیان''، ج2، ص 158 پر ایک حکایت ہے کہ ایک عارف پیدل حج کیلئے جارہا تھا۔ راستے میں اُونٹ پر سوار ایک بدو نے اسے کہا:

''اے شیخ! کہاں جارہے ہو؟''

اس نے کہا: ''بیت اللہ کو جارہا ہوں''۔

اس نے پوچھا: ''پیدل کیوں جارہے ہو؟''

عارف نے جواب دیا: ''میرے پاس بہت سی سواریاں ہیں جو تمہیں نظر نہیں آرہی ہیں''۔

اس عرب نے سوال کیا: ''وہ کونسی سواریاں ہیں جو نظر نہیں آتی ہیں؟

عارف نے جواب دیا: ''جب کوئی بلا اور مصیبت نازل ہوتی ہے تو میں صبر کی سواری پر سوار ہوجاتا ہوں۔ جب کوئی نعمت نازل ہوتی ہے تو شکر کو اپنی سواری بنالیتا ہوں۔ قضاوقدر کے معاملہ میں رضا کی سواری پر سوار ہوجاتا ہوں اور جب میرا سرکش نفس مجھے کسی بات کی طرف دعوت دیتا ہے تو میں اس بات پر توجہ کرتا ہوں کہ میری جتنی عمر رہ گئی ہے، وہ اس عمر سے کم ہے جو گزر چکی ہے''۔

یہ سن کر عرب نے کہا: ''درحقیقت سوار تو ہو، پیدل تو تم میں ہی ہوں، جاؤ اللہ حافظ''۔

نویں آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہلِ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دے رہا ہے کہ مشکلات میں صبر اور نماز کی طاقت سے مدد حاصل کرو۔

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ''

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔(بقرہ:153)

اس آیت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہر قسم کے صبر واستقامت کو اپنے دامن میں لے لیتا ہے، خواہ وہ صبر اطاعت کیلئے ہو یا معصیت وگناہ کے خلاف یا جہاد وغیرہ جیسے کسی کام کی انجام دہی کیلئے۔ بنابرایں ضروری ہے کہ ہر کام کو انجام دینے کیلئے صبر کی کسی ایسی شاخ سے مدد لی جانی چاہئے جو اس کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔

بعض علمأ نے اس آیت میں صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ روزہ صبر کا ایک نمایاں ترین مصداق تو ضرور ہے لیکن صبر کا مفہوم روزے کے مساوی نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال بھی رونما ہوسکتا ہے کہ صبر کے وسیع مضمون اور نماز کے درمیان کیا رابطہ پایا جاتا ہے؟

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ بعض اوقات انسان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے اور اس کی صبر کرنے کی ہمت اور طاقت جواب دے جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نماز اسے قوتِ قلب فراہم کرتی ہے، اس کے اندر اللہ پر توکل پیدا ہوتا ہے اور نماز کی بدولت اس کے صبر کی قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

بالفاظِ دیگر جب انسان نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی لامحدود اور لازوال طاقت کے ساتھ جوڑ لیتا ہے۔ اس طرح مشکلات کے مقابلے میں اس کی قوت اور ہمت اس قدر زیادہ ہوجاتی ہے کہ انسان ایک ناقابلِ شکست طاقت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولِ خدا اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں روایات میں آیا ہے:

"اِذَا اَهَالَهُ اَمْرٌ فَزِعَ اِلَى الصَّلٰوةِ ثُمَّ تَلٰى هٰذِهِ الْآيَةَ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ"۔ (اصولِ کافی، 1:154۔ رُوح البیان، 1:257)

''جب آپ کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو آپ نماز کیلئے کھڑے ہوجاتے اور (نماز کے بعد اپنی مشکل کے حل کیلئے عملی کوشش میں مصروف ہوجاتے) پھر اس آیت کی تلاوت کرتے: ''وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ''[1]

بہرحال یہ آیت واضح ترین آیات میں سے ایک ہے جو زندگی میں کامیابی کے عامل اور سبب کی حیثیت سے صبر کی اہمیت کو آشکار کرتی ہے۔

---

[1] مؤلف محترم نے اس روایت کے ترجمہ میں بریکٹ کے اندر کے مطالب کا اضافہ کرکے جو مفہوم بیان کیا ہے، بظاہر وہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ روایت کا واضح اور سیدھا مفہوم یہ ہے کہ ''آنحضرتؐ نماز پڑھتے اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے''، اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد اس آیت کو پڑھتے تھے، جیسا کہ نماز کے بعد تعقیبات پڑھی جاتی ہیں (مترجم)۔

دسویں آیت میں جنابِ رسولؐ خدا کو حکم دیا جارہا ہے کہ (اللہ کی طرف سے) اللہ کے سب بندوں تک یہ پیغام پہنچادیں:

"قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔ (زمر:10)

کہہ دو اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو! تقویٰ اختیار کرو۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کی، ان کیلئے نیک جزا ہے اللہ کی زمین وسیع ہے اور صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

اس آیت میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ ظالموں کے مقابلے میں انسان پر لازم ہے کہ صبر واستقامت کی راہ اختیار کرے اور اگر ایسا نہ کرے گا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا کہ ان کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرلے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس آیت میں صبر کرنے والوں سے بے حساب اجر کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ ''بے حساب'' کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ انہیں اتنا اجر عطا فرمائے گا کہ خود اس کے سوا کوئی اس کا حساب نہ کرسکے گا۔

جنابِ رسولِ خدا سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جب اعمال نامے کھولے جائیں گے اور اعمال کو تولنے کے ترازو نصب کئے جائیں گے تو وہ لوگ جو مصائب میں مبتلا ہوئے اور ان پر صبر کرتے رہے، ان کیلئے کوئی ترازو نصب کیا جائے گا، نہ کوئی اعمال نامہ کھولا جائے گا (بلکہ انہیں بے حساب اجر دیا جائے گا)۔

پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: (مجمع البیان، قرطبی، رُوح البیان)۔

"اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ"۔ (زمر:10)

''بِغَيْرِ حِسَابٍ'' کے الفاظ متعدد آیات میں استعمال ہوئے ہیں جن میں سے زیادہ تر دُنیوی رزق کے بارے میں ہیں۔ صرف اس آیت اور سورۂ مومن کی آیت 40 میں یہ الفاظ اُخروی اجر کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں۔

یہ یقینی بات ہے کہ بے حساب روزی یا اجر کا انسان کے اعمال کی کمیت اور کیفیت یعنی مقدار اور معیار سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا نتیجہ ہے جو بہت عظیم الشان ہے۔

گیارہویں آیت میں صبر کی اہمیت کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب فرشتے اہلِ جنت کی ملاقات کو جائیں گے تو کہیں گے:

"سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ"۔ (رعد:24)

''تم پر سلام ہو، تمہارے صبر واستقامت کے نتیجہ میں اس دُنیا میں تمہیں کیا حسین انجام نصیب ہوا ہے''۔

یہ بات نہایت قابلِ توجہ ہے کہ اہلِ جنت کے تمام اعمال، عبادات اور اطاعات میں سے صرف صبر کو جنت میں داخل ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ انسان کی سعادت اور اس کے جنت میں داخل ہونے میں صبر کا

بہت اہم کردار ہے، اس لئے کہ صبر کے بغیر نہ تو گناہوں سے پرہیز ممکن ہے اور نہ ہی عبادات کو انجام دینا ممکن ہے۔ اپنے نفس کے خلاف جہاد ہو یا بیرونی دشمن کے خلاف جنگ، صبر کے بغیر یہ بھی ممکن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے اہلِ جنت کو مبارکباد دیتے وقت صبر کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی سورت کی آیت 22 بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ تمام عبادات صبر کے زیر سایہ ہی انجام پاتی ہیں:

"وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

''غور وفکر سے کام لینے والے صاحبانِ عقل وہ ہیں جو اپنے رب کی خوشنودی کیلئے صبر کی راہ پر چلتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اسی میں سے اعلانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور نیکی کے ذریعے برائی کو دُور کرتے ہیں''۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام علی ابن الحسین زین العابدین علیہم السلام سے ایک بہت خوبصورت حدیث نقل کی گئی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں کہ جب قیامت برپا ہوگی تو آواز دی جائے گی کہ صبر کرنے والے کھڑے ہوجائیں۔ ایک گروہ کھڑا ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہوجاؤ۔

اس وقت فرشتے ان کے استقبال کو آئیں گے اور کہیں گے: کہاں جارہے ہو؟''

وہ کہیں گے: ''جنت''۔

فرشتے کہیں گے: ''حساب سے پہلے؟''

وہ جواب دیں گے: ''جی ہاں''۔

فرشتے پوچھیں گے: ''تم لوگ کون ہو؟''

وہ جواب دیں گے: ''ہم اہلِ صبر ہیں''۔

فرشتے پوچھیں گے: ''تمہارا صبر کیا تھا؟''

وہ کہیں گے: ''ہم اللہ کی اطاعت، گناہوں سے پرہیز اور دُنیا میں غموں اور دُکھوں پر صبر کرتے تھے''۔

فرشتے کہیں گے: ''جنت میں داخل ہوجاؤ، عمل کرنے والوں کیلئے کیا عمدہ اجر ہے!''

بعض روایات میں آیا ہے کہ اسی موقع پر فرشتے کہیں گے: ''سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ'' (تفسیر قرطبی، 4532:5)

بارہویں آیت میں اللہ تعالیٰ کے رحمٰن کے بندوں کی بارہ صفات کو بیان کیا گیا ہے۔

"اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا"۔ (فرقان: 75)

''انہیں ان کے صبر کے بدلے میں جنت میں اعلیٰ درجات ملیں گے''۔

''غُرْفَةَ''، غُرْف سے مشتق ہے۔اس کے معنی کسی چیز کو اُٹھا لینے کے ہیں۔اسی وجہ سے اس پانی کو بھی غرفہ کہا جاتا ہے جو انسان پینے کیلئے اپنے ہاتھوں کے چُلّو میں اُٹھاتا ہے۔اس آیت میں غرفہ سے مراد جنت کے وہ بلند درجات ہیں جو صابروں کو ملیں گے۔

صد ہزاراں کیمیا حق آفرید
کیمیائی ہمچوصبر، آدم ندید

''حق تعالیٰ نے لاکھوں قسم کی کیمیا خلق کی ہیں لیکن انسان نے صبر جیسی کیمیا نہیں دیکھی''۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ صبر 'عبادالرحمٰن' کی بارہ صفات میں ایک مشترک مقام رکھتا ہے۔

تیرھویں آیت میں، جو صبر کے بارے میں بہت مشہور آیت ہے، اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائشوں پر صبر کرنے والوں کو بشارت دیتے ہوئے کہا جارہا ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ''۔

''یقیناً ہم کچھ خوف، بھوک، جان و مال کے نقصان اور پھلوں میں کمی کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے اور آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں کہ جب بھی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کیلئے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں''۔(بقرہ:155 تا 157)

اگرچہ ان آیات میں صرف صبر کے ایک شعبے یعنی مصیبتوں پر صبر کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کی وجہ سے ان صابرین پر اللہ کی طرف سے صلوات و رحمت کی بارش برستی ہے اور اسی صبر کی بدولت وہ ہدایت کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ناقابلِ تغیر و تبدل سنت ہے کہ اس دُنیا میں انسان پر مختلف قسم کی آزمائشیں آتی رہتی ہیں اور صبر کے بغیر ان آزمائشوں پر پورا اترنا ممکن نہیں ہے۔یہاں سے ہم صبر کی اہمیت کو بخوبی جان سکتے ہیں۔

انسان کیلئے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ صرف صبر کی بدولت یہ تین الٰہی عنایات (صلوات، رحمت اور ہدایت) اسے نصیب ہوجائیں۔

اس آیت میں صَلَوٰتٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جمع کا صیغہ ہے۔اس کی دو تشریحات کی گئی ہیں اور دونوں صحیح ہوسکتی

ہیں۔ایک یہ کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف قسم کے اکرام وانعام ہوں، دوسرے یہ کہ اس میں صلوٰۃ کے تکرار کی طرف اشارہ بھی مراد ہوسکتا ہے(یعنی بار بار صلوات ہے)۔

اسی طرح رحمت کیلئے اسم نکرہ کا استعمال بھی اس کی عظمت واہمیت کو واضح کرنے کی خاطر استعمال کیا گیا ہے۔

چودھویں اور آخری آیت، جو سورۃ العصر میں آئی ہے، قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ سب انسان نقصان اور خسارے میں ہیں، صرف وہ لوگ اس خسارے سے محفوظ ہیں جو اس سورۃ میں بیان شدہ چار نکاتی پروگرام پر عمل پیرا ہیں جن میں سے ایک صبر واستقامت ہے۔

"وَالْعَصْرِ۔اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"۔(والعصر 1تا3)

''قسم ہے عصر کی، ہر انسان خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور عملِ صالح کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور وصیت کرتے رہے''۔

''تَوَاصَوْا'' کا مصدر ''تواصی'' ہے جس کے معنی ایک دوسرے کو تلقین اور وصیت کرنے کے ہیں۔اس آیت میں اس لفظ کا استدلال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مومنین ایمان اور عملِ صالح کے بعد حق کو قائم کرنے کی طرف توجہ کریں، خود حق کو پہچانیں اور دوسروں کو اس کی وصیت وتلقین کریں۔

چونکہ انسانی معاشرے میں حق کو قائم کرنا ایک مشکل کام ہے، جس میں لامحالہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں، لہٰذا یہ کام صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح صبر، جو اس چار نکاتی پروگرام کا چوتھا نکتہ ہے، درحقیقت پہلے تین نکات بھی اسی کی بدولت نافذ ہوسکتے ہیں۔ بنابرایں صبر انسانوں کی سعادت کی اصلی بنیاد ہے جسکے بغیر ایمان کا درخت پھل نہیں دیتا۔اس کے بغیر اعمالِ صالح انجام پانا ممکن نہیں اور اس کے حق کا قیام اور نفاذ بھی ممکن نہیں ہے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ حق کا قیام اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ یہ حق اس کے عزیزوں اور اقربا میں سے کسی کے خلاف ہو۔اس صورت میں صبر کی مدد کے بغیر حق کی ادائیگی امکان پذیر نہیں ہوسکتی۔

نتیجہ:۔

مندرجہ بالا آیات میں جو کچھ بیان ہوا، ان سب کا نتیجہ اور ماحصل یہ ہے کہ صبر وشکیبائی اور استقامت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا ہم تصور کرتے ہیں۔بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں صبر کا لفظ ستر بار یا تقریباً سو بار مذکور ہوا ہے جبکہ انسانی فضائل میں سے کسی فضیلت اور اس قدر تاکید نہیں کی گئی ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید اس انسانی فضیلت کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے اور اسے تمام فضائل کا نچوڑ اور خلاصہ قرار دیتا ہے اور اسے تمام سعادتوں کے حصول اور ہر قسم کی خوش بختی

تک پہنچنے کا سبب اور ذریعہ سمجھتا ہے۔

صبر، احادیث کی روشنی میں

بعض علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ صبر کی فضیلت کے بارے میں جو روایات معصومین علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں، وہ احاطہ شمار سے باہر ہیں۔

بعض کتب میں، جو صبر کے بارے میں لکھی گئی ہیں، جنابِ رسولؐ خدا اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی نوسو (900) احادیث ہوئی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ جنابِ رسولؐ خدا نے فرمایا: (میزان الحکمہ، 10025:2)

"اَلصَّبْرُ خَيْرُ مَرْكَبٍ مَارَزَقَ اللهُ عَبْدًا خَيْرًا لَهُ وَلَا اَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ"۔

''صبر بہترین سواری ہے، اللہ نے کسی بندے کو صبر سے بہتر اور کھلا رزق نہیں دیا''۔

اس حدیث میں صبر کو بہترین سواری قرار دینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صبر ہر قسم کی سعادت اور خوش بختی تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر انسان دنیا اور آخرت میں کسی مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

2۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 82)

"عَلَيْكُمْ بِالصَّبْرِ فَإِنَّ الصَّبْرَ مِنَ الْإِيمَانِ كَالرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ"۔

''تم پر صبر و استقامت فرض ہے، اس لئے کہ صبر کا ایمان سے وہی رشتہ ہے جو سر کا بدن سے ہے''۔

اس حدیث میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صبر انسان کی زندگی کے ہر پہلو میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی بیان ہوا ہے:

"لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا صَبْرَ لَهُ"۔

''جس شخص میں صبر نہیں، اُس کے پاس ایمان نہیں ہے''۔

3۔ امیر المومنین علیہ السلام ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"لَا يَعْدَمُ الصَّبُوْرُ الظَّفَرَ وَاِنْ طَالَ بِهِ الزَّمَانُ"۔ (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار: 153)

''صبر کرنے والا کبھی کامیابی سے محروم نہیں رہتا، چاہے کامیابی حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگ جائے''۔

اس حدیث میں صبر اور کامیابی دونوں مطلق ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کا تعلق انسان کی زندگی کے

تمام مادی اور معنوی پہلوؤں سے ہے۔

4۔ جنابِ رسولؐ خدا نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ"(المحجة البیضأ، 7:106)

''صبر نصف ایمان ہے''۔

بعض روایات میں شکر کو نصف ایمان اور باقی نصف ایمان صبر کو قرار دیا گیا ہے۔ نعمتوں کے حصول کیلئے صبر واستقامت کے ساتھ عمل کرنا اور نعمتوں کے حصول کے بعد ان کا شکر ادا کرنا، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو صحیح راہ میں استعمال کرنا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ حدیث گزشتہ احادیث کی نفی نہیں کرتی، اس لئے کہ جیسا ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگر مومن میں صبر موجود نہ ہو تو ایمان کی راہ میں پیش آنے والے رُکاوٹوں کے مقابلہ میں اس کا ایمان ختم ہو جائے گا اور اگر وہ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرے گا تو نعمتوں سے محروم ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْد"۔

''اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب شدید ہے''۔

5۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ"۔(المحجة البیضأ، 7:107)

''صبر جنت کی چابیوں میں سے ایک چابی ہے''۔

6۔ مندرجہ بالا احادیث کی تائید امیر المومنینؑ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جس میں آپؑ نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ عُوْنٌ عَلٰی كُلِّ اَمْرٍ"۔(غرر الحکم، حدیث:765)

''صبر ہر معاملے میں ترقی کرنے میں مددگار ہے''۔

اسلئے کہ زندگی میں ہر اہم کام کی راہ میں رُکاوٹیں موجود ہوتی ہیں جن کو صرف صبر کی بدولت ہی عبور کیا جا سکتا ہے۔

7۔ گناہ کے مقابلے میں صبر کے بارے میں ایک حدیث میں ہے:

"وَمَنْ صَبَرَ عَنْ مَعْصِیَةِ اللهِ فَهُوَ كَالْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ"۔

''جو شخص اللہ کی نافرمانی کے مقابلے میں صبر کرتا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین کی مانند

ہے''۔(جامع احادیثِ شیعہ،253:14)

جی ہاں! یہ دونوں مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ ایک بیرونی دشمن کے خلاف جہادِ اصغر کرتا ہے اور دوسرا اندرونی دشمن یعنی گناہ کی خواہش کے خلاف جہادِ اکبر کرتا ہے۔

8۔ ایک حدیث میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"اِنْ صَبَرْتَ اَدْرَكْتَ بِصَبْرِكَ مَنَازِلَ الْاَبْرَارِ،وَاِنْ جَزِعْتَ اَوْرَدَكَ جَزَعُكَ عَذَابَ النَّارِ"۔(شرح غرر الحکم،حدیث:3713)

''اگر تم صبر کرو تو اپنے صبر کی بدولت ابرار (نیک لوگوں) کے درجات پالو گے اور اگر بے صبری کرو گے تو تمہاری بے صبری تمہیں جہنم میں لے جائے گی''۔

9۔ زندگی کے تلخ حوادث اور مصائب پر صبر کے بارے میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"مَنِ ابْتُلِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِبَلَاءٍ فَصَبَرَ عَلَيْهِ كَانَّ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ اَلْفِ شَهِيْدٍ"۔

''جو مومن کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو اس کیلئے ایک ہزار شہیدوں کا اجر ہے''۔(اصولِ کافی،92:2)

علامہ مجلسیؒ بحار الانوار کی جلد 68 میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد اس سوال کو زیر بحث لاتے ہیں کہ یہ اجر کس طرح ممکن ہے، حالانکہ شہید خود بھی صابرین میں سے ہوتا ہے اور صبر ہی کی بدولت دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت دکھاتا ہے، یہاں تک جامِ شہادت نوش کر جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ شہید دشمن کے حملوں کے مقابلے میں صبر کرتا ہے جبکہ صابرین زندگی کے تلخ حوادث مثلاً بیماریوں، ناکامیوں اور عزیز و اقارب کی موت وغیرہ پر صبر کرتے ہیں۔شہید کی نسبت ان کے اجر کی برتری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شہید ایک بار شہید ہوتا ہے جبکہ زندگی کے دکھ اور مصائب بار بار حملہ آور ہوتے ہیں۔

10۔ صبر کرنے والوں کے معنوی و رُوحانی ثواب کے بارے میں ایک حدیث میں جنابِ رسولِؐ خدا نے فرمایا:

"مَنِ ابْتُلِيَ فَصَبَرَ وَاُعْطِيَ فَشَكَرَ وَظُلِمَ فَغَفَرَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ"۔(مجمع الانوار،526:2)

''جن لوگوں پر آزمائش آئے اور وہ صبر کریں اور انہیں نعمت عطا ہو اور وہ شکر کریں اور ان پر ظلم ہو اور وہ معاف

کریں تو ان کیلئے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

11۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلصَّبْرُ یُظْهِرُ مَافِیْ بَوَاطِنِ الْعِبَادِ مِنَ النُّوْرِ وَالصَّفَاءِ وَالْجَزَعُ یُظْهِرَ مَافِیْ بَوَاطِنِهِمْ مِنَ الظُّلْمَةِ وَالْوَحْشَةِ"۔(بحار الانوار،90:68)

''صبر بندوں کے اندر کے نور اور پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے جبکہ بے صبری ان کے اندر اندھیرے اور وحشت کو آشکار کرتی ہے''۔

12۔ صبر کے بارے میں احادیث کو امیر المومنینؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اَلصَّبْرُ مَطِیَّةٌ لَاتَکْبُوْا وَالْقَنَاعَةُ سَیْفٌ لَایَنْبُوْا"۔ (بحار الانوار، 96:68)

''صبر ایک ایسی سواری ہے جو کبھی نہیں گرتی اور قناعت ایسی تلوار ہے جو کبھی کند نہیں ہوتی''۔

صبر کے اثرات اور نتائج

گزشتہ مباحث میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیوی زندگی کی طبیعت اور مزاج ہی یہ ہے کہ یہ مشکلات ،رکاوٹوں اور آفات کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اوامر و نواہی کی پابندی میں انسان ایسی رکاوٹوں سے روبرو ہوتا ہے کہ اگر وہ انہیں عبور نہ کرے تو اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے علاوہ آفات و مشکلات نعمتوں کی تاک میں رہتی ہیں تا کہ انہیں برباد کر دیں۔ یہ آفات و مشکلات اموال و انفس کے نقصان اور عزیزوں، دوستوں اور دیگر نعمتوں کی جدائی اور زوال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہیں۔

صبر کے بغیر انسان مثبت سمت میں حرکت کر سکتا ہے نہ مشکلات و موانع کے مقابلے میں قدم رہ سکتا ہے۔ اسی لئے صبر و استقامت کو کامیابی کی اصل کنجی قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ دین اوامر و نواہی کا مجموعہ ہے اور اطاعت کی انجام دہی اور معاصی سے اجتناب صبر و استقامت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لئے صبر اور ایمان کا وہی رشتہ بیان کیا گیا ہے جو سر اور بدن کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث میں، جیسا کہ حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں صبر کو ہی کامیابی قرار دیا گیا ہے:

"اَلصَّبْرُ الظَّفَرُ"۔(غرر الحکم، حدیث:213)

''صبر ہی کامیابی ہے''۔

قرآنی آیات میں بھی صبر کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی کامیابی کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔

﴿۰ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا

مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

''اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دوسو کافروں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے''۔(انفال۔65)

یہ صبر ہی کی قوت ہے جو ایک انسان کو دس دُشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت فراہم کرتی ہے۔ کمزور ارادے کے مالک، کم حوصلہ اور بے صبر افراد جلد ہی حوادث کے میدان سے بھاگ جاتے ہیں یا مشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ صبر واستقامت کے بغیر انسان کو دنیا ملتی ہے نہ آخرت۔ یہی وجہ ہے کہ جن اقوام میں صبر واستقامت کا عنصر پایا جاتا ہے، وہی اقوام دُنیا میں ترقی کرتی ہیں۔

بڑے علماً اور موجدوں اور سائنس دانوں میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے اور وہ صبر ہے جو ان کی دیگر خصوصیات کے مقابلہ میں زیادہ درخشاں اور نمایاں ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک سائنس دان کو سالہا سال تک کتب خانوں اور لیبارٹری میں محنت کرنا پڑتی ہے، پھر کہیں جا کر کسی سائنسی قانون کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"مَنْ رَكِبَ مَرَاكِبَ الصَّبْرِ اهْتُدِيَ اِلٰى مَيْدَانِ النَّصرِ"۔

''جو شخص صبر کی سواری پر سوار ہوتا ہے، کامیابی کے میدان میں قدم رکھتا ہے''۔(کنز الفوائد:58)

ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

"مِفْتَاحُ الظَّفَرِ لُزُوْمِ الصَّبْرِ"۔(غرر الحکم، حدیث:9809)

''صبر پر کاربند رہنا ہی کامیابی کی کنجی ہے''۔

اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ حقیقت بھی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ جن لوگوں میں صبر اور استقامت کی کمی ہوتی ہے، وہ جلدی گناہ سے آلودہ ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ میں انسان کے سرکش نفس کیلئے بڑی کشش ہوتی ہے۔ اگر اس کشش کے مقابلہ میں انسان کے اندر صبر واستقامت کی مناسب قوت نہ پائی جاتی ہو تو گناہ کی اس کشش کا مقابلہ انسان کیلئے ممکن نہیں ہوتا۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"كَمْ مِنْ صَبْرِ سَاعَةٍ قَدْاَوْرَثَتْ فَرَحًاطَوِيْلاً وَكَمْ مِنْ لَذَّةِ سَاعَةٍ قَد اَوْرَثَتْ حُزْنًا طَوِيْلًا۔"(بحار الانوار، 45:68)

''اکثر اوقات گھڑی بھر کا صبر انسان کو ایک طویل راحت سے ہمکنار کر دیتا ہے اور اکثر اوقات گھڑی بھر کی لذت انسان کو ایک طویل غم واندوہ سے دوچار کر دیتی ہے''۔

ممکن ہے انسان کو زندگی کے مختلف مراحل میں مادی اور معنوی نقصانات کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہوتا کہ سارے دوست، عزیز اور رشتہ دار اکٹھے پیدا ہوں اور اکٹھے مر جائیں۔ بعض کی موت پہلے آجاتی ہے۔ اس طرح مرنے والے اپنے پسماندہ گان کو فرقت اور جدائی کا صدمہ دے جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر پسماندگان میں صبر نہ ہو تو بہت جلد زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر بیمار ہو جاتے ہیں۔ زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔

لیکن اگر انسان میں صبر ہو تو ان تمام تلخ حوادث کے باوجود انسان کے دل اور اس کی روح میں زندہ رہنے کی آرزو تازہ رہتی ہے۔ اس سے پہلے ہم ایک حدیث میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے صابر کے اجر کو شہید کے اجر کا ہزار گنا قرار دیا ہے۔

مختصر یہ کہ صبر کی اہمیت اور زندگی میں اس کے کردار کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے، کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا احادیث میں صبر کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اسے مبالغہ نہیں سمجھنا چاہئے۔

"اَنَّهُ مَنْ صَبَرَنَا بِصَبْرِهٖ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ، وَدَرَجَةَ الشَّهِيْدِ الَّذِیْ ضَرَبَ بِسَفِيْنِهٖ قُدَّامَ مُحَمَّدٍ ﷺ"۔ (وسائل الشيعه، 209:11)

''جو شخص صبر کرے، وہ اپنے صبر کی بدولت شب بیداری کرنے والے روزہ اور اس شہید کے درجہ کو پالیتا ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تلوار سے جہاد کیا ہو''۔

صبر کی شاخیں

علمائے اخلاق اور بزرگانِ دین کی اکثر تحریروں اور تقریروں میں صبر کو تین شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔ اطاعت پر صبر 2۔ گناہ پر صبر 3۔ مصیبت پر صبر

اطاعت پر صبر سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے جو مشکلات پیش آئیں، صبر و استقامت سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، خمس اور مستحب عبادات میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر کرنے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

گناہ پر صبر سے مراد یہ ہے کہ انسان خواہشاتِ نفسانی کے ہیجان سے پیدا ہونے والے شہوت کے سرکش شعلوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لے۔ اگر انسان ایسا نہ کرے تو شہوت کے یہ شعلے ایمان، تقویٰ اور باطنی پاکیزگی کے سارے سرمائے کو جلا کر راکھ کر دیں۔

مصیبت پر صبر سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں انسان کو جو مالی اور معنوی نقصانات، عزیزوں اور دوستوں کی موت اور دیگر حوادث و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان تمام مراحل اور مصیبتوں میں انسان صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

علمائے اخلاق نے صبر کی اقسام احادیث کی بنیاد پر بنائی ہیں، مثلاً جنابِ رسولِ خدا کی ایک حدیث میں نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اَلصَّبْرُ ثَلَاثَةٌ، صَبْرٌ عَلَى الْمُصِيْبَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الطَّاعَةِ وَصَبْرٌ عَلَى الْمَعْصِيَةِ فَمَنْ صَبَرَ عَلَى الْمُصِيْبَةِ حَتّٰى يَرُدَّهَا بِحُسْنِ عَزَائِهَا، كَتَبَ اللهُ لَهٗ ثَلَاثَ مِأَةَّ دَرَجَةٍ كَمَابَيْنَ السَّمٰاءِ اِلَى الْاَرْضِ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الطَّاعَةِ كَتَبَ اللهُ لَهٗ سِتَّ مِأَةٍ دَرَجَةٍ، مَابَيْنَ الدَّرَجَةِ اِلَى الدَّرَجَةِ كَمَابَيْنَ تُخُوْمُ الْاَرْضِ اِلَى الْعَرْشِ وَمَنْ صَبَرَ عَلَى الْمَعْصِيَةِ كَتَبَ اللهُ لَهٗ تِسْعَ مِأَةٍ دَرَجَةٍ مَابَيْنَ الدَّرَجَةِ كَمَابَيْنَ تُخُوْمِ الْاَرْضِ اِلٰى مُنْتَهَى الْعَرْشِ"۔

''صبر کی تین اقسام ہیں: مصیبت پر صبر، جو شخص کسی مصیبت پر صبر کرے اور صبر جمیل کے ساتھ مصیبت کو برداشت کرے، اللہ اسکے لیے تین سو درجات لکھ دے گا جن میں سے ہر درجے کے درمیان زمین اور آسمان جتنا فاصلہ ہے۔ جو شخص اطاعت پر صبر کرے، اللہ اس کیلئے چھ سو درجات لکھ دے گا جن میں سے ہر درجے کا دوسرے سے اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین اور عرش کے درمیان فاصلہ ہے۔ جو شخص گناہ پر صبر کرے گا، اللہ اس کیلئے نو سو درجات لکھ دے گا جن میں سے ہر درجے کا دوسرے درجے سے اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین سے عرش کے درمیان فاصلہ ہے''۔(بحارالانوار، 77:68)

اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ گناہ کے خلاف صبر کرنا سب سے افضل ہے۔ اطاعت پر صبر کا درجہ دوسرا اور مصیبت پر صبر کا درجہ تیسرا ہے۔

حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں ایمان کو چار شعبوں میں تقسیم کرکے فرمایا، جن میں سے پہلا شعبہ صبر ہے، اس کے بعد یقین، عقل اور جہاد کو بالترتیب دُوسرا، تیسرا اور چوتھا شعبہ قرار دینے کے بعد فرمایا:

"وَالصَّبْرُ مِنْهَا عَلٰى اَرْبَعَ شُعَبٍ، عَلَى الشَّوْقِ وَالشَّفَقِ وَالزُّهْدِ وَالتَّرَقُّبِ"

''اور صبر کے بھی چار شعبے ہیں: شوق، خوف، زہد اور انتظار''۔(نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، حدیث:31)

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو شخص جنت کا شوق رکھتا ہو، شہوت اور خواہشاتِ نفسانی سے دُور رہتا ہے۔ جو شخص جہنم سے ڈرتا ہے، حرام کاموں سے پرہیز کرتا ہے، جو شخص زاہد ہو، وہ نیکی کے کاموں میں سرعت کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس ارشادِ گرامی میں حضرت علی علیہ السلام نے صبر واستقامت کے محرکات کو بیان فرمایا ہے۔ ایسی ہی ایک حدیث جنابِ رسولِ خدا سے بھی نقل کی گئی ہے۔

صبر واستقامت کے محرکات

اطاعت میں پیش آنے والی مشکلات، ترکِ گناہ اور مصائب پر صبر کے بہت سے محرکات ہو سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنی مخصوص تاثیر ہے جو انسان کے اندر اس عظیم فضیلت کے پیدا ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

ان میں سے چند اہم محرکات یہ ہیں:

1۔ ایمان اور یقین کی بنیادوں کو مضبوط کرنا، خصوصاً اس نکتے پر توجہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے جو ہر ایک سے بڑھ کر اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں کی بہتری اور ان کی مصلحت کیلئے ان کی زندگی میں حوادث اور مشکلات پیدا کرتا ہے جن کا فائدہ عام طور پر پوشیدہ ہوتا ہے اور انسان کے اندر صبر وشکیبائی کی پرورش کرتا ہے۔ اگر انسان اللہ کے فرمانبردار بندوں، گناہوں سے دوری اختیار کرنے والوں اور مصائب ومشکلات پر صبر کرنے والوں کے اجر وثواب پر توجہ رکھے تو اس سے بھی انسان کے اندر صبر واستقامت کی رُوح مزید پختہ ہوتی ہے۔

اس بات کے پیش نظر امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"اَصْلُ الصَّبْرِ حُسْنُ الْیَقِیْنِ بِاللّٰہِ"

''صبر کی بنیاد اللہ تعالیٰ پر حسنِ یقین ہے''۔ (غرر الحکم، حدیث: 3082)

ظاہری بات ہے کہ جس قدر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حکمت پر انسان کا ایمان پختہ ہوگا، اس کا صبر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس نکتے کے پیش نظر اپنے بعض اصحاب سے فرمایا:

"اِنَّا صُبَّرٌ وَشِیْعَتُنَا اَصْبَرُ مِنَّا"۔

''ہم بڑے حوصلے والے ہیں اور ہمارے شیعہ ہم سے بھی بڑے صبر والے ہیں''۔

امام علیہ السلام نے مزید فرمایا:

"لِاَنَّا نَصْبِرُ عَلٰی مَا نَعْلَمُ وَشِیْعَتُنَا یَصْبِرُوْنَ عَلٰی مَا لَا یَعْلَمُوْنَ"۔

''اس لئے کہ ہم جن باتوں پر صبر کرتے ہیں، ہم ان کے اسرار سے آگاہ ہوتے ہیں جبکہ ہمارے شیعہ جن باتوں پر صبر کرتے ہیں، ان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہوتے''۔ (کافی، 2:93)

2۔ دیگر تمام اخلاقی فضائل کی طرح صبر بھی مشق اور مختلف قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

"مَنْ تَوَالَتْ عَلَیْہِ نَکَبَاتُ الزَّمَانِ اَکْسَبَتْہُ فَضِیْلَۃُ الصَّبْرِ"۔ (غرر الحکم: 9144)

''جس شخص پر پے در پے حوادث نازل ہوتے ہیں، اسے صبر کی فضیلت حاصل ہوتی ہے''۔

بالفاظِ دیگر جب انسان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو ابتدأ میں آہ وفغاں اور نالہ وفریاد کرتا ہے۔اسی طرح جب وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کی طرف آتا ہے تو ابتدأ میں جلدی تھک جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ انسان کے اندر صبر کی فضیلت ایک پختہ عادت بن جاتی ہے۔

3۔ اس بات پر توجہ رکھنا کہ دُنیا حوادث اور مشکلات کا گھر ہے، یہاں کسی بھی مادی اور معنوی نعمت کا حصول رکاوٹوں اور مشکلات کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ کہ کم ہمت اور صبر وحوصلہ سے محروم افراد اس دُنیا میں کوئی مقام اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔اگر انسان ان باتوں کی طرف توجہ رکھے تو لامحالہ اُس کے اندر ایک ایسا عزم وارادہ پیدا ہوجائے گا جو مشکلات وحوادث کا مقابلہ کرنے کیلئے اس کے اندر صبر واستقامت کو مزید مستحکم اور پختہ کردے گا۔

اس دُنیا میں ایک پھول حاصل کرنے کیلئے کانٹوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ایک گھونٹ شہد حاصل کرنے کیلئے شہد کی مکھی کے ڈنگ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔قدرتی خزانے نکالنے کیلئے صحراؤں اور پہاڑوں کو کھودنا پڑتا ہے۔اسی طرح جنت کے حصول کے لئے سخت، ناخوشگوار اور کٹھن حالات وواقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی شخص ان باتوں پر غور کرے تو یقیناً اس میں صبر واستقامت حاصل کرنے کی استعداد اور مزید پختہ ہوجائے گی۔اسی لئے حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''لِكُلِّ نِعْمَةٍ مِفْتَاحٌ وَمِغْلَاقٌ وَمِفْتَاحُهَا الصَّبْرُ وَمِغْلَاقُهَا الْكَسَلُ''۔

''ہر نعمت کیلئے ایک تالا اور کنجی ہے۔کنجی صبر اور تالا سستی وکاہلی ہے''۔(شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید،322:20)

4۔ صبر کے محرکات وعوامل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان صابرین کے ساتھ مشابہت اور مماثلت پیدا کرے۔ یہ مسئلہ تمام اخلاقی فضائل میں مشترک ہے کہ اگر انسان کسی صفت سے آراستہ نہ ہو تو بظاہر ایسا رویہ اختیار کرے گا کہ گویا یہ صفت اس میں موجود ہے۔ایسا کرنے سے بتدریج یہ صفت انسان کے اندر پیدا ہوجائے گی۔جنابِ رسولِؐ خدا کی ایک حدیث میں ہے:

''مَنْ يَّتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يَعُفَّهُ اللهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ وَمَا أُعْطِيَ عَبْدٌ عَطَاءً هُوَ خَيْرٌ وَاَوْسَعُ مِنَ الصَّبْرِ''۔(میزان الحکمہ، 10128:2)

''جو شخص صابروں جیسی مماثلت بنالے، اللہ تعالیٰ اسکے اندر صبر کی روح پیدا کردیتا ہے، جو شخص پاک دامن افراد کی مماثلت اختیار کرلے، اللہ تعالیٰ اسے پاکدامنی کی زینت عطا فرمادیتا ہے، جو شخص غنی ہونے کا مظاہرہ کرے، اللہ اسے غنی کردیتا ہے اور کسی بھی شخص کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی ہے''۔

5۔ صبر کا انسان کے وجود کے ظرف کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔جس قدر انسان کا ظرف وسیع ہوگا، اُتنا ہی اس کا صبر زیادہ ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ بچوں اور بوڑھوں میں صبر کم ہوتا ہے لیکن جن افراد کا ظرف وسیع ہوتا ہے، وہ حوادث اور مشکلات کے سامنے اپنے ماتھے پر ذرا سی شکن بھی نہیں آنے دیتے۔بڑی شخصیات خصوصاً انبیاؑ اور اولیائے الٰہی، جو صبر کی بدولت اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے، ان کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ بھی ایک اہم عامل اور محرک کا کردار ادا کرسکتا ہے۔

مشکلات کے سامنے صبر واستقامت دکھانا صرف ایک اخلاقی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا انسان کی صحت اور سلامتی کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔جن لوگوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے، وہ دل اور اعصاب کی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں جبکہ صبر کی دولت سے مالا مال افراد صحت وسلامتی کے ساتھ طویل عمر پاتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے مذہب کو انسان کی جسمانی اور نفسیانی صحت کا ایک اہم سبب قرار دیا ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مذہب انسان کو صبر واستقامت کی دولت عطا کرتا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"مَنْ اَحَبَّ الْبَقَاءَ فَلْيُعِدَّ لِلْمَصَائِبِ قَلْبًا صَبُوْرًا"۔

''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر طویل ہو تو اسے چاہئے کہ مصائب کے مقابلے کیلئے صبر کرنے والا دل پیدا کرے''۔(بحارالانوار، 81:75)

جزع وبیتابی:۔

جزع صبر کی ضد ہے یعنی بے صبری۔اس سے مراد وہ حالت ہے جس میں انسان حوادث اور مشکلات کے سامنے ہمت ہار جاتا ہے، مایوس ہوجاتا ہے، بیتابی کرتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کوشش اور جدوجہد ترک کردیتا ہے۔

جزع بدترین اور مذموم ترین صفت ہے جو دُنیا اور آخرت میں انسان کو ذِلت اور بدبختی سے دوچار کرتی ہے اور انسان کو بلند مقامات تک پہنچنے سے روک دیتی ہے۔اس صفت کی بدولت معاشرے میں انسان کی عزت بھی جاتی رہتی ہے اور اس کی زندگی بھی تلخ ہوجاتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس صفت کے حوالے سے انسان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا"۔

''انسان تھوڑے دل والا پیدا کیا گیا ہے۔جب اُسے کوئی برائی پیش آتی ہے تو بے صبری کرتا ہے اور جب کوئی خیر اور بھلائی نصیب ہوتی ہے تو سخت بخل سے کام لیتا ہے''(معارج:19 تا 21)

ان آیات میں جن انسانوں کی مذمت کی جارہی ہے، وہ غیر تربیت یافتہ انسان ہیں لیکن جن لوگوں کی ایمان تربیت ہوجاتی

ہے، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا آگے چل کر فرمایا گیا:

"اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۔ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔

''سوائے نماز پڑھنے والوں کے جو اپنی نماز کا التزام رکھتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کیلئے ایک حصہ مقرر ہے اور جو لوگ روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک ان کے پروردگار کے عذاب سے بے خوف نہ ہونا چاہئے اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی اپنی بیویوں اور اپنی لونڈیوں کے سوا اوروں سے حفاظت کرتے ہیں تو ان لوگوں کی ہرگز ملامت نہیں کی جائے گی۔ تو جو ان کے سوا اور کے خواستگار ہوں تو یہی لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہیں اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں اور جو لوگ اپنی نمازوں کا خیال رکھتے ہیں''۔ (معارج: 22 تا 34)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ وہ باایمان افراد جو نماز کا اہتمام کرتے ہیں، ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں، اپنی زندگی عفت اور پاکدامنی کے ساتھ گزارتے ہیں، امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں، انہیں ''ھلوع'' کے دائرے سے نکال دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عموماً صبر واستقامت سے محروم لوگ بخیل بھی ہوتے ہیں، جس طرح کہ بخیل، بے صبر بھی ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر بخل اور جزع کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لئے ان دونوں کو ''ھلوع'' میں جمع کر دیا گیا ہے۔

احادیث میں بھی اس سلسلہ میں قابلِ توجہ اور عمیق مطالب ونکات بیان کئے گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں نقل کی جاتی ہیں:

1۔ حضرت علیؑ نے جزع کی مذمت میں فرمایا:

"اِيَّاكَ وَالْجَزَعَ فَاِنَّهُ يَقْطَعُ الْاَمَلَ وَيُضَعِّفُ الْعَمَلَ وَيُوْرِثُ الْهَمَّ"۔

''جزع اور بے صبری سے پرہیز کرو، اس لئے کہ یہ انسان کی امید کو منقطع کر دیتی ہے، کوشش اور عمل کو ضعیف کر دیتی ہے اور غم واندوہ کا سبب ہوتی ہے''۔ (بحار الانوار، 144:79)

2۔ ایک اور ارشادِ گرامی میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْجَزَعُ وَاَتْعَبُ مِنَ الصَّبْرِ"۔ (بحار الانوار، 131:79)

''جزع صبر سے زیادہ تکلیف دہ ہے''۔

اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ جزع، بے صبری اور بیتابی کسی بھی مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ انسان کی روح اور جسم کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے صبر سے زیادہ تکلیف دہ قرار دیا گیا ہے مثلاً اگر کسی انسان کا کوئی عزیز فوت ہو جائے اور وہ صبر کی بجائے جزع کی راہ پر چل پڑے، کبھی اپنا سر دیوار سے مارے، گریبان پھاڑ دے، آہ وفغاں کرے یا خودکشی کر لے تو ان سب کاموں میں سے کوئی بھی اس کے فوت شدہ عزیز کو تو زندہ نہیں کر سکتا لیکن اس کی اپنی جسمانی، نفسیاتی اور روحانی صحت ضرور متاثر ہوگی۔ مزید برآں اس کے یہ سارے کام اسے صبر کے اجر وثواب سے بھی محروم کر دیں گے۔ یہ بات اگلی حدیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔

3۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْجَزَعُ لَا يَدْفَعُ الْقَدَرَ وَلٰكِنْ يُحْبِطُ الْاَجْرَ"۔ (غرر الحکم، حدیث: 1876)

''جزع تقدیر کو تو نہیں ٹال سکتی لیکن انسان کے اجر کو برباد کر دیتی ہے''۔

ظاہر سی بات ہے کہ جزع اور بے صبری اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جزع کرنے والا انسان اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہے اور اس کی تقدیر کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت پر اعتراض کر رہا ہوتا ہے، خواہ خود اسے اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔

4۔ ایک حدیث میں حضرت امام تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْمُصِيْبَةُ لِلصَّابِرِ وَاحِدَةٌ وَلِلْجَازِعِ اَثْنَانِ"۔ (بحار الانوار، 124:79)

''صبر کرنے والے کی ایک مصیبت ہوتی ہے جبکہ جزع کرنے والے کیلئے دو مصیبتیں ہوتی ہیں''۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جزع اور بے صبری بہت سی جسمانی، نفسیاتی اور رُوحانی تکالیف ساتھ لاتی ہے اور انسان کے اجر وثواب کو بھی برباد کر دیتی ہے۔ اسی طرح جزع کرنے والے افراد کی مصیبت دوگنا ہو جاتی ہے۔

5۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصائح کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَا تَجْعَلُوْا قُلُوْبَكُمْ مَأْوًى لِلشَّهَوَاتِ اِنَّ اَجْزَعَكُمْ عَلُمْ عِنْدَ الْبَلَاءِ لَا شَدَّكُمْ حُبًّا لِلدُّنْيَا اِنَّ اَصْبَرَ كُمْ عَلَى الْبَلَاءِ لَازْهَدُ كُمْ فِي الدُّنْيَا"۔ (بحار، 106:1)

''اپنے دِلوں کوشہوات کی پناہ گاہ میں نہ رکھو۔تم میں سے مصیبتوں پر زیادہ جزع وہی کرتا ہے جو دُنیا سے زیادہ محبت کرتا ہےاورتم میں سے مصیبتوں پر زیادہ صبروہی کرتا ہے جو دُنیا سے زیادہ بے رغبتی برتتا ہے''۔

اس روایت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ جزع کا بنیادی سبب حرص اور حُبِ دُنیا ہے۔جزع کو کم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ حرص اور حُبِ دُنیا کو کم کیا جائے۔

6۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جنابِ رسولِؐ خدا نے ملک الموت سے فرمایا:اس کی رُوح پیار سے قبض کرو،اس لئے کہ یہ مومن ہے۔

ملک الموت نے جواب دیا:میں ہر مومن کی روح پیار سے قبض کرتا ہوں۔جب اس کے گھر والے جزع اور بیتابی کرتے ہیں تو میں گھر کے ایک کونے میں کھڑا ہوکر کہتا ہوں۔کیا میں نے اس کی عمر پوری ہونے سے پہلے اس کی رُوح قبض کرلی ہے؟ میں نے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی ہوئی ذمہ داری پوری کی ہے،میرا کیا قصور ہے؟(بحارالانوار،169:6)

7۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی ایک مختصر مگر پُرمعنی حدیث میں آیا ہے:

''مَنْ لَمْ يُنْجِهِ الصَّبْرُ اَهْلَكَهُ الْجَزَعُ''۔(بحار الانوار، 96:68)

''جس شخص کو صبر نجات نہ دے، بے صبری اسے ہلاک کردیتی ہے''۔

اس حدیث میں ہلاکت سے مراد دُنیا اور آخرت دونوں کی ہلاکت ہوسکتی ہے۔

8۔ ہم اس بحث کو جنابِ رسولِؐ خدا کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں ہے کہ آپؐ کے ایک صحابی کے بیٹے کا انتقال ہوگیا۔جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام ایک تعزیتی پیغام بھیجا جس میں آپؐ نے لکھوایا:

''اللہ تعالیٰ تمہارے اجر میں اضافہ فرمائے اور تمہیں صبر عطا فرمائیے۔۔۔۔''۔

خبردار! جزع اور بے صبری کے ذریعے اپنے اجر کو برباد نہ کردینا ورنہ قیامت کے دن اس مصیبت پر صبر کرنے کے ثواب سے محرومی پر پشیمان ہوگے۔اس بات کو جان لو کہ جزع اور بیتابی سے تمہارا بیٹا زندہ نہیں ہوجائے گا۔غم واندوہ اللہ کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتا۔لیکن یہ باتیں بیٹے کی موت کی مصیبت پر صبر کرنے کے اجر کو ضائع کردیں گی''۔(میزان الحکمہ ،1563:2)

محدث قمی نے ''سفینۃ البحار'' میں ''بوذر جمہر'' اور ''صبر و جزع'' کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جو تاریخ کی بعض کتب میں مذکور ہوا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایک بار نوشیرواں کسی بات پر بوذر جمہر سے ناراض ہوگیا اور اس کو ایک تاریک کمرے میں قید کرنے کا حکم دے دیا۔چند روز کے بعد نوشیرواں نے کسی کو اس کا حال معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔اس شخص نے بوذر جمہر کو خوشحال اور مطمئن دیکھ کر اس سے پوچھا کہ اس سختی میں اس قدر مطمئن کیونکر ہو؟

بوذر نے جواب دیا کہ میں ہر روز ایک معجون استعمال کرتا ہوں جو چھ چیزوں سے مل کر بنی ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ میں

خوشحال اور مطمئن ہوں۔

نوشیرواں کے نمائندے نے پوچھا: وہ معجون اور وہ چھ اجزا کیا ہیں؟

بوذرجمہر ے نے جواب دیا:

1۔ اللہ پر توکل

2۔ جو کچھ تقدیر میں ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ جزع اور بے صبری کسی مسئلے کو حل نہیں کرتی۔

3۔ صبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائشوں میں انسان کا سب سے بڑا مددگار ہے۔

4۔ اگر صبر نہ کروں تو کیا جزع کر کے خود کو ہلاک کر دوں!

5۔ اس وقت میں جس مصیبت میں گرفتار ہوں، اس سے بڑی مصیبت بھی ممکن ہے۔ اللہ کا شکر کہ میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں۔

6۔ ساعت بہ ساعت مصیبت سے رہائی ملتی ہے۔

جب اس کی یہ بات نوشرواں تک پہنچی تو اس نے اسے آزاد کر دیا اور اس کا احترام کرنا شروع کر دیا۔

جزع اور بے صبری کا علاج

دوسری بہت سے بیماریوں کی طرح اس باطنی بیماری کے علاج کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

1۔ بیماری کی تشخیص اور بہترین طریقۂ علاج تجویز کرنا:۔

جب ایک روحانی طبیب اس بیماری کی علامات (منہ اور سر پیٹنا، انگلیاں چبانا، آہ وفغاں کرنا، بداخلاقی سے پیش آنا، دوسروں کے ساتھ درشت رویہ رکھنا، بیوی بچوں کے ساتھ برا سلوک کرنا یا کم از کم اپنی زبان سے حالات کا شکوہ کرنا) کی موجودگی سے اس بیماری کی تشخیص کرتا ہے تو اس کا علاج کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کا علاج کرتا ہے۔

2۔ جزع کے منحوس نتائج کی یاد آوری:۔

جزع اور بتیابی کے برے اور منحوس اثرات ونتائج کی یاد آوری اس رُوحانی بیماری کے علاج میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو جزع و بے صبری کے ان اثرات سے بچنے کا خواہش مند نہ ہو جن کی کچھ تفصیل گزشتہ سطور میں بیان ہو چکی ہے۔ ان اثرات ونتائج کو انسان جس قدر دقتِ نظر سے دیکھے گا، بتدریج صبر کی صفت اس کے اندر

پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

3۔صابرین کے اجر کے بارے میں آیات واحادیث کا مطالعہ:۔

انسان کے اندر صبر کی رُوح کو پختہ کرنے اور جزع کی حالت کو دُور کرنے کیلئے ان آیات واحادیث کا مطالعہ بہت گہرا اثر رکھتا ہے جن میں صبر کرنے والوں کے اجروثواب کا ذکر کیا گیا ہے، خصوصاً یہ آیۂ شریفہ:

"وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ"۔

''اور بشارت دے دوان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کیلئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ان پر ان کے رب کی طرف سے صلوات اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں''۔

اس آیت میں ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' (یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں) کی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ان میں سے ایک تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوچکی ہے اور وہ یہ کہ صبر کرنے والے مشکل حالات میں دوسروں کی نسبت جلدی حالات کا صحیح حل تلاش کر لیتے ہیں اور مشکلات سے نکلنے کی راہیں ان پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ جزع اور بے صبری کا اصل سبب ''ضعفِ نفس'' ہے۔انسان جس قدر ضعیف النفس ہوگا، اس قدر جزع اور بے صبری اس میں زیادہ ہوگی۔اسکے برعکس انسان جس قدر اپنی نفسیاتی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گا، اسی قدر جزع و بے صبری کی حالت سے دور ہوتا جائے گا۔

4۔انبیاؑ واولیاؑ کے حالات کا مطالعہ:۔

جزع کی بیماری کا علاج کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ انسان انبیاؑ واولیاؑ اور بزرگانِ دین کے حالات، خصوصاً مشکلات کے مقابلے میں ان کے صبر واستقامت کے واقعات کا مطالعہ کرے۔ان باتوں کی یادآوری انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ انسان کو مشکلات کے مقابلہ میں جزع اور بیتابی نہیں کرنی چاہئے۔

5۔تلقین بہ نفس:۔

ہمیں اس نکتے کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ تلقین، خواہ اپنی طرف سے ہو، خواہ دوسروں کی طرف سے، نفس انسانی سے ناپسندیدہ صفات کا خاتمہ کرنے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔اگر صبر واستقامت سے محروم افراد ہر روز اپنے آپ کو صبر کی تلقین کریں اور ان کے اردگرد رہنے والے افراد بھی تلقین صبر میں کوتاہی نہ کریں تو یقیناً ان میں صبر کے آثار ظاہر ہونے لگیں گے۔

ہم اب بحث کو حضرت امام زین العابدینؑ کی ایک دعا پر ختم کرتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ یَوْمِیْ ھٰذَا صَلَاحًا وَاَوْسَطَہٗ فَلَاحًا وَآخِرَہٗ نَجَاحًا اَعُوْذُبِکَ مِنْ یَوْمٍ اَوَّلُہٗ فَزَعٌ وَاَوْسَطُہٗ جَزَعٌ وَآخِرُہٗ وَجَعٌ"۔

''یا اللہ! میرے اس دن کے آغاز کو صلاح، درمیان کو فلاح اور آخر کو کامیابی قرار دے۔ میں اس دن سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کا آغاز فرع (بیتابی)، درمیان جزع اور آخر رنج والم ہو۔''

اس دعا سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جزع وفزع کا نتیجہ رنج والم ہوتا ہے۔

جزع اور معقول جذبات کے درمیان فرق

انسان کا دل جذبات اور احساسات کا مرکز ہے۔ اگر انسان کے کسی عزیز کی موت واقع ہوجائے تو اسے دکھ ہوتا ہے اور اشک اس کی آنکھوں سے جاری ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان جذبات کا اظہار جزع وفزع سے بالکل مختلف چیز ہے۔ انسان کا دل مختلف حالات وواقعات سے متاثر ہوتا ہے اور چونکہ انسان کی آنکھ اس کے دل کا دریچہ ہے، لہٰذا عین ممکن ہے کہ آنکھ قلبی کیفیات سے متاثر ہوجائے۔

بنابرایں کسی عزیز کی موت پر رونا یا غمگین ہونا ایک قدرتی سی بات ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایسے حالات میں انسان کی زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکلے جو ناشکری اور شکوہ کی غمازی کرتی ہو۔ انسان کی زبان پر ایسی کوئی بات نہیں آنی چاہئے جو ایک فرمانبردار بندے کے شایانِ شان نہیں ہے۔ گریبان چاک کرنے اور منہ سر پیٹنے سے اجتناب کرے۔ اس سلسلہ میں جناب رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

"لَیْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُیُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَی الْجَاھِلِیَّۃِ"۔

''جو شخص اپنے گالوں پر طمانچے مارے، گریبان چاک کرے یا زمانہ جاہلیت کی باتیں زبان پر لائے، وہ ہم سے نہیں ہے''۔ (امالی الطوسی: 388)

جنابِ رسولِ خدا کے حالاتِ زندگی میں ہے کہ جب آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپؐ اس طرح روئے کہ اشکوں کا ایک سیلاب آپؐ کی آنکھوں سے نکل کر آپؐ کے سینے پر بہنے لگا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! آپ ہمیں رونے سے منع فرماتے ہیں لیکن خود رو رہے ہیں؟''

آپؐ نے فرمایا:

"لَیْسَ ھٰذَا بُکَاءً وَاِنَّ ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ وَمَنْ لَمْ یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ"۔

''یہ رونا نہیں ہے، یہ محبت اور رحمت کا اظہار ہے۔ جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا''۔

یہی واقعہ بحار الانوار میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان ہوا ہے:

''جب جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی آخری سانسیں چل رہی تھیں، حضورؐ نے انہیں اپنی گود میں لیا اور کہنے لگے: اے میرے بیٹے! اللہ کی تقدیر کے سامنے میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا'۔

یہ کہتے ہی آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبدالرحمٰن ابن عوف وہاں موجود تھے۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپؐ رو رہے ہیں؟ کیا آپؐ نے ہمیں رونے سے منع نہیں فرمایا؟

آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: ''میں نے تمہیں زمانہ جاہلیت کی نوحہ گری اور دو احمقانہ اور جاخرانہ آوازوں سے منع کیا ہے: ایک نعمت کے وقت لہو ولعب اور شیطانی دُھنوں سے آراستہ آواز اور دوسری مصیبت کے وقت منہ نوچنا، گریبان چاک کرنا اور شیطانی نغمے۔ لیکن جو کچھ تم نے مجھ سے دیکھا ہے، وہ جذبہ اور محبت ہے۔ جو شخص جذبات نہ رکھتا ہو اور رحم نہ کرتا ہو، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا''۔

پھر آپؐ نے اپنے صاحبزادے جنابِ ابراہیم کو مخاطب کر کے فرمایا:

"وَاِنَّابِكَ لَمَحْزُوْنُوْنَ تَبْكِيَ الْعَيْنُ وَيَدْمَعُ الْقَلْطُ وَلَانَقُوْلُ مَايُسْخِطُ الرَّبَّ عَزَّوَجَلَّ"۔

''ہم تمہاری وجہ سے غمگین ہیں، آنکھ رو رہی ہے اور دل اشک بہا رہا ہے لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دے''۔ (بحار الانوار، 90:79)

بعض اوقات ممکن ہے کہ انسان آپے سے باہر ہو جائے، چیخے اور گریبان چاک کر دے یا یہ کہ اظہارِ بیتابی کرے اور پیٹنے لگے۔ اگر یہ سب کچھ ایک معقول حد کے اندر ہو اور اس کا مقصد دشمن کے خلاف قوم کے جذبات کو متحرک کرنا ہو تو یہ ضروری بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا استثنائی حالات کو، جو بعض بزرگوں کے حالات میں نظر آتے ہیں، ان کو عام ضابطے سے مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ ہم اس بحث کو جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اَلنِّيَاحَةُ عَمَلُ الْجَاهِلِيَّةُ"۔ (بحار الانوار، 130:79)

''نوحہ گری زمانہ جاہلیت کا عمل ہے''۔

یہاں نوحہ گری سے عزاداری، ذکرِ مصائب، رونا اور انفرادی یا اجتماعی عزاداری نہیں ہے بلکہ ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں عربوں میں رائج تھے۔ اگر ان کا کوئی عزیز مرجاتا تو پیشہ ور رونے والیوں کو بلایا جاتا تھا جو مصنوعی آہ وفغاں کے ساتھ مرنے والے کی ان خوبیوں کا مبالغہ آرائی کے ساتھ ذکر کرتی تھیں جو اس میں سرے سے پائی ہی نہیں جاتی تھیں۔ کبھی وہ اپنا گریبان چاک کر دیتی تھیں اور منہ اور سر پیٹتی تھیں اور ان بیہودہ اعمال سے سوگ کی محفل کی رونق میں اضافہ کرتی تھیں۔



علم الاخلاق

جلد سوم

مؤلف

حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ

مترجم

سید ظفر حسین نقوی (قم)

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب _____ علم الاخلاق

مؤلف _____ حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ

مترجم _____ سید ظفر حسین نقوی

تصحیح و نظر ثانی _____ مجاہد حسین حرؔ

کمپوزنگ _____ قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس کراچی 0345-2401125

ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور۔ پاکستان

تعداد _____ ایک ہزار (۱۰۰۰)

طبع _____ اوّل

قیمت _____ 500

ملنے کا پتہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

قرآن سینٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کرتی رہے گی۔

موجودہ کتاب ''علم الاخلاق'' اخلاق در قرآن (فارسی) کی تیسری جلد ہے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن ٹرسٹ ایک خود مختار ادارہ ہے اس کے بانی مرحوم حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ تھے انہوں نے اس ادارہ کا ایک الگ ٹرسٹ تشکیل دیا تھا جو اپنے اول دن سے اپنے اخراجات کا خود انتظام کرتا ہے۔

مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com
www.misbahulqurantrust.org
EMail Add:
misbahulqurantrust@hotmail.com, misbahulqurantrust@yahoo.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کی ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

القرآن:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

یہ آخرت کا گھر تو ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کر دیں گے جو روئے زمین پر نہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ فساد اور (پھر سچ بھی یوں ہے کہ) پھر انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

تقریظ

حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ شبیر میثمی

فرمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ مجھے اخلاقیات کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔

اخلاقیات کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے لیکن آج کے اس افراتفری کے دور میں اخلاقیات پر جس قدر کام کیا جائے کم ہے۔ ایک طرف لادینیت اور یورپی تہذیب کی یلغار ہے تو دوسری طرف مسلم ممالک کے سربراہان کی دین کی طرف کم توجہی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اخلاقیات پر بھرپور کام کیا جائے خاص کر معصومین علیہم السلام کے فرامین کو لوگوں میں زیادہ سے زیادہ بیان و رائج کیا جائے تاکہ معاشرہ اپنی صحیح راہ کی طرف گامزن ہو سکے۔ حضرت آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ لائق صد تحسین ہیں کہ انہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور انتہائی جامع اور خوبصورت انداز میں معاشرے کی اصلاح کے لئے ایک کتاب اخلاق در قرآن تین جلدوں میں مرتب کی۔

لائق تحسین ہیں مصباح القرآن کے کارکنان کہ جنہوں نے اس شعبہ کو بھی خالی نہیں چھوڑا اور حضرت آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ کی مرتب کردہ کتاب ''علم الاخلاق'' کو شائع کر رہے۔

خداوند عالم مصباح القرآن ٹرسٹ کے بانی حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید صفدر حسین نجفی نور اللہ مرقدہ کی روح کو جوار معصومین علیہم السلام میں جگہ عنایت فرمائے اور اس ادارے کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

طالب دعا
شبیر میثمی

حضرت خضر علیہ السلام کی نصیحت

إِيَّاكَ وَ اللَّجَاجَةَ أَوْ أَنْ تَمْشِيَ فِي غَيْرِ حَاجَةٍ أَوْ أَنْ تَضْحَكَ مِنْ غَيْرِ عَجَبٍ وَ اذْكُرْ خَطِيئَتَكَ وَ إِيَّاكَ وَ خَطَايَا النَّاسِ.

بہانہ جوئی سے پرہیز کرنا، وہ جن کی تمہیں حاجت نہیں ان کے قریب نہ جانا، بے وجہ ہنسنا نہیں، اپنے خطاؤں کو یاد رکھنا اور لوگوں کی خطاؤں کو بھول جانا۔

فہرست کتاب

مقدمہ _____ 15

اخلاقیات سے منہ موڑنا ہر چیز سے منہ موڑنا _____ 15

۱۔جاہ طلبی _____ 17

صاعقہ کیا ہے؟ _____ 20

روایات میں حب ریاست _____ 25

ریاست حق و ریاست باطل _____ 27

ریاست طلبی کی علامت _____ 29

اسباب حُب مقام _____ 30

مقام طلبی کا علاج _____ 31

۲۔ بہانہ جوئی و ہٹ دھرمی _____ 33

تفسیر و خلاصہ _____ 33

تفسیر و جمع بندی _____ 37

روایات میں بہانہ تراشی اور ہٹ دھرمی _____ 46

بہانہ جوئی کے عوامل _____ 49

پائیداری اور ہٹ دھرمی میں فرق _____ 50

ہٹ دھرمی کا علاج _____ 51

۳۔کفران نعمت اور شکر گزاری 53
تفسیر وخلاصہ 53
تفسیر وجمع بندی 56
روایات میں کفران نعمت 63
چند نکات 65
۱۔معنی کفران نعمت: 65
۲۔کفران نعمت کا انجام 66
ناشکری کے اسباب اور ان کا علاج 68
حصول نعمت خدا اور شکر کا طریقہ 71
فلسفہ شکر گزاری 74
روایات میں شکر گزاری 75
سیرت پیشواؤں میں شکر گزاری 78
شکر کیسے کرنا چاہیے؟ 80
شکر گزاری کا عمل 83
۴۔غیبت 89
اشارہ 89
تفسیر اور خلاصہ 91
روایات میں غیبت 95
۱۔تعریف غیبت 98
اقسام غیبت 101
غیبت کے عوامل 101
غیبت کے آثار 102
غیبت کا علاج 105

۱۔غیبت سننا 106
۲۔غیبت حقوق العباد ہے یا حقوق اللہ؟ 108
غیبت سے استثناء 111
فسق آشکارانہ 112
۱۔غیبت کی حدود 114
غیبت عام و خاص 115
۳۔غیبت سے دفاع 116
۴۔مردہ کی غیبت کا حکم کیا ہے؟ 117
۵۔حسن اخلاق اور بداخلاق 119
تفسیر اور خلاصہ 121
روایات میں خوش اخلاقی کی اہمیت 128
آثار و معنوی و مادی 129
(۱) تعریف خوش اخلاقی 130
(۲) آثار و انجام حسن اخلاق 131
حسن خلق کا سرچشمہ 132
سیرتِ معصومین علیہم السلام 134
بداخلاقی کے آثار 142
بداخلاقی کا علاج 144
مذاق اُڑانا 145
۶۔امانت و خیانت 149
تفسیر اور خلاصہ: 151
روایات اسلامی میں امانت و خیانت 156
آثارِ امانت و خیانت 160

امانت وخیانت کا نتیجہ 164
دفاع اور علاج 166
بیت المال میں امانت وخیانت 168
۷۔صدق وسچائی 173
تفسیر وجمع بندی 175
صدق روایات کی روشنی میں 179
زندگی میں صداقت کی تاثیر 185
صدق کے نتائج 187
مفہوم صدق 188
۸۔جھوٹ اور آثار وانجام 189
تفسیر وخلاصہ 191
جھوٹ روایات کی روشنی میں 195
جھوٹ کے آثار 199
جھوٹ کے اسباب 202
جھوٹ کا علاج 203
جھوٹ کے استثناءات 204
توریہ (جھوٹ سے راہِ فرار) 206
۹۔وعدہ وفا اور وعدہ خلافی 209
تفسیر وجمع بندی 212
وعدہ وفا کرنے کے سلسلے میں روایات 217
فردی واجتماعی آثارِ وعدہ وفائی 220
وعدہ وفائی اور وعدہ خلافی کا سرچشمہ 221
وعدہ خلافی کا علاج 223

عہد کی اقسام 223
مسلمانوں کی عہد سے وفا کی پابندی 226
منطقی بحث 228
تفسیر وخلاصہ 231
۱۰۔جدال ومراء کی تعریف 239
جدال مراء اور مخاصمہ میں فرق 239
روایات میں مراء کے آثار ونتائج 247
جدال ومراء کے اسباب 248
اقسام مراء وجدال 250
اس بیماری کا علاج 255
گفتگو میں انصاف 256
۱۱۔سخن چینی اور صلح (اصلاح ذات البین) 257
تفسیر وخلاصہ 260
روایات میں سخن چینی 266
سخن چینی کے آثار 269
سخن چینی کے اسباب 271
علاج کے طریقے 273
مواردِ استثناء 274
صلح کرنا (اصلاح ذات البین) 275
لوگوں میں صلح کرانا 279
۱۲۔حسن ظن وسوئے ظن 281
تفسیر وجمع بندی 284
سوئے ظن روایات میں 289

حسن ظن روایات میں 292
لوگوں سے حسن ظن: 292
اللہ سے حسن ظن: 293
سوئے ظن و حسن ظن کی تعریف 295
سوئے ظن کے برے آثار 296
خدا سے سوئے ظن کے آثار 298
سوئے ظن کے علل و اسباب 298
مراتب سوئے ظن 299
بدگمانی کا درمان 301
مواردِ استثناء 302
۱۳۔ لوگوں کے کاموں میں تجسس 305
روایات میں تجسس 307
سوئے تجسس کے آثار 309
استثناء 310
۱۔ محکمہ اطلاعات: 310
۲۔ محکمہ نظارت 313
علاج کے طریقے 314
راز داری اور فاش راز 314
راز داری روایات کی روشنی میں 317
اسرار فاش کرنے کے نتائج 324
اظہارِ راز کی ضرورت 326
راز فاش کرنے کے اسباب اور علاج 327
علاج کا طریقہ 328

۱۴۔حلم وغضب 329
تفسیر وخلاصہ 331
غصہ وغضب روایات کی روشنی میں 335
آثار وانجام غضب 338
اسباب غضب 341
غضب کا علاج 342
اقسام غضب 345
۱۔غضب الٰہی 345
۲۔غضب منفی 346
۳۔غضب مثبت 346
حلم و بردباری 350
چند اہم نکات 354
۱۔انسانی زندگی پر حلم و بردباری کے آثار 354
۲۔حلم و بردباری کے اسباب 355
۳۔استثناء 357
۱۵۔عفو اور انتقام 359
تفسیر وخلاصہ 362
عفو وانتقام روایات میں 369
اقسام عفو 372
آثار،ثمرات واسباب عفو 374
کسب فضیلت عفو اور انتقام کا علاج 376
۱۶۔غیرت و بے غیرتی 377
تفسیر وخلاصہ 379

غیرت روایات کے آئینے میں 382
اقسام غیرت 385
انسانی زندگی میں غیرت کے آثار 386
۱۷۔ اجتماعی زندگی یا گوشہ نشینی 389
تفسیر اور خلاصہ 391
اجتماعی و گوشہ نشین زندگی روایات کے آئینے میں 396
کچھ روایات گوشہ نشینی کے بارے میں 402
آیات اور روایات کو جمع کرنے کا راستہ 404
گوشہ نشینی کی اور اجتماع پرستی کے نتائج و محرکات۔ 406

مقدمہ

اخلاقیات سے منہ موڑنا ہر چیز سے منہ موڑنا

اس وقت جب میں یہ مختصر مقدمہ تحریر کر رہا ہوں دنیا میں امریکہ پر ہونے والے دہشت گردوں کے حملے امریکہ اور ساری دنیا پر ان حملوں کے منفی اثرات، افغانستان اور بعض دیگر ممالک پر امریکہ کے انتقامی حملوں کی باتیں ہو رہی ہیں

جسے دیکھو وہ اس صدی کے اس سب سے نقصان دہ اور بے نظیر حملے کے قلیل المدت اور طویل المدت نتائج کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔لیکن اس حادثے کے اخلاقی پیغام کے بارے میں بات کرنے والے کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔

وہ پیغام جو یہ کہہ رہا ہے کہ دنیا کے طاقتور ترین ملک کو بھی بھاری نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور صرف چند افراد اس کی ہیبت اور دبدبے کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔

وہ پیغام جو یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی کسی بھی چیز پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ چند افراد کے منصوبے کی بنیاد پر واقع ہونے والا ایک حادثہ تمام محاسبات (Calculation) اور معاملات (equations) کو بے اثر کرسکتا ہے۔صرف یہی نہیں بلکہ وہ طاقت وروں کو ذلت اور کمزوری اور ہوشیار ذہنوں کو اس طرح غفلت اور بے خبری میں دھکیل سکتا ہے کہ جب وہ سب ہوں تو دیکھیں گے کہ سب کچھ برباد ہو چکا ہے۔

اس حادثے کا ایک پیغام یہ ہے کہ آج کا انسانی،فردی اور اجتماعی زندگی میں اخلاقیات کی بنیادوں کے کمزور ہوجانے کی نہ صرف بھاری قیمت ادا کر رہا ہے بلکہ اس کا سب کچھ خطرے میں پڑ چکا ہے۔

جب عدل کا خوبصورت محل زمین بوس ہو جائے اور اس کی جگہ ظلم وستم لے لے طاقتوروں کی خود پسندی خود مرکزیت اور ہر چیز پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی خواہش، زندگی کو مظلوموں اور محرموں کے لئے ایک تلخ زہر بنادے

جب غرور وتکبر اور احساس برتری حقیقت کا ادراک کرنے کی صلاحیت کا خاتمہ کر دیں اور انسان اپنے اردگرد کے حقائق وواقعات سے بھی بے خبر ہو جائے، تو پھر ایسے حوادث غیر متوقع نہیں ہوتے اور یہ ایسے حوادث ہوتے ہیں جو خدا سے غافل مغرور ستمگروں پر لرزہ طاری کر دیتے ہیں اور دعوی نہیں بلکہ مہینوں تک ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ماؤف کر دیتا ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف کر لیں کہ مادیت ایک بند گلی کے آخری سرے پر پہنچ چکی ہے، کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ انسان اس حقیقت کو سنبھالے کہ اب اسے انسان کی اخلاقی مصنویت کی راہ پر چلنا شروع کر دینا چاہئے تا کہ نہ صرف یہ کہ دہشت گردی کی جڑیں خشک اور کھوکھلی ہو جائیں بلکہ دنیا پر محبت، پاکیزگی اور اخلاص کی حکمرانی قائم ہو جائے۔

مائل کو نظر انداز کر دینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ جب تک ظلم وستم، بے انصافی، امتیازی رویے اور جبر واسبید اداس دنیا میں موجود ہیں، ایسے حوادث بلکہ ان سے بدتر حوادث بھی رونما ہوتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں باتیں اور تجزیے تو بہت زیادہ ہیں۔لیکن اس مختصر مقدمہ میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں صرف احسان کو بیدار کرنے کے لئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ دنیا کی موجودہ خطرناک حالت کی اصلاح انتقامی کاروئی سے نہیں ہو گی۔ انتقامی کاروائی اس آگ کے شعلوں کو مزید بھڑکائے گی اور ایسے حملوں کا سلسلہ دراز سے دراتر ہوتا چلا جائے گا۔ نہ ہی ان حادثات کی ذمہ داری ایک دوسرے پر نڈالنے سے مسئلہ حل ہو گا۔

ہر ایک پر فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو قبول کرے اور اخلاقی اصولوں کی پابندی کرے اور اس بات کی ضرورت کو محسوس کرے کہ یہی سکون اور اطمینان سے بھرپور زندگی کی ضمانت ہے۔

یہاں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس کی توفیق سے ''اخلاق درقرآن'' کی تیسری جلد مکمل ہوئی۔ اب ہم دنیا کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

☆ یہ ہیں ہمارے اسلامی اخلاقیات

☆ یہ ہے راہ ورسمِ زندگی

☆ یہ ہے مشکلات سے نجات کا نسخہ

ناصر مکارم شیرازی

حدز، علمیہ قیم

۱۔جاہ طلبی

ہر انسان کسی نہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے کچھ لوگ مال دنیا سے عشق کرتے ہیں کچھ لوگ حسن و جمال سے محبت کرتے ہیں اور کچھ لوگ کمال کے خواہشمند ہوتے ہیں اسی طرح کچھ لوگ جاہ و مقام کے در پے ہوتے ہیں اسی آخری گروہ کو جاہ طلب کہا جاتا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کا احترام کریں ان کے گھروں میں آمدو رفت رکھیں یعنی وہ مقام و منزلت کے اعتبار سے دوسروں سے برتر سمجھے جائیں۔ان کے احکامات پر عمل کیا جائے کسی کے پاس ان کے احکامات پر اعتراض کرنے کا حق نہ ہو اگرچہ وہ اس کی اہلیت و صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ایسے لوگوں کو جاہ طلب، نام طلب اور اپنے لئے مقام کے خواہاں کہا جاتا ہے۔

معمولاً ایسی صفت بڑی عمر کے لوگوں میں پائی جاتی ہے جوانوں اور نوجوانوں میں ایسی صفت کم ہی نظر آتی ہے بعض دفعہ یہ صفت انسان کی موت تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

اس بری صفت کی بنا پر اس کی تمام قوتیں تحلیل ہونا شروع ہو جاتی ہیں مگر یہ صفت (جاہ طلبی) اس کے دل کی گہرائیوں میں پوری قوت کے ساتھ باقی رہتی ہے بلکہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس صفت کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

یہ بری صفت بہت سی انفرادی و اجتماعی برائیوں کا سرچشمہ ہے انسان کو خدا اور مخلوق خدا سے دور کرتی ہے اور اسے خطرناک گناہوں کی وادی میں دھکیل دیتی ہے۔

سب سے بڑھ کر بعض اوقات یہ صفت رذیلہ، انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی، وظیفہ شناسی سے مشابہ ہوتی ہے حدیث میں آیا ہے:

آخِرُ ما یَخرُجُ مِنْ قُلُوبِ الصِّدِیقِینَ حُبُّ الْجَاہِ.

مومن انسان کے دل سے دنیا کی محبت میں سے سب سے آخر میں جو چیز نکلتی ہے وہ مقام طلبی ہے۔

یہ حدیث اس امر کی طرف بخوبی اشارہ کرتی ہے یہ صفت رذیلہ کتنی خطرناک ہے۔ یہاں امر کی طرف یاددہانی ضروری ہے کہ یہ صفت ریاکاری، تکبر وخودپسندی کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اسی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے۔

ا۔ سورۂ طٰہٰ میں آیات ۸۵ تا ۹۸ سامری کے واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے اور اس واقعہ میں سامری اور قوم بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب جس چیز کو بیان کیا گیا ہے وہ جاہ طلبی ہے سامری کی جاہ طلبی ہی سبب بنی کہ وہ اس عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے۔ اس نے بچھیا میں خاک ڈالی جس سے آواز نکلتی تھی پھر لوگوں کو اس کے پوجا کی دعوت دی بہت کم ہی عرصے میں بہت سے لوگ بچھیا کے سامنے جھک گئے، اسے سجدہ کرنے لگے اور اسے طلب حاجت کا وسیلہ قرار دیا قرآن کی مذکورہ آیات میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ.

فرمایا تو ہم نے تمہارے آنے کے بعد تمہاری قوم کا امتحان لیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر چھوڑا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سخت غصہ کیا اور بہت ہی جلد اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور فریاد کی اپنے بھائی ہارون کو بعض خاص قرار دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے تقصیری کا اظہار کیا اور اس انحراف و بت پرستی میں سامری کو اصلی عامل قرار دیا:

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِیَ.

پھر (سامری) نے ان لوگوں کے لئے (اسی زیور سے) ایک بچھڑے کی مورت بنائی جس کی آواز بھی بچھڑے کی سی تھی۔ اس پر بعض لوگ کہنے لگے یہی تمہارا (بھی) معبود ہے اور موسیٰؑ کا معبود ہے۔ مگر وہ بھول گیا ہے

جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کلام میں سامری کو عنوان اس فساد کا عامل اصلی سامری کو قرار دیا اور کہا:

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾

(تب سامری سے) کہنے لگے کہ او سامری! تیرا کیا حال ہے۔ (اس نے جواب میں) کہا: مجھے وہ چیز دکھائی دی جو اوروں کو نہ سوجھی (جبرئیلؑ گھوڑے پر سوار جا رہے تھے) تو میں نے جبرئیلؑ (کے گھوڑے) کے نشانِ قدم کی ایک مٹھی (خاک کی) اٹھالی۔ پھر میں نے (بچھڑے کے قالب میں) ڈال دی (تو وہ بولنے لگا) اور اس وقت مجھے میرے نفس نے یہی سوجھایا۔

لیکن موضوع یہ ہے کہ سامری اقتدار و مقام طلب انسان تھا خداوند عالم نے اس دنیا میں اسے یہ سزا دی کہ اسے معاشرے سے دور کر دیا اور جس طرح خداوند عالم قرآن میں کہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُس سے کہا:

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ.

موسیٰؑ نے کہا چل (دور ہو) تیرے لئے (اس دنیا کی) زندگی میں تو (یہ سزا ہے کہ) تو کہتا پھرے گا کہ مجھے نہ چھونا (ورنہ بخار چڑھ آئے گا)۔

کیا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا ایک قانون تھا کہ اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اسے ایک پلید اور نجس و ناپاک سمجھا جاتا تھا نہ کوئی اس سے میل جول رکھتا، نہ اسے حق تھا کہ وہ دوسروں سے آنا جانا رکھے یا یہ کہ اس کے عمل کی سزا یہ تھی کہ خدا نے اسے ایک بیماری میں مبتلا کیا لہٰذا کوئی شخص اس سے نہیں ملتا کیونکہ یہ ڈر تھا کہ اس کو ملنے والا بیماری میں مبتلا ہوسکتا ہے یا یہ کہ سامری ایک نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہوا کہ جس سے اسے سخت وسوسہ اور لوگوں سے خوف کھاتا تھا اس طرح کہ اگر کوئی شخص اس کے قریب جاتا تو وہ فریاد کرتا تھا مجھے نہ ملو۔

جی ہاں یہ ہے اقتدار طلبی کی سزا کہ حتیٰ کہ دین حق کو بھی اپنی حاکمیت سمجھتا تھا قرآنی آیات کے دوسرے حصے میں کچھ اور چہرے دیکھنے میں آتے ہیں جو بنی اسرائیل میں سے ہیں اور مقام طلب ہیں انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک عجیب درخواست کی:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾

(اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ اے موسیٰؑ ہم تم پر اس وقت

تک ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس پر تمہیں بجلی نے لے ڈالا اور تم تکتے ہی رہ گئے۔ پھر تمہیں تمہارے مرنے کے بعد ہم نے جلا اٹھایا تا کہ تم شکر کرو۔

صاعقہ کیا ہے؟

صاعقہ درحقیقت دو مثبت و منفی تاروں کا نام ہے اور اس کی حرارت پانچ ہزار درجہ سینٹی گریڈ ہوتی ہے اس کی صدا بہت زیادہ ہوتی ہے جہاں تک پہنچتی ہے نابود کر دیتی ہے۔

بنی اسرائیل کی داستان میں صاعقہ جب کوہ طور کے اوپر سے آئی تو پہاڑ لرزنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ستر (۷۰) افراد کا گروہ اور وہ بھی خدا کا جواب سننے کوہ طور پر آئے تھے جب خدا کی طرف سے صاعقہ آئی تو کوہ طور اتنا لرزا کہ وہ ستر افراد سب کے سب ہلاک ہو گئے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے اور جب ہوش میں آئے تو خدا سے ان افراد کو دوبارہ زندہ کرنے کی درخواست کی خدا نے آپؑ کی درخواست کو قبول کیا اور وہ سب کے سب زندہ ہو گئے۔ یہ متعصب، ہٹ دھرم اور مقام طلب وخودخواہ ایک آسمانی بجلی دیکھنے سے اپنا سب کچھ کھو بیٹھے اور اپنے پروردگار کے سامنے خود کو حقیر سمجھنے لگے اور یہ بات انہیں اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ خدا کے نزدیک اقتدار طلبی خود کو رسوا کرنا ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ اسی داستان کی طرف اشارہ ہوا ہے:

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ

(اے رسولؐ) اہل کتاب (یہود) جو تم سے (یہ) درخواست کرتے ہیں کہ تم ان پر ایک کتاب آسمان سے اُتروا دو۔

ممکن ہے یہ تقاضا بہانہ جوئی یا مقام طلبی یا دونوں مراد ہوں قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے:

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ

تو (تم اس کا خیال نہ کرو کیونکہ) یہ لوگ موسیٰؑ سے تو اس سے کہیں بڑھ (بڑھ) کے درخواست کر چکے ہیں چنانچہ کہنے لگے کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دو تب ان کو ان کی شرارت کی وجہ سے بجلی نے لے ڈالا۔

ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر مقام طلبی، تکبر، غرور، تعصب اور ہٹ دھرمی کی فضا حاکم تھی۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بہانہ تلاش کرتے تھے اور وہ بری صفت وہی ہے جو آج بھی معاشرے میں دیکھی جا سکتی ہے یعنی بعض افراد اس صفت میں مبتلا ہیں اور جاہ طلبی کا شکار ہیں۔ بعض متخصص افراد جانتے ہیں کہ وہ اس فکر میں ہیں کہ خودنمائی اور اقتصاد خراب کر کے پورے جہان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں مقام طلبی صرف بنی اسرائیل اور سامری کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ فرعون اور نمرود بھی اس کی مثالیں ہیں جس طرح ہم نے آیات کے تیسرے حصے میں پڑھی ہیں:

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ [1]

اور فرعون نے اپنے لوگوں میں پکار کر کہا اے میری قوم کیا (یہ) ملک مصر ہمارا نہیں اور کیا یہ نہریں جو ہمارے (شاہی محل کے) نیچے بہہ رہی ہیں (ہماری نہیں) تو کیا تم کو اتنا بھی نہیں سوجھتا۔ یا (سوجھتا ہے کہ) میں اس شخص (موسیٰؑ) سے جو ایک ذلیل آدمی ہے اور (ہکلے پن کی وجہ سے) صاف گفتگو بھی نہیں کرسکتا کہیں بہت بہتر ہوں۔ (اگر یہ بہتر ہے) تو اس کے لئے سونے کے کنگن (خدا کے ہاں سے) کیوں نہیں اتارے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے جمع ہو کر آتے۔

فرعون نے اپنی قوم کے درمیان ندا دی اے میری قوم!۔۔۔۔فرعون کی اس گفتگو میں چند بری صفات کا ذکر ہوا ہے یعنی غرور، بزرگ نمائی، مقام طلبی، عوام فریبی یہ کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عظیم معجزات کو دیکھنے کے بعد انہیں نظر انداز کر دیا حالانکہ اس کے اور بھی افراد دیکھنے والے تھے پھر بھی سب نے انکار کر دیا۔ بہرحال فرعون نے اپنی قوم کو خالی ذہن بنایا تا کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔

آیات کے چوتھے حصے میں قارون کی داستان بیان ہوتی ہے قارون بھی مذکورہ بالا یعنی فرعون کی لسٹ میں ہے وہ بھی بنی اسرائیل کی مانند مقام طلبی کی خواہش رکھتا تھا۔ اسی بری عادت نے اسے بدبخت بنایا اور آخر زمین کے اندر دھنس گیا۔ مقام طلبی اس طرح کا ضخیم پردہ ہوتا ہے جس سے واضح و آشکار مسائل فراموش ہو جاتے ہیں جب بنی اسرائیل کے آگاہ افراد نے اسے یہ نصیحت کی کہ یہ ساری نعمتیں خدا نے تجھے دی ہیں کتنا اچھا ہے کہ خدا داد نعمتوں سے آخرت کو آباد کرتا۔

---

[1] سورۂ زخرف

دنیا سے اپنا حق بھی بھولنا نہیں چاہیے چونکہ عمر بہت کم ہے اور دولت ضائع ہونے والا مال ہے ایسا نہ ہو کہ یہ عظیم ثروت زمین میں فساد کے لئے خراب ہو جائے اور تو بنی خدا کے ساتھ جنگ پر اتر آئے!

اس مغرور اور پاگل آدمی نے اسے جواب میں یہ کہا:

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ [1]

تو قارون کہنے لگا کہ یہ (مال و دولت) تو مجھے اپنے علم (کیمیا) کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

یہ بات کر کے اس کی سرکشی میں اضافہ ہوا اپنے مقام کو دکھانے کے لئے تمام زینت یعنی قیمتی گھوڑوں، غلاموں، کنیزوں، سونے کی زین اور سونے کے دوسرے آلات کے ساتھ قوم موسیٰ کے سامنے ظاہر ہوا۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ [2]

غرض (ایک دن قارون) اپنی قوم کے سامنے بڑی آرائش اور ٹھاٹھ کے ساتھ نکلا۔

منظر اتنا زیبا اور دلکش تھا کہ بنی اسرائیل کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہو گئی اور انہوں نے اس طرح کہا:

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۷۹

جو لوگ دُنیا کی (چند روزہ) زندگی کے طالب تھے (اس شان سے دیکھ کر) کہنے لگے جو مال و دولت قارون کو عطا ہوئی ہے کاش ہمارے لئے (بھی) ہوتی اس میں شک نہیں کہ قارون بڑا نصیب ور ہے۔

لیکن جس طرح آیات کے ذیل میں آیا ہے کہ خداوند عالم نے قارون، اس کے محل اور مال سمیت زمین میں دھنس دیا ایک ایسا زلزلہ آیا جس سے زمین میں شگاف پڑ گیا اور زمین کے منہ میں چلا گیا یوں کہا جائے کہ نہ قارون رہا اور نہ اس کی زینت و زیوراتی آلات اس دوران قارون بننے کی آرزو رکھنے والوں کو سخت دھچکا لگا اور خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور خدا کی پناہ لی۔

ہاں! مقام طلبی، غرور اور غفلت اس طرح غافل کرنے والے ہیں کہ انسان کو واضح مسائل زندگی میں بھی غافل

---

[1] سورۂ قصص: ۷۸

[2] سورۂ قصص: ۷۹

کر دیتے ہیں تا کہ انسان ہمیشہ ناتوان رہے اور مختلف حادثات کا شکار ہوتا رہے اور زندگی سخت بنی رہے۔ اس کی دلچسپی کی تمام اشیاء فنا ہو جائیں گی انسان آہستہ آہستہ ان رذائل میں مبتلا ہو کر خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

آیات کے پانچویں حصے میں فرعون کا ذکر ہوا ہے وہ ایک بلند پرواز مغرور ریاست طلبی کا جنون رکھنے والا اور دیوانہ قسم کا آدمی تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ [1]

فرعون نے کہا اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو (اپنا) خدا بنایا ہے تو میں ضرور تمہیں اپنا قیدی بناؤں گا۔

بے شک فرعون ایک وسیع و عریض ملک مصر پر حکومت کرتا تھا ایسا سادہ نہیں تھا کہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کا خالق سمجھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول نہ کرے۔

بے شک خود خواہی، جاہ طلبی اور مقام طلبی نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ خدا کو قبول کرے اور اللہ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے سر تسلیم خم ہو جائے۔

ہاں! حاکمیت طلب افراد کا مزاج ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ حق کے مقابلے میں زور پر اعتماد کرنا اور برہان کے مقابلے میں کوئی قاطع جواب نہ دینا ممکن ہے یہ تصور کیا جائے فرعون کے زندان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام کے مقابلے میں کہ جس سے اس کی حکومت نابود ہو گئی، کوئی کم چیز تھی! مفسرین کی تفسیر کے مطابق فرعون کے زندان سے سالم باہر آنا بہت مشکل تھا لوگ اتنا زندان میں رہتے وہاں پر اتنی تکلیفیں اٹھاتے کہ آخر جان دے دیتے تھے۔

ان آیات کے چھٹے حصے میں عرب کے مشرکین کا ذکر ہوا ہے جنہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برہان و دلیل اور زندہ معجزات کی بجائے بہانے بناتے تھے کبھی خشک زمین چشم جاری کرنے اور کبھی پہاڑ کو چلانے کی بات کرتے تھے کبھی نہروں کے درمیان کھجور اور انگور باغ کا تقاضا کرتے تھے کبھی آسمان سے پتھروں کی بارش تو کبھی سونے سے بھرے گھر دیکھنے کا شوق رکھتے تھے آخر کار انہوں نے کہا:

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ [2]

---

[1] سورۂ شعراء

[2] سورۂ بنی اسرائیل: ۹۳

یا تمہارے (رہنے کے) لئے کوئی طلائی محل سرا ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم ہم پر (خدا کے ہاں سے ایک) کتاب نہ نازل کرو گے کہ ہم اُسے خود پڑھ بھی لیں، اس وقت تک ہم (تمہارے آسمان پر) چڑھنے کے بھی قائل نہ ہوں گے۔

ان تعبیرات میں "**بیت من زخرف**" ان کی خود بینی اور حاکمیت طلبی ظاہر ہوتی ہے انہوں نے ثابت کیا کہ انسان بری عادت کے اثر سے منطق وعقل کی حدود سے کتنا دور ہو جاتا ہے ایسا سونے کا گھر ہے جو سونے سے بھرا ہوا ہو یا سونے کی اشیاء سے سجا ہوا ہو یا ایسا گھر مراد ہے کہ جو نقش ونگار سے بھرا ہوا ہو ان دو احتمال میں سے پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے۔

ان آیات کے آخری اور ساتویں حصے قارون سے مربوط ہیں "**من زخرف**" ایک عنوان کلی کے طور پر دستور فرماتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾ [1]

یہ آخرت کا گھر تو ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کر دیں گے جو روئے زمین پر نہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ فساد اور (پھر سچ بھی یوں ہے کہ) پھر انجام تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

جی ہاں! حاکمیت طلب افراد کا حال قارون والا حال ہوتا ہے اپنی تمام قدرت کو تکبر اور مقام پر خرچ کیا جس سے خدا کے عذاب کی لپیٹ میں آ گیا اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ گیا اور لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

ممکن ہے کہ فساد کا عطف "**علوّا فی الارض**" پر کریں جس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو برتر سمجھنے والے افراد مقام طلبی کی وجہ سے زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور ہر قسم کی جنایت کرنے سے باز نہیں آتے دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں نقل ہوا کہ جب آپؑ کو ظاہری خلافت ملی اور بازار میں جاتے تو بھٹکے ہوئے افراد کی رہنمائی کرتے، فقیروں کی مدد کرتے تھے اور جب دکانداروں کے قریب سے گزرتے تو اس آیت کی تلاوت فرماتے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ

یہ آخرت کا گھر تو ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کر دیں گے جو روئے زمین پر نہ سرکشی

---

[1] سورۂ قصص: ۸۳

کرنا چاہتے ہیں اور نہ فساد۔

پھر آیت کی تفسیر کرتے اس طرح فرماتے کہ نہ صرف حکام کو شامل تھی بلکہ سب قدرت مند لوگوں کو شامل تھی۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جب اس آیت کی تلاوت کی تو گریہ کیا اور فرمایا:

ذَهَبَتْ وَ اللهِ الْأَمَانِيُّ عِنْدَ هَذِهِ الْآيَةِ۔[1]

اس آیت کے باوجود تمام آرزو برباد ہوگئی ہیں۔

شاید امامؑ کی مراد یہ ہو کہ خدا آخرت کو ان لوگوں کے حق میں دے گا کہ جن کے دل میں برتری جوئی کا ارادہ بھی نہ رکھتے ہوں اور دماغ کی کھوپڑی میں مقام طلبی کا تصور بھی نہ کرتے ہوں لیکن یہ کام بہت مشکل ہے مجموعاً مذکورہ آیات کے علاوہ اور بھی ان کے مشابہ آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حاکمیت طلبی دوسرے رذائل جیسے تکبر، غرور، تعصب اور ہٹ دھرمی کے ساتھ مل جائے تو اس کے خطرناک آثار زندگی انسان میں نظر آتے ہیں اور نہ صرف ایک فرد بلکہ تمام معاشرے کو نابود کر دیتے ہیں۔

روایات میں حب ریاست

اسلامی روایات میں اس کی بڑی مذمت کی گئی ہے بعض اوقات اس کو حب مقام و حب شرف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے مندرجہ ذیل روایات اسی مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ یہ اخلاقی بدی انسان میں اس قدر شدید ہوتی ہے کہ اس کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ما ذئبان ضاريان فی ذريبة غنم بأسرع فيها من حبّ الشّرف و المال فی دين المرء المسلم.[2]

دو بھیڑیے، جیسے درندے کو بھیڑوں کے ریوڑ میں چھوڑنے سے جو نقصان ہوتا ہے حب مال و مقام کے پیدا ہونے والا نقصان اس سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ اس قول کے مطابق ریاست طلبی انسان کے دین و ایمان کو تباہ کر دیتی ہے کہ جس طرح بھوکے بھیڑیے بھیڑوں کو

---

[1] تفسیر قمی، ج ۲، ص: ۱۴۷

[2] شرح فارسی شہاب الاخبار (کلمات قصار پیامبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، متن، ص: ۳۳۶

کھاتے ہیں۔

۲۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے ایک اور حدیث یوں نقل ہوئی ہے:

حُبُّ الْجَاهِ وَ الْمَالِ يُنْبِتَانِ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الْبَقْلَ.[۱]

مال و مقام سے بے حد محبت کرنے سے انسان کے دل میں نفاق اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پانی گھاس کو اگاتا ہے۔

۳۔ایک اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے:

مَنْ طَلَبَ الرِّئَاسَةَ هَلَكَ.[۲]

جو شخص طلب ریاست ہوتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

۴۔ یہ مسئلہ اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اسلامی روایات میں اس کی کم ترین علامت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

إِيَّاكُمْ وَ هَؤُلَاءِ الرُّؤَسَاءَ الَّذِينَ يَتَرَءَّسُونَ فَوَ اللهِ مَا خَفَقَتِ النِّعَالُ خَلْفَ رَجُلٍ إِلَّا هَلَكَ وَ أَهْلَكَ.[۳]

اس ریاست طلب گروہ سے دوری رکھو، خدا کی قسم! کسی کے جوتوں کی آواز بلند نہیں ہوتی مگر یہ کہ خود ہلاک ہو جاتا ہے اور دوسروں کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے

یاد رہے! اس زمانے میں فقیر و محروم لوگ اکثر ننگے پاؤں چلتے تھے اور آواز دینے والے جوتے صرف ثروت مند پہنتے تھے۔

۵۔ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گناہ کی جڑ کے بارے میں فرمایا:

أَوَّلُ مَا عُصِيَ اللهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى بِسِتِّ خِصَالٍ حُبُّ الدُّنْيَا وَ حُبُّ الرِّئَاسَةِ وَ حُبُّ الطَّعَامِ وَ حُبُّ النِّسَاءِ وَ حُبُّ النَّوْمِ وَ حُبُّ الرَّاحَةِ.[۴]

---

[۱] کشف الریبۃ، ص:۵۱

[۲] الکافی (ط۔الاسلامیۃ)، ج۲، ص:۲۹۷

[۳] الکافی (ط۔الاسلامیۃ)، ج۲، ص:۲۹۷

[۴] الخصال، ج۱، ص۳۳۰

دنیا میں سب سے زیادہ خدا کی نافرمانی چھ چیزوں کی وجہ سے ہوئی۔

(۱)۔دنیا پرستی۔ (۲)۔مقام طلبی۔

(۳)۔لذیذ کھانوں کا شوق۔ (۴)۔عورتوں سے محبت۔

(۵)۔نیند کی کثرت۔ (۶)۔آرام وسکون

(۶)۔امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ حُبَّ الشَّرَفِ وَ الذِّكْرِ لَا يَكُونَانِ فِي قَلْبِ الْخَائِفِ الرَّاهِبِ.[۱]

جس کے دل میں خوف خدا ہو اس دل میں مقام طلبی کی خواہش نہیں ہوتی۔

۷۔امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہی ایک اور روایت ہے:

مَنْ طَلَبَ الرِّئَاسَةَ بِغَيْرِ حَقٍّ حُرِمَ الطَّاعَةَ لَهُ بِحَق.[۲]

جو شخص ناحق ریاست طلب ہوتا ہے خدا اُسے حق سے محروم کر دیتا ہے۔

اس حدیث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ریاست طلبی دو قسم کی ہے۔

ریاست حق و ریاست باطل

بعض آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ اللہ کے مخلص بندوں کی ایک خواہش ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا.[۳]

خدایا! ہمیں متقین کا امام و پیشوا قرار دے۔

اس تعبیر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ریاست طلبی ہمیشہ مذموم نہیں ہے بلکہ بقول علامہ مجلسیؒ ریاست کی دو اقسام ہیں۔

---

[۱] الکافی (ط-الاسلامیۃ)، ج۲،ص:۶۹

[۲] تحف العقول۔ص:۳۵۱

[۳] سورۂ فرقان: ۷۴

۱۔ ریاست حق۔

۲۔ ریاست باطل

پھر ریاست حق کی مثال پیش کرتے ہیں کہ فتاویٰ دینا، درس و تدریس اور وعظ و نصیحت یہ سب ریاست حق ہیں وہ مزید کہتے ہیں: جو شخص اس کام کا اہل ہوتا ہے قرآن و سنت کا علم رکھتا ہو اور اس اصلی ہدف مخلوق کی ہدایت دین کی تبلیغ ہو ایسی ریاست، ریاست حق ہے کبھی واجب عینی اور کفائی ہوتا ہے لیکن جو شخص ان علوم سے آگاہ نہیں یا علم رکھتا ہے لیکن ہدف درست نہیں تو ایسا شخص تو صرف شہرت چاہتا ہے مال و مقام اس کا ہدف ہوتا ہے اس قسم کی ریاست، ریاست باطل ہے اور یہ صفت ان لوگوں کی ہوسکتی ہے جو مقام طلبی چاہتے ہوں۔

پھر وہ بعض محققین سے نقل کرتے ہیں کہ مقام کا معنی دل میں نفوذ کرنا ہے اور اس کا ہدف دنیاوی زندگی ہے اور موت کے بعد ختم ہو جاتا ہے دنیا آخرت کی کھیتی ہے پس جس شخص کے پاس آخرت کے لئے زاد راہ ہے وہ سعادت مند ہے اور جس کا ہدف شہوت ہو وہ بدبخت ہوتا ہے جو افراد اپنی زندگی میں خدائی ہدف رکھتے ہوں وہی درحقیقت حضرت علی علیہ السلام کے پیروکار ہیں کہ امامؑ فرماتے ہیں:

أَمَا وَ الَّذِی فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَأَ النَّسَمَةَ لَوْ لَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَ قِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَ مَا أَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَلَّا يُقِرُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَ لَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ أَوَّلِهَا.

اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں۔ اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی مظلومیت پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اوّل کو سیراب کیا تھا۔

ریاست طلبی کی علامت

ریاست طلب افراد کی حرکات وسکنات، ان کی گفتگو اور بول چال سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ریاست طلبی کی خواہش رکھتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی کی تمام نیکیوں سے لوگ واقف ہو جائیں تا کہ انہیں مقام ومنزلت ملے۔

ریاست طلب لوگوں میں عام طور پر ریاکاری بھی ہوتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ مقام طلبی کی حس بیدار نہیں ہوتی بعض علمائے اخلاق نے مقام طلبی اور ریاکاری کو اپنی کتابوں میں اکٹھا ذکر کیا ہے۔

بعض افراد تو ایسے ہوتے ہیں کہ جو خوبیاں ان میں نہیں پائی جاتی ہیں وہ چاہتے ہیں وہ بھی ان سے مختص ہو جائیں اور لوگ سمجھیں کہ ان میں یہ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں آیت میں کچھ اس طرح ہے:

وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا.[1]

وہ اس بات کو دوست رکھتے ہیں کہ جو نیکیاں ان میں نہیں پائی جاتی وہ بھی ان کے نام مشہور ہو جائیں۔

وہ درحقیقت کسب مقام کے پیچھے ہوتے ہیں جس طرح سے بھی مل جائے وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریف کریں ریاست طلب افراد اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے انہیں شہرت ملتی ہو جن کاموں میں شہرت نہیں ہوتی وہ انجام نہیں دیتے اگر ان کاموں کا عوام کو کافی فائدہ ملتا ہو وہ عوام کا نہیں سوچتے بلکہ اپنی شہرت کے درپے ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں ہمیشہ ان کی مدح ہو لوگ ان کے گیت گائیں ان کے سامنے کوئی دوسرا آدمی بات نہ کرے، ان کی بات حتمی اور حرف آخر ہونی چاہیے جو لوگ ان کا احترام کرتے ہیں وہ ان کے نزدیک با معرفت افراد ہیں اور ان کی خوشامد نہیں کرتے وہ ان کی نظروں میں بے معرفت لوگ شمار ہوتے ہیں۔

عوام میں سے اکثر لوگ مقام طلب افراد سے متنفر ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[1] آل عمران:۱۸۸

وَإِنَّ شِرَارَكُمْ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوطَأَ عَقِبُه.[1]

جو افراد یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے گن گائیں وہ بدترین افراد ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عوام ان کے سامنے مطیع رہے اور ہر وقت ان کی خدمت کے لئے حاضر ہوں وہ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ کے لئے تیار کرتے ہیں۔

اسباب حُب مقام

مرحوم فیض کاشانی بہت خوبصورت بیان کرتے ہیں:

لوگوں سے ان کے مقام کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلقات رکھنا یا دوسرے لفظوں ان کے مال وثروت کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنا کیونکر مقام تک (اولاً) مال تک پہنچنے کے لئے مقام طلبی زیادہ مناسب ہے بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس مال کافی ہوتا ہے لیکن وہ لوگوں کے دلوں میں حاکم نہیں ہوتے ہیں لیکن جو لوگوں کے دلوں پر چھا جاتے ہیں ان کے لئے مال و دولت کا جمع کرنا آسان ہے۔(ثانیاً) مال ہمیشہ خطرے میں ہوتا ہے اور ان کی حفاظت آسانی نہیں ہے لیکن اگر کوئی کسی کے دل پر حاکم ہو جائے تو اس کی حفاظت آسان ہے (ثالثاً) عام طور پر دلوں پر حکومت ہر روز بڑھتی جارہی ہے اور اس میں زیادہ زحمت نہیں ہوتی[2] پس ایسے افراد کی تعریف کرنا کافی ہے۔حالانکہ مال کو کمانے کے لئے بہت ہی محنت کرنی پڑتی ہے مرحوم فیض کاشانی نے یہ مطلب خوب مقام کے لئے بیان کیا ہے لیکن ایک انگیزہ بھی ہوسکتا ہے۔

مقام طلبی کے دوسرے اسباب میں سے افراط ہے یعنی حد سے بڑھ جانا خود بینی بھی مقام طلبی کا عکس عمل ہے۔

---

[1] الکافی (ط-الاسلامیۃ)، ج۲،ص:۲۹۹

[2] محجۃ البیضاء، جلد۶ ،صفحہ ۱۱۵،۱۱۶ باتلخیص

مقام طلبی کا علاج

اگر انسان اخلاقی رضائی یعنی بری صفات میں مبتلا ہونے والا برے انجام کو دیکھ کر اکثر اسے ترک کرنے کی فکر میں ہوتا ہے اگر مقام طلب افراد جانتے تو یہ بری صفات انسان کو نا صرف خدا سے دور کتی ہے بلکہ مخلوق کی نظر میں بھی حقیر ہوتا ہے لوگ اس سے دوری اختیار کرتے ہیں اس کے دوست اس سے جدا ہوجاتے ہیں یہ صفت انسان کو خطرناک ترین گناہ یعنی ریا کاری میں مبتلا کرتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات سامری اور قارون سے افراد (جو) جنہوں نے کفر اختیار کیا اور حق کی مخالفت کی اگر وہ یہ جان لیتے کہ مقام طلبی ایک بھیڑیے کی مانند ہے جو بھیڑوں کو کھا جاتا ہے اسی طرح یہ انسان کے دین اور ایمان کو تباہ کر دیتا ہے دل میں اس طرح نفاق پیدا ہوتا ہے جس طرح پانی سے گھاس اُگتی ہے۔

اگر وہ یہ سوچتے کہ دنیا عارضی ہے عمر چھوٹی ہے اور نعمتیں امانت ہیں اور یہ سب کچھ ہاتھ سے جانے والی چیزیں ہیں علمائے اخلاق کے قول کے مطابق شرق وغرق میں رہنے والے تمام انسان ایک انسان کو کئی سال سجدہ کرتے رہے نہ سجدہ کرنے والا باقی رہے گا اور نہ مسجود۔ فرعون، نمرود، قارون، سامری اور دوسرے افراد کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام طلبی ایک بری صفت ہے یہ (دیداری کے لئے) بیداری کے لئے ایک درس ہے اور مقام طلب افراد کے لئے ایک تنبیہ ہے مقام طلبی توحید کے اعتقاد ضعیف کر دیتی ہے۔ ایمان ضعف ہو جاتا ہے اگر کوئی شخص خدا کی عظمت سے واقف ہے تو وہ جانتا ہے تمام مخلوقات خدا کے مقابلے میں ناچیز ہیں اس کے علاوہ یہ بھی جانتا ہے کہ عزت و ذلت، عظمت وحقارت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام لوگوں کے دلوں پر اسی کی حکومت ہے وہی حاکم ہے لوگوں کا اقبال خدا کے ہاتھ میں ہے قدرت طلبی نا پائیدار ہے یہ سب علاج کے نمونے ہیں اور علمی ہیں عملی راہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسے حالات میں لائے جس سے حب مقام ختم ہوتا ہے مثلاً مجالس میں وہاں بیٹھے جہاں عام لوگ بیٹھتے ہیں ایسا لباس پہنے جو عام لوگ پہنتے ہیں اسی طرح سواری، گھر اور کھانے عام افراد جیسے ہونے چاہیے۔

بعض علمائے اخلاق لکھتے ہیں کہ حب مقام کی رگ کو کاٹنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے دوری اختیار کریں لیکن ان میں بھی شرط یہ ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو متقی سمجھ کر یہ کام انجام نہ دیں بہت سارے صوفی اور عارف افراد حب مقام کی رگ کو کاٹنے کے لئے ایسے کام انجام دیتے ہیں جو شرعیت میں جائز نہیں ہوتے مرحوم فیض

کاشانی نقل کرتے ہیں کہ قدیم بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ایک راہب اور عبادت گزار کی خدمت میں پہنچا جب اس زاہد کو خبر ملی کہ بادشاہ اس کی خدمت میں آرہا ہے تو اس نے روٹی اور سبزی حاضر کرنے کے لئے کہا جب کھانا کھانے لگے تو اس میں ایک بڑا لقمہ بنا کر کھانے لگا جب بادشاہ نے یہ منظر دیکھا تو وہ بغیر گفتگو کے واپس آ گیا زاہد نے کہا:

الحمدللہ الّذی صرفك عنّی

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے کہ وہ ہم سے منصرف ہو گیا ہے۔

بعض دوسرے افراد سے نقل ہوا ہے کہ بعض اوقات صوفی افراد دستر خوان پر شراب بھی رکھتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھیں یہ شراب پیتے ہیں اور وہ لوگوں سے دور رہیں ایک اور شخص سے نقل ہوا ہے کہ ایک علاقے میں معروف راہب رہتا تھا لوگ اس کا بڑا احترام کرتے تھے ایک دفعہ جب وہ حمام گیا تو جان بوجھ کر کسی دوسرے کا مخفی لباس پہنا اور باہر آ کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا جب لوگوں نے اسے پہچانا تو اسے پکڑ کر بہت مارا اور لباس واپس لے لیا لوگوں نے کہا یہ چور ہے لہٰذا ایسے شخص سے دور ہو جانا چاہیے۔

بے شک اس جیسے کام حرام ہیں اور بعض اوقات مکروہ ہے اسلام نے بھی اجازت نہیں دی کہ اس جیسے بدنام کرنے والے کام انجام دے اور لوگوں کی نظر سے گر جائے جس طرح اسلام نے مخلوق سے کہا سوئے ظن ممنوع ہے لہٰذا مقام طلبی کی رگ کو کاٹنے کے لئے ایسے اعمال انجام دینے چاہیے جو شریعت اور عدل کے ساتھ سازگار ہیں شریعت میں بہت سے مطلوب راستے موجود ہونے کے باوجود نا مطلوب راستوں کو اختیار نہیں کرنا چاہیے مرحوم فیض کاشانی مزید لکھتے ہیں کہ دستر خوان پر دکھاوے کی شراب کو حاضر کرنا محل اشکال ہے بہت سارے صوفی لوگ ایسے کام انجام دیتے ہیں جن کا مجتہد فتویٰ نہیں دیتا ایسے کام ایک صوفی سے ہونا ممکن ہے لیکن مجتہد کے لئے بعید ہے ایسے کام کرنے سے انسان کے دل پاک نہیں ہوتے بلکہ یہ غیر منطقی کام انسان کو رسوا کر دیتے ہیں۔

امام غزالی نے بھی اس قسم کے باتیں لکھی ہیں:

> فرقہ (ملامتیہ) صوفیوں کا ایک مشہور فرقہ ہے جو اس قسم کی حرکات کرتے ہیں وہ گمنامی و بدنامی کے لئے یہ راہ انتخاب کرتے ہیں اسی وجہ سے وہ ملا متیاں معروف ہو گئے لیکن اسلام ہرگز ایسے کاموں کی اجازت نہیں دیتا یہ منطق، عقل اور شریعت سے دور ہے البتہ یاد رہے کہ مرحوم فیض کاشانی اس فرقہ کے اعمال کو قبول نہیں کرتا جو گناہان کبیرہ ہیں۔



۲۔ بہانہ جوئی و ہٹ دھرمی

بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی حقیقت کو پانے کے لئے ایک منابع ہے کیونکہ ایسا انسان حق تک نہیں پہنچتا۔ بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی یہ نہیں کہ انسان کشف حقیقت کے لئے تکرار کریں اور پے در پے سوال کرے کیونکہ سوال کشف حقائق کی اصل دلیل ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ حق آشکار ہونے کے بعد باطل پر اصرار کرنا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلی اقوام میں سے بنی اسرائیل سب سے زیادہ بہانہ جو ہے اس لئے قرآن نے ان کی بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام نادان اقوام میں خودخواہ اور خود پرست جو بھی موجود نہیں ہیں وہ وہی بری عادات میں مبتلا تھے۔

بہرحال برائی شیطان کی ایک عادت ہے اور شاید سب سے پہلے جس نے ہٹ دھرمی کا درس دیا وہ شیطان تھا اس کے آثار اتنے برے ہیں کہ بعض اوقات خونی جنگوں کا باعث بنتی ہے جس سے انسان اور مال تباہ ہو جاتا ہے اور آباد شہر ویران ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تفسیر و خلاصہ

سب سے پہلی آیت میں کافروں کی بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی بیان ہوئی ہے کہ جب لوگوں کو خدا کی نعمتیں ملتی

ہیں اور مصیبتیں دور ہوتی ہیں شاید محبت کے طریقے سے وہ بیدار ہو جائیں ان کے غرور میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی طغیان گری جاری رہتی ہے خداوند عالم فرماتا ہے اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان کے مصائب کو دور کریں تو وہ نہ صرف بیدار نہیں ہوتے بلکہ ان کی طغیان گری میں اضافہ ہوتا ہے وہ سرگردان ہو جاتے ہیں۔

① ۔ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ.[1]

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان کی تکلیف کو دور بھی کر دیں تو بھی یہ اپنی سرکشی پر اڑے رہیں گے اور گمراہ ہی ہوتے جائیں گے۔

② ۔ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ؕ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ.[2]

یا یہ تم کو روزی دے سکتا ہے اگر خدا اپنی روزی کو روک لے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ نافرمانی اور نفرت میں غرق ہو گئے ہیں۔

③ ۔ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ. قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ. قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ.[3]

اس نے کہا کہ پھر مجھے قیامت تک کی مہلت دے دے ارشاد ہوا کہ تو مہلت والوں میں سے ہے۔ اس نے کہا کہ پس جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھ جاؤں گا۔

④ ۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ﴿۷﴾

انہوں نے کہا: پروردگار میں نے اپنی قوم کو دن میں بھی بلایا اور رات میں بھی پھر بھی میری دعوت کا کوئی اثر سوائے اس کے نہ ہوا کہ انہوں نے فرار اختیار کیا۔ اور میں نے جب بھی انہیں دعوت دی کہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے اپنی انگلیوں کو کانوں میں رکھ لیا اور اپنے

---

[1] سورۂ مومنون: ۷۵

[2] سورۂ ملک: ۲۱

[3] سورۂ اعراف: ۱۴ تا ۱۶

کپڑے اوڑھ لئے اور اپنی بات پر اڑ گئے اور شدت سے اکڑے رہے۔

⑤۔ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ. [1]

اس پر ان لوگوں نے اپنے دلوں کی طرف رجوع کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ یقیناً تم ہی لوگ ظالم ہو اس کے بعد ان کے سر شرم سے جھکا دیئے گئے اور کہنے لگے ابراہیم تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں ابراہیم نے کہا کہ پھر تم خدا کو چھوڑ کر ایسے خداؤں کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ حیف ہے تمہارے اوپر اور تمہارے ان خداؤں پر جنہیں تم نے خدائے برحق کو چھوڑ کر اختیار کیا ہے کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو ان لوگوں نے کہا کہ ابراہیم کو آگ میں جلا دو اور اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس طرح اپنے خداؤں کی مدد کرو۔

⑥۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ. [2]

اور وہ موقع بھی یاد کرو جب موسیٰؑ نے قوم سے کہا کہ خدا کا حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کرو تو ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں مذاق بنا رہے ہیں۔ فرمایا پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے

---

[1] سورۂ انبیاء: ۶۴ تا ۶۸

[2] سورۂ بقرہ: ۶۷ تا ۷۱

ہوجاؤں ان لوگوں نے کہا کہ اچھا خدا سے دعا کیجئے کہ ہمیں اس کی حقیقت بتائے۔ انہوں نے کہا کہ ایسی گائے چاہئے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچہ۔ درمیانی قسم کی ہو۔ اب حکم خدا پر عمل کرو ان لوگوں نے کہا یہ بھی پوچھئے کہ رنگ کیسا ہوگا۔ کہا کہ حکم خدا ہے کہ زرد بھڑک دار رنگ کی ہو جو دیکھنے میں بھلی معلوم ہو ان لوگوں نے کہا کہ ایسی تو بہت سی گائیں ہیں اب کون سی ذبح کریں اسے بیان کیا جائے ہم انشاء اللہ تلاش کرلیں گے حکم ہوا کہ ایسی گائے جو کاروباری نہ ہو نہ زمین جوتے نہ کھیت سینچے ایسی صاف ستھری کہ اس میں کوئی دھبّہ بھی نہ ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ اب آپ نے ٹھیک بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ذبح کردیا حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہیں تھے۔

⑦۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ [1]

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو اعلانیہ نہ دیکھ لیں جس کے بعد بجلی نے تم کو لے ڈالا اور تم دیکھتے ہی رہ گئے پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندہ کردیا کہ شاید اب شکرگزار بن جاؤ۔

⑧۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ [2]

ان لوگوں نے کہا کہ موسیٰؑ ہم ہرگز وہاں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں ہیں۔ آپ اپنے پروردگار کے ساتھ جاکر جنگ کیجئے ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

⑨۔ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ۝۴۹ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ۔ [3]

اور ان لوگوں نے کہا کہ اے جادوگر (موسیٰؑ) اپنے رب سے ہمارے بارے میں اس بات کی دعا کرو جس بات کا تجھ سے وعدہ کیا گیا ہے تو ہم یقیناً راستہ پر آجائیں گے لیکن جب ہم

---

[1] سورہ بقرہ ۵۵، ۵۶

[2] سورۂ مائدہ: ۲۴

[3] سورۂ زخرف: ۴۹، ۵۰

نے عذاب کو دور کر دیا تو انہوں نے عہد کو توڑ دیا۔

﴿۹۰﴾ اَوۡ یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰی فِی السَّمَآءِ ؕ وَ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیۡنَا کِتٰبًا نَّقۡرَؤُہٗ ؕ قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ ہَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا.[1]

یا تمہارے پاس سونے کا کوئی مکان ہو یا تم آسمان کی بلندی پر چڑھ جاؤ اور اس بلندی پر بھی ہم ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب نازل نہ کردو جسے ہم پڑھ لیں آپ کہہ دیجئے کہ ہمارا پروردگار بڑا بے نیاز ہے اور میں صرف ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

تفسیر وجمع بندی

ہاں یہ بہانہ جو گروہ جس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیوانہ کہا جس پر آیات دلالت کرتی ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی بات کو مانیں ہر معجزہ دیکھنے کے باوجود انکار کرنے والے ہیں خداوند عالم نے انہیں بیدار کرنے کے لئے بعض اوقات مصیبتوں میں مبتلا کیا اور بعض دفعہ بہت ساری نعمتیں عطا کرتا ہے ان افراد پر نہ مصیبتوں اور نہ نعمتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ بہانہ جو عصیاں کار اور نادان تھے۔

مفسرین کے قول کے مطابق طغیان کی مختلف اقسام ہیں:

طغیان علم، یعنی فخر فروشی

طغیان مال یعنی بخل

طغیان عبادت یعنی ریاکاری

طغیان نفس یعنی شہوت کی پیروی

انسان ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان سب گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسری آیت میں دوبارہ مشرکین کی ہٹ دھرمی بیان ہوئی ہے کہ کبھی بھی کسی قیمت پر حاضر نہیں تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سر تسلیم ہو اور خود سخت خدا ان کو چھوڑ دے قرآن مجید میں فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل: ۹۳

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ.[1]

اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان کی تکلیف کو دور بھی کر دیں تو بھی یہ اپنی سرکشی پر اڑے رہیں گے اور گمراہ ہی ہوتے جائیں گے۔

قرآن مجید بت پرستوں کے بارے میں بار بار تکرار کرتا ہے کہ تمہارے بت کسی کام کے نہیں ہیں یہ نہ تمہارے دشمن سے دفاع کرتے ہیں نہ تمہیں روزی دیتے ہیں نہ تمہارے ساتھ بات کرتے ہیں نہ تمہیں نفع دیتے ہیں اور نہ ہی نقصان۔ پس ان کی عبادت کس لئے ہے؟

ان سوالوں کے جواب ان کے پاس نہیں تھے اور مسلسل بتوں کی پوجا کرتے تھے ان آیات کے تیسرے حصے میں سب سے پہلے بہانہ جوئی اور معتصب شیطان کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جب تکبر کی وجہ سے درگاہ خدا سے دھتکار گیا اور اپنے بلند مرتبہ سے گر گیا خود بینی کی وجہ سے بہت حقیر اور ناچیز بن گیا اسے اپنی غلطی قبول کرنی چاہیے تھی اور خدا سے توبہ کر کے گناہ سے پاک ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے کوشش کی کہ گناہ میں رہے اور یہ صرف تکبر اور حسد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوا شیطان نے چاہا کہ وہ آدم اور اس کی اولاد سے انتقام لے اور ان کے اندر وسوسہ پیدا کر کے گمراہ کرے نہ صرف ایک دن دو دن ایک ماہ ایک سال بلکہ قیامت تک اپنی برائی کو جاری رکھے گا ہر جگہ گناہ کی مجلس برپا کرتا ہے اور لوگوں کو بدبخت بناتا ہے یہاں تھا کہ اس نے عرض کی:

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ.[2]

کہنے لگا تو (خیر) مجھے اس دن تک کی (موت سے) مہلت دے جس دن ساری خدائی کے لوگ (دوبارہ جلا کر) اُٹھا کھڑے کیے جائیں گے۔ فرمایا (اچھا منظور) تجھے ضرور مہلت دی گئی کہنے لگا چونکہ تو نے میری راہ ماری تو میں بھی بنی آدمؑ کے (گمراہ کرنے کے لیے) تیری سیدھی راہ پر تاک میں بیٹھوں گا تو سہی

بے شک طولانی عمر جس شخص کے لئے ہو ایک بڑا سرمایا ہے اپنے گناہوں کی اصلاح کرے اور نیکیوں میں اضافہ کرے اگر پہلے گمراہ تھا تو توبہ کرے لیکن باغی افراد کو طولانی عمر کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی بدبختی میں اضافہ

---

[1] سورۂ مومنون: ۷۵

[2] سورۂ اعراف: ۱۴ تا ۱۶

ہوتا ہے طولانی عمر دعائیں قبول کرانے کا باعث ہوتو یہ ایک خدا کی رحمت ہے لیکن بہانہ جو اور ہٹ دھرم افراد نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔

چوتھی آیت میں قوم نوحؑ کی ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ ہوا ہے حضرت نوح علیہ السلام نے پوری سعی وکوشش کی اور اس قوم کو گمراہی سے نکالنا چاہا مگر ان کی طرف سے عجیب سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کی بارگاہ میں ان کی شکایت کی اور فرمایا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَ اِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُہُمۡ لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَہُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا [1]

(جب لوگوں نے نہ مانا تو) عرض کی پروردگارا میں اپنی قوم کو (ایمان کی طرف) رات دن بُلاتا رہا۔ لیکن وہ میرے بلانے سے اور زیادہ گریز ہی کرتے رہے اور میں نے جب ان کو بلایا کہ (یہ توبہ کریں اور) تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور (مجھ سے چھپنے کو) کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور بہت شدت سے اکڑ بیٹھے۔

یہ کیا تعصب اور ہٹ دھرمی ہے کہ انسان حرف حق نہیں سنتا۔

بلکہ کانوں میں انگلی ڈال لیتا ہے اور حق سے گریز کرتا ہے مریض شخص کیسے ڈاکٹر سے گریز کرتا ہے؟ اگر وہ بیمار ہے تو ڈاکٹر سے رجوع کرنا فائدہ ہے یہ چراغ کو پشت کرنے کے مترادف ہے۔

تمام انبیاء میں سے جتنی حضرت نوح علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی ایسی کسی اور نبی نے نہیں دی کیونکہ اللہ نے انہیں عمر بہت طولانی عطا فرمائی۔ نوسو پچاس سال تو انہوں دین کی دعوت دی اور وہ بھی دن رات آپ نے اپنی دعوت کو جاری رکھا لیکن اس کے باوجود بہت کم لوگ اسلام لائے بعض نے لکھا ہے کہ ہر ۱۲ سال میں ایک شخص مسلمان ہوتا تھا دوسرے لفظوں میں:

جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ.

انسان کا انگلیوں کو کان میں ٹھونسنا۔

اس سے مراد شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حق سے دوری کرتے تھے وہ چاہتے تھے پوری انگلی کو

---

[1] سورۂ نوح: ۵ تا ۷

کان میں ڈال دیں تا کہ حق نہ سن سکیں۔

اسی طرح یہ تعبیر بھی ہے:

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا.

لیکن وہ میرے بلانے سے اور زیادہ گریز ہی کرتے رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا اثر معکوس تھا ہاں بعض افراد ہٹ دھرم اور متکبر جب حق طلب کی آواز سنتے ہیں تو ان کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوتا ہے جس طرح گندگی کے ڈھیر پر بارش گرنے سے بو آتی ہے۔

پانچویں آیت میں یہ اشارہ ہوا ہے کہ قوم ابراہیمؑ بھی بہانہ جو اور ہٹ دھرم قوم تھی یہ بت پرست قوم بابل میں رہتی تھی جب ابراہیمؑ نے دلیل قاطع خود ساختہ خدا کا پول کھول دیا اور تمام بتوں کو توڑ دیا سوائے ایک بت کے اور اس بڑے بت کو اس لئے چھوڑ دیا تا کہ وہ ٹوٹے ہوئے بتوں کے بارے میں اس بڑے بت سے پوچھیں لوگ ایک دفعہ بیدار ہوئے اور اپنی سرزنش کرنے لگے جس سے ان میں بیداری آئی اگر یہ بیداری جاری رہتی تو وہ شرک کو چھوڑ دیتے اور توحید پرست بن جاتے لیکن اچانک ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی نے ان کو ڈھیر کر دیا۔ اور وہ حق کی طرف آتے آتے پھر باطل کی طرف پلٹ گئے۔ جس طرح خداوند عالم فرماتا ہے:

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ [1]

پھر ان لوگوں کے سَر (اسی گمراہی میں) جھکا دیئے گئے (اور تو کچھ بن نہ پڑا مگر یہ بولے کہ) تم کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بُت بولا نہیں کرتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. [2]

(پھر ان سے کیا پوچھیں) ابراہیمؑ نے کہا تو کیا تم لوگ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ تمہارا کچھ نقصان ہی کر سکتی ہیں۔ تف ہے تم

---

[1] سورۂ انبیا: ۶۵

[2] سورۂ انبیا: ۶۶۔۶۷

پر اور اس چیز پر جسے تم خدا کے سوا پوجتے ہو تو کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔

اگر انسان متعصب نہ ہوتا تو اپنی آنکھوں سے مشکلات کو دیکھ کر سخت حوادس میں مبتلا نہ ہوتا متعصب لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے نیک لوگ خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں ہاں ہٹ دھرمی اور تعصب سنگین پردے ہوتے ہیں جس سے انسان واضع ترین مسائل سے بھی بے خبر ہوتا ہے۔ دلچسپ یہ کہ پہلی آیت میں کہتا ہے:

فَرَجَعُوٓا اِلٰٓی اَنۡفُسِهِمۡ

اس پر ان لوگوں نے اپنے جی میں سوچا۔

بعد والی آیت میں کہتا ہے:

ثُمَّ نُكِسُوۡا عَلٰی رُءُوۡسِهِمۡ

پھر ان لوگوں کے سَر (اسی گمراہی میں) جھکا دیئے گئے۔

چھٹی آیت میں بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں بے نظیر تھے۔

یہ آیت اور پہلے کی آیات اس داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں بنی اسرائیل کے ایک آدمی نے کسی کو قتل کر دیا اور خون ریزی و جنگ کا سخت خطرہ تھا کیونکہ قتل کی تہمت ایک دوسرے پر تھونپ رہے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہیں خدا کے حکم سے قاتل بتا سکتا ہوں لہٰذا ایک گائے ذبح کرو اور اس کے بدن کا گوشت اس مقتول کے بدن سے مس کریں وہ خود زندہ ہو کر قاتل کا نام بتا دے گا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ تجویز تمام بنی اسرائیل کے لئے حیرت کا باعث بنی بلکہ امیدواری کا سبب بھی تھی حق تو یہ تھا کہ جلدی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو بجا لاتے لیکن افسوس انہوں نے بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی شروع کر دی کبھی کہتے گائے کی عمر کتنی ہونی چاہیے، کبھی گائے کے رنگ کے بارے میں سوال کرتے اور کبھی اس کے کان کے بارے میں پوچھتے ان سوالات کی خاطر انہوں نے اپنے لئے ایک مشکل کھڑی کری دی جس کا سر انجام یہ ہوا کہ انہیں ایسی صفات والی گائے پیدا کرنا مشکل ہو گئی تھی انہوں نے گائے بہت مہنگی خریدی بلکہ اگر وہ پہلے ہی کسی گائے کو ذبح کر دیتے تو مشکل حل حل ہو جاتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی حکمت پر ایمان نہیں رکھتے تھے کیونکہ خدا حکیم ہے اور سوال کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے شاید بنی اسرائیل یہ چاہتے تھے کہ اس بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی سے اصلاً وہ کوئی گائے ذبح ہی نہ کریں قرآن کی مذکورہ بالا آیت میں ہے کہ خدا فرماتا ہے: یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا خدا تمہیں ایک مادہ گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے پھر ایک گوشت کا ٹکڑا مقتول کے بدن سے مس کرتے اور وہ زندہ ہو کر اپنا قاتل خود بتاتا انہوں نے

کہا تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو موسیٰؑ نے کہا میں خدا کی پناہ لیتا ہوں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ.[1]

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم لوگوں کو تاکیدی حکم کرتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کیا تم ہم سے دل لگی کرتے ہو (موسیٰؑ نے) کہا میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہل بنوں۔

اس سورہ کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کو تلاش کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے درمیان بہت ہی نزاع اور جنگ چھڑنے کا خطرہ تھا لیکن وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے آیات کے ساتویں حصے میں بنی اسرائیل کی عجیب ہٹ دھرمی بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے موسیٰؑ کے پیروکاروں کو پکڑ لیا اور کہا:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً[2]

(اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ اے موسیٰؑ ہم تم پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔

ظاہراً وہ جانتے تھے کہ خدا کا جسم مکان اور سمت نہیں ہے لیکن وہ سرکشی میں ہی غرق رہے استکبار نے موسیٰؑ سے کہا: تم کہتے ہو کہ خدا نظر نہیں آتا ہم اس کو نہیں مانتے یہ سب سن کر خدا نے انہیں فرمایا: اپنی قوم کے ستر معتبر آدمیوں کا انتخاب کرو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر جائیں تا کہ وہ اپنی درخواست کا جواب لے سکیں اور واپس آ کر یہ ستر افراد دوسروں کو بتائیں جب وہ کوہ طور پر آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں ان کی درخواست پیش کی اور کہا: خدایا! اپنے آپ کو ہمیں دکھا دے۔

اللہ نے فرمایا: اے موسیٰؑ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ ہم نے اپنے جلوے کو صاعقہ کی صورت میں کوہ طور پر بھیجا ہے اگر اس جلوہ کے سامنے پہاڑ مقاومت نہ کر سکا تو خدا کو دیکھنے کا خواب اپنے مغز سے نکال دو۔ تھوڑی دیر کے بعد سخت بجلی چمکی، سخت آواز آئی، کوہ طور پر زلزلہ آ گیا بنی اسرائیل کے تمام افراد وحشت زدہ ہوئے اور جان دے بیٹھے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ رہے وہ بھی بے ہوش ہو گئے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ: ۶۷

[2] سورۂ بقرہ: ۵۵

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ. [1]

اس پر تمہیں بجلی نے لے ڈالا اور تم تکتے ہی رہ گئے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوش میں آئے تو خدا سے ان کی زندگی کا تقاضا کرنے لگے تا کہ وہ اس عذاب سے بچ جائیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوگئی اور سب کے سب دوبارہ زندہ ہو گئے جس طرح قرآن کی دوسری آیت میں اسی طرح ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. [2]

پھر تمہیں تمہارے مرنے کے بعد ہم نے جلا اٹھایا تا کہ تم شکر کرو۔

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تقاضا اپنی مرضی سے نہیں کیا بلکہ وہ اس پر مامور تھے کہ بنی اسرائیل کا تقاضا خدا کی بارگاہ میں پیش کرتے انہیں درس عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ ایک پہاڑ میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ ایک بجلی کے مقابلے میں باقی رہے تو یہ لوگ خدا کو دیکھنے کا کیسے ارادہ کرتے ہیں؟

آیات کے آٹھویں حصے میں بنی اسرائیل کے جنگ سے بزدلی اور بہانہ بازی کا ذکر ہوا ہے کہ جب خداوند عالم نے انہیں اپنے دشمنوں پر فتح نصیب کی اور فرعون کے شر سے بچ گئے اس کے بعد انہوں نے بیت المقدس کی طرف حرکت کی ان کے دلوں میں سالوں سے دیکھنے کی آرزو تھی جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو خدا کا حکم ہوا کہ وہ اس سرزمین میں داخل ہو جائیں اور کسی قسم کی مشکل سے نہ گھبرانا، لیکن انہوں نے موسیٰؑ سے کہا: اس زمین پر قدرت مند افراد رہتے ہیں کیونکہ عمالقہ نامی قوم وہاں رہتی تھی لہٰذا جب تک یہ قدرت مند قوم عمالقہ اس سرزمین سے خارج نہ ہو جائیں ہم داخل نہیں ہوں گے سچے مومنین کو نصیحت کی کہ مت گھبرائیں لیکن بنی اسرائیل نے اپنی جہالت اور ہٹ دھرمی کو جاری رکھا حالانکہ خدا کی طرف سے حکم ہو چکا تھا کہ ڈریں مت اور حکم خدا سے فتح بھی ہوتی لہٰذا جب ان لوگوں نے اللہ کا حکم نہ مانا اور ہٹ دھرمی پر ڈٹے رہے جس طرح ہم آیت میں بیان کر چکے ہیں۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ [3]

---

[1] سورۂ بقرہ:۵۵

[2] سورۂ بقرہ:۵۶

[3] سورۂ مائدہ:۲۴

وہ کہنے لگے اے موسیٰؑ (چاہے جو کچھ ہو) جب تک وہ لوگ اس میں ہیں ہم تو اس میں ہرگز (لاکھ برس) پاؤں نہ رکھیں گے۔ ہاں تم جاؤ اور تمہارا خدا (جائے) اور دونوں جا کے لڑو ہم تو یہیں جمے بیٹھے ہیں۔

یہاں پر بھی بنی اسرائیل کو سخت دھچکا لگا اور خدا نے اس سرزمین میں داخل ہونے کے لئے چالیس سال تک مؤخر کر دیا لہٰذا انہیں چالیس سال تک بیان میں سرگردان ہونا پڑا اس بیان کا ایک حصہ سیناء بھی تھا ان کی ہٹ دھرمی اس بات کا باعث بنی کہ انہوں نے خدا کے حکم کی اہانت کی یہ جملہ:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ.

ایک قسم کا مذاق اور اہانت تھی۔

چالیس سال تک بیابان میں سرگرداں رہنا بھی خدا کی ایک حکمت تھی کہ جو نسل مصر میں پیدا ہوئی وہ قابل اصلاح نہ تھی بلکہ نئی پیدا ہونے والی نسل کہ جو بیابان میں حیرت و سرگردانی کی حالت دیکھ چکی تھی وہ اصلاح کے قابل تھی کیونکہ انہوں نے ساری مشکلات دیکھ لی تھیں۔

آیات کے نویں حصے میں قوم فرعون کا ذکر ہے خدا کی ان کی ہدایت کے لئے معجزات بھیجے۔ قرآن مجید میں ان معجزات کی تعداد تسع عنوان یعنی نو (۹) مہم معجزات بیان ہوئی ہے لیکن بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ بلکہ بار بار بہانہ تراشی کرتے رہے اور آخر انہوں نے اس طرح کہا:

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ [1]

اور (جب عذاب میں گرفتار ہوئے تو موسیٰؑ سے) کہنے لگے اے جادوگر اس عہد کے مطابق جو تمہارے پروردگار نے تم سے کیا ہے ہمارے واسطے دعا کرو (اگر اب کی چھوٹے تو) ہم ضرور راہ پر آجائیں گے۔ پھر جب ہم نے ان سے عتاب کو ہٹا دیا تو وہ فوراً (اپنا) عہد توڑ بیٹھے۔

آیات کی تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہٹ دھرم اور بہانہ جو تھے ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہتے تھے اور جب کوئی مصیبت آتی تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سہارا لیتے تھے یہ الفاظ کہتے تھے ربك یعنی تیرا پروردگار کہا نہ ہمارا پروردگار یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پروردگار تو ہے ان کا پروردگار نہیں۔ کلمہ ینکثون فعل مضارع ہے۔ جو اس مطلب پر دلالت کرتا ہے۔ کئی بار عہد و پیمان باندھا اور پھر توڑا جس کے نتیجے میں اسی مصیبت میں گرفتار

---

[1] سورۂ زخرف: ۴۹، ۵۰

ہوئے کہ خداوندا عالم نے سب کو دریا میں غرق کر دیا۔ یہی ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ان آیات کے دسویں حصے میں مشرکین عرب کی ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ ہے وہ ہمیشہ بہانہ تراشی کرتے تھے تا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول نہ کریں اور ان کے معجزات کا انکار کریں۔ اگر ان کی روح میں حق طلبی ہوتی تو وہ قرآن جیسے بڑے معجزے سے ہدایت پاتے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ ہے لیکن وہ ہمیشہ نئے معجزے کی پیشکش کرتے لیکن پھر بھی ایمان نہیں لاتے تھے ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہٹ دھرمی کے آخری درجے پر تھے خداوند عالم فرماتا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۔ [1]

اور (اے رسولؐ) کفّار مکّہ نے تم سے کہا جب تک تم ہمارے واسطے زمین سے چشمہ نہ بہا نکالو گے ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے یا (یہ نہیں تو) کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اس میں تم بیچ بیچ میں نہریں جاری کر کے دکھلا دو یا جیسا تم گمان رکھتے تھے۔ یا ہم پر آسمان ہی کو ٹکڑے (ٹکڑے) کر کے گراؤ یا خدا اور فرشتوں کو (اپنے قول کی تصدیق میں) ہمارے سامنے (گواہی میں) لا کھڑا کر دو یا تمہارے (رہنے کے) لیے کوئی طلائی محل سرا ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم ہم پر (خدا کے ہاں سے ایک) کتاب نہ نازل کرو گے کہ ہم اُسے خود پڑھ بھی لیں، اس وقت تک ہم (تمہارے آسمان پر) چڑھنے کے بھی قائل نہ ہوں گے ان کے جواب میں خداوند عالم اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا.

(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ سبحان اللہ! میں ایک آدمی (خدا کے) رسول کے سوا آخر اور کیا ہوں (جو یہ بیہودہ باتیں کرتے ہو)۔

اس کلام میں بہانہ تراشی نمایاں اور مکمل ظاہر ہوتی ہے اس سے ایک اور انحرافی نقطہ ملتا ہے کہ وہ یہ تصور کرتے

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳

تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام جہاں کی حاکمیت کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ معجزات ہمیشہ خدا کی طرف سے ہیں۔ جب خدا چاہتا ہے نازل کرتا ہے لہٰذا آیات کے آخر میں اس طرح آیا ہے ان آیات کا شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ ک ایک گروہ یعنی سب سے آگے ولید بن مغیرہ اور ابوجہل تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کے کنارے اجماع کیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاموں کے بارے میں بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی شخص کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجنا چاہیے اور انہیں تجویز دیں کہ وہ اس جگہ میں آئے اور ہمارے ساتھ بات کریں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلدی سے ان کے پاس گئے تو شاید وہ حق کو قبول کرلیں۔ لیکن آپ کے جانے تو تو میں میں ہونے لگا بلکہ آپ کی اہانت کی گئی۔ یقیناً اگر وہ حق کی تلاش میں ہوتے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی ضرور بات سنتے اور انہیں معجزہ بھی دکھاتے۔ لیکن مشرکین کئی معجزے دیکھ چکے تھے اور انکار کر چکے تھے آخر انہوں نے کہا کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان جائے تو بھی ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر انہوں نے کہا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی طرف سے ایک خط لے آئے لیکن اگر آپ ایسا بھی کرتے تو وہ ایمان لانے والے نہیں تھے کیونکہ وہ پہلے بہانہ تراشی اور ہٹ دھرمی میں مشہور ہو چکے تھے اور اگر معجزہ کو دیکھ بھی لیتے تو فوراً کہتے تھے یہ کام جادو ہے اور یہ مرد جادوگر ہے اور اس جیسی تہمتیں لگاتے تھے۔

مذکورہ آیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ پوری تاریخ آغاز بشر سے لے کر آج تک راہ حق کے لئے ایک مانع ہے انبیاء کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ ان کی قوم بہانہ تراشی اور ہٹ دھرمی میں مبتلا تھی۔

روایات میں بہانہ تراشی اور ہٹ دھرمی

ہم اس کتاب کی فصل نہم میں تعصب اور ہٹ دھرمی کو بیان کر چکے ہیں اب ہم روایات کی روشنی میں بیان کریں گے کہ لوگ کیسے اندھی تقلید کا شکار ہو جاتے ہیں اور بچوں جیسے بہانہ تراشی کرتے ہیں بعض افراد حق کو کبھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ بہانہ ڈھونڈتے ہیں بہت سارے لوگ اس برائی میں مبتلا ہو کر سعادت سے محروم رہتے ہیں اور بدبختی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الخَيْرُ عَادَةٌ و الشَّرُّ لَجَاجَة.[1]

نیک کام بتدریج عادت بنتے ہیں لیکن برے کام ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہیں۔

۲۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

إِيَّاكَ وَمَذْمُومَ اللَّجَاجِ فَإِنَّهُ يُثِيرُ الْحُرُوب.[2]

ہٹ دھرمی سے بچو کیونکہ یہ جنگ کا باعث ہے۔

اس روایت میں مظلوم کلمہ ذکر ہوا ہے جسے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی انسان نیکی کے کاموں میں بھی اصرار کرتا ہے اور اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

جِمَاعُ الشَّرِّ اللَّجَاجُ وَ كَثْرَةُ الْمُمَارَاة.[3]

شر و فساد کا مرکز ہٹ دھرمی اور تعصب انگیز بحث ہے۔

بعض لوگ اجتماعی مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں بعض لوگ ہٹ دھرمی کی وجہ سے اور بعض جہل و نادانی کی وجہ سے اچانک ان کے درمیان جھگڑا ہوجاتا ہے جس سے دونوں گروہ بغیر ہدف کے لڑتے ہیں اور قتل ہوجاتے ہیں حالانکہ اگر وہ تھوڑا یہ سوچتے تو اس فساد عظیم سے بچ جاتے۔

۴۔حضرت علی علیہ السلام اس بری عادت کی مذمت کے بارے میں فرماتے ہیں:

خَيْرُ الْأَخْلَاقِ أَبْعَدُهَا عَنِ اللَّجَاج.[4]

بہترین اخلاق وہ اخلاق ہے جو ہٹ دھرمی سے دور ہو۔

۵۔آپؑ ہی فرماتے ہیں:

لَا مَرْكَبَ أَجْمَحُ مِنَ اللَّجَاجِ.[5]

---

[1] اساس البلاغہ صفحہ ۴۳۸

[2] تصنیف غرر الحکم و درر الکلم / 464 / بعض آثارها .....ص: 464

[3] تصنیف غرر الحکم و درر الکلم / 463 / ذمها .....ص: 463

[4] تصنیف غرر الحکم و درر الکلم / 463 / ذمها .....ص: 463

[5] عیون الحکم و المواعظ (للیثی) / 540 / الفصل الثانی بلفظ النفی.....ص: 531

ہٹ دھرمی سے بڑھ کر کوئی سرکش سواری نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہانہ تراشی انسان کو ایسی وادی میں لے جاتی ہے جس کی وہ امید بھی نہیں کرتے کبھی جھوٹ کبھی تکبر کبھی دھوکا۔

۶۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے چاہا کہ اپنے معلم خضرؑ سے جدا ہوں تو انہوں نے نصیحت کی حضرت خضر علیہ السلام کی نصیحت یہ تھی:

إِيَّاكَ وَ اللَّجَاجَةَ أَوْ أَنْ تَمْشِيَ فِي غَيْرِ حَاجَةٍ أَوْ أَنْ تَضْحَكَ مِنْ غَيْرِ عَجَبٍ وَ اذْكُرْ خَطِيئَتَكَ وَإِيَّاكَ وَ خَطَايَا النَّاسِ.[1]

بہانہ جوئی سے پرہیز کرنا، وہ جن کی تمہیں حاجت نہیں ان کے قریب نہ جانا، بے وجہ ہنسنا نہیں، اپنے خطاؤں کو یاد رکھنا اور لوگوں کی خطاؤں کو بھول جانا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی کا کوئی خاص ہدف نہیں ہوتا اور نہ ہی عقل و منطق کے مطابق۔

۷۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جو ہٹ دھرمی کرتا ہے:

وَ مَنْ لَجَّ وَ تَمَادَى فَهُوَ الرَّاكِسُ الَّذِي رَانَ اللهُ عَلَى قَلْبِهِ وَ صَارَتْ دَائِرَةُ السَّوْءِ عَلَى رَأْسِهِ.[2]

جو شخص بہانہ جوئی وعہد شکنی کرے وہ شخص ہے جس کے دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور زمانے کے حوادث اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔

ان کے علاوہ اس برے اخلاقی مرض کو بیان کرنے کے لئے بہت سی روایات ہیں جن میں سے ہم نے بعض کی طرف اشارہ کیا ہے ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے اتنی بری اخلاقی بیماری ہے کہ انسان کو بدبخت بنا دیتی ہے اور حق سے دور اور باطل کے نزدیک کر دیتی ہے اور اس کا بہت برا انجام نکلتا ہے۔

---

[1] الامالی (للصدوق) / النص / 323 / المجلس الثانی و الخمسون۔ بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 13 / 294 / باب 10 قصة موسى عليه السلام حين لقي الخضر و سائر قصص الخضر عليه السلام و أحواله.....ص: 278

[2] شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد / ج 17 / 141 / 58 و من كتاب له عليه السلام كتبه إلى أهل الأمصار يقص فيه ما جرى بينه و بين أهل صفين.....ص: 141

بہانہ جوئی کے عوامل

اس بری عادت کا سر چشمہ جہالت اور نادانی ہے عاقل اور متفکر افراد ہمیشہ عقل و منطق کے طابع ہوتے ہیں اور استدلال کو قبول کرتے ہیں لیکن جہل اور نادان افراد آسانی سے اپنی عادت کو نہیں چھوڑتے ہیں اور ان کے سامنے استدلال کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس کا ایک عامل یہ ہے کہ سرزنش کا اثر نہیں ہوتا اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس کی سرزنش کرتے ہیں اگر یہ سرزنش محبت سے ہو تو حق کی طرف بازگشت ممکن ہے لیکن اگر یہ سرزنش حد سے زیادہ ہو جائے تو اکثر لوگ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی کام غلط انجام نہیں دیا اور وہ اپنی بات چلاتے ہیں آہستہ آہستہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے اچھے کام انجام دیئے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں:

الْإِفْرَاطُ فِي الْمَلَامَةِ يُشِبُّ نِيرَانَ اللَّجَاجَةِ. [1]

زیادہ سرزنش کرنے سے ہٹ دھرمی کی یاد شعلہ ور ہوتی ہے۔

اس صفت کا تیسرا عامل احساس حقارت ہے حقارت کی وجہ سے لوگ دوسروں کے دباؤ میں نہیں رہتے اور اپنی شخصیت کو ثابت رکھنے کے لئے دوسروں کی بات نہیں سنتے ہیں وہ منطقی کلام کو قبول نہیں کرتے اور اپنی باطل پر ڈٹے رہتے ہیں حالانکہ بعض افراد منطق و دلیل کے سامنے سر تسلیم ہوتے ہیں اور ہرگز گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔

ضعیف ارادہ اور کم ظرفی بہانہ جوئی اور ہٹ دھرمی کے لئے چوتھا عامل شمار ہوتا ہے یہ ظاہر ہے اگر کوئی شخص بہت مدت تک اشتباہ میں رہے تو وہ اپنے اشتباہ پر اچھائی کو قبول نہیں کرتا اس کے لئے قوی ارادہ اور شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانچواں عامل آرام طلبی ہے کیونکہ ایسے راستے کو چھوڑنا آسان نہیں جس پر انسان کافی مدت تک گامزن رہے یہ سب عوامل وہ بہانہ تراشی کی عادت کے لئے ذکر کر سکتے ہیں۔

اس بری عادت کے منفی آثار کسی پر مخفی نہیں ہے کیونکہ ایک طرف انسان مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے جس طرح

---

[1] عیون الحکم و المواعظ (للیثی) / 22 / الفصل الأول مما أوله الألف و اللام .....ص: 17

بنی اسرائیل کی گائے کی داستان ہے انہوں نے اپنی مشکل کو خود زیادہ مشکل بنایا یہاں تک کہ اس گائے کی صفات کے بارے میں اعتراض کرتے رہے جس کے ذریعے انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی حدیث میں ہے کہ سب سے مل کر گائے کو خریدنے کے لئے مال جمع کیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور فریاد کرنے لگے اور کہنے لگے اے موسیٰؑ ہمارا قبیلہ فقیر ہو گیا ہے اور گدھائی کرنے لگا ہے یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے محبت کی اور انہیں دعا سکھائی تا کہ ان کی مشکلات حل ہو جائیں۔

درک واقعیت سے محروم ہونا انسان کے تکامل کے لئے زمینہ ساز ہے اس بری عادت کے منفی آثار میں سے ہیں کیونکہ ہٹ دھرمی اور بہانہ تراشی انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کریں اور حقائق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ ترقی و تکامل سے محروم رہتا ہے۔ لوگ عام طور پر ہٹ دھرم اور بداخلاق لوگوں سے متنفر ہوتے ہیں اور ان کی مدد کے لئے تیار نہیں ہوتے کیونکہ اجتماعی کاموں میں انعطاف پذیری کی ضرورت ہوتی ہے اور ہٹ دھرمی سے کام نہیں چلتا اس قسم کے افراد معاشرے میں نادان مشہور ہوتے ہیں جس طرح حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَ مَنْ نَازَعَ فِي الرَّأْيِ وَ خَاصَمَ شُهِرَ بِالْعَثَلِ مِنْ طُولِ اللَّجَاجِ.[1]

جو شخص اپنے اعتقاد کا دفاع ہٹ دھرمی سے کرتا ہے وہ معاشرے میں نادان مشہور ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا یہ بری عادت انسان کو خدائی مخلوق اور حتیٰ کہ آپ کو اپنے سے دور کر دیتی ہے جب تک یہ خامی انسان سے نہیں نکلتی وہ معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

پائیداری اور ہٹ دھرمی میں فرق

جو شخص خیر اور حق کے راستے کا راہی بن جائے تو اس نے ایک بہترین کام انجام دیا ہے یہ وہ فضیلت اور صبر و استقامت ہے کہ جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن اگر شخص ناحق اور باطل اختیار کریں وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ مخالفین کو غلط سمجھتا ہے۔

---

[1] الكافي (ط - الإسلامية) / ج 2 / 392 / باب دعائم الكفر و شعبه ..... ص : 391۔ مرآة العقول في شرح أخبار آل الرسول / ج 11/ 148/ الحديث 1..... ص: 139

ہٹ دھرمی کا علاج

ہم جانتے ہیں کہ اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں کا علاج، عام طور پر دو طریقے ہیں:

ا۔ پہلا علمی ہے اور اسے بد اخلاقی کے انجام دینے سے منفی آثار ہوتے ہیں یعنی انسان خدا اور مخلوق سے دور ہو جاتا ہے راہ تکامل بند ہو جاتی ہے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بہانہ تراشی ایمان سے سازگار نہیں ہے۔ جس طرح کہ روایت ہے:

سِتَّةٌ لا تَكُونُ فی المُؤمِنِ

قيلَ وَ ما هی؟

قالَ العُسْرُ وَ النَّكْدُ وَ اللَّجاجَةُ وَ الكِذْبُ وَ الْحَسَدُ وَ الْبَغیُ.[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

چھ چیزیں اگر انسان میں پائی جائیں تو اس کا ایمان نہیں ہوتا ہے۔

پوچھا گیا: وہ چھ چیزیں کون سی ہیں؟

فرمایا: سخت گیر، بخل، ہٹ دھرمی، جھوٹ، حسد اور ظلم ہے۔

دوسرا طریقہ عملی ہے یعنی اگر کسی میں اس صفت کے مقدمات پائے تو فوراً حق قبول کر لینا چاہیے اور نصیحت کرنے والے کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن اگر ابتدا ہی سے وہ سختی کا مظاہرہ کرے تو ایک بات ہٹ دھرمی والی نہیں ہوتی۔ ہٹ دھرم افراد کے ساتھ میل جول نہیں رکھنا چاہیے اور اس کے ساتھ بات نہ کریں بلکہ پہلے بزرگوں کے حالات کا مطالعہ کریں تو وہ کیسے ایک بچے یا حیوان سے صرف حق کو قبول کرتے اگر شاگرد اشکال کرتا تو اسے دوست سمجھتے اور اس کا احترام کرتے تھے ریاکاری اور جہل و نادانی سے اصلاح نہیں کر سکتے۔



[1] بحار الأنوار، جلد 13، صفحہ 272.

مَكْتُوبٌ فِي التُّوراتِ، الشُّكرُ مِنَ النِّعَمِ عَليكَ وَ اَنْعِمُ عَلى مَنْ شَكَرَكَ فَاِنَّهُ لا زَوالَ لِلنَّعماءِ اذا شُكِرَتْ، وَ لا بَقاءَ لَها اِذا كُفِرَتْ.

تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جو کوئی نعمت دیتا ہے اس کا شکر کرو اور جو تیرا شکر کرے تو اسے نعمت بخش دے کیونکہ اگر نعمتوں کا شکر کیا گیا تو زوال نہیں ہوتا اور اگر کفران نعمت کیا تو بقاء نہیں ملے گی۔

۳۔ کفران نعمت اور شکر گزاری

اشارہ: شکر نعمت یعنی نعمت کی قدردانی ہے خاص زبان سے جو یا عمل سے لہٰذا کفران نعمت اور ناشکری یعنی نعمت کو ضائع کرنا اور انہیں حقیر سمجھنا یہ ایک اہم اخلاقی برائی ہے چاہیے اس کا تعلق اخروی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے ہو شکر گزاری سے معاشرے میں محبت تازہ ہوتی ہے حالانکہ ناشکری سے تعلقات قطع ہوتے ہیں اور انسانی معاشرہ جہنم کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے انسانی روح کے تکامل، سیر و سلوک اور تزکیہ نفس کے لئے کفران نعمت بہت بڑا مانع ہے اس سے روح آلودہ ہو جاتی ہے دل ضعیف ہو جاتا ہے اور باطل کی روحانیت ختم ہو جاتی ہے۔

شکر منعم انسانی فطرت ایک امانت ہے اسے خداشناشی اور توحید پرستی کی راہ ملتی ہے بہت سارے علما نے عقیدت کی بحث میں سب سے پہلے ضرورت شناخت الٰہی پر تقیہ کرتے ہیں اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ وہ آیات قرآنی جو کفران نعمت کی مذمت اور شکر نعمت کی تعریف کرتے ہیں۔

تفسیر و خلاصہ

سب سے پہلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا تذکرہ ہوا ہے فرماتے ہیں:

① ۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ. [1]

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے تمہیں جتا دیا کہ اگر میرا شکر کرو گے تو میں یقیناً تم پر (نعمت کی) زیادتی کروں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو یاد رکھو کہ یقیناً میرا عذاب سخت ہے۔

② ۔ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ. [2]

اور جو شخص ناشکری کرتا ہے تو (یاد رکھے) میرا پروردگار یقیناً بے پروا اور سخی ہے۔

③ ۔ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ. [3]

اور جس نے ناشکری کی تو (اپنا بگاڑا کیونکہ) خدا تو (بہرحال) بے پروا (اور) قابل حمد وثنا ہے۔

④ ۔ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ. [4]

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائیں پھر اس کو ہم اس سے چھین لیں تو (اس وقت) یقیناً بڑا بے آس اور ناشکرا ہوجاتا ہے۔ (اور ہماری شکایت کرنے لگتا ہے) اور اگر ہم تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تھی، راحت وآرام کا ذائقہ چکھائیں تو ضرور کہنے لگتا ہے کہ اب تو سب سختیاں مجھ سے دفع ہوگئیں اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا (جلدی) خوش ہوجانے والا شیخی باز ہے۔

⑤ ۔ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى

---

[1] سورۂ ابراہیم: ۷

[2] سورۂ نمل: ۴۰

[3] سورۂ لقمان: ۱۲

[4] سورۂ ہود: ۹، ۱۰

الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا.[1]

اور جب سمندر میں کبھی تم کو کوئی تکلیف پہنچی تو جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے غائب (غلا) ہو گئے مگر بس وہی (ایک خدا یاد رہتا ہے) اس پر بھی جب خدا نے تم کو چھٹکارا دے کر خشکی تک پہنچا دیا پھر تم اس سے مُنہ موڑ بیٹھے اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

۶۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ.[2]

(اے رسولؐ) کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جنہوں نے میرے احسان کے بدلے ناشکری اختیار کی اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک دیا کہ سب کے سب جہنم واصل ہوں گے اور وہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔

۷۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ.[3]

خدا نے ایک گاؤں کی مثل بیان فرمائی جس کے رہنے والے ہر طرح کے چین و اطمینان میں تھے ہر طرف سے بافراغت ان کی روزی ان کے پاس چلی آتی تھی پھر ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو خدا نے بھی ان کے کرتوتوں کی بدولت ان کو مزا چکھا دیا کہ بھوک اور خوف کو اوڑھنا (بچھونا) بنا دیا۔

۸۔ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل: ۶۷

[2] سورۂ ابراہیم: ۲۸، ۲۹

[3] سورۂ نحل: ۱۱۲

قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ. [1]

اور (قوم) سبا کے لیے تو یقیناً خود انہی کے گھروں میں (قدرتِ خدا کی) ایک بڑی نشانی تھی (کہ ان کے شہر کے دونوں طرف) داہنے بائیں (ہرے بھرے) باغات تھے۔(اور ان کو حکم تھا کہ) اپنے پروردگار کی دی ہوئی روزی کھاؤ (پیو) اور اس کا شکر ادا کرو (دنیا میں) کیسا پاکیزہ شہر اور (آخرت میں) پروردگار سا بخشنے والا۔ اس پر بھی ان لوگوں نے منہ پھیرلیا (اور پیغمبروں کا کہا نہ مانا) تو ہم نے (ایک ہی بند توڑ کر) ان پر بڑے زوروں کا سیلاب بھیج دیا اور (ان کو تباہ کر کے) ان کے دونوں باغوں کے بدلے ایسے دو باغ دیئے جن کے پھل بدمزہ تھے اور ان میں جھاؤ تھا اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کی سزا دی اور ہم تو بڑے ناشکروں ہی کی سزا کیا کرتے ہیں۔

تفسیر وجمع بندی

یہ کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت بنی اسرائیل سے کیا کہ جب بنی اسرائیل نے فرعون سے نجات پائی اور استقلال، عظمت، آزادی اور نعمتوں سے مالا مال ہوئے "لَاَزِيْدَنَّ" اس بات کی تاکید ہے کہ وعدہ الٰہی شکر گزار افراد کو زیادہ نعمتیں دینے کا وعدہ کرتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کفران نعمت کرنے والوں کے بارے میں نہیں فرماتا کہ میں تمہیں عذاب کروں گا بلکہ فرمایا کہ میرا عذاب سخت عذاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم بہت ہی مہربان ہے۔حالانکہ نعمت کی ناشکری کرنے والوں کے لئے سخت عذاب کی سزا سنائی گئی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل اپنی ناشکری کی وجہ سے چالیس سال تک بیابان میں سرگردان رہے۔

دوسری آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہوا ہے کہ جب انہوں نے وزراء کو تخت ملکہ بلقیس شام سے یمن لانے کے لئے کہا تو سلیمان کے ایک قریبی آدمی جن کے پاس کتاب کا علم تھا نے کہا: ''میں آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو لے آتا ہوں سلیمان اس شخص کے اس عمل سے بہت خوش ہوئے چونکہ درمیان میں ایسی معنوی قدرت کے افراد موجود ہیں وہ ایسے کام انجام دے سکتے ہیں پھر اس نے کہا:

---

[1] سورۂ سبا:۱۵ تا ۱۷

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ.

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے تمہیں جتا دیا کہ اگر میرا شکر کرو گے تو میں یقیناً تم پر (نعمت کی) زیادتی کروں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو یاد رکھو کہ یقیناً میرا عذاب سخت ہے۔

قابل غور نقطہ یہ ہے کہ شکر گزار افراد کی جگہ ذکر ہوئی ہے لیکن کفران نعمت کرنے والوں کی سزا مستقل طور پر بیان نہیں ہوئی فرماتا ہے جو شخص کفران نعمت کرے میرا پروردگار بے نیاز و کریم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات بہت ہی کریم اور مہربان ہے اس سے یہ نقطہ بھی ملتا ہے کہ خداوند عالم نے کفران نعمت والوں کو ڈرایا اور شکر گزاری کرنے والوں کو دعوت دیتا ہے یہ اس لئے نہیں کہ وہ خرچ کرتا ہے بلکہ وہ تو بعض اوقات ناشکری میں بھی لطف و کرم کرتا ہے تا کہ لوگ بیدار ہو جائے اور خدا کی نعمتوں سے محروم نہ رہے جائیں۔ اصولاً تمام وظائف الٰہی کا نتیجہ بندوں کی طرف جاتا ہے ان کی تربیت کی کلاس ہے وگرنہ خدا کی ذات غنی ہے نہ بندوں کی اطاعت اسے منفعت پہنچاتی ہے اور نہ ہی گناہ سے اس کی کبریائی میں کمی آتی ہے۔

تیسری آیت میں لقمان حکیم نے کہا خدا فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ.[1]

اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور حکم دیا تھا کہ) تم خدا کا شکر کرو۔ اور جو خدا کا شکر کرے گا وہ اپنے ہی (فائدہ کے) لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو (اپنا بگاڑا کیونکہ) خدا تو (بہرحال) بے پروا (اور) قابل حمد و ثنا ہے۔

خداوند عالم نے لقمان کو جو حکمت سکھائی وہ تمام افراد کو شامل ہے حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں اور وہ خدا ایک معنوی نعمت ہے یہاں دو قابل ذکر نقاط ہے۔

(۱) شکر گزاری فعل مضارع کی صورت میں ذکر ہوئی ہے اور کفران نعمت فعل ماضی کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔

---

[1] سورۂ لقمان: ۱۲

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے تکامل اور قرب الٰہی کے لئے ہمیشہ کے شکر کرنا لازم ہے حالانکہ گناہ ناشکری صرف ایک لحظہ میں انسان کو بدبخت بنا دیتی ہے اور برے و دردناک نتائج نکلتے ہیں آیت میں دوصفت غنی وحمید (بے نیازی وحمد) ذکر ہوئے ہیں حالانکہ وہ آیت جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ہے اس میں دوصفات غنی وکریم بیان ہوئی ہیں اور یہ فرق شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا اپنے شکر گزار بندوں پر حال میں غنی و بے نیاز ہیں اور فرشتے اس کی ہمیشہ سے حمد وثنا کر رہے ہیں اگر چہ وہ حمد وثنا کا بھی محتاج نہیں ہے۔

چوتھی آیت میں کم ظرف اور بے تقویٰ افراد کا ذکر ہوا ہے کہ ناشکری ان کا وطیرہ ہے خدا فرماتا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹
وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ.

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائیں پھر اس کو ہم اس سے چھین لیں تو (اس وقت) یقیناً بڑا بے آس اور ناشکرا ہوجاتا ہے۔ (اور ہماری شکایت کرنے لگتا ہے) اور اگر ہم تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تھی، راحت وآرام کا ذائقہ چکھائیں تو ضرور کہنے لگتا ہے کہ اب تو سب سختیاں مجھ سے دفع ہوگئیں اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا (جلدی) خوش ہوجانے والا شیخی باز ہے۔

جس طرح قرآن مجید میں مذموم صفات مطلق ذکر ہوتی ہیں یہ اس مطلب کی طرف اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو بے تربیت، بے ایمان ہیں اسی وجہ سے ہم بعد والی آیات میں پڑھتے ہیں:

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ. [1]

مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور اچھے اچھے کام کیے (وہ ایسے نہیں) یہ وہ لوگ ہیں جن کے واسطے (خدا کی) بخشش اور بہت بڑی (کھری) مزدوری ہے۔

اس استثناء سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انسان ناشکرا، ناامید، غافل اور مغرور ہے اور جو ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں اور صبر وعمل صالح انجام دینے والے ہوں اس چند آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کفران نعمت اور ناشکری انسان کو ایسی مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ انسان مغفرت اور اجر وثواب سے محروم رہتے ہیں یہ تعبیر کہ "ولئن اذقنا" ایک لطیف تعبیر ہے خدا فرماتا ہے کہ جب بے ایمان یا ضعیف الایمان کی نعمتوں میں اگر تھوڑی سی کمی واقع ہو تو وہ اظہار ناشکری کرنا شروع کر دیتے ہیں وہ ناامید ہوجاتے ہیں اور اگر انہیں کوئی نعمت مل جائے تو غرور کرنا شروع کر دیتے ہیں

---

[1] سورۂ ہود:۱۱

غافل ہو جاتے ہیں حالانکہ جو کچھ ان کو ملتا ہے وہ دنیا کا بہت ہی ایک کم حصہ ہے کم دینا یا زیادہ خدا کی ذات بہتر جانتی ہے۔

پانچویں آیت میں ان افراد کا ذکر ہے جن کو جب کوئی مصیبت آتی ہے تو خدا کی پناہ لیتے ہیں اور اس کے کرم کی امید رکھتے ہیں۔ صرف خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب یہ مصیبت ختم ہو جاتی ہے تو پھر بھول جاتے ہیں اور ناشکری کا اظہار کرتے ہیں خدا فرماتا ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا.

اور جب سمندر میں کبھی تم کو کوئی تکلیف پہنچی تو جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے غائب ہو گئے مگر بس وہی (ایک خدا یاد رہتا ہے) اس پر بھی جب خدا نے تم کو چھٹکارا دے کر خشکی تک پہنچا دیا پھر تم اس سے مُنہ موڑ بیٹھے اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

ہم اپنی زندگی میں ایسے افراد کو دیکھتے ہیں کہ جب بے ایمان یا ضعیف ایمان والے افراد کسی بلا و مصیبت میں اسیر ہو جاتے ہیں تو خدا کو خلوص دل کے ساتھ پکارتے ہیں تا کہ ان کی مصیبتیں دور ہو جائیں لیکن دور ہو جانے کے بعد وہ خواب غفلت میں پڑ جاتے ہیں حالانکہ انہیں خدا کا اور زیادہ شکر بجالانا چاہئے۔

آگے قرآن مجید کی ایک بہت ہی لطیف آیت ہے ارشاد ہوتا ہے:

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا.

یا تم کو اس کا بھی اطمینان ہو گیا ہے کہ خدا پھر تم کو دوبارہ اسی سمندر میں لے جائے گا اس کے بعد ہوا کا ایک ایسا جھونکا جو (جہاز کے) پرخچے اڑا دے تم پر بھیجے پھر تمہیں تمہارے کفر کی سزا میں ڈوبا دے پھر تم کسی کو (ایسا حمایتی) نہ پاؤ گے جو ہمارا پیچھا کرے (اور تمہیں چھڑائے)

یہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ تم کیسے ناشکری کا اظہار کرتے ہو اور کیسے مغرور ہوتے ہو تم جہاں بھی ہو خدا کی قدرت سے باہر نہیں۔ دریا میں پانی کی موجیں خدا کے حکم سے ہیں بحر و بر، خشک و تر، ریت کے ٹیلے خدا کے حکم سے اونچے نیچے ہیں خدا تمہیں دریا کی موجوں میں غرق کر سکتا ہے اور خشکی پر تمہیں زمین میں دھنسا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کی آیت میں دو کلمات استعمال ہوئے ہیں ''خسف'' خشکی میں زمین میں دھنس جانا اور ''غرق'' دریا کی موجوں میں

ہلاک کر دینا۔

ان آیت کے چھٹے حصے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلام ہوتا ہے ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ.

(اے رسولؐ) کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جنہوں نے میرے احسان کے بدلے ناشکری اختیار کی اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک دیا۔

ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفران نعمت کرنے سے ممکن ہے انسان دوزخ میں جائے جو اس کے لئے بدترین ٹھکانہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ آیت میں نعمت سے کیا مراد ہے؟

بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے کہ مشرکین نے ان کا انکار کیا (جو کہ کفران نعمت ہے) اور جہنم میں گئے۔

بعض نے تحریر کیا ہے کہ نعمت سے مراد اہل بیت علیہم السلام ہیں کہ جن کا بنی امیہ نے انکار کیا۔

لیکن اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت عموم پر دلالت کرتی ہے یعنی خدا کی سب نعمتوں کو شامل ہے۔ بعض مفسرین جیسے فخر رازی مرحوم اور مرحوم طبرسی مجمع البیان میں مذکورہ آیات کے شان نزول میں لکھتے ہیں کہ ان سے مراد اہل مکہ ہیں کہ خدا نے انہیں بے شمار نعمتیں دیں جن میں ایک رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بھی ہے انہوں نے کفران نعمت کیا اور سخت عذاب میں مبتلا ہوئے ان کا رسول کا انکار کرنا ان کا کفر تھا۔

آیت کے ساتویں حصے میں اس گروہ کا ذکر ہوا ہے کہ جن کو اللہ کی نعمتیں ملی تھیں جیسے امن کی نعمت، رزق و روزی اور دونوں نعمتیں جو انبیاء کے ذریعے انہیں ملی تھیں لیکن انہوں نے انکار کیا جن سے وہ نعمتوں سے محروم ہو گئے اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئے خداوند عالم فرماتا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرۡيَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً يَّاۡتِيۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا مِّنۡ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ بِمَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ.

خدا نے ایک گاؤں کی مثل بیان فرمائی جس کے رہنے والے ہر طرح کے چین و اطمینان میں تھے ہر طرف سے بافراغت ان کی روزی ان کے پاس چلی آتی تھی پھر ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو خدا نے بھی ان کے کرتوتوں کی بدولت ان کو مزا چکھا دیا کہ بھوک اور خوف

کو اوڑھنا (بچھونا) بنا دیا۔

ان آیات میں ایک خاص زمین کی طرف اشارہ ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ سرزمین مکہ مراد ہے اس عبارت میں بھی اس سرزمین کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مکہ کی سرزمین ہی خشک و بیابان وصحرا والی ہے وہاں کسی قسم کی کوئی گھاس نہیں اس عبارت میں۔

يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ

پس مکہ کی سرزمین مراد ہوسکتی ہے کیونکہ حجاز کی سرزمین بدامنی کی جگہ بھی تھی لیکن خانہ کعبہ میں امن و امان تھا جب نعمتیں زیادہ ہوئیں اور دونوں نعمت یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اضافہ ہوا تو اہل مکہ نے ان مادی ومعنوی نعمت کا انکار کر دیا تو قحط، بدامنی جیسی مصیبت میں اسیر ہو گئے اور یہ ناشکری کرنے والوں کا انجام ہوتا ہے۔

لیکن آیت کا جمع مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ ان تمام گروہوں کو شامل ہو جو مادی ومعنوی نعمتوں کا انکار کرنے والے ہیں اور اہل مکہ ان میں سے ایک مصداق ہے۔

آیات کے آٹھویں حصے میں ایک ناشکر ترین قوم کا تذکرہ ہوا ہے یعنی قوم سبا مراد ہے اللہ نے انہیں بہترین نعمتیں عطا کی لیکن انہوں نے غفلت، غرور اور ہوس بازی جیسی بری صفات کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا لہٰذا خدا نے سب نعمتیں واپس لے لیں خداوند عالم فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ﴿١٥﴾

اور (قوم) سبا کے لیے تو یقیناً خود انہی کے گھروں میں (قدرتِ خدا کی) ایک بڑی نشانی تھی (کہ ان کے شہر کے دونوں طرف) داہنے بائیں (ہرے بھرے) باغات تھے۔(اور ان کو حکم تھا کہ) اپنے پروردگار کی دی ہوئی روزی کھاؤ (پیو) اور اس کا شکر ادا کرو (دنیا میں) کیسا پاکیزہ شہر اور (آخرت میں) پروردگار سا بخشنے والا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ خاک یمن وسیع وعریض اور زرخیز تھی وہاں کوئی دریا نہیں لہٰذا خاک کا کوئی خاص محصول نہیں اگتا تھا وہاں کے رہنے والوں نے یہ لکھا کہ پہاڑوں سے آنے والے پانی کو جمع کریں لہٰذا انہوں نے پانی کے ڈیم بنائے ان میں اہم ڈیم (سدماء ب) تھا بلق کے دو عظیم پہاڑوں کا پانی جمع ہوتا اس ڈیم کے پیچھے بھی پانی جمع تھا جس سے انہوں نے ڈیم کے ساتھ باغ بنائے اور آہستہ آہستہ قریبی گاؤں میں بھی آبپاشی کا نظام شروع ہو گیا اور کھیتی

باڑی کا سلسلہ شروع کیا گیا ہر طرف درخت اور سبزہ نظر آنے لگا بے شمار نعمتیں وجود میں آئیں۔ یہ علاقہ باامن اور نعمتوں کے لئے فراواں اور لوگوں کی زندگی اچھی ہوگئی خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا بہترین موقع تھا۔

دوسری آیت میں خداوندعالم فرماتا ہے وہ لوگ نعمتوں سے جب محروم تھے تو وہ وقت بھول گئے اور خدا کو آہستہ آہستہ بھول گئے اور کفران نعمت کرنے لگے ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے امیر وغریب کی تقسیم ہوگئی اور آخر برے انجام کو پہنچے۔

فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ وَبَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّاَثۡلٍ وَّشَىۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا ؕ وَهَلۡ نُجٰزِىۡۤ اِلَّا الۡكَفُوۡرَ.

اس پر بھی ان لوگوں نے منہ پھیرلیا (اور پیغمبروں کا کہا نہ مانا) تو ہم نے (ایک ہی بند توڑ کر) ان پر بڑے زوروں کا سیلاب بھیج دیا اور (ان کو تباہ کرکے) ان کے دونوں باغوں کے بدلے ایسے دو باغ دیئے جن کے پھل بدمزہ تھے اور ان میں جھاؤ تھا اور کچھ تھوڑی سی بیریاں تھیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کی سزا دی اور ہم تو بڑے ناشکروں ی کو سزا دیا کرتے ہیں۔

قرآن کی تعبیر کے مطابق وہ خدا سے دور ہو گئے خدا فرماتا ہے ہم نے ایسا سیلاب بھیجا جس سے وہ دو باغ بہہ گئے۔ درخت نابود ہو گئے پھل کا ذائقہ بدمزہ ہوگیا کفران نعمت کی انہیں یہ سزا ملی۔

بعض تاریخوں میں اس عجیب وغریب داستان کے بارے میں ملتا ہے: صحرائی چوہے نکل آئے اور چوہوں نے ان کفران نعمت کرنے والے مغرور لوگوں پر حملہ کر دیا جس سے ڈیم کی دیواریں بھی کمزور ہوگئیں اچانک شدید بارش آئی اور عظیم سیلاب آیا جس سے ڈیم کی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں تمام محل، باغ، حیوانات اور کھیتیاں نابود ہوگئیں دوبارہ یہ آباد زمین بیابان وصحرا میں بدل گئی پرندے کوچ کر گئے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے وہ جو کل ثروت مند تھے آج فقیر بن گئے اور در بدر دھکے کھا رہے تھے جی ہاں! یہ ہے ناشکری قوم کی بداعمالی کا نتیجہ۔

دلچسپ یہ ہے قوم سبط کے ثروت مند افراد شکایت کرتے تھے کہ ہماری آبادیاں کیوں ایک دوسرے کے قریب ہوگئی ہیں اور آنا جانا آسان ہوگیا ہے پہلے ہم آسانی سے سفر کرتے تھے اب ہمارے ساتھ فقرا بھی سفر کرتے ہیں لہٰذا انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے درمیان خدا فاصلہ کر دے تا کہ وہ غریبوں کے ساتھ سفر کرنے سے بچ جائیں۔

ہاں! انہوں نے کفران نعت کا آخری درجہ اختیار کیا لہٰذا ان کی سزا بھی اعلیٰ درجہ کی تھی وہ اس طرح نابود ہوئے کہ لوگوں کے لئے ایک ضرب المثل بن کے رہ گئے۔

تَفَرَّقُوا أَيادِي سَبَأً.[1]

مذکورہ آیات میں کفران نعمت بطور مطلق بیان ہوئی ہے اور گزشتہ ناشکر اقوام کی حالت کو بیان کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفران نعمت اور ناشکری کتنی بری چیز ہے اور اس کے آثار کتنے خطرناک ہیں

روایات میں کفران نعمت

بہت سی روایات کفران نعمت اور ان کے خطرناک آثار پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَسْرَعُ الذُّنُوبِ عُقُوبَةً كُفْرانُ النِّعْمَةِ.[2]

وہ گناہ جس کا عذاب انسان کو جلدی لپیٹ میں لیتا ہے یہ کفران نعمت ہے۔

(۲) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

سَبَبُ زَوالِ النِّعَمِ الْكُفْرانُ.[3]

کفران نعمت نعمتوں کے زوال کا باعث ہے۔

(۳) ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں کہ

كُفْرُ النِّعْمَةِ مُزِيلُها وَشُكْرُها مُسْتَدِيمُها.[4]

ناشکری سے نعمتیں ختم ہو جاتی ہیں اور شکر کرنے سے نعمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۴) ایک اور حدیث میں آپؑ سے منقول ہے:

---

[1] تاج العروس من جواہر القاموس/ ج20 / 353 / [یدی]:.....ص: 351

[2] بحار الانوار، جلد 66، صفحہ 70

[3] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 121

[4] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 627

كُفْرانُ النِّعَمِ يُزِلُّ الْقَدَمَ وَيَسْلُبُ النِّعَمِ.[1]

کفران نعمت سے انسان کے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

(۵) آپؑ ہی نے فرمایا:

آفَةُ النِّعَمَ الْكُفرانُ.[2]

نعمتوں کی آفت ناشکری ہے۔

(۶) یہ حدیث بھی حضرت امیر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

كافِرُ النِّعمَةِ كافِرُ فَضْلِ اللهِ.[3]

کفران نعمت کرنے والا درحقیقت فضل الٰہی کا منکر ہوتا ہے۔

(۷) عذاب الٰہی میں سے ایک عذاب یہ ہے کہ عذاب استدراجی آتا ہے۔ یعنی خدا بعض ظالم افراد کو جب عذاب دینا چاہتا ہے تو انہیں بہت زیادہ نعمتیں عطا کرتا ہے اور پھر فوراً نعمت کو سلب کر لیتا ہے تا کہ انہیں سخت عذاب کا احساس ہو۔

اس لئے امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

نعمت استدراج سے خدا انسان کو غافل کرتا ہے۔

یعنی بندے کو نعمت دیتا ہے لیکن اس سے توفیق سلب کر دیتا ہے اور اچانک انسان زمین پر جا گرتا ہے۔

(۸) امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا:

اَلذُّنُوبُ الَّتی تُغَيِّرُ النِّعَمَ البَغْيُ عَلَى النّاسِ وَالزَّوالُ عَنِ الْعادَةِ فِي الْخَيْرِ وَاصْطِناعُ الْمَعْرُوفِ، وَكُفْرانُ النِّعَمِ وَتَرْكُ الشُّكْرِ.[4]

وہ گناہ جس سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ لوگوں پر ظلم ۲۔ اچھے امور کی عادت کو بدلنا

---

[1] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 660

[2] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 98

[3] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 634

[4] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 375

۳۔کفران نعمت ۴۔ناشکری

(۹)حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

كُفْرُ النِّعْمَةِ لُؤْمٌ وَ صُحْبَةُ الاَحمق شُؤْمٌ.[۱]

نعمت کی ناشکری پستی کی علامت ہے اور احمق سے دوستی مغلوب ہونے کا سبب ہے۔

(۱۰)امام جعفر صادق علیہ السلام عقل وجہل کے شکروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

خداوندعالم نے عقل کے لئے پچھتر (۷۵) شکر قرار دیئے اور ان کی ضد میں جہل کے شکر ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا:

وَالشُّكْرُ وَ ضِدُّهُ الْكُفْرانُ.[۲]

عقل کا ایک لشکر شکر ہے اور اس کا مخالف جہل ہے۔

اوپر والی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے یہ اخلاقی برائی کتنی خطرناک ہے اور کتنے برے آثار ہوتے ہیں جو انسان کی اخروی واجتماعی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں نعمت سے محروم ہوکر انسان زمین پر گرتا ہے توفیقات سلب ہوتی ہیں اور خدا سے دور اور شیطان کے نزدیک ہونے کا سبب ہے۔

چند نکات

۱۔معنی کفران نعمت:

کفر کا اصلی معنی کسی چیز کو چھپانا ہے جو ناشکرا شخص کوشش کرتا ہے کہ نعمتوں کی عظمت کو چھپائے اسے کفران نعمت کہا جاتا ہے کفران نعمت کبھی دل سے کبھی زبان اور کبھی عمل سے ہوتا ہے دل میں کفران نعمت یعنی نعمت کو اہمیت نہ دینا اسی طرح کفران زیاں یعنی نعمتوں کی اہمیت بھول جانا اور زبانی کلامی کہنا کہ نعمتوں کی کیا اہمیت ہے؟

---

[۱] غررالحکم، جلد 4، صفحہ 630

[۲] بحارالانوار، جلد اول، صفحہ 110 (باتلخیص)

اور عمل میں نعمتوں کا عملی طور پر شکر نہ بجالانا اور عملی طور پر صحیح فائدہ نہ اٹھانا۔ اسی وجہ سے علمائے اخلاق فرماتے ہیں۔

اَلشُّکْرُ صَرْفُ الْعَبْدِ جَمِیْعَ ما اَنْعَمَهُ اللهُ تَعالَی فی ما خُلِقَ لِاَجْلِهِ.

نعمت کا شکر یہ ہے کہ خدا نے جو نعمت جس کے لئے دی ہے اسی طرح اس کا استعمال کرے۔

خدا نے آنکھ جائز چیزوں کو دیکھنے کے لئے عطا کی جب انسان نامحرم کو دیکھتا ہے تو یہ آنکھ کا غلط استعمال ہے اور عملی طور پر آنکھ جیسی نعمت کا کفران نعمت ہوتا ہے اسی طرح ہاتھ، پاؤں، زبان کو صحیح اور جائز کاموں کے لئے استعمال کرنا شکر ہے۔ زبان، ہاتھ اور پاؤں سے گناہ نہ کیا جائے اگر گناہ کرتا ہے تو کفران نعمت ہوگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

شُکْرُ النِّعْمَةِ اِجْتِنابُ الْمَحارِمِ.[1]

نعمت کا شکر یہ ہے کہ انسان گناہوں سے بچے۔

۲۔ کفران نعمت کا انجام

نعمت کی ناشکری کے معنوی اور مادی لحاظ سے برے آثار ہیں ایک طرف نعمت کا زوال ہو جاتا ہے خداوند عالم حکیم ہے وہ کسی کو کوئی چیز کو بغیر حساب و کتاب کے نہیں دیتا کفران نعمت یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا کہ ہم اس نعمت کے لائق نہیں ہیں جب نعمت سے محروم ہوتے ہیں تو پھر کہتے ہیں کہ خدایا! ہماری نعمتوں میں اضافہ فرما۔ ہم اس کے لئے ایک مثال دیتے ہیں:

ایک باغ اور ایک مالی ہے باغ میں وہ درخت جو جلدی بڑھتے ہیں مالی ان پر زیادہ توجہ دیتا ہے لیکن جس درخت کا نہ پھل ہے اور نہ ہی وہ تیزی سے بڑھتا ہے، نہ پھول ہیں، نہ ان میں طراوت پائی جاتی ہے۔ ایسے درختوں پر مالی توجہ نہیں دیتا۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام اس طرح فرماتے ہیں:

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 95، حدیث 10 نور الثقلین، جلد 2، صفحہ 529.

مَنْ شَكَرَ النِّعَمَ بِجَنانِهِ اِسْتَحَقَّ الْمَزيدَ قَبْلَ اَنْ يَظْهَرَ عَلى لِسانِهِ.[1]

جو شخص دل سے نعمت کا شکر ادا کرے اس سے پہلے وہ زبان سے شکر بجالائے۔

بعض روایات میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما اَنْعَمَ اللهُ عَلى عَبْدٍ مِنْ نِعْمَةٍ فَعَرَفَها بِقَلْبِهِ وَ حَمِدَ اللهَ ظاهِراً بِلِسانِهِ فَتَمَّ كَلامُهُ حَتّى يُؤْمَرَ لَهُ بِالْمَزيدِ.[2]

جب انسان نعمت کو دیکھتا ہے تو اسے خدا کی حمد بجالانی چاہیے کیونکہ خداوند عالم نعمت میں اضافہ کا دستور فرمادیتا ہے۔

ناشکری سلب نعمت کا باعث ہوتی ہے ممکن ہے خداوند عالم سلب نعمت یعنی نعمت کو تاخیر سے دے جب کوئی نعمت دیر سے ملتی ہے تو بھی انسان ناشکری کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر انسان بیدار نہ ہو تو اسے ضرور عذاب ہوتا ہے کیونکہ اس میں خدا کی حکمت ہے کہ نعمت کو جلد عطا کرے یا تاخیر سے عطا فرمائے۔

دوسری طرف ناشکری سے انسان اللہ کی معرفت سے دور ہو جاتا ہے اور یہ ایک بہت ہی خسارہ ہے۔ علمائے اخلاق نے علم کلام میں سب سے پہلے اس بات کو شروع کیا انسان میں معرفت خدا کا عامل ہونا چاہے اور مزید لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا شکر کا عمل معرفت پروردگار ہے کیونکہ شکر گزاری خدا کی طرف سے ایک وجدانی امر ہے جب ایک انسان نعمتوں سے مالا مال ہوتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ اس کے وجود کے اندر و باہر جو نعمتیں موجود ہیں یہ اس کی اپنی نعمتیں نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں۔ اس سے خدا کی معرفت کا فریضہ ہموار ہوتا ہے لیکن جو نعمت کو اہمیت نہیں دیتا اور نہ ہی نعمت عطا کرنے والے کو اہمیت دیتا ہے جس سے وہ نعمتوں سے محروم رہتے ہیں دوسری طرف خدا کی نعمتوں کی ناشکری اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان مخلوق خدا کے سامنے بھی ناشکر ہوتا ہے۔

وہ صرف اور صرف دوسروں کی محبت و خدمت کا قائل نہیں بلکہ اپنے آپ کو دوسروں سے طلب گار سمجھتا ہے اس سے لوگوں میں اس کے بارے میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] مستدرک الوسائل، جلد 2، صفحہ 399

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 95، حدیث 9

ناشکری کے اسباب اور ان کا علاج

بعض اوقات انسان نعمتوں کا شکر اس لئے نہیں کرتا کہ وہ ان کی شناخت نہیں رکھتا بلکہ وہ انہیں نعمت الٰہی نہیں سمجھتا۔ اگر ہم اپنے بدن کی طرف نگاہ کریں اور دیکھیں کہ اللہ نے اس جسم میں کتنی نعمتیں رکھی ہیں انسان کے جسم میں دل، پھیپھڑے، جگر وغیرہ موجود ہیں جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہیں اب اگر ان کی بجائے مصنوعی لگائیں تو وہ اصلی کی مانند کام نہیں کرتے لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے خرچ کر کے اعضاء خریدے جاتے ہیں جبکہ اللہ نے سب کچھ مفت میں بطور نعمت عطا کیے ہیں۔

نعمت کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ہاتھ سے چلی جائے جسم میں تو اندرونی نعمتیں ہیں ان کے علاوہ بیرون یعنی جسم کے علاوہ دنیا میں بے شمار نعمتیں ہیں جن کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پانی کے ایک گھونٹ کی قیمت دنیا کے برابر ہے بعض نے نقل کیا کہ

ایک دن ایک عالم بادشاہ کے پاس گیا تو بادشاہ کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا جو وہ پینا چاہتا تھا بادشاہ نے عالم سے کہا: مجھے نصیحت کرو۔

اس عالم نے کہا اگر تم سخت پیاسے ہو اور یہ پانی تجھ سے واپس لے لیا جائے تا کہ تم اس پانی کے بدلے میں حکومت سمیت تمام چیزیں دے دو تو تم اس وقت کیا کرو گے؟

بادشاہ نے کہا: کوئی چارہ نہیں تمام چیزیں دے دوں گا۔

عالم نے کہا: تجھے حکومت سے کتنی محبت ہے جبکہ اس کی قیمت پانی کے ایک گلاس کے برابر ہے۔

آپ بعض افراد کو دیکھتے ہیں جو مریض ہوتے ہیں اور مرض کی شدت سے تکلیف میں ہوتے ہیں اور موت کو ایک آسمانی عطیہ حساب کرتے ہیں کیا اس وقت سوچتے ہیں کہ اگر تمام دنیا اسے دی جائے تو اس کی بیماری کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن اگر تمام دنیا اس سے لے لی جائے اور اسے صرف تندرستی دی جائے تو یہ اس کے لئے فائدہ مند ہو۔

انسان کے وجود میں ظاہراً بہت ہی کم نعمتیں موجود ہیں حالانکہ یہی نعمتیں جب سلب ہو جائیں تو زندگی خطرے

میں پڑ جاتی ہے اللہ نے منہ کے اندر لعاب رکھا جس کے اندر غدود ہیں اور پانی پیدا کرتے ہیں جن سے زبان، گلہ، منہ اور لب نرم رہتے ہیں کھانا کھاتے وقت غذا کو چبانے میں مدد دیتا ہے غذا نرم ہوتی ہے اور ہاضمہ میں بھی وہ پانی مدد کرتا ہے۔

اگر ایک لمحے کے لئے یہ چشمہ بالکل بند ہو جائے تو انسان کے لب، گلا اور زبان لکڑی کی مانند خشک ہو جائیں گے۔ وہ بات کرنے کی قدرت نہیں رکھے گا ممکن ہے ایک لقمہ گلے میں پھنس جائے اور زندگی کا خاتمہ ہو جائے (یقیناً ایسا ہی گا کیونکہ لقمے کو حرکت دینے والا تر گلا اور متحرک زبان ہی تو ہیں جو کہ خشک ہوں گی) پس یہ چھوٹا سا چشمہ انسان کے لئے پوری دنیا سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔[1]

ان کے علاوہ بے شمار نعمتیں ہیں جیسے سورج، ہوا، زمین، سبزہ، سواریاں جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط.[2]

اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہتے ہو تو شمار نہیں کر سکتے۔

بعض ایسی نعمتیں جو انسان سے کبھی بھی سلب نہیں ہوتی ہیں لیکن ہماری ان کی طرف توجہ نہیں بہت سی نعمتیں ناشناخت رہ جاتی ہیں خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت کشش ثقل ہے اگر یہ نعمت نہ ہوتی آج ہمارے گھر، محل، زراعت اور درخت تھوڑی سی ہوا آنے سے گر جاتے حتیٰ کہ ہوا آنے سے دسترخوان غذا سمیت اڑ جاتا۔ دریا کا پانی فضا میں پھیل جاتا ہے اگر کشش ثقل نہ ہوتی زمین بیابان وصحرا نظر آتی اب اندازہ کریں کہ اگر ہم تمام زندگی اس نعمت کا شکر ادا کریں تو بھی ہم نہیں شکر کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

اسی طرح معنوی نعمتیں یعنی انبیاء وائمہ علیہم السلام اور نزول کتب آسمانی جو کہ مادی نعمتوں سے افضل ہیں پس معلوم

---

[1] اس موضوع پر ایک کتاب اردو زبان میں ڈاکٹر محمد علی سید کی ''جسم کے عجائبات'' کے نام سے موجود ہے قارئین کرام کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ مند ہوگا۔ (مجاہد حسین حرّ)

سورہ یٰسین کے آخر کی آیات کی تفسیر کا مطالعہ کر رہا تھا کہ مفسر لکھتے ہیں کہ دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی ایک کافر نے قرآن کی آیت ''اگر اللہ تمہارے کنوؤں کا پانی خشک کر دے تم کیا کرو گے'' جواب میں کہا کہ ہم نئے کنوئیں کھود لیں گے اس کا یہ کہنا تھا کہ اس کی آنکھوں کا پانی خشک ہوگیا۔ میڈیکل سے تعلق رکھنے لوگ ہی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلنا چاہئے اب ایسا ہے کہ وہ آنکھوں کو کھلا رکھنا چاہتا ہے کھلا نہیں رکھ سکتا بند کرنا چاہتا ہے بند نہیں کر سکتا سونا چاہتا ہے سو نہیں سکتا دیکھ نہیں سکتا۔ یعنی اب اس کے پاس آنکھیں تو ہیں لیکن اس کے کسی کام کی نہیں ہیں بلکہ مستقل اذیت ہیں۔ (مجاہد حسین حرّ)

[2] سورۂ ابراہیم: ۳۴

ہوا کہ خدا کا کتنا لطف و کرم ہے کہ اس نے ہمیں بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اگر ہم ان چیزوں پر توجہ دیں ناشکری ختم کر کے شکر گزاری کی روح انسان میں زندہ ہوسکتی ہے یہ جان کر ہم ناشکری کا علاج ڈھونڈ سکتے ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ شکر گزاری کی پہلی راہ خدا کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا ہے۔

شکر گزاری کی دوسری راہ یہ ہے کہ ان افراد کو دیکھا جائے جو پست ترین انسان ہیں اس سے انسان میں شکر گزاری کی روح زندہ ہوتی ہے۔

شکر گزاری کی تیسری یہ ہے کہ اس مسئلہ پر غور کریں وقتی مصیبت و بلا انسان پر آتی ہے اسے شکر کرنا چاہیے کہ اس سے سخت مصیبت نہیں آئی۔[1]

نقل ہوا ہے کہ کسی عالم کے پاس شکایت ہوئی اور کہا: میرے گھر میں چور آیا ہے اور سب کچھ لے گیا۔

عالم نے اس سے کہا: خدا کا شکر کرو اگر اس چور کی جگہ شیطان چور آتا تو وہ تمہارا ایمان بھی لے جاتا اس وقت تم کیا کرتے۔[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

بات کرنا اور لکھنا کہ اصلی انسانی تمدن کی اساس ہے اگر خداوند عالم یہ دو چیزیں انسان کو نہ دیتا تو نہ بات کرسکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا۔

ہاں! خداوند عالم نے انسان کے اختیار میں زبان و دہن دیا جن کے ذریعے وہ کلام کرتا ہے اللہ نے انسان کو انگلیاں دی ہیں تا کہ قلم کو پکڑ کر لکھ سکے اور یہ دو نعمتیں نہ ہوتی تو انسان جانور ہوتا کیونکہ نہ بات کرسکتا اور اس کے پاس نہ علم ہوتا۔ جو شخص کفران نعمت کرتا ہے وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے کیونکہ خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔[3]

---

[1] معراج السعادہ، صفحہ 810.

[2] المحجۃ البیضاء، جلد 7، صفحہ 227

[3] بحار الانوار، جلد 3، صفحہ 82 (با تلخیص).

حصول نعمت خدا اور شکر کا طریقہ

کفران نعمت کا مخالف شکران نعمت ہے۔شکر الٰہی کا معنی یہ ہے کہ دل و زبان اور عمل میں نعمتوں کی قدردانی کرنا، دل سے شکر یعنی معرفت خدا، اس کے سامنے سر تسلیم خم ہو اور ان کی عطا کردہ نعمتوں پر راضی ہونا، زبان سے شکر یعنی ایسا کلام کرنا جس میں نعمتوں کی قدردانی اور شکر گزاری ہو عمل سے شکر یعنی عملی طور پر نعمت کا صحیح استعمال کرنا اللہ نے نعمت دے کر اس کا استعمال یعنی حلال وحرام بھی بیان فرمایا ہے۔

مفردات میں راغت رکھتا ہے: شکر کا یہ معنی ہے کہ نعمت کا تصور کرنا اور پھر اظہار کرنا۔بعض نے لکھا کہ شکر بروزن کشف تھا یعنی اظہار کرنا دابۃ شکور اس حیوان کو کہتے ہیں جیسے جتنا چارہ زیادہ دیں وہ بہت جلد ہی موٹا ہو جاتا ہے عین شکراء کا معنی یہ ہے: پانی سے بھرا ہوا چشمہ یعنی شکر؛ وجود انسان میں نعمت خدا کی یاد سے بھرا ہونا۔

شکر دو قسم کا ہوتا ہے:

۱۔شکر تکوینی ۲۔تشکر تشریعی

شکر تکوینی وہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کے اختیار میں خدا کی خاطر ان کی حفاظت کریں ہے اور شکر کے نو کے لئے استفادہ کرتی ہیں جیسے پھول، درخت، پھل جو کہ مالی کی حفاظت میں ہوتا ہے تو پھول و پھل جیسی نعمت ملی ہے اور اس کی ناشکری یہ ہے مالی باغ کی حفاظت نہ کرے لہٰذا جو شخص نعمت خدا گناہ میں استعمال کرتا ہے وہ بطور تکوینی ناشکری کرتا ہے انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ توفیق شکر گزاری، فکر، عقل، زبان، ہاتھ اور پاؤں کہ انسان ان کے ذریعے شکر قلبی ولسانی اور عملی انجام دیتا ہے یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں اس شکر میں اعضاء کا استعمال کے لئے ایک اور شکر کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح مسلسل شکر کے لئے شکر ادا کرنا ہوتا ہے اسی لئے روایات میں ملتا ہے کہ سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے عاجزی کا اظہار کرے اب ہم بعض آیات و روایات کو ذکر کرتے ہیں جو اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ

رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ.[1]

اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے سمندر میں (چلنے والے بادبانی) جہاز ہیں جو گویا پہاڑ ہیں۔ اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو جہاز بھی سمندر کی سطح پر کھڑے (کے کھڑے) رہ جائیں۔ بے شک تمام صبر اور شکر کرنے والوں کے واسطے ان (باتوں) میں (قدرت خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں

اسی جیسی تعبیرات قرآن میں اور جگہ بھی ذکر ہوئی ہیں۔بعض اوقات آنکھ، کان اور عقل جیسی نعمتوں جو معرفت کے بہترین وسائل ہیں کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.[2]

اور تم کو کان دیئے اور آنکھیں (عطا کیں) دل (عنایت کیے) تا کہ تم شکر کرو۔

قرآن مجید میں اس شکر گزاری والی فضیلت کا بہت ذکر ہوا ہے کہ اے لوگو! شکر کرو کبھی خدا فرماتا ہے: حقیقی شکر گزار بہت کم افراد ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ یوں خطاب فرماتا ہے:

اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ.[3]

اے داؤدؑ کی اولاد شکر کرتے رہو اور میرے بندوں میں سے شکر کرنے والے (بندے) تھوڑے سے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے کہ خدا کی شکر گزاری اس کی خوشنودی سے مشروط ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ ۚ وَلَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ ؕ.[4]

شکر گزاری سے مربوط قرآن میں بہت سی آیات ہیں اور تقریباً ستر آیات اسی موضوع کے بارے میں ہے۔

---

[1] سورۃ الشوریٰ: ۲۳، ۳۳

[2] سورۂ نحل: ۷۸

[3] سورۂ سبا: ۱۳

[4] سورۂ زمر: ۷

سورۂ نساء آیت ۱۴۷ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا.[1]

اگر تم نے خدا کا شکر کیا اور اس پر ایمان لائے تو خدا تم پر عذاب کر کے کیا کرے گا بلکہ خدا تو (خود شکر کرنے والوں کا) قدردان اور واقف کار ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر حقیقی شکر گزاری کی جائے تو عذاب الٰہی بطور کلی ختم ہو جائے گا شکر گزاری خدا کے اوصاف میں سے ایک صفت ذکر ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے اس صفت میں خداوند عالم بندوں کے شریک ہے یعنی یہ صفت انسان اور خدا دونوں کی مشترک صفت ہے البتہ لوگوں کی خدا کے لئے شکر گزاری کا معنی یہ ہے کہ انسان اس کی نعمتوں کو صحیح استعمال کرے اور خدا کی خوشنودی حاصل ہو اللہ کا شکر گزار یعنی وہ اپنے شکر گزار بندوں کی قدر دانی کرتا ہے اور انہیں ثواب دیتا ہے۔

بعض آیات میں آیا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کی قدر کرنے سے انسان گناہ سے بچ جاتا ہے سورۂ اعراف کی آیت ۷۴ میں اقوام گزشتہ سے خداوند عالم فرماتا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ.

اور (وہ وقت) یاد کرو جب اس نے تم کو قوم عاد کے بعد (زمین میں) خلیفہ (و جانشین) بنایا اور تمہیں زمین میں اس طرح بسایا کہ تم ہموار و نرم زمین میں (بڑے بڑے) محل اُٹھاتے ہو اور پہاڑوں کو تراش (تراش) کے گھر بناتے ہو تو خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اور روئے زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔

اور اسی سورہ کی آیت ۶۹ میں فرماتا ہے:

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۗءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

---

[1] سورۂ نساء: ۱۴۷

کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے پروردگار کا حکم تمہارے پاس تمہی میں کے ایک مرد (آدمی) کے ذریعے سے آیا کہ تمہیں (عذاب سے) ڈرائے۔ اور (وہ وقت) یاد کرو جب اس نے تم کو قومِ نوحؑ کے بعد خلیفہ (وجانشین) بنایا اور تمہاری خلقت میں بھی بہت زیادتی کردی۔ تو خدا کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم دلی مرادیں پاؤ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتیں فلاح و بہبود کا باعث بنتی ہیں۔

مختصر یہ کہ شکر گزاری تمام سعادتوں کے حصول اور برکات الٰہی کا سرچشمہ ہے اس سے انسان روز بروز خدا کے نزدیک ہوجاتا ہے لہٰذا تقویٰ حاصل کرنے کا عامل ہے۔

فلسفہ شکر گزاری

ممکن انسان ایک دوسرے کو نعمتیں دیں اور شکر گزاری کی امید رکھتے ہوں بعض شرائط میں اس کا نیاز مند ہوتا ہے خواہ روحانی طور پر نیاز مند ہو یا اجتماعی۔ لیکن خدا تمام مخلوق سے بے نیاز ہے اگر تمام انسان کافر ہوجائیں تو اس کی عظمت میں کمی نہیں آتی۔ وہ بندوں کی شکر گزاری کا نیاز مند نہیں ہے جو شخص اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے چاہے دل سے ہو یا زبان اور یا عمل سے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نعمت کے لائق ہے اور خدا کے تمام احکام میں حکمت ہے بغیر دلیل سے وہ نہ کسی سے نعمت واپس لیتا ہے اور کسی کو نعمت عطا کرتا ہے لہٰذا جب انسان اللہ کی نعمتوں کا شکر کرتا ہے تو زبان حال کہتی ہے کہ وہ شکر کے لائق ہے اور حکمت خدا یہ ہے کہ نہ صرف اسے نعمت دیتا ہے بلکہ اس کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن ناشکرا انسان کا حال بتاتا ہے کہ وہ نعمت کے لائق نہیں اور خدا کی حکمت یہ ہے کہ وہ نعمت واپس لے لیتا ہے اگر انسان ایک دن شاکرین کی صفت رکھتا ہے اور دوسرے دن کافروں میں سے ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.[1]

یہ سزا اس وجہ سے (دی گئی) کہ جب کوئی نعمت خدا کسی قوم کو دیتا ہے تاوقتیکہ وہ لوگ خود

---

[1] انفال، آیہ ۵۳.

اپنی قلبی حالت (نہ) بدلیں خدا بھی اسے نہیں بدلے گا اور خدا تو یقینی (سب کی) سنتا (اور سب کچھ) جانتا ہے۔

آیات و روایات سے معلوم ہوا کہ شکر نعمت سے دائمی نعمت ملتی ہے یا اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بِالشُّكْرِ تَدُومُ النِّعَمُ.[1]

شکر کرنے سے دائمی نعمت ملتی ہے۔

ایک اور جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

ثَمَرَةُ الشُّكْرِ زِيادَةُ النِّعَمِ.[2]

شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ شکر گزاری سے انسانی روح کی پرورش ہوتی ہے اس سے اسلامی معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے لوگوں میں ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

شکر گزاری سے معرفت میں اضافہ ہوتا ہے اللہ اور مخلوق کے درمیان رابطہ محکم ہوتا ہے جتنی نعمتوں میں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے شکر گزاری زیادہ ہوتی ہے اسی طرح نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے شکر منعم کے لئے معرفت نعمت ضروری ہے روز بروز انسان کے دل میں عشق پیدا ہوتا ہے۔

روایات میں شکر گزاری

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلطّاعِمُ الشّاكِرُ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ كَاَجْرِ الصّائِمِ الْمُحْتَسِبُ وَ الْمُعافى الشّاكِرِ لَهُ مِنَ الْاَجْرَ كَاَجرِ الْمُبْتَلِى الصّابِرِ وَ الْمُعْطى الشّاكِرِ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ كَاَجْرِ

---

[1] شرح فارسی غرر الحکم، جلد ۳، صفحہ ۱۹۸.

[2] شرح فارسی غرر الحکم، جلد ۳، صفحہ ۳۲۸.

الْمَحْرُومِ الْقَانِعِ.[1]

جو شخص غذا کھاتا ہے اور شکر خدا کرتا ہے اس کو روزہ دار شخص کا ثواب ملتا ہے جو تندرست شخص روزہ رکھتا ہے اس کو اس مریض کا ثواب ملتا ہے جو دکھ و درد سہتا ہے نعمت کے ہوتے ہوئے شکر کرنے والے کو اتنا اجر ملتا ہے کہ جتنا ایک صابر شخص کو ثواب ملتا ہے۔

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَكْتُوبٌ فِي التَّوْراتِ، الشُّكْرُ مِنَ النِّعَمِ عَلَيكَ وَ اَنْعِمُ عَلى مَنْ شَكَرَكَ فَاِنَّهُ لا زَوالَ لِلنَّعماءِ اذا شُكِرَتْ، وَلا بَقاءَ لَها اِذا كُفِرَتْ.[2]

تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جو کوئی نعمت دیتا ہے اس کا شکر کرو اور جو تیرا شکر کرے تو اسے نعمت بخش دے کیونکہ اگر نعمتوں کا شکر کیا گیا تو زوال نہیں ہوتا اور اگر کفران نعمت کیا تو بقاء نہیں ملے گی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نہ صرف خدا کا شکر بجا لانے سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ انسان کا بھی کہ جب اس کا شکریہ ادا کیا جائے تو وہ نعمت میں اضافہ کرے۔

۳۔ آپؑ ہی سے ایک روایت نقل ہوئی ہے:

ثَلاثٌ لا يَضُرُّ مَعَهُنَّ شَيءٌ، اَلدُّعاءُ عِنْدَ الْكَرْبِ، وَ الْاِسْتِغْفارِ عِنْدَ الذَّنْبِ، وَ الشُّكْرَ عِنْدَ النِّعْمَةِ.[3]

تین چیزوں سے کبھی نقصان نہیں ہوتا:

۱ _____ مصیبت کے وقت دعا

۲ _____ گناہ کے بعد استغفار

۳ _____ نعمت ملنے پر شکر۔

آیات و روایات سے معلوم ہوا کہ نعمت کا شکر دعا اور استغفار کے ذکر ہوا لہٰذا نعمت کا شکر بھی بہت اہمیت کا

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ 94، حدیث ۱.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 94، حدیث ۳.

[3] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 94، حدیث ۷.

حامل ہے۔

انسان تین حالتوں سے خارج نہیں:

۱۔ _____ مصیبت میں اسیر ہوتا ہے۔

۲۔ _____ یا اسے نعمت ملتی ہے اور وہ اس کی حفاظت کے بارے میں ڈرتا ہے۔

۳۔ _____ یا اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بہت ہی لطیف مطلب بیان ہوا ہے یعنی مشکلات کو دعا کے ذریعے دور کیا جاتا ہے گناہ کے آثار استغفار کے ذریعے مٹائے جا سکتے ہیں اور نعمت کو شکر گزاری کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے اسی مطلب کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

نِعْمَةٌ لا تُشْكَرُ كَسِيِّئَةٍ لا تُغْفَرُ.[1]

جس نعمت کا شکر ادا نہ کیا جائے یہ اس گناہ کی مانند ہے جس کے بعد استغفار نہ کی جائے۔

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سفر میں اونٹ پر سوار تھے اچانک آپؐ اونٹ سے اترے اور سجدہ شکر بجالائے جب اٹھے اور اونٹ پر سوار ہوئے تو اصحاب نے پوچھا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! آپؐ نے ایسا عمل کیا جو پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تو آپؐ نے فرمایا:

نَعَمْ اِسْتَقْبَلَنی جَبْرَئیلُ فَبَشَّرَنی بِبِشارات مِن اللهِ عزّ و جَل فَسَجَدْتُ لِلّهِ شُكراً لِكُلِّ بُشْرى سَجْدَةً.[2]

جی ہاں! جبرائیل میرے پاس آیا اور اس نے مجھے خدا کی طرف سے بشارت دی اور میں ہر بشارت کے لئے سجدہ شکر بجالاتا ہوں۔

۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام شکر کے لئے جامع و کامل دستور میں فرمایا:

اِذا اَصْبَحتَ وَ اَمْسَيْتَ فَقُلْ عَشْرَ مَرّات اَللّهُمَّ ما اَصْبَحْتَ بی مِنْ نِعْمَة اَوْ عافِيَة مِنْ دِين اَوْ دُنْيا فَمِنْكَ وَحْدَكَ لا شَريكَ لَكَ، لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ بِها

---

[1] شرح فارسی غرر الحکم، جلد 6، صفحہ 170.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 98، حدیث 24.

عَلَيَّ يا رَبِّ حَتّٰى تَرْضى وَبَعْدَ الرِّضا.[1]

صبح و شام ہوتے ہی دس مرتبہ یہ دعا پڑھیں : خدایا! جو صبح کے وقت مجھے نعمت دی گئی، میرے دین و دنیا تجھ سے سلامتی میں ہے تو یکتا ہے اور تیرا شریک نہیں حمد و شکر صبر تجھ سے مخصوص ہے اس لئے کہ جو کچھ مجھے تو نے عطا کیا تا کہ تجھ سے راضی رہوں حتیٰ راضی ہونے کے بعد بھی حمد وثنا اور شکر کرتا ہوں۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

شُكْرُ النِّعْمَةِ اَمانٌ مِنْ تَحْليلِها وَ كَفيلٌ بِتَأْييدِها.[2]

اگر تو یہ عمل انجام دے گا تو جو نعمتیں تجھے اس دن و رات میں ملی ہیں تو ان کا شکر ادا کر رہا ہے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: نعمت کا شکر زوال نعمت سے مانع ہے بلکہ تائید کا سبب ہے۔

ایک اور روایت حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

شَرُّ النّاسِ مَنْ لا يَشْكُرُ النِّعْمَةَ وَلا يَرْعى الْحُرْمَةَ.[3]

لوگوں میں سے بدترین افراد وہ ہیں جو نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے اور احترام بھی نہیں کرتے۔

سیرت پیشواؤں میں شکر گزاری

قول، فعل اور تقریر معصومؑ کو حدیث کہتے ہیں یعنی اس طرح ان کا قول اور فعل ہمارے لئے حجت ہے اسی طرح عمل بھی حجت ہے جو کام کسی معصومؑ کے سامنے کیا جائے وہ سکوت اختیار کریں یعنی عمل کو دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہتے تو اسے تقریر معصومؑ کہا جاتا ہے۔

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 98، حدیث ۲۸.

[2] شرح فارسی غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 179.

[3] شرح فارسی غرر الحکم، جلد 4، صفحہ ۱۷۰.

ہم چند روایات ونقل کرتے ہیں۔

۱۔حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عائشہ کے گھر تھے، عائشہ نے کہا: آپؐ کیوں اس قدر زحمت وتکلیف کررہے ہیں حالانکہ خدا نے گزشتہ وآئندہ کے لئے آپ کو بخش دیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلّا اَکُونَ عَبْداً شَکُوراً.

کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔[۱]

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیائے خدا کا انگیزہ خدا کی نعمتوں کا شکر کرنا ہوتا ہے بہت سی روایات میں ملتا ہے کہ جب کبھی آپؐ سے سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

اَلّا اَکُونَ عَبْداً شَکُوراً.

کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

۲۔ہشام بن احمر جو کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

میں امام علیہ السلام کے ساتھ تھا اور ہم مدینہ کے اطراف میں تھے میں نے اچانک دیکھا امام علیہ السلام سواری سے اترے اور سجدہ میں چلے گئے کافی دیر تک سجدے میں رہے پھر سجدے سے سر اٹھایا اور دوبارہ سواری پر سوار ہو گئے۔

میں نے عرض کیا! قربان جاؤں! آپؑ نے کافی طولانی سجدہ کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

اِنَّنِي ذَکَرْتُ نِعْمَةً اَنْعَمَ اللهُ بِها عَلَیَّ فَاَحبَبْتُ اَنْ اَشْکُرَ رَبّی.[۲]

مجھے خدا کی عطا کردہ نعمت یاد آئی تو مجھے اچھا لگا کہ سجدہ شکر بجالاؤں۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ہمارے پیشوا نعمت ملنے پر ہر نعمت کا جدا شکر کرتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جب کسی کو نعمت ملے تو پیشانی سجدے کے لئے خاک پر رکھے اور خدا کا شکر بجالائے

---

[۱] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 95.

[۲] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 98، حدیث 26.

اور اگر کسی سواری پر سوار ہے تو اُتر جائے اور سجدہ کرے۔[1]

۳۔ آپؑ ہی سے منقول ہے کہ آپؑ نے ایک ابوبصیر نامی صحابی سے فرمایا: کبھی تم میں سے کوئی ایک گلاس پانی پیتا ہے اور خدا اسے اس کی خاطر جنت میں داخل کرتا ہے۔

پھر اپنے کلام کی تفصیل میں فرمایا: جب انسان پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے اور ہونٹوں کے قریب لے جاتا ہے تو بسم اللہ پڑھتا ہے تھوڑا پانی پینے کے بعد وقفہ کرتا ہے چند گھونٹ پی کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے دوبارہ باقی پانی پیتا ہے لیکن پھر بھی تھوڑا پینے کے بعد اللہ کا شکر بجالاتا ہے حتیٰ تیسری بار بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے،

فَيُوجِبُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُ بِهَا الْجَنَّةَ.

اللہ تعالیٰ اس شخص پر جنت واجب کر دیتا ہے۔[2]

یاد رہے کہ پانی کے ایک گلاس کو تین مرتبہ پینا چاہیے اور ایک سانس میں نہیں پینا چاہیے لہٰذا انسان ایک مرتبہ بسم اللہ اور تین مرتبہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

شکر کیسے کرنا چاہیے؟

ہم شکر کی تعریف میں بیان کر چکے ہیں کہ

شکر گزاری یعنی نعمتوں کی قدر کرنا چاہے دل سے ہو، زبان سے یا عمل سے ہو اور

کفران یعنی نعمتوں کی قدر نہ کرنا بلکہ انہیں ضائع کرنا اور صاحب نعمت کی متوجہ نہ ہونا۔

بہترین شکر، شکر عملی ہے کیونکہ بہت سے انسان زبان سے شکر کرتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے بلکہ کفران نعمت کرتے ہیں جو اسراف کرتے ہیں یا بخیل ہوتے ہیں یا نعمتوں کے ذریعے دوسروں پر فخر کرتے ہیں یا مست ہو جاتے ہیں اور سرکشی کرتے ہیں وہ سب ناشکرے ہیں کفران نعمت کرتے ہیں۔

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 98، حدیث ۲۵.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ ۹۶، حدیث ۱۶.

بلکہ اس کے برعکس نعمت کی کفران نہیں کرتے ہیں آشکار و پنہاں خرچ کرتے ہیں جب انہیں نعمت زیادہ ملتی ہے تو تواضع وفروتنی کا اظہار کرتے ہیں مخلوق خدا کی خدمت کرتے ہیں نعمتوں کو صحیح استعمال کرتے ہیں اور ضائع ہونے سے بچاتے ہیں ایسے لوگ شکر گزار ہیں اور ہمیشہ نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

روایات میں شکر کے تینوں مراحل کی طرف بہت لطیف اشارہ ہوا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِ بِنِعْمَةٍ فَعَرَفَها بِقَلْبِهِ فَقَدْ اَدّى شُكْرَها.[1]

جسے خدا نعمت عطا کرتا ہے اور وہ اس کی معرفت رکھتا ہو تو اس نے شکر بجالایا۔

آپؑ ہی سے ایک اور حدیث میں نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے اپنے صحابی سے فرمایا:

ما اَنْعَمَ اللهُ عَلى عَبْدٍ بِنِعْمَةٍ صَغُرَتْ اَوْ كَبُرَتْ فَقالَ الْحَمْدُللهِ اِلّا اَدّى شُكْرَها.[2]

جب خدا کسی کو چھوٹی یا بڑی نعمت عطا کرے اور وہ کہے الحمدللہ، اس نعمت کا وہ شکر بجالایا ہے حمد صرف زبانی نہ ہو بلکہ دل کی گہرائی سے ہو۔

تیسری حدیث بھی آپؑ سے منقول ہے کہ کسی صحابی نے آپؑ سے پوچھا کہ شکر کی معین حد ہے کہ جب انسان شکر کرے تو شاکر ہو۔

آپؑ نے فرمایا: ہاں

اس صحابی نے سوال کیا کہ وہ کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

يَحْمِدُللهَ عَلى كُلِّ نِعْمَةٍ عَلَيْهِ فى اَهْلٍ وَ مالٍ وَاِنْ كانَ فى ما اَنْعَمَ اللهُ عَلَيهِ فى مالِهِ حَقَّ اَدّاهُ.

اللہ جو نعمت عطا کرتا ہے اس کا شکر ادا کیا جائے چاہے وہ اہل خانہ یا مال میں سے ہو اور

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 96، حدیث 15.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 96، حدیث ۱۴.

اگر خدا کی طرف سے عطا ہونے کے بدل حق تھا (غریبوں کی مدد کرنا) تو اسے ادا کرے۔[1]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

شُكْرُ الْعالِمِ عَلى عِلْمِهِ، عَمَلُهُ بِهِ وَبَذْلُهُ لِمُسْتَحَقِّهِ.

عالم اپنے علم کا شکر ادا کرے یعنی اس علم پر عمل کرے اور دوسروں کو تعلیم دے۔[2]

اس میں شکر عملی کی طرف اشارہ ہے کہ ہر نعمت کے بعد انجام دینا چاہیے یقیناً جو عالم اپنے علم پر عمل نہیں کرتا یا دوسروں کو تعلیم نہیں دیتا وہ ناشکرا انسان ہے اور زبان حال میں کہتا ہے کہ میں اس نعمت کے لائق نہیں ہوں۔

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ عملی شکر افراد کے لحاظ سے مختلف ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

شُكْرُ إلهِكَ بِطُولِ الثَّناءِ، شُكْرُ مَنْ فَوْقَكَ بِصِدْقِ الْوَلاءِ، شُكْرُ نَظِيرِكَ بِحُسْنِ الْإِخاءِ، شُكْرُ مَنْ دُونَكَ بِسَيْبِ الْعَطاءِ.[3]

تیرے پروردگار کا شکر یہ ہے کہ ہمیشہ اس کی حمد وثنا کی جائے اپنے سے اوپر والوں کا شکر یہ ہے کہ اس کے ساتھ صداقت سے رہنا ہم منصب کا شکر یہ ہے کہ اخوت و برادری کا خیال رکھا جائے آپ سے نیچے والوں کا شکر یہ ہے کہ انہیں ضرور عطا کریں۔

شکر عملی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب شخص اپنے دشمن پر کامیاب ہو جائے تو اگر خطرہ نہ ہو تو جتنا ممکن ہو سکے اس معاف کر دینا چاہیے اور یہ کامیابی کا شکر ہے ایک مشہور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِذَا قَدَرْتَ عَلى عَدُوِّكَ فَاجْعَلِ الْعَفْوَ عَنْهُ شُكْراً لِلْقُدْرَةِ عَلَيْهِ.[4]

جب تم دشمن سے جیت جاؤ تو اسے معاف کر دو کیونکہ یہ جیت کا شکر ہے نعمتوں میں سے بعض کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی شکر کی بہترین مثال ہے۔

مولا امیر علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 96، حدیث ۱۲.

[2] شرح غرر الحکم فارسی، جلد 4، صفحہ 160، حدیث 5667.

[3] شرح غرر الحکم فارسی، جلد 4، صفحہ 158، حدیث 5653.

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حکمت 11.

اَحسِنْ شُکْرِ النِّعَمِ اَلْاَنْعامُ بِهَا.

خدا کی عبادت اور اس سے دعا کرنا عملی شکر گزاری کا ایک طریقہ ہے۔[1]

بلکہ روایات میں ہے کہ عبادت کے لئے بہترین عمل شکر گزاری ہے حالانکہ جنت کی نعمتوں کے لالچ میں عبادت کا عمل تاجروں جیسی عبادت ہوتی ہے اور دوزخ سے ڈرنے کی وجہ سے عبادت کو بندوں سے ڈر کی عبادت کہا گیا ہے لیکن شکر کا عمل آزاد بندوں کی عبادت تعبیر ہوتی ہے۔

حضرت امیر علیہ السلام کا قول ہے:

اِنَّ قَوْماً عَبَدُوهُ شُکْراً فَتِلْکَ عِبادَةُ الْاَحْرارِ.[2]

(یعنی) خبردار اے قوم! خدا کی شکر گزاری کرنا کیونکہ یہی آزاد لوگوں کی عبادت ہوا کرتی ہے۔

شکر گزاری کا عمل

شکر گزاری کی روح کیسے انسان میں محکم ہوتی ہے؟ اس کے مختلف طریقے ہیں سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ نعمتوں کی معرفت حاصل ہو جیسا کہ آپ جانتے ہیں انسان کا پورا وجود نعمتوں سے مالا مال ہے نعمت مادی و معنوی نعمت ظاہری و باطنی نعمت فردی و اجتماعی بیشتر فقہ علوم نے نعمت کی شناخت میں کافی مدد دی ہے جدید علوم سے بہت سی نعمتیں کشف ہو چکی ہیں ہم جانتے ہیں کہ آج ہمارے جسم میں لاکھوں سیل ہیں سب خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں آج کشف ہو چکا ہے کہ ہمارے خون میں لاکھوں سیلز ہیں جو گلوبن کے نام مشہور ہیں جو انسان کے جسم میں داخل ہونے والے بے شمار جراثیم سے دفاع کرتے ہیں ایک دن میں ہر سانس دو نعمتیں ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے ہر سانس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے جدید علوم نے واضح کر دیا کہ صرف چار عناصر نہیں جو ہماری زندگی کا سبب ہے بلکہ ہزاروں عامل ہیں تا کہ زمین سے گندم اُگے اور انسان کی خوراک بنے۔

شکر گزاری کا دوسرا عامل یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے سے نیچے طبقے کو دیکھے کہ انہیں کتنی کتنی نعمتیں عطا ہوئی

---

[1] شرح فارسی غرر الحکم، جلد 2، صفحہ 407.

[2] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 69، حدیث 18.

ہیں۔حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی حارث ہمدانی کو لکھا:

وَاَكْثِرْ اَنْ تَنْظُرَ اِلٰى مَنْ فُضِّلْتَ عَلَيْهِ، فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ اَبْوابِ الشُّكْرِ.[1]

اپنے سے نیچے کے طبقے پر نگاہ کرو کہ یہ خود ایک ابواب شکر ہے۔

حالانکہ بعض اپنے سے اونچے اور امیر طبقے کو دیکھتے ہیں جس سے شیطانی وسوسہ پیدا ہوتا ہے اور ناشکری کی روح ایجاد ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے عہد نامہ میں مالک اشتر کو یوں خطاب کیا:

وَلا يَكُونَنَّ الْمُحسِنُ وَ الْمُسيئُ عِنْدَكَ بِمَنْزِلَةٍ سَواءً فَاِنَّ فى ذٰلِكَ تَزْهيداً لِاَهْلِ الْاِحْسانِ فِى الْاِحْسانِ وَ تَدْريباً لِاَهْلِ الْاِساءَةِ عَلَى الْاِساءَةِ.[2]

تیرے پاس نیک اور برے افراد برابر نہیں ہونے چاہیں کیونکہ اس سے نیک افراد اپنی نیکیوں میں راغب نہیں ہوں گے اور برے افراد کے گناہوں میں حوصلہ افزائی ہوگی۔

شکر گزاری صرف خالق ومخلوق کے درمیان نہیں بلکہ اگر کوئی انسان دوسرے کی خدمت کرتا ہے اور کوئی نعمت دیتا ہے اگرچہ دینے والا قدردانی کی خواہش نہ بھی رکھتا ہو لیکن پھر بھی نعمت لینے والے کو چاہیے کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔زبان، قلب اور عملی طور پر اس کا شکریہ ادا کرے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَشْكُرِ الْمُنْعِمَ مِنَ الْمَخْلُوقينَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ عَزّوجل.[3]

جو کسی بندے کا شکر ادا نہ کرے وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

یہ جملہ "من لم یشکر المخلوق لم یشکر الخالق" اگرچہ یہ عبارت روایات میں نہیں آئی لیکن اس کا مفہوم اوپر والی روایت میں بیان ہو چکا ہے جب انسان انسان کا شکر ادا نہیں کرتا تو یہ دلیل ہے کہ اس کے وجود میں ناشکری پائی جاتی ہے ایسا شخص لوگوں کے لئے نعمتوں کا قائل نہیں ہوتا بلکہ کبھی اپنے آپ کو طلبگار سمجھتا ہے ایسا انسان خداوند عالم کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔انسانوں میں خدمت کرنا یعنی نعمتوں کا ردو بدل ہونا کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن خداوند عالم

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ 69.

[2] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳.

[3] عیون اخبار الرضا، جلد 2، صفحہ 24.

کی طرف سے ہر لحظہ نعمت مل رہی ہے سانس لینا وجود اور جسم کا سالم رہنا یعنی ہر گھڑی اللہ کی نعمت کا انسان محتاج ہوتا ہے مخلوق کا شکر درحقیقت خالق کا شکر ہے کیونکہ انسان ایک واسطہ ہے جس کے ذریعے نعمتیں ایک دوسرے کے پاس منتقل ہوتی ہیں لہٰذا جس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا وہ انسان کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔

بہرحال روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی نعمت دے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جتنا شکر زیادہ ہوگا اتنا نعمت میں اضافہ ہوگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اُشْكُرْ مَنْ اَنْعَمَ عَلَيْكَ وَ اَنْعِمْ عَلٰى مَنْ شَكَرَكَ.[1]

جس نے تجھے نعمت دی ہو اس کا شکر کرو اور جو تیرا شکر کرتا ہے اسے زیادہ نعمت بخش دے۔

خداوند عالم نے قرآن میں صراحت کے ساتھ اس موضوع کو بیان فرمایا کہ شکر گزاری کرو اور اپنے شکر کے ساتھ قرار دیا خداوند عالم فرماتا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ.[2]

اور ہم نے انسان کو جسے اس کی ماں نے دُکھ پر دُکھ سہ کے پیٹ میں رکھا (اس کے علاوہ) دو برس میں (جا کے) اس کی دودھ بڑھائی کی (اپنے اور) اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید کی کہ میرا بھی شکریہ ادا کرو اور اپنے والدین کا (بھی اور آخر سب کو) میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔

یقیناً صرف ماں باپ کا حق ہماری گردنوں پر نہیں بلکہ ہر شخص جو معنوی یا مادی نعمت دے اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

بعض معزز افراد میں دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات بہت کم خدمت کو بہت بڑی خدمت تصور کرتے ہیں اور اس کے بدلے بڑی نعمت دیتے ہیں ایک مشہور داستان ہے کہ ایک کنیز نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو پھولوں کا گلدستہ دیا تو

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 94.

[2] لقمان، آیہ 14.

آپؑ نے اس کنیز کو آزاد کر دیا۔ جب آپؑ سے پوچھا گیا کہ اتنے چھوٹے سے کام کے بدلے میں اتنا بڑا احسان؟

آپؑ نے فرمایا:

كذا اَدَّبَنَا اللهُ.

اسی طرح خدا نے ہمیں ادب سکھایا ہے۔[1]

ہم نے ایک مشہور داستان سن رکھی ہے کہ ایک دفعہ امام حسن و حسین علیہما السلام اور عبداللہ بن جعفر سفر کر رہے تھے اور قافلے سے پیچھے رہ گئے اور بیابان میں انہیں سخت پیاس لگی انہیں دور سے ایک خیمہ نظر آیا وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت تنہائی میں ہے اس عورت نے انہیں پانی پلایا اور پھر اس بوڑھی عورت کی ایک بھیڑ تھی جو اس نے ذبح کر کے انہیں کھانا کھلایا۔ آخر میں یہ تینوں شخصیات رخصت ہونے لگیں تو بوڑھی عورت سے کہا: اگر تو مدینہ آئی تو ہمارے پاس ضرور آنا ہوسکتا ہے ہم بھی تیرے اس خلوص و محبت کا جبران کر سکیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد قحط اور خشک سالی آ گئی جس کی وجہ سے بیابان کے لوگوں نے شہروں کا رخ کیا اور لوگوں سے مدد کی درخواست کی۔ ایک دن امام حسن علیہ السلام نے اس بوڑھی عورت کو مدینہ میں دیکھا وہ گلی میں لوگوں سے مدد کی درخواست کر رہی تھی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے اسے بلایا اور پوچھا: کیا تجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم تمہارے مہمان تھے اور تم نے ہماری بڑی خدمت کی تھی۔

بوڑھی عورت کو یاد نہیں تھا اس کے بعد امامؑ نے اسے کافی دینار اور بھیڑ بکریاں دیں اور پھر اسے امام حسین علیہ السلام کے پاس بھیجا آپؑ نے بھی کافی مدد فرمائی پھر اسے عبداللہ بن جعفر علیہ السلام کے پاس بھیجا انہوں نے بھی دل کھول کر مدد کی۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں:

صارَتْ مِنْ اَغْنَى النّاسِ.

وہ ایک ثروت مند ترین انسان بن گئی۔[2]

اسی طرح ایک اور داستان ہے جو حلیمہ سعدیہ کی بیٹی شیما اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی بہن کی داستان ہے۔

جنگ حنین میں بنی سعد قبیلہ کا ایک بہت بڑا گروہ مسلمانوں نے قیدی بنا لیا تھا اور اس میں حلیمہ کی بیٹی شیما بھی تھی جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا آپؐ کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ آپؐ اٹھے اور اپنی عبا کو زمین پر پھیلایا اور شیما کو اس پر بٹھایا اور احوال پرسی کی آپؐ نے فرمایا: تو وہی ہے کہ جب میں تیری ماں کا دودھ پیتا تھا اور تو مجھ سے محبت کرتی

---

[1] بحارالانوار، جلد 44، صفحہ 195. اس حدیث کی مانند ایک حدیث امام حسن علیہ السلام سے منقول ہے۔ بحارالانوار، جلد 43، صفحہ 343.

[2] نورالابصار محمد شبلنجی مصری (با اقتباس و تلخیص) بحارالانوار، جلد 43، صفحہ 348.

تھی شیما نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قبیلہ کے اسیروں کی رہائی کی درخواست کی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اپنا حصہ بخش دیتا ہوں۔

جب باقی مسلمانوں کو پتا چلا تو انہوں نے بھی معاف کر دیا لہٰذا تمام گروہ کو آزاد کر دیا گیا۔[1]

اس عملی شکر گزاری کی مثالیں ہمارے پیشواؤں کی زندگی میں بہت زیادہ ہیں اسی طرح ایک اور داستان بیان ہوئی ہے کہ جن کا خلاصہ یہ ہے تاریخ میں ملتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلیمہ سعدیہ کا دودھ پینے سے پہلے ثوبیہ نامی دایہ کا دودھ بھی پیا تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کی اور آپؐ کی مالی حالت اچھی ہوئی تو آپؐ نے ثوبیہ کو بھی فراموش نہ کیا اور ہمیشہ آپؐ اس کی آخری زندگی تک لباس وغیرہ بھیجتے تھے ثوبیہ جنگ خیبر کے بعد دنیا سے رخصت ہوئیں۔[2]

دلچسپ یہ ہے کہ تاریخ میں ملتا ہے کہ ثوبیہ ابولہب کی کنیز تھی اور جب اسے خبر ملی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی تو اس نے خوشی میں اسے آزاد کر دیا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی دشمنی کے بعد جب ابولہب مرا تو اس کے اپنے بھائی عباس نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا: کیا حال ہے؟

ابولہب نے کہا: آگ میں ہوں لیکن پیر کے دن میرا عذاب کم ہو جاتا ہے میری انگلیوں سے پانی آتا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیر کے دن پیدا ہوئے تھے اور میں نے ان کی ولادت میں ثوبیہ کو آزاد کیا تھا۔



---

[1] اعلام الوری، صفحہ 126 و 127، سفینۃ البحار، مادہ ''حلم''.

[2] سفینۃ البحار، جلد 1، ص 522 (واژہ ثوبیہ).

مَنْ ماتَ تُائباً مِنَ الْغَيْبَةِ فَهُوَ آخِرُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَ مَنْ ماتَ مُصِرّاً عَلَيها، فَهُوَ اَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ النّارَ.

جو شخص مرجائے اور اس نے غیبت کی ہو اور توبہ بھی کی تو وہ آخری شخص جنت میں جانے والا ہوگا اور جو شخص مرجائے اور کسی شخص کی غیبت کی ہو اور توبہ بھی نہ کی ہو تو وہ دوزخ میں سب سے پہلے داخل ہونے والا ہوگا۔

۴۔غیبت

اشارہ

اس کتاب کی پہلی جلد میں اخلاق بطور کلی بیان ہوئے ہیں زبان کی آفات سے مبارزہ کے بارے میں بحث ہوتی ہے پہلا قدم اصلاح اخلاق، تہذیب نفس اور سیروسلوک الی اللہ بیان ہوا ہے اور ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی جزئیات پر بحث کریں گے ان میں سے ایک عیب کا مسئلہ ہے جو بدترین اور خطرناک ترین فساد اخلاقی شمار ہوتا ہے لوگوں کی ہتک، کشف اسرار شائع فحشا وغیرہ کے سبب سے اجتماعی زندگی میں خلل پڑتا ہے اعتماد عمومی سلب ہو جاتا ہے معاشرے میں متعدد فساد پیدا ہو جاتے ہیں لہٰذا اسلام نے اسے سختی سے منع کیا ہے اخلاقی کتابوں میں زبان ایک بدترین آفت ذکر ہوئی ہے۔

اس کی برائی سے بچے بغیر قرب الٰہی حاصل نہیں ہوتا اسلامی معاشرے کی روح اور سعادت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

شخص کی عدم موجودگی میں اس کے مختلف القابات سے پکارنا جو وہ پسند نہ کرتا ہو نقطہ مقابل غیبت ہے کہ جب کوئی آدمی نہ ہو اور اس کی نیکیوں کو یاد کرنا اور اگر کوئی غیبت کرے تو اسے روکے یا اس محفل سے اٹھ کر چلا جائے یہ ایک اچھی فضیلت ہے جن کے معاشرے پر بہت سے آثار و برکات ہیں لہٰذا قرآن مجید میں اس موضوع کی بڑی تاکید کی گئی

ہے۔

① ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ. [1]

اے ایماندارو! بہت سے گمانِ (بد) سے بچے رہو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تم تو ضرور اس سے نفرت کرو گے اور خدا سے ڈرو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

② ۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ. [2]

ہر طعنہ دینے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

③ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. [3]

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمانداروں میں بدکاری کا چرچا پھیل جائے بے شک ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور خدا (اصل حال کو) خوب جانتا ہے اور تم لوگ نہیں جانتے ہو۔

④ ۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا. [4]

خدا (کسی کے) ہانک پکار کر بُرا کہنے کو پسند نہیں کرتا۔ مگر مظلوم ظالم کی برائیاں بیان کرسکتا ہے۔ اور خدا تو (سب کی) سُنتا (اور ہر ایک کو) جانتا ہے۔

---

[1] حجرات: ۱۲

[2] ھمزۃ: ۱

[3] النور: ۱۹

[4] النساء: ۱۴۸

تفسیر اور خلاصہ

پہلی آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ تین چیزوں سے منع کر رہا ہے جو درحقیقت ایک دوسرے کے لئے علت ومعلول ہیں۔

پہلا یہ کہ بدگمانی دوسرا تجسس اور تیسرا غیبت کا انجام۔واضح ہے کہ بدگمانی سے انسان میں تجسس آتا ہے دوسرے کے احوال کے پیچھے اوران کے نقص وعیب ڈھونڈنے میں رہتا ہے۔لیکن قرآن کی اس آیت میں غیبت بدگمانی اورتجسس سے زیادہ اہم اخلاقی موضوع ہے خدا فرماتا ہے:

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ

اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے۔کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تم تو ضرور اس سے نفرت کرو گے اور خدا سے ڈرو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

یہ دلیل درحقیقت ایک منطقی دلیل ہے جس میں غیبت کے تمام پہلو بیان ہوئے ہیں۔شخص غائب کو مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس کے دین رابطہ کو اخوت و برادری کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور غیبت کو بمنزلہ بھائی کے گوشت کے کھانے کے مترادف سمجھا گیا ہے جو کام و جدانی لحاظ سے جتنا ضعیف ہو اس سے انسان وحشت کھاتا ہے حتیٰ کہ سخت حالات میں یہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں اس میں کئی نکات بیان کیے جا سکتے ہیں۔

غائب انسان مردہ کی مانند ہے کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا بے شک مردہ بھائی کا گوشت کھانا اس بات کا سبب ہے کہ جسم و جان سالم نہیں رہتی بلکہ مختلف بیماریوں کا سرچشمہ ہے لہٰذا غیبت کرنے والا آدمی اپنے حسد و کینہ کی آگ کو غیبت کے ذریعے وقتی طور پر خاموش کرتا ہے تو یقیناً جلد ہی وہ خود ذلیل وخوار ہوگا۔

غیبت کرنے والا انسان ضعیف و ناتوان ہے بزدل ہوتا ہے جس کی وجہ سے مردے پر حملہ کرتا ہے۔

جس طرح ایک مردہ خور انسان یا حیوان بیماری کے جراثیم پھیلانے کا سبب بنتے ہیں اسی طرح غیبت کرنے والا شخص بھی دوسروں کے گناہ ذکر کر کے مسلمان بھائیوں کے لئے فحشاء کا عامل ہوتا ہے خداوند عالم نے قرآن مجید میں مثال دے کر بہت لطیف نکات کی وجہ اشارہ فرمایا ہے۔خداوند عالم نے جملہ کو سوال سے شروع کیا ہے تا کہ انسان اپنے

دل سے جواب دے: کیا تم میں سے کوئی یہ دوست رکھتا ہے کہ وہ مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟

بعض مقامات پر غیبت کرنا جائز ہے جیسے ظالم شخص اور دو مسلمان بھائیوں میں صلح کے وقت غیبت کرنا جائز تو ہے لیکن ایسے ہی جیسا کوئی انسان اضطرار کے وقت مردہ کھا سکتا ہے تا کہ زندہ رہ سکے مردار کھانے والے افراد سالوں میں نادر ہی پائے جاتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اس بری صفت سے تمام انسان پرہیز کرتے ہیں لیکن غیبت ایک ایسا رائج عمل ہے جس میں اکثر لوگ اسیر ہیں بلکہ سیر وتفریح کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا ہے لوگ اکٹھے ہوتے تو دوستوں کی غیبت کرنا شروع کر دیتے ہیں گلہ وغیبت کرنا بعض لوگ اسے معمولی سمجھتے ہیں۔

دوسری آیت میں سخت تہدید ہوتی ہے ان افراد کی جو اس بری صفت میں اسیر ہیں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ.

ہر طعنہ دینے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

اس آیت میں **لمزہ** کا کلمہ **لمز** کے مادے سے ہے **لمز** بروزن رمز اور **همزہ همز** کے مادے سے لیا گیا ہے **همز** بروزن **لمز** ہے یہ دونوں صیغہ مبالغہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔مفسرین کے درمیان ان دو کلمات کے معنی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض نے لکھا ہے کہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے یعنی غیبت کرنے والے بعض نے کہا کہ دونوں کے الگ الگ معنی ہیں ہمزۃ یعنی غیبت کرنے والا **لمزہ** یعنی عیب نکالنا۔

بعض نے اس کے برعکس کہا ہے بعض نے ہمزہ کا معنی یعنی اشارہ سے عیب جوئی کرنا اور لمزہ یعنی زبان اور عمل سے عیب جوئی نکالنا لکھا ہے۔

بعض نے پہلے کا معنی آشکار عیب جوئی اور دوسرے کا معنی پنہانی عیب جوئی لکھا ہے۔

بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمزہ وہ شخص ہے جو کسی انسان کی موجودگی میں اس کی عیب جوئی کرے اور **لمزہ** یعنی جو عدم موجودگی میں عیب نکالے۔[1]

بعض نے لکھا ہے کہ دونوں بری صفتیں جہل وغضب، تکبر سے مرکب ہیں کیونکہ ایک قسم دوسروں کو تکلیف دینا ہے اور دوسری قسم برتری حاصل کرنا ہے۔[2]

یہ دونوں صفات منافقین کی ذکر ہوئی ہیں۔کلمہ ویل جو آیت کے شروع میں آیا ہے قرآن مجید میں ۲۷ مرتبہ

---

[1] روح البیان، جلد 10، صفحہ 58.

[2] روح البیان، جلد 10، صفحہ 58.

ذکر ہوا ہے جس کا معنی ہلاکت ہے یہ کلمہ اور "وَیْل" و "وَیح" سب انسان حسرت کی حالت کو بیان کرتے ہیں البتہ ''ویل'' برے کاموں اور دیس حقیر کاموں اور ''ویح'' مقام ترحم میں استعمال ہوتے ہیں لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ عیب جوئی بدترین اعمال میں ہے۔[1]

تیسری آیت بلا واسطہ اس گناہ کے مرتکب ہونے والوں کی سخت مذمت ہوئی ہے اور اس کے ضمن میں غیبت کا ذکر ہوا ہے کیونکہ گناہ اکثر غیبت یا تہمت کے ذریعے ہوتا ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمانداروں میں بدکاری کا چرچا پھیل جائے بے شک ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ اور خدا (اصل حال کو) خوب جانتا ہے اور تم لوگ نہیں جانتے ہو۔

البتہ آیت کا شان نزول ان منافقین کے بارے میں ہے جنہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ پر تہمت لگائی تھی درحقیقت آیات میں سے پہلی آیت میں مسئلہ حق الناس یعنی غیبت کا ذکر ہوا ہے اس میں بہت آثار و انجام کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

فاحشہ، فحش کے مادے سے ہے ہر وہ کام جو حد اعتدال سے خارج ہو تو ایسا کام فحش کہلاتا ہے لہٰذا یہ تمام برے اعمال کو شامل ہوتا ہے فحش عام طور پر روزمرہ مسائل میں سے جنسی مسائل میں استعمال ہوتا ہے جو ناموس کے بارے میں ہو لیکن ایسا نہیں بلکہ یہ کلمہ عام ہے اور بد اعمال کو شامل ہے سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۵ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ.

(اے رسولؐ) جو کتاب تمہارے پاس نازل کی گئی ہے، اس کی تلاوت کرو اور پابندی سے نماز پڑھو بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے باز رکھتی ہے اور خدا کی یاد یقیناً بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو خدا اس سے واقف ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد 32، صفحہ 91.

یہ مفہوم عام ہے اسی آیت کے ضمن میں ایک حدیث ہے:

مَنْ قالَ فِي مُؤْمِنٍ ما رَأَتْهُ عَيْناهُ وَ سَمِعَتْهُ أُذُناهُ فَهُوَ مِنَ الَّذينَ قالَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ.

وہ شخص کہ کسی مومن کے (چھپے ہوئے) عیب کو دیکھے اور اسے دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کرے یہ شخص انہی لوگوں میں سے ہے کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ.

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمانداروں میں بدکاری کا چرچا پھیل جائے بے شک ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ایسے افراد کو دنیا و آخرت میں عذاب ہوتا ہے سب آخری بات جو مذکورہ آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ قرآن میں یہ نہیں ہے کہ جو لوگ فحش کرتے ہیں انہیں دنیا و آخرت میں عذاب ہوتا ہے بلکہ فرمایا کہ جو لوگ دوست رکھتے ہیں فحش برپا کرنے کو۔

چوتھی اور آخری آیت میں جواز غیبت کا ذکر ہوا ہے ظالم افراد کی غیبت جائز ہے جن کے مقابلے میں لوگوں کا ایک قسم کا احتجاج ہوتا ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا.

خدا (کسی کے) ہانک پکار کر بُرا کہنے کو پسند نہیں کرتا۔ مگر مظلوم ظالم کی برائیاں بیان کرسکتا ہے۔ اور خدا تو (سب کی) سُنتا (اور ہر ایک کو) جانتا ہے۔

جہل من العقول سے مراد یہ ہے کہ ہر قسم کا اظہار کرنا خواہ وہ شکایت کی صورت میں ہو یا غیبت و نفرین اور مذمت کی صورت ہو۔ لہٰذا وہ مظلوم جن پر ستم کیا گیا ہو وہ عالم کے سامنے اپنا دفاع کرسکتا ہے اس استثناء سے فائدہ نہ اٹھایا جائے کہ مظلوم کا بہانہ بنا کر ہر شخص دوسرے کی غیبت کرنا شروع کردے۔

روایات میں غیبت

اخلاقی کتب میں غیبت کی مذمت اور اس کے دردناک انجام کے بارے میں بڑی تاکید کی گئی ہے اور بہت سخت روایات ذکر ہوئی ہیں۔

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن خطبہ دے رہے تھے کہ گھروں سے ان عورتوں کی آواز آئی جن کے گھر نزدیک تھے تو آپؐ نے فرمایا:

یا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسانِهِ وَ لَمْ یُؤْمِنْ بِقَلْبِهِ لاتَغْتابُوا الْمُسْلِمینَ وَ لا تَتَبَّعُوا عَوراتَهُمْ فَاِنَّ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَتَ اَخِیهِ یَتَتَبَّعُ اللهَ عَوْرَتَهُ حَتّٰی یَفْضِحَهُ فی جَوْفِ بَیْتِهِ.[1]

اے وہ گروہ! جو صرف زبانی ایمان لائے ہو اور تمہارے دلوں میں ایمان نہیں ہے مسلمانوں کی غیبت نہ کرو دوسروں کی عیب جوئی نہ کرو جو کسی مسلمان بھائی کی عیب جوئی کرے خدا اس کے عیب کشف کر دے گا حتیٰ ان کو گھروں میں رسوا کرے گا۔

۲۔ سود کی مذمت کے بارے میں آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا: سود کا ایک درہم چھتیس زنا سے بدتر ہے پھر فرمایا:

اِنَّ اَرْبَا الرِّبا عِرْضُ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ.[2]

بدترین سود یہ ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی ہو۔

اس قسم کی بہت سی روایات موجود ہیں زنا کار انسان توبہ کرنے سے بخشا جاتا ہے لیکن غیبت حق الناس ہے جب تک لوگ معاف نہ کریں خدا معاف نہیں کرتا۔

۳۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] جامع السادات، جلد 2، صفحہ 303.

[2] جامع السادات، جلد 2، صفحہ 303.

اَلْغَيْبَةُ حَرَامٌ عَلى كُلِّ مُسْلِم وَ اِنّها لَتَأكُلُ الْحَسَناتِ كَما تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ.[1]

ہر مسلمان پر غیبت حرام ہے اس سے نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

۴۔ایک حدیث قدسی میں ہے کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کیا اور فرمایا:

مَنْ ماتَ تائباً مِنَ الْغَيْبَةِ فَهُوَ آخِرُ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَ مَنْ ماتَ مُصِرّاً عَلَيها، فَهُوَ اَوَّلُ مَنْ يَدْخُلُ النّارَ.[2]

جو شخص مرجائے اور اس نے غیبت کی ہو اور توبہ بھی کی تو وہ آخری شخص جنت میں جانے والا ہوگا اور جو شخص مرجائے اور کسی شخص کی غیبت کی ہو اور توبہ بھی نہ کی ہو تو وہ دوزخ میں سب سے پہلے داخل ہونے والا ہوگا۔

۵۔ایک اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ مَشى فِي غَيْبَةِ اَخِيهِ وَ كَشْفِ عَوْرَتِهِ كانَ اَوَّلُ خُطْوَة خَطاها وَضَعَها فِي جَهَنَّمَ.[3]

جو شخص کسی مسلمان بھائی کی غیبت کرے اور عیب جوئی کرے اور کسی کے پنہانی عیب بیان کرنے کے لئے قدم اٹھائے تو گویا اس کا پہلا قدم دوزخ میں ہوتا ہے۔

۶۔ایک حدیث میں ہے:

ما عُمِّرَ مَجلسٌ بِالْغَيْبَةِ اِلّا خُرِّبَ بِالدِّينِ فَنَزِّهُوا اَسْماعَكُمْ مِنْ اسْتِماعِ الْغَيْبَةِ فَاِنَّ الْقائِلَ وَ الْمُسْتَمِعَ لَها شَرِيكانِ فِي الاِثْمِ.[4]

کوئی غیبت کرنے والی مجلس آباد نہیں ہوتی مگر یہ کہ دین کی نظر میں ویران ہو جائے گی

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 601، حدیث 18.

[2] جامع السادات، جلد 3، صفحہ 305.

[3] جامع السادات، جلد 3، صفحہ ۳۰۳.

[4] بحارالانوار، جلد 75، صفحہ 259.

لہٰذا اپنے آپ کو غیبت سننے سے بچاؤ کیونکہ غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں گناہ میں شریک ہیں۔

۷۔غیبت کے معنوی بربادی کے بارے میں رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ اِغْتابَ مُسْلِماً اَوْ مُسْلِمَةً لَمْ يَقْبَلَ اللهُ صَلاتَهُ وَ لا صِيامَهُ اَرْبَعِينَ لَيْلَةً اِلّا اَنْ يَغْفِرَ لَهُ صاحِبُهُ. [۱]

جوشخص کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت کرتا ہے تو خداوندعالم چالیس دن تک اس کی نماز اور روزوں کی عبادت قبول نہیں کرتا ہاں! اگر جس کی غیبت کی ہو وہ خود بخش دے تو خدا قبول کرنے والا ہے۔

۸۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ رَوى عَلى مُؤْمِنٍ رِوايَةً يُرِيدُ بِها شَيْنَهُ وَ هَدْمَ مُرَوَّتِهِ لِيَسْقُطَ مِنْ اَعْيُنِ النّاسِ، وَ اَخْرَجَهُ اللهُ مِنْ وِلايَتِهِ اِلى وِلايَةِ الشَّيْطانِ فَلا يَقْبَلُهُ الشَّيْطانُ. [۲]

جوشخص کسی مومن بھائی کی غیبت کرے اور اس کا ہدف عیب جوئی بیان کرنا ہوتا کہ وہ لوگوں کی نظر میں گر جائے خدا اسے اپنی سرپرستی سے نکال کر شیطان کی سرپرستی میں بھیج دیتا ہے اور شیطان بھی اسے قبول نہیں کرتا۔

۹۔رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: آپؐ نے غیبت سے منع کیا اور فرمایا:

نَهى عَنِ الْغَيْبَةِ وَ قالَ مَنِ اِغْتابَ امْرَءً مُسْلِماً بَطَلَ صَوْمُهُ وَ نَقَضَ وَضُوئُهُ، وَ جاءَ يَوْمَ الْقِيامَةِ يَفُوحُ مِنْ فِيهِ رائِحَةٌ اَنْتَنُ مِنَ الْجِيفَةِ يَتَاَذّىٰ بِهِ اَهْلُ الْمَوْقِفِ. [۳]

جوشخص کسی مومن کی غیبت کرتا ہے اس کا روزہ اور وضو باطل ہوتے ہیں اور روز قیامت

---

[۱] بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 258، حدیث 53.

[۲] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 358، حدیث 1.

[۳] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 599، حدیث 13.

اس کے منہ سے بدبو آئے گی جو مردار سے بدتر ہو گی اور اہل محشر کو تکلیف ہو گی اور وہ ناراض ہوں گے۔

۱۰۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِيّاكَ وَ الْغَيْبَةَ فَاِنَّها تُمْقِتُكَ اِلَى اللهِ وَ النّاسَ، وَ تَحْبُطُ اَجْرَكَ. [۱]

غیبت سے پرہیز کرو تو یہ عمل خدا کی بارگاہ اور لوگوں میں مبغوض ہوتا ہے اور صالح اعمال کا اجر وثواب بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

قرآن و حدیث کے علاوہ عقل و اجتماع میں مسلمان کی غیبت حرام ہے کیونکہ عقلاً ایک ظلم ہے بعض مسائل کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔تعریف غیبت

علمائے اخلاق کے درمیان اس کے معنی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

صحاح اللغۃ لکھتا ہے:

غیبت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے پوشیدہ عیب بیان کرتا پھرے یا ایسی بات کرے جس کو سن کر وہ ناراض ہو جائے۔

مصباح المنیر میں ہے:

کسی کے پوشیدہ عیوب کو فاش کرنا جس سے وہ ناراض ہو جائے۔

شیخ انصاری بعض بزرگ علما سے نقل کرتے ہیں:

روایات اور اجماع کی روشنی میں غیبت کی تعریف یہ ہے کہ کسی دوسرے کی اس کی عدم موجودگی میں ایسی بات کرنا جس سے وہ ناراض ہوتا ہو۔ [۲]

اسی مضمون کی روایت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی منقول ہے امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

غیبت یہ ہے کہ کسی مسلمان کے بارے میں ایسی بات کرنا جس کو خدا نے پنہاں رکھا ہوا

---

[۱] شرح غرر الحکم، جلد 2، صفحہ 687، حدیث 2632.

[۲] مکاسب محرّمہ شیخ انصاری، صفحہ 41.

تھا اگر شخص کی عدم موجودگی بات کرنا غیبت اور اس کے سامنے کہنا اس کی اہانت ہے عیب بھی پنہانی ہوں اگر وہ عیب جو ہر آدمی جانتا ہے اور سب کے لئے آشکار ہوں وہ غیبت نہیں ہے اگر کسی اور عنوان سے حرام بھی ہو۔ پنہانی عیوب کے ظاہر ہونے سے شخص زیادہ ناراض ہوتا ہے بعض افراد کو جب غیبت سے منع کریں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم یہ باتیں اس کے سامنے بھی کرتے ہیں تو یہ عذر گناہ سے بھی بدتر ہے کیونکہ کسی کے سامنے کہنا اس کی ہتک واہانت ہے۔[1]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت منقول ہے کہ لوگوں کی موجودگی میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص کا نام لیا گیا تو حاضرین نے کہا: وہ ایک عاجز آدمی ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس کی غیبت کی ہے۔

عرض کیا گیا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! ہم نے اس کی صفت کو بیان کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

اِنْ قُلْتُمْ ما لَيْسَ فِيهِ فَقَدْ بُهِتُّمُوهُ.[2]

ہر وہ بات جو کسی شخص میں نہ ہو، کہنا اس پر تہمت ہے۔

بعض افراد غیبت سے منع کرنے پر یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ کیا یہ عیب فلاں میں نہیں پایا جاتا ہم کوئی جھوٹ بول رہے ہیں بعض لوگ غیبت کو جائز سمجھنے کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول سے تمسک کرتے ہیں:

مَنْ عامَلَ النّاسَ فَلَمْ يَظْلِمْهُمْ، وَحَدَّثَهُمْ فَلَمْ يَكْذِبْهُمْ، وَ وَعَدَهُمْ فَلَمْ يُخْلِفْهُمْ كَانَ مِمَّنْ حُرِّمَ غَيْبَتُهُ وَ كَمُلَتْ مُرُوَّتَهُ، وَ ظَهَرَ عِدالَتُهُ، وَ وَجَبَتْ اِخْوَتُهُ.[3]

جو شخص لوگوں کے ساتھ روابط میں کسی پر زیادتی نہ کرے، اپنے قول وفعل میں لوگوں سے جھوٹ نہ بولے اور وعدہ خلافی نہ کرے ایسے شخص کی غیبت حرام ہے ایسا آدمی باشخصیت اور

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد 8، ابواب احکام العشرہ، صفحہ 602.

[2] محجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 256.

[3] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 239، حدیث 28.

عادل ہوتا ہے اور اسے شخص کے ساتھ برادری واجب ہے۔

اسی حدیث میں اس شخص کی غیبت حرام ہے جو عادل ہو اور فاسق کی غیبت لوگ جائز جانتے ہیں۔

مرحوم علامہ مجلسی بحار الانوار کی ج ۷۲ میں کتاب العشرہ میں اس نے اس قول کو قبول کیا لیکن ذیل میں اس سے عدول کیا لیکن اگر صرف عادل کی غیبت حرام ہو تو پھر بہت سے افراد دوسروں کو غیر عادل سمجھ کر اس کی غیبت کرنا شروع کر دیتے ہیں بعض روایات میں ملتا ہے کہ چند گروہوں کی غیبت جائز ہے۔ ان میں سے ایک فاسق ہے جس کا فسق مشہور ہو۔[۱]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَرْبَعَةٌ لَيْسَتْ غَيْبَتُهُمْ غَيْبَةٌ، اَلْفاسِقُ الْمُعْلِنِ بِفِسْقِهِ...[۲]

چار گروہ ایسے ہیں جن کی غیبت درحقیقت غیبت نہیں ہے ان میں پہلا وہ فاسق ہے جو عام گناہ کرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِذا جاهَرَ الْفاسِقُ بِفِسْقِهِ فَلا حُرْمَةَ لَهُ عَلى غَيْبَة.[۳]

جب فاسق فسق میں مشہور ہو اور شر عام گناہ کرے ایسے شخص کا نہ احترام ہے اور نہ غیبت۔

امام علی رضا علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

مَنْ اَلْقى جَلْبابَ الْحَياءَ فَلا غَيْبَةَ لَهُ.[۴]

(یعنی) جو شخص چادر حیا رکھتا ہو وہ کبھی غیبت نہیں کرتا۔

ان احادیث کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث غیبت کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ اس شخص کی

---

[۱] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 235 تا 237.

[۲] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 235 تا ۲۶۱.

[۳] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 253.

[۴] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ ۲۶۰.

غیبت بھی جائز نہیں جو پوشیدہ گناہ کرے مگر یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر یا لوگوں کو کسی کے شر سے محفوظ رکھنا مقصود ہو۔

اقسام غیبت

بعض یہ سمجھتے ہیں کہ غیبت صرف زبان سے ہوتی ہے حالانکہ حقیقت میں عیوب کا ظاہر کرنا جو پنہانی ہوں اور اگر وہ شخص سن لے تو ناراض ہو جائے یہ کام ممکن ہے زبان سے ہو یا ممکن ہے قلم سے ہو حتیٰ آنکھ اور ہاتھ کے اشارے سے بھی غیبت ممکن ہے۔

بعض لوگ اس طرح غیبت کرتے ہیں: فلاں بڑا نیک ہے.....پھر چپ ہوتے ہیں تو اشارہ اور کنایہ ہوتا ہے کہ وہ نیک نہیں ہے یا اس میں برائی پائی جاتی ہے۔

غیبت کے عوامل

غیبت کے کئی عوامل ہو سکتے ہیں:

۱۔حسد	۲۔خودخواہی	۳۔غرور
۴خودبینی	۵۔مقام طلبی	۶۔کینہ
۷۔دنیا پرستی	۸۔ریاکاری	۹۔تزکیہ نفس
۱۰۔شہوت	۱۱۔سوئے ظن	۱۲۔انتقام جوئی
۱۳۔تشفی قلب	۱۴۔مذاق اڑانا	

بعض انسان کوشش کرتے ہیں غیبت کے ذریعے دوسرے کی شخصیت پر دھبہ لگایا جائے کبھی انتقام کے ذریعے کبھی مقام و حال کے ذریعے کہ دوسروں کو محروم کرنا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَصْلُ الْغِيْبَةِ تَتَنَوَّعُ بِعَشْرَةِ اَنْواع;

شِفَآءِ غَيْظ وَ مُسَاعَدَةِ قَوْم وَ تُهْمَة، وَ تَصْدِيْقِ خَبَرٍ بِلَا كَشْفِهِ، وَ سُوْٓءِ ظَنٍّ وَ حَسَدٍ وَ سُخْرِيَّة وَ تَعَجُّب وَ تَبَرُّم وَ تَزَيُّن،

فَاِنْ اَرَدْتَ السَّلَامَةَ فَاذْكُرِ الْخَالِقَ لاَ الْمَخْلُوقَ فَيَصِيْرُ ذَالِكَ مَكَانَ الْغِيْبَةِ عِبْرَةً وَ مَكَانَ الْاِثْمِ ثَواباً.

غیبت کا سرچشمہ دس قسم کا ہوتا ہے:

۱۔تسکین قلب کے لئے	۲۔تعصب کی بنا پر
۳۔غصہ کو پینے کے لئے،	۴۔دوسروں پر تہمت لگانا،
۵۔کبھی خبر کی جلدی تصدیق کرنا،	۶۔سوئے ظن،
۷۔حسد	۸۔مذاق بنانا،
۹۔اظہار تعجب،	۱۰۔خود پسندی۔

واضح ہے کہ امامؑ نے صرف نمایاں اور چند ایک وجوہات کو بیان کیا ہے ورنہ غیبت کی وجوہات بہت سی ہوسکتی ہیں۔

غیبت کے آثار

انسانی اور اسلامی معاشرے کو خراب کرنے کے لئے غیبت کے کئی آثار ہیں اس مطلب پر دلالت کرنے والے چند آثار کو ذکر کیا جاتا ہے۔

۱ غیبت اسلامی معاشرے کا اہم ترین سرمایہ خراب کردیتی ہے۔

۲ غیبت تمام افراد کی نسبت سوئے ظن کا سرچشمہ ہے۔

۳ غیبت فحش کا سبب ہے امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ قالَ فی مُؤْمِن مارأتْهُ عَيْناهُ وَ سَمِعَتْهُ اُذُناهُ فَهُوَ مِنَ الَّذِينَ قالَ اللهُ

عَزَّ وَجَلَّ: اِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ اَنْ تَشِيْعَ الْفاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذابٌ اَلِيْمٌ.
[1]

جو شخص دوسرے مومنوں کی بدی کو آنکھ سے دیکھتے ہیں یا کان سے سنتے ہیں یا زبان سے کہتے ہیں ان کے بارے میں خدا فرماتا ہے جو لوگ دوست رکھتے ہیں مومنوں کی برائیاں عام ہوں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۴ غیبت گناہ گار لوگوں کو ان کے گناہوں میں جری بنا دیتی ہے۔

۵ غیبت کینہ، عداوت و بغض کا سبب ہے۔

۶ غیبت، غیبت کرنے والے کو لوگوں کی نظروں میں گرا دیتی ہے۔

۷ غیبت، غیبت کرنے والوں کے لئے بہانہ و عذر بن جاتی ہے۔

اب ہم بعض سوئے معنوی آثار ذکر کرتے ہیں:

۱ غیبت نیکیوں کو تباہ کر دیتی ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

۲ غیبت انسان کے دین کو خراب کر دیتی ہے۔

۳ غیبت کرنے والا اگر بخشا بھی جائے تو جنت میں آخری شخص داخل ہونے والا ہوگا اور اگر بخشا نہ گیا تو پہلا فرد دوزخ میں جانے والا ہوگا۔

۴ غیبت رسوائی کا سبب ہوتی ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

يا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلسانِهِ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِقَلْبِهِ لا تَغْتابُوا الْمُسْلِمِينَ وَ لا تَتَبَّعُوا عَوْراتِهِمْ فَاِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ اَخِيْهِ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ وَ مَنْ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحُهُ فِي جَوْفِ بَيْتِهِ.
[2]

اے وہ گروہ جو صرف زبان سے لائے ہو لیکن تمہارے دلوں میں ایمان نہیں ہے مسلمانوں کی غیبت نہ کرو اور ان کے عیوب کو ظاہر نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمان بھائیوں کے عیوب کشف کرتا ہے، خدا اس کے عیوب کو ظاہر کر دیتا ہے اور جس کے عیب خدا ظاہر کرے تو وہ رسوا ہو

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 357.

[2] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 252.

گا۔

۵۔غیبت کرنے والے کی نیکیاں جس کی غیبت کی جائے اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں اور جس کی غیبت کی جائے اس کی برائیاں غیبت کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

يُؤْتى بِأَحَدٍ يَوْمَ الْقِيامَةِ يُوقَفُ بَيْنَ يَدَيِ اللهُ يُدْفَعُ إِلَيْهِ كِتابُهُ فَلا يَرَى حَسَناتِهِ فَيَقُولُ إِلهِي لَيْسَ هذا كِتابِي فَإِنِّي لا أَرَى فِيها طاعَتِي فَقالَ إِنَّ رَبَّكَ لا يَضِلُّ وَ لا يَنْسى، ذَهَبَ عَمَلُكَ بِاغْتِيابِ النّاسِ ثُمَّ يُؤْتى بِآخَرَ وَ يُدْفَعُ إِلَيْهِ كِتابُهُ فَيَرى فِيها طاعاتٍ كَثِيرةً، فَيَقُولُ إِلهِي ما هذا كِتابِي فَإِنِّي ما عَمِلْتُ هَذِهِ الطّاعاتِ، فَيَقُولُ: إِنَّ فُلاناً اِغْتابَكَ فَدُفِعَتْ حَسَناتُهُ إِلَيْكَ.[1]

روز قیامت ایسے شخص کو خدا کی بارگاہ میں حاضر کریں گے کہ اس کے ہاتھ میں اعمال نامہ دیں گے جب وہ اپنی نیکیوں کو دیکھے تو کچھ نہیں ہوگا تو خدا سے عرض کرے گا خدایا! یہ نامہ اعمال میرا نہیں ہے کیونکہ اس میں میری عبادت نہیں لکھی ہوئی خدا اس سے کہے گا تو نہ گمراہ ہوا ہے اور بھولا ہے تیری عبادات لوگوں کی غیبت کی وجہ سے ختم ہوگئی ہیں پھر ایک اور شخص کو لائیں گے اور اسے نامۂ اعمال دیں گے اس میں وہ ایسی عبادات کو دیکھے گا جو اس نے انجام نہیں دیں وہ کہے گا یہ میرا نامۂ اعمال نہیں ہے خدا فرمائے گا کہ فلاں شخص نے تیری غیبت کی تھی لہٰذا اس کی نیکیاں تیرے نامہ اعمال میں لکھی گئی ہیں۔

اخلاقی کتب میں ملتا ہے کہ کسی شخص نے کسی دوسرے کی غیبت کی تو جس کی غیبت ہوئی اس نے ایک طشت کھجور کا غیبت کرنے والے کی خدمت میں بھیجا اور پیغام بھیجا: تم اپنی نیکیاں مجھے ہدیہ کرتے ہو لہٰذا میں نے بھی ہدیہ بھیجا ہے۔

۶۔غیبت کرنے سے انسان کے چالیس دن تک روزے ونماز خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوں گے مگر یہ کہ جس کی غیبت ہوئی ہو وہ معاف کر دے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اِغْتابَ مُسْلِماً اَوْ مُسْلِمَةً لَمْ يَقْبَلِ اللهُ تَعالى صَلاتَهُ وَ لا صِيامَهُ

---

[1] مستدرک الوسائل، جلد 9، صفحہ 121، حدیث 30.

اَرْبَعِیْنَ یَوْماً وَلَیْلَةً اِلّا اَنْ یَغْفِرَ لَهُ صاحِبُهُ.[1]

جو کوئی کسی مرد یا عورت کی غیبت کرتا ہے خداوند عالم اس کے چالیس دن رات نماز و روزے قبول نہیں کرتا لیکن جس کی غیبت ہوئی ہے اگر وہ معاف کر دے تو اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

غیبت کا علاج

بیماری دو قسم کی ہوتی ہے مادی اور معنوی جسم کا مریض مادی بیماری ہے اور روحانی بیماری کو معنوی بیماری کہتے ہیں۔

غیبت ایک خطرناک بیماری ہے بعض ابعاد سے اس بیماری کا علاج مادی بیماری اور بعض ابعاد سے معنوی علاج سے ممکن ہے۔

۱۔ مندرجہ ذیل امور کی رعایت سے غیبت کا علاج ممکن ہے بیماری مادی ہو یا روحانی جب تک اس بیماری کی جڑ کا پتہ نہ چلے علاج مشکل ہوتا ہے لہٰذا ان عوامل کو دیکھنا ضروری ہے جو اس بیماری میں مؤثر ہیں ۔ حسد، کینہ، خود پسندی، انتقام جوئی اور تکبر بہت اہم عوامل ہیں جن سے انسان غیبت کرتا ہے جب تک ان سے پاک نہ ہو انسان کا روحانی علاج مشکل ہوتا ہے۔

۲۔ اس خطرناک بیماری کے علاج کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان غیبت کے آثار و انجام کی طرف توجہ کرے جب انسان غیبت کرتا ہے تو وہ لوگوں کی نظر میں حقیر بن جاتا ہے لوگ اسے خائن اور ناحق شناخت سمجھتے ہیں معاشرے میں اس پر کوئی اعتماد نہیں کرتا اگر توبہ کرتا ہے تو جنت میں جانے والا آخری فرد ہوگا اور اگر توبہ قبول نہ ہوئی تو دوزخ میں پہلا داخل ہونے والا ہوگا جب تک انسان جس کی غیبت کی ہو وہ راضی نہ ہو جائے جب انسان ان عواقب کو دیکھتا ہے تو ضرور پشیمان ہوتا ہے تو ایک دن غیبت چھوڑ دیتا ہے۔

۳۔ غیبت کرنے والے کو یہ سوچنا چاہیے کہ انسان کی طاقت محدود ہے اگر وہ اپنی قدرت کو لوگوں میں بدنام

---

[1] مستدرک الوسائل، جلد 9، صفحہ ۱۲۲، حدیث 34.

کرنے پر لگ جائے اور اپنا مقام بنانے کی خاطر دوسروں کو ذلیل وخوار کرے تو اس کا انجام بھی برا ہے بہتر تو یہی ہے کہ انسان دوسروں کے گھروں کو خراب کرنے کی بجائے اپنے گھر کی تعمیر کرے۔

انسان کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ شاید متوجہ ہو جائے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما عُمِّرَ مَجْلِسٌ بِالْغَيْبَةِ اِلّا خَرِبَ مِنَ الدِّينِ.[1]

کوئی مجلس غیبت کے ذریعے آباد نہیں ہوئی مگر یہ کہ دین کی نظر میں خراب ہوئی۔

بعض لوگ اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہیں اور پھر سمجھتے ہیں کہ وہ خطا کار نہیں ہیں ایسے عذر گناہ سے بھی بدتر ہیں اور بہت خطرناک انجام ہوتا ہے۔

اس بحث میں غیبت کے چند موضوعات باقی رہ گئے ہیں جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کو ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ غیبت سننا

جس طرح غیبت کرنا گناہان کبیرہ ہے اسی طرح غیبت سننا بھی گناہان کبیرہ ہے کیونکہ فساد دونوں طرف ہے یعنی غیبت کرنے والا اور سننے والا اگر کوئی شخص حاضر نہ ہو کہ وہ کسی کی غیبت کے سننے کو نہ جائے تو یہ بھی ایک نہی از منکر ہے اس سے نہ کسی کی غیبت ہو گی نہ آبرو ریزی اور نہ ہی اہانت، اسی لئے روایات میں غیبت کرنے والا اور سننے والا دونوں کو ایک شمار کیا گیا ہے دونوں گناہ میں برابر شریک ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمُسْتَمِعُ اَحَدُ الْمُغْتابِيْنَ.[2]

غیبت سننے والا بھی غیبت کرنے میں شریک ہے

یعنی غیبت سننے والا بھی ایک غیبت کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔

---

[1] روضۃ الواعظین، صفحہ 542.

[2] جامع السّعادات، جلد 2، صفحہ 297 بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 226.

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلسّامِعُ لِلْغَیْبَةِ اَحَدُ الْمُغْتابِینَ.[1]

غیبت سننے والا ایک غیبت کرنے والا ہے۔

ایک شخص امام حسن علیہ السلام کے پاس غیبت کر رہا تھا تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

یابُنَیَّ نَزِّهْ سَمْعَكَ عَنْ مِثْلِ هذا فَاِنَّهُ نَظَرَ اِلی اَخْبَثِ ما فی وِعائِهِ فَاَفْرَغَهُ فی وِعائِكَ.[2]

اے بیٹے! غیبت سے اپنے کانوں کو پاک رکھو کیونکہ غیبت کرنے والے میں گندی ترین چیز پائی جاتی ہے اور تجھے بھی ملوث کرنا چاہتا ہے روایات میں آیا ہے کہ غیبت سننے والے کو مومن بھائی کا دفاع کرنا چاہیے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اُغْتِیْبَ عِنْدَهُ اَخُوْهُ الْمُسْلِمُ فَاسْتَطاعَ نَصْرَهُ فَلَمْ یَنْصُرْهُ خَذَلَهُ اللهُ فِی الدُّنْیا وَ الْاٰخِرَةِ.[3]

جس شخص کے پاس کسی مومن کی غیبت ہو اور اس کا دفاع کر سکتا ہو لیکن دفاع نہ کرے تو ایسے شخص کو خداوند عالم دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

اذا وُقِّعَ فی رَجُل وَ اَنْتَ فی مَلأ فَکُنْ لِلرَّجُلِ ناصِراً وَ وَ لِلْقَومِ زاجِراً وَ قُمْ عَنْهُمْ.[4]

اگر تم ایسے شخص کے پاس ہو اور کسی مسلمان کی غیبت ہو رہی ہو تو تمہیں اس کا دفاع کرنا چاہیے (اور تم پر لازم ہے کہ) اسے منع کرو ورنہ اس محفل سے اٹھ جاؤ ہو۔

---

[1] جامع السّعادات، جلد 2، صفحہ 297 بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 226.

[2] میزان الحکمہ، جلد 3، صفحہ 2339.

[3] میزان الحکمہ، جلد 3، صفحہ 2339.

[4] کنز العمال، حدیث 8028.

آپؐ ہی نے فرمایا:

اَلسّاکتُ شریكُ المُغتاب.[1]

غیبت کے وقت سننے والا کا چپ رہنا بھی غیبت کرنے میں وہ شریک ہے۔

ایک حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اَلا وَمَنْ تَطَوَّلَ عَلی اَخِیْهِ فی غَیْبَة سَمِعَها فِیهِ فی مَجْلِس فَرَدَّها عَنْهُ رَدَّ اللهُ عَنْهُ اَلْفَ باب مِنَ الشَّرِ فِی الدُّنیا وَ الاٰخِرَةِ، فَاِنْ هُوَ لَمْ یَرُدَّها وَ هُوَ قادِرٌ عَلی رَدِّها کانَ عَلَیْهِ کَوِزْرِ مَنْ اِغْتابَهُ سَبْعینَ مَرَّةً.[2]

جو شخص کسی اپنے مسلمان بھائی پر احسان کرے اور اس کی غیبت میں اس کا دفاع کرے تو خداوند عالم ایسے شخص سے ہزار بدی دنیا و آخرت میں دور کرتا ہے اور اگر دفاع کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود دفاع نہ کرے تو ستر برابر گناہ اور غیبت کرنے والے کے ساتھ شمار ہوگا۔

۲۔ غیبت حقوق العباد ہے یا حقوق اللہ؟

جو کچھ غیبت کی تعریف میں بیان ہو چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقوق العباد میں سے ہے کیونکہ اس میں لوگوں کی آبرو ریزی اور ہتک ہوتی ہے اور مسلمان بھائی کی آبرو بھی اس کے جان و مال کی طرح محترم ہے قرآن میں مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کا حق ہے احادیث میں آیا ہے کہ غیبت ایک قسم کا ظلم و ستم ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَیُّهَا النّاسُ اِنَّ دِمائَکُمْ وَ اَمْوالَکُمْ وَ اَعْراضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ هذَا فی شَهْرِکُمْ هذا فی بَلَدِکُمْ هذا اِنَّ اللهَ حَرَّمَ الْغَیْبَةَ کَما

---

[1] آثار الصادقین، ج16، ص98.

[2] من لایحضرہ الفقیہ، جلد 4، صفحہ 8 و 9.

حَرَّمَ الْمالَ وَ الدَّمَ.[1]

اے لوگو! تمہارا خون، مال اور آبرو ایک دوسرے کے لئے محترم ہے جیسا آج ذوالحجہ کا احترام ہے اور اس کے شہر مکہ کی مانند محترم ہے ان کی حرمت حرام ہے غیبت کو اس طرح حرام کیا گیا ہے۔ بے شک جب کسی کا ناحق خون بہایا جائے تو اس کا جبران کرنا چاہیے مومن کی آبرو اس کے خون و مال کے مقابلے میں ذکر ہوئی ہے لہٰذا یہ حق الناس میں سے ہے۔

ایک روایت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

غیبت زنا جیسے گناہ سے بھی بدتر ہے۔

پھر فرمایا:

زانی بعد از توبہ (یعنی زانی توبہ کرنے کے بعد) قابل بخشش ہے۔

اِنَّ صاحِبَ الْغِیْبَةِ لا یُغْفَرُ لَهُ حَتّٰی یَغْفِرَ لَهُ صاحِبُهُ.[2]

یقیناً غیبت کرنے والا نہیں بخشا جائے گا جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرامٌ دَمُهُ وَ مالُهُ وَ عِرْضُهُ، وَالْغِیْبَةُ تَناوُلِ الْعِرْضِ.[3]

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے زیادتی کرنا حرام ہے اس کا خون، مال، آبرو اور غیبت اس کی آبرو ہے۔

روایات میں بیان ہو چکا ہے کہ غیبت کرنے والے کی نیکیاں غیبت ہونے والے شخص کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور اس کے برعکس غیبت ہونے والے شخص کی برائیاں غیبت کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں یہ بھی ایک بہترین دلیل ہے کہ غیبت حقوق العباد میں سے ہے اب سوال یہ آتا ہے کہ غیبت کرنے والا کیسے جبران کرے روایات میں ملتا ہے کہ غیبت کرنے والے کو چاہیے وہ اس شخص سے معافی مانگے اور اگر اس تک نہ پہنچے تو اس کے لئے

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج9، صفحہ 62.

[2] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 251.

[3] مجموعہ ورّام، جلد 1، صفحہ 123.

اللہ سے طلب مغفرت کرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

فَإِنْ اُغْتِيْبَ فَبَلَغَ الْمُغْتَابَ فَلَمْ يَبْقَ إِلّا اَنْ تَسْتَحِلَّ مِنْهُ وَإِنْ لَمْ يَبْلُغْهُ وَلَمْ يَلْحَقْهُ عِلْمَ ذٰلِكَ فَاسْتَغْفِرِ اللهَ لَهُ.[1]

یعنی جس شخص نے غیبت کی اسے (جس کی غیبت کی ہے اس سے) معافی مانگنی چاہیے اور اگر (اس شخص تک) نہ پہنچ سکے تو اس کے لئے اسے استغفار کرنا چاہیے۔

متعدد روایات میں ملتا ہے:

كَفّارَةُ الْإِغْتِيابِ اَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنْ اِغْتَبْتَهُ.[2]

غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہو اس کے لئے استغفار کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كانَتْ لاَخِيْهِ عِنْدَهُ مَظْلَمَةٌ فى عِرْض اَوْ مال فَلْيَتَحَلَّلْها مِنْهُ مِنْ قبلِ اَنْ يَأْتِيَ يَوْمَ لَيْسَ هُناكَ دِينارٌ وَلا دِرْهَمٌ اِنَّما يُؤْخَذُ مِنْ حَسَناتِهِ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَناتٌ اُخِذَ مِنْ سَيِّئاتِ صاحِبِهِ فَزِيْدَتْ عَلى سَيِّئاتِهِ.[3]

جو شخص کسی دوسرے کے مال و آبرو میں زیادتی کرتا ہے اسے اس سے معافی مانگنی چاہیے اس سے پہلے وہ وقت آجائے جہاں کوئی درہم و دینار نہیں ہے بلکہ اس کی نیکیاں اس دوسرے مسلمان کے حق میں لکھی جاتی ہیں اور اگر کوئی نیکی نہ ہو۔ تو مسلمان بھائی کے گناہ اس زیادتی کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔

ایام ہفتہ کی معروف دعاؤں میں سے پیر کے دن کی دعا امام سجاد علیہ السلام سے اسی موضوع پر دلالت کرتی ہے امامؑ خدا سے درخواست کرتے ہیں:

اگر میں نے کسی پر ظلم و ستم کیا ہے، عزت و آبرو ہو یا مال اس کا خاندان ہو یا اولاد یا میں

---

[1] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 242.

[2] میزان الحکمۃ، جلد 3، صفحہ 2339، احادیث 15543 تا 15548.

[3] جامع السّعادات، جلد 2، صفحہ 306.

نے اس کی غیبت کی ہو یا تکبر وتعصب و ریاکاری یا اس کے ساتھ خود پسندی کی ہو اور اب میری اس تک رسائی نہیں تا کہ اس سے معافی مانگو یا اس کا حق واپس کروں تو میں معافی مانگتا ہوں اور خدایا! تو مصلحت جانتا ہے مجھ سے راضی ہو جا بہرحال غیبت کا حق العباد ہونا قوی احتمال ہے اور اگر معافی مانگنی پڑے تو ضرور معافی مانگے۔[1]

غیبت کے جبران کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان اس شخص کے پاس جائے جس کی اس نے غیبت کی ہو اور اس سے معافی مانگے۔

غیبت سے استثناء

علمائے اخلاق اور فقہا کی نظر میں بعض مقامات پر غیبت جائز ہے حتیٰ بعض اوقات غیبت واجب ہے جس کے اپنے اسباب وعلل ہیں دوسرے لفظوں میں اصل اولیٰ یہ ہے کہ غیبت حرام ہے لیکن حکم ثانوی کے لحاظ سے بعض مورد استثناء ہیں یعنی غیبت کرنا جائز ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل مورد استثناء ہیں۔

۱۔ اپنے حق کو لینے اور عدالت کے موقع پر غیبت جائز ہے اگر کوئی ظلم کرے اور مظلوم آواز نہ اٹھائے تو کون سنے گا اور کون عدالت کا تقاضا کرے گا خداوند عالم فرماتا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا.[2]

خدا (کسی کے) ہانک پکار کر بُرا کہنے کو پسند نہیں کرتا۔ مگر مظلوم ظالم کی برائیاں بیان کرسکتا ہے۔ اور خدا تو (سب کی) سُنتا (اور ہر ایک کو) جانتا ہے۔

۲۔ بدعت گزاری کے وقت بھی غیبت جائز ہے جو افراد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کرتے ہیں اور اس کی نسبت اسلام ومسلمانوں سے دیتے ہیں تو اس وقت روکنا ضروری ہے ایسے لوگوں کی غیبت جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

۳۔ نہی عن المنکر یعنی اگر انسان فریاد و پکار نہ کرے تو گناہ گار اپنے گناہوں پر اصرار کریں گے لہٰذا امر

---

[1] ملحقات صحیفہ سجادیہ، دعای روز دوشنبہ (با تلخیص).

[2] النساء: ۸۴۱

بالمعروف کی مصلحت غیبت پر غالب ہے لہٰذا ایسے موقع پر نہ صرف غیبت جائز بلکہ واجب ہے۔

۴۔جس مسلمان کی جانو مال اور ناموس خطرے میں ہو اور خود نہیں جانتا ایسے موقع پر اسے بتانا ضروری اور واجب ہے تا کہ وہ خطرے سے محفوظ رہ سکے۔

۵۔مشوارت کے وقت بھی غیبت کرنا جائز ہے مثلاً کوئی شخص کمیٹی تشکیل دیتا ہے یا سفر کرنا چاہتا ہے یا کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو ایسے موقع پر سچ سچ کہنا ضروری ہے اگر لڑکے والا شخص پوچھتا ہے کہ وہ لڑکی کیسی ہے؟ تو اس وقت مشورہ دینے والے کو صحیح بتانا ضروری ہے کیونکہ اگر اس نے درست نہ بتایا تو گویا اس نے مشورے میں خیانت کی۔

۶۔شہادت کے وقت بھی غیبت کرنا جائز ہے شہادت کی مصلحت غیبت کی مصلحت پر غالب ہے اگر کوئی زنا کرے یا شراب پی لے تو شہادت کے وقت صحیح صحیح بتانا ضروری ہے تا کہ ان پر حد جاری ہو سکے۔

فسق آشکارانہ

عام طور پر علمائے اخلاق اور فقہا ایسے شخص کی غیبت کو جائز سمجھتے ہیں جو آشکارانہ اور کھلم کھلا گناہ کرتا ہو مثلاً لوگوں کے سامنے شراب پینا، لہٰذا ایسے افراد کی غیبت جائز ہے۔رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَرْبَعَةٌ لَيْسَتْ غِيبَتُهُمْ غِيبَةً الْفَاسِقُ الْمُعْلِنُ بِفِسْقِه.[1]

چار گروہوں کی غیبت جائز ہے اور ان کی غیبت شمار نہیں ہوتی ان میں سے ایک فاسق ہے جو کھلم کھلا گناہ کرتا ہو۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ثَلَاثَةٌ لَيْسَ لَهُمْ حُرْمَةٌ: صَاحِبُ هَوًى مُبْتَدِعٌ، وَ الْإِمَامُ الْجَائِرُ، وَ الْفَاسِقُ الْمُعْلِنُ بِالْفِسْقِ.[2]

تین افراد کا احترام نہیں: ۱۔بدعت گزار فرد ۲۔ظالم حاکم ۳۔فاسق جو کھلم کھلا گناہ کرتا

---

[1] بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 72 / 261 / باب 66 الغیبۃ .....ص: 220

[2] ہدایۃ الامۃ الی احکام الائمۃ علیہم السلام / ج-5 / 180 / 7 - فی احکام الغیبۃ .....ص: 179

ہو۔

ایک حدیث میں امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ أَلْقَى جِلْبَابَ الْحَيَاءِ فَلَا غَيْبَةَ لَهُ.[1]

جو شخص حیا کا لباس اتار دے اس کی کوئی غیبت نہیں ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَنْزِعُوْنَ عَنْ ذِكْرِ الفاجِرِ اَنْ تَذْكُرُوهُ. فَاذْكُرُوهُ يَعْرِفُهُ النّاسُ.[2]

کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا، فاسق افراد کا ذکر کرنا، ان کا نام لوتا کہ لوگ انہیں پہچان سکیں۔

لیکن ہماری نظر میں یہ افراد غیبت کے موضوع سے خارج ہیں نہ کہ استثناء ہے کیونکہ غیبت میں دو شرائط ہیں:

۱۔ مخفی عیب بیان کرنا ۲۔ جس سے سن کر وہ ناراض ہو جائے۔

یہ دونوں شرائط ان افراد میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر ناراض ہوتے ہیں تو کھلم کھلا گناہوں کا مرتکب کیوں ہوتے ہیں۔ علمائے اصول کی اصطلاح میں وہ افراد تخصیصاً خارج ہیں نہ تخصیصاً اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غیبت صرف ان گناہوں کو شامل ہے جو کھلے عام کیے جائیں یا تمام گناہوں میں غیبت جائز ہے؟ دوسرا یہ کہ ایک شخص ایک جگہ پر فاسق معروف ہے اور دوسری فاسق نہیں یا بعض گروہوں کے نزدیک فاسق ہو اور بعض کے نزدیک فاسق نہ ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

مذکورہ آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے ایسے افراد کی غیبت اس وقت جائز ہے جب کھلے عام گناہ کرتے ہوں لیکن جو گناہ وہ نہیں کرتے یا جس جگہ وہ فاسق معروف نہیں تو وہاں غیبت کرنا جائز نہیں ہے البتہ آج کل میڈیا کا دور ہے اور ظالم بادشاہ پوری دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں لہٰذا ایسے افراد کی غیبت جائز ہے یا عوام کے وہ افراد جو حیا کی چادر اتار دیتے ہیں اور کھلے عام گناہ کرتے ہیں ان کی غیبت کرنا جائز ہے۔ من القی جلباب الحیاء یعنی جو حیا کی چادر اتار دے۔ فاذکروہ یعرفہ الناس اس کا نام لے کر غیبت کر سکتے ہیں تا کہ لوگ اس کو پہچان لیں۔

پس کھلے عام گناہ کرنا دو قسم کے ہیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ ۲۶۰.

[2] کنز العمال، جلد 3، صفحہ 595، حدیث 8069.

۱۔ کھلے عام گناہ کرنا اور صرف اسی گناہ میں اس کی غیبت جائز ہے۔

۲۔ جو حیا کی چادر اتار دیتے ہیں بدمعاش بن کر گناہ کرتے ہیں ایسے افراد کا کوئی احترام نہیں ہے اور غیبت بھی جائز ہے تا کہ لوگ اسکے خطرات سے آگاہ ہو جائیں۔

اب مطلب کو دو نکات بیان کرنے کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

۱۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ علوم اسلامی میں سے ایک علم رجال کا علم ہے جس میں راویوں کے صدق و کذب کے بارے میں بحث ہوتی ہے بعض نا آشنا افراد اسی علم کو سیکھنے سے منع کرتے ہیں۔ احکام کا درست سمجھنا ضروری ہے لہٰذا راویوں کے حالات سے آشنا ہونا ضروری ہے تا کہ روایت کو صحیح طور پر سمجھیں بعض راوی ضعیف ہیں بعض راوی مؤثق ہیں اسی طرح بعض روایات ضعیف ہیں یا موثق ہیں بعض یہ بہانہ بناتے ہیں کہ علم رجال میں غیبت ہوتی ہے لہٰذا سیکھنا ضروری نہیں ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے روایت اور راوی کی پہچان کے لئے علم رجال ضروری ہے۔

۲۔ دوسرا نکتہ ہے اجتماعی و سیاسی مسائل میں افراد کی شناخت ضروری ہے اگر بعض نکات پنہانی اور مخفی ہوں جس سے معاشرے کی اصلاح مربوط ہے تو ایسے مسائل کو بیان کرنا ضروری ہے۔ ایسے مسائل میں غیبت کا بہانہ بنا کر باتوں کو راز میں رکھنا اور یہ کہنا کہ غیبت ہو جائے گی یہ غلط ہے ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پڑھ چکے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ فاسق فاجروں کی غیبت نہیں بلکہ ایسے افراد کے عیب ظاہر کرنا ضروری ہے تا کہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔

CIA اور اطلاعات کے ادارے بعض کو سمجھنے کے لئے بعض افراد کے عیب ظاہر کرتے ہیں تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ ادارے کا وظیفہ ہے کہ وہ اپنے کام کریں بعض خفیہ ادارے ہیں جو اپنے کام کر رہے ہیں۔

۱۔ غیبت کی حدود

بے شک مومن، بالغ و عاقل افراد کی غیبت حرام ہے لیکن کافر حربی جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہے غیبت کرنا حرام نہیں ہے لیکن مسلمان بھائیوں یا کافر ذمی کی غیبت ناجائز ہے۔

بعض فقہاء جیسے محقق اردبیلی علامہ سبزواری صاحب کفایہ غیبت کی حرمت کو عام کہا ہے۔ وہ روایات جن میں ...یا الناس کلمات آئے ہیں ان سے استدلال کیا ہے کہ ان کی غیبت کرنا تعجب کا مقام نہیں کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جان و مال ان کی محفوظ ہو اور آبرو ناموس ان کی محفوظ نہ ہو لیکن صاحب جواہر نے مخالفت کی اور کہا کہ بعض روایات کو

بعض دوسری روایات کے ساتھ رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ مخصوص مومنین اور شیعیانِ اہل بیتؑ ہے۔[1]

اگر ان بزرگوار کی مراد یہ ہو کہ جو ولایت کا مخالف ہو یعنی ناصبی، معاند اور مومنین و مسلمانوں کے دشمن تو بے شک ایسے افراد کا نہ احترام ہے اور نہ ہی غیبت۔

لہٰذا ایسے تمام افراد کی غیبت سے بچنا چاہیے جن کی جان و مال اور آبرو محترم ہو اور وہ سب حق الناس میں سے ہے اگر ان کا گناہ کھلے عام نہ ہو اور گناہ بھی مخفی ہوں وہ مورد جہاں پر غیبت کرنے سے وہ شخص ناراض ہوتا ہو تو ایسے شخص کی غیبت بھی حرام ہے جس طرح شیخ انصاری نے مکاسب محرمہ میں اشارہ کیا ہے:

قرآن کریم فرماتا ہے:

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ [2]

اگر ان کے ساتھ اکٹھے زندگی کر رہے ہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔

بعض ممیز بچے کی قید لگائی ہے یعنی ایسا بچہ اچھے برے کی تمیز کر سکتا ہو لیکن حق یہ ہے کہ تمیز قید صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر پنہانی عیب غیر ممیز بھی کہتا ہے تو اس شخص کی جو آبرو ریزی ہوتی ہے اسی لئے شہید ثانی کی کتاب کشف الریبہ میں فرمایا کہ بچہ چھوٹا ہو یا بڑا فرق نہیں ہے جہاں سے دیوانہ افراد کا حکم بھی روشن ہو جاتا ہے۔

غیبت عام و خاص

کبھی ایسے شخص کی غیبت ہوتی ہے جو معین ہوتا ہے مثلاً زید نے یہ کام کیا اس کا حکم گزر چکا ہے کہ غیبت حرام ہے اس کے علاوہ وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ بعض لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

لیکن کبھی غیبت عام ہوتی ہے مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شہر کے لوگ کنجوس ہیں، فلاں شہر کے لوگ بے وقوف ہیں، فلاں دیہات کے افراد چور ہیں یا نشہ کرتے۔

کیا غیبت کے احکام ایسے مواقع پر بھی جاری ہوتے ہیں؟

---

[1] جواہر الکلام، جلد 22، صفحہ 62.

[2] البقرہ:۲۲۰

۱۔اگر کوئی شخص اس طرح غیبت کرتا ہے کہ فلاں شہر کے لوگوں کو میں نے شراب پیتے دیکھا یا فلاں شہر کے کچھ لوگ چور ہیں اور سننے والا نہیں پہچانتا تو ایسے افراد کی غیبت شمار نہیں ہوگی کیونکہ یہ کھلی باتیں نہیں ہیں اور مخاطب بھی ایسے افراد کو نہیں جانتا۔

۲۔ایک بار اس طرح کہتا ہے میں نے چار آدمیوں کو شراب پیتے دیکھا یہاں پر چار افراد میں منحصر ہے یا ایسی بات کریں جس سے دوسروں پر تہمت لگ جائے ایسے موقع پر غیبت شمار ہوتی ہے کیونکہ مخفی گناہ اور عیوب کو ظاہر کیا گیا ہے اور مومنوں کی بے احترامی اور ہتک ہوتی ہے۔

۳۔ایک شہر والوں کی غیبت کرنا فلاں شہر کے آدمی چور ہیں اس میں شہر اور آبادی منحصر ہو جاتی ہے لہٰذا اسلام کی نظر میں غیبت کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔غیبت سے دفاع

بعض فقہاء لکھتے ہیں کہ غیبت سے دفاع واجب ہے شیخ انصاری مکاسب محرمہ میں غیبت کی بحث میں فرماتے ہیں کہ دفاع واجب ہے۔اس مطلب پر بہت سی روایات موجود ہیں وسائل الشیعہ کے مصنف اباب العشرۃ کے باب ۱۵۶ میں لکھتے ہیں:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَا عَلِيُّ مَنِ اغْتِيبَ عِنْدَهُ أَخُوهُ الْمُسْلِمُ فَاسْتَطَاعَ نَصْرَهُ فَلَمْ يَنْصُرْهُ خَذَلَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ.[1]

جس کے پاس کسی مومن کی غیبت ہو اور وہ دفاع بھی کر سکتا ہے لیکن دفاع نہیں کرتا خداوند عالم ایسے شخص کو دنیا و آخرت میں ذلیل وخوار کرتا ہے۔

اسی قسم کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے ایک روایت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

---

[1] من لایحضرہ الفقیہ/ ج 4 / 372 / باب النوادر و ہو آخر أبواب الکتاب.....ص: 352

مَنْ رَدَّ عَنْ اَخیه غَیْبَةً سَمِعَهُا فی مَجْلِس رَدَّ اللهُ عَنْهُ اَلْفَ باب مِنَ الشَّرِّ فِی الدُّنْیا وَ الاْخِرَةِ، فَاِنْ لَمْ یَرُدَّ عَنْهُ وَ اَعْجَبَهُ کانَ عَلَیْه کَوِزْرِ مَنْ اغْتابَ.[1]

جوشخص کسی محفل میں اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کا دفاع کرتا ہے خداوندعالم برائیوں کا ایک ہزار دروازہ بند کر دیتا ہے اور دفاع نہ کرے بلکہ اس سے خوشحال ہوتو وہ غیبت کرنے والے کے ساتھ گناہ میں شریک ہے۔

اورآپؐ نے فرمایا:

مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ اَخیه کانَ لَهُ حِجاباً مِنَ النّارِ.[2]

جوشخص غیبت کے دوران اپنے بھائی کا دفاع کرے تو ایسے شخص کے لئے دوزخ کی آگ پر پردہ ہوگا۔

ان روایات سے غیبت کا دفاع واجب ہونا نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ سنت مؤکدہ ہوسکتا ہے بہرحال دفاع واجب ہو یا سنت مؤکدہ مسلمانوں کا ایک اسلامی فریضہ ہے لہٰذا عمل کیا جائے اگر امر بالمعروف کے باب سے ہوتو یقیناً واجب ہے۔

۴۔مردہ کی غیبت کا حکم کیا ہے؟

بعض لوگ تصور کرتے ہیں کہ غیبت صرف زندہ لوگوں کی ہوتی ہے اس طرح روایات بھی زیادہ زندہ افراد کا ذکر ہوا ہے اور مردوں کا ذکر نہیں ہوا ہے لہٰذا مردے کی غیبت جائز ہے؟ لیکن یہ بڑا اشتباہ ہے ہمارے پاس ایسی روایات بھی موجود ہیں جو دلالت کرتی ہیں زندہ افراد کی مانند مردوں کی غیبت حرام ہے۔

حُرْمَةُ الْمَیِّتِ کَحُرْمَتِهِ وَ هُوَ حَیٌّ.[3]

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 66.

[2] وسائل الشیعۃ/ ج 12 / 293 / 156 باب وجوب ردغیبۃ المؤمن وتحریم سماعہا بدون الرد .....ص: 291

[3] وسائل الشّیعہ، جلد 19، صفحہ 47، باب 24.

مردے کا احترام بھی زندہ افراد کی مانند قابل احترام ہے۔

کیونکہ زندہ افراد ممکن ہے اپنی غیبت ایک دن سن لیں اور اپنا دفاع کریں لیکن مردہ بے چارہ تو اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا اسی طرح ممکن ہے زندہ آدمی کی غیبت کرنے کے بعد اس سے معافی مانگ کر اسے راضی کرے لیکن مردوں کو کیسے راضی کیا جا سکتا ہے مردے کے غسل وکفن، دفن وغیرہ کے احکام میں اس کا احترام ہے قبر کی بے حرمتی کرنا حرام ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے مسلمان بھائی کے مرنے کے بعد بھی اس کی عزت وآبرو محفوظ ہے۔



۵۔حسن اخلاق اور بداخلاق

حسن خلق کا ایک خاص معنی یہ ہے کہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے شیریں زبان اور نرم لب ولہجہ میں بات کرے جب بھی کوئی اخلاق سے پیش آئے تو اس کے منہ پر تبسم ہونا چاہیے محبت آمیز کلمات سے گفتگو کرنی چاہیے یہ ایک اخلاقی فضیلت جو معاشرے کی اصلاح میں بڑی مؤثر ہے۔

اس کے برعکس بداخلاقی کرنا اور سخت کلمات سے گفتگو یا بے مہری سے پیش آنے والے شخص سے لوگ نفرت کرتے ہیں بداخلاق شخص سے لوگ دور بھاگتے ہیں بداخلاق شخص کے دوست بہت کم ہوتے ہیں اس مطلب پر قرآن و سنت میں بڑی تاکید کی گئی ہے اہل بیت علیہم السلام کی سیرت و اخلاق میں خود اخلاق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے معاشرے میں بہت سے افراد ترقی نہیں کرسکتے ان کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بداخلاق ہوتے ہیں اور بعض بہت جلدی ترقی کر جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بااخلاق ہوتے ہیں جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انبیاءؑ، اہل بیتؑ اور اولیاء کرام کی سیرت میں بااخلاق ہونا نظر آتا ہے۔

اس موضوع پر دلالت والی آیات کی تفسیر میں جاتے ہیں۔

① ۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ.[1]

(تو اے رسولؐ یہ بھی) خدا کی ایک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل (سردار) ان کو ملا اور تم اگر بدمزاج اور سخت دل ہوتے تب تو یہ لوگ (خدا جانے کب کے) تمہارے گرد سے تتر بتر ہوگئے ہوتے پس (اب بھی) تم ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو اور (حسبِ سابق دستور ظاہراً) ان سے کام کاج میں مشورہ کرلیا کرو (مگر) اس پر بھی جب کسی کام کو ٹھان لو تو خدا ہی پر بھروسا رکھو (کیونکہ) جو لوگ خدا پر بھروسا رکھتے ہیں خدا ان کو ضرور دوست رکھتا ہے۔

②۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ.[2]

اور بے شک تمہارے اخلاق بڑے (اعلیٰ درجہ کے) ہیں

③۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ.[3]

اور لوگوں کے سامنے (غرور سے) اپنا منہ نہ پھلانا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کیونکہ خدا کسی اکڑنے والے اور اترانے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی چال (ڈھال) میں میانہ روی اختیار کرو اور دوسرے سے بولنے میں) اپنی آواز دھیمی رکھو۔ کیونکہ آوازوں میں سے تو سب سے بُری آواز (چیخنے کی وجہ سے) گدھوں کی ہے۔

④۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ.[4]

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے (جو تمہارے بزرگ تھے) عہد

---

[1] آل عمران:۱۵۹

[2] القلم:۴

[3] لقمان:۱۸،۱۹

[4] بقرہ:83

و پیمان لیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح (نرمی) سے باتیں کرنا اور برابر نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا۔ پھر تم میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا (سب کے سب) پھر گئے اور تم لوگ ہو ہی اقرار سے منہ پھیرنے والے۔

⑤۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى. [1]

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ پھر اسے (جا کر) نرمی سے باتیں کرو تا کہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

⑥۔ وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. [2]

اور بھلائی برائی (کبھی) برابر نہیں ہوسکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقہ سے جواب دو جو نہایت اچھا ہو (ایسا کرو گے) تو (تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ یہ بات بس ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب ور ہیں۔

تفسیر اور خلاصہ

پہلی آیت میں خوش اخلاقی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک صفت کے طور پر بیان ہوئی ہے اور ترقی یافتہ معاشرے کا سبب بھی ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظّاً غَلِيظَ الْقَلْبِ لاَ نْفَضُّوا مِنْ

---

[1] طٰہٰ: 43و44

[2] فصّلت: 34و35

حَوْلِكَ.[1]

(تو اے رسولؐ یہ بھی) خدا کی ایک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل (سردار) ان کو ملا اور تم اگر بدمزاج اور سخت دل ہوتے تب تو یہ لوگ (خدا جانے کب کے) تمہارے گرد سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش اخلاقی والی صفت ان کے لئے خدا کی ایک رحمت اور اس کی اُمت کے لئے بھی رحمت تھی، بے شک جس شخص میں یہ خوبی پائی جاتی ہے وہ اس کے لئے رحمت و برکت ہے، خوش اخلاقی کے مقابلے میں بد اخلاقی ہے، افعال میں غصہ، سخت لب ولہجہ سے پیش آنا اس عمل کا ردعمل ہے جس سے لوگ دور ہو جاتے ہیں اور نفرت بیدار ہوتی ہے، اس میں ''فظ'' اور غلیظ القلب کے کلمات استعمال ہوتے ہیں جن دونوں کا ایک معنی ہے یعنی دوسرا تاکید کے لئے ہے یا ان دو کلمات کے دو مختلف معانی بھی ہو سکتے ہیں مرحوم طبرسی مجمع البیان میں فرماتے ہیں، بعض لکھتے ہیں کہ یہ دونوں قریب کے معنی رکھتے ہیں، ''فظ'' عام طور پر غصے کا اظہار ہے جو سنگ دلی سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا دونوں کا ایک معنی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ''فظ'' گفتگو میں غصہ اور غلیظ القلب عمل میں بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کا نام ہے۔

بہر حال خداوند عالم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خندہ پیشانی اور حُسن اخلاق سے پیش آنے کے لئے فرمایا، آپؐ ہمیشہ غصہ والے اور بد اخلاق افراد کے سامنے نرمی سے پیش آتے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حُسن اخلاق سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا، بعض افراد میں صرف ظاہری یہ صفت ہوتی ہے، لیکن عملی طور پر ایسے نہیں ہوتے، لہٰذا عملی اخلاق کی بڑی تاکید کی گئی ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ.[2]

پس (اب بھی) تم ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو اور (حسبِ

---

[1] ''فبما رحمة من الله'' میں ''ما'' استفہامیہ، نافیہ یا زائدہ ہے۔ احتمالات متعددی کے بھی دیئے گئے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ موصولہ یا زائدہ ہے۔ مرحوم ؒ طبرسی ؒ در ؒ مجمع البیان ؒ میں کہا ہے کہ اس کے زائدہ ہونے پر مفسرین کا اتفاق ہے۔ (البتہ یہ حروف زائدہ، تأکید کے لئے ہے نہ کہ بے فائدہ۔

[2] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 251.

سابق دستور ظاہراً) ان سے کام کاج میں مشورہ کرلیا کرو (مگر) اس پر بھی جب کسی کام کو ٹھان لو تو خدا ہی پر بھروسا رکھو (کیونکہ) جو لوگ خدا پر بھروسا رکھتے ہیں خدا ان کو ضرور دوست رکھتا ہے۔

وہ لوگ جو اسلام سے بڑے دور تھے لیکن آپؐ کی خوش اخلاقی سے لوگ اسلام لے آئے۔ سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت جنگ کے بارے میں ہے، اس جنگ میں دوست و دشمن دونوں نے آپؐ پر دباؤ ڈالا واضح ہے کہ عفو و درگذر، خوش اخلاقی، مہر و محبت سے سلوک کرنا، جس کی وجہ سے آپ خلق عظیم کے مالک تھے دوسری آیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کو خلق عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے، خلق بروزن افق معزز ہے اور خلق برقفل دونوں کا ایک معنی ہے مفردات راغب سے استفادہ ہوتا ہے، خلف برخلق کا مشترک معنی ہے، خلف صفات ظاہری کو کہا گیا ہے اور خلف یا خلق اندرونی صفات کو کہتے ہیں۔ بعض نے اس طرح لکھا کہ خلق اور خلق بمعنی دین وطبیعت ہے اور اس سے انسان کا باطن مراد ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس صفت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاءؑ میں افضل ترین صفت خوش اخلاقی تھی۔

بعض مفسرین نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلق عظیم سے مراد یہ لکھا ہے کہ راہ خدا میں صبر کرنا، بخشش، سختی کا برداشت کرنا، راہ خدا میں دعوت دینا، عفو و درگزر اور جہاد راہ خدا میں، ترک حسد و حرص لکھا ہے،[1] اس سے معلوم ہوتا ہے خلق عظیم صرف خوش اخلاقی نہیں مذکورہ صفات کے مجموعہ کا نام ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کی تائید میں ایک روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ اَدَّبَ نَبِيَّهُ فَاَحسَنَ اَدَبهُ فَلَمّا اَكمَلَ لَهُ الْاَدَبَ قالَ اِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيم.[2]

خدا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تربیت فرمائی جب ان کی تربیت کامل ہوگئی تو فرمایا:

اِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظِيم.

بعض روایات میں خلق عظیم کو اسلام اور قرآنی آدب سے تفسیر کیا گیا ہے، اس لئے اسلام اور قرآن فضائل اخلاقی پر مشتمل ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ حُسن خلق کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

---

[1] مجموعہ ورّام، جلد 1، صفحہ 123.

[2] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 242.

اِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ اَدَّبَ نَبِيَّهُ فَاَحسَنَ اَدَبهُ فَلَمّا اَكمَلَ لَهُ الْاَدَبَ قالَ اِنَّكَ لَعَلى خُلُقٍ عَظيم

لوگوں کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آنا، پاکیزہ کلام کرنا مسلمان بھائیوں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا۔

انك لعلى خلق عظيم میں حرف (علی) کا استعمال ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ (علی) معنی تسلط ہے لہٰذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حُسن اخلاق پر پورا تسلط تھا۔

تیسری آیت میں لقمان کا ذکر ہوا ہے کہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے اور چار چیزوں کی بڑی تاکید کی گئی ہے، پہلا یہ کہ فرمایا:

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ.

اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کیونکہ خدا کسی اکڑنے والے اور اترانے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ.

اور اپنی چال (ڈھال) میں میانہ روی اختیار کرو اور دوسرے سے بولنے میں) اپنی آواز دھیمی رکھو۔ کیونکہ آوازوں میں سے تو سب سے بُری آواز (چیخنے کی وجہ سے) گدھوں کی ہے۔

تیسرے اور چوتھے جملے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ.

یہ حکم دوسروں سے ملاقات کے بارے میں ہے، حُسن اخلاق یعنی نرمی سے بات کرو، خندہ پیشانی سے پیش آنا اور تواضع کا اظہار کرنا یہ، لقمان کتنے باعظمت ہیں کہ خداوند عالم نے اپنے کلمات میں آپ کا ذکر فرمایا، لقمان کے بارے میں دوسرا نظریہ بھی ہے، بعض کے نزدیک نبی اور بعض کے نزدیک حکیم شخص تھے۔ "تصعر" "صعر" مادہ سے لیا گیا ہے جو درحقیقت ایک بیماری کا نام ہے جو اونٹ کو لگتی ہے جس سے اس کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے، اس کا روگردانی پر اطلاق

کیا گیا،ممکن ہے یہ بات اس کی طرف اشارہ ہو کہ بدخلقی ایک قسم کی بیماری ہے، جو حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مومنوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام افراد کے لئے ہے۔خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ

اس صفت رزیلہ سے ہر حال میں بچنا چاہئے کیونکہ یہ انسان کو بہت تیزی کے ساتھ تکبر کے راستے پر لے چلتی ہے اور یہ ایسی صفت رذیلہ ہے جس کی وجہ سے لوگ اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت :وَلا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ لوگوں سے منہ نہ موڑنا، اگر کوئی شخص تجھ سے بات کرتا ہے تو، توہین کے طور پر چہروں کو دوسری طرف نہ موڑ لینا۔[1]

جملہ وَلا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ ذکر ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں کے درمیان عہد و پیمان جو توحید، احسان، نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں یہ لوگوں کی طرف نسبت ہے، یعنی خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی اور اساس ترین دستور خداوند عالم ہے۔ درحقیقت انسان کامل محدود ہے اور سب کی مدد نہیں کرسکتا، لہٰذا حُسن اخلاق سے پیش آنے کا حکم دیا، یہ فنا نہ ہونے والے سرمایہ ہے۔

چوتھی آیت میں خداوند عالم نے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے، جن سے عہد و پیمان لیا گیا، اس کے بعد خالص توحید، والدین کے ساتھ احسان اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی، یتیموں اور مساکین کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

انَّكُمْ لا تَسَعُونَ النَاسَ بِاَمْوالِكُمْ وَلكِنْ يَسَعُهُمْ مِنْكُمْ بَسْطُ الْوَجْهَ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ؛[2]

تم لوگوں کو اپنے مال سے سب کو راضی نہیں کر سکتے ہو، لیکن خوش اخلاقی اور حُسن خلق تم سب کے لئے ہے،

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

قُولُوا لِلْناسِ احْسَنَ ما تُحِبُّونَ انْ يُقالَ لَكُمْ.[3]

لوگوں سے حُسن اخلاق سے پیش آنا کہ وہ تمہیں اسی سے دوست رکھتے ہیں۔

---

[1] نورالثقلین، جلد 4، صفحہ 207.

[2] کنزالعمال، جلد 3، صفحہ 6، حدیث 5158.

[3] تحف العقول/ النص/ 300 / وروی عنہ ※ فی قصار ہذہ المعانی.....ص: 292

یہ درست ہے کہ اس آیت میں مخاطب بنی اسرائیل ہے لیکن قرآن کا ہدف ایک کلی مثال بیان کرتا ہے۔

پانچویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی حتیٰ دشمنوں کو شامل ہے یعنی دشمن سے خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے، خاص طور پر جہاں دعوت حق دی جائے، اسی لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مامور کیا گیا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دیں تو یہ خطاب فرمایا:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾
قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى. [1]

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ پھر اسے (جا کر) نرمی سے باتیں کرو تا کہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔ دونوں نے عرض کی اے ہمارے پالنے والے ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ ہم پر زیادتی (نہ) کر بیٹھے یا اور زیادہ سرکشی کر بیٹھے۔

اس تعبیر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حق کی دعوت کے لئے امر بالمعروف میں نرمی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا ضروری ہے، خوش اخلاقی کا سنگین ترین افراد پر بہت اثر ہوتا ہے۔ان دو کلمات میں تذکرہ و بخشش میں کیا فرق ہے؟ تو یہ کہہ سکتے ہیں اس سے منظور یہ ہے کہ اگر تم نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آؤ اور اپنے مطلب کو صراحت سے بیان کرو کیونکہ دلیل منطقی کو قبول کیا جاتا ہے۔

فخر رازی کہتا ہے، ہمیں اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس کیوں بھیجا، حالانکہ خداوند عالم جانتا تھا کہ فرعون اسلام نہیں لائے گا، پھر کہتا ہے، اس قسم کی آیات کے سامنے ہم تسلیم خم ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ کریں۔

لیکن اس سوال کا جواب روشن ہے اور فخر رازی کی طرح کہنا کہ ہم پر مخفی ہے صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں خدا اپنی محبت تمام کرنا چاہتا تھا، حتیٰ ان لوگوں کے بارے میں کہ جو ایمان لانے والے نہیں ان پر خدا حجت تمام فرماتا ہے تا کہ عذاب کے وقت کوئی عذر نہ کر دیں اور یہ کہیں کہ اگر رسولؐ ہمارے پاس آئے تو ہم ایمان لاتے، اس سورہ نساء، آیت ۱۶۵، میں خدا فرماتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

---

[1] سورۂ طٰہٰ: ۴۳ تا ۴۵

اور (ہم نے نیکوں کو بہشت کی) خوشخبری دینے والے اور (بدوں کو عذاب سے)
ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہ جائے
اور خدا تو بڑا زبردست حکیم ہے۔

اور یہ کہنا کہ شاید وہ متذکر ہوں یا خدا سے خوف کھائیں اس کا یہ معنی ہے کہ تبلیغ خوش اخلاقی کے ساتھ ہونی چاہیے تا کہ اس کا ہدف پورا ہو سکے، اگر چہ بعض افراد کے ساتھ حُسن اخلاق کا کوئی ثمرہ نہیں ملتا، واضح ہے آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام مخاطب ہیں، لیکن آیت کا معنی تمام مبلغین کو شامل ہے، تمام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر والوں کو شامل ہے، نرمی و ادب سے ہدایت ممکن ہے لیکن سختی سے برعکس ہوتا نظر آتا ہے۔

چھٹی اور آخری آیت میں دشمنوں کے ساتھ بھی نرمی و خوش اخلاقی سے پیش آنے کے لئے دستور دیا گیا ہے، اس کا بڑا اثر ہوتا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾

(سخت کلامی کا) ایسے طریقہ سے جواب دو جو نہایت اچھا ہو (ایسا کرو گے) تو (تم
دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔

جالب یہ ہے کہ بعد والی آیت ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾

یہ بات بس ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور انہی لوگوں کو
حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں۔

البتہ اس مرحلے پر پہنچنے پر ہر آدمی کے بس کی بات نہیں کہ بدی کا جواب نیکی سے دیا جائے بلکہ اس کام کے لئے تہذیب نفس اور خودسازی کی ضرورت ہوتی ہے، یہ صرف وہ افراد کر سکتے ہیں جو اپنے دل سے انتقام جوئی کی رگ کو کاٹ دیتے ہیں۔ مذکورہ آیات سے معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن، نرمی، خوش بیانی اور خوش اخلاقی کا اعلان کر رہا ہے، پیشوائے اسلام خصوصاً حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا کامل نمونہ ہیں۔ بلکہ آپؐ کا ایک معجزہ اخلاق ہے۔

روایات میں خوش اخلاقی کی اہمیت

خوش اخلاقی اور لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کے بارے میں کافی روایات ہیں اور روایات بھی متواتر ہیں، جتنی روایات اس موضوع کے بارے میں ہیں اتنی کسی دوسرے کے لئے نہیں ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت اہم اخلاقی مسئلہ ہے، اب ہم اس موضوع پر دلالت کرنے والی روایات کو ذکر کرتے ہیں؛

(۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاِسْلامُ حُسْنُ الْخُلُقِ.[۱]

اسلام خوش اخلاقی کا نام ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ حُسن اخلاق ہے۔

(۲) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

عُنْوَانُ صَحِيفَةِ الْمُؤْمِنِ حُسْنُ خُلُقِهِ.[۲]

سرنامہ اعمال خوش اخلاقی باایمان ہے۔

(۳) ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَكْثَرُ ما تَلِجُ بِهِ امَّتى الْجَنَّةَ التَّقوى وَ حُسْنُ الْخُلُقِ.[۳]

سب سے زیادہ وہ عمل جس سے میری اُمت جنت میں جائے گی وہ خوش اخلاقی اور تقویٰ ہے،

اس روایت میں خوش اخلاقی تقویٰ کے برابر فضیلت میں ذکر ہوئی ہے۔

(۴) ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[۱] کنز العمّال، جلد 3، صفحہ 17، حدیث 5225.

[۲] صحیفۃ ال اِمام الرضا علیہ السلام/ 67 /متن الصحیفۃ

[۳] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 100، حدیث 6.

اَکْمَلُکُمْ اِیْماناً اَحْسَنُکُمْ خُلُقاً.[1]

جس کا ایمان جتنا کامل ہوگا اس کا حُسن اخلاق اتنا زیادہ ہوتا ہے۔

آثار و معنوی و مادی

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْخُلُقُ الْحَسَنُ یُذیبُ السَّیِّئَةَ.[2]

خوش اخلاقی گناہوں کو دھو دیتی ہے یعنی آثار مٹ جاتے ہیں۔

(۲) ایک اور حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ صاحِبَ الْخُلُقِ الْحَسَنِ لَهُ مِثْلُ اَجْرِ الصَّائِمِ الْقائِمِ.[3]

خوش اخلاقی کا ثواب اتنا ہے جیسے کوئی شخص دن کو روزہ رکھے اور رات کو عبادت کرتا ہو۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ تَبارَكَ وَ تَعالی لَیُعْطِی الْعَبْدَ مِنَ الثَّوابِ عَلی حُسْنِ الْخُلُقِ کَما یُعْطِی الْمُجاهِدَ فِی سَبِیلِ اللهِ.[4]

اللہ تعالیٰ، خوش اخلاق شخص کو وہی ثواب عطا کرتا ہے جو راہ خدا میں جہاد کرنے والے شخص کو ملتا ہے۔

(۴) رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حُسْنُ الْخُلُقِ یُثْبِتُ الْمَوَدَّةَ.[5]

---

[1] بحارالانوار، جلد 68، صفحہ 387، حدیث 34.

[2] بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 321.

[3] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 100، حدیث 5.

[4] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 101.

[5] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 148، حدیث 71.

خوش اخلاقی سے دوستی مضبوط ہوتی ہے۔

(۵) حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا عَيْشَ اهْنَأُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ.[۱]

کوئی زندگی خوش اخلاقی سے بڑھ کر نہیں ہے۔

(۶) ایک اور روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْبِرُّ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ يَعْمُرانِ الدِّيارَ وَيَزيدانِ فِي الْاَعْمارِ.[۲]

نیکی اور خوش اخلاقی سے گھر آباد ہوتے ہیں اور عمر طولانی ہوتی ہے۔

(۷) حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

حُسْنُ الْاَخْلاقِ يُدِرُّ الْاَرْزاقَ وَيُؤْنِسُ الرِّفاقَ.[۳]

خوش اخلاقی سے روزی میں اضافہ ہوتا ہے اور دوستوں کی دوستی زیادہ ہوتی ہے۔

(۸) آپؑ ہی سے ایک روایت ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

فِي سِعَةِ الْاَخْلاقِ كُنُوزُ الْاَرْزاقِ.[۴]

وسعت خوش اخلاقی میں روزی کے گنج پہنانی ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش اخلاقی کی بڑی اہمیت ہے انسان کی مادی اور معنوی مسائل میں اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی بنیادی ترین اُمور میں سے ہے، مندرجہ ذیل اُمور پر توجہ کریں:

(۱) تعریف خوش اخلاقی

خوش اخلاقی ایسا کلمہ ہے جس کو ہر انسان جانتا ہے لہٰذا اگر غور کریں ان معانی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے

---

[۱] غرر الحکم، جلد 6، صفحہ 399.

[۲] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 100، حدیث 8.

[۳] شرح غرر فارسی، جلد 3، صفحہ 393.

[۴] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 53، حدیث 86.

ہیں، نرمی سے بات کرنا، خندہ پیشانی، خوش اخلاقی کا اظہار، ادب کی رعایت، تبسم، بردباری ان صفات کے مجموعہ کو خوش اخلاقی کہتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب خوش اخلاقی کی تعریف کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا:

تَلينُ جانِبَكَ وَ تُطيّبُ كَلامَكَ وَ تَلْقى اخاكَ بِبِشْرٍ حَسَنٍ.[1]

لوگوں کے ساتھ نرمی اور پاکیزہ بات کرنا اور اپنے بھائی سے خوش اخلاقی سے ملاقات کرنا۔

ایک اور حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش اخلاقی کی تعریف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

انَّما تَفْسيرُ حُسْنِ الْخُلُقِ ما اصابَ الدُّنْيا يَرْضى، وَ انْ لَمْ يُصِبْهُ لَمْ يَسْخَطْ.[2]

حُسن اخلاق کی تعریف یہ ہے کہ جو کچھ دنیا سے ملے اس پر راضی رہے اور خوشحال رہے اور اگر دنیا سے کچھ نہ ملے تو ناراض نہ ہو۔

(۲) آثار و انجام حسن اخلاق

مذکورہ روایات میں ذکر کیے مادی اور معنوی آثار کی تجزیہ و تحلیل کرنا ضروری ہے۔

خوش اخلاقی کے اجتماعی اور دنیاوی آثار یہ ہیں کہ یہ محبت کا باعث ہے، اس کو تمام لوگ جانتے ہیں کہ کسی سے محبت بھرے الفاظ کہنا اور ادب سے پیش آنے سے انسان اس کا دل جیت لیتا ہے، دوسرے یہ کہ حُسن اخلاق سے شہر آباد ہوتے ہیں اور عمر طولانی ہوتی ہیں، کیونکہ آبادی جھگڑوں اور کشمکش سے ویران ہوتی ہے۔ خندہ پیشانی سے الفت و محبت پیدا ہوتی ہے، جس سے وحدت و اتحاد اور خیر و برکت کا باعث ہے۔ اس سے روح کو آرام ملتا ہے جس سے عمر زیادہ ہوتی ہے آج کل ثابت ہو چکا ہے کہ موت کے عوامل میں سے ایک عامل نفسیاتی مرض ہے، محبت سے نفسیاتی طور پر انسان شاد رہتا ہے۔ خوش اخلاقی سے رزق و روزی میں اضافہ ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہوا جہاز میں ایئر ہوسٹس

---

[1] بحار الانوار، جلد 68، صفحہ 389، حدیث 42.

[2] کنز العمال، جلد 3، صفحہ 17، حدیث 5229.

سوار ہوتی ہیں، لیکن اسلام آج کل کی طرح ریاکاری کا حسن اخلاق کو قبول نہیں کرتا، اگر، مصنوعی بھی ہو تو اثر ضرور ہوتا ہے۔

خوش اخلاقی کا معنوی ثواب خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کی مانند ہے، کیونکہ مجاہد عظمت و سربلندی اسلام کی طرف راغب ہوتے ہیں اس کے علاوہ خوش اخلاق شخص کو اتنا ثواب ملتا ہے، جتنا ایک ایسے شخص کو ثواب ملتا ہے۔ جو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو عبادت کرتا ہے، کیونکہ یہ ایک خود سازی کا طریقہ ہے جو شخص خدا کے لئے نیکی کرتا ہے اس کی روح و جان کو تقویت ملتی ہے خلاصہ یہ ہوا کہ خوش اخلاق انسان اللہ کی بارگاہ میں بھی محبوب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی، ایسے افراد اپنی زندگی میں کامیاب رہتے ہیں۔

حسن خلق کا سرچشمہ

بعض افراد طبیعی طور پر خوش اخلاق ہوتے ہیں، ایک خدا کا عطیہ ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا، بعض افراد بااخلاق نہیں ہیں، لیکن وہ مشق اور بار بار عمل کر کے اپنے آپ کو با اخلاق بنا سکتے ہیں بد اخلاق شکست کھانے والے انسان ہوتے ہیں، بااخلاق ہونے کے لئے بہترین راہ یہ ہے کہ وہ مذکورہ آثار کی طرف توجہ کرے۔ علمائے اخلاق لکھتے ہیں کہ

> اگر بخیل آدمی پہلے کچھ خرچ کرے تو اس کے لئے بڑا مشکل مرحلہ ہوگا لیکن آہستہ آہستہ اگر وہ مشق کرتا ہے اور کچھ نہ کچھ لوگوں کو عطا کرے تو ایک دن آئے گا کہ جب تک وہ کچھ خرچ نہ کرے اسے چین نہیں آتا، اسی ڈرپوک انسان کو میدان جنگ میں جانا چاہیے تا کہ ان کا ڈر ختم ہو اور شجاع و دلیر بنے۔

اسی طرح غصہ اور شہوت ترک کر کے حد اعتدال اختیار کرنا چاہیے حسد، تکبر، خود پسندی اور بخل اپنے اندر سے نکال دے تا کہ انسان اخلاق سے آراستہ ہو سکے۔

غزالی لکھتا ہے:

> چہرہ اس وقت زیبا ہوتا ہے جب اس کے تمام اعضاء خوبصورت ہوں، مثال کے طور پر صرف آنکھ خوبصورت ہو لیکن ناک اور لب یا پیشانی خوبصورت نہ ہو تو وہ خوبصورتی نہیں ہوتی، لہٰذا حسن اُس وقت کمال کو پہنچتا ہے جب تمام اعضاء خوبصورت ہوں، حسن خلق میں اگر یہ چار عناصر

شناخت، غضب، شہوت، اور عدالت، حد اعتدال تک نہ ہوں تو یہ زیبائی حاصل نہیں ہوسکتی، بے شک حسن میں موروثی عامل بھی موثر ہے یعنی جس کے والدین خوبصورت ہوں اس کی اولاد بھی خوبصورت ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

حُسْنُ الْاَخْلاقِ بُرهانُ كَرَمِ الْاَعْراقِ.[1]

حسن اخلاق بزرگواری کی دلیل اور وراثتی جڑیں ہیں۔

ایک جگہ پر آپؑ نے فرمایا:

اَطْهَرُ النَّاسِ اَعْراقاً اَحْسَنُهُمْ اَخْلاقاً.[2]

وہ لوگ پاکیزہ ہیں جو با اخلاق ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ یہ ایک نعمت الٰہی ہے اگر لطفِ خدا ہو اور اس کی رحمت شامل حال ہو تو یہ نعمت مل سکتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاَخْلاقُ مَنايِحُ مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ فَاِذا اَحَبَّ عَبْداً سَنَحَهُ خُلُقاً حَسَناً وَ اِذا اَبْغَضَ عَبْداً مَنَحَهُ خُلُقاً سَيِّئاً.[3]

اخلاق ایک لطف الٰہی ہے اللہ جس پر لطف کرنا چاہتا ہے اسے خوش اخلاق بناتا ہے اور جب کسی بندے پر غضب کرتا ہے تو اسے بد اخلاق بناتا ہے۔

---

[1] غرر الحکم، حدیث شمارہ 4855.

[2] غرر الحکم، حدیث شمارہ ۳۰۳۲.

[3] بحار الانوار، جلد 68، صفحہ 394، حدیث 64.

سیرتِ معصومین علیہ السلام

اس فضیلت کو پانے کے لئے ہمیں اپنے معصومینؑ کی سیرت کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

(۱)امام حسین علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

میں نے اپنے بابا علی علیہ السلام سے سنا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر ہمیشہ تبسم ہوتا تھا، لوگوں پر آسانی کرتے تھے، نرمی سے بات کرتے وہ غصے والے اور سنگ دل نہ تھے وہ فریاد نہیں کرتے تھے، کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے، چاپلوس نہ تھے، کسی سے ناراض نہ ہوتے تھے، امیدواروں کو ناامید نہیں کرتے تھے، تین چیزیں ہمیشہ آپؐ میں نہ تھیں ، مذمت، تجسس اور عیب جوئی، نیچے نگاہ کر کے چلتے تھے کسی کی پہلے بات سنتے اور پھر خود فرماتے، آپؐ اتنے بارعب تھے کہ کسی کو جرأت نہ تھی کہ کوئی ان کے سامنے جھگڑا کرے۔[۱]

(۲)ایک حدیث میں ہے کہ

حضرت علی علیہ السلام کوفہ جا رہے تھے، اس سفر میں ایک یہودی شخص بھی آپؑ کے ساتھ تھا، جب ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں سے ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہتے تھے، تو حضرت علی علیہ السلام چند قدم یہودی کے ساتھ چلے اور پھر واپس آ کر اپنے سفر میں کوفہ کی راہ لی، جب مولا علی علیہ السلام اس کے ساتھ چلے وہ یہودی کہنے لگا کہ آپؑ نے تو کوفہ جانا تھا، آپؑ ہمارے ساتھ آ رہے ہیں۔آپؑ نے فرمایا، میں جانتا ہوں لیکن ہمسفر کے آداب ہوتے ہیں تو میرے ساتھ سفر کر رہا تھا لہٰذا میں تجھے رخصت کرنے کے لئے چند قدم آیا ہوں، اور یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی تربیت دی ہے ، یہودی نے بڑے تعجب سے کہا کہ ، یہ تمہارے پیغمبرؐ کا اخلاق اور اس کی سیرت ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ہاں، جب یہودی مرد نے یہ سنا تو فوراً اسلام لے آیا۔[۲]

---

[۱] جلاء الافہام ابن قیم جوزی ،صفحہ 92، مطابق نقل کتاب پرورش روح ، جلد 1، صفحہ 79.

[۲] سفینۃ البحار، چاپ جدید، جلد 2، مادہ خلق ،صفحہ 692.

امام حسن عسکری علیہ السلام سے روایت ہے کہ

ایک عورت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی خدمت میں آئی اور کہتی ہے، میری ماں بوڑھی ہے ، نماز کے مسائل میں اسے مشکل پیش آتی ہے، میں آئی ہوں تا کہ مسائل پوچھوں آپؑ نے اس عورت کے سوال کا جواب دیا، اس عورت نے پھر سوال کیا، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے جواب دیا، اس عورت نے تیسری بار سوال کیا اور آپؑ نے جواب دیا، دس مسائل اس عورت نے پوچھے، آپؑ نے تمام مسائل کے جوابات دیئے، اس کے بعد کہنے لگی، اب میں تمہیں زیادہ زحمت نہیں دیتی، اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی!

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا: جو کچھ سوال کرنا ہے کرو اور پھر فرمایا، اگر کسی سے کہا جائے کہ ایک لاکھ دینار لے لو اور اس سنگین وزن کو اوپر لے جاؤ تو کیا یہ اس کے لئے سنگین محسوس ہوگا۔

اس عورت نے کہا: نہیں۔

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا: تیرے ہر سوال کے بدلے زمین و آسمان کے اندازوں کے برابر جنتی زمین جس میں لعل و جواہرات ہوں اس کا اجر ملے گا، پھر اس کا بوجھ یا زحمت کیا ہے۔ آپؑ نے سوال کرنے کی شرمندگی کو کتنے خوبصورت انداز میں بیان فرما یا، یہ ہمارے لئے درس عبرت ہے۔[1]

(۴) ایک معروف حدیث امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے ہے کہ

ایک دن شامی شخص نے امامؑ کو دیکھا کہ آپؑ سواری پر سوار ہیں اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا، امامؑ نے اسے کچھ نہ کہا، جب اس شامی نے بُرا بھلا کہہ دیا اور چپ ہوا تو امامؑ نے سلام کیا اور مسکرا کر فرمایا: اے شخص کیا تو پردیسی ہے، اور تجھ پر حقائق مخفی ہیں اس کے باوجود بھی مجھے عفوودرگزر کے لئے کہے تو میں بخش دوں گا، اگر تجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں اور تجھے سواری کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں اور تجھے کھانا کھلاتا ہوں، اگر تیرے پاس لباس نہیں تو میں لباس دوں گا اگر تجھے کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو وہ دوں گا، اگر تجھے پناہ چاہیے تو پناہ دوں

---

[1] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 3.

گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپؑ اس شامی شخص کی ہر حاجت پوری کرنے کے لئے تیار تھے، آپؑ نے فرمایا، اگر تو دعوت قبول کرتا ہے تو چل، تجھے گھر لے جاتا ہوں۔

جب اس شخص نے یہ محبت بھرے الفاظ سنے تو رونے لگا اور فوراً بدل گیا اور کہنے لگا، میں گواہی دیتا ہوں، کہ آپ زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں خدا جانتا ہے کہ کس خاندان میں نبوت یا امامت کو قرار دے تمہاری گفتگو سننے سے پہلے تمہارا اور تمہارے باپ کا دشمن تھا لیکن تم دونوں میرے نزدیک محبوب ترین ہو، پھر وہ شخص تھا لیکن امام حسن علیہ السلام کے گھر آیا، جتنے دن رہنا تھا وہاں قیام کیا اور آپؑ کا ہی مہمان رہا۔[1]

(۵) تحف العقول میں ملتا ہے کہ

ایک بوڑھا عیسائی آدمی امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے کسی چیز کی ضرورت تھی امامؑ نے فرمایا؛ اپنی آبرو کو محفوظ رکھو اور جس چیز کی تجھے حاجت ہے وہ کاغذ پر لکھ دو میں تیری حاجت پوری کرتا ہوں۔

اس شخص نے کاغذ پر یہ لکھا: اے ابا عبداللہؑ، میں فلاں شخص پانچ ہزار درہم کا مقروض ہوں اور اب وہ مانگتا ہے، مجھے اس سے مہلت لے دو تا کہ کمائی کر کے اسے دوں۔

جب امام نے اس کا لکھا ہوا پڑھا تو اندر تشریف لے گئے اور اشرفیوں کی تھیلی لے آئے جس میں ہزار درہم تھے، آپؑ نے فرمایا: پانچ ہزار درہم کا قرض ادا کرو اور پانچ ہزار درہم دوسری مشکلات کے لئے ہیں، جب بھی تجھے حاجت ہو تو تین قسم کے افراد سے مانگ،

۱ دین دار شخص سے

۲ صاحب شخصیت ہے

۳ یا کسی آقا زادہ سے

دین دار شخص دین کی وجہ سے تیری آبرو کو محفوظ رکھے گا

باشخصیت انسان اپنی شخصیت کا حیا کرتے ہوئے تیری حاجت پوری کرے گا

---

[1] بحار الانوار، جلد 43، صفحہ 344.

اور آقا زادہ جانتا ہے کہ تو نے بے موقع سوال نہیں کیا لہٰذا وہ بھی تیری مدد کرے گا۔ [1]

(۶) چوتھے امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک شخص دشمن اہل بیتؑ میرے پاس آیا مجھے بُرا بھلا کہنے لگا لیکن میں نے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ اس آیت کی تلاوت فرمائی:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. [2]

اور غصّہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کی خطا سے درگزر کرتے ہیں۔ اور نیکی کرنے والوں سے خدا اُلفت رکھتا ہے

اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے امامؑ نے اس کی بداخلاقی کو نظر انداز کر دیا، پھر جب وہ اپنے گھر چلا گیا تو امامؑ بھی اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس کے دروازے پر آواز دی کہ علی ابن الحسینؑ تم سے ملنے آیا ہے اب جو اس نے سنا کہ امامؑ اس سے ملنے آئے ہیں تو اس نے خیال کیا کہ شاید آپؑ اس سے بدلہ لینے آئے ہے لیکن جب وہ امامؑ کے سامنے آیا تو امامؑ نے فرمایا: اے برادر تم ہمارے پاس آئے تھے اور کچھ کہا تھا یہاں تک کہ بہت سی بری باتوں کی نسبت ہماری طرف دی تھی اگر تم نے سچ کہا تھا تو خداوند قدوس (بہتر جانتا ہے) مجھے معاف کرے اور اگر تم نے جھوٹ کہا تھا تو خداوند قدوس تمہیں معاف کرے۔

جب اس شخص نے امام کی یہ بزرگواری و خوش اخلاقی دیکھی تو بہت شرمندہ ہوا اور اس نے امامؑ کی پیشانی کا بوسہ لیا اور کہا کہ یہ آپ کہہ رہے ہیں جب کہ میں نے آپ کو کس قدر ناسزا کہا تھا۔ [3]

(۷) امام محمد باقر علیہ السلام کے حالات میں ملتا ہے:

شامی آدمی مدینہ میں رہتا تھا، ایک امام کی محفل میں آیا اور کہنے لگا، یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری محبت میں آیا ہوں بلکہ میرے نزدیک تجھ سے بڑھ کر مبغوض ترین نہیں ہے تمہارے ساتھ

---

[1] تحف العقول، صفحہ 178.

[2] آل عمران: ۱۳۴

[3] منتہی الآمال، جلد 2، صفحہ 4.

دشمنی اللہ کی اطاعت ہے، رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہے لیکن تیرے کلام میں فصاحت و بلاغت ہے لہٰذا میں خوش ہوا ہوں جس کی وجہ سے تیری محفل میں آیا ہوں،

امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

لَنْ تَخْفی عَلَی اللهِ خافِیَةٌ.

خدا پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے

کافی عرصہ گزرنے کے بعد امامؑ کو پتہ چلا کہ وہ شامی شخص بیمار ہو گیا ہے اور اپنی وصیت لکھ چکا تھا، اور اپنے وارثوں کو لکھا کہ میری نماز جنازہ امام محمد باقر علیہ السلام پڑھیں، جب وہ مرا اور امامؑ کو بلایا گیا، امامؑ آئے اور بلند آواز سے مرے ہوئے شخص کو آواز دی، مرے ہوئے شخص نے لبیک یابن رسول اللہؐ کہا، آپؑ نے اسے بٹھایا اور ہلکی غذا دی، پھر فرمایا: اس کے سینے اور شکم کو ٹھنڈا کرو۔

کچھ دیر بعد وہ شخص ہوش میں آ گیا، امامؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا: میں شہادت دیتا ہوں کہ آپؑ حجت خدا ہیں اور جو آپؑ سے تمسک نہیں کرتا وہ گمراہ ہے،

آپؑ نے پوچھا: کیا ہوا ہے؟

اس نے کہا مجھے کوئی شک نہیں کہ میری روح قبض ہو چکی تھی، موت کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا، اچانک میں نے آواز سنی کہ اس کی روح کو واپس پلٹایا جائے۔[1]

(۸) امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالاتِ زندگی میں ملتا ہے کہ مفضل کہتا ہے کہ

ایک دن نماز عصر کے بعد روضہ رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک میں نے ابن ابی العوجاء کو دیکھا جو ایک ملحد فرد تھا۔ وہ رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل بیان کر رہا تھا، اس کے ایک ساتھی نے پوچھا اور ایک فلسفی مرد تھا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لوگوں کے لئے معجزے لے آیا، جب لوگ اس کا دین قبول کرنے لگے تو اس نے اپنا نام خدا کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا پانچ وقت کی نماز کی اذان میں اللہ کے نام کے بعد اس کا نام آتا ہے ابن ابی العوجاء نے کہا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بات نہ کرو کیونکہ ان کے بارے میں میری عقل بھی حیران ہو جاتی ہے۔

مفضل کہتا ہے کہ مجھے بہت غصہ آیا، میں نے اسے کہا: اے دشمن خدا! تو نے الحاد کی راہ

---

[1] منتہی الآمال، جلد 2، صفحہ 63 (با تلخیص).

اختیار کر لی ہے تو خدا کا انکار کرتا ہے حالانکہ خدا کی خدائی تیرے وجود میں نظر آتی ہے ایسی باتیں مت کہو، علم کلام سے بات کرو، اگر قائل کرنے والی دلیل ہے تو وہ بتاؤ، تا کہ ہم بھی قبول کریں، اگر تو عالم نہیں تو ہم تیرے ساتھ گفتگو نہیں کرتے، وہ ایک عاقل انسان ہیں اور تلخ کلام نہیں کرتے وہ با استقلال باتیں کرتے ہیں، ہمیں عاجز کر دیتے ہیں، اگر تو ان کے اصحاب میں سے ہے تو ایسی کلام سے گفتگو کیوں کرتے ہو۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ضدی اور دشمن کے لئے بھی نرمی سے گفتگو کرتے ہیں۔

(۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام کاظم علیہ السلام کے حالات زندگی میں ملتا ہے کہ

خلیفہ دوم کے زمانے کا ایک آدمی مدینہ میں تھا جو امام کو بہت تکلیفیں دیتا تھا، حضرت علی علیہ السلام کو بُرا بھلا کہتا تھا، آپؑ کے بعض صحابی کہتے تھے کہ ہمیں اجازت دیں، ہم اسے قتل کر دیں، اس کے سر کا دفاع کریں، امام نے سختی سے منع کیا، اور پوچھا: ہمارے دشمن کا کیا مقام ہے،

لوگوں نے عرض کیا: یہ مدینے کے گاؤں میں زراعت کرتا ہے۔

امامؑ سواری پر سوار ہو گئے اور اس کے کھیت کی طرف آئے اور دیکھا کہ وہ مرد چلّا رہا ہے کہ تم میری زراعت کو پامال کر رہے ہو،

امام نے توجہ نہ کی اور اس کے پاس آئے اور خوش اخلاقی سے پیش آئے اور پوچھا: تو نے اس زمین پر کتنا خرچ کیا۔

اس نے کہا: سو دینار،

امامؑ نے پوچھا: تجھے اس سے کتنا فائدہ ہونے کی امید ہے۔

اس نے عرض کیا: مجھے علم غیب نہیں آتا،

آپؑ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ تجھے کتنا ملے گا؟

اس نے عرض کیا: دوسو دینار۔

امامؑ نے فرمایا، یہ تین سو درہم لے لے اور زراعت بھی رکھ،

---

[1] بحارالانوار، جلد 3، صفحہ 57 و 58 (با تلخیص و نقل بہ معنی).

وہ مرد اُٹھا آپؑ کے سر مبارک کا بوسہ لیا،

امامؑ واپس مسجد نبوی میں آ گئے، اچانک آپؑ نے اس آدمی کو مسجد میں دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھا ہوا ہے جب اس پر امام کی نگا پڑی تو وہ کہنے لگا، خدا بہتر جانتا ہے کہ کس خاندان میں نبوت یا امامت قرار دے۔

اس کے ساتھیوں نے کہا: پہلے سخت لب و لہجہ رکھتا تھا لیکن آج بڑی نرمی سے پیش آ رہے ہو، اس کا راز کیا ہے؟

اب امامؑ نے اپنے صحابہ سے پوچھا کہ تم تو اسے قتل کرنا چاہتے تھے اب کیا کہتے ہو؟[1]

(۱۰) امام علی رضا علیہ السلام کے حالات میں ملتا ہے کہ آپؑ کا صحابی اس کو نقل کرتا ہے:

میں امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا اور آپؑ کی مجلس میں لوگوں کا بڑا اجتماع بھی تھا، لوگ حرام و حلال کے بارے میں پوچھ رہے تھے، اچانک ایک بلند قد و قامت والا مرد حاضر ہوا، سلام کیا اور کہنے لگا: میں تمہارے دوستوں میں سے ہوں، تمہارے آباء واجداد کا بھی دوست ہوں، میں حج سے واپس آ رہا ہوں، توشہ راہ کم ہو گیا ہے مجھے اتنا دو کہ میں اپنی منزل و مقصود تک پہنچ جاؤں، جب میں اپنے شہر پہنچ گیا تو تمہارا دیا مال واپس کروں گا، کیونکہ میں صدقہ کا مستحق نہیں ہوں۔

آپؑ نے فرمایا: تجھ پر اللہ کی رحمت ہو بیٹھو، پھر آپؑ نے لوگوں سے گفتگو جاری رکھی، جب لوگ چلے گئے۔ بعد میں وہ شخص آپؑ کے ساتھ آپ کے گھر آیا تو آپ ایک کمرے کے اندر تشریف لے گئے، کمرے سے واپس باہر آنے کی بجائے اندر ہی سے آواز دی کہ وہ خراسانی مرد کہاں ہے؟

اس شخص نے کہا حاضر ہوں۔

آپؑ نے اندر سے ہاتھ باہر نکالا جس پر پیسوں کی ایک تھیلی رکھی ہوئی تھی فرمایا: یہ دو سو درہم لے لو اور یہ تمہارے راستے کا خرچہ ہے اور مجھے واپس نہ کرنا، جاؤ اب بہتر ہے تم مجھے نہ دیکھو اور میں تمہیں نہ دیکھوں۔

---

[1] اعیان الشیعہ، جلد 2، صفحہ 7.

جب وہ مرد چلا گیا تو ایک حاضر شخص نے پوچھا: میں قربان جاؤں آپؑ نے اس سے محبت کا اظہار کیا، لیکن پھر پیسے دیتے وقت اس کے سامنے کیوں نہیں آئے۔

آپؑ نے فرمایا: مجھے ڈر تھا کہ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نظر آئیں گے۔[1]

(۱۱) امام محمد تقی علیہ السلام کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ داستان ملتی ہے کہ

آپؑ کے ایک صحابی کہتے ہیں، میں امامؑ کی خدمت میں حاضر تھا، مولا کی کنیزوں میں سے ایک کنیز کی بھیڑ گم ہوگئی تھی، لوگوں نے ایک ہمسایہ پکڑ لیا اور زمین پر گھسیٹنا شروع کر دیا اور امامؑ کی خدمت میں لے آئے اور کہا اس نے ہماری بھیڑ چوری کی ہے اس کا لباس انھوں نے پھاڑ دیا تھا حالانکہ وہ خدا کی قسمیں دیتا رہا کہ اس نے چوری نہیں کی۔

امامؑ نے فرمایا: وائے ہو تم پر، اس مرد پر تم نے ظلم کیا ہے بھیڑ خود ہی اس کے گھر چلی گئی تھی۔

پھر امامؑ نے فرمایا: تم لوگوں نے اس کے کپڑے پھاڑے ہیں لہٰذا اس کا خسارہ پورا کرو اور اسے راضی بھی کرو۔[2]

(۱۲) امام علی نقی علیہ السلام کے حالات حیات میں اس طرح ملتا ہے کہ

آپؑ کے ایک ابو ہاشم جعفری نامی صحابی نے نقل کیا کہ ایک وقت اس پر سخت تھا لہٰذا وہ امام کی خدمت میں گیا تا کہ امام کو اس کی شکایت کرے، اس سے پہلے کہ بات کرے۔

امامؑ نے پوچھا: اے ابو ہاشم اللہ کی کسی ایک نعمت کا شکر ادا کرنا چاہتے ہو؟

ابو ہاشم کہتا ہے، میں ناراض ہو گیا اور چپ رہا، مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ امامؑ کو کیا جواب دوں۔

امامؑ نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور فرمایا: خدا نے تجھے ایمان دیا، جس کی وجہ سے تیرے بدن پر دوزخ کی آگ حرام ہے، خدا نے تجھے تندرستی و سلامتی عطا فرمائی ہے۔

اے ابو ہاشم! میں نے اس لئے پہلے کلام کرنا شروع کیا کہ شاید تو شکایت کرے، میں

---

[1] فروع کافی، جلد 4، صفحہ 23، حدیث 3، با کمی تلخیص.

[2] بحار الانوار، جلد 50، صفحہ 47.

نے حکم دیا کہ تجھے ایک سو دینار دیئے جائیں، انھیں لے لو، آپؑ کی اس مہربانی سے وہ خوشحال ہو گیا ، حالانکہ ابھی اس نے امامؑ سے شکایت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔[1]

(۱۳) مرحوم کلینی اصول کافی کی جلد ۱، میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام زندان میں تھے اور ان پر ایک سخت دشمن اہلبیتؑ دروغہ تھا، اسے حکم دیا گیا کہ وہ امامؑ پر بڑی سختی کرے، لیکن ایک دن میں وہ شخص بدل گیا اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے قدموں میں جا گرا آپؑ کے پاؤں پر ماتھا رکھ کا اوپر نہ دیکھا، جب باہر آیا تو امامؑ کا دوست گیا تھا اور آپؑ کی ہمیشہ تعریف کرتا تھا۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی عبادت اور خوش اخلاقی کا اتنا اثر ہوا کہ سخت دشمن دوست میں بن گیا۔

(۱۴) اس طرح امام مہدی علیہ السلام کی زندگی کے واقعات میں سے ملتا ہے کہ آپؑ نے لوگوں کو اخلاق اور عبادت سے تربیت کیا ہے، یہ سیرت پیشوائے اہل بیتؑ تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے مہربان، با اخلاق اور سخی تھے۔[3]

بد اخلاقی کے آثار

حسن اخلاق کے مقابلے میں بد اخلاقی ہے جسے بد زبانی بھی کہا جا سکتا ہے، بد اخلاق افراد معاشرے کے لئے ایک بڑی مصیبت شمار ہوتے ہیں، بد اخلاقی سے نفرت پھیلتی ہے لوگ دور ہو جاتے ہیں، لوگ ایسے افراد کے پاس بہت کم جاتے ہیں، صرف مجبوری کی حالت اور ضرورت کے وقت لوگ جاتے ہیں، مجبوری کے علاوہ لوگ انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، اور اسے لعنتی کہتے ہیں اگر بد اخلاقی کا مرض عالم میں ہو تو یہ ایک بڑا خطرہ ہے، کیونکہ لوگوں کے لئے عالم نمونہ عمل ہوتا ہے اور وہ اس مرض میں مبتلا ہو جائے تو لوگ اس سے دور بھاگیں گے، اور دین سے دوری اختیار کریں گے، اسی وجہ سے روایت میں بد اخلاقی کی بڑی مذمت ہوئی ہے، اب ہم چند روایات کا ذکر کرتے ہیں، توجہ فرمائیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد 50، صفحہ ۱۲۹.

[2] اصول کافی، جلد 1، صفحہ 508، حدیث 8.

[3] جنّۃ الماوی کہ بہ ضمیمہ جلد 53، بحار الانوار چاپ شدہ، صفحہ 240.

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ایَّاکُمْ وَسُوءَ الْخُلُقِ فَاِنَّ سُوءَ الْخُلُقِ فِی النَّارِ لا مُحالَةَ. [۱]

بداخلاق شخص سے پرہیز کریں کیونکہ اس عمل کا انجام آگ ہے۔

(۲) آپؐ سے ہی منقول ہے کہ بداخلاقی ایک ایسا گناہ ہے جس کی توبہ نہیں ہے اور فرمایا:

ابَی اللهُ لِصاحِبِ الْخُلُقِ السَّیِّیِ بِالتَّوْبَةِ. [۲]

اچھے اخلاق کے مالک کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے۔

لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے اور کیوں؟ آپؐ نے فرمایا:

لِاَنَّهُ اذا تابَ مِنْ ذَنْبٍ وَقَعَ فی اعْظَمَ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِی تابَ مِنْهُ. [۳]

کیونکہ جب وہ گناہ سے توبہ کرتا ہے تو ایک گناہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے، جو اس گناہ سے بھی بڑا ہوتا ہے۔

شاید اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو جب بداخلاق شخص توبہ کرتا ہے تو اس کے وجود میں آثار باقی رہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی اور اکثر بداخلاق افراد توبہ کرنے پر موفق ہوتے ہیں۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام نے بداخلاقی کو بدترین مصیبت شمار کیا ہے اور فرمایا:

اشَدُّ الْمَصائِبِ سُوءِ الْخُلُقِ.

سب سے بڑی مصیبت بداخلاقی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی نظروں میں انسان گر جاتا ہے اور لوگ نفرت کرنے لگتے ہیں۔

(۴) آپؐ ہی نے فرمایا:

لا وَحْشَةَ اوْحَشُ مِنْ سُوءِ الْخُلُقِ. [۴]

---

[۱] بحارالانوار، جلد 68، صفحہ 383.

[۲] بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 299.

[۳] عیون اخبارالرضا، جلد 2، صفحہ 37، بہ نقل از پرورش روح، جلد 1، صفحہ 83.

[۴] شرح غرر، جلد 6، صفحہ 400.

بد اخلاقی سے بڑھ کر کوئی وحشت نہیں ہے۔

(۵) ایک حدیث میں منقول ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا:

لا عَيْشَ لِسَيِّئِ الْخُلُقِ.[۱]

بد اخلاق شخص کی زندگی نہیں ہوتی۔

کیونکہ خود بھی زحمت میں ہوتا ہے اور دوسروں کو عذاب کی طرف لے جاتا ہے۔

(۶) آپؑ ہی نے فرمایا:

لا سُؤْدَدَ لِسَيِّئِ الْخُلُقِ.[۲]

معاشرے میں بد اخلاق انسان کو کوئی خاص مقام نہیں ملتا،

کیونکہ مقام حاصل کرنے کی پہلی شرط دوست اور خوش اخلاقی ہے۔

(۷) حضرت علی علیہ السلام ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

الْمُؤْمِنُ لَيِّنٌ الْاریکة، سَهْلُ الْخَلِيقَةِ، الْكافِرُ شَرِسُ الْخَلِيقَةِ سَيِّئُ الطَّرِيقَةِ.[۳]

مومن نرم اور با اخلاق ہوتا ہے اور کافر بد چلن اور بد اخلاق ہوتا ہے۔

پس خوش اخلاقی ایمان کی نشانی اور بد اخلاقی کفر کی نشانی ہے۔

بد اخلاقی کا علاج

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ بد اخلاقی بدترین صفت ہے اور اس کے خطرناک آثار ہوتے ہیں، لہٰذا جو افراد اس بُری صفت میں مبتلاء ہیں انھیں جلد از جلد علاج کا سوچنا چاہیے، علمائے اخلاق کے درس اخلاق پر انھیں توجہ دینی چاہیے۔

---

[۱] شرح غرر، جلد 6، صفحہ ۳۵۹.

[۲] شرح غرر، جلد 6، صفحہ ۳۵۹.

[۳] شرح غرر جلد 1، صفحہ 364، حدیث 1381.

یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ انسان اس بُری صفت کو ختم کرنے کے لئے مشق اور ریاضت سے کام لیں، آہستہ آہستہ با اخلاق ہونے کی کوشش کریں اور با اخلاق افراد کے ساتھ میل جول رکھیں بعض لوگ اعصاب کے مریض ہوتے ہیں یا شوگر کے مریض ہوتے ہیں جن کو زیادہ غصہ آتا ہے لہٰذا ایسے افراد کو بھی جسمانی علاج کرنے کی بہت ضرورت ہے، بعض اوقات بُری محفل اور بداخلاق لوگوں کے ساتھ رہنے سے انسان بداخلاق بن جاتا ہے لہٰذا ایسے افراد سے تعلق قطع کرنا چاہیے۔

مذاق اُڑانا

اسلام میں ہر چیز کی حد بندی ہوتی ہے، مذاق کی بھی ایک حد ہے، اگر حد اعتدال میں ہو تو نہ صرف گناہ نہیں بلکہ حسن اخلاق میں سے ہے اور اگر حس سے بڑھے اور گناہ سے آلودہ ہو تو یہ ایک بُری صفت بن جاتا ہے، اور برے آثار ہوتے ہیں۔لوگوں کی اہانت کرنا مذاق نہیں بلکہ گناہ ہے اہل بیتؑ کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاق حد اعتدال میں جائز ہے، اب ہم ان روایات کو ذکر کرتے ہیں جن میں مذاق کو اچھا فرمایا گیا اور پھر ان روایات کو ذکر کریں گے جن میں مذاق کی بڑی مذمت ہوئی ہے۔

(۱) حضرت علی علیہ السلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

كانَ رَسُولُ اللهِ(صلى الله عليه وآله) لَيَسُرُّ الرَّجُلَ مِنْ أَصْحابِهِ إِذا رَآهُ مَغْمُوماً بِالْمُداعَبَةِ.[1]

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی صحابی کو غمگین دیکھتے تو اس سے مذاق کرتے تا کہ وہ خوشحال ہو جائے، ہاں ایسے مذاق کا مطلوب ہدف ہے۔

(۲) امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

كَيْفَ مُداعَبَةُ بَعْضِكُمْ بَعْضاً.

تم کس طرح ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہو؟

---

[1] مستدرک الوسائل، جلد 8، صفحہ 408.

اس نے جواب دیا، ہم بہت کم مذاق کرتے ہیں،

امامؑ نے فرمایا:

فَلا تَفْعَلُوا فَاِنَّ الْمُداعَبَةَ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَ اِنَّكَ لَتُدْخِلُ بِها السُّرُورَ عَلى اَخِيكَ وَ لَقَدْ كانَ رَسُولُ اللهِ(صلى الله عليه وآله) يُداعِبُ الرَّجُلَ يُرِيدُ اَنْ يَسُرَّهُ.[1]

مذاق کو ترک نہ کرو کیونکہ، مذاق خوش اخلاقی ہے، اس سے مومن بھائی کا دل خوش ہوتا ہے، رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مذاق کرتے تھے تا کہ لوگ خوشحال ہوں۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک اور روایت نقل ہوئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ما مِنْ مُؤْمِنٍ اِلّا وَ فِيهِ دُعابَةٌ.

قُلْتُ: وَ مَا الدُّعابَةُ

قالَ: الْمَزاحُ.[2]

کوئی مومن ایسا نہیں جس میں دعابہ نہ ہو،

راوی کہتا ہے؛ میں نے سوال کیا کہ دعابہ کیا ہے،

آپؑ نے فرمایا: دعابہ سے مراد مذاق ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو خشک نہیں ہونا چاہیے، حد کے اندر رہتے ہوئے لوگوں سے مذاق کرنا خوش اخلاقی ہے۔

(۴) سیرت معصومین علیہم السلام میں ملتا ہے کہ وہ دوسروں کو شوق دلاتے کہ مذاق کیا کریں تا کہ لوگوں کی خوشحالی کا باعث ہو۔مرحوم کلینیؒ کافی میں لکھتے ہیں کہ

ایک دیہاتی آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپؐ کو ہدیہ دیتا تھا، ایک دن ہدیہ لے آیا اور پھر عرض کیا یہ رقم میری طرف سے ہدیہ قبول فرمائیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنسے، لہٰذا جب کبھی آپؐ غمگین ہوتے تو فرماتے ، وہ دیہاتی آدمی کہاں ہے، اے کاش

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 663، حدیث 3.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 663، حدیث ۲.

وہ آتا![1]

(۵) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول روایات ہیں جن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذاق ہیں،

ایک اُم ایمن نامی عورت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی میرے شوہر نے آپ کی دعوت کی ہے،

آپؐ نے پوچھا، تیرا شوہر کون ہے؟ وہ مرد جس کی آنکھ میں سفیدی ہے؟

عورت نے عرض کیا، خدا کی قسم اُس کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے،

عورت نے کہا، لا واللہ، خدا کی قسم نہیں،

آپؐ نے فرمایا، ہر آدمی کی آنکھ میں سفیدی ہوتی ہے۔[2]

اس کے مقابلے میں بہت سی روایات ہیں جو مذاق سے منع کرتی ہیں۔

(۱) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِیّاکُمْ وَ الْمَزاحَ فَاِنَّهُ یَذْهَبُ بِماءِ الْوَجْهِ وَ مَهابَةِ الرِّجالِ.[3]

مذاق کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے انسان کی آبرو ریزی ہوتی ہے۔

(۲) ایک اور حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

اِذا اَحْبَبْتَ رَجُلا فَلا تُمازِحْهُ وَلا تُمارِهِ.[4]

جب تم کسی کو دوست رکھتے ہو تو اس کے ساتھ مذاق نہ کرو اور اس کے ساتھ بحث نہ کرو۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِیّاکُمْ وَ الْمَزاحَ فَاِنَّهُ یَجُرُّ السَّخِیمَةَ وَ یُورِثُ الضَّغِینَةَ وَ هُوَ السَّبُّ الْاَصْغَرُ.[5]

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 663، حدیث ۱.

[2] تنبیہ الخواطر، جلد 1، صفحہ 112.

[3] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 665، حدیث 16.

[4] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 664، حدیث 9.

[5] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 664، حدیث 12.

مذاق کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ کینہ اور دشمنی کا سبب ہے اور گالیاں شمار ہوتی ہیں۔

(۴) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لا تُمازِحْ فَيُجْتَرَءُ عَلَيْكَ.[۱]

تم مذاق نہ کرو لوگ تجھ پر جور نہیں ہوں گے۔

پس ان روایات سے معلوم ہوا کہ مذاق نہیں کرنا چاہیے اس سے انسان کی آبرو ختم ہو جاتی ہے، لوگ حقیر نظر آتے ہیں، دشمنی کا سبب ہوتا ہے، پہلی روایات میں مذاق کو جائز قرار دیا گیا ہے لیکن ان احادیث میں منع فرمایا گیا ہے، یہ قابل توجہ ہے۔

مذاق ایک پیچیدہ عمل ہے، اس کی ایک حد اعتدال ہے اگر حد سے بڑھ کر مذاق کریں تو اس کے بُرے آثار ہوتے ہیں لیکن اگر مذاق حد اعتدال میں ہو اور لوگوں کو خوشحال کرنے کے لئے ہو تو یہ نہ صرف جائز ہے، بلکہ حسن اخلاق میں سے ہے، ایسا مذاق مطلوب ہے اور اللہ بھی راضی ہوتا ہے، اگر مذاق انتقام جوئی کے قصد سے ہو یا کسی کی اہانت کی وجہ سے ہو تو ایسا مذاق ممنوع ہے، اس سے کینہ و عداوت پیدا ہوتی ہے، بعض لوگوں کے اہداف شیطانی ہوتے ہیں اور وہ اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے مذاق کا سہارا لیتے ہیں، ایسا مذاق اللہ کو پسند نہیں اور گالیوں سے بھی بدتر ہے۔

بعض عارف لوگ مذاق نہیں کرتے اور اس طرح کچھ خشک متقی افراد بھی مذاق نہیں کرتے کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی کی اہانت نہ ہو جائے بعض بزرگ افراد کا قول ہے:

اَلْمَزاحُ فِي الْكَلامِ كَالْمِلْحِ فِي الطَّعامِ.

باتوں میں مذاق، کھانے میں نمک کی مانند ہے،

زیادہ مذاق کرنے سے بھی انسان لوگوں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ كَثُرَ هَزْلُهُ بَطَلَ جِدُّهُ.[۲]

جو شخص زیادہ مذاق کرتا ہے وہ خاندانی طور پر ہوتا ہے۔

بعض دفعہ مذاق کا خاص ہدف ہوتا ہے اگر اخلاقی و تربیتی نکات پر منحصر ہو تو وہ خوش اخلاقی شمار ہوتا ہے۔

---

[۱] اصول کافی، جلد 2، ہمان، صفحہ 665، حدیث 18.

[۲] غرر الحکم، شمارہ 8356، جلد 5، صفحہ 279.

۶۔امانت وخیانت

فضائل اخلاق میں سے ایک امانت ہے قرآن وسنت میں اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے، اس کے برعکس خیانت گناہاں کبیرہ میں سے ہے اور اس کی سخت مذمت کی گئی ہے، انسانی معاشرے کا اصلی سرمایہ امانت ہے اس سے تعلقات ایک دوسرے سے قائم ہوتے ہیں۔حالانکہ خیانت جو تعلقات ختم کر کے رکھ دینے والی جلتی ہوئی آگ ہے، خیانت سے معاشرے میں ہرج ومرج، غربت اور بدبختی ہوتی ہے، امانت ایک ایسی صفت ہے جس سے اللہ اور مخلوق کے درمیان رابطہ ہے اسی انسانوں کا ایک دوسرے سے ایک قسم کا رابطہ ہوتا ہے، آسمانی کتب اور دین الٰہی خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے امانت ہیں۔جسم میں ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، کان، دفاع سب خدا کی طرف سے عطا کردہ نعمتیں ہیں۔

مال و دولت اور مقام سب اللہ کی امانت ہیں، والدین کی اولاد، اور استاد کے شاگرسب اللہ کی نعمتیں شمار ہوتی ہیں، پانی، زمین، ہوا اور جو کچھ زندگی کے ضروری اشیاء ہیں سب اللہ کی نعمتیں ہیں اب ہم ان آیات قرآنی کا ذکر کرتے ہیں جن میں امانت کا ذکر ہوا ہے، قرآن مجید میں امانت واحد اور جمع دونوں صورت میں بار بار ذکر ہوئی ہے۔

انبیاءؑ میں چھے انبیاءؑ کے لئے کہ من جملہ "اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ" میں تمہارے لئے رسول امین ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے لئے سورہ شعراء، آیت ۱۰۷ میں اور سورہ ھود، آیت ۱۲۵، جناب صالح علیہ السلام کے لئے سورہ شعراء آیت ۱۴۳، حضرت لوط علیہ السلام کے لئے سورۂ شعراء آیت ۱۶۲، حضرت شعیب علیہ السلام کے لئے سورۂ شعراء آیت ۱۷۸ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے سورۂ دخان، آیت ۱۸ میں ذکر آیا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی

ہوسکتا ہے کہ، خدا نے رسالت کے ساتھ امانت کو ذکر کیا ہے، رسالت کے ساتھ اگر امانت نہ ہوتی تو لوگ اعتماد کیسے کرتے؟

اب ان آیات پر توجہ فرمائیں۔ان میں مکمل امانت الٰہی کا ذکر ہوا ہے۔

① ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ.[1]

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔

② ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا. [2]

(اے ایماندارو) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں امانت رکھوانے والوں کے حوالے کردو۔اور جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔خدا تم کو اس کی کیا ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔اس میں تو شک نہیں کہ خدا (سب کی) سُنتا (اور سب کچھ) دیکھتا ہے۔

③ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ [3]

اے ایماندارو نہ تو خدا اور رسولؐ کی (امانت میں) خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم سمجھتے بوجھتے ہو۔

④ ۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ. [4]

---

[1] مؤمنون::8، معارج::32

[2] نساء::58

[3] انفال:27

[4] بقرہ:283

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ ملے (اور قرض دینا ہو) تو رہن یا قبضہ رکھ لو اور اگر تم میں سے ایک کا ایک کو اعتبار ہو تو (یوں ہی قرض دے سکتا ہے) مگر پھر جس شخص پر اعتبار کیا گیا ہے (قرض لینے والا) اس کو چاہیے کہ قرض دینے والے کی امانت (قرض) پورا پورا ادا کر دے۔ اور اپنے پالنے والے خدا سے ڈرے (مسلمانو) تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا تو بے شک اس کا دل گنہگار ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو خدا اس کو (خوب) جانتا ہے۔

۵۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا.[1]

بے شک ہم نے (روز ازل) اپنی امانت (اطاعت عبادت) کو سارے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کے (بار) اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اسے (بے تامل) اٹھالیا بے شک انسان (اپنے حق میں) بڑا ظالم (اور) نادان ہے۔

تفسیر اور خلاصہ:

پہلی آیت میں حقیقی مومنین کی صفات بیان ہوئی ہیں، اور انھیں فلاح پانے کی بشارت دی گئی ہے کہ اس کے بعد نماز کی اہمیت بیہودگی سے پرہیز، زکات کی ادائیگی اور ہر قسم کے جنسی تعلقات سے پرہیز کا ذکر ہوا ہے، پانچویں اور چھٹی آیات میں حفظ امانت اور عہد و پیمان کی پابندی کا مسئلہ بیان ہوا ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ.

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔

اس قسم کی تعبیر سورۂ معارج آیت ۳۲، میں نیک لوگوں کی صفات کے ضمن میں ذکر آیا ہے، قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں امانت جمع لفظ آیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امانت کی اقسام ہیں۔

تمام مفسرین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس آیت میں امانت سے مراد صرف مادی نعمتیں نہیں بلکہ

---

[1] احزاب: 72

معنوی نعمتوں کو بھی شامل ہے، جیسے قرآن ،عبارت، دستور الٰہی اور وظائف شرعیہ اللہ نے انسان کو مختلف نعمتیں عطا کی ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی مومن وہ انسان ہے جو ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے ، (واوء عاطفہ) درمیان عہد اور امانت کے درمیان آئی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے دونوں کی ایک اصل ہے کیوں عہد خلافی ایک قسم کی خیانت ہے اور عہد و پیمان پر عمل کرنا اور ایک قسم کی امانت ہے کلمہ ''راعون'' استعمال ہوا ہے جو رعایت سے نکلا ہے۔ امانت ایک دفع فردی ہوتی ہے یعنی ایک شخص کے پاس امانت ہوتی ہے جسے کوئی شخص اپنی چیز کو دوسرے کے پاس امانت رکھتا ہے اور ایک دفعہ امانت اجتماعی ہوتی ہے ،قرآن کی حفاظت و دستور الٰہی ایسی امانتیں ہیں جو معاشرے کو سپرد کی گئی ہیں اور معاشرہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ لوگوں کے مجموعے کا نام ہے۔

دوسری آیت میں دو دستور بیان ہوئے ہیں ، پہلا دستور امانت اور دوسرا دستور عدالت کے بارے میں ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا.

(اے ایماندارو) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں امانت رکھوانے والوں کے حوالے کردو۔ اور جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ خدا تم کو اس کی کیا ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ خدا (سب کی) سُنتا (اور سب کچھ) دیکھتا ہے۔

عادلانہ حکومت اور لوگوں کے درمیان درست فیصلے کی بڑی اہمیت ہے، حالانکہ اس سے پہلے امانت کے دستور کا ذکر آیا ہے عادلانہ حکومت بھی ایک قسم کی امانت ہے،

تفسیر کبیر میں فخری رازی امانت کی تین اقسام لکھتا ہے:

۱۔امانت الٰہی،

۲۔لوگوں کی امانتیں

۳۔اپنی ذاتی امانتیں،

پھر ہر ایک کی وضاحت کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ایک امانت خدا ہے، اس کی مختلف مصادیق بیان کرتا ہے، از جملہ، امانت زبان، امانت آنکھ اور کان کا کرتا ہے، زبان سے گالیاں نہ دی جائیں، آنکھ سے نامحرم پر نظر نہ پڑنے اور کان سے کسی کی غیبت نہ سنے۔

لوگوں کی امانتوں میں وہ مراد ہیں جو ایک دوسرے کے پاس رکھتے ہیں، کم فروشی، ترک غیبت، حکومتی مسائل میں رعایت کرنا، لوگوں کو باطل پر نہ بھڑکانا۔[1]

اس آیت کے شانِ نزول سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے،

شانِ نزول میں یہ ہے جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں فاتح کے طور پر داخل ہوئے تو کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ کو بلایا اس سے کعبہ کی چابی لی اور کعبہ کو اندار سے بتوں سے پاک کیا گیا، اس کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس نے چابیاں لینے کا تقاضا کیا لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہ کیا، اور دوبارہ عثمان بن طلحہ کو دے دیں اس آیت کی تلاوت فرمائی:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ

خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں امانت رکھوانے والوں کے حوالے کردو۔

حالانکہ عثمان بن طلحہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔

تیسری آیت میں واضح طور پر تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے:

(۱) خدا سے خیانت (۲) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت (۳) لوگوں کی ایک دوسرے کی امانتیں۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

اے ایماندارو! نہ تو خدا اور رسولؐ کی (امانت میں) خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم سمجھتے بوجھتے ہو۔

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ اس امانت سے مراد اللہ اور اس کے رسولؐ ہیں کہ ان سے خیانت کی گئی ہے، بعض ضعیف الایمان افراد اپنے ذاتی مفاد کے خاطر مشرکین کے لئے پراپیگنڈے کرتے تھے لیکن خدا نے اپنے پیغمبر کو

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد 10، صفحہ 139. (ذیل آیہ مورد بحث

اس سے آگاہ کر دیا جن میں ایک نمونہ ابولبابہ کی داستان ہے کہ اس مسلمانوں کی فوجی راز بنی قریظہ جیسے سخت دشمن کو جا کر بتا دیئے یا مسلمانوں نے رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابوسفیان کی طرف حرکت کو فاش کر دیا۔

بعض لوگ اللہ کے وظائف میں خیانت کرتے ہیں، سنت میں خیانت، رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت ہے اور اموال میں خیانت لوگوں کی خیانت ہے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ امانت سے مراد ہر معنوی اور مادی دونوں مراد ہیں۔

رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوذرؓ سے فرمایا:

يا اَباذَرٍ اَلْمَجالِسُ بِالاَمانَةِ وَاِفْشاءُ سِرِّ اَخيكَ خِيانَةٌ. [1]

اے ابوذرؓ، خصوصی گفتگو ایک امانت ہوتی ہے، اور کسی بھائی کا راز بتانا خیانت شمار ہوتی ہے۔

آیت نمبر ۲۸ سورہ انفال، میں اس آیت کے بعد بھی اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مال اور اولاد بھی خطرے میں ہو تو بھی خیانت نہیں کرنی چاہیے۔

خداوند عالم فرماتا ہے کہ:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

اور یقین جانو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہاری آزمائش کی چیزیں ہیں (کہ جوان کی محبت میں بھی خدا کو نہ بھولے وہ دیندار ہے) اور یقیناً خدا کے ہاں بڑی مزدوری ہے۔

تیسری آیت مخصوص امانت مالی کے بارے میں ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ.

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ ملے (اور قرض دینا ہو) تو رہن یا قبضہ رکھ لو اور اگر تم میں سے ایک کا ایک کو اعتبار ہو تو (یوں ہی قرض دے سکتا ہے) مگر پھر جس شخص پر اعتبار کیا گیا ہے (قرض لینے والا) اس کو چاہیے کہ قرض دینے والے کی امانت (قرض) پورا پورا ادا کر دے۔ اور اپنے پالنے والے خدا سے ڈرے (مسلمانو) تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا تو بے شک

---

[1] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 89.

اس کا دل گنہگار ہے۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو خدا اس کو (خوب) جانتا ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں امانت الٰہی کا ذکر ہوا ہے آسمان و زمین اور پہاڑ کی جس کی حفاظت سے عاجز تھے، خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا.

بے شک ہم نے (روز ازل) اپنی امانت (اطاعت عبادت) کو سارے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کے (بار) اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اسے (بے تامل) اٹھالیا بے شک انسان (اپنے حق میں) بڑا ظالم (اور) نادان ہے۔

یہ کون سی امانت ہے جس سے زمین اور پہاڑ بھی اُٹھانے سے ناتواں تھے اور خاکی انسان جس کا جسم بھی چھوٹا سا ہے نے اس امانت کو لے لیا۔

مفسرین نے کافی احتمالات تحریر کیے ہیں، لیکن صحیح نظریہ یہ ہے کہ اس سنگین امانت سے مراد تکلیف اور وظیفہ الٰہی ہے اور یہ وظیفہ عقل، آزادی، اور ارادے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ واقعاً تعہد اور وظیفہ الٰہی مخلوق کے لئے ایک سنگین بار ہے، انسان کے علاوہ کسی نے قبول نہیں کیا، خداوند عالم نے ثواب و عذاب کے لئے عقل کو معیار قرار دیا، انسان کے اندر یہ تین صفات یعنی وظیفہ الٰہی، عقل و آزادی یا عظمت ہیں، لیکن اس جہل و ظالم انسان نے اس مقام کی قدر نہ کی اور خواہشات نفس کا اسیر بن گیا جس سے سعادت جیسی نعمت سے محروم ہو گیا، جہل یا ظالم ہونا اس امانت کو قبول کرنے کی وجہ سے نہیں کیونکہ اس کا قبول کرنا عقل اور افتخار کا باعث ہے کیوں کہ اس کے علاوہ خلیفہ اللہ کا مقام حاصل نہیں ہوتا لہٰذا جہل اور ظالم ہونا اس لئے تھا کہ اس نے امانت کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے، اگر اس امانت کی حفاظت کرتا تو سعادت حاصل کرتا اور خیانت کرنے سے پست ترین اور ذلت کا شکار ہو جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں آسمان و زمین اور پہاڑ اتنی وسعت کے باوجود اس امانت کو نہ اُٹھا سکے لیکن انسان میں یہ استعداد ہے کہ وہ اس امانت کو قبول کرتا اور انسان کے لئے یہ ایک بڑا افتخار تھا لیکن اس امانت کا سنگین بار اُٹھانے کے بعد اس نے اس کا حق قبول نہ کیا اور اس کی حفاظت نہ کر سکا، لہٰذا جاہل اور ظالم بن گیا اور اپنے افتخار سے غافل رہا۔

ہاں امانت کی حفاظت پر عقل و عدالت کی دلیل ہے اور خیانت کی دلیل ظلم و جہالت ہے، جو کچھ بیان ہو چکا

ہے اس سے مراد عام انسان، کافر، بے ایمان یا مومن ضعیف الایمان ہیں وگرنہ اولیاء اللہ اور اللہ کے نیک افراد نے اس امانت کا حق ادا کر دیا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت بڑی اہم چیز ہے، امانت ایک مشترک اصول ادیان میں ہے۔

روایات اسلامی میں امانت وخیانت

اب ان احادیث پر توجہ فرمائیں:

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے خطاب فرمایا:

يا اَبَاالْحَسَنِ اَدِّ الاَمانَةَ اِلَى الْبَرِّ وَ الْفاجِرِ فِي ما قَلَّ وَجَلَّ حَتّى فِي الخَيْطِ وَ الْمَخِيطِ.[۱]

اے ابوالحسن، امانت چاہے نیک انسان کی ہو یا بدکار کی، کم ہو یا زیادہ اسے ادا کرو، اگرچہ سوئی اور دھاگہ ہی کیوں نہ ہو،

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ کلام آپؐ نے مجھے اپنی وفات سے چند گھنٹے پہلے بیاں فرمایا اور تین بار تکرار کیا۔

(۲) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا اِيمانَ لِمَنْ لا اَمانَةَ لَهُ.[۲]

جو شخص امانت کی رعایت نہیں کرتا اس کا ایمان نہیں ہے۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يَبْعَثْ نَبِيّاً اِلّا بِصِدْقِ الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الاَمانَةِ اِلَى الْبَرِّ وَ الْفاجِرِ.[۳]

---

[۱] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 273.

[۲] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 273.

[۳] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 104.

اللہ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ سب کو یہ تعلیم دی کہ امانت ادا کرو چاہے نیک فرد کی ہو یا بد کی۔

(۴) آپؑ ہی نے لوگوں کے ایمان کے امتحان کے بارے میں فرمایا:

لا تَنْظُرُوا اِلَى طُوْلِ رُكُوعِ الرَّجُلِ وَ سُجُودِهِ، فَاِنَّ ذٰلِكَ شَيْءٌ اِعْتادَهُ فَلَو تَرَكَهُ اِسْتَوْحَشَ لِذٰلِكَ وَلٰكِنْ اُنْظُرُوا اِلى صِدْقِ حَدِيثِهِ وَ اَداءِ اَمانَتِهِ.[1]

لوگوں کے طولانی رکوع و سجود کو نہ دیکھو، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ اس کی عادت ہو کہ جب اسے ترک کرتا ہو تو تکلیف محسوس ہوتی ہو، بلکہ اس کی صداقت اور امانت کی ادائیگی دیکھو۔

(۵) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لاتَنْظُرُوا اِلَى كَثْرَةِ صَلاتِهِمْ وَ صَوْمِهِمْ وَ كَثْرَةِ الْحَجِّ وَ الْمَعْرُوفِ وَ طَنْطَنَتِهِمْ بِاللَّيْلِ وَلٰكِنْ اُنْظُرُوا اِلى صِدقِ الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الْاَمَانَةِ.[2]

کسی کی نماز روزہ کی کثرت یا حج اور دوسرے نیک کاموں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اس کی صداقت اور امانت کو دیکھو۔

اس میں یہ مراد نہیں کہ نماز، روزہ، حج یا دوسرے نیک کاموں کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ صرف نماز یا روزہ وغیرہ دین دار ہونے کی نشانی نہیں بلکہ دورکن اساسی پر بھی توجہ دی جائے یعنی صداقت و امانت پر۔

(۶) امام سجاد علیہ السلام اپنے شیعوں سے فرماتے ہیں:

عَلَيْكُمْ بِاَداءِ الْاَمَانَةِ فَوالَّذِي بَعَثَ مُحَمّداً (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بِالْحَقِّ نَبِيّاً لَوْ اَنَّ قاتِلَ اَبِي الْحُسَيْنِ ابْنِ عَلِيّ (علیہما السلام) اَئْتَمَنَنِي عَلَى السَّيْفِ الَّذِي قَتَلَهُ بِهِ لَاَدَّيْتُهُ اِلَيْهِ.[3]

تمہیں امانت ادا کرنی چاہیے اس خدا کی قسم جس نے برحق نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا اگر میرے باپ حسین علیہ السلام کا قاتل بھی میرے پاس شمشیر امانت رکھتا تو میں اس امانت میں

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 105، حدیث 13.

[2] بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 114، حدیث 5.

[3] بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 114، حدیث 3.

خیانت نہ کرتا۔

(۷)امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ ضارِبَ عَلِیٍّ بِالسَّیْفِ وَ قاتِلَه لَوْ اِئْتَمَنَنِی وَ اسْتَنْصَحَنِی وَ اسْتَشارَنِی، ثُمَّ قَبِلتُ ذلِكَ مِنْهُ، لاَدَّیْتُ اِلَیْهِ الْاَمانَةَ.[۱]

جس شخص نے جس تلوار سے علی علیہ السلام کو شہید کیا اگر وہ میرے پاس امانت رکھتا یا مجھ سے نصیحت کا تقاضا کرتا تو میں اس سے قبول کرتا۔

(۸)امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ایک صحابی عبداللہ بن ابی یعفور سے فرمایا:

اُنْظُرْ ما بَلَغَ بِهِ عَلِیٌّ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ(صلی الله علیه وآله) فَالْزَمْهُ.

دیکھو علی علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کتنا مقام حاصل کرلیا، پھر فرمایا،:

فَاِنَّ عَلِیّاً(علیہ السلام) اِنَّما بَلَغَ ما بَلَغَ بِهِ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ بِصِدْقِ الْحَدِیثِ وَ اَداءِ الْاَمانَةِ.[۲]

امام علی علیہ السلام کو یہ مقام اس لئے حاصل ہوا کہ وہ راست گو یعنی سچے اور امانت دار تھے۔

(۹)حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْاَمانَةُ تَجُرُّ الرِّزْقَ وَ الْخِیانَةُ تَجُرُّ الْفَقْرَ.[۳]

امانت داری سے رزق وروزی میں اضافہ ہوتا ہے اور خیانت سے غربت آتی ہے۔

(۱۰)آپؑ ہی نے فرمایا:

رَأْسُ الْاِسْلامِ اَلْاَمانَةُ.[۴]

اسلام کی اساس امانت ہے۔

(۱۱)لقمان حکیم سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

---

[۱] مجموعہ ورّام، جلد 1، صفحہ 20.

[۲] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 104، حدیث 5.

[۳] بحار، جلد 78، صفحہ 60.

[۴] شرح غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 47.

يابُنَيَّ اَدِّ الْاَمانَةَ تَسْلُمُ لَكَ دُنْياكَ وَ آخِرَتُكَ وَ كُنْ اَمِيناً تَكُنْ غَنِيّاً.[1]

اے بیٹے، امانت کو ادا کرو تا کہ تیری دنیا و آخرت سالم رہے اور امانت دار ہو تا کہ تم غنی ہو جاؤ۔

(۱۲) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لاتَزالُ اُمَّتِي بِخَيْرٍ ما تَحابُّوا وَ تَهادُّوا وَ اَدَّوُا الْاَمانَةَ وَ اِجْتَنِبُوا الْحَرامَ وَ وَقَّرُوا الضَّيْفَ وَ اَقامُوا الصَّلاةَ وَ آتُوا الزَّكاةَ فَاِذا لَمْ يَفْعَلُوا ذلِكَ اِبْتَلَوا بِالْقَحطِ وَ السِّنِيْنِ.[2]

میری اُمت ہمیشہ خیر و سعادت کی راہ پر ہے، جب تک ایک دوسرے سے محبت کرے، ایک دوسرے پر اعتماد کرے، امانت کو ادا کرے اور حرام سے پرہیز کرے، مہمان کی عزت کرے، نماز قائم کرے اور زکات کی ادائیگی کرے، اگر ایسا نہ کیا تو قحط اور خشک سالی میں اسیر ہوں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ

جب نماز کا وقت ہوا تو حضرت علی علیہ السلام کی حالت کچھ اور محسوس ہو رہی تھی جب آپؑ سے پوچھا تو آپؑ نے فرمایا، نماز کا وقت ہے اور یہ وہی امانت الٰہی ہے جس کو خداوند عالم نے آسمان و زمین اور پہاڑ سے قبول کرنے کو فرمایا تو انھوں نے انکار کر دیا اور ڈر گئے۔[3]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملتا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب خداوند عالم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی ارواح کو خلق کیا تو فرمایا، ان کی ولایت میری مخلوق کے پاس امانت ہے۔[4]

ایک اور حدیث میں ملتا ہے کہ

---

[1] معانی الاخبار، صفحہ 253 بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 117.

[2] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 115.

[3] نور الثقلین، جلد 4، صفحہ 313.

[4] بحار الانوار، جلد 26، صفحہ 320.

خلافتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی امانت ہے [1]

یا یہ کہ نماز و روزہ زکوٰۃ اور حج امانت ہیں۔ [2]

یا ہماری بیویاں، تمہارے پاس امانت ہیں۔ [3]

نہج البلاغہ میں مولا امیر علیہ السلام نے فرمایا:

گورنری تیرے لئے نان و آب کا وسیلہ نہیں بلکہ تیری گردن پر ایک امانت ہے یہ خط مولا علی علیہ السلام نے اشعث بن قیس کو لکھا تھا۔ [4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

محفل خصوصی امانت ہے، [5]

بعض روایات میں ملتا ہے کہ غسل جنابت بھی ایک امانت الٰہی ہے۔ [6]

آثارِ امانت وخیانت

اہم ترین مسئلہ امانت اعتماد ہے، اجتماعی زندگی میں لوگوں کو اساسی طور پر ایک دوسرے کی مشکلات کو دور کرنا اور اعتماد نفس ہے، اگر اعتماد متقابل بہ ہو معاشرے بُرے آثار جنم لے سکتے ہیں اور ایک سالم اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا، اس اعتماد کی اساس دو چیزیں ہیں (۱) امانت (۲) صداقت پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امانت کی رعایت کرنے سے روزی میں اضافہ ہوتا ہے اور خیانت سے غربت پیدا ہوتی ہے۔

مرحوم کلینیؒ کافی میں لکھتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد 99، صفحہ 175.

[2] بحار الانوار، جلد 99، صفحہ ۲۷۴

[3] بحار الانوار، جلد 21، صفحہ 381.

[4] نہج البلاغہ، نامہ 5.

[5] المحجۃ البیضاء، جلد 3، صفحہ 327.

[6] بحار الانوار، جلد 10، صفحہ 181.

ایک شخص عبدالرحمن بن سیّابہ نقل کرتا ہے کہ جب اس کے باپ نے وفات پائی، اس کا ایک دوست گھر آیا اور مجھے تسلی دی کی پھر کہنے لگا کیا تیرے باپ نے تیرے لئے کوئی ترکہ چھوڑا ہے؟

میں نے کہا: نہیں،

اس شخص کے پاس ایک تھیلی تھی جس میں ہزار درہم تھے مجھے دیئے اور کہا اس مال کی حفاظت کرو اور اس کے منافع سے فائدہ اُٹھاؤ، میں بہت خوش حال تھا اور یہ خبر اپنے اہل وعیال کو سنائی میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر کچھ چیزیں خریدیں اور بازار میں تجارت شروع کردی، خداوندعالم نے میرے مال میں برکت دی اور بڑا منافع ہوا، حج کا زمانہ آیا تو ماں سے کہا: مجھے حج پر جانا ہے،

میری ماں نے کہا: ہزار درہم اس آدمی کو واپس کردو،

میں اس کے پاس گیا اس کی امانت اسے واپس کر دی، جب میں حج کے اعمال بجالایا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا آپؑ کے پاس کافی لوگ جمع تھے جب مجلس ختم ہوگئی تو امامؑ نے مجھے اشارہ فرمایا، میں امامؑ کے نزدیک گیا تو آپؑ نے فرمایا، کیا تجھے کوئی حاجت ہے؟

اس نے عرض کیا، عبدالرحمن بن سیّابہ ہوں،

آپؑ نے پوچھا: تیرا باپ کہاں ہے؟

میں نے عرض کیا: وہ وفات پا چکے ہیں،

حضرتؑ کو دکھ ہوا اور میرے باپ کے لئے طلب مغفرت کی،

پھر فرمایا، کیا تمہارا باپ تمہارے لئے کچھ ترکہ چھوڑ کر گیا ہے؟

میں نے کہا: نہیں،

امامؑ نے فرمایا: پھر حج پر کس طرح اکیلے آئے ہو؟

میں نے سارا ماجرا سنایا، ابھی میں بات کر رہا تھا کہ امامؑ نے پوچھا: ہزار درہم تم نے کہاں خرچ کیے؟

میں نے عرض کیا: وہ جس کے تھے اسے واپس کر کے آیا ہوں،

آپؑ نے فرمایا: شاباش ہو تم پر، کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں کوئی نصیحت کروں؟

میں نے عرض کیا: تم پر قربان ہوں، ہاں ضرور نصیحت فرمائیں،

آپؑ نے فرمایا:

عَلَيْكَ بِصِدْقِ الْحَدِيثِ وَاَداءِ الْاَمانَةِ تَشْرُكُ النّاسَ فِي اَمْوالِهِمْ هَكَذا؛ وَ جَمَعَ بَيْنَ اَصابِعِهِ.

صداقت اور امانت کا خیال رکھنا اگر لوگوں کے ساتھ مال میں شریک ہو تو اس طرح (انگلیوں کا اشارہ فرمایا) آپؑ نے اپنی انگلیاں جمع کیں، یعنی ان انگلیوں کی مانند عبدالرحمن بن سیّابہ کہتا ہے کہ میں نے یہ نورانی کلام سنا اور واپس آ گیا، اگلے سال مجھ پر تین لاکھ درہم زکوٰۃ واجب ہو گئی۔[1]

ہماری زندگی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں،

نجف اشرف میں ایک تاجر رہتا تھا، ہم سب اس کو جانتے تھے، وہ امین تھا لوگ اس کے پاس امانتیں رکھتے تھے، وہ خود عراقی تھا لہٰذا جو طالب علم گھر خریدتا تھا اس کے نام خریدتا تھا اس کی وفات کے وقت پانچ سو گھر اس کے نام تھے، کسی طالب علم کو کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

امانت کی رعایت کرنے سے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے انسان فکری طور پر پُرسکون رہتا ہے اور نفسانی طور پر بااعتماد ہوتا ہے، کیونکہ خیانت سے سب لوگ ڈرتے ہیں، ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ خیانت نہ ہو۔

امانت داری گھر کے خرچ کو کم کرتی ہے، وقت، عمر اور مال میں بچت ہوتی ہے، کیونکہ اگر معاشرے میں خیانت رائج ہو جائے تو پولیس اور حکومت کو پوچھ گچھ کرنی پڑتی ہے، اس کام میں جتنے لوگ کام کرتے ہیں انھیں تنخواہ دینا پڑتی ہے خیانت سے ملکی اقتصاد میں بحران آتا ہے، امانت داری سے دوستی و محبت پیدا ہوتی ہے اور خیانت سے کبھی لاکھوں روپے ضائع ہوتے ہیں، خدا ہم سب کو امین بنائے۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لاتَزالُ اُمَّتِي بِخَيْرٍ ما تَحابُّوا وَ تَهادُوا وَ أَدَّوُا الْاَمانَةَ وَاجْتَنَبُوا الْحَرامَ...

---

[1] فروع کافی، جلد 5، صفحہ 134. (با کمی تلخیص).

فَاِذا لَمْ یَفْعَلُوا ذٰلِكَ اُبْتِلُوا بِالْقَحْطِ وَ السِّنِین.[1]

میری اُمت ہمیشہ خیر و برکت کی طرف حرکت میں ہے لیکن جب وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور مدد کرتے ہیں، امانت کی رعایت کرنا، حرام سے پرہیز کرنا، اگر ان کاموں کو ترک کرتے ہیں تو قحط وخشک سالی میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔

پانچویں آیت میں امانت کا مفہوم وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، علم اور پیشرفتہ ٹیکنالوجی بھی امانت ہے دانشمند افراد امین ہوتے ہیں وہ اپنی صداقت سے مطالعہ کرتے ہیں، تجربات کے بعد علم کی دوسروں کو تعلیم دیتا ہے اگر علم میں امانت نہ ہوتی تو افراد گمراہ ہو جاتے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

كُلُّ ذِی صَناعَة مُضْطَرٌّ اِلَی ثَلاثِ خَلال یَجْتَلِبُ بِهَا الْمَكْتَسِبَ وَ هُوَ اَنْ یَكُونَ حاذِقاً بِعَمَلِهِ، مُؤَدِّیاً لِلْاَمانَةِ فِیهِ، مُسْتَمِیلا لِمَنْ اِسْتَعْمَلَهُ.[2]

ہر کارخانے کے مالک پر ضروری ہے کہ اس میں تین صفات پائی جائیں، ان کے ذریعے اپنے کاروبار کو رونق دے:

(۱) کام میں ماہر ہو

(۲) امانت ادا کرتا ہو

(۳) ماتحت افراد کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْاَمانَةُ تُؤَدِّی اِلَی الصِّدْقِ.[3]

امانت انسان کو صداقت کی دعوت دیتی ہے

دوسری حدیث میں آپؑ فرماتے ہیں:

---

[1] بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 115.

[2] بحارالانوار، جلد 75، صفحہ 236.

[3] شرح فارسی غرر، جلد 2، صفحہ 7.

اِذا قَوِیَتِ الْاَمانَۃُ کَثُرَ الصِّدْقُ.[1]

جب امانت محکم ہوتو صداقت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔

امانت وخیانت کا نتیجہ

جولوگ خیانت کرتے ہیں وہ درحقیقت امانت پر خیانت کوترجیح دیتے ہیں، خیانت کرنے سے فوری منافع و مال مل جاتا ہے، جولوگ حرص وطمع کی آرزو رکھتے ہیں وہ خیانت کے انجام کے بارے میں بہت سوچتے ہیں کیونکہ جلدی سے ملنے والے مال سے ان کی آنکھوں اور کانوں اور عقل پر پردہ پڑھ جاتا ہے، یہ کام اکثر ضعیف الایمان کا ہوتا ہے امانت دارکو دنیاوآخرت میں ثواب دینے کا وعدہ کیا گیا ہے، لہٰذا خیانت کا سرچشمہ مندرجہ ذیل اُمور ہیں:

(۱) ضعیف الایمان وعدم یقین حاکمیت خدا

(۲) غلبہ ہواوہوس اور دنیا پرستی

(۳) غلبہ حرص وطمع

(۴) زندگی میں خیانت کے انجام پرتوجہ نہ دینا

(۵) کوشش کوترک کردینا

اس کے برعکس امانت کے نتائج حیرت انگیز ہیں

(۱) امانت ایمان اوریقین سے پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ خدا پرتوکل کرنا۔

(۲) امانت سے انسان کواوہام اورآلودہ ہواوہوس پرستی سے رہائی ملتی ہے۔

(۳) امانت داری انسان کو بڑا بناتی ہے۔

عہدنامہ مالک اشتر میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

.....ثُمَّ اخْتَرْ لِلْحُكْمِ بَيْنَ النَّاسِ أَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِي نَفْسِكَ مِمَّنْ لَا تَضِيقُ بِهِ الْأُمُورُ وَ لَا تُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ وَ لَا يَتَمَادَى فِي الزَّلَّةِ وَ لَا يَحْصَرُ مِنَ الْفَيْءِ إِلَى

---

[1] شرح فارسی غرر، جلد 3، صفحہ 134.

الْحَقِّ إِذَا عَرَفَهُ وَ لَا تُشْرِفُ نَفْسُهُ عَلَى طَمَعٍ وَ لَا يَكْتَفِي بِأَدْنَى فَهْمٍ دُونَ أَقْصَاهُ وَ أَوْقَفَهُمْ فِي الشُّبُهَاتِ وَ آخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ وَ أَقَلَّهُمْ تَبَرُّماً بِمُرَاجَعَةِ الْخَصْمِ وَ أَصْبَرَهُمْ عَلَى تَكَشُّفِ الْأُمُورِ وَ أَصْرَمَهُمْ عِنْدَ اتِّضَاحِ الْحُكْمِ مِمَّنْ لَا يَزْدَهِيهِ إِطْرَاءٌ وَ لَا يَسْتَمِيلُهُ إِغْرَاءٌ وَ أُولَئِكَ قَلِيلٌ ثُمَّ أَكْثِرْ تَعَاهُدَ قَضَائِهِ وَ أَفْسِحْ لَهُ فِي الْبَذْلِ مَا يُزِيحُ عِلَّتَهُ وَ تَقِلُّ مَعَهُ حَاجَتُهُ إِلَى النَّاسِ وَ أَعْطِهِ مِنَ الْمَنْزِلَةِ لَدَيْكَ مَا لَا يَطْمَعُ فِيهِ غَيْرُهُ مِنْ خَاصَّتِكَ لِيَأْمَنَ بِذَلِكَ اغْتِيَالَ الرِّجَالِ لَهُ عِنْدَكَ فَانْظُرْ فِي ذَلِكَ نَظَراً بَلِيغاً فَإِنَّ هَذَا الدِّينَ قَدْ كَانَ أَسِيراً فِي أَيْدِي الْأَشْرَارِ يُعْمَلُ فِيهِ بِالْهَوَى وَ تُطْلَبُ بِهِ الدُّنْيَا.[1]

.....پھر لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ان افراد کا انتخاب کرنا جو رعایا میں تمہارے نزدیک سب سے زیادہ بہتر ہوں۔ اس اعتبار سے کہ نہ معاملات میں تنگی کا شکار ہوتے ہوں اور نہ جھگڑا کرنے والوں پر غصّہ کرتے ہوں۔ نہ غلطی پر اَڑ جاتے ہوں اور حق کے واضح ہوجانے کے بعد اس کی طرف پلٹ کر آنے میں تکلّف کرتے ہوں اور نہ ان کا نفس لالچ کی طرف جھکتا ہو اور نہ معاملات کی تحقیق میں ادنیٰ فہم پر اکتفا کر کے مکمل تحقیق نہ کرتے ہوں۔ شہادت میں توقف کرنے والے ہوں اور دلیلوں کو سب سے زیادہ اختیار کرنے والے ہوں۔ فریقین کی بحثوں سے اُکتا نہ جاتے ہوں اور معاملات کی چھان بین میں پوری قوت برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوں اور حکم کے واضح ہوجانے کے بعد نہایت وضاحت سے فیصلہ کردیتے ہوں۔ نہ کسی کی تعریف سے مغرور ہوتے ہوں اور نہ کسی کے اُبھارنے پر اونچے ہوجاتے ہوں۔ ایسے افراد یقیناً کم ہیں۔ لیکن ہیں۔ پھر اس کے بعد تم خود بھی ان کے فیصلوں کی نگرانی کرتے رہنا اور ان کے عطایا میں اتنی وسعت پیدا کردینا کہ ان کی ضرورت ختم ہوجائے اور پھر لوگوں کے محتاج نہ رہ جائیں انھیں اپنے پاس ایسا مرتبہ اور مقام عطا کرنا جس کی تمہارے خواص بھی طمع نہ کرتے ہوں کہ اس طرح وہ لوگوں کے ضرر پہونچانے سے محفوظ ہوجائیں گے۔ مگر اس معاملہ پر بھی گہری نگاہ رکھنا کہ یہ دین بہت دنوں اشرار کے ہاتھوں میں قیدی رہ چکا ہے جہاں خواہشات کی بنیاد پر کام ہوتا تھا اور

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ 53.

مقصد صرف دنیا طلبی تھا۔

اس طرح امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

مَنْ اُؤْتُمِنَ عَلی اَمانَة فَاَدّاها فَقَدْ حَلَّ اَلْفَ عُقْدَة مِنْ عُنُقِهِ مِنْ عُقَدِ النّارِ، فَبادِرُوا بِاَداءِ الْاَمانَةِ، فَاِنَّ مَنْ اُؤْتُمِنَ عَلی اَمانَة وَكَّلَ بِهِ اِبْلِيسُ مِأَةَ شَيْطانٍ مِنْ مَرَدَةِ اَعْوانِهِ لِيُضِلُّوهُ وَيُوَسْوِسوا اِلَيْهِ حَتّی يُهْلِكُوهُ اِلّا مَنْ عَصَمَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ.[1]

جس شخص کو امانت دی جائے اور اسے ادا کرے تو ہزار گرہ دوزخ کی آگ کھل جاتی ہے۔

اپنی امانتوں کی ادائیگی میں جلدی کرو، کیونکہ جسے امانت ملتی ہے ابلیس اس پر ایک ہزار کا اپنا لشکر مامور کر دیتا ہے تا کہ اسے گمراہ کرے اور اس کے دل میں خیانت کا وسوسہ ڈالے مگر یہ کہ خدا جس کی حفاظت کرے۔

دفاع اور علاج

با ایمان افراد میں خیانت ممکن نہیں کیونکہ ایمان مانع ہوتا ہے یہ کام ان افراد کا ہے جن کا ایمان ضعیف ہو، ایسے لوگوں کا خرچہ خیانت سے چلتا ہے، ان کا خدا پر توکل نہیں ہوتا، یہ لوگ منحرف ہوتے ہیں، ذلت کا لباس پہنتے ہیں، کسی بڑے عہدے پر ایماندار شخص کو فائز کیا جاتا ہے کہ عام آدمی خیانت نہ کرے، انسان کو خیانت کے انجام پر توجہ دینی چاہیے، رسوائی اور محرومیت کو مدنظر رکھے، غربت میں مبتلا ہونے کو نگاہ میں رکھے اور عبرت حاصل کرے یہ ایسے اُمور ہیں جو دفاع اور فلاح کا باعث ہوتے ہیں۔

جب انسان کو لقمان حکیم کی وہ نصیحت یاد آئے جو اس نے اپنے بیٹے کو کی تھی، کہ جس میں وہ فرماتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 114.

يابُنَيَّ اِدِّ الْاَمانَةَ تَسْلُمُ لَكَ دُنْياكَ وَ آخِرَتُكَ وَ كُنْ اَمِيناً تَكُنْ غَنِيّاً.[1]

اپنے پورے وجود سے ذوق دلا رہا ہے کہ امانت داری کا خیال رکھیں اور خیانت سے بچنا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

رَأْسُ الْكُفْرِ اَلْخِيانَةُ.[2]

کفر کا سرچشمہ خیانت ہے

ایک اور جگہ پر آپؑ نے فرمایا:

رَأْسُ النِّفاقِ اَلْخِيانَةَ.[3]

نفاق کا سرچشمہ خیانت ہے

آپؑ مزید فرماتے ہیں:

جانِبِ الْخِيانَةَ فَاِنَّها مُجانِبَةُ الْاِسْلامَ.[4]

خیانت سے کنارہ کشی کرو کیونکہ یہ اسلام سے دوری کا سبب ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَرْبَعٌ لا تَدْخُلُ بَيْتاً واحِدَةٌ مِنْهُنَّ اِلَّا خَرِبَ وَ لَمْ يَعْمُرْ بِالْبَرَكَةِ اَلْخِيانَةُ وَ السِّرِقَةُ وَ شُرْبُ الْخَمْرِ وَ الزِّنا.[5]

چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر گھر میں داخل ہو جائیں تو گھر کو ویران کر دیتی ہیں اور ہرگز برکت الٰہی سے آباد نہیں ہوتیں:

(۱) چوری

---

[1] میزان الحکمہ، جلد 1، صفحہ 215.

[2] میزان الحکمہ، جلد 1، صفحہ 215.

[3] غرر الحکم و درر الکلم / 376 / 6.....ص: 376

[4] بحار الانوار، جلد 76، صفحہ 125.

[5] بحار الانوار، جلد 106، ص 179.

(۲) شراب خوری

(۳) خیانت

(۴) زنا۔

اگر ان میں سے ایک چیز سے گھر ویران ہو جاتا ہے تو جس گھر میں یہ سب داخل ہوجائیں اس گھر کا کیا حال ہوگا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ جس طرح خیانت والوں کو خیانت نہیں کرنی چاہیے، اسی طرح امانت داروں کو بھی ہوشیاری سے کام لینا چاہیئے کہ اپنی امانت کس کے حوالے کر رہا ہے، اگر امانت رکھنے والا جانتا ہے کہ جس کے پاس وہ امانت رکھ رہا ہے وہ خائن ہے اور پھر وہ امانت کھا جاتا ہے تو امانت رکھوانے والے کو اپنے آپ کو ملامت کرنا چاہیے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنِ ائْتَمَنَ غَيْرَ اَمِينٍ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللهِ ضِمانٌ لِاَنَّه قَدْ نَهاهُ اَنْ يَأْتَمِنَهُ.[1]

جو شخص اپنی امانت کسی خائن کے پاس رکھتا ہے خدا اس کی حفاظت کا ضامن نہیں ہے اور اس نے ایسے آدمی کے پاس امانت رکھنے سے منع کیا ہے۔

لہٰذا تمام افراد کو ہوشیار رہنا چاہیے، کہ کوئی عہدہ یا مقام کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں نہ ہو جو خائن کو ووٹ دیتے وقت کسی امین شخص کو وزیر یا ایم پی اے، اور ایم این اے، بنائیں۔

بیت المال میں امانت وخیانت

امانت ایک مطلوب عمل ہے یعنی سب لوگ پسند کرتے ہیں اسلام نے بڑی تاکید کی ہے کہ لوگوں کے مال میں خیانت نہ ہو خاص کر ایسے ہر حال میں امین ہونا چاہیے، جس میں لوگوں کا حق ہو کیونکہ یہ حقوق العباد میں سے ہے، اگر بیت المال میں خیانت کی جائے تو معاشرے کا نظام خراب ہوکر رہ جاتا ہے، ایسا معاشرہ سعادت مند نہیں بن سکتا، اس موضوع پر ہم ایک داستان تحریر کرتے ہیں توجہ فرمائیں:

---

[1] فروع کافی، جلد 5، صفحہ 299.

ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس عقیل آئے اور کہا کہ بیت المال سے مجھے زیادہ دیا جائے، کیونکہ میں تیرا رشتہ دار ہوں، لہٰذا رشتہ داری کی بنا پر بیت المال کی تقسیم میں تبدیلی لائی جائے، حضرت علی علیہ السلام نے گرم لوہے کی سلاخ لی اور عقیل کے ہاتھ پر رکھ دی، عقیل کا ہاتھ جلنے لگا، جناب عقیل نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا، اور فریاد کرنے لگے، مولا علی علیہ السلام بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:

يا عقيل اَتَئِنُّ مِنْ حَدِيْدَة اَحْماها اِنْسانُها لِلَعِبِهِ وَ تَجُرُّنِي اِلى نار سَجَرَها جَبّارُها لِغَضَبِهِ.

اے عقیل! تم اس لوہے کی گرم سلاخ سے فریاد کر رہے ہو، لیکن مجھے اس آگ میں ڈال رہے ہو، جو آگ خدا کی طرف سے سخت ہے۔

اَتَئِنُّ مِنَ الْاَذَى وَ لا اَئِنُّ مِنْ لَظَى.

تم اس تھوڑی سی آگ سے جلنے پر گریہ کر رہے ہو، اور پھر میں جلا دینے والی، دکھ دینے والی آگ پر گریہ کیوں نہ کروں۔ [1]

جب عثمان نے کنبہ پروری کا ثبوت دیا، حکومت کا بیت المال اپنے رشتہ داری کی بنا پر تقسیم کیا، عہد و مقام اپنے رشتہ دار کو دیا تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اللهِ لَوْ وَجَدْتُهُ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَاءُ وَ مُلِكَ بِهِ الْإِمَاءُ لَرَدَدْتُهُ فَإِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً وَ مَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ أَضْيَقُ. [2]

خدا کی قسم! اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہوتا تو اسے بھی واپس پلٹا لیتا. چونکہ عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں وسعت ہے اور جسے عدل کی صورت میں تنگی محسوس ہو اُسے ظلم کی صورت میں اور زیادہ تنگی محسوس ہو گی.

جب بعض لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کو یہ تجویز دی کہ بالحاظِ شخصیات افراد کو بیت المال سے زیادہ ملنا چاہیے تو آپؑ ناراض ہوئے اور فرمایا:

أَ تَأْمُرُونِّي أَنْ أَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِيمَنْ وُلِّيتُ عَلَيْهِ وَ اللهِ لَا أَطُورُ بِهِ مَا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ 224.

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵.

سَمَرَ سَمِيرٌ وَ مَا أَمَّ نَجْمٌ فِي السَّمَاءِ نَجْماً- [وَ] لَوْ كَانَ الْمَالُ لِي لَسَوَّيْتُ بَيْنَهُمْ فَكَيْفَ وَ إِنَّمَا الْمَالُ مَالُ اللهِ- [ثُمَّ قَالَ عليه السلام] أَلَا وَ إِنَّ إِعْطَاءَ الْمَالِ فِي غَيْرِ حَقِّهِ تَبْذِيرٌ وَ إِسْرَافٌ وَ هُوَ يَرْفَعُ صَاحِبَهُ فِي الدُّنْيَا وَ يَضَعُهُ فِي الْآخِرَةِ وَ يُكْرِمُهُ فِي النَّاسِ وَ يُهِينُهُ عِنْدَ اللهِ وَ لَمْ يَضَعِ امْرُؤٌ مَالَهُ فِي غَيْرِ حَقِّهِ وَ لَا عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ إِلَّا حَرَمَهُ اللهُ شُكْرَهُمْ وَ كَانَ لِغَيْرِهِ وُدُّهُمْ فَإِنْ زَلَّتْ بِهِ النَّعْلُ يَوْماً فَاحْتَاجَ إِلَى مَعُونَتِهِمْ فَشَرُّ خَلِيلٍ وَ أَلْأَمُ خَدِينٍ.[1]

کیا تم مجھے اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے ہو کہ میں جس رعایا کا ذمہ دار بنایا گیا ہوں ان پر ظلم کر کے چند افراد کی مدد حاصل کروں؟

خدا کی قسم! جب تک یہ دنیا چلتی رہے گی اور ایک ستارہ دوسرے ستارہ کی طرف جھکتا رہے گا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ہے ۔ یہ مال اگر میرا ذاتی مال ہوتا جب بھی میں برابر سے تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال مال خدا ہے اور یاد رکھو کہ مال کا ناحق عطا کر دینا۔بھی اسراف اور فضول خرچی میں شمار ہوتا ہے اور یہ کام انسان کو دنیا میں بلند بھی کر دیتا ہے تو آخرت میں ذلیل ورسوا کر دیتا ہے ۔لوگوں میں محترم بھی بنا دیتا ہے تو خدا کی نگاہ میں پست تر بنا دیتا ہے اور جب بھی کوئی شخص مال کو ناحق یا نا اہل پر صرف کرتا ہے تو پروردگار اس کو شکریہ سے بھی محروم کر دیتا ہے اور اس کی محبت کا رخ بھی دوسروں کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ پھر اگر کسی دن پیر پھسل گئے اور ان کی امداد کا بھی محتاج ہو گیا تو وہ بدترین دوست اور ذلیل ترین ساتھی ہی ثابت ہوتے ہیں ۔

اس طرح آپؑ اپنے دوستوں کو تہدید کرتے تھے ،جن لوگوں نے بیت المال سے مال کھایا انھیں اس طرح لکھا:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ الْوَفَاءَ تَوْأَمُ الصِّدْقِ وَ لَا أَعْلَمُ جُنَّةً أَوْقَى مِنْهُ وَ مَا يَغْدِرُ مَنْ عَلِمَ كَيْفَ الْمَرْجِعُ وَ لَقَدْ أَصْبَحْنَا فِي زَمَانٍ قَدِ اتَّخَذَ أَكْثَرُ أَهْلِهِ الْغَدْرَ كَيْساً وَ نَسَبَهُمْ أَهْلُ الْجَهْلِ فِيهِ إِلَى حُسْنِ الْحِيلَةِ مَا لَهُمْ قَاتَلَهُمُ اللهُ قَدْ يَرَى الْحُوَّلُ الْقُلَّبُ وَجْهَ الْحِيلَةِ وَ دُونَهَا مَانِعٌ مِنْ أَمْرِ اللهِ وَ نَهْيِهِ فَيَدَعُهَا رَأْيَ عَيْنٍ بَعْدَ الْقُدْرَةِ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶.

عَلَيْهَا وَ يَنْتَهِزُ فُرْصَتَهَا مَنْ لَا حَرِيجَةَ لَهُ فِي الدِّينِ.[1]

اے لوگو! یاد رکھو وفا ہمیشہ صداقت کے ساتھ رہتی ہے اور میں اس سے بہتر محافظ کوئی سپر نہیں جانتا ہوں اور جسے بازگشت کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے وہ غداری نہیں کرتا ہے۔ہم ایک ایسے دور میں واقع ہوئے ہیں جس کی اکثریت نے غداری اور مکاری کا نام ہوشیاری رکھ لیا ہے۔اور اہل جہالت نے اس کا نام حسن تدبیر رکھ لیا ہے۔آخر انہیں کیا ہوگیا ہے۔خدا انہیں غارت کرے۔وہ انسان جو حالات کے الٹ پھیر کو دیکھ چکا ہے وہ بھی حیلہ کے رخ کو جانتا ہے لیکن امر و نہی الٰہی اس کا راستہ روک لیتے ہیں اور وہ امکان رکھنے کے باوجود اس راستہ کو ترک کر دیتا ہے اور وہ شخص اس موقع سے فائدہ اٹھالیتا ہے جس کے لئے دین سد راہ نہیں ہوتا ہے۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب فتح مکہ ہوا، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو معاف کر دیا تھا، حالانکہ لوگوں کا ناحق قتل و غارت اور ناحق مسلمانوں کا خون بہایا گیا تھا، لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب افراد کی عام معافی کا حکم دیا، اس عمل سے لوگوں پر بڑا اثر ہوا وہ اسلام لے آئے، اس کا نام بھی معافی والا سال رکھا گیا تھا، اس عام معافی سے چند افراد کو مستثنیٰ کیا اور حکم دیا کہ جہاں کہیں وہ ملیں انھیں قتل کردو، ان میں سے ایک خطل تھا اس کا گناہ یہ تھا کہ جب وہ اسلام لایا اور مدینہ کی طرف ہجرت کی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے زکوٰۃ جمع کرنے کا حکم دیا اور ایک اور شخص کو بھی اس کے ساتھ بھیجا، خطل نے ایک کافی مقدار میں زکوٰۃ جمع کر لی اور اپنے ساتھی کو قتل کر دیا، خطل باقی مال بھی لے کر واپس مکہ چلا گیا، جب قریش مکہ نے پوچھا کہ کیوں واپس آگئے ہو تو خطل نے کہا تمہارے دین سے بہتر کوئی دین نہیں ہے، اس کے پاس گانا گانے والی کنیزیں تھیں، وہ محفل برپا کرتا تھا جس میں بت پرست شرکت کرتے تھے، محفلوں میں گانا گایا جاتا اور شراب پی جاتی تھی۔ اس فاسق و فاجر شخص نے بیت المال میں خیانت کی اور مرتد ہوگیا اور واپس بت پرستی کی طرف پلٹ آیا اور اسلام کی اہانت کرنے لگا تھا، لہٰذا ایسے شخص کے قتل کا آپؐ نے دستور دیا۔اس شخص نے کعبہ کی پناہ لی تھی، لیکن اسے باہر نکال کر قتل کر دیا گیا۔[2]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بیت المال میں خیانت کرتا ہے اس کی سزا سخت ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ خیبر سے واپسی پر وادی القریٰ کی سرزمین پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ 41.

[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد 18، صفحہ 14و15.

سمیت ٹھہرے، آپؐ کے ساتھ ایک غلام بھی تھا، حسبِ معمول اس غلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسائل سواری سے اُتارنے شروع کر دیئے۔ اچانک ایک دشمن نے تیر مارا جس سے وہ مر گیا، اصحاب نے اظہار افسوس کیا، اور کہا اللہ اسے جنت نصیب فرمائے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اس خدا کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، اب وہ غلام دوزخ کی آگ میں ہے، آگ کا لباس اس کو پہنایا گیا ہے، کیونکہ اس نے خیبر کے مال غنیمت میں خیانت کی تھی،

اصحاب نے تعجب کیا، ایک شخص آگے بڑھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنے لگا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے بھی دو جوتے مال غنیمت سے لئے تھے آپؐ نے فرمایا: تیرے لئے بھی دوزخ کی آگ ہے۔[1]



[1] سیرہ ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 353.

۷۔صدق وسچائی

انسانوں میں سے ہر بالحاظ شخصیت افراد کی بہترین خوبی صدق وسچائی ہے حقیقی مسلمان میں امانت اور سچائی دونوں صفات پائی جاتی ہیں ان دو صفات کی جڑ مشترک ہے کیونکہ سچائی گفتگو میں امانت کے علاوہ نہیں اور امانت صداقت میں عمل کے سوا کچھ نہیں اسی وجہ سے سیرت پیشواؤں میں یہ دو اکٹھے کلمات ملتے ہیں، یعنی صدق الحدیث اور اداء امانت، سچے افراد اپنی زندگی میں اصول کے پابند ہوتے ہیں، حالانکہ جھوٹے افراد ابن وقت اور منافق ہوتے ہیں، ان دوکلمات سے انسان کا امتحان لیا جاسکتا ہے جب کسی کا امتحان لینا چاہتے ہو کہ وہ کتنا صادق و امانت دار ہے یا نہیں اس میں اب ہم ان روایات کو ذکر کرتے ہیں جو مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

قرآن مجید میں سچائی کے بارے میں ذکر ہونے والی روایات بے نظیر ہیں خداوند عالم فرماتا ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. [1]

خدا فرمائے گا کہ یہ دن ہے کہ سچّے بندوں کو ان کی سچائی (آج) کام آئے گی ان کے لئے (ہرے بھرے بہشت کے) وہ باغات ہیں جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں

---

[1] مائدہ: 119

(اور) وہ اس میں ابدالآباد تک رہیں گے۔ خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش ۔ یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

② ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ. [1]

اے ایماندارو! خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

③ ۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۲۴. [2]

(یہ امتحان اس لیے تھا) تاکہ خدا سچّے (ایمانداروں) کو ان کی سچّائی کی جزائے خیر دے اور اگر چاہے تو منافقین کو سزا دے یا (اگر وہ لوگ توبہ کریں تو خدا) ان کی توبہ قبول فرمائے اس میں شک نہیں کہ خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

④ ۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّاۗىِٕمِيْنَ وَالصّٰۗىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا. [3]

(دل لگا کے سُنو) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بکثرت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں بے شک ان سب لوگوں کے واسطے خدا نے مغفرت اور بڑا (بڑا) ثواب مہیّا کر رکھا ہے۔

---

[1] توبہ:119

[2] احزاب:24

[3] احزاب:35

⑤۔طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ. [1]

(ان کے لیے اچھا کام تو) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات ہے۔ پھر جب لڑائی ٹھن جائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچّے رہیں تو ان کے حق میں بہت بہتر ہے۔

⑥۔وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ. [2]

اور ہم نے تو ان لوگوں کا بھی امتحان لیا جو ان سے پہلے گزر گئے۔غرض خدا ان لوگوں کو جو سچّے (دل سے ایمان لائے) ہیں یقیناً علیحدہ دیکھے گا اور جھوٹوں کو بھی (علیحدہ) ضرور دیکھے گا۔

تفسیر و جمع بندی

قرآن مجید میں راست گوئی و سچائی کو بہت ہی زیادہ نمایاں کیا گیا ہے اور اسے بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد رب العزت ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ.

خدا فرمائے گا کہ یہ دن ہے کہ سچّے بندوں کو ان کی سچائی (آج) کام آئے گی۔

یہ اشارہ اس بات کی طرف کہ دنیا کی سچائی آخرت کے کام آنے والی ہے اور دنیا کے جھوٹے لوگوں کی بخشش کی امید نہیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ.

ان کے لیے (ہرے بھرے بہشت کے) وہ باغات ہیں جن کے (درختوں کے) نیچے

---

[1] محمد:21

[2] عنکبوت:3

نہریں جاری ہیں (اور) وہ اس میں ابدالآباد تک رہیں گے۔ خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش ۔ یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

ایسی صفت کے لوگ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے مالامال ہوں گے اور انہیں اللہ کی رضایت حاصل ہوگی، صادقین کا مقام بہت بلند ہے اور یہ اس لئے کہ ان کے اعمال صدق کے اندر انجام پائے ہیں، قرآن میں چار مقام پر یہ تعبیر آئی ہے، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

(۱) مہاجرین، انصار و تابعین

(۲) حزب اللہ

(۳) خیر البریۃ۔

(۴) صادقین

دوسری آیت میں خداوند عالم نے تمام مومنین کو مخاطت قرار دیا ہے اور فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ.

اے ایماندارو! خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہ حکم تمام مومنین کو ہر زمان اور مکان پر شامل ہے صادقین کے ساتھ رہنا بھی ایسا وظیفہ ہے جو ہر مکان و زمان کو شامل ہے، صادقین سے مراد کون لوگ ہیں اس کے لئے مختلف تفسیریں ملتی ہیں، بعض کے نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب مراد ہیں، بعض کے نزدیک صادق اور صحیح عقائد رکھنے والے انسانوں کو شامل ہے۔

سورۂ حجرات کی آیت ۱۵، میں خدا ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵

(سچّے) مومن تو بس وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انہوں نے اس میں کسی طرح کا شک شُبہ نہ کیا اور اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

اس آیت میں صادقین کی صفات اعلیٰ ذکر ہوئی ہیں، ان کے دل ہر قسم کے شک و تردید سے خالی ہوتے ہیں اور راہ خدا میں جان و مال کا جہاد کرتے ہیں۔

سورہ حشر کی آیت ۸، میں مہاجرین کا ذکر ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر اور اموال کو چھوڑ کر رضائے خدا کے لئے ہجرت کر گئے اور ہمیشہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷، میں ان کی اور صفات کو ذکر کیا گیا ہے، جیسے اللہ پر ایمان لانا، اسی طرح بہترین مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا، اللہ کے لئے نماز قائم کرنا زکواۃ ادا کرنا، عہد کی وفا مشکلات میں صبر جیسی صفات ذکر ہوئی ہیں، ان اوصاف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے کلام میں صادق نہیں بلکہ ایمان، عمل ، ایثار اور اطاعت خدا میں بھی صادق ہیں ان صفات کا کامل نمونہ اہل بیتؑ ہیں، اہل سنت کی تفاسیر میں موجود ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور ان اصحاب کے بارے میں ہے۔

علامہ ثعلبی اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا، (مع الصادقین) یعنی (مع علی ابن ابی طالب و اصحابہ)[1]

اسی طرح علامہ گنجی کفایہ الطالب میں سبطین حوزی تذکرہ میں سب نے یہی معنی نقل کیا ہے، بعض اصحاب کی جگہ اہل بیتؑ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (قال بن عباس، علی سید الصادقین) یعنی ابن عباسؓ نے کہا، علی علیہ السلام سید وسرور صادقین ہیں۔[2]

جابر بن عبداللہ انصاریؓ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا، اس ''آل محمد'' سے مراد اہل بیتؑ مراد ہیں۔ بعض مفسرین نے آیت کو عام سمجھا اور کہا کہ یہ تمام مسلمانوں کو شامل ہے اور ہر زمانے میں اور ہر مکان میں۔[3]

تیسری آیت میں صادقین کی جزا وثواب ذکر ہوا ہے اور صادقین کو منافقین کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے، جو شہادت کا شربت پی چکے اور دوسرا گروہ اس شربت کا جام پینے کے انتظار میں تھے، اس کے بارے میں فرمایا ہے:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾.

(یہ امتحان اس لیے تھا) تاکہ خدا سچّے (ایمانداروں) کو ان کی سچّائی کی جزائے خیر دے

---

[1] احقاق الحق، جلد 3، صفحہ 297.

[2] احقاق الحق، جلد 3، صفحہ 297.

[3] تفسیر نور الثقلین، جلد 2، صفحہ 280.

اور اگر چاہے تو منافقین کی سزا کرے یا (اگر وہ لوگ توبہ کریں تو خدا) ان کی توبہ قبول فرمائے اس میں شک نہیں کہ خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

لہٰذا مادی ومعنوی عظیم ثواب صادقین کے انتظار میں ہے، صادقین گفتگو میں، کردار میں اور عقائد میں۔

چوتھی آیت میں اس گروہوں کو مغفرت اور ثواب عظیم کی بشارت دی گئی ہے کہ ان میں سے چوتھا گروہ صادقین کا ہے، اسلام، ایمان، اطاعت خدا کے بعد صدق وسچائی کا ذکر آیا ہے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے اس اخلاقی فضیلت میں مرد وعورت دونوں برابر ہیں، معروف حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لایَسْتَقِیمُ اِیمانُ عَبْد حَتّی یَسْتَقِیمَ قَلْبُهُ وَ لا یَسْتَقِیمَ قَلْبُهُ حَتّی یَسْتَقِیمَ لِسانُهُ.[1]

ہر شخص کا اس وقت تک ایمان درست نہیں ہوتا جب تک اس کا دل صحیح نہ ہو اور اس کا دل اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو۔

پانچویں آیت میں نا مطلوب حالت منافقین کی بیان ہوئی ہے کہ وہ عمل میں دوغلا پن رکھتا ہے، جہاد سے ڈرتے ہیں، حالانکہ جہاد عزت وآبرو کا باعث ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے:

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۭ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۭ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ.

(ان کے لیے اچھا کام تو) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات ہے۔ پھر جب لڑائی ٹھن جائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچّے رہیں تو ان کے حق میں بہت بہتر ہے۔

اس مطلب سے معلوم ہوا کہ جھوٹا ہونا منافق کی ایک علامت ہے اور میدان جہاد میں جانے سے پہلے صرف وعدے کرتا پھرتا ہے لیکن عمل کے وقت اس کی عدم صداقت اور جھوٹ ظاہر ہوجاتا ہے، درحقیقت جھوٹا نفاق کا ایک دروازہ ہے۔

چھٹی آیت میں یہ اعلان ہوتا ہے کہ خدا کے امتحان قطعی ہوتے ہیں اور سب کو شامل ہیں، خداوند عالم فرماتا ہے:

---

[1] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 193.

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ.

اور ہم نے تو ان لوگوں کا بھی امتحان لیا جو ان سے پہلے گزر گئے۔غرض خدا ان لوگوں کو جو سچّے (دل سے ایمان لائے) ہیں یقیناً علیحدہ دیکھے گا اور جھوٹوں کو بھی (علیحدہ) ضرور دیکھے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں اصحاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت امتحان کا سامنا ہوا جن میں سے ایک امتحان ہجرت تھا، ہجرت یعنی اپنے گھر خالی چھوڑ کر چلے جانا، اپنے وطن کی محبت سے چشم پوشی کرنا، ایسی جگہ پر آباد ہونا، کہ سارا کام صفر سے دوبارہ شروع کرنا، اگر جس کی اولاد ہجرت میں اس کا ساتھ نہ دے تو یہ اور مشکل ہوتا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے کہ یہ امتحان ہجرت یا جہاد صرف تمہیں پیش نہیں آئے بلکہ تم سے پہلے اقوام کو بھی امتحان کا سامنا کرنا پڑا تھا، یہاں پر درحقیقت صدق و ایمان کی نشانی اور کذب نفاق و کفر کی نشانی بیان ہوئی ہے۔

البتہ یہاں پر صدق و کذب عملی مراد ہے نہ صرف زبانی، صدق بیان حقیقت ہے اور کذب اس کے برعکس ہے، خداوند عالم نے صفت اصلی، رہبر صداقت بیان فرمائی اور پھر سب کو دعوت دی کہ سب صادق ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے انبیاءؑ کی باقی صفات صدق کے محور پر ہیں۔

صدق روایات کی روشنی میں

اس موضوع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور باقی ائمہ علیہم السلام سے بے شمار روایات بیان ہوئی ہیں ہم ان میں سے بعض ذکر کرتے ہیں:

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لاتَنْظُرُوا اِلی کَثْرَةِ صَلاتِهِمْ وَ صِيامِهِمْ وَ کَثْرَةِ الْحَجِّ وَ الزَّکاةِ وَ کَثْرَةِ الْمَعْرُوفِ وَطَنْطَنَتِهِمْ بِاللَّيلِ، اُنْظُرُوا اِلی صِدْقِ الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الْاَمانَةِ.[1]

لوگوں کی کثرت نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ، نیکیوں کی کثرت اور راتوں کے جاگنے کی طرف

---

[1] بحارالانوار، جلد 68، صفحہ 9، حدیث 13.

نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ وہ اپنی گفتار میں کتنے سچے ہیں اور امانتیں ادا کرنے کے کیسے پابند ہیں۔

(۲) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يَبْعَثْ نَبِيّاً اِلّا بِصِدْقِ الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الْاَمانَةِ اِلَى الْبَرِّ وَ الْفاجِرِ.[۱]

خداوند عالم نے کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر صدق الحدیث اور اداء امانت کے ساتھ۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ صَدَقَ لِسانُهُ زَكى عَمَلُهُ.[۲]

جس کی زبان پر صدق ہے اس کے اعمال پاکیزہ ہیں، کیونکہ صدق وسچائی اعمال صالح کا ریشہ ہے۔

(۴) آپؑ ہی نے ایک اپنے صحابی عبداللہ بن ابن یعفور سے فرمایا:

اُنْظُرْ ما بَلَغَ بِهِ عَلِيٌّ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ (صلى الله عليه وآله) فَالْزَمْهُ.

فَاِنَّ عَلِيّاً (عليه السلام) اِنَّما بَلَغَ ما بَلَغَ بِهِ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ بِصِدْقِ الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الْاَمانَةِ.[۳]

دیکھو علی علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کتنا مقام حاصل کر لیا،

پھر فرمایا،: امام علی علیہ السلام کو یہ مقام اس لئے حاصل ہوا کہ وہ راست گو یعنی سچے اور امانت دار تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جیسی شخصیت نے بھی ان دو صفات کے ذریعے مقام حاصل کیا۔

(۵) کسی نے حضرت علی علیہ السلام سے مقام وشخصیت انسان کے بارے میں سوال کیا؟

اَیُّ النّاسِ اَکْرَمُ؟

کون زیادہ باعظمت ہے؟

---

[۱] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 104، حدیث 1.

[۲] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 104، حدیث ۳.

[۳] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 104، حدیث 5.

آپؑ نے فرمایا:

مَنْ صَدَقَ فِي الْمَواطِنِ.

جو شخص ہر وقت سچ بولتا ہو۔[1]

اس بات کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے اگر ہم تھوڑا سا بھی قرآن میں غور وفکر کریں: قرآن میں خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقیکُمْ.[2]

اللہ کے نزدیک باکرامت صاحبان تقویٰ ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ سچائی وہی تقویٰ ہے۔

(۶) حضرت علی علیہ السلام صدق سے نجات کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلْزَمُوا الصِّدْقَ فَإِنَّهُ مَنْجَاة.[3]

صدق کا دامن نہ چھوڑنا کیونکہ یہ انسان کی نجات کا سبب ہے۔

صدق کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلصِّدْقُ نُورٌ غَيرَ مُتَشَعْشِعٍ اِلّا فِي عالَمِهِ كَالشَّمْسِ يَسْتَضِيءُ بِها كُلُّ شَيء يَغْشاهُ مِنْ غَيرِ نُقْصان يَقَعُ عَلى مَعْناها.[4]

صدق ایک ایسا نور ہے کہ اپنے اطراف کو روشن کرتا ہے۔جس طرح سے سورج کی روشنی ہوتی ہے اور تمام چیزوں پر چمکتی ہے اور کسی کو نقصان نہیں ہوتا۔

آپؑ ہی سے ایک روایت منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

---

[1] بحارالانوار، جلد 67، صفحہ 9، حدیث 12.

[2] سورہ حجرات، آیت ۱۳

[3] تحف العقول/ النص/ 104 / آدابه علیہ السلام لأصحابه و هی أربعمائة باب للدین و الدنیا .....ص: 100

[4] بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 68 / 10 / باب 60 الصدق و المواضع التی یجوز ترکه فیها و لزوم أداء الأمانة .....ص: 1

اَلصِّدْقُ سَيْفُ اللهِ فِي اَرْضِهِ وَ سَمائِهِ اَيْنَما هَوى بِهِ يُقَدُّهُ.[1]

سچائی زمین و آسمان پر اللہ کی تلوار ہے جو بھی اسے استعمال کرے کامیاب ہوگا۔

(۷) حضرت علی علیہ السلام صدق کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلصِّدْقُ رَأْسُ الدِّيْنِ.[2]

سچائی دین کی اساس ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

الصِّدْقُ صَلَاحُ كُلِّ شَيْءٍ.[3]

صدق ہر چیز کی اصلاح کرسبب ہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

الصِّدْقُ أَقْوَى دَعَائِمِ الْإِيمَان.[4]

صدق ایمان کا قوی ترین ستون ہے۔

دوسرے لفظوں میں فرمایا:

الصِّدْقُ جَمَالُ الْإِنْسَانِ وَ دَعَامَةُ الْإِيمَان.[5]

صدق انسان کا حسن اور ایمان کا قوی ترین ستون ہے۔

آپ ہی سے مروی ہے:

اَلصِّدْقُ اَشْرَفُ خَلائِقِ الْمُوْقِنِ.[6]

صدق شریف ترین افراد کا اخلاق ہے۔

---

[1] مصباح الشریعۃ/ 35 / الباب الخامس عشر فی الصدق

[2] عیون الحکم والمواعظ (للیثی) / 25 / الفصل الأول مما أوله الألف و اللام.....ص:17

[3] عیون الحکم والمواعظ (للیثی) / 44 / الفصل الأول مما أوله الألف و اللام.....ص:17

[4] تصنیف غرر الحکم و درر الکلم / 218 / الصدق والدین.....ص:218

[5] غرر الحکم و درر الکلم / 121 / 2142.....ص:121

[6] عیون الحکم والمواعظ (للیثی) / 46 / الفصل الأول مما أوله الألف و اللام.....ص:17

(۸) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت و دوزخ کی کلید کے بارے میں فرماتے ہیں:

اِنَّ رَجُلا جاءَ اِلَی النَّبِی فَقالَ یارَسُولَ اللهِ ما عَمَلُ الْجَنَّةِ؟

قالَ ﷺ الصِّدْقُ اِذا صَدَقَ الْعَبْدُ بَرَّ، وَاِذا بَرَّ آمَنَ، وَاِذا آمَنَ دَخَلَ الْجَنَّةَ.

قالَ: یارَسُولَ اللهِ ﷺ وَ ما عَمَلُ النّارِ؟

قالَ ﷺ اَلْکِذْبُ، اِذا کَذِبَ الْعَبْدُ فَجَرَ وَ اِذا فَجَرَ کَفَرَ، وَ اِذا کَفَرَ دَخَلَ النّارَ.[1]

کسی نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، وہ عمل بتائیں جس سے انسان کو جنت ملتی ہے،

آپؐ نے فرمایا: سچائی، کیونکہ جب انسان سچ بولتا ہے تو وہ نیکی کرتا ہے اور جب نیکی کرتا ہے تو ایمان لاتا ہے اور جب ایمان لاتا ہے تو جنت میں جاتا ہے۔

لوگوں نے عرض کیا: اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سا عمل دوزخ میں لے جاتا ہے،

آپؐ نے فرمایا: جھوٹ بولنا جب وہ جھوٹ بولتا ہے تو بدی کرتا ہے اور جب بدی کرتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے، اور جب کافر ہوتا ہے تو دوزخ میں جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سچائی وصداقت نیکی کا سرچشمہ ہے اور نیکی کا سرچشمہ ایمان ہے، بدکردار لوگ اپنے گناہ کے عُذر پیش کرنے کی خاطر جھوٹ بولتا ہے اور آہستہ آہستہ ایسے شخص کا ایمان ضعیف ہو جاتا ہے اور کافر ہو جاتا ہے جس طرح خداوند عالم فرماتا ہے:

ثُمَّ کَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللهِ وَکَانُوْا بِهَا یَسْتَهْزِءُوْنَ.[2]

پھر جن لوگوں نے برائی کی تھی ان کا انجام بُرا ہی ہوا۔ کیونکہ ان لوگوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا تھا اور ان کے ساتھ مسخرا پن کیا۔

(۹) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] میزان الحکمۃ، جلد 3، صفحہ 2674.

[2] الروم:10

اِذا اَحَبَّ اللهُ عَبْداً اَلْهَمَهُ الصِّدْقُ.[1]

جب خدا کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کے دل میں صداقت وسچائی ڈال دیتا ہے۔

(۱۰) ایک اور حدیث میں مولا امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَرْبَعٌ مَنْ اُعْطِیَهُنَّ فَقَدْ اُعْطِیَ خَیْرُ الدُّنْیا وَ الْاٰخِرَةِ،صِدْقُ حَدِیث وَ اَداءُ اَمانَة وَ عِفَّةِ بَطْن وَ حُسْنِ خُلْق.[2]

چار چیزیں ایسی کہ جس کو مل جائیں اس کو دنیا وآخرت کی خیر و برکت مل جاتی ہے:

(۱) سچائی (۲) امانت کی ادائیگی

(۳) شکم کی نگہداری حرام سے (۴) حسن اخلاق۔

مجموعہ احادیث سے مندرجہ ذیل نکات ذکر ہوئے ہیں:

لوگوں کے امتحان کا ایک طریقہ یہ ہے کہ با ایمان افراد کا امتحان سچائی سے ہے،

سچائی کی طرف دعوت تمام انبیاءؑ کا دستور تھا،

صداقت وسچائی عمل کی پاکیزگی کا سبب ہے،

صادق افراد کا رتبہ خدا کے پاس بلند ہے،

سب سے زیادہ گرامی افراد سچے افراد ہیں،

صداقت وسچائی دین کا محکم ترین ستون ہے،

صداقت آخرت میں نجات کا سبب ہے،

صداقت وسچائی جنت کی کنجی ہے،

صداقت وسچائی خدا کے ہاں محبوب ہے،

جو انسان سچا ہے اسے دنیا وآخرت کی خیر و برکت نصیب ہوتی ہے۔

---

[1] شرح غرر آمدی، جلد 3، صفحہ 161.

[2] شرح غرر آمدی، جلد 3، صفحہ ۱۵۱.

زندگی میں صداقت کی تاثیر

انسان کی زندگی میں صداقت وسچائی کی تاثیر کسی پر مخفی نہیں ہے سب سے پہلی تاثیر یہ ہے کہ انسان میں اعتماد پیدا ہوتا ہے، اجتماعی زندگی میں اس کی بڑی تاثیر ہے کیونکہ اکثر لوگوں کی زندگی اجتماعی صورت میں ہے اور اجتماعی زندگی اس وقت کامیاب ہے جب لوگوں میں ایک دوسرے پر اعتماد ہو اور اعتماد اس وقت حاصل ہوتا، جب صداقت و امانت حاکم ہو۔

ان کا خطرناک ترین دشمن جھوٹ ہے۔ایک سیاستدان جب بار بار جھوٹ بولتا ہے تو وہ لوگوں کی نظر میں گر جاتا ہے۔

اگر ایک دانشمند اپنی تحقیق میں جھوٹ بولتا ہے تو اس پر کوئی اعتماد نہیں کرتا،

ایک اقتصادی ادارہ اگر جھوٹ بول کر غلط اشتہار دیتا ہے تو اس کی قدر بھی آہستہ آہستہ کم ہو جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلصِّدْقُ صَلاحُ کُلِّ شَیءٍ اَلکِذْبُ فَسادُ کُلِّ شَیءٍ.[1]

ہر چیز کی اصلاح کا سبب صداقت ہے اور تمام فساد کا سبب جھوٹ ہے۔

(۱) حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

اَلْکَذّابُ وَ الْمَیِّتُ سَواءٌ فَاِنَّ فَضِیلَةَ الْحَیِّ عَلَی الْمَیِّتِ اَلثِّقَةُ بِهِ. فَاِذا لَمْ یُوثَقْ بِکَلامِهِ فَقَدْ بَطَلَتْ حَیاتُهُ.[2]

جھوٹا شخص اور مردہ یکساں ہیں کیونکہ زندہ انسان کو مردے پر برتری ، اعتماد تھا، اور اگر اُس نے اعتماد نہ ہو تو اس کا زندہ ہونا بے فائدہ ہے

(۲) دوسرا یہ کہ صداقت اور سچائی انسان کو باشخصیت بناتا ہے حالانکہ جھوٹ انسان کو رسوا کرتا ہے صادق شخص

---

[1] شرح غرر آمدی، جلد 1، صفحہ 281.

[2] شرح غرر آمدی، جلد 2، صفحہ 139.

ہمیشہ سر بلند ہوتا ہے لیکن جھوٹا آدمی سرنگوں اور بے عزت ہوتا ہے۔حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

عَلَيْكَ بِالصِّدْقِ، فَمَنْ صَدَقَ فِي أَقْوالِهِ جَلَّ قَدْرُهُ.[1]

ہمیشہ صداقت وسچائی سے کام لو کیونکہ جو شخص اپنے کلام میں سچا ہے، معاشرے میں اس کا مقام بلند ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ صداقت وامانت سے انسان شجاع ہوتا ہے لیکن جھوٹا انسان ڈرپوک اور خوف زدہ ہوتا ہے۔

(۴) چوتھا یہ کہ صداقت انسان کو بہت سے گناہوں سے نجات دیتی ہے کیونکہ جانتا ہے کہ اگر کوئی خلاف کام کیا تو سوال کیا جائے گا اور پھر انسان گناہ کا اعتراف نہیں کرسکتا لہٰذا بہتر تھا گناہ نہ کرتا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث ہے کہ

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا، میں چار مخفی گناہوں میں اسیر ہوں:

(۱) زنا (۲) شراب خوری

(۳) چوری (۴) جھوٹ،

اے اللہ کے رسولؐ ان میں ایک کو آپ کی خاطر چھوڑتا ہوں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جھوٹ کو چھوڑ دو،

وہ شخص واپس چلا گیا، جب کسی گناہ کا سوچتا تو اپنے آپ سے کہتا اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گا۔ اگر جھوٹ بولتا ہوں، جھوٹ چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے اور سچ بولتا ہوں تو شرعی حد جاری ہوتی ہے، جب بھی اس کے دل میں شراب خوری یا چوری کا خیال آتا تو وہی فکر کرتا۔ دوبارہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے مجھ پر تمام گناہوں کے راستے بند کردیئے، میں نے سب گناہوں کو ترک کردیا ہے۔[2]

(۵) پانچواں یہ کہ صداقت وسچائی بہت سی مشکلات کا حل ہوتا ہے اور انسان سعادت مند بنتا ہے، معاشرے میں آرام وسکون پیدا ہوتا ہے، عدالتوں میں کیس کم ہو جاتے ہیں، دوستی ومحبت زیادہ ہوتی ہے، انسان باشخصیت اور

---

[1] شرح غرر، جلد 4، صفحہ 296.

[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد 6، صفحہ 357.

بارعب ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَحسَنُ مِنَ الصِّدقِ قائِلُهُ وَ خَيرٌ مِنَ الخَيرِ فاعِلُهُ.[1]

سچائی سے بہتر اس سچائی کا کہنے والا ہے اور نیکی سے بہتر نیکی انجام دینے والا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

يَكتَسِبُ الصّادِقُ بِصِدقِهِ ثَلاثاً. حُسنُ الثِّقَةِ وَ المَحَبَّةُ لَهُ وَالمَهابَةُ مِنهُ.[2]

سچے انسان کو اپنے سچ کی وجہ سے تین چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

(۱) لوگوں میں حسن اعتماد (۲) جذب دوستی ومحبت

(۳) شخصیت ورعب۔

صدق کے نتائج

الف: _____ اعتماد نفس

ب: _____ شجاعت

ج: _____ باکردار ہونا

د: _____ خدا وقیامت پر ایمان

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلإِيمانِ أَنْ تُؤْثِرَ الصِّدْقَ حَيثُ يَضُرُّكَ عَلَى الْكَذِبِ حَيثُ يَنْفَعُكَ.[3]

ایمان یہ ہے کہ جہاں (ظاہراً) سچ نقصان دے اور جھوٹ فائدہ دے وہاں پر بھی سچ ہی بولا جائے۔

---

[1] بحار الانوار، جلد 68، صفحہ 9.

[2] غرر الحکم، جلد 2، صفحہ 876.

[3] نہج البلاغہ، کلمات قصار، شمارہ 458.

مفہوم صدق

بعض نے لکھا ہے کہ صدق یعنی واقع کے ساتھ مطابقت رکھنا اور بعض نے کہا مطابقت باتشخیص کہ کہنے والا کیا کہتا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ.[1]

(اے رسولؐ) جب تمہارے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو اقرار کرتے ہیں کہ آپ یقیناً خدا کے رسولؐ ہیں اور خدا بھی جانتا ہے کہ تم یقینی اس کے رسولؐ ہو۔ مگر خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ یہ لوگ (اپنے اعتقاد کے لحاظ سے) ضرور جھوٹے ہیں۔

واضح ہے منافقین رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے تھے، یہ ان کا کلام واقع کے مطابق تھا، لیکن چونکہ ان کے عقائد کے مطابق نہ تھا تو وہ جھوٹے تھے یعنی وہ اپنا اندرونی عقیدہ ظاہر کرتے تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الصِّدْقُ مُطَابَقَةُ الْمَنْطِقِ لِلْوَضْعِ الْإِلَهِي.

سچ بولنا ایک الٰہی ذمہ داری ہے۔

اَلْكَذِبُ زَوَالُ الْمَنْطِقِ عَنِ الْوَضْعِ الْإِلَهِي.

جھوٹ بولنا الٰہی ذمہ داری سے فرار ہے۔

ظاہراً وضع الٰہی سے مراد جہاں کی خلافت ہے جو خدا کے ارادے سے خلق ہوا ہے، البتہ جس طرح صدق و کذب زبان پر جاری ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کے عمل میں ظاہر ہوتے ہیں۔



[1] سورۂ منافقون: ۱

۸۔جھوٹ اور آثار وانجام

اسلام میں جھوٹ کا مقابلہ کرنے کی بڑی تاکید کی گئی ہے جھوٹے افراد کو کافر اور منکر خدا شمار کیا گیا ہے جھوٹ تمام گناہوں کی کلید ہے انسان جب تک جھوٹ نہیں چھوڑتا وہ ایمان کا ذائقہ نہیں چکھتا، اب ہم اس موضوع پر آیات قرآنی کو ذکر کرتے ہیں، توجہ فرمائیں:

① ۔ اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ.[1]

جھوٹ بہتان تو بس وہی لوگ باندھا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور (حقیقت امر یہ ہے کہ) یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

② ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ.[2]

بے شک خدا جھوٹے ناشکرے کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔

---

[1] نحل::105

[2] زمر:3

③۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ۔ [1]

بے شک خدا اس شخص کی ہدایت نہیں کرتا جو حد سے گزرنے والا (اور) جھوٹا ہے۔

④۔ فَاَعْقَبَھُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَہٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوْہُ وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ۔ [2]

پھر اس کے خمیازہ میں اپنی ملاقات کے دن (قیامت) تک ان کے دلوں میں (گویا خود) نفاق ڈال دیا اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے جو خدا سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس وجہ سے کہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

⑤۔ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ۔ [3]

ان کے دلوں میں مرض تھا ہی اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا اور چونکہ وہ لوگ جھوٹ بولا کرتے تھے اس لیے ان پر تکلیف دِہ عذاب ہے

⑥۔ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ۔ [4]

(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ بے شک جو لوگ جھوٹ موٹ خدا پر بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

⑦۔ ... ثُمَّ نَبْتَھِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ۔ [5]

اس کے بعد ہم سب مل کر (خدا کی بارگاہ میں) گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔

---

[1] غافر::28

[2] توبہ:77

[3] بقرہ:10

[4] یونس:69

[5] آل عمران:61

تفسیر وخلاصہ

پہلی آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ.

جھوٹ بہتان تو بس وہی لوگ باندھا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور (حقیقت امر یہ ہے کہ) یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

یہ آیت اس وقت ظاہر ہوئی کہ جب دشمن اسلام مشرکین نے یہ دیکھا بعض آیات نسخ ہوگئی ہے، لہٰذا احکام الٰہی کے بجائے اپنے پاس سے احکام جاری کرتے اور بہانہ کرتے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جھوٹ بولتے ہیں یا یہ کہتے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دو عیسائی غلام (یسا اور جبر) سے علم سیکھتے ہیں اور کبھی کہتے کہ (بلعم) نامی نصرانی آپؐ کا استاد ہے حالانکہ قرآن مجید فصیح عربی زبان میں ہے وہ عجمی تھے، خدا ان کے سب جواب میں کہتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی نازل ہونے والی آیت بیان فرماتے ہیں، اور صدق وسچائی ان سے ظاہر ہے وہ صادق امین کے لقب سے مشہور تھے، جو جھوٹ بولتے ہیں وہ خدا پر ایمان نہیں رکھتے یعنی ایمان جھوٹ کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا، حقیقی مومن کی زبان سے صدق کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا، جملہ (يَفْتَرِى الْكَذِبَ) درحقیقت تاکید ہے، ان کے جھوٹ پر، کہ ہم جھوت بولتے ہیں اور ہم تہمت لگاتے ہیں۔

طبرسی کے قول کے مطابق بمعنی (يَخْتَرِعُ الْكَذِبَ) یعنی اپنے پاس سے جھوٹ بناتے تھے۔

جھوٹ اور تہمت میں عموم خصوصی من مطلق کی نسبت ہے، ہر وہ بات جو واقع کے خلاف ہو جھوٹ ہوتا ہے لیکن وہ عیب ہے جو کسی میں نہ پایا جائے، یہ بھی احتمال ہے کہ (یختری الکذب) سے مراد کفر وشرک کے علمبردار ہوں کہ جو کہ ہمیشہ جھوٹ بولنے والے ہیں اور جھوٹ جیسے شاعر، جادوگر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہنا، دوسرے لوگ اس کی پیروی کرتے تھے، بہرحال آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ایمان جھوٹ سے سازگار نہیں ہے،

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا مومن آبروریزی کرسکتا ہے؟

آپؐ نے فرمایا، ہوسکتا ہے،

پھر سوال ہوا، کیا مومن چوری کرسکتا ہے،

آپؑ نے فرمایا، ممکن ہے،

پھر پوچھا کیا ممکن ہے کہ مومن جھوٹ بولے؟

آپؑ نے فرمایا، نہیں۔

پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ.

بے شک خدا جھوٹے ناشکرے کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔

دوسری آیت میں خدا فرماتا ہے:

اِنَّمَا يَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ.

جھوٹ بہتان تو بس وہی لوگ باندھا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور (حقیقت امر یہ ہے کہ) یہی لوگ جھوٹے ہیں۔

ہم جانتے ہیں ہدایت و گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے، حتیٰ اگر رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو ہدایت کرنا چاہیں تو جب تک خدا کا ارادہ نہ ہو وہ ہدایت نہیں کر سکتے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ.[1]

(اے رسولؐ) بے شک تم جسے چاہو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ مگر ہاں خدا جسے چاہے منزلِ مقصود تک پہنچائے اور وہی ہدایت یافتہ لوگوں سے خوب واقف ہے۔

لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ خدا مجبوراً کسی کو ہدایت اور کسی کو گمراہ کرتا ہے، ایک گروہ کو نعمتیں عطا کرنا اور دوسرے کو دوزخ کی آگ میں ڈالنا عقل و منطق سے سازگار نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب لوگ ہدایت یا گمراہی کے لئے فرامین ہموار کرتے ہیں، خدا ہر ایک اس کی لیاقت کے مطابق ثواب دیتا ہے جو گروہ ہدایت کے لئے زمین ہموار کرتا ہے خدا اسے منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اور جو گروہ ضلالت و گمراہی کے لئے زمین ہموار کرتا ہے خدا اسے سرگردان کرتا ہے تاکہ وہ سعادت مند نہ ہو سکے۔

---

[1] قصص، آیہ 56.

مہم ترین وہ اُمور جو گمراہی کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں:

(۱) جھوٹ (۲) اسراف اور

(۳) کفران نعمت ہیں۔

چوتھی آیت میں منافقین کا ذکر ہوا ہے جن کا ایمان اور عمل صالح میں دکھاوا یا اور ریاکاری تھی، ثعلبہ بن حاطب انصاری نے خدا سے عہد کیا اگر خدا نے اسے زیادہ رزق دیا تو وہ غریبوں کی مدد کرے گا لیکن یہ اس کا جھوٹ تھا، لہٰذا خداوند عالم فرماتا ہے:

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ

پھر اس کے خمیازہ میں اپنی ملاقات کے دن (قیامت) تک ان کے دلوں میں (گویا خود) نفاق ڈال دیا

پھر فرمایا:

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ.

اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے جو خدا سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس وجہ سے کہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

خدا سے وعدہ خلافی ایک قسم کی عملی جھوٹ ہے، وعدہ خلافی اور جھوٹ میں فرق واضح ہے کیونکہ نفاق ظاہر و باطن دوغلا پن ہے وعدہ خلافی کرنے والے بھی ظاہری طور پر اپنے آپ کو پابند نہ ہونے کا ظاہر کرتے ہیں حالانکہ باطن میں ایسا نہیں ہوتا۔

آج بھی ثعلبہ بن حاطب کی مانند افراد موجود ہیں کہ مشکلات کے وقت خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں، نذر مانتے ہیں لیکن مشکلات ختم ہو جاتی ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں پانچویں آیت میں منافقین کی بُری صفات ذکر ہوئی ہیں، خداوند عالم فرماتا ہے

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ.

ان کے دلوں میں مرض تھا ہی اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا اور چونکہ وہ لوگ جھوٹ بولا کرتے تھے اس لیے ان پر تکلیف دِہ عذاب ہے

یہاں پر بیماری سے مراد نفاق کی بیماری ہے، یہ ایک اخلاقی بیماری شمار ہوتی ہے

چھٹی آیت معین خدا پر جھوٹ باندھنے کے بارے میں ہے خدا فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ.

(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ بے شک جو لوگ جھوٹ موٹ خدا پر بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

اصولاً جھوٹ سچائی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا خصوصاً یہ جھوٹ اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ہو، خدا پر جھوٹ سے مراد یہ ہے کہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے، ہم عام انسان کو فطری طور پر مدد کے لئے اور بقائے نسل کے لئے اولاد کی ضرروت ہوتی ہے، لیکن ان چیزوں سے منزہ و پاک ہے خدا ان چیزوں سے بے نیاز ہے وہ ازل اور ابد سے ہے۔

قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں مشرکین کے اعمال جھوٹ اور تہمت دونوں کو شمار کیا گیا ہے یہ اس لئے ہے کہ جھوٹ کا مفہوم وسیع معنی رکھتا ہے، اس قسم کا مضمون آیت سورہ نحل کی آیت ۱۱۶، میں بھی آیا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ.

اور جھوٹ موٹ جو کچھ تمہاری زبان پر آئے (بے سمجھے بوجھے) نہ کہہ بیٹھا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تا کہ اس کی بدولت خدا پر جھوٹ بہتان باندھنے لگو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

ساتویں اور آخری آیت مباہلہ کے بارے میں معروف ہے جھوٹ کی ایک قسم ہے یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ باندھنا کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، خداوند عالم فرماتا ہے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ.

پھر جب تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (نصرانی عیسیٰ

کے بارے میں) حجّت کرے تو کہو کہ (اچھا میدان میں) آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنی جانوں کو بلائیں اور تم اپنی جانوں کو اس کے بعد ہم سب مل کر (خدا کی بارگاہ میں) گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔

مباہلہ دراصل "بہل" کے مادہ سے سہل کے وزن پر ہے یعنی چھوڑنا مذہبی تفسیر میں مباہلہ سے مراد یہ ہے کہ دوگروہوں کا آمنے سامنے آنا اور ہر ایک دوسرے پر نفرین کرلے، جس کی نفرین موثر واقع ہو وہ حق پر شمار ہوتا ہے، جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نجران کے عیسائیوں کے درمیان مباہلہ ہوا، جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام وحسین علیہ السلام کو ساتھ لیا تھا، جب عیسائیوں نے ان ہستیوں کو دیکھا تو واپس ہو گئے،

مذکورہ آیات سے معلوم ہوا کہ جھوٹ اور اس کے آثار کتنے خطرناک ہیں۔

جھوٹ روایات کی روشنی میں

(۱) بعض روایات میں ملتا ہے کہ جھوٹ گناہوں کی کلید ہے امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ جَعَلَ لِلشَّرِّ أَقْفَالًا وَ جَعَلَ مَفَاتِيحَ تِلْكَ الْأَقْفَالِ الشَّرَابَ وَ الْكَذِبُ شَرٌّ مِنَ الشَّرَابِ.[1]

خداوندعالم نے شر کے لئے تالے قرار دیئے ہیں اور ان کی کلید شراب ہے۔

(۲) امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا:

جُعِلَتِ الْخَبَائِثُ فِي بَيْتٍ وَ جُعِلَ مِفْتَاحُهُ الْكَذِبُ.[2]

تمام خبیث اشیاء کو ایک کمرے میں قرار دیا گیا اور اس کمرے کی چابی جھوٹ ہے،

اس کی دلیل یہ ہے جب گناہ گار انسان رسوا ہوتا ہے تو وہ جھوٹ کے ذریعے اپنے گناہوں کو چھپاتا ہے۔

---

[1] الکافی (ط - الاسلامیۃ) / ج 2 / 339 / باب الکذب .....ص: 338

[2] بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 69 / 263 / باب 114 الکذب وروایۃً وسماعہ .....ص: 232

ایک مشہور حدیث ہے کہ

ایک شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، جو مختلف گناہ کرتا تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے صرف یہ وعدہ کیا کہ جھوٹ نہ بولنا اس نے جھوٹ چھوڑ دیا تو باقی گناہ بھی چھوٹ گئے۔ [1]

(۳) احادیث سے استفادہ ہوتا ہے، جھوٹ ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے، ایک حدیث میں ہے:

سُئِلَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَكُونُ الْمُؤمِنُ جَباناً؟

قالَ: نَعَمْ؛

قيلَ وَيَكُونُ بَخِيلا؟

قالَ: نَعَمْ.

قِيلَ يَكُونُ كَذَّاباً

قالَ: لا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا، کیا ممکن ہے مومن انسان ڈرپوک ہو؟

آپؐ نے فرمایا، ہاں

پھر آپؐ سے پوچھا گیا، کیا ممکن ہے مومن بخیل ہو؟

آپؐ نے فرمایا، ہاں

پھر آپؐ سے پوچھا گیا: کیا ممکن ہے کہ مومن جھوٹا ہو،

آپؐ نے فرمایا: نہیں۔

اس مضمون والی روایت حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے،

لَا يَجِدُ عَبْدٌ طَعْمَ الْإِيمَانِ، حَتَّى يَتْرُكَ الْكَذِبَ، هَزْلَهُ وَجِدَّهُ. [2]

کوئی انسان ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا جب تک وہ جھوٹ کو ترک نہ کرے، خواہ مذاق میں ہو یا عام گفتگو میں ہو۔

جھوٹ ایمان کے ساتھ کیوں سازگار نہیں؟ کیونکہ جب فضل خدا ہوتا ہے تو سب کچھ جانتا ہے لیکن جب کوئی

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد 6، صفحہ 357.

[2] الفصول المہمۃ فی اصول الائمۃ (تکملۃ الوسائل) / ج 3 / 364 / باب 90 - تحریم کل کذب الا ما استثنی .....ص: 363

مشکل پیش آئے تو پھر وعدہ و نذر ماننا شروع کر دیتا ہے۔

(۴) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَشَرُّ الْقَولِ اَلْکِذْبُ.[۱]

بدترین بات، جھوٹ ہے۔

کیونکہ اس کے خطرناک آثار ہر بری بات کے آثار سے بدتر ہیں۔

(۵) حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَعْظَمُ الْخِطایا عِنْدَاللهِ اَلْلِسانُ الْکَذُوبِ وَ شَرُّ النَّدامَةِ نَدامَةُ یَوْمِ الْقِیامَةِ.[۲]

خدا کے نزدیک بدترین گناہ جھوٹ ہے اور روز قیامت بدترین پشیمانی ہے۔

(۶) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِیّاکُمْ وَ الْکِذْبَ فَاِنَّ الْکِذْبَ یَهْدی اِلَی الْفُجُورِ وَ اِنَّ الْفُجُورَ یَهْدِی اِلَی النّارِ.[۳]

جھوٹ سے پرہیز کرو کیونکہ جھوٹ فجور کو دعوت دیتا ہے اور فجور دوزخ کی آگ میں جاتا ہے۔

(۷) جھوٹ عقل سے بھی سازگار نہیں ہے، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْعاقِلَ لایَکْذِبُ وَاِنْ کانَ فِیهِ هَواهُ.[۴]

عاقل انسان جھوٹ نہیں بولتا اگرچہ اس کی طرف میلان بھی رکھتا ہو۔

(۸) جھوٹ سے خدا کی رحمت کے فرشتے انسان سے دور ہو جاتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذا کَذِبَ الْعَبْدُ کِذْبَةً تَباعَدَ الْمَلَکُ مِنْهُ مَسیرَةَ میل مِنْ نَتْنِ

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ 84.

[۲] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 243،

[۳] کنز العمال، حدیث 8219.

[۴] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 305.

ماجاءَ بِهِ.[1]

جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے منہ سے آنے والی بدبو کی خاطر ایک میل دور ہو جاتا ہے۔

(۹) جھوٹ نفاق کا دروازہ ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

اِنَّ الْکِذْبَ بابٌ مِنْ اَبْوابِ النِّفاقِ.[2]

جھوٹ نفاق کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔

(۱۰) جھوٹ سے لوگوں میں اعتماد نہیں رہتا، حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ عُرِفَ بِالْکِذْبِ قَلَّتِ الثِّقَةُ بِهِ.[3]

جو شخص جھوٹا ہوتا ہے لوگ اس پر اعتماد کرنا کم کر دیتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں آپؑ ہی نے فرمایا:

مَنْ تَجَنَّبَ الْکِذْبَ صُدِّقَتْ أَقْوالُهُ.[4]

جو شخص جھوٹ سے پرہیز کرتا ہے لوگ اس کی بات کو قبول کرتے ہیں۔

(۱۱) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اِیّاکَ وَ مَصادَقَةَ الْکَذَّابِ فَاِنَّهُ کَالسَّرَابِ یُقَرِّبُ عَلَیْکَ الْبَعِیدَ وَ یُبَعِّدُ عَلَیْکَ الْقَرِیبَ.[5]

جھوٹے شخص سے دوستی کرنے سے بچو کیونکہ اس کی دوستی سراب کی مانند ہے تجھے دور کو نزدیک دکھاتا ہے اور نزدیک کو دور دکھاتا ہے۔

باقی نکات کو خلاصہ کے طور پر تحریر کرتے ہیں۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابی ابی الحدید، جلد 6، صفحہ 357.

[2] کنز العمال، حدیث 8212.

[3] شرح غرر، جلد 5، صفحہ 390.

[4] شرح غرر، جلد 5، صفحہ ۴۶۱.

[5] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ 38.

جھوٹ کے آثار

سب سے پہلا خطرناک اثر یہ ہے کہ جھوٹ سے رسوائی ہوتی ہے معاشرے میں انسان لوگوں کی نگاہوں میں گر جاتا ہے، یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ جھوٹے کا حافظہ نہیں ہوتا، تجربات سے ثابت ہے جھوٹی بات کافی مدت تک مخفی نہیں رکھی جاسکتی، فارسی میں کہتے ہیں (دورغ گو حافظہ ندارد) جیسے حضرت یوسفؑ کی داستان کہ جب اس کے بھائیوں نے اسے کنویں میں ڈالا اور کہا، اسے بھیڑیا کھا گیا ہے، اور خون آلودہ قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس لائے حالانکہ یہ بھول گئے کہ بھیڑیا اگر مارتا تو قمیص پھٹی ہوئی ہوتی اس طرح یوسف علیہ السلام اور زُلیخا کا واقعہ، زُلیخا نے کہا یوسفؑ میرے پیچھے بھاگا، اس صورت میں وہ فراموش کر گئی کہ یوسفؑ کی قمیص تو پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے، کیونکہ وہ یوسف علیہ السلام کے پیچھے دوڑی تھی۔

آج بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں کہ جو جھوٹ بول جاتے ہیں اور جب انھیں بعد میں یاد دلائیں تو شرمندہ ہوتے ہیں۔

آثار میں دوسرا اثر یہ ہے جھوٹا آدمی ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے کئی اور جھوٹ بولتا ہے، کیونکہ وہ اپنے گناہوں کو مخفی کرنا چاہتا ہے۔

جھوٹ کے آثار میں تیسرا یہ ہے دکھاوے کا کام کرتا ہے۔

اس طرح چوتھا یہ ہے کہ انسان آہستہ آہستہ منافق کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے کیونکہ جھوٹ نفاق کا ایک دروازہ ہے جھوٹا آدمی اپنے آپ کو سچا بناتا ہے لیکن دل میں جھوٹا ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْکِذْبُ یُؤَدِّی اِلَی النِّفَاقِ.[1]

جھوٹ انسان کو نفاق کی طرف کھینچ لاتا ہے۔

پانچواں اثر یہ ہے کہ جھوٹا آدمی اجتماعی زندگی میں لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے، اس کے ہر کام پر لوگ

---

[1] شرح غرر الحکم، جلد 1، صفحہ 310.

شک کرنے لگ جاتے ہیں، اسی وجہ سے بعض روایات میں جھوٹے کو مردے کے یکساں شمار کیا گیا ہے،

روایت میں ہے:

اَلْکَذّابُ وَ الْمَیّتُ سَواءٌ فَاِنَّ فَضیلَةَ الْحَیِّ عَلَی الْمَیّتِ اَلثِّقَةُ بِهِ، فَاِذا لَمْ یُوْثَقْ بِکَلامِهِ بَطَلَتْ حَیاتُهُ.[1]

جھوٹا شخص مثل مردے کے ہے زندہ کو مردے پر اگر کوئی فضیلت ہے تو وہ اعتماد کی ہے اگر کسی شخص کی باتوں پر اعتماد نہ رہے تو اس کی زندگی موت سے بدتر ہے۔

چھٹا اثر یہ ہے کہ جھوٹا آدمی حسد، کینہ و بخل کرتا ہے جب کوئی قرض مانگتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔

ساتواں اثر یہ ہے کہ اگر ایک دانشمند اپنے علم و تحقیق میں جھوٹ بولتا ہے تو بعد میں اس تحقیق کا کوئی اعتبار نہیں رہتا، اس کے علاوہ جھوٹ کے اور بھی آثار ہیں جن کو ہم ذکر کرتے ہیں۔

فرشتے انسان سے دور ہو جاتے ہیں امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

اِذا کَذِبَ الْعَبْدُ کِذْبَةً تَباعَدَ الْمَلَکُ مِنْهُ مَسیرَةَ میل مِنْ نَتْنِ ماجاءَ بِهِ.[2]

جب انسان جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس سے ایک میل دور ہو جاتے ہیں کیونکہ جھوٹے آدمی سے بدبو آتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَکْذِبُ الْکِذْبَةَ فَیُحْرَمُ بِها صَلاةَ اللَّیْلِ، فَاِذا حُرِمَ صَلاةَ اللَّیْلِ حُرِمَ بِها الرِّزْقَ.[3]

کبھی انسان جھوٹ بولتا ہے اور نماز شب سے محروم ہو جاتا ہے، اور جب نماز شب سے محروم ہوتا ہے تو روزی سے محروم ہو جاتا ہے۔

---

[1] شرح آقا جمال خوانساری بر غرر الحکم و درر الکلم / ج 2 / 139 / 2104 الکذاب و المیت سواء فان فضیلة الحی علی المیت الثقة به فاذا لم یوثق بکلامه بطلت حیاته.....ص: 139

[2] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد 6، صفحہ 357.

[3] بحار الانوار، جلد 69، صفحہ 260.

احادیث میں ملتا ہے کہ جھوٹے سے عبادات قبول نہیں ہوتی ہیں، جس طرح روزہ داروں کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

فَإِذا صُمْتُمْ فَاحْفَظُوا اَلْسِنَتَكُمْ عَنِ الْكِذْبِ وَ غُضُّوا اَبْصارَكُمْ.[1]

جب انسان روزہ رکھتا ہے تو اسے جھوٹ سے زبان کی حفاظت کرنی چاہیے اور آنکھوں کو گناہ سے دور رکھے،

اس سے معلوم ہوا کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو روزے کی فضیلت کم ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات جھوٹے شخص کے لئے برکات الٰہی قطع ہو جاتی ہیں۔

امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا:

اِذا كَذِبَ الْوُلاةُ حُبِسَ الْمَطَرُ.[2]

جب حاکم اور بادشاہ لوگ جھوٹ بولیں گے تو بارش نہیں برستی۔

اس کے علاوہ معنوی آثار بھی ہیں مثلاً

جھوٹ سے رزق و روزی میں کمی ہوتی ہے

اور فقر و تنگدستی آتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِعْتِيادُ الْكِذْبِ يُورِثُ الْفَقْرَ.[3]

جھوٹ بولنے کی عادت سے غربت و تنگدستی آتی ہے، ایک حدیث میں رسولؐ فرماتے ہیں:

اَلْكِذْبُ يُنَقِّصُ الرِّزْقَ.[4]

اس رزق سے ممکن ہے معنوی اثر ہو۔

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد 7، صفحہ 119، حدیث 13.

[2] مسند الامام الرضا (علیہ السلام)، جلد 1، صفحہ 280.

[3] بحار الانوار، جلد 69، صفحہ 261.

[4] میزان الحکمہ، حدیث 17463.

جھوٹ کے اسباب

جھوٹ کے مختلف اسباب ہیں مہم ترین یہ ہیں:

(۱) ایمان اور عقیدے کا ضعیف ہونا،

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جانِبُوا الْکِذْبَ فَاِنَّ الْکِذْبَ مُجانِبُ الْاِیْمانِ.[۱]

جھوٹ سے کنارہ کشی کرو کیونکہ ایمان اور جھوٹ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

(۲) جھوٹ کا دوسرا سبب ضعف شخصیت اور حقارت ہے،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لایَکْذِبُ الْکاذِبُ اِلّا مِنْ مَهانَةِ نَفْسِهِ عَلَیْهِ.[۲]

جو شخص اپنی شخصیت کو دکھانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے وہ اس کا اپنے لئے ہے۔

(۳) لوگوں سے حسد، بخل، تکبر اور خود پسندی و عداوت کی وجہ سے جھوٹ بولتے ہیں اور تہمت لگاتے ہیں۔

(۴) کسب مقام و شخصیت

بعض افراد معاشرے میں جھوٹ بولتے ہیں۔

(۵) دنیا سے محبت،

نہج البلاغہ خطبہ ۱۴۷، میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّهُ سَیَأْتی عَلَیْکُمْ مِنْ بَعْدِی زَمانٌ لَیْسَ فِیهِ شَیءٌ اَخْفی مِنَ الْحَقِّ وَ لا اَظْهَرَ مِنَ الْباطِلِ وَ لا اَکْثَرَ مِنَ الْکِذْبِ عَلَی اللهِ وَ رَسُولِهِ.[۳]

میرے بعد تم پر ایک زمانہ آئے گا کہ کوئی چیز حق سے پنہاں تر، باطل سے زیادہ آشکارا اور خدا و رسول کی طرف جھوٹ کی نسبت سے زیادہ کوئی چیز نہ ہوگی۔

---

[۱] بحار الانوار، جلد 66، صفحہ 386.

[۲] کنز العمّال، حدیث 8231 (جلد 3، صفحہ 625).

[۳] الکافی (ط - الاسلامیۃ) / ج 8 / 387 / خطبۃ لامیر المؤمنینؑ .....ص: 386

جھوٹ کا علاج

اس بُری صفت کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینکنا، اس کے لئے وہی راہ اختیار کرنی چاہیے جو دوسری بُری صفات کو ختم کرنے کے لئے علاج کے طور پر اختیار کیا گیا ہے، سب سے پہلے اس کی جڑیں دیکھیں گے کہ وہ کہاں ہیں تا کہ جب جڑیں قطع ہو جائیں تو علاج ممکن ہے، اگر توحید افعالی کے بارے میں ایمان ضعیف ہو تو ایمان کو محکم کرنا چاہیے، خدا کو ہر چیز پر قادر سمجھنا چاہیے، رزق و روزی اور عزت و آبرو سب خدا کے ہاتھ میں ہے، ان سب پر اگر عقیدہ ہو تو جھوٹ چھوٹ سکتا ہے۔

اگر اس کا سبب حسد، بخل، تکبر اور غرور ہو تو تدریجاً اس کی جڑ کو قطع کرنے سے انسان میں صداقت آتی ہے اس کے علاوہ جھوٹ کے خطرناک آثار پر توجہ کرنی چاہیے تا کہ درس عبرت حاصل کر سکیں، اگر انسان سوچے کہ اس سے غربت، بدبختی اور دنیا و آخرت میں رسوائی ہوتی ہے تو جھوٹ کی جڑ قطع ہو سکتی ہے، جھوٹ سے بچنے کے لئے اچھے دوستوں سے آنا جانا رکھیں، اور جھوٹے افراد سے دوری اختیار کریں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا تُلَقِّنُوا النَّاسَ فَيَكْذِبُونَ فَإِنَّ بَنِي يَعْقُوبَ لَمْ يَعْلَمُوا إِنَّ الذِّئْبَ يَأْكُلُ الْإِنْسَانَ فَلَمَّا لَقَّنَهُمْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ. قَالُوا أَكَلَهُ الذِّئْبُ. [1]

لوگوں کو جھوٹ بولنے کی تلقین نہ کرو کیونکہ یعقوب کے بیٹے نہیں جانتے تھے کہ بھیڑیا انسان کو کھا جاتا ہے لیکن جب یعقوب نے انھیں کہا، یوسف کی حفاظت کرنا، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ اسے بھیڑیا نہ کھا جائے۔

یہ سن کر انھوں نے یاد کر لیا کہ بھیڑیا انسان کو کھاتا ہے، لہٰذا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے حالانکہ وہ کنویں میں تھے۔

جب کوئی آدمی بلند شخصیت بنتا ہے تو وہ جھوٹ بولنا چھوڑ دیتا ہے اگر جھوٹے افراد کو معلوم ہو کہ سچے آدمی انبیاءؑ

---

[1] کنز العمال، جلد 3، صفحہ 624، حدیث 8228.

اور شہدا کی صف میں ہوتے ہیں تو وہ جھوٹ بولنا ش چھوڑ دیتے ہیں۔

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا.[1]

اور جس شخص نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی تو ایسے لوگ ان (مقبول) بندوں کے ساتھ ہوں گے۔ جنہیں خدا نے اپنی نعمتیں دی ہیں یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا:

اِتَّقُوا الْكِذْبَ فِي صَغِيرٍ وَ كَبِيرٍ فِي كُلِّ جِدٍّ وَ هَزْلٍ فَاِنَّ الرَّجُلَ اِذا كَذِبَ فِي الصَّغِيرِ اِجْتَرَءَ عَلَى الْكَبِيرِ.[2]

جھوٹ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس سے پرہیز کرو، مذاق ہو یا شوخی کیونکہ جب انسان چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھوٹ بولتا ہے تو جرأت کرتا ہے اور ایک دن بڑے بڑے جھوٹ بولنے لگتا ہے۔

جھوٹ کے استثناءات

جھوٹ گناہان کبیرہ میں سے ہے اور اس کے خطرناک آثار مادی و معنوی، فردی اور اجتماعی ہوتے ہیں، لیکن بعض مقامات پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دو مومنوں کے درمیان صلح کے وقت

(۲) میدان جنگ سے دشمن کو غافل کرنے کے لئے

---

[1] نساء، آیہ 69.

[2] بحارالانوار، جلد 69، صفحہ 235.

(۳) مقام تقیہ

(۴) ظالم کے شر سے دفاع کے وقت

(۵) جب انسان کی جان و مال اور ناموس خطرے میں ہوتو وہ جھوٹ بولتا ہے اگر ایک شخص متعصب اور بے رحم افراد کے درمیان میں ہو اور اگر سچ بولے تو خون کا خطرہ ہوتو ایسی صورت میں وہ جھوٹ بول سکتا ہے۔

اس کے علاوہ معصومین علیہ السلام کی روایات بھی منقول ہیں۔

(۱) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لَيْسَ شَيْءٌ مِمَّا حَرَّمَ اللهُ إِلَّا وَقَدْ اَحَلَّهُ لِمَنِ اضْطُرَّ إِلَيْهِ.[۱]

اللہ کا کوئی ایسا حرام نہیں مگر یہ کہ وہ مضطر شخص کے لئے حلال ہو۔

(۲) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

اِحْلِفْ بِاللهِ كَاذِباً وَ نَجِّ اَخَاكَ مِنَ الْقَتْلِ[۲]

خدا کی جھوٹی قسم کھاؤ اور اپنے مومن بھائی کو قتل ہونے سے نجات دو۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ الْكِذْبِ يَكْتُبُ عَلى إبنِ آدَمِ إِلّا رَجُلٌ كَذَبَ بَيْنَ رَجُلَيْنِ يُصْلِحُ بَيْنَهُما.[۳]

ہر جھوٹ جھوٹ بولنے والے کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے سوائے اس جھوٹ کے جو دو مومن بھائیوں کے درمیان صلح کے وقت بولا جائے۔

(۴) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْكِذْبُ مَذْمُومٌ إِلّا فِي اَمْرَيْنِ دَفْعُ شَرِّ الظَّلَمَةِ وَاِصْلاحُ ذاتِ الْبَيْنِ.[۴]

---

[۱] بحار الانوار، جلد 101، صفحہ 284.

[۲] وسائل الشیعہ، جلد 16، صفحہ 134، (حدیث 4 باب 12 از کتاب الایمان).

[۳] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 245.

[۴] بحار الانوار، جلد 69، صفحہ 263.

جھوٹ کی مذمت کی گئی ہے سوائے دو جگہ ظالم کے شر سے دفاع اور دو مومن بھائیوں میں صلح کرانا۔

(۵) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ الْكِذْبِ مَكْتُوبٌ كِذْباً لا مَحالَةَ اِلّا اَنْ يَكْذِبُ الرَّجُلُ فِي الْحَرْبِ فَاِنَّ الْحَرْبَ خُدْعَةٌ اَوْ يَكُونُ بَيْنَ رَجُلَيْنِ شَحْناءُ فَيُصْلِحُ بَيْنَهُما اَوْ يُحَدِّثُ اِمْرَأَتَهُ يُرْضِيها.[1]

تمام جھوٹ حتماً جھوٹ لکھے جاتے ہیں سوائے وہ جھوٹ جو انسان کو جنگ میں بولنا پڑتا ہے کیونکہ جنگ ایک فریب ہے یا دو آدمی جن کے درمیان کینہ وعداوت ہو اور ان کے درمیان صلح کرنا یا بیوی سے کوئی بات کرے کہ جس سے وہ راضی ہو۔

ہر بات میں بیوی سے جھوٹ بولنا نہیں چاہیے بلکہ وہ بیوی جو زیادہ پیشکش کرتی ہو، اور شوہر پوری نہ کرسکتا ہو تو ایسے موقع پر اس سے جھوٹ بولا جاسکتا ہے

توریہ (جھوٹ سے راہِ فرار)

ایسی بات کہنا جو صرف سننے والے کچھ سمجھنے اور کہنے والے کا ارادہ کچھ اور ہو جو لوگ جھوٹ نہیں بولتے وہ توریہ کا سہارا لیتے ہیں۔ ہم کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں، توجہ فرمائیں:

(۱) اگر کوئی شخص سوال کرے کہ کیا یہ غلط کام تو نے کیا؟ جواب میں دوسرا کہے، استغفراللہ، سننے والا اس سے نفی سمجھے گا یعنی اس نے انجام نہیں دیا۔

(۲) اگر کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ فلاں آدمی نے تیرے پاس مجھے بُرا بھلا کہا، وہ کہتا ہے، کیا ایسا ممکن ہے، سننے والے اس سے نفی سمجھتا ہے۔

(۳) اگر ایک شخص گھر میں موجود ہو اور کوئی پوچھے کہ وہ گھر میں ہے؟ وہ دوسری طرف منہ کرکے اشارہ کرے

---

[1] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 245.

کہ وہ نہیں ہے یعنی وہاں نہیں ہے۔

(۴) ایک دانشمند سے سوال کیا گیا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین اور خلیفہ بلافصل کون ہے؟

وہ اپنے عقیدہ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے جواب میں کہا، (مَنْ بِنْتُهُ فِي بَيْتِهِ) وہ شخص کہ جس کی بیٹی اس کے گھر میں ہے،

سننے والے نے یہ خیال کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جس کی بیٹی ہے وہ افضل و جانشین ہے، یعنی ابوبکر، حالانکہ دانشمند کا عقیدہ یہ تھا کہ جس کے گھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی ہے وہ جانشین ہے یعنی حضرت علی علیہ السلام

(۵) سعید بن جبیر اور حجاج بن یوسف کی داستان کو بیان کرتے ہیں جب حجاج نے اس سے سوال کیا کہ تو مجھے کیسا آدمی سمجھتا ہے؟

وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا عقیدہ کیا ہے، اس شخص نے جواب میں کہا: أَنْتَ عَادِلٌ

عربی زبان میں عادل کے دو معانی ہیں (۱) عادل (۲) کافر جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیتا ہے، بمعنی عدیل، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ.[1]

پھر (باوجود اس کے) کفّار (اوروں کو) اپنے پروردگار کے برابر کرتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے معلوم ہوا کہ توریہ جھوٹ نہیں ہوتا کیونکہ کہنے والے کی نیت سچ ہوتی ہے لیکن سننے والا دوسرا معنی سمجھتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جب جھوٹ بولنے کی ضرروت ہو اور انسان توریہ کر سکتا ہو تو توریہ کرے اور جھوٹ سے بچے۔

غزالی نے توریہ کو جائز نہیں سمجھا اور اسے جھوٹ قرار دیا ہے لیکن غزالی کا یہ قول درست نہیں ہے۔

بہر حال جھوٹ کا فساد بہت زیادہ ہے لہٰذا جتنا ممکن ہو سکے جھوٹ سے بچے اور توریہ سے کام لے، قرآن و حدیث میں بھی توریہ ذکر ہوا ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بابل کے بت پرستوں نے سوال کیا کہ تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ کیا کیا، تو آپؑ نے فرمایا:

---

[1] النساء:۱

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗۤ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ.[1]

ابراہیمؑ نے کہا بلکہ یہ حرکت ان بتوں (خداؤں) کے بڑے (خدا) نے کی ہے تو اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو ان ہی سے پوچھو۔

اسی طرح جملہ "انکم سارقون"، تم چور ہو، حضرت یوسف علیہ السلام کے نوکروں نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے کہا تھا،

پہلی آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بادشاہ کا پیمانہ چوری کیا تھا۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ توریہ کرنا جھوٹ نہیں ہے، اگرچہ مخاطب کے ذہن میں کچھ اور ہو جبکہ سننے والے سمجھے کچھ اور۔



[1] انبیا:63.

[2] یوسف، آیہ 70.

۹۔ وعدہ وفا اور وعدہ خلافی

جیسا کہ کئی بار بیان ہو چکا ہے کہ معاشرے میں اعتماد کی بڑی ضرورت ہوتی ہے جب تک لوگوں میں ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہوتو معاشرہ فساد کا شکار ہوجاتا ہےاور اصل ہدف یعنی سعادت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا، ان میں سے وعدہ وفا اور وعدہ خلافی موضوع بھی بہت اہم ہیں، وعدہ وفا ایک اخلاقی فضیلت اور وعدہ خلافی ایک رذیلت شمار ہوتی ہے۔

وعدہ کو پورا کرنا فطرت کا تقاضا ہے، فطرت کبھی انکار نہیں کرسکتی ہے، فطرتی اُمور وہ ہوتے ہیں کہ جنھیں ہر انسان درک کرسکتا ہے، اس لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہوتی، عدل اچھا ہے، ہر انسان عدالت کو پسند کرتا ہے ،جبکہ ظلم بُرا ہے اور ہر انسان اسے بُرا سمجھتا ہے، اس طرح وعدہ وفا اور وعدہ خلافی بھی واضح موضوع ہیں، ہر آدمی سمجھتا ہے کہ وعدہ پورا کرنا اچھی بات اور وعدہ خلافی بُری بات ہے۔ ہر آدمی فطرتی طور پر پسند اور ناپسند کرتا ہے، اس لئے وہ لوگ جو مسلمان نہیں وہ بھی وعدہ کی وفا کرنا ضروری سمجھتے ہیں اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں بھی وعدہ وفا کرتے تھے اور کوشش کرتے کہ وعدہ خلافی نہ ہو، آیات و روایات میں اس موضوع پر بڑی تاکید کی گئی ہے، اب ہم آیات کو ذکر کرتے ہیں ان پر غور فرمائیں۔

① ۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ

ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. [1]

نیکی کچھ یہی تھوڑی ہی ہے کہ (نماز میں) اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو خدا اور روزِ آخرت اور فرشتوں اور (خدا کی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اس کی الفت میں اپنا مال قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پردیسوں اور مانگنے والوں اور لونڈی غلام (کی گلو خاصی) میں صرف کرے اور پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ دیتا رہے اور جب کوئی عہد کرے تو اپنے قول کو پورا کرے اور فقر وفاقہ رنج سختی اور کٹھن کے وقت ثابت قدم رہے یہی لوگ وہ ہیں جو (دعویٰ ایمان میں) سچے نکلے اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

② ۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ. [2]

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔

③ ۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا. [3]

اور یتیم جب تک جوانی کو پہنچے اس کے مال کے قریب بھی نہ جانا مگر ہاں اس طرح کہ (یتیم کے حق میں) بہتر ہو۔ اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت میں) عہد کی ضرور پوچھ گچھ ہوگی۔

④ ۔ بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ. [4]

ہاں (البتہ) جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے تو بے شک خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

⑤ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْـًٔا وَّلَمْ

---

[1] بقرہ: 177

[2] مومنون: 8، معارج: 32

[3] بنی اسرائیل: 34

[4] آل عمران: 76

يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. [1]

مگر (ہاں) جن مشرکوں سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا پھر ان لوگوں نے کبھی کچھ تم سے (وفا عہد میں) کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان کے عہد و پیمان کو جتنی مدّت کے واسطے مقرر کیا ہے پورا کردو خدا پرہیزگاروں کو یقیناً دوست رکھتا ہے۔

⑥۔ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ. [2]

اور جب تم لوگ باہم قول وقرار کرلیا کرو تو خدا کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور قسموں کو ان کے پکا ہوجانے کے بعد نہ توڑا کرو۔ حالانکہ تم تو خدا کو اپنا ضامن بنا چکے ہو۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو خدا اسے ضرور جانتا ہے۔

⑦۔ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ. [3]

اور ہم نے تو ان میں سے اکثروں کا عہد ٹھیک نہ پایا۔ اور ہم نے ان میں سے اکثروں کو بدکار ہی پایا۔

⑧۔ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. [4]

اور (انکی یہ حالت ہے کہ) جب کبھی کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک فریق نے توڑ ڈالا۔ بلکہ ان میں سے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے۔

---

[1] توبہ:4

[2] نحل:91

[3] اعراف:102

[4] بقرہ:100

تفسیر وجمع بندی

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں چھ موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

سب سے پہلے خدا، روز قیامت، فرشتوں، انبیاءؑ اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا، اس کے بعد(انفاق فی سبیل)یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور نماز بر پا کرنا، اور زکوٰۃ ادا کرنا، پانچواں موضوع وعدہ وفائی کے بارے میں ہے۔ چھٹے عنوان میں مشکلات وحوادث میں صبر واستقامت کی اہمیت کے بارے میں ذکر ہوا ہے، خداوندعالم وعدہ وفا کے بارے میں فرماتا ہے:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا .

جب کوئی عہد کرے تو اپنے قول کو پورا کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ وفا اتنا اہم کہ قرآن واسلام کی نظر میں خدا، نماز وزکوٰۃ پر ایمان لانے کے ہم مرتبہ قرار پایا، اصل وفا اس کو کہتے ہیں، جو چیز اپنے کمال تک پہنچ جائے جو شخص وعدہ و پیمان پورا کرتا ہے اس کے لئے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے۔

عہد کا اصل معنی کسی چیز کی پاسداری کرنا مراد ہے، اسی وجہ سے وہ قرار داد جن کو حفظ کرنا ضروری ہے اسے عہد کہا گیا ہے، قرآن مجید میں عہد کے لئے وجوب نہیں آیا، لہٰذا وعدہ الٰہی اور لوگوں کے وعدہ دونوں کو شامل ہے، خواہ وہ لوگ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان۔

دوسری آیت میں سچے مومنوں کی صفات کا ذکر ہوا ہے اور کلمہ "قد افلح المومنون" سے شروع ہوتا ہے جس میں سات صفات کا ذکر آیا ہے، پانچویں اور چھٹی صفات کے بارے میں خداوندعالم فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ.

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔

رعایت کلمہ (راعون) سے لیا گیا ہے جس کا مفہوم وعدہ وفا سے وسیع ہے کیونکہ رعایت یعنی پوری طرح حفاظت کرنا مراد ہے کہ جس سے کسی قسم کا نقصان نہ ہو، جس شخص کے پاس امانت ہے یا جس نے عہد کیا ہے تو اسے پوری طرح رعایت کرنی چاہیے تا کہ اسے کسی قسم کا نقصان نہ ہو، البتہ امان کا مفہوم بھی وسیع ہے۔

تیسری آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا.

اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت میں) عہد کی ضرور پوچھ گچھ ہوگی۔

مفسرین نے اس جملہ (ان الحمد کان عنہ مستولا) کی مختلف تفاسیر بیان کی ہیں جن سے ایک یہ ہے کہ انسان مسئول ہے اور عہد (مسئول عنہ) یعنی انسان سے وعدوں کا بھی کال ہوگا دوسرا یہ کہ خود عہد و پیمان کا سوال ہوگا۔

سورہ بنی اسرائیل، آیت ۲۲ تا ۳۹ مہم ترین احکام اسلامی بیان ہوئے ہیں، توحید سے لے کر مسئلہ والدین کے احترام اور مسئلہ قتل نفس سے لے کر زنا اور مال یتیم کھانے تک، وعدہ وفا سے لے کر آنکھ، کان، اور دن کی ذمہ داری تک مشتمل ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وفا وعدہ ایک اہم ترین مسئلہ ہے، دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ احکام کے آخر میں خداوند عالم فرماتا ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ

یہ بات تو حکمت کی ان باتوں میں سے ہے جو تمہارے پروردگار نے تمہارے پاس وحی بھیجی۔

چوتھی آیت میں اہل کتاب کے ایک گروہ کی مذمت ہوئی جو امانت میں خیانت کرتے ہیں، خداوند عالم مزید فرماتا ہے:

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ.

ہاں (البتہ) جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے تو بے شک خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

یہاں پر عہد تقویٰ کے ہم رتبہ ذکر ہوا ہے، تقویٰ روز قیامت انسان کے لئے بہترین زادہ راہ ہے اور جنت میں جانے کا سبب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد تقویٰ کی ایک شاخ ہے۔

پانچویں آیت میں مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ عہد و پیمان کے احترام کے بارے میں ذکر ہوا ہے خداوند عالم دستور فرماتا ہے وہ وعدہ، وفا ہوں تو تم بھی وعدہ خلافی نہ کرو، پھر فرماتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ.

مگر (ہاں) جن مشرکوں سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا پھر ان لوگوں نے کبھی کچھ تم سے (وفا عہد میں) کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان کے عہد و پیمان کو جتنی مدّت کے واسطے مقرر کیا ہے پورا کردو خدا پرہیزگاروں کو یقیناً دوست رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ برأت مشرکین کا مسئلہ سال نہم ہجری واقع ہوا اور فتح مکہ کے بعد اسلام کو استقراء حاصل ہوا۔ مسلمان سرزمین حجاز پر مستقر ہوئے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ سورہ برأت کی پہلی آیات مراسم حج کے موقع پر تلاوت فرمائیں اور مشرکین میں اعلان کریں وہ اپنی تکلیف مشخص کریں اور چارہ ماہ کی مہلت ہے یا بت پرستی سے باز آجائیں، پرچم توحید کے نیچے آجائیں، یا پھر مسجد الحرام میں داخل نہ ہوں، اگر چار ماہ کے بعد وہ بت پرستی سے باز نہیں آئے تو جنگ کے لئے تیار رہیں۔ اس وقت حضرت علی علیہ السلام کے توسط سے چار موضوع لوگوں کے لئے مراسم حج میں بیان ہوئے۔

(۱) وعدہ خلافی کرنے والے مشرکین سے کوئی عہد و پیمان نہیں۔

(۲) سال آئندہ مراسم حج میں مشرکین شرکت نہیں کر سکتے۔

(۳) خانہ خدا میں مشرکین کا داخلہ ممنوع ہوگیا۔

(۴) عریاں و برہنہ افراد کا طواف ممنوع قرار دیا گیا۔

حالانکہ یہ ماجرا بعد از فتح مکہ کا ہے، مسلمان قدرت رکھتے تھے لیکن پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وعدہ وفا کیا اور مشرکین سے وعدہ خلافی نہیں کی، صلح حدیبیہ میں دس سال کا عرصہ تھا اور سات سال باقی رہتے تھے لیکن مسلمانوں نے آخر تک عہد و پیمان کا خیال رکھا۔[1]

چھٹی آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب ہے خداوند عالم فرماتا ہے کہ:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ.

اور جب تم لوگ باہم قول و قرار کرلیا کرو تو خدا کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور قسموں کو ان کے پکا ہوجانے کے بعد نہ توڑا کرو۔ حالانکہ تم تو خدا کو اپنا ضامن بنا چکے ہو۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو خدا اسے ضرور جانتا ہے۔

---

[1] شرح وتفسیر کے لئے مطالعہ کیجئے پیام قرآن کی جلد نہم سورہ برائت کی انہی آیات کے ذیل میں۔

اس آیت میں عہد الٰہی سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے،

بعض نے لکھا ہے کہ وہ وعدہ جو مسلمانوں نے خدا سے باندھ رکھا تھا،

بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت ہے۔

اور بعض صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام وعدہ و پیمان ہیں جو انسان نے خدا سے کر رکھے ہیں، یا خدا و رسولؐ سے وعدہ مراد ہے، کیونکہ خدا نے حکم دیا کہ عمل کیا جائے، لہٰذا ایک قسم کا پیمان الٰہی شمار ہوتا ہے یا اس سے مراد وہ قسمیں ہیں جو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے ہیں۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا

اور جب تم لوگ باہم قول و قرار کرلیا کرو تو خدا کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور قسموں کو ان کے پکا ہوجانے کے بعد نہ توڑا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ وفا نہ کرنا اور قسم کی پابندی نہ کرنا ایک قسم کی بے وفائی ہے اس کی دلیل بھی واضح ہے کہ اگر معاشرے میں وعدہ خلافی ہو تو اعتماد ختم ہوجاتا ہے ایسا کام جو کوئی عاقل نہیں کرتا، بعض افراد مختلف بہانوں سے وعدہ خلافی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عہد و پیمان سے دور کردیتے ہیں جیسے قرآن کا یہ جملہ "اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ط" اسی حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے، ایک دوسرے سے وعدہ خلافی نہ کرو کیونکہ اس کا بُرا نتیجہ نکلتا ہے یہ آیت نہ صرف عہد اُخروی بلکہ عہد جہانی کو بھی شامل ہے "اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ط اس کی طرف اشارہ ہے۔

ساتویں آیت میں اقوام گذشتہ کی دردناک سرگذشت اور ان کے انحراف میں دو گناہوں کی طرف اشارہ ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ.

اور ہم نے تو ان میں سے اکثروں کا عہد ٹھیک نہ پایا۔ اور ہم نے ان میں سے اکثروں کو بدکار ہی پایا۔

یہ عمومی عہد جو اللہ نے اپنی اُمتوں سے لیا تھا اس میں سے اکثر نے توڑ دیا اور وفا نہ کیا، یہ کون سا عہد تھا؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، [1] بعض نے کہا کہ اس سے مراد عہد و پیمان فطری ہے کہ جو خدا نے تمام

---

[1] تفسیر مراغی، جلد اول، صفحہ 177.

مخلوقات سے لیا ہے کہ توحید پر ثابت قدم رہیں۔ انسان ہوش سنبھالے اور حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرے یا شاید اس عہد و پیمان کی طرف اشارہ ہو جو انبیاءؑ نے دعوت کے وقت لوگوں سے لیا کیونکہ بہت سے لوگوں نے وعدہ کیا اور وعدہ خلافی کر گئے۔

ممکن ہے تمام وعدوں کی طرف اشارہ ہو فطری یا تشریعی، پس معلوم ہوا کہ وعدہ خلافی بدبختی کا موثر ترین عامل ہے جس طرح آج بھی دنیا میں ہے کہ جب تک ضعیف ہیں عہد و پیمان کے پابند ہیں اور قدرت مند ہو جاتے ہیں تو پھر بھول جاتے ہیں۔

آٹھویں اور آخری آیت میں یہودیوں کی جنایات کے بارے میں ذکر ہوا ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ.

اور (انکی یہ حالت ہے کہ) جب کبھی کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک فریق نے توڑ ڈالا۔

بلکہ ان میں سے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے۔

ایک طرف ان سے وعدہ لیا گیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئیں گے تورات میں یہ بشارت تھی اس پر ایمان لانا چاہیے لیکن اس پر وہ صرف ایمان نہ لائے بلکہ آنحضورؐ سے کیا گیا وعدہ کو بھی بھلا دیا جس میں یہ تھا کہ وہ دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے، جس کے نتیجے میں جنگ احزاب کا سامنا ہوا کہ جس میں، ضدِ اسلام تمام گروہ تیار ہو گئے تھے۔

یہ یہودیوں کا پرانا طریقہ ہے کہ اکثر وعدہ وفا نہیں کرتے خاص کر جب بھی ان کے منافع کے خلاف واقعہ پیش آجائے تو فوراً وعدہ خلافی کرنے لگتے ہیں، حتیٰ بین المللی وعدہ کی رعایت نہیں کرتے اور فراموش کر دیتے ہیں، پس آیات کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ اسلام تعلیم میں عہد و پیمان کی بڑی اہمیت، ایمان کی نشانی اور تقویٰ کے قریب ہے اور امانت کے برابر ہے، اس قدر مہم ہے حتیٰ مسلمان وغیرہ مسلمان دونوں یکساں ہیں۔

وعدہ وفا کرنے کے سلسلے میں روایات

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا دِينَ لِمَنْ لا عَهْدَ لَهُ.[۱]

جو شخص وعدہ کا پابند نہیں ہوتا اس کا کوئی دین نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَصْلُ الدِّينِ اَداءُ الْاَمانَةِ وَ الْوَفاءِ بِالْعُهُودِ.[۲]

اصل دین امانت کی ادائیگی اور عہد کی وفا کرنے کا نام ہے۔

(۲) آپؑ نے فرمایا:

ما اَيْقَنَ بِاللهِ مَنْ لَمْ يَرْعَ عُهُودَهُ وَ ذِمَّتَهُ.[۳]

جو شخص وعدے کا پابند نہیں ہوتا اس کا خدا پر کوئی ایمان نہیں ہے۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو نامہ لکھا جس میں وعدہ وفا کی بڑی تاکید کی گئی ہے اور فرمایا:

وَ اِنْ عَقَدْتَ بَيْنَكَ وَ بَيْنَ عَدُوِّكَ عُقْدَةً، اَوْ اَلْبَسْتَهُ مِنْكَ ذِمَّةً فَحُطْ عَهْدَكَ بِالْوَفاءِ، وَ ارْعَ ذِمَّتَكَ بِالْاَمانَةِ، وَ اجْعَلْ نَفْسَكَ جُنَّةً دُونَ ما اَعْطَيْتَ فَاِنَّهُ لَيْسَ مِنْ فَرائِضِ اللهِ شَيْءٌ النّاسُ اَشَدُّ عَلَيْهِ اِجْتِماعاً مَعَ تَفَرُّقِ اَهْوائِهِمْ وَ تَشَتُّتِ آرائِهِمْ مِنْ تَعْظِيمِ الْوَفاءِ بِالْعُهُودِ، وَ قَدْ لَزِمَ ذلِكَ الْمُشْرِكُونَ فِيما بَيْنَهُمْ دُونَ الْمُسْلِمِينَ لِمَا اسْتَوْبَلُوا مِنْ عَواقِبِ الْغَدْرِ.[۴]

اگر اپنے اور دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ کرنا یا اسے کسی طرح کی پناہ دینے کا تعہد کرلیا

---

[۱] بحار الانوار، جلد 69، صفحہ 198، (حدیث 26)

[۲] غرر الحکم، حدیث 1762.

[۳] غرر الحکم، حدیث 9577.

[۴] نہج البلاغہ، نامہ 53.

ہے تو اپنے عہد کی پاسداری و وفاداری کرنا اور اپنے ذمہ (پناہ گزیں) کو امانتداری کے ذریعہ محفوظ بنانا اور اپنے قول وقرار کی راہ میں اپنے نفس کو سپر بنا دینا کیونکہ اللہ کے فرائض میں ایفائے عہد جیسا کوئی فریضہ نہیں ہے جس پر تمام لوگ خواہشات کے اختلاف اور افکار کے تضاد کے باوجود متحد ہیں اور اس کا مشرکین نے بھی اپنے معاملات میں لحاظ رکھا ہے (انہوں نے بھی) عہد شکنی کے نتیجہ میں تباہیوں کا اندازہ کرلیا ہے۔

(۴) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَقْرَبُكُمْ غَدَاً مِنِّي فِي الْمَوْقِفِ اَصْدَقُكُمْ لِلْحَدِيثِ وَ اَدّا كُمْ لِلْاَمانَةِ وَ اَوْفا كُمْ بِالْعَهْدِ وَ اَحسَنُكُمْ خُلْقاً وَ اَقْرَبُكُمْ مِنَ النّاسِ.[1]

کل قیامت کے دن مجھ سے وہ سب سے زیادہ نزدیک، سچا اور امین ہوگا جو وعدہ وفا کرتا ہوگا اور لوگوں میں سے سب سے زیادہ سے با اخلاق ہو۔

(۵) وعدہ وفا کی اہمیت اور برے انجام کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ الْوَفَاءَ تَوْأَمُ الصِّدْقِ وَ لَا أَعْلَمُ جُنَّةً أَوْقَى مِنْهُ وَ مَا يَغْدِرُ مَنْ عَلِمَ كَيْفَ الْمَرْجِعُ وَ لَقَدْ أَصْبَحْنَا فِي زَمَانٍ قَدِ اتَّخَذَ أَكْثَرُ أَهْلِهِ الْغَدْرَ كَيْساً وَ نَسَبَهُمْ أَهْلُ الْجَهْلِ فِيهِ إِلَى حُسْنِ الْحِيلَةِ مَا لَهُمْ قَاتَلَهُمُ اللهُ قَدْ يَرَى الْحُوَّلُ الْقُلَّبُ وَجْهَ الْحِيلَةِ وَ دُونَهَا مَانِعٌ مِنْ أَمْرِ اللهِ وَ نَهْيِهِ فَيَدَعُهَا رَأْيَ عَيْنٍ بَعْدَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهَا وَ يَنْتَهِزُ فُرْصَتَهَا مَنْ لَا حَرِيجَةَ لَهُ فِي الدِّينِ.[2]

اے لوگو! یاد رکھو وفا ہمیشہ صداقت کے ساتھ رہتی ہے اور میں اس سے بہتر محافظ، کوئی سپر نہیں جانتا ہوں اور جسے بازگشت کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے وہ غداری نہیں کرتا ہے۔ہم ایک ایسے دور میں واقع ہوئے ہیں جس کی اکثریت نے غداری اور مکاری کا نام ہوشیاری رکھ لیا ہے۔اور اہل جہالت نے اس کا نام حسن تدبیر رکھ لیا ہے۔آخر انہیں کیا ہوگیا ہے۔خدا انہیں غارت کرے۔وہ انسان جو حالات کے الٹ پھیر کو دیکھ چکا ہے وہ بھی حیلہ کے رخ کو جانتا ہے لیکن

---

[1] بحار الانوار، جلد 74، صفحہ 150، حدیث 82 تاریخ یعقوبی، جلد 2، صفحہ 92.

[2] نہج البلاغہ، خطبہ 41.

امر و نہی الٰہی اس کا راستہ روک لیتے ہیں اور وہ امکان رکھنے کے باوجود اس راستہ کو ترک کر دیتا ہے اور وہ شخص اس موقع سے فائدہ اٹھالیتا ہے جس کے لئے دین سد راہ نہیں ہوتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں امام علیہ السلام کی مراد اس ''شخص'' سے اپنی ذات ہے۔

(۶) امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ثَلاثٌ لَمْ يَجْعَلِ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِاَ فِيهِنَّ رُخْصَةً اَداءُ الْاَمانَةِ اِلَى الْبَرِّ وَ الْفاجِرِ، وَ الْوَفاءِ بِالْعَهْدِ لِلْبَرِّ وَ الْفاجِرِ، وَبِرُّ الْوالِدَيْنِ بَرَّيْنِ كانا اَوْ فاجِرَيْنِ.[1]

تین چیزیں ایسی ہیں جس میں کسی کو مخالفت کا حق حاصل نہیں ادائے امانت، خواہ امانت نیک آدمی کی ہو یا بُرے آدمی کی وعدہ وفا کرنا خواہ دوسرا نیک ہو یا بدکار، والدین سے نیکی کرنا خواہ وہ نیک ہوں یا بُرے۔

اسی مضمون پر مشتمل حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔

(۷) ایک اور حدیث میں امام نے عہد و پیمان کو گردن میں ایک طوق فرمایا:

اِنَّ الْعُهُودَ قَلائِدُ فِي الْاَعْناقِ اِلى يَوْمِ الْقِيامَةِ فَمَنْ وَصَلَها وَصَلَهُ اللهُ، وَ مَنْ نَقَضَها خَذَلَهُ اللهُ.[2]

عہد و پیمان انسان کی گردن میں ایک طوق ہے، جو کوئی وفا کرتا ہے خدا اسے ثواب عطا کرتا ہے، اور جو عہد خلافی کرتا ہے خدا اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

(۸) ایک شخص نے امام سجاد علیہ السلام سے عرض کیا:

اَخْبِرْنِي بِجَمِيعِ شَرايِعِ الدِّينِ.

تمام اصول اسلام مجھ سے بیان فرمائیے۔

حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا:

قَوْلُ الْحَقِّ وَالْحُكْمُ بِالْعَدْلِ وَ الْوَفاءُ بِالْعَهْدِ.[3]

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 162، حدیث 15.

[2] خصال، صفحہ 140، حدیث 118.

[3] غرر الحکم، حدیث 3650.

حق کہنا، عدالت کا فیصلہ کرنا اور وعدہ وفا کرنا۔

(۹) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَشْرَفُ الْخَلائِقِ اَلْوَفاءُ.[۱]

عہد سے وفا کرنا انسان کا بہترین حُسن اخلاق ہے۔

(۱۰) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذا نَقَضُوا الْعَهْدَ سَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِمْ عَدُوَّهُمْ.[۲]

جب لوگ عہد خلافی کرتے ہیں تو خدا اس پر ان کے دشمنون کو مسلط کر دیتا ہے۔

فردی و اجتماعی آثارِ وعدہ وفائی

انسان کے اکھٹے رہنے سے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے مختلف فکروں سے تہذیب وتمدن میں ترقی ہوتی ہے، اگر انسان ایک دوسرے سے مختلف زندگی کریں تو ان کا تجربہ بھی مختصر ہوتا ہے، نہ پیش رفت ہوتی ہے نہ ترقی، تمدن رُک جاتا ہے اس لئے اسلام اجتماعی زندگی کا قائل ہے، جو چیز اجتماع کو محکم کرتی ہے وہ مطلوب ہے اور سست کرنے والی چیز مغفور ہے معاشرے میں ایک دوسرے سے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی پیوند ہیں، اگر وعدہ وفا انفرادی و اجتماعی ایک دن کے لئے معطل ہو جائے تو زندگی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے اور پیش رفت متوقف ہو جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا تَعْتَمِدْ عَلى مَوَدَّةِ مَنْ لا يُوفِي بِعَهْدِهِ.[۳]

جو آدمی وعدہ وفا نہیں کرتا اس پر اعتماد نہ کرے،

انسان کی کامیابی کا دارو مدار اس کے وعدوں میں منحصر ہے جتنا وعدہ وفا ہوتا ہے کامیاب ہوتا اور جتنا وعدہ خلافی

---

[۱] غرر الحکم، حدیث 2859.

[۲] بحار الانوار، جلد 97، صفحہ 46، حدیث 3.

[۳] غرر الحکم، حدیث 10290.

کرتا ہے قابل اعتماد نہیں ہوتا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْوَفاءُ حِصْنُ السُّؤدَدِ.[1]

وعدہ وفا ایک محکم قلعہ ہے۔

وعدہ خلافی کرنے والا شخص معاشرے میں بدبین ہوتا ہے لوگ اعتماد نہیں کرتے ، ایسا شخص جلد ہی دشمن کے سامنے تسلیم ہو جاتے ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذا نَقَضُوا الْعَهْدَ سَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِمْ عَدُوَّهُمْ.[2]

جب بھی مسلمان ایک دوسرے سے عہد توڑتے ہیں اللہ ان کا دشمن ان پر مسلط کر دیتا ہے۔

اقتصاد کی رونق ہوتی ہے، وعدہ وفا کے علاوہ عدالت قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے، وعدہ خلافی کرنے والے افراد ظالموں کی صف میں ہوتے ہیں۔

وعدہ وفائی اور وعدہ خلافی کا سرچشمہ

بے شک صداقت پر ایمان اور توحید افعالی کا عقیدہ وعدہ وفا کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، کیونکہ وعدہ خلاف کرنے والے افراد جلدی اور عارضی فائدہ کو دیکھ کر اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ حقیقت میں رازق خدا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] غرر الحکم، حدیث 1044.

[2] بحار الانوار، جلد 97، صفحہ 46، حدیث 3.

مِنْ دَلائِلِ الْإِیمانِ الْوَفاءُ بِالْعَهْدِ.[1]

ایمان کی نشانیوں میں سے ایک نشانی وعدہ وفا کرنا ہے۔

ایک اور جگہ آپؑ فرماتے ہیں کہ:

ما آیْقَنَ بِاللهِ مَنْ لَمْ یَرْعَ عُهُودَهُ وَ ذِمَّتَهُ.[2]

جوانسان اپنے وعدہ و پیمان کا پابند نہیں ہوتا، اس کا خدا پر ایمان نہیں ہے۔

صاحبِ اعتبار شخصیت اور رعب والے افراد وعدہ خلافی نہیں کرتے اور ناتوان اور ضعیف قسم کے لوگ اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے وعدہ وفا کرنا نیک لوگوں کی ایک نشانی بیان فرمائی ہے، اور مزید کہا کہ:

بِحُسْنِ الْوَفاءِ یُعْرَفُ الْأَبْرارُ.[3]

نیک افراد کو ان کے وعدہ سے شناخت کر سکتے ہیں۔

جاہلیت، غفلت اور بے خبری وعدہ خلافی کرنے والوں کے آثار میں سے ایک اثر ہے، عاقل لوگ یہ کام نہیں کرتے،

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْوَفاءُ حِلْیَةُ الْعَقْلِ وَ عُنْوانُ النُّبْلِ.[4]

وعدہ وفا عقل کی زینت اور انسان کی فضیلت ہے۔

---

[1] غرر الحکم، حدیث 9414.

[2] غرر الحکم، حدیث 9575.

[3] غرر الحکم، جلد 1، صفحہ 337، حرف الباء، حدیث 153.

[4] عیون الحکم والمواعظ (للیثی) / 50 / الفصل الأول مما أوله الألف و اللام.....ص: 17

وعدہ خلافی کا علاج

جب لوگ اس بُری صفت کو ختم کرنا چاہتے ہوں تو انھیں سب سے پہلے ایمان کے لئے عمل کرنا ہوگا، کیونکہ وعدہ خلافی ضعیف ایمان ہونے کی علامت ہے، جتنی خدا کے بارے میں معرفت زیادہ ہوگی ایمان زیادہ ہوتا ہے، ان کے بُرے آثار ہوسکتا ہے، وقتی طور پر منافع بخش ہوں لیکن جلد ہی انسان اپنے دوستوں، عزیزوں اور معاشرے میں ذلیل وخوار ہوتا ہے، لوگ اس پر اعتماد نہیں کرتے، خالق ومخلوق دونوں کے سامنے سیاہ چہرہ ہوتا ہے،

حضرت علی علیہ السلام اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَالْخُلْفُ يُوجِبُ الْمَقْتَ عِنْدَاللهِ وَعِنْدَ النّاسِ.[1]

وعدہ خلافی خدا اور لوگوں کے نزدیک غضب کا موجب ہوتی ہے۔

اس لئے بہت سے معاشرے ایسے ہیں جن میں خدا وایمان کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔

عہد کی اقسام

عہد کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) خدا سے عہد (۲) لوگوں سے عہد (۳) اپنے آپ سے عہد

فقہی کتابوں میں خدا سے عہد کا ذکر ہوا ہے اور نذر کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی خدا سے عہد کرتا ہو تو اسے عربی میں ''صیغہ'' پڑھنا ضروری ہے، مثلاً کہے:

عاهَدْتُ اللهَ اَنَّهُ متی شَفانِي اللهُ اَصومُ ثَلاثَةَ اَيّام اَوْ اَتَصَدَّقُ بِكُذا وَ كَذا

میں خدا سے عہد کرتا ہوں کہ جب بھی بیماری سے شفا پاؤں گا تین روزے رکھوں گا، یا

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ 53 (عہدنامہ معروف مالک اشتر).

فلاں فلاں مقدار صدقہ دوں گا۔

البتہ عہد کا صیغہ عربی کے علاوہ اردو یا فارسی زبان میں بھی پڑھا جا سکتا ہے، جب عہد کرتا ہے اس پر واجب ہے کہ اپنے عہد کو پورا کرے، اگر انسان مخالفت کرتا ہے تو اسے کفارہ دینا چاہیے، اس کا کفارہ وہی ہے جو ماہِ رمضان میں روزہ توڑنے کا کفارہ ہے۔لہٰذا خدا سے عہد نہ صرف اخلاقی طور پر لازم ہے، بلکہ فقہی طور پر واجب ہے اور اس کی مخالفت کا کفارہ ہے، اگر انسان صیغہ نہ پڑھے بلکہ صرف دل میں بیت کرے تو تب بھی وفا اور پورا کرنا لازم ہے۔

خداوند عالم ایک ضعیف الایمان مومن گروہ یا منافقین سے فرماتا ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ.

اور جب تم لوگ باہم قول وقرار کرلیا کرو تو خدا کے عہد و پیمان کو پورا کرو۔

بعض مفسرین نے اس عہد کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مراد لیا ہے،

بعض نے جہاد کا معنی اور بعض نے خدا کی قسم مراد لی ہے،

اور بعض نے کہا کہ ہر وہ کام جو عقل وشریعت میں اس پر واجب ہو،[1] لوگوں سے عہد پر قسم کی قرار داد عہد میں شامل ہے، جو شرع وعقل کے قالب میں واجب ہوتا ہے، لیکن ایک طرف عہد جیسے ایک انسان عہد کرتا ہے کہ وہ فلاں فلاں سے مدد کرے گا، ایسے عہد کو ابتدائی عہد کہا جاتا ہے، ایسے عہد کا پورا کرنا واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے، اور اسلام میں تمام لوگوں کی نظر میں قابل احترام ہے اور لازم الوفا ہے اگر ایسا نہ ہو تو انسان سعادت مند نہیں بن سکتا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

عِدَةُ الْمُؤْمِنِ اَخَاهُ نَذْرٌ لا كَفّارَةَ لَهُ فَمَنْ اَخْلَفَ فَبِخُلْفِ اللّٰهِ بَدَءَ وَ لِمَقْتِهِ تَعَرَّضَ وَ ذٰلِكَ قَوْلُهُ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳ [2] [3].

جو مومن کسی دوسرے مومن سے وعدہ کرتا ہے وہ نذر ہے، ہر چند کہ اس کی مخالفت کا کفارہ نہیں ہے جس نے اس کی مخالفت کی اس نے خدا کی مخالفت کی اور غضبِ خدا کا سبب قرار

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد 20، صفحہ 106.

[2] سورۂ صف: ۳، ۴

[3] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 36، حدیث 1.

پاتا ہے، یہ وہی ہے جو خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ③

''اے ایمان والو! وہ کیوں کہتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو، اللہ کے نزدیک یہ غضب کا باعث ہے کہ بات کرتے ہو لیکن اسے پورا نہیں کرتے ہو۔''

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَفِ اِذا وَعَدَ.[1]

جو شخص خدا اور روز قیامت پر یقین رکھتا ہے اسے وعدہ پورا کرنا چاہیے۔

بعض وعدے ایسے ہیں جو انسان اپنے آپ کے ساتھ کرتا ہے، یہ خود سازی صفات کے تکامل کے لئے بہت موثر ہے، عارف افراد اسے پہلے قدم میں سیر وسلوک کہتے ہیں، اور ان کی اصطلاح میں اسے ''مشارطہ'' کہا جاتا ہے، مشارطہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر روز صبح کے وقت اپنے آپ سے وعدہ کرے کہ وہ اس دن خدا کی اطاعت کرے گا اور گناہ سے پرہیز کرے گا، پھر اپنے اعمال کی دن میں حفاظت کرتا ہے اور اپنی شرط پر عمل کرتا ہے، آج بھی بہت سی شخصیات اپنے نفس سے وعدہ کرتے ہیں اور پھر مراقبہ کرتے ہیں، ایسے عہد تہذب نفس اور اخلاقی فضیلت کے حصول کے لئے موثر راہ ہے۔

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 364، حدیث 2.

مسلمانوں کی عہد سے وفا کی پابندی

پہلی صدیوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلا تھا، مشرق ومغرب میں اسلام پھیلتا نظر آیا، اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں، ایک علت یہ ہے کہ لشکر اسلام عہد و پیمان کا پابند تھا، قرآن وحدیث میں اس مسئلے پر بڑی تاکید کی گئی ہے۔

اس مہم قانون امان جو کہ اسلامی دستورات میں سے ایک حکم الٰہی ہے، لشکر میں جو سپاہی جس رتبہ کا ہو، وہ کسی شخص کو امان دے سکتا تھا، تمام سپاہی اس امان پر عمل کرنے کے پابند تھے، تاریخ اسلام میں مندرجہ ذیل مثالوں پر توجہ فرمائیں:

(۱) یاقوت حموئی، موجم البلدان میں شہر ''سہر یاج'' کی فتح کے بارے میں عجیب داستان تحریر کرتے ہیں:

کسی خلیفہ کا زمانہ تھا، خلیفہ نے اس شہر کو فتح کرنے کے لئے لشکر بھیجا، بعض نے سوچا کہ یہ شہر فتح کرنے کے لئے چند منٹوں کی ضرورت ہے، شہریوں اور لشکر اسلام کے درمیان جنگ شروع ہوئی فوج دوسرے حملے کے لئے واپس اپنے مورچے میں آئی اور صرف ایک جنگجو شہر کے قریب رہ گیا تھا، لوگوں نے اس شخص سے امان چاہی، امان نامہ لکھا گیا، اور فوج دیکھ کر تعجب کرنے لگی، لوگوں کے لئے شہر کا دروازہ کھول دیا اور فوج کو امان نامہ دکھایا، لشکر السلام نے بھی امان نامہ کی پابندی کی اور اس شہر والوں کو بھی پابند ہونے کی نصیحت کی۔ خلیفۂ وقت کو خط لکھا گیا تو اس نے جواب میں لکھا کہ ایک آدمی کا عہد و امان نامہ تمام مسلمانوں کی طرف سے عہد و پیمان شمار ہوتا ہے، لہٰذا اس ایک جنگجو نے امان دی اب تم سب پر ضروری ہے کہ اس کی پابند کرو، اور شہر والوں کو امان دو، اس کا اتنا اثر ہوا کہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے۔ [1]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ کی سرزمین پر حجۃ الوداع کے موقع پر لوگوں کے اجتماع سے فرمایا:

اَلْمُؤمِنُونَ اِخْوَةٌ تَتَكافَأُ دِمائُهُمْ وَ هُمْ يَدٌ عَلى مَنْ سِواهُمْ يَسْعى

---

[1] معجم البلدان، جلد 3، مادہ سُہر یاج.

بِذِمَّتِهِمْ اَدْناهُمْ.[1]

تمام مسلمان ایمان میں برابر ہیں، ان کوخون یکساں ہے وہ دشمن کے مقابلے میں متحد ہیں اوران میں بہت کم افرادتمام لوگوں کی طرف سے عہد کر سکتے ہیں۔

(۲) جب ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک اور واقعہ ملتا ہے، خلیفہ دوم کا زمانہ تھا، مسلمانوں نے ساسانیوں کوشکست دی اوران کے لشکر کا بڑا سردار ''ہرمزگان'' کوقیدی بنا لیا گیا اور اسے حضرت عمر کے سامنے لایا گیا،

خلیفہ نے اس سے کہا: تو نے کئی بار ہم سے عہد و پیمان کیے لیکن پھر تو نے وعدہ خلافی کی ہے اس کی دلیل کیا ہے؟

ہرمزگان نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ مجھے قتل کر دو گے۔

اسی دوران ہرمزگان نے پانی مانگا، پانی ایک سادے سے برتن میں لایا گیا، لیکن ہرمزگان نے کہا: میں مرجاؤں گا، لیکن اس برتن میں پانی پینا پسند نہیں کروں گا، کیونکہ برتن بہت ہی سادہ تھا۔

خلیفہ دوّم نے حکم دیا کہ دوسرے صاف اور اچھے برتن میں پانی لایا جائے، ہرمزگان نے پانی پیا اور کہنے لگا مجھے ڈر ہے تم مجھے قتل کر دو گے،

خلیفہ دومّ نے کہا: نہ ڈرو مجھے تجھ سے کوئی سروکار نہیں، اچانک ہرمزگان نے پانی کو برتن سے اُنڈیل دیا، خلیفہ دومّ سمجھے کہ پانی بے اختیاری کی حالت میں اس سے گر گیا ہے، لہٰذا حکم دیا اور پانی لایا جائے، تاکہ اسے پیاسا نہ قتل کیا جائے۔

ہرمزگان نے کہا، مجھے پانی کی ضرورت نہیں، میں نے تو سوچا کہ آپ نے مجھ سے سروکار نہ ہونے کے الفاظ کے ذریعے سے امان دے دی ہے۔

خلیفہ دومّ نے کہا: میں تجھے ہرصورت میں قتل کروں گا۔

لیکن ہرمزگان نے کہا: خلیفہ تم نے تو مجھے امان دی ہے!

خلیفہ دوم نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے۔

---

[1] اصول کافی، جلد 1، صفحہ 404، حدیث 2.

اس موقع پر ایک شخص اور وہاں موجود تھا اور کہنے لگا: ہرمزگان سچ کہتا ہے، خلیفہ تو نے اسے امان دی، کیونکہ تو نے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے تجھ سے کوئی سروکار نہیں اور پانی پیو،

خلیفہ دوم نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر ہرمزگان سے کہا، تو نے مجھے فریب دیا ہے، لیکن میں نے اس لئے فریب کھایا کہ شاید تو مسلمان ہو گیا ہے، اس دوران ہرمزگان مسلمان ہو گیا۔[1]

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد و امان لازم الوفا ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لَوْ اَنَّ قَوْماً حاصَرُوا مَدِيْنَةً فَسَأَلُوهُمُ الْاَمانَ فَقالُوا: لا، فَظَنُّوا اَنَّهُمْ قالُوا: نَعَمْ فَنُزِلُوا اِلَيْهِمْ كانُوا آمِنِينَ.[2]

جب بھی کوئی گروہ لشکر اسلام کے محاصرے میں ہو اور وہ امان کا تقاضا کریں، لیکن مسلمان اسے قبول نہ کریں، لیکن اگر وہ مسلمان لشکر کی طرف خود رجوع کریں محاصرے سے پہلے تو پھر اُن کو امان میں لیا جائے۔

منطقی بحث

صحیح نظریات اور حقائق تک پہنچنے کی بہترین راہ یہ ہے کہ انسان منطق اور استدلال سے بحث کرے اگر تعصب، ہوا و ہوس اور ہٹ دھرمی سے کام لے گا تو اس کے بُرے آثار مرتب ہو سکتے ہیں، لہٰذا اگر مختلف لوگوں کے افکار جمع ہوں تو ایک بہترین راہ حل سامنے آ سکتا ہے اور ترقی و عروج نصیب ہوتا ہے، اسلام نے تعصب کی عینک اُتار کر بحث کرنے کا حکم دیا ہے، اگر ضد اور تعصب ہو تو بہت سے حقائق پنہاں ہو سکتے ہیں، بحث میں حسن اخلاق کی رعایت ہونی چاہیے، بداخلاقی کی مذمت ہوئی ہے، لہٰذا منطقی بحث سے حق و عدالت قائم ہو سکتی ہے اب ہم ان آیات کو بیان کرتے ہیں جن میں یہ اہم موضوع بیان ہوا ہے۔

① يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد 11، صفحہ 383.

[2] وسائل الشیعہ، جلد 11، صفحہ 50، حدیث 4.

يَنْظُرُوْنَ.[1]

وہ لوگ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی تم سے (خواہ مخواہ) سچّی بات میں جھگڑتے تھے اور اس طرح (کرنے لگے) گویا وہ (زبردستی) موت کے منہ میں دھکیلے جارہے ہیں۔ اور اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔

② ۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا.[2]

اور ہم نے تو اس قرآن میں لوگوں (کے سمجھانے) کے واسطے ہر طرح کی مثالیں پھیر بدل کر بیان کر دی ہیں مگر انسان تمام مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

③ ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ.[3]

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بغیر جانے خدا کے بارے میں (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں

④ ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ.[4]

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بے جانے بوجھے بے ہدایت پائے بغیر روشن کتاب کے (جو اسے راہ بتائے خدا کی آیتوں سے) منہ موڑتے ہیں۔

⑤ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ.[5]

بے شک جو لوگ خدا کی آیتوں میں (خواہ مخواہ) جھگڑے نکالتے ہیں حالانکہ ان کے پاس (خدا کی طرف سے) کوئی دلیل تو آئی نہیں۔ ان کے دل میں بڑائی (کی بے جا ہوس) کے سوا

---

[1] انفال:6

[2] کہف:54

[3] حج:3

[4] حج:8

[5] غافر:56

کچھ نہیں حالانکہ وہ لوگ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں تو تم بس خدا کی پناہ مانگتے رہو بے شک وہ بڑا سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

⑥۔ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ.[1]

اور بول اُٹھے کہ بھلا ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ (عیسیٰؑ) ان لوگوں نے جو (عیسیٰؑ کی) مثال تم سے بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔ بلکہ (حق تو یہ ہے کہ) یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

⑦۔ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ.[2]

اور جس (ذبیحہ) پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو اس میں سے مت کھاؤ (کیونکہ) یہ بے شک بدچلنی ہے اور شیاطین تو اپنے ہوا خواہوں کے دل میں وسوسہ ڈالا ہی کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے (بے کار بے کار) جھگڑے کیا کریں اور اگر (کہیں) تم نے ان کا کہنا مان لیا تو (سمجھ رکھو کہ) بے شبہ تم بھی مشرک ہو۔

⑧۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ.[3]

حج کے مہینے تو (اب سب کو) معلوم ہیں (شوال، ذیقعد، ذی الحجہ) پس جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج لازم کرے تو (احرام سے) آخرِ حج تک نہ عورت کے پاس جائے نہ کوئی اور گناہ کرے اور نہ جھگڑے اور نیکی کا کوئی سا کام بھی کرو تو خدا اس کو خوب جانتا ہے اور (راستہ کے لیے) زادراہ مہیا کرلو اور سب سے بہتر زادِراہ پرہیزگاری ہے اے عقلمندو مجھ سے ڈرتے رہو۔

⑨۔ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ

---

[1] زخرف:58

[2] انعام:121

[3] بقرہ:197

وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ.[1]

جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اور جو مومن ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قیامت یقینی برحق ہے آگاہ رہو کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کیا کرتے ہیں وہ بڑے پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

۱۰۔ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ.[2]

اور لوطؑ نے ان کو ہماری پکڑ سے ڈرا بھی دیا تھا مگر ان لوگوں نے ڈرانے ہی میں شک کیا۔

تفسیر و خلاصہ

پہلی آیت میں ضعیف الایمان مومنین کے ایک گروہ کی راہِ خدا میں جنگ بدر کے دوران، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے حوصلہ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجادلہ کرنے کی مذمت کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ.

وہ لوگ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی تم سے (خواہ مخواہ) سچّی بات میں جھگڑتے تھے اور اس طرح (کرنے لگے) گویا وہ (زبردستی) موت کے منہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ اور اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے جو تازہ مسلمان ہوئے تھے وہ جنگ کا تجربہ نہیں رکھتے تھے اور میدان جنگ سے ڈرتے تھے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف انھیں فرمایا: میں خدا کے حکم سے جا رہا ہوں۔

پھر بھی وہ آپؐ سے جدال و بحث و مباحثہ کرتے تھے تا کہ آپؐ اس راہ سے پیچھے ہٹ جائیں، وہ گویا چند

---

[1] شوری:18

[2] قمر:36

قدموں پر موت کو دیکھ رہے تھے، درحقیقت وہ ضعیف ایمان والے تھے اور ان کے دل میں خوف ودہشت تھی، قرآن میں خدا نے ان کی مذمت کی اور بعد والی آیات میں صراحت سے موجود ہے کہ خدا چاہتا ہے، حق کو قوی کیا جائے، اور کافروں کا قلع قمع کیا جائے۔اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بحث وجدال کا سبب غیر منطقی گفتگو ہے۔

تاریخ اسلام میں ملتا ہے کہ جب مسلمانوں کے لشکر نے قریش کے تجارتی کارواں پر حملہ کرنا چاہا تو بعض ضعیف الایمان افراد نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ واپس مدینہ چلے جائیں کیونکہ قریش کے لشکر سے ہم میں جنگ کی طاقت نہیں، من جملہ حضرت ابوبکر اُٹھے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کرنے لگے، ''اے اللہ کے رسولؐ، قریش کے سردار ایمان نہیں لائے اور انھوں نے شکست بھی نہیں کھائی اور ہم جنگ کے لئے تیار نہیں لہٰذا بہتر ہے کہ مدینہ واپس چلے جائیں۔[1]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بیٹھ جاؤ،

پھر حضرت عمر کھڑے ہوئے اور یہی تکرار کی، لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔

پھر حضرت مقدادؓ اُٹھے اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! خدا نے آپؐ کو جس کا حکم دیا ہے اسی راہ پر قائم رہیں، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں،

خدا کی قسم! آپؐ حق کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں، آپؐ جہاں کا حکم دیں ہم جانے کے لئے تیار ہیں، اگر آپؐ حکم دیں تو ہم آگ کے شعلوں اور کانٹوں پر جانے کے لئے تیار ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقدادؓ کے حق میں دعا فرمائی''۔[2]

عجیب بات یہ ہے کہ ابن ہشام اور طبری نے اپنی اپنی کتابوں میں جنگ بدر کے حالات میں حضرت ابوبکر وعمر کے قول کو نقل نہیں کیا بلکہ صرف اتنا لکھا:

قالَ اَبُوبَکرُ وَ اَحسَنَ، ثُمَّ قامَ عُمَرُ بنِ الخَطّابِ وَ قالَ وَ اَحسَنَ.[3]

یعنی پہلے ابوبکر نے کہا اور اچھا کہا پھر عمر ابن خطاب نے کہا اور اچھا کہا۔

دوسری آیت میں تمام ہٹ دھرم اور متعصب نہ تجربے کار افراد کا ذکر ہوا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

---

[1] مغازی واقدی، جلد 1، صفحہ 48.

[2] قاموس الرجال، جلد 9، صفحہ 15.

[3] سیرہ ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 266 وتاریخ طبری، جلد 2، صفحہ 140.

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا.

اور ہم نے تو اس قرآن میں لوگوں (کے سمجھانے) کے واسطے ہر طرح کی مثالیں پھیر بدل کر بیان کر دی ہیں مگر انسان تمام مخلوقات سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

اس تعبیر سے معلوم ہوا کہ ناتجربہ کار افراد کی عادت جلدی کرنا ہوتی ہے، جو لوگ باطل اور تعصب سے گفتگو کرتے ہیں وہ حق سے دور ہوتے ہیں اور جو لوگ منطقی بحث کرتے ہیں وہ ہدایت پا جاتے ہیں۔

تیسری آیت میں مجادلہ کرنے والوں کے انجام کا ذکر ہوا ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ.

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بغیر جانے خدا کے بارے میں (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت کا نشان نزول نصر بن حارث کے بارے میں لکھا ہے جو کہ ہٹ دھرم اور متعصب مشرکین میں سے تھا۔قرآن کی توہین کرتا تھا اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتا تھا،لیکن آیت کا مفہوم عام ہے، اور تمام ان کو شامل ہے جو متعصب اور ضد سے کام لیتے ہیں۔

دلچسپ یہ ہے کہ جلدی کرنے والے افراد کو مردود اور شیطان کا پیرو کار شمار کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مجادلہ باطل اور شیطانی عمل ہے، شیطان کی صفت مُرید یعنی مردود اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ مردود کی صفت والے حق کے برابر اور اس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں، جملہ "یجادل فی اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفات کے بارے میں یا اس کی قدرت وعمل کے بارے میں جدل کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کی مذمت اور باطل آشکار ہے۔

اس صورت حال کو سورہ حج کی آٹھویں آیت میں خدا فرماتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ.

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بے جانے بوجھے بے ہدایت پائے بغیر روشن کتاب کے (جو اسے راہ بتائے خدا کی آیتوں سے) منہ موڑتے ہیں۔

علم ومعرفت اور ہدایت راہنمائی، صرف آسمانی کتابوں کی صورت میں روشن ہے، نہ صرف یہ ضرورت ہے بلکہ تمام مشکلات کے حل کی کلید ہے، اگر علم وآگاہی، معرفت اور راہنمائی نہ ہو تو جدال میں ہوا وہوس کی راہ تعصب اور حد کی

شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کا نتیجہ گمراہی اور بدبختی ہے۔

اسی سورہ کی نویں آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ.

(خواہ مخواہ) خدا کے بارے میں لڑنے (مرنے) پر تیار ہیں تا کہ (لوگوں کو) خدا کی راہ سے بہکا دے۔ ایسے (نابکار) کے لیے دنیا میں (بھی) رسوائی ہے اور قیامت کے دن (بھی) ہم اسے جہنم کے عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔

پانچویں آیت میں باطل جدال کرنے والوں کا ایک اور سبب بیان ہو رہا ہے اور وہ تکبر اور خود پسندی ہے جو دوسروں کو گمراہ کرنے کا سبب ہے، اس سے لوگ ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور اپنے ہدف میں کامیاب نہیں ہوتے، خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ

بے شک جو لوگ خدا کی آیتوں میں (خواہ مخواہ) جھگڑے نکالتے ہیں حالانکہ ان کے پاس (خدا کی طرف سے) کوئی دلیل تو آئی نہیں۔

کلمہ سلطان یہاں پر دلیل، حجت اور برہان کے معنی استعمال ہوا ہے جدال کی اصل جڑ تکبر میں ہے، یہ ایک اندرونی صفت جو انسان کے باطن میں موجود ہے اور آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے، یہ خطرناک اخلاقی بیماری ہے، آیت میں آیا ہے:

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ.

تم بس خدا کی پناہ مانگتے رہو بے شک وہ بڑا سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

چھٹی آیت میں مشرکین کا ذکر ہوا ہے جو سخت کفر و شرک پر اصرار کرتے تھے، اپنے کاموں کی تاویل کرتے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدال کرتے تھے، جب خدا نے فرمایا، کہ تم اور تمہارے ہٹ دھرم ساتھی دوزخ میں جائیں گے تو انھوں نے جدال کیا اور کہا:

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ

اور بول اُٹھے کہ بھلا ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ (عیسیٰؑ)

پھر خداوند عالم فرماتا ہے:

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ.

ان لوگوں نے جو (عیسیٰؑ کی) مثال تم سے بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔ بلکہ (حق تو یہ ہے کہ) یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

پھر قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بت پرستوں کے درمیان فرق بیان ہوا، خدا فرماتا ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.

عیسیٰؑ تو بس ہمارے ایک بندے تھے جن پر ہم نے احسان کیا (نبی بنایا اور معجزے دیئے) اور ان کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے (اپنی قدرت کا) نمونہ بنایا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھتے تھے اور راضی نہ تھے، کہ لوگ ان کی عبادت کریں، عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، لیکن خود اس بات کی نفی فرمارہے ہیں، یہ جملہ "**هم قوم خصمون**" سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدال باطل کا ایک سبب ہے بغض و عداوت ہے اور انسان غیر منطقی گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ خود جانتا ہے کہ جو وہ کہہ رہا ہے وہ باطل ہے لیکن کینہ وحسد اسے حق کے سامنے تسلیم نہیں ہونے دیتے۔

ساتویں آیت میں حرام مردار اور وہ حیوان جو بتوں کے لئے ذبح کیا جاتا تھا کا ذکر ہے یا وہ گوشت جس پر اللہ کا نام نہ لیا اور ذبح کیا گیا ہو، یہ کام گناہ ہے (**وانه لفسق**) پھر خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور جس (ذبیحہ) پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو اس میں سے مت کھاؤ (کیونکہ) یہ بے شک بدچلنی ہے اور شیاطین تو اپنے ہوا خواہوں کے دل میں وسوسہ ڈالا ہی کرتے ہیں تا کہ وہ تم سے (بے کار بے کار) جھگڑے کیا کریں اور اگر (کہیں) تم نے ان کا کہنا مان لیا تو (سمجھ رکھو کہ) بے شبہ تم بھی مشرک ہو۔

بعض مفسرین جیسے مرحوم طبرسی اور ابوالفتوح رازی نے یہ لکھا ہے کہ یا جدال سے مراد یہ تھی وہ کہتے تھے اگر ہم مردار کا گوشت کھاتے ہیں تو یہ اسلئے ہے کہ انھیں خدا نے مارا ہے اور جو حیوان ہم ذبح کرتے ہیں وہ اس سے بہتر ہے باطل مردار خور افراد کے لئے شیطان کے دوستوں میں ان کے دلوں میں ڈال رکھا تھا، ذبح شدہ گوشت سے مردار

کے گوشت کو اچھا سمجھنا بلکہ اس سے بہتر سمجھنا ایک شیطانی فکر ہوسکتی ہے۔

بعض روایات میں ملتا ہے کہ یہ باطل سخن ایک مجوسی گروہ کا ہے کہ جو انھوں نے مشرکین کو ایک خط لکھا تھا۔

آٹھویں آیت احرام اور حج کے دوران جدال کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ.

حج کے مہینے تو (اب سب کو) معلوم ہیں (شوال ،ذیقعد ،ذی الحجہ) پس جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج لازم کرے تو (احرام سے) آخرِ حج تک نہ عورت کے پاس جائے نہ کوئی اور گناہ کرے اور نہ جھگڑے اور نیکی کا کوئی سا کام بھی کرو تو خدا اس کو خوب جانتا ہے اور (راستہ کے لیے) زادراہ مہیا کرلو اور سب سے بہتر زادِراہ پرہیز گاری ہے اے عقلمندو مجھ سے ڈرتے رہو۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ احرام ایک معنوی و روحانی حالت کا نام ہے اس سے انسان کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے، اس لئے بہت سے مباح کام حرام کی حالت میں ممنوع قرار دیئے گئے ہیں اور بعض حرام کا گناہ اور زیادہ ہے کہ جب انھیں اس حالت میں انجام دیا جائے۔ فقہاء کے نزدیک پچیس (۲۵) کام ایسے ہیں جو حرام ہیں ان میں سے ایک جدال ہے۔

فقہاء کے قول کے مطابق جدال سے مراد کلمہ جسے ''بلیٰ'' والا کہنا ہے، اور فسق سے مراد جھوٹ بولنا، گالیاں دینا اور دوسروں پر برتری کے حصول کا اظہار کرنا، لیکن بعید نہیں کہ ہر قسم کے جھگڑے کو جدال کہتے ہیں، بہر حال حرام کی حالت میں جدال کا منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے انسان خدا سے دور ہوتا ہے، مذکورہ روایت میں جملہ خبریہ استعمال ہوا ہے، حج میں جدال کا وجود نہیں ہے، یہ جملہ تاکید ہے جو کہ یہ عمل روح حج سازگار نہیں ہے۔

آیت نہم میں مراد جو جدال کے مشابہ ہے کا ذکر ہوا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ.

جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اور جو مومن ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قیامت یقینی برحق ہے آگاہ رہو کہ جو لوگ قیامت کے

بارے میں شک کیا کرتے ہیں وہ بڑے پر لے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

واضح ہے کہ ہدایت یعنی انسان حق جو اور حق طلب ہو، جہاں بھی حق ہو اسے قبول کرتا ہو، جب تکبر وغرور اور حق سے مانع ہونے سے انسان گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے، مردار اور جدال میں فرق بعد میں بیان ہوگا۔

آیت دسویں اور آخری آیت میں ضدی قوم لوط کا ذکر ہوا ہے، جتنا ان کے نبی نے عذاب الٰہی سے ڈرایا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور قوم نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، بلکہ جنگ وجدال کے لئے تیار ہو گئے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ.

اور لوطؑ نے ان کو ہماری پکڑ سے ڈرا بھی دیا تھا مگر ان لوگوں نے ڈرانے ہی میں شک کیا۔

یہی سبب بنا کہ قوم لوط غافل رہی اور فرمان الٰہی صادر ہوا ان کا شہر شدید زلزلوں کی لپیٹ میں آ گیا، اور نیست و نابود ہو گئے، ان کی لاشوں پر آسمان سے پتھر گرے، یہ ہے مراد اور جدال کرنے والوں کا انجام، اس آیت میں واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دو رزائل اخلاقی کتنے خطرناک ہیں کہ جس سے انسان ہدایت نہیں پا سکتا، بلکہ شیطانی ہوتا ہے اور عذاب الٰہی میں غوطہ ور ہوتا ہے۔



اَرْبَعٌ یُمِتْنَ الْقُلُوبَ اَلذَّنْبُ عَلَی الذَّنْبِ وَ کَثْرَۃُ مُناقَشَۃِ النِساءِ یَعْنی مُحادَثَتَھُنَّ وَ مُماراتُ الْاَحْمَقِ تَقُولُ وَ یَقُولُ وَ لا یَرْجِعُ اِلی خَیْرٍ وَ مُجالَسَۃُ الْمَوْتی فَقَیلِ یا رَسُولَ اللہِ وَ ما الْمَوْتی قالَ کُلُّ غَنِی مُتْرَفٌ.

چار چیزیں انسان کے دل کو مار دیتی ہیں، پے در پے گناہ بغیر معرفت کے زیادہ گفتگو کرنا، احمق سے مناظرہ کرنا، کیونکہ تو ایک چیز کہتا ہے تو وہ دوسری چیز اور تم کسی نتیجے تک نہیں پہنچتے اور مُردوں کی ہم نشینی۔ بعض نے تعجب سے پوچھا! مُردوں سے کیا مراد ہے اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟

فرمایا: ہر ثروت مند جو غافل

اور مغرور و مست ہو۔

۱۰۔جدال ومراء کی تعریف

جدال مراء اور مخاصمہ میں فرق

کلمہ جدل و جدال کے بارے میں راغب کہتا ہے،(جدلت الحبل) یعنی اس نے ان کو حکم بتایا ایسا شخص جو لڑاکا ہو، جھگڑالو قسم کا آدمی ہو، جو دوسرے کو اس کے عقائد اور انکار سے دور کرے، بعض نے کہا کہ جدال کا معنی مارنا ہے یا دوسرے کو زمین پر دے مارنا، البتہ جدال دو قسم کا ہوتا ہے:

(۱) جدال حق

(۲) جدال باطل

جدال حق کی تعریف ہوئی ہے لیکن جدال باطل کی مذمت ہوتی ہے قرآن مجید میں ایک جگہ خداوند عالم فرماتا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط [1]

---

[1] سورۂ نحل:۱۲۵

(اے رسولؐ) تم (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو اس طریقہ سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک گئے ان کو تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی خوب واقف ہے۔

یہاں پر رسول خداؐ، جدال حق کے لئے مامور ہوئے ہیں اور حکمت و وعدہ ونصیحت کے لئے مبعوث ہوئے۔ لیکن جدال باطل وہی ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے کہ متعصب اور ضدی قسم کے افراد، واضح اور روشن دلیل کو انکار کرنے والے تھے، (مراء) بروزن حجاب کا معنی یہ ہے کہ ایسی گفتگو کرنا جس میں شک وتردید ہو۔

راغب کہتا ہے:

یہ اصل میں (مَرَیْتُ النّاقَةَ) یعنی اونٹ کا دودھ دوہنے کے لئے اس کا پستان پکڑنے کے معنی میں ہے اس کے بعد ہر اس بات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس میں شک وتردید ہو۔

بعض نے اس سے دقیق تر بیان کیا ہے اور لکھا ہے:

(مَرَیْتُ النّاقَةَ) وہاں کہا جاتا ہے کہ جب اونٹنی کا دودھ دوہ لینے کے بعد باقی بچنے والے دودھ کو خارج کرنا یعنی، شاید باقی دودھ ہے یا نہیں یہ عمل شک وتردید میں انجام دیا جاتا ہے، لیکن بعد میں ہر قسم کے شک وتردید کے موضوع میں استعمال ہونے لگا، خواہ وہ بحث مثبت اور باحق ہو یا ضدی قسم کی بحث ہو۔

سورہ کہف کی آیت ۲۲، میں (مراء) مثبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ مخالفین سے اصحاب کہف کے بارے میں بحث کرو تو آشکارانہ طور پر گفتگو کے لئے بیٹھ جاؤ:

فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا [1]

(اے رسولؐ) تم (ان لوگوں سے) اصحاب کہف کے بارے میں سرسری گفتگو کے سوا (زیادہ) نہ جھگڑو۔

اس کے منفی موارد زیادہ ہیں، آیت مذکورہ میں دو موارد میں منفی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] کہف:۲۲

یاد رہے کہ کلمہ (مریہ) بروزن خزیہ وقریہ تقسیم گیری میں تردید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

جدال ومراء روایات میں جیسا کہ جدال باطل کے آثار مانند حق کا مخفی ہونا، تعصب میں اضافہ غصہ اور دوسرے بے شمار فسادات بیان ہو چکے ہیں، اس طرح روایات میں اس کی سختی سے منع کیا گیا ہے۔

(۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ اَنْ هَدَاهُمُ اللهُ اِلَّا اُوتُوا الْجَدَلَ.[۱]

کوئی قوم اس کی ہدایات کے بعد گمراہ نہیں ہوئی مگر یہ کہ وہ جدال میں اسیر ہوئے۔

(۲) اسی مضمون سے ملتی جلتی روایت آپؐ سے نقل ہوئی ہے:

مَا ضَلَّ قَوْمٌ اِلَّا وَ اَوْثَقَ الْجَدَلَ.[۲]

کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ اس نے جدال کیا۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لَعَنَ اللهُ الَّذِينَ يُجادِلُونَ فِي دِينِهِ اُولئِكَ مَلْعُونُونَ عَلى لِسانِ نَبِيِّهِ.[۳]

خداوند عالم کی ایسے لوگوں پر لعنت ہو کہ جو دین میں مجادلہ کرتے ہیں، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ملعون ومرتد قرار پائے۔

(۴) آپؑ ہی سے مروی ہے کہ:

اَلْجَدَلُ فِي الدِّينِ يُفْسِدُ الْيَقِينَ.[۴]

دین میں جدال ایمان میں فساد کا باعث ہے

(۵) امام جعفر صدق علیہ السلام نے فرمایا:

اِيّاكُمْ وَ الْخُصُومَةَ فِي الدِّينِ فَاِنَّها تُشْغِلُ الْقَلْبَ عَنْ ذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ تُورِثُ النِّفاقَ، وَ تَكْسِبُ الضَّغائِنَ، وَتَسْتَجِيرُ الْكِذْبَ.

---

[۱] احیاء العلوم، جلد 3، صفحہ 1553.

[۲] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 138، حدیث 52.

[۳] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 129، حدیث 13.

[۴] غرر الحکم، حدیث 1177.

دین میں جدال سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے فکرِ انسان ذکر خدا سے دور ہو جاتی ہے، اختلاف، نفاق، کینہ، اور عداوت کا سبب بنتا ہے، اسی طرح انسان جھوٹ کی پناہ لیتا ہے۔

(۶) امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

اِيّاكَ وَ الْخُصُومَةَ فَاِنَّها تُورِثُ الشَّكَّ وَ تَحبِطُ الْعَمَلَ وَ تُرْدِي بِصاحِبِها.[۱]

جدال و جھگڑے سے شک و تردید پیدا ہوتی ہے اور انسان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، اور انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اور بعض اوقات انسان ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ جو بخشش کے قابل نہیں ہوتی۔

(۷) لقمان حکیم جدال کے بارے میں اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں:

يابُنَيَّ لا تُجادِلِ الْعُلَماءَ فَيَمْقُتُوكَ.[۲]

اے بیٹے! دانشمندوں سے جدال نہ کرنا، کہ تیرے دشمن ہوں گے۔

(۸) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ طَلَبَ الدِّينَ بِالْجَدَلِ تَزَنْدَقَ.[۳]

جو شخص دین کو جدال سے لیتا ہے وہ کفر کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

(۹) امام علی رضا علیہ السلام اپنے صحابی سے فرماتے ہیں:

اَبلِغْ عَنِّي اَوْلِيائِيَ السَّلامَ وَ قُلْ لَهُمْ اَنْ لا تَجْعَلُوا لِلشَّيْطانِ عَلى اَنْفُسِهِمْ سَبِيلا وَ مُرْهُمْ بِالصِّدْقِ فِي الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الأَمانَةِ وَ مُرْهُمْ بِالسُّكُوتِ وَ تَرْكِ الْجِدالِ فِيما لا يَعْنِيهِمْ.[۴]

میرے دوستوں کو میرا سلام کہنا، اور انہیں کہہ دینا کہ شیطان کے نقش قدم پر نہ چلنا، انھیں صداقت کا حکم دینا اور امانت کی ادائیگی کی نصیحت کرنا اور انہیں ایسے اُمور میں جو ان سے

---

[۱] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 128، حدیث 6.

[۲] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 134، حدیث 30.

[۳] مجموعہ ورّام، جلد 1، صفحہ 117، (باب ما جاء فی المراء والمزاح).

[۴] المحجۃ البیضاء، جلد 1، صفحہ 107.

مربوط نہیں ہیں اُن کو ترک جدال کرنے کی نصیحت کرو۔

(۱۰) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لا يَسْتَكْمِلُ عَبْدٌ حَقِيقَةَ الْإِيمانِ حَتّٰى يَدَعَ الْمِراءَ وَ الْجَدَلَ وَ إِنْ كانَ مُحِقّاً.[۱]

انسان دین کی حقیقت کو کمال تک نہیں پہنچا سکتا سوائے اس کے کہ وہ (مراء) وجدال کو ترک کرے اگرچہ باحق ہی کیونکہ نہ ہو۔

اب (مراء) اور جدال میں فرق بیان ہو چکا ہے کہ جدال لفظوں میں ہوتا، لیکن (مراء) ہر وہ چیز جس میں شک وتردید ہو۔

مراء کے حوالے سے روایات پیش مطالعہ ہیں:

(۱) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لايَسْتَكْمِلُ عَبْدٌ حَقِيقَةَ الْإِيمانَ حَتّٰى يَدَعَ الْمِراءَ وَإِنْ كانَ مُحِقّاً.[۲]

کسی شخص کا ایمان کامل نہیں ہوتا جب تک وہ (مراء) کو ترک نہ کر دیتے اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) چند اصحاب کی زبانی نقل ہے کہ ایک دفعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم ایک مسئلہ میں (مراء) کر رہے تھے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراض ہوئے اور پھر فرمایا:

إِنَّما هَلَكَ مَنْ كانَ قَبْلَكُمْ بِهذا، ذَرُوا الْمِراءَ فَإِنَّ الْمُؤْمِنَ لايُمارِي، ذَرُوا الْمِراءِ فَإِنَّ الْمُمارِي قَدْ تَمَّتْ خَسارَتُه، ذَرُوا الْمِراءِ فَإِنَّ الْمُمارِي لا أَشْفَعُ لَهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ ذَرُوا الْمِراءِ فَأَنَا زَعِيمٌ بِثَلاثَةِ أَبْياتٍ فِي الْجَنَّةِ فِي رِياضِها وَ أَوْسَطِها وَ أَعْلاها لِمَنْ تَرَكَ الْمِراءِ وَ هُوَ صادِقٌ، ذَرُوا الْمِراءِ فَإِنَّ أَوَّلَ ما نَهانِي عَنْهُ رَبِّي بَعْدَ عِبادَةِ الْأَوْثانِ الْمِراءُ.[۳]

---

[۱] میزان الحکمہ، جلد 1، صفحہ 372.

[۲] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 208.

[۳] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 138، حدیث 53.

تم سے پہلے والی اقوام ہوس آلودہ بحث ومباحثہ کی وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں (مراء) کو ترک کرو کیونکہ مراء کرنا مومن کی شان نہیں، (مراء) کو چھوڑ دو کیونکہ مراء کرنے والا خسارے میں ہے، مراء کو ترک کردو کیونکہ مراء کرنے والے کی روز قیامت میں شفاعت نہیں کروں گا، (مراء) کو چھوڑ دو اگرچہ حق ہو ایسے شخص کے لئے میں جنت میں تین گھروں کی ضمانت دیتا ہوں۔

(۱) ریاض جنت

(۲) وسط جنت

(۳) جنت کے اوپر

مراء کو چھوڑ دو کیونکہ بت پرستی کے بعد خداوند عالم نے جو اولین چیز سے منع فرمایا وہ مراء تھا۔

(۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ذَرُوا الْمِراءَ فَاِنَّهُ لاتَفْهَمُ حِكْمَتُهُ وَلا تُؤْمَنُ فِتْنَتُه.[۱]

مراء کو ترک کرو کیونکہ اس میں حکمت نہیں ہے اور فتنہ سے امان نہیں ہے۔

(۴) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْمِراءُ داءٌ رَدِیٌّ وَ لَیْسَ لِلْاِنْسانِ خَصْلَةٌ شَرٌّ مِنْهُ وَ هُوَ خُلُقُ اِبْلیسَ وَ نِسْبَتِهِ فَلا یُماری فی اَیِّ حال کانَ اِلّا مَنْ کانَ جاهِلا بِنَفْسِهِ وَ بِغَیْرِهِ مَحْرُوماً مِنْ حَقایِقِ الدّینِ.[۲]

مراء (بحث غیر منطقی) ایک مصیبت ہے، اور انسان کے لئے اس سے بدتر کوئی صفت نہیں ہے اور وہ ابلیس اور اس سے منسوب افراد کا اخلاق ہے مراء کرنے والا صرف جاہل آدمی ہو سکتا ہے اور دین کے حقائق سے محروم ہوتا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مراء کرنے والا اپنے آپ کو غلطی سے پاک اور دوسروں کو خطا کار سمجھتا ہے اور یہ اس مطلب کی دلیل ہے کہ وہ نہ خود پہنچا تا ہے اور نہ دوسروں کو ایسا شخص دینی حقائق حاصل کرنے سے محروم رہتا

---

[۱] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 138، حدیث ۵۰.

[۲] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 135، حدیث 32.

ہے۔

(۵) ایک حدیث میں ملتا ہے کہ ایک شخص امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا، آؤ بیٹھتے ہیں تا کہ دینی مسائل پر گفتگو کریں اور بحث ومناظرہ کریں، امامؑ نے جواب میں فرمایا:

يا هذا اَنَا بَصيرٌ بِدينى مَكْشُوفٌ عَلَيَّ هُداىَ فَاِنْ كُنْتَ جاهِلاً بِدينِكَ فَاذْهَبْ وَ اطْلُبْهُ مالى وَلِلْمُماراتْ وَاِنَّ الشَّيْطانَ لَيُوَسْوِسُ لِلرَّجُلِ وَ يُناجيهِ وَ يَقُولُ ناظِرِ النّاسَ فِي الدّينِ كَيْ لا يَظُنُّوا بِكَ الْعَجْزَ وَ الْجَهْلَ..... [۱]

اے مرد، میں دین سے آشنا ہوں اور میری ہدایت روشن ہے اگر تو دین سے جاہل ہے تو جا اور تحقیق کرو، مجھے مراء سے کیا سروکار ہے، جان لو، شیطان ہمیشہ انسان کو وسوسہ میں ڈالتا ہے اور شیطان انسان کے کان میں کہتا ہے کہ وہ بحث ومناظرہ کرے اور دین میں بحث کرے تا کہ گمان کریں تو جاہل ہے۔

(۶) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَرْبَعٌ يُمِتْنَ الْقُلُوبَ اَلذَّنْبُ عَلَى الذَّنْبِ وَ كَثْرَةُ مُناقَشَةِ النِساءِ يَعْنى مُحادَثَتَهُنَّ وَ مُماراتُ الْاَحْمَقِ تَقُولُ وَ يَقُولُ وَ لا يَرْجِعُ اِلى خَيْرٍ وَ مُجالَسَةُ الْمَوْتى فَقيلِ يارَسُولَ اللهِ وَما الْمَوْتى قالَ كُلُّ غَنِي مُتْرَفٌ. [۲]

چار چیزیں انسان کے دل کو مار دیتی ہیں، پے در پے گناہ بغیر معرفت کے زیادہ گفتگو کرنا، احمق سے مناظرہ کرنا، کیونکہ تو ایک چیز کہتا ہے تو وہ دوسری چیز اور تم کسی نتیجے تک نہیں پہنچتے اور مُردوں کی ہم نشینی۔

بعض نے تعجب سے پوچھا! مُردوں سے کیا مراد ہے اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟

آپؐ نے فرمایا: ہر ثروت مند جو غافل اور مغرور ومست ہو۔

(۷) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَيّاكُم وَ الْمِراءَ وَ الْخُصُومَةَ فَاِنَّهُما يَمْرُضانِ الْقُلُوبَ عَلَى الْاِخوانِ وَ

---

[۱] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 135، حدیث 32.

[۲] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 128، حدیث 10.

يُنْبِتُ عَلَيْهِمَا النِفاقَ.[1]

مراء جدال اور کینہ توزی والی بحث سے پرہیز کرو کیونکہ اس سے مومن بھائیوں کے ایک دوسرے کے دل بیمار ہوتے ہیں اور تفرقہ کا باعث ہوتا ہے۔

(۸) اسی وجہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک جامع حدیث میں آیا کہ آپؐ نے فرمایا:

اَوْرَعُ النّاسِ مَنْ تَرَكَ الْمِراءَ وَاِنْ كانَ مُحِقاً.[2]

لوگوں میں سب سے زیادہ متقی وہ شخص ہے جو مراء کو چھوڑ دیتا ہے اور اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔

(۹) حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے:

جِماعُ الشَّرِ اللِّجاجُ وَ كَثْرَةُ الْمُماراةِ.[3]

شر کا مرکز کثرت بحث و مباحثہ اور غیر منطقی گفتگو ہے۔

(۱۰) یہ حدیث حضرت سلمان فارسیؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لا يُؤْمِنُ رَجُلٌ حَتّى يُحِبَّ اَهْلَ بَيْتِي وَ حَتّى يَدَعَ الْمِراءَ وَهُوَ مُحِقٌّ

فَقالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطابِ ما عَلامَةُ حُبِّ اَهْلِ بَيْتِكَ؟ قالَ: هذا، فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلى عَلِي بْنِ اَبي طالِب(السلام عليه).[4]

مجھ پر کوئی شخص ایمان نہیں لایا جب تک اس نے اہل بیتؑ سے دوستی نہیں رکھی اور مراء کو ترک نہ کیا ہو اگرچہ وہ حق پر (چلنے کی کوشش کرتا) ہو۔

حضرت عمر وہاں حاضر تھے انہوں نے پوچھا: محبت اہل بیتؑ کی نشانی کیا ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو اِسے دوست رکھتا ہو پھر آپؐ نے اپنا ہاتھ علی علیہ السلام کے کاندھے پر مارا۔

---

[1] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 139، حدیث 56.

[2] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 127، حدیث 3.

[3] غرر، جلد 3، صفحہ 376، حدیث 4795.

[4] سفینۃ البحار، مادہ «مَرَءَ» بحارالانوار، جلد 27، صفحہ 107، حدیث 79.

بے شک ان دو موضوعات کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کلام میں دو نشانیاں ذکر کی ہیں، ان کا آپس میں گہرا ربط ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے فضائل کے دلائل اتنے روشن ہیں کہ جس میں جدال و مراء کی ضرورت نہیں ہے۔

روایات میں مراء کے آثار و نتائج

بعض روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ جدال و مراء قلب کو بیمار کر دیتے ہیں ممکن ہے قلب بمعنی عقل ہو اور بیماری سے مراد عدم درک حقائق ہو۔

جدال و مراء کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کی شخصیت کمزور ہو جاتی ہے اور جاہلوں کی زبان کھل جاتی ہے۔

بعض اوقات واضح ترین چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا اور انکار کرنے لگتا ہے یا ان مطالب کا دفاع کرتا ہے جس پر عام لوگوں کی نظر میں اس کی تضحیک ہوتی ہے۔

اگر انسان کسی جاہل سے جدال و مراء کرے تو سوائے ہتک عزت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدال و مراء سے انسان کو چار نقصانات ہوتے ہیں:

(۱) قلب انسان مردہ ہو جاتا ہے۔

(۲) روح انسان بیمار ہو جاتی ہے۔ شک و تردید دین خدا پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ کافر ہو جاتا ہے۔

(۳) دوستوں کے درمیان عداوت و دشمن پیدا ہوتی ہے اور انسان خدا سے غافل ہوتا ہے۔

(۴) آہستہ آہستہ انسان سے علم رخصت ہو جاتا ہے۔

جدال ومراء کے اسباب

۱۔ جدال ومراء کا مہم ترین عامل تکبر وغرور ہے جو انسان کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ حق کے سامنے تسلیم ہو جائے امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد سے روایت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

اِنَّ مِنَ التَّواضُعِ اَنْ یَرْضی الرَّجُلُ بِالْمَجْلِسِ دُونَ الْمَجْلِسِ وَ اَنْ یُسَلِّمَ عَلی مَنْ یَلْقی وَ اَنْ یَتْرُكَ الْمِراءَ وَاِنْ كانَ مُحِقّاً وَ لا یُحِبَّ اَنْ یُحْمَدَ عَلَی التَقْوی.[1]

اس حدیث میں امام نے چار چیزوں کو تواضع کی نشانیاں بتائی ہیں:

(۱) محفل میں جہاں جگہ مل جائے بیٹھ جانا۔

(۲) ہر ایک ملاقات کرنے والے کو سلام کرنا۔

(۳) جدال ومراء کو ترک کرنا اگرچہ وہ حق کے ساتھ ہو

(۴) تقویٰ کی تعریف پر خوش ہونے کی بجائے انکساری کرنا۔

۲۔ اظہار فضل اور ریاکاری اس کا ایک سبب ہے، پہلے حدیث بیان ہو چکی ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اِنَّ الشَّیْطانَ لَیُوَسوِسُ لِلرَّجُلِ وَ یُناجیهِ وَ یَقُولُ ناظِرِ النّاسِ فِی الدِّینِ كَیْ لا یَظُنُّوا بِكَ الْعَجْزَ وَ الْجَهْلَ.[2]

شیطان ہمیشہ انسان کو وسوسہ میں ڈالتا ہے اور لوگوں کے کانوں میں یہ بات ڈال دیتا ہے وہ لوگوں کے ساتھ مناظرہ کرے اور عاجزی کا اظہار نہ کرے۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے طالب علموں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ گروہ جو علم حاصل کرتا ہے تا کہ لوگوں سے جدال ومراء اور غیر منطقی بحث کرے، دوسرا گروہ وہ ہے جو علم حاصل کرتا ہے لیکن فخر فروشی

---

[1] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 131، حدیث 20.

[2] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 135، حدیث 32.

کے لئے حاصل کرتا ہے، تیسرا گروہ علم حاصل کرتا ہے تا کہ اس پر عمل کرے اور دوسروں کو اس علم کی تعلیم دے، پھر پہلے گروہ کے بارے میں ہے:

وَ اِنَّ الشَّیْطانَ لَیُوَسْوِسُ لِلرَّجُلِ وَ یُناجیهِ وَ یَقُولُ ناظِرِ النّاسِ فِی الدِّینِ کَیْ لا یَظُنُّوا بِكَ الْعَجْزَ وَ الْجَهْلَ.

جو شخص علم کو جدال اور مراء کے لئے طلب کرتا ہے اس کے کلام سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور اپنی گفتگو وہاں کرتا ہے جہاں مجلس و محفل ہو،

آخر میں امامؑ اس شخص پر نفرین کرتے ہیں۔

فَصاحِبُ الْجَهْلِ وَ الْمِراءِ مُوذٍ مُمارٍ مُتَعَرِّضٌ لِلْمَقالِ فِی اَنْدِیَةِ الرِّجالِ.

خداوند عالم ایسے شخص کی ناک خاک پر رگڑاتا ہے۔ معاشرے میں اس کی ناک کٹ جاتی ہے۔

ایک روایت میں امامؑ نے اس پر نفرین کی ہے فرماتے ہیں:

فَدَقَّ اللهُ مِنْ هذا خَیْشُومَهُ.[1]

خداوند عالم اس کی ناک زمین پر رگڑے۔

۳۔ اسی موضوع پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث ہے جس میں آپؑ نے فرمایا کہ مراء ایک بیماری ہے اور یہ شیطانی عمل ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

فَلا یُمارِی فِی اَیِّ حالٍ کانَ اِلّا مَنْ کانَ جاهِلا بِنَفْسِهِ وَ بِغَیْرِهِ.[2]

مراء کرنے والا شخص صرف جاہل ہوسکتا ہے اس کے علاوہ کوئی جدال و مراء نہیں کرتا۔

۴، ۵۔ انتقام جوئی اور حسد مراء اور ان میں سے ہر کے دو سبب ہیں:

1. دوسروں کی آبرو ریزی کی خاطر ان سے انتقام جوئی اور حسد کرتا ہے۔
2. وہ اپنی توہین و تحقیر کو چھپانے اور حسد کی آگ بجھانے کے لئے ان رزائل کا سہارا لیتا ہے۔

۶۔ تعصب اور جھگڑا جدال و مراء کے مہم عوامل میں سے ہے ایسی صفت کا انسان اپنے فاسد عقائد سے

---

[1] مقدمہ کتاب معالم الاصول، صفحہ 11.

[2] بحار الانوار، جلد 2، صفحہ 134، حدیث 31.

آسانی سے دستبردار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر آئے دن بحث و مناظرہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنے باطل عقائد کو دوسروں پر متحمل کرانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ انبیاء کے سامنے ہر کردار ادا کرتے تھے۔

مثال کے طور پر بابل کے بت پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے ایسا ہی کرتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن تعصب اور ضدی پر ڈٹے رہے اور جہالت وظلمت کے بادل ان پر چھائے رہے، عقل وفکر پر پردے پڑے رہے اور اپنی احمقانہ حرکت کو جاری رکھا۔

۷۔ اکثر یا تمام گناہوں کا اصلی عاقل دنیا پرستی ہے اور یہی جدال ومراء کا ایک عامل بھی ہے۔ اس کے ذریعے لوگ اپنا مقام بلند کرنا چاہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس کے منفی اثرات بہت زیادہ ہیں اور ان کے برے آثار ہوتے ہیں، انسان کو ادب وعدل اور انسانیت سے دور کرتے ہیں۔ وہ انسان مجبور ہوجاتا ہے حق کے مقابلے میں آئے اور اپنے باطل کا دفاع کرے۔

اقسام مراء وجدال

جدال اور مراء کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱ جدال ومراء مثبت۔

۲ جدال ومراء منفی

جدال ومراء مثبت یعنی منطقی گفتگو کرنا اور مسائل وحقائق کی وضاحت کرنا۔ مراء وجدال منفی یعنی جھگڑالو بحث کرنا۔ ضد بازی کرنا ایسے شخص کا کوئی ہدف نہیں ہوتا۔ اس کا ہدف روشن حقائق کرنا نہیں بلکہ اس کا ہدف ضد، تعصب اور خود پسندی ہوتا ہے اور دوسروں پر برتری حاصل کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ تقسیم آیات میں نظر آتی ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ
وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ

مُسْلِمُوْنَ.[1]

اور (اے ایماندارو!) مناظرہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر عمدہ اور شائستہ الفاظ وعنوان سے لیکن ان میں سے جن لوگوں نے تم پر ظلم کیا۔ (ان کے ساتھ رعایت نہ کرو) اور صاف صاف کہہ دو (کتاب) جو ہم پر نازل ہوئی اور جو کتاب تم پر نازل ہوئی ہے ہم تو سب پر ایمان لا چکے اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

ایک اور جگہ خداوند عالم نے فرمایا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ.[2]

(اے رسولؐ) تم (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو اس طریقہ سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک گئے ان کو تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی خوب واقف ہے۔

کافروں کی خدمت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یُجَادِلُوْنَكَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ كَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ.[3]

وہ لوگ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی تم سے (خواہ مخواہ) سچّی بات میں جھگڑتے تھے اور اس طرح (کرنے لگے) گویا وہ (زبردستی) موت کے منہ میں دھکیلے جارہے ہیں۔ اور اسے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔

اصحاب کہف کی داستان میں مراء مثبت ہے، ان کی تعداد کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ

---

[1] عنکبوت:۴۶

[2] نحل:۱۲۵

[3] انفال:6

رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا.[1]

قریب ہے کہ لوگ (نصاریٰ نجران) کہیں گے کہ وہ تین آدمی تھے چوتھا ان کا کتّا (قطمیر) ہے۔ اور کچھ لوگ (عاقب وغیرہ) کہتے ہیں کہ پانچ آدمی تھے چھٹا ان کا کتّا ہے (یہ سب) غیب میں اٹکل پچو لگاتے ہیں اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سات آدمی ہیں اور آٹھواں ان کا کتّا ہے (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ ان کا شمار میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے ان (کی گنتی) کو تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں تو (اے رسولؐ) تم (ان لوگوں سے) اصحاب کہف کے بارے میں سرسری گفتگو کے سوا (زیادہ) نہ جھگڑو اور ان کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے کچھ پوچھو بھی نہیں۔

منفی مورد میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ.[2]

جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اور جو مومن ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قیامت یقینی برحق ہے آگاہ رہو کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کیا کرتے ہیں وہ بڑے پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

دوسری تقسیم اجزاء کے لحاظ سے کی جاسکتی ہے جن میں ایک وہ انسان ہے جو سمجھ دار اور عاقل ہوتا ہے اور اپنی منطقی گفتگو سے دوسروں پر غالب ہوتا ہے جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی وصیت میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

دَعِ الْمُمَارَاتِ وَمُجَارَاتِ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ وَلَا عِلْمَ.[3]

مناظرہ و گفتگو بغیر عقل و علم کے نہیں ہوا کرتا۔

---

[1] کہف: 22

[2] شوری: 18

[3] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 129، حدیث 14.

مناظرہ کرنے والے شخص کو آشنا و واقف ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر نا آشنا حق کا دفاع کرے گا تو اپنی کم معلومات کی وجہ سے شکست کھائے گا۔ جن سے حق ضائع ہوجائے گا لہٰذا ایک حدیث ہے کہ محمد بن عبداللہ جو طیار کے نام سے معروف ہیں، وہ امام صادق علیہ السلام سے عرض کرتے ہیں:

بَلَغَنی اَنَّكَ كَرِهْتَ مُناظَرَةَ النّاسِ.

میں نے سنا ہے کہ مجھے کہا گیا ہے کہ تم مخالفین سے مناظرہ کرنے سے نفرت کرتے ہو؟

امام نے فرمایا:

اَمّا كَلامُ مِثْلِكَ فَلا يُكْرَهُ، مَنْ اَذا طارَ يَحْسُنُ اَنْ يَقَعَ وَاِنْ وَقَعَ يَحْسُنُ اَنْ يَطيرَ فَمَنْ كانَ هكَذا لا نَكْرَهُهُ.[1]

میں جیسے تم سے گفتگو کر رہا ہوں ایسی گفتگو سے مجھے نفرت نہیں ہے۔ انسان کو ماہر ہونا چاہیے، مہارت سے گفتگو کو شروع کرے اور مہارت سے گفتگو کا اختتام کرے، ہم ایسے مناظرہ کرنے سے ناراض نہیں ہوتے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے محمد بن عبداللہ کو طیار کا لقب اس لئے دیا تھا کہ وہ مناظرے میں ماہر تھے اور حق کا دفاع کرنے والا تھا۔ لہٰذا جو لوگ کافی علم نہیں رکھتے یا حق کے دفاع کی قدرت نہیں رکھتے انہیں مناظرہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ جن افراد کے پاس علم نہ ہو یا وہ دفاع کرنے سے عاجز ہوں وہ شکست کھا جاتے ہیں اور سرنگوں ہوجاتے ہیں اور دوسروں کی نگاہ میں مذہب پر حرف آتا ہے بعض نادان افراد میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ وہ افراد جو افراط سے کام لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں مناظرہ حرام ہے لہٰذا کسی سے مناظرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ انسان ماہر ہو اور منطق و استدلال سے دفاع کرنے کی صلاحیت ہی کیوں نہ رکھتا ہو یہ ایک منحرف راستہ ہے۔ بلکہ ایسے افراد کو مناظرہ کرنا چاہیے تاکہ حق کا دفاع ہو اور لوگوں پر حقائق واضح ہوں اس مطلب کو ایک حدیث سے ختم کرتے ہیں۔

امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے جد امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے دین نہیں جدال کے بارے میں کچھ فرمایا اور فرمایا کہ یہ بات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرین علیہم السلام نے مناظرے سے منع فرمایا ہے کہ اس کی مکمل طور پر نفی نہیں کی گئی بلکہ اس جدال و مناظرے سے نفی کی گئی ہے جو غیر منطقی اور صحیح نہ ہو پھر فرمایا کیا تو نے خداوند عالم کا قول نہیں سنا کہ فرماتا ہے:

---

[1] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 136، حدیث 39.

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ .[1]

اور (اے ایماندارو) مناظرہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر عمدہ اور شائستہ الفاظ وعنوان سے۔

اس آیت میں خداوندعالم احسن جدال کرنے کا حکم دیتا ہے جس جدال سے منع کیا گیا ہے وہ غیر احسن جدال ہے۔ لہٰذا اس آیت میں خداوندعالم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو احسن جدال کرنے کا دستور دے رہا ہے۔ خداوندعالم فرماتا ہے:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ.[2]

(اے رسولؐ) تم (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو اس طریقہ سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک گئے ان کو تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی خوب واقف ہے۔

احسن جدال میں منطق و دلیل کی گفتگو ہوئی ہے۔ بعض افراد نے آپ سے پوچھا کہ جدال غیر احسن کیا ہوتا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا: جو شخص باطل کے ساتھ مناظرہ کرے اور وہ دلیل نادرست لے آئے اور تم منطق واستدلال سے بحث کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہو ایسا عمل ہم شیعہ پر حرام ہے جس سے ضعیف ایمان والوں میں فتنہ وانحراف پیدا ہوتا ہے۔ اس سے باطل غالب آجاتا ہے۔

پھر امام جعفر صادق علیہ السلام بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں معاد کے لئے استدلال سے بحث ہوئی ہے اور مشرکین سے قیامت کے بارے میں منطق سے بحث ہوئی ہے۔[3]

احسن جدال سے کفار پر اتمام حجت ہوتی ہے اور شبہات دور ہوتے ہیں۔

---

[1] عنکبوت:۴۶

[2] نحل:۱۲۵

[3] بحارالانوار، جلد 2، صفحہ 125، حدیث 2 (باتلخیص).

اس بیماری کا علاج

متعصب شخص، جھگڑالو اور غیر احسن جدال کرنے والے شخص کا ایمان و تقویٰ خطرے میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس خطرے سے نجات کے لئے اس بیماری کا علاج کیا جائے۔ اس بیماری کے علاج کے لئے سکوت بہترین چیز ہے جہاں پر باطل جدال کا احتمال ہو اور جتنا سکوت ہوگا تو علاج کے لئے زمین ہموار ہوگی۔ البتہ سکوت بہت سی بیماریوں کا علاج ہے جیسے حسد، کینہ، سخن چینی، ریاکاری، ناشکری، تہمت، جھوٹ خود پسندی، برتری حاصل کرنا۔

اس بیماری کے علاج کے لئے دوسری راہ یہ ہے انسان اس بیماری کے آثار و نتائج کی طرف متوجہ ہو کہ اس سے عداوت و دشمنی بڑھتی ہے اور دوستوں میں نفرتیں پروان چڑھتی ہیں، ایمان سے دوری ہوتی ہے، غضب الٰہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اگر انسان ان پر توجہ دے تو کافی اثر ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو انسان جانتا ہو کہ یہ کھانا زہریلا ہے اور پھر وہ اسے کھالے۔ زہریلا کھانا صرف وہی کھاتا ہے جو زہر کے اثر سے بے خبر ہو۔ اس کے علاوہ ایسے افراد سے دوری اختیار کرنی چاہیے جو اس بیماری میں مبتلا ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ جالَسَ الْجاهِلَ فَلْيَسْتَعِدَّ لِقيلٍ وَ قال.[1]

جو شخص جاہل کا ہم نشین ہو اسے جدال و مراء کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

جب انسان تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ اس بیماری کو ترک کر دے گا تو یقیناً ایک دن وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار، جلد 2، صفحہ 532، چاپ قدیم (مادہ مراء).

گفتگو میں انصاف

مراء اور جدال کے مقابلے میں انصاف ہے یعنی طالب حق ہو جب دوسرے کی دلیل محکم ہے تو اسے قبول کرے۔حتیٰ اگر ایک بچہ یا کافر بھی حق کہے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔

البتہ روایات میں انصاف کی بڑی تعریف ہوئی ہے یعنی اپنے اور دوسروں کے منافع میں یکساں فکر کرنا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

سَيِّدُ الْاَعْمالِ ثَلاثَةٌ: اِنْصافُ النّاسِ مِنْ نَفْسِكَ حَتّى لا تَرْضى بِشَيءٍ اِلّا رَضِيتَ لَهُمْ مِثْلَهُ وَمُواساتُكَ الْاَخَ فِي الْمالِ وَذِكْرُ اللهِ عَلى كُلِ حال.[1]

بہترین اعمال تین چیزیں ہیں:

۱ لوگوں کے حق میں انصاف کی رعایت کرنا

۲ جو چیز اپنے لئے پسند ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرے،

۳ مسلمان کے حال میں مساوات اور ہر حال میں ذکر خدا کرنا۔



[1] کافی، جلد 2، صفحہ 144.

۱۱۔ سخن چینی اور صلح (اصلاح ذات البین)

اجتماعی زندگی میں ہمیشہ مزاحمت اور نزاع ہوتے ہیں ان میں سے ایک تزاحم یہ ہے کہ بعض افراد میں کہو اور نہ کہو والی باتیں ہوتی ہیں اور بعض اوقات چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور ممکن ہے کہ خون بہہ جائے۔

دوسروں کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ لوگوں میں خوش گوار ماحول پیدا کریں رفع سوئے تفاہم اور حسن ظن کی کیفیت بنائی جائے۔ بعض لوگ بات کو اور طول دیتے ہیں اور جلتی آگ پر تیل جھڑکتے ہیں ایسی باتوں کو سخن چینی کہتے ہیں اور یہ خدا کی بدترین مخلوق ہے حالانکہ صلح کرانے والے اور حسن ظن کا ماحول بنانے والے ایسے ہیں کہ گویا راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ جس طرح روایات میں آیا ہے:

اَجْرُ الْمُصْلِحِ بَيْنَ النّاسِ كَاَجْرِ الْمجاهِدِ بَيْنَ اَهْلِ الْحَرْبِ.[1]

لوگوں کے درمیان صلح کروانے والوں کا اجر و ثواب جنگ کے مجاہد کی مثل ہے۔

سخن چینی ایک بری بیماری کا نام ہے۔ آیات و روایات میں اس کی بڑی خدمت ہوئی ہے اور اس کے عکس عمل کرنے والوں کی تعریف ہوئی ہے۔ اب آیات کو ذکر کرتے ہیں جن میں ان دو صفات کے آثار و نتائج کی بحث ہوگی۔

---

[1] تفسیر منہج الصادقین، ج 8، صفحہ 417.

① ۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ. [1]

ہر طعنہ دینے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

② ۔ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝١٠ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝١١ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ. [2]

اور تم (کہیں) ایسے کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ذلیل اوقات عیب جو اعلیٰ درجہ کا چغل خور، نیکی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا گنہگار، تند مزاج اور اس کے علاوہ بدذات (حرام زادہ) بھی ہے۔

③ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ. [3]

اے ایماندارو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (ایسا نہ ہو کہ) تم کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچاؤ پھر اپنے کیے پر نادم ہو۔

④ ۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا. [4]

جو شخص اچھے کام کی سفارش کرے تو اس کو بھی اس کام کے ثواب سے کچھ حصّہ ملے گا۔ اور جو بُرے کام کی سفارش کرے تو اس کو بھی اسی کام کی سزا کا کچھ حصّہ ملے گا۔ اور خدا تو ہر چیز پر نگہبان ہے۔

⑤ ۔ يَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. [5]

---

[1] ہمزہ:1

[2] قلم:11 تا 13

[3] حجرات:6

[4] نساء:85

[5] انفال:1

(اے رسولؐ) تم سے لوگ انفال (مال غنیمت) کے بارے میں پوچھا کرتے ہیں تو تم کہہ دو کہ انفال مخصوص خدا اور رسولؐ کے واسطے ہے تو خدا سے ڈرو اور اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو اور اگر تم سچے ایماندار ہو تو خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

⑥۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. [1]

اور (تم مسلمانو) تم اپنی قسموں (کے حیلے) سے خدا (کے نام) کو (لوگوں کے ساتھ) سلوک کرنے اور خدا سے ڈرنے اور لوگوں کے درمیان صلح کرا دینے کا مانع نہ ٹھہراؤ اور خدا (سب کی) سنتا اور (اور سب کو) جانتا ہے۔

⑦۔ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا. [2]

(اے رسولؐ) ان کے راز کی باتوں سے اکثر میں بھلائی (کا تو نام تک) نہیں۔ مگر (ہاں) جو شخص کسی کو صدقہ دینے یا اچھے کام کرنے یا لوگوں کے درمیان میں ملاپ کرانے کا حکم دے (تو البتہ ایک بات ہے) اور جو شخص (محض) خدا کی خوشنودی کی خواہش میں ایسے کام کرے گا تو ہم عنقریب ہی اُسے بڑا اچھا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

⑧۔ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ. [3]

شعیب نے کہا: اے میری قوم کیا تم یہ سمجھے ہو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے (حلال) روزی کھانے کو دی ہے (تو میں بھی تمہاری طرح حرام کھانے لگوں) اور میں تو یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تم کو روکوں تمہارے برخلاف آپ اس کو

---

[1] بقرہ:224

[2] نساء:114

[3] ہود:88

کرنے لگوں میں تو جہاں تک مجھ سے بن پڑے اصلاح کے سوا (کچھ اور) چاہتا ہی نہیں اور میری تائید تو خدا کے سوا اور کسی سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

تفسیر و خلاصہ

پہلی آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ.

ہر طعنہ دینے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

ہمزہ اور لمزہ کی تفسیر میں فرق ہے۔ یہ دونوں لفظ جدا معانی رکھتے ہیں۔ ہم نے تفسیر نمونہ میں ذکر کیا ہے کہ ان میں سے ایک تفسیر یہ ہے کہ جو ترجمہ میں ذکر ہو چکا ہے۔ آیت کا اشارہ سخن چینی کرنے والے افراد کی طرف ہے۔

روایت میں ہے کہ ابن عباس سے جب پوچھا گیا کہ اس آیات سے کیا مراد ہے؟ وہ کون افراد ہیں جن کی اتنی خدمت ہوئی ہے؟

ابن عباس نے جواب دیا:

هُمُ الْمَشاؤُنَ بِالنَّمِيمَةِ اَلْمُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْاَحِبَّةِ اَلنّاعِتُونَ لِلنّاسِ بِالْعَيْبِ.[1]

ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو سخن چینی کرتے ہیں اور جو لوگوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں اور لوگوں پر عیب لگاتے ہیں۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں پہلی تفسیر کا ذکر کیا ہے اور فخر رازی نے ساتویں اور آخری تفسیر آیات کے لئے ذکر کی ہے، خداوند عالم نے ایسے افراد کے لئے حامیہ کی سزا کا وعدہ دیا ہے یعنی بھڑکتی ہوئی اور شعلہ ور آگ جو انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیا کی آگ کے برعکس دوزخ کی آگ پہلے انسان کے اندرونی حصے جیسے دل وغیرہ

---

[1] الخصال/ ج ۱ / 183 / فی السؤال ثلاث خصال وشر الناس ثلاثۃ ..... ص: 182

کو جلائے گی اور پھر باہر والے حصے کو جلائے گی اور یہ شاید اس لئے ہو کہ انسان کے برے اعمال کا سبب انسان کا اندرونی حصہ ہے۔

دوسری آیت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہوا خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝١٠ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۝١١ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
اَثِيْمٍ ۝١٢ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ.

اور تم (کہیں) ایسے کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ہو ذلیل اوقات عیب جو اعلیٰ درجہ کا چغل خور، نیکی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا گنہگار، تند مزاج اور اس کے علاوہ بد ذات (حرام زادہ) بھی ہو۔

اس بری صفت کے بعد دوسری آیات میں ایک اور بری صفت کا ذکر ہوتا ہے جسے نیکی سے منع کرنا، حق سے تجاوز کرنا کینہ رکھنا، غصہ اور آیات الٰہی کا انکار کرنا، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ.

اور تم (کہیں) ایسے کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔

آیات الٰہی کا اشکار کرنا اس صفت کے ردیف میں ذکر ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ بڑی بری صفت ہے۔

مشاء بنیم مبالغہ کا صیغہ ہے اور ان افراد کی طرف اشارہ ہے جو ہمیشہ ایک دوسرے سے بدبین، سخن چین اور لوگوں کے دلوں میں عداوت و دشمنی ڈالتے ہیں۔

یہ ایک گناہان کبیرہ ہے حلاف اس شخص کو کہتے ہیں جو زیادہ قسمیں کھانے والا ہو، یہ اکثر وہ افراد ہیں جن پر لوگوں کا اعتماد نہیں ہوتا اور نہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔ ان کی دوسری صفت مھین یعنی پست اور گھٹیا جو دوسروں پر عیب لگاتے ہیں۔ ہمیشہ سخن چینی کرتے ہیں اور فساد برپا ہوتا ہے لوگوں میں الفت و محبت کی بجائے ایک دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اور کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح خود لوگوں کی نظروں سے گرے ہوئے ہیں دوسروں کو بھی ایسا دیکھنا چاہتے ہیں۔

تیسری آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو ایک گروہ سمیت بنی مصطلق سے زکوٰۃ لینے بھیجا۔ جب اس قبیلہ نے یہ سنا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمائندہ آرہا ہے تو وہ استقبال کے لئے آئے ولید نے یہ سوچا کہ وہ ہمیں قتل کرنے آرہے ہیں لہٰذا وہ سیدھا حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس آیا

اور ماجرا سنایا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے بلکہ وہ جنگ پر اتر آئے ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

لوگ بھی ان سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو دستور دیا گیا کہ جب کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو تحقیق کے لئے روانہ کیا، تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہو گیا قبیلہ بنی مصطلق اسلام سے وفا دار ہے اور ان کی طرف سے کوئی بغاوت نہیں ہے۔ جب یہ خبر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا:

اَلتَّاَنِّی مِنَ اللّٰہِ وَ الْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ.[1]

تحقیق کرنا خدا کی طرف سے اور جلد بازی شیطانی عمل ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت کے مطابق مذکورہ آیت نمام کی طرف اشارہ ہے۔[2]

اس تعبیر سے معلوم ہوا کہ نمام اور سخن چینی جھوٹے کلام کو بھی شامل ہے۔

چوتھی آیت کو بعض بزرگان دین جیسے علامہ مجلسی بحث نمیم میں لے آئے ہیں خداوند عالم فرماتا ہے:

مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْہَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْہَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا.

جو شخص اچھے کام کی سفارش کرے تو اس کو بھی اس کام کے ثواب سے کچھ حصّہ ملے گا۔ اور جو بُرے کام کی سفارش کرے تو اس کو بھی اسی کام کی سزا کا کچھ حصّہ ملے گا۔ اور خدا تو ہر چیز پر نگہبان ہے۔

حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ اَمَرَ بِسُوءٍ اَوْ دَلَّ عَلَیْہِ اَوْ اَشَارَ فَھُوَ شَرِیْکٌ.[3]

جو شخص بدی کی دعوت دیتا ہے یا اشارہ کرتا ہے وہ اس میں خود بھی شریک ہے۔

پانچویں آیت میں اصلاح ذات البین ہے جو سخن چینی کے مقابلے میں ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

---

[1] سیرہ ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 308.

[2] تفسیر قرطبی، جلد 9، صفحہ 613.

[3] مستدرک سفینۃ البحار، جلد 10، صفحہ 152.

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(اے رسولؐ) تم سے لوگ انفال (مال غنیمت) کے بارے میں پوچھا کرتے ہیں تو تم کہہ دو کہ انفال مخصوص خدا اور رسولؐ کے واسطے ہے تو خدا سے ڈرو اور اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو اور اگر تم سچے ایماندار ہو تو خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

اس آیت کی شان نزول میں ملتا ہے کہ جنگ بدر کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے دوران انصار کے دو افراد کے درمیان لڑائی جھگڑا ہو گیا لہٰذا آیت نازل ہوئی اور خدا نے صراحت سے فرمایا کہ مال غنیمت کا اختیار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو حاصل ہے اور اختلاف کرنے والوں کے درمیان آنحضور صلح کرائیں۔

چھٹی آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.

اور (تم مسلمانو) تم اپنی قسموں (کے حیلے) سے خدا (کے نام) کو (لوگوں کے ساتھ) سلوک کرنے اور خدا سے ڈرنے اور لوگوں کے درمیان صلح کرا دینے کا مانع نہ ٹھہراؤ اور خدا (سب کی) سنتا اور (اور سب کو) جانتا ہے۔

اس کی تفسیر میں دو نظریے ہیں پہلا یہ کہ یہ آیت ان افراد کے بارے میں ہے جو کبھی دوسرے سے ناراض و غصہ میں آکر یہ کہہ دیتے کہ ہم ان کے لئے کوئی کار خیر انجام نہیں دیں گے اور ان کے درمیان صلح کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

آیت نازل ہوئی کہ یہ کام باطل اور بیہودہ ہیں اور کوئی چیز کار خیر اور صلح کے درمیان حائل نہیں ہے۔[1]

دوسری تفسیر یہ ہے کہ کار خیر انجام دینے، تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح کے لئے قسم نہ کھاؤ کیونکہ ان کا موں کا رجحان اتنا واضح ہے کہ قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال لوگوں میں صلح کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، اس آیت سے جو خیر و تقویٰ کے ساتھ ذکر ہوئی ہے۔

---

[1] اس تفسیر کے مطابق اس جملہ اَنْ تَبَرُّوْا میں کلمہ «لا» مقدر ہے در اصل اَلَّا تَبَرُّوْا... ہے، لفظ «عُرْضَه» اس جگہ معنی مانع ہے، لیکن بعد کی تفسیر میں معنی معرضیت ہے۔

ساتویں آیت میں سرگوشی کی گفتگو کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے دوسروں کو تکلیف ہوئی ہے اور سوئے ظن پیدا ہوتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ

(اے رسولؐ) ان کے راز کی باتوں سے اکثر میں بھلائی (کا تو نام تک) نہیں۔

لیکن بلا فاصلہ فرماتا ہے:

اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ.

مگر (ہاں) جو شخص کسی کو صدقہ دینے یا اچھے کام کرنے یا لوگوں کے درمیان میں ملاپ کرانے کا حکم دے۔

آیت کے آخر میں ان امور میں رغبت کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا.

اور جو شخص (محض) خدا کی خوشنودی کی خواہش میں ایسے کام کرے گا تو ہم عنقریب ہی اُسے بڑا اچھا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اس میں صدقہ اور معروف میں کیا فرق ہے۔ بعض نے کہا کہ صدقہ ایسی چیز ہے جو مستحب اور بلاعوض ہو اور معروف کا معنی قرض الحسنہ ہے۔

بعض نے معروف کے مفہوم کو عام کہا جو تمام کار خیر کو شامل ہے لہٰذا صدقہ اور معروف کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول روایت میں ہے

اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى صَدَقَةٍ يُحِبُّهَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ؟ تُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ اِذَا تَفَاسَدُوْا وَتُقَرِّبُ بَيْنَهُمْ اِذَا تَبَاعَدُوْا.[1]

بہترین امور میں سے ایک یہ ہے لوگوں کے درمیان صلح کرائی جائے۔ جو ایک دوسرے سے دور ہیں انہیں قریب لایا جائے۔

لہٰذا لوگوں میں اصلاح بطور مستقل ذکر بھی ہوا اور صدقہ کا مصداق بھی ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد 3، صفحہ 1955.

آٹھویں اور آخری آیت میں انبیاء میں سے ایک نبی حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ وہ اپنے قیام کرنے ہدف اس طرح بیان کرتے ہیں:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

شعیب نے کہا اے میری قوم کیا تم یہ سمجھے ہو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے (حلال) روزی کھانے کو دی ہے (تو میں بھی تمہاری طرح حرام کھانے لگوں) اور میں تو یہ نہیں چاہتا کہ جس کام سے تم کو روکوں تمہارے برخلاف آپ اس کو کرنے لگوں میں تو جہاں تک مجھ سے بن پڑے اصلاح کے سوا (کچھ اور) چاہتا ہی نہیں۔

یہ وہی ہدف ہے جو تمام انبیاء کا ہدف تھا جیسے اصلاح عقائد اصلاح اخلاق، اصلاح عمل اور اصلاح روابط اجتماعی بعض نے اصلاح کی تفسیر میں رکھا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں تمہاری دنیا کو عدالت اور آخرت کے لئے عبادت کی اصلاح کریں لیکن واضح ہے کہ اصلاح کا مفہوم وسیع ہے اور عدالت کے علاوہ عنوان کو بھی شامل ہے۔

پھر خداوند عالم فرماتا ہے:

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ.

اور میری تائید تو خدا کے سوا اور کسی سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

دلچسپ یہ بات ہے کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی گمراہ قوم سے کہا کہ وہ مالی و اخلاقی فساد میں غرق ہیں تو انہوں نے بتوں کی پوجا، کم فروشی، مالی فساد اور اپنی آزادی کے خلاف تھے اور کہتے تھے تم ایک سمجھ دار اور عاقل انسان ہو لہٰذا تم سے بعید ہے۔ اگر چاہتے ہو تو ہمارے لئے فکری و عملی آزادی کو واپس لے لیں گویا وہ لوگ بھی آج کل ہمارے کچھ افراد کی مانند تھے جو آزادی کے معنی سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ آزادی ایک افتخار اس وقت ہے جب حدود کے اندر ہو۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: میرا ہدف حقیقی اصلاح کرنا ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قوم شعیب آپ کو ایک عاقل انسان کہتے تھے اور دوسرا کہ حلیم یعنی رشید بردبار سمجھتے تھے

لیکن جب حضرت شعیب علیہ السلام ان کے عقائد و مال کی فسادی حالت کو روکنا چاہا تو ان کی قوم مخالف ہوگئی۔

مجموعہ آیات سے دو نکات واضح ہوجاتے ہیں کہ نمام اور سخن چینی سے لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے یہ ایک گناہان کبیرہ میں سے ہے اور دوسرا صلح و اصلاح جو اہم الٰہی فریضہ ہے۔

روایات میں سخن چینی

سخن چینی اجتماعی زندگی میں بدترین صفت ہے جو معاشرے کو خراب کردیتی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں حتیٰ کہ خون ریزی ہوتی ہے روایات میں اس کی نہی کی گئی ہے۔ اب ان روایات کو لاتے ہیں جو اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے پوچھا:

اَلا اُنَبِّئُکُمْ بِشِرارِکُمْ.

کیا تمہیں بدترین افراد سے آگاہ کروں۔

اصحاب نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہؐ!

آپؐ نے فرمایا:

اَلْمَشّائُونَ بِالنَمِیمَةِ وَ الْمُفَرِّقُونَ بَیْنَ الْاَحِبَّةِ اَلْباغُونَ لِلْبُراءِ الْمَعایِبِ.

[1]

یہ وہ افراد ہیں جو سخن چینی کرتے ہیں اور دوستوں میں جدائی ڈالتے ہیں اور نیک لوگوں پر عیب لگاتے ہیں۔

نمیمہ دراصل آہستہ آواز کو کہتے ہیں اور سخن چینی کرنے والے افراد بھی عام طور پر آہستہ اور سرگوشی کرتے ہیں۔[2]

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 616.

[2] اقتباس از مفردات راغب (واژہ نمیمہ).

بعض نے لکھا ہے نمیمہ دراصل جھوٹے کے کلام کو زینت کے معنی میں ہے کیونکہ سخن چین افراد اپنے کلام کو جھوٹ کے ساتھ سجا کر پیش کرتے ہیں۔ [1]

اسی معنی کی روایت حضرت علی علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔ [2]

۲۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْجَنَّةُ مُحَرَّمَةٌ عَلَى الْقَتّاتِينَ اَلْمَشّائِينَ بِالنَّمِيمَةِ. [3]

جنت قتات افراد پر حرام ہے۔

"قتات" "قت" بروزن "شط" کے وزن پر ہے۔ اس کا اصل معنی جھوٹ بولنا ہے۔ خواہ سخن چینی ہو یا نہ ہو خدا "قتات" اسے کہتے ہیں جو لوگوں کے مخفی رازوں سے دوسروں کو آگاہ کرتا پھرے تا کہ لوگوں میں فساد ہو۔

بعض روایات اور نعت کی کتب میں قتات اور غام دونوں کا ایک معنی آیا ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں ابوذر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرماتا:

يا اَباذَرٍ صاحِبُ النَّمِيمَةِ لا يَسْتَرِيحُ مِنْ عَذابِ اللهِ فِي الْآخِرَةِ. [4]

سخن چینی کرنے والا شخص روز قیامت عذاب الٰہی سے نجات نہیں پائے گا۔

۴۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا کہ آپؐ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

وَ مَنْ مَشى فى نَمِيمَةٍ بَيْنَ اِثْنَينِ سَلَّطَ اللهُ عَلَيْهِ فِي قَبْرِهِ نارا تُحْرِقُهُ اِلى يَوْمِ الْقِيامَةِ. [5]

جو شخص دو افراد کے درمیان سخن چینی کرے تو خداوند عالم اس کی قبر پر آگ کو مسلط کرے گا جو روز قیامت قیامت تک جلاتی رہے گی۔

۵۔ ایک روایت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے:

---

[1] اقتباس از لسان العرب (واژہ نمیمہ).

[2] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 617.

[3] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 617.

[4] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 617. ح۔ ۴

[5] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 618، حدیث 6.

ایک سال بنی اسرائیل سخت قحط وخشک سالی میں مبتلا تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چند بار نماز استسقاء پڑھی لیکن کی دعا مستجاب نہ ہوئی خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی: میں تری اور تیرے ساتھ آنے والے افراد کی دعا کو قبول نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان میں سے ایک سخن چین فرد ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا خدایا! وہ شخص کون ہے؟ تا کہ ہم اس کو اپنے درمیان دور کریں۔

خداوند عالم نے فرمایا: اے موسیٰ میں جو سخن چینی سے منع کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں خود نمام بنو! اور لوگوں کے گناہوں کو فاش کرو۔ اس کے سب نے توبہ کی جن کے بعد اللہ رحمت یعنی بارش نازل ہوئی۔ [1]

۶۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَرْبَعَةٌ لا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ اَلْكاهِنُ وَ الْمُنافِقُ وَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ وَ الْقَتّاتُ وَ هُوَ النَّمّامُ. [2]

چار گروہ ایسے ہیں جو جنت میں نہیں جاسکتے۔ نجومی و کاہن منافق، مشروب پینے والا اور نمام

۷۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلنَّمامُ جِسْرُ الشَّرِّ. [3]

سخن چینی کرنے والا شخص شر کی پل ہوتا ہے۔

۸۔ ایک اور جگہ آپؑ نے فرمایا:

لا تَجْتَمِعُ اَمانَةٌ وَ نَمِيمَةٌ. [4]

امانت داری اور غامت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتی ہیں۔

سخن چینی کرنے والا خائن ہوتا ہے۔

۹۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 276.

[2] وسائل الشیعہ، جلد 8، صفحہ 619، حدیث 11 (باب تحریم النمیمہ).

[3] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 279.

[4] غرر الحکم، حدیث 10581.

اِنَّ اَحَبَّکُمْ اِلَی اللهِ الَّذِینَ یُؤَلَّفُونَ وَ یَأْلِفُونَ وَ اِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَی اللهِ اَلْمَشَّائُونَ بِالنَّمِیمَةِ، اَلْمُفَرِّقُونَ بَیْنَ الْاِخْوانِ.[1]

تم میں سے خدا کے نزدیک محبوب ترین افراد وہ ہیں جو لوگوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا کرتے ہیں اور خود بھی الفت ومحبت کو پسند کرتے ہوں۔ مبغوض ترین افراد تم میں سے خدا کے نزدیک وہ افراد ہیں جو سخن چینی کرتے ہیں اور لوگوں میں جدائی ڈالتے ہیں۔

ان احادیث کی روشنی میں واضح ہوجاتا ہے کہ سخن چینی کرنا گناہان کبیرہ میں سے ہے اور بہت ہی خطرناک اور نقصان کا باعث ہے۔ دنیا و آخرت دونوں خراب ہوتی ہیں۔ جو لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوجائیں اور لوگوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہوں وہ ہرگز جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہ کہ توبہ کریں۔

سخن چینی کے آثار

ہم بار بار بیان کرچکے ہیں ایک معاشرے کا اصلی سرمایہ اعتماد اور اطمینان ہے جو آپس میں اعتماد کرتے ہیں اعتماد سے ہماری صفوں میں اتحاد پیدا ہوگا۔ اسلام نے حفظ اعتماد کی بڑی تاکید کی ہے کیونکہ یہ وحدت کا سبب ہے اور جس چیز سے وحدت میں خلل آئے وہ حرام ہے۔ بے شک سخن چینی کرنا تفرقہ کا ایک اہم عامل ہے لوگوں میں بدبینی پیدا ہوتی ہے۔ معاشرہ عداوت و دشمنی کا شکار ہوجاتا ہے۔ اسی لئے معاشرے میں سخن چینی کرنے والے افراد شریر ترین افراد شمار ہوتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِیّاکُمْ وَ النَّمائِمَ فَاِنَّها تُورِثُ الضَّغائِنَ.[2]

سخن چینی سے پرہیز کرو کیونکہ یہ کینہ اور دشمنی کا سبب ہے۔

آپؑ سے ایک روایت ہے جس میں فرماتے ہیں:

---

[1] غررالحکم، حدیث 10581.

[2] بحارالانوار، جلد 68، صفحہ 293، حدیث 63.

اِيّاكَ وَ النَّمِيمَةَ فَاِنَّها تَزْرَعُ الضَّغينَةَ وَ تُعَبِّدُ عَنِ اللهِ وَ النّاسِ.[1]

سخن چینی سے بچو کیوں کہ یہ عداوت و دشمنی کا سبب ہے اور انسان خدا اور لوگوں سے دور ہوجاتا ہے

بعض روایات میں کلمہ "شحناء" استعمال ہوا ہے جس میں وہی معنی عداوت و دشمنی ہے۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ سخن چینی کرنے والے افراد بدترین مخلوق ہے کیونکہ یہ دوستوں میں جدائی ڈالتے ہیں اور نیک لوگوں پر تہمت لگاتے ہیں۔

اس کے علاوہ سخن چینی کرنے والا معاشرے میں مردود انسان شمار ہوتا ہے۔ جو لوگ ان کی بات سنتے ہیں وہ بعد میں پشیمان ہوتے ہیں اور جدائی ڈالنے والوں پر لعنت کرتے ہیں۔ لوگ سخن چینی کرنے والوں میں مشہور ہوجاتے ہیں۔ سخن چینی کرنے والا خدا اور مخلوق خدا دونوں سے دور ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے سخن چینی کرنے والے کو جادوگر سے تشبیہ دی ہے کہ وہ دوستوں کے درمیان جادو کرتا ہے اور جدائی ڈالتا ہے آپؑ فرماتے ہیں:

اِنَّ مِنْ اَكْبَرِ السِحرِ اَلنَّمِيمَةِ يُفَرِّقُ بِها بَيْنَ الْمُتَحابِينَ وَ يَجْلِبُ الْعِداوَةَ عَلَى الْمُتَصادِقّينَ وَ يَسْفِكُ بِها الدِّماءَ وَ يَهْدِمُ بِها الدُّورَ وَ يَكْشِفُ بِها السُّتُورَ، وَالنَّمامُ اَشَرُّ مَنْ وَطَأَ عَلَى الْاَرْضِ بِقَدَم.[2]

جادو میں سے ایک بڑا جادو سخن چینی ہے کہ جن سے دو دوستوں کے درمیان جدائی ہوجاتی ہے۔ ان کے درمیان دشمنی پیدا ہوتی ہے اور خون بہانا اور آبادیوں کا ویران ہونے کا باعث ہے۔ سخن چینی شخص زمین پر قدم رکھنے والا بدترین شخص ہے۔

البتہ سخن چینی جادو نہیں لیکن اس میں جادو کے آثار پائے جاتے ہیں لہٰذا امام نے فرمایا کہ یہ ایک سحر ہے قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ سخن چینی جڑے ہوئے دلوں کو توڑ دیتی ہے، ممکن ہے کہ دو دوست چالیس سال سے دوست ہوں لیکن اس سے ایک دن میں وہ دوستی ختم ہوجائے اور جدائی کا باعث ہو۔ ایک ڈیم بنانا مشکل ہوتا ہے کئی سال لگتے ہیں تا کہ پانی ذخیرہ کیا جاسکے لیکن اسے خراب کرنا دیر نہیں لگتی ایک بم رکھ کر پھاڑ دیں تو پورا ٹیم ویران ہوجائے گا۔

---

[1] غررالحکم، حدیث 2663.

[2] بحارالانوار، جلد 60، صفحہ 21، حدیث 14.

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَلساعِی قاتِلُ ثَلاثَۃ قاتِلُ نَفْسِہِ وَ قاتِلُ مَنْ یُسْعی بِہِ وَ قاتِلُ مَنْ یُسْعی اِلَیْہ.[1]

سخن چینی کرنے والا شخص اپنا قاتل بھی ہے اور اس کا قاتل بھی ہے جس پر وہ سخن چینی کرتا ہے اور ان لوگوں کا بھی قاتل ہے جن کے سامنے وہ سخن چینی کرتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ بعض لوگ بادشاہ یا کسی وزیر کے سامنے سخن چینی کرے جو بعد قتل کا سبب بنے۔

یاد رہے کہ بعض مفسرین نے "سعایت" اور "نمام" کا ایک ہی معنی لکھا ہے حالانکہ ان دو کلمات کے معانی میں فرق پایا جاتا ہے۔ "نمام" سخن چینی کرنے والا وہ شخص ہے جو دو دوستوں، دو رشتہ داروں یا دو کلاس فیلو کے درمیان جدائی ڈالتا ہے۔ لیکن روایت میں "سعایت" کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص بڑے شخص کے سامنے بدگوئی کرے جس سے اس شخص کی جان و مال یا کام میں اس کے لئے خطرہ ہو۔

روایات میں "سعایت" کے ساتھ سلطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

سخن چینی کے اسباب

یہ بری صفت دوسری برائیوں کی مانند ایک بہت بری بیماری ہے اور دوسری بری صفات سے مربوط بھی ہے جیسے حسد ہے حاسد شخص دوسروں کی زندگی کو نہیں دیکھ سکتا۔ لوگوں میں الفت و محبت یا ایک با اخلاق خاندان یا میاں بیوی کی محبت کو برداشت نہ کرنا۔ وہ موقع پا کر سخن چینی کے ذریعے سب میں جدائی ڈال سکتا ہے۔

دنیا پرستی دوسرا سبب سخن چینی ہے کیونکہ دنیا پرست شخص دوسروں میں اختلافات ڈالتا ہے۔

وہ ہر موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور سخن چینی کے ذریعے ہمیشہ جدائی ڈالنا پسند کرتا ہے۔

سخن چینی کا ایک اور سبب نفاق ہے خداوند عالم منافقین کے بارے میں فرماتا ہے:

---

[1] خصال (مترجم) شیخ صدوق، صفحہ 122 (باب الثلاثہ).

اَلا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلٰكِنْ لا يَشْعُرُونَ.[1]

ہاں! ان کا نام ہی فساد ہے جس طرح ممکن ہو فساد کریں گے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

عَلامَةُ النِّفاقِ اَلْحَثُّ عَلَى النَّمِيمَةِ.[2]

نفاق کی ایک نشانی یہ ہے سخن چینی پر اصرار کیا جائے۔

خیر خواہ بن کے آتا ہے اور بدگوئی کر کے جاتا ہے، اپنا زہر آلود کلام کر کے ہی رہتا ہے۔ ایسا شخص دوغلا اور منافق ہوتا ہے اس کا ہدف اختلاف پیدا کرنا ہوتا ہے۔ معاشرے میں کشمکش ہوتی ہے۔

بعض روایات میں نطفہ ناپاک ہونا بھی ایک عامل سخن چینی شمار ہوا ہے۔ البتہ یہ زمین ہموار کرتا ہے لیکن انسان کو مجبور نہیں کرتا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلسّاعِي بِالنّاسِ اِلَى النّاسِ لِغَيْرِ رُشْدِهِ.[3]

جو شخص دوسروں پر سخن چینی کرتا ہے وہ راہ راست پر نہیں ہوتا۔ بعض تفسیر کے مطابق جملہ

لِغَيْرِ رُشْدِهِ.

یعنی

لَيْسَ بِوَلَدِ حَلال

یعنی ایسا شخص حلال زادہ نہیں ہوتا۔

سخن چینی کا ایک اور عامل جھوٹ ہے، جھوٹا شخص ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان اپنے جھوٹ کے ذریعے فساد پیدا کرتا ہے تا کہ ان کے درمیان اختلاف ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَمّا عَلامَةُ الْكَذّابِ فَاَرْبَعَةٌ...اِنْ قالَ لَمْ يَصْدُقْ وَاِنْ قِيلَ لَهُ لَمْ يُصَدِّقْ

---

[1] بقرہ، آیہ 12.

[2] بحار الانوار، جلد 69، صفحہ 207، حدیث 8.

[3] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 270.

وَ الَنميمةُ وَ الْبُهْتُ.[1]

جھوٹے شخص کی چار نشانیاں ہیں۔ جب بھی بات کرتا ہے سچ نہیں بولتا اگر اسے کوئی بات کہی جائے تو وہ تصدیق نہیں کرتا، سخن چینی کرتا ہے اور بہتان لگاتا ہے۔

علاج کے طریقے

اس بیماری کا مقابلہ کرنا اور اسے جڑ سے اکھاڑنے کے لئے پہلے ہمیں احباب کو تلاش کرنا ہوگا تا کہ عوامل اصلی جیسے حسد، دنیا پرستی نفاق اور انتقام جوئی جب تک نہ ختم ہوں یہ بیماری ختم نہیں ہوتی۔ ممکن محکم ارادے اور عزم سے کچھ محدود ہوجائے لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔

بہت سے اخلاقی رذائل ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ایک دوسرے پر تاثیر گزار ہیں۔

سخن چینی کے برے نتائج اور آثار سے عبرت حاصل کرنی چاہیے انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ باایمان افراد سے تعلقات رکھیں تا کہ اس بری بیماری سے بچ سکیں۔ اس بیماری سے بچنے کا ایک عامل نیک افراد کی محفل ہے۔ برے لوگوں کی محفل سے انسان برا ہوسکتا ہے۔ سخن چینی افراد کے خریدار کم ہوتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَكْذِبِ السِّعايَةَ وَ الَّنميمَةَ باطِلَةً كانَتْ اَوْ صَحِيحَةً.[2]

سخن چینی کی تکذیب کرو خواہ باطل ہو یا صحیح۔

اگر جھوٹ ہو تو اس کی تکذیب کرو اور اگر سچ ہو تو اعتماد نہ کرو۔ ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام کو خط لکھا جس میں کسی کی سخن چینی کی گئی تھی۔

امام نے اس سے فرمایا:

اِنْ كُنْتَ صادِقاً مَقَتْناكَ وَاِنْ كُنْتَ كاذِباً عاقَبْناكَ وَ اِنْ اَحْبَبْتَ

---

[1] بحارالانوار، جلد 1، صفحہ 122.

[2] غررالحکم، حدیث 2442.

الْقِيلَةَ اَقَلْناكَ بَلْ تُقيلُنى يا اَميرَ الْمُؤْمِنينَ.[1]

جو کچھ تو نے لکھا ہے اگر سچ ہے تو ہم تجھ سے ناراحت ہیں اور اگر جھوٹ کہا ہو تو تجھے سزا دیں گے اور اگر تو نے توبہ کی تو تیری توبہ قبول کرتے ہیں۔

اس مرد نے عرض کیا: اے امیر المومنین میری توبہ قبول فرمائیں۔

یاد رہے کہ جن افراد کی تو آج سخن چینی کر رہا ہے کل وہ تیری سخن چینی کریں گے۔

ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی کہ آپؑ نے فرمایا:

وَ مَنْ نَمَّ اِلَيْكَ سَيَنُمُّ عَلَيْكَ.[2]

جو شخص تیرے پاس سخن چینی کرتا ہے وہ تیرے خلاف بھی سخن چینی کر سکتا ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ اکثر اس قسم کی بیماری کی وجہ ضعیف الایمان ہوتا ہے۔ جتنا ایمان محکم ہوگا اتنی بیماری کم ہوگئی۔

موارد استثناء

سخن چینی کا حرام اور گناہان کبیرہ میں سے ہو تو مسلم ہے۔ مسلم اخلاق میں اس کی بڑی مذمت ہوئی ہے۔ بعض مقامات پر یہ جائز ہے لیکن وہ شاذ و نادر مواقع ہیں جہاں پر یہ عمل انجام دینا جائز ہو۔ باقی امور میں بعض مقامات پر جواز ہے لیکن اس میں بہت کم مواقع ہیں جہاں جواز ہو۔ جن مقامات پر جائز ہے وہ یہ ہیں کہ اگر الگ گروہ کسی کو قتل کرنا چاہیں یا اس کی جان و مال و آبرو کو خطرہ لاحق ہو تو ایسے مقامات پر سخن چینی نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مستجاوز قبطی شخص کو قتل کیا تو بعد میں ایک شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا:

اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ اِنّى لَكَ مِنَ النّاصِحينَ.[3]

---

[1] میزان الحکمۃ، جلد 4، حدیث 20685۔ بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 270 میں بھی اس کی مثل حدیث آئی ہے۔

[2] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 230.

[3] قصص، آیہ 20.

بعض اوقات سچی یا جھوٹی سخن چینی سے دشمن میں اختلاف ڈالا جاسکتا ہے،

یہ وہ مقام ہے جہاں سخن چینی جائز یا واجب ہے۔ جنگ احزاب میں نعیم بن مسعود نامی شخص نے دشمنان اسلام کے دو گروہوں کے درمیان اختلاف ڈالا جس سے وہ ایک دوسرے سے بدبین ہو گئے اور جنگ کی طاقت کمزور پڑ گئی تھی ایسے مقامات کو دیکھ کر بہانہ بنانا اور سخن چینی کو جائز سمجھ لینا جائز نہیں ہے۔[1]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لَا تَعْجَلَنَّ اِلٰی تَصْدِیْقِ وَآشٍ وَاِنْ تَشَبَّهَ بِالنَّاصِحِیْنَ.[2]

سخن چینی کرنے والے افراد میں تصدیق کرنے میں جلدی نہ کرو اگر چہ اپنے آپ کو خودخواہ لباس میں ظاہر کیا ہو۔

صلح کرنا (اصلاح ذات البین)

سخن چینی کے مقابلے میں صلح کرنا ہے۔ ایک شخص ان دو افراد کے درمیان صلح کرائے جن میں اختلاف پایا جاتا تھا یہ علم اخلاق میں بہترین فضیلت ہے۔ آیات و روایات میں بھی اس کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ آیات کے ذکر کے بعد روایات کو ذکر کرتے ہیں جن میں اس اہم موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ مَشٰی فِی صُلْحٍ بَیْنَ اِثْنَیْنِ صَلّٰی عَلَیْهِ مَلَائِکَةُ اللهِ حَتّٰی یَرْجِعَ وَ اُعْطِیَ ثَوَابَ لَیْلَةِ الْقَدْرِ.[3]

جو شخص دو افراد کے درمیان صلح کرانے کے لئے قدم اٹھاتا ہے، آسمان کے فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں، اس کے واپس آنے تک، اور اسے شب قدر کا ثواب ملتا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد 17، صفحہ 259، ذیل آیہ 25 سورہ احزاب

[2] غرر الحکم، شمارہ 10327.

[3] وسائل الشیعہ، جلد 13، صفحہ 163، حدیث 7.

۲۔ ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام اپنے بیٹوں امام حسن و حسین علیہما السلام کو وصیت کرتے ہیں صلح کرانے کو ترک نہ کرنا اور فرمایا:

فَاِنِّی سَمِعْتُ جَدَّکُما(صلی الله علیه وآله) یَقُولُ صَلاحُ ذاتِ الْبِینِ اَفْضَلُ مِنْ عامَّةِ الصَّلاةِ وَ الصِّیامِ.[۱]

لوگوں میں صلح کرانا تمام روزوں اور نمازوں سے افضل ہے۔

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلا اُخْبِرُکُمْ بِاَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الصِّیامِ وَ الصَّلاةِ وَالصَّدَقَةِ اِصْلاحُ ذاتِ البینِ فَاِنَّ فِسادَ ذاتِ البینِ هِیَ الْحالِقَةُ.[۲]

کیا تمہیں خبر دوں ایسی چیز کی جو نماز، روزہ اور صدقے سے بھی بہتر ہے وہ لوگوں میں صلح کرانا ہے کیونکہ لوگوں میں فساد ان کی تمام چیزوں کو ختم کر لیتا ہے۔

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

صَدَقَةٌ یُحِبُّها اللهُ اِصْلاحُ بَیْنَ النّاسِ اِذا تَفاسَدُوا وَتَقارُبُ بَیْنَهُمْ اِذا تَباعَدُوا.[۳]

وہ صدقہ جس کو اللہ دوست رکھتا ہے ہو لوگوں میں صلح کرانا ہے جب لوگوں میں رابطہ ٹوٹ جائے تو ان کو قریب کرنا جب وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔

اگر ہمارے شیعہ کے دو افراد میں ناراضگی دیکھو تو میرے والی رقم سے ان کے درمیان صلح کراؤ۔

۵۔ امام صادق علیہ السلام نے عمر بن مفضل سے فرمایا:

اِذا رَاَیْتَ بَیْنَ اِثْنَیْنِ مِنْ شِیْعَتِنا مُنازِعَةً فَاَفْتَدْها مِنْ مالِی.[۴]

جب بھی ہمارے شیعہ کے درمیان اختلاف ہوں ان کی صلح کے لئے خرچ کرنا۔

---

[۱] نہج البلاغہ، نامہ 47.

[۲] میزان الحکمہ، جلد 2، حدیث 10517.

[۳] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 209، حدیث 1.

[۴] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 209، حدیث ۳.

ابو حنیفہ سابق الحج کہتے ہیں کہ مجھ میں اور میرے داماد میں میراث کے معاملہ میں جھگڑا ہو گیا اتفاقاً مفضل وہاں سے گزر رہا تھا۔ تھوڑا سا کھڑا ہوا اور پھر کہنے لگا، تم دونوں گھر میں آنا، ہم وہاں گئے اور اس نے چار سو درہم دونوں کو دے کر ہمارے درمیان اختلاف حل کر دیا۔ اور پھر ہم سے کہا: یہ میرا مال نہ تھا بلکہ یہ مال امام صادق علیہ السلام کا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہوا تھا کہ جب بھی ہمارے شیعہ کے درمیان اختلاف ہوں ان کی صلح کے لئے خرچ کرنا۔[1]

۶۔ اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے:

وَلا تَجْعَلُوا اللهَ عُرْضَةً لِأَيْمانِكُمْ.

امامؑ نے فرمایا:

اِذا دُعِيتَ لِصُلْحٍ بَيْنَ اِثْنَيْنِ فَلا تَقُلْ عَلَيَّ يَمِينٌ اَنْ لا اَفْعَلَ.[2]

جب تمہیں دو افراد کے درمیان صلح کرانے کے لئے کہا جائے تو یہ مت کہو میں نے ایسا کرنے سے قسم کھا رکھی ہے اس قسم کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی صلح کرانے کے دوران مشکلات پیش آئیں اور صلح کرانے سے قسم کھانے کا کوئی اعتبار نہیں ایسی قسم شرعی نہیں تا کہ کفارہ دینا پڑے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اِسْتَصْلَحَ الْاَضْدادَ بَلَغَ الْمُرادَ.[3]

جو شخص دو مخالف کے درمیان صلح کراتا ہے وہ اپنے ہدف کو پہنچ جاتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں اضداد سے مراد فلسفی اضداد نہیں بلکہ اضداد عرفی مراء ہے کیونکہ اضداد فلسفی جمع نہیں ہو سکتی۔

اس حدیث کی ایک اور تفسیر بھی ہے کہ اگر دو مختلف افکار کے گروہوں کے درمیان صلح کرائے وہ معاشرے میں اپنے ہدف کو پہنچ جاتا ہے۔

۸۔ صلح کرانے کی اتنی اہمیت ہے کہ اس میں جھوٹ بول سکتے ہیں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 209، حدیث ۴.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 210، حدیث 6.

[3] غرر الحکم، حدیث 8043.

اَلْكَلامُ ثَلاثَةٌ صِدْقٌ وَ كِذْبٌ وَ اِصْلاحٌ بَيْنَ النّاسِ قيلَ لَهُ جُعِلْتُ فِداكَ ما الْاِصلاحُ بَيْنَ النّاسَ.

قالَ تَسْمَعُ مِنَ الرَّجُلِ كَلاماً يَبْلُغُهُ فَتَخْبُثُ نَفْسُهُ فَتَلقاهُ فَتَقُولُ سَمِعْتُ مِنْ فُلان قالَ فيكَ مِنَ الْخَيْرِ كَذا وَ كَذا خِلافُ ما سَمِعْتَ مِنْهُ.[1]

کلام تین قسم کی ہوتی ہے۔

۱۔ سچی کا جھوٹی ۲۔لوگوں میں صلح

کسی عرض کیا: قربان جاؤں ''بین الناس'' سے مراد کیا ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: اگر تو کسی شخص سے اس کا کلام سنتا ہے کہ اگر وہ آدمی جس کے بارے میں کلام ہو وہ سن لے تو ناراض ہوجائے تو ایسی صورت میں اگر تو اس شخص سے ملاقات کرتا ہے کہ یہ کہہ کر کہ فلاں آدمی تیری تعریف کررہا تھا۔

مرحوم علامہ مجلسیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس کلام میں اگرچہ صرف اور لغت میں جھوٹ ہے لیکن صلح کرانے کے مقصد سے جائز ہے۔تمام اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں پھر کہتے ہیں ایسے موارد میں توریہ کرنا واجب نہیں اگرچہ توریہ کرسکتا ہے۔[2]

بے شک کلام دو قسم کے ہیں:

۱ یا واقع کے مطابق ہوتا ہے

۲ یا واقع کے خلاف۔

پہلی قسم کو صدق اور دوسری کو کذب کہا جاتا ہے۔خلاف واقع کی پھر دو قسمیں ہیں یا باعث فساد یا موجب اصلاح ہے۔امام نے ان دو کو جدا ذکر کیا اور اصلاح کو چوتھی قسم شمار کیا۔

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 341، حدیث 16.

[2] بحار، جلد 9، صفحہ 251، حدیث 19.

لوگوں میں صلح کرانا

لوگوں میں صلح کرانا ایک پیچیدہ کام ہے خصوصاً جن لوگوں میں عداوت و دشمنی ہو اور کینہ پایا جاتا ہو۔ بڑی دقت سے کام لینا چاہیے۔ انسان کی نفسیات کے مطابق اس سے پیش آنا چاہیے، ایسا طریقہ اپنانا چاہیے جو مؤثر بھی ہو۔

۱۔ سب سے پہلے اختلاف کے سبب کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر سبب معلوم نہ ہو علاج کرنا مشکل ہوجاتا ہے لیکن اختلاف کا ریشہ معلوم سے جلد صلح ہوتی ہے۔

۲۔ صلح کرانے میں جلدی کی جائے۔

۳۔ صلح کراتے وقت ہر دو کی شخصیت کی خیال رکھا جائے۔ پارٹی بازی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۴۔ صلح کرانے والے شخص میں ایثار کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ اگر کچھ دینا پڑے تو قربانی دینے سے دریغ نہ کرے۔

۵۔ صلح کرانے والا شخص کسی کی طرف داری نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو ثالث سمجھ کر فیصلہ کرے تاکہ صلح ہوجائے۔

۶۔ صلح کرانے شخص با حوصلہ اور صابر ہونا چاہیے۔ مایوسی کا اظہار نہ کرے۔ بعض مسائل دقت طلب ہوتے ہیں اور دیر لگتی ہے۔

آخر میں ہم ایک داستان بیان کرتے ہیں، مرحوم مجلسیؒ بعض سے نقل کرتے ہیں کہ

پہلے زمانے میں ایک شخص کے پاس غلام تھا جو بیچنا چاہتا تھا۔ خریدار سے مالک نے کہا کہ اس غلام میں کوئی عیب نہیں ہے اور صرف سخن چینی کرتا ہے خریدار نے اس عیب کو معمولی سمجھا اور خرید لیا۔ جب غلام مالک کے گھر آیا تو شیطانی حرکات کرنے لگا، مالک کی بیوی سے کہتا ہے کہ تیرا شوہر تجھے دوست نہیں رکھتا اور وہ دوسری بیوی کی تلاش میں ہے۔

میں تجھے بلیڈ دیتا ہوں اور تو اس کے سر کے کچھ بال کاٹ ڈال تاکہ میں اس پر جادو

کروں جس سے وہ مجھ سے محبت کرے گا۔ پھر وہی غلام بیوی کے شوہر کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تیری بیوی نے اپنا یار بنا رکھا ہے اور وہ تجھے قتل کرنا چاہتی ہے اگر تو نہیں مانتا ہے تو امتحان کر کے دیکھ لے یعنی اپنے آپ کو سونے کی حالت میں بنالے۔

مرد رات کو سوتا ہے اور اچانک محسوس کرتا ہے کہ کوئی اس کے سر کے بال کاٹ رہا ہے۔اب مرد نے سمجھا کہ اس کی بیوی اسے قتل کرنا چاہتی ہے۔لہٰذا اٹھتا ہے اور بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔عورت کے قبیلہ کو خبر ملی وہ آئے اور انہوں نے مرد کو قتل کر دیا اس کے بعد دو قبیلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ نتیجہ آپ نے پڑھا ایک سخن چینی والے حضرت کا۔



۱۲۔ حسن ظن وسوئے ظن

معاشرے کی ایک بیماری بدگمانی ہے۔ یہ ایک انسان کی اندرونی حالت ہوتی ہے جس سے خاندانوں میں چھوٹ پڑ جاتی ہے۔

بدگمانی کا پہلا سبب عدم اعتماد ہے۔ اگر اعتماد ختم ہوجائے تو معاشرہ ایک جہنم بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے اعتماد کی بڑی تاکید کی ہے اور بدگمانی کو سختی سے منع کیا گیا اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جو حسن ظن اور سوئے ظن پر دلالت کرتی ہیں۔

① ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ [1]

اے ایماندارو! بہت سے گمان (بد) سے بچے رہو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تم تو

---

[1] حجرات:12

ضرور اس سے نفرت کرو گے اور خدا سے ڈرو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

② ۔ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا. [1]

(یہ فقط تمہارے حیلے ہیں) بات یہ ہے کہ تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسولؐ اور مومنین ہرگز کبھی اپنے لڑکے بالوں میں پلٹ کر آنے ہی کے نہیں (اور سب مار ڈالے جائیں گے) اور یہی بات تمہارے دلوں میں کھپ گئی تھی اور (اسی وجہ سے) تم طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے تھے اور (آخرکار) تم لوگ آپ برباد ہوئے۔

③ ۔ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا. [2]

اور منافق مرد اور منافق عورتیں اور مشرک مرد اور مشرک عورتوں پر جو خدا کے حق میں بُرے بُرے خیال رکھتے ہیں عذاب نازل کرے ان پر (مصیبت کی) بڑی گردش ہے۔ اور خدا ان پر غضب ناک ہے اور اُس نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے جہنم کو تیار کر رکھا ہے۔ اور وہ کیا بُری جگہ ہے۔

④ ۔ اِذْ جَاۗءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا. [3]

جس وقت وہ لوگ تم پر تمہارے اوپر سے آ پڑے اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی پل گئے اور جس وقت (ان کی کثرت سے) تمہاری آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں اور (خوف سے) کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور خدا پر طرح طرح کے (بُرے) خیال کرنے لگے تھے۔

⑤ ۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ

---

[1] فتح:12

[2] فتح:6

[3] احزاب:10

وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. [1]

پھر خدا نے اس رنج کے بعد تم پر اطمینان کی حالت طاری کی کہ تم میں سے ایک گروہ کو (جو سچے ایماندار تھے) خوب گہری نیند آ گئی اور ایک گروہ (جن کو اس وقت بھاگنے کی شرم سے) جان کے لالے پڑے تھے خدا کے ساتھ (خواہ مخواہ) زمانہ جاہلیّت کی ایسی بدگمانیاں کرنے لگے (اور) کہنے لگے بھلا کیا یہ امر (فتح) کچھ بھی ہمارے اختیار میں ہے؟ (اے رسُولؐ) کہہ دو ہر امر کا اختیار خدا ہی کو ہے (زبان سے تو کہتے ہی نہیں) یہ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپائے ہوئے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے (اب سنو) کہتے ہیں کہ اس امر (فتح) میں اگر ہمارا کچھ بھی اختیار ہوتا تو ہم یہاں مارے ہی نہ جاتے (اے رسُولؐ ان سے) کہہ دو کہ تم اگر اپنے گھروں میں رہتے تو جن کی تقدیر میں مرجانا لکھا تھا وہ (اپنے گھروں سے) نکل نکل کے اپنے مرنے کی جگہ ضرور آ جاتے اور (یہ اس واسطے کیا گیا) تاکہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے خدا اس کا امتحان کرے (اور لوگ دیکھ لیں) اور تاکہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے صاف کر دے اور خدا تو دلوں کا راز خوب جانتا ہے۔

۞ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ. [2]

اور جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو اسی وقت ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلائی کا گمان کیوں نہ کیا اور یہ کیوں نہ بول اٹھے کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے۔

---

[1] آل عمران:154

[2] نور:12

تفسیر وجمع بندی

پہلی آیت میں وضاحت کے ساتھ سوئے ظن سے نہی کی گئی ہے۔ یہ غیبت اور تجسس کا مقدمہ ہوتا ہے۔
خداوندعالم فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ.

اے ایماندارو! بہت سے گمانِ (بد) سے بچے رہو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تم تو ضرور اس سے نفرت کرو گے اور خدا سے ڈرو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

یہاں كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ یعنی بہت سی بدگمانیاں یہ اس لئے ہے کہ اکثر لوگ ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان ہوتے ہیں بعض نے ایک اور احتمال بھی دیا ہے لیکن پہلا قول قوی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بہت سے گمان کی نفی کی گئی ہے اس کی علت یہ ہے کہ خداوندعالم فرماتا ہے کہ کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بدگمانی دو قسم کی ہوتی ہے

بعض واقع کے مطابق اور بعض واقع کے خلاف ہوتی ہیں۔ جو واقع کے خلاف ہو وہ گناہ ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سے واقع کے مطابق اور کون سے واقع کے خلاف گمان ہیں لہٰذا انسان بدگمانی سے پرہیز کرے تاکہ خلاف واقع سوئے ظن میں مبتلا نہ ہوجائے۔

لوگوں کے اعمال کے بارے میں بدگمانی سے ایک قسم کا تجسس ہوتا ہے اور تجسس سے چھپے ہوئے عیب آشکار ہوتے ہیں جن سے غیبت کا باعث بنتی ہے۔

پہلی آیت میں پہلے بدگمانی پھر تجسس اور اس کے بعد غیبت سے نہی کی گئی ہے۔

دوسری آیت میں منافقین کی مذمت کی گئی ہے جنہوں نے حدیبیہ میں یہ گمان کیا تھا کہ جو مومنین رسولؐ کے

ساتھ مکہ جارہے ہیں مشرکین انہیں نیست و نابود کردیں گے حالانکہ قضیہ برعکس ہوا اور مسلمان کامیاب واپس آئے، خداوندعالم فرماتا ہے:

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا.

(یہ فقط تمہارے حیلے ہیں) بات یہ ہے کہ تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ رسولؐ اور مومنین ہرگز کبھی اپنے لڑکے بالوں میں پلٹ کر آنے ہی کے نہیں (اور سب مار ڈالے جائیں گے) اور یہی بات تمہارے دلوں میں کھپ گئی تھی اور (اسی وجہ سے) تم طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے تھے اور (آخرکار) تم لوگ اپنے آپ برباد ہوئے۔

کلمہ بور کا معنی شدید کساد اور شدت کساد۔ جو فساد کا باعث ہوتا ہے۔ عربوں میں ضرب المثل معروف ہوگئی کہ "كَسَدَ حَتّٰى فَسَدَ" یہ کلمہ پہلے فساد کے معنی میں استعمال ہوا اور پھر ہلاکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ درخت، پھول اور گھاس سے خالی زمین کو بھی کہا جاتا ہے چونکہ ایسی زمین درحقیقت فاسد اور مردہ ہوتی ہے۔

صلح حدیبیہ میں منافقین اس بدگمانی کا شکار ہوگئے تھے لہٰذا یہاں پر "بور" کا معنی ہلاکت ہے اور ہلاکت معنوی مراد ہے یعنی ثواب سے محروم ہونا۔ ان کے دل فضائل اخلاقی کے لئے پھول ہیں۔ یا ہلاکت سے مراد آخرت میں عذاب الٰہی ہے۔ دنیا میں رسوائی کا سبب ہے۔

تیسری آیت میں خدا سے سوئے ظن کے بارے میں ذکر ہوا ہے حالانکہ پچھلی آیات میں انسان سے سوئے ظن سے نہیں کی گئی تھی۔

خداوندعالم فرماتا ہے:

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا.[1]

اور منافق مرد اور منافق عورتیں اور مشرک مرد اور مشرک عورتوں پر جو خدا کے حق میں بُرے بُرے خیال رکھتے ہیں عذاب نازل کرے ان پر (مصیبت کی) بڑی گردش ہے۔ اور خدا

---

[1] فتح:6

ان پر غضب ناک ہے اور اُس نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے جہنم کو تیار کر رکھا ہے۔ اور وہ کیا بُری جگہ ہے۔

ان کا خدا کے بارے میں بدگمان ہونا اور سوئے ظن رکھنا یعنی خدا کے وعدے کبھی پورے نہیں ہوں گے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کامیاب نہیں ہوں گے۔ مسلمان جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مکہ جا رہے ہیں وہ نہ صرف ناکام ہوں گے بلکہ مشرکین سے شکست کھا کر یا شرکی خاطر انہیں قتل کر دیں گے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ کافی نہ تھا لیکن خدا نے کامیابی کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اللہ نے مشرکین کے دلوں میں رعب اور وحشت ڈال دی جس سے وہ صلح حدیبیہ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی صلح نامہ تھا جس کے بعد مسلمان ہمیشہ کامیاب رہے۔

بہرحال اسلام اور قرآن نے سوئے ظن کی سخت خدمت کی ہے اور اس بیماری والوں کو سخت عذاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ خدا سے سوئے ظن والا مسئلہ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کے درمیان مشترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ اس کے برعکس مومنین خدا کے وعدوں سے حسن ظن رکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ وعدے حتماً پورے ہو کر رہیں گے۔ ممکن ہے مصلحت کی وجہ سے جلد یا دیر ہو لیکن ہوگا ضرور کیونکہ تمام جہانوں کے جاننے والا اور قادر ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. [1]

اور سارے آسمان و زمین کے لشکر خدا ہی کے ہیں اور خدا تو بڑا واقف کار اور غالب ہے۔

مشرکین کا سوئے ظن اور مومنین کا حسن ظن کرانا اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین ظاہری امور پر نگاہ رکھتے ہیں حالانکہ مومنین باطن کو بھی جانتے ہیں۔

چوتھی آیت بھی خدا کے وعدوں کے بارے میں سوئے ظن کے بارے میں ذکر ہوئی ہے۔ یہ جنگ احزاب کی داستان سے مربوط ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں خطرناک ترین جنگ ہوئی ہے کیونکہ مشرکین اپنے تمام گروہوں کے ساتھ متحد ہو کر اسلام کے خلاف جنگ کرنے آئے تھے۔ خداوند عالم نے فرمایا:

---

[1] فتح:7

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا.[1]

جس وقت وہ لوگ تم پر تمہارے اوپر سے آ پڑے اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی پل گئے اور جس وقت (ان کی کثرت سے) تمہاری آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں اور (خوف سے) کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور خدا پر طرح طرح کے (بُرے) خیال کرنے لگے تھے۔

بے شک لوگوں کے بارے میں سوئے ظن اور خدا کے بارے میں سوئے ظن کرنے میں فرق ہے۔ لوگوں سے سوئے ظن کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے ایک گناہ کا کام واقع ہوا ہے لیکن خدا سے سوئے ظن کا سبب تزلزل ایمان ہوتا ہے کیونکہ خدا کے وعدوں پر یقین نہ کرنا اور وعدہ خلافی سمجھنا جہالت کا سبب ہے یا عاجز اور چھوٹا ہونے کی نشانی ہے۔

پانچویں آیت میں بھی خدا سے سوئے ظن کا ذکر ہوا ہے، یہ جنگ احد سے مربوط ہے۔ بعض وہ مسلمان جو تازہ مسلمان ہوئے تھے جب انہوں نے پہلے جنگ احد میں شکست دیکھی تو ان میں خدا کے بارے میں سوئے ظن پیدا ہونے لگا، مذکورہ آیت نازل ہوئی اور ان کی سخت خدمت کی گئی۔ حالانکہ جنگ کے شروع میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی لیکن بعض دنیا پرست نے مال غنیمت کے جمع کرنے کے لالچ میں اگر جیتی ہوئی جنگ دوبارہ شکست میں بدل دی۔ دشمن نے انہیں غافل بنا کر ایک سخت حملہ کیا۔ لہٰذا دوبارہ مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے وعدے پر عمل کیا لیکن بندوں نے وعدہ پورا نہ کیا۔

پھر خدا فرماتا ہے:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

پھر خدا نے اس رنج کے بعد تم پر اطمینان کی حالت طاری کی کہ تم میں سے ایک گروہ کو

---

[1] احزاب:10

(جو سچے ایماندار تھے) خوب گہری نیند آ گئی اور ایک گروہ (جن کو اس وقت بھاگنے کی شرم سے) جان کے لالے پڑے تھے خدا کے ساتھ (خواہ مخواہ) زمانہ جاہلیّت کی ایسی بدگمانیاں کرنے لگے (اور) کہنے لگے بھلا کیا یہ امر (فتح) کچھ بھی ہمارے اختیار میں ہے؟ (اے رسُولؐ) کہہ دو ہر امر کا اختیار خدا ہی کو ہے (زبان سے تو کہتے ہی نہیں) یہ اپنے دلوں میں ایسی باتیں چھپائے ہوئے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے (اب سنو) کہتے ہیں کہ اس امر (فتح) میں اگر ہمارا کچھ بھی اختیار ہوتا تو ہم یہاں مارے ہی نہ جاتے (اے رسُولؐ ان سے) کہہ دو کہ تم اگر اپنے گھروں میں رہتے تو جن کی تقدیر میں مرجانا لکھا تھا وہ (اپنے گھروں سے) نکل نکل کے اپنے مرنے کی جگہ ضرور آ جاتے اور (یہ اس واسطے کیا گیا) تا کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے خدا اس کا امتحان کرے (اور لوگ دیکھ لیں) اور تا کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے صاف کر دے اور خدا تو دلوں کا راز خوب جانتا ہے۔

اس آیت میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ تمہارے لئے یہ ایک امتحان الٰہی تھا تا کہ تمہارے ایمان اور اسلام سے وفاداری کا میزان کا پتہ چل جائے۔

گزشتہ آیات سے روشن ہوگیا خدا سے سوئے ظن کا سبب ضعف ایمان ہونا ہے۔ جنگ احد، جنگ احزاب اور کبھی حدیبیہ میں ایمان اخلاص کا امتحان ہوا تھا۔

چھٹی آیت میں سوئے ظن سے حسن ظن کی طرف دعوت دی گئی ہے یہ آیت داستان افک کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ منافقین کے ایک گروہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بیوی پر عفت کے خلاف تہمت لگائی۔ یہ ایک سازش تھی اور پورے مدینہ میں بات پھیل گئی۔ منافقین کے ظاہری طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی پر تہمت لگائی تھی لیکن درحقیقت یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے خلاف سازش تھی۔ اس واقعہ کے بعد آیات نازل ہوئیں اور منافقین کی سازش ناکام ہوگئی۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ.

اور جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو اسی وقت ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلائی کا گمان کیوں نہ کیا اور یہ کیوں نہ بول اٹھے کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے۔

یہاں مومنین و مومنات کی تعبیر آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں حسن ظن پیدا کرنا ایمان کی ایک نشانی ہے۔

درحقیقت یہاں پر لوگوں کے تین گروہ ہیں منافقین، سازشی گروہ کے سرکردہ افراد اور مومنین پاک دل ہیں لیکن سادگی کی وجہ سے سوئے ظن کا شکار ہو گئے۔

سوئے ظن روایات میں

روایات میں سوئے ظن کی خدمت ہوئی ہے اور بدترین بیماری کے طور پر شمار ہوئی ہے۔ اب مندرجہ ذیل روایات پر توجہ فرمائیں:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِیّاکُمْ وَ الظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْکِذْبِ.[۱]

گمان سے پرہیز کرو کیونکہ بدگمانی بدترین قسم کا جھوٹ ہے۔

۲۔ آپؐ ہی سے منقول ہے آپؐ نے فرمایا:

اَنَّ اللهَ حَرَّمَ مِنَ الْمُسْلِمِ دَمَهُ وَ مالُهُ وَ عِرْضُهُ وَ اَنْ یَظُنَّ بِهِ السُّوءِ.[۲]

خداوند عالم نے مسلمانوں کا حال، خون اور آبرو ایک دوسرے پر حرام کی ہے اسی طرح ان کے بارے میں بدگمانی بھی حرام ہے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا اِیْمانَ مَعَ سُوءِ ظَنٍّ.[۳]

جو شخص سوئے ظن کرتا ہے اس کا ایمان نہیں

---

[۱] وسائل الشیعہ، جلد 18، صفحہ 38 (حدیث 42)، بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 195.

[۲] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 268.

[۳] غررالحکم، جلد 6، صفحہ 362.

۴۔ آپ ہی نے فرمایا:

اِیّاکَ اَنْ تُسِیءَ الظَّنَّ فَاِنَّ سُوءَ الظَّنِ یُفْسِدُ الْعِبادَةَ وَ یُعَظِّمُ الْوِزْرَ.[۱]

سوئے ظن سے پرہیز کرو کیونکہ سوئے ظن عبادت کو باطل اور اس سے انسان کی پشت پر سنگین بار ہوتا ہے۔

۵۔ حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا:

سُوءُ الظَّنِ بِالْمُحْسِنِ شَرُّ الْاِثْمِ وَ اَقْبَحُ الظُّلْمِ.[۲]

نیک افراد سے بدگمانی بدترین گناہ اور بہت بڑا ظلم ہے۔

۶۔ حضرت امیر علیہ السلام ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

سُوءُ الظَّنِ یُفْسِدُ الْاُمُورَ وَ یَبْعَثُ عَلَی الشُّرُورِ.[۳]

سوئے ظن سے فساد برپا ہوتا ہے اور مختلف شر کا سبب بنتا ہے۔

۷۔ آپ ہی نے فرمایا:

شَرُّ النّاسِ مَنْ لا یَثِقُ بِاَحَدٍ لِسُوءِ ظَنِّهِ وَ لا یَثِقُ بِهِ اَحَدٌ لِسُوءِ فِعْلِهِ.[۴]

لوگوں میں سے بدترین وہ افراد ہیں جو سوئے ظن کی وجہ سے لوگوں پر اعتماد نہیں کرتے اور اس کے اس برے عمل کی وجہ سے ان پر کوئی اعتماد نہیں کرتا۔

۸۔ نہج البلاغہ میں ملتا ہے:

لا تَظُنَّنَّ بِكَلِمَةٍ خَرَجَتْ مِنْ اَحَدٍ سُوءً وَ اَنْتَ تَجِدُ لَها فِي الْخَيْرِ مُحْتَمَلا (مَحْمِلا).[۵]

جو کسی کے منہ سے بات نکلتی ہے اس سے سوئے ظن نہ کرو حالانکہ اس صحت پر عمل کر سکتے

---

[۱] غرر الحکم، جلد 2، صفحہ 308.

[۲] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 132.

[۳] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 132، حدیث 5575.

[۴] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 178.

[۵] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حدیث 360، بحار الانوار، جلد 71، صفحہ 187.

ہو۔

۹۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

وَاللهِ ما يُعَذِّبُ اللهُ سُبْحانَهُ مُؤمِناً بَعْدَ الْإيمانِ اِلّا بِسُوءِ ظَنِّهِ وَ سُوءِ خُلُقِهِ.[۱]

خدا کی قسم! خداوند عالم کسی مومن کو ایمان کے بعد عذاب نہیں دیتا سوائے سوئے ظن اور بداخلاقی کی وجہ سے۔

ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں:

مَنْ غَلَبَ عَلَيْهِ سُوءُ الظَّنِّ لَمْ يَتْرُكْ بِيْنَهُ وَبَيْنَ خَليل صُلْحاً.[۲]

جس شخص پر سوئے ظن غالب ہو تو وہ اپنے دوستوں سے صلح برقرار نہیں رکھ سکتا۔

سوئے ظن کی مذمت اور خدا کے وعدہ پر عدم ایمان کی بھی سخت مذمت ہوئی ہے۔ اس سے مادی و معنوی زندگی پر اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

۱۔ امام باقر علیہ السلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں نقل کرتے ہیں:

وَاللهِ الَّذى لا اِلهَ اِلّا هُوَ لا يُعَذِّبُ اللهُ مُؤمِناً بَعْدَ التُوبَةِ وَالْإسْتِغْفارِ اِلّا بِسُوءِ ظَنِّهِ بِاللهِ وَ تَقْصِيرٍ مِنْ رَجائِهِ بِاللهِ وَ سُوءُ خُلْقِهِ وَاغْتِيابِهِ لِلْمُؤمِنينَ.[۳]

اس خدا کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور قسم ہے اس خدا کی کہ جو کسی مومن کو اس کی توبہ و استغفار کے بعد عذاب نہیں دیتا سوائے خدا سے سوئے ظن کرنے، اس پر امید نہ رکھنا بداخلاقی اور مومن کی غیبت کی وجہ سے۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام نبی سے یوں حدیث نقل کرتے ہیں!

يا رَبِّ ما آمَنَ بِكَ مَنْ عَرَفَكَ فَلَمْ يُحْسِنِ الظَّنَّ بِكَ.[۴]

---

[۱] غرر الحکم، جلد 6، صفحہ 244، حدیث 10140.

[۲] غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 406.

[۳] بحار الانوار، جلد 67، صفحہ 394.

[۴] بحار الانوار، جلد 67، صفحہ 394.

خدایا! جو تیری معرفت رکھتا ہے لیکن تجھ سے حسن ظن نہ رکھتا ہو وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْجُبْنُ وَ الْحِرْصُ وَ الْبُخْلُ غَرائِزُ سُوء یَجْمَعُها سُوءُ الظَّنِّ بِاللهِ سُبحانَهُ.[۱]

ڈر، حرص اور بخل مختلف وجوہات ہیں جو شخص خدا پر سوئے ظن رکھتا ہے اس میں یہ سب جمع ہیں۔

جو شخص خدا کی نصرت کا یقین کرتا ہے اور اسے کسی قسم کا ڈر نہیں ہونا چاہیے اور جو شخص خدا کے وعدوں پر مطمئن ہے اسے حریص نہیں ہونا چاہیے۔

حسن ظن روایات میں

سوئے ظن انسان کی بدبختی کا سامان ہے۔ اس سے معاشرہ ویران ہوجاتا ہے۔

اس سے انسان کی روح وجسم کو تکلیف ہوتی ہے۔ حسن ظن آرام و راحت کا باعث ہے۔ اس لئے خدا اور لوگوں میں سے ہر دو کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے:

لوگوں سے حسن ظن:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ اَفْضَلِ السَّجایا وَ اَجْزَلِ الْعَطایا.[۲]

حسن ظن بہترین صفات میں سے ہے اور بہترین عطیہ الٰہی ہے۔

۲۔ آپؑ ہی نے فرمایا:

---

[۱] شرح غرر، جلد 2، صفحہ 60.

[۲] غرر الحکم، حدیث 4834.

حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ اَحْسَنِ الشِّيَمِ وَ اَفْضَلِ الْقِسَمِ.[1]

حسن ظن بہترین عادت اور بہترین چیز ہے کہ جس سے لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی سے روایت ہے:

حُسْنُ الظَنِّ يُخَفِّفُ الهَمَّ وَ يُنجِي مِنْ تَقَلُّدِ الْاِثْمِ.[2]

حسن ظن سے غم کم ہوتا ہے اور گناہوں سے نجات ملتی ہے۔

۴۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے:

حُسْنُ الظَّنِّ راحَةُ الْقَلْبِ وَ سَلامَةُ الدّينِ.[3]

حسن ظن سے دل کو سکون ملتا ہے اور دین سلامت رہتا ہے۔

۵۔ ایک حدیث معصومین علیہم السلام سے مروی ہے:

مَنْ حَسُنَ ظَنُّهُ بِالنّاسِ حازَ مِنْهُمُ الْمَحَبَّةَ.[4]

جس کے دل میں لوگوں کے بارے میں حسن ظن ہو لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔

اللہ سے حسن ظن:

خدا سے حسن ظن کے بارے میں بھی بہت زیادہ روایات موجود ہیں۔ اب ہم ان میں سے بعض روایات کو ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ بعض معصومین علیہم السلام سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے:

وَالَّذی لااِلهَ اِلّا هُوَ ما اُعْطِيَ مُؤْمِنٌ قَطُ خَيْرَ الدُّنيا وَ الْاٰخِرَةِ اِلا بِحُسْنِ ظَنِّهِ بِاللهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ رَجائِهِ لَهُ وَ حُسْنِ خُلْقِهِ وَ الْكَفِّ عَنْ اِغْتِيابِ الْمُؤْمِنينَ.[5]

---

[1] غرر الحکم، حدیث 4824.

[2] غرر الحکم، حدیث 4823.

[3] غرر الحکم، حدیث 4816.

[4] غرر الحکم، حدیث 8842.

[5] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 71، حدیث 2.

اس خدا کی قسم! جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور کوئی مومن انسان دنیا و آخرت کی بھلائی کو نہیں پا سکتا سوائے خدا سے حسن ظن رکھنے اور اس پر امید رکھنے، خوش اخلاق ہونے اور غیبت سے بچنے کی وجہ سے۔

۲۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اَحْسِنِ الظَّنَّ بِاللهِ فَاِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ بِی اِنْ خَيْراً فَخَيْراً وَاِنْ شَرّاً فَشَرّاً.[۱]

خدا سے حسن ظن رکھو کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے: جب کوئی بندۂ مومن گمان کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں اگر وہ اچھا گمان کرے تو اس کا اچھا نتیجہ ملے اور اگر برا گمان کرے گا تو اس کا نتیجہ برا ملے گا۔

۳۔ اسی مضمون کی روایت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہوئی ہے:

وَالَّذِی لا اِلهَ اِلّا هُوَ لايُحْسِنُ ظَنَّ عَبْد مُؤمِن بِاللهِ اِلّا كانَ اللهُ عِنْدَ ظَنَّ عَبْدِهِ الْمُؤمِنِ لِاَنَّ اللهَ كَرِيمٌ بِيَدِهِ الْخَيْراتُ يَسْتَحْيِی اَنْ يَكُونَ عَبْدُهُ الْمُؤمِنُ قَدْ اَحْسَنَ بِهِ الظَّنّ ثُمَّ يُخْلِفُ ظَنَّهُ وَرَجائَهُ فَاَحْسِنُوا بِاللهِ الظَّنَّ وَارْغَبُوا اِلَيْهِ.[۲]

قسم ہے اس خدا کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے جو مومن آدمی خدا سے حسن ظن رکھتا ہو تو خدا اس مومن کے گمان کے ساتھ ہے کیونکہ خدا کریم ہے اور تمام نیکیاں اسی کی طرف سے ہیں خدا ایسے مومن بندے سے حیا کرتا ہے جو اللہ پر حسن ظن رکھتا ہو لیکن خدا اسے ناامید کرے لہٰذا خدا پر حسن ظن رکھو اور اس کی طرف رغبت کرو۔

۴۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

رَأَيْتُ رَجُلا مِنْ اُمَّتی عَلَی الصِّراطِ يَرْتَعِدُ كَما تَرْتَعِدُ السَّعْفَةُ فی يَوْمِ رِيحٍ عاصِفٍ وَجائَهُ حُسْنُ ظَنِّهِ بِاللهِ فَسَكَّنَ رَعْدَتَهُ.[۳]

---

[۱] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 72، حدیث 3.

[۲] بحار الانوار، جلد 67، صفحہ 365، حدیث 14.

[۳] مستدرک الوسائل، جلد 11، صفحہ 250.

میں نے اپنی امت کا ایک فرد پل صراط پر لرزتے دیکھا۔جس طرح کھجور کی شاخ طوفان میں لرزتی ہے۔اس دوران وہ کہ جس نے خدا پر حسن ظن رکھا تھا اُسے آرام آ گیا۔

۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

حُسْنُ الظَّنِّ بِاللهِ اَنْ لاتَرْجُوَا اِلّا اللهَ وَلاتَخافَ اِلّا ذَنْبَهُ.[1]

خدا سے حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اسی پر امید رکھی جائے اور اس کے علاوہ گناہ میں کسی سے نہ ڈرو۔

سوئے ظن وحسن ظن کی تعریف

لوگوں میں ان کلمات کا معنی واضح ہے۔سوئے ظن کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کی صحیح اور غلط دو معانی مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن یہ شخص غلط ہی مراد لیتا ہے۔مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی شخص کو عورت کے ساتھ دیکھتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ نامحرم ہے اور اس کی نیت برے عمل کی طرف ہو۔

حالانکہ حسن ظن یہ ہے کہ شاہد وہ اس کی محرم یا اس کی اپنی بیوی ہو۔اگر کوئی شخص مسجد کو بناتا ہے اور کوئی دوسرا سوئے ظن کرتا ہے یعنی خیال کرتا ہے کہ اس نے ریا کاری کی وجہ سے مسجد بنائی ہے حالانکہ حسن ظن یہ ہے کہ اس نے اللہ کی خوشنودی کے لئے بناتی ہے۔

یہاں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حسن ظن اور سوئے ظن کا دائرہ وسیع ہے اور نہ صرف عبادات کو شامل ہے بلکہ اجتماعی، اخلاقی، اعتقادی اور سیاسی مسائل کو بھی شامل ہے۔

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 72، حدیث 4.

سوئے ظن کے برے آثار

انسانی معاشرے میں یہ بیماری بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے آثار بہت ہی نامطلوب ہیں جو کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل نکات پر مجبور کریں۔

(۱) معاشرے کا اصلی سرمایہ اعتماد ہے اور سوئے ظن سے یہ اعتماد ختم ہوجاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے اعتمادی عام ہے روایات میں اس بیماری میں مبتلا افراد کو بدترین افراد کہا گیا ہے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ ساءَتْ ظُنُونُه اِعْتَقَدَ الْخِيانَةَ بِمَنْ لا يَخُونُه.[۱]

جو شخص ایسے فرد کے بارے میں سوئے ظن رکھتا ہو جس نے اس سے خیانت نہ کی۔

(۲) سوئے ظن سے معاشرے میں آرام وسکون ختم ہوجاتا ہے۔

(۳) انسان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت نہیں ہوتی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

سُوءُ الظَّنِّ يُفْسِدُ الْاُمُورَ وَيَبْعَثُ عَلَى الشُّرُورِ.[۲]

سوئے ظن سے فساد ہوتا ہے اور لوگوں میں مختلف برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

بعض اوقات سوئے ظن جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

بعض افراد سوئے ظن سے مجنون و پاگل ہوجاتے ہیں،

ایک مشہور واقعہ کو ہم نقل کرتے ہیں کہ

ایک ماہر نفسیات جب ایک ہسپتال میں جاتے ہیں اور ایک مجنون کو دیکھتا ہے جو بار بار ٹشو ٹشو کا تکرار کرتا ہے۔ جب پوچھ گچھ ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ ایک داستان ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے اس کی بیوی کے پرس میں مردانہ ہدیے تھے وہ اپنی بیوی کے بارے میں بدگمان ہوگیا، اس

---

[۱] غرر الحکم، حدیث 8837.

[۲] عیون الحکم والمواعظ (للیثی) / 283 / الفصل الثانی باللفظ المطلق .....ص: 283

نے سمجھا اس نے کسی مرد سے بنا رکھی ہے۔ بہت غصہ میں آ کر اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ جب اس نے پرس کو کھولا اور ٹشو پیپر نکالا تو ایک کاغذ پر یہ لکھا ہوا تھا۔ یہ میرے شوہر کی سالگرہ کے لئے تحفہ ہے جب اس نے یہ سمجھا کہ یہ تحفہ تو میرے لئے ہی تھا۔ اچانک دیوانہ ہوجاتا ہے اور بار بار ٹشو پیپر ٹشو پیپر کی تکرار کرتا تھا۔

(۴) سوئے ظن درحقیقت ایک ظلم ہے جیسا کہ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: بدگمانی بدترین ظلم ہے۔

(۵) سوئے ظن رکھنے والے شخص کے دوست کم ہوئے ہیں۔ حتیٰ رشتہ دار بھی اس سے دور ہوجاتے ہیں اور وہ تنہا رہ جاتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

جس شخص پر سوئے ظن غالب ہوجائے تو وہ اپنے دوستوں سے صلح نہیں کرسکتا۔

(۶) سوئے ظن انسان کی عبادت کو باطل کر دیتا ہے۔

(۷) سوئے ظن ایک انحرافی تفکر ہے۔ آہستہ آہستہ دونوں لوگوں (سوئے ظن کرنے والے اور جس پر سوئے ظن کیا جاتا ہے) پر اثر انداز ہوتا ہے۔

حضرت سے منقول ہے:

مَنْ ساءَ ظَنُّهُ ساءَ وَهْمُه.[1]

جو شخص سوئے ظن رکھتا ہے اس کا تفکر خراب ہوجاتا ہے۔

---

[1] عیون الحکم والمواعظ (للیثی) / 430 / الفصل الأول بالمیم المفتوحة بلفظ من .....ص: 423

خدا سے سوئے ظن کے آثار

اللہ سے سوئے ظن رکھنا یعنی اس کے وعدے پر امید رکھنا: آیات و روایات میں ملتا ہے کہ اس کے خطرناک آثار اور ایمان وعقائد کی اساس کو کمزور کر دیتا، انسان خدا سے دور ہوجاتا ہے، جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا: خدایا! جو تیری معرفت رکھتا ہے اور حسن ظن نہیں رکھتا وہ ایسا ہے جیسے ایمان نہ لایا ہو۔ خدا سے سوئے ظن اس بات کا بھی سبب بنتا ہے کہ انسان کی عبادت باطل ہوجاتی ہے کیونکہ انسان میں روح اخلاص مرجاتا ہے۔ خدا کے وعدوں سے سوئے ظن کرنا انسان کی سخت حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان الطاف الٰہی سے محروم ہوجاتا ہے کیونکہ خداوند عالم شخص کے سوئے ظن یا حسن ظن کے مطابق عمل کرتا ہے۔ حضرت نعمان اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہیں: خدا سے حسن ظن رکھو پھر لوگوں سے سوال کرو کہ کون ہے ایسا جو خدا کی سمت نیک ظن رکھتا ہو اور خدا اس کے مطابق عمل نہ کیا ہو۔ [1]

سوئے ظن کے علل و اسباب

دوسرے رذائل کی مانند اس کے بھی کئی علل و اسباب ہیں۔

۱۔ ظاہری و باطنی آلودگی، جو افراد خود آلودہ ہیں وہ دوسروں کو بھی آلودہ سمجھتے ہیں۔ جب تک خود گناہ کرتے ہیں دوسروں کو بھی گناہ گار سمجھتے ہیں۔ جب خود نیک ہوجاتے تب جا کر حسن ظن پیدا ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا یَظُنُّ بِاَحَدٍ خَیْراً اِلّا اَنَّهُ لا یَراهُ اِلّا بِطَبْعِ نَفْسِهِ. [2]

---

[1] آثار الصادقین، جلد 12، صفحہ 240.

برا آدمی کسی سے اچھا گمان نہیں کرتا کیونکہ دوسروں کو اپنے جیسا سمجھتا ہے۔

۲۔ برے افراد کی صحبت، جس کی محفل میں برے دوست ہوں وہ ہمیشہ سب لوگوں کے بارے میں برا سوچتا ہے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مُجالَسَةُ الْاَشْرارِ تُورِثُ سُوءَ الظَّنِّ بِالْاَخْيارِ.[۱]

بروں کی صحبت سے نیک لوگوں کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ بری سوسائٹی: ایک خاندان، شہر یا ملک میں جب فساد حاکم ہو تو ہر شخص کی نظر میں سب برے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ معاشرے میں اچھے افراد بھی موجود ہوتے ہیں۔

۴۔ حسد، کینہ، تکبر وغرور یہ بھی اسباب سوئے ظن ہیں۔

۵۔ حقارت: سوئے ظن کا ایک سبب حقارت ہے، جو شخص دوسروں کی نگاہ میں حقیر ہو وہ دوسروں کو بھی حقیر سمجھتا ہے۔

مراتب سوئے ظن

ایک مہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا سوئے ظن ایک اختیاری عمل ہے یا غیر اختیاری؟

اگر کوئی آدمی ایک واقعہ دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے کیا یہ اس کا عمل قابل مذمت ہے؟ اس جواب کے لئے دو حل ہیں۔

۱۔ یہ کہ فکر انسان میں بدگمانی پیدا ہوئی ہے اور اس کا عذاب نہیں یعنی جب عملی صورت نہ ہو مجازیت نہیں ہوتی۔ عملی یعنی زبان سے کہنا۔

اس لئے بعض علمائے اخلاق نے فرمایا ہے:

وَ اَمّا الْخَواطِرُ وَ حَدِيْثُ النَّفْسِ فَهُوَ مَعْفُوٌّ عَنْهُ...وَلكِنَّ الْمَنْهِيَّ عَنْهُ اَنْ تَظُنَّ، وَ الظَّنُّ عِبارَةٌ عَمّا تَرْكَنُ اِلَيْهِ النَّفْسُ، وَ تَمِيْلُ اِلَيْهِ الْقَلْبُ.[۲]

جو چیز انسان کے ذہن میں جاتی ہے اور خود انسان اپنے آپ سے کہتا ہے تو یہ معاف ہے۔ جس کو منع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے بارے میں بدگمانی کرے اور عمل سے

ظاہر ہو خلاصہ: یہ کہ سوئے ظن کے تین مراحل ہیں:

۱۔ سوئے ظن قلبی

۲۔ سوئے ظن زبانی

۳۔ سوئے ظن عملی

جو کچھ دل میں ہے انسان اس کا مکلف نہیں ہوتا چونکہ اختیار ہی نہیں ہے لیکن جو کچھ زبان اور عمل میں ہے حرام وممنوع ہے۔

بعض روایات میں ملتا ہے: تین چیز ایسی ہیں کوئی انسان اس سے پاک نہیں ہوتا ان میں سے ایک بدگمانی ہے، پھر فرمایا:

وَإِذا ظَنَنْتَ فَلا تَحَقَّقْ.[۱]

جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کے بارے میں چھان بین نہ کرو۔

۲۔ برے افراد کی صحبت سے پرہیز کرنا جب کسی مرد کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھو تو حسن ظن رکھو کہ یہ اس کی محرم ہوگی۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اُطْلُبْ لِأَخِيكَ عُذْراً فَإِنْ لَمْ تَجِدْ لَهُ عُذْراً فَالْتَمِسْ لَهُ عُذْراً.[۲]

اپنے مسلمان بھائی کے لئے کوئی عذر تلاش کرو اگر (ظاہراً) عذر نہ ہو تو پھر بھی کوشش کرو کہ کوئی عذر مل جائے۔

اس طرح حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اپنے بھائی کے عمل کو بہترین صورت پر عمل کرو اور اس سے بدگمانی نہ کرو اور اس کے عمل کو عمل برصحت سمجھو۔

ایک لحاظ سے سوئے ظن کی تین اقسام ہوسکتی ہیں۔

۱۔ وہ سوئے ظن کہ جس کے آثار کردار میں نمایاں ہوں، یہ سوئے ظن حرام ہے۔

۲۔ وہ سوئے ظن کی جس کا ظاہری اثر نہیں۔ احتمال ہے کہ یہ بھی حرام ہو۔

۳۔ وہ سوئے ظن جس کا خارج میں کوئی ترتیب اثر نہ ہو۔ کلی طور پر انسان کے اختیار سے

باہر ہے۔اس کا انسان مکلف نہیں۔

قرآن مجید سورۂ اسراء کی ۳۶ آیت میں ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا.

اور جس چیز کا کہ تمہیں یقین نہ ہو (خواہ مخواہ) اس کے پیچھے نہ پڑا کرو۔ (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ان سب کی (قیامت کے دن) یقیناً باز پُرس ہونی ہے۔

بدگمانی کا درمان

سب سے پہلے انسان کو گناہ کے آثار پر توجہ کرنی چاہیے۔

۱ _____ معاشرے میں اصلی سرمایہ یعنی اعتماد ختم ہوجاتا ہے۔

۲ _____ معاشرے میں بدنظمی آتی ہے۔

۳ _____ انسان کے دوست دور ہوجاتے ہیں۔

۴ _____ انسان حقیقت سے غافل ہوجاتا ہے۔

۵ _____ دوسروں کے حق میں بے انصافی ہوتی ہے۔

۶ _____ یہ ایک زہریلی غذا کی مانند ہے۔

۷ _____ بروں کی محفل سے پرہیز کیا جائے۔

۸ _____ حسد، کینہ، تکبر اور غرور بھی سوئے ظن کے عوامل ہیں لہٰذا ان سے پرہیز کریں۔

مندرجہ ذیل امور سے بھی نجات مل سکتی ہے:

الف: مجمل اعمال کی توجیہ کرنا۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا تَظُنَّنَّ بِكَلِمَةٍ خَرَجَتْ مِنْ اَحَدٍ سُوءً وَ اَنْتَ تَجِدُ لَهَا فِي الْخَيْرِ مُحْتَمِلا.[1]

جس شخص سے کوئی کلام صادر ہوا ہو اُسے بدگمانی نہ سمجھو کیونکہ اسے صحیح توجیہہ کرسکتے ہیں

انسان کے اعمال کا عمل برصحت کرو۔

ب: دوسروں کے اعمال میں جستجو وتجسس نہ کرنا۔

ج: بدگمانی کو زبان وعملی ترتیب نہ دینا،

روایات میں ملتا ہے:

اِذا ظَنَنْتُمْ فَلا تَحَقَّقُوا.[1]

جب تمہیں بدگمانی ہوتو اسے عملی صورت میں ظاہر نہ کرو۔

موارد استثناء

بے شک سوئے ظن ایک عنوان کلی کے طور پر قبول ہے لیکن اس کے استثناء بھی ہیں۔

ا۔ جب فساد معاشرے میں غالب عادت بن چکا ہو۔ فساد کرنے والے غالب ہوں۔ ایسی صورت میں حسن ظن نہ صرف فضائل اخلاقی نہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ انسان ناخوشگوار واقعہ میں مبتلا ہوجائے۔

(ا) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِذا اسْتَوْلَى الصَّلاحُ عَلَى الزَّمانِ وَ اَهْلِهِ ثُمَّ اَساءَ رَجُلٌ الظَّنَّ بِرَجُل لَمْ تَظْهَرْ مِنْهُ حَوْبَةٌ فَقَدْ ظَلَمَ، وَ اِذا اسْتَوْلَى الْفَسادُ عَلَى الزَّمانِ وَ اَهْلِهِ فَاَحْسَنَ رَجُلٌ الظَّنَ بِرَجُل فَقَدْ غَرَّرَ.[2]

جب معاشرے اور ماحول میں دوستی ہو ایسی صورت میں دوسرے سے اگر کوئی گناہ ہوتو سوئے ظن کرنا ظلم وستم ہے۔ لیکن جب ہر طرف فساد ہی فساد ہو حسن ظن پیدا کرنا اپنے آپ کو فریب دینے کے مترادف ہے۔

اس مضمون کی روایت امام جعفر صادق، امام علی نقی اور امام موسیٰ کاظم علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں۔[3]

ایک حدیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے:

اِحْتَرِسُوا مِنَ النّاسِ بِسُوءِ الظَّنِّ.[4]

لوگوں سے سوئے ظن کرنے سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

البتہ ان استثناء کو بہانہ بنا کر سوئے ظن کرنا نہیں چاہتے۔

(۲)CIA یعنی اجنبیت اور اطلاعات جو معاشرے کے بارے میں مربوط ہے میں حسن ظن نہیں رکھنا چاہیے بلکہ مشکوک حرکات پر توجہ دینی چاہیے اور تحقیق کرنا چاہتے۔

(۳)ایک جگہ سوئے ظن نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے اور وہ ہے دشمن کے مقابلے میں۔ دشمن کی حرکات سے ہوشیار رہنا چاہتے۔

اس لئے مالک اشترؓ کے نام فرمان میں آیا ہے:

اَلْحَذَرَ كُلَّ الْحَذَرِ مِنْ عَدُوِّكَ بَعْدَ صُلْحِهِ فَاِنَّ الْعَدُوَّ رُبَّما قارَبَ لِيَتَغَفَّلَ فَخُذْ بِالْحَزْمِ وَ اتَّهِمْ فى ذلِكَ حُسْنَ الظَّنِّ.[1]

جب تم دشمن سے صلح یا پیمان باندھتے ہوتو ہوشیار رہو کیونکہ کبھی دشمن نزدیک ہوتا ہے تاکہ دوسرے کو بغل گیر بنائے۔ لہٰذا ایسی شرائط میں احتیاط سے کام لو اور دور اندیشی سے کام لو اور حسن ظن نہ کرو۔

يا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسانِهِ وَ لَمْ يُسْلِمْ بِقَلْبِهِ لا تَتَّبِعُوا عَثَراتِ الْمُسْلِمينَ، فَاِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعُ عَشَراتِ الْمُسْلِمينَ تَتَبَّعُ اللهُ عَثْرَتَهُ وَ مَنْ تَتَبَّعُ عَثْرَتَهُ يُفْضِحْهُ.

اے وہ گروہ جو زبانی مسلمان ہو لیکن تمہارے دلوں میں اسلام نہیں ہے۔ مسلمانوں کی لغزش میں تجسس نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کی لغزش میں تجسس کرتا ہے۔ خداوند عالم اس کی لغزش کی جستجو کرے گا اور جس کی لغزش کی خداوند عالم جستجو کرے وہ رسوا ہوگا۔

۱۳۔لوگوں کے کاموں میں تجسس

تجسس یعنی دوسروں کے اعمال میں جستجو کرنا اور اکثر نا مطلوب اور خلاف اخلاق کام ہوتے ہیں۔ البتہ تجسس عربی زبان میں امور مثبت میں جستجو کرنا مراد ہے۔

درحقیقت سوئے ظن سبب بنتا ہے کہ انسان لوگوں کے راز میں جستجو کرے، کبھی بخل و تنگ نظری بھی ممکن ہے عوامل ہوں اسلام میں تجسس ممنوع ہے۔ معاشرے میں بدامنی کا سبب ہوتا ہے۔ بہت سے افراد کی آبرریزی ہوجاتی ہے۔اس سے کینہ کی آگ روشن ہوتی ہے۔

البتہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اطلاعات کے اداروں سے مربوط نہیں ہے۔

صرف ایک آیت ۱۲ سورۂ حجرات میں خداوند عالم فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۱۲

اے ایماندارو! بہت سے گمانِ (بد) سے بچے رہو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تم تو

ضرور اس سے نفرت کرو گے اور خدا سے ڈرو بے شک خدا بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

چنانچہ حضرت یوسف اور یعقوب علیہما السلام کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو دستور دیا:

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ.[1]

اے میرے فرزندو (ایک بار اور پھر مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو (جس طرح بنے) ڈھونڈ کے لے آؤ اور خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہو کیونکہ خدا کی رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے اور کوئی نا امید نہیں ہوا کرتا۔

بعض نے لکھا ہے کہ تجسس سے مراد کسی کے مخفی راز کو سننا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے سورۂ حجرات میں تجسس سے نہی کی گئی اور اس میں کوئی قید یا شرط نہیں لہٰذا معلوم ہوتا ہے تجسس بطور کلی حرام ہے۔ لوگوں میں تجسس کا معنی اس قدر روشن ہے کہ خود استعمال کرتے ہیں۔

ایک حدیث اہل سنت کے منابع کنز العمال میں ثور کندی سے نقل ہوئی اور عمل شاہد یہ ہے کہ وہ لکھتا ہے:

حضرت عمر کبھی کبھی رات میں امنیت کے مسائل کی خاطر مدینہ گشت کرتے تھے۔ حضرت عمر نے ایک گھر میں آواز سنی جو گانے کی آواز تھی۔ حضرت عمر نے دیوار سے چھلانگ لگائی اندر گیا اور کہتا ہے: اے دشمن خدا! کیا تو گمان کرتا ہے کہ تو گناہ کر رہا ہے اور خدا نے تجھے چھپا رکھا ہے؟

اس مرد نے عمر سے کہا: اے خلیفہ جلدی نہ کرو۔ اگر میں نے ایک گناہ کیا تو تم نے تین گناہ کیے ہیں:

خداوند عالم فرماتا ہے۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا.[2]

تجسس نہ کرو۔

لیکن تو نے تجسس کیا، نیز خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا.[3]

گھر میں دروازے سے داخل ہوا کرو۔

لیکن تم دیوار سے کود کر آئے ہو۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۔[1]

اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لی جائے اور اہل خانہ پر سلام کرو

تم بغیر اجازت کے داخل ہوئے ہو۔

حضرت عمر یہ سن کر حیران رہ گیا اور اس سے کہا: اگر میں تجھے معاف کردوں تو کیا تو راہ راست پر آجائے گا؟

اس نے جواب دیا: ہاں

حضرت عمر نے اسے چھوڑ دیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔[2]

روایات میں تجسس

روایات میں اس موضوع کی بڑی مذمت ہوئی ہے۔ اب ہم چند روایات کو نقل کرتے ہیں جو اس موضوع میں دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِيّاكُمْ وَ الظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَ لا تَحَسَّسُوا وَ لا تَجَسَّسُوا.[3]

بدگمانی سے پرہیز کرو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور تجسس نہ کرو

۲۔ آپ ہی نے فرمایا:

لا تَحاسَدُوا و لاتَباغَضُوا وَ لا تَجَسَّسُوا وَ لا تَحَسَّسُوا وَ لا تَناجَشُوا وَ كُونُوا عِبادَ اللهِ اِخواناً.[4]

ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، بغض و کینہ نہ رکھو اور دوسروں کے کاموں میں تجسس نہ کرو،

لوگوں کو اپنے سے دور نہ کرو، اللہ کے بندے اور دینی بھائی بنو۔

اس حدیث سے معلوم ہو کہ تجسس حسد، کینہ، نفرت اور لوگوں کا ایک دوسرے سے دوری کا سبب ہے۔

مرحوم کلینیؒ کتاب کافی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

يا مَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسانِهِ وَ لَمْ يُسْلِمْ بِقَلْبِهِ لا تَتَّبِعُوا عَثَراتِ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَثَراتِ الْمُسْلِمِينَ تَتَبَّعَ اللهُ عَثْرَتَهُ وَ مَنْ تَتَبَّعَ عَثْرَتَهُ يُفْضِحْهُ. [1]

اے وہ گروہ جو زبانی مسلمان ہو لیکن تمہارے دلوں میں اسلام نہیں ہے۔ مسلمانوں کی لغزش میں تجسس نہ کرو کیونکہ جو شخص مسلمانوں کی لغزش میں تجسس کرتا ہے۔ خداوند عالم اس کی لغزش کی جستجو کرے گا اور جس کی لغزش کی خداوند عالم جستجو کرے وہ رسوا ہوگا۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

تَتَبُّعُ الْعُيُوبِ مِنْ اَقْبَحِ الْعُيُوبِ وَ شَرِّ السَّيِّئاتِ. [2]

دوسرے لوگوں کے عیب میں تجسس کرنا بدترین گناہوں میں سے ہے۔

۴۔ آپؑ ہی نے فرمایا:

مَنْ بَحَثَ عَنْ اَسْرارِ غَيْرِهِ اَظْهَرَ اللهُ اَسْرارَهُ. [3]

جو شخص دوسروں کے عیب کی تفتیش کرتا ہے خداوند عالم اس کے رازوں کو فاش کر دیتا ہے۔

۵۔ حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ تَتَبَّعَ خَفِيّاتِ الْعُيُوبِ حَرَّمَهُ اللهُ مَوَدّاتِ الْقُلُوبِ. [4]

جو دوسروں کے مخفی عیبوں میں تجسس کرتا ہے خدا اسے لوگوں کی دوستی سے محروم کر دیتا ہے۔

۶۔ امام صادق علیہ السلام اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں:

---

[3] شرح غرر، جلد 5، صفحہ 371، حدیث 8799.

[4] شرح غرر، جلد 5، صفحہ 371، حدیث 8800.

لا تَفَتَّشِ النّاسَ عَن اَدْیانِهِمْ فَتَبْقی بِلا صَدیق.[1]

لوگوں کے عقائد کے بارے میں تفتیش نہ کرو کہ اس سے تیرا کوئی نہیں بنے گا۔

سوئے تجسس کے آثار

دوسروں کے عقائد اور اسرار میں تجسس کرنے سے دشمنی و عداوت پیدا ہوتی ہے جس سے معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اگر تم صحیح اسلامی معاشرہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی طرف متوجہ رہو۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

مَنْ بَحَثَ عَنْ اَسْرارِ غَیرِهِ اَظْهَرَ اللهُ اَسْرارَهُ.[2]

جو شخص دوسروں کے اسرار میں جستجو کرتا ہے خداوند عالم اس کے رازوں کو فاش کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

مَنْ کَشَفَ حِجابَ اَخِیهِ اِنْکَشَفَ عَوراتِ بَیْتِهِ.[3]

جو دوسروں کے رازوں کے پردے اٹھاتا ہے تو ایسے شخص کے گھر کے راز فاش ہوں گے۔

ایک اور جگہ معصوم علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ تَطَلَّعَ عَلی اَسْرارِ جارِهِ اِنْتَهَکَتْ اَسْتارُهُ.[4]

جو شخص اپنے ہمسایہ کے رازوں کو فاش کرتا ہے تو اس کے اپنے رازوں کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔

دوسروں کے حالات و اسرار میں جستجو کرنے کے کئی اسباب و عوامل ہو سکتے ہیں جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سوئے ظن اکثر انسان کو دوسروں کے تجسس کی طرف لے جاتی ہے۔

---

[1] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 253، حدیث 109.

[2] شرح غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 371، حدیث 8799.

[3] شرح غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 371، حدیث 8802.

[4] شرح غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 371، حدیث 8798.

۲۔ گناہوں سے آلودگی جستجو کا ایک عامل ہے کیونکہ آلودہ افراد اپنے جیسے افراد پیدا کرنے کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

شَرُّ النّاسِ اَلظّانُّونَ وَ شَرُّ الظّانِّینَ اَلْمُتَجَسِّسُونَ.....[۱]

سب سے بدترین وہ افراد ہیں جو سوئے ظن رکھتے ہیں اور سب سے بدترین سوئے ظن افراد وہ ہے جو تجسس کرنے والے ہیں۔

۳۔ حسد، کینہ، عداوت، تکبر ہر ایک جستجو کا عامل ہیں۔

۴۔ ایمان کا ضعیف ہونا بھی تجسس کا ایک عامل ہے کیونکہ بے ایمان شخص دوسروں کے احترام کا قائل نہیں ہے لہٰذا آسانی سے دوسروں کے حقوق سے تجاوز کرتا ہے اور مسلمانوں کی آبروریزی کرتا پھرتا ہے۔ جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلسانِهِ وَلَمْ یَدْخُلِ الْاِیمانُ فی قَلْبِهِ.[۲]

اے وہ گروہ جو زبانی ایمان لائے ہو لیکن تمہارے دلوں میں ایمان نہیں ہے۔

استثناء

اب سوال یہ ہے کہ کیا تجسس بطور ایک عنوان کلی ضد اخلاقی ممنوع وحرام ہے یا بعض مقامات پر استثناء بھی ہے۔ ہر کے ملک کچھ خاص ادارے ہوتے ہیں ملک و معاشرے کے فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے ہیں آیا ایسے اداروں میں تجسس جائز ہے۔ اب ہم ایک ایک کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔ محکمہ اطلاعات:

---

[۱] مستدرک الوسائل، چاپ جدید، جلد 9، صفحہ 147، حدیث 15 (باب 141).

[۲] دلائل الصدق لنہج الحق/ ج 5 ص 185

ہر ملک کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ملک کی اندرونی و بیرونی سازشوں سے اس کی حفاظت کرے۔ ہر ہر محکمہ کے بڑے بڑے آفیسر حسن ظن سے کام لیں مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا دشمن کی سازشوں کے لئے تجسس حرام نہیں ہے بلکہ ضروری ہے اگر احتمال ہوتا ہے کوئی بے گناہ شخص پر اعتماد نہ کیا جائے لیکن حقیقی دشمن کو ڈھونڈنے کے لئے تفتیش ضروری ہے آج دشمن نے مختلف لباس پہن رکھا ہے اور جاسوسی کرتا ہے لہٰذا ایسے افراد کی تلاش کے لئے ہر جگہ جانا اور تجسس کرنا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ توبہ کی آیت ۴۷ میں خداوند عالم صراحت سے فرماتا ہے کہ تمہارے درمیان تمہارے جاسوس دشمن موجود ہیں:

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝۴۷

اگر یہ لوگ تم میں مل کر نکلتے بھی تو بس تم میں فساد ہی کو برپا کر دیتے اور تمہارے حق میں فتنہ انگیزی کی غرض سے تمہارے درمیان (اِدھر اُدھر) گھوڑے دوڑاتے پھرتے اور تم میں سے ان کے جاسوس بھی ہیں (جو تمہاری خبر اُن سے بیان کرتے ہیں)۔ اور خدا شریروں سے خوب واقف ہے۔

بعض اوقات معجزہ کی صورت میں پرندوں سے دور کے ممالک کا تجسس کیا جاتا ہے۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کی داستان مشہور ہے۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا:

كانَ رَسُولُ اللهُ(صلى الله عليه وآله) إذا بَعَثَ جَيْشاً فَأَتَّهَمَ أميراً . يا فَأَتَّهم اميراً .بَعَثَ مَعَهُمْ مِنْ ثِقاتِهِ مَنْ يَتَجَسَّسُ لَهُ خَبَرَهُ.

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر کو بھیجتے اور ان کا امیر بناتے تو اس کے ساتھ ایک اور قابل اعتماد آدمی بھیجا جاتا کہ وہ اس کا تجسس کرے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تفصیل بتائے۔

نہج البلاغہ میں نامہ ۳۳ میں حضرت علی علیہ السلام قثم بن عباس مکہ کے حاکم کو یوں لکھتے ہیں:

أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ عَيْنِي بِالْمَغْرِبِ كَتَبَ إِلَيَّ يُعْلِمُنِي أَنَّه وُجِّهَ إِلَى الْمَوْسِمِ أُنَاسٌ مِنْ أَهْلِ الشَّامِ الْعُمْيِ الْقُلُوبِ الصُّمِّ الْأَسْمَاعِ الْكُمْهِ الْأَبْصَارِ الَّذِينَ يَلْبِسُونَ

الْحَقَّ بِالْباطِلِ وَ يُطِيعُونَ الْمَخْلُوقَ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ وَ يَحْتَلِبُونَ الدُّنْيَا دَرَّهَا بِالدِّينِ وَ يَشْتَرُونَ عَاجِلَهَا بِآجِلِ الْأَبْرَارِ الْمُتَّقِينَ وَ لَنْ يَفُوزَ بِالْخَيْرِ إِلَّا عَامِلُهُ وَ لَا يُجْزَى جَزَاءَ الشَّرِّ إِلَّا فَاعِلُهُ فَأَقِمْ عَلَى مَا فِي يَدَيْكَ قِيَامَ الْحَازِمِ [الطَّبِيبِ] الصَّلِيبِ وَ النَّاصِحِ اللَّبِيبِ التَّابِعِ لِسُلْطَانِهِ الْمُطِيعِ لِإِمَامِهِ وَ إِيَّاكَ وَ مَا يُعْتَذَرُ مِنْهُ وَ لَا تَكُنْ عِنْدَ النَّعْمَاءِ بَطِراً وَ لَا عِنْدَ الْبَأْسَاءِ فَشِلًا وَ السَّلَام.

اما بعد! میرے مغربی علاقے کے جاسوس نے مجھے لکھ کر اطلاع دی ہے کہ موسم حج کے لئے شام کی طرف سے کچھ ایسے لوگوں کو بھیجا گیا ہے جو دلوں کے اندھے، کانوں کے بہرے اور آنکھوں کی روشنائی سے محروم ہیں ۔ یہ حق کو باطل سے مشتبہ کرنے والے ہیں اور خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کو خوش کرنے والے ہیں ۔ ان کا کام دین کے ذریعے دنیا کا حصول ہے اور یہ نیک کردار و پرہیزگار افراد کی آخرت کو دنیا کے ذریعے خریدنے والے ہیں جبکہ خیر اس کا حصہ ہے جو خیر کے کام کرے اور شر اس کے حصہ میں آتا ہے جو شر کا عمل کرتا ہے دیکھو اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں ایک تجربہ کار، پختہ کار، مخلص، ہوشیار انسان کی طرح قیام کرنا جو اپنے حاکم کا تابع ہو، اپنے امام کا اطاعت گذار ہو اور خبردار کوئی ایسا کام نہ کرنا جس کی معذرت کرنا پڑے اور راحت و آرام میں مغرور نہ ہو جانا اور نہ شدت کے مواقع پر کمزوری کا مظاہرہ کرنا۔ والسلام

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی کو اطلاعات کے لئے مامور فرمایا تا کہ ابوسفیان کے کاروان کا تجسس کر کے خبر دے۔

مالک اشتر کے خط میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے انہیں دستور دیا کہ اطلاعات کے لئے کچھ افراد کو مامور کرے اور تمام اطلاعات آپ تک بھیجی جائیں، آپؑ نے فرمایا:

ثُمَّ تَفَقَّدْ أَعْمَالَهُمْ، وابْعَثِ الْعُيُونَ مِنْ أَهْلِ الصِّدْقِ والْوَفَاءِ عَلَيْهِم، فَإِنَّ تَعَاهُدَكَ فِي السِّرِّ لأُمُورِهِمْ حَدْوَةٌ لَهُمْ عَلَى اسْتِعْمَالِ الأَمَانَةِ، والرِّفْقِ بِالرَّعِيَّةِ.[1]

اس کے بعد ان عمال کے اعمال کی بھی تفتیش کرتے رہنا اور نہایت معتبر قسم کے اہل

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ 53.

صدق وصفا کو ان پر جاسوسی کے لئے مقرر کر دینا کہ یہ طرزِ عمل انھیں امانتداری کے استعمال پر اور رعایا کے ساتھ نرمی کے برتاؤ پر آمادہ کرے گا۔

جب امام حسین علیہ السلام نے مدینہ چھوڑا تو محمد بن حنیفہ کو اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ آپ کو اطلاعات دیتے رہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

اَمّا اَنْتَ فَلا عَلَیْكَ اَنْ تُقِیمَ بِالْمَدِینَةِ وَ تَكُونُ لِی عَیْناً لا تَخْفَ عَنّی شَیْئاً مِنْ اُمُورِهِمْ.[1]

تم میرے ہمراہ نہ آؤ اور مدینہ میں رہو اور تو میرے لئے نظارت کر اور تا کہ مجھ سے کوئی چیز مخفی نہ رہے۔

۲۔ محکمہ نظارت

تمام دوسرے محکموں کی طرح اس محکمہ کی بھی ایک ذمہ داری ہے اور وہ یہ کہ تمام ملازمین و آفیسر اور لوگوں کے اعمال پر نظارت کرے اور بدعنوانی کو کنٹرول کرے۔ واضح رہے کہ یہ کام کسی کی شخصی زندگی سے مربوط نہیں بلکہ ملک معاشرے کی سلامتی کے لئے تجسس ہے۔ اگر ایسا محکمہ نہ ہو تو معاشرے میں مجرموں پر کنٹرول پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ کی خاص نوعیت و زبان یا مکان سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر دور میں یہ سلسلہ چلتا آرہا ہے۔

محکمہ اطلاعات مخفی کام کرتا ہے لیکن محکمہ نظارت آشکارانہ اور لوگوں کی نظروں کے سامنے کام کرتا ہے۔

۳۔ تقدیر ساز شخص مسائل میں تجسس، جو شخص شادی کرنا چاہتا ہے یا کسی کو کاروبار میں شریک بنانا چاہے یا ایک حساس ادارہ کھولنا چاہتا ہے تجسس و تحقیق کرنا ضروری ہے تا کہ انسان دھوکہ نہ کھائے اس قسم کا تجسس حرام نہیں ہے۔

---

[1] حیاۃ الحسین، جلد 2، صفحہ 263.

علاج کے طریقے

جب تک اس بیماری کو جڑ سے نہ اکھاڑا جائے اس کا ترک غیر ممکن ہے لہٰذا جو انسان سعادت مند بننا چاہتے ہیں اور وہ اس بیماری سے دور رہیں۔ سوئے ظن نہ کریں کیونکہ اس سے انسان دوسروں کے امور میں وضاحت کرتا ہے اور ان کے اعمال میں تجسس کرنے لگتا ہے۔ حسد، کینہ، عداوت و تکبر تجسس کے عوامل میں سے شمار ہوتے ہیں۔

حقارت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے جیسے انسان تلاش کرے کیا جو شخص اس کے انجام کو دیکھتا ہے وہ راضی ہے کہ دوسروں کے امور میں تجسس کرے؟ اگر راضی نہیں تو پھر کیوں دوسروں کے اسرار میں جستجو کرتا ہے۔ سو تجسس کے برے اثرات سے انسان اور معاشرے کے لئے دنیا و آخرت میں سخت عذاب الٰہی ہے جو شخص دوسرے کے راز فاش کرے گا خدا اس کے عیوب کو ظاہر کر دے گا۔

راز داری اور فاش راز

یہ مسئلہ درحقیقت پہلی بحث کی تکمیل کے لئے ہے۔ دوسرے لفظوں میں راز داری کو ایک فضیلت اور راز فاش کو ایک گناہ شمار کیا جاتا ہے۔ بہرحال راز داری کی تعریف یہ ہے کہ: بہت سے لوگ اچھے یا برے اعمال رکھتے ہیں اگر انہیں فاش کیا جائے تو اس شخص کے لئے ضرر ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک معزز شخص شیطانی وسوسہ سے گناہ کا مرتکب ہوگیا ہو اور بعض افراد اس گناہ کے عمل و اسباب جانتے ہیں لہٰذا اگر وہ اس کا گناہ فاش کریں وہ معاشرے کی نظروں میں گر جائے گا وہ ان سے درخواست بھی کرتا ہے کہ اسے راز داری میں رکھیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص نے کار خیر انجام دیا اگر اس کو عام کریں تو شاید وہ غرور میں پڑ جائے۔ یا لوگ اس کے پیچھے پڑ جائیں کہ دوسرے سے بھی مدد کرے حالانکہ وہ نہ کرسکتا ہو۔

اسی طرح بعض لوگوں کو کسی کی اچھائی بتانے سے اس کے لئے ضرر ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر یہ مشہور کر دیں

کہ فلاں ڈاکٹر شیعہ حضرات کا مفت علاج کرتا ہے تو دشمن اہل بیت یہ برداشت نہیں کرتا لہٰذا ممکن ہے وہ اس کو قتل کردیں۔ پس رازداری صرف گناہ سے مربوط نہیں بلکہ بعض اوقات نیکی میں راز داری سے کام لینا چاہتے۔ قرآن میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ سورہ توبہ آیت ۱۶ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم (یونہی چھوڑ) دیئے جاؤ گے اور ابھی تک خدا نے ان لوگوں کو ممتاز کیا ہی نہیں جو تم میں کے (راہ خدا میں) جہاد کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے سوا کسی کو اپنا رازدار دوست نہیں بناتے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو خدا اس سے بھی باخبر ہے۔

یہ آیت کہتی ہے کہ ان افراد کو راز بتاؤ جو حفاظت کر سکتے ہیں۔

۲۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۸ میں خود فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اے ایماندارو اپنے (مومنین کے) سوا غیروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ (کیونکہ) یہ غیر لوگ تمہاری بربادی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے (بلکہ) جتنا تم زیادہ تکلیف میں پڑو گے اتنا ہی یہ لوگ خوش ہوں گے دشمنی تو ان کے منہ سے ٹپکی پڑتی ہے اور جو (بغض وحسد) ان کے دلوں میں بھرا ہے وہ کہیں اس سے بڑھ کر ہے ہم نے تم سے (اپنے) احکام صاف صاف بیان کر دیئے ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو

اس میں تاکید کی گئی ہے مومن کو راز دار بنا سکتے ہو اور غیر مسلمان کو راز دار نہ بناؤ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی کے بارے میں راز داری سے کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ

عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ.[1]

اور جب پیغمبر نے اپنی بعض بیوی (حفصہ) سے چپکے سے کوئی بات کہی پھر جب اس نے (باوجود ممانعت) اس بات کی (عائشہؓ کو) خبر دے دی اور خدا نے اس امر کو رسولؐ پر ظاہر کر دیا تو رسولؐ نے (عائشہؓ کو) بعض بات (قصّہ ماریہ) جتا دی اور بعض بات (قصّہ شہد) ٹال دی غرض جب رسولؐ نے اس واقعہ (حفصہ کے افشائے راز) کی اس (عائشہ) کو خبر دی تو (حیرت سے) بول اُٹھی آپ کو اس بات (افشائے راز) کی کس نے خبر دی رسولؐ نے کہا مجھے واقف کار خبردار (خدا) نے بتا دیا۔ (تو اے حفصہ و عائشہ) اگر تم دونوں (اس حرکت سے) توبہ کرو تو (خیر کیونکہ) تمہارے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں اور تم دونوں رسولؐ کی مخالفت میں ایک دوسرے کی اعانت کرتی رہو گی تو (کچھ پرواہ نہیں کیونکہ) خدا اور جبرئیل اور تمام ایمانداروں میں نیک شخص ان کے مددگار ہیں اور ان کے علاوہ کل فرشتے مددگار ہیں۔

اس کے علاوہ سورہ توبہ کی آیت ۱۰۲ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا (تو) اقرار کیا (مگر) ان لوگوں نے بھلے کام کو اور کچھ بُرے کام کو ملا جلا (کر گول مول کر) دیا قریب ہے کہ خدا ان کی توبہ قبول کرے (کیونکہ) خدا تو یقینی بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

---

[1] سورۂ تحریم: ۳، ۴

رازداری روایات کی روشنی میں

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذا حَدَّثَ الرَّجُلُ اَلْحَدِیثَ ثُمَّ اِلْتَفَتَ فَهِیَ اَمانَةٌ.[۱]

جب کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی بات کرتا ہے اور پھر اطراف میں دیکھتا ہے تو وہ امانت ہے اور راز فارش کرنا خیانت ہے۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اَفْشی سِرّاً اِسْتَوْدَعَهُ فَقَدْ خانَ.[۲]

جس شخص کے پاس کسی کا راز ہو اور وہ فاش کرے تو یہ خیانت ہے۔

۳۔ آپؑ ہی نے فرمایا:

مَنْ کَشَفَ حِجابَ اَخِیهِ اِنْکَشَفَ حِجابَ بَیْتِهِ.[۳]

جو شخص کسی مسلمان بھائی کے رازوں کو فاش کرتا ہے تو غداری کے عیوب ظاہر کر دیتا ہے۔

۴۔ حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا:

جُمِعَ خَیْرُ الدُّنیا وَ الآخِرَةِ فِی کِتْمانِ السِرِّ وَ مُصادِقَةُ الأَخْیارِ وَ جَمِیعَ الشَّرِ فِی الأَذاعَةِ وَ مُواخاةُ الأَشرار.[۴]

دنیا و آخرت کی تمام اچھائیاں دو چیزوں میں جمع ہیں:

---

[۱] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 237.

[۲] شرح غرر، جلد 5، صفحہ 268، حدیث 8295.

[۳] شرح غرر، جلد 5، صفحہ 371، حدیث 8802.

[۴] بحار الانوار، جلد 71، صفحہ 178، حدیث 17.

۱ راز داری اور ۲ نیک افراد سے دوستی

اور تمام برائیں دو چیزوں میں جمع ہیں:

۱ راز فاش کرنا اور ۲ برے افراد کی صحبت۔

۵۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوذرؓ کو نصیحت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

يا اَباذَرُ اَلْمَجالِسُ بِالْاَمانَةِ، وَ اِفْشاءُ سِرِّ اَخيكَ خِيانَةٌ، فَاجْتَنِبْ ذلِكَ؛ [۱]

محافل و مجالس خصوصی امانت ہیں، مومن بھائی کا راز فاش کرنا خیانت ہے لہٰذا اس سے پرہیز کرو۔

راز داری کے مختلف شعبے ہوتے ہیں۔

۱۔ دوسرے کے اسرار کی حفاظت۔

۲۔ اپنے رازوں کی حفاظت

۳۔ اولیاء دین کے اسرار کی حفاظت

۴۔ اسرار نظام حکومت اسلامی

یہ سب دوسروں کے رازوں کے بارے میں بحث ہوئی ہے لیکن اپنے رازوں کی حفاظت بھی روایات میں ہے کہ اگر راز فاش ہوجائے تو حسد، کینہ اور دشمنی پیدا ہوسکتی ہے۔

۱۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

سِرُّكَ سُرُورُكَ اِنْ كَتَمْتَهُ وَاِنْ اَذَعْتَهُ كانَ ثُبُورَكَ. [۲]

تیرا راز تیری خوشحالی ہے اس شرط کے ساتھ کہ اسے چھپائے رکھو اگر اسے فاش کرو گے تو ہلاک ہوجاؤ گے۔

۲۔ ایک اور جگہ فرمایا:

---

[۱] بحار الانوار، جلد 74، صفحہ 89.

[۲] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 141، حدیث 5616.

سِرُّكَ اَسيرُكَ فَاِنْ اَفْشَيْتَهُ سِرْتَ اَسيرَهُ.[1]

تیرا راز تیرا اسیر ہے اگر اسے فاش کرو گے تو اس میں گرفتار ہوجاؤ گے۔

۳۔ آپ ہی نے فرمایا:

صَدْرُ الْعاقِلِ صُنْدُوقُ سِرِّهِ.[2]

عاقل کا سینہ رازوں کا خزینہ ہوتا ہے۔

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

سِرُّكَ مِنْ دَمِكَ فَلا يَجْرِيَنَّ مِنْ غَيْرِ اَوْداجِكَ.[3]

تیرا راز تیرے خون کی مثل ہے فقط تیری رگوں میں جاری ہے۔

۵۔ امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مومن میں تین خصلتیں پائی جاتی ہیں۔

ا۔ سنت خدا، سنت رسولؐ وسنت ولی پھر فرمایا:

فَسُنَّةٌ مِنْ رَبِّهِ كِتْمانُ سِرِّهِ قالَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ: عالِمُ الْغَيْبِ فَلا يُظْهِرُ عَلى غَيْبِهِ اَحَداً اِلّا مَنِ ارْتَضى مِنْ رَسُول.[4]

خدا عالم غیب جانتا ہے اور اسرار غیب کسی پر فاش نہیں کرتا سوائے رسولوں، پھر سنت رسولؐ لوگوں سے حسن اخلاق اور سنت ولی کو مشکلات کے مقابلے میں صبر کو شمار کیا بعض روایات میں ملتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے تمام راز کسی کو نہ بتائے کیوں کہ ہوسکتا ہے جس کو تم نے راز بتائے ہیں وہ تمہارا دوست اور ایک دن دشمن بن جائے اور موقع سے فائدہ اٹھائے ہوئے تمہارا راز فاش کرتا پھرے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لا تَطَّلِعْ صَدِيقَكَ مِنْ سِرِّكَ اِلّا عَلى مالَوِ اطَّلَعَتْ عَلَيْهِ عَدُوكَ لَمْ

---

[1] غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 146.

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حدیث 6.

[3] میزان الحکمۃ، جلد 4، صفحہ 427.

[4] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 68.

يَضُرُّكَ، فَإِنَّ الصَّدِيقَ قَدْ يَكُونُ عَدُوّاً يَوْماً ما.[1]

اپنے دوست کو اتنا راز دار بناؤ کہ اگر تمہارا دشمن اس سے آگاہ ہوجائے تو ضرر نہ دے کیونکہ ممکن ہے دوست دشمن بن جائے۔

بہت سی روایات میں ملتا ہے کہ اولیائے خدا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے اسرار بھی فاش نہ کیے جائیں۔ یہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے اگر اہل بیت علیہم السلام کی کرامات لوگوں کو بتائیں تو وہ غلو کرنے لگ جائیں گے جس سے شیعہ بدنام ہوں گے۔

تاریخ اسلام میں ملتا ہے کہ بعض ائمہ قیام کرنا چاہتے تھے لیکن چند بے معرفت شیعہ نے دشمن کو بتادیا جس سے وہ قیام بے ہدف رہ گئے۔ اب ہم ان روایات کو ذکر کرتے ہیں جو ائمہ کے راز کو راز رکھنے پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

إِذا تَقارَبَ هذا الْأَمْرُ كانَ أَشَدُّ لِلتَّقِيَّةِ.[2]

ج ہمارا قیام نزدیک ہوجائے تو اسے راز کو راز رکھیں۔

۲۔ آپؑ ہی نے فرمایا:

مَنْ أَفْشى سِرَّنا أَهْلَ الْبَيْتِ أَذاقَهُ اللهُ حَرَّ الْحَدِيدِ.[3]

جو شخص ہمارے راز کو فاش کرتا ہے خداوند عالم گرم لوہے سے اسے جلائے گا۔

۳۔ امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے ایک اصحاب سے فرمایا:

آمُرُكَ أَنْ تَصُونَ دِينَكَ وَ عِلْمَنا الَّذِي أَوْدَعْناكَ، وَ أَسْرارَنا الَّذِي حَمَّلْناكَ فَلا تُبْدِ عُلُومَنا لِمَنْ يُقابِلُها بِالْعِنادِ...و لا تُفْشِ سِرَّنا إِلى مَنْ يَشْنَعُ عَلَيْنا عِنْدَ الْجاهِلِينَ بِأَحْوالِنا.[4]

میں تمہیں دستور دیتا ہوں کہ اپنے دین کی حفاظت کرو اور جو علم تیرے پاس امانت ہے

---

[1] میزان الحکمہ، جلد 4، صفحہ 427، حدیث 8419.

[2] بحار، جلد 72، صفحہ 412.

[3] بحار، جلد 72، صفحہ 412.

[4] بحارالانوار، جلد 72، صفحہ 418.

اس کی حفاظت کرو اور ہم نے اپنے اسرار تمہیں سپرد کیے ہیں۔ لہٰذا ہمارے راز دشمنوں کو نہ بتانا بے معرفت لوگوں کو ہمارے حالات سے آگاہ نہ کرنا کہ وہ ہم پر عیب لگاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل بیت علیہم السلام کے حالات و راز و با معرفت لوگوں سے بیان کرنا روایت ہے صرف ان لوگوں کو نہ بتایا جائے جو اتنی معرفت نہیں رکھتے۔

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

اِمْتَحِنُوا شِيْعَتَنا عِنْدَ ثَلاث: عِنْدَ مَواقِيتِ الصَّلاةِ كَيْفَ مُحافِظَتُهُمْ عَلَيْها، وَ عِنْدَ اَسْرارَهُمْ كَيْفَ حِفْظُهُمْ لَها عَنْ عَدُوّنا وَ اِلَى اَمْوالِهِمْ كَيْفَ مُواساتِهِمْ لِاِخْوانِهِمْ فِيها.[1]

ہمارے شیعہ کا تین چیزوں سے امتحان لو۔

الف نماز کے وقت کہ وہ نماز کی کیسے حفاظت کرتا ہے۔

ب اسرار کی دشمن سے کیسے حفاظت کرتا ہے۔

ج کیا اموال میں مساوات سے کام لیتا ہے؟

۵۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

ما قَتَلنا مَنْ اَذاعَ حَدِيثَنا قَتْلَ خَطاء وَلكِنْ قَتَلْنا قَتْلَ عَمْد.[2]

جو ہمارے اسرار کو فاش کرتا ہے اس نے ہمیں غلطی سے قتل نہیں کیا بلکہ اس نے ہمیں جانتے بوجھتے قتل کیا ہے۔

۶۔ بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کو بعض مشکلات کا جو سامنا تھا وہ اس وجہ سے تھا کہ شیعہ ائمہ علیہم السلام راز فاش کر دیتے تھے اور وقت کے حاکم کو معلوم ہو جاتا تھا جس سے ائمہ طاہرین علیہم السلام کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

۷۔ اس آیت: "وَيَقْتُلُونَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ط"[3] کسی تفسیر میں فرمایا:

---

[1] بحار الانوار، جلد 80، صفحہ 22.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 370، حدیث 4.

[3] سورۂ آل عمران: ۱۱۲

اَما وَاللهِ ما قَتَلُوهُمْ بِاَسْيافِهِمْ وَلكِنْ اَذاعُوا سِرَّهُمْ وَ اَفْشَوْا عَلَيْهِمْ فَقُتِلُوا.[1]

خدا کی قسم! پیغمبروں کو اتنا تلواروں سے قتل نہیں کیا گیا جتنا ان کے اسرار کو فاش کر کے قتل کیا گیا۔

۸۔ ایک روایت مفضل بن عمر سے نقل ہوئی ہے کہ جس دن معلیٰ بن خنیس کو قتل گیا تو میں امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یابن رسول اللہ! کیا آج کے واقعہ کو جانتے ہیں؟

آپؑ نے پوچھا: کیا ہوا ہے؟

میں نے عرض کیا: معلیٰ بن خنیس کو قتل کر دیا گیا ہے۔

آپؑ نے فرمایا:

رَحِمَ اللهُ الْمُعَلّى قَدْ كُنْتُ اَتَوَقَّعُ ذلِكَ اَنَّهُ قَدْ اَذاعَ سِرَّنا، وَلَيْسَ النّاصِبُ لَنا حَرْباً بِاَعْظَمِ مَؤُنَةً عَلَيْنا مِنَ الْمُرِيعُ عَلَيْنا سِرَّنا.[2]

خدا معلیٰ پر رحمت کرے، مجھے اس سے یہی امید تھی اس نے ہمارے رازوں کو فاش کیا اور جو ہمارے خلاف جنگ کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس کی مشکل اس سے زیادہ نہیں جو ہمارے راز کو فاش کرتا ہے۔

بہرحال ائمہ علیہم السلام کے اسرار کی حفاظت کرنا مسلمات میں سے ہے کیونکہ راز فاش ہوجائیں تو دشمن میں جسارت کی آگ بھڑک اٹھے گی اور وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔

راز داری رکھنے کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ اپنے اصحاب کو اس کی نصیحت فرماتے تھے اور بہت سی جنگوں میں فتح کا راز بھی یہی تھا یعنی اسرار اور راز داری سے کام لیا گیا۔

مثلاً اگر فتح مکہ کے وقت اسلامی فوج کی مکہ کی طرف روانگی اگر فاش ہوجاتی تو تقیناً کفار مکہ اس قدر آسانی کے ساتھ مغلوب نہ ہوتے بلکہ بھرپور مقابلہ کی کوشش کرتے نتیجتاً بہت زیادہ جانوں کا زیاں ہوتا خون بہتا، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کا بہت زیادہ اہتمام کر رکھا تھا اور اس راز کو فاش نہ ہونے دیا جس کے نتیجے میں مشرکین مکہ

---

[1] مرآۃ العقول، جلد 11، صفحہ 64. (حدیث شمارہ 7).

[2] مرآۃ العقول، جلد 11، صفحہ 62.

بغیر جنگ لڑے مغلوب ہو گئے۔

روایات میں بھی راز کو راز رکھنے کی طرف اشارہ ملتا ہے:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلظَّفَرُ بِالْحَزْمِ وَ الْحَزْمُ بِاِجالَةِ الرَّأْیِ وَ الرَّأْیُ بِتَحصِینِ الْاَسرارِ.[۱]

کامیابی و کامرانی دور اندیشی کا نتیجہ ہے اور دور اندیشی صحیح نگہداری ہے اور صحیح نگہداری یہ ہے کہ اپنے رازوں کو چھپایا جائے۔

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ عَیَّرَ قَوماً بِالْاِذاعَةِ. فَقالَ اِذا جاءَهُم اَمرٌ مِنَ الْاَمنِ اَو الْخَوفِ اَذاعُوا بِهِ. فَایّاکُم وَالْاِذاعَةَ.[۲]

خداوند عالم نے ایک گروہ کو اسرار فاش کرنے کی وجہ سے اس کی سرزنش فرمائی اور فرمایا کہ جب انہیں امنیت یا خوف کے بارے میں معلوم ہوا اور وہ اسے فاش نہ کریں لہٰذا راز داری سے کام لو اور راز فاش کرنے سے پرہیز کرو۔

۳۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

اِظْهارُ الشَّیءِ قَبْلَ اَنْ یَسْتَحْکُمَ مَفْسَدَةٌ لَهُ.[۳]

کسی چیز کا استحکام پانے سے پہلے اظہار فساد کا باعث بن جاتا ہے۔

کیونکہ دشمن باخبر ہو جاتا ہے اور راستے میں کانٹے بچھا دیتا ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حدیث 48.

[۲] مرآۃ العقول، جلد 11، صفحہ 65.

[۳] بحار الانوار، جلد 72، صفحہ 71.

اسرار فاش کرنے کے نتائج

ہر انسان کی زندگی کے اسرار و رموز ہوتے ہیں۔بعض ضعف ایمان اور عیب سے مربوط ہیں اور بعض اس کی کامیابی کے بارے میں ہیں۔ جو ضعف ایمان سے مربوط ہیں ان کے فاش ہونے سے انسان معاشرے میں گر جاتا ہے۔اس کی آبرو ریزی ہوجاتی ہے۔لہٰذا ہر انسان اپنے رازوں کو پوشیدہ رکھیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس طرح فرماتے ہیں:

اِحْفَظْ لِسانَكَ تُعِزَّ، وَلا تُمَكِّنِ النّاسَ مِنْ قِيادِ رَقَبَتِكَ فَتُذِلَّ.[1]

اپنی زبان کی حفاظت کرو تا کہ آبرومند ہو اور اپنے اختیار کو لوگوں کے ہاتھ میں نہ دو کہ ذلیل ہوگے۔

اس حدیث کے شروع میں یہ آیا ہے:

اِنْ كانَ فِي يَدِكَ هذِهِ شَيءٌ، فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَلّا تُعْلَمَ هذِهِ فَافْعَلْ.[2]

اگر کوئی راز کی بات تیرے پاس ہے اگر تمہارے سوا کوئی دوسروں کو آگاہ نہیں کرسکتا تو ایسا ضرور کرو(اس کو راز میں رکھو)۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ جب انسان دوسروں کے راز سے واقف ہوجائے تو وہ اس کے لئے امانت ہیں اور اگر راز فاش کرتا ہے تو اس نے خیانت کی ہے۔

لہٰذا جتنا ممکن ہو اپنے رازوں سے کسی کو باخبر نہ کرو کیوں کہ عاقل کا سینہ رازوں کا خزینہ ہوتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جس نے ہمارے راز کو فاش کیا اس نے ہمیں عمداً قتل کیا۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسیؒ ایک دلچسپ حدیث نقل کرتے ہیں کہ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 225، حدیث 14.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 225، حدیث 14.

دو افراد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور سخت درد میں مبتلا تھے۔ انہیں اپنے گھر (آرام کرنے کے لئے) لے جایا گیا ان دونوں نے دو ماہ تک سخت حالات میں گزارے اور ان کی صحت ٹھیک نہ ہوئی۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ انہیں حاضر کیا جائے۔ جیسے ہی وہ آئے تو آپؑ نے پوچھا: تمہارا حال کیسا ہے؟

انہوں نے عرض کیا: ہم سخت درد میں مبتلا ہیں۔

آپؑ نے فرمایا: جس گناہ کی وجہ سے تم نے یہ سختی سے دیکھی اس سے توبہ کرو۔

انہوں نے عرض کیا: ہم سے کیا گناہ سرزد ہوا۔

آپؑ نے ایک کی طرف رخ کیا اور فرمایا: فلاں شخص نے سلمان فارسیؓ کی بدگوئی کی تھی لیکن تم نے دفاع نہیں کیا حالانکہ تجھے جان و مال کا خوف بھی نہ تھا۔ صرف تو شرمندگی کی وجہ سے چپ رہا اگر تو چاہتا ہے کہ خدا تیرا درد ختم کر دے تو آئندہ کے لئے عزم کرلو کسی مومن بھائی کی بدگوئی نہیں سنو گے۔ ہاں اگر جان و مال خطرے میں ہو تو وہ ایک دوسری بات ہے۔

اب آپؑ نے دوسرے کو خطاب کیا اور فرمایا: کیا تجھے یاد ہے تو اس مصیبت میں کیوں مبتلا ہوا ہے۔ کیا تجھے یاد ہے کہ ایک دن قنبر ایک حاکم کے دربار میں حاضر ہوا اور تو اس کے احترام کے لئے اٹھا اور اس حاکم نے اعتراض کیا کہ تو نے قنبر کا احترام کیوں کیا تو تم نے کہا: وہ بافضیلت انسان ہیں اور فرشتے بھی اس کا احترام کرتے ہیں اور وہ فرشتوں کے پروں پر چلتا ہے۔ جب حاکم نے یہ سنا تو اسے سخت غصہ آ گیا اور اس نے قنبر کو تکلیف پہنچائی۔ [1]

---

[1] بحارالانوار، جلد 26، صفحہ 237. (با تلخیص).

اظہارِ راز کی ضرورت

بعض اوقات ضرورت پڑتی ہے کہ انسان اپنا راز دوسروں کو بتائے، ایسے موقع پر حکم دیا گیا ہے کہ کسی عاقل اور امین فرد کو راز بتائیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اَسَرَّ اِلی غَیْرِ ثِقَة فَقَدْ ضَیَّعَ اَمْرَهُ. [1]

جو شخص اپنے رازوں کو غیر مطمئن شخص کو بتاتا ہے تو اس نے گویا اپنے رازوں کو ضائع کیا۔

ہمیں دستور دیا گیا ہے کہ اگر ضرورت بھی ہو تو صرف ایسے شخص سے کہو جو تیرے راز کی حفاظت کر سکتا ہو اور راز فاش نہ کرتا ہو۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا تَضَعْ سِرَّكَ عِنْدَ مَنْ لا سِرَّ لَهُ عِنْدَكَ. [2]

ایسے شخص کو راز نہ بتاؤ جو تجھے راز نہیں بتاتا۔ لہٰذا اپنے راز دوسروں کو بتانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ ضَعُفَ عَنْ حِفْظِ سِرِّهِ لَمْ یُطِقْ سِرَّ غَیْرِهِ. [3]

جو شخص اپنے راز نہیں رکھ سکتا وہ دوسروں کے راز کیسے چھپا سکتا ہے۔

---

[1] شرح غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 257.

[2] شرح غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 255.

[3] ہمان مدرک، جلد 5، صفحہ 403.

راز فاش کرنے کے اسباب اور علاج

۱۔ حسد کی وجہ سے لوگ دوسروں کے راز فاش کرتے ہیں۔

۲۔ ایک سبب کینہ ہے جس سے وہ لوگوں کے راز فاش کرتے ہیں۔

۳۔ جہالت و نادانی بھی ایک سبب ہے جو لوگ دوسروں کے اسرار غیروں کو بتاتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

تین افراد کو اپنا راز نہ بتاؤ ان میں ایک شخص احمق ہے۔ لہٰذا احمق کو راز نہ بتاؤ۔[۱]

آپؑ ہی نے فرمایا:

لاتُسِرَّ اِلَی الْجاهِلِ شَیْئاً لایُطیقُ کِتْمانَهُ.[۲]

جاہل شخص کو اپنا راز نہ بتاؤ کیونکہ وہ چھپانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

۴۔ لوگوں کے لئے پنہانی راز شگفت انگیز ہوتے ہیں وہ ایسی باتیں سننے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو لطف اندوز ہوتے ہیں۔

۵۔ بعض لوگ غفلت کی وجہ سے دوسرے کے راز فاش کرتے ہیں لہٰذا یہ بھی ایک عامل ہے۔ اگر راز دو افراد سے تجاوز کر جائے تو فاش ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے عمار نامی صحابی سے پوچھا:

کُلُّ سِرٍّ جاوَزَ الْاِثْنانِ شاعَ.

کیا تم اس راز کو دوسرے کو بتاتے ہو جو ہم نے تجھے بتائے ہیں؟

اس نے عرض کیا: نہیں، صرف سلیمان بن خالد کو کہتا ہوں۔

آپؑ نے فرمایا: آفرین و شاباش ہو تم پر۔

---

[۱] غرر الحکم، حدیث 4662.

[۲] غرر الحکم، حدیث 10265.

کیا تو نے شاعر کا یہ قول سنا ہے جس میں وہ کہتا ہے:

فَلا یَعْدُوَنْ سِرِّی وَ سِرَّکَ ثالِثاً اَلا کُلُّ سِرٍّ جاوَزَ الْاِثْنَیْنِ شایعُ

میرے اور تیرے درمیان والا راز تیسرے شخص کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ جس راز سے دو آدمیوں سے زیادہ کوئی واقف ہوجائے وہ راز فاش ہوجاتا ہے۔[1]

علاج کا طریقہ

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ راز فاش ہونے سے انسان کا اعتماد ختم ہوجاتا ہے آبرو ریزی ہوئی ہے۔ معاشرے میں آدمی کا مقام گر جاتا ہے۔ اگر راز کسی مکتب یا ملک اور معاشرے سے مربوط ہے تو اس سے اور زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ مکتب کے لوگ اسیر ہوجاتے ہیں اور بے گناہ خون بہتا ہے اور مال کو غارت کر لیتے ہیں۔

حسد، جہل اور کینہ کی بیماری کو ختم کرنے سے اس بیماری کا علاج ممکن ہے۔



[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 224، حدیث 9.

۱۴۔حلم وغضب

غصہ اور غضب انسان کے بدترین حالات میں سے ایک حالت ہے اگر اسے کنٹرول نہ کیا جائے تو انسان جنون کی حد تک پہنچ سکتا ہے۔حتیٰ کہ وہ اعصابی مریض ہوجاتا ہے اور قتل جیسے خطرناک جرم کا مرتکب ہوسکتا ہے۔غصہ اور غضب ایک جلا دینے والی آگ ہے جو کئی گھروں بلکہ شہروں کو جلاسکتی ہے۔اگر تاریخ کا مطالعہ کریں بہت سے واقعات نظر آتے ہیں جس سے اسلامی معاشرہ جل کر رہ گیا ہے۔اس موضوع پر آیات الٰہی کی تفسیر کرتے ہیں توجہ کریں:

① ۔ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ.[1]

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچے رہتے ہیں اور جب غصّہ آجاتا ہے تو معاف کردیتے ہیں۔

② ۔ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.[2]

---

[1] شوریٰ:37

[2] آل عمران:134

جو خوشحالی اور مشکل کے وقت میں بھی (خدا کی راہ پر) خرچ کرتے ہیں اور غصّہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کی خطا سے درگزر کرتے ہیں۔ اور نیکی کرنے والوں سے خدا اُلفت رکھتا ہے۔

③۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ.[1]

اور ذوالنون (یونسؑ کو یاد کرو) جب کہ غصّے میں آ کر چلے اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر روزی تنگ نہ کریں گے (تو ہم نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا) تو (گھٹا ٹوپ) اندھیرے میں (گھبرا کر) چلّا اٹھا کہ (پروردگارا) تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے بے شک میں قصوروار ہوں۔

④۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ.[2]

اور ابراہیمؑ کا اپنے چچا (آذر) کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اس سے کرلیا تھا پھر جب ان کو معلوم ہوگیا کہ وہ یقینی خدا کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہوگئے۔ بے شک ابراہیمؑ یقیناً بڑے دردمند بُردبار تھے۔

⑤۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ.[3]

بے شک ابراہیمؑ بردبار نرم دل (ہر بات میں خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔

⑥۔ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ.[4]

تو ہم نے ان کو ایک بڑے نرم دل لڑکے (کے پیدا ہونے کی) خوشخبری دی۔

⑦۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ

---

[1] انبیاء:87

[2] توبہ:114

[3] ہود:75

[4] صافات:101

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا.[1]

اور (خدائے) رحمن کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سلام (تم سلامت رہو)۔

⑧۔ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ.[2]

(اے رسولؐ) تم درگزر کرنا اختیار کرو اور اچھے کام کا حکم دو اور جاہلوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

تفسیر و خلاصہ

پہلی آیت میں پاک دل مومنین صفات اور ان پر اللہ کے الطاف کا ذکر ہوا ہے۔ خدا پر توکل و ایمان کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ.

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچے رہتے ہیں اور جب غصّہ آجاتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

جب انسان میں غصہ و غضب کی آگ بھڑکے اسے مومنین کنٹرول کر لیتے ہیں اور گناہ سے ہاتھ آلودہ نہیں کرتے۔ گناہوں سے اجتناب کے بعد اس صفت کا ذکر ہے اور یہ اس لئے ہے کہ بہت سے گناہوں کا سرچشمہ غصہ و غضب ہوتا ہے۔ مومنین غصہ و غضب نہیں کرتے انہیں غصہ و غضب پر کنٹرول ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں پرہیزگاروں کو جنت کا وعدہ دیا گیا ہے اور اس جنت کی وسعت زمین و آسمان کے وسعت کے برابر ہے۔ اس کے بعد انفاق کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.

---

[1] فرقان:63

[2] اعراف:199

جو خوشحالی اور کٹھن کے وقت میں بھی (خدا کی راہ پر) خرچ کرتے ہیں اور غصّہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کی خطا سے درگزر کرتے ہیں۔ اور نیکی کرنے والوں سے خدا اُلفت رکھتا ہے۔

اس آیت میں بخشش و مغفرت کے وعدہ کے بعد کہا گیا ہے کہ اگر کوئی خطا کرتا ہے تو اسے یاد خدا کرنی چاہیے اور استغفار کرے اور خداوند عالم بھی انہیں بخش دیتا ہے جو افراد دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں خدا بھی انہیں معاف کر دیتا ہے۔

تیسری آیت میں ایک نبی کے غصہ و غضب کا ذکر ہوا ہے یعنی یونس علیہ السلام اپنی امت پر غضب ناک ہوئے۔ ان کا غصہ ظاہری طور پر مقدس تھا لیکن درحقیقت وہ جلد بازی تھی لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام سے ترک اولیٰ سرزد ہوا جس کا انہیں امتحان دینا پڑا۔ آخر میں انہوں نے توبہ کی خداوند عالم فرماتا ہے:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ.

اور ذوالنون (یونسؑ کو یاد کرو) جب کہ غصّے میں آ کر چلے اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر روزی تنگ نہ کریں گے (تو ہم نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا) تو (گھٹا ٹوپ) اندھیرے میں (گھبرا کر) چلّا اٹھا کہ (پروردگارا) تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے بے شک میں قصوروار ہوں۔

سرانجام یہ ہوا کہ کافی سختی کے بعد خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی اور مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے۔ جب باہر آئے تو آپؑ کا بدن بہت ہی کمزور، ضعیف اور ملائم تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں کتنے دن رہے اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

۱۔ چالیس دن
۲۔ ایک ہفتہ
۳۔ تین روز

ایک روایت حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس کے مطابق وہ صرف ۴ گھنٹے رہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کونسا ترک اولیٰ کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں یہ امتحان دینا پڑا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نبی یا امام گناہ نہیں کرتا بلکہ وہ معصوم ہوتا ہے۔ اگر حضرت یونس علیہ السلام کچھ اور تحمل و

صبر کر لیتے یعنی دعوت حق کی تاثیر میں انہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ آخر ان کی قوم میں بیداری آ گئی اور انہوں نے اللہ سے توبہ کی جس سے عذاب ٹل گیا یہاں غضب سے مراد گناہگار قوم پر غضب تھا (نہ کہ حضرت یونس علیہ السلام پر)۔

وہ آیات جو حلم و بردباری پر دلالت کرتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی اور دوسری آیت میں خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا **حلیم اوّاہ یا اوّاہ حلیم** کے الفاظ سے تعارف کرایا۔ پہلی آیت میں ان کے چچا آذر کی سرپیچی کا ذکر ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے دعوت توحید دی اور اس کے لئے استغفار کیا۔ دوسری آیت میں فرشتوں کو خبر دی گئی کہ قوم لوط کو عذاب ہوگا۔

''اواہ'' کا معنی مہربان و رحیم ہے اور لوگوں کی ہدایت کے لئے زیادہ دل سوزی ہوتی ہے۔

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''اواہ حلیم'' یا ''حلیم آواہ'' کی صفات سے یاد کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے خدا غصہ اور غضب پر قابو پانے والے حلیم و بردبار ہوتے ہیں۔ حتیٰ مجرمین اور گناہگار کو گناہوں سے نجات دلانے کے لئے انبیاء میں یہ صفت موجود ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ صرف اپنے متعصب چچا آذر کے بارے میں حلیم و بردبار تھے بلکہ قوم لوط کے لئے بھی دلسوز تھے لیکن حکم خدا آ پہنچا اور حلیم و بردباری اس کے چچا اور قوم لوط کے لئے کافی تھی لیکن وہ ہدایت کے قابل نہیں تھے اور آخر قوم لوط عذاب میں مبتلا ہوگئی۔

چھٹی آیت میں خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اپنی نعمت کا ذکر کیا اور فرمایا:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ.

تو ہم نے انکو ایک بڑے نرم دل لڑکے (کے پیدا ہونے کی) خوشخبری دی۔

انسان کی تمام صفات میں سے صرف ان دو صفات حلیم و بردباری پر تکیہ کیا گیا۔

راغب نے مفردات میں لکھا:

> ''حلم'' غصہ و غضب کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول کے معنی میں ہے، اس سے عقل و خرد پیدا ہونا ہے لہٰذا علم بمعنی عقل بھی استعمال ہوا ہے۔ حلم والی صفت حضرت اسماعیل میں پائی جاتی تھی۔ جب حکم آیا کہ اسے ذبح کیا جائے تو انہوں نے حلم و بردباری کا مظاہرہ کیا تھا۔ بعد والی آیت میں ہے:
>
> يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ.

اسماعیلؑ نے کہا ابّا جان! جو آپ کو حکم ہوا ہے اس کو (بے تامل) کیجیے۔

ساتویں آیت میں عبدالرحمن یعنی اللہ کے خالص بندوں کی بارہ صفات کا ذکر ہوا ہے۔ خدا فرماتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا.

اور (خدائے) رحمن کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سلام (تم سلامت رہو)۔

اگرچہ آیت میں حلم کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن مفہوم سے سمجھا جاتا ہے مراد حلم ہی ہے یعنی اللہ کے خالص بندے جاہلوں کی سخت کلامی میں غصہ نہیں کرتے بلکہ بردبار ہوتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن فرمایا: میری امت کا ایک گروہ جسے میں دوست رکھتا ہوں اور وہ مجھے دوست رکھتے ہیں وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے لیکن میں انہیں دیکھ رہا ہوں (پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی کچھ صفات بیان فرمائی)۔

پھر یہ آیت نازل ہوئی:

اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا.

یہاں سلام سے مراد یہ ہے کہ ان سے حسن اسلوبی سے پیش آئیں ان کے غلط اور گالیاں جیسے کلمات پر توجہ نہیں دیتے۔

آٹھویں اور آخری آیت میں سورۂ اعراف میں تین مہم دستور بیان ہوتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ.

(اے رسولؐ) تم درگزر کرنا اختیار کرو اور اچھے کام کا حکم دو اور جاہلوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسم زندگی بھی ہمیشہ اس طرح تھی کہ جاہلوں اور بے عقل کے مقابلے میں صبر و تحمل سے کام لیتے تھے۔

اس کے بعد کی آیت ہے:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.

اور اگر شیطان کی طرف سے تمہاری (امت کے) دل میں کسی طرح کا دغدغہ پیدا ہو تو تم

خدا سے پناہ مانگو (کیونکہ) اس میں تو شک ہی نہیں کہ وہ بڑا سننے والا واقف کار رہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ملتا ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں:

''مکارم اخلاق کے لئے جامع ترین یہی آیت ہے۔''

مذکورہ مجموعہ آیات سے حلم و بردباری کی فضیلت واضح ہوجاتی ہے۔

غصہ وغضب روایات کی روشنی میں

ہم یہاں پر بارہ احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْغَضَبُ جَمْرَةٌ مِنَ الشَّيْطانِ.[۱]

غصہ وغضب شیطان کی طرف سے جلتی ہوئی آگ ہے۔

۲۔ آپؐ ہی کا فرمان ہے:

اَلْغَضَبُ يُفْسِدُ الْاِيْمانَ كَما يُفْسِدُ الصَّبْرُ اَلْعَسَلَ.[۲]

غصب ایمان کو خراب کرتا ہے جس طرح صبر (تلخ دارو) شہد کو خراب کر دیتا ہے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اَعْدَى عَدُوٍّ لِلْمَرْءِ غَضَبُهُ وَ شَهْوَتُهُ، فَمَنْ مَلَكَهُما عَلَتْ دَرَجَتَهُ وَ بَلَغَ غايَتَهُ.[۳]

انسان کا سخت ترین دشمن اس کا غصہ وغضب اور ہوائے نفس ہے جو شخص ان دو کو چھوڑ سکتا ہے اس کا درجہ بلند ہوتا ہے اور کمال کے آخری مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے۔

---

[۱] بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 265.

[۲] بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 265.

[۳] شرح غرر، جلد 2، صفحہ 454، حدیث 3269.

۴۔ مولا امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْغَضَبُ نارٌ مُوقَدَةٌ، مَنْ كَظَمَهُ اَطْفَأَها، وَ مَنْ اَطْلَقَهُ كانَ اَوَّلُ مُحْتَرِقٍ بِها.

[۱]

غضب جلتی ہوئی آگ ہے۔جس نے غصہ پی لیا اس نے آگ کو بجھالیا اور نہیں بجھاتا وہ پہلا شخص آگ میں جلنے والا ہوگا۔

۵۔ آپؑ ہی نے فرمایا:

لَيْسَ لِإِبْلِيْسَ جُنْدٌ اَشَدُّ مِنَ النِّساءِ الْغَضَبِ. [۲]

شیطان کے سپاہی فاسد عورت اور غضب سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔

۶۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْغَضَبُ مِفْتاحُ كُلِّ شَرٍّ. [۳]

غصہ وغضب تمام برائیوں کی کلید ہے۔

۷۔ غضب اس قدر خطرناک چیز ہے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے اس سے خدا کی پناہ لی ہے اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَيَجانِ الْحِرْصِ وَ سَوْرَةِ الْغَضَبِ وَ غَلَبَةِ الْحَسَدِ وَ ضَعْفِ الصَّبْرِ وَ قِلَّةِ الْقَناعَةِ. [۴]

خدایا! میں تیری پناہ لیتا ہوں، حرص سے، شدت غضب سے حسد کے غالب آنے سے، ضعیف صبر سے اور قناعت کی قلت سے۔

۸۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

---

[۱] شرح غرر، جلد 2، صفحہ 47، حدیث 1787.

[۲] آثار الصادقین، جلد 15، صفحہ 454.

[۳] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 303.

[۴] صحیفہ سجادیہ، دعا 8.

اِيّاكَ وَ الْغَضَبَ فَاَوَّلُهُ جُنُونٌ وَ آخِرُهُ نَدَمٌ.[1]

غضب سے پرہیز کرو کہ جس کا آغاز دیوانگی اور آخر پشیمانی ہے۔

۹۔ آپؑ ہی نے فرمایا:

عِنْدَ غَلَبَةِ الْغَيْظِ وَ الْغَضَبِ يُخْتَبَرُ حِلْمُ الْحُلَماءِ.[2]

غصہ وغضب کے غالب ہونے کے دوران حلیم افراد کا امتحان ہوتا ہے۔

۱۰۔ اس طرح آپؑ نے غصہ کے دردناک انجام کے بارے میں فرمایا:

عُقُوبَةُ الْغَضُوبِ وَ الْحَقُودِ وَ الْحَسُودِ تَبْدَءُ بِاَنْفُسِهِمْ.[3]

غصہ، کینہ اور حاسد افراد کا انجام دوسروں سے پہلے ان کے اپنے ہی دامن گیر ہوتا ہے۔

۱۱۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ كَفَّ غَضَبَه سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ.[4]

جو شخص اپنے غصہ پر کنٹرول کر لیتا ہے۔ خدا اس کے عیوب کو چھپاتا ہے۔

۱۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ہی کا فرمان ہے:

اَيُّ شيء اَشَدُّ مِنَ الْغَضَبِ اِنَّ الرَّجُلَ اِذا غَضِبَ يَقْتُلُ النَّفْسَ وَ يَقْذِفُ الْمُحْصَنَ.[5]

غصہ سے بدتر کیا چیز ہے جب انسان غصے میں ہوتا ہے تو انسان کو قتل کرتا ہے، نیک افراد کو گالیاں دیتا ہے اور تہمت لگاتا ہے۔

---

[1] شرح غرر، جلد 2، صفحہ 286، حدیث 2635.

[2] شرح غرر، جلد 4، صفحہ 326، حدیث 6225.

[3] شرح غرر، صفحہ 361، حدیث 6325.

[4] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 293.

[5] سفینۃ البحار، مادہ غضب.

آثار و انجام غضب

جتنے غضب کے برائے آثار ہوتے ہیں اتنے کسی اور گناہ کے نہیں ہوتے اور اس سے بہت ہی زیادہ تباہی و ویرانی ہوتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ غصہ وغضب انسان کا دشمن ہے اور غضب کے وقت عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ انسان دیوانے جیسی حرکات کرنے لگتا ہے اور قریب ترین دوستوں پر بھی حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وحشیانہ حالت ہوتی ہے ہر ایک اس آدمی سے ڈرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْغَضَبُ يُفْسِدُ الْاَلْبابَ وَ يُبْعِدُ مِنَ الصَّوابِ.[۱]

غضب آدمی کی عقل کو فاسد کر دیتا ہے اور درست کام سے انسان کو دور کر دیتا ہے۔

اس لئے روایات میں ملتا ہے کہ اگر یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ انسان کی عقل کتنی ہے اسے غصہ کی حالت میں دیکھو کہ اسے اپنے اعصاب وعقل پر کتنی حاکمیت حاصل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

لايُعْرَفُ الرَّأْيُ عِنْدَ الْغَضَبِ.[۲]

فقط غضب کے وقت افراد کی عقل کو دیکھا جاسکتا ہے۔

۲۔ غضب موجب تباہی ایمان ہے۔ غصہ کرنے والے افراد گناہان کبیرہ انجام دیتے ہیں جو درست ایمان کے لئے سازگار نہیں ہے۔ پہلے حدیث بیان ہوچکی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

شِدَّةُ الْغَضَبِ تُغَيِّرُ الْمَنْطِقَ وَ تَقْطَعُ مادَّةَ الْحُجَّةِ، وَ تُفَرِّقُ الْفَهْمَ.[۳]

---

[۱] الکافی (ط - ال إسلامیۃ) / ج 7 / 413 / باب أدب الحکم .....ص: 412

[۲] غرر الحکم، حدیث 1356.

[۳] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 113.

غضب ایمان کو خراب کر دیتا ہے جس طرح تلخ دار و شہد کو خراب کرتا ہے۔

۳۔ غضب منطق انسان کو خراب کرتا ہے۔ باطل اور جھوٹ بولنے کا عادی کرتا ہے۔ اگر غصہ والا آدمی قضاوت کرے تو وہ صحیح قضاوت نہیں کر سکتا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَنِ ابْتُلِیَ بِالْقَضاءِ فَلا یَقْضِی وَ هُوَ غَضْبانٌ.[۱]

جو شخص قضاوت کرنا چاہئے اسے چاہئے کہ غصے میں قضاوت نہ کرے۔

شدت غصب سے انسان کی منطق خراب ہوجاتی ہے اور دلیل کا ریشہ قطع ہوجاتا ہے اور فہم و شعور متفرق ہوجاتے ہیں۔

فقہی کتب میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ قاضی کو غضب کی حالت میں قضاوت نہیں کرنی چاہیے۔

۴۔ اس سے انسان کے پنہاں عیوب ظاہر ہوجاتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

بِئْسَ الْقَرِیْنُ اَلْغَضَبُ یُبْدِیُ الْمَعایِبَ، وَ یُدْنِی الشَّرَّ وَ یُباعِدُ الْخَیْرَ.[۲]

غضب ایک برا ساتھی ہے اور چھپے ہوئے اسرار کو ظاہر کرتا ہے شر اور بدی کو نزدیک اور خیر و نیکی کو دور کرتا ہے۔

۵۔ غصہ و غضب سے انسان شیطان کے نزدیک ہوتا ہے۔ کیونکہ ایمان و عقل دو قوی مانع شیطانی ہوتے ہیں جو دونوں غضب کی حالت میں ضعیف پڑ جاتے ہیں۔ مشہور حدیث ہے کہ

جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی امت پر نفرین کی تو اس وقت شیطان حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا ''تیرا مجھ پر حق ہے اگر چاہتے ہو تو اس کی تلافی کروں۔

حضرت نے بہت تعجب کیا کہ شیطان پر میرا حق؟

شیطان نے کہا: وہی جو تو نے نفرین کی اور تیری قوم غرق ہوگئی اب کوئی باقی نہیں جسے میں گمراہ کروں، اب کچھ مدت کے لئے میں آرام سے بیٹھوں گا دوسری آنے والی نسل کو گمراہ کروں گا۔ شیطان نے نصیحت کرنا شروع کر دی اور کہا:

---

[۱] بحار الانوار، جلد 68، صفحہ 428.

[۲] جامع احادیث الشیعہ، کتاب الجہاد، جلد 13، صفحہ 468.

تین وقت مجھے یاد رکھنا کیونکہ ان مواقع پر میں انسان کے نزدیک ترین ہوتا ہے۔

۱۔ غصے کے وقت

۲۔ قضاوت کے وقت

۳۔ جب انسان نامحرم کے ساتھ ہو۔[۱]

ایک حدیث میں ہے کہ

ذوالقرنین نے ایک فرشتے سے ملاقات اور اسے کہا: مجھے تعلیم دو جن سے میرا ایمان و یقین میں اضافہ ہو،

فرشتے نے کہا: غصہ وغضب کو ترک کرو کیونکہ جب انسان غصہ کرتا ہے اور شیطان اس پر مسلط ہوجاتا ہے لہٰذا غضب کو وقار میں بدل دو، اس کی آگ کو خاموش کرو، جلد بازی سے پرہیز کرو اگر کام میں جلدی کرو گے تو اپنے نصیب سے محروم ہوجاؤ گے۔ دور ونزدیک سب کے ساتھ مہربان رہو اور سخت گیری نہ کرو۔[۲]

بے شک غضب کے برے آثار انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی کے علاوہ معنوی بھی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اس بیماری سے بچا ہوا ہے اسے بہت ثواب ملتا ہے۔ مختلف روایات میں ملتا ہے کہ جو غصہ پی جاتا ہے اسے شہداء کا ثواب ملتا ہے[۳] اور روز قیامت انبیاء کا ہمسایہ ہوگا[۴]، اور اس کا دل نور ایمان سے پر ہوتا ہے۔[۵]

---

[۱] بحارالانوار، جلد 11، صفحہ 318.

[۲] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 293.

[۳] جامع احادیث الشیعہ، جلد 13، صفحہ 479.

[۴] جامع احادیث الشیعہ، جلد 13، صفحہ 479.

[۵] جامع احادیث الشیعہ، جلد 13، صفحہ 478.

اسباب غضب

غصہ وغضب کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ چند ایک کو ہم ذکر کرتے ہیں:

۱۔ قضاوت میں جلدی کرنا، انسانی خودی اور اجتماعی زندگی میں ہر لحظہ مختلف واقعات و حادثات پیش آتے ہیں اگر انسان فوری فیصلہ کرے تو اس کے دل میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی لہٰذا جب کوئی قصہ پیش آئے تو جلد قضاوت نہیں کرنی چاہیے وگرنہ تلخ دردناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

مِنْ طَبائِعِ الْجُهّالِ اَلتَّسَرُّعُ اِلَى الْغَضَبِ فِي كُلِّ حال.[1]

جاہل افراد کی طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہر حال میں جلدی غضب ناک ہوجاتے ہیں۔

۲۔ کم ظرفیت: جو افراد تلخ واقعات کو برداشت کرتے ہیں ان کی روح بلند و بالا اور وسیع فکر ہوتی ہے۔لیکن اس کے برعکس کچھ افراد کم ظرفیت والے ہوتے ہیں اور چھوٹی سی بات پر برملا ہوجاتے ہیں۔

۳۔ تکبر اور خود پسندی: متکبر افراد ہمیشہ توقع رکھتے ہیں کہ دوسرے ان کی عزت و اکرم کریں اور اگر لوگ ایسا نہیں کرتے وہ جلد ہی غصہ وغضب میں آکر برا بھلا کہنا شروع کردیتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے کہ غضب کے اسباب میں سے ایک عامل تکبر وغرور اور خود پسندی ہے۔ ایک جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حواریوں نے پوچھا: ہمیں بتائیں کہ خطرناک ترین چیز کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا: اللہ کا غضب۔

لوگوں نے عرض کیا: غضب کا سبب کیا ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

اَلْكِبْرُ وا التَّجَبُّرُ وَ مَحْقَرَةُ النّاسِ.[2]

---

[1] شرح غرر الحکم، جلد 6، صفحہ 28، حدیث 9351.

[2] محجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 304.

تکبر، خودنمائی اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

۴۔ حسد و کینہ یہ دو بیماریاں بھی غضب کا باعث بنتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْحِقْدُ مَثارُ الْغَضَبِ.[۱]

کینہ رکھنا غصہ و غضب کا سبب ہوتا ہے۔

۵۔ حرص اور دنیا پرستی: بعض افراد دنیا کے عاشق ہوتے ہیں اور ان کی روح میں ہوس ہوتی ہے۔ تھوڑے سے منافع کی کمی سے لڑ پڑتے ہیں۔ پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منقول روایت میں بیان ہو چکا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

وَشِدَّةُ الْحِرْصِ عَلَى فُضُولِ الْمالِ وَ الْجاهِ.[۲]

شدت حرص مال و مقام کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

غضب کا علاج

۱۔ غضب کے انجام پر متوجہ ہونا۔ غضب ایمان و سعادت کو جلا دیتا ہے۔ غضب سے دوست دور ہوجاتے ہیں۔ غضب ناک انسان نفسیاتی مریض ہوجاتا ہے جس سے عمر کم ہوجاتی ہے اور صحت و سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے، غضب کرنے والا معنوی مقام حاصل نہیں کرسکتا۔

اس کے برعکس حلم و بردباری میں کامیابی اور پیشرفت ہوتی ہے انسان کا جسم و روح سلامت رہتے ہیں۔ معاشرے میں محبوبیت ہوتی ہے۔ خدا راضی ہوتا ہے اور شیطان سے دوری ہوتی ہے۔

۲۔ غصہ و غضب کے انجام پر غور و فکر کرنا۔

۳۔ ذکر خدا ایک درمان ہے۔ روایات میں ملتا ہے کہ جب انسان کو غصہ آئے تو "اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ

---

[۱] سفینۃ البحار، مادہ غضب.

[۲] شرح غرر، جلد 1، صفحہ 142، حدیث 530.

الشَّيْطانِ الرَّجِيْمِ" پڑھے۔[1]

اسی طرح بعض روایات میں ملتا ہے "لا حَوْلَ وَ لا قُوَّةَ اِلّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ" پڑھیں تا کہ غصہ ٹھنڈا ہوجائے۔[2]

بعض روایات میں ملتا ہے کہ جب غصہ آئے تو زمین پر سجدہ کرے۔

ابوسعید خدری رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتا ہے:

غصہ ایک گھونٹ ہے جو انسان کے قلب میں ہوتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس کی آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں اور رگوں میں ورم آجاتا ہے جو انسان اپنے آپ میں یہ آثار دیکھے تو اسے زمین پر سجدہ کرنا چاہتے۔[3]

یقیناً جو شخص ایسا کرتا ہے اور خدا کی پناہ لیتا ہے وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہ جاتا ہے اور اس کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔اس کے علاوہ ذکر خدا کرنا اس حال میں مناسب ہے۔

مرحوم شیخ حر عاملی نے وسائل میں ایک وجوب ذکر اللہ عندالغضب کے نام باب لکھا ہے اور اسے جہاد بالنفس کے باب میں تحریر کیا گیا ہے۔[4]

۴۔ حالت کو بدلنا بھی غضب کا ایک علاج ہے۔اگر کھڑے انسان کو غصہ آئے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھے ہوئے کو غصہ آئے تو کھڑا ہوجائے یا اس جگہ سے دور ہوجائے اور اپنے آپ کو کسی کام میں مشغول کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كانَ النَّبِيّ اِذا غَضِبَ وَ هُوَ قائِمٌ جَلَسَ وَ اِذا غَضِبَ وَ هُوَ جالِسٌ اِضْطَجَعَ، فَيَذْهَبُ غَيْضُهُ.[5]

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غصہ آتا تو اگر کھڑے ہوتے تو بیٹھ جاتے تھے اور اگر بیٹھے ہوتے تو پہلو میں سوجاتے تھے جس سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا تھا۔

---

[1] سفینۃ البحار، مادہ غضب، المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 307.

[2] جامع الاحادیث، جلد 13، صفحہ 472.

[3] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 308.

[4] وسائل الشیعہ، جلد 11، صفحہ 291، (باب 54 از ابواب جہاد النفس)

[5] المحجۃ البیضاء، جلد 5، صفحہ 308، بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 272.

بحارالانوار میں امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اَیُّما رَجُل غَضِبَ وَ هُوَ قائِمٌ فَلْیَجْلِسْ فَاِنَّهُ سَیَذْهَبُ عَنْه رِجْزُ الشَّیْطانِ وَاِنْ کانَ جالِساً فَلْیَقُمْ.[1]

جس آدمی کو غصہ آجائے اگر وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے کیونکہ شیطان کی پلیدگی اس سے دور ہوجاتی ہے اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو کھڑا ہوجائے۔

روایات میں ملتا ہے کہ اگر انسان اپنے رشتہ داروں سے غصہ کرے تو اپنے ہاتھوں کو ملے اور یہ اس کا ملنے سے غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔[2]

۵۔ وضو کرنا، پانی پینا اور چہرے پر ڈالنے میں غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَتَوَضَّأ.[3]

جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کیا کرو۔

مرحوم علامہ مجلسی نے تفسیر میں اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ بعید نہیں کہ یہاں وضو سے مراد ہاتھ دھونا ہے۔بعض روایات میں وضو کے علاوہ غسل کا ذکر بھی آیا ہے۔آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَاِذا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَتَوَضَّأْ وَلْیَغْتَسِلْ فَاِنَّ الْغَضَبَ مِنَ النّارِ.[4]

جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کرو اور غسل کرو کیونکہ غضب آگ ہے اور آگ کو پانی بجھاتا ہے۔

دوسری تعبیر بھی ملتی ہے کہ غضب شیطانی کام ہے اور شیطان آگ سے خلق ہوا ہے اور آگ کو پانی بجھاتا ہے میں جب تم میں کسی کو غصہ آئے تو وضو کرو۔[5]

---

[1] بحارالانوار (ط - بیروت) / ج 70، ص: 262

[2] بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 272.

[3] بحارالانوار، جلد 77، صفحہ 312.

[4] بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 272.

[5] بحارالانوار، جلد 70، صفحہ 272.

اقسام غضب

غصہ وغضب ہمیشہ منفی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس کا مثبت پہلو بھی ہوتا ہے جو انسان کی مادی اور معنوی زندگی میں ضروری ہے۔ لہٰذا، غصہ وغضب کی دو تقسیم منفی ومثبت کی جاسکتی ہیں اور اگر غضب الٰہی اس کا اضافہ کریں تو غضب کی تین اقسام بنتی ہیں۔

ا۔ غضب الٰہی

بہت سی آیات میں غضب الٰہی کا ذکر ہوا ہے۔ خاص کر بنی اسرائیل کے بارے میں کہ ان پر غضب خدا ہوا بلکہ غضب کے بعد غضب ہوتا تھا۔ بعض مفسرین **مغضوب علیھم** جو کہ سورہ حمد میں آیا ہے کہ تفسیر میں بنی اسرائیل کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ بے شک غضب ایک اندرونی حالت کا نام ہے جس میں انسان انتقام جو ہوتا ہے۔ اس میں غصہ کی آگ بھڑکتی ہے اور رکیں خون کی شدت سے پھول جاتی ہیں اور لہٰذا مفسرین نے غضب کا معنی یہ لکھا ہے کہ عادلانہ فیصلہ مراد ہے۔ مرا غضب اپنی کتاب مفردات میں صراحت سے کہنا ہے: جب غضب خدا کی صفات میں سے ایک صفت کے طور پر ذکر ہو وہاں مراد انتقام اور عادلانہ فیصلہ ہوتا ہے۔

احادیث میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام باقر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ غضب خدا سے مراد کیا ہے؟

آپ نے فرمایا:

غَضَبَ اللهُ تَعالی عِقابُهُ. یا عَمرو![1] مَنْ ظَنَّ اَنَّ اللهَ یُغَیِّرُهُ شَیْءٌ فَقَدْ کَفَرَ.[2]

---

[1]

[2] بحار الانوار، جلد 4، صفحہ 68.

اے عمر! غضب خدا سے مراد اس کا عذاب ہے اور جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ کوئی چیز خدا کو دگرگوں کر دیتی ہے اور وہ کافر ہے۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

غضب خدا اس کا کیفر ہے جس طرح اس کی رضا ثواب ہے۔

۲۔ غضب منفی

وہ غضب جس سے تباہی ہو، اس کے آثار پہلے بیان ہو چکے ہیں لہٰذا مزید بحث نہیں کرتے۔

۳۔ غضب مثبت

خدا نے کوئی بھی چیز انسان میں حکمت سے خالق خلق نہیں فرمائی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہے انسان کی خدا داد طاقتیں صرف تباہی کے لئے نہیں ہیں اگر ایسا ہے تو خدا کی توحید افعال ناقص ہوتی ہے، یہ محال ہے کہ ایک عضو انسان میں موجود ہوں اور اثر مثبت نہ رکھتا ہو جیسا کہ غضب کے بارے میں بیان ہو چکا ہے جب انسان غصے میں ہوتا ہے تو اس کے بدن کی طاقت زیادہ ہوتی ہے اس غضب کا انسانی بدن میں خلق کرنے کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال و جان کا دفاع کر سکے اس وقت اگر غصہ نہ ہوتا تو انسان کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا یہ خدا کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ پرندوں اور حیوانوں میں یہ دیکھا گیا کہ وہ ایک اشارے میں فرار کر جاتے ہیں لیکن اپنے دفاع کے وقت وہ خوب دفاع کرتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کو جب چیل اٹھانے آتی ہے تو یہی مرغی اس چیل پر حملہ کر دیتی ہے۔ اس طرح جنگل میں بعض حیوان جب شکار کرتے ہیں تو شکار ہونے والے اپنا اچھی طرح دفاع کرتے ہیں اور طاقت بھی پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔

لہٰذا غضب کی قدرت ایک اہم نعمت الٰہی ہے۔

آیات و روایات میں غضب کے بارے میں بہت کچھ بیان ہوا ہے۔

۱۔ آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان یاد ہے کہ جب وہ پیام الٰہی لینے کوہ طور پر گئے اور ان کے بعد ساحری نے لوگوں کو ایک بچھیا کی پوجا میں گمراہ کر دیا۔ اللہ نے اس کی خیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں کوہ طور پر پہنچا دی۔

لہٰذا حضرت موسیٰ غصہ وغضب کی حالت میں اپنی قوم کی طرف آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بنی اسرائیل کے لئے احکام کی ایک تختی موجود بھی جو گر گئی اور اپنے بھائی کے سر اور داڑھی کے بال پکڑے اور کھینچے اور اس پر فریاد کی کہ تو اتنے بڑے سامری کے کام پر کیوں خاموش رہا؟ کیا تو نے میرا فرمان بھلا دیا۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ.[1]

اور جب موسیٰؑ پلٹ کر اپنی قوم کی طرف آئے تو (یہ حالت دیکھ کر) رنج وغصّہ میں (اپنی قوم سے) کہنے لگے کہ تم لوگوں نے میرے بعد بہت بری حرکت کی۔ تم لوگ اپنے پروردگار کے حکم (میرے آنے) میں کس قدر جلدی کر بیٹھے اور (توریت کی) تختیوں کو پھینک دیا اور اپنے بھائی (ہارونؑ) کے سر (کے بالوں) کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔

اس قسم کا غصہ جو انحراف کو روکنے کے لئے ہے مثبت پہلو رکھتا ہے۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپ سخت غصے میں ہوتے اور غصہ و غضب کے آثار آپؐ کے چہرے سے نمایاں نظر آنے لگے۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے موقع پر سہیل بن عمرو پر جو قریش کا نمائندہ تھا صلح نامہ کے نادرست شقوں پر آپؐ کو بہت غصہ آیا۔[2]

۳۔ حضرت علی علیہ السلام کے حالات زندگی میں ملتا ہے کہ جب مسلمانوں نے جناب زہرا سلام اللہ علیہا کا حق غصب کیا اور آپؑ کے دروازے کو آگ لگانے جیسے واقعات میں آپ سخت ناراض ہوئے اور غصہ وغضب کی حالت میں تلوار اٹھائی اور فرمایا: میں تجھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوں۔[3]

۴۔ ابوذر غفاریؓ کے بارے میں بھی ملتا ہے کہ حضرت عثمان نے ابوذرؓ کے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو برداشت نہ کیا اور اسے ملک بدر کر دیا اور وہ زندہ چلے گئے حضرت علی علیہ السلام نے انہیں الوداع کیا اور فرمایا:

يا اَباذَرَ اِنَّكَ غَضِبْتَ لِلّٰهِ (عزّ وجل) فَارْجُ مَنْ غَضِبْتَ لَهُ اِنَّ الْقَوْمَ خافُوكَ عَلى دُنْياهُمْ وَ خِفْتَهُمْ عَلى دِينِكَ. فَاتْرُكْ فِي اَيدِيهِمْ ما خافُوكَ عَلَيهِ

---

[1] سورۂ اعراف: 150

[2] بحار الانوار، جلد 20، صفحہ 360.

[3] بحار الانوار، جلد 40، صفحہ 113.

وَاهْرُبْ مِنْهُمْ بِمَا خِفْتَهُمْ عَلَيهِ.[1]

ابوذر کا غصہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جو لوگوں کا ناحق مال کھاتے تھے اور لوگوں پر ظلم وستم کرتے تھے۔ لہٰذا ایسا غصہ وغضب الٰہی شمار ہوتا ہے۔

ایک واقعہ میں ملتا ہے کہ جب ابوذرؓ نے معاویہ پر اعتراضات کئے جس کی بنا پر معاویہ اسے شام سے نکالنا چاہتا تھا۔ جب وہ ملک بدر ہو رہے تھے تو شام کے کچھ مومنین سے ابوذرؓ نے یوں خطاب کیا:

اَيُّهَا النّاسُ اِجْمَعُوا مَعَ صَلاتِكُم وَ صَومِكُمْ غَضَباً لِلّه عَزَّوَجَلَّ اِذا عُصِيَ فِي الاَرْضِ.[2]

اے لوگو! اپنے نماز وروزہ کے ساتھ گناہوں کی خاطر خدا کے لئے غصہ بھی کرو۔

۵۔ ایک حدیث امام حسین علیہ السلام سے ہے:

جب مدینہ کا حاکم ولید بن عتبہ تھا امام نے اس کے سر کا عمامہ اس کے گلے میں ڈالا۔[3]

ساتھ بیٹھے ہوئے مروان نے کہا: میں نے آج تک اتنی جرأت و جسارت نہیں دیکھی۔ آج تک کسی حاکم کی اتنی ذلت نہیں ہوئی۔

ولید نے کہا: تو میری حمایت نہیں کر رہا بلکہ میرے حلم و بردباری پر حسد کر رہا۔ یہ مال حسینؑ کا مال تھا۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: اے ولید! میں نے یہ مال تیرے سپرد کیا اور یہ کہہ کر آپ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ کا غصہ دنیا کے لئے نہ تھا بلکہ مقصود یہ تھا کہ یہ ثابت کریں وہ امام کے ساتھ زبردستی سے پیش نہ آئیں۔

۶۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنایا اور خط لکھا کہ آغاز اس طرح کریں۔

مِنْ عَبْدِاللهِ عَلِي اميرِالمُؤمِنينَ(عليه السلام) اِلَى الْقَوْمِ الَّذينَ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ 130.

[2] میزان الحکمہ، جلد 3، صفحہ 2270.

[3] بحارالانوار، جلد 44، صفحہ 191.

غَضِبُوا لِلّٰهِ حِينَ عُصِيَ فِی اَرْضِهِ وَ ذُهِبَ بِحَقِّهِ؛.[1]

یہ خط علی بن ابی طالب امیر المومنینؑ کی طرف سے اس قوم کے نام ہے کہ جو اللہ کے لئے غضب ناک ہوتی ہے جب زمین پر اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور ان کا حق چھینا جاتا ہے۔

۷۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ خدا نے حضرت شعیاء علیہ السلام سے وحی فرمائی:

میں ایک لاکھ افراد تیری قوم کا ہلاک کروں گا ان میں چالیس ہزار گناہ گار اور ساٹھ ہزار نیک ہیں۔ شعیاء علیہ السلام نے عرض کیا: گناہ گار تو عذاب کے مستحق ہیں لیکن نیک افراد کا کیا گناہ ہے؟ اللہ نے فرمایا:

داهَنُوا اَهْلَ الْمَعاصِی فَلَمْ یَغْضِبُوا لِغَضَبی.

ان لوگوں نے گناہ گاروں سے لاپرواہی برتی اور انہیں گناہ سے نہیں روکا۔[2]

آیات و روایات میں بیان ہو چکا ہے کہ غضب اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ حق کا دفاع کرنا اور غضب کرنا اچھا ہے۔ مقدس غضب عقل و شرع کی حدود میں رہ کر ہوتا ہے اور برائیوں سے روکنے کے لئے ہوتا ہے لیکن شیطانی غضب عقل کے کنٹرول بھی نہیں ہوتا غضب مقدس میں ایک خاص ہدف ہوتا ہے۔ اچھا غضب اس سیلاب کی مانند ہے جو پہاڑوں سے آتا ہے لوگ اس کا پانی جمع کر لیتے ہیں تا کہ کھیتی باڑی کے لئے مفید ہو لیکن غضب شیطانی ایسا سیلاب ہے جو پہاڑ سے آتا ہے اور ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤمِنُ الَّذی اِذا غَضِبَ لَمْ یَخْرُجْهُ غَضَبُهُ مِنْ حَقٍّ، وَ اِذا رَضِیَ لَمْ یَدْخُلْهُ رِضاهُ فِی باطِلٍ.[3]

مومن وہ ہے کہ جب بھی اسے غصہ آتا ہے وہ حق کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا اور جب بھی خوش ہوتا ہے تو باطل نہیں ہوتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ 38.

[2] بحار الانوار، جلد 14، صفحہ 161.

[3] بحار الانوار، جلد 64، صفحہ 354.

حلم و بردباری

غصہ وغضب کے مقابلے میں حلم و بردباری ہے۔ امام حسن علیہ السلام سے حلم و بردباری کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

كَظْمُ الْغَيْظِ وَمِلكُ النَّفْس.[1]

حلم درحقیقت غصے کو پی کر اپنے نفس پر مسلط ہوا جاتا ہے۔

لوگوں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا حلم و بردباری ہے۔ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لَيْسَ بِحَلِيمٍ مَنْ لَمْ يُعاشِرْ بِالْمَعْرُوفِ مَنْ لابُدَّ لَهُ مِنْ مُعاشَرَتِهِ.[2]

جوشخص دوسروں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش نہیں آتا وہ حلیم و بردبار نہیں ہے۔

بعض لوگ عاجز ہوتے ہیں اور غصہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ لہٰذا ایسے افراد کو بھی حلیم و بردبار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ جب ان کو موقع ملتا ہے اور اپنے سے چھوٹے پر غصہ نکالنا خوب جانتے ہیں جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لَيْسَ الحَلِيمُ مَنْ عَجَزَ فَهُجِمَ وَ اِذا قَدَرَ اِنْتَقَمَ. اِنَّما الْحَلِيمُ مَنْ اِذا قَدَرَ عَفى.[3]

جوشخص عاجز ہو وہ حلم و بردبار نہیں ہے حلم وہ ہے جو قدرت رکھتے ہوئے بھی بخش دے۔

بہرحال حلم و بردباری، آفیسرز حضرات، انچارج اور فیملی کے سرپرست کے لئے ایک بہترین فضیلت ہے۔ اس سے ترقی ہوتی ہے اور عہدوں میں حسن کردار ادا ہوتا ہے اور بڑی بڑی مشکلات کا حل ہوتا ہے۔ اس فضیلت کی

---

[1] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 102.

[2] کنز العمال، حدیث 5815، جلد 3، صفحہ 130.

[3] غرر الحکم، حدیث 7529.

اہمیت کے لئے ہم چند روایات نقل کرتے ہیں توجہ فرمائیں۔

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلا اُخبِرُکُم بِاَشبَھِکُم بِی اَخلاقاً؟

قالُوا بلی یا رَسُولَ اللہ

فَقالَ اَحسَنَکُم اَخلاقاً وَ اَعظَمَکُم حِلماً وَ اَبَرَّکُم بِقَرابَتِہِ وَ اَشَدَّکُم اِنصافاً مِن نَفسِہِ فِی الغَضَبِ وَالرِّضا۔ [۱]

کیا تمہیں آگاہ کروں کہ تم میں سے اخلاق کے لحاظ سے زیادہ میرے مشابہ کون ہے؟

لوگوں نے عرض کیا: ہاں اے اللہ کے رسولؐ۔

آپ نے فرمایا: جو سب سے زیادہ خوش اخلاق ہے، بردبار اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے والا خوشی وغصہ کی حالت میں باانصاف ہو۔

۲۔ آپؐ ہی کا فرمان ہے:

ما جُمِعَ شَیءٌ اِلی شَیءٍ اَفضَلُ مِن حِلمٍ اِلَی عِلمٍ۔ [۲]

کوئی چیز کسی چیز سے مل کر برتر نہیں ہوئی کہ جتنا حلم علم کے ساتھ۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَشجَعُ النّاسِ مَن غَلَبَ الجَھلَ بِالحِلمِ۔ [۳]

لوگوں میں سب سے زیادہ شجاع ودلیر وہ ہے کہ جس کا علم اس کی جہالت پر غالب ہو۔

اس کی مثل ایک دوسری حدیث میں ہے:

اَقوَی النّاسِ مَن قَوِی عَلی غَضَبِہِ بِحِلمِہِ۔ [۴]

---

[۱] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 152، تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس کی مثل ایک حدیث وسائل الشیعہ جلد 11، صفحہ 211 میں بھی آئی ہے۔

[۲] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 212۔

[۳] شرح فارسی غرر، جلد 2، صفحہ 450۔

[۴] شرح فارسی غرر، جلد 2، صفحہ 435۔

لوگوں میں سب سے طاقتور وہ ہے جس کا علم اس کے غضب پر غالب ہو۔

۴۔ آپ ہی کا فرمان ہے:

اِنَّ اَفْضَلَ اَخْلاقِ الرِّجالِ اَلْحِلْمُ.[۱]

مردوں کا بہترین اخلاق ان کا حلم ہے۔

۵۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الْمُؤمِنَ لِيُدْرِكَ بِالْحِلْمِ وَاللّٰينَ دَرَجَةَ الْعابِدِ الْمُتَهَجِّدِ.[۲]

مومن وحلیم شخص اپنے علم سے شب زندہ دار کا درجہ پاتا ہے۔

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مِنْ اَحَبِّ السَّبيلِ اِلَى اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ جُرْعَتانِ جَرْعَةُ غَيظ تَرُدُها بِحِلْم وَ جُرْعَةُ مُصيبَة تَرُدُّها بِصَبْر.[۳]

خدا کے نزدیک دو گھونٹ محبوب ترین گھونٹ ہیں غصے کا گھونٹ پینا علم کے ساتھ اور مصیبت کا گھونٹ صبر کے ساتھ پینا۔

۷۔ ایک دن حضرت علی علیہ السلام نے سنا کہ کسی شخص نے قنبر کو گالیاں دیں۔ قنبرؓ بھی اس کا جواب دینا چاہتے تھے۔

امامؑ نے فرمایا: اے قنبرؓ! اسے چھوڑ دو اس سے تمہارا خدا راضی اور شیطان غمگین ہوگا۔

پھر فرمایا:

فَوَالَّذِي خَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَءَ النَّسَمَةَ مَا اَرْضَى الْمُؤمِنُ رَبَّهُ بِمِثْلِ الْحِلْمِ، وَ لَا اَسْخَطَ الشَّيْطانَ بِمِثْلِ الصَّمْتِ، وَ لَا عُوْقِبَ الْاَحْمَقِ بِمِثْلِ السُّكُوْتِ عَنْهُ.[۴]

قسم باخدا! جو ذات زیر زمین دانے کو شگافتہ کرتی ہے کوئی چیز مومن کے دل کو حلم کی

---

[۱] شرح فارسی غرر، جلد 2، صفحہ 488.

[۲] مستدرک الوسائل، جلد 11، صفحہ 288 (کتاب الجہاد).

[۳] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 110، حدیث 9.

[۴] سفینۃ البحار، مادہ حلم.

طرح خوشنود اور شیطان کو غضبناک نہیں کر سکتی اور احمق کو خاموشی سے زیادہ کوئی چیز فائدہ نہیں دیتی۔

۸۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَظَمَ غَيْظاً وَ هُوَ قادِرٌ عَلى اِنفاذِهِ وَ حَلُمَ عَنْهُ، اَعْطاهُ اللهُ اَجْرَ شَهيد.[1]

جو شخص اپنا غصہ پی جاتا ہے حالانکہ جواب دینے کی قدرت بھی رکھتا تھا لیکن وحلم و بردباری سے کام لیتا ہے۔ خداوند عالم ایسے شخص کو شہید کا ثواب عطا فرمائے گا۔

۹۔ حضرت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّهُ لَيُعْجِبُني الرَّجُلُ اَنْ يُدْرِكُهُ حِلْمُهُ عِنْدَ غَضَبِهِ.[2]

مجھے خوشی ہوتی ہے کہ جب انسان غصے کے وقت حلم و بردباری سے کام لیتا ہے۔

۱۰۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ

ان کا ایک خط تھا اور اسے کسی کام کے لئے بھیجا لیکن اس نے دیر کردی۔ امام خود ان کے پیچھے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں سویا ہوا تھا۔ آپ کچھ دیر کے لئے اسی کے اوپر کھڑے ہوگئے اور جب بیدار ہوا تو امام نے اس سے فرمایا: یہ کام اچھا نہیں ہے رات کو بھی سوجاؤ اور دن کو بھی رات کو سویا کرو اور دن کو ہمارے لئے کام کرو۔[3]

یہ ہمارے لئے آپ کی سیرت عملی ہے۔ ہمیں اہل بیت علیہم السلام کو نمونہ علم بنانا چاہئے۔

---

[1] مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل/ ج 11 / 291 / 26 باب استحباب الحلم ..... ص: 287

[2] الکافی (ط - الاسلامیۃ) / ج 2 / 112 / باب الحلم .....ص: 111

[3] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 112، حدیث 3و7.

چند اہم نکات

۱۔انسانی زندگی پر حلم و بردباری کے آثار

انسان غضب کے خطرات سے نجات پاتا ہے۔

حلم و بردباری سبب عزت و آبرو ہے۔[۱]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ حَلُمَ سَادَ.[۲]

جو حلم ہوتا ہے وہ سرور ہوتا ہے۔

حلم و بردباری نادان افراد کے مقابلے میں اس بات کا سبب ہوتا ہے حلیم افراد نادان افراد کے خلاف قیام کرتے ہیں۔اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ عِوَضِ الْحَلیمِ مِن خِصْلَتِهِ اَنَّ النَّاسَ کُلُّهُم اَعْوانُهُ عَلی خَصْمِهِ.[۳]

سب سے پہلا نتیجہ جو حلم شخص کو اپنے حلم سے ملتا ہے یہ ہے کہ جاہل دشمن لوگوں کے مقابلے میں لوگ اس کی مدد کرتے ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[۱] بحارالانوار، جلد 74، صفحہ 208، حدیث 1.

[۲] غررالحکم، جلد 2، ص 66،

[۳] شرح غررالحکم، جلد 2، صفحہ 66.

ما اَعَزَّ اللهُ بِجَهْل قَطُّ وَ لا اَذَلَّ بِحِلْم قَطُّ.[1]

خداوند عالم کسی کو اس کے جہل کی وجہ سے دوست نہیں رکھتا جس طرح حلم شخص کو اس کے حلم کی وجہ سے ذلیل وخوار نہیں کرتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حلم و بردباری کے انسانی زندگی میں بہت آثار و برکات ہوتی ہیں اس کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَاَمّا الْحِلْمُ فَمِنْهُ رُكُوبُ الْجَميلِ، وَ صُحْبَةُ الاَبْرارِ، وَ رَفْعٌ مِنَ الضِّعَةِ، وَ رِفْعٌ مِنَ الخَساسَةِ، وَ تَشهّي الْخَيرِ، وَ يُقَرِّبُ صاحِبَهُ منْ مِعالِي الدَّرَجاتِ، وَ الْعَفوِ وَ الْمَهلِ وَالْمَعْرُوفِ وَالصَّمْتِ، فَهذا ما يَتَشَعَّبُ لِلْعاقِلِ بِحِلْمِهِ.[2]

آپؐ نے اس حدیث میں حلیم کے دس نتائج بیان فرمائے حلم کے آثار ہیں:

۱۔ بردبار ہونا، ۲۔ نیک افراد کی ہم نشینی،
۳۔ باعزت شخص ہونا، ۴۔ پستی و ذلت کا دور ہونا،
۵۔ خیر کا طالب ہونا، ۶۔ عالی مقام پانا
۷۔ لوگوں کو معاف کر دینا، ۸۔ مقروض کو قرض کی مہلت دینا
۹۔ نیک کاموں کا بجالانا ۱۰۔ نادان کے جواب میں سکوت اختیار کرنا

یہ وہ امور ہیں کہ عاقل اپنے عمل کی خاطر بہرہ مند ہوتا ہے۔

۲۔ حلم و بردباری کے اسباب

الف: اپنے نفس پر کنٹرول کرنا، حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّمَا الْحِلْمُ كَظْمُ الْغَيْظِ وَ مِلْكُ النَّفسِ.[3]

---

[1] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 112.

[2] تحف العقول، صفحہ 19.

[3] شرح غرر الحکم، جلد 3، صفحہ 741، حدیث 3859.

حلم یعنی غصے کو پینا اور مالکیت نفس۔

انہی معانی کی روایت امام حسن علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔ [1]

ب: بلند ہمت، انسان اپنی شخصیت کو بچانے کی خاطر اپنے غصہ پر قابو پاتا ہے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْحِلْمُ وَ الْاَناۃُ تُوْأمانِ یُنتجُهُما عُلُوُ الهِمَّةِ. [2]

بردباری اور خودسری دو جڑواں بھائی ہیں جو بلند ہمت سے پیدا ہوئے ہیں۔

ج: خدا پر ایمان بھی ایک سبب حلم و بردباری ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْحِلْمُ سِراجُ اللهِ یَسْتَضیئی بِهِ صاحِبُهُ اِلی جَوارِهِ وَ لا یَکُونُ حَلیماً اِلّا الْمَؤیَّدُ بِاَنْوارِ اللهِ وَ بِاَنْوارِ الْمَعْرفَةِ وَ التّوحیدِ. [3]

حلم اللہ کا روشن چراغ ہے کہ جس کے پاس ہے وہ فائدہ اٹھاتا ہے اور خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انسان اس وقت تک حلیم نہیں ہوسکتا جب تک اسے معرفت انوار الٰہی حاصل نہ ہوں۔

د: علم و عقل اور معرفت نتائج مثبت و منفی حلم۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْحِلْمُ نورٌ جَوْهَرُهُ الْعَقْلُ. [4]

حلم و بردباری ایک ایسا نور ہے کہ جس کا جوہر عقل ہے

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 102.

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حدیث 460.

[3] بحار الانوار، جلد 68، صفحہ 422، حدیث 61.

[4] شرح غرر الحکم، جلد 1، صفحہ 311، حدیث 1185.

بِوُفُورِ الْعَقْلِ يَتَوَفَّرُ الْحِلْمُ.[1]

عقل کے بڑھنے سے حلم و بردباری بھی بڑھ جاتی ہے۔

نیز آپ ہی سے مروی ہے کہ:

عَلَيْكَ بِالْحِلْمِ فَإِنَّهُ ثَمَرَةُ الْعِلْمِ.[2]

حلم و بردباری اختیار کرو کیونکہ یہ علم کے درخت کا میوہ ہے۔

۳۔ استثناء

حلم و بردباری کی بڑی تاکید کی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بھی ہے لیکن بعض مقامات پر یہ پسندیدہ نہیں ہے اگر حلم و بردباری سے جاہل افراد کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہو۔ انسان فساد اور گناہ کی طرف جا رہا ہو۔

ایسے موقع پر حلم پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو غضبناک ہونا چاہتے تاکہ دوسرا چپ ہو جائے اگر حلم سے معاشرے کو نقصان پہنچ رہا ہو اور لوگوں کا عقیدہ خراب ہو رہا ہو وہاں پر حلم کرنا مناسب نہیں ہے۔



---

[1] شرح غرر الحکم، جلد 3، صفحہ 221، حدیث 4274.

[2] شرح غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 285، حدیث 6084.

اِذا کانَ یَوْمُ الْقِیامَةِ نادی مُناد مَنْ کانَ اَجْرُهُ عَلَی اللهِ فَلْیَدْخُلِ الْجَنَّةَ فَیُقالُ مَنْ ذَا الَّذی اَجْرُهُ عَلَی اللهِ، فَیُقالُ الْعافُونَ عَنِ النّاسِ فَیَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِغَیْرِ حِساب.

جس روز قیامت ہوگی تو منادی ندا دے گا جن کا اللہ پر کوئی اجر ہے وہ جنت میں داخل ہوجائے۔ کہا جائے گا کس کا اجر خدا پر ہے؟ جواب میں کہا جائے گا۔ جو لوگ عفو کرتے ہیں اور وہ بے حساب جنت میں داخل ہوجائیں گے۔

۱۵۔عفو اور انتقام

فضائل اخلاقی میں سے ایک فضیلت عفو و درگزر ہے، البتہ جب قدرت رکھتا ہو۔ بہت سے لوگوں کے سینوں میں کینہ ہوتا ہے اور وہ ایسے موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ اپنے دشمن پر غصہ نکالے اور انتقام لے۔ وہ نہ صرف بدی کا جواب بدی میں دیتے ہیں بلکہ ایک بدی کا جواب چند بدیوں سے دیتے ہیں اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ بعض لوگ اس پر افتخار کرتے ہیں۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ انتقام جوئی ایک زنجیر کی مانند ہے۔ ایک قبیلے کا فرد دوسرے قبیلے کے فرد کو قتل کر دیتا۔ دوبارہ دوسرا قبیلہ اٹھتا وہ دوسرے پانچ آدمی قتل کر دیتا۔ اسی طرح دوسرے کو موقع ملا تو وہ اس آدمی کو قتل کر ڈالے گا۔ جس سے ایک زنجیر بنتی چلی جاتی ہے۔

لیکن ائمہ و اہل بیت علیہم السلام کی سیرت یہ رہی کہ وہ فاتح ہوتے تو دشمن کو معاف کر دیتے تھے۔ دشمن دوست بن جاتے تھے۔ فتح مکہ کے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام معافی کا اعلان فرمایا تھا اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جن میں عفو و درگزر کا ذکر ہوا ہے:

① ۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ.[1]

---

[1] شوریٰ:40

اور برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے اس پر بھی جو شخص معاف کر دے اور (معاملہ کی) اصلاح کر دے تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے۔ بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

② ۔ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ. [1]

اور جو لوگ تم میں سے مال و دولت اور وسعت والے ہیں وہ قسم نہ کھائیں کہ وہ قرابتداروں، مسکینوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے۔ چاہئے کہ یہ لوگ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے؟ اور اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔

③ ۔ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ. [2]

(اے رسولؐ) تم درگزر کرنا اختیار کرو اور اچھے کام کا حکم دو اور جاہلوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

④ ۔ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ. [3]

اور اگر (مخالفین کے ساتھ) سختی کرو بھی تو ویسی ہی سختی کرو جیسی سختی ان لوگوں نے تم پر کی تھی اور اگر تم صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے واسطے بہتر ہے۔

⑤ ۔ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ. [4]

اور بُری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو جو کچھ یہ لوگ (تمہاری نسبت) بیان کرتے ہیں اس سے ہم خوب واقف ہیں۔

---

[1] نور:22

[2] اعراف:199

[3] نحل:126

[4] مؤمنون:96

⑥۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. [1]

اور بھلائی برائی (کبھی) برابر نہیں ہوسکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقہ سے جواب دو جو نہایت اچھا ہو (ایسا کرو گے) تو (تم دیکھو گے) کہ جس میں اورتم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ یہ بات بس ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب ور ہیں۔

⑦۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ط اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ط فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ط ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ط فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. [2]

اے مومنو! جولوگ (ناحق) مار ڈالے جائیں ان کے بدلے میں تم کو جان کے بدلے جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پس جس (قاتل) کو اس کے (ایمانی) بھائی (طالب قصاص) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسے بھی اسی کے قدم بقدم نیکی کرنا اور خوش معاملگی سے (خون بہا) ادا کر دینا چاہیے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے پھر اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے

⑧۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ج وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. [3]

اے ایماندارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں تو تم ان

---

[1] فصلت:34و35

[2] بقرہ:178

[3] تغابن:14

سے بچے رہو اور اگر تم معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

⑨۔ اِنۡ تُبۡدُوۡا خَيۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡهُ اَوۡ تَعۡفُوۡا عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيۡرًا.

[1]

اگر کھلم کھلا نیکی کرتے ہو یا چھپا کر یا کسی کی برائی سے طرح دیتے ہو تو خدا بھی بڑا طرح دینے والا (اور) قادر ہے۔

⑩۔ وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا. [2]

اور جو کچھ لوگ بکا کرتے ہیں اس پر صبر کرو اور اُن سے بعنوان شائستہ الگ تھلگ رہو۔

تفسیر و خلاصہ

پہلی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سزا و بدلہ اتنا لینا چاہیے جتنا کسی نے نقصان کیا ہے اور اسے مومنین کا شمار کیا گیا ہے پھر عفو و درگزر اور ترک انتقام کی طرف اشارہ ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ.

اور برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے اس پر بھی جو شخص معاف کر دے اور (معاملہ کی) اصلاح کر دے تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے۔ بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

سورہ شوریٰ کی آیت ۳۹ میں دستور ہوتا ہے کہ ظلم کے مقابل تسلیم نہ ہونا۔ جب تم پر کوئی ظلم کرے تو دوسروں سے مدد لو اور ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ پھر آیت ۴۰ میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر تمہارے دوست تم پر ظلم و ستم کریں تو اس کے بدلے میں حد سے تجاوز نہ کرنا بلکہ معاف کرنا بہتر ہے۔ یہاں پر عفو کے بعد اصلاح کا کلمہ استعمال ہوا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اصلاح سے اپنے اور خدا کے درمیان صلاح

---

[1] نساء:149

[2] مزمّل:10

مراد ہے۔بعض نے ظالم ومظلوم کے درمیان اصلاح مراد لی ہے اور بعض نے ترک قصاص کو ذکر کیا ہے۔[1]

دوسری آیت میں واقعہ افک کا ذکر ہوا ہے یعنی بعض منافقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ پر تہمت لگائی اور چاہتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسوا کریں۔آیت نازل ہوئی کہ اصحاب کے ایک گروہ نے واقعۂ افک کے بعد قسم کھالی ہے کہ بعض کی مالی مدد نہیں کریں گے یہ آیت نازل ہوئی کہ انہوں کے لئے عفو و درگزر کا دستور دیا خدا فرماتا ہے:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ

اورتم میں سے جو لوگ زیادہ دولت اور مقدر والے ہیں قرابت داروں اور محتاجوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ دینے لینے) سے قسم نہ کھا بیٹھیں۔

ارشاد قدرت ہوتا ہے:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ.

انہیں چاہیے کہ (ان کی خطا) معاف کر دیں اور درگزر کریں۔کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ خدا تمہاری خطا معاف کرے۔اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یاد رہے کہ واقعہ افک ایک خطرناک داستان تھی۔اس میں اصل منافقین کا ہاتھ تھا لیکن کچھ غافل مومنین نے دھوکہ کھایا اور وہ بھی اس قسم کی فکر کرنے لگے۔خدا نے اس غافل فریب خور گروہ کو عفو و درگزر کا دستور دیا۔لہٰذا شخصی مسائل میں تو لوگوں کو اور زیادہ معافی کا موقع دینا چاہتے۔''عفو'' اور ''صفح'' میں کیا فرق ہے؟ راغب لکھتا ہے:

عفو کا معنی درگزر اور ''صفح'' کا معنی ترک ملامت ہے۔

تیسری آیت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہوا ہے۔جس میں دوسروں کا وظیفہ بیان ہوا ہے۔خداوند عالم فرماتا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ.

(اے رسولؐ) تم درگزر کرنا اختیار کرو اور اچھے کام کا حکم دو اور جاہلوں کی طرف سے منہ پھیر لو۔

---

[1] تفسیر المیزان وقرطبی واثنی عشری وروح البیان وفی ظلال، ذیل آیہ مورد بحث.

یہ تین دستور خدا کی طرف سے بعنوان ایک رہبر کبیر کو دیئے گئے۔ پہلے دستور میں عفو ہے۔ دوسرے میں یہ اشارہ ہے کہ لوگوں کی طرف طاقت سے زیادہ وظیفہ نہ لو۔ تیسرے دستور میں جاہل افراد کی نسبت بے اعتنائی ذکر ہوئی ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے لئے رہبر آئے جنہیں ہتک وتوہین کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک حدیث میں ملتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: اس سے کیا مراد ہے؟

جبرائیل علیہ السلام نے کہا: مجھے معلوم نہیں خدا سے سوال کرتا ہوں۔

دوبارہ جبرائیل آئے اور اس نے عرض کیا:

اِنَّ اللهَ يَأْمُرُكَ اَنْ تَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَ تُعْطِى مَنْ حَرَمَكَ وَ تَصِلُ مَنْ قَطَعَكَ.[1]

خداوندعالم فرماتا ہے کہ جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دو، جو تمہیں محروم کرے اسے عطا کرو، جو تم سے قطع رحمی کرے تم اس سے صلہ رحمی کرو۔

چوتھی آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب ہوا ہے۔ خداوندعالم فرماتا ہے

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ.

اور اگر (مخالفین کے ساتھ) سختی کرو بھی تو ویسی ہی سختی کرو جیسی سختی ان لوگوں نے تم پر کی تھی اور اگر تم صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے واسطے بہتر ہے۔

روایات میں ہے کہ یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ علیہ السلام کی لاش خون سے آلودہ دیکھی اور دشمن نے ان کا سینہ چاک کر دیا تھا اور دل نکال لیا، ناک اور کان قطع کر لئے گئے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراحت ہوئے اور فرمایا: اگر میں غلبہ پاؤں گا تو ان کا بھی یہی حال کروں گا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: میں دشمن کے ستر افراد سے یہی سلوک کروں گا۔ یہ آیت نازل ہوئی اور حکم خدا ہوا کہ تعدی اور تجاوز جائز نہیں لہٰذا صبر کا دامن نہ چھوڑو۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا:

---

[1] مجمع البیان، جلد 2، صفحہ 512.

اَصْبِرُ اَصْبِرُ.

صبر کروں گا، صبر کروں گا۔[1]

اس کے بعد والی آیت خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴿۱۲۷﴾

اور (اے رسولؐ) تم صبر ہی کرو اور خدا (کی مدد) کے بغیر تو تم صبر کر بھی نہیں سکتے اور ان مخالفین کے حال پر تم رنج نہ کرو اور جو مکاریاں یہ لوگ کرتے ہیں اس سے تم تنگ دل نہ ہو۔

آیت کی ابتداء میں مقابلہ کی صورت میں مثل کو مثل قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ جتنا تجاوز ہوا تنا ہی تجاوز کیا جائے اور یہ عمل قتل عمد میں ہے۔ مثلہ کرنا یعنی ناک کان یا دوسرے اعضاء کا قطع کرنا مثلہ میں بھی جائز نہیں ہے کیونکہ مثلہ ایک غیر انسان عمل ہے۔

روایات میں ملتا ہے کہ حتیٰ کتے کو بھی مثلہ کرنا جائز نہیں ہے۔

پانچویں آیت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہوا۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ط نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ.

اور بُری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو جو کچھ یہ لوگ (تمہاری نسبت) بیان کرتے ہیں اس سے ہم خوب واقف ہیں۔

چھٹی آیت میں بھی یہی تعبیر آئی ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ.

اور بھلائی برائی (کبھی) برابر نہیں ہوسکتی تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقہ سے جواب دو جو نہایت اچھا ہو (ایسا کرو گے) تو (تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ یہ بات بس ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور انہی

---

[1] تفسیر عیاشی و الدُّر المنثور، ذیل آیہ مورد بحث.

لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب ور ہیں۔

سورہ رعد کی آیت ۲۲ میں ہم پڑھتے ہیں جب صاحبان عقل کے اوصاف بیان ہوتے ہیں تو خداوند عالم فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے جو مصیبت ان پر پڑی اسے جھیل گئے اور پابندی سے نماز ادا کی اور جو کچھ ہم نے انہیں روزی دی تھی اس میں سے چھپا کر اور دکھلا کر (خدا کی راہ میں) خرچ کیا اور یہ لوگ بُرائی کو بھی بھلائی سے دفع کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کی خوبی مخصوص ہے۔

اس سے مراد یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے گناہوں کو نیکیوں سے جبران کرتے ہیں اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں دیتے ہیں بلکہ بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں تفسیر میں یہ اعمال بھی ہیں کہ ہر دو معنی مراد ہوں۔[1]

ان تین آیات سے روشن ہوگیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مامور تھے کہ عفو و درگزر سے بڑھ کر بدی کا جواب نیکی میں دیں اسی لئے بعد والی آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. [2]

یہ بات بس ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب ور ہیں۔

ساتویں آیت میں قصاص کا مسئلہ ذکر ہوا ہے۔ اسلام کے ایک اہم اجتماعی مسائل میں سے ہے۔ قرآن نے قصاص کو حیات کا سبب شمار کیا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ

اے مومنو! جو لوگ (ناحق) مار ڈالے جائیں ان کے بدلے میں تم کو جان کے بدلے

---

[1] تفسیر المیزان، جلد 16، ذیل آیہ مورد بحث رجوع کریں۔

[2] سورہ فصلت: ۳۵

جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔

پھر خداوند عالم فرماتا ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ

پس جس (قاتل) کو اس کے (ایمانی) بھائی (طالب قصاص) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسے بھی اسی کے قدم بقدم نیکی کرنا اور خوش معاملگی سے (خون بہا) ادا کر دینا چاہیے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔

آخر میں یہ بیان ہوا ہے کہ عفو و درگزر کے بعد یا قصاص کو دیت میں لینے کے بعد پشیمان ہونا اور قدرت کے ذریعے قاتل کو قتل کرنا گناہ ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ.

پھر اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

کیونکہ جب کوئی معاف کر دیتا ہے یا قصاص کے بدلے پر راضی ہوجاتا ہے تو پھر راستہ بند ہوجاتا ہے اور قاتل کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

اس میں ''بھائی'' کا کلمہ استعمال ہوا ہے یعنی اگر کوئی مسلمان بھائی قتل ہوجاتا ہے تو پھر بھی برادری کا رابطہ قطع نہیں ہوتا۔ اسلام عفو و درگزر کو قصاص پر ترجیح دیتا ہے اس مضمون کی روایت ابن عباس سے نقل ہوئی ہے۔[1]

اسی طرح "ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِنْكُمْ وَ رَحْمَةٌ" یعنی دوسری اس بات کی دلیل ہے عفو یا قصاص بجائے دیت لینا ترجیح ہے۔

آٹھویں آیت میں مومنین سے خطاب ہوا ہے۔ گھریلو جھگڑوں اور کشمکش کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد اول، صفحہ 285.

اے ایماندارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں تو تم ان سے بچے رہو۔

یہ عداوت مختلف نوع کی ہوسکتی ہے مثال کے طور پر جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا تو اس سے منع کرنا یا بعض نیکی کے امور میں وصیت کرنا یا دوسرے معنوی مسائل میں نااہل اولاد یا بیویاں مانع بن سکتی ہیں۔ خداوندعالم فرماتا ہے:

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

اور اگر تم معاف کردو اور درگزر کرو اور بخش دو تو خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

بے شک ایک خاندان میں خوشگوار ماحول ہونا چاہیے۔ روایات میں ملتا ہے کہ جو شخص اپنے خاندان میں پرمسرت ماحول میں بیٹھ کر باتیں کرتا ہے تو اس کا اتنا ثواب ہے جتنا ایک اعتکاف میں بیٹھنے والے کو ملتا ہے۔

اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہو تو وہ گھر جہنم ہوتا ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ خداوندعالم نے پہلے عفو پھر صفح اور اس کے سخن عفران کا حکم دیا ہے کیونکہ خداوندعالم فرماتا ہے: کیا تم دوست نہیں رکھتے کہ خدا تمہیں بخش دے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عفو، صفح اور غفران میں کیا فرق ہے؟[1]

پہلے مرحلہ میں عفو ہوتا ہے یعنی درگزر کرنا

دوسرے مرحلہ میں ترک انتقام اور صفح کا قفس نظر انداز کردینا اور بھول جانے کے معنی میں ہے۔

اور غفران سے مراد گناہوں کو چھپانا ہے اور یہ آخری مرحلہ ہے اور بہترین مقام ہے۔

آیت نہم میں عفو کے ساتھ نیک اعمال بجا لانے کا بھی ذکر ہوا ہے اور عفو کے ثواب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ خداوندعالم فرماتا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا.

اگر کھلم کھلا نیکی کرتے ہو یا چھپا کر یا کسی کی برائی سے طرح دیتے ہو تو خدا بھی بڑا طرح دینے والا (اور) قادر ہے۔

لہٰذا انسان کو اس بات پر افتخار نہیں کرنا چاہیے کہ جب وہ قدرت رکھتا ہو تو انتقام لینا شروع کردے بلکہ افتخار یہ

---

[1] قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (جاثیہ، آیہ 14) و مانند وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ، آیہ 37)

ہے کہ انسان اپنے اعصاب پر کنٹرول کرے اور عفو و درگزر سے کام لے۔

دسویں اور آخری آیت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے کہ لیکن تمام مسلمان بھی شامل ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا.

اور جو کچھ لوگ بکا کرتے ہیں اس پر صبر کرو اور اُن سے بعنوان شائستہ الگ تھلگ رہو۔

مشرکین اور دشمن اسلام افراد نے مختلف طریقوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی جس سے آپؐ کو سخت تکلیف ہوئی۔ ان سب مشکلات کے باوجود اللہ نے آپ کو صبر و تحمل کی نصیحت فرمائی کہ ہجر جمیل فرمائیں۔ یعنی خوش اخلاق دل سوزی سے حق کی دعوت دیں اور دستور ہوتا ہے کہ ہتک کرنے والوں کے مقابلے میں مقاومت کا مظاہرہ کریں۔ بعض نے یہ سوچا ہے کہ یہ دستور جہاد کی آیت نازل ہونے سے پہلے آیا اور جہاد کے دستور نے اسے منسوخ کر دیا حالانکہ ایسا نہیں مرحوم طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت تمام مبلغین کے لئے پیغام ہے وہ متعصب اور نادان افراد کے مقابلے میں مایوس نہ ہوں بلکہ ہمت سے کام لیں اور خوش اخلاقی سے پیش آنا۔[1]

مذکورہ آیات جس میں کبھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے اور بعض اوقات مسلمانوں کو شامل ہے۔ یہ خطاب رہبر کے عنوان سے ہے کہ انسان سخت حوادث کے مقابل درگزر کریں۔

عفو و انتقام روایات میں

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذا كانَ يَوْمُ الْقِيامَةِ نادى مُنادٍ مَنْ كانَ اَجْرُهُ عَلَى اللهِ فَلْيَدْخُلِ الْجَنَّةَ فَيُقالُ مَنْ ذَا الَّذى اَجْرُهُ عَلَى اللهِ، فَيُقالُ الْعافُونَ عَنِ النّاسِ فَيَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِساب.[2]

---

[1] مجمع البیان جلد 10، صفحہ 379.

[2] مجمع البیان ذیل آیہ 40 سورہ شوری.

جس روز قیامت ہوگی تو منادی ندا دے گا جن کا اللہ پر کوئی اجر ہے وہ جنت میں داخل ہوجائے۔ کہا جائے گا کس کا اجر خدا پر ہے؟ جواب میں کہا جائے گا۔ جو لوگ عفو کرتے ہیں اور وہ بے حساب جنت میں داخل ہوجائیں گے۔

۲۔ آپؐ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

اَلا اُخبِرُکُم بِخَیرِ خَلائِقِ الدُّنیا وَ الآخِرَةِ اَلعَفوُ عَمَّن ظَلَمَكَ وَ تَصِلُ مَن قَطَعَكَ وَالاِحسانُ اِلی مَن اَساءَ اِلَیكَ، وَاِعطاءُ مَن حَرَمَكَ.[۱]

کیا میں تمہیں آگاہ کروں کہ دنیا و آخرت میں بہترین اخلاق کیا ہے؟ جس نے تم پر ستم کیا ہو اسے عفو کرنا بہترین اخلاق ہے۔ اس شخص سے نیکی کرنا جس نے تم سے بدی کی ہو اور اس کو بخش دینا جس نے محروم کیا ہو۔ اس حدیث میں عفو کے عالی ترین مرتب بیان ہوئے ہیں یعنی عفو و درگزر کرنا اور یہ مقام، مقام انبیاء و اولیائے کرام ہے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلعَفوُ تاجُ المَکارِمِ.[۲]

عفو و درگزر اخلاقی فضیلت کا تاج ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ تاج عظمت و قدرت کی نشانی اور ذہنیت کے لئے ہوتا ہے اور ایک بہترین عفو یعنی سر پر کھا جاتا ہے جسے سرتاج کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عفو و درگزر تمام فضائل میں سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔

۴۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

شَیئانِ لا یُوزَنُ ثَوابُهُما اَلعَفوُ وَالعَدلُ.[۳]

دو چیزوں کا اتنا زیادہ ثواب ہے کہ جن کا وزن نہیں ہوسکتا وہ دو چیزیں عفو اور عدالت ہیں۔

---

[۱] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 107.

[۲] شرح غرر الحکم، جلد 1، صفحہ 140 (حدیث 520).

[۳] شرح غرر الحکم، مدرک، جلد 4، صفحہ 184 (حدیث 5769).

عفو کا عدالت کے ساتھ ذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ عفو کی بڑی اہمیت ہے۔ عدالت سے معاشرے میں نظم وضبط ایجاد ہوتا ہے لیکن عفو ایک فضیلت ہے جو کینہ کو برطرف کرتا ہے۔

۵۔ آپؐ ہی سے ایک روایت ہے کہ جس میں آپ نے بدترین لوگوں کا تعارف کروایا اور فرمایا:

شَرُّ النَاسِ مَنْ لا یَعْفُ عَنِ الزَّلَّةِ وَلا یَسْتُرُ الْعَوْرَةَ.[۱]

بدترین وہ لوگ ہیں جو غلطی کو معاف نہیں کرے اور لوگوں کے عیوب کو نہیں چھپاتے۔

۶۔ ایک حدیث میں ہے کہ

ایک مجرم شخص مامون کے ہاں حاضر کیا گیا اور وہ قتل کرنا چاہتا ہے امام علی رضاعلیہ السلام حاضرین میں موجود تھے۔ مامون نے حضرت امام رضاعلیہ السلام سے پوچھا:

ما تَقُولُ یا اَبَا الْحَسَنِ؟

اے ابوالحسنؑ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

امام نے فرمایا:

فَقالَ اَقُولُ اِنَّ اللهَ لا یَزیدُكَ بِحُسْنِ الْعَفْوِ اِلّا عِزّاً فَعَفی عَنْهُ.[۲]

میں کہتا ہوں کہ عفو کردیں کیونکہ اس میں تیری عزت ہے۔

مامون نے آپ کا کلام سن کر اس شخص کو معاف کردیا۔

۷۔ ایک اور حدیث میں حضرت امیرعلیہ السلام فرماتے ہیں:

قِلَّةُ الْعَفْوِ اَقْبَحُ الْعُیُوبِ، وَ التَّسَرُّعُ اِلَی الانتِقامَ اَعْظَمُ الذُنُوبِ.[۳]

عفو و درگزر کی کمی بدترین عیب ہے اور انتقام لینے میں جلد بازی گناہان کبیرہ میں سے ہے۔

۸۔ حضرت علیعلیہ السلام نہج البلاغہ میں کلمات قصار میں فرماتے ہیں:

---

[۱] شرح غرر الحکم، جلد 4، صفحہ 175 (حدیث 5735).

[۲] بحار الانوار، جلد 49، صفحہ 172، حدیث 10.

[۳] شرح غرر، جلد 4، صفحہ 505، حدیث 6766.

اِذا قَدَرْتَ عَلَى عَدُوِكَ فَاجْعَلِ الْعَفْوَ عَنْهُ شُكْراً لِلْقُدْرَةِ عَلَيْهِ.[1]

جب تم دشمن پر غالب آجاؤ تو عفو کو کامیابی کے لئے شکر قرار دو۔

یہی معنی ایک دوسرے جملہ میں بھی ہے:

اَلْعَفْوُ زَكاةُ الظَفَرِ.[2]

عفو وبخشش کامیابی کی زکوٰۃ ہے۔

۹۔ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

مَا الْتَقَتْ فِئَتانِ قَطُّ اِلّا نَصَرَ اللهُ اَعْظَمَهُما عَفْواً.[3]

جب دو گروہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرتے ہیں تو خداوند عالم اس شخص کو فتح عطا کرتا ہے جو زیادہ عفو کرتا ہو۔

۱۰۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

دَعِ الْاِنْتِقامَ فَاِنَّهُ مِنْ اَسْوَءِ اَفْعالِ الْمُقْتَدِرِ.[4]

انتقام لینا چھوڑ دو کیونکہ یہ قدرت مند افراد کے بدترین کام ہیں۔

اقسام عفو

عفو و درگزر اور ترک انتقام فضیلت کا ایک اہم باب ہے۔قرآن وسنت اور عقل وشرع میں اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اس کا استثناء نہ ہو بلکہ بعض موارد میں معاشرے کی حفاظت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر، پیش گیری از جرائم ،عفو کو نظر انداز کر کے عادلانہ فیصلہ کرنے کا حکم ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ،کلمات قصار، حدیث 11.

[2] نہج البلاغہ،کلمات قصار، حدیث 211.

[3] بحارالانوار، جلد 68، صفحہ 424، حدیث 65.

[4] شرح غررالحکم، جلد 4، صفحہ 20، (حدیث 5139)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ.[1]

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے برابر ہے (اور کچھ مہینہ کی خصوصیت نہیں) سب حرمت والی چیزیں ایک دوسرے کے برابر ہیں پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ خدا پرہیزگاروں کا ساتھی ہے۔

عفو کرنے کا بڑا ثواب ہے عفو وہاں ہوتا ہے جہاں بدلہ لینے کی قدرت رکھتا ہو لیکن معاف کردے تو ضعف نہیں۔ البتہ عام امور میں معاف کرنا اور خطاؤں کے مطابق عفو ہوتا ہے۔ اگر عفو کرنے سے معاشرے میں خرابی کا خطرہ ہو تو معاشرے کو زندہ رکھنے اور اسے نجات دینے کیلئے حق کا فیصلہ زیادہ مناسب ہے۔ ایسے امور میں استثناء ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْعَفْوُ يُفْسِدُ مِنَ اللَّئِيمِ بِقَدْرِ اِصْلاحِهِ مِنَ الْكَرِيمِ.[2]

عفو پست آدمی کو فاسد کرتا ہے، جس قدر باشخصیت افراد کی اصلاح ہوتی ہے۔

ایک اور مقام پر آپؑ نے فرمایا:

اَلْعَفْوُ عَنِ الْمُقِرِ لا عَنِ الْمُصِرِّ عفو.[3]

عفو اس شخص کے بارے میں ہے جو گناہ کا اعتراف و اقرار کرلے نہ کہ اس شخص کے لئے جو گناہ میں اصرار کرتا ہو۔

آپؑ ہی کا فرمان ہے:

جازِ بِالْحَسَنَةِ وَ تَجاوَزْ عَنِ السَّيِئَةِ ما لَمْ يَكُنْ ثَلَماً فِي الدينَ اَوْ وَهْناً فى

---

[1] کنز الفوائد، جلد 2، صفحہ 182، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد 20، صفحہ 270، حدیث 124.

[2] بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 74 / 419 / باب 15 مواعظ امیر المومنینؑ وخطبہ أیضا وحکمہ .....ص: 376

[3] بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 75 / 89 / باب 16 ما جمع من جوامع کلم امیر المومنین صلی اللہ علیہ وعلی ذریتہ .....ص: 36

سُلْطانِ الْاِسلامِ.[1]

نیکی کا جواب نیکی میں دو اور بدی کو نظر انداز کرو جب دینی یا حکومت اسلامی پر کوئی حرف نہ آتا ہو۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

حَقُّ مَنْ اَسائَكَ اَنْ تَعْفُوَ عَنْهُ. وَ اِنْ عَلِمْتَ اَنَّ الْعَفْوَ عَنْهُ يُضِرُّ اِنْتَصَرْتَ قالَ اللهُ تَبارَكَ وَ تَعالى وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولئِكَ ما عَلَيْهِمْ مِنْ سَبيلٍ.[2]

اگر کسی نے تیرے حق میں بدی کی ہو تو اس سے نیکی کرو لیکن یہ سمجھو کہ معاف کر دینے سے ضرر ہوگا تو اس وقت تم اپنا بدلہ لے سکتے ہو۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ.

اور جس پر ظلم ہوا ہو اگر وہ اس کے بعد انتقام لے تو ایسے لوگوں کو کوئی الزام نہیں۔

لیکن استثناء کو بہانہ بنا کر اس سورہ سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ مقام دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ چھوٹی سی غلطی کو معاف کر دیا یا ان افراد کو معاف کرنا جو معافی کے مقابل ہوں تو یہ عادلانہ فیصلہ ہے۔ اگر ہر آدمی انتقام لینے پر اتر آئے تو بھی عفو کا درجہ ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ حدود اور تعزیرات واجب ہیں اور ان کا جاری کرنا واجب ہے۔

آثار، ثمرات و اسباب عفو

آیات و روایات میں عفو و درگزر کے بہت سے مطلوب آثار و برکات پائے جاتے ہیں جن کا خاصہ یہ ہے۔

۱۔ عفو و درگزر سے دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے۔

۲۔ یہ فضیلت حکومت اسلامی اور قدرت کی بقا کا سبب ہے اس سے دشمنی کم ہوتی ہے اور دوستی زیادہ ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] غرر الحکم، حدیث 4788.

[2] میزان الحکمہ، جلد 3، صفحہ 2015، حدیث 13225.

عَفْوُ الْمُلُوكِ بَقاءُ الْمُلْكِ.[1]

بادشاہوں کا معاف کرنا حکومت کی بقا کا سبب ہے۔

۳۔ عفو و درگزر عزت و آبرو کا سبب ہے۔عفو شرح صدر اور انتقام نفس پر عدم تسلط کی نشانی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

علیکم بالعفو فَإِنَّ الْعَفْوَ لا یَزِیدُ إِلّا عِزّاً.[2]

عفو و درگزر سے کام لو کیونکہ عفو سے شان اور عزت و آبرو میں اضافہ ہوتا ہے۔

۴۔ عفو و درگزر بہت سے کینہ، عداوت اور قتل جیسے جرائم کا خاتمہ ہوتا ہے۔کیونکہ انتقام جوئی سے لوگوں کے سینوں میں کینہ کی آگ روشن ہوجاتی ہے۔بعض اوقات سینوں میں کینہ کی آگ روشن ہوجاتی ہے۔بعض اوقات جنگ تک چھڑ جاتی ہے جس سے ناحق خون ہوجاتا ہے۔اس کے علاوہ مال و متاع تباہ ہوجاتا ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تَعافُوا تَسْقُطُ الضَغائِنُ بَیْنَکُمْ.[3]

ایک دوسرے سے عفو کرو کیونکہ اس سے دشمنی اور کینہ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

۵۔ عفو روح و جان کی سلامتی کا سبب ہے۔جس سے عمر طولانی ہوتی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ کَثُرَ عَفْوُهُ مُدَّ فی عُمُرِهِ.[4]

جو شخص زیادہ عفو کرتا ہے اس کی عمر طولانی ہوتی ہے۔

جو کچھ اجتماعی آثار و برکات کا ذکر ہوئے ہیں وہ مادی تھے ان کے علاوہ معنوی اور آخرت میں ثواب کے بارے میں بھی روایات ہیں۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] بحار الانوار، جلد 74، صفحہ 168.

[2] اصول کافی، جلد 2، صفحہ 108.

[3] کنز العمال، جلد 3، صفحہ 373، حدیث 7004.

[4] میزان الحکمۃ، جلد 3، حدیث 13184.

العفو مع القدرة جُنّةٌ مِنْ عَذابِ اللهِ سُبْحانَهُ.[1]

قدرت رکھتے ہوئے عفو کرنا عذاب الٰہی سے ڈھال ہے۔

انتقام جوئی کے اسباب میں کئی ایک ہو سکتے ہیں جیسے تنگ نظری، حسد، کینہ، ضعف نفس، شہوت پرستی اور اس قسم کی دیگر برائیاں جو معاشرے کے لئے خطرناک ہیں۔

کسب فضیلت عفو اور انتقام کا علاج

عفو جیسی فضیلت کو حاصل کرنا اور انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی بہترین راہ یہ ہے کہ اس صفت کے انجام پر غور کریں۔ جب انسان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ عفو و درگزر کے کیا کے کیا آثار و برکات ہیں؟ اور کیسے یہ صفت انسان کو عروج تک لے جاتی ہے۔ انسان کتنی مشکلات سے نجات پاتا ہے اور لوگوں میں محبوب ہوتا ہے۔

اس کے برعکس انتقام سے زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ جان و مال و آبرو خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اگر انسان کو یہ پتہ چل جائے کہ انتقام کا اصل سبب کیا ہے اور کس چیز سے پیدا ہوا ہے تو اس کا علاج آسان ہوتا ہے۔



[1] غرر الحکم، جلد 1، صفحہ 398، حدیث 1547.

۱۶۔غیرت و بے غیرتی

روایات میں ایک اخلاقی فضیلت کے طور پر ذکر ہونے والی ایک فضیلت غیرت ہے۔غیرت کا اصل معنی عزت وآبرو پامال ومملکت یا دین وآئین کا شدت سے دفاع کرنا ہے۔یہ لفظ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کا حق ہو اور دوسرا اس میں مداخلت کرے جس سے صاحب حق دفاع کرتا ہے۔

بہرحال اگر یہ صفت انسان میں اعتدال کی حد تک ہوتو بڑی فضیلت ہے۔اس سے بڑھ کر اور فضیلت کیا ہوسکتی ہے کہ انسان کسی غیر سے اپنی ناموس یا کشورو دین کا دفاع کرے۔افسوسناک بات یہ ہے کہ یورپ میں یہ فضیلت ختم ہوکر رہ گئی ہے۔مردوں اورعورتوں کے نامشروع رابطہ ہیں اور اس سے بھی بدتر یہ کہ وہ اسے عیب نہیں سمجھتے۔

غیرت کا لفظ آہستہ آہستہ بھلایا جارہا ہے۔اس کے موضوع پر قرآن مجید کی آیات پیش کرتے ہیں توجہ فرمائیں:

① ۔ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا.[1]

---

[1] احزاب:60 تا62

(اے رسولؐ) منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (کفر کا) مرض ہے اور جو لوگ مدینہ میں بُری خبریں اڑایا کرتے ہیں اگر یہ لوگ (اپنی شرارتوں سے) باز نہ آئیں گے تو ہم تم ہی کو (ایک نہ ایک دن) ان پر مسلط کر دیں گے پھر وہ تمہارے پڑوس میں چند روزوں کے سوا ٹھہرنے (ہی) نہ پائیں گے۔لعنت کے مارے جہاں کہیں ہتھے چڑھے پکڑے گئے اور پھر بُری طرح مار ڈالے گئے۔ جو لوگ پہلے گزر گئے ان کے بارے میں (بھی) خدا کی (یہی) عادت (جاری) رہی۔اورتم خدا کی عادت میں ہرگز تغیّر وتبدّل نہ پاؤ گے۔

② قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ.[1]

(یوسفؑ نے) عرض کی اے میرے پالنے والے جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے خواہش رکھتی ہیں اس کی بہ نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔اور اگر تو اُن عورتوں کے فریب مجھ سے دفع نہ فرمائے گا تو مبادا میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں اور جاہلوں سے شمار کیا جاؤں۔

③ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.[2]

اور (اے رسولؐ) ایماندار عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے بناؤ سنگار کے مقامات کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں۔مگر جو خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے (چھپ نہ سکتا ہو اس کا گناہ نہیں) اور اپنی اوڑھنیوں کو (گھونگٹ مار کے)

---

[1] یوسف:33

[2] نور:31

اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈالے رہیں اور اپنے شوہروں یا اپنے باپ داداؤں یا اپنے شوہر کے باپ داداؤں یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں یا اپنی لونڈیوں یا (گھر کے) وہ نوکر چاکر جو مرد صورت ہیں مگر (بہت بوڑھے ہونے کی وجہ سے) عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے یا وہ کم سن لڑکے جو عورتوں کے پردے کی بات سے آگاہ نہیں ہیں ان کے سوا (کسی پر) اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ ہونے دیا کریں اور چلتے میں اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے پوشیدہ بناؤ سنگار (جھنکار وغیرہ) کی خبر ہوجائے۔ اور اے ایمانداروتم سب کے سب خدا کی بارگاہ میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

تفسیر وخلاصہ

پہلی آیت میں خدا نے تین گروہوں کو تنبیہ کی ہے۔ منافقین، بدمعاش، غلط خبریں پھیلانے والا اور تہمت لگانے والا خداوندعالم فرماتا ہے:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾

(اے رسولؐ) منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (کفر کا) مرض ہے اور جو لوگ مدینہ میں بُری خبریں اڑایا کرتے ہیں اگر یہ لوگ (اپنی شرارتوں سے) باز نہ آئیں گے تو ہم تم ہی کو (ایک نہ ایک دن) ان پر مسلط کر دیں گے پھر وہ تمہارے پڑوس میں چند روز کے سوا ٹھہرنے (ہی) نہ پائیں گے۔

یہ غیرت الٰہی ہے کہ جو مسلمانوں کی عزت وآبرو کی دفاع کا سبب بنی ہے۔ غیرت دینی اور ناموس کے معاملے میں منافقین اور بدمعاش افراد کے مقابلے میں خاموشی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ آیت میں تین گروہ کی طرف اشارہ ہے:

مَلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا.

لعنت کے مارے جہاں کہیں ہتھے چڑھے پکڑے گئے اور پھر بُری طرح مار ڈالے

گئے۔ جو لوگ پہلے گزر گئے ان کے بارے میں (بھی) خدا کی (یہی) عادت (جاری) رہی۔ اور تم خدا کی عادت میں ہرگز تغیّر و تبدل نہ پاؤ گے۔

ظاہر آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین جدا جدا گروہ تھے۔

منافقین جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قضاوت کے بارے میں غلط خبریں مدینہ میں پھیلاتے تھے تاکہ مسلمانوں کی روحانی حالت کمزور پڑ جائے۔

ایک گروہ بدمعاش افراد کا تھا جو مسلمانوں کی عورتوں کو پریشان کرتے تھے اور ان کی ناراحتی کا سبب بنتے تھے۔

اور ایک گروہ وہ ہے تھا جو باایمان عورتوں پر تہمت لگاتے تھے۔

آیت مذکور میں تینوں گروہوں کی سخت سرزنش ہوئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کی تعبیر سے مختلف معانی مراد ہیں، کبھی نفاق مراد ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ آیت ۱۰ میں آیا ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

ان کے دلوں میں مرض تھا ہی اب خدا نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا۔

اور بعض اوقات ہوس باز افراد مراد ہوتے ہیں جو شہوت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ کی آیت ۳۲ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو دستور دیا گیا کہ ایسے افراد کے ساتھ سنجیدہ ہوکر بات کریں:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ﴿۳۲﴾

اے نبی کی عورتو! تم اور معمولی عورتوں کی سی تو ہو نہیں (پس) اگر تم کو پرہیزگاری منظور ہے تو (اجنبی آدمی سے) بات کرنے میں نرم نرم (لگی لپٹی) بات نہ کرو تاکہ جس کے دل میں (شہوت زنا کا) مرض ہے وہ (کچھ) اور آرزو (نہ) کرے اور (صاف صاف) عنوان شائستہ سے بات کیا کرو۔

اس آیت کے بعد (آیت ۶۰۔۶۱) میں خداوند عالم فرماتا ہے: یہ ایک سنت الٰہی پہلی اقوام میں بھی تھی اور سنت الٰہی میں تبدیل ممکن نہیں ہے۔

دوسری آیت میں ایک نبی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی غیرت کا نمونہ ذکر ہوا ہے۔ ہوس باز عورتوں نے زلیخا کو برا بھلا کہا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی جوانی میں شہوت کے طوفان کے مقابلے میں مقاومت کا اظہار کیا۔ وہ خدا سے اس طرح عرض کرتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ.

عرض کی اے میرے پالنے والے جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے خواہش رکھتی ہیں اس کی بہ نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اور اگر تو اُن عورتوں کے فریب مجھ سے دفع نہ فرمائے گا تو مبادا میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں اور جاہلوں سے شمار کیا جاؤں۔

تیسری آیت میں خداوند عالم مومنین عورتوں کو حجاب کے علاوہ دستور دیتا ہے:

۳۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

اور (اے رسولؐ) ایماندار عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے بناؤ سنگار کے مقامات کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں۔ مگر جو خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے (چھپ نہ سکتا ہو اس کا گناہ نہیں) اور اپنی اوڑھنیوں کو (گھونگٹ مار کے) اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈالے رہیں اور اپنے شوہروں یا اپنے باپ داداؤں یا اپنے شوہر کے باپ داداؤں یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں یا اپنی لونڈیوں یا (گھر کے) وہ نوکر چاکر جو مرد صورت ہیں مگر (بہت بوڑھے ہونے کی وجہ سے) عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے یا وہ کم سن لڑکے جو عورتوں کے پردے کی بات

سے آگاہ نہیں ہیں ان کے سوا (کسی پر) اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ ہونے دیا کریں اور چلتے میں اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے پوشیدہ بناؤ سنگار (جھنکار وغیرہ) کی خبر ہوجائے۔ اور اے ایماندارو! تم سب کے سب خدا کی بارگاہ میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس آیت میں عفت وغیرت کو بیان کیا جارہا ہے۔ عورتوں کو زمین پر زور سے پاؤں مارنے کی اجازت نہیں جس سے خلخال کی آواز آئے۔ جیسا کہ رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عورتوں سے خطاب ہوا کہ وہ نامحرموں سے سنجیدہ ہوکر گفتگو کریں۔

غیرت روایات کے آئینے میں

روایات میں اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ غیرت کا مسئلہ ایک فضیلت کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔

۱۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ غَیُورٌ یُحِبُّ کُلَّ غَیُور وَلِغیرَتِهِ حَرَّمَ الْفَواحِشَ ظاهِرَها وَ باطِنَها.[1]

خداوند عالم غیور ہے اور غیور ہونے کو دوست رکھتا ہے اور غیرت کی وجہ سے تمام برے اعمال کو حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ آپؑ ہی کا فرمان ہے:

اِذا لَمْ یَغُرِ الرَّجُلُ فَهُوَ مَنْکُوسُ الْقَلْبِ.[2]

اگر کوئی انسان غیرت مند نہ ہو تو اس کا دل الٹا اور معکوس ہے۔

علامہ مجلسیؒ کہتے ہیں کہ معکوس دل سے مراد یہ ہے کہ جس طرح برتن الٹا ہو تو اس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی بلکہ

---

[1] فروع کافی، جلد 5، صفحہ 535، باب الغیرہ، حدیث 1.

[2] فروع کافی، جلد 5، صفحہ 536، حدیث 2.

باہر نکل جاتی ہے اس طرح جن کے دلوں میں غیرت نہیں ہوتی وہ صفات و اخلاق سے خالی ہوتے ہیں۔[1]

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كانَ اِبْراهيمُ اَبي غَيُوراً وَ اَنَا اَغْيَرُ مِنْهُ وَ اَرْغَمَ اللهُ اَنْفَ مَن لايُغارُ مِنَ الْمُؤمِنينَ.[2]

میرے باپ ابراہیم غیور تھے اور میں ان سے زیادہ غیور ہوں۔ جن افراد میں غیرت نہیں خدا ان کی ناک زمین پر رگڑتا ہے۔

۴۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنّي لَغَيُورٌ وَاللهُ عَزَّ وَجَلَّ اَغْيَرُ مِنّي وَ اِنَّ الله تَعالى يُحِبُّ مِنْ عِبادَهُ الْغَيُورَ.[3]

میں غیور ہوں اور خدا مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے۔ خداوند عالم غیور لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

۵۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ الْغيرَةَ مِنَ الاْيمانِ.[4]

غیرت ایمان میں سے ہے۔

۶۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

قَدْرُ الرَجُلِ عَلى قَدْرِ هِمَّتِهِ... وَ شَجاعَتُهُ عَلى قَدْرِ اَنَفَتِهِ وَ عِفَّتُهُ عَلى قَدْرِ غَيرَتِهِ.[5]

انسان کی قیمت اس کی ہمت کے برابر ہے۔ اس کی شجاعت اس کی عزت نفس کے برابر

---

[1] مرأت العقول، ذیل حدیث مورد بحث.

[2] بحار الانوار، جلد 100، صفحہ 248، حدیث 33.

[3] کنز العمال، حدیث 7076، (جلد 3، صفحہ 387).

[4] کنز العمال، صفحہ 385، حدیث 7065.

[5] نہج البلاغہ، کلمات قصار، حدیث 47.

اور اس کی عفت اس کی غیرت کے اندازے کے مطابق ہے۔

۷۔ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ایک اسیر گروہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا اور صرف ایک شخص کو آزاد فرمایا:

اس ایک آزاد ہونے والے آدمی نے آپؐ سے پوچھا: آپؐ نے مجھے کیوں آزاد فرمایا۔

آپؐ نے فرمایا: مجھے جبرائیل نے خبر دی ہے کہ تیرے اندر پانچ خوبیاں ہیں کہ جنہیں خداوند عالم اور اس کا رسولؐ دوست رکھتے ہیں فرمایا:

اَلْغیرَۃُ الشَّدیدَۃُ عَلی حَرَمِكَ وَالسَّخاءُ وَ حُسْنُ الْخُلْقِ وَ صِدْقُ اللِسانِ وَ الشَّجاعَۃِ.[1]

وہ پانچ صفات یہ ہیں:

(۱) _____ اپنے خاندان کے بارے میں غیرت مند ہونا۔

(۲) _____ سخاوت

(۳) _____ حسن اخلاق

(۴) _____ صداقت

(۵) _____ شجاعت

جب اس مرد نے سنا تو فوراً اسلام لے آیا اور بعد میں ایک اچھا مسلمان ثابت ہوا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں وہ شہید ہوا تھا۔

۸۔ حضرت علی علیہ السلام نے عراق کے بعض افراد کی مذمت فرمائی جن کی عورتیں نامحرم لوگوں سے روابط رکھتی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا:

لَعَنَ اللهُ مَنْ لا یُغارُ.[2]

لعنت ہو ایسے افراد پر جو غیرت مند نہیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد 14، صفحہ 109 (باب 77 حدیث 10).

[2] بحار الانوار، جلد 76، صفحہ 115، حدیث 7.

اقسام غیرت

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ غیرت انسان کی ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان اپنے دین، ناموس اور ملک کا دفاع کرتا ہے۔ اگرچہ یہ کلمہ اکثر ناموس کی غیرت کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے بھی وسیع ہے۔ اس صفت میں شدت نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ آج کل غیرت کے نام پر عورتوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ایک عورت جب کسی دوسرے مرد سے ہنس کر بات کرنے لگے تو دوسری طرف سے گولی آجاتی ہے اور اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا جاتا ہے ایسی غیرت کی مذمت کی گئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مِنَ الْغیرَةِ ما یُحبُ اللهَ وَ مِنْها ما یَکْرَهُ اللهُ فَاَماما یُحِبُّ فَالْغیرَةُ فِی الرَّیْبَةِ وَ اَماما یَکْرَهُ فَالغیرَةُ فی غَیْرِ الرَّیْبَةِ.[1]

ایک قسم کی غیرت کو خدا دوست رکھتا ہے اور ایک قسم کی غیرت کو خدا دوست نہیں رکھتا۔ جس غیرت کو خدا دوست رکھتا ہے وہ غیرت ہے جو مشکوک ہو لیکن اس کے علاوہ غیرت کو خدا دوست نہیں رکھتا جیسا کہ بدگمانی میں لوگ دوسروں پر تہمت لگاتے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے جس میں حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند حسن علیہ السلام کو خط لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

وَ اِیّاکَ وَ التَّغایُرَ فِی غَیْرَ مَوْضِعِ غَیْرَة فَاِنَّ ذلکَ یَدْعُوا الصَّحِیحَةَ اِلَی السَّقَمِ وَ الْبَرِیَّةَ اِلَی الرَّیْبِ.[2]

غیرت کے علاوہ موارد میں غیرت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ سبب بن جاتا ہے کہ صحیح و سالم افراد اور بے گناہ تہمت کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

---

[1] کنز العمّال، جلد 3، صفحہ 385، حدیث 7067.

[2] نہج البلاغۃ، نامہ 31.

چھوٹی چھوٹی باتوں میں بدگمانی اور شبہات میں آ کر غیرت کا نام دینا اور لوگوں پر تہمت لگانا غیرت کے نام پر ان کو قتل کر دینا حرام ہے۔ اس طرح معاشرے میں فساد عام ہوجاتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی پر شک کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا ایسے موارد میں پرہیز کرنا چاہیے۔ اسلام سے پہلے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے اور یہ ایک قسم کی منحرف غیرت تھی۔ شاید وہ لوگ یہ سوچتے تھے کہ ہماری عورتیں دشمن کے ہاتھ آئیں گی اور وہ اس کو غیرت سمجھتے تھے۔

انسانی زندگی میں غیرت کے آثار

صحیح اور مثبت ایک دفاعی طاقت ہے کہ جس سے انسان اپنے دشمن اور مخالف پر غالب آتا ہے۔ جب انسان کی جان، مال، عزت، دین اور ملک کو خطرہ ہو تو انسان میں غیرت کا جذبہ ابھرتا ہے اور انسان میں عام حالت سے کئی گنا زیادہ طاقت آجاتی ہے کہ جن سے وہ اپنا دفاع کرتا ہے۔

غیرت عزت و سربلندی اور اقتدار ایک سبب ہے کہ بے غیرت افراد غیرت مند افراد کے سامنے اپنی ملامت کرتے ہیں۔ غیرت سے اسلامی معاشرہ برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں ملتا ہے:

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ. [1]

اور ان کی قوم (لڑکوں کا آنا سن کر بُرے ارادے سے) ان کے پاس دوڑتی ہوئی آئی اور یہ لوگ اس کے قبل بھی بُرے بُرے کام کیا کرتے تھے لوطؑ نے (جب ان کو آتے دیکھا تو) کہا اے میری قوم یہ میری (قوم کی) بیٹیاں (موجود) ہیں (ان سے نکاح کرلو) یہ تمہارے واسطے (جائز اور) صاف ستھری ہیں تو خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمان کے بارے میں رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی سمجھ دار آدمی نہیں ہے۔

---

[1] ہود: ۷۸

لیکن جب اس کلام کا ان پر اثر نہ ہوا تو فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں، وہ جلد ہی عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں گے اور نیست و نابود ہو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْمَرْءَ یَحْتاجُ فِی مَنْزِلِهِ وَ عَیالِهِ اِلَی ثَلاثِ خَلالٍ یَتَکَلَّفُها وَ اِنْ لَمْ یَکُنْ فِی طَبْعِهِ ذٰلِكَ; مَعاشِرَةٌ جَمِیلَةٌ، وَ سِعَةٌ بِتَقْدِیرٍ، وَ غَیْرَةٌ بِتَحْصِینٍ.[1]

انسان اپنے گھر میں اہل وعیال کے ساتھ رہنے کے لئے تین صفات کا محتاج ہے۔

اگر یہ تین صفات نہیں تو اسے زحمت کا سامنا کرنا ہوگا۔

وہ تین صفات یہ ہیں:

۱۔ _____ حسن اخلاق سے پیش آنا

۲۔ _____ وسعت قلبی

۳۔ _____ غیرت



[1] بحار الانوار، جلد 75، صفحہ 236.

لَصَبْرُ اَحَدِ كُمْ ساعَةً عَلى ما يَكْرَهُ فِي بَعْضِ مَواطِنِ الْاِسْلامِ خَيْرٌ مِنْ عِبادَتِهِ خالِياً اَرْبَعِينَ سَنَةً..

تم میں کسی ایک کا صبر کرنا کسی مومن بھائی کی ناراضگی پر اگرچہ ایک لمحہ کے لئے ہو یہ چالیس سال کی رہبانیت کی عبادت سے افضل ہے۔

۱۷۔ اجتماعی زندگی یا گوشہ نشینی

علمائے اخلاق نے اپنی کتابوں میں یہ عنوان بھی لکھا ہے کہ آیا اجتماعی زندگی بہتر ہے یا گوشہ نشینی، بعض اس بات کے قائل ہیں کہ گوشہ نشینی بہتر زندگی ہے اور بعض نے اجتماعی زندگی کو افضل لکھا ہے لیکن بعض اوقات اجتماعی اور بعض اوقات گوشہ نشینی مطلوب ہے، شرط کو دیکھنا چاہیے۔ لیکن معاصر محققین نے قرآن وسنت اور عقل کی روشنی میں اجتماعی زندگی کو افضل سمجھا ہے۔ وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان ایک اجتماعی موجود ہے۔ انسان اپنی مشکلات کو اجتماع کے ذریعے بہتر حل کرسکتا ہے اور سعادت وکمال کی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ گوشہ نشینی کی زندگی انسانی فطرت کے سازگار نہیں ہے اور نہ ہی روح تعلیم اسلام کے مطابق ہے بلکہ اجتماعی زندگی روح تعلیم اسلام کے مطابق ہے۔ عبادت اجتماعی زیادہ افضل ہے۔

اسلام نے خدا کے ہاتھ کو جماعت سے تعبیر کیا ہے اور مسلمانوں کی صفوں سے جدا ہونا نفوذ شیطان کا سبب ہوتا ہے۔ اب ہم ایسی آیات کو ذکر کرتے ہیں جو اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں:

① ۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.[1]

اور تم سب کے سب (مل کر) خدا کی رسی مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے حال (زار) پر خدا کے احسان کو (تو) یاد کرو جب تم آپس میں (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو خدا نے تمہارے دلوں میں (ایک دوسرے کی) اُلفت پیدا کر دی تو تم اس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم (گویا) سلگتی ہوئی آگ کی بھٹی (دوزخ) کے لب پر (کھڑے تھے) اور گراہی چاہتے تھے کہ خدا نے تم کو اس سے بچالیا تو خدا اپنے احکام یوں واضح بیان کرتا ہے تا کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔

② ۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا.[2]

اور جو شخص راہِ راست کے ظاہر ہونے کے بعد رسولؐ سے سرکشی کرے اور مومنین کے طریقہ کے سوا کسی اور راہ پر چلے تو جدھر وہ پھر گیا ہے ہم بھی اِسے اُدھر ہی پھیر دیں گے اور (آخر) اُسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ تو (بہت ہی) بُرا ٹھکانا ہے۔

③ ۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.[3]

اور اگر وہ لوگ تمہیں فریب دینا چاہتے ہیں تو (کچھ پروانہیں) خدا تمہارے واسطے یقینی کافی ہے (اے رسولؐ) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے اپنی خاص مدد اور مومنین سے تمہاری تائید کی۔ اور اسی نے ان (مسلمانوں) کے دلوں میں باہم ایسی اُلفت پیدا کر دی کہ اگر تم جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں ایسی اُلفت پیدا نہ کر سکتے مگر خدا ہی تھا جس نے ان میں باہم اُلفت پیدا کی بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔

---

[1] آل عمران:103

[2] نساء:115

[3] انفال:62 و 63

④۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ. [1]

خدا تو ان لوگوں سے اُلفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح پَرا باندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

⑤۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ. [2]

پھر ان کے پیچھے ہی ان کے قدم بقدم اپنے اور پیغمبر بھیجے اور ان کے پیچھے مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دلوں میں شفقت اور مہربانی ڈال دی اور رہبانیت (لذات سے کنارہ کشی) ان لوگوں نے خود ایک نئی بات نکالی تھی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ مگر (ان لوگوں نے) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے (ایجاد کیا) تو اس کو بھی جیسا بنانا چاہیے تھا نہ بنا سکے۔ تو جو لوگ ان میں ایمان لائے ان کو ہم نے ان کا اَجر دیا اور ان میں کے بہتیرے تو بدکار ہی ہیں۔

تفسیر اور خلاصہ

مذکورہ آیات میں ایک اہم موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ہے وحدت و اتحاد پہلی آیت میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے اور تفرقہ نہ کرنے کے بعد خداوند عالم فرماتا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا

---

[1] صف:4

[2] حدید:27

حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.

اور تم سب کے سب (مل کر) خدا کی رسی مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے حال (زار) پر خدا کے احسان کو (تو) یاد کرو جب تم آپس میں (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو خدا نے تمہارے دلوں میں (ایک دوسرے کی) اُلفت پیدا کر دی تو تم اس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم (گویا) سلگتی ہوئی آگ کی بھٹی (دوزخ) کے لب پر (کھڑے تھے) اور گراہی چاہتے تھے کہ خدا نے تم کو اس سے بچالیا تو خدا اپنے احکام یوں واضح بیان کرتا ہے تا کہ تم راہِ راست پر آجاؤ۔

یہاں پر حبل اللہ سے کیا مراد ہے؟

مفسرین نے مختلف تفاسیر لکھی ہیں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ بعض روایات میں خاندان نبوت مراد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب ایک ہی حقیقت ہے۔ حبل اللہ یعنی خدا سے ارتباط قرآن و خاندان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے۔ قرآن نے آیت مذکورہ میں دشمن و عداوت کو زمانہ جاہلیت کی رسم اور محبت و دوستی کو اسلام کی ایک صفت شمار کیا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ

اور تم (گویا) سلگتی ہوئی آگ کی بھٹی (دوزخ) کے لب پر (کھڑے تھے) اور گراہی چاہتے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں مسلمان کی ایک دوسرے سے رابطہ کی دوستی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں میں برادری کا رشتہ ہے۔ ظاہر ہے کہ برادری کی بنا پر ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہ سکتے بلکہ آپس میں ایک عاطفی پیوند رکھتے ہیں اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ ہے کہ مادی مسائل وحدت کی رمز نہیں ہو سکتے کیونکہ مادی امور میں ہمیشہ تنازع و جھگڑا ہوتا ہے۔ لوگوں کے تقاضے لامحدود اور مادی مسائل محدود ہیں، لیکن حبل اللہ اور خدا سے رابطہ ایک معنوی امر ہے جس سے معاشرے میں بہتر عاطفی رابطہ بن سکتا ہے۔

دوسری آیت میں ایک دردناک انجام کا ذکر ہوا ہے یعنی جو اسلامی معاشرے اور مسلمانوں سے کٹ جائے۔ خداوند عالم فرماتا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ

الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا.

اور جو شخص راہِ راست کے ظاہر ہونے کے بعد رسولؐ سے سرکشی کرے اور مومنین کے طریقہ کے سوا کسی اور راہ پر چلے تو جدھر وہ پھر گیا ہے ہم بھی اِسے اُدھر ہی پھیر دیں گے اور (آخر) اُسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ تو (بہت ہی) بُرا ٹھکانا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو واضح طور پر دستور دیتا ہے کہ اسلامی معاشرے سے کٹ نہ جاؤ۔

بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ایک جماعت کے ساتھ تھے۔ آپ پانچ وقت کی نمازیں مسلمانوں کے ساتھ پڑھتے تھے نماز جمعہ اور حج جیسے عظیم اجتماع میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ آپؐ نے گوشہ نشین ہونے سے منع فرمایا۔ بعض اہل سنت کے علماء نے اس آیت کو اجماع کی حجیت کے لئے دلیل لائے ہیں۔ ہم بھی اجماع کو قبول کرتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں وہ اجماع حجت ہے جو کشف فعل معصوم علیہ السلام ہو۔

تیسری آیت میں خداوند عالم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بڑی نعمت کا ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے مومنین کو جمع کیا اور ان کے درمیان الفت و محبت قائم کی۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

اور اگر وہ لوگ تمہیں فریب دینا چاہتے ہیں تو (کچھ پروا نہیں) خدا تمہارے واسطے یقینی کافی ہے (اے رسولؐ) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے اپنی خاص مدد اور مومنین سے تمہاری تائید کی۔ اور اسی نے ان (مسلمانوں) کے دلوں میں باہم ایسی اُلفت پیدا کر دی کہ اگر تم جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں ایسی اُلفت پیدا نہ کر سکتے مگر خدا ہی تھا جس نے ان میں باہم اُلفت پیدا کی بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔

اگر اسلام کی نظر میں گوشہ نشینی جائز ہوتی تو پھر خداوند عالم ہرگز مومنین کے درمیان تالیف قلوب کا ذکر نہ فرماتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف اجتماعی زندگی مطلوب ہے بلکہ اجتماعی ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں پیوند و خدمت بھی ہو۔ یہ بھی روشن ہے کہ یہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے مربوط نہیں کے اس کی ہر زمانے میں ضرورت ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ خداوند عالم نے تالیف قلوب کی نسبت اپنی طرف دی اور فرمایا: خدا نے تمہارے

دلوں میں الفت ایجاد فرمائی ہے۔جس طرح سورہ آل عمران آیت ۱۰۳ میں بھی خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک معجزہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا اور وحدت قائم فرمائی وگرنہ اسلام سے پہلے بے حد متعصب، ہٹ دھرم، ضدی اور دشمنی و کینہ رکھنے والے تھے جن کو ایک دوسرے کے قریب لانا بہت مشکل تھا۔ اگرچہ وہ تمام مادی مسائل میں تمام دولت بھی خرچ کر دیتے تو بھی ممکن نہ تھا لیکن اللہ کے فضل و کرم سے خدا نے رسولؐ کے ذریعے یہ کام کر کے دکھایا۔

چوتھی آیت میں مسلمانوں کی وحدت کا ذکر ہوا ہے خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ.

خدا تو ان لوگوں سے اُلفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح پَرا باندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

''بنیان'' کا معنی ہر قسم کی بنیاد ہے اور بند بنانے کے معنی کو بھی شامل ہے۔''مرصوص''''رصاص'' کے مادہ سے ہے۔ بنیاد کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے مختلف اشیاء کو جمع کر کے مواد بنایا جاتا تھا تاکہ بنیاد''مرصوص'' یعنی مستحکم و مضبوط ہو۔

پانچویں اور آخری آیت میں رہبانیت یعنی ترک دنیا اور گوشہ نشینی کا ذکر ہوا ہے۔

رہبانیت عیسائیوں سے لی گئی ہے۔اس کی سخت مذمت ہوئی ہے۔خداوند عالم فرماتا ہے:

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةِ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ.

پھر ان کے پیچھے ہی ان کے قدم بقدم اپنے اور پیغمبر بھیجے اور ان کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دلوں میں شفقت اور مہربانی ڈال دی اور رہبانیت (لذات سے کنارہ کشی) ان لوگوں نے خود ایک نئی بات نکالی تھی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔مگر (ان لوگوں نے) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے (ایجاد کیا) تو اس کو بھی جیسا بنانا چاہیے تھا نہ بنا سکے۔تو جو لوگ ان میں ایمان لائے ان کو ہم نے

ان کا اَجر دیا اور ان میں کے بہتیرے تو بدکار ہی ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آج عیسائی تارک دنیا ہیں اور ان میں مرد وعورت دونوں شامل ہیں وہ علیحدہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا کو پشت کر کے صرف اور صرف عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ آج کل تو ایسے بہت سے مراکز قائم ہو چکے ہیں۔

یہ آج کی بدعت نہیں بلکہ تیسری صدی میلادی میں جب رومیوں کا عیسائیوں سے مبارزہ ہوا۔ رومیوں نے شکست دی جس کی وجہ سے عیسائی بیابانوں میں چلے گئے اور انہوں نے رہبانیت اختیار کر لی۔ بعد میں کچھ نادان افراد نے ان کی پیروی کی جو آج تک جاری ہے۔ رہبانیت انبیاء کی تعلیم سے سازگار نہیں ہے۔ رہبانیت میں لوگوں نے شادی کرنا چھوڑی دی اور عبادت و ریاضیت میں ہی رہتے ہیں۔ وہ اجتماعی زندگی کو پسند نہیں کرتے۔ یہ فطرت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس سے زندگی پر منفی اثرات پڑتے ہیں اور انسان نفسیاتی مریض ہوجاتا ہے۔ بعض عیسائی محققین نے اسے فحشا شمار کیا ہے۔

رہبانیت دراصل "رهبة" بروزن "ضربة" کے مادہ سے لیا گیا ہے اس کا معنی خوف اور ڈر کے ہے۔ یہاں خوف سے مراد خوف خدا ہے۔ راغب کے قول کے مطابق ایسا ڈر اوخوف ہے جس میں پرہیز اور اضطراب ہو۔ اس کے بعد گوشہ نشینی عیسائیوں نے اپنی رہبانیت اپنی عبادت کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان میں شادی حرام ہوتی ہے۔

مذکورہ آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ رہبانیت دو قسم کی ہیں۔ مطلوب وغیر مطلوب

غیر مطلوب رہبانیت وہی ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور رہبانیت مطلوب سے مراد سادہ زندگی گزارنا ہے مقام و مال میں رغبت نہ ہو۔ اجتماعی زندگی ہو۔ بہرحال اسلام میں رہبانیت کی مذمت ہوئی ہے۔ ایک مشہور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ.[1]

یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

رہبانیت کی مزید تاریخ وتفصیل کے لئے آیت مذکورہ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔

---

[1] جامع احادیث الشیعۃ (للبر وجردی) / ج 25 / 104 / .....ص: 72

اجتماعی و گوشہ نشین زندگی روایات کے آئینے میں

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام میں اجتماعی زندگی کی بڑی فضیلت ہے۔ اذان اور اقامت میں دعوت عام ہے کہ نماز و فلاح کی طرف آئیں۔

حَیَّ عَلَی الصَّلاۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلاح.

سورہ حمد میں ساری ضمیریں جمع کی آئیں ہیں۔ نماز کے آخر میں تمام مومنین و نماز گزار لوگوں پر سلام بھیجا گیا ہے۔ اس مطلب پر بہت سی روایات دلالت کرتی ہیں۔ جن میں سے ہم بعض کو ذکر کرتے ہیں:

۱۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَیُّھا النّاسُ عَلَیْکُمْ بِالْجَماعَۃِ وَاِیّاکُمْ وَ الْفُرْقَۃَ.[۱]

اے لوگو! جماعت کی صورت میں اکٹھے رہو اور جدائی سے پرہیز کرو۔

۲۔ آپؐ نے فرمایا:

اَلْجَماعَۃُ رَحْمَۃٌ، وَ الْفُرْقَۃُ عَذابٌ.[۲]

اجتماع رحمت اور تفرقہ عذاب ہے۔

۳۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

یَدُاللہِ عَلَی الْجَماعَۃِ فَاِذَا اشْتَدَّ (شَذَّ) الشّاذُّ مِنْھُمْ اِخْتَطَفَہُ الشَّیْطانُ کَما یَخْتَطِفُ الذِّئْبُ الشّاۃَ الشّاذَّۃَ مِنَ النِّعَمِ.[۳]

خدا کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جب جماعت میں سے کوئی جدا ہوتا ہے شیطان اسے دبوچ

---

[۱] تفسیر نمونہ، جلد 23، صفحہ 381-390.

[۲] کنز العمال، جلد 1، حدیث 1028، صفحہ 206.

[۳] میزان الحکمۃ، جلد اوّل، حدیث 2438، صفحہ 406.

لیتا ہے جس طرح جدا ہونے والی بھیڑ کو بھیڑیا دبوچ لیتا ہے۔

۴۔ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

وَ اَلْزَمُوا السَّوادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّ یَدَاللهِ مَعَ الْجَماعَةِ، وَ اِیّاکُمْ وَ الْفُرْقَةَ فَاِنَّ الشّاذَ مِنَ النّاسِ لِلشَّیْطانِ، کَما اَنَّ الشّاذَ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ، اَلا مَنْ دَعا اِلی هذَا الشِّعارِ فَاقْتُلُوهُ وَلَوْ کانَ تَحْتَ عِمامَتی هذِهِ.[۱]

اور اسی نظریہ جماعت کے ساتھ ہو جاؤ کہ اللہ کا ہاتھ اسی جماعت کے ساتھ ہے اور خبردار تفرقہ کی کوشش نہ کرنا کہ جو ایمانی جماعت سے کٹ جاتا ہے وہ اسی طرح شیطان کا شکار ہوجاتا ہے جس طرح ریوڑ سے الگ ہوجانے والی بھیڑ بھیڑیئے کی نذر ہوجاتی ہے تو آگاہ ہوجاؤ کہ جو بھی اس انحراف کا نعرہ لگائے اسے قتل کردو چاہے وہ میرے ہی عمامہ کے نیچے کیوں نہ ہو۔

۵۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّ الشَّیْطانَ ذِئْبُ الْاِنْسانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَأْخُذُ الْقاصِیَةَ وَ النّاحِیَةَ وَ الشّارِدَةَ، اِیّاکُمْ وَ الشِّعابَ، وَعَلَیْکُمْ بِالْعامَّةِ وَ الْجَماعَةِ وَ الْمَساجِدِ.[۲]

شیطان انسان کا بھیڑیا ہے اور اس بھیڑیئے کی مانند ہے جو ریوڑ سے جدا ہونے والی اور فرار کرنے والی بھیڑ کو کھا جاتا ہے۔ جدائی اور تفرقہ سے بچو اور ہمیشہ لوگوں کے ساتھ جماعت کی صورت میں زندگی بسر کرو۔

۶۔ آپ ہی کا فرمان ہے:

لا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَهْجُرَ اَخاهُ فَوْقَ ثَلاثَةِ (اَیّام)، وَ السّابِقُ بِالصُّلْحِ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ.[۳]

کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے مومن بھائی سے تین دن سے زیادہ دوری اختیار کرے اور جو شخص صلح میں پہل کرتا ہے جنت میں داخل ہوگا۔

---

[۱] نہج البلاغۃ، خطبہ 127.

[۲] المجازات النبویۃ/ 313 / المجاز (268)

[۳] المحجّۃ البیضاء، جلد 4، صفحہ 8.

۷۔ اس مضمون کی ایک روایت میں آپ فرماتے ہیں:

لا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَهْجُرَ اَخاهُ فَوْقَ ثَلاثَةِ اَیّامٍ اِلّا اَنْ یَکُونَ مِمَّنْ لا یُؤْمِنُ بَوائِقَهُ.[۱]

کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ ناراض رہے سوائے اس کے کہ انسان اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔

بعض روایات میں ملتا ہے کہ

اگر دو آدمی ایک دوسرے سے ناراض ہوں اور ان میں سے کوئی فوت ہوجائے وہ مسلمان نہیں مرتا۔[۲]

۸۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک شخص پہاڑ پر جاکر رہبانیت اختیار کرنا چاہتا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا:

لَصَبْرُ اَحَدِکُمْ ساعَةً عَلی ما یَکْرَهُ فِی بَعْضِ مَواطِنِ الْاِسْلامِ خَیْرٌ مِنْ عِبادَتِهِ خالِیاً اَرْبَعِینَ سَنَةً.[۳]

تم میں کسی ایک کا صبر کرنا کسی مومن بھائی کی ناراضگی پر اگرچہ ایک لمحہ کے لئے ہو یہ چالیس سال کی رہبانیت کی عبادت سے افضل ہے۔

۹۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَیْسَ فِی اُمَّتِی رَهْبانِیَّةٌ وَلا سِیاحَةٌ.[۴]

میری امت میں رہبانیت اور سیاحت نہیں ہے۔

رہبانیت سے مراد گوشہ نشینی کرنا عبادت کے لئے ہے اور سیاحت سے سیار یعنی گردش کی گوشہ نشینی، پرانے زمانے میں بعض لوگ بطور کلی ترک دنیا کرتے اور بعض دائماً گردش کی صورت گوشہ نشین تھے۔

---

[۱] المحجۃ البیضاء، جلد 4، صفحہ ۷.

[۲] المحجۃ البیضاء، جلد 4، صفحہ ۷.

[۳] سفینۃ البحار، مادہ ہجر.

[۴] میزان الحکمۃ، جلد 3، صفحہ 1966، حدیث 12914.

۱۰۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک صحابی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شدید غمگین ہوا حتیٰ کہ سارے کام چھوڑ کر گھر میں ہی بیٹھ کر عبادت کرنے لگا۔ جب یہ خبر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے اسے آواز دی اور فرمایا:

يا عُثْمانُ إِنَّ اللهَ تَبارَكَ وَ تَعالى لَمْ يَكْتُبْ عَلَيْنا الرَّهْبانِيَّةَ، إِنَّما رَهْبانِيَّةُ أُمَّتِي الْجِهادُ فِي سَبيلِ اللهِ. [1]

اے عثمان! خدا نے ہمارا وظیفہ رہبانیت قرار نہیں دیا۔ میری امت میں رہبانیت راہِ خدا میں جہاد ہے۔

پھر اس سے فرمایا: کیا تو خوش نہیں کہ روز قیامت جنت کے ہر دروازہ پر تو پہنچے گا تو اپنے باپ کو دیکھے گا وہ تیرا دامن پکڑے گا اور خدا سے تیری شفاعت کرے گا۔

۱۱۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت علی علیہ السلام کی حیات میں بھی نظر آتا ہے جس کی طرف نہج البلاغہ میں اشارہ موجود ہے۔ روایت میں ہے کہ جب بصرہ میں اپنے صحابی علاء بن زیاد حارثی کے گھر عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور ان کے گھر کی وسعت کا مشاہدہ کیا اور فرمایا:

مَا كُنْتَ تَصْنَعُ بِسَعَةِ هَذِهِ الدَّارِ فِي الدُّنْيَا- [أَمَا] وَ أَنْتَ إِلَيْهَا فِي الْآخِرَةِ كُنْتَ أَحْوَجَ وَبَلَى إِنْ شِئْتَ بَلَغْتَ بِهَا الْآخِرَةَ تَقْرِي فِيهَا الضَّيْفَ وَ تَصِلُ فِيهَا الرَّحِمَ وَ تُطْلِعُ مِنْهَا الْحُقُوقَ مَطَالِعَهَا فَإِذاً أَنْتَ قَدْ بَلَغْتَ بِهَا الْآخِرَةَ فَقَالَ لَهُ الْعَلَاءُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَشْكُو إِلَيْكَ أَخِي عَاصِمَ بْنَ زِيَادٍ قَالَ وَ مَا لَهُ قَالَ لَبِسَ الْعَبَاءَةَ [الْعَبَاءَ] وَ تَخَلَّى [مِنَ] عَنِ الدُّنْيَا قَالَ عَلَيَّ بِهِ فَلَمَّا جَاءَ قَالَ يَا عُدَيَّ نَفْسِهِ لَقَدِ اسْتَهَامَ بِكَ الْخَبِيثُ أَ مَا رَحِمْتَ أَهْلَكَ وَ وَلَدَكَ أَ تَرَى اللهَ أَحَلَّ لَكَ الطَّيِّبَاتِ وَ هُوَ يَكْرَهُ أَنْ تَأْخُذَهَا أَنْتَ أَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ ذَلِكَ قَالَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ هَذَا أَنْتَ فِي خُشُونَةِ مَلْبَسِكَ وَ جُشُوبَةِ مَأْكَلِكَ قَالَ وَيْحَكَ إِنِّي لَسْتُ كَأَنْتَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى فَرَضَ عَلَى أَئِمَّةِ [الْحَقِ] الْعَدْلِ أَنْ يُقَدِّرُوا أَنْفُسَهُمْ بِضَعَفَةِ النَّاسِ كَيْلَا يَتَبَيَّغَ

---

[1] بحار الانوار، جلد 67، صفحہ 115.

بِالْفَقِيرِ فَقْرُه.[1]

تم دنیا میں اس گھر کی وسعت کو کیا کرو گے؟ درآنحالیکہ آخرت میں تم گھر کی وسعت کے زیادہ محتاج ہو (کہ جہاں تمہیں ہمیشہ رہنا ہے) ہاں! اگر اس کے ساتھ تم آخرت میں بھی وسیع گھر چاہتے ہو تو اس میں مہمانوں کی مہمان نوازی قریبوں سے اچھا برتاؤ اور موقع ومحل کے مطابق حقوق کی ادائیگی کرو اگر ایسا کیا تو اس کے ذریعے آخرت کی کامرانیوں کو پالو گے۔

علاء ابن زیاد نے کہا: یا امیر المومنینؑ مجھے اپنے بھائی عاصم ابن زیاد کی آپ سے شکایت کرنا ہے۔

حضرتؑ نے پوچھا: کیوں اسے کیا ہوا؟

علاء بن زیاد نے کہا کہ اس نے بالوں کی چادر اوڑھ لی ہے اور دنیا سے بالکل بے لگاؤ ہو گیا ہے

حضرتؑ نے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ۔

جب وہ آیا تو آپؑ نے فرمایا: اے اپنی جان کے دشمن تمہیں شیطان خبیث نے بھٹکا دیا ہے تمہیں اپنی آل اولاد پر ترس نہیں آتا؟ اور کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے جن پاکیزہ چیزوں کو تمہارے لیے حلال کیا ہے اگر تم انہیں کھاؤ، برتو گے نہیں تو اسے ناگوار گزرے گا تم اللہ کی نظروں میں اس سے کہیں زیادہ گرے ہوئے ہو کہ وہ تمہارے لیے یہ چاہے۔

اس نے کہا: یا امیر المومنینؑ! آپ کا پہناوا بھی تو موٹا جھوٹا اور کھانا روکھا سوکھا ہوتا ہے۔

حضرتؑ نے فرمایا: تم پر حیف ہے میں تمہاری مانند نہیں ہوں۔ خدا نے ائمہ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تا کہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائیں۔

۱۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت جو کہ عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے اس سے استفادہ ہوتا ہے کہ مسئلہ رہبانیت اور اجتماع سے دوری بنی اسرائیل میں کب ہوا۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ 209.

ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سواری پر کہیں جا رہے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا جانتے ہو کہ رہبانیت کا مسئلہ بنی اسرائیل میں کب در آیا۔

ابن مسعود نے عرض کیا: خدا و پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ظَهَرَتْ عَلَيْهِمُ الْجَبَابِرَةُ بَعْدَ عِيسَى عليه السلام يَعْمَلُونَ بِمَعَاصِي اللهِ فَغَضِبَ أَهْلُ الْإِيمَانِ فَقَاتَلُوهُمْ فَهُزِمَ أَهْلُ الْإِيمَانِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَلَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ إِلَّا الْقَلِيلُ فَقَالُوا إِنْ ظَهَرَنَا هَؤُلَاءِ أَفْنَوْنَا وَ لَمْ يَبْقَ لِلدِّينِ أَحَدٌ يَدْعُو إِلَيْهِ فَتَعَالَوْا نَتَفَرَّقُ فِي الْأَرْضِ إِلَى أَنْ يَبْعَثَ اللهُ النَّبِيَّ الَّذِي وَعَدَنَا بِهِ عِيسَى عليه السلام يَعْنُونَ مُحَمَّداً صلى الله عليه وآله وسلم فَتَفَرَّقُوا فِي غِيرَانِ الْجِبَالِ وَ أَحْدَثُوا رَهْبَانِيَّةً فَمِنْهُمْ مَنْ تَمَسَّكَ بِدِينِهِ وَ مِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ وَرَهْبانِيَّةً ابْتَدَعُوها.[1]

جابروں کا ایک گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ظاہر ہوا کہ جو بہت زیادہ گناہ کیا کرتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے ان سے شدید غصہ ہوا کرتے اور لڑتے تھے یہاں تک کہ تین بار گرفتار شکست ہوا یہاں تک کہ زیادہ تر مومنین کے افراد شہید ہو گئے اور بہت ہی کم افراد بچے تو انہوں (باقی بچ جانے والے افراد) نے فیصلہ کیا کہ اگر ہم اسی طرح لڑتے رہے تو باقی بچ جانے والے افراد بھی ختم ہو جائیں گے اور دین کی طرف دعوت دینے والا کوئی باقی نہ بچے گا لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم بکھر جائیں جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وعدہ کا ظہور نہ ہو یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ غاروں میں جا چھپے اور اس صورت ان میں رہبانیت در آئی۔

رہبانیت عیسائیت کا آئین و قانون نہ تھا۔ ایک روش تھی جو کہ ایک شرط میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے خود کو تحفظ دینے کے لئے اختیار کیا تھا جو آہستہ آہستہ ان کے دین کا جز بن کر رہ گئی۔

---

[1] بحار الانوار (ط - بیروت) / ج 14 / 277 / باب 20. ص: 272

کچھ روایات گوشہ نشینی کے بارے میں

کچھ روایات ایسی ہیں کہ جن میں گوشہ نشینی کی تعریف کی گئی ہے اگر چہ یہ ہمارے مقصود و مفہوم کے مخالف ہیں لیکن بطور علم ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعُزْلَةُ عِبادَةٌ.[۱]

گوشہ نشینی عبادت ہے۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی حدیث میں آیا ہے:

مَنِ انْفَرَدَ عَنِ النّاسِ اَنَسَ بِاللهِ سُبْحانَهُ.[۲]

جو شخص لوگوں سے دور ہو جائے خدا اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

فِي اعْتِزالِ اَبْناءِ الدُّنْيا جَماعُ الصَّلاحِ.[۳]

لوگوں سے جدا ہو جانا اچھائیوں کا مجموعہ ہے۔

۴۔ حضرت علی علیہ السلام سے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

فِي الْاِنْفِرادِ لِعِبادَةِ اللهِ كُنُوزُ الْاَرْباحِ.[۴]

عبادت خدا کی خاطر لوگوں سے دوری کامیابیوں کی کنجی ہے۔

۵۔ ایک حدیث میں ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہشام بن ملک سے فرمایا:

---

[۱] میزان الحکمۃ، جلد 3، حدیث 12884.

[۲] شرح غرر الحکم، جلد 5، صفحہ 338.

[۳] شرح غرر الحکم، جلد 4، حدیث 6505، صفحہ 406.

[۴] شرح غرر الحکم، جلد 4، حدیث 6504، صفحہ 406.

اَلصَّبْرُ عَلَى الْوَحْدَةِ عَلامَةٌ عَلى قُوَّةِ الْعَقْلِ فَمَنْ عَقَلَ عَنِ اللهِ اِعْتَزَلَ عَنِ الدُّنْيا وَ الرّاغِبِيْنَ فِيْها وَ رَغِبَ فى ما عِنْدَاللهِ....[1]

صبر گوشہ نشینی پر عقلی دلیل ہے جو شخص عقل الٰہی رکھتا ہے وہ دنیا و دنیا پرستوں سے دوری اختیار کرتا ہے اس لئے کہ اس میں خدا سے قربت پیدا ہو اور وہ خدا سے قریب ہو سکے۔

۶۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

اِنْ قَدَرْتَ اَنْ لا تَخْرُجَ مِنْ بَيْتِكَ فَافْعَلْ، فَاِنَّ عَلَيْكَ فى خُرُوجِكَ اَلّا تَغْتابَ وَ لا تَكْذِبَ وَ لا تَحْسُدَ وَ لا تُرائِيَ وَ لا تَتَصَنَّعَ وَ لا تُداهِنَ.[2]

اگر آپ اپنے گھر سے باہر جانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں تو کیا کر سکتے ہیں جب گھر سے باہر نہیں جائیں گے تو کسی سے غیبت نہیں کریں گے، جھوٹ نہیں بولیں گے، کسی سے حسد نہیں کریں گے، ریاکاری و تصنع نہیں کریں گے اور نہ کسی کی چاپلوسی کریں گے۔

۷۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

سَلامَةُ الدّينِ فِي اعْتِزالِ النّاسِ.[3]

لوگوں سے دوری دین کی سلامتی ہے۔

۸۔ اختصار کی خاطر حضرت علی علیہ السلام کی اس حدیث پر اختتام کرتے ہیں:

مَنِ اعْتَزَلَ النّاسَ سَلِمَ مِنْ شَرِّهِمْ.[4]

لوگوں سے کنارہ کشی ان کے شر سے تحفظ ہے۔

کبھی کبھار صوفیا اور درویشوں میں موجود تنہائی اور گوشہ نشینی کے طرفداروں نے بعض آیات و روایات سے بھی اپنے نظریہ کے لئے توسل و تمسک کیا ہے۔ از جملہ سورۂ کہف کی سولہویں آیت کہ جس میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾

---

[1] بحار الانوار، جلد 67، صفحہ 111.

[2] فروع کافی، ج 8، ص 128.

[3] شرح غرر، جلد 4، حدیث 5609، صفحہ 140.

[4] شرح غرر، جلد 5، حدیث 8151، صفحہ 238.

اور (اے رسولؐ) قران میں مریم کا (بھی) تذکرہ کرو۔ کہ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہوکر پورب کی طرف والے مکان میں (غسل کے واسطے) جا بیٹھی۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو سے تمسک کیا ہے جو سورۂ مریم کی ۴۸، ویں اور ۴۹ ویں آیت میں بیان ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝

اور میں نے آپ کو (بھی) اور (ان بتوں کو بھی) جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پوجا کرتے ہیں (سب کو) چھوڑا اور اپنے پروردگار ہی کی عبادت کروں گا۔ امید ہے کہ اپنے پروردگار کی عبادت سے محروم نہ رہوں گا۔ غرض جب ابراہیمؑ نے ان لوگوں کو اور جس کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پرستش کیا کرتے تھے چھوڑا تو ہم نے انہیں اسحاقؑ و یعقوبؑ (سی اولاد) عطا فرمائی اور ہر ایک کو نبوت کے درجہ پر فائز کیا۔

تنہائی، معاشرے سے الگ ہو جانے اور کنارہ کشی پر مبنی ان دونوں آیات کو رحمت پروردگار اور عنایت الٰہی حاصل کرنے کا وسیلہ شمار کیا گیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ تنہائی اور گوشہ نشینی کوئی ناپسندیدہ اور قابل مذمت عمل نہیں ہے۔

آیات اور روایات کو جمع کرنے کا راستہ

لیکن اگر ہم آیات و روایت کے متن پر غور وفکر کریں تو یہ بات انتہائی آسانی سے ثابت ہو جائے گی کہ تنہائی اور گوشہ نشینی کے متعلق نصیحت، خاص سماجی حالات اور استثنائی صورت حال کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ ہم اصحاب کہف کے متعلق جانتے ہیں کہ وہ جن کافر اور بے تربیت معاشرے میں گرفتار ہوئے تھے اور ان کا خدا پر ایمان کے جرم میں تعاقب کیا جا رہا تھا اور ان کے پاس شہر سے فرار اور غار میں پناہ لینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے بھی حالات کچھ ایسے ہی تھے آپؑ نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بت

پرستی کے خاتمے کے لئے بھرپور کوشش اور جدوجہد کی، لیکن جب ان کی کوششیں مؤثر اور بارآور واقع نہ ہوئیں اور ان کی جان کو خطرات لاحق ہوئے تو انہیں تنہائی اور ہجرت کا حکم ہوا۔

روایات میں ایسی جمع کی مثالیں بہت ہیں جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام گوشہ نشینی کو خود اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں اور اس کی دلیل اس وقت معاشرے میں برائیوں، دوستوں کی بے وفائی اور لوگوں کے ساتھ تعاون غیر ممکن ہونا بتاتے ہیں۔

وہ روایت جو حضرت علی علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے اس میں آپؑ دین کی سلامتی تنہائی میں سمجھتے ہیں۔ اس بات کا تعلق اس جگہ سے ہے جہاں لوگوں سے تعلقات انسان کے دین کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔

بعض لوگوں کے حالات کچھ خاص نوعیت کے ہوتے ہیں جو برائیوں کے سامنے انتہائی کمزور واقع ہوتے ہیں اور ان برائیوں کے آثار کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اجتماعات میں نہ جائیں یا کم جائیں۔ یہ کمزور مزاج لوگوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جو الگ موسم و مزاج کے اجتماعات میں چلے جائیں تو ان کا مزاج بہت جلد مختلف قسم کی بیماریوں کو جذب کر لیتا ہے۔ ممکن ہے طبیب انہیں ایسے اجتماعات میں کم جانے یا بالکل ہی منع کر دے۔ آج کل یہ بات معمول بن گئی ہے کہ جب فضا گرد آلود ہو تو بوڑھوں، دل اور سانس کے مریضوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہ نکلیں۔

واضح ہے کہ مذکورہ باتوں میں سے کوئی بات بھی کلی قاعدہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق معاشرے کے خاص حالات سے ہے یا فرد کے خاص حالات سے ہے۔ لہٰذا تنہائی اور گوشہ نشینی کی نصیحت ہر ایک یا ہر زمانے اور مقام کے لئے نہیں کی جاسکتی۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے ایک صحابی کو فرماتے ہیں:

اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ گھر سے باہر نہ نکلو تو ایسا ہی کرو اس طرح تم غیبت، تہمت، جھوٹ، حسد، ریاکاری، خودنمائی اور خوشامدی وغیرہ سے بچ جاؤ گے۔

یقیناً یہ اس وقت کے سماجی حالات اس طرح کا تقاضا کرتے تھے یا وہ شخص کمزور ارادے اور مزاجی طور پر متاثر ہو جانے والا تھا۔

ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

ہم اس بات سے بھی بے توجہ نہیں رہ سکتے کہ سماجی لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ سے قربت اور مناجات کے لئے روزانہ کچھ وقت اپنی ذات کو دینا چاہئے۔ خاص طور پر رات کے آخری حصے میں بالکل تنہا ہو کر اللہ سے مناجات کرے

اور حرکت پیدا کرے اور اس سے بالاتر ہو کر عارف و عاشقان خدا عین اس وقت جب وہ لوگوں کے درمیان ہوتے ہیں ان کے ذکر و فکر میں خدا ہوتا ہے وہ اللہ کے سوا نہ کچھ دیکھتے ہیں اور نہ اس کے سوا کسی سے محبت کرتے ہیں اور ہر خیر کو اس سے مانگتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں سے جدا یا ناراض ہونا جو ہٹ دھرمی کے ساتھ برائی کے راستے کو افشاء کئے ہوئے ہوتے ہیں، برائی کے خاتمے کا ایک منفی ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ یہ عمل ان کی روح و جان کو جھنجھوڑنے کا سبب بنتا ہے تاکہ وہ اپنی ذات پر توجہ دیں۔ ہم اکثر علما کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ جب لوگ برائیوں پر اصرار کرتے تھے تو انہیں انتہائی غصے اور ناراضگی کے ساتھ تنہا چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور اس طرح لوگوں کو بہت جلد اپنے نقصانات اور ان کی کمی کا احساس ہو جاتا تھا اور پھر یہ لوگ اس عالم کو ڈھونڈ کر اپنے درمیان واپس لے آتے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرتے تھے۔

یہ سب وہ استثناءات ہیں جو انسان کے سماجی ہونے پر کلی قاعدہ کے سامنے قابل قبول ہیں۔

گوشہ نشینی کی اور اجتماع پرستی کے نتائج و محرکات۔

انسان کی اجتماعی مسائل اور معاشرہ پرستی کی جانب توجہ کا اصلی محرک انسان کی فطرت ہے اور یہ جملہ کہ انسان مدنی بالطبع'' ہے ماہرین سماجیات کے نزدیک معروف ہے۔ گوشہ نشینی اور تنہائی انسان کو شدید تکلیف پہنچاتی ہے اور ماہرین سماجیات کی وہ تحقیق جو انہوں نے تارک انبیاء اور گوشہ نشینوں کے متعلق انجام دی ہے اسی بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ گوشہ نشینی نے ان کی روح پر انتہائی برے اثرات چھوڑے، جس نے ان میں نا امیدی افسردگی اور توہمات پیدا کئے اور اکثر اوقات ان کی نفسیات میں نا ہمواری اور خلل کو جنم دیا[1] اسی لئے انسان کے لئے قید تنہائی بدترین سزا ہے کہ حتیٰ ضرورت کے وقت اسے جاری نہیں رہنا چاہئے کیونکہ یقیناً وہ اس حالت میں ذہنی اور نفسیاتی مریض بن جائے گا، مگر ان لوگوں کے لئے قید تنہائی کوئی مسئلہ نہیں جو غیر معمولی عرفانی روح رکھتے ہوں، خدا سے لو لگائے ہوں اور اللہ سے مناجات کو ہر چیز کا جانشین قرار دیتے ہیں۔

---

[1] جامعہ شناسی ساموئیل کنیک، صفحہ 428.

البتہ انسان کی اجتماعی زندگی کا سرچشمہ صرف انسان کی فطرت اور مزاج نہیں ہے بلکہ منطق اور عقل بھی اسے اس بات کی تلقین ونصیحت کرتی ہے، کیونکہ انسان اجتماعی زندگی کے بغیر کسی بھی قسم کی ترقی حاصل نہیں کرسکتا اور اگر انسان ایک دوسرے سے الگ زندگی گذارتے تو آج بھی ان کے حالات گذشتہ انسانوں جیسے ہوتے۔ کیونکہ مختصر مطالعہ سے ہی یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ تمام علوم و دانش، معلومات اور صنعتی علوم، افکار کے اضافہ ہونے اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے سے ہی وجود میں آتے ہیں اور یہی چیز انسانی معاشرے کو آگے بڑھاتی ہے اور اسے خطرناک راستہ عبور کراتی ہے اور اسے ترقی اور تکامل کی چوٹی تک پہنچاتی ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تنہائی اور گوشہ نشینی بہت سی برائیوں کا ثبوت اور بدبختی کی جڑ ہے، ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بہت سے فکری گمراہی، غلط رویے، غلط فہمی اور بداخلاقی کا سرچشمہ تنہائی و گوشہ نشینی ہے اسی لئے گوشہ نشین افراد زیادہ تر جذباتی، سخت رویہ، ہٹ دھرم، ضدی اور خود کو بڑا سمجھنے والے ہوتے ہیں (البتہ یہ اصل بھی ہر دیگر اصل کی طرح استثناءات رکھتی ہے)

۲۔ خود پسندی اور خودغرضی تنہائی اور گوشہ نشینی کے دیگر آثار میں سے ایک ہے کیونکہ انسان حب ذات کے جذبات کی وجہ سے عام طور پر اپنی ذات اور اپنی تخلیقات سے شدید محبت کرتا ہے اور جب وہ دوسروں سے تعلقات نہیں رکھے گا اور ان کے فضائل و کمالات کو نہیں دیکھے گا اور خدا کا ان سے موازنہ نہیں کرے گا تو یہ اور خود کو دوسروں سے بالاتر سمجھنے کا سبب بنیں گا۔

اسی طرح اکثر دیکھا گیا ہے کہ تنہائی پسند اور گوشہ نشین افراد بہت بڑے اور عجیب وغریب دعوے کرتے ہیں کہ جو ان میں موجود غیر معمولی خود پسندی، خودغرضی توہمی خیالاتی حالت کو بیان کرتی ہے۔

لیکن جب انسان دوسروں کے ساتھ باہمی زندگی کرتا ہے تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کے اطراف میں اس سے زیادہ قابل، فاضل، پاک اور متقی افراد موجود ہیں یا کم از کم اس جیسے بہت سے لوگ موجود ہیں، اس لئے وہ دوسروں کو خیالی اور وہمی دنیا سے نکال لیتے ہیں اور بے مقصد دعوؤں سے پرہیز کرتے ہیں۔

۳۔ ہر ایک کے متعلق حتیٰ اپنے نزدیک ترین افراد کے متعلق منفی سوچ تنہائی اور گوشہ نشینی کے خطرناک آثار میں سے ایک ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ منفی سوچ؛ تنہائی اور گوشہ نشینی کا سبب بن جاتی ہے اور گوشہ نشینی مزید منفی سوچ کا سبب بنتی ہے اور اس قسم کے افراد لوگوں کو بدکردار، آلودہ، حق ناشناس، کینہ اور حاسد سمجھتے ہیں، لیکن جب وہ معاشرے میں جاتے ہیں اور اپنے لئے اچھے دوست ڈھونڈتے ہیں تو وہ بہت جلد سمجھ جاتا ہے کہ اس کی توقعات اور خیالات انتہائی

غلط ہیں۔

۴۔ اپنے عیبوں سے غافل رہنا، انسان عام طور پر اپنی ذات سے شدید محبت رکھنے کی وجہ سے اپنے عیبوں کو نہیں دیکھ پاتا بلکہ کبھی تو وہ اپنے عیبوں کو اپنی بڑی خوبی اور توانائی کا باعث سمجھتا ہے، انسان کو ہمیشہ اپنے عیوب کو دوسروں کے فیصلوں کے آئینے میں دیکھنا چاہئے اور اسے دیکھنا چاہئے کہ غیر وابستہ افراد اس کے متعلق کیا کہتے ہیں اور کیا اعتراض کرتے ہیں حتیٰ بعض اوقات انسان اپنے عیوب کو بدخواہوں کی سوچ کے آئینے میں بہتر انداز میں دیکھ پاتا ہے کیونکہ وہ اس میں عیب تلاش کرنے کے درپہ ہوتا ہے اور وہ ان کا انتہائی باریکی سے تجزیہ کرتا ہے، لیکن تنہائی پسند اور گوشہ نشین افراد اس آئینے سے محروم ہوتے ہیں۔

۵۔ دوسروں کے تجربات سے دور اور محروم رہنا، ہر انسان کی سوچ اور توانائی جدا جدا ہوتی ہے اور وہ اپنی زندگی کے انتہائی مختصر حصے میں تجربہ کرتا ہے اور اگر وہ دوسروں خاص طور پر اہل نظر افراد کے ساتھ رابطے میں ہو تو علم و دانش اور تجربوں کا ایک سمندر اس کے اختیار میں قرار پا جائے گا اور اپنی تمام مشکلات کا حل اس میں تلاش کرلے گا اور اپنی تمام خواہشوں کو اس میں پالے گا۔

ہمارے زمانے میں علم کی تیزی سے ترقی کا راز اور تنظیموں کا قیام ہے اور ان کے ذریعے منعقد ہونے والے اجلاس اور کانفرنسوں میں پوری دنیا کے مختلف علاقوں سے قابل اور فاضل ترین لوگ اس میں شریک ہوکر اپنی تحقیقات اور معلومات کو پیش کرتے ہیں اور اپنے تجربوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں اور کبھی یہ ذمہ داری مطبوعات اور جرائد اٹھا لیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اجتماع پرستی کی برکات اور نتائج اس قدر زیادہ ہے کہ جنہیں اس مختصر کتاب میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور جو کچھ کہا گیا اس کا ایک چھوٹا سا گوشہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ تنہائی اور گوشہ نشینی کے نقصانات اس سے کئی گنا زیادہ ہیں جو بیان ہوئے ہیں۔



خداوندا! ہم حمد وشکر بجا لاتے ہیں کہ تو ہمیں پہلی بار اخلاقی مسائل کے اصول کو آیات قرآن کے سائے میں تفصیل سے پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور اپنی طاقت کے مطابق اس حوالے سے اپنے اعرائض پیش کرسکیں عوامل، وجوہات، نتائج، آثار فضائل اور ان کی تقویت اور برائیوں سے مقابلے کے طریقے کی اپنی سمجھ کے مطابق وضاحت کرسکیں۔

خداوندا! ہم جانتے ہیں کہ یہ فضائل و رذائل ہم پر ہماری ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ ہم خود اس پر عمل کریں اس عظیم ذمہ داری پر عمل پیرا ہونے کی طاقت اور توانائی عطا فرما اور اس راہ میں تو ہماری مدد فرما۔

اے میرے معبود! ہم اس دور میں زندگی کر رہے ہیں کہ اخلاقی فضائل نے اس دنیا سے اپنا رخت سفر باندھ لیا ہے اور برائیوں کا طوفان تمام انسانی اقدار، نیک سنتوں اور انبیاء و اولیاء علیہم السلام کی راہ ورسم کو بری طرح متأثر کر رہا ہے۔ زمین ظلم و جور سے بھر چکی ہے، اپنے وعدے کو پورا فرما اور اپنی آخری حجت حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور میں تعجیل فرما۔ اور ہمیں ان کی راہ کے مجاہدین کی پہلی صف میں قرار دے (آمین یارب العالمین)